ف ۵۵

یہ جو ملنے میں اُس سے شرماتی ۔۔۔ وہ اُسے چھیڑ چھیڑ گرماتی

آگئیں خوب اُس کے جب بس میں ۔۔۔ پھر تو دینے لگیں اُسے قسمیں

اب تجھ سے ہے یہ سوال میرا ۔۔۔ کیوں تجھ کو نہیں خیال میرا

مِسّی تری ہے اگر نمودار ۔۔۔ تو میری دھڑی بھی ہے دھواں دار

گر نکلے ہے تجھ پہ خلق کا دم ۔۔۔ تو مجھ کو بھی چاہتا ہے عالم

افسوس ہے کہ فحش کی آمیزش نے مثنوی کو اس قابل نہ رکھا کہ اُس کے طویل اقتباسات پیش کئے جاسکیں اور کوئی مسلسل بیان نقل کیا جاسکے۔

اُستادالاساتذہ شیخ غلام ہمدانی مصحفی نے ایک مثنوی بحرالمحبت نام میرتقی کی دریائے عشق کے جواب میں لکھی۔

گرچہ ہے کلکِ میر نادر کار ۔۔۔ تو بھی قدرت کو اپنی کر اظہار

جن مقاموں میں رنگ کم ہے بھرا ۔۔۔ دے ذرا اور بھی تو حسن ملا

وہی قصہ ہے وہی بحر لیکن وہ درد نہیں۔ میر صاحب کے ہر شعر کا جواب لکھنے کی کوشش فرمائی ہے۔

میر:۔ ہوش جاتا رہا نگاہ کے ساتھ ۔۔۔ صبر رخصت ہوا اک آہ کے ساتھ

مصحفی:۔ جان ہونٹوں پہ آئی آہ کے ساتھ ۔۔۔ لہو آنے لگا نگاہ کے ساتھ

میر:۔ نکلے باہر وے موئے نکلے ۔۔۔ دونوں دست و بغل ہوئے نکلے

مصحفی:۔ دو ہم آغوش دام میں نکلے ۔۔۔ پکّے اپنے وہ کام میں نکلے

میر:۔ کھینچ گیا قعر کو یہ گوہر ناب ۔۔۔ تھی کشش عشق کی مگر تہِ آب

مصحفی:۔ کفش کے ساتھ ہی گیا تہِ آب ۔۔۔ ہوا غواص گوہر نایاب

شیخ صاحب مثنوی کے خاتمہ پر عرض پرداز ہیں:۔

ہے توقع کہ صاحب انصاف ۔۔۔ مجھکو اس گفتگو میں رکھیں معاف

کچھ مرے حق میں خیر و شر نہ کہیں ۔۔۔ نہ کہیں بد بھی نیک گر نہ کہیں

لہذا موازنہ مناسب نہیں اور اظہار رائے کی ضرورت نہیں۔ ہنسوڑ کہتے ہیں:۔

"کہاں چاندنی چوک کی سلونی زبان اور کہاں یہ امروہہ کا پھیکا پکوان !!"

اس بحر کے آبدار موتیوں کا نمونہ یہ ہے:۔

ہجر میں وصل جاودانی ہے ہجر عاشق کی زندگانی ہے
نہ کوئی آشنا نہ ہمدم ہے ہے جو مونس تو بس ترا غم ہے
جان مضطر ہو تن سے جانے لگی بیخودی میں غشی سی آنے لگی

مصحفی کے شاگرد رشید طالب علی خاں عیشی نے ایک مختصر مثنوی "سوز و ساز" لکھی۔ قصہ دلچسپ نہیں لیکن بندش کی صفائی اور تاثیر کلام میں اُستاد سے گوئے سبقت لے گئے۔ چند شعر درج کئے جاتے ہیں:-

سرمایۂ سوز و ساز ہے عشق نیرنگ نیاز و ناز ہے عشق
دل بسکہ ضعیف و ناتواں ہے تن پر مرے جان بھی گراں ہے
طاقت نہیں جان مضمحل میں اک آگ سی لگ رہی ہے دل میں
ناساز ہوئی جو زندگانی بیمار نے اپنی موت ٹھانی
گر عشق دکھائے اپنی بازی محمود کیا کرے ایازی

مصحفی کے دوسرے نامور شاگرد میر تقی ہوس نے نظامی کی لیلیٰ مجنوں کا ترجمہ کیا اور ایسی دردناک مثنوی لکھی کہ دریائے عشق اُس کے آگے پانی پانی ہے۔ قصہ دلچسپ - انداز بیان دردخیز - بحر عاشقانہ - مثنوی کو قبولیت نصیب ہوئی - زبان اب بہت ترقی کر چکی ہے۔ "نپٹ"۔ "نت"۔ "روندھنا" وغیرہ الفاظ غیر مانوس ہوگئے ہیں لیکن کلام کی تاثیر آج بھی دلوں میں چٹکیاں لیتی ہے اور آنسوؤں کے دو چار موتی شاگرد مصحفی کی اس یادگار پر چڑھانا ہی پڑتے ہیں۔

ابتدائے عشق:-

از بسکہ تجسس دل آرام جھک جھک کبھی دیکھتا در و بام
کرتا کبھی دیکھنے کی گھاتیں کرتا کبھی آپ ہی آپ باتیں
رُک کر گہے زار زار روتا اُٹھ بیٹھتا گاہ سوتا ہوتا
کرتا کبھی چاک پیرہن کو ملتا گہے خاک سے بدن کو
ہر کوچے میں بے قرار پھرتا غش کھا کے ہر ایک در پہ گرتا

لیلیٰ غرفہ سے مجنوں کو دیکھتی ہے:-

آلودہ بگرد وہ سراپا ڈوبی یہ عرق میں سر سے تا پا
تہ گرد کی اُس کے تھی بدن پر تھا بار لباس اس کے تن پر

عریاں تھا جو بے کلاہ واں سر | افسوس سے ہاتھ یاں جبیں پر
واں درد سے تھا وہ دست بر دل | یاں عشق سے تھی شکست پر دل
وہ فرشِ زمیں پہ پا بزنجیر | مسند پہ یہاں یہ غم کی تصویر
وہ صورتِ موج بے قراری | یہ غرق بہ بحرِ شرمساری
بسمل کی طرح سے وہ پھڑکتا | دل سینے میں اس کا تھا دھڑکتا
وہ آتشِ عشق سے پھُنکے تھا | یاں ضبط سے اس کا دم رُکے تھا
ملتی تھی اُدھر وہ دستِ افسوس | کرتا تھا یہ دور سے قدمبوس

مجنوں کی ماں کا حالِ زار۔

ماں کا ترے حال ہے دگرگوں | ہے یاد تری ہی اُس کو مجنوں
روتی شب و روز رہتی ہے وہ | بیچین ہو کر یہ کہتی ہے وہ
مجنوں کی مجھے خبر نہ آئی | صورت وہ کہیں نظر نہ آئی
جس روز سے تو جدا ہوا ہے | میں کیا کہوں اُس کو کیا ہوا ہے
مطلق نہیں اپنا ہوش اُس کو | غم رکھے ہے نت خموش اُسکو
ہے شدتِ غم مدام اُس کو | ہے خواب و خورش حرام اُس کو
کھینچے ہے جگر سے آہ پر آہ | خوں روتی ہے شام اور سحر گاہ
نے گھر کا اُسے خیال تجھ بن | نے غم سے ہے اُس میں حال تجھ بن
بے فرش پڑے ہیں سارے دالان | سب گھر ہے بغیر تیرے ویران
ہے نام ترا ہی لیتی پھرتی | بالوں سے ہے جھاڑ دیتی پھرتی

نواب اعظم الدولہ سرورؔ دہلوی نے سات مثنویاں یوسف زلیخا۔ شیریں فرہاد۔ لیلیٰ مجنوں وغیرہ تصنیف کیں اور وہ "سبعہ سیارہ" کے نام سے سپہرِ سخن پر درخشاں ہوئیں مگر اب اُن کا نشان نہیں ملتا۔ کلام کا نمونہ یہ ہے :-

اگر حاصل ہو عمرِ جاودانی | نہیں بن عشق لطفِ زندگانی

. . . . | . . . .

اگرچہ عشق میں آفت ہے یکسر | نہیں پر شغل کوئی اس سے بہتر

اندوہ میں اُسکے راحتیں ہیں مرغوب اُس کی اذیتیں ہیں
مجھ کو رہے عشق سے سروکار اس نشہ کا دل سے ہوں طلبگار

۱۲۲۵ھ میں دہلی کے ایک شاعر منشی مولچند نے تقریباً ۹۰۰۰ بیت کی ایک طویل مثنوی لکھکر ادب اُردو کا دامن جمشید و کیخسرو۔ رستم و افراسیاب کی کہانیوں سے بھر دیا۔ سبب تالیف مولف کی زبان سے سنئے:۔

عزیزان معنی شناس ایک روز کہ تھا مثل نور وز بہجت فروز
بہم محفل آرا تھے ہنگام شب مہیا تھے سامان عیش و طرب
وہ مجلس تھی رشک بہار چمن ہر اک لحظہ تھا ذکر شعر و سخن
تو اریخ کا بھی جو مذکور تھا تو واں پر کسی نے بیاں یوں کیا
کہ ہے شاہنامہ تماشہ کتاب عجب نظم دلکش ہی با آب و تاب
توکل کہ مرد سخن سنج تھا کیا ترجمہ اُس نے شہنامے کا
لکھا نثر میں قصۂ مختصر کہ احوال معلوم ہو سر بسر
یہ شمشیر خانی وہ موسوم ہے تمام اُس میں احوال مرقوم ہے
یہ سُنکر برادر مرے مہرباں سخن فہم دانشور و نکتہ داں
یہ بولے کہ منشی جی اس نامے کو تم اب ریختے کی زباں میں لکھو
ہوا میں دل و جاں سے معروف کار لکھی نظم یہ دلکش و آبدار
مرتب یہ شہنامہ جب ہوچکا کیا فکر تب سال تاریخ کا
تو پھر ہاتف غیب نے صبحدم کہا۔ قصۂ خسروان عجم

شعرا کے نقطۂ نگاہ سے اس مثنوی میں بے شمار نقائص تھے۔ بندشیں کمزور۔ قافیے سُست۔ محاورے بے محل الفاظ غلط۔ اُن کی بزم میں یہ نظم مقبول نہوئی گر داستانیں دلچسپ تھیں۔ بیان صاف و سادہ تھا۔ ملک نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور منیژہ کی کہانی گلی گلی بیان ہونے لگی۔

منیژہ ہوں میں دختِ افراسیاب کیا گردشِ آسماں نے خراب

ناگ پنچمی اور سلونو کے میلوں میں یہ شعر اب بھی سُننے میں آجاتا ہے۔

پکڑ کر کمر بند سُہراب کا زمیں سے لیا پہلتن نے اُٹھا

اسی عہد کے قریب حکیم مومن خاں دہلوی نے متعدد مثنویاں لکھیں جن میں سے شکایت ستم (۱۲۳۱ھ) قصۂ غم (۱۲۳۵ھ) اور قول غمین (۱۲۳۶ھ) نہایت درد انگیز ہیں مگر ادب اُردو کی بدنصیبی سے ان کی واقعہ نگاری اور سخن طرازی کی کچھ قدر نہ ہوئی غزلیں غالب کی "واہ واہ" سے اور مثنویاں میر کی "آہ" سے کم رتبہ سمجھی گئیں - اسباب وعلل پر مباحثہ نقیر کا شعار نہیں لیکن یہ واقعہ کا اظہار ہے کہ آج سخن سنجوں کی بزم میں چند ہی نفوس اس حقیقت سے آشنا ہوں گے کہ مومن کی مثنویاں درد و تاثیر میں میر و مصحفی کی مسلسل نظموں سے فائق ہیں - اور غالب تو اس میدان کے مرد ہی نہ تھے وہ صرف غزلوں کی "شاخ"[1] سے "چوگان" کھیلتے تھے اور اس بازی میں بھی مومن سے اکثر ہارتے تھے !!

مومن اُسی نے مجھ سے دی برتری کسی کو
جو پست فہم تیرے اشعار تک نہ پہونچا

(از قول غمین)

جدائی

اُس کے کوچے سے نہ اُٹھتا تھا قدم — بیٹھے جاتے تھے ہر اک گام پہ ہم
دل میں جب ہوک اُٹھی بیٹھ گیا — پاؤں اُٹھا بھی تو جی بیٹھ گیا

آخری ملاقات

کیا نئے ڈھب سے ملاقات ہوئی — کہ نہ کچھ بولے نہ کچھ بات ہوئی
ملکے حیرت زدگان بیکس — دور بیٹھے ہوئے روتے رہے بس
[illegible]وں فشاں لب پہ وہ آہیں باہم — [illegible]سرت آلودہ نگاہیں باہم
گرچہ ہرگز بھی نہ تھی تاب کلام — پر یہ بولی کہ ذرا جی کو تھام
کہ یہ کیا حال ہے کیوں روتے ہو — مفت کس واسطے جی کھوتے ہو
اب تم اور دں سے لگا لیجیو جی — نہ ہوئے ہم تو کوئی اور سہی
ہاں اگر فکر ہو تو ہم کو ہو — رنج و اندوہ ہو جو ہم کو ہو
کہ بری آہ ہماری خو ہے — ہم میں اک مہر و وفا کی بو ہے

---

[1] ایک مختصر مثنوی انبہ کی تعریف میں غالب نے کہی تھی -

آم کا کون مرد میداں ہے — ثمر و شاخ گوے و چوگاں ہے

تم رہو خوش کسی جاناں کے ساتھ　　ہم چلے حسرت و حرماں کے ساتھ

کام دل رنج و بلا کو سونپا　　تم کو تو ہم نے خدا کو سونپا

(از قصۂ غم)

چھیڑ چھاڑ

وہ ہاتھ کو دمبدم جھٹکنا　　وہ تکیے پہ سر کو دے پٹکنا

وہ ہاتھ کو زور سے چھڑانا　　وہ ہو کے تبنگ کاٹ کھانا

ہرجائی کی چٹکیاں وہ لینی　　آزردہ ہو گالیاں وہ دینی

وہ جی سے تنگ ہونے لگتا　　کچھ بس نہ چلا تو رونے لگتا

اسی زمانہ میں لکھنؤ کے ایک ہندو شاعر راحت (یا تاج ؟) تخلص نے نلدمن فیضی کا خلاصہ اُردو نظم میں کیا۔ قصہ کی نُدرت سے مثنوی مشہور ہوئی اور آج تک نوجوانوں کی صحبت میں اُس کی قدر باقی ہے۔ زبان صاف اور شاہنامہ نلشی سے بہتر ہے۔

سببِ تالیف کتاب :-

قلم سے کرکے اول دُر فشانی　　لکھوں میں دل کے اسرار نہانی

کہ تھا از بس سخن سے ذوق مجھ کو　　سدا تھا مثنوی سے شوق مجھ کو

جو دیکھا آج کل ہندی کا چرچا　　ہوا اِک دن مشتاق اُس کا

کہ عشقِ نل جو ہے عالم میں مشہور　　کرے ہندی زباں میں اسکو مذکور

اگرچہ فارسی میں سب بیاں ہے　　مگر طول سخن کی ہر اک داستاں ہے

کرے تو مختصر ایسا بیاں سب　　کھلے ہر اک پہ جو راز نہاں سب

ہندوستان کی تعریف :-

زبس ہے حُسن میں وہ ملک نامی　　بجا ہے گر کرے کنعاں غلامی

وہ کافر زلف رکھتے ہیں کمر تک　　پھنسے جس میں دل اسلام بیشک

جہاں ایسے بتوں کی ہو خدائی　　کریں کیونکر نہ واں سب جبہ سائی

یہ مثنوی سنہ ۱۲۴۲ھ میں تمام ہوئی۔ " یہ داستان ہے راحت افزا " تاریخ اختتام ہے۔ مصنف کا صحیح نام معلوم نہ ہوسکا۔ کوئی کہتا ہے کہ تاج بہادر تاج کی تصنیف ہے جو محلہ نوبستہ لکھنؤ کے رہنے والے تھے اور کوئی راحت کی طرف منسوب کرتا ہے۔ داستان مشہور ہے

مگر داستان گو گمنام ہوگیا۔ ۵

میر تقی - میر حسن - انشا و مصحفی نے لکھنؤ کی مبارک سرزمین پر اپنی مشہور مثنویاں تمام کیں لیکن اُن کے سینوں میں دلّی کے "اُجڑے ہوئے دیار" کی یاد تھی - وہ اپنی زبان و محاورات کی سند کے لئے "خانم کی بازار" اور "جامع مسجد کی سیڑھیوں" کی طرف اشارہ کرتے تھے۔ لکھنؤ کی زبان اور بیان کا اُسوقت تک کوئی جداگانہ انداز نہ تھا اس لئے زبان کے اعتبار سے ان بزرگوں کی مثنویاں خواہ لکھنؤ کی خیال کی جائیں یا دلّی کی اگران سب میں عموماً اور سحرالبیان میں خصوصاً لکھنؤ کی معاشرت کا اس قدر گہرا نقش ہے کہ کم از کم مثنوی میر حسن کو تو خالص لکھنؤ کی پیداوار سمجھنا چاہئے۔

ناسخ و آتش کے دور میں لکھنؤ نے علم بغاوت بلند کیا - نواب وزیر شطرنج کے بادشاہ بنے - متروکات سخن کے نئے دفتر اور محاسن کلام کے جدید قوانین مرتب ہوئے - تازہ محاورات خانہ ساز ٹکسال میں ڈھلنے لگے - شعرا نے دلّی کی مرکزی حکومت کا جُوا گردنوں سے اُتار پھینکا - صحت زبان صفائی بیان پر مرجح قرار پائی - صنعت طرازی اظہار جذبات سے اعلیٰ متصور ہوئی اور بازاری خوش بیانی کا ایک جدید اسکول یہاں قایم ہوگیا - اس دور انقلاب کی پہلی مشہور مثنوی شیخ ناسخ کی نظم سراج ہے جو ۱۲۵۴ھ میں مکمل ہوئی چھ سات سو بیتوں میں بعض احادیث کا ترجمہ ہے صحت الفاظ میں شک کی گنجایش نہیں لیکن قافیے بے حد سست ہیں۔ "نیک نام" "نیک خو" خوش بیان" "خوش کلام" وغیرہ وقف عام صفتیں مصرعوں کا وزن پورا کرنے کو بے ضرورت استعمال کی گئی ہیں اور ایک شعر بھی اس قابل نہیں ہے کہ اس مضمون میں نقل کیا جائے۔ "معجزۂ آل نبی" اور "قصۂ شاہ روم" جو اسی زمانہ کی بعض غیر مشہور شاعروں کی تصنیفات ہیں وہ بحیثیت زبان کی اس مثنوی سے افضل ہیں - اُن میں روانی اور تاثیر ہے جس کا نظم سراج میں نشان نہیں۔ ناسخ کی مثنوی کلیات میں بحفاظت مقفل ہے لیکن "قصۂ شاہ روم" اب بھی بچوں کی زبان پر ہے -

عجب تھا سہمگیں میداں وہاں کا	شجر بھی واں نہ تھا سایہ کہاں کا
ہوئی مرضی جو رب العالمیں کی	طنابیں کھنچ گئیں اُس سرزمیں کی
وہ شہ اور فوج و لشکر اُس کے ہمراہ	ستاروں کے ہو جیسے بیچ میں ماہ

شیخ ناسخ کے انتساب سے نظم سراج لکھنؤ اسکول کی پہلی مثنوی تصور کی گئی ورنہ شاعرانہ حیثیت سے اُس کا کوئی درجہ نہیں۔ علاوہ اس کے وہ اس حجت سے بھی اول کہلانے کی مستحق نہیں کہ جو اس نظم کا سنہ تالیف ہے وہی سال اُس بے مثال مثنوی کے انتہا کا ہے جس کا ادب اُردو میں کوئی ثانی نہ ہوسکا - پنڈت دیا شنکر نسیم نے گل بکاؤلی کا دلچسپ قصہ جو پہلے سے اُردو نثر میں موجود تھا نظم کر

وہ نثر ہے داو نظم دوں میں	اس مے کو دو آتشہ کردوں میں

اور ۱۲۵۴ھ میں یہ بیش بہا مثنوی تمام ہوئی -

این نامہ کہ خامہ کرد بنیاد | گلزار نسیم نام بنہاد
بشنید و نوید ہاتفے داد | توقیع قبول روز پیشں باد
۱۲۵۴ھ

میر حسن نے مناظر کی مصوری اور جذبات کی نقاشی میں کمال دکھایا تھا لیکن داستان اُن کی طبعزاد تھی جس جگہ جیسی ضرورت ہوئی قصہ کو توڑ مروڑ لیا۔

نسیم دوسرے کی لکھی ہوئی "روداد زبان باستانی" کے پابند تھے اور اس میں ترمیم و تحریف کی گنجائش نہ تھی۔

میر حسن نے زبان صاف۔ سادہ اور بے تکلف اختیار کی جو واقعہ نگاری کے لئے مناسب و موزوں تھی۔ نسیم نازک خیالی۔ نقش طرازی۔ اور معنی آفرینی کے بغیر شعر کہنا شعاری کے خلاف سمجھتے تھے۔ اور یہ فکر بھی دامن گیر تھی کہ کسی جگہ اسلوب بیان سحر البیان سے ٹکر نہ کھائے۔ ان سخت قیود کے ساتھ داستان نگاری میں کامیابی نسیم کا سحر نیرنگ ہے۔

خوبی سے کرے دلوں کو تسخیر | نیرنگ نسیم باغ کشمیر
نقطے ہوں پسند خوش بیانی | جدول ہو حصار سحر خوانی
جو نامہ لکھوں کہیں نہ حرف آئے | مرکز پہ کشش مری پہونچ جائے

مصوری کے کمالات دیکھئے:۔

(۱)

اک شب راجہ تھا محفل آرا | یاد آئی بکاؤلی دل آرا
پوچھا پریوں سے کچھ خبر ہے | شہزادی بکاؤلی کدھر ہے
منھ پھیر کے ایک مسکرائی | آنکھ ایک نے ایک کو دکھائی
چتون کو ملا کے رہگئی ایک | ہونٹوں کو ہلا کے رہگئی ایک

راقم الحروف کئی دن غور کرتا رہا کہ مندرجۂ بالا دو شعروں کا جواب اُردو شاعری کے تمام سرمایہ میں کہیں موجود ہے یا نہیں بلکہ فارسی کی گرانقدر مثنویوں میں بھی یہ سینما کی سی چلتی پھرتی تصویریں نظر آتی ہیں یا نہیں مگر کوئی نظیر یاد نہ آئی۔ ممکن ہے کہ اُسکی کوتاہ نظری کا قصور ہو یا فہم کا فتور۔

(۲)

جب خوب وہ شعلہ رو نہائیں | باہر بصد آب و تاب آئیں
پوشاک دھری ہوئی نہ پائی | جانا کہ حریف نے اُڑائی

جھک جھک کے بدن چراتی آئیں — رُک رُک کے قدم بڑھاتی آئیں
جھنجھلا کے کہا کہ لاؤ مانو — ہم کو بھی بکاؤلی نہ جانو

واقعہ نگاری کی شان دیکھئے:-

روح افزا نے کہا بہن سے — بہتر کوئی جا نہیں چمن سے
گلگشت کریں چلو — کہا خیر — کیا جانے کہ ہوگی سیر میں سیر
چل پھر کے ہنسی ہنسی میں پوچھا — کھونا ملنا بہن یہ کیا تھا
روح افزا نے کہا کہ ہمشیر — میں نے یہ سُنا کہ تو ہے دلگیر
واللہ کہ چھان کر خدائی — تیرے پیارے کو ڈھونڈھ لائی
سمجھی وہ ہنسی کہا سڑن ہو — نادان ہو کیا کہوں بہن ہو
ہم کو یہ ہنسی نہیں گوارا — پیارا ہوئیگا وہ تمہارا
پیارا جو نہ تھا تو کھو گئیں کیوں — بدرا بھی آپ ہو گئیں کیوں
بولی وہ آشنا تمہارا — پیارا نہیں پیاری کا ہے پیارا
گر اُس کی تلاش میں میں کھوئی — بدراہ نہ کہہ سکیگا کوئی
جو چاہو کہو جواب کیا دوں — قایل نہیں ہوتی ہو دکھا دوں
وہ جوگی وہ دھونی اور وہ آسن — دکھلایا تو تھی اُسیکی جوگن

جذبات کی نغمہ سرائی:-

منھ دھونے جو آنکھ ملتی آئی — پر آب وہ چشم حوض پائی
دیکھا تو وہ گل ہوا ہوا ہے — کچھ اور ہی گل کھلا ہوا ہے
گھبرائی کہ ہیں! کدھر گیا گل؟ — جھنجھلائی کہ کون دے گیا جُل
ہاتھ اُس پہ اگر پڑا نہیں ہے — بُو ہو کے تو پھول اُڑا نہیں ہے
تھرائیں خواصیں صورتِ بید — اک ایک سے پوچھنے لگی بھید
اپنوں میں سے پھول لیگیا کون — بیگانہ تھا سبزہ کے سوا کون
شبنم کے سوا چُرانے والا — اوپر کا تھا کون آنے والا

بولی وہ بکاؤلی کہ افسوس — غفلت سے یہ پھول پر پڑی اوس
آنکھوں سے عزیز گل مرا تھا — پتلی وہی چشم حوض کا تھا
نام اُس کا صبا نہ لیتی تھی میں — اُس گل کو ہوا نہ دیتی تھی میں
او بادِ صبا ہوا نہ بتلا — خوشبو ہی سُنگھا پتا نہ بتلا

اشارات وکنایات کا طلسم:-

جب پردۂ صبح ہوگیا فاش — خنداں خنداں اُٹھا وہ بشاش
اُس غنچہ دہن کا مُسکرانا — بے رنگ بکاؤلی نے جانا
ہنستے ہنستے کہا ہنسے کیوں — ہنستا نہیں بے سبب کوئی یوں
بولا وہ کہ خواب دیکھتا تھا — آتش پہ کباب دیکھتا تھا
بولی وہ کہ ہم بتائیں تعبیر — دل سوزی کرے گا کوئی دلگیر
بولا وہ کہ رات کو اُفق میں — خورشید تھا آتشِ شفق میں
بولی وہ کہ مہر سے شب و روز — عالم میں رہوگے رونق افروز
بولا وہ کہ اک مقام ہو تھا — گلزارِ خلیل روبرو تھا
بولی وہ بشر ہو تم دلاور — سرسبز ہو قوم آتشی پر
بولا وہ کہ دیکھی اک شبستاں — شعلہ ہوا انجمن میں رقصاں
بولی وہ کہ شعلہ میں پری ہوں — جو ناچ نچاؤ ناچتی ہوں
بولا وہ کہ جب ہوا اُجالا — بخشا مہِ انجمن نے ہالا
ہالا مہِ انجمن کا کیا تھا ؟ — وہ ہار تھا جو گلے پڑا تھا!!
گھبرائی پری کہ ہیں! یہ کیا ہے ؟ — بولی وہ کہ ہار نولکھا ہے!!
کاندھے پہ تھا جس کے رات ڈالا — پہچانتی ہو وہ سطبلے والا

صنعت طرازی کے ساتھ الفاظ کی سادگی اور قافیوں کی چستی۔

تو باغِ ارم سے لے گیا گُل — تو مجھ سی پری کو دے گیا جُل
تجھ کو ترے باپ سے ملایا — مجھ کو یہ ملا کہ تجھ کو پایا

جو جو اسرار تھے نہانی | سب تجھ سے سُنے تری زبانی
کیا لطف جو غیر پردہ کھولے | جادو وہ جو سر پہ چڑھ کے بولے
اب تک ہیں وہ خار جی کے جی میں | جلد آکہ ہے مصلحت اسی میں
آئے گا تو درگزر کروں گی | ورنہ میں بہت سا شر کروں گی
کانٹوں میں اگر نہو اُلجھنا | تھوڑا لکھا بہت سمجھنا

اختصار اس مثنوی کا بے مثال ہے۔ ایک شعر درمیان سے حذف کیجئے تو ساری داستان برہم ہو جائے۔

طوطا بنکر شجر پہ آکر | پھل کھا کے بشر کا روپ پاکر
پتے پھل گوند چھال لکڑی | اُس پیڑ سے لیکے راہ پکڑی
گھر بار سے کیا فقیر کو کام | کیا لیجئے چھوڑے گاؤں کا نام
پوچھا کہ سبب ؟ کہا کہ قسمت | پوچھا کہ طلب ؟ کہا۔ قناعت
تنہا اُسے دیکھ کر کہا۔ ہیں ! | محمود اکیا ہوئیں ؟ کہا "ہیں"
یہ کہکے اُٹھا کہا کہ "لو جان | جاتے ہیں کہا۔ "خدا نگہبان"
پوچھا کہ کدھر سے آئے کیا نام | بولا وہ کہ نام سے ہے کیا کام
تیورا کے وہیں وہ بار بر دوش | بیٹھا تو گرا۔ گرا تو بیہوش
جھنجھلا کے ڈرا کے غل مچا کے | سمجھا کے۔ دبا کے۔ دست پا کے
من چھین کے چوری کے بہانے | بھیجا کھلے بندوں قید خانے

نازک خیالی کا کمال

چھالے پڑیں گال اگر چھوئے ہوں | کالے ڈسیں بال اگر چھوئے ہوں
سیاح کو کیا قیام سے کار | شبنم نہیں جاگزین گلزار
جو نخل تھا سوچ میں کھڑا تھا | جو برگ تھا ہاتھ مل رہا تھا

اشعار کہاں تک نقل کئے جائیں۔ اول سے آخر تک صنایع و بدایع کا دریا موجزن ہے۔ جب تک اُردو زبان ہندوستان میں زندہ ہے یہ نظم سخن فہموں کے گلے کا ہار رہیگی اور سحرالبیان کے برابر اس کی عزت و توقیر ہو گی۔

گلزار نسیم کی مہک نے سخنوروں کی محفل کو طبلۂ عطار بنا دیا۔ لکھنؤ کے گلی کوچے اس خوشبو سے مست ہوئے اور مثنوی "گلشن" کا

عام شوق پیدا ہوگیا۔

نازک خیالی اور سخن آفرینی کے ساتھ واقعہ نگاری نسیم کا حصہ تھا۔ تقلید کی بیشتر کوششیں ناکام رہیں۔ ملک الشعرا قاضی صادق علی خاں اختر نے ایک مثنوی "سراپا سوز" لکھی۔ نہ بیان میں روانی تھی نہ زبان میں شعلہ فشانی۔ افسانہ بھی دلچسپ نہ تھا۔ دختر زرگر کی کہانی بُجھکر رہگئی۔ (رئیس زادہ جوگی بنکر آتا ہے)

گرد و پیش اُس کے ایک جم غفیر	ہمدم گریہ سب صغیر و کبیر
خاک اڑاتا تھا اپنے سر پہ کوئی	ہاتھ رکھے ہوئے جگر پہ کوئی
کوئی کرتا تھا اس طرح نالے	جس سے جینے کے پڑ گئے لالے
لوگ، تھے گرد ماتمی سج سے	بیچ میں وہ جوان تھا اس دھج سے
تن کی اُس کے بھبھوت سے یہ نمود	جیسے دُرِ یتیم گرد آلود
سر پہ یوں زر کے انڈوے کی پھبن	ہووے سورج کے گرد جیسے کرن
کنڈل اُن کانوں میں یہ آفت ہوش	مہر و مہ جسکی چھب کے حلقہ بگوش
زیب بخش گلو تھا یوں زُنار	ہو بندھا جیسے آنسوؤں کا تار
غرض اس شکل سے جو آتا تھا	خلق کا جی ہی نکلا جاتا تھا

آتش کے نامور شاگرد میر زا زیر صبا نے ۱۲۶۴ھ میں ایک مثنوی "صیدیہ" لکھی۔ اپنے مُربّی نواب محسن الدولہ کے سیر و شکار کی حکایت نظم کی۔ صنایع و بدایع کے طلسم بنائے۔ محاورات کے دریا بہائے لیکن قبولیت عام کا شکار نہ کرسکے۔ بہرحال اُستاد کا کلام ہے اور موتیوں سے تولنے کے قابل ہے۔ چند اشعار سنئے :-

عجب ایک بستی لب آب تھی	کہ جو بات تھی اُس کی نایاب تھی
جسے دیکھئے حسن میں وہ پری	وہ صورت کہ دیکھا کرے آدمی
لٹک۔ اچپلاہٹ۔ شرارت۔ اُمنگ	دمکتا وہ کندن سا چہروں کا رنگ
وہ چھوٹے ہوئے گیسوئے عنبریں	کمندیں لئے غارت نقد دیں
وہ لہنگے نمونے تھے گلزار کے	اور اُن پر دوپٹے وہ زرتار کے
وہ باتیں جو سنئے تو کیا بات ہے	وہ چالیں کہ کبک دری مات ہے
وہ دریا کا عالم وہ جنگل کا روپ	وہ دھانوں کے کھیتوں پہ بدلی کی دھوپ

میر حسن کا شعر یاد آ گیا:۔

درختوں کی چھاؤں اور کچھ وہ دھوپ   یہ دھانوں کی سبزی وہ سرسوں کا روپ

۱۲۶۷ھ میں منشی جگناتھ خوشتر لکھنوی نے رامائن کا ترجمہ کیا:۔

سروشِ غیب نے فرمایا سُنکر   ریاض نور ہے تاریخ خوشتر

حکایتیں دلچسپ اور نتیجہ خیز تھیں۔ تافیے بھی چست تھے۔ مگر تشبیہات و استعارات کے ساتھ داستان نگاری میں کامیابی نہ ہوئی اور سخنوروں نے اس نظم کی کچھ قدر نہ کی۔

خاتم السلاطین واجد علی شاہ اختر نے متعدد مثنویاں کہیں۔ شاہ ذیجاہ نے محاورات کے دریا بہائے۔ خدام بارگاہ نے ہر قطرہ سے تحسین و آفریں کے باغ لگائے لیکن سخن سنجوں کی بزم میں اس شعبدہ پردازی کی کچھ قیمت نہ ہوئی۔ دریا تعشق کا قصہ دلچسپ تھا الف خاں حباب نے ڈراما بنا کر شوقین نوجوانوں کو مدتوں "عزالہ ماہرو" کا شکار رکھا مگر مثنوی کے اُچھالنے کا حباب میں دم نہ تھا وہ بدستور ڈوبی رہی۔ تاہم زبان صاف و سلیس ہے۔ بیان میں درد ہے۔ "ملک الکلام" نہ سہی "کلام الملوک" ضرور ہے۔

لال پری خودکشی کے لئے طیار ہوتی ہے:۔

وہ رشکِ قمر نہا چکی جب   پہنا کفن اُس نے گیروا سب
تسبیح گلے میں ایک ڈالی   اور مانگ بھی بالوں میں نکالی
بالوں کو بھی کر دیا پریشاں   حُسن اُس سے ہوا مگر دو چنداں
کافور لگایا سب بدن میں   کچھ عطر بھی مل دیا کفن میں
عمامہ بھی باندھا اُس نے سر پہ   اور گیروی اوڑھی ایک چادر
جسم اپنا چھپا کے سب کفن میں   وہ شمع رُخ آئی انجمن میں
اک ہاتھ میں اُس کے خنجر تیز   اور ایک میں جام سم سے لبریز
اک لونڈی کے ہاتھ میں گیسوز   رومال لئے کوئی جگر سوز
واں ناچ کا شغل ہو رہا تھا   غُل ساز طرب کا جا بجا تھا
مطرب سب کو رجھا رہے تھے   اختر کی غزل یہ گا رہے تھے

عاشق کو نہ اس قدر ستاؤ   پچھتاؤ گے اب بھی باز آؤ
ہمتِ اُٹھتے ہیں اب جہاں سے   جا ہو جسے پاس تم بٹھاؤ

عاشق نہ ملے گا ہم سا کوئی   جو کہتے ہیں اب بھی مان جاؤ

آغا حسن نظم لکھنوی نے ایک مثنوی لذت عشق نام سحرالبیان کے جواب میں لکھی۔ وہی بحر ہے مگر روانی زیادہ ہے۔ اُسی طرز کا قصہ ہے لیکن بے حیائی میں دس بیس قدم آگے ہے۔ مصحفی کی بحر المحبت کو جو نسبت دریائے عشق سے تھی وہ بھی اس مثنوی کو سحرالبیان سے نصیب نہوئی۔ میرحسن کی جوگن بصیرت افروز ہو چکی ہے۔ نظم کا "فقیر" دیکھئے:۔

رنگا گیروا اپنا سارا لباس   مہیا کیا فقر کا سب اساس

وہ بیراگی اک بانس کی پیچدار   کہیں شکل آہو کہیں شکل مار

وہ تسمہ وہ کفنی وہ تہمت لنگوٹ   تکلف کی جس میں لگی سبز گوٹ

سمندر کا بس اک منگا نا رجیل   بنائی وہ کشکول اک بے عدیل

"بدرمنیر" کی بیتابی فراق ملاحظہ ہو چکی ہے۔ نظم کی ہیروین کا سوگ دیکھئے:۔

تلاطم میں شب بھر طبیعت رہی   نہ رنگت رہی وہ نہ صورت رہی

بہت آگیا فرق اوقات میں   وہ کھسیانا ہو جانا ہر بات میں

وہ گرمی سے رخ تمتمایا ہوا   وہ رونے سے مُنھ بھر بھرایا ہوا

خوشی ہے نہ راحت نہ عیش و طرب   خواصیں بھی میلی کچیلی ہیں سب

کہیں ہے جو مسند تو تکیہ نہیں   کہیں فرش تک بھی بچھایا نہیں

دروں میں ہر اک جا پہ جالے لگے   چھتوں میں ابابیل کے گھونسلے

کہاں سحرالبیان کی مرصع کاری اور کہاں یہ نظم بازاری!! ـــ چہ نسبت خاک را بہ عالم پاک!!
نظم کے وقت تک زبان بہت ترقی کر چکی تھی لیکن وہ "ہینگے" بے تکلف استعمال کرتے ہیں اور تعقید کو بھی عیب نہیں سمجھتے۔

یہ دونوں جو ہینگے مرے میہماں   بٹھا تخت پران کو تم ہو رواں

صرف چند شعر یاد رکھنے کے قابل ہیں:۔

نیا پھول گلشن میں پھولا ہے آج   مسافر کوئی راہ بھولا ہے آج

بیاں کیا کروں اُنکے کیا روپ ہے   کہ سائے میں چھٹکی ہوئی دھوپ ہے

سحر تک نہ سوئی نہ سونے دیا   نہ موتی میں دھاگا پرونے دیا

لنگوٹے کو آگے بڑھا لیجئے	کرامات داتا چھپا لیجئے

آخری دو شعر اخلاقی معیار سے پست ہیں لیکن غضب کی شوخی ہے اور اُردو زبان ان کو کسی طرح فراموش نہیں کر سکتی۔ نواب بادشاہ محل عالم نے بھی ایک مثنوی لکھی۔ بیگماتی زبان میں منجموں اور جوگیوں کی اصلاحیں اور شادی بیاہ کی رسمیں نظم کیں۔ علم نجوم و موسیقی سے واقفیت کا ثبوت پیش کیا۔ قصہ سحر البیان کے طرز کا تھا مگر دلچسپی میں اُس سے کم۔ شائستگی و متانت جنس لطیف کی تصنیف میں ہونا ہی چاہیئے وہ موجود تھی مگر درد و تاثیر کا نشان نہ تھا۔ مثنوی کی کچھ قدر نہوئی۔ بیگم صاحبہ نے خاتمہ کتاب پر دعا مانگی تھی وہ بھی قبول نہوئی روشنائی کبھی خشک نہوئی تھی کہ سلطنت چھن گئی اور راج اُٹھ گیا۔

رہے جب تک کہ مہر و مہ میں نور	مہدی دین کا جب تلک ہو ظہور
نوجواں بادشاہ خوش اقبال	واجد لکھنؤ خجستہ خصال
جو کہ مشہور جانعالم ہے	رونق بوستان عالم ہے
رہے رونق فزائے خطۂ ہند	فخر ایران بنائے خطۂ ہند

البتہ آفتاب الدولہ قلق نے ایک طویل مثنوی طلسم اُلفت نام لکھکر لکھنؤ کے انداز واقعہ نگاری کی آبرو رکھی جس طرح شاعروں کی زبان میں زلف یار کی درازی پائے معشوق کے لئے گاہ گاہ کمند ہو جاتی رہتی ہے اس نظم کی برجستگی کو اُس کی فضول طوالت سے نقصان پہونچا۔ اگر نسیم کی طرح وہ بھی وہ یک کا قانون جاری کرتے یا غالب کی طرح کلیات کا عطر نکالتے تو شاید گلزار نسیم پر حرف آ جاتی مگر خیالات کی بے اندازہ وسعت۔ مضامین کے بے ضرورت پھیلاؤ نے قافیے سست کر دئے "اسے حور زاد" "اسے ماہ" "خوشخو" "نیک ذات" "بے پیر" وغیرہ بھرتی کے الفاظ نے آورد و تصنع کی حد کر دی اور بعض جگہ گفتگو مقتضائے حال کے خلاف ہو گئی۔

مواصلت میں عُریاں نگاری کی رسم قبیح میر اثر۔ میر حسن۔ مومن اور نسیم نے رائج کی تھی لیکن انھوں نے سارا لوک شاستر نظم کر دیا۔ اور سنجیدہ صحبتوں میں اس مثنوی کے نام پر ثقاہت کی نگاہیں نیچی ہونے لگیں۔

بایں ہمہ پر لطف بیان۔ بیگمات کی شستہ زبان۔ محلات شاہی کے نادر نمونے۔ رنگیلے جانعالم کے عہد کی معاشرت عشق آباد لکھنؤ کے رسم و رواج۔ قصہ دلچسپ۔ اشعار نور آگیں۔ آبدار مضامین۔ مثنوی کو قبولیت عام کا خلعت ملا اور شاعر کی آرزو پوری ہوئی کہ بزم خوباں میں جب پڑھی جائے۔ ایک اک سُن کے وجد میں آئے۔

پہلے سرزمین عشق کی تعریف سنئے:۔

شہر مانند لکھنؤ آباد	ہر گلی رشک گلشن شداد
مثل بازار مصر ہر بازار	یوسف وقت ساکنان دیار

تھی وہ کچھ سرزمیں بھی اُلفت خیز ۔ کوچہ کوچہ تھا اُس کا عشق انگیز
کھیل لڑکوں کا عشق بازی تھا ۔ شمع ساں شغل جانگدازی تھا
سب جو عاشق مزاج رہتے تھے ۔ عشق آباد اُس کو کہتے تھے

حُسن آباد کی توصیف:-

شہر دیکھا کہ آدمی تو کیا ۔ گر پری دیکھے تو ہو سکتا
ہے ہر اک گلفروش البیلا ۔ پھول والوں کا روز ہے میلا
دلکش اک اک مقام ہے اُس کا ۔ حُسن آباد نام ہے اُس کا

فرزند عزیز کے وداع کے وقت باپ کی حالت:-

سر کو رکھے ہوئے ہیں تکیے پر ۔ تر ہے اشکوں سے مسندِ پُرزر
جب اُٹھاتے ہیں سر تو آہ کے ساتھ ۔ وزرا رو رہے ہیں شاہ کے ساتھ
خود تو اپنے جگر کو تھامے ہیں ۔ لوگ ان کی کمر کو تھامے ہیں

ماں کی حالت زار:-

ضعف سے دمبدم غش آتے تھے ۔ لوگ سب لخلخے سُنگھاتے تھے
گاہ صحنِ محل میں آ آکر ۔ کھول کر سر کے بال گھبرا کر
گود پھیلا کے مانگتی تھی دعا ۔ یارب اس داغ سے کلیجہ بچا
کبھی در سے وہ سر ٹپکتی تھی ۔ کبھی دیوانہ وار بکتی تھی
اب کوئی دم میں گھر اُجڑتا ہے ۔ مجھ سے بچہ مرا بچھڑتا ہے

ں بیٹے کو رخصت کرتی ہے:-

واری اب کیا یہی ارادہ ہے ۔ رات ابھی تو بہت زیادہ ہے
اتنی کیوں جلدی کرتے ہو جانا ۔ اب نہ روکیں گے بیٹے لو مانا
ہمکو تنہا ہی آپ چھوڑ چلے ۔ ماں سے بے جُرم مُنھ کو موڑ چلے
یہ تو کہہ دو کہ جلد آؤ گے ۔ ہم کو تم بھول تو نہ جاؤ گے
وعدہ کر لو تو کچھ تسلی ہو ۔ دل کو ڈھارس بندھے تشفی ہو

میرا پیش نگاہ حال رہے | واری آتا ذرا خیال رہے
کہ یہ ماں گور کے کنارے ہے | بے سہارے ہے بے سہارے ہے
تم کو تولائے گا خدا پھر یاں | میں کہاں؟ چند دن کی ہوں مہماں

معشوق کی فراق یار میں بیتابی :-

جس قدر عرصہ ہوتا جاتا تھا | شوق دیدار اُسے ستاتا تھا
چوٹ پہلے پہل جو کھائی تھی | نئے غم سے جو آشنائی تھی
وہ گُلِ تر ہزار ٹالتی تھی | لاکھ صورت سے دل سنبھالتی تھی
پر نہ دل کو قرار آتا تھا، | غم کلیجے کو کھائے جاتا تھا
حسرتِ دید بڑھتی جاتی تھی | وحشتِ عشق سر اُٹھاتی تھی
لیکن اک ایک سے چھپاتی تھی | دل ہی دل میں وہ کوفت کھاتی تھی
متحمل جو ہو نہ سکتی تھی | آپ ہی آپ پہروں بکتی تھی

باغ معشوق کی مالینوں کی شان دیکھئے :-

مالنیں چار پانچ سو کمسن | پیاری پیاری ادا غضب کے دن
چوٹیاں نور کی گندھی ہوئیں صاف | جلوہ گر رنگ رنگ کے موباف
غارت ہوش پاؤں میں چھا گل | کتنی کولے پہ خوشنما ہیکل
لہنگے اطلس کے پاؤں میں پُر زر | سر سے پاتک جڑاؤ سب زیور
بیلچے کھرپیاں مرصع کار | شغل آرائش چمن ہر بار

مالنیں شہزادہ سے پوچھتی ہیں کہ :-

ایسی وہ کون سی ہے مہ پارہ | جس کی اُلفت میں تم ہو آوارہ

شہزادہ جواب دیتا ہے :-

اے جوانان گلشن شاداب | خار دیتی ہیں یہ تمھیں دو جواب
کہ وہ نوبادہ ریاض جمال | وہ ثریائے آسمان کمال
حُسن میں بے مثال ہے کہ نہیں | گلِ باغ جمال ہے کہ نہیں

تمھیں غنچہ تنک کے کچھ دو جواب
دہن اُس گل کا کیا نہیں نایاب
تو ہی ان سے اُلجھ پڑا اے سنبل
بوئی عارض سنگھا دے نکہتِ گل

شہزادہ کو اُس باغ میں یار کی خوشبو ملتی ہے۔ وہ متحیر ہوتا ہے۔ انہیں نام و نسب دریافت کر رہی تھیں اسی عالم حیرت میں اُنکو جواب دیتا ہے۔ پورا سین ملاحظہ کے قابل ہے:-

بیٹھنے کو وہ آکے بیٹھا تھا
پر دھواں سوزِ دل سے اُٹھتا تھا
چین لیتا نہ تھا دلِ مضطر
چار سو دیکھتا تھا اُٹھ اُٹھ کر
دل سے کہتا تھا وہ اسیرِ ستم
یاں کہیں آج اسے دلِ پُر غم
نکہتِ زلفِ یار آتی ہے
بوئے شوخ نگار آتی ہے
آتشِ شوق نے جو گرمایا
کھینچکر آہِ سرد فرمایا
کیا کہیں تم سے کون ہیں کیا ہیں؟
بلبلِ گلشنِ تمنا ہیں!
وطن آوارہ خانماں برباد
نامراد و ستم کش و ناشاد
آہ فرہادِ کوہِ غربت ہوں
قیسِ صحرائے درد و محنت ہوں
جھوٹ کہتا نہیں میں سچ جانو
کافرِ عشق ہوں مسلمانو
یہ جو صورت ہے یہ جو وحشت ہے
حضرتِ عشق کی بدولت ہے
کیا بتائیں تمھیں نسب اپنا
اب تو ناشاد ہے لقب اپنا
کبھی انسان تھے پری زادو
دلِ ناداں کے بس میں ہیں اب تو
نام ہے اب تو عاشقِ بدنام
اب تو مہر و وفا سے رکھتے ہیں کام
مہوشو سب عجیب کہتے ہیں
عاشقِ بدنصیب کہتے ہیں
سرگزشتِ بلاکشاں نہ سنو
نہ سنو میری داستاں نہ سنو
فقرہ فقرہ ہے اس کا پُرتاثیر
ہو نہ جاؤ کہیں بلا میں اسیر

طلسمِ اُلفت ابھی تمام نہوئی تھی کہ لکھنؤ نواب مرزا شوق کے زمزموں سے گونجنے لگا اور حسن و عشق عیش و عشرت کے متوالے نغمہائے شوق سے پرجوش ہوگئے۔ فریبِ عشق نے رنگین مزاج نوجوانوں کی آتشِ شوق پر تیل چھڑکا۔ بہارِ عشق نے دردمندانِ محبت کے دل چھینے اور زہرِ عشق کی حسرتناک موسیقی نے سارے شہر کو دیوانہ بنا دیا۔ بندش کی صفائی۔ زبان کی سادگی۔ بول چال کی بے ساختگی۔

محاورات کی برجستگی نے عوام کے قلوب کو مسخر کیا۔ واقعہ نگاری اور نقش طرازی کے کمال نے خواص کی گردنیں خم کیں اور ان مثنویوں کو ایسی مقبولیت عام نصیب ہوئی کہ اگلے سخنوروں کے چراغ ٹمٹمانے لگے اور میر حسن کی سحر البیانی فراموش ہو گئی حاسدوں نے ان نظموں کی "لغزش مستانہ" کو پستی اخلاق سے تعبیر کیا۔ سفارشیں اُٹھوا کر برسوں ممنوع الاشاعت رکھا۔ بزرگوں کی سنجیدہ صحبتوں میں ان کا تذکرہ اخلاقی جرم قرار دیا لیکن شمع کی روشنی دامن سے اور چاند کا نور خاک سے چھپ نہیں سکتا۔ بہار عشق اور زہر عشق کو بقاء دوام کے دربار میں جگہ ملی اور نکتہ چیں منہ دیکھتے رہ گئے۔

واجد علی شاہ کے دور میں لکھنؤ کی خانگیوں کی زبان سنئے:۔

(فریب عشق)

ارے لو میں کہوں سبب کیا ہے — ارے تو ہی نواب مرزا ہے
ایک ہی مرشد ہو تم قصور معاف — سن چکی ہوں میں آپ کے اوصاف
بیوفائی میں دل جلانے میں — تو تو مشہور ہے زمانے میں
جعلسازی یہ تجھکو کیونکر آئی — ایک کو سانی دوسرے کو بڑھائی
دور بھی ہو نگوڑے سودائی — ہوا ہر دیگی چمچا ہرجائی
کس کے عاشق بنے ہو کیسی چاہ — میں کہاں تم کہاں معاذ اللہ
اک ذرا ہٹ کے میٹھو منہ بنواؤ — کہے چونی بھی مجھ کو گھی سے کھاؤ
ساتھ سے دیکے اپنے یاروں کو — مینڈکی بھی چلی مداروں کو
مردوا ہووے نوج اس گت کا — جیسے دھونسا نگوڑا نوبت کا
سن کے یہ پھبتی میں نے اس سے کہا — اب یہ نوبت ہوئی ہماری بجا
بولی چپ رہیے منہ کی کھائیے گا — اک ذرا سینک کر بجائیے گا
ہوش کی اپنے کچھ دوا کیجئے — مجھ سے ناحق نہ چو چلا کیجئے

معشوق کا سراپا میر تقی، میر حسن اور دوسرے مثنوی نگاروں نے بھی بیان کیا تھا لیکن بہار عشق کی حسینہ کی شان ہی نرالی ہے اور یہ خشک مضمون دلچسپ ہو گیا ہے:۔

حُسن یوسف بھی اُسکے آگے ماند — چہرہ زلفوں میں جیسے ابر میں چاند
جلوۂ حسن رشک شعلۂ طور — چشم بد دور آنکھیں ملوتی چور

رخ پہ وہ بکھرے بکھرے زلف کے بال رگِ گل سے وہ ہونٹ پان سے لال
بے مِسی کے وہ دانت رشکِ گہر جان عاشق نثار ہو جس پر
قد میں آثار سب قیامت کے گوری گردن میں طوق منت کے
رخ پہ گرمی سے وہ عرق کم کم جس طرح گل پہ قطرۂ شبنم
عکس رخ موتیوں کے دانوں میں بجلیاں چھوٹی چھوٹی کانوں میں
آڑی ہیکل گلے میں ڈالے ہوئے پیاری پیاری گچیں نکالے ہوئے
رگِ گل سی کمر لچکتی ہوئی چوٹی ایڑی تلک لٹکتی ہوئی
پائنچے ناز سے جو اُس نے اُٹھائے میں پکارا خدا کمر کو بچائے

جس طرح سحر البیان کی "عیش بائی" نقاشی کا بہترین نمونہ ہے ویسے ہی بہار عشق کی "خادمہ" مصوری کا کمال ہے:۔

اتنے میں نکلی گھر سے ایک عورت سانولا رنگ چلبلی صورت
لال نیفہ ازار بند بڑا گچھا ایک کنجیوں کا اُس میں پڑا
کھیلتی ہنستی کھلکھلاتی ہوئی انکھ ایک ایک سے ملاتی ہوئی
چاق چوبند سینہ زوری میں پھول رکھے ہوئے کٹوری میں
حسن کے دور جوانی زوروں پر رات کی باسی مہندی پوروں پر
دھیان اک اک سے بدگمانی کا ستیاناس ہو جوانی کا
پوچھتی آئی ہے۔ یہاں تک گھر ہاتھ رکھے کھڑی ہے کولے پر
اپنے سایہ سے بھی بھڑکتی ہے بوٹی بوٹی پڑی پھڑکتی ہے
شرم ہے آنکھ میں نہ دل میں خطر پھبتیاں کہہ رہی ہے اک اک پر
کُلڑی اک اک کا مُنھ چڑھاتی ہے ہنسے دیتی ہے لوٹی جاتی ہے
چوٹی لپٹی ہے باسی ہاروں سے لڑ رہی ہے جگت کہاروں سے

تصویر کشی کا ایک اور نمونہ ملاحظہ ہو:۔

مُنھ دوپٹے سے ڈھانپتی اُتری خوف کے مارے کانپتی اُتری
نیچی نظروں سے دیکھ بھال لیا سر پہ آنچل اُلٹ کے ڈال لیا

کہا پھر کس لیے محنت سفر کی؟	کہا "ہوں بوئے گل، عادت سفر کی"
کہا "جائے گا آخر اب کہاں کو؟"	کہا "تقدیر لے جائے جہاں کو"

ناچ گانا ہوتا ہے :-

موافق ساز سے آواز ہو کر	ہوئی پردے سے باہر راز ہو کر
وہ انگیز بدن انداز کے ساتھ	وہ لینا منہ پہ آنچل ناز کے ساتھ

جنگل کا سماں :-

نہ سایہ تھا نہ برگ خشک و تر تھا	ہر رنگ شوخ آہو ہر شجر تھا
کفِ سائل کی صورت چشمۂ آب	ہوائے گرم سے ہر مرغ بیتاب
حرارت سے دھواں اٹھتا جگر میں	تپش سے آبلہ پڑتا نظر میں
یہ عالم دیکھ کر دشتِ بلا کا	نظر میں پڑ گیا ساماں قضا کا

تیسری مثنوی صبح خنداں نو عمری میں دیکھی تھی، اب تلاش سے نہیں ملتی اور اس کا کوئی شعر اس وقت یاد نہیں آتا، شام غریباں سے بہتر نہ تھی۔

سید مظفر علی خاں اسیر کے نامور شاگرد منشی احمد علی شوق نے ۱۳۰۵ھ میں اس دور کی بہترین عاشقانہ مثنوی لکھی، میر حسن کی مصوری نسیم کی نازک خیالی، نواب مرزا شوق کی خوش بیانی کو دلیل راہ بنا کر خیالات و محاورات کا طلسم بنایا، قصۂ طلسم الفت سحر البیان اور دریائے تعشق کا عطر مجموعہ تھا۔ دلچسپی میں ان سے کم مگر تہذیب و سنجیدگی میں زیادہ نئی نئی تشبیہیں ایجاد کیں۔ محاورے خوش آیند اسلوب سے باندھے، بول چال کی صفائی اور بندش کی خوبی نے نظم میں چار چاند لگا دیے، گلزار نسیم کی بحر تھی اور اسی کی سخن طرازی کی تقلید، اختصار کی کوشش کی مگر یہ سعی لاحاصل ثابت ہوئی، آورد و تصنع کا پردہ بری طرح فاش ہوا اور بعض جگہ بے ضرورت طول ہو گیا، بے جان اشیاء میں جان ڈالنا اور ان سے ہمکلام ہونا نسیم کا نیرنگ تھا۔ لیکن جو خیال حد سے بڑھا وہ مسا ہوا یہاں طوالت نے اس شعبدہ پردازی کی قلعی کھول دی، مثنوی درد سے خالی تھی۔ لبوں پر "واہ واہ" آئی مگر دل سے "آہ" نکلی پہلے تشبیہا کی بہار دیکھیے جو تمام دنیا میں شعر کی روح رواں سمجھی جاتی ہے،

(منقبت اہلبیت)	گویا قدِ مصطفےٰ شجر تھا	اس میں کوئی گل کوئی ثمر تھا
(مناجات)	ہر صفحہ کتاب کا فلک ہو	نقطوں میں ستاروں کی چمک ہو
	صفحے پہ ہو اُن کی ضو فشانی	مردمی بو ٹی کا ملہدانی

(سراپا) ۔ پیشانی کی تعریف

کیا رنگ کہوں شگفتگی کا — اک پھول کھلا تھا چاندنی کا
گیسو تھے کہ دام تھے بلا کے — ابرو تھے کہ پنجے قضا کے
بے خود تھے شراب پینے والے — مستی میں الٹ دیے پیالے

گالوں پہ جو چھائی ہے اُداسی — دو پھول تو ہیں مگر ہیں باسی
چشمہ پر تو کسی جبیں کا — بنگلہ گھونگھٹ کسی حسیں کا
تھی بیل زمیں پہ جو بال کھولے — کالی ڈبی تھی یا بال کھولے
ہلکی بہت سی ایک تھی ناؤ — جھولا جھولو جو اس پہ چڑھ جاؤ
حیرت تھی کہ لوچ کس قدر ہے — یہ بال کمانی یا کمر ہے
قد میں زیور کچھ اس قدر تھا — گھنگچی کا پھیلا ہوا شجر تھا
دھانی کپڑوں میں تن کا یہ حال — مینا تو زمرد میں تھا اور مے لال
تھے راہ میں جمع شہر والے — یا مانگ بھری تھی موتیوں سے
چوٹی پہ شجر کے دام رکھا — چھپکا کہنے کو نام رکھا
گلشن سے نکل سکا نہ اسطرح — گونگے کے دہن سے بات جسطرح

اب نازک خیالی دیکھئے جو ایشائی شاعری کی جان ہے :-

حیرت سے تھے اہل ہوش ششدر — بت خانہ تھا بادشاہ کا گھر
لائی قسمت فسوں کے بس میں — فیروزہ تھا خاتم قفس میں
سائے سے بدن کے دھوپ پھیلی — رخ صاف تھا آرسی تھی میلی
جو نخل تھا چپ کھڑا تھا ڈر سے — سایہ غش میں پڑا تھا ڈر سے
اختر نے حجاب کی نظر سے — در بند کیے ہوا کے ڈر سے
منظور اسے خود تھی پردہ داری — منھ پھیر کے آرسی اتاری
کہتی تھی حیا یہ ظلم ہے سخت — آتی جاتی ہے سانس کمبخت

یہ نیل اور یہ بدن کی زردی مینا سونے پہ لاجوردی

محاورات اور بول چال:۔

تصویر کو دیکھ کے زر خریدا سودا لیا درد سر خریدا
کیا بخت ہے اور کیا مقدر بجلی تو کہیں ۔ جلے کہیں گھر
تصویر کی کون ایسی ہستی اللہ تم اور بت پرستی
مٹی نہ کر آبرو کو جانی اندھا ہے کنواں جو ہو نہ پانی
چلتی آندھی کا ٹوکنا کیا بہتے پانی کا روکنا کیا
بیمار کو جان کھوتے کیا دیر نیند آہی گئی تو سوتے کیا دیر
وہ جل گئی ۔ دوڑی تاؤ کھا کر یہ ہنس پڑی بھاگی منھ چڑھا کر
بگڑی تو بنایا دل لگی سے روٹھی تو منا لیا ہنسی سے
کچھ کھیل نہیں ہے عشق کی لاگ پانی نہ سمجھ یہ آگ ہے آگ
چار اپنے پرائے کیا کہیں گے تھوکیں گے بُرا بھلا کہیں گے
چپ مرغ تھے خوف سے غضب کے طوطے سے اُڑے ہوئے تھے سب کے
کیسی ہے خطا معاف صورت دھویا کپڑا کہ صاف رنگت
چھائی تھی اُداسی سی صحن پر جھاڑو سی پھری تمام گھر پر
"تم" لکھتی ہوں میں بگڑ نہ جانا منظور رہے لطف کا جتانا
بولی کہ نہ دون گی یوں نہ بان میں کھیلی نہیں کچی گولیاں میں

سوال جواب:۔

پوچھا کہ "یہاں میں آیا کس طرح؟" بولی کہ "قرار دل میں جس طرح"
پوچھا "یہ ستم کیا ہے کس نے؟" بولی "تمھیں دل دیا ہے جس نے"
پوچھا "لشکر؟" کہا کہ "ہاں تھا" پوچھا کہ "ملیگا؟" کہا "نا"
بولا "یہ غضب!" تو بولی "خاموش" بولا کہ "پھر اب؟" تو کھولی آغوش
بولا کہ "نہیں" تو بولی "بیکار" بولا کہ "رہائی؟" بولی "دشوار"

بولا "کوئی پُر غرور کیوں ہو؟" بولی "کوئی ناصبور کیوں ہو؟"
بولا وہ "کسی کا دل ہو بےچین" بولی "تو وہ ضبط کرکے لے چین"
بولا "جو ضبط نہ کر سکے وہ" بولی "تو مرے جو مر سکے وہ"
بولا "تو ہو خون یوں کسی کا" بولی "تو ہوا کرے مجھے کیا؟"
بولا "یہ ستم ترس کے بدلے!" بولی "یہ کہو۔ ہوس کے بدلے"
بولا کہ "ہوس ہے اور ہی چیز یہ عشق ہے عشق۔ قدر کی چیز
اتنا کوئی شکل پر نہ اِترائے کس کی رہی اور کس کی رہ جائے
بولی کہ "چلو چلو ہوا ہو میں نے تو نہیں کہا کہ چاہو
تم لاکھ چھپاؤ کھا کے قسمیں پوشیدہ غرض تھی اس ترس میں
کیا تم مرتے ہو سچ بتاؤ کیونکر مرتے ہو مر تو جاؤ"

مصوری:—

ہونٹوں پہ تھی اُف۔ جگر پہ تھا ہاتھ تصویر یہ دل نگاہ کے ساتھ
صدمہ تھا۔ ملال تھا۔ قلق تھا آنکھیں نیچی تھیں رنگ فق تھا
ہونٹوں پہ تھے دانت سر پہ تھے ہاتھ سر سے جو ہٹے جگر پہ تھے ہاتھ
کانپا۔ سہما۔ ہٹا۔ ڈرا وہ پھرنے کے لئے مُڑا ذرا وہ
بولا یہ جھجک کے ایں! یہ کیا ہے؟ بولی وہ تنک کے دل مرا ہے
سسکی لب پر شکن جبیں پر آنچل منہ پر نظر زمیں پر
گردن نہ اُٹھا سکی وہ گلفام احسان کا بوجھ شرم کا نام

(ہجر)

رنگت کہیں نام کو نہیں ہے سادہ کا غلاف ہے یا جبیں ہے
کوٹھے پہ کھڑی ہے تو کھڑی ہے کونے میں جو پڑی ہے تو پڑی ہے
چوٹی جو کھلی کھلے بلا سے بال اُڑتے ہیں تو اُڑیں ہوا سے
تارے گن گن کے رات کاٹی کوئی بولا تو بات کاٹی

اختصار کی کوشش:۔

لعل و زر و سیم سب منگایا — بانٹا، بخشا، دیا، لٹایا
خسرو شبیہہ و نامہ دینا — کہنا ۔ سننا ۔ جواب لینا
آنکھیں جو کھلیں نصیب سویا — کانپا ۔ سہما ۔ غریب رویا
پوچھا جو مزاج کو کہا "خیر" — پوچھا سبب آنے کا کہا "سیر"
کھٹکی ۔ جھجکی ۔ زبان کھولی — بل ڈال کے تیوریوں پہ بولی
تسلیم جو کی ۔ جواب پایا — غمدیدہ اٹھی ۔ ملی ۔ بٹھایا
پوچھا کہ لقب؟ ۔ کہا "پریشاں" — پوچھا کہ سبب؟ کہا کہ "طوفاں"
پوچھا مقصد؟ کہا کہ "پانا" — پوچھا مطلب؟ کہا "ملانا"
اپنے کے عوض کہی پرائی — الٹی گنگا غرض بہائی

واقعہ نگاری:۔

گردوں نے بلائے شب جو ٹالی — چونکی طوطا پڑھانے والی
طوطا نہ ملا تو ہوگئی بھور — سمجھی وہ کہ لے اڑا کوئی چور
طوطا بھی گیا قفس بھی ٹوٹا — دل بھی دست ہوس بھی ٹوٹا
کالی آنکھیں ہونے لگیں لال — انگارے ہوئے وہ پھول سے گال
چہرہ کندن سا تمتمایا — الماس سے لعل کو دبایا
طائر کے مثال اڑ گیا رنگ — جھنجھلائی کہ ہیں یہ کیا رنگ؟
او سرو چمن ادھر تو آ تو — طوطا مرا کیا ہوا بتا تو
او سوسن باغ تو بیاں کر — او چاندنی راز تو عیاں کر
بتلا تو شمیم تو کہاں تھی — سچ کہدے نسیم تو کہاں تھی
برگ گل لالہ تو ہی لب کھول — کیا تو گونگی ہے او کلی بول
طوطا صیاد نے اڑایا، — چڑیاں رہیں چپ اڑیں خدایا
کیا باغ میں سو رہا تھا سویا — کلیاں نادان ہی تھیں گویا

انگور تو ہے پرست ٹھیرے | کیا ان سے کہوں یہ مست ٹھیرے
آنے والی نسیم ہے بس | جانے والی شمیم ہے بس
ہے لوث ہے پاک انکا دامن | پکڑے کوئی خاک انکا دامن

اقتباسات طویل ہوگئے اور مثنوی کے کل محاسن بیان نہ ہوسکے۔ آورد و تصنع کی مثالیں بکثرت ہیں۔ شاعر کہتا ہے:-

جتنی میرے سخن کی ہے دھوم | سب ہے فیض اسیر مرحوم

اور رعایت لفظی کا گورکھ دھندا اس کشت سخن کی خاص پیداوار ہے۔ اس مثنوی سے بے لطف اشعار حذف کرکے مسلسل داستان بنائی جائے تو بیشک۔

نکلے یہ زبان اہل فن سے | لعل اُگلے ہیں شوق نے دہن سے

ترانۂ شوق کے بعد لکھنؤ اسکول کے طرز میں صرف ایک مثنوی اور لکھی گئی مگر افسوس کہ وہ ناتمام رہی۔ سید ولایت علی فردوس نے فسانۂ عجائب کا [illegible] تھا۔ اگر وہ اتمام کو پہونچتا اور شاعر کو نظر ثانی کا وقت ملتا تو ادب اردو میں ایک گرانقدر اضافہ ہوتا۔ انداز بیان دکھانے کو چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں:-

(۱) ماہ طلعت نے طوطے سے پوچھا کہ اُس کی سی خوبصورت شکل "گزری ہے کہیں تری نظر سے"

طوطے کی ذات بے مروت | بولا بگڑی بنا کے صورت
خوبی کیا اپنی پوچھتی ہو | جیسا کہتی ہو ایسی ہی ہو

یہ جواب صاف سُنکر ماہ طلعت بہت جھنجی۔ طوطے کو گالیاں دے رہی تھی کہ شہزادہ محل میں آگیا۔ دیکھا کہ بیگم طوطے سے لڑ رہی ہے اُسوقت کی تصویر یہ ہے:-

سر گرم جلال ہو رہی تھی | فیروزے سے یہ لال ہو رہی تھی

(۲) ملکہ مہر نگار شہزادۂ مہمان کو اپنے پاس روکنا چاہتی ہے اور بہت گفتگو کے بعد اپنا حال زار بیان کرتی ہے:-

ہنسنا تو گیا خوشی کے ہمراہ | رونا ہے بس اب یہی کہ ہر گاہ
پونچھیں اگر اشک غم بہیں گے | دیکھیں گے جو لوگ کیا کہیں گے
ہنس ہنس کے مجھے رُلائینگے اور | بگڑوں گی جو میں بنائیں گے اور
کب تک نہ یہ حال ہاں سنیں گے | پائیں گی خبر تو سر دُھنیں گے

....

رنگ ناسخ کا منسوخ کرنے والا پہلا شاعر

(ضامن علی جلال لکھنوی سنہ ۱۲۵ھ سے ۱۳۲۵ھ)

حشر میں کہتے پھرے ہم جلوہ اسکا دیکھ کر
حوصلہ یاں بھی نہ نکلا شوق خاطر خواہ کا

یاد رہ جائے گی فرقت کی یہ مجبوری بھی
دم نہ ہم توڑ سکے موت [illegible] ہوا

تغافل کے گلے سنکر جھکا لیں تم نے کیوں آنکھیں
مرے شرمندہ کرنے کو ذرا بیباک ہونا تھا

آپ کو بھول گئے دیکھ کے اُس بُت کو جلال
حق ادا ہو نہ سکا پھر بھی شناسائی کا

اگرچہ ایک بھی تسکین کا جواب نہ تھا
مگر کچھ آتے ہی قاصد کے اضطراب نہ تھا

کسے خبر جو ہوئیں مجھ میں یار میں باتیں
یہاں خطاب تھا کچھ وہاں جواب نہ تھا

کب آئے گا کوئی مجھ تک جواب دیتا جا
تسلیاں بھی تو اے اضطراب دیتا جا

مری داستانِ فراق نے شبِ وصل طرفہ مزا دیا
کہیں میرے منہ پہ ہنسا دیا کہیں اُس نے ہنسکے رُلا دیا

نہ خوفِ آہ بتوں کو نہ ڈر ہے نالوں کا
بڑا کلیجہ ہے ان دل دُکھانے والوں کا

پہونچے نہ وہاں تک یہ دُعا مانگ رہا ہوں
قاصد کو اُدھر بھیج کے دھیان آئے ہیں کیا کیا

انھیں سے پوچھیے دیکھا ہی جو کچھ آنکھوں نے
ہمیں خبر نہیں کیا روز انتظار ہوا

ایذا دہ کوسئے یار میں رہکر اُٹھائی ہے
اب ذکر سُن کے کانپتے ہیں ہم بہشت کا

عاشق کو جلال آپ وہ فرما گئے ناشاد
اس پر بھی تو کمبخت کو شاداں نہیں دیکھا

دل سے تنگ آئے ہیں ہم جوشِ جنوں کا کیسا
یوں گریباں نہیں کیا پھاڑتے سودا کیسا

اپنا ہاتھ اپنی چھُری اپنا گلا ہو اک دن
خنجر و بازو قاتل کا بھروسا کیسا

میں شوق دید میں کیا جانے کتنی دور آیا
کھلی کچھ آنکھ وہیں جب قریب طور آیا

تسلیاں جو وہ یونہیں دیا کریں گے جلال　　تو صبر پھر دل بیتاب کو ضرور آیا

یاد آگئیں کچھ اور جلال اس کو جفائیں　　بھولے سے بھی اظہار نہ کرنا تھا وفا کا

جستجو تیری دو عالم سے مجھے کھو دیگی　　میں بھی تجھکو نہیں ملنے کا اگر تو نہ ملا

جہاں سُنا کوئی مجمع ہے اس کو ڈھونڈھ آئے　　ذرا خیالِ پریشانیِ نظر نہ کیا

جلال وصل سے ہم ہو چکے تھے نا اُمید　　ستم کیا کہ پھر اُس نے امیدوار کیا

کیوں کسی کی جستجو کو دل گیا　　کھوئے جانے کے سوا کیا مل گیا

ہائے قاتل نے ہمیں کو نہ کیا قتل جلال　　مجرم آخر وہی ٹھہرا جو گنہگار نہ تھا

دم بھر کو ترے وعظ میں ہم بیٹھ کے واعظ　　برسوں نہ رہے بزم خرابات کے قابل

جلال دلکی تڑپ یوں ہی دور ہو شاید　　اُٹھائے دیتے ہیں لو اُن کو اپنے پاس سے ہم

جو دل ہو گا نہ ہو اسکا مجھ کو غم بھی نہیں　　سنا رہی ہے تری آرزو کہ ہم بھی نہیں

سیکڑوں بار اُنھیں پہنا دئے ہونگے ہم نے　　کیا اگر قبر پہ دو پھول چڑھا جاتے ہیں

ہوش میں آؤ ذرا تم تو بھلا کیا ہو جلال　　اچھے اچھوں کو وہ دیوانہ بنا جاتے ہیں

کس کی محشر میں ہم کریں فریاد　　داور حشر ہو تمھیں نہ کہیں

خوش نصیب اس سے زیادہ کوئی دنیا میں نہیں　　پیار سے جس کو وہ کمبخت کہا کرتے ہیں

باز آئے کہ نہ آئے وہ جفاؤں سے جلال　　تم تو کر گزرو جو کچھ اہلِ وفا کرتے ہیں

حشر میں چھپ نہ سکا حسرتِ دیدار کا راز　　آنکھ کمبخت سے پہچان گئے، تم مجھ کو

کہدیں تم سے کون ہیں کیا ہیں کہاں رہتے ہیں ہم　　بیخودوں کو اپنے جب تم ہوش میں آنے بھی دو

کردے خبر اُس خانہ برانداز سے کوئی　　روتا ہے کہیں درد کی آواز سے کوئی

چونکا رہا ہوں وصل کی شب چونکتے نہیں　　کچھ نیند ہے شباب کی کچھ خواب ناز ہے

رگِ گلو ہے جگہ یار جاودانی کی　　صدا قریب سے آتی ہے لن ترانی کی

دعوے کرتے تو ہو وفا کے جلال　　دیکھو وہ شوخ بے وفا نہ سُنے

تمھاری بزم میں ہم خود سنبھل جاتے یہ مشکل تھا　　تمھیں بیتاب کرتے تھے تمھیں پھر تھام لیتے تھے

پھر ہم اُن کے روٹھ جانے پر فدا ہونے لگے　　پھر ہمیں پیار آگیا جب وہ خفا ہونے لگے

چنانچہ مشہور چینی سیاح ہیون سانگ نے "بیت سیل بھدر" کی خانقاہ میں پندرہ ماہ تک قیام کرکے "یوگ شاستر" کی تکمیل کی، کوہ برابر، کوہ اڈول، کولا پربت، لوماس آشرم، روہن مالا، رشیا سرنگ آشرم، مندار گیری، کنڈگام (اولہار یجا سمیدھ سک، (جینی تیرتھنکروں کے "موکش" کا مشہور مقام واقع ضلع ہزاری باغ) وکرم شیلا وہار، وغیرہ جو اب جینی اور بدھ مذہب کے آثار قدیمہ میں ہیں اسوقت فروغ پر تھے اور سنیاسی اور تارک الدنیا فقرا ان میں ذکر و شغل کرتے تھے۔ جینیوں کی مذہبی کتابیں عموماً مگدھی، سنسکرت، پراکرت، کنٹری اور تامل میں پائی جاتی ہیں۔ اسیطرح بودھ مذہب کی کتابیں پالی اور سنسکرت میں ہیں اس لئے ظاہر ہے کہ بہار میں مگدھی زبان کے اندر سنسکرت، پراکرت، کنٹری اور تامل کے عناصر شامل تھے جس طرح عربی زبان پر بابلی و آرامی، عبری و حبشی زبانوں کا اثر پڑتا ہے، اور ہماری مذہبی ادبیات سے اس کا ثبوت ملتا ہے اسی طرح جینیوں اور بودھوں کے مذہبی افکار و وظایف نے بہار میں مگدھی زبان کے اندر سنسکرت، کنٹری، تامل اور پالی وغیرہ زبانوں کا اثر ڈال رکھا تھا، اور یہی وجہ ہے کہ پہلے پہل جب صوفیہ یہاں بغرض تبلیغ و ارشاد تشریف لائے تو انھوں نے اسی مخلوط مگدھی زبان میں وعظ و پند شروع کیا، اور یہیں سے مقامی زبان پر عربی و فارسی کا بھی اثر پڑا۔ بہار کے صوفی خانوادوں کے حالات ابھی دنیا کی نظروں سے محجوب ہیں خود اہل بہار بھی اپنے بزرگوں کے حالات سے نابلد ہیں، آج کتنے بہاری ہیں جو حضرت مولنا جمال الدین قدس سرہٗ اور حضرت شیخ شہاب الدین جگجوتؒ (جو پھلواری میں آسودہ ہیں) کے حالات زندگی سے واقف ہیں، اسی طرح یہاں کے صوفی ادب کا بڑا خزانہ یا تو غیر مطبوعہ ہے، یا امتداد زمانہ نے اس کو تلف کردیا پھر بھی حضرت شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری قدس سرہ کی تصنیفات اور منیر، پھلواری اور بہار کے بعض صوفیہ و محدثین کے علمی کارنامے محفوظ ہیں۔ حضرت شرف منیری رحمۃ اللہ سلسلۂ فردوسیہ کے بزرگ تھے، لیکن آپ نے شیخ ضیاء ابو النجیب عبد القاہر سہروردیؒ (سلسلۂ سہروردیہ کے بانی) کی مشہور کتاب آداب المریدین کی جو فارسی شرح لکھی ہے، وہ تصوفی ادب کا ایک شاہکار ہے، مولنا سید کمال علی صاحب (معاصر شیخ علی حزیں) نے مولنا محمود شبستری کی کتاب "گلشن راز" کی شرح لکھی، مولنا عبد الغفار پھلواروی نے ادب المفرد بخاری کا اردو میں ترجمہ کیا، کیفیت العارفین اور کنز الانساب مولفہ مولنا سید عطا حسین منعمی، اور الدر المنثور مصنفہ مولنا عبد الرحیم صادق پوری کو بھی اس سلسلہ میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ صوفیہ کی خدمات رشد و ہدایت نے ہماری زبان پر گہرا اثر ڈالا، "کنز الانساب" اور "الدر المنثور" سے پتہ چلتا ہے کہ بہار کے صوفی علماء، عرب و عجم سے آئے، یقیناً ان کے ساتھ مذہبی اور ادبی کتابوں کا ذخیرہ بھی ہوگا۔ ان کی زبان عربی رہی ہو یا فارسی لیکن انکی تصنیفات عموماً فارسی میں ہیں، باہمی میل جول اور ارتباط و تعلقات نے ایک نئی زبان

پیدا کردی، اور یہ زبان دہلی اور لکھنؤ کی زبانوں سے یقیناً مختلف تھی، اس لئے آج بھی بہار کے دور دراز دیہاتوں میں مسلمانوں کے معزز اور تعلیم یافتہ خاندانوں میں بھی ایسی اردو بولی جاتی ہے جو لکھنؤ اور دہلی کے روزمرہ کی بول چال سے مختلف ہے، اور یہ اثر ہے اسی مخلوط گھریلو زبان کا جو ان کے آبا و اجداد باوجود علم و فضل تبلیغ و ارشاد کی غرض سے بولتے آئے۔ اس سلسلہ میں اتنا اور عرض کر دینا ضروری ہے کہ اس وقت جتنے بڑے بڑے صوفیہ و بزرگان دین تشریف لائے انھوں نے مقامی زبان میں زیادہ تر عربی زبان کے عناصر شامل کئے حضرت تاج فقیہ کی ؒ کے دور بہار سے اس نظریہ کی تائید ہوتی ہے۔

ایرانی شعراء اور فارسی ادبیات

افاغنۂ دہلی کے عہد میں بھی بہار میں ہمیشہ ایک عامل آیا گیا۔ اور اس کے ساتھ فارسی زبان کی بھی ترویج ہوتی رہی۔ ضیاء برنی، فیروز شاہی، فرشتہ، اور روضۃ الصفا کے صفحات کا جائزہ لیا جائے۔ تو پتہ چلے گا، کہ افغانی عامل نے یہاں اپنے عہد حکومت کے کتنے نقوش چھوڑے ہیں۔ افاغنۂ دہلی کے زوال کے بعد جب مغلوں کی حکومت قائم ہوئی۔ تو ایرانی ذوق کے مختلف اصناف کی تقلید شروع ہوئی۔ چمن و حدیقہ کی آرائشیں، نقوش و نگارش کی دلاویزیاں۔ خطاطی و مصوری، ادب و شعر، سارے شعبے ایرانی مذاق کا پتہ دیتے ہیں۔ متقدمین صوفیہ کی کتابیں فارسی میں تو پہلے ہی سے موجود تھیں اب ایرانی شعراء کی آمد شروع ہوئی "صبح صادق" کے اوراق میں آپ کو کافی تعداد ان ایرانی شعراء کی ملے گی جو عظیم آباد میں آئے اور یہاں فارسی شاعری کا ایک ایسا بلند ذوق پیدا کر دیا کہ دہلی کے سوا اس کی نظیر کسی دوسری جگہ نہیں ملتی، "صبح صادق" کا مصنف مرزا محمد صادق بن محمد صالح اصفہانی ۱۰۲۹ھ سے ۱۰۳۳ھ تک پٹنہ میں مقیم رہا۔ مصنف نے قزوین، لاہیجان، یزد، گیلان وغیرہ کے بہت سے شعراء کا تذکرہ کیا ہے، جو عظیم آباد کو رشک ایران بنائے ہوئے تھے مثلاً مولانا نادم گیلانی، حکیم عارف لاہیجی، مولانا اعزالدین یزدی مولانا محمد حسین تبریزی وغیرہ۔ انھیں شعراء کے قدوم کی برکت کا نتیجہ ہے کہ شاہ ابوالحسن فرد، شاہ علی حبیب نصر، مولانا محمد سعید حسرت، شاہ الفت حسین فریاد جیسے بلند پایہ فارسی شعراء کے علاوہ صرف پھلواری میں فارسی زبان کے تقریباً پچاس صاحب دیوان شعراء گزرے ہیں، ایرانی شعراء کی آمد کا سلسلہ "صبح صادق" کے مصنف ہی تک ختم نہیں ہوگیا۔ بلکہ سید شاہ الفت حسین فریاد (متوفی ۱۲۹۶ھ) کے زمانہ تک سید محمد اشرف کا مقبرہ (واقع عظیم آباد) ایرانیوں کا ماویٰ و ملجا تھا، اور یہیں قاجوقی، اور حاجی ملا بابا جیسے اساتذۂ ایران مشاعرہ میں شریک ہوا کئے۔ شیخ علی حزیں بھی راجہ شتاب رائے عظیم آبادی کے یہاں ٹھہرے، خان آرزو نے "مجمع النفائس" میں اس پر تعریض بھی صرف کی ہے۔

صوفی مہاجرین اور ایرانی شعراء نے صرف بہار ہی میں زبان پر اثر نہیں ڈالا، بلکہ سارے ہندوستان پر یہی اثر

تاثر تھا۔ پنجاب، اودھ، دکن، بنگالہ ہر جگہ انھیں عناصر کے اختلاط نے مقامی زبان میں ایک تغیر پیدا کر دیا۔ دہلی میں اکبر اعظم اور عبدالرحیم خانخاناں کی ادبی سرپرستی اور بارش کرم نے بے شمار ایرانی شعرا کا ایک وسیع حلقہ بنا لیا تھا۔ دکن میں سلاطین بہمنیہ۔ عادل شاہیہ۔ قطب شاہیہ اور نظام شاہیہ نے بہت سے ایرانی شعرا کی سرپرستی کی بعض دکنی سلاطین خود بھی بلند پایہ شاعر گزرے ہیں۔ مثلاً فیروز شاہ عروجی، یوسف عادل شاہ یوسف۔ اسمٰعیل عادل شاہ وفائی وغیرہ، وفائی اپنی شاعرانہ متانت و لطافت اور شگفتہ بیانی کے لئے تمام دکنی بادشاہوں میں ممتاز ہے۔ فرشتہ نے ان تمام سلاطین کا کلام درج کیا ہے۔ سلاطین کے اسی ادبی ذوق نے دکن کو رشک ایران و توران بنا دیا چنانچہ عہد بہمنیہ میں ملک الشعرا شیخ آذری اسفرائنی۔ ملا عبدالکریم ہمدانی۔ ملا سامی وغیرہ نظر آتے ہیں خواجہ حافظ اور مولنا جامی کو ایران میں دعوت نامہ جاتا ہے۔ اسی طرح عہد عادل شاہی میں مولنا ملک قمی۔ ظہوری ترشیزی۔ رضائی مشہدی، اور دور نظام شاہی میں ملک قمی اور ظہوری کے علاوہ میرزا صادق کا نام لیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح دور قطب شاہی میں میر محمد مومن استرآبادی، نے جو محمد قلی قطب شاہ کے درباری شاعر و ندیم خاص تھے۔ دکن کو نوازا، ان کے علاوہ مولنا اشرف ماژندرانی، میر معز فطرت، مولنا نظیری، نیشاپوری، تقی اوحدی نے بھی دکن میں قیام کیا اور یہاں کے باشندوں کو اپنے افکار عالیہ سے اثر پذیر کیا۔ دکن کی اردو شاعری پر ان ایرانی شعرا کا اثر پڑا جس طرح اہل بہار کے روزمرہ کی زبان میں مگدھی زبان کا اثر پایا جاتا ہے، لیکن فرق یہ ہے، کہ بہار کا ادبی خزینہ مقامی زبان کے ثقل و ضغطہ سے زیادہ تر پاک رہا، اور دکن میں مقامی زبانوں۔ تامل۔ کنھڑی، تلنگی وغیرہ نے ادب و انشا پر بھی اثر ڈالا، دکن میں ریختہ کے کثیر التعداد شعرا گذرے ہیں اور یقیناً انھوں نے ایرانی شعرا سے استفادہ کیا پھر بھی نقلی، سید حمزہ، فراقی، فخری، لطفی، عونی حیدرآبادی، صبائی احمد آبادی، سعدی دکنی، سراج اورنگ آبادی نقیر اللہ آزاد، ولی وغیرہ کے کلام کا جائزہ لیا جائے، تو ان میں مقامی بول چال کا کافی اثر پایا جاتا ہے، برخلاف اس کے بہار کے قدیم شعرا، سید عماد، غلام نقشبند سجاد، مرزا بیدل، محمد روشن جوشش، جذب، انتظار، فغاں وغیرہ کے کلام میں زیادہ صفائی اور فصاحت پائی جاتی ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے، کیا بہار کا ادبی خزینہ دہلی و لکھنؤ سے مستغنی ہے؟ دہلی کے متعلق تو ذیل میں تفصیل کیساتھ عرض کیا جائیگا، لیکن لکھنؤ کے باب میں تو کسی طرح نہیں کہا جا سکتا کہ بہار کی قدیم اردو شاعری پر اسکا اثر پڑا، ہاں عہد متاخرین میں ناسخ اسکول کی شاعری نے شیخ امان علی سحر، رشک، وزیر، اور برق کی وساطت سے بہار پر اثر ڈالا چنانچہ شیخ علی حسن جویا عظیم آبادی (صاحب دیوان) رشک کے شاگرد تھے، سید فرزند احمد صفیر بلگرامی نے سحر سے، اور مولنا مرشد حسین کامل، دھنگوی، اور سید احمد حسین جہاں نے خواجہ وزیر سے اصلاحیں لیں

مولانا ظہیر احسن شوق نیموی (متوفی ۱۳۲۲ھ) اور ہمارے عہد میں مکرم حضرت تمنا پھلواروی مدظلہ اور مولانا حکیم ضمیر الحق قیس آروی (جن کا دیوان طبع ہو رہا ہے) اسی اسکول کے پیرو ہیں۔ میر انیس اور مرزا دبیر بھی آئے اور اپنے مراثی سے عظیم آباد کی مجالس ذکر کو رشک اودھ بنا دیا اور اپنے تلامذہ بھی چھوڑے، حضرت امیر مینائی نے بھی قدم رنجہ فرمایا لیکن یہ سب آخر عہد کی باتیں ہیں بہار میں تو میر سے بہت پہلے اردو شاعری کا رواج ہو چکا تھا اور مختلف تذکروں اور تاریخوں میں اس عہد کا کلام مذکور ہے

اب آئیے اس اہم مسئلہ پر غور کریں کہ کیا بہار کی اردو شاعری دہلی اسکول کی پیرو ہے؟ اس میں شک نہیں کہ دہلی اور عظیم آباد کے درمیاں ربط و اختلاط بہت قدیم ہے۔ لیکن اگر یہی دہلی اسکول کے تفوق کا سبب ہو سکتا ہے تو پھر یہ کیوں نہ کہا جائے کہ خود دہلی اسکول پر بہار نے بھی اثر ڈالا، مذاہب فلسفہ میں اسکندریہ کے یہودی اسکول اور فلسفہ اشراقی میں جو مماثلت پائی جاتی ہے، اہل نظر جانتے ہیں۔ فلسفہ کا ایک طالب العلم حیران رہ جاتا ہے، جب وہ فلسفۂ اشراقی کے مشہور قائد فلاطینوس اور اسکندریہ کے یہودی فلسفہ کے علمبردار فیلو کے نظریات میں یگانگت پاتا ہے ایک عرصہ تک یہ موضوع محل نظر تھا کہ نہیں کون مقدم کون موخر ہے اور کس نے کس پر اثر ڈالا، اولیت کا فخر فلسفہ اشراقی کو ہے یا یہودی فلسفہ کو، یہ تو ظاہر ہے کہ یہودیوں کو مشرکین یونان سے تنفر تھا اور یونانی علما بھی ان کو حقارت ہی کی نظر سے دیکھتے تھے، پھر فلاطینوس، اور فیلو کی یہ ہم نوائی کیسی؟ آخر کار یہ تسلیم کرنا پڑا، کہ انہیں باہمی اثر و تاثر نہیں ہے بلکہ دونوں نے ایک ہی ماحول میں ایک ہی قسم کے اثرات کے ماتحت آزادانہ ترقی کی، میرا خیال بھی دہلی اسکول اور بہاری اسکول کے متعلق یہی ہے، ہرگز بہاری اسکول دہلی اسکول کے تتبع کا نتیجہ نہیں۔ ہاں شعرائے دہلی سے یہاں کے بعض اکابر رجال نے اصلاحیں لیں مثلاً میر حسن کے استاد میر ضیا دہلی سے عظیم آباد چلے آئے، اور یہیں راجہ شتاب رائے کے لڑکے کے یہاں وظیفہ یاب ہوئے جس کا خود میر حسن نے تذکرہ کیا ہے اسی طرح علامہ سید کمال علی صاحب عظیم آبادی کے دونوں صاحبزادوں اشکی و جمال نے خواجہ میر درد کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا (ملاحظہ ہو حیات زیبا صفحہ ۱۵۷) لیکن اس کو کیا کیجئے خود میر تقی میر جعفر عظیم آبادی کے شاگرد تھے، غالب نے بیدل کا کلام سامنے رکھ کر مشق سخن کی، "نسخہ حمیدیہ" میں غالب کے بیسوں اشعار بیدل کے ساتھ ارادت و نیازکیشی میں پائے جاتے ہیں مرزا بیدل (متوفی ۱۱۳۳ھ) اور غلام نقشبند سجاد (متوفی ۱۱۷۰ھ) کے اردو اشعار دہلی اسکول کے کس شاعر کے تتبع کا نتیجہ ہیں نکات الشعرا میر تقی، تذکرہ میر حسن، مخزن نکات قائم چاند پوری میں بیدل کے صرف دو شعر پائے جاتے ہیں اور وہ یہ ہیں۔

مت پوچھو دل کی باتیں وہ دل کہاں ہے ہم میں اس تخم بے نشاں کا حاصل کہاں ہے ہم میں

جب دل کے آستاں پر عشق آن کر پکارا پردے سے یار بولا بیدل کہاں ہے ہم ہیں

سید صغیر بلگرامی نے بھی تذکرہ "جلوہ خضر" میں بیدل کا ایک اردو شعر لکھا ہے۔

بیدل کا بقیہ اردو کلام یا تو ضائع ہو گیا یا کہیں گمنامی میں پڑا ہے۔ سید خواجہ عماد الدین عماد (۱۰۶۵ھ - ۱۱۲۴ھ) اور سید غلام نقشبند سجاد (۱۱۱۶ھ - ۱۱۶۳ھ) کا کلام پھلواری میں حضرت مکرم مولنا تمنا مدظلہ کے پاس محفوظ ہے "معارف" پھلواری (بابت صفر ۱۳۴۲ھ) میں حضرت تمنا مدظلہ کے قلم سے غلام نقشبند سجاد کی زندگی پر ایک بسیط مقالہ شائع ہو چکا ہے۔ خواجہ عماد کا کلام ملاحظہ ہو۔

جب بیچ چمن کے فصل بہاری آوے ہے تب جوش جنوں تلوا میرا کھجلاوے ہے
بیچ نظر کے ادھر اودھر ہر دم آوے جاوے ہے دل بے ظالم تس پر بھی ٹک دیکھنے کو ترساوے ہے
جب ستی چھوڑ یس کھانا پینا تیر اودا نہ الفت میں خوں جگر کا پیوے ہے۔ اور غم غصہ کو کھاوے ہے
آوے اپنے ہاتھ دہ موہ رکھو نہیں عماد اب اسکی آس اسکے کارن کون جتن ہم کیا جو نہیں آوے ہے

تذکرہ نگاروں کی کثرت رائے کے مطابق غلام نقشبند سجاد میر تقی سے پہلے پیدا ہوئے۔ آپ کے کلام میں ایک ایسا سوز و درد ہے کہ پڑھنے کے بعد ایک خاص کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

بھٹی کو چلا کیا ہوتے سحر پوچھو تو کوئی سجاد ستی تھا رات تلک تو کام اس کو اشغال ستی اور اوراد ستی
ٹک میری طرف سے باد صبا کہتی جا کر صیاد ستی اب جاں لبوں پر بلبل کے پہونچی تیری بیداد ستی
تنہائی فرقت میں اپنا کیا کیا نہ یہ دل گھبراوے ہے بہلے ہے جو یہ ٹک شدنی تو صرف تمھاری یاد ستی
جب آگ دھندھکتی ہو اس پر مت چھینٹو تیل خدارا تم کیا دل کی خوشی کو پوچھو ہو یارو تم اک ناشاد ستی
اے باد سحر اے موج صبا لے جلد ہماری آ کے خبر نکلا ہے ہمارا کام سدا تیری ہی فقط امداد ستی
سن پایا ہے اس نے دل میرا کعبہ ہے یہ گھر اللہ کا ہے اب کھود کے اس کو پھینکوائے وہ بت نہ کہیں بنیاد ستی
جو دیکھ کے ہم کو ہاتھ ملے پچھتاوے اور افسوس کرے بتلاؤ کوئی شکوہ کریں کیا ایسے ستم ایجاد ستی
ٹھانا تو بہت اب جاوینگے ہرگز نہ کسو کے کوچہ میں ہر بار مگر مجبور رہے ہم اپنے دل ناشاد ستی
توڑا ہے وہ کب کا تقوی کو بھٹی میں تو اسکی گزرے ہے سجادہ و مسجد کی بابت مت پوچھو اب سجاد ستی

اب آئیے اس مسئلہ پر غور کریں کہ بہاری اسکول پر تبصرہ کرنے کے لئے ایک محقق کو کن مراحل سے گزرنا ہوگا ہر چند یہ مسئلہ شرح و بسط کا طالب ہے۔ لیکن مختصراً ان ماخذ کا تذکرہ کیا جائے گا جن کو پیش نظر رکھنے کے

بعد کوئی صحیح نتیجہ نکالا جا سکتا ہے شعرائے ریختہ کے متعلق تو عموماً فضلائے دہلی، اودھ اور دکن کے تذکرے نظر آتے ہیں ان میں نکات الشعرا۔ میر تقی، مخزن نکات قائم چاندپوری، تذکرہ میر حسن، چمنستان شعرا شفیق، تذکرہ مصحفی، آب حیات آزاد گلشن بیخار شیفتہ زیادہ مشہور ہیں افسوس ہے بہار کے اردو فارسی شعرا کی طرح بہاری تذکرہ نگاروں کو بھی زمانہ نے فراموش کر دیا حالانکہ محمد روشن جوشش (معاصر میر حسن) عزیز الملک ابراہیم خاں خلیل مولف "گلزار ابراہیمی" ناظر وزیر علی عبرتی (متوفی ۱۲۸۹ھ) مولف تذکرہ "معراج الخیال" سید علی محمد شاد۔ مولف "حیات فریاد" نواب سید امداد امام اثر مولف تذکرہ "کاشف الحقایق"، تمام حضرات بہار کے بہت ہی بلند پایہ تذکرہ نگار گزرے ہیں لیکن ان میں چند حضرات تو مجمل طور پر ادبی دنیا میں روشناس ہیں بقیہ گمنامی میں ہیں، بہار میں فارسی شعرا کے بھی بعض مستند تذکرے پائے جاتے ہیں مثلاً نواب آغا علی خاں مولف تذکرہ "نشتر عشق" کا وطن بہار ہی تھا۔ "سفینۂ خوشگو" کے مصنف بندرابن داس نے یہیں عظیم آباد میں وفات کی۔ دونوں تذکروں کے مخطوطات پٹنہ اور نشیل لائبریری میں موجود ہیں تذکرہ نگاروں کے علاوہ نواب غلام حسین خاں مولف "سیر المتاخرین" بھی یہیں کے رہنے والے تھے، مصنف نے اس کے ایک حصہ میں بہار کے صوفیہ وغیرہ کا حال لکھا ہے۔ ابراہیم خاں خلیل نے گلزار ابراہیمی کے علاوہ فارسی شعرا کا بھی ایک تذکرہ لکھا تھا جو بہت ہی مشہور رہے۔ اس کا نام "صحف ابراہیم" ہے اس کتاب کا ایک مخطوطہ پٹنہ لائبریری میں ہے۔ جوشش کا تذکرہ ناپید ہے اس کے متعلق صرف تذکرہ میر حسن سے اتنا پتہ چلتا ہے کہ میر حسن جب اپنا تذکرہ لکھ رہے تھے، تو عظیم آباد میں جوشش بھی اپنا تذکرہ تالیف کر رہے تھے۔ عبرتی راجہ پیارے لعل الفتی کے شاگرد تھے، الفتی کے خاندان میں میر حسن کے خاندان کی طرح نسلاً بعد نسل شاعری کا رواج رہا چنانچہ انکے لڑکے کنور ہیرا لعل ضمیر اور پوتے کنور سکھراج بہادر رحمتی بھی بلند پایہ شاعر گزرے ہیں۔ ضمیر تو زبان عربی کے بہت بڑے ادیب تھے، ایکدفعہ اعداد و ہندسہ کے متعلق علامہ سید غلام حسین مشہور ریاضی دان سے اور ضمیر سے عربی زبان میں خوب مباحثے ہوئے، کنور سکھراج بہادر رحمتی نے چند بار مہتم بالشان مشاعرے کئے چنانچہ صفیر بلگرامی (ساکن آرہ) نے بھی تذکرہ "جلوہ خضر" (جلد ۲) میں ایک مشاعرہ کا تذکرہ کیا ہے جسمیں وہ خود ۱۲۹۶ھ میں مدعو تھے، اور گلدستہ موسوم بہ "تحفہ انجمن رحمتی" میں انکی غزل بھی چھپی تھی۔ عبرتی مرحوم نے دو تذکرے لکھے ایک معراج الخیال، دوسرا ریاض الافکار، اول الذکر میں شعرا کا تذکرہ ہے ثانی الذکر میں نثر نگاروں سے بحث کی ہے۔ لیکن ضمناً شعرا کا بھی تذکرہ آ گیا ہے۔ صفیر بلگرامی ....بہت بڑے محقق زبان، اور مختلف فنون ادبیہ کے ماہر تھے۔ ان کی ایک تالیف "جلوۂ خضر" بہت مشہور ہے۔ یہ بڑی محنت و کاوش، تحقیق و استقرار کے بعد مرتب کی گئی ہے۔ اس کی دو جلدیں ہیں ایک دہلی اسکول کی شاعری اور اس کے اساتذہ و متبعین کے متعلق ہے

دوسری جلد میں لکھنوی شاعری بالخصوص ناسخ و آتش کے اسکولوں کا فرق و امتیاز دکھایا گیا ہے، ناسخ کی حسرکات و ایجادات پر مکمل بحث کی گئی ہے، یہ بحث اس قدر فاضلانہ و محققانہ ہے کہ شاید ہی اتنا بڑا ذخیرۂ معلومات کسی اور جگہ دستیاب ہو سکے۔ آج ہر عامی بھی غریب ناسخ کی شاعری پر علی الرغم طبع آزمائیاں کیا کرتا ہے، جہاں تک شاعرانہ شگفتگی و برجستگی، احساسات و تاثرات کا تعلق ہے، یقیناً ناسخ کی شاعری میرے لئے بھی کوئی دلچسپی نہیں رکھتی، بہاری شعرا میں میر ضیا، شیخ راسخ، عطا بہاری اور غیر بہاریوں میں میر و درد، میر حسن و قائم، سودا و غالب کا کلام مجھے زیادہ محبوب ہے، عہد حاضر میں جہاں تک انفرادی پسند کا تعلق ہے، اصغر گونڈوی کے شاعرانہ افکار میرے لئے حد درجہ دلاویز ہوتے ہیں لیکن پھر بھی میں ناسخ کو زبان اردو کا بہت بڑا فایدہ اور مصلح خیال کرتا ہوں جن نقاد نگاہوں نے بصیرت و تعمق کے ساتھ ناسخ کی لسانی خدمات کا مطالعہ کیا ہے وہ اس کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتے — کہ اردو کو اس منزل ترقی پر پہونچانے میں ناسخ اور آپ کے تلامذہ نے بڑی جگر کاویاں کی ہیں میرا خیال ہے کہ ایک دن ایسا آئے گا جبکہ لسانیات کے محققین ناسخ کی خدمات زبان پر فلسفیانہ روشنی ڈالیں گے اور بتائیں گے کہ ناسخ اسکول کا مطالعہ کئے بغیر اردو کی صحیح تاریخ مرتب کرنا احاطۂ امکان سے باہر ہے جہاں تک جذبات کی برانگیختگی، پیام اور اثر آفرینی کا تعلق ہے، ناسخ اسکول نے کوئی اہم خدمت انجام نہیں دی۔ لیکن زبان کا خط و خال کچھ اس طرح درست کیا کہ اردو شاہد رعنا بن گئی۔

اب چند الفاظ میں یہ عرض کر دینا ضروری ہے، کہ بہار میں اردو شاعری کے کتنے اسکول ہیں؟ بہار کے باکمال شعرا کا بیشتر کلام غیر مطبوعہ ہے، اور جو کچھ طبع ہو چکا ہے، وہ بہت مختصر ہے، پھر بھی شعرائے بہار کے افکار عالیہ کا جتنا حصہ ہمارے احاطہ معلومات کے اندر ہے، ان کی بنا پر ہم بعض قیاسی نتایج مرتب کر سکتے ہیں ہر چند ابھی تحقیق و استقرار کا میدان وسیع ہے اور امتداد زمانہ ہماری بہت سی قیاس آرائیوں میں تبدیلیاں پیدا کرے گا۔

(۱) دہلی اور دکن میں فارسی شاعری کا شباب ہے۔ عہد جہانگیر سے لے کر دور عالمگیری تک تمام اکابر رجال فارسی میں شعر کہتے ہیں دور جہانگیری کے شعرا ابو طالب کلیم، ملا سرابی۔ ملا شیدا، طالب آملی، حکیم رکنائے کاشی، عہد شاہجہانی کے مرزا رضی دانش، محمد قلی سلیم، سالک یزدی، صائب تبریزی، میر صیدی، قدسی مشہدی، عصر عالمگیری کے محمد سعید اعجاز ملا سعید اشرف، محمد زماں راسخ، ناصر علی، علی، محمد علی ماہر، مرزا سرخوش، موسوی خاں فطرت وغیرہ نے ۱۰۱۴ھ سے ۱۱۱۸ھ تک نہ صرف دہلی بلکہ سارے ہندوستان میں فارسی ہی کا ذوق پیدا کر رکھا تھا لیکن شعرائے عالمگیری کے دور میں ایک ایسا بہاری شاعر تھا جس کی حسیات لطیف، وجدانات شعری، الہامات صوفیانہ، اور کشف حقایق نے اس کو رومی کے دوش بدوش لا کھڑا کیا بلکہ آج ہندوستان کے بے مثل نقاد ادب (حضرت مولنا نیاز فتحپوری مدظلہ)

تو اس کو تمام شعرائے ایران سے ممتاز بتاتے ہیں یہ مرزا عبدالقادر بیدل کی ذات ہے۔ اس میں شک نہیں بیدل کے معاصر مرزا معز فطرت کے فارسی اور مخلوط اشعار نکات الشعرا اور تذکرہ میر حسن میں پائے جاتے ہیں لیکن اسی کے پہلو بہ پہلو بیدل کے اردو اشعار پڑھئے پھر بہاری اردو کی فوقیت کا اندازہ لگائیے، فطرت کہتے ہیں۔

از زلف سیاہ تو بہ دل دھوم پڑی ہے   در خانۂ آئینہ گھٹا جھوم پڑی ہے

بیدل کہتا ہے۔

مت پوچھ دل کی باتیں وہ دل کہاں ہے ہم میں   اس تخم بے نشاں کا حاصل کہاں ہے ہم میں

بیدل کے اردو اشعار میں بھی اس کی وہی شاعرانہ قادر الکلامی اور رفعت فکری کارفرما ہے جو اس کے فارسی کلام میں ہے اور جس نے اس کو تمام فارسی شعرا میں ممتاز بنا دیا ہے، زبان کی صفائی صاف بتا رہی ہے، کہ بیدل نے اردو میں بھی اس سے پہلے بہت کچھ کہا ہوگا۔ شاید زمانہ نے اس کو برباد کر ڈالا، یا پھر کہیں "تبرکات خاندانی" میں ہو، بہرحال دور عالمگیری کے اس بہاری شاعر نے اپنی ندرت افکار کے بہت کچھ نمونے چھوڑے۔ اور مقامی لوگوں میں ذوق تتبع پیدا کر دیا ہر چند بیدل کے عہد میں یا اس سے پہلے بہار کے اندر اردو شاعری کا آغاز ہو چکا تھا لیکن ابھی اس عہد کا کلام غیر مطبوعہ ہے اور بہاری اہل قلم پوری طرح زور بازو صرف کر کے ان اکابر کے حالات و کلام فراہم کر رہے ہیں غلام نقشبند سجاد اور اشرف علی خان فغاں وغیرہ کی شاعری بیدل اسکول سے اثر پذیر ہوئی، ہر چند میر تقی نے نکات الشعرا میں فغاں کو قزلباش خاں امید کا شاگرد بتایا ہے لیکن امید تو فارسی کے شاعر تھے، اردو میں انھوں نے صرف دو شعر موزوں کئے میر صاحب نے ان کے دونوں شعر نقل کئے ہیں جو امید نے میر صاحب کو سید حسن رسول نما بنارسی قدس سرہ کے عرس کی تقریب میں بمقام بنارس سنایا تھا۔ فغاں بہار کے رہنے والے تھے میر صاحب ان کے متعلق لکھتے ہیں "بندہ بخدمت اوبسیار مربوطم" اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ فغاں نے میر صاحب کے دل پر کون سا نقش ارادت چھوڑا تھا۔

(۲) بیدل کی وفات کے تقریباً پچاس سال کے بعد مضافات عظیم آباد کے ایک قریہ "سائیں" میں شیخ غلام علی راسخ پیدا ہوئے نصف صدی کے اس درمیانی زمانہ میں بہار کے اندر اردو شاعری نے کافی ترقی کر لی تھی بیدل اور سجاد کے نقوش میں زیادہ جلا ہو رہی تھی، میر ضیا، فغاں، اشکی اور جمال نے عظیم آباد کو "دامان بہار" بنا رکھا تھا میر ضیا دہلی سے آگئے تھے اشکی و جمال نے خواجہ میر درد کی شاگردی اختیار کر لی تھی، اسی دور میں راسخ نے بھی شعر کہنا شروع کیا۔ آب حیات آزاد اور حیات فریاد علامہ شاد میں ان کا وہ مشہور شعر درج ہے، جو انھوں نے میر تقی کو سنایا تھا، اس میں شک نہیں راسخ کے ذوق شعری کو میر صاحب کی شاعری سے خاص مناسبت تھی، اسی لئے وہ میر صاحب کی خدمت میں زانوئے تلمذ تہ کرنے کے لئے گئے

راسخ، میر صاحب کی شاگردی پر فخر بھی کرتے ہیں خود میر نے ان کو "فخر میر" کا لقب دیا لیکن تلمذ سے پہلے راسخ کے کلام میں کافی پختگی آچکی تھی. فرماتے ہیں۔

ہوے ہیں ہم ضعیف اب دیدنی رونا ہمارا ہے مژہ پر اپنے آنسو صبح پیری کا ستارہ ہے

راسخ کے اس شعر سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی شاعری بہار میں میر صاحب کی شاگردی سے پہلے فروغ پا چکی تھی، راسخ ۱۱۶۲ء میں پیدا ہوئے اور ۱۲۳۳ھ میں وفات کی اس عہد کے تمام اکابر بہار اُلفتی، اشکی، جمال، عبرتی، فرد سب میں راسخ کی شاعری کو زیادہ فروغ ہوا، شاہ ابو الحسن فرد (متوفی ۱۲۶۶ھ) اور غلام علی راسخ دونوں حضرت شاہ نور الحق تپاں کے شاگرد تھے، شاہ نور الحق صاحب بڑے محدث بھی تھے، شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے "عجالہ نافعہ" آپ ہی کے لئے لکھی تھی تپاں پھلواری کے رہنے والے تھے، آپ نے ۱۲۳۴ھ میں انتقال کیا اس لئے راسخ اسکول بلا واسطہ بہاری اسکول ہے راسخ کے تلامذہ میں مفتی انور علی یاس آروی (متوفی ۱۲۶۲ء) بہت اہمیت رکھتے ہیں فرماتے ہیں۔

یاں طرز سخن میں اے یاس راسخ کے یادگار ہیں ہم

یاس مرحوم ایک جید عالم اور فارسی کے مستند شاعر تھے، آپ کا دیوان ۱۲۹۸ھ میں طبع ہوا تھا یاس کے سوانح حیات اور شاعری پر سالنامہ ساقی (۳۲ء) میں ایک تبصرہ ہو چکا ہے۔

(۳) بہار میں تیسرا اسکول سادات بلگرام کا ہے، یہ لوگ بلگرام سے آرہ اور کوانتھ چلے آئے چنانچہ سید خورشید علی خورشید بندہ علی بندہ غلام یحیی یحیی، سید محمد مہدی خبر، میر امامی، سید فرزند احمد صفیر اس خانوادہ کے اہل کمال گزرے ہیں صفیر (متوفی ۱۳۰۷) سے پہلے آرہ میں مولنا انور علی یاس آروی کی شہرت ہو چکی تھی، اسی زمانہ میں سید شاہ عالم صاحب مارہروی آرہ تشریف لائے، لیکن صفیر نے اپنے عہد میں مجالس ادبی کی جو یادگاریں چھوڑی ہیں اس کی نظیر ان سے قبل نہیں ملتی، صفیر نے دہلی اسکول اور لکھنؤ اسکول دونوں سے استفادہ کیا چنانچہ جہاں انھوں نے غالب کو اپنا کلام دکھایا وہاں آسخ کے شاگرد رشید شیخ اماں علی سحر سے بھی اصلاح لی، دبیر کے سامنے بھی زانوئے تلمذ نہ کیا لیکن غالب، سحر، اور دبیر سے مشورہ سخن کرنے سے بہت پہلے ان کی شاعری کا آغاز ہو چکا تھا خود گھر میں سید صاحب عالم صاحب، میر امامی، سید محمد مہدی خبر موجود تھے میر امامی کا دیوان کوانتھ اور آرہ کے بعض حضرات کے یہاں آج بھی دستیاب ہو سکتا ہے میر امامی کی شاعری بہار ہی میں پھولی پھلی، اس لئے وہ ہماری تاریخ ادب کے ایک اہم باب ہیں صفیر نے اپنی تالیفات و تصنیفات کے علاوہ بہت سے باکمال شاگرد چھوڑے جن میں مولنا اسمعیل، مہر، قاضی واجد حسین وجد، سید امیر حسن بدر (صاحب خمخانہ) کا نام لیا جا سکتا ہے، یہ سب ملکی محلہ آرہ کے رہنے والے تھے۔

(۴) ماضی قریب اور عہد حاضر میں شمشاد کے شاگردوں نے بہار پر زیادہ اثر ڈالا، شمشاد لکھنوی ناسخ اسکول کے مشہور تلامذہ ہیں، فرنگی محل کے جید عالم تھے، اس لئے طبقہ علما میں آپ کی زیادہ پذیرائی ہوئی، چنانچہ مولنا شوق نیموی مولنا ضمیر الحق قیس آروی، حضرت تمنا پھلواروی، اسی اسکول کے علمبردار ہیں، مولنا شوق بہت بڑے علامہ تھے، حدیث میں آپ کی تالیف "آثار السنن" نہ صرف ہندوستان بلکہ حجاز میں بھی پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے، اور داخل نصاب ہے آپ کی ایک مثنوی سوز و گداز بہت ہی مقبول ہوئی۔

ہمارا زمانہ اردو ادب کے لئے دور نہضت ہے، اس وقت قدیم عربی اور یوروپی شعرا کی طرح علمی، سیاسی اور معاشرتی نظم نگاری کا ذوق پیدا ہو رہا ہے، پنجاب نے اقبال، اودھ نے جوش اور دکن نے علی اختر اختر پیدا کئے بہار بھی اس میدان میں کسی سے پیچھے نہ رہا آج ہم اپنے وطن کے مایہ ناز بزرگ ڈاکٹر عظیم پر بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں، اس سلسلہ میں سید عبدالغنی شمس اور احمد آرمان ایم اے کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ شمس صاحب کی نظمیں ندیم، نظرت وغیرہ میں شایع ہو چکی ہیں، آپ کی بہت سی نظمیں غیر مطبوعہ ہیں، آپ کی ذات سے اہل بہار کی بہت سی توقعات وابستہ ہیں جامعہ شمس الہدی (پٹنہ) کا یہ عالم اپنی انشائے عالیہ، اور ادب لطیف کے لئے نقادنگاہوں میں گھر کر چکا ہے، شمس کی موجودہ زندگی سراپا شعر ہے، موسیقیت ہے ایک ایسی لطیف زندگی ہے جہاں عبوساً قمطریرا قسم کا کوئی مولوی مشکل ہی سے پہونچ سکتا ہے، اگر بہار کے اس نوجوان شاعر نے اپنی مشق سخن جاری رکھی تو پھر وہ دن دور نہیں جبکہ ہندوستان ایک قومی شاعر کی حیثیت سے ان پر فخر کرےگا۔[۱]

عبدالمالک (آروی)

---

[۱] اس مضمون میں اساتذہ بہار کے متعلق بعض اشارے کر دیے گئے ہیں ہمارے عہد میں بہار کے اندر بڑے بڑے شعرا موجود ہیں افسوس ہے کہ وہ اپنے بزرگوں کی طرح شہرت و نمود سے یکسر علیحدہ ہیں، حالانکہ اجتماعی مفاد کے لیے افراد میں ان خیالات کا ہونا ضروری ہے، مگر کیا کیجئے بہار کے خمیر ہی میں زہد گزینی کا مادہ ہے، حضرت فضل حق آزاد، حضرت شفق عماد پوری، حضرت عرش گیاوی، شاہ نصیر عظیم آبادی، جناب نصیر (بیرسٹر)، جناب بیدل (پروفیسر)، ہمارے زمانہ کے صاحب کمال بہاری شعرا ہیں ان کے علاوہ گیا، عظیم آباد پھلواری، آرہ تمام شعر و سخن کا پاکیزہ مذاق ہے، اور ہر جگہ ماہران علم و ادب کی کافی تعداد موجود ہے؛

دکن اور اُردو شاعری

(سلطنت آصفیہ سے پہلے دکن کی اُردو شاعری پر ایک نظر)

شاعری کا انسانی ترقی میں خاص حصہ رہا ہے۔ اخلاق کی تہذیب اور تمدن کی اصلاح میں جو کارہائے نمایاں اس سے ظہور میں آئے وہ اور وسائل سے نہیں آئے۔ نظم کے باعث ہی فطری ولولے جوش میں آتے اور قدرتی جذبات کو حرکت و جنبش ہوتی ہے۔

اس امر کا ٹھیک پتہ لگانا نہایت دشوار ہے کہ پہلے کس زبان میں نظم کی ابتدا ہوئی۔ لیکن یہ کہا جاسکتا ہے کہ دنیا میں جس قدر زبانیں عالم وجود میں آئیں ان میں اول نظم ہی کا رواج ہوا ہے کیونکہ نظم انسان کو بالطبع مرغوب ہے۔ اسی لئے قدیم زمانہ میں مذہبی کتابیں نظم ہی میں قلمبند ہوا کرتی تھیں۔ سنسکرت میں عرفان حقیقی اور فلسفہ و حکومت کا اشراقی کام نظم کے ذریعہ ہی سے وابستہ تھا۔ زمانہ جاہلیت میں جبکہ عرب میں کتابت کا دستور نہ تھا سیکڑوں ہزاروں اشعار عرب یاد رکھتے تھے۔ اسی طرح فارسی زبان میں شاعری سے بڑے بڑے کام لئے گئے اور شاعری کو بادشاہوں کی خلوت جلوت، رزم بزم سے خاص تعلق رہا۔ شاعروں کی کافی طور سے عزت افزائی کی گئی اور انھیں ملک الشعرا کا خطاب دیا جانے لگا۔

مگر دکھنی زبان میں ایسا نہیں ہوا یہاں نظم کی ابتدا نثر کے بعد ہوئی اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ تحریر کی ابتدا چونکہ ترجمہ سے ہوئی اور نظم کے بہ نسبت نثر میں ترجمہ کرنا آسان اور سہل تھا اس لئے غالباً نظم کی ابتدا نہیں ہوئی بلکہ نثر سے ابتدا کی گئی۔

یہ امر ہنوز تحقیق طلب ہے کہ دکھنی زبان کا پہلا شاعر کون تھا؟ حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز سید محمد حسینی کیطرف بھی اشعار منسوب کئے جاتے ہیں۔ خواجہ صاحب کے کلام کے متعلق کوئی قطعی ثبوت نہیں ہے اس لئے سردست ہم کوئی فیصلہ کن خیال ظاہر نہیں کرسکتے۔

ایک زمانہ تھا کہ اہل علم ولی اورنگ آبادی کو اردو کا پہلا شاعر تصور کرتے تھے اب جدید تحقیقات اور مزید معلومات

کی بنا پر سلطان محمد قلی قطب شاہ المتوفی سنہ ۱۰۲۰ھ کو پہلا شاعر قرار دیا گیا ہے۔ لیکن سلطان کے کلام سے خود اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ یہ اردو کا بالکل ابتدائی کلام نہیں ہے۔

جہاں تک ہم نے اب تحقیقات کی ہے اس کے لحاظ سے "نظامی" پہلا شاعر ہے جو سلطان احمد شاہ بہمنی المعروف نظام شاہ ۸۶۵ھ تا ۸۶۷ھ کے دور حکمرانی میں موجود تھا۔

نظامی کی مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" دستیاب ہوئی ہے جس سے اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ یہ دکھنی شاعری کا ابتدائی نمونہ ہے بہمنی حکومت (۷۴۸ھ تا سنہ ۹۰۰ھ) کے کسی اور شاعر کا اس وقت تک کوئی کلام نہیں ملا ہے بہمنی حکومت کے زوال پر ۹۱۶ھ میں گولکنڈہ پر قطب شاہی اور ۸۹۵ھ میں بیجاپور پر عادل شاہی پرچم لہرانے لگا اور تقریباً دو سو سال کے بعد دونوں علم سرنگوں ہو گئے اس طرح ۱۰۹۷ھ اور ۱۰۹۸ھ میں بیجاپور اور گولکنڈہ پر مغلیہ جھنڈا بلند ہو گیا

اس عرصہ میں ان دونوں سلطنتوں نے علم ہنر کی ترویج اور تمدن و تہذیب کے رواج دینے میں جو کچھ سعی کی تھی ہرگز فراموش نہیں ہو سکتی۔ جب ہم ان کے مختصر رقبہ مملکت کو پیش نظر رکھ کر ان کی شان و شوکت اور دبدبہ و طمطراق دیکھتے ہیں تو تعجب ہوتا ہے کہ اتنی عظیم الشان دولت و ثروت اور بیش قرار لشکر کس طرح فراہم ہوتا تھا جس طرح ان کی دولت مندی اور ان کے زر و جواہر کی فراوانی یا دی النظر میں افسانہ معلوم ہوتی ہے اسی طرح ان کی علم دوستی اور اہل کمال کی قدر دانی بھی حیرت انگیز ہے۔ گولکنڈہ اور بیجاپور علم و ہنر کے مرکز اور تمدن و تہذیب کے گہوارے تھے۔ دور دور سے اہل علم و فضل یہاں کی قدر دانی کا شہرہ سنکر آتے اور اپنی محنت و مشقت کا کافی صلہ پاکر نہال ہو جاتے تھے۔ یہاں کے چشمہ ہائے فیض کی آبیاری سے چمنستان علم و فضل سرسبز اور شاداب تھے۔ ہر خانہ علم و فن معمور شعر و سخن کی مجلسیں آباد تھیں۔ گھر گھر شاعروں کے جمگھٹے ہوتے تھے۔ غرضکہ بیجاپور اور گولکنڈہ کو اگر زمانہ سلف میں قرطبہ اور بغداد سے مثل سمجھا جاتا تھا تو اب لنڈن اور برلن کو اس کے مقابل لا سکتے ہیں۔

عربی و فارسی سے قطع نظر ہم دکھنی بہ الفاظ دیگر اردو کی ترقی پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔ یہ امر ہم کو معلوم ہے کہ اردو کی ابتدا دکن میں ان دونوں سلطنتوں کے قیام کے بہت پہلے ہو چکی تھی اور وہ اگرچہ عام بول چال کے درجہ سے گزر چکی تھی اور پھر نثر و نظم کے مدارج بھی طے ہو چکے تھے مگر پھر بھی نثر فقہ و تصوف کی ایک دو کتابوں تک محدود تھی اور نظم کے بھی ایک آدھ نمونہ کا پتہ چلتا ہے ان دونوں سلطنتوں نے اردو کی سرپرستی فرمائی اور اس کو ترقی دیکر بارور اور بر کر دیا۔ اس کو اپنی سرکاری زبان قرار دے کر عزت دی۔

ان خاندانوں کے خود کئی ایک تاجدار اچھے شاعر تھے انکا کلام آج تک موجود اور اپنے مصنفوں کی اعلیٰ قابلیت کی زندہ گواہ ہے

سلطان محمد قلی اور سلطان محمد اور عبداللہ قطب شاہ کے کلیات اپنی گوناگوں خوبیوں کے لحاظ سے اردو کے جواہر پارے قرار دیے جا سکتے ہیں۔ اسی طرح ابراہیم عادل شاہ کا شہ کار "نورس" اور علی عادل شاہ کا کلیات اور مثنوی بدی الجمال درحقیقت کلام الملوک ملوک الکلام کے مصداق ہیں۔

ان حکمرانوں کے دور کے مسلسل اور طویل نظموں کے نمونے موجود ہیں جو صرف کسی اور زبان کے ترجموں تک محدود نہیں ہیں بلکہ اپجی اور طبع زاد بھی ہیں صنف شاعری کے متعدد اقسام مثلاً مثنوی۔ قصیدہ۔ غزل۔ رباعی اور قطعہ میں انھوں نے طبع آزمائی کی ہے اور اپنی یادگار میں شعر و سخن کے بہتر سے بہتر نمونے چھوڑے ہیں۔

ان کی شاعری میں رزم و بزم۔ واقعہ نگاری۔ مرقعہ نگاری۔ عشق و محبت تصوف و فلسفہ۔ روزمرہ و اخلاق سب کچھ موجود ہے۔ اسلوب بیان کی جدت تخیل کی بلند پروازی خیالات کی ندرت اور سادگی و صفائی تسلسل اور پاکیزگی انکے کلام کے خاص جوہر ہیں۔

گولکنڈہ اور بیجاپور کے جن جن شاعروں اور ان کی تصانیف کا پتہ اب تک چلا ہے ان کی فہرست حسب ذیل ہے۔

گولکنڈہ

شمار	نام شاعر	زمانہ	تفصیل تصانیف
۱	فیروز	۹۷۵ھ	؟
۲	محمود	۹۷۵ھ	؟
۳	وجہی	۹۸۸ھ	مثنوی قطب مشتری۔ مرثیہ
۴	سلطان محمد قلی	۹۸۸ھ	کلیات
۵	احمد	۹۹۰ھ	لیلیٰ مجنوں بمصیبت اہل بیت
۶	سلطان محمد	۱۰۲۰ھ	کلیات
۷	غواصی	۱۰۲۰ھ	[illegible]
۸	قطبی	۱۰۳۰ھ	مثنوی تحفۃ النصائح
۹	جنیدی	۱۰۳۵ھ	مثنوی ماہ پیکر
۱۰	سلطان عبداللہ	۱۰۳۵ھ	کلیات
۱۱	ابن نشاطی	۱۰۳۶ھ	مثنوی پھول بن

شمار	نام شاعر	زمانہ	تفصیل تصانیف
۱۲	طبعی	۱۰۵۰ھ	مثنوی بہرام و گل اندام
۱۳	امین	۱۰۵۷ھ	قصہ ابوشحمہ
۱۴	خواص	۱۰۷۵ھ	قصہ حسینی
۱۵	غلام علی	۱۰۷۵ھ	مثنوی پدماوت
۱۶	سیوک	"	
۱۷	فائز	"	
۱۸	لطیف	۱۰۸۰ھ	ظفرنامہ
۱۹	افضل	"	محی الدین نامہ
۲۰	نوری	"	
۲۱	کاظم	"	
۲۲	مرزا	"	
۲۳	شاطی	"	

بیجاپور۔ بیجاپور کے شعراء اور ان کے تصانیف کی فہرست یہ ہے:۔

شمار	نام شاعر	زمانہ	تفصیل تصانیف
۱	شاہ میران جی	۸۹۰ھ	خوش نامہ، خوش نغز، شرح مرغوب القلوب
۲	ابراہیم	۹۸۸ھ تا ۱۰۳۷ھ	نورس
۳	برہان الدین جانم	۹۷۵ھ	وصیت الہادی، سک سہیلا وغیرہ
۴	آتشی	۱۰۵۰ھ	؟
۵	مقیمی	۱۰۵۰ھ	مثنوی چندر بدن و مہیار
۶	امین	"	بہرام و حسن بانو
۷	شوقی	"	فتح نامہ نظام شاہ۔ میزبانی نامہ
۸	صنعتی	"	قصہ تمیم انصاری
۹	ملک خوشنود	"	مثنوی ہشت بہشت

شمار	نام شعر	زمانہ	تفصیل تصانیف
۱۰	رستمی	۱۰۵۵ھ	مثنوی خاور نامہ
۱۱	دولت	۱۰۵۵ھ	تکمل بہرام وحسن بانو
۱۲	علی عادل شاہ شاہی	۱۰۶۷ھ تا ۱۰۸۳ھ	کلیات اور مثنوی الجمال
۱۳	نصرتی	۱۰۶۰ھ	گلشن عشق۔ علی نامہ۔ تاریخ سکندری
۱۴	شاہ ملک	۱۰۶۰ھ	شریعت نامہ
۱۵	امین الدین علی	۱۰۷۵ھ	رموز السالکین۔ محبت نامہ وغیرہ
۱۶	ہاشمی	"	یوسف زلیخا
۱۷	مرزا	"	مرثیہ
۱۸	ایاغی	"	نجات نامہ
۱۹	سیدا	"	روضۃ الشہدا
۲۰	شغلی	"	
۲۱	مومن	۱۰۸۰ھ	اسرار عشق
۲۲	قادر	"	غزل
۲۳	شاہ من عرف	"	"
۲۴	معظم	"	شجرۃ الاتقیا۔ گنج مخفی

ادہر گولکنڈہ میں وجہی کی قطب مشتری۔ غواصی کی سیف الملک ابن نشاطی کی پھول بن طبعی کی بہرام وگل اندام۔ غلام عل
کی پدماوت اور لطیف کا ظفر نامہ شہ کار ہیں تو ادہر بیجا پور میں صنعتی کا قصہ تمیم الفاری۔ رستمی کا خاور نامہ۔ نصرتی کی گلشن ع
اور علی نامہ۔ اپنی خوبیوں سے ادب اردو کے جگمگاتے نگیں ہیں۔

ان دونوں سلطنتوں میں مرثیہ گوئی کا بھی آغاز ہوا۔ اس وقت کے مرثیے اپنے سوز وگداز سے خاص اثر پیدا کرتے
اس زمانہ کے مرثیوں سے مجلس عزا میں حقیقی طور پر اشک باری ہوا کرتی تھی۔ ان کا جوہر مرثیہ پن تھا۔ غواصی۔ کاظم۔ م
شاہی اور ہاشمی کے مرثیے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ہم بیان کر چکے ہیں کہ ۱۰۹۷ھ میں بیجا پور اور ۱۰۹۸ھ میں گولکنڈہ فتح ہو کر سلطنت مغلیہ میں شامل ہو گئے۔ اس

..ل شاہی اور قطب شاہی سلطنتوں کا خاتمہ ہوگیا اور اب عالمگیر کی جانب سے یہاں صوبہ دار مقرر ہونے لگے۔ اور سلطنت مغلیہ کا بھی دکن ہی مستقر ہوگیا۔

قطب شاہی پایۂ تخت گولکنڈہ اور عادل شاہی دار الحکومت بیجاپور شاعری کے مرکز تھے لیکن اب مغلیہ دور میں اورنگ آباد نے اس کی جگہ لے لی اس طرح اورنگ آباد نہ صرف سلطنت مغلیہ کا دار الحکومت ہونے کے لحاظ سے امرا اور علما و شعراء کا مرکز بن گیا بلکہ گولکنڈہ اور بیجاپور کے باکمالوں کا بھی ملجا ٹھہر گیا

گولکنڈہ اور بیجاپور کے درباروں سے شعراء اردو کے ساتھ بیحد مراعات کئے جاتے تھے انھیں ان کی تصانیف کا دل صلہ دیا جاتا تھا نہ صرف سلاطین بلکہ امراء دکن بھی اردو کی سرپرستی میں ایک دوسرے پر سبقت لے جایا کرتے .. لیکن مغلیہ دور میں اس قسم کی قدر دانیوں کے کم ہوجانے کے باوجود قابل افراد بلا کسی صلہ یا قدر دانی کی امید کے ..میں شعر و سخن کی داد دینے لگے تھے۔ علاوہ ازیں عالمگیر نے بھی فتح بیجاپور کے بعد دکھنی شاعری کی قدر دانی کی اور نصرتی ملک الشعراء کے خطاب سے مشرف کیا تھا۔

اورنگ آباد کو اورنگ زیب عالمگیر نے سنہ ۱۰۶۲ھ میں اپنا صدر مقام قرار دیا تھا اسی وقت سے اس کی رونق زیادہ ..نے لگی تھی۔ فتح گولکنڈہ و بیجاپور کے بعد اس کی ترقی میں اور بھی اضافہ ہوگیا۔ تمدن و تہذیب کے ساتھ علم و فن میں بھی ترقی ..نے لگی۔ شعر و شاعری کا بھی چرچا بڑھا۔ اس طرح اردو شاعری کے بھی قدم یہاں اچھی طرح جم گئے اور شعراء نے اپنی یادگار بہترین کلام کو یادگار زمانہ چھوڑا۔

سنہ ۱۰۹۸ھ میں تقریباً پورا دکن ..مغلیہ میں شامل ہوا تھا اور سنہ ۱۱۳۳ھ میں حضرت آصفجاہ اول نے اپنی حکومت کی بنا ڈالی اس ..سالہ مدت میں بھی اردو کے کئی ایک شعراء مشہور ہوئے جن کی مثنویاں۔ دیوان اور مرثیے آج تک موجود ہیں

اس زمانہ کے شعراء جن سے ہم واقف ہیں یہاں درج کئے جاتے ہیں۔

شمار	نام	زمانہ	تفصیل و تصانیف
۱	عاجز	سنہ ۱۱۰۰ھ	مثنوی ملک مصر
۲	ضعیفی	سنہ ۱۱۰۰ھ	عشق صادق - ہدایت نامہ
۳	امین	سنہ ۱۱۰۹ھ	یوسف زلیخا

۵ تذکرہ فتوحات موسوم ریاض حسنی مخطوطہ دفتر دیوانی و مال سرکاری نظام

شمار	نام	زمانہ	تفصیل و تصانیف
۴	ذوقی	۱۱۱۰ھ	غوث نامہ۔ مرثیے
۵	وجدی	۱۱۱۵ھ	تحفہ عاشقاں، منطق الطیر باغ جانفزا
۶	بحری	۱۱۱۶ھ	من لگن
۷	اشرف	۱۱۲۵ھ	جنگ نامہ حیدر
۸	عشرتی	۱۱۲۵ھ	دیپک پتنگ۔ نیہ درپن وغیرہ
۹	مجرمی	۱۱۳۰ھ	
۱۰	طالب	"	
۱۱	بیچارہ	"	
۱۲	تمیم احمد	"	
۱۳	فراقی	"	
۱۴	ندیم	"	
۱۵	ولی ویلوری	"	رتن و پدم۔ روضہ بہشت
۱۶	ولی اورنگ آبادی	۱۱۱۹ھ	کلیات

سلطنت آصفیہ کے زمانہ میں اردو کی ترقی کے متعلق یہاں تفصیل کا موقع نہیں ہے۔ ہماری کتاب دکن میں اردو کے تیسرے اڈیشن میں جو زیر طبع ہے اس کے متعلق پوری وضاحت کی گئی ہے۔

نصیر الدین (ہاشمی)

تخلیق اُردو

پوچھنا تاریخ سے پیدائش اردو کا حال
جس زباں کی آفرینش کا تجھے آئے خیال
ملک میں اردو زباں افواج کی بھرتی نہ تھی

کم سنوں سے ہے بزرگوں کی ولادت کا سوال
اور سکے اسباب علل اور فلسفے کو دیکھ بھال
یک بیک الفاظ کی بارش ہوا کرتی نہ تھی

ہند تیرہ سو برس سے مسلموں کا ہے مقام
کس زباں میں ہندیوں کے ساتھ ہوتا تھا کلام
کیا سوال آنکھوں سے ہوتا اور ابرو سے جواب

تاجروں اور صوفیوں اور لشکروں کا ہے قیام
کاروبار باہمی کا کس طرح چلتا تھا کام
گفتگو ہند اور عجم کی تھی کوئی گونگے کا خواب؟

عقل و تہذیب و تمدن متحد تھے سب بہم
دلفریبی سے بتانِ ہند پہنچے تا حرم
لائے سوغاتیں وہ اور ان سے مداراتیں ہوئیں

مجتمع تھے اہل ہند اہل عرب اہل عجم
ہو گئے تھے ایک مل کر کعبہ و بیت الصنم
پہلے مستعمل ہوئے الفاظ پھر باتیں ہوئیں

چند تاجر آئے پھر درویش پھر فوجی نشان
پہلے ہی پنجاب ان چاروں کا لیتا امتحان
اس زباں کا نام ہندی ہو گیا پھر ہندوی

کچھ عرب، کچھ ترک، بعد اونکے مغل تھے پھر پٹھان
پاس جب سب یہ ہوئے پیدا کی ایک جامع زبان
بعد ازاں ہندوستانی، آخرش اردو ہوئی

اہلِ دیں نے کی اسی ہندی میں خدمت دین کی
پند اک منظوم ہے حضرت فرید الدین کی
پڑھ کے مخطوطات یورپ کیجئے گا غور بھی

اور اسی میں سعد نے دیوان کی تدوین کی!
نظم خسرو میں بھی ہے ترکیب اسی آئین کی
کیا نہیں ممکن کہ ہو اس کے سوا کچھ اور بھی

الغرض اردو کا اول مستقر پنجاب تھا
نقطۂ مردم پئے اہل نظر پنجاب تھا
جیسے خارخ کا بڑھے ابرو کی جدول چھوڑ کر
تخم جو الفاظ کے بوئے گئے پنجاب میں

کیونکہ قصرِ ہند کا پہلا ہی در پنجاب تھا
دائرہ تھا دور تک مرکز مگر پنجاب تھا
بڑھ چلا یوں نقش ثانی نقش اول چھوڑ کر
ہر طرف بہتے پھرے وہ جنگ کے سیلاب میں

تھے قلم اس کے بھی تلواروں کیساتھ اسباب میں
دہ بہار جانفزا جب دولت آباد آگئی
ہند کے پودوں میں کچھ ایران کے پیوند تھے
مختلف سب مذہب و تہذیب میں ہرچند تھے
تھے جو دونوں صورت شیر و شکر آمیختہ
بات جو تھی بند بند، اب دوبدو ہونے لگی
بات میں اک بات ہو یہ آرزو ہونے لگی
نثر ہی کے سلسلوں سے نظم کی کڑیاں بنیں
اہل جوہر گوندھ کے اس کو نفس کے تار میں
قدر و قیمت اسکی روز افزوں تھی ہر بازار میں
یہ جواہر قابلِ انگشتری ہونے لگے
انقلابِ دہر نے بدلا جو رنگ آسماں
مثنوی پر مرثیہ پڑھنے لگے جب نوحہ خواں
ضبط رہتا کب تک آخر، اور کیوں رہنے لگا
حسن نے جرأت دلائی، عشق کے دفتر کھلے
منظر اردو پہ جب نظارے کے زیور کھلے
ساغر اُردو میں اب خطِ جلی پیدا ہوا
ہاں دکنی کے دل پہ سایہ تھا علی کے نور کا
ظرف موسیٰ کا دیا تھا حق نے، دل منصور کا
ایسی معراج ایسے اعجاز، ایسی امت پا گئے
اہل دہلی کو دکنی سے کچھ ملا حسن بیاں
شاہ سعد اللہ گلشن نے کئے نکتے عیاں
خل رنگین و فغاں و شاہ حاتم آبرو

سینچا دہلی کی فضا نے شبنم شاداب میں
بیل اوسکی بڑھ کے گجرات و دکن پر چھا گئی
جوڑ ان دونوں میں گویا نیشکر کے بند تھے
پھر بھی انسانی تمدن کے تو سب پابند تھے
مدھ بھرے ہونٹوں سے رس ٹپکا تو وہ تھا ریختہ
بے تکلف بیجا با گفتگو ہونے لگی
قید آزادی میں ہو یہ جستجو ہونے لگی
اس قدر بکھرے یہ موتی خود بخود لڑیاں بنیں
لے گئے بھر بھر کے موتی دامنِ گفتار میں
تھی رسا دربار میں پوچھی گئی سرکار میں
عادلی و قطب شاہی مشتری ہونے لگے
اٹھ گئے دنیا سے گجرات و دکن کے قدرداں
سوز سے پیدا کیا جذبات نے ساز فغاں
حسن اپنے عشق میں خود ہی غزل کہنے لگا
عشق نے کھولی زباں تو حسن کے جوہر کھلے
پھر دلی جذبات کے بھی میکدے کے در کھلے
میکشان ریختہ میں ایک ولی پیدا ہوا
رشتۂ الہام تھا جبریل سے بھی دُور کا
اور ادھر معمورۂ دلی پہ عالم طور کا
آ کے دہلی میں ولی گویا نبوت پا گئے
اہل دہلی سے دکنی کو کچھ ہوا فیض زباں
ہم سخن تھے دہلوی و اکبر آبادی وہاں
اور مظہر ناجی و یکرنگ و مضمون آرزو

سادگی تھی ریختہ کی مقتضائے کمسنی
بندشوں سے عہدِ طفلی تک تو آزادی رہی
ولولے سودا کے تھے سب سلسلے زنجیر کے

مثنوی کہدی حسن نے بے نظیر و بے بدل
ذوق کا شوق زباں دانی ہوا ضرب المثل
پھیر کے غالب نے رُخ سجادۂ تخئیل کا

دیگئے تھے کیا سبق وہ شاعرانِ ماسبق
لیکن افسوس اب جو الٹا دورِ گردوں نے ورق
منتشر اہلِ سخن، اہلِ زباں ہونے لگے

خاک و خوں میں مل گیا اس طرح دہلی کا چمن
شامِ غربت سے بھی کچھ تاریک تھی صبحِ وطن
کرچکا تھا زرِ شجاع الدولہ کی جو آرزو

جب یہاں یہ لوگ آئے اور ہی کچھ رنگ تھا
سادہ کاری کا نگیں بے نقشِ زینت تنگ تھا
یہ نگینہ جب ترشوایا تو ضو دینے لگا

جس قدر پہلو تھے اس کے سب کے سب روشن ہوئے
خال و خط ابابِ زینت کے سبب روشن ہوئے
خود نمائی کے لئے خود بینیاں پیدا ہوئیں

گو یہاں موجود تھے پہلے سے چند اہلِ کمال
میر کو بھی کھینچ لایا قدر دانی کا خیال
اپنی اُردو کے تحفظ میں تھے گویا کم سخن

میر پر گزرے تھے اتنے حادثاتِ رنج و غم
ہر نظر اک متنِ غم تھی، ہر نفس شرحِ ستم

بھولی بھالی شکل و صورت سیدھی سادھی بات تھی
پھر جوانی کا جنوں ہمراہ لایا قید بھی
عشق کی دیوانگی تھی اور نشتر میر کے

درد نے موزوں کئے پُر درد نالے برمحل
کعبۂ معنی بنا مومن کا ہر بیت الغزل
اک نیا میخانہ کھولا بادۂ تخئیل کا

ان ادیبوں پر جو روشن کر گئے چودہ طبق
ہو گیا برباد دہلی کا وہ سب نظم و نسق
طائرانِ خوش نوا بے آشیاں ہونے لگے

رہ گئے گلہائے خلعت پوش بے گور و کفن
شمعِ کشتہ بن کے نکلے بزم آرائے سخن
آہ وہ سودا خود آیا بن بلائے لکھنؤ

دیکھ کر ہر جوہری رنگینیوں کو دنگ تھا
صیقلِ دینا سے اب خورشید کا ہم رنگ تھا
لکھنؤ کی بزم میں آیا تو لَو دینے لگا

رہ گئے تھے رُخ جو تاریکی میں اب روشن ہوئے
آئینہ دیکھا تو رخسارِ ادب روشن ہوئے
سادگی جاتی رہی رنگینیاں پیدا ہوئیں

مصحفی کا ذکر ہے مشہور اور انشا کا حال
یہ وہی تھے میر جن سے بات کرنی تھی محال
کس کی منہ میں تھی زباں، انسے جو ہوتا ہم سخن

تھے بجائے روح و دم رگ رگ میں اب درد و الم
ہر سخن اک نامہ بر تھا دردِ دل کا تازہ دم

رنگ شوخی لائے وہ کیا شعر کے مضمون میں
جس کا دل ڈوبا ہوا ہو آپ اپنے خون میں

لکھنؤ اس وقت تھا عیش و طرب کا نغمہ گاہ
زمزموں میں ان کے نالوں کو کہاں ملتی پناہ

عاقبت بینی سے لیکن قدرداں تھا بادشاہ
میر کی نازک مزاجی سے بھی کرتا تھا نباہ

پھر جب آ پہونچی یہاں بھی گردش لیل و نہار
ہے جبھی سے شور بلبل جوش گل کی یادگار

انتزاع ملک پر جن کو ہوا رنج و تعب
انکے رنج و غم پہ بیدردوں کو ہے غیظ و غضب

نخل ماتم سے جو بیگانہ ہے گلچین طرب
پوچھتا ہے نے سے ہنس ہنس کر وہ نالوں کا سبب

یہ وہ سمجھے ہمنشینوں سے ہو جو چھوٹا ہوا
گل ہے کیوں فسردہ اپنی شاخ سے ٹوٹا ہوا

الغرض اب لکھنؤ کیا تھا ادب کا اک چمن
کھل گیا گویا نیا اک درسگاہ علم و فن

کیوں نہ کھلتا جمع تھے جب ایسے ایسے اہل فن
سوز و انشا مصحفی و میر، سودا و حسن

ان ادیبوں کا جہاں مسکن بنے مدفن بنے
کیا عجب گر وہ ادب کا مرکز و مخزن بنے

اس فضا میں طائران فکر کے پر کھل گئے
پر کھلے کیا وسعت اردو کے دفتر کھل گئے

فطرت سادہ پہ اب صنعت کے زیور کھل گئے
کھل گئی قسمت جواہر کی کہ جوہر کھل گئے

چشمے جو پنجاب کے دریا تھے دلی کے لئے
لکھنؤ والوں نے اس دریا سے موتی رولیے

جو یہ سکے تھے انھوں نے دیکھ کر کھوٹے کھرے
سکے سلیپٹ لے کے دارالضرب کو واپس کئے

یعنی جو الفاظ تھے معیار سے اترے ہوئے
جاے ہے اور آئے ہے یا جا پڑے اور آ پڑے

اس سے ثابت ہے کہ یہ داخل فصاحت میں نہیں
نج میں مستعمل ہیں تصنیف و اشاعت میں نہیں

دیکھی انگریزوں نے جب یہ معرکہ آرائیاں
جی میں سوچے گھیر لے گی ملک بھر کو یہ زباں

قسمت اقلیم میں اب کرنے لگے صف بندیاں
ہو چکا تھا زور نظم و نثر پہلے ہی یہاں

فوج انشا کی کماں انشا کو اول دے گئی
لکھنؤ میں پہلے اردو سے قواعد لی گئی

میر مجلس نثر کا فضلی تھا وہ مجلس لکھی
باغ اردو کی بہار آرائش محفل ہوئی

چار درویشوں کی بپتی میر امن سے سنی
اک عجب افسانہ تھا نثر سرور لکھنوی

ناشر اتنے ہو گئے اخبار ناشر ہو گئے
آخرش اردو میں سرکاری دفاتر ہو گئے

لکھنؤ والوں نے جو اصلاح میں تقدیم کی
جس نظام خاص پر جس طرح کی تنظیم کی

مصحفی نے اپنے شاگردوں کو جو تعلیم کی
صاف ہو کر اب زباں کے فقرے دلکش ہوگئے

موجد اپنے رنگ کے تھے شاعرانِ بینظیر
بندشِ مضموں میں ناسخ اور رہنوٹ میں وزیر
مرثیے کے مجتہد مرزا دبیر و میر انیس

تھے روانی کے مجدد بحر اور کیف و صبا
فرد تھے رنگ تغزل میں رشید باصفا
رند و برق و درخشاں، نجم، تلق، فضل، نسیم

اور شہروں میں بھی تھے اہل سخن شہرت پذیر
شیفتہ سالک یقین۔ ممنوں، شہیدی و صغیر
نظم ہوں کس طرح موتی اسقدر بکھرے ہوئے

جب ہمارے ہاتھ سے ہندوستاں جاتا رہا
جوشِ دل جاتا رہا۔ زورِ زباں جاتا رہا
وہ ستارے کیا چھپے وہ رات ہی جاتی رہی

شاعری کچھ کم نہیں لیکن اثر کچھ بھی نہیں
زوردار الفاظ ہیں معنی مگر کچھ بھی نہیں
ذکر کے قابل نہیں ناواقفوں کے تذکرے

ہاں مگر ہے رازدارانِ زمانہ کا خیال
پہونچے دربارِ دکن میں کچھ حکیمانِ شمال
ضعف میں اس چارہ سازی سے کمی تو ہوگئی

اس طرف تو زندہ کرتا ہے دکن مردہ علوم
شاعرانِ قدر رس و نثر خود روکی ہے دھوم
عشق علمی کیجئے یا حسن تجارت مانئے

ملک کے ہر ناظم و نثار نے تسلیم کی
جملہ منسوخات ناسخ نذرِ آتش ہوگئے

بات میں بیباک جرأت۔ فکر میں آزاد و میر
عشق میں سرگرم آتش جامعیت میں امیر
اک بلاغت میں لطیف اور اک فصاحت میں نفیس

درد اور تاثیر میں ہمسر تعشق کا نہ تھا
قابلِ ذکر اور بھی استاد ہیں ان کے سوا
عاشق و منظر، جلال و شاد و جاوید و حکیم

جیسے فرد کانپوری۔ اکبر آبادی نظیر
قدر و مجروح و حضور و داغ و شاد اکبر منیر
کس سے کہئے لٹ گئے کتنے گہر بکھرے ہوئے

مثل سکوں کے ہمارا ہر نشاں جاتا رہا
گم ہوا عشق ادب حسن بیاں جاتا رہا
وہ سخنور کیا گئے وہ بات ہی جاتی رہی

ہے بظاہر علم، باطن میں ہنر کچھ بھی نہیں
چشم تصویر آنکھ ہے گویا نظر کچھ بھی نہیں
شاعری پر غیر شاعر کر رہے ہیں تبصرے

کرتی ہے تاریخ بیماران ماضی کو بحال
کھل گئے ہیں چند اُردو محکموں کے ہسپتال
صحت کامل نہو، پر زندگی تو ہوگئی

اس طرف پنجاب میں ڈوبے ہوئے نکلے نجوم
اور اردو کی کمک پر ہے رسالوں کا ہجوم
کچھ بھی ہو ناطق مگر یہ بھی غنیمت جانئے

ناطق۔ لکھنوی۔

لکھنؤ کی شاعری لکھنؤ اسکول کے قیام سے قبل

(یعنی)

اودھ کا سب سے پہلا جذبات نگار شاعر

(نواب آصف الدولہ بہادر)

ولادت ۱۱۶۱ھ تخت نشینی ۱۱۸۸ھ وفات ۱۲۱۲ھ ہجری

نواب آصف الدولہ، فرمانروایان اودھ میں اپنی بعض خصوصیات کی وجہ سے بہت مشہور فرمانروا ہوا ہے لیکن یہ شاید بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ اسکی سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت اسکا پاکیزہ ذوق سخن تھا

پانچ لاکھ روپیہ خرچ کرکے نجف اشرف میں نہر آصفی جاری کرانا، شریف مکہ کی ایک لاکھ روپیہ سے مدد کرنا، اسی طرح بیشمار دولت انعام واکرام میں تقسیم کردینا غلط بخشیوں کی تاریخ میں اسے خلعت دوام بخش سکتا ہے اور لکھنؤ کا وہ عظیم الشان عزاخانہ جو اسکے نام سے منسوب ہے ممکن ہے مذہبی نقطۂ نظر سے بھی اس کی یاد کو کبھی فراموش نہ ہونے دے، لیکن جو چیز حقیقی معنی میں اس کے نام کو زندہ رکھنے والی ہے وہ اسکی سخن سنجی ہے جسکا ذکر اور تو اور خود حضرات لکھنؤ نے بھی کبھی نہیں کیا،

شاہ عالم بادشاہ دہلی کے پندرھویں سنہ جلوس میں اودھ کی مسند وزارت پر ۱۱۸۶ھ میں متمکن ہوا اور ۱۲۱۲ھ بعارضۂ استسقا انتقال کیا اس چھبیس ۲۶ سال کے طویل عہد وزارت میں اُس نے کیا کیا حرکتیں کیں، کن کن خباثت میں مبتلا رہا، عیش وعشرت کی بدمستیوں میں ملک کی دولت کس بدتمیزی سے اڑائی، ہمیں ان باتوں سے کوئی سروکار نہیں ان سے بحث کرنا موضوع زیر بحث سے علٰحدہ ہے لیکن یہ جستجو ہمارے لیے ضروری ہے کہ سرزمین اجودھیا میں جہاں اسکے باپ شجاع الدولہ کے زمانہ میں بھی کوئی شاعر پیدا نہ ہوا تھا اس میں یہ اہلیت کیونکر پیدا ہوگئی؟

دہلی و نواح دہلی کے شعراء میں سب سے پہلے اشرف علی فغاں نے ہجرت اختیار کی اور ۱۱۶۸ھ میں اپنے چچا ایرج خاں کے پاس مرشد آباد گئے وہاں سے لوٹے تو فیض آباد آئے (شجاع الدولہ کا زمانہ تھا) اور پھر عظیم آباد چلے گئے جہاں ۱۱۸۶ھ میں یعنی آصف الدولہ کی تخت نشینی سے

ایک سال قبل انتقال کیا، ان کے بعد ضیاء الدین ضیا کا شجاع الدولہ کے زمانے میں فیض آباد جانا پایا جاتا ہے لیکن یہاں انکی کس مپرسی کا حال اس سے ظاہر ہے کہ وہ نہ فیض آباد میں رہ سکے نہ لکھنؤ میں بلکہ عظیم آباد جاکر شتاب رائے کے بیٹے کا دامن پکڑا اور وہیں انکا انتقال ہوا، ضیا کی ولادت و وفات کی کوئی تاریخ تذکروں میں درج نہیں ہے لیکن یہ ثابت ہے کہ میر ضیا سودا کے ہمعصر تھے میر حسن کے استاد سودا کا سنہ ولادت ۱۱۲۵ھ ہے اس لیے اگر میر ضیا کا سنہ ولادت زیادہ سے زیادہ ۱۱۵۰ھ قرار دیا جائے اور ۱۱۶۵ھ میں فیض آباد آنا تو اس کے معنی یہ ہونگے کہ آصف الدولہ کی عمر اس وقت زیادہ سے زیادہ چودہ سال کی رہی ہوگی۔

میر ضیا کے بعد میر حسن فیض آباد گئے اور لکھنؤ بھی آکر رہے لیکن شجاع الدولہ اور آصف الدولہ کی کوئی توجہ حاصل نہ کرسکے کیونکہ انکا تعلق اگر رہا بھی تو لکھنؤ میں نواب سالار جنگ یا اُن کے بیٹے مرزا نوازش علی خاں سے اور وہ بھی اسدرجہ تنگی و عسرت کیساتھ کہ وہ خود لکھتے ہیں

"بہرحال بہر نوع گزراں می نمائیم"

اس لیے ظاہر ہے کہ آصف الدولہ کو ان تینوں شاعروں میں سے کسی کی صحبت نصیب نہیں ہوئی۔ اس کے بعد جب وہ تخت نشین ہوا تو بیشک سودا، میر، سوز، مصحفی، انشاء بھی لکھنؤ پہونچے لیکن اس کے کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں نہ سودا کا رنگ ہے نہ میر کا نہ مصحفی کا اتباع ہے نہ انشاء کا البتہ سوز کی خصوصیات ضرور پائی جاتی ہیں سو ان کو بھی ہم سوز کا فیض صحبت اسلیے نہیں کہہ سکتے کہ یہ استادی شاگردی رہی کتنے دن!

سوز کا سنہ ولادت کسی تذکرہ نویس نے نہیں لکھا لیکن تاریخ وفات ۱۲۱۳ھ پر سب کا اتفاق ہے بعض نے عمر ۷۰، ۸۰ کے درمیان بتائی ہے بعض نے ۹۰ سال بہرحال یہ یقینی ہے کہ تقریباً ۸۰ سال کی عمر انھوں نے پائی تھی اور اسی لیے ۱۱۳۱ھ کے لگ بھگ پیدا ہوئے ہونگے سوز اول لکھنؤ کب پہونچے اسکی بھی صحیح تاریخ متعین نہیں ہوسکتی آزاد نے لکھا ہے کہ ۱۱۸۱ھ میں لباس فقر اختیار کیا اور لکھنؤ چلے گئے آزاد نے غالباً میرزا علی لطف کے تذکرہ کو دیکھ کر لکھا ہے لیکن لطف کے بیان سے یہ کہیں واضح نہیں ہوتا کہ وہ اسی سال لکھنؤ گئے البتہ لباس فقر اختیار کرنے کا ذکر کیا ہے بظاہر یہ تو صحیح معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس سال دہلی سے روانہ ہوئے اور سب سے پہلے فرخ آباد مہربان خاں رند کے پاس گئے لیکن فرخ آباد سے لکھنؤ و مرشد آباد کب گئے اس کا پتہ کچھ نہیں چلتا بعض تذکروں سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۱۲۱۱ھ میں مرشد آباد گئے اور اسی سال لکھنؤ واپس آئے تو آصف الدولہ شاگرد ہوئے اور چندماہ کے بعد انتقال کر گئے بعض تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ فرخ آباد چھوڑ کر یہ لکھنؤ آئے اور جب انکا رنگ یہاں نہ جما تو مرشد آباد چلے گئے اور وہاں سے پھر ۱۲۱۲ھ میں واپس آئے۔ اگر یہ کہا جائے کہ آصف الدولہ نے سوز کی شاگردی اسی وقت اختیار کرلی تھی جب وہ فرخ آباد سے پہلی مرتبہ لکھنؤ پہونچے تھے تو اس کا یقین نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اگر نواب ان کا شاگرد ہوجاتا تو یہ بددل ہوکر مرشد آباد کیوں چلے جاتے،

میرزا علی لطف نے اپنے تذکرہ گلشن ہند میں جو اس عہد کا نہایت مستند تذکرہ ہے نہ سوز کے تذکرہ میں آصف الدولہ کے استاد

ہونے کا ذکر کیا ہے نہ آصف الدولہ کے بیان میں سوز کے شاگرد ہونے کا۔ انھوں نے سوز کے متعلق صرف اس قدر لکھا ہے کہ شاہ عالم کے اٹھارویں سنہ جلوس میں لباس فقر اختیار کیا۔ لکھنؤ میں توکل وقناعت کی زندگی بسر کرتے تھے ۱۲۱۲ھ میں مرشدآباد گئے اور اسی سال لکھنؤ واپس آکر انتقال کیا۔ اسی طرح تذکرۂ بزم سخن (عوض علیخاں) میں بھی آصف کی شاگردی کا ذکر نہیں پایا جاتا

الغرض مجھے اسکے ماننے میں تامل ہے کہ آصف الدولہ سوز کے شاگرد تھے۔ زیادہ سے زیادہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ آصف الدولہ ان کے کلام کو پسند کرتا تھا اور انکی شاگردی اختیار کرنے سے قبل اسکا انتقال ہوگیا۔ یا یہ کہ اگر شاگردی کا سلسلہ رہا بھی تو صرف چند دن جو نہ ہونے کے برابر ہے یہ درست ہے کہ اسکا کلام سوز کے رنگ کا ہے اور ممکن ہے اس بنا پر کوئی شخص یہ کہے کہ آصف الدولہ کا سارا کلام سوز ہی کا کلام ہے اور اسی لیے اب سوز کا کلام بہت کم نظر آتا ہے لیکن یہ کہنا بالکل غلط ہوگا کیونکہ سوز نے جب کہا ہمیشہ سہل زمینوں میں اور مشکل ردیف وقوافی اختیار ہی نہیں کیے۔ برخلاف اسکے آصف الدولہ کے یہاں ایسی ایسی مشکل زمینیں نظر آتی ہیں کہ شاید ہی کسی دوسرے شاعر کے کلام میں نظر آئیں۔ اور میرے نزدیک یہ اثر تھا مصحفی اور انشا کی صحبت کا۔

بہرحال آصف الدولہ نے سوز کی شاگردی اختیار کی ہو یا نہ کی ہو یہ بالکل یقینی ہے کہ وہ قدرت کی طرف سے نہایت پاکیزہ ذوق سخن لے کر آیا تھا اور اس میں سوز یا کسی اور کی صحبت کو دخل نہ تھا۔

آصف الدولہ کی ماں تاریخ اودھ کی وہ مشہور خاتون ہے جسے بہو بیگم کے نام سے آج لکھنؤ کا ہر وثیقہ دار جانتا ہے۔ بہو بیگم سسرال کا لقب تھا ورنہ انکا نام امۃ الزہرا بیگم تھا اور موتمن الدولہ محمد اسحاق خاں شوستری کی بیٹی تھیں۔ موتمن الدولہ محمد شاہ بادشاہ دہلی کے زمانے میں میر آتش کی خدمت پر مامور تھے اور بادشاہ نے ان کی لڑکی امۃ الزہرا بیگم کو اپنی بیٹی بنایا تھا اور شجاع الدولہ کو بیاہ دیا تھا امۃ الزہرا بیگم کا نشو ونما محمد شاہ کے اس دور میں ہوا تھا جب بال کے ذرہ ذرہ سے رنگینی وشاعری ابلتی تھی اسلیے کوئی وجہ نہیں کہ وہ اس ماحول سے متاثر نہ ہوئی ہوں اور ان کے بیٹے آصف الدولہ میں یہ اثر منتقل نہ ہوا ہو

آصف الدولہ کی شاعری کی عمر کیا تھی یا یہ کہ کس عمر میں انھوں نے شاعری کی ابتدا کی اسکے متعلق تاریخیں اور تذکرے ساکت ہیں لیکن کلام کی کثرت کو دیکھ کر یہ ماننا پڑتا ہے کہ یہ شوق انھیں عنفوان شباب ہی سے شروع ہوگیا ہوگا

اُن کا جو قلمی کلیات میری نظر سے گزرا ہے بڑی تقطیع کے سیکڑوں صفحات کو محیط ہے اور تمام اصناف سخن اس میں پائے جاتے ہیں سب سے پہلے تقریباً ایک ہزار سے زیادہ اشعار کی مثنوی، حمد اور نعت ومنقبت میں ہے، اس کے بعد چوبیس پچیس غزلیں فارسی کی ہیں اور مختلف اساتذہ فارسی واردو کی غزلوں پر تضمینیں۔ جن شعرا کی غزلوں کی تضمین کی ہے ان میں خاص خاص یہ ہیں میلی، سعدی، نظیری، حافظ، سودا، سوز، احسن، میر، جرأت، درد، مصحفی، ضیا، اور سوزاں[1]،

---

[1] تخلص تھا نواب احمد علی خاں شوکت جنگ کا جو نواب افتخار الدولہ مرزا علی خاں کا بیٹا اور نواب سالار جنگ کا بھتیجا تھا

اس کے بعد ایک نظم مسلسل "مثنوی حضور" کے نام سے ۲۶ اشعار کی ہے جس میں کسی لشکر کا حال بیان کیا گیا ہے اس کا پہلا شعر یہ ہے

آصف اک جی میں آئی ہے یہ چُھل
لکھیے لشکر کا حال جسنر وا در کُل

ایک مثنوی مرزا وزیر علی خاں بہادر کی شادی پر ہے جس کو انھوں نے اپنا بیٹا بنایا تھا اور دوسری مختصر مثنوی وزیر باغ کی تعریف میں ہے۔ ایک حصہ ہزل و ہجو کا بھی ہے جس میں میر جھجو، میر مہتوا اور کربلا بھانڈ کا خاکہ ایسے فحش الفاظ میں اڑایا گیا ہے کہ ان کو کوئی سنجیدہ شخص پڑھ نہیں سکتا۔

کربلا کی ہجو کے چند اشعار جو بہت سنجیدہ ہیں نمونتاً ذیل میں درج کیے جاتے ہیں ؎

نقل طرفہ ہے اک کربلا کی — آئی بے اختیار جس پہ ہنسی
پاک ساون کی رات اندھیاری — جا پڑا اپنی ماں پہ یکبارگی
ٹانگیں لیں اس چڑیل کی جو اٹھا — بولی وہ تجھ کو خیر ہے بیٹا
تب وہ ماں کا فلانا یوں بولا — میں جو تیری ازار کو کھولا

نہ بگڑ مجھ سے میں سنورتا ہوں
باپ اپنے کی نقل کرتا ہوں

خیر یہ ہزل و ہجو تو کوئی ایسی چیز نہیں جس پر حیرت کی جائے کیونکہ آصف الدولہ کی عمر ہی اس قسم کی بیہودگیوں میں صرف ہوئی لیکن تعجب تو اُس وقت ہوتا ہے جب اس کے بعد غزلیات کا حصہ سامنے آتا ہے کہ شروع سے لیکر آخر تک سلاست و روانی کے سوا اور کچھ ہی نہیں

فارسی غزلیں کم ہیں لیکن جس رنگ کی ہیں اس کا حال ذیل کے اشعار سے واضح ہوگا۔

پیوستہ کسے کہ کامران است — آں آصف خسرو زمان ست
دل بُردن و باز رو ندادن — ایں رسم کدام دلستان ست

تاثیر آہ بالب افغاں رسید و ماند — دست جنوں بچاک گریباں رسید و ماند

تضمینوں کے لیے جن اساتذہ اور ان کی جن غزلوں کا انتخاب کیا ہے اس سے تو خیر آصف الدولہ کی پاکیزگی ذوق ظاہر ہوتی ہی ہے لیکن تضمینیں جس خوبصورتی سے کی ہیں ان کی داد نہیں دی جا سکتی۔

تیملی کے ایک شعر کی تضمین ملاحظہ ہو۔

بہتیرا چاہا دل سے بھلاؤں ٹک اسکی یاد　　　جیوں جیوں خیال کم کیا الفت ہوئی زیاد

جوں راہبر میں دیکھا اسے کرکے دل کو شاد　　　گفتم بیا بوعدہ وفاکن جواب داد

خوش برفریب وعدۂ ما دل نہادۂ

سعدی کے ایک شعر پر فارسی کی تضمین دیکھیے :-

صد چشم بر خم خود کشودیم　　　بر پائے تو روئے عجز سودیم

بیجا نہ چنیں وفا نمودیم　　　آخر من و تو نہ دوست بودیم

عہدِ تو شکست و من ہمانم

حافظ کی غزل پر تضمین کی ہے، اس کے ایک شعر پر فارسی کے مصرعے ملاحظہ ہوں :-

اگرچہ پیش تو مجنون و بیخود و رندم　　　مزن بغفلت من طعنہ ناسزا بہیم

خوشم ز بیخودی خویشتن کہ او ہام　　　سحر کرشمۂ وصلش بخواب می دیدم

زہے مراتب خوابیکہ بہ ز بیداریست

حافظ کی ایک اور غزل پر تضمین کی ہے ایک شعر کے مصرعے ملاحظہ ہوں :-

چہ گویم از من احوال خاک گردیدن　　　سر از جفائے تو لے جان من نہ پیچیدن

تعجب ست ز من سرگزشت پرسیدن　　　ز نقش چہرۂ عاشق ہمی تواں دیدن

کہ ساکنان درِ دوست خاکسارانند

سوز کی بہت مشہور غزل ہے جس کا مطلع ہے :

مرا جان جاتا ہے یارو سنبھالو!　　　کلیجہ میں کانٹا لگا ہے نکالو!

اسی غزل کا ایک اور شعر ہے

کہو ایک بندہ تمہارا مرے ہے　　　اسے جان کندن سے چلکر بچالو

آصف الدولہ نے پوری غزل تضمین کی ہے لیکن متذکرۂ بالا دو شعروں پر جو گرہیں لگائی ہیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں

ارے مجھسے اُو دوستی کرنے والو　　　کسی سے مرے دردِ دل کی دوا لو

کسی طرح اب کی مجھے تم بچالو　　　مرا جان جاتا ہے یارو سنبھالو

کلیجہ میں کانٹا لگا ہے نکالو

کہو کوئی جی تم پہ صدقو کری ہے   کہو کوئی تمھارا ہی دم بس بھرے ہے
کہو کوئی مرنے پہ دل کو دھرے ہے   کہو ایک بندہ تمھارا مرے ہے

اسے جان کندن سے چلکے بچا لو

تضمین کی خوبی یہ ہے کہ وہ اصل شعر کے ساتھ مل کر بالکل ایک چیز ہو جائے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ آصف الدولہ اسمیں کتنا کامیاب ہوا ہے سادگی و بے تکلفی، روانی و بیساختگی آصف کے ہر کلام میں نظر آتی ہے چند رباعیاں ملاحظہ ہوں:۔

جب کوئی کسی کو یار کلپاوے گا   یہ یاد رہے وہ بھی نہ کل پاوے گا
اس دور مکافات میں سن اے غافل   بیداد کرے گا آج کل پاوے گا

کیا تجھ سے کہوں کہ کسطرح گزرے ہے   کیا دوں میں پتہ کہ اسطرح گزرے ہے
بالفرض اگر کہا تو پھر کیا حاصل   گزرے ہے خیر جسطرح گزرے ہے

آصف جو گلی صنم کی ہم آتے ہیں   ظلم و ستم و جور اور آفاتیں ہیں
ہر شب یہی عہد ہے کہ جانا چھوڑیں   پر تحفگی یہ کہ روز پھر جاتے ہیں

یوں جی میں تمہارے ہو سمائی تو خیر   ہم جانتے ہیں آپ ہی یہاں کیجئے سیر
خلقت ساری پڑی پھرے میں ہی جاؤں   اللہ رے تیرا بغض! اللہ رے بیر

فرقت کا ستم تو مجھ سے سہنا معلوم   جو گزرے ہے دل پہ تجھسے کہنا معلوم
وابستہ ہے تجھسے زندگانی اپنی   گر تو ہی چلا تو جی کا رہنا معلوم

ہر روز شب ہجر کا وسواس رہے   ہر رات کو روز ہجر کا پاس رہے
یہ بے چینی تو اپنی جاتی ہے ابھی   آصف کنے سے نہ جائے تو پاس رہے

ذیل کی دو رباعیاں کس قیامت کی لکھ گیا ہے :۔

ہر لحظہ تری گلی میں رو جاتا ہوں صبر و دل و دین و ہوش کھو جاتا ہوں
دیکھوں ہوں اِدھر اُدھر کہ جب کوئی نہیں چپکے سے کہیں بیٹھ کے رو جاتا ہوں

آصف مرا عشق جوں جوں مشہور ہوا توں توں بت مغرور وہ مغرور ہوا
میں کاہے کو چاہتا تھا رسوا ہونا پر کیا کروں دل کے ہاتھوں مجبور ہوا

آپ نے دیکھا کہ رباعیوں میں کتنا پختہ رنگ تغزل رچا ہوا ہے اور زبان کی خامی بعض بعض جگہ کتنا لطف دیجاتی ہو اگر انہیں اشعار کو اُٹھا کر آپ اسکی غزلوں میں شامل کر دیں تو کوئی فرق محسوس نہ ہوگا

جیسا کہ ہم نے ابھی ظاہر کیا، آصف کی زبان نہایت سلیس، انداز بیان حد درجہ سادہ، جذبات ہلکے قسم کے عاشقانہ ہیں اور اس کا رنگ شاعری "گفتگو کرنے" کی حد سے آگے نہیں بڑھتا اور ظاہر ہے کہ ایسے شاعر کے کلام میں دقت مضامین یا بلندی مفہوم ڈھونڈھنا بیکار ہو لیکن ردیف و قوافی کے سلسلہ میں اس نے اپنی دشوار پسند طبیعت کے سارے حوصلے نکال لیے چنانچہ بعض ردیف و قوافی ملاحظہ ہوں

جواب تلخ، حساب تلخ، لیکن شعر میں وہی سادگی ہے :۔

کم ہووے یا الٰہی کہیں یا یہ مر رہے لگتا ہے اب تو نالۂ دل بحساب تلخ

صنم یا قسمت، عجم یا قسمت، اس زمین کا ایک شعر ملاحظہ ہو :۔

کوچہ گردی سے اسے شوق ہی لیکن گاہے اس طرف کو نہیں رکھتا وہ قدم یا قسمت

گفتگو آتش کا پرکالہ، روبرو آتش کا پرکالہ، اس سخت و سنگین زمین میں کاوش دیکھیے :۔

عجب شوخی، عجب گرمی عجائب حسن ہی واللہ نہ آتش تو، نہ شعلہ تو، نہ تو آتش کا پرکالہ

با دام لذیذ، ناکام لذیذ، اس زمین کا ایک شعر ہے :۔

دوستو! عشق میں کچھ چیز نہیں بھاتی ہے ورنہ کس کو نہ لگے خواب اور آرام لذیذ

اسی ردیف میں بحر و قافیہ بدل کر لکھتے ہیں :۔

جو غمزدہ ہو ترے عشق کا وہی جانے کہ کیا مزہ کی ہے غم کی بھی داستانِ لذیذ

اسی طرح کی سنگلاخ زمینیں خدا جانے کتنی اس نے پیدا کیں اور کسی ایک میں بھی اپنا رنگ نہیں چھوڑا غزلوں کا حصہ کئی سو صفحات پر حاوی ہے اور مشکل سے کسی غزل میں دو چار شعر ایسے ہونگے جو انتخاب میں نہ آسکیں

یقیناً آصف کے کلام میں درد کے جذبات کی گہرائی یا میر کے سوز و گداز کی برشتگی نہیں پائی جاتی، لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ معاملات محبت اور واردات الفت سے وہ کسی جگہ نہیں ہٹا۔ وہی سہل و سرسری اظہار الفت وہی سادہ بیان ہجراں اور وہی تمام باتیں جو عام طور پر دنیائے محبت میں شکر و شکوہ کے طور پر بیان کی جاتی ہیں آصف کے کلام کی خصوصیات ہیں۔

محبوب کے سامنے حرف مدعا لب تک نہ آسکنے کا ذکر تمام شعراء نے کیا ہے چنانچہ میر کا یہ شعر مشہور ہے

کہتے تو ہو یوں کہتے یوں کہتے جو وہ آتا　　　کہنے کی ہیں سب باتیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

آصف نے اس حقیقت کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

سب مجھی سے کہتے ہیں تو اس سے مطلب عرض کر　　　جب زباں یاری نہ دے تو عرض مطلب کیا کروں

اس غزل کا مقطع ملاحظہ ہو:-

جان و دل تیار کر رکھوں نثار اس کا دے　　　بے خبر آصف وہ آجاوے ادھر جب کیا کروں

کس قدر لطیف جذبہ ہے اور کتنے پُر لطف پیرایہ میں ظاہر کیا ہے،

غیر کے ساتھ محبوب کو دیکھنا عاشق کے لیے ستم ہے لیکن یہ بھی نہیں ہوسکتا کہ اسکو دیکھے نہیں آصف اس کشمکش کو یوں ظاہر کرتے ہیں

جو دیکھوں غیر سے باہم تو غیرت مارے ڈالے ہے　　　اگر آنکھیں چُراتا ہوں تو الفت مارے ڈالے ہے

اس غزل کے مقطع میں شاعر محبت سے گھبرا کر بیتاب ہوجانے کی کیفیت ملاحظہ کیجیے:-

کہاں کی یہ بلا پیچھے پڑی یارب کہاں جاؤں　　　مجھے تو رات دن یارو محبت مارے ڈالے ہے

ہجر کی تنہائی بہت کٹھن ہوتی ہے لیکن جب محبوب آکر چلا جاوے تو یہ تنہائی سے بھی زیادہ کٹھن اور جنیر ہوجاتی ہے، اور اس خلا کو محسوس کرکے جو بیتابی پیدا ہوتی ہے اسکی تکلیف کی کوئی انتہا نہیں، آصف اس کیفیت کو کس قدر سادہ لیکن پُر سوز انداز میں ظاہر کرتا ہے سہ

کیا حقیقت پوچھتا ہے میری تنہائی کی تو　　　جب کہ میرے پاس سے پیارے ترا جانا ہوا

محبت کی فتادگیاں جن میں کچھ کچھ تمنا بھی شامل ہو قیامت کی ہوتی ہیں اسکی چند مثالیں ملاحظہ ہوں!

کہ پیچھے سے اپنے تو نے مجھ کو عبث اُٹھایا　　　سب تو چلے گئے تھے اک میں ہی رہ گیا تھا

کیسا رو رو کے وہ شب کرتا تھا مذکور ترا　　　وہی بیمار ترا خستہ و رنجور ترا

ہم نے قصہ بہت کہا دل کا　　　نہ سُنا تم نے ماجرا دل کا

یہی حسرت رہی اے جان رہی مرگ تلک　ایک دن تم نے نہ کی ہنس کے کبھی پیار کی بات

معشوق کی اداؤں کا ذکر ہلکی سی کیفیت محاکات کے ساتھ، تغزل کی جان ہے، آصف کے یہاں اس کی بھی بعض مثالیں بہت پاکیزہ ملتی ہیں۔

میں پوچھا اس سے کچھ تجھ میں دغا ہے　تو مُڑ کر، دیکھ کر، ہنس کر کہا "ہے"

مرے احوال کو سُن سُن کے یہ بولا آخر　خوش نہیں آتی ہے آصف مجھے تکرار کی بات

تشبیہ و استعارہ سے ان کا کلام پاک ہے لیکن اگر کبھی کوئی شعر ایسا نکل گیا ہے تو بھی لطف سے خالی نہیں مثلاً

عجب عالم نظر آتا ہے معشوقوں کے رونے میں　ذرا دیکھو تو آصف شمع کے آنسو ڈھلکنے کو

فارسی ترکیبیں ان کے کلام میں کہیں نہیں پائی جاتیں اگر کبھی کوئی ترکیب استعمال بھی کی ہے تو نہایت ہی شگفتہ و صاف مثلاً

ہوا ہے جب سے تو اوجھل ہماری نظروں سے　بسانِ خانۂ غارت زدہ صدا ہیں باز

چونکہ سادگی ان کے ذوق کی خصوصیت ہے اس لیے چھوٹی بحروں میں ان کی کامیابی عجیب ہوتی ہے، چند اشعار ملاحظہ ہوں

ہائے کیا آصف کو وہ دُکھ دے گیا　لے گیا دل لے گیا دل لے گیا

کھُل گیا باراں برس کر لاکھ بار　پر یہ اشکِ چشم نت برسے گیا

اب کوئی لمحہ میں آتا ہے وہ یار　دل سے سارا دن یہی کہتے گیا

مومن کی غزل "تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو" دُنیائے تغزل کی نہایت ہی مشہور و مقبول چیز ہے اور اس میں کلام نہیں کہ مشکل ہی سے دو چار چیزیں کلام اساتذہ میں ایسی نظر آئیں گی، آصف الدولہ نے بھی اسی بحر میں لیکن بہ تبدیل ردیف و قافیہ ایک غزل لکھی ہے جسے بھی دیکھیے

مرے یار کیسی ادا ہے یہ، کہ چمن میں جس گھڑی آ گئے　کبھی گُل کو آ کے ہنسا گئے، کبھی بلبلوں کو رُلا گئے

مرے آگے سے جو گزر گئے، تو پلک سے لاگی نہ پھر پلک　وہ جو ضبط کر کے رہا تھا میں، مرے اشک آ کے بہا گئے

جو گزرتی ہو مجھے رات دن، ترے اشتیاق وصال میں　سو کہوں کا حالتِ ہجر سب، کبھی روبرو جو تم آ گئے

نہ وصال ہی میں قرار تھا، نہ فراق ہی میں قرار ہے　وہ وصال کیسا دکھا گئے، یہ فراق کیسا لگا گئے

یہ جو کہتے ہو کہ بتا سبب ترے لگتے کیوں نہیں لب سے لب　اُسی روز سے مجھے بڑ گئی، جو تم اپنی باتیں سُنا گئے

یہ پیام و پیچ و قتا مرا، کہ خرابی اور تو کیا کہوں　وہ جو جائے امن تھا ایک دل، غم و درد اس میں بسا گئے

مجھے آصف آہ یہ کیا ہوا کہ مدام نالہ و آہ ہے　میاں یہ فسانۂ عشق ہے ترا بھید ہم بھی تو پا گئے

آپ دیکھیں گے کہ کلامِ آصف میں بہت سے وہ الفاظ بھی نظر آتے ہیں جو اس وقت متروک ہیں مثلاً کنے (بمعنی قریب) تئیں، ٹک، ٹک ٹک، میاں، تلک، جدھر، ادھر، وغیرہ لیکن اس نوع کے الفاظ اس عہد کے تمام شعراء میں پائے جاتے ہیں، یہاں تک کہ میر، درد، سودا اور سوز سب نے انھیں استعمال کیا ہے

آخر میں ان کے چند منتخب اشعار درج کر کے اس مضمون کو ختم کرتا ہوں لیکن میرا یہ انتخاب کسی کمال استقصا کا نتیجہ نہیں ہے اس لیے یہ سمجھ لینا درست نہ ہوگا کہ آصف کے کلیات میں اتنے ہی شعر کام کے ہیں، حالانکہ اگر صرف اتنے ہوں تو بھی بہت ہیں

اس انتخاب میں وہ اشعار شامل نہیں ہیں جو اصل مضمون میں آ گئے ہیں

یہ نہ آنے کے بہانے ہیں سبھی ورنہ میاں　　آشنا تو گھر سے مرے کچھ نہیں گھر دور ترا

قصۂ فرہاد و مجنوں رات دن پڑھتے تھے ہم　　سو تو وہ ماضی پڑا، اب اپنا افسانہ ہوا
رات دن یہ سوچ رہتا ہے مرے دل کے تئیں　　اے خدا یاں سے وہ جا کر کس کا ہمخانہ ہوا

قاصد تو لیے جاتا ہے پیغام ہمارا　　ہر ذرے سے ہر سے کہیو واں نام ہمارا
آغاز نے تو عشق کے یہ حال دکھایا　　اب دیکھیو کیسا ہو وے گا انجام ہمارا

نامہ ترا میں لے کر منہ دیکھ رہ گیا تھا　　کیا جانیے کہ قاصد کیا مجھ کو کہہ گیا تھا
کوچہ سے اپنے تو نے مجھ کو عبث اٹھایا　　سب تو چلے گئے تھے اک میں ہی رہ گیا تھا
کچھ بھی نہ سوجھتا تھا اس دن مجھے تو آصف　　جس روز ہائے یاں سے وہ رشکِ مہ گیا تھا

اس ادا سے مجھے سلام کیا　　ایک ہی آن میں غلام کیا
یارو اس گلبدن کے تئیں ہم نے　　گل صبا سے بھی کچھ پیام کیا
قصۂ جاں گداز اے آصف　　تھوڑی سی بات میں تمام کیا

درد دل ہے تو یار کے باعث　　غم ہے تو اس نگار کے باعث
ایک گردش سے تو نہیں سکتا　　اس دلِ بیقرار کے باعث
چھائی بادِ صبا نے کیا کیا خاک　　سر ہی دشتِ غبار کے باعث
دم رکا جائے ہے مرا آصف　　گریۂ بے شمار کے باعث

رو رہا ہے جیسے یہ دلِ زار و نزار آج　　ایسا تو روتے دیکھا نہ ابرِ بہار آج
آصف کو منہ لگایا ہے آج اُس نے ظاہرا　　جاتا ہے روڑ دوڑ جو واں بار بار آج

دردِ دل اپنا میں اس شوخ سے کہتا لیکن　　جو چھپانے میں مزہ ہے نہیں اظہار کے بیچ
گریہ و نالے ہیں اے دل تو تری شورش سے　　رہنے پاویں گے نہ ہم کوچۂ دلدار کے بیچ

کوئی بات تو ہماری بھی مان اب خدا سے ڈر　　کب تک دیا کرے گا ہمیں تو جواب تلخ
پھرتا ہوں کوہ و دشت میں روتا میں زار زار　　تجھ بن ہوا ہے گھر مجھے خانہ خراب تلخ
آصف کو عشق ہے وہ نہ مانے گا ایک بات　　کیوں اس سے زیست کرتے ہو اے شیخ و شاب تلخ

بڑا چرچا پڑے گا اُس کا آصف　　ہر اک بیدرد کو تو مت سنا درد

ہم نہ سمجھتے تھے یار آصفِ شوریدہ بھی　　عاشقوں میں اُس کے ہے عاشقِ فیروزمند

گزری جو تیرے غم میں دلِ نیم جان پر　　کچھ پوچھ مت میں لا نہیں سکتا زبان پر
آصف کو جس نے عشق میں دیکھا ترے کہا　　آتا ہے رحم میرے تئیں اِس جوان پر

دلِ آصف پہ کوئی نہ رکھیو ہاتھ　　جل رہا ہے وہ خاکسار ہنوز

یہ تیری بات کا کرنا لگا کے تجھ پہ ہاتھ　　رہے گا حشر تلک دوستی کی دستاویز

جو نالہ تھمتا ہے تو گریہ جوش کرتا ہے　　غرض چھپائے سے چھپتا نہیں ہے عشق کا راز

کل تلک ہوتی تھی کچھ نبض میں گرمی محسوس　　آج تو نبض ہی ہوتی نہیں اپنی محسوس
بات جو دل میں کھٹکتی تھی، ہوئی ظاہر آج　　موت اس شخص کی مدت سے ہمیں تھی محسوس

نہ بیٹھو یارو کوئی مجھ سے بیقرار کے پاس　　کہ خوار ہے جو کوئی بیٹھے بیقرار کے پاس
کسی کے پاس نہ تو دل سے بیٹھ اے ظالم　　مضائقہ نہیں یوں بیٹھ تو ہزار کے پاس
اٹھا کے پہنچا ہے کیا کیا خرابیاں تجھ تک　　ذرا تو بیٹھ کبھو اپنے سوگوار کے پاس
یہ کون دوست ہے میرا جو تجھ کو منع کیا　　نہ بیٹھ آصفِ غم خوار و غمگسار کے پاس

لاکھوں جفاؤ جور سہے اُس کے لیک آہ　　جاتی نہیں ہے دل سے مرے چاہ کیا کروں

اتنا تو کیا کہ اس کا ادھر کو گزر نہیں　　اے آہ! تجھ میں اتنا بھی ظالم اثر نہیں
رکھتے ہیں دو جہان کے اسرار کی خبر　　گو ہم کو اُس کے عشق میں اپنی خبر نہیں
ہر دم کی آہ سرد، رُخ زرد و چشم تر　　آصف یہ کیا ہے تیرے تئیں عشق اگر نہیں

ناصح ترے کہے سے نہ اس سے ملا کروں　　لیکن جو دل ستاوے تو پھر اس کو کیا کروں

کب تلک تیرے جدا رہنے کا غم کھاتے رہیں　　کب تلک باتوں میں اپنے دل کو بہلاتے رہیں
گو برا مانے نہیں تو، اپنا اب یہ دھیان ہے　　دل ترے کوچے میں چھوڑیں اور ہم جاتے رہیں
تیرے رونے سے اب آصف لوگوں کو تکلیف ہے　　بس نہ رو، کب تک بچارے کپڑے سکھلاتے رہیں

ہمنشیں پوچھے ہے کیا افسانۂ میرے غم کا ہائے　　غور کر ٹک دیکھ میں خود صورت افسانہ ہوں

جس سے میں اپنا حال کہا اس نے یوں کہا　　تو نے تو مجھ سے حال کہا میں کہاں کہوں
مرتا ہوں اب تو جان ہی جاتی ہے دوستو!　　لے آؤ اس کو جلد کوئی تو، ہنساں منوں

چشم عاشق میں یار و خواب کہاں　　دل عاشق میں صبر و تاب کہاں
تجھ سے کیونکر کہے وہ اپنا عشق　　آصف اتنا وہ بے حجاب کہاں

کیا کریں کہنے میں ناصح یہ دل زار نہیں　　ورنہ ترک اس سے ترا آنا کوئی دشوار نہیں
یوں تو دیوانہ ہوں کیا کیا نہیں بکتا رہتا　　سامنے اس کے مگر طاقت گفتار نہیں

آصف اس وقت میاں کچھ متردد سے ہے تو　　آج سچ بولیو گھر میں ترے مہمان ہے کون

یہ ساری شیخیاں ہیں سن لو یارو، سامنے ہو کر　　کرے گر بات کوئی اس ستمگر سے تو ہم جانیں

فرہاد تھا یا مجنوں، پھر اچھا زمانہ تھا　　اب لطف نہیں آصف کچھ الفت خوباں میں

نہ جی چاہے تھا جسکے پاس سے اکدم سرکنے کو　　ہو اُسکے در پہ اب رخصت نہیں ہے سر پٹکنے کو

جاتا تو ہوں ہزار خرابی سے واں تلک　　کیا جانیے وہ گھر میں بھی ہو اپنے یا نہ ہو

وہ ہوا حال سے مرے آگاہ　　میرے حق میں کچھ ہوئی واللہ
دل تو جاتا ہے اُسکے کوچہ میں　　جا مری جان، جا خدا ہمراہ

عشق کر کے تو یہ کیا آصف ہے پر اس کا خدا کے ہاتھ نباہ

کیا فاش کروں غم نہاں کو پایاں نہیں میری داستاں کو
آصف ابھی میں نے کیا کہا تھا ٹک بند نہیں مری زباں کو

جی نکل جائے گا ظالم مرا اب جانے سے یاں نہ آنا ہی بھلا تھا ترے اس آنے سے

ملنے کو تجھ سے دل تو مرا بے قرار ہے تو آ کے مل نہ مل یہ ترا اختیار ہے
تم زخم دل کی میرے خبر پوچھتے ہو کیا تیر نگاہ دل کے تو اب آر پار ہے
یہ کچھ تو حال تیرے دوانے کا اب ہوا جیدھر کو جائے آہ اسے مار مار ہے

سمجھو دوست بولتا ہے پر مجھی سے نہیں کچھ بولتا کیسا جانے کیا ہے

کیا سبب آصف گئے جونہی چلے آئے وونہی آج کیوں صحبت میں اسکے یار کچھ تم کم رہے

کہتے ہیں سبھی گئے گلی سے اک آصف نوحہ گر رہا ہے
جب تب اسے دیکھتا ہوں در پر لے شام سے تا سحر رہا ہے

جان کیوں کھاتے ہو گھر بھی جاؤ گے ناصحو! کب تک مجھے سمجھاؤ گے

لینا خبر تو اس کی جس کا ہے نام آصف مدت سے وہ گلی میں تیری رہا کرے ہے
اور آخر کار آج میں نے اس کی خبر لے ہی لی گو وہ کبھی میری گلی میں آ کر نہیں رہا

نیاز

لکھنؤ کے موجودہ لکھنوی شعراء

شاعر	مصرعِ اول	مصرعِ ثانی
انور حسین آرزو (عمر تقریباً ۶۰ سال)	دہ یہ کہتے ہوئے نظر آئے	کیوں جی پھر تم ہمارے گھر آئے
محمد علی خاں آزاد (عمر تقریباً ۵۰ سال)	ہاں بھی تم سے مری لاش پہ کھولے نہ گئے	بے اثر تھا اثرِ خوابِ پریشاں دیکھو
حکیم سید علی آشفتہ (عمر تقریباً ۴۴ سال)	بڑے تم بوجھنے والے بنے ہو	جبھی جانیں بتا دو دل میں کیا ہے
مہدی حسن احسن (عمر تقریباً ۶۰ سال)	اک جلوۂ روشن ہے مری نزع کا عالم	میں شعلۂ آخر ہوں چراغِ سحری کا
مرزا جعفر علی خاں اثر (عمر تقریباً ۵۴ سال)	جھلملاتے ہوئے تارے کیا ہیں	مل گئے پھول ترے بستر کے
پیارے نواب برق (عمر تقریباً ۴۰ سال)	اب تو اکثر کوئی راتوں کو کہا کرتا ہے	یہ صدا کس کی چلی آتی ہے ویرانے سے
سید حسین بیتاب (عمر تقریباً ۶۰ سال)	لینا ہے آج مشقِ تصوّر سے ایک کام	تصویر کھینچنا ہے تری جلوہ گاہ کی
نواب چھنے صاحب سحر (عمر تقریباً ۲۴ سال)	نہ سنو میری داستانِ طویل	کہ یہ حسرت بھرا فسانہ ہے
سراج الحسن سراج (عمر تقریباً ۴۰ سال)	آپ کے پاؤں کے نیچے دل ہے	اک ذرا آپ کو زحمت ہوگی
ننھو میاں شفیق (عمر تقریباً ۵۷ سال)	اے شفیق اپنے کو پھر رشکِ سکندر سمجھوں	آئینہ دل کا اگر اُن کی نظر تک پہونچے
ابوالفضل شمس (عمر تقریباً ۵۰ سال)	بروزِ حشر شہید دل کو ہے بڑا دعویٰ	مزہ تو ہو جو نہ ثابت ہو جرم قاتل پر
علی نقی صفی (عمر تقریباً ۸۰ سال)	دل سے نزدیک ہیں آنکھوں سے بہت دور نہیں	گر اس پر بھی ملاقات انھیں منظور نہیں
الطاف حسین عالم (عمر تقریباً ۲۵ سال)	سب ہیں آمادہ طرفداری پر اسکی خبر ہیں	ایسا مجمع اور یہ میرا ہم زباں کوئی نہیں
مرزا محمد ہادی عزیز (عمر تقریباً ۵۵ سال)	اپنے مرکز کی طرف مائلِ پرواز تھا حسن	بھولتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا
خواجہ عبدالرؤف عشرت (عمر تقریباً ۷۰ سال)	پانی پانی ہوئے غیرت سے بریدہ غنچے	بے بلائے ہوئے شبنم جو چمن میں آئی
حکیم منتے آغا فاضل (عمر تقریباً ۵۷ سال)	اُن کی ہنسی پہ آنکھ سے آنسو ٹپک پڑے	اب دل خوشی کا بھی متحمل نہیں رہا
قدیر احمد قدیر (عمر تقریباً ۲۴ سال)	اب سر نہیں اُٹھنے کا سنگِ درِ جاناں سے	میرا یہی قبلہ ہے، میرا یہی کعبہ ہے
چھبن صاحب گستر (عمر تقریباً ۵۴ سال)	کوئی پوچھے مرنے والا کون تھا کیا نام تھا	یہ نہ کہہ دینا کہ میرا عاشقِ ناکام تھا
کاظم حسین محشر (عمر تقریباً ۷۰ سال)	اے چارہ ساز اتنی ہی مدت ہے زیست کی	جب تک کہ دردِ عشق ہمارے جگر میں ہے
جعفر حسین منظر (عمر تقریباً ۲۴ سال)	حسبِ منشا دلِ پرشوق کی باتوں کا جواب	دے دیا شرم میں ڈوبی ہوئی انگڑائی نے

لکھنؤ کے موجودہ غیر لکھنوی شعراء

شاعر	مصرعِ اول	مصرعِ ثانی
عبدالباری آسی میرٹھی (عمر تقریباً ۵۴ سال)	اپنی حالت کا خود احساس نہیں ہے مجھ کو	میں نے اوروں سے سنا ہے کہ پریشاں ہوں میں
حامد اللہ افسر میرٹھی (عمر تقریباً ۴۲ سال)	رو رو کے انتظار کی گھڑیاں گزار دیں	یہ بھی خطا ہوئی ترے امیدوار سے
محمد حسین انفر موہانی (عمر تقریباً ۵۴ سال)	بہار آنے سے پہلے اِک پریشاں خواب دیکھا تھا	کہ جیسے چھُٹ رہا ہے فصلِ گل میں آشیاں ہم سے
محمد علی امید امیٹھوی (عمر تقریباً ۶۵ سال)	چار دن کی تھی زندگی لیکن	یہ بھی اُن کی خوشی نہیں، نہ سہی
محمد امین امین سلونوی (عمر تقریباً ۵۳ سال)	آپ عیسیٰ نفس سہی لیکن	میرے جینے کا کیا سہارا ہے
محمد احمد بیخود موہانی (عمر تقریباً ۵۴ سال)	تری غیرت کو اے نازِ ستمگر کیا ہوا آخر؟	ترے ہوتے ہوئے ممنونِ جورِ آسماں ہوں میں!
علی سکندر جگر مرادآبادی (عمر تقریباً ۴۴ سال)	الٰہی ترکِ محبت بھی کیا محبت ہے	بھُلاتے ہیں اُنھیں وہ یاد آئے جاتے ہیں
آل رضا رضا نیوتنوی (عمر تقریباً ۳۵ سال)	چلے تھے ایک نظر تیری بزم دیکھ آئیں	یہاں جو آئے تو بے اختیار بیٹھ گئے
محمد زماں زماں الہ آبادی (عمر تقریباً ۵۰ سال)	اے غمِ دوست یہ تو سمجھا دے	کتنا اندوہناک ہونا ہے
شمس الحسن شمس فرخ آبادی (عمر تقریباً ۵۲ سال)	یوں یکایک نظر اُٹھی اُن کی	ہم نے جانا کہ کامیاب ہوئے
محمد عمر شوکت تھانوی (عمر تقریباً ۳۲ سال)	موت برحق تھی مگر کاش نہ آتی شبِ ہجر	یہ تو کہنے کو نہ ہوتا کہ اِک ارماں نکلا
نواب علیحسن خاں طاہر فرخ آبادی (عمر تقریباً ۶۰ سال)	اُس کا ہر جلوہ حجابِ ناز سے کچھ کم نہیں	پردہ گرتا جائے ہے جتنا کہ اُٹھتا جائے ہے
مقبول عظیم عرش میرٹھی (عمر تقریباً ۳۵ سال)	اُن کے ہی ہو جائیں گے سب اُن کی صورت دیکھ کر	کون میرا ہم خیال و ہم زباں رہ جائے گا
محمد حسین عرشی لکھیم پوری (عمر تقریباً ۴۰ سال)	کیوں سہارا دے رہی ہے موجِ دریا تو مجھے	لطف ساحل سے سوا نظارۂ ساحل میں ہے
واجد علی فرخ بنارسی (عمر تقریباً ۴۵ سال)	وہ آئے بھی تو دید کا موقع کہاں نصیب	ہم سے تو اپنے ہوش میں آیا نہ جائے گا
ظفر مہدی گہر جائسی (عمر تقریباً ۳۵ سال)	لے وہ تمہارا ایک لفظ موتِ دلِ حزیں سہی	کچھ تو کہو جواب میں ہاں نہ سہی، نہیں سہی
محمد حسین نازش بدایونی (عمر تقریباً ۶۰ سال)	ہوں جادۂ ناکامیِ اُلفت میں سبک گام	شاید کبھی اس راہ سے امید گزر جائے
نیاز محمد نیاز فتحپوری (عمر تقریباً ۴۸ سال)	گھڑی گھڑی نہ اِدھر دیکھیے کہ دل پہ مجھے	ہے اختیار، پر اتنا بھی اختیار نہیں
مقبول حسین وصل بلگرامی (عمر تقریباً ۵۰ سال)	ہائے وہ بزمِ ناز میں جلوۂ حُسنِ خود نما	چہرے پر ایک تمکنت، آنکھ میں کچھ غرورسا
یونس حسین یونس زیدپوری (عمر تقریباً ۶۰ سال)	اب نہ سمجھے گا تو کل قدر وفا کیجیے گا	یاد رکھیے کہ کہا تھا کسی سودائی نے

لکھنؤ اور مختلف اصناف سخن

فرمانروایان اودھ کا زمانہ بھی عجیب زمانہ تھا، دولت کی افراط تھی اور اسباب مسرت و نشاط کی فراوانی، ہر علم و ہنر کا اُستاد لکھنؤ میں اکٹھا تھا اور ہر فن کا ماہر یہاں موجود۔ یہاں کا ایک شاعر اس حقیقت کو ان الفاظ میں ظاہر کرتا ہے:۔

لکھنؤ اہلِ ہنر کے لئے ٹکسال ہے آج رندؔ کھل جاتا ہے یاں کھوٹے کھرے کا پردہ

چنانچہ دیگر علوم و فنون کے علاوہ شاعری بھی اپنے ماحول سے متاثر ہو کر ایک خاص صورت اختیار کرتی جا رہی تھی سلطنت میں شیعی مذہب کی ترقی معراج کمال تک پہونچ گئی تھی۔ اور تمام امرا و شرفا مجالس عزا میں شرکت ضروری سمجھتے تھے۔ حتیٰ کہ غیر مسلم امرا بھی شہید کربلا کے غم میں آنسو بہانا باعث فخر و سعادت تصور کرتے تھے۔ اور سال میں شاید دو ہی چار دن ایسے گزرتے ہوں کہ جب کسی نہ کسی تقریب میں مجالس عزا برپا ہوتی ہوں ان مجالس میں میر ضمیر، میر خلیق، میاں دلگیر، اور دبیر و انیس کے مرثیے پڑھے جاتے تھے اور اس طرح سیکڑوں دردناک اشعار بچے بچے کو حفظ ہو گئے تھے۔ چونکہ اُس وقت لکھنؤ نصف شیعہ تھا اور مذاق شاعری پر مذہب اثر انداز ہو رہا تھا اس لئے اس باب میں شیعہ سنّی کی کوئی قید باقی نہ رہی، چنانچہ منشی امیر احمد نے بھی جنکا شمار حنفی علما میں تھا مصائب اہلبیت پر مسلسل اشک بہائے اور اس سعادت کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ ان کے بعض اشعار ملاحظہ ہوں:۔

کیا اثر نام علی میں ہے کہ لیتے ہی امیرؔ کام بگڑے ہوئے جتنے ہیں سنور جاتے ہیں

جو کربلا میں شاہِ شہیداں سے پھر گئے کعبہ سے منحرف ہوئے قرآں سے پھر گئے

امیرِ خستہ جاں آفت میں ہے یا حیدرِ صفدر کرو امداد اسکی وقت ہے مشکل کشائی کا

امیرؔ اپنا دلِ پُر داغ سوئے کربلا لیچل یہ گلدستہ ہے نذرِ روضۂ شبیر کے قابل

اسی کے ساتھ اس وقت کی معاشرت پر بھی اک نگاہ ڈالیئے۔ سامان عیش و عشرت کی فراوانی نے ایک عام کیفیت نشاط پیدا کر دی تھی اور ولادت، عقیقہ، بسم اللہ، شادی وغیرہ کوئی تقریب ایسی نہ ہوتی تھی جس میں رقص و سرود کی بزم منعقد کرنا فرض نہ سمجھا جاتا ہو۔ پھر یہ رنگ اسی جگہ ختم نہ ہو جاتا تھا بلکہ علم مجلس سیکھنے، گفتگو میں لوچ اور حلاوت پیدا کرنے کے لئے شاہدان بازاری کی صحبت اس وقت کی تہذیب میں شامل ہو گئی تھی۔ یہاں تک کہ واجد علی شاہ اختر سریر آرائے سلطنت ہوئے اور لکھنؤ کی یہ رنگینیاں بڑھکر خدا جانے کہاں سے کہاں پہونچ گئیں۔ تقریباً ۸ سال تک انھوں نے وہ دادِ عیش دی کہ محمد شاہ رنگیلے کی یاد دلوں سے محو ہو گئی۔ اور ظاہر ہے کہ ان حالات میں یہاں کی شاعری کے رجحانات کیا ہو جانے چاہئے تھے چنانچہ صاحب شعر الہند نے اس وقت دہلی و لکھنؤ اسکول کی شاعری کا جو فرق لکھا ہے وہ بڑی حد تک صحیح ہے کہ:۔

(۱) لکھنؤ کے تمدن و معاشرت میں بالعموم نسائیت پیدا ہو گئی تھی اور اس کا اثر داخلی وہاں کی شاعری پر پڑا۔

(۲) فارسی تراکیب کا لکھنوی شعراء کے یہاں فقدان تھا۔ لیکن شعرائے دہلی کا کلام اس سے مالا مال تھا۔

(۳) شعرائے دہلی مختصر غزلیں کہنے کے عادی تھے اور لکھنؤ میں سیر حاصل غزلیں لکھی جاتی تھیں اور اسوجہ سے ابتذال کا رنگ نمایاں تھا۔

(۴) شعرائے لکھنؤ میں روحانیت کا فقدان تھا اور خارجی اوصاف و لوازم کا ذکر اس کثرت سے ہوتا تھا کہ تغزل کا لطف حاصل نہیں ہوتا تھا۔

(۵) رعایت لفظی کے ساتھ ابتذال لکھنوی شاعری کا طرۂ امتیاز ہو گیا تھا۔

ہر چند رعایت لفظی و ایہام کی شاعری اہل دہلی نے بھی کی ہے یہاں تک کہ میر، مومن و غالب کا کلام بھی اس سے خالی نہیں اور ابتذال و سخافت کے اشعار ان کے یہاں بھی ملتے ہیں، لیکن ان سب کا عمومی رنگ جذبات نگاری تھا حتےٰ کہ شاہ نصیر اور ذوق کا کلام بھی جو دہلی کے دو بڑے زبردست غیر حقیقی شاعر تھے اس سے خالی نظر نہیں آتا۔

غزل مولانا نیاز صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے:۔

"شاعری کے تمام اصناف میں غزل کوئی جس قدر بلند چیز ہے کوئی نہیں، روح کی گہرائیوں اور قلب کے اعماق سے خبردار کرنے والی چیز اگر کوئی ہو سکتی ہے تو صرف غزل ہے، اور اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ غزل کا ارتقا تصوف ہی مگر تصوف سے مراد وہ علوئے فطرت، وہ عروج روحانیت اور وہ استعلاء تصور ہے جہاں انسان مادیت سے گزر کر اپنے مرکز اصلی، نور ربانی اور جلوۂ حقیقی سے ہم آغوش ہو جاتا ہے اور تمام امتیازات دنیاوی کو جن میں امتیاز مذہبی بھی شامل ہے محو کر دیتا ہے۔ پھر جو شخص فطرتاً شاعر ہوتا ہے وہ اپنی اول منزل میں بھی جو منزل لب بام ہوا کرتی ہے،

شاہد اصلی کے جلوہ کو سامنے رکھتا ہے اور دنیاوی زیر و بم میں بھی اس نغمہ سرمدی کو سنتا رہتا ہے جو ہر دم اسکو اپنی
لذت سے بیخود رکھتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ہر شاعر اختلاف استعداد کے لحاظ سے ایک مخصوص درجہ سے آگے نہیں بڑھتا
اور بہت کم ایسے ہیں جو بیدل کے مرتبہ تک پہونچنے میں کامیاب ہوں لیکن ایک فطری و وہبی شاعر خواہ وہ کتنی ہی
ابتدائی منزل میں کیوں نہ ہو اس سوز و گداز، اس درد و تاثیر، اس عذوبت بیان، اس حلاوت زبان اور اس
حقیقت و صداقت سے معرا نہیں ہو سکتا، جو صرف فطرت کی طرف سے ودیعت ہوتی ہے اور کوشش سے
حاصل نہیں کی جا سکتی"۔

اس سلسلہ میں مولانا نیاز نے بھی لکھنوی شاعری پر وہی اعتراضات کئے ہیں جو صاحب شعر الہند نے قایم کئے ہیں اور اسمیں
شک نہیں کہ لکھنوی شاعری کا دور اول جس نے پست ماحول، اخلاقی فرومایگی اور مذہبی تنگ نظری میں آنکھیں کھولی تھیں وہ
بقول نیاز صاحب یقیناً صرف ناسخ و وزیر ہی پیدا کر سکتا تھا جن کی شاعری الفاظ کی طلسم بندی، کنگھی چوٹی، بے معنی صنایع اور اسی
قسم کی بہت سی سطحی اور غیر سنجیدہ خصوصیات کے علاوہ کچھ نہیں ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ دور ثانی میں اسیر، امیر، جلال، منیر، محسن
تسلیم وغیرہ ایسے شاعر ضرور پیدا ہوئے جنھوں نے اس رنگ کو ترک کر کے ایک اور کیفیت غزل میں پیدا کر دی جس میں دہلی کے
جذبات کی سادگی اور لکھنؤ کی رنگینی دونوں کا امتزاج تھا۔

ریختی | غزل کی ایک بگڑی ہوئی شکل ریختی کہلاتی ہے اور سعادت یار خاں رنگین اس صنف کے موجد تسلیم کئے جاتے ہیں، لیکن
مرزا قادر بخش صابر اس دعوے کی تردید کرتے ہیں کہ:۔

"یہ ادعائے محض ہے اسواسطے کہ انشا سے بہت پہلے ریختیاں مشہور اور السنۂ عوام پر مذکور تھیں"۔

تذکرۂ گلستان سخن میں ہے کہ:۔

"زبان اردو میں اول ریختی کا رواج انشا اللہ خاں انشا نے دیا۔ اور اس کے بعد سعادت یار خاں رنگین نے
خواہ اس سبب سے کہ ان کی طبیعت کو خود اس صنف کلام کی طرف التفات تھا خواہ انشا اللہ خاں کے اثر
صحبت سے اس نظم میں ایسی زبان آوری کی گویا اس کو اپنا شعار کر لیا، اب اس عرصہ میں یار علی جان نے کمال
جانکاہی کی اور اس نظم کی مشق حد کمال تک پہونچائی"۔

تذکرہ مہر جہانتاب میں بھی انشا کو ریختی کا موجد تسلیم کیا گیا ہے اور رنگین کو صرف شریک مشورہ قرار دیا ہے۔

صاحب شعر الہند نے لکھا ہے کہ:۔

"یہ صنف اس قدر غیر مہذب الفاظ و مضامین کا مجموعہ ہے کہ اس دور تہذیب و شایستگی میں ان کے دو چار شعر کے

نقل کرنے کی بھی جرأت نہیں کر سکتے"،

گر میں اس سے متفق نہیں ہوں، کیونکہ بہت سے شعرا ایسے نکل سکتے ہیں جن کو یقیناً پیش کیا جا سکتا ہے اور خصوصیت کے ساتھ جس حد تک عورتوں کی زبان، اور اُن کے مراسم وغیرہ کا تعلق ہے، ریختی کی اہمیت سے انکار نہیں ہو سکتا۔ بہرحال اس صنف سخن میں انشاؔ، رنگینؔ اور جانؔ صاحب بہت مشہور ہوئے ہیں۔

واسوخت ایرانی شعرا کے دورِ متاخرین میں جب معاملہ بندی نے ترقی کی اور ان کے ادا کرنے کے لئے غزل کا دامن تنگ نظر آنے لگا تو وحشیؔ یزدی نے واسوخت کو ایجاد کیا، اُردو میں سوداؔ نے سب سے پہلے اس کے اتباع میں واسوخت لکھی جس کی ہرٹیپ فارسی زبان میں تھی۔ تذکرہ گلدستہ نازنیناں میں جرأت کی واسوخت بھی ہماری نظر سے گزری ہے۔ متوسطین کے دور میں آتشؔ نے بھی واسوخت لکھی اور اُسکے بعد شعرائے لکھنؤ نے اُس کو اپنا محبوب ترین موضوع بنا لیا۔ یہاں تک کہ اس کا اثر غزل پر بھی پڑا۔ منشی امیر احمد نے واسوخت لکھی جو مینائے سخن کے نام سے شایع ہو چکی ہے۔ لیکن اماؔنت نے اس صنف خاص میں بہت شہرت پائی اور مرثیوں سے کچھ عناصر علحدہ کر کے واسوخت میں شامل کر لئے چنانچہ پروفیسر آزادؔ نے لکھا ہے کہ:۔

> "سب سے پہلے ضمیرؔ نے مرثیہ میں سراپا لکھا اور پھر اماؔنت اور دوسرے شاعروں نے واسوخت میں اسکو داخل کیا"

تذکرۂ شعر الہند میں اماؔنت کے متعلق حسب ذیل خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔

> "امانت کی واسوخت میں اور بھی چند باتیں ایسی جمع ہو گئیں جو اُس زمانہ میں نہایت مقبول تھیں اور اسی لئے وہ تمام واسوختوں میں بہت مشہور ہو گئی۔"

تذکرۂ مہر جہاں تاب میں امانت کے حالات میں لکھا ہے:

> "ایں واسوخت کہ حالا شہرتے تمام دارد اگر راستہ پرسی در مراعات النظیر و دیگر صنایع بے نظیر اُفتادہ و بلطفِ سخن و چستی بندش بے سہیم۔"

اب اردو میں یہ صنفِ سخن متبدل [illegible] جس [illegible] اگرچہ کبھی کبھی واسوخت کہہ لیا کرتے ہیں۔

قصیدہ قصیدہ گوئی کی اصلی ترقی قدما کے دوسرے دور میں ہوئی اور سوداؔ نے اس صنف میں سب سے زیادہ شہرت اور ناموری حاصل کی۔ شعر الہند میں سوداؔ کی قصیدہ نگاری کے متعلق حسب ذیل تبصرہ کیا ہے:۔ سوداؔ نے جہاں تک ممکن ہوا ہے قصیدے کی متانت و تخیّر، الفاظ کی شان و شوکت اور مضمون آفرینی پر پورا زورِ طبع صرف کیا ہے۔ اس نے مشکل لیکن دل آویز ردیفیں اختیار کی ہیں اور انکو نہایت خوبی سے نباہا ہے۔ قصاید میں بہاریہ تمہید ایک عام چیز ہے لیکن سوداؔ نے جدید تمہیدیں لکھی ہیں اور نہایت پرلطف طریقے سے گریز کیا ہے اور قصاید کو صرف حمد و نعت و مدح و ستائش ہی تک محدود نہ رکھا بلکہ بعض قصاید میں

واقعہ نگاری بھی کی ہے اور ہر درجے کے لوگوں کے مشاغل اُن کے کاروبار اور اُن کے پیشے کا اس تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے کہ اُس سے اجمالاً اُس دور کی تمدنی اور اقتصادی حالت معلوم ہو سکتی ہے۔ لیکن اس سے بھی انکار ممکن نہیں کہ سودا نے بعض جگہ ابتذال و فحاشی سے بھی کام لیا ہے۔ انشاء نے بھی قصاید لکھے ہیں لیکن شیفتہ ان کے متعلق یہ عام فیصلہ کر چکے ہیں کہ:-

"ہیچ صنف را بطریقہ راسخہ شعرانہ گفتہ"

لکھنوی شعراء میں قصیدہ نگاری کچھ زیادہ مقبول نہیں ہوئی ناسخ و آتش نے اس طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ منیر شکوہ آبادی اور محسن کاکوروی نے نعت کے بعض نہایت زوردار قصاید لکھے، متاخرین میں منیر، امیر، جلال نے قصاید لکھے ہیں لیکن کوئی خاص بات پیدا نہ کر سکے۔

مرثیہ | مرثیہ کے لفظی معنی وصف میت کے ہیں اور اصطلاح شاعری میں مرثیہ اُس صنف سخن کو کہتے ہیں جس میں شخص متوفی کے محاسن و فضایل درد و حسرت کے ساتھ بیان کئے جائیں۔ مولوی امیر احمد صاحب علوی بی۔ اے یادگار انیس کے مصنف نے مرثیہ پر حسب ذیل تبصرہ کیا ہے:-

"درد و غم کا جذبہ تمام جذبات انسانی سے قوی تر ہے اور حسرت و مصیبت کی کہانی عیش و شادمانی کی داستان سے زیادہ با اثر اور آنسوؤں کے تار یا گجرے کی لڑیوں سے زیادہ دلکش ہے، رنج و آلام سے متاثر ہونا فطرت انسانی کا خاصہ ہے اس لئے مرثیہ کا اثر قصیدہ اور منقبت سے زیادہ دیرپا ہوتا ہے ہر ایک مصرع دلوں پر نشتر چلاتا ہے اور ہر ایک شعر آہ و زاری کا آئینہ ہوتا ہے، یوں تو مرثیہ ہر مصیبت اور تباہی میں کہا جا سکتا ہے، لیکن ہمارے ملک میں مرثیہ کا اطلاق زیادہ تر حضرت حسین اور ان کے رفقا کے احوال شہادت پر ہوتا ہے۔

عرب میں مرثیہ گوئی کا عام رواج تھا اور ایام جاہلیت میں یہ فن کافی ترقی کر چکا تھا عبدالمطلب اور بعض دیگر امراء و رؤسا کے مرثیے عربی ادبیات میں اس وقت تک محفوظ ہیں اور حماسہ میں ایک مستقل فصل باب المراثی کے عنوان سے موجود ہے آفتاب رسالت کے طلوع ہونے کے بعد بھی مرثیہ گوئی کو زوال نہیں ہوا۔ حسان بن ثابت نے شہنشاہ کونین کی وفات پر ایسے مرثیے لکھے کہ اُس کا ہر ہر شعر تصویر سوز و گداز ہے، حضرت فاطمہ زہرا نے بھی اس سانحہ پر ایک دردناک مرثیہ کہا خلیفہ دوم جناب فاروق اعظم نے بھی اپنے بھائی کا مرثیہ کہلوایا لیکن افسوس ہے کہ محمد کے نواسہ پر آنسو بہانے کی کسی میں ہمت نہ تھی اور کربلا کے محشر خیز ظلم پر کوئی مرثیہ ایسا تصنیف نہیں ہوا جو زندہ رہتا خانوادہ امویہ کے جور و ستم نے تمام شعرا کی زبانیں بند کر دی تھیں فرزدق نے ایک قصیدہ حضرت سجاد کی شان میں لکھا تھا، لیکن شاعر کو اس کے صلہ میں قید خانہ سے واسطہ پڑا اسی جباری کا نتیجہ تھا کہ اس زمانہ کے کسی مشہور شاعر نے واقعۂ کربلا نظم کرنے کی جرأت نہیں کی خانوادۂ عباسیہ کے زریں عہد میں متفرق اشعار چند غیر مشہور شعرا نے واقعۂ کربلا کے متعلق ضرور کہے، لیکن ادبیات میں کوئی نقش قائم نہ کر سکے۔

ایران کی مقدس سرزمین نے خاندان رسالت کی غلامی کا حق ضرور ادا کیا اور جب اس ملک کو خودمختاری نصیب ہوئی اور شاہ طہماسپ صفوی سریر آرائے سلطنت ہوا تو اس نے حکم دیا کہ شعرا کو ائمۂ اہلبیت کی شان میں طبع آزمائی کرنا چاہئے، اور قدرت نے یہ شرف محتشم کاشی کے لئے محفوظ رکھا تھا کہ وہ مصائب کربلا پر پہلی مرتبہ دردناک الفاظ میں نوحہ کرے۔ اس نے چند بندوں کا ایک مرثیہ لکھا جو درد و غم کی تصویر ہے محتشم کے بعد مقبل نے مرثیہ گوئی میں شہرت پائی اور شوکت الفاظ کے زور سے ملا محتشم کے درد و تاثیر کا جواب دیا انھوں نے سب سے بڑا کام یہ کیا کہ کربلا کے تمام واقعات ابتدائے سفر سے اہل حرم کے قید ہونے اور رہائی پاکر مدینہ آنے تک نظم کردئے۔

پھر تو ایران میں مرثیہ گویوں کا ایک گروہ پیدا ہوگیا اور سیکڑوں شاعر مرثیہ کہنے لگے۔

ہندوستان میں اردو شاعری کی ابتدا دکن سے ہوئی اور مرثیہ گوئی کا آغاز بھی وہیں سے ہوا۔ عہد جہانگیری میں اول اول شجاع الدین نوری نے مرثیہ گوئی میں نام پیدا کیا اُس کے بعد ہاشم علی برہان پوری نے مرثیے کہے اور ان دونوں کے بعد رام راؤ سیوا اور کاظم علی نے اس صنف میں شہرت حاصل کی ہاشم و کاظم کے مراثی ایڈنبرا یونیورسٹی میں محفوظ ہیں۔ میرزا نامی ایک پاک طینت بزرگ تھے جو صرف مرثیہ کہتے تھے۔

گولکنڈہ کے آخری تاجدار ابوالحسن تاناشاہ شعر و سخن کے فریفتہ تھے اور اُن کے مصاحبوں میں شاہ قلی خاں ایک مرثیہ گو شاعر تھے جن کے اشعار ہاتھوں ہاتھ شمالی ہند میں پہونچتے اور وہاں مجالس عزا میں پڑھے جاتے۔ جب زمانے نے گولکنڈہ کا ورق اُلٹ دیا تو دلی کو عروج ہوا اور اس نے بھی شہدائے کربلا کے حالات میں ایک مثنوی لکھ کر مرثیہ گوئی کا حق ادا کیا۔ دلی کی پیرانہ سالی میں سودا و میر کا عنفوان شباب تھا۔ محبان اہلبیت کو رُلانے اور مجالس ماتم میں گرمی پیدا کرنے کے لئے مرثیہ گوئی کی ضرورت تھی چنانچہ ہر طبقہ کے شعرا توشۂ آخرت فراہم کرنے کے لئے نعت و منقبت کہتے اور ان میں سے بیشتر مرثیے بھی تصنیف کرتے تھے سودا اور میر کے عروج سے پہلے مرثیہ کا خوب رواج ہوچکا تھا اُسوقت کے مشہور مرثیہ گو میاں سکین کا سودا نے اپنے شہر آشوب میں تذکرہ کیا ہے۔ میر تقی میر نے بھی مرثیہ کہا لیکن وہ اس پایہ کا نہ تھا کہ اس شہنشاہ سخن کے دیوان میں شامل کیا جاتا۔ مرثیہ اول اول صرف چار مصرعوں کا ہوتا تھا اور ٹیپ کا بند نہ ہوتا تھا لیکن بعد کو اسنے مسدس کی صورت اختیار کی۔ مسدس کی ابتدا کس نے کی اسکے متعلق اختلاف ہے بعض کا خیال ہے کہ سب سے پہلے حیدر کاکوروی نے لکھا جو احمد شاہ کے عہد میں پائے جاتے تھے۔[1]

---

[1] ان کا یہ بند بہت مشہور ہے:-

عزیزو آج ناموس نبی پر آفت آئی ہے　　شب رخصت ہی بہنوں سے شہ دیں کی جدائی ہے
خصوصاً بی بی بانو نے عجب حالت بنائی ہے　　سرہانے بی سکینہ کے کھڑی دیتی دہائی ہے
منھ اسکا چومتی ہے اور یہی کہہ کہکے روتی ہے　　ارے اُٹھ لاڈلی میری غضب کی صبح ہوتی ہے

اور بعض میاں سکندر کا نام لیتے ہیں جو مرزا کے معاصرین میں تھے۔ اور بہ تلاش معاش پنجاب سے لکھنؤ آکر یہیں تکیہ بے نوا شاہ میں پڑے رہتے تھے۔ ان کا ایک نہایت دردناک مرثیہ آج تک گداگروں کی زبان پر رائج ہے اور شاید کسی جگہ مجلس میں بھی پڑھا جاتا ہو اس مرثیہ کے سال تصنیف کا پتہ نہیں چلتا، لیکن چونکہ میاں سکندر سودا کے ہمعصر تھے اس لئے قیاس سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسکا سنہ تالیف ۱۱۹۵ھ سے پہلے رہا ہوگا۔ دریائے لطافت میں انشا نے لکھا ہے کہ :۔ بگڑا شاعر مرثیہ گو ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُسوقت تک مرثیہ خوانی کو لوگ حقارت سے دیکھتے تھے۔ مگر سلطنت کا مذہب شیعہ تھا امرا و اعیان ریاست اسی مشرب کے حلقہ بگوش تھے، عشق اہلِ بیت لکھنؤ کی خاک میں سرایت کر گیا تھا، مجالس عزا دھوم دھام سے ہوتی تھیں۔ اہلِ ایمان آرزو کرتے تھے کہ اُن کی مذہبی مجلسوں میں مشاعروں سے زیادہ رونق پیدا ہو اور مرثیوں میں دردانگیز واقعات ظاہر کئے جائیں، اس لئے اہلِ کرم کی داد و دہش نے مرثیہ گویوں کی ہمت افزائی کی اور چند ہی روز میں ایک کامل پیدا ہوا جس نے عاشقانہ شاعری سے دست بردار ہوکر مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی شروع کی۔ یہ بزرگ مرزا دبیر کے اُستاد میر ضمیر تھے۔ بعد کو میاں دلگیر، میر فصیح اور میر خلیق نے بھی اسی صنف میں کمال حاصل کیا اور بادشاہ غازی الدین حیدر کے عہد میں یہ فن اس قدر ترقی کر گیا کہ مرزا رجب علی بیگ سرور نے اپنے فسانۂ عجائب میں اہل لکھنؤ کے کمالات کا تذکرہ کرتے ہوئے مرثیہ گویوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے اور ان تمام مرثیہ گویوں کے نام گنائے ہیں جو اُسوقت موجود تھے یا اس سے پہلے اس فن میں شہرت حاصل کر چکے تھے۔

نصیر الدین حیدر کے عہد میں دلگیر، ضمیر، خلیق ہم پلہ سمجھے جاتے تھے اور مرثیہ گویوں کی توجہ صرف بین پر تھی۔ مراثی کے بند ۱۲ سے لیکر ۳۵ یا ۵۰ تک ہوتے تھے اور بیشتر مرثیے سوزخواں ہی پڑھتے تھے۔ میر ضمیر نے روایات نظم کرنا شروع کیں تو مراثی ۵۰ بندوں سے بڑھکر ۷۰ یا ۸۰ کے ہونے لگے رفتہ رفتہ یہ تعداد سو سے بھی متجاوز ہوگئی۔ اور جب میر ضمیر نے رزم و سراپا کو بھی مراثی میں داخل کیا تو پھر اس کی طوالت کی کوئی حد نہ رہی۔ جس طرح قصیدہ تشبیب۔ گریز۔ مدح۔ دعا اور عرض حال پر مشتمل ہوتا تھا، اسی طرح مراثی میں چہرہ، رخصت، سراپا، رجز، جنگ، شہادت اور دعا لازمی قرار پائے۔ میر ضمیر نے مرثیہ میں جو جدتیں کیں وہ یہ ہیں :۔

(۱) رزمیہ لکھا (۲) سراپا شامل کیا (۳) اسپ اور اسلحہ جنگ کے اوصاف لکھے (۴) صفائی بندش پر توجہ کی (۵) غلط الفاظ جو مراثی میں بے تکلف مستعمل تھے ترک کئے اور (۶) تحت اللفظ پڑھنے کا رواج دیا۔

میر خلیق کا جوہر کمال لطف زبان کو دردانگیز خیالات کے ساتھ ترکیب دیکر صرف اہل مجلس کو رُلانا تھا وہ اس کوچہ سے قدم آگے بڑھانا نہیں چاہتے تھے۔ انھوں نے میر ضمیر کی تقلید اپنے کمالات میں موجب افزائش نہ سمجھ کر رزمیہ مضامین سے احتراز کیا اور صرف درد و تاثیر کی نعمت سے حریفوں کا مقابلہ کرتے رہے۔ فصیح نے البتہ رزم کو مراثی میں شامل کیا مگر وہ تھوڑے عرصہ

کے بعد عتبات کی زیارت کو تشریف لے گئے اور وہیں اقامت اختیار کرلی لیکن مشق سخن وہاں بھی جاری تھی اور ایک پُرزور سلام کر سے بھیجا جو لکھنؤ میں بہت مقبول ہوا اس کا پہلا شعر یہ ہے :۔

سلام لکھتا ہوں میں حرم میں قلم سے زمزم ٹپک رہا ہی　سراپا کعبہ کے سنگ در پر سیاہ پردہ ٹپک رہا ہی

میر ضمیر کے نامور شاگرد مرزا دبیر مرثیہ گوئی کی مشق کر رہے تھے۔ انھوں نے اُستاد کی پیروی میں حضرت علی اکبر کے حال کا مرثیہ طرز جدید میں لکھ کر سُنایا۔ خواجہ آتش بھی اس صحبت میں موجود تھے۔ جب گھوڑے کی تعریف مرزا صاحب نے پڑھی تو خواجہ آتش نے پکار کر فرمایا :۔

"بھئی سلامت علی خدا تم کو سلامت رکھے کون کہتا ہے تم فقط مضامین اچھے کہتے ہو تم سے بہتر دوسرا شاعر زبان بھی نہیں کہہ سکتا"

اسی وقت میر خلیق کے بلند اقبال صاحبزادے میر ببر علی انیس نے فیض آباد سے آکر لکھنؤ میں مجلس پڑھی اور رزم بزم کی وہ چلتی پھرتی تصویریں دکھائیں کہ آفریں کی صدا ہر گوشہ سے بلند ہونے لگی انھوں نے طرز مرثیہ گوئی میں کوئی خاص جدت نہیں کی بلکہ ضمیر و دبیر کے محاسن کلام میر خلیق کی محاورہ بندی اور میر حسن کی داستان نگاری کو باہم ملا کر نئی صورت سے پیش کیا، اور آخر کار سب کی گردنیں ان کے سامنے جھک گئیں۔

میر ضمیر جانعالم کے عہد تک زندہ تھے اور کہا جاتا ہے کہ دور آخر میں انھوں نے ایک بے نظیر مرثیہ ۸۰۰ بند کا لکھا تھا جو گر شائع ہوتا تو دبیر و انیس دونوں کے چراغ گل ہو جاتے۔ مگر غالباً یہ افسانہ ہی افسانہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میر انیس کا حریف اس صنف سخن میں اگر کوئی ہو سکتا ہے تو وہ صرف مرزا دبیر کی ذات ہے۔ ان دونوں باکمالوں کے نقش قدم پر چلنے والے سیکڑوں پیدا ہوئے لیکن دوسروں کا کیا ذکر ہے اُن کے بھائی بیٹے بھی گوئے سبقت نہ لیجا سکے۔ خاندان انیس میں سے مونس و نفیس اور خاندان دبیر میں سے مرزا اوج نے بہت زور مارا لیکن انصاف کی بات یہ ہے کہ کوئی ترقی نہ کرسکے۔

رہا یہ امر کہ ان دونوں میں صدر نشین فضیلت کون تھا۔ یہ مسئلہ اسوقت تک زیر بحث چلا آرہا ہے، لیکن نقادان فن سے پوشیدہ نہیں کہ دونوں اصحاب کی روش جداگانہ ہے اگر میر انیس کے کلام میں فصاحت و شیرینی موجود ہے تو ملاحت مرزا دبیر کے کلام کا حصہ ہے، شیرینی اور نمک دونوں کی بنی آدم کو احتیاج ہے اس لئے ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دی جاسکتی ہاں ضرور کہا جاسکتا ہے کہ انیس کی سادگی و تاثیر عرصہ تک باقی رہیگی اور دبیر کی شوکت الفاظ اور بلند پروازی جلد فنا ہو جائیگی۔ دبیر کے صنایع و بدایع سمجھنے والے ہندوستان میں انگلیوں پر شمار کئے جاسکتے ہیں اور اگر انحطاط کا یہی دور رہا تو وہ دن دور نہیں جب صنایع و بدایع سے لطف اندوز ہونے والا جستجو سے بھی دستیاب نہ ہوسکیگا۔ لیکن انیس کی سادہ زبان و محاورہ بندی ہر موسم کی چیز ہے اور اُردو زبان جب تک زندہ رہیگی انیس کا کلام سمجھا جائے گا۔ حالی نے کیا خوب کہا ہے :۔

اُردو کو راج چار سو تیرا ہے شہروں میں رواج کو بکو تیرا ہے
پر جب تک انیس کا سخن باقی ہے تو لکھنو کی ہے اور لکھنؤ تیرا ہے

میرانیس نے صنایع لفظی پر زیادہ توجہ نہیں کی۔ مراعات النظیر کی مثالیں البتہ ان کے کلام میں بعض جگہ پائی جاتی ہیں۔ لیکن اس کو وہ عیب سمجھتے تھے کسی شخص نے ان سے دریافت کیا کہ "آپ رعایت لفظی کو پسند کرتے ہیں تو ارشاد ہوا کہ کیا کروں لکھنؤ میں رہتا ہوں"۔

طبقۂ متوسطین کے اساتذہ متاخرین میں آمیر، جلال، منیر، تسلیم نے اس صنف سخن کی طرف مطلق توجہ نہیں کی۔ دور حاضر کے مشہور نقادہ مولانا نیاز نے اپنے مخصوص رنگ میں بے نظیر تبصرہ کیا ہے، لکھتے ہیں کہ:۔

"لکھنؤ میں جس بُری طرح تغزل کی مٹی پلید ہوئی وہ ناقابل عفو حد تک عفونت و گندگی سے لبریز ہے۔ لیکن یہ ماننا پڑیگا کہ شاعری کی اُس صنف نے جسے مرثیہ کہتے ہیں یہاں غیر معمولی ترقی کی اور شاہان اودھ۔ کے اخلاقی مظالم کی تلافی اگر فطرت کی طرف سے کوئی ہوئی تو صرف یہ کہ اُس نے انیس و دبیر کو یہاں پیدا کر دیا"۔

سلام تذکرہ بہارستان سخن میں ہے کہ:۔

"عروضی ترکیب کی رو سے غزل، سہرا اور سلام شے واحد ہیں، مگر اُن کے مضامین کے تقاضے ایک دوسرے سے علحدہ انداز رکھتے ہیں فارسی میں سہرا، اس واسطے نہیں ہوتا کہ اس ملک میں دولھا یا دُلھن سہرا نہیں باندھتے، سلام میں غزل کی طرح اعلیٰ درجہ کے مضامین از قسم واردات قلبیہ ضرور لاتے ہیں مگر اُن میں غزلیت کا رنگ پیدا ہونے نہیں دیتے سلام کی ترکیب کو با وجود رنگینی کے غزل سے علحدہ ہونا چاہئے۔ سلام گوئی کا لطف یہ ہے کہ باوجود شوخی و رنگینی کے غزل سے جدا نظر آئے۔ عموماً سلام میں واقعۂ کربلا، شہادت امیر المومنین و شہادت امام حسین و مصائب حضرت خاتون جنت، علاوہ ان کے اخلاقی و تمدنی و مذہبی مسایل بھی منظوم کئے جاتے ہیں۔ میرضمیر، میاں دلگیر، میرانیس و میر مونس اور مرزا دبیر کے سلام اُردو زبان میں بہت مشہور ہیں۔

نوحہ اسلام کی ایک قسم ہے جس میں بین کیا جاتا ہے، آج کل یہ صنف مقبول نہیں ہے لیکن پھر بھی بہت سی خواتین کا محبوب مشغلہ ہے اور آج کل بھی لکھنؤ کی خواتین اسطرف توجہ کرتی ہیں چنانچہ محترمی مرزا جعفر علی خاں صاحب اثر کی صاحبزادیاں اس فن میں بہت مہارت رکھتی ہیں[1]

---

[1] جناب اثر کی تین صاحبزادیاں ہیں۔ ایک قمر جہاں بیگم قمر دوسری بلقیس جہاں بیگم عصمت، تیسری انور جہاں بیگم انور۔ ان کے نوحوں اور سلاموں کا نمونہ یہ ہے:۔ قمر جہاں بیگم قمر

رحم کچھ حال پہ معصوم کے کھایا نہ گیا تھوڑا پانی علی اصغر کو پلایا نہ گیا،
جان دیدی غم شبیر میں روتے روتے باپ کا داغ سکینہ سے اٹھایا نہ گیا

علیگڈھ میں بھی یہ فن بہت مقبول ہے اور ہر سال ۱۰-۱۲ نوحے لکھے جاتے ہیں اور حق یہ ہے کہ خوب ہوتے ہیں گو اُس کا مقصود محض تفنن طبع ہوا کرتا ہے۔

پھونک دی قالبِ اسلام میں شبیر نے روح　　مٹ کے وہ نقش بٹھایا کہ اُٹھایا نہ گیا
باپ کی تاب و تواں ساتھ گئی بیٹے کے　　لاشہ اکبر کا شہِ دیں سے اُٹھایا نہ گیا
ہاتھ دونوں تھے بندھے بال تھے چھوٹے چھوٹے　　چہرہ بلوے میں سکینہ سے چھپایا نہ گیا
ہائے وہ خشک گلا کُند چھری سے جو کٹا　　ہائے وہ سر جو کبھی تن سے ملایا نہ گیا
اسے قمر کوئی بھی بانو کا نہ ارماں نکلا　　دودھ تک اصغر ناداں کا بڑھایا نہ گیا

بلقیس جہاں بیگم عصمت :-

شاہ دیں ہاتھوں سے تھامے دلِ ناکام آئے　　جب سوئے نعشِ علی اکبر گلفام آئے
مسکراتے ہوئے جنت کو سدھارے تم تو　　کس طرح اے مرے دلبر مجھے آرام آئے
بانو کہتی تھیں نہ نیند آئیگی تنہائی میں　　پاس اصغر ترے کس طرح یہ ناکام آئے
ختم شبیر پہ ہے شیوۂ تسلیم و رضا　　دل کو آرام نہ آئے اگر آرام آئے
رہ گئے یکہ و تنہا شہِ بیکس رن میں　　ظہر تک سب رفقائے شہِ دیں کام آئے
کہتے تھے شوقِ شہادت میں شہِ تشنہ گلو　　دن ڈھلے جلد کہیں عصر کا ہنگام آئے
دربدر یوں ہوئے تشہیر حرم بعد حسین　　کبھی کوفے گئے سر ننگے کبھی شام آئے
باپ کے سینے پہ سونے کی جسے عادت ہو　　آہ کس طرح اُسے خاک پہ آرام آئے
تشنگی پر شہِ مظلوم کی رونا عصمت　　سامنے آنکھوں کے پانی کا اگر جام آئے

انور جہاں بیگم - انور :-

حوصلہ اے چشمِ گریاں رہ گیا　　ماتمِ سرور کا ارماں رہ گیا
جسنے دیکھی حسنِ اکبر کی بہار　　صورتِ آئینہ حیراں رہ گیا
بارک اللہ اے شہِ گلگوں قبا　　مٹ چکا تھا نقشِ ایماں، رہ گیا
سہرا اکبر کا نہ دیکھا جیتے جی　　دل میں بانو کے یہ ارماں رہ گیا
جس کا جی چاہے وہ لوٹے یا ستائے　　قافلے کا میر ساماں رہ گیا
آج تک کہتا ہے اُٹھ اُٹھ کے غبار　　بے کفن شاہِ شہیداں رہ گیا
تیر جب اصغر کی گردن پر لگا　　ایک ہچکی لے کے ناداں رہ گیا
بیکسی میں کوئی تو ہمدم ہو　　سینۂ سرور میں پیکاں رہ گیا
ہند انور ہم چلے آئے مگر　　کربلا میں قلب نالاں رہ گیا

ہرسیہ | ہرسیہ ایک بے معنی لفظ ہے مگر ایک واقف کار کا خیال ہے کہ یہ "ہرسہ" کی بگڑی ہوئی صورت ہے اور غالباً ہرسہ سے مطلب خلفائے راشدین کی ظرافت آمیز ہجو ہے۔ مرثیہ کا مضمون پرعظمت تھا اگر ظرافت شامل کی جاتی تو مجلس ماتم بزم طرب بن جاتی ہنسنے ہنسانے کے لئے لکھنؤ کے زندہ دل حضرات نے یہ صورت نکالی کہ آٹھویں ربیع الاول کو عزاداری سے فراغت کرکے جشن عید منعقد کرتے تھے اور قاتلانِ حسین کے انجام پرخوشیاں مناتے تھے۔ اس عید میں میر ضمیر نے سب سے پہلے ہرسیہ پڑھا۔ مرزا دبیر اور میر انیس نے بھی تقلید کی میاں مشیر نے سارا زور اس پر صرف کردیا اور مختلف قوموں اور اہل پیشہ کی اصطلاحوں کو کثرت سے نظم کرکے اردو شاعری کو ظرافت وشوخی کے انمول خزانہ سے مالا مال کر دیا۔ اب یہ صنف مفقود ہے اور کوئی اُستاد فن اس طرف متوجہ نہیں ہوتا۔

قطعہ | قصیدہ اور قطعہ میں بہت کم فرق ہے یعنی یہ کہ قطعہ میں مطلع ہمیشہ نادر رہتا ہے اور اشعار کی تعداد چار سے کم نہیں ہوتی برخلاف اس کے قصیدہ میں مطلعوں کی تعداد مقرر نہیں اور طوالت میں وہ جتنا بھی بڑھ جائے کم ہے۔ قطعہ نگاری میں یہ ضروری ہے کہ شاعر کا کلام تغزل کا رنگ پیدا نہ کرے سوائے اس صورت کے کہ قطعہ بند اشعار خود کسی غزل کا حصہ ہوں، چونکہ قطعہ نگاری تملق و درباری خوشامد کے لئے مناسب وموزوں نہیں تھی اس لئے اس صنف میں جن شعرانے کوششیں کی ہیں وہ ہر آئینہ کامیاب ہوئی ہیں فارسی میں سعدی، ابن یمین، نظامی، فردوسی، سنائی، خسرو، غالب کے قطعات بہت مشہور ہیں لیکن غالب کے قطعات میں مداحی پائی جاتی ہے اردو شعرا میں قطعہ نگاری کی طرف بہت کم توجہ ہوئی صادق علی خاں اختر، ذوق، ظفر، غالب کے قطعات بہت مشہور ہیں، دور حاضر میں اس طرف توجہ نہیں ہے، فی الحال لکھنؤ میں عزیز لپ قطعات لکھتے ہیں۔

منظوم افسانے | اُردو زبان میں منظوم افسانے بالعموم مثنوی ہیں۔ اُس کے لئے اشعار کی تعداد متعین نہیں ہے ممکن ہے کہ چار شعر کی مثنوی ہو یا چار لاکھ کی۔ مضامین کے اعتبار سے جو وسعت اس صنف شاعری کو حاصل ہے کسی اور صنف کو نہیں ہر طرح کے مضامین اس میں گنجایش پاسکتے ہیں۔ تذکرہ بہار سخن میں ہے کہ:۔

"مثنوی نگاری صرف اس شاعر سے حسب مراد انجام پا سکتی ہے جس کو امور مذہبی اور معاملات خارجی کو موزوں کرنے کی صلاحیت معقول حاصل رہتی ہو وہ شاعر جو صرف اُمور مذہبی کو یا صرف معاملات خارجی کو حوالۂ قلم کرسکتا ہے مثنوی نگاری کی داد نہیں دے سکتا مثنوی نگاری کے لئے شاعر کو بڑی اطلاع عام کی حاجت ہے، اُسے معاملات عالم سے پورے طور پر باخبر ہونا چاہئے اُس کے ساتھ اسے مصور عالم بھی ہونا درکار ہے اگر بندش مضامین میں سے اسے مصوری کی قدرت نہیں ہے تو اس کی مثنوی نگاری لطف کمال نہیں دکھلا سکیگی۔ اُردو میں سب سے پہلے میر نے منظوم افسانے لکھے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ میر کی مثنوی نگاری بھی مضامین کے اعتبار سے ایک قسم کی غزل سرائی نظر آتی ہے گو میر کی مثنویات میں خارجی مضامین کا نقدان ہے لیکن روحانی اور قلبی معاملات سے مملو ہیں

اُردو زبان میں مثنوی کی ابتدا مذہبی حیثیت سے ہوئی، قطب شاہ نے بھی ایک نعتیہ مثنوی لکھی تھی جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے مخطوطات میں محفوظ ہے رستمی نے بھی قطب شاہ کی بیوی خدیجہ خاتون کی فرمایش سے خاورنامہ مرتب کیا، اس کے بعد نصرتی نے گلشن عشق کے نام سے ایک مثنوی لکھی اور دوسری علی نامہ کے نام سے۔ اس کے بعد خواجہ محمود بحری نے ایک صوفیانہ مثنوی من لگن لکھی چنانچہ صاحب "تاریخ شعرائے اُردو" لکھتے ہیں کہ:۔

(افضل الدین خاں افضل) دکن کے متقدمین شعرا میں سے ہیں دکنی زبان میں ایک راجہ کے بیان میں ایک مثنوی لکھی زبان مغلق ہے"

شاہ مبارک نے بھی ایک مثنوی لکھی اور حیدر بخش حیدری نے اُردو میں شاہنامہ لکھا اور نظامی کی ہفت پیکر کا اُردو ترجمہ کیا اور دکنی زبان میں بہرام و گل اندام کو بھی نظم کیا۔

ایک شخص ساقی نامی نے بھی شاہنامہ نظم کرنے کی کوشش کی اور اس کے بعد سودا اور راسخ نے کثرت سے مختصر مثنویاں لکھیں لیکن میر اثر کی مثنوی خواب و خیال کو زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔ جعفر علی خاں زکی نے بھی ایک مثنوی لکھی۔

انشاء و جرأت نے اس طرف توجہ نہ کی البتہ مصحفی نے بحر المحبت مثنوی لکھی جو اب شائع ہوگئی ہے۔ صاحب شعر الہند نے خوب لکھا ہے کہ:۔

جب ستارے ڈوبنے لگتے ہیں تو ڈوبتے ڈوبتے طلوع آفتاب کا مژدہ سُنا جاتے ہیں اس اُصول کے مطابق اس دور میں مثنویوں کی بھرمار تو کم ہوگئی، لیکن میر حسن نے مثنوی بدر منیر لکھ کر مصحفی۔ انشاء۔ جرأت سب کا کفارہ ادا کر دیا۔

اساتذۂ متوسطین میں ناسخ و آتش نے مثنوی کی طرف مطلقاً توجہ نہ کی البتہ شاگرد آتش پنڈت دیا شنکر نسیم نے مثنوی گلزار نسیم لکھ کر میر حسن کی طرح اس دور کے تمام شعرا کی جانب سے فرض کفایہ ادا کر دیا۔ متاخرین میں قلق کی طلسم الفت کو شہرت ہوئی اور نواب مرزا شوق کی مثنویوں نے تو قیامت ہی کر دی۔

اودھ کو گلزار نسیم اور طلسم الفت پر ناز ہے اور میر حسن کی بدر منیر کو یہاں کے لوگوں نے اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا میر حسن کی اصلی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے ہزارہا اشیا کا منظر کھینچا ہے اور مختلف مناظر کا سماں دکھایا ہے لیکن کہیں فطری مصوری سے متجاوز نہیں ہوئے۔ گلزار نسیم کی بنیاد تخیل، رعایت لفظی تشبیہ استعارہ پر رکھی گئی ہے اس لئے فطری مناظر پیش نہیں کر سکتی البتہ طرز ادا نہایت شستہ، رواں اور صاف ہے۔

مثنوی طلسم الفت، گلزار نسیم و بدر منیر دونوں کا مجموعہ ہے۔ رعایت لفظی تشبیہ اور استعارہ کا التزام ہر جگہ موجود ہے اور بدر منیر کی طرح مناظر بھی تفصیل سے دکھائے گئے ہیں لیکن فطری کیفیت کہیں نہیں ہے۔ افسانے میں بھی تناسب نہیں ہے

اس کے بعد نواب مرزا شوق کی مثنویوں کا دور آتا ہے۔ ان میں یقیناً ابتذال کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے لیکن اگر مبتذل شعر نکالدئے جائیں تو کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ بدر منیر و گلزار نسیم یا طلسم اُلفت کے ساتھ ان کا ذکر نہ کیا جائے۔ واجد علی شاہ اختر کی مثنوی حزن اختر بھی قابل ذکر ہے کیونکہ انھوں نے خود اپنی آپ بیتی اس میں نظم کی ہے اور ان کے اخلاقی جرات کی داد نہ دینا یقیناً ظلم ہے۔ محسن نے بھی نعتیہ مثنوی چراغ کعبہ لکھی جو درد و تاثیر کے کیف سے مالا مال ہے۔

مذہبی شاعری | صفیر بلگرامی نے لکھا ہے کہ ولی کے عہد سے پہلے شعراء نے جو کچھ لکھا اُس کا بیشتر حصہ حمد، مناجات اور مناقب پر مشتمل تھا۔ لیکن بعد کو یہ سلسلہ جاری رہا اور سودا و میر نے نعت و منقبت میں متعدد قصائد لکھے۔ انشاء نے بھی زور طبع صرف کیا۔ شعر الہند میں ہے کہ اُس عہد کے ایک باکمال بزرگ حضرت شاہ غلام محی الدین اُویسی نے قرآن مجید کی تفسیر منظوم کی۔ البتہ دور وسطیٰ میں ناسخ و آتش نے صرف غزل کو جولانگاہ بنایا۔ اس دور کی شاعری میں دو اسکول نظر آتے ہیں۔ حنفی۔ شیعی۔ حنفی اسکول نے خلفائے راشدین کی شان میں بھی قصائد لکھے لیکن شیعی اسکول میں مناقب اہل بیت کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔ مولوی غلام امام شہید جو اینٹھی مضافات لکھنؤ کے باشندہ تھے انھوں نے اودھ میں مذہبی شاعری کا سنگ بنیاد رکھا اور غزل، مثنوی، قصیدہ، ترجیع بند غرضکہ جملہ اصناف شاعری میں نعت گوئی کو وسیلۂ نجات تصور کیا اور شاعرانہ رنگ کی آمیزش اور تشبیہات و استعارات سے نعت گوئی کو مقبول بنایا۔ علاوہ ان کے اُسی دور میں لطف علی لطف نے بھی نعت گوئی کی اور جو کچھ لکھا مدح رسول میں لکھا، گو وہ غلام امام شہید کا زور و اثر اپنے کلام میں پیدا نہ کرسکے۔ تاہم جوش مذہبی سے اُن کا کلام خالی نہیں ہے۔ اُسی زمانہ میں شہیدی نے نعت میں خوب خوب لکھا اور حق یہ ہے کہ کیفیت و تاثر کے لحاظ سے اُن کی نعت گوئی خاص مرتبہ کی چیز تھی۔

دور آخر میں اس طرف بہت کم توجہ کی گئی اور صرف محسن نے اس حیثیت سے غیر معمولی شہرت حاصل کی مضامین کی بلندی الفاظ کا شکوہ بندش کی چستی اُن کا خاصہ نہیں تھا۔ اور رعایت لفظی کا بھی وہ خاص طور پر التزام رکھتے تھے۔ ان کے کلام میں کیف و اثر کوٹ کوٹ کر بھرا تھا جس کا تعلق وجدان سے ہے۔ اُنھوں نے نعتیہ قصاید لکھے۔ مثنویاں لکھیں اور استعارات کی جدت تشبیہات کی لطافت بندش کی چستی کو کسی جگہ ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ جہاں صفائی و سادگی سے کام لیا ہے وہاں بھی وہی کیف و وقار کا عالم ہے۔

صوفیانہ شاعری | سب سے پہلے جو کتاب تصوف کی نظم میں لکھی گئی وہ من لگن تھی جو خواجہ محمود بحری کی تصنیف ہے اسکے بعد صوفیانہ شاعری کو بہت ترقی ہوئی۔ خواجہ حسن حسن نے مسئلہ وحدت الوجود کو اُردو میں نظم کیا اور کلیم نے فصوص الحکم کا اُردو نظم میں ترجمہ کیا۔ میر فضل علی دانا نے ترک دنیا کر کے صوفیانہ شاعری کو اختیار کیا۔ تذکرہ میر حسن سے پتہ چلتا ہے کہ

شیخ فرحت نے بھی کچھ اشعار صوفیانہ رنگ کے کہے۔ خواجہ میر درد نے اس صنف خاص کو اپنا لیا۔ میر حسن کی مثنوی رموز العارفین حیدرآباد سے شایع ہو گئی جس میں نکات تصوف کو قصص و حکایات کے پیرایہ میں سمجھایا ہے۔ راسخ نے نور الانظار مثنوی لکھی اور حکایات و تمثیلات سے تصوف و اخلاق کی تعلیم دی اس کے بعد قدما کا تیسرا دور شروع ہوا تو صاحب شعر الہند کے الفاظ میں شاعری فقر و تصوف کی آغوش سے نکل کر امرا اور رؤسا کے دامن میں پرورش پانے لگی اگرچہ اس دور میں بھی گوشہ نشین مصحفی نے قدما کی ایک یادگار کو محفوظ رکھا، "تاہم بالعموم صوفیانہ شاعری کی رَو رک گئی۔ اور انشا و جرأت کے " خارج از آہنگ" نغمات نے اس کو بالکل پست کر دیا۔

اودھ کے شاعروں میں ناسخ اور تلامذۂ ناسخ اس کوچہ سے ناواقف ہی رہے آتش اور اُن کے تلامذہ خلیل، رند، صبا۔ کے کلام میں کسی حد تک تصوف کی چاشنی ضرور پائی جاتی ہے لیکن رموز تصوف سے یہ لوگ بھی آشنا نہیں تھے۔ البتہ شاہ تراب علی کاکوروی کا اُردو کلیات صوفیانہ شاعری کا اچھا ذخیرہ ہے۔

اخلاقی شاعری دور وسطیٰ میں ناسخ نے اخلاقی مسائل کے لئے صائب کا تمثیلی رنگ اختیار کیا لیکن یہ تقلیدی طریقہ صرف شاعرانہ زور استدلال ظاہر کرنے کا ایک ذریعہ تھا اس لئے یہ لوگ اپنے کلام میں اخلاقی اثر قائم نہ کر سکے۔ آتش اسکول میں قناعت توکل تجرد استغنا کے مضامین البتہ پائے جاتے ہیں لیکن اس کے بعد امیر و جلال نے اس صنف شاعری کو بالکل ہاتھ نہ لگایا۔

ہنگامہ مشرق ۱۸۵۷ء انتزاع سلطنت کے بعد دلی اور لکھنؤ دونوں ویران ہو گئے ادبی انجمنوں کا خاتمہ ہو گیا۔ ہزارہا لتب خانے نذر آتش ہو گئے اور جو باقی بچے وہ یا تو نخاس میں آئے اور ردیوں کے مول بکے یا گھروں میں سڑگل کر تباہ و خراب ہوئے ارباب کمال ایک ایک کر کے اُٹھ گئے کچھ رامپور گئے اور کچھ حیدرآباد چلے گئے لیکن یہ جماعت زبان کی امین تھی جہاں گئی اپنی خصوصیات کلام کو ساتھ لیتی گئی گو وہ گھرانے جہاں کی اُردو مستند تھی دونوں جگہ ختم ہو گئے لیکن اودھ میں ایک بات ضرور باقی رہی کہ مضافات لکھنؤ میں بلگرام، سندیلہ، خیرآباد، کاکوری میں علم و فن کا چرچا باقی رہا اور اس لئے ان قصبات سے جو پس ماندگان لکھنؤ آکر آباد ہوئے وہ اُردو کی خدمت پر بہت تندہی سے تیار ہو گئے اور گو لکھنوی و غیر لکھنوی کا فرق ہمیشہ قایم رہا لیکن مضافات اودھ والوں کو ہمیشہ لکھنوی تسلیم کیا گیا۔

اثرات ما بعد ہنگامۂ غدر کے اثرات یہ ہوئے کہ قلوب میں اضمحلال اور طبیعتوں میں افسردگی پیدا ہوتی گئی۔ ایام عیش کے افسانے خواب ہو گئے۔ حکومت و جاہ کا نشہ ہرن ہو گیا۔ عیش کی داستانیں اور جوانی کے ولولے اور دولت کی ترنگیں سب خاک میں مل گئیں شاعری میں بھی انقلاب ہوا شہر آشوب تصنیف کئے گئے۔ اور وہ طرز شاعری جو نصیر الدین حیدر، امجد علی شاہ، واجد علی شاہ جانعالم کے دور میں چمک چکا تھا سرد ہو گیا رعایت لفظی ضلع، جگت، استعارہ، تشبیہ سب بھولی بسری کہانیاں ہو گئیں۔

تہذیبِ جدید جب انقلاب حکومت کے بعد ہندوستان میں کسب معاش کے لئے انگریزی تعلیم ضروری سمجھی گئی تو سرسید نے علیگڈھ میں مدرسۃ العلوم کی بنیاد رکھی، اودھ میں بھی کیننگ کالج کھولا گیا اور مختلف مدارس ثانوی جاری کئے گئے، آخر کار ایک جماعت جدید تعلیمات سے آراستہ ہوکر ملک میں رونما ہوئی اور یہی ابتدا تھی جدید شاعری کی ۔ اودھ میں نئے سرے سے ادبی انجمنیں قائم ہوئیں مشاعرے ہونا شروع ہوئے رسائل نکلے، مطابع کھولے گئے ۔ اخبارات کا اجرا ہوا ۔ لیکن ان ادبی خدمات کی سرپرستی حکومت سے متعلق نہ تھی بلکہ انفرادی مساعی پر محمول تھی ۔ اور مختلف روسا نے ان بدنصیب شعرا کی عزت افزائی کی جو خود اپنی زندگی سے عاجز ہوچکے تھے اور اس سلسلہ میں راجہ نوشاد علی خاں راجہ امیر حسن خاں اور حامد علی خاں بیرسٹر کے نام خصوصیت کے ساتھ نمایاں نظر آتے ہیں

حالی کا مقدمہ شعر و شاعری اسی دور میں خواجہ الطاف حسین حالی نے مقدمہ شعر و شاعری (جو اصل میں اُن کے دیوان کا مقدمہ ہے) شایع کیا ۔ یہ تنقید بے لاگ تھی اس مقدمہ نے آگ لگادی اور لکھنوی شاعری پر اعتراضات کی بھرمار ہونے لگی یہاں تک کہ اُردو شاعری کی طرف سے لوگوں کو تنفر پیدا ہونے لگا ۔

یادِ رفتگان لیکن ایک نوجوان طبقہ جو سیاست و شاعری و ادب و مذہب کا بڑا علمبردار تھا سید سجاد حسین کی قیادت میں ادب کی پشت پناہی کے لئے اُٹھ کھڑا ہوا اور ایک بے ضابطہ کلب اودھ پنچ کے دفتر میں قائم کیا جس کے سر برآوردہ اراکین میں مرزا مچھو بیگ عاشق (ستم ظریف) نادر کاکوروی، پنڈت تربھون ناتھ ہجر، منشی محفوظ علی کاکوروی، پنڈت جوالا پرشاد برق، منشی احمد علی کسمنڈوی، نواب سید محمد آزاد، خان بہادر اکبر حسین اکبر، منشی احمد علی شوق قدوائی، منشی واحد علی ابر، پنڈت رتن ناتھ سرشار، پنڈت بشن نراین در کے نام نظر آتے ہیں ان میں بعد کو مولوی نور الحسن نیر مولف نور اللغات منشی امیر احمد علوی، منشی ارتضا علی شرر اور سید اعجاز حسین علوی اعجاز کا بھی اضافہ ہوا ۔ اس طبقہ نے قدیم شاعری کی جانب سے مقدمہ شعر و شاعری کا جواب دینا شروع کیا ۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ اہم خدمت منشی امیر احمد علوی نے انجام دی یعنی انھوں نے سید فضل الحسن حسرت موہانی کے اصرار سے معترضین کا جواب اُردو شاعری کے عنوان سے اردوئے معلیٰ میں لکھا ۔ جو بہت مقبول ہوا اور اُسی وقت سے اُردو شاعری کے شہ پاروں کی انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ میں قدر ہونے لگی اور شکسپیر، بایرن ۔ جانسن شیلے، ورڈس ورتھ کے ساتھ ساتھ انیس محسن، امیر، غالب، میر، مصحفی وغیرہ کے ناموں سے بھی کان آشنا ہونے لگے ۔

اودھ کے جدید شاعر اسوقت لکھنؤ اسکول کے جدید شعرا میں اچھے اچھے کہنے والے موجود ہیں مثلاً آرزو، صفی، عزیز، اثر، آشفتہ سراج اور ثاقب وغیرہ لیکن اگر دہلی لکھنؤ کے امتیاز کو نظر انداز کرکے تمام ہندوستان کو پیش نظر رکھا جائے تو ملک میں اور بھی بہت سے اچھے شاعر نظر آتے ہیں، لیکن جس حد تک صرف تغزل کا تعلق ہے حسرت موہانی کا جواب نہیں ۔ مشیر احمد علوی ناظر بی ۔ اے ۔ کاکوروی

دہلی کے وہ شعراء جو لکھنؤ یا جوار لکھنؤ کی طرف گئے

اشرف علی فغاں — تقریباً ۱۱۶۸ھ میں دہلی سے اپنے چچا ربیع خاں کے پاس مرشد آباد گئے اور وہاں سے لوٹتے ہوئے فیض آباد میں ٹھہر گئے (نواب شجاع الدولہ کا ابتدائی زمانہ تھا) لیکن پھر عظیم آباد چلے گئے اور راجہ شتاب رائے کے پاس ساری عمر ختم کردی۔ ۱۱۸۶ھ میں انتقال ہوا۔

قیام الدین قائم — سودا کے ہمعصر تھے، دہلی کی تباہی کے بعد یہ بھی غالباً ۱۱۷۰ھ کے قریب نواب محمد یار خاں (نواب فیض اللہ خاں رئیس رامپور کے بھائی) کے پاس ٹانڈہ چلے گئے اور سو روپیہ مشاہرہ قرار پایا۔ جب نواب محمد یار خاں مرہٹوں کے فتنہ کے زمانہ میں رامپور چلے گئے تو یہ بھی وہیں پہونچ گئے اور ۱۲۱۰ھ میں انتقال کیا۔

سودا — پہلے فرخ آباد نواب احمد خاں غالب جنگ کے دیوان مہربان خاں رند کے پاس رہے۔ پھر ۱۱۸۵ھ میں فیض آباد آئے، نواب شجاع الدولہ کا زمانہ تھا۔ اس کے بعد عہد آصف الدولہ میں لکھنؤ آگئے اور یہیں آخر عمر تک رہے۔ ۱۱۹۵ھ میں انتقال ہوا۔

سید محمد میر سوز — تقریباً ۱۱۷۰ھ میں دہلی چھوڑ کر پہلے مہربان خاں رند کے پاس فرخ آباد گئے، اس کے بعد ۱۱۹۱ھ میں لکھنؤ ہوتے ہوئے مرشد آباد گئے اور جب دوبارہ ۱۲۱۲ھ میں لکھنؤ پہونچے تو نواب آصف الدولہ کے اُستاد ہوئے یہیں ۱۲۱۳ھ میں وفات پائی۔

میر — ۱۱۹۷ھ میں بہ عہد نواب آصف الدولہ لکھنؤ پہونچے۔ ۳۰۰ ماہوار تنخواہ مقرر ہوگئی اور اخیر عمر تک یہیں رہے ۱۲۲۵ھ میں انتقال ہوا۔

ضیاء الدین ضیاء ــ دہلی کی تباہی کے بعد شجاع الدولہ کے زمانہ میں فیض آباد آئے۔ ٹھیک تاریخ کا پتہ نہیں چلتا۔ پھر لکھنؤ آگئے اور چند دن بعد عظیم آباد چلے گئے۔ یہاں شتاب رائے کے بیٹے نے ان کی قدر کی۔ یہیں ان کا انتقال ہوا۔ تاریخ وفات نامعلوم ہے۔

میر محمد باقر حزیں ــ (شاگرد میرزا مظہر) دہلی چھوڑ کر عظیم آباد نواب صولت جنگ کے پاس چلے گئے تھے۔

میر حسن ــ عنفوان شباب میں دہلی سے فیض آباد گئے اور نواب سالار جنگ بہادر کی قدر دانی سے مرزا نوازش علی خاں ان کے صاحبزادہ کی صحبت میں رہے۔ ۱۲۰۱ھ میں انتقال ہوا۔

مصحفی ــ انھوں نے دہلی ۱۱۸۶ھ کے قریب چھوڑا اور نواب محمد یار خاں کے پاس ٹانڈہ پہونچے یہاں قائم پہلے سے موجود تھے۔ اس لئے ان کی وساطت سے رسائی ہوگئی۔ دو چار سال بعد فیض آباد گئے۔ شجاع الدولہ کا زمانہ تھا۔ اور یہ مرہٹوں کے خلاف جنگ میں مصروف تھا اس لئے پھر دہلی چلے گئے اور وہاں سے پھر لکھنؤ آکر مرزا سلیمان شکوہ کی سرکار میں ملازم ہو گئے۔ یہ زمانہ آصف الدولہ کا تھا۔ غازی الدین حیدر کے زمانہ میں ۱۲۴۰ھ میں انتقال کیا۔

انشاء ــ دہلی سے نواب آصف الدولہ کے زمانہ میں لکھنؤ گئے۔ پہلے مرزا سلیمان شکوہ کی سرکار سے متوسل ہوئے، پھر نواب کے دربار سے۔ ۱۲۳۳ھ میں یہیں انتقال کیا۔

شاہ نصیر ــ دہلی کے باشندہ تھے۔ اول مرتبہ مصحفی و انشاء کے زمانہ میں لکھنؤ گئے اور پھر ناسخ و آتش کے دور میں، لیکن زیادہ قیام نہیں کیا۔ اور حیدر آباد چلے گئے۔

نسیم ــ دہلی کے باشندہ تھے۔ واجد علی شاہ کے زمانہ میں لکھنؤ گئے۔ ۱۲۸۲ھ میں یہیں انتقال کیا۔

نظام الدین ممنون ــ دہلی کے رہنے والے تھے لیکن یہ بھی لکھنؤ آئے اور سرکار اودھ نے کافی قدر دانی کی، بعد کو اجمیر کے صدر الصدور ہو گئے۔

دہلی و لکھنؤ کے مشہور شعراء جو رامپور گئے

قیام الدین قائم — سنہ ۱۱۷۰ھ کے قریب نواب محمد یار خاں کے پاس ٹانڈہ پہونچے اور جب نواب رامپور گئے تو یہ بھی وہیں چلے گئے۔

حکیم مومن خاں مومن - نواب یوسف علی خاں ناظم کے عہد میں غدر سے پہلے رامپور گئے اور نواب کے اُستاد ہوئے۔ مومن کا شعر ہے:-

دلّی سے رامپور میں لایا جنوں کا جوش ویرانہ چھوڑ آئے ہیں ویرانہ تر میں ہم

یہاں سے کب واپس گئے اس کا صحیح پتہ نہیں چلتا۔

غالب — غدر کے بعد نواب یوسف علی خاں کے زمانہ میں رامپور گئے اور نواب کے اُستاد ہوئے۔

میر حسین تسکین — شاہ نصیر اور مومن کے شاگرد۔ نواب یوسف علی خاں کے زمانہ میں رامپور پہونچے اور یہیں سنہ ۱۲۶۹ھ میں انتقال کیا۔

ضامن علی جلال لکھنوی - غدر کے بعد رامپور گئے۔ نواب یوسف علی خاں کا زمانہ تھا۔ اس کے بعد نواب کلب علی خاں کے زمانہ میں بھی وہیں رہے۔ پھر لکھنؤ چلے آئے اور سنہ ۱۳۲۵ھ میں یہیں انتقال کیا۔

اسیر لکھنوی — نواب یوسف علی خاں کے زمانہ میں رامپور گئے۔ نواب کلب علی خاں کا بھی زمانہ دیکھا۔ سنہ ۱۲۹۹ھ میں وفات پائی

امیر اللہ تسلیم — غدر کے بعد نواب یوسف علی خاں کے زمانہ میں رامپور پہونچے نواب حامد علی خاں کے زمانہ میں انتقال ہوا (۱۳۲۹ھ)

ظہیر دہلوی — ذوق کے شاگرد تھے لکھنؤ کے ارادہ سے دہلی کو چھوڑا لیکن پہونچ گئے رامپور۔ نواب [illegible] خاں کا زمانہ تھا۔

امیر مینائی — سنہ ۱۲۷۴ھ میں بعہد نواب یوسف علی خاں رامپور گئے۔ جب سنہ ۱۲۸۱ھ میں نواب کلب علی خاں تخت نشین ہوئے تو ان کی بڑی قدر ہوئی۔ نواب کے انتقال پر حیدر آباد گئے اور وہیں سنہ ۱۳۱۸ھ میں انتقال ہوا۔

داغ — غدر کے بعد نواب یوسف علی خاں کے زمانہ میں رامپور پہونچے۔ نواب کلب علی خاں کے عہد میں بھی وہیں رہے پھر حیدر آباد چلے گئے۔

بحر لکھنوی — یہ بھی نواب کلب علی خاں کے عہد میں رامپور گئے تھے۔

اصلاحِ زبان
اور
لکھنؤ کی گراں قدر خدمات

اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ اردو زبان پیدا ہوئی دہلی میں اور پروان چڑھی لکھنؤ میں، یہ بات کہ بچپن میں کس کی گودوں میں پلی ہوش کہاں سنبھالے، اس کا بچپن جوانی سے کہاں بدلا اور آراستہ پیراستہ کن ہاتھوں سے ہوئی اور ترقی کی بلندیوں پر اس کو کن لوگوں نے پہنچایا، اس کا فیصلہ کچھ مشکل نہیں ہے

پیدا ہوئی دلی میں اور رہی دلی میں، پھیلی چمن ہند کے مختلف حصوں میں اور سنواری گئی لکھنؤ میں، اس لیے کہ سلطنت مغلیہ کے زوال کی ابتدا سے دہلی کے بھلے مانسوں کے بیشمار خاندان لکھنؤ آکر آباد ہوتے رہے اور ہمیشہ کے لیے وہیں بس گئے لہذا ہندوستان کے کسی شہر کو دہلی والوں سے اس قدر ربط ضبط کا موقع نہیں ملا جس قدر لکھنؤ کو، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان دونوں شہروں کی زبان میں ایک نوعی مشابہت ہوگئی اور سوا خاص خاص الفاظ اور محاورات کے دونوں جگہ کی بات چیت اور لب ولہجہ میں کوئی مابہ الامتیاز تفرقہ باقی نہ رہا

وہ حضرات لکھنوی یا دہلوی جو اپنے آپ کو زبانِ اردو کا مالک خیال کرتے ہیں اور ان کو اس پر فخر ہے کہ صرف ہم ہی اردو زبان کے کرشن ہیں اور ہماری ہی زبان کو لوگ اپنی زبان تصور کریں اور ہمارے ہی بولے ہوئے روزمرہ اور محاوروں کا اتباع کریں، ان کو اس بات کا لحاظ رکھنا چاہیے کہ اگر وہ ان ہی رنگ رلیوں میں پڑے رہے اور انھوں نے اپنی زبان کی خبر نہ لی اس کے محفوظ رکھنے کے وسیلے بہم نہ پہنچائے اور اس کے الفاظ و محاورات کو بڑی احتیاط اور سمجھ بوجھ سے اکٹھا نہ کیا اور اس کی نظم و نثر کو زمانے کے مزاج کے موافق مرتب نہ کر سکے تو ان کی زبان کا وہ سرمایہ جو ان کے لیے ہندوستان کی دوسری جگہوں کے مقابلے میں مابہ الامتیاز ہے حرف باطل کی طرح اردو کی زریں لوح سے مٹ جائے گا اور یہی بری بھلی اردو جو عام اخبارات اور نئی نئی تالیفات اور تصنیفات کے ذریعے سے ملک کے کونے کونے میں نشو و نما پا رہی ہے اور جس کو وہاں کے لوگ تحقیر آمیز نگاہوں سے دیکھتے رہتے ہیں کچھ زیادہ نہیں دس بیس برس میں یہی ملک کی ٹکسالی اور فصیح بولی کہلانے کی مستحق ہو جائے گی۔

ناسخ کے قواعد

ناسخ کا مقرر کیا ہوا اصول یہ ہے کہ غیر زبان کے الفاظ میں تصرف جائز نہیں سوائے اس حالت کے کہ عوام کے تصرف کی وجہ سے فصحاء بھی اس کے اختیار کرنے پر مجبور ہو جائیں (اس لیے کہ الفاظ اور محاورات کے استعمال میں عوام کا خیال بھی ضروری ہے) یا فصحاء نے خود تصرف کر کے اس قدر رائج کر دیے ہوں کہ وہ روزمرہ بول چال اور محاورے میں آ گئے ہوں مثلاً گر فارسی اگر حرف شرط ہے اس کو اگر ہی باندھنا درست ہے چونکہ روزمرہ میں یہ اگر بگڑ کے بصورت گر ہو گیا اس لیے فصحائے فارس نے اس تصرف کو جائز سمجھ لیا لیکن بعض فصحاء نے اسی اصول پر کہ خاص و عام کی بول چال میں گر نہیں ہے بلکہ اگر ہی ہے اگر ہی کے لفظ کو بغیر کسی تصرف کے جائز مانا ہے، اسی طرح جن ہندی الفاظ میں اردو فصحاء نے تصرف کر کے اس کو اپنا بنا لیا ہے ان کے سوا ہندی لفظوں کا استعمال جائز نہیں مثلاً نمن (طرح) کے معنی میں اور ماس گوشت کے معنی میں، یہی وجہ ہے کہ اس قاعدے نے لکھنؤ اور دہلی کی زبان کو جو بالکل ایک ہی تھی دو مختلف صورتوں میں پیش کیا کیونکہ دلی والوں نے ہندی الفاظ کو جن کی تبدیلی اردو میں موجود ہے استعمال کیا ہے اور لکھنؤ کے فصحاء نے ان کے استعمال سے گریز کیا ہے

یہ دور اصلاح اردو کا میر تقی میر تک جاری رہا اور میر کے آخر زمانے میں جب مصحفی اور انشا موجود تھے ناسخ نے اپنے اصلاحی طرز سے غزل گوئی شروع کی، اور اس میں شبہ نہیں کہ اس جدید انقلاب سے اردو کی دنیا میں ایک انقلاب برپا ہو گیا اول اول تو بعض اساتذہ برا بھلا کہنے پر اتر آئے چنانچہ مصحفی کی غزلیں اس کی شاہد ہیں لیکن جب خیال اور توجہ کرنے سے یہ بات دماغ میں آئی کہ یہ اصلاح قاعدے کے مطابق ہوئی ہے اور ناسخ نے اس کی داغ بیل قواعد صرف و نحو پر ڈالی ہے تو وہ بھی متفق ہو گئے

اردو کی پہلی کتاب قواعد

یہ خیال کہ انشاء نے سب سے پہلے قواعد صرف و نحو مرتب کیے مجھ کو اس سے اختلاف ہے کیونکہ انشاء نے بہت سے اصلاحات اور صرف و نحو کے قاعدے خود ناسخ سے لیے تھے میرے نزدیک افضلیت کا شرف ناسخ کو ہے نہ انشاء کو، اور میری رائے کی تائید صفیر بلگرامی کے جلوۂ خضر سے بھی ہوتی ہے

سب سے پہلی کتاب جو قواعد صرف و نحو میں مرتب ہوئی وہ شاہ حاتم کا مسودہ دیوان زادہ ہے اور صفیر بلگرامی کی بھی یہی رائے ہے کہ "بیشک یہی پہلی تحریر ہے جو قواعد اردو کے نام کو حاصل کر سکتی ہے، شاہ حاتم نے اپنے دیوان زادہ کے دیباچے میں لکھا ہے کہ میں نے تسبیح کو تسبی اور صحیح کو صحی، بیگانہ کو بگانہ اور دیوانہ کو دوانہ کہنا ترک کر دیا لیکن اس ترک کا ثبوت ان کے کلام سے نہیں ملتا، اسی طرح ان کا بیان یہ بھی ہے کہ متحرک کو ساکن اور ساکن کو متحرک کرنا میں نے چھوڑا لیکن ان کے کلام کو دیکھنے سے یہ بات بخوبی ظاہر ہو جاتی ہے کہ یہ ان کی باتیں ہی باتیں تھیں اور ان کے کلام میں وہ متروک کردہ الفاظ پائے جاتے ہیں

مثلاً خَجِل کو خَجَل ؎　دیکھ سرو چمن ترے قد کو ن　خجل ہے پا بگِل ہے بے بر ہے

صحن کو صحن ؎ اے حسن کے گلزار بہار چمن دل　　گلشن ترے آنے پہ ہوا ہے صحن دل

چتر کو چھتر ؎ بادشاہوں کو ہے گر تخت و چھتر کا تکیہ　　ہے فقیروں کے تئیں پیر کے در کا تکیہ

شاہ حاتم ہی دوسری جگہ فرماتے ہیں ہندی کے لفظ مثلاً نین، جگ، نت وغیرہ میں نے ہی نظم اُردو سے مٹائے حالانکہ یہ الفاظ ان کے کلام میں پائے جاتے ہیں مثلاً ؎

مثال بحر موجیں مارتا ہے　　کیا ہے جس نے اس جگ سوں کنارا

آب حیات جانے کسو نے پیا تو کیا　　مانند خضر جگ موں اکیلا جیا تو کیا

البتہ ناسخ نے ضرور اس کی پابندی کی کہ جو لفظ ترک کر دیا، ترک کر دیا ــ نہ خود اسے استعمال کیا نہ اپنے شاگردوں کو استعمال کرنے دیا ہندی الفاظ کے متعلق اس نے یہ اصول مقرر کیا کہ ترکیب کے ساتھ محاورے کی شکل میں یا ضرب المثل کے اندر جائز ہے مثلاً تنہا جگ یا نت کا استعمال تو درست نہیں۔ بہر حال حاتم نے خود عمل کیا ہو یا نہ کیا ہو لیکن یہ بالکل صحیح ہے کہ قواعد صرف و نحو کی طرف سب سے پہلے اُن کو خیال ہوا، دیوان زادہ کے بعد مرزا جان عیش دہلوی کی کتاب ہے جو ۱۲۰۱ھ میں شمس الدولہ نواب احمد علی خان بہادر ذوالفقار جنگ کی فرمائش سے مرشدآباد میں لکھی گئی، اس کے بعد تیسرا نمبر جان گلگرائسٹ کی قواعد کا ہے جو ۱۲۱۱ھ میں لکھی گئی، انشا نے دریائے لطافت ۱۲۲۲ھ میں لکھی جس کا تاریخی نام اردوئے ناظمی ہے یہ مصطلحات عیش کے ۱۶ سال بعد اور قواعد گلگرائسٹ کے ۶ برس بعد لکھی گئی ہے اس لیے یہ عام خیال کہ انشا نے پہلی قواعد مرتب کی درست نہیں ہے۔ ذیل کے نقشوں سے واضح ہوگا کہ ولی دکنی سے لیکر عہد ناسخ تک زبان و محاورات میں کس کس قسم کی تبدیلیاں پیدا ہوئیں،

ولی دکنی اور میر و مرزا کی زبان کا فرق

ولی دکنی کی زبان	تبدیلی الفاظ بوقت میر و مرزا	ولی دکنی کی زبان	تبدیلی الفاظ بوقت میر و مرزا
نین	چشم	اَچھے	ہے
کال	مصیبت	ماس	گوشت
نمن	طرح	موہن	معشوق
درشن	زیارت، دیدار	ستی	سے
ساجن	معشوق	آپس	اپنے
جگ	دنیا	پیو	دوست، معشوق، یار

پیا	معشوق	بنا	بن
برھا	عشق	سون	سے
پگ	پگڑی	مکھ	مُنھ
سنسار	دُنیا	انچھو	آنسو
ہاٹ	رستہ	بوجھے	سمجھے
منے	میں	چند	چاند
سریجن	معشوق	کدھیں	کبھی
دوجا	دوسرا	اِتا	اِتنا
لگ	تک	درس	زیارت
کن	پاس	دارو	دوا
دستا	مانند	گلنا	پگھلنا
پیتم	معشوق	کدھی	کبھی
تسدن	ہمیشہ	سین	سے
نغمہ بولنا	نغمہ کرنا	آرسی	آئینہ
دربن	آئینہ	جیو	جی
دکھا	دکھا		

میر و مرزا اور ناسخ کی زبان کا فرق

میر و مرزا کی زبان	ناسخ کی زبان	میر و مرزا کی زبان	ناسخ کی زبان
پہنر	لَیَن	آگر	آگے
نپٹ	بہت	طرح غنچہ	غنچہ کی طرح
پرے	الگ	کریو	کیجیو
میں	میں نے	بدلا کرنا	بدلا لینا

لاگا	لگا	اُور	طرف
تین	تو	جوں ایندھن	ایندھن کی طرح
دوانہ	دیوانہ	چلا جا ہے	چلا جاتا ہے
ان نے	اس نے	پگاہ کا نالہ	نالۂ سحر
تجھ بن	بے تیرے	ٹک	ذرا
اس کو پوچھنا	اس سے پوچھنا	میرے موئے گئے	میرے مرنے کے بعد
سجن	صنم	طَرَفْ	طَرْف
حال سہنا	صدمہ سہنا	تجھ تئیں	تجھ تک
پون بہی	ہوا چلی	نت	ہمیشہ
رنگ جھمکے ہے	رنگ جھلکتا ہے	بدشراب	بدمست
کسو	کسی	نہُڑنا	جھکنا
جامۂ کم گھیر	کم گھیر کا جامہ	رو رکھنا	منھ رکھنا
اس دم تئیں	اس وقت تک	جاگہ	جگہ
شمع کا گلنا	شمع کا پگھلنا	اس کنے	اسکے پاس
داغ ہوں	داغ کھاتا ہوں	قاصد چلانا	قاصد بھیجنا
ندان	ہمیشہ	دارو	شراب
لوہو	لہو	انتہا لانا	انتہا کو پہونچنا
بستار	شہرہ	جائے باش	جائے بود و باش
دخترِ تاک	دخترِ رز	ہلاکی کو پہونچنا	ہلاکت کو پہونچنا
دامن چلنا	دامن مسکنا	بھروسا پڑنا	بھروسا ہونا
سر کو فرو لانا	سر کو فرو کرنا	خرابا پھیلنا	خرابی پھیلنا
جانا جاتا ہے	سمجھا جاتا ہے	نمط	طرح
ہر پات ہرے کے اوجھل	ہر ایک ہرے پتے کے اوجھل	اس کے گئے	اسکے جانیکے بعد
خاک میں رُل جانا	خاک میں مل جانا	دار کھینچنا	دار پر کھینچنا
دریا کا سا	دریا سا	پالہ	پیالہ

دہلوی اور لکھنوی زبان کا فرق

الفاظ و محاورات دہلی	نام شاعر مع سنہ	کلام		لکھنوی زبان
تا	مصحفی سنہ ۱۲۴۰ھ تک (?)	لب زخم قلم ذرا وا ہو	تا کہیں تجھ سے نالہ پیدا ہو	تاکہ
پیچاک	"	کہیں پیچاکِ آہ کر تحریر	دے بنا زلف کی کہیں زنجیر	پیچ و خم
طراحی، دور کھنچنا	"	تیری طراحیوں سے دور کھنچا	کئی اہلِ سخن نے اس کو لکھا	طرحدار، دور تک کھنچنا بہت مشہور ہوا
رمز جتانا	"	رمزِ شق القمر جتا دے تو	معجزہ اپنا ٹک دکھا دے تو	راز بتا دینا
نپٹ	"	ایک جا اک جوانِ خوش ظاہر	تھا نپٹ فنِ عشق سے ماہر	کامل بحت
نادیدہ	"	بہ تقاضائے عشق سنجیدہ	لیکن اس پر بھی تھا وہ نادیدہ	ندیدہ، لالچی
جوں، دوں	"	جوں پہ اس کے سما گئی جی میں	دوں کچھ اس کے بھی آگئی جی میں	جونہی، جیسے ہی اسیوقت، ویسے ہی
ناگہ، حیران وار	"	جس کا ناگہ ہوا ادھر سے گزار	وہ رہا دیکھ اس کو حیراں وار	ناگہاں، حیران
دھائے	"	یک بیک اس جوان پر دھائے	لڑکے کیا آئے اک بلا آئے	چڑھ دوڑے
آنکھ مندنا	معروف سنہ ۱۲۶۴ھ تک (?)	اور تو باتیں بری چھٹ گئیں سب جیتے جی	آنکھ مندی پر چھٹا ایک نگر دیکھنا	آنکھ بند ہونے پر
ہوئینگے	"	اس بڑھاپے میں بھی کم ہوئینگے لہری ہمسے	سبزہ رنگوں سے چھنا کرتی ہے گہری ہمسے	ہونگے
دلے	"	رُوٹھنے کو تو چلے روٹھ کے ہم واں سے دلے	لڑکے تکتے تھے کہ اب کوئی منا کرلے جائے	ولیکن
آ	"	چشم ترسے گرچہ آ مژگاں پہ پانی بھر گیا	اس پہ بھی تو نوح کے طوفاں کا پانی پھر گیا	آکر
دیکھوں ہوں	فراق سنہ ۱۲۱۱ھ تک (?)	میں رکھ کے ہاتھ جو سینے پہ اپنے دیکھا ہوں	قدم جو رکھوں تو نقشِ قدم نہیں ہوتا	دیکھتا ہوں
تلک	"	دامن تلک گیا تھا کہیں اس کے دستِ وہم	اللہ ری نازکی وہیں چولی مسک گئی	تک

نسط | شاہ نصیر ۱۲۵۴ھ تک | کمان و تیر نسط ربط تھا مجھے اس سے | جب اس نے آپ کو کھینچا میں گوشہ گیر ہوا | کی طرح
کبھو، چھائیاں | ؍ | کبھو جو اس رخ روشن پہ چھائیاں دیکھیں | گھٹائیں چاند پہ سو بار چھائیاں دیکھیں | کبھی، چھائی ہوئی
دیکھ | ؍ | فلک پہ دیکھ مرے دودِ آہ کا ٹکڑا | گھٹا ہے شرم سے ابرِ سیاہ کا ٹکڑا | دیکھ کر
سہمے ہے کیا | ؍ | تیرِ خاکی ہے نگاہِ سُرمہ آلودگی دیکھ | مرغِ دل سہمے ہے کیا! ہے گا نشانہ تیر کا | کیا سہما جاتا ہے
کیونکہ | ؍ | ہو ذوق ساقیا! بطے کے شکار کا | پھندا بناؤں کیونکہ نہ بارش کے تار کا | کیونکر
چشم (بمعنی اُمید) | ؍ | خاک اب پروانۂ دل سوز رکھے تجھ سے چشم | تیری آنکھوں پر تو چربی چھا گئی یک بار شمع | امید
سُوجھے ہے | ؍ | سرکشی بے وجہ کچھ کرتی ہیں زلفیں آپ کی | مجھ کو سُوجھے ہے کہیں یہ مار اب کھا دیں نہیں | معلوم ہوتا ہے
آئے جائے ہے، چیتو | ؍ | اے غافلو! دم از وصفت آئے جائے ہے | چیتو! کہ نخلِ عمر کو یہ کھائے جائے ہے | آتا جاتا ہے، ہوشیار رہو
کاڑھنے | ؍ | قبا دیکھی ہے پھلکاری کی یہ کس ماہ پارہ کی | فلک جو کاڑھنے سیکھا ہے ٹوپی چاند تارہ کی | کاڑھنا

وہی، ہوویگا | میر ممنون ۱۲۶۰ھ تک | بخدا بندے کو وہی خطِ آزادی ہے | نامہ اغیار کو گر اب کی رقم ہووے گا | وہی، ہوگا
تقاضا کا | ؍ | الٰہی وہ جو وعدے ہیں وفا کس طرح ہوویں گے | نہ واں خو یاد آنے کی نہ یاں شیوہ تقاضا کا | تقاضے کا
دُنبال | ؍ | ہیں رواں ناقے کے دُنبال ہزاروں بیتاب | دیکھیو پردہ محمل نہ اٹھانا اپنا | پیچھے

تیرے بن | شیخ ۱۲۶۱ھ تک | تیرے بن جب تک کہ میرا دم رہا | آہ اور نالہ ہی بس ہر دم رہا | بے تیرے

آفت رسیدگاں کا | احسان ۱۲۶۶ھ تک | پہونچ اے اجل کہ لب پر اٹکا ہر کام جاں کا | حامی ہے کون تجھ بن آفت رسیدگاں کا | آفت رسیدوں کا

اس سبب | عارف ۱۲۶۸ھ تک | اے پری تیری زباں کی نہیں فہمید ہمیں | اس سبب اُٹھتی ذرا لذتِ دشنام نہیں | اس سبب سے
کیجے | ؍ | مجھ کو اور آپ کو عالم میں نہ رُسوا کیجے | آپ ہو رہیے مرے یا مجھے اپنا کیجے | کیجئے

دکھلا دکھلا | تسکین ۱۲۶۶ھ تک | دیکھے کیا میری طرف یار ہے اس کو اپنی | چشمکیں غیر سے کرنیں مجھے دکھلا دکھلا | دکھلا دکھلا کر
کُو | ؍ | اُس کُو میں مجھ کو جانے سے کرتا ہے منع ہائے | ناصح کو کوئی جا کے کرے پاسبانِ غیر | کوچہ
تسکین دِہ | ؍ | نام تسکین دہ یہ مضمون تپش نازیبا | تھا تخلص جو سزاوار تو بے تاب مجھے | تسکین دینے والا

لفظ	شاعر	مصرع	اصلاح	لفظ
جائے جائے	مومن ۱۲۶۸ھ تک	بعد مدت اسی کو سے یوں پھرے شب تنگ آکر	جائے جائے پھرتے ہیں پوچھتے ہیں مکاں اپنا	جگہ جگہ
خطوں	″	کیا جواب آئے کہ کثرت سے مرے خطوں کے	کھیا اب سیاہی بنی صنعت کاغذ	خطوں (بلا تشدید)
مسیحی	″	لب کا ترے دعویٰ مسیحی	مراد رہ آزمائیں گے ہم	مسیحائی
کھوے	″	کیوں گر نہ مرے مت مل تو کھوے طعن سے رگ کر	یہ کیوں کس واسطے ہم تیرے لیے ہوگئے بس ہیں	ٹوکتا ہے یا تو کہے
صورت بلبل گلستاں بیاں	″	برنگ صورت بلبل نہیں نوا سنجی	یہ کیا ہوا کہ چپ لے گلستاں بیان لگی	تصویر بلبل رنگیں بیاں
بہلے بہل	″	پیغام سے بن سکے ہو کیونکر تسکین	باتوں میں بہل جائے عاشق ہی نہیں	بے ملے بہل بروزن محل
شمرہ	″	دل ایسے شوخ کو مومن نے دے دیا کہ وہ ہے	محب حسین کا اور دل رکھے شمر کا سا	شمرہ
پاؤں وہ نازک	″	بجائے گریہ خاک میں اس نے وہاں کی خاک	گل کی تھی کیونکہ پاؤں وہ نازک پھسل گیا	وہ نازک پاؤں
ہر بار لگا	″	تا بخیے چاک گریباں کو تو ہر بار لگا	ہاتھ کٹوا دوں جو ناصح رہے اک تار لگا	ہار لگا کرتا بخیے
سم کھا موے	″	سم کھا موے تو دردِ دلِ زار کم ہوا	بارے کچھ اس دوا سے تو آزار کم ہوا	زہر کھا کر مر گئے
تغافلِ بسیار	″	ہر چند اضطراب میں میں نے کمی نہ کی	تو بھی نہ واں تغافلِ بسیار کم ہوا	تغافلِ کثیر
دوگیا	″	شوخیٔ قاتل کے میں قربان ہوں	کہتے رہے سب، یہ گیا دوگیا	وہ گیا

لفظ	شاعر	مصرع	اصلاح	لفظ
کھوج	ذوق ۱۲۷۱ھ تک	اُسے ہم نے بہت ڈھونڈھا نہ پایا	اگر پایا تو کھوج اپنا نہ پایا	سُراغ
دارو	″	پیرِ مغاں کے پاس وہ دارو ہے جس سے ذوق	نامرد مرد - مردِ جواں مرد ہوگیا	دوا
روشِ مرد	″	سو بار مر کے عاشقِ جاں باختہ ترا	اٹھنے لو پھر کھڑا روشِ مرد ہوگیا	بصورت مرد
تا جی سے	″	آئے تو کہاں جائے نہ تا جی سے کوئی جائے	جب تک اسے غصہ نہیں آتا نہیں آتا	جبتک جی سے
ناچار، سب فن	″	قسمت ہی سے لاچار ہوں اے ذوق وگرنہ	سب فن میں ہوں میں طاق مجھے کیا نہیں آتا	ناچار، ہر فن
ناا	″	دیا قمری کو مصرع نا لا	مصرع قدِ سرو پر بالا	نالہ

لفظ	شاعر	مصرع	اصلاح	لفظ
پریشان حالوں کی / دیکھ	رند ۱۲۷۰ھ تک	پریشان حالوں کی جب قدر جانو / ہوگیا اس کو دیکھ حیراں دل	جو اس طرح ہو دل پریشاں تمہارا / بات کرنے کا حوصلہ نہ ہوا	پریشاں حالوں کی بغیر اظہار نون / دیکھ کر

لفظ	شاعر	مصرع	اصلاح	لفظ
کوئی دن کی	نسیم ۱۲۷۳ھ تک	توبہ تو کوئی دن کی ہے پھر آپ ہی حضرت	قابو میں نہ دل ہوگا تو کیا کیا نہ کریں گے	چند دن کی

لفظ	شاعر	مصرع اول	مصرع ثانی	بجائے
سبک رفتہ	شفق ۱۲۹۱ھ تک	ہم سبک رفت چلے جانب صحرائے عدم	سیر ہستی کی مبارک ہو گراں جانوں کو	سبک رو
پارہ	[illegible]	عرضِ خم پوست ال بھی دے اس کے تیغِ عشق	میں پارہ عمر بھر نہ کرد ایا اندمال کا	فکر، خیال
خضر	”	ہوں راہ رو اس وادی پر خوف و خطر کا	جس میں نہ ملا نقش قدم تک بھی خضر کا	خضر
ناموس	”	ناموس ضبط کھوتی ہے کیوں اے صدائے حور	اس بدگماں کو ہو نہ گماں مجھ پر آہ کا	عزت
راز دیتے نہیں	”	راز دیتے نہیں ہم، دوست ہو یا دشمن ہو	حال کہہ دیتے ہو تم غیر سے کیونکر اپنا	راز کہتے نہیں
ملنے کو ہوگا	داغ ۱۳۰۲ھ تک	آپ کے سر کی قسم داغ کو پروا بھی نہیں	آپ کے ملنے کو ہوگا جسے ارماں ہوگا	ملنے کا ہوگا
کوئی روز	”	ہائے وہ مان کہاں یہ غمِ جاناں ہوگا	خانۂ دل تو کوئی روز میں ویراں ہوگا	چند روز
اب سے	”	زندگی عشق میں مشکل ہے تو مر جائیں گے	اب سے وہ کام کرینگے کہ جو آساں ہوگا	آئندہ سے
سندیسا	”	سن کے وہ حال مرا غیر سے فرماتے ہیں	آئے ہیں آپ محبت کا سندیسا لے کر	پیام
عاقبت	”	عاقبت کثرتِ عصیاں سے مرے گھبرا کر	رہ گیا کاتبِ اعمال کو لکھنا باقی	آخرکار
سحر کہتا ہے	”	دمِ اعجاز مسیحا کو برا کہتا ہے	لب ترا سحر کچھ اے ہوش ربا کہتا ہے	سحر کرتا ہے
صبر کیے سے	”	کچھ صبر کیے سے بن نہ آیا	یوں بھی تو بہت دنوں بسر کی	صبر کرنے سے
اپنے بھی عکس سے ہے	”	اللہ رے غرور کہ آئینہ دیکھ کر	اپنے بھی عکس سے ہے شکایت سلام کی	ہے اپنے عکس سے بھی
کہے بنا	”	محشر میں حالِ دل دمِ پرسش کہے بنا	کیا کیا مرے جواب نے رسوا کیا تجھے	کہتے بنا
ادا چھانا		پھر ادا اتنا نہ سر سے پاؤں تک چھائی ہوئی	اُف تری کافر جوانی جوش پر آئی ہوئی	کیفیت طاری ہونا

داغ کا کلام البتہ شروع سے آخر تک دیکھ جائیے ان مزخرفات سے پاک ہے لیکن کہیں کہیں انھوں نے بھی وہی الفاظ و محاورات باندھے ہیں جو لکھنؤ میں متروک ہو چکے مگر ایسا شاذ و نادر ہے۔

بعض مقامات پر داغ نے خاص خاص دہلی کے محاورات لکھے ہیں جو لکھنؤ میں بالکل استعمال نہیں کیے جاتے۔

	مصرع اول	مصرع ثانی	بجائے
مثلاً	عاقبت کثرتِ عصیاں سے مرے گھبرا کر	رہ گیا کاتبِ اعمال کو لکھنا باقی	آخرکار
”	دمِ اعجاز مسیحا کو برا کہتا ہے	لب ترا سحر کچھ اے ہوش ربا کہتا ہے	سحر کرتا ہے
”	کچھ صبر کیے سے بن نہ آیا	یوں بھی تو بہت دنوں بسر کی	صبر کرنے سے
”	اللہ رے غرور کہ آئینہ دیکھ کر	اپنے بھی عکس سے ہے شکایت سلام کی	ہے اپنے عکس سے بھی
”	محشر میں حالِ دل دمِ پرسش کہے بنا	کیا کیا مرے جواب نے رسوا کیا تجھے	کہتے بنا

(نور الحسن نیر کاکوروی)

آگرہ اور دہلی کا شاعرانہ تعلق

دہلی اور آگرے کا شاعرانہ تعلق تین حیثیتوں سے واضح کیا جا سکتا ہے

(۱) جغرافیائی حیثیت سے،

(۲) تاریخی حیثیت سے،

(۳) اس حیثیت سے کہ دہلی کے زمانۂ شعر و شباب کی شہرت و عظمت میں شعرائے اکبر آباد (آگرہ) نے کتنا حصہ لیا؟

جغرافیائی حیثیت سے، دہلی، آگرہ اور لکھنؤ آج سے چند سال پہلے تک ایک ہی صوبے کے تین ممتاز شہر تھے، ممالک متحدہ میں انہیں تین شہروں کو وقتاً فوقتاً دار السلطنت بننے کا موقع ملا ہے اور یہی تین مقام مرکز ادب اردو رہے ہیں انتقال دار الصدر کے بعد بھی جغرافیائی حیثیت سے آگرہ، لکھنؤ اور دہلی کے بین بین تھا اور ہے اس لیے دہلی اور لکھنؤ کو آگرے سے وہی تعلق رہا جو کسی نہال کے برگ و بار کو اصل سے ہوتا ہے، ہندوستان کے نقشے میں اب بھی آگرہ، دہلی اور لکھنؤ کے محاذی خطوط کا وسطی حصہ ہے

لہٰذا جغرافیائی اعتبار سے ماننا پڑے گا کہ لکھنؤ، آگرہ اور دہلی ایک ہی زنجیر کی تین کڑیاں ہیں اور لسانی حیثیت سے ان تینوں کو ایک دوسرے سے قطعاً مربوط ہونا چاہیے۔

تاریخی توضیح یہ ہے کہ آگرہ، سکندر لودی، ابراہیم لودی، بابر، ہمایوں، اکبر، جہانگیر اور شاہ جہاں کے عہد سلطنت تک ہندوستان کا پایۂ تخت رہا ہے اور اردو زبان ان میں سے آخری تین بادشاہوں کے زمانے میں ہندی، فارسی، عربی اور ترکی زبانوں کے اختلاط سے بنی ہے

عہد[1] جلال الدین محمد اکبر میں جو مردانہ اور زنانہ بازار قلعہ (آگرہ) میں لگتا تھا اُسے "اردو" کہتے تھے، جہانگیر کے عہد میں بھی یہ بازار آباد رہا

[1] ظہیر الانشار

وہاں لین دین بدستور اسی مخلوط زبان میں ہوتا تھا، شاہ جہاں نے اسے اور رونق دی، یہ شاہی بازار چونکہ احتراماً اور تعظیماً "اُردوئے معلے" کہلاتا تھا اس لیے اس نئی زبانِ مرکب کا نام بھی اُردوئے معلےٰ رکھا گیا۔

صاحب "ظہیر الانشا" کے اس بیانِ محقق سے ظاہر ہے کہ اس مخلوط زبان (اُردو) کی بنیاد سب سے پہلے قلعۂ آگرہ میں پڑی۔ وضع زبان کے بعد پہلے بھاشا (ہندی اُردو) میں شاعری کا رواج ہوا اور پھر اُردو شاعری وجود میں آئی۔

جلال الدین محمد اکبر کے عہد سے عہد شاہجہاں تک فارسی شاعری زیادہ مقبول و مروج تھی جسے مغل سلطنت اپنے آبائی وطن سے ساتھ لائی تھی، اس تمام زمانے میں بھی اکبر آبادی الاصل شعرا موجود تھے۔ مثلاً شیخ ابو واجد فارغی، علامہ فیضی بن ملا مبارک، میر حشمی ملا صبوحی چغتائی، ملا شیدا، محمد امین ذوقی، عبد اللہ سحری وغیرہ وغیرہ، لیکن اردو شاعری کا رواج تدریج عہد اورنگ زیب عالمگیر سے شروع ہوتا ہے۔

عہد شاہجہاں میں جب بعض سیاسی مصالح کی بنا پر حکومت کا پایۂ تخت آگرے سے دہلی منتقل ہو گیا تو آگرے کا دربار اور شعرا نے بھی دہلی کا رُخ کیا حتیٰ کہ جب دہلی سے کاروان ادب لکھنؤ پہنچا تو میر کاروان میر تقی میر اکبر آبادی ہی تھے۔

اگر اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں مرزا عبد القادر بیدل، میر جعفر زٹلی اور نواب لطف اللہ خاں صادق وغیرہ شعرا نے دہلی کے مطلع سخن کو چمکایا تو عالمگیر ثانی کے عہد میں قاضی سراج الدین علی خاں آرزو اکبر آبادی اور مرزا مظہر جانِ جاناں اکبر آبادی خلف مرزا جان علوی آگرے ہی کی شاعر خیز خاک سے اٹھے اور دہلی میں صدر الصدور بن کر بیٹھے۔

میاں نجم الدین عرف شاہ مبارک آبرو کا مولد گوالیار تھا لیکن اگر میر و غالب کی زادگاہ آگرہ ہونے کے باوجود انہیں دہلوی مانا جا سکتا ہے تو آبرو کو اکبر آبادی کہنے میں کوئی چیز مانع نہیں۔ جن کی عمر کا زیادہ حصہ آگرے میں گزرا اور جو عہد عالمگیر ثانی کے بہت مشہور شاعر ہیں عہد محمد شاہ میں (۱۱۶۲ھ) میر باقر علی مخلص اکبر آبادی نے نقل وطن کیا اور دہلی کی محفل ادب کو چار چاند لگا دیئے۔

خان آرزو کے ارشد تلامذہ میں میاں نصرت الدین علی پیام اکبر آبادی بھی اسی عہد کے ممتاز شاعر تھے، بیشتر فارسی میں اور زیادہ تر اُردو میں شعر کہتے تھے، یہ بھی آگرے ہی سے دہلی گئے اور پھر وہیں کے ہو رہے۔

اسی طرح میر باقر علی جعفر اکبر آبادی برادر زادہ نظام الدین ممنون آگرے میں پیدا ہوئے اور آخر عمر میں دہلی چلے گئے۔

میر باقر حزیں اکبر آبادی مرزا مظہر جانِ جاناں کے شاگرد اور سپاہی پیشہ آدمی تھے، سادات آگرہ میں سے تھے، یہ بھی آگرے سے دہلی گئے اور پھر وہاں سے بنگال چلے گئے۔

میر تقی میر، میر عبد اللہ اکبر آبادی کے فرزند اور ہمشیر زادہ سراج الدین علی خاں آرزو تھے۔ آگرے میں پیدا ہوئے یہیں تعلیم و تربیت پائی، یہیں شعر کہنا سیکھا، اور پھر اپنے باپ عبد اللہ کے انتقال کے بعد دہلی چلے گئے، وہاں راجہ ناگرمل کی فاقہ کشی

کچھ دن بسر کیے، دہلی اب اجڑ رہی تھی اور لکھنؤ آباد ہو رہا تھا اس لیے دہلی میں آپ کا قیام زیادہ نہ رہا، اور وہاں سے دوسرے شرفا اور رؤسا کی طرح آپ بھی لکھنؤ چلے گئے۔

محمد عارف عارف اکبرآبادی، میر تقی میر کے دوست، اور شیخ شرف الدین مضمون[1] کے شاگرد تھے، رفوگری پیشہ کرتے تھے جب میر تقی میر دہلی گئے تو عارف اپنے دوست کی مفارقت برداشت نہ کر سکے اور ترک وطن کر کے خود بھی دہلی چلے گئے۔

مغل سلطنت کے آخری تاجدار سراج الدین محمد بہادر شاہ ظفر کے عہد میں مرزا اسد اللہ خاں غالب اکبرآبادی بھی تعلیم و تربیت اور کافی مشق سخن کے بعد آگرے سے دہلی پہنچے۔ مرزا رفیع سودا میر اکبرآبادی کی طرح دہلی چھوڑ کر لکھنؤ جا چکے تھے، مگر ان کے شاگرد رشید شاہ نصیر اور شاہ نصیر کے شاگرد ابراہیم علی خاں ذوق دہلوی کی موجودگی میں مرزا غالب اکبرآبادی نے اپنا پرچم سخن ایسا لہرایا کہ حریف بن کر کوئی ان کے مقابلے میں نہ ٹھہر سکا۔

۱۸۶۹ء یعنی مرزا غالب کی وفات تک، آگرہ اور دہلی کا اتحاد و تعلق شاعرانہ اسی نوعیت سے تھا جس کا ذکر ضمناً میں کر چکا ہوں یعنی آبرو اکبرآبادی، آرزو اکبرآبادی، مظہر اکبرآبادی، مخلص اکبرآبادی، پیام اکبرآبادی، جعفر اکبرآبادی حزیں اکبرآبادی، میر اکبرآبادی، عارف اکبرآبادی، اور غالب اکبرآبادی یہ سب آگرے ہی کی خاک پاک سے تربیت یافتہ تھے آگرے ہی میں پیدا ہوئے، آگرے ہی میں پروان چڑھے یہیں تعلیم پائی، یہیں شاعر بنے اور پھر دہلی کی مرکزیت نے انہیں اپنی طرف کھینچ کر تاریخ ادب اردو کا ہیرو بنا دیا،

یہ میرا خیال یا بیان نہیں ہے، بلکہ اس مضمون کی ترتیب کے وقت میرے مطالعہ کے تحت پر نکات الشعرا، مآثر الامرا، تصویر الشعرا آب حیات، مخزن نکات، منتخب التواریخ، خزانۂ عامرہ، ظہیر الانشا، نتائج الافکار، تذکرہ سرخوش، مرآۃ العالم، گلشن بیخار اور تذکرۃ الانساب وغیرہ کتابیں اور تذکرے موجود ہیں، ان تذکروں کو پیش نظر رکھ کر میں نے جو کچھ لکھا ہے میں اسے ایک تحقیقی نقطۂ نظر یقین کرتا ہوں۔

آگرے اور دہلی کا شاعرانہ تعلق انہیں ارباب فضل و کمال کی ذات گرامی سے پیدا ہوا اور مرزا غالب اکبرآبادی ثم الدہلوی کے عہد پر کچھ عرصے کے لیے ختم ہو گیا،

آگرے میں مرزا غالب کے کئی شاگرد تھے، جن سے مرزا کا سلسلۂ اصلاح و مکاتبت تمام عمر جاری رہا، منشی ہر گوپال تفتہ اکبرآبادی رائے بہادر شیو نرائن آرام اکبرآبادی (سکریٹری میونسپل بورڈ متوفی ۱۸۹۸ء) مرزا تفضل حسین خاں تفضل اکبرآبادی (جو آگرہ میں کتب داری

---

[1] ان کا مولد قصبہ جاجو ضلع آگرہ ہے اس لیے انہیں بھی اکبرآبادی ہی کہنا چاہیے (مخزن نکات)

کرتے تھے پھر ریاست الور میں ملازم ہوگئے تھے) مولوی سید مددعلی تپش اکبرآبادی، شیخ عبدالمجید رسوا اکبرآبادی، بابو ہرگوبند سہائے نشاط اکبرآبادی یہ سب مرزا غالب کے عزیز و شاگرد تھے، ان میں سے اکثر دہلی کے مشاعروں میں بھی شریک ہوئے ہیں۔

مرزا غالب، دہلوی بن جانے کے بعد بھی اپنے مولد و وطن آگرے کو نہیں بھولے، وہ اکثر دہلی سے آگرے آتے رہتے تھے خصوصاً جب کوئی نئی غزل کہتے تو جب تک منشی نبی بخش حقیر اکبرآبادی خلف منشی حسین بخش اکبرآبادی کو آگرے آکر نہ سنا دیتے انہیں چین نہیں آتا تھا۔

منشی نبی بخش حقیر اکبرآبادی کی سخن فہمی کے متعلق مرزا غالب خود فرماتے ہیں:-

اس فرزانہ یگانہ (یعنی نبی بخش حقیر) کو کس درجہ سخن فہمی و سخن سنجی عنایت ہوئی ہے، حالانکہ میں شعر کہتا ہوں اور شعر کہنا جانتا ہوں مگر میں نے جبتک اس بزرگوار کو نہیں دیکھا یہ نہیں جانا کہ سخن فہمی کیا چیز ہے؟ (اردوئے معلیٰ)

مرزا غالب کا اکثر آگرے آنا اُن کے شاگردوں کا دہلی جانا، اور سلسلۂ مکاتبت و اصلاح برسوں جاری رہنا بھی دہلی اور آگرے کے تعلق شاعرانہ پر کافی روشنی ڈالتا ہے۔

انیسویں صدی عیسوی کا آخری دور برطانوی حکومت کی تاسیس و تشکیل کا ابتدائی زمانہ تھا، جب حکومت کو مرکزیت حاصل نہو تو ادب و شعر کی مرکزیت کہاں قائم رہ سکتی ہے؟ مغل سلطنت کے زوال سے جو عظیم سیلاب بے سکونی اٹھا وہ اپنے ساتھ ادبی رجحانات کو بھی بہالے گیا، مرزا غالب کی موت دراصل آگرے اور دہلی کے رابطۂ شاعرانہ کی موت تھی، جہاں تک میرا مطالعہ ہے ۱۸۶۹ء سے ۱۸۹۹ء تک دہلی اور آگرے کا شاعرانہ تعلق تاریخ کے کسی صفحہ سے ثابت نہیں ہوتا۔

اس تمام زمانے میں آگرے اور دہلی کی بساط سخن شعراسے معمور تھی مگر ان میں پہلے سے ربط و اتحاد کا فقدان تھا، آگرہ میں ۲۹، ۳۰ سال تک شاعرانہ طوائف الملوکی رہی، شعر سے ذوق رکھنے والے آگرے ہی کے کسی دیرینہ مشق شاعر کو اپنی غزلیں دکھاتے رہے گو میر و میرزا نے آگرے سے لکھنؤ اور دہلی پہونچ کر آگرے کا جو نام پیدا کیا تھا اسے باقی رکھنے کی کسی نے کوشش نہ کی

مگر فطرت کو آگرے اور دہلی کا یہ قطع تعلق منظور نہ تھا، آخر ان دونوں مراکز ادب کے شاعرانہ تعلق کی تجدید ۱۸۹۹ء میں راقم السطور نے کی یعنی میں نے فصیح الملک نواب مرزا خاں داغ دہلوی سے رشتۂ تلمذ پیدا کرکے آگرے اور دہلی میں پھر ایک شاعرانہ تعلق قائم کر دیا،

خدا کا شکر ہے کہ آج "آگرہ اسکول" "دہلی اسکول" کی طرح ایک علحدہ[1] ادارۂ فکریہ تسلیم کیا جاتا ہے جو محاورات اور مصطلحات اردو میں مرزا داغ دہلوی کے مذہب کا تابع ہے۔

سیماب (اکبرآبادی)

---

[1] جب "آگرہ اسکول" دہلی اسکول کا متبع ہے تو پھر اس کا علحدہ ادارۂ فکریہ ہونا کیا معنی رکھتا ہے؟ (اڈیٹر)

وہ مشہور شعراء جو اودھ یا لکھنؤ میں پیدا ہوئے

یا اُن کا نشو و نما یہاں ہوا

میر شیر علی افسوس — ان کے والد نواب شجاع الدولہ کی سرکار سے متوسل تھے اس لیے ان کا نشو و نما یہیں ہوا۔ بعد کو یہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازم ہو کر کلکتہ چلے گئے۔

میرزا جعفر علی حسرت — سرب سنگھ دیوانہ کے شاگرد، ان کے والد ابوالخیر کی اکبری دروازہ میں عطاری کی دکان تھی، ۱۲۱۷ھ میں انتقال ہوا، انھوں نے شجاع الدولہ و نواب آصف الدولہ کا پورا زمانہ اور نواب سعادت علی خاں کا تھوڑا زمانہ دیکھا ہے

شیخ قلندر بخش جرأت — فیض آباد میں نشو و نما ہوا، جعفر علی حسرت سے مشق سخن کی، اول اول محبت خاں کی سرکار میں ملازم ہوئے اور پھر مرزا سلیمان شکوہ کے دربار میں انشاء کا ان کا ساتھ رہا ہے ۱۲۲۵ھ میں انتقال ہوا۔

غلام علی راسخ — وطن فیض آباد تھا لیکن نشو و نما لکھنؤ میں ہوا، ۱۱۶۲ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۳۸ھ میں بعہد غازی الدین حیدر انتقال کیا۔

میر تقی ہوس — فیض آباد کے رہنے والے تھے لیکن نشو و نما لکھنؤ میں ہوا مصحفی کے شاگرد تھے اس لیے ان کا زمانہ ۱۲۰۰ھ اور ۱۲۴۰ھ کے درمیان رہا ہوگا، تذکروں میں کہیں ان کا ذکر نہیں پایا جاتا، بڑے بے مثل شاعر تھے

شیخ امام بخش ناسخ — (ولادت ۱۲۰۴ھ) فیض آباد میں پیدا ہوئے وہیں نشو و نما ہوا، نواب سعادت علی خاں کے زمانے میں لکھنؤ گئے جب مصحفی اور انشا کا دور دورہ تھا، محمد علی شاہ کے زمانے میں انتقال ہوا ۱۲۵۴ھ ۔

نام	کیفیت
کرامت علی شہیدی	ولادت بانس بریلی میں ہوئی، نشو و نما لکھنؤ میں ہوا، پہلے مصحفی کے شاگرد ہوئے اور پھر شاہ نصیر کے، غازی الدین حیدر کا زمانہ تھا
خواجہ حیدر علی آتش	فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ لکھنؤ آکر مصحفی کے شاگرد ہوئے، نواب سعادت علی خاں کا زمانہ تھا، محمد علی شاہ کے زمانے میں انتقال ہوا۔ (۱۲۶۳ھ)
خواجہ وزیر لکھنوی	گوشہ نشین شخص تھے، غالباً نصیر الدین حیدر کے زمانے میں پیدا ہوئے اور ۱۲۷۰ھ میں انتقال کیا، واجد علی شاہ نے طلب کیا لیکن نہیں گئے، ناسخ کے شاگرد تھے۔
مرزا محمد رضا برق	مرزا کاظم علی خاں (مصاحب واجد علی شاہ) کے بیٹے تھے، ناسخ کے شاگرد تھے، واجد علی شاہ کے ساتھ مٹیا برج گئے اور ۱۲۸۳ھ میں وہیں انتقال کیا۔
میر اوسط علی رشک	فیض آباد میں پیدا ہوئے، نشو و نما لکھنؤ میں ہوا، ناسخ کے شاگرد تھے، نصیر الدین حیدر اور محمد علی شاہ کا زمانہ دیکھا، ۱۲۸۸ھ میں کربلائے معلی میں انتقال ہوا۔
امداد علی بحر لکھنوی	پیدائش ۱۲۲۵ھ بعہد نواب سعادت علی خاں، انتقال ۱۳۰۰ھ
مظفر علیخاں اسیر	نصیر الدین حیدر کے زمانے میں ملازم ہوئے اور واجد علی شاہ کا بھی زمانہ دیکھا، پھر رام پور چلے گئے ۱۲۹۹ھ میں انتقال ہوا۔
ضامن علی جلال	۱۲۵۰ھ میں پیدا ہوئے، امجد علی شاہ اور واجد علی شاہ کا زمانہ دیکھا، غدر کے بعد رام پور چلے گئے نواب کلب علی خاں کے انتقال کے بعد پھر لکھنؤ آ گئے اور ۱۳۲۵ھ میں انتقال کیا،
امیر اللہ تسلیم	پیدائش فیض آباد، نشو و نما لکھنؤ، شاگرد نسیم، محمد علی شاہ، واجد علی شاہ کا زمانہ دیکھا۔ غدر کے بعد رامپور گئے لیکن چلے آئے، نواب کلب علی خاں کے دور میں پھر گئے اور نواب حامد علی خاں کے زمانے میں انتقال کیا (۱۳۲۹ھ)
مرزا سلامت علی دبیر	پیدائش دہلی (۱۲۱۸ھ) ۶، ۷ سال کی عمر میں لکھنؤ آئے (عہد واجد علی شاہ میں) [illegible] میں انتقال کیا،
میر ببر علی انیس	فیض آباد میں پیدا ہوئے (۱۲۲۰ھ) لکھنؤ میں نشو و نما ہوا اور یہیں انتقال کیا
آغا حجو شرف	واجد علی شاہ کے سمدھی تھے اور انھیں کے ساتھ مٹیا برج چلے گئے ۱۲۷۱ھ میں انتقال کیا
مہربان خاں رند	پیدائش فیض آباد (۱۲۱۲ھ) ۱۲۴۰ھ میں لکھنؤ آئے اور آتش کے شاگرد ہوئے
وزیر علی صبا لکھنوی	۱۲۷۱ھ میں انتقال ہوا، اسی سال واجد علی شاہ معزول کیے گئے۔

لکھنؤ اور دلّی اسکول کے ریختی کہنے والے شاعر

ریختی کا رواج کب سے شروع ہوا یا ریختی کب ایجاد ہوئی، اس باب میں ہماری تحقیق یہ ہے کہ سب سے پہلی ریختی سید شاہ ہاشم کے مرید، سید میراں ہاشمی نے لکھی۔ حضرت ہاشمی بیجاپور کے رہنے والے اور علی عادل شاہ بادشاہ بیجاپور کے درباری شاعر تھے جنکی مثنوی یوسف زلیخا بہت مشہور رہے۔ ہاشمی نے ۱۶۹۷ء میں انتقال کیا۔ ان کی ریختی کا یہ نمونہ ہے:-

او جسدن گول کنڈی میں گئی ہو یاد ہیں باتاں — ہمیں تم مل کے بیٹھے تھے سکھی جسدن دلاے میں

مجھے پکڑے ہیں کی چھوڑ دا دو دیکھو ہانک ماردنگی — خدا کی سوں میں کہتی ہوں بڑی بوکو پکاردنگی

سجن آویں تو پردے کے نکل کر بہار بیٹھوں گی — بہانا کر کے موتیاں کا پروتی ہار بیٹھوں گی

رضا گر مجھ کو دیتے ہو کر دل گی گھر میں جا دارد — اگر مجھ ہو دے گی فرصت صبح پھر آؤنگی چھوڑ دو

اگر کوئی آکے دیکھے گا تو دل میں کیا کہے گا جی — مجھے بدنام کرتے ہو کہیں نیں جاؤنگی چھوڑ دو

دوسرے ریختی گو دکن کے سید محمد قادری خاکی تھے جو دلی کے معاصر اور دکن کے مشاہیر پیران طریقت سے تھے، آپ کا دیوان سنہ ۱۱۸۲ھ کا لکھا ہوا بعض کتب خانوں میں محفوظ ہے آپ بھی ہاشمی کی طرح تصوف آمیز ریختی کہا کرتے تھے مثلاً:-

کر دپیو پیر سیں ظاہر یو سب مل سات سکیاں — جنم سب بحر میں غم کے تیرے بن نت یو کھوتی ہوں

یو جاری عین ممکن ہو ملی جب دیکھ بالا سوں — بہی سوں بردکی تب میں نکل پیو سات سوتی ہوں

رہوں میں کب تلک جھرتی جلا کر دل کیتیں کرتی — کہ اب غم کے پہاڑوں پر بہلا ہے سر ٹپرتی ہوں

مدد سوں شاہزادہ کی ترقی پا کے لے خاکی — کبھی وحدت کے دریا میں اپیں پن ڈبوتی ہوں

انہی کے ساتھ اور ایک دکنی شاعر رحیم کے بھی چند شعر ملتے ہیں:-

اری ناداں تیں اپنے سجن کو کیوں روٹھایا ہے — روٹھا کر پیو کو جگ میں کسی نے ذوق پایا ہے

بہت پچتائیگی میری نصیحت مان کہتی ہوں — سکھی کو رات سوہی ہے پیارے کو جو بھایا ہے

تیرے سوں ہوئیگا تجھ مہرباں او پرنہ روٹھے گا ——— روٹھائے کو منائے بن تجھے کیسے سلایا ہے

یہ ریختی گو ۱۱۰۹ھ سے لیکر ۱۱۵۵ھ تک گزرے ہیں اور غالبًا یہ ریختی کا پہلا دور ہے، کیونکہ اس زمانہ میں سوائے دکن کے اور کسی جگہ اس کا وجود نہیں پایا جاتا تھا، ۱۲۱۸ھ کے بعد نواب بدرالدین خاں بہادر امیر جنگ امیر ولد ولہ لائق نے ریختی کہی ہے جو نواب سکندر جاہ بہادر کے داروغہ جواہر خانہ تھے۔

پاس میرے تو کسی ڈھب سے اسے لاری ددا ——— میں بلائیں تیری لیتی ہوں اری جاری ددا

اس موے ماٹھی ملے پر تو دو ہتڑ ماروں ——— یا کوئی اور مجھ تدبیر تو بتلاری ددا

کیا کہا اس نے کہا تیرے سے لائق شب کو ——— تجھ کو لو ہو کی قسم کہہ دے نہ تر ماری ددا

ان کے بعد محمد صدیق قیس کا دور آتا ہے جس نے مستقل طور پر ریختی کا دیوان مرتب کیا۔

قیس حیدر آباد کے مشہور شاعر اور شیر محمد خاں ایمان کے بھانجے تھے اور مہاراجہ چندو لعل اور شمس الامرا امیر کبیر کے مصاحب۔ ۱۲۳۰ھ میں آپ نے انتقال کیا اور چونکہ یہی زمانہ سعادت یار خاں رنگین کا ہے اس لئے بعض لوگوں کو یہ دھوکا ہوا کہ قیس نے رنگین کے دیوان کا جواب کہا ہے یا رنگین کی ریختیوں کو دیکھ کر خود ریختی کہی ہے مگر یہ قرینِ قیاس نہیں ہے کیونکہ رنگین کی ریختی کا دیوان جو انڈیا آفس کے کتب خانہ میں محفوظ ہے اس کا سنہ تصنیف ۱۲۴۹ھ ہے اور قیس نے ۱۲۳۰ھ میں انتقال کیا ہے اس طرح قیس کا انتقال رنگین کے دیوان ریختی کی ترتیب سے انیس سال قبل ہو چکا تھا ظاہر ہے کہ مرنے سے دس بارہ سال پہلے ہی سے قیس نے ریختی کہی ہوگی اس طرح رنگین کے کلام کا قیس کے پیشِ نظر رہنا تقریبًا ناممکن ہے۔

قیس نے اپنے دیوان ریختی پر یہ عبارت لکھی ہے :-

"منتخب دیوان ریختی قیس محاورِ بیگمات شوخ محل بادشاہی شاہجہاں آباد"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قیس نے بیگمات دہلی کی زبان سے متاثر ہو کر انھیں کی زبان میں شعر کہے ہیں اور اس لئے ان کا شمار دہلی اسکول کے ریختی گو شعرا میں ہونا چاہئے۔

قیس نے عمومًا انھیں ردیفوں میں غزلیں کہی ہیں جو رنگین کی ریختیوں کی ہیں نمونہ کے طور پر قیس کے چند شعر نقل کئے جاتے ہیں۔

تو نے چڑیا وہ بنائی ہے کہ بس بول اُٹھے ! ——— تیرے ہاتھوں کے میں قربان گئی مُغلانی!

ٹھیک ہیں مونڈھے تو اس کرتی کے لیکن اتنا ——— تنگ ہوتا ہے گلے میں سے گریبان ددا!

چنپا ٹکا تھا جس کے گریبان کے اوپر ——— کرتی وہ مری کیا ہوئی بسنتائی جمیلا !

لاڈ بازار کو جاتی ہے تو صدقے تیرے ——— بھول مت یاد سے نے آ میری ڈوری انا!

جس کی چڑیا کا وہ عالم تھا کہ اب اُڑ جائے — میں نے باجی سے جو کل شرط میں ہاری انگیا

کیا بنالائی ہے منہیارن ممانی چوڑیاں — میں نہ پہنوں گی کبھی یہ آسمانی چوڑیاں

اب کے رکھی ہوں دوگانا وہ طرحدار اصیل — نوجوان تپلی سی گوری سی دھواں دھار اصیل

قیس کے معاصرین میں اور کوئی ریختی کا شاعر دکن میں نہیں ملتا، البتہ ۱۲۹۰ھ کے ایک ریختی گو شاعر رائے گلاب چند ہمدم کا کلام مولوی سردار علی صاحب نے ہمیں مرحمت فرمایا ہے مگر ہمدم چونکہ رنگین اور انشار کے بعد کے ہیں اس لئے ان کا ذکر رنگین اور انشار کے بعد ہی کیا جانا مناسب ہے۔

انشاء اللہ خاں جو ریختہ کے مشہور شاعر ہیں ریختی کے بھی بڑے اچھے شاعر تھے مرشد آباد میں پیدا ہوئے اور وہیں علوم متعارفہ کی تکمیل کی اور دلّی جاکر شاہ عالم کے دربار میں منسلک ہوگئے مگر چند ہی روز کے بعد دلّی سے جی بھر گیا تو لکھنؤ پہونچے اور مرزا سلیمان شکوہ کے دربار سے تعلق پیدا کر لیا اس کے بعد نواب سعادت علی خاں کے مصاحب ہوگئے ۱۲۲۵ھ میں نواب سے روٹھ کر خانہ نشین ہوگئے اور نہایت ہی پریشان حالی اور تکلیف سے زندگی بسر کر کے ۱۲۳۳ھ میں انتقال کیا۔ رنگین کی تتبع میں ریختی بھی کہنی شروع کی اور ایک دیوان مرتب کر لیا چونکہ انشائی نے دلّی میں زیادہ دن گزارے تھے اور ان کے ریختہ کے کلام میں دہلی اسکول کا رنگ ہے اس لئے ان کا ریختی کلام بھی دہلی ہی کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے چند شعر دیوان سے نقل کئے جاتے ہیں۔

ہاتھوں سے تیرے میں تو کمبخت عاجز آئی — جو کام ہو نگوڑا تیرا سو ہلبلی کا

بندی کی دشمنی میں ناحق جو ہوں الٰہی! — لگ جائے ان کے منہ پر از غیب کا تھپیڑا

چوٹی یہ تیری سانپ کی ہے لہر دوگانا! — کھاتی ہوں تیرے واسطے میں زہر دوگانا!

تھام تھام اپنے کو رکھتی ہوں بہت سا لیکن — کیا کہوں تھم نہیں سکتا مرا اندر والا

پوتوں پھلنا تجھے اور دودھوں نہانا ہو نصیب — بیاہ ہو سونے کے سہرے سے تیری عمر دراز

اری بی ایک ہی عیار ہو تم! — ناک چوٹی میں گرفتار ہو تم!

کچھ نہیں معلوم پوچھو کونسا میلا ہے آج — جاتیاں ہیں جو کھچا کھچ ڈولیوں پر ڈولیاں

میں تیرے صدقے نہ رکھ لے میری پیاری روزہ — بندی رکھ لیگی تیرے بدلے ہزاری روزہ

جو ہم کو چاہے اس کا خدا انت بھلا کرے — دودھوں نہائے اور وہ پوتوں پھلا کرے

رات بھر اپنا تر ستا ہی رہا جی باجی! — اب تو نوبت بھی اُٹھو اجی باجی! باجی!!

میں پھاند کے کل رات جو دیوار نہ جاتی۔ کنڈی نہ ہلاتی۔ جا کر نہ جگاتی

نیند اس کو نہ آتی۔ جوبن کی وہ ماتی۔ تیوری نہ ہلاتی

اور چٹکیوں میں میرے تئیں صبح اڑاتی۔ ہاتھوں پہ نچاتی۔ گاتی نہ بجاتی

کھانے کو نہ کھاتی۔ پھر تو نہ بلاتی سو سوہلے گاتی

سعادت یار خاں رنگین مرزا طہماسپ بیگ خاں تورانی کے بیٹے تھے سرہند میں پیدا ہوئے دلی میں نشو نما پائی سپاہیانہ فنون کے ماہر تھے تمام عمر شہزادوں کی مصاحبت میں بسر ہوئی ۱۲۵۱ھ میں اسی برس جی کر وفات پائی خود اپنے دیوان ریختی کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ عرسوں اور خانگیوں کی تماش بینی کی وجہ سے ریختی گوئی کا شوق ہوا ایک پورا دیوان ریختی کا موجود ہے اس کے علاوہ چونتیس جلدیں ان کی مختلف تصانیف کی انڈیا آفس کے کتب خانہ میں محفوظ ہیں چونکہ دلی میں پرورش ہوئی تھی اور زبان پر دلی کے محاورات چڑھے ہوئے تھے اس لئے ریختی میں بھی دلی ہی کی بیگماتی زبان استعمال کی ہے اس طرح یہ بھی دلی اسکول ہی کے ریختی گو شاعر ہیں نمونہ کے طور پر چند شعر نقل کئے جاتے ہیں:۔

چلو چلکر قطب صاحب میں جھولے ڈالکر جھولیں — دوگانا مینھ برستا ہے مہینہ ہے یہ ساون کا!

کل جو مغلانی نے سی دے کے مروڑی انگیا — ہو گئی تنگ پچھادن سے نگوڑی انگیا

کوئی پیس کر خوب سی لال مرچیں — ترے دونوں دیدوں میں بھر جائے آتوں

نہے سے کلیجہ کو کیا اس کے ہوا لوگو؟ — کچھ ان دنوں رہتی ہے دلگیر مری چھوچھو!

رائے گلاب چند ہمدم امیر کبیر شمس الامرا بہادر کے متوسل تھے ۱۲۸۰ھ میں ان کی ریختیاں نواب شمس الامرا بہادر کے مطبع میں شائع ہوئی ہیں حالات معلوم نہ ہو سکے مگر کلام سے پتہ چلتا ہے کہ کہنہ مشق شاعر تھے اور دلی اسکول کا تتبع کرتے تھے نمونتاً چند شعر نقل کئے جاتے ہیں:۔

اے دوا چھوڑ گیا کب سے وہ لشکر والا — چاہتا ہووے گا کیا کیا میرا اندر والا!

کیا یونہیں اپنی جوانی وہ کرے ہے برباد — جس کا پردیس چلا جائے کوئی گھر والا!

چھپ چھپا کے تو کسی ڈھب سے بلا لے گھر میں — تیکھا بانکا سا کھڑا ہے جو وہ خنجر والا!

جس کی چمک کے آگے مہ و مہر ماند ہوں — ایسی کوئی منگا دو جھلاجھل کی اوڑھنی

بجلی سی اک چمک گئی اسے ہمدم ابر سے — خلوت میں رات ان کی یہ کچھ جھلکی اوڑھنی

سید امام علی بلگرامی انشا کے ہمعصر ایک اور بزرگ تھے یہ بھی ریختی اور ہزل کہا کرتے تھے صاحبقران تخلص تھا آخر عمر میں

لکھنؤ جاکر آصف الدولہ کے ملازم ہوگئے تھے۔

اب تک ہم نے جن ریختی گو شعرا کا کلام پیش کیا ہے وہ دلی اسکول کے تھے، صاحبقراں پہلے ریختی گو شاعر ہیں جو لکھنؤ اسکول سے متعلق ہیں قصبۂ بلگرام کی زبان پر لکھنؤ ہی کا اثر ہے پھر آصف الدولہ کی ملازمت اور لکھنؤ کے قیام نے صاحبقراں کی زبان کو لکھنؤ کے رنگ میں رنگسا دیا تھا اس طرح دلی اسکول کا پہلا ریختی گو شاعر دکنی زبان کے ریختی کہنے والوں کو چھوڑ کر قیس حیدرآبادی ہے اور لکھنؤ اسکول کا پہلا ریختی گو صاحبقراں چند شعر نمونتاً نقل کئے جاتے ہیں:۔

کانوں کی اپنے بالی او میری بھولی بھالی !   ہاتھوں سے کیوں چھپالی او میری بھولی بھالی !

باریک سا دوپٹہ لازم ہے گرمیوں میں ،   اوڑھا نہ کر نہالی او میری بھولی بھالی !

جو دیکھتا ہے سر کو تھپڑ پہ مارتا ہے   ہونٹوں کی تیری لالی او میری بھولی بھالی !

اس دور میں دو ایک ریختی گو دلی اسکول کے بھی نظر آتے ہیں جن میں سے مرزا علی بیگ نازنین زیادہ مشہور ہیں یہ لکھنؤ اسکول کے سب سے بڑے ریختی گو جان صاحب کے معاصر تھے، ناسخ کا خیال ہے کہ جان صاحب سے اچھی ریختی کہتے تھے۔ ذوق سے تلمذ تھا ۱۲۷۱ھ میں زندہ تھے دیوان نہیں ملتا مگر چند متفرق شعر ملتے ہیں جن میں سے چند نقل کئے جاتے ہیں ذوق کی وفات پر ریختی میں ایک قطعہ کہا ہے جو اپنی نوعیت کی پہلی چیز ہے۔

نہیں نازنین رنج کرتی کسی کا   گیا جب سے یار اور حرمت ہے کھوئی

بلا سے رکھوں شاد دل کو تو اپنے   اگر میں نے کنبے کی عزت ڈبوئی

خصم جب موا لونڈیوں کو رولایا   کہ اس پردے میں نام رکھے نہ کوئی

ولیکن مجھے کاملوں سے ہے اُلفت   غم ذوق میں رات بھر میں نہ سوئی

لکھی اس کی تاریخ اور یہ ہوا غم   میاں ذوق کو میں بوا آپ روئی

نازنیں اتنا بھی ہرجائی پنا ؟   یہ تمھارے آگیا کیا دھیان میں !

سونا کبھی شوہر کو میسر نہیں ہوتا !   عورت ! انھیں باتوں سے تیرا گھر نہیں ہوتا !

کیا جانئے کیا کسبیوں میں شہد گھلا ہے   گھر والیوں سے خوش کوئی شوہر نہیں ہوتا

ہوئی عشاق میں مشہور یوسف سا جواں تاکا   بُوا ہم عورتوں میں تھا بڑا دیدہ زلیخا کا

ہمسائی آئی تھی میرے گھر میں بنی ٹھنی   ان کو تو دیکھو رات اسی پر پھسل پڑے

قدسی کی غزل پر سیکڑوں شعرا نے خمسہ کہا ہے مگر باوجود ریختی میں مصرع لگانے کے نازنین نے اس مزے سے مص

ہم پہونچائے ہیں کہ جواب نہیں ا۔

لونڈی سو جان سے قربان گئی تجھ پہ نبی　　ابھی محشر میں بجھا دیجو مری تشنہ لبی

تو ہے بندی کا وسیلہ دمِ حاجت طلبی　　مرحبا سید کی مدنی العربی

دل و جان بادِ فدایت چہ عجب خوش لقبی

عورتیں جمع تھیں یک جا پہ سُن اے شاہِ اُمم　　وصفِ یوسف وہ لگیں کرنے زلیخا سے بہم

دیکھ تصویر تیری بولی یہ بی بی مریم　　منِ بیدل بجمالِ تو عجب حیرانم

اللہ اللہ چہ جمال است بریں بوالعجبی

درد عصیاں سے جو تھی نازنیں کو بیتابی　　منہ پہ آنچل وہ ڈوپٹہ کا دھری روتی تھی

دیکھا اس دکھیا کا عالم تو اُسے کچھ نہ بنی　　سیدی انت حبیبی وطبیبِ قلبی

آمدہ سوئے تو قدسی پئے درماں طلبی

میر یار علی جان صاحب فرخ آباد میں پیدا ہوئے لکھنؤ میں پرورش پائی آخر عمر میں رام پور رہا رہے، ۱۲۳۴ھ میں پیدا ہوئے ۱۳۱۲ھ میں انتقال کیا نواب عاشور علیخاں سے تلمذ تھا۔ جان صاحب کو ریختی کا شاعر اعظم کہا جا سکتا ہے کیونکہ انھوں نے ریختی کو [illegible] ترقی دی اور نہایت عمدہ ریختیاں کہیں چونکہ لکھنؤ میں پرورش پائی تھی اور عمر کا بڑا حصہ لکھنؤ میں گزرا اور قیام لکھنؤ ہی کے زمانہ میں [illegible] کہنا شروع کی تھی اس لئے لکھنؤ ہی کے رنگ میں ڈوب گئے، نمونتاً چند شعر نقل کئے جاتے ہیں:۔

[illegible] جب میں رومئی پانچ دریا بہ گئے　　میری آنکھوں نے بوا پنجاب سے دعویٰ کیا

چوری ہوئی پتا نہیں ملتا ہے مال کا　　گھر گھر گلا کروں گی اجی کوتوال کا

ہمسائی میرے سر کی قسم آئیو ضرور　　کونڈا کروں گی جمعہ کو سید جلال کا

پھبتی کہوں چراغ بڑے کی ہے جھونجھیں　　محرم کی جب کٹوری میں جگنو نظر پڑا

پڑ ہائی کیوں زلیخا مولوی صاحب نے یوسف کو　　کیا خانہ خراب اسکو دکھایا کوچہ الفت کا

کھلتی ہے جبھی ٹھوکریں کھانے کی حقیقت　　سر پہ جو کوئی چاہنے والا نہیں رہتا

خدا او کھائے نہ پیڑو کی آنچ کا صدمہ　　یہ وہ جلا پا ہے ہرگز سہا نہیں جاتا

نہ کر رات کو کنگھی سر میں تو اپنے　　زنا خی! بہت دل پریشان ہوگا

ہو خیر دلھن وہ لھسا کی ماتھا میرا ٹھنکا　　اچھا نہیں بی ٹوٹنا سہرے کی لڑی کا

تیسرے دن نہیں جاتے ہیں کسی کے گھر سے　　اور رہ جاؤ بوا آج کا دن آج کی رات
ادھر آئی بوا اُدھر بھاگی　　ہے جوانی بھی خواب کے مانند
میری ماما نے نکالی ہے نئی مجھسے چھیڑ　　بھیجتی ہوں کہیں جاتی ہے یہ مردار کہیں

اس دور میں بہت سے ریختی گو گزرے ہیں مگر کسی نے جان صاحب کی طرح فقط ریختی کو اپنے لئے مخصوص نہیں کیا بلکہ غزل کے ساتھ ساتھ ایک آدھ غزل ریختی کی بھی کہہ لیا کرتے تھے اس لئے اس عہد میں سوائے نازنین، صاحبقراں اور جان صاحب کے کوئی دوسرا مستقل ریختی گو کہلانے کا مستحق نہیں۔

چونکہ زمانہ بہت کچھ بدل گیا تھا اور وہ عیش و تنعم جو ریختی گوئی کا سبب تھا باقی نہیں رہا تھا اور تہذیبی نقطۂ نگاہ سے بھی ریختی بری سمجھی جانے لگی اس لئے بہت کم لوگوں نے اس طرف توجہ کی۔

نازنین پر دلی والوں کی ریختی گوئی کا خاتمہ ہوگیا، دلی اسکول میں ریختی نے کچھ زیادہ ترقی نہیں کی قیس، انشا، رنگین، ہدم اور نازنین کے علاوہ بہت کم شاعر ریختی گو دلی اسکول میں نظر آتے ہیں۔ لیکن لکھنؤ میں ریختی گو زیادہ پیدا ہوئے۔

اختر پیا یعنے جانِ عالم کے زمانے میں آغا حجو شرف اور گلشن الدولہ وغیرہ بہت سے ریختی گو پیدا ہو گئے تھے مگر افسوس ہے ان کا کلام ہمیں نہیں ملا، عابد مرزا صاحب بیگم اُسی اُجڑے دربار کی یادگار ہیں، ۱۸۵۷ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے چونکہ انکے والد حسین اختر پیا کے محلات میں کتاب خوانی پر مامور تھے اس لئے انھیں اپنے ساتھ کلکتہ لے گئے ۱۳۱۵ھ سے ریختی کہنی شروع کی جب مٹیا برج مٹی میں مل گیا تو بیگم بھی عظیم آباد چلے گئے وہاں سے بھوپال اور پھر حیدر آباد آئے اور یہیں رہ پڑے اعلیٰ حضرت غفراں مکاں نواب محبوب علی خاں بہادر نے بیگم کی ریختیوں کو بہت پسند فرمایا اور اپنی فیاضی سے سرفراز فرماتے رہے۔

ہز اکسلنسی سر مہاراجہ کشن پرشاد بہادر پیشکار و صدر اعظم باب حکومت نہایت اچھے ادیب اور شاعر ہونے کے علاوہ فیاض اور قدر دان امیر ہیں آپ نے بیگم کو اپنے یہاں رکھ لیا اور بیگم بھی اس طرح بیٹھ گئے کہ کسی اور کا نام تک نہ لیا اب تک سر مہاراجہ بہادر کی محفلوں کی شمع بنے ہوئے ہیں لکھنؤ اسکول کے آخری ریختی گو ہیں چند شعر نموتاً نقل کئے جاتے ہیں:-

مردوے تلوار کا کس بل نہیں دم خم نہیں　　بل ہے تیوری پر تو ہو بندی کو اس کا غم نہیں
سوت بازی مجھسے لیجائے خدا کی شان ہے　　وہ ہے چھتیسی اگر میں بھی کچھ اس سے کم نہیں
کرتی تھی ادھر کام اُدھر دیکھ رہی تھی　　اے چھوکری اسوقت ترا دھیان کدھر تھا
جان اگر ہے جانے والی جائے گی　　بات تو ان کی نہ ٹالی جائے گی
بھاگ جائے گی یہ جب ہو گی جوان　　چھوکری مجھ سے نہ پالی جائے گی

کہاں تھی رات کو ڈھونڈا نہ اس گھر میں نہ اُس گھر میں تِرا عاشق تجھے دونوں جگہ جا کر پکار آیا

چمن سے دور ہوں بے بس ہوں کیا میں کیا زباں میری کلیجہ تھام لو بی ابھر سنو تم داستاں میری

گرے بجلی الٰہی ایسے سادے کار پر اے بی کھٹائی میں موئے نے ڈال رکھیں بالیاں میری

موجودہ زمانے کے اور ایک ریختی گو نثار حسین خاں صاحب شیدا الٰہ آبادی ہیں آپ ارادت خاں واضح مصنف شجرِ قدو دمینا بازار کے پروتے اور حسن عسکری خاں عسکری مصنف کرشمۂ سخن کے فرزند ہیں ۱۲۸۵ھ میں دریاباد میں پیدا ہوئے امین الدین قیصر کے جو بیک واسطہ خواجہ آتش کے شاگرد تھے یہ بھی شاگرد ہو گئے چونکہ استاد لکھنؤ اسکول کے تھے اور خود بھی لکھنوی ماحول میں پرورش پائی تھی اس لئے لکھنؤ اسکول کے ریختی گو ہو کر رہ گئے۔ اپنا ایک ریختی دیوان ۱۹۳۲ء تک کے کلام کا "مجموعۂ آرسی" کے نام سے شائع کیا ہے جس میں غزل کے علاوہ قصیدے اور سلام بھی ہیں، زبان میں بیگم جیسا چٹخارا نہیں مگر پھر بھی شعر اچھے کہتے ہیں اور آپ کی ریختیوں میں جدید رنگ جھلکتا ہے نمونتاً چند شعر نقل کئے جاتے ہیں:-

آؤ آؤ گھر تمہارا ہے مگر یہ جان لو مردوا میری طرف سے بدگماں ہو جائیگا

بال بال اپنا خدا کے سامنے ہوگا گواہ روئیاں روئیاں جسم کا بیٹی زباں ہو جائیگا

ریل نے بھاگی میاں کو اور بی چھٹ گئیں پہونچا ابرا لکھنؤ دلی میں استر رہ گیا

الٰہی خون تھوکے سوت کو ہو عارضہ سِل کا اٹھا کر لے گئی جھاڑو پھری بہنا مری سِل کا

بیگم اور شیدا دونوں لکھنؤ اسکول کے ریختی گو شعرا ہیں ان کے علاوہ چند اور شاعر بھی لکھنؤ اسکول کے ایسے ملتے ہیں جو کبھی کبھی ریختی کہہ لیتے ہیں چنانچہ منجملہ ان کے ایک عنقا بیگم بھی ہیں جن کا نام محسن خاں ہے، خان پور اسٹیٹ ریاست بھاولپور پنجاب کے متوطن ہیں اور اب لکھنؤ میں رہتے ہیں ایک دیوان ریختی کا چھپوا چکے ہیں جس میں اپنے آپ کو جان صاحب سے بڑھا ہوا ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے مگر جان صاحب تو بڑی چیز ہیں ان کی ریختیاں بیگم اور شیدا کے کلام کے ٹکر کی بھی نہیں چونکہ پنجاب کے رہنے والے ہیں اور ریلوے کی ملازمت کی وجہ سے مختلف دیہات اور غیر فصیح مقامات پر رہنے کا اتفاق ہوا ہے اس لئے .... بعض دفعہ تو بالکل گنواروں کی سی بولی بول جاتے ہیں چند شعر نمونتاً نقل کئے جاتے ہیں:-

عجیب بلا میں پھنسی ہوں گوئیاں میں اس نگوڑے سے دل لگا کر یہ دونوں پھوٹیں جو رات سوئی ہوں میں پلک سے پلک لگا کر

بلا کی شوخی زبان میں ہے ستم کا جادو بیان میں ہے وہ موہنی آن بان میں ہے کہ مار ڈالا لبھا لبھا کر

کھلے ہیں ایام حیدری کے بڑی ہی گھر میں وہ شیخ جی کے جلائینگے ہم چراغ گھی کے ضرور مسجد میں آج جا کر

بوا یہ بیگم ہیں لکھنؤ کی بڑی ہے دھوم اس کی گفتگو کی ذرا جو آنکھ اس سے دو بدو کی تو اس نے مارا جلا جلا کر

شب ہجر شعلہ نار ہے مرا بھن رہا دل زار ہے بوا صبر ہے نہ قرار ہے ہوا درد کم تو بخار ہے

مجھے کیا چمن کی بہار سے مجھے کیا گلوں کے نکھار سے مجھے کیا کسی کے سنگار سے نہیں بر میں اپنا جو یار ہے

متذکرہ بالا ریختی گو شعراء کے کلام اور حالات سے ایک سطحی اندازہ ہو جائے گا کہ ریختی نے تدریجی طور پر کیا ترقی کی سنہ ۱۱۰۹ھ سے ۱۱۵۵ھ تک ایسے شعراء نظر آتے ہیں جنھوں نے زنانی بولی کو نظم ضرور کیا مگر یہ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ انھوں نے ریختہ سے ہٹ کر کسی علیحدہ صنف شاعری میں طبع آزمائی کی ہے یا ہندی شاعری کی تتبع میں عورت کی زبان سے اظہار جذبات کیا ہے بہرحال یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اردو یا دکنی زبان میں عورتوں کے جذبات کو نظم کرنے کی کوشش ہاشمی نے کی، اشرف اور رحیم نے کی البتہ سنہ ۱۲ھ کے اوائل میں نواب بدرالدین خاں بہادر امیر الدولہ لائق نے بیگماتی زبان میں ریختی کہنی شروع کی ان کی زبان پر دہلی کی بیگماتی اردو کا خاصہ اثر تھا ان کے بعد محمد صدیق قیصر نے اپنا ریختی کا دیوان مکمل کیا جو بیگماتی زبان کا خاصہ ذخیرہ مہیا کرتا ہے ان کی زبان نہایت صاف اور شیریں ہے ان کے بعد رنگین اور انشا نے ریختیاں کہیں جو اس عہد کی زبان کی جیتی جاگتی تصویر ہے تاہم ان ریختیوں میں کیا ہے اس کو مرزا قادر بخش صابر نے تذکرہ گلستان سخن میں اس طرح بیان کیا ہے:۔

"صرف عورتوں کی گفتگو اور ان معاملوں کے سوا کہ مرتبہ شناسان سخن کے نزدیک فضول اور نازک دماغوں کے آگے نامعقول ہیں اور کچھ نہیں اور نامعقولیت سے مراد یہ ہے کہ کلام فحش آمیز یا کلمات شہوت انگیز سے زبان قلم کو آلودہ کیا ہے یہ تو اس نظم کے گوش و گردن کا پیرایہ بلکہ اس طرز کا خمیر مایہ ہے مراد اس سے یہ ہے کہ وہ باتیں جو عورتوں کو اثنائے خانہ داری میں پیش آتی رہتی ہیں مثلاً کسی بہن بہیلی کے گھر مہمان جانا یا کسی بھائی بند کا اپنے گھر بلانا خصم سے تو م چھلے کے گھڑوانے کی تمنا اور کرتی انگیا رنگوانے کا تقاضا اس طرح سے خرچ کئے ہیں کہ ان سے کچھ لطف یا نکتہ کہ شاعر خوش مذاق کو لذت دے حاصل نہیں ہوتا"

یہ مختصر تعریف ہے ریختی کی جو ہمارے تذکرہ نویسوں نے کی ہے مگر ایک حد تک اس کی صحت سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا، قلیس سے لیکر صاحبقران تک سب اسی رنگ میں ہولئے ہیں نازنین نے البتہ ایک قدم ان سب سے آگے بڑھایا اور ذوق کی وفات پر ریختی میں قطعہ کہنے کے علاوہ قدسی کی نعتیہ غزل پر نعتیہ مصرع پہونچائے ان کے بعد جان صاحب نے تو ریختی کی کایا ہی پلٹ دی بقول مرزا صابر کے فحش آمیز شہوت انگیز نظم کے علاوہ بہن بہیلی کو گھر بلانے کرتی انگیا رنگوانے کے مضامین بھی باندھے مگر ان کے ساتھ ہی ساتھ سنجیدہ اور روزانہ کے مضامین بھی نظم کئے ہیں چنانچہ نمونہ کے لئے چند شعر اس قسم کے نقل کئے جاتے ہیں:۔

چوری ہوئی پتہ نہیں ملتا ہے مال کا گھر گھر گلا کروں گی بوا کر تو ال کا

یہ سات پیڑھیوں کے ہوا بعد اتفاق | کہنے میں بیگما کے دو ہا جو نظر پڑا
اُجڑا ہوا آبادی کا جب گھر نظر آیا | رونے لگی میں دیکھ کے جی میرا بھر آیا
گرگٹ کی طرح کا لا کبھی لال ہو گیا | غصہ سے مزدوے کا عجب حال ہو گیا
کھلتی ہے جبھی ٹھوکریں کھانے کی حقیقت | سر پر جو کوئی چاہنے والا نہیں رہتا
یہ دل مسوس کے چپ بھی نہیں رہا جاتا | گلا جو کرتی ہوں چاہت کا ہے مزا جاتا
اور کیا بھیتی کہوں بن آئے ہو لنگور سے | داڑھی منڈواؤ میں باز آئی خدا کے نور سے

دیوان جان صاحب کے مطالعہ کرنے والوں کو اس طرح کے سیکڑوں شعر ملیں گے جاؔن کے بعد بیگم نے ریختی کو اور ترقی دی اور ریختی میں بڑی گنجایش پیدا کر دی چنانچہ اخلاقی اور نعتیہ مضامین بھی باندھے ہیں پہلے پہل جب بیگم حیدرآباد آئے اسوقت حیدرآباد میں لکھنؤ اور دلی دونوں اسکول کے شعرا بکثرت تھے اور لکھنؤ کی زبان اور دلی کی زبان پر خاصے جھگڑے ہو رہے تھے لکھنوی ہونے کی حیثیت سے بیگم کو بھی طیش آگیا اور انھوں نے بھی ایک طویل ریختی کہدی جس کے بعض اشعار یہ ہیں :-

کیا خالق نے پیدا ایک پر ایک | سنا میں نے یہ آتوں کی زباں سے
زباں کے خلد کی ہے حور عورت | اگر ہو لکھنؤ کے بوستاں سے
زباں کے ملک کا سکہ ہے عورت | انوکھا ہے چلن سارے جہاں سے
زباں کا فیصلہ ہے عورتوں پر | یہ باتیں مردوے لائیں کہاں سے
زباں دانی ہے حصہ بیگموں کا | لڑائے کیا زباں کوئی زباں سے
نگوڑی سوت جل ککڑی کے ہاتھوں | بتنگ آئی بہت اب میں یہاں سے
یہ بیکاری بنی ہے سوت میری | نکلتی ہی نہیں میرے مکاں سے
وطن چھوڑا اسی شغل کے چلتے | دکن میں آئی میں ہندوستاں سے
چھوڑایا مجھ کو پیاروں سے اسی نے | چھپا کے منہ چلی آئی وہاں سے
موی کو لاگ مجھ سے ہو گئی ہے | یہاں بھی آن لپٹی میری جاں سے
سند اس نے مجھے دی مفلسی کی | نتیجہ خوب نکلا امتحاں سے
غرض ہونا ہے جو ہو جائے مجھ پر | میں کچھ کہتی نہیں اپنی زباں سے

سید تمکین کاظمی

لکھنؤ کی شاعری

شاعر ہمیشہ اپنے ماحول سے متاثر ہوتا ہے، گردوپیش کے حالات، اس کے زمانے کے تمام اثرات و رجحانات، اسوقت کا تمدن و معاشرت یہ سب چیزیں شاعر پر اثرانداز ہوتی ہیں لیکن اسمیں شک نہیں کہ ایک ہی زمانہ کے مختلف شعراء پر ان چیزوں کا اثر اکثر مختلف ہوتا ہے اور مختلف صورتیں اختیار کرتا ہے اور بہت ممکن ہے کہ دو ہمعصر شعراء کا کلام متضاد اوصاف کا حامل ہو اور دونوں کا رنگ بالکل جداگانہ ہو، اس کا سبب یہ ہے کہ شاعر عام تجربات و حالات کو اپنی ذات پر منعکس کر کے اس طرح پیش کرتا ہے کہ ان حالات کے بیان میں خود اس کی شخصیت رونما ہو جاتی ہے، لیکن اگر ذرا غور سے مطالعہ کیا جائے تو ان دو مختلف رنگ رکھنے والے ہمعصر شاعروں میں ایک چیز ضرور مشترک ہوگی اور وہ چیز ماحول کا اثر ہے۔ ہماری زبان کی شاعری میں اس کی بہترین مثال جیسا کہ میں نے نقد الادب میں عرض کیا ہے میر تقی میر، میرزا سودا اور میر درد کے کلام سے ملتی ہے، گو یہ تینوں اہلِ کمال ایک ہی زمانہ میں تھے اور تینوں نے ایک ہی قسم کے حالات میں زندگی بسر کی لیکن ذرا گہرے مطالعہ سے یہ امر روزِ روشن کی طرح ظاہر ہے کہ ان تینوں نے اپنے ماحول اور اپنے زمانے کے واقعات اور حالات سے اپنی طبعی خصوصیات کے مطابق مختلف اثر قبول کیا، ہندوستان کی تاریخ کا یہ نہایت تاریک دور تھا مغلوں کی سلطنت دم توڑ رہی تھی، طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا، نادر خاں کے حملے روہیلوں کی تاخت و تاراج، مرہٹوں کی لوٹ مار فرنگیوں کی روز افزوں سطوت و جبروت کا شور یہ سب چیزیں امن و آشتی اور اطمینان قلب اور سکون خاطر کے لئے سم قاتل کا حکم رکھتی تھیں، ہر طرف تباہی و بربادی کے آثار نمایاں تھے، حساس اور گداختہ دل میر ان مصائب و آلام کو دیکھ دیکھ کر بے اختیار روتے ہیں اور رُلاتے ہیں، سودا اپنے دل پر میر سے زیادہ قابو رکھتے ہیں لیکن صرف اس حد تک کہ ان کی آنکھوں سے اشک جاری نہیں ہوتے بلکہ ان کے دل کا درد زہرخند میں تبدیل ہو جاتا ہے، وہ اپنے زمانہ کے لوگوں کی حالت پر ہنستے ہیں مگر ان کی طعن آمیز نظروں اور ان کے متبسم لبوں کے پیچھے ایک درد بھرا دل نظر آتا ہے جو اپنے ماحول اور اپنے اردگرد کے حالات پر آنسو بہا رہا ہے، لیکن میر درد ان دونوں سے جداگانہ طریقہ پر ان الم انگیز واقعات سے اثر پذیر ہوتے ہیں، وہ دہلی کے برباد ہونے پر میر تقی اور سودا کی طرح ترک وطن اختیار نہیں کرتے بلکہ اس کے بجائے ترک دنیا کو اولیٰ سمجھتے ہیں، وہ عارف ہیں، خداشناس ہیں، درویش ہیں اس قسم کے واقعات و حالات کا اثر ان کو اور زیادہ خدا کی مصلحت اور اس کی رضا پر قناعت کے لئے مجبور کرتا ہے اور وہ عزلت گزینی اختیار

کر لیتے ہیں اور فانی چیزوں سے دلبستگی اور ان پر تکیہ کرنے سے لوگوں کو روکتے ہیں، قناعت، صبر، تحمل اور خودداری کے درس دیتے ہیں
کسی زبان کی شاعری میں مختلف ادوار کا قیام بھی ہر دور کے مخصوص ماحول کی بنا پر ہوتا ہے، اس لئے شاعر کے کلام پر تبصرہ کرنے سے پہلے جس دور کا وہ شاعر ہے اس دور کے مخصوص ماحول کا مطالعہ کرنا نہایت ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر اس شاعر کے کلام پر صحیح رائے قایم نہیں کی جا سکتی،

اس گفتگو سے نتیجہ یہ نکلا کہ مختلف ادوار کے شعرا میں خواہ اور کسی حیثیت سے کوئی خاص فرق ہو یا نہو لیکن ....
جہاں تک ماحول کے اثر کا تعلق ہے ان میں ضرور نمایاں فرق ہوگا اور جو محاسن یا معائب کسی مخصوص ماحول کے اثر نے اس ماحول میں زندگی بسر کرنے والے شعراء کے کلام میں پیدا کر دئے ہیں وہی محاسن یا معائب دوسرے دور کے شعرا میں تلاش کرنا تنقید کے اِس اہم ترین اُصول کو نظرانداز کر دینا ہے۔

اُردو شاعری کو جب دہلی میں عروج ہوا تو وہ زمانہ سلطنت مغلیہ کے زوال کا تھا، نادر شاہ کا حملہ، احمد شاہ درّانی کی غارتگری، مرہٹوں کی لوٹ مار یہ چیزیں ایسی تھیں جنھوں نے دہلی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور دہلی کے پریشان حال باشندوں کو تباہ و برباد کر دیا ظاہر ہے کہ ان المناک واقعات کا اثر لوگوں پر بہت حزن انگیز ہوا ہوگا اور شاعر تو شدید الحس ہوتا ہی ہے، یہی سبب ہے کہ دہلی کے اُس دور کے شعرا کا کلام بہت ہی یاس انگیز اور درد خیز ہے۔ ماحول کا اثر اسی کا متقاضی تھا خصوصاً میرتقی میر جن کو اس دور کی ادبی جدوجہد کا قافلہ سالار کہنا چاہئے اپنے زمانہ کے واقعات سے اس درجہ متاثر ہوئے ہیں کہ بعض اوقات تغزل کے رنگ میں سیاسی اور تمدنی واقعات اور ان کے اثرات کی طرف صریحاً اشارے کرتے ہیں اور اس زمانہ کے واقعات کا ان پر اتنا اثر ہے کہ کہیں کہیں تو وہ یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ میں غزل کہہ رہا ہوں اور یہ شعر جو میں نے کہا ہے غزل کے اشعار میں شامل نہو گا، سُنئے:۔

یا قافلہ در قافلہ ان رستوں میں تھے لوگ — یا ایسے گئے یاں سے کہ پھر کھوج نہ پایا

کیا زمزمہ کروں ہوں خوشی تجھ سے ہم صفیر — آیا جو میں چمن میں تو جاتی رہی بہار

شعر کے پردے میں میں نے غم سُنایا ہے بہت — مرثیے نے دل کو میرے بھی رُلایا ہے بہت
ارض و سما کی پستی بلندی اب تو ہم کو برابر ہے — یعنی نشیب و فراز جو دیکھے طبع ہوئی ہموار بہت

دل کی بربادی کی اس حد ہے خرابی کہ نہ پوچھ — جانا جاتا ہے کہ اس راہ سے لشکر گزرا

پھر پھر گیا ہے آکر مُنھ تک جگر ہمارے گزرے ہیں جان و دل پر یاں اضطراب کیا کیا

اک آن اس زمانہ میں یہ دل نہ دا ہوا کیا جانئے کہ میر زمانے کو کیا ہوا

خرابہ دلّی کا وہ چند بہتر لکھنؤ سے تھا وہیں میں کاش مرجاتا سراسیمہ نہ آتا یاں

پس دہلی کے سیاسی انقلابات نے ہماری زبان کی شاعری کے اس دور میں یاس انگیز اور درد خیز کیفیات پیدا کردیں، حزن و ملال اور درد و غم کے بیان میں تاثیر ہوتی ہے، یہ چیزیں دل میں چبھتی ہیں، یہی سبب ہے کہ شعرائے دہلی کے کلام میں کچھ ایسا اثر ہے کہ دل کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔

جب دہلی تباہ ہوگئی تو لوگ اپنے جان و مال کی حفاظت کے لئے وطن چھوڑ چھوڑ کر اطراف و اکناف ہند میں پھیلنے لگے، اس زمانہ میں مشہور اور مستند شعراء عموماً سلطنت کے دامن دولت سے وابستہ ہوتے تھے یا ارکین دربار و عمائد و امراء ان کی پرورش کرتے تھے اس لئے دہلی کی تباہی کے بعد اگر کوئی خطہ ایسا تھا جہاں ہمارے شعراء کو قدر شناسی کی اُمید ہوسکتی تھی تو وہ لکھنؤ تھا، چنانچہ میر تقی میر، سودا، اور میر حسن وغیرہ نے دہلی چھوڑ کر لکھنؤ کا رُخ کیا اور اہل لکھنؤ نے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور امید سے زیادہ انکی قدر افزائی کی حکومتِ وقت کی طرف سے ان کی تنخواہیں مقرر ہوئیں، ان کو جاگیریں عطا کی گئیں اور شاہان اودھ نے اور ان کی دیکھا دیکھی امرائے دولت اور ارکین دربار نے ان کو اپنا مصاحب بنایا،

لکھنؤ میں اس وقت شعر و شاعری کا چرچا تھا، اول اول تو وارد شعرائے دہلی کا یہاں کی زبان اور خیالات پر بہت اثر پڑا، انکی تقلید اور ان کے قدم بہ قدم چلنے میں اگر کچھ بھی کامیابی ہوجاتی تھی تو اسکو باعث فخر سمجھا جاتا تھا چنانچہ خود آصف الدولہ کے کلام میں شعرائے دہلی کا اثر نمایاں ہے، ان کے کلام میں فطری جذبات اور کیفیات دلی کا بیان ہے اور شاید اس حیثیت سے وہ قدیم لکھنو اسکول کے تمام شعراء میں ممتاز ہیں کہ ان کا کلام تاثیر سے خالی نہیں ہے مصحفی کے یہاں بھی میر کی تقلید کا اثر نمایاں ہے لیکن اس کے بعد ہی جو دور شروع ہوا وہ یکسر تاثیر سے معرا تھا اور اس کے کارنامے سطحی اور مضحکہ خیز مضامین کے انبار سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے

یہ زمانہ سلطنت اودھ کے عروج کا زمانہ تھا، عیش و عشرت کا دور دورہ تھا، ہر طرف رنگ رنگ رلیاں تھیں، چہل پہل تھی بےفکری تھی ان چیزوں کا گہرا اثر لکھنؤ کے تمدن و معاشرت پر پڑا اور اس ماحول نے شعر و شاعری کو بہت متاثر کیا، چنانچہ فطری جذبات اور تخئیل پر رعایت لفظی اور صنایع بدایع کو ترجیح دی گئی، تکلف اور تصنع کی بھرمار ہوگئی، سوقیانہ مضامین اور مبتذل الفاظ اور محاوروں سے غزلیں لبریز نظر آنے لگیں اور کنگھی چوٹی اور انگیا کرتی کے راگ بے تکلف مشاعروں میں الاپے جانے لگے۔

شیخ ناسخ فرماتے ہیں:-

اے پری تو نے جو پہنی ہے سُنہری انگیا آج آئی ہے نظر سونے کی چڑیا مجھکو

دے دوپٹا تو اپنا ململ کا ناتواں ہوں کفن بھی ہو ہلکا

استرا منھ پہ جو پھرنے نہیں دیتا ہے بجا محو دیندار سے کیونکر خط قرآں ہوتا

کس ادا سے تو نے شانہ اپنے بالوں میں کیا سر پہ ہر محبوب کے خط مانگ کا آرا ہوا
چشم بد دور آج کیا آتے نظر ہیں گال صاف سبزۂ خط کیا غزالِ چشم کا چارا ہوا

اس بے راہ روی کی بنیاد تو مصحفی اور انشاء کے وقت ہی سے پڑگئی تھی لیکن اصل میں قدیم لکھنؤ اسکول آتش و ناسخ کے وقت قایم ہوا جس کی اہم خصوصیات یہ ہیں کہ اس دور کے شعراء کا کلام بے اثر اور بے کیف ہے، اس کو واردات قلبیہ اور امور ذہنیہ سے کوئی سروکار نہیں بلکہ وہ عشق و محبت کو آوارگی اور فسق و فجور کا مرادف بنا کر پیش کرتا ہے، اس دور کے کلام میں متانت اور ثقاہت کے بجائے ابتذال پیدا ہو گیا ہے اور معاملہ بندی نے اُسے "بازاریت" کی حد تک پہونچا دیا ہے۔

لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ اس دور کے شعراء نے زبان کی کوئی خدمت نہیں کی، انھوں نے زبان کی اصلاح کی، اس کو حشو و زوائد سے پاک کیا اور زبان کو وسعت دی گو ایک زندہ زبان کی اصلاح زمانہ کی ضروریات خود کرتی جاتی ہیں، اُسوقت زمانہ کا اقتضا یہی تھا کہ کوئی نہ کوئی ناسخ پیدا ہو، اگر اس کام کو ناسخ نہ انجام دیتے تو کوئی اور انجام دیتا، بہر طور لکھنؤ اسکول کا مقصد بظاہر شعرائے لکھنؤ کو دہلی کی تقلید سے آزاد کرنا تھا اور ناسخ اور ان کے متبعین نے اس مقصد کو کما حقہ پورا کیا، زبان میں جو اصلاحیں انھوں نے کیں اُنکو زبان نے قبول کر لیا یہاں تک اہل دہلی بھی ان اصلاحوں کو اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے۔

آخری تاجدار اودھ سلطان واجد علی شاہ اختر کے وقت تک لکھنؤ اسکول کے رنگ میں کوئی فرق نہیں آیا لیکن اس کے بعد ہی سے ماحول میں تبدیلی ہونا شروع ہو گئی انقلاب سلطنت نے لکھنؤ کی دنیا ہی بدلدی، نہ وہ رنگ رلیاں رہیں، نہ وہ تعیش کے سامان رہے، نہ وہ بے فکری اور بے خودی رہی، ہزاروں گھر تباہ و برباد ہو گئے، طرز بود و ماند میں فرق آنے لگا، تمدن و معاشرت نے دوسرا رنگ اختیار کرنا شروع کیا، اقتصادی مشکلات قدم قدم پر دامن گیر ہونے لگیں، آخر رفتہ رفتہ ان سب باتوں کا اثر لٹریچر میں بھی نمودار ہوا سطحی اور خارجی مضامین کی جگہ قلبی واردات اور داخلی مضامین نظم ہونے لگے، ہوتے ہوتے یہ جدید رنگ پختگی اختیار کرتا گیا

یہاں تک کہ آج لکھنؤ کا تغزل جس رفعت اور بلندی پر ہے وہ اس سے پہلے اُردو تغزل کو کبھی نصیب نہ ہوئی تھی -

ہماری شاعری کا قدیم لکھنؤ اسکول جب انتہائی عروج پر تھا تو اسی دور کے چند، خوش فکر اور قادر الکلام شعراء نے تغزل کے بازاری اور مبتذل مضامین سے اکتا کر جولانیٔ طبع کے لئے ایک اور میدان تلاش کر لیا جس نے اُردو شاعری میں ایک نئے باب کا اضافہ کر دیا، ضمیر اور خلیق اور ان کے بعد انیس اور دبیر کا مرثیہ کی طرف رجوع لانا فنی حیثیت سے نتیجہ تھا اسوقت کے پست تغزل کے ردّ عمل کا، اور اس میں شبہ نہیں کہ انیس نے مرثیہ گوئی کی بدولت اُردو زبان کے خزانہ کو انمول جواہر سے مالا مال کر دیا، حقیقت یہ ہے کہ حالی اور آزاد نے نہیں بلکہ میر انیس نے جدید اُردو شاعری کا نہ صرف سنگ بنیاد نصب کیا بلکہ اس پر ایسی عمارت تعمیر کر دی جس کا جواب باوجود موجودہ وسائل ترقی کے ہم آج تک پیش نہ کر سکے، انیس نے مرثیہ کو معراج کمال پر پہونچا دیا اور مسدس کو اُردو شاعری کی وقیع ترین صنف بنا دیا جذبات کی صحیح ترجمانی، واقعہ نگاری کا کمال، تخئیل کی نزاکت، تشبیہوں اور استعاروں کا اعتدال، سلاست و روانی، فصاحت و دلآویزی یہ سب چیزیں میر صاحب کے کلام میں کوٹ کوٹ کر بھری ہیں، انیس ہی کا کلام ہے جس کے بھروسہ پر ہم یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ ہماری زبان نے بھی دنیا کے گنجینۂ خیالات میں اضافہ کیا ہے -

ہمارے تمدن و معاشرت میں جو تبدیلی مغربی تعلیم و تربیت سے ظہور میں آئی اس کا اثر ہمارے لٹریچر کی سطر سطر میں نظر آتا ہے، چنانچہ لٹریچر کے اور اصناف کی طرح ہماری غزل بھی اس سے اثر پذیر ہوئی، ایجادات و اختراعات نے، ضروریات زندگی کی فراوانی نے اور علم کی ترویج نے خیالات میں بے انتہا وسعت پیدا کر دی ہے اور یہ وسعت محض لکھنؤ اور دہلی تک محدود نہیں ہے بلکہ سارا ملک اس سے مستفید ہوا ہے اور جہاں جہاں اُردو ادبیات سے ذوق رکھنے والے موجود ہیں ان سب کے ذوق کی تربیت ایک ہی قسم کے ماحول میں ہو رہی ہے اور موجودہ تعلیم و تربیت اور کلچر نے یکرنگی پیدا کر دی ہے اس کا اثر یہ ہوا کہ ہماری زبان کی شاعری نہ صرف لکھنؤ اور دہلی میں بلکہ قریب قریب ہر جگہ جہاں اُردو زبان رائج ہے یکساں طور پر موجودہ تہذیب کا اثر قبول کر رہی ہے، ہاں یہ ضرور ہے کہ لکھنؤ اور دہلی زبان کے مراکز ہیں، ان مقامات کے ذرہ ذرہ میں زبان کے نشو و نما کے اثرات موجود ہیں اس لئے موجودہ تہذیب اور موجودہ کلچر کا اثر یہاں کچھ قدیم ایشیائی تہذیب میں سمویا ہوا بھی ہے اور ذرا گہرا بھی ہے،

لیکن جہاں تک شاعرانہ ذوق کی تربیت کا سوال ہے لکھنؤ اور دہلی میں کافی فرق ہے، لکھنؤ کی فضا میں شعریت ہے، یہاں کے باشندوں کی گفتار میں رفتار میں، آوازمیں رہنے سہنے اور ملنے جلنے کے طریقوں میں شاعرانہ کیفیت موجود ہے، یہ چیزیں یہاں فطری ہیں وہبی ہیں، قدرتی ہیں جو ایک دہلی کیا شاید ہندوستان کے کسی اور خطہ کو نصیب نہیں۔ زمانۂ حال کا دہلی ایک بڑی تجارتی منڈی میں تبدیل ہو گیا ہے، اس پر کچھ عجب قسم کی "کارخانہ داریت" غالب ہے اور وہاں کی فضا میں کچھ کرختگی سی، کچھ ثقل سا، کچھ گرانی سی معلوم ہوتی ہے، یہی سبب ہے کہ وہاں کوئی ایسا شاعر موجود نہیں ہے جو مقبول ہو -

لیکن لکھنؤ میں آج کل بھی چند ایسے شعراء موجود ہیں جن کا کلام جب تک زبان باقی رہے گی اس کے ساتھ باقی رہے گا، صفی، عزیز، آرزو، اور اب سے کچھ مدت پہلے کے ثاقب یہ لوگ نہ صرف لکھنؤ کے لئے بلکہ اردو زبان کے لئے مایۂ صد نازو افتخار ہیں، اور پھر نوجوان طبقہ کے شعراء میں حکیم آشفتہ نواب جعفر علی خاں اثر، سید آل رضا، قدیر، سراج اور منظر وغیرہ نہایت خوش فکر اور خوش گو شعراء میں سے ہیں۔

لکھنؤ کی شاعری بالکل بدل گئی ہے لیکن عجب یہ ہے کہ یہاں کی شاعری پر اعتراضات کی نوعیت وہی ہے جو ناسخ اور ان کے تبعین کے کلام پر تھی، حالانکہ اب وہ ماحول نہیں اور آج سے نہیں بلکہ علی میاں کامل اور تعشق کے زمانہ ہی سے لکھنؤ کی غزل میں داخلی مضامین کی کثرت نظر آتی ہے، میں یہ نہیں کہتا کہ لکھنؤ کی موجودہ شاعری عیوب سے کیسر پاک ہے بلکہ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہم لکھنؤ کی شاعری پر رائے قائم کرتے وقت قدیم لکھنؤ اسکول کو نظر میں رکھتے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ خود موجودہ لکھنؤ اس اسکول کو کس نظر سے دیکھتا ہے۔

جہاں تک میری ذاتی رائے کا تعلق ہے میں بلاخوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ اسوقت لکھنؤ میں غزل نے جو رفعت حاصل کرلی ہے وہ ہندوستان کے کسی اور شہر میں اسے نصیب نہیں ہے، یہاں کے کسی مشاعرے میں شرکت فرمایئے تو آپ کو غزل کے اکثر اشعار کے وہ وہ مصرعوں میں تخئیل کا اعجاز نظر آئے گا، فطری جذبات کے نازک سے نازک خاکے، واردات قلبیہ کی سچی اور بے عیب تصویریں، زبان کا لوچ اور الفاظ کی موسیقیت یہ سب چیزیں کچھ اس رنگ سے پیش نظر ہوں گی کہ آپ کو حیرت ہونے لگے گی اور آپ مسرت خیز استعجاب کے اثر میں یہ سوچتے ہوئے وہاں سے آئیں گے کہ ہماری زبان میں کس قدر وسعت پیدا ہوگئی ہے کہ خیال کے نازک سے نازک پہلو کو بھی نمایاں سے نمایاں تر انداز میں پیش کیا جاسکتا ہے۔

حامد اللہ افسر

نگار

شمار ۲ | فہرست مضامین فروری ۱۹۳۵ء | جلد ۲۷

نگار

اڈیٹر :- نیاز فتحپوری

شمار ۲	فروری ۱۹۳۵ء	جلد ۲۷

ملاحظات

ہندوستان کا جدید نظام سیاست

چونکہ ہمارا ملک ایک جدید آئین حکومت کے زیر اثر آنے والا ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس ماہ کی اشاعت میں اس پر ایک عمومی تبصرہ کرکے قارئین کرام کو اس حقیقت سے آگاہ کردیا جائے۔

اس سے ہندوستان کا ہر فرد آگاہ ہے کہ کانگرس ایک زمانہ سے اس امر کا مطالبہ کررہی ہے کہ ہندوستان کا موجودہ نظام حکومت نہایت بیہمتی اور حد درجہ خود غرضانہ ہے اور تاوقتیکہ خود اہل ملک کو ایوان حکومت میں کامل عاملانہ اختیارات نہ دئے جائیں، کوئی اصلاح ممکن نہیں۔ آخر کار بہت چیخ پکار کے بعد حکومت ہند اس بات پر راضی ہوئی کہ ایک کمیشن کی وساطت سے اہل ہند کے مطالبات پر غور کرے۔ چنانچہ سائمن کمیشن کی تشکیل عمل میں آئی اور اس نے ہندوستان کا دورہ کرکے اپنی رپورٹ شایع کی۔ اس کمیشن کے تیور ابتدا ہی سے ایسے تھے کہ آزاد خیال تو خیر کیا اعتدال پسند حضرات نے بھی اس کی طرف سے کسی کامیابی کی توقع نہ پائی اور تقریباً ہندوستان کے ہر گوشہ سے سائمن کمیشن کی مخالفت میں آواز بلند ہوگئی۔

اس میں شک نہیں کہ سائمن کمیشن نے اہل ملک کے خیالات کا کافی مطالعہ کرلیا تھا اور اگر وہ دیانت سے کام لیتی تو ملک کے رجحانات کا لحاظ کرکے کوئی مناسب لائحۂ عمل پیش کرتی، لیکن افسوس ہے کہ اُس کی کوئی سفارش ایسی نہ تھی جسے یہاں کا کوئی طبقہ قبول کرسکتا۔

یہ زمانہ وہ تھا جب کانگرس کا زور تھا اور ہر طرف سے یہی چیخ پکار سننے میں آتی تھی کہ اگر ملک کو آزادی کامل نہیں مل سکتی تو کم ازکم ڈومینین ہوم رول تو ملنا ہی چاہئے جو برطانیہ کے دیگر مستعمرات کو حاصل ہے۔ اکابر قوم جیلوں میں بند کئے جارہے تھے، بائکاٹ اور پکٹنگ کے سلسلہ میں روزانہ حکومت اور ارکان کانگرس کے درمیان تصادُم کی خبریں آرہی تھیں اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ملک شاید غلامی کی آخری ساعتوں سے گزر رہا ہے

حکومت برطانیہ چونکہ جنگ و صلح دونوں زمانوں میں اپنی نرم و گرم پالیسی کبھی نہیں چھوڑتی، اس لئے اس نے اگر ایک طرف قانون کے شکنجہ پر لوگوں کو کسنا شروع کیا تو دوسری طرف گول میز کانفرنس کے انعقاد کی تجویز پیش کردی۔ اس سے مدعا یہ تھا کہ اہل ملک کی توجہ اس طرف مایل کردی جائے اور کم ازکم کوئی ایک ہی جماعت حکومت کا ساتھ دینے والی پیدا کرلی جائے۔

اس میں شک نہیں کہ یہ حکمت عملی بہت کامیاب ہوئی اور سارا ملک گول میز کانفرنس کو کامیاب بنانے کا خواب دیکھنے لگا۔ اسکے بعد ایک طرف کانگرس کا زور گھٹ جانے اور دوسری طرف برطانوی کابینہ کی تبدیلی نے ہوا کا رُخ بدلدیا اور گول میز کانفرنس کا نتیجہ قرطاس ابیض کی صورت میں ظاہر ہوا۔

خیال تھا کہ قرطاس ابیض میں جو تجویزیں پیش کی جائیں گی وہ ملک کے ان مطالبات کے موافق ہوں گی جو گول میز کانفرنس میں پیش کئے گئے تھے، لیکن جیسا کہ ابھی ظاہر کیا گیا، کابینہ میں قدامت پسند طبقہ کے اقتدار اور کانگرس کے کمزور پڑجانے سے تمام اُمیدیں خاک میں ملگئیں اور جس طرح سائمن کمیشن رپورٹ کوئی صحیح چارۂ کار ثابت نہ ہوئی تھی۔ اسی طرح قرطاس ابیض بھی ایک بوسیدہ پارۂ کاغذ سے زیادہ نہ

خیر یہ تو جو کچھ ہوا سو ہوا، لیکن تماشہ تو یہ ہے کہ اب جو پارلیمنٹ کی مشترکہ کمیٹی کی رپورٹ شائع ہوئی ہے، اور جس پر ہندوستان کا آئندہ آئین حکومت قایم ہونے والا ہے۔ وہ قرطاس ابیض سے بھی زیادہ عجیب و غریب ہے اور ہندوستان کے کسی طبقہ نے اس کو نگاہِ پسندیدگی سے نہیں دیکھا۔ اس کی سب سے زیادہ اہم و اصولی تجویز یہ ہے کہ ہندوستان کے ہر صوبہ کو خود مختار کردیا جائے، یعنی ہر صوبہ اپنے حالات کے لحاظ سے جو قانون مناسب سمجھے طیار کرے اور جو طریقے اس کی فلاح و بہبود کے لئے موزوں ہوں ان کو عمل میں لائے۔ اس میں شک نہیں کہ اُصولاً یہ تجویز نہایت مناسب ہے، کیونکہ ہندوستان کے مختلف حصوں کی آبادی اپنی تہذیب و معاشرت، اپنے عادات و خصائل اور اپنے جذبات و ماحول کے لحاظ سے یقیناً جداگانہ قانون کی مقتضی ہے۔ لیکن یہ خود مختاری جس انداز سے دی جارہی ہے، اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ ہم کسی شخص کو روپیہ کا صندوقچہ تو سپرد کردیں لیکن کنجی اپنے ہی پاس رکھیں۔

قبل اس کے کہ آپ اس خود مختاری کی حقیقت کو سمجھیں، یہ امر ذہن نشین کرلینا ضروری ہے کہ آئین حکومت میں دو جماعتیں بالکل علحدہ علحدہ ہیں، ایک وہ جو قانون بناتی ہیں اور دوسری وہ جو نظم و نسق کی ذمہ دار ہے، یعنی ایک وہ جسے مجلس آئین ساز کہتے ہیں اور دوسری وہ جسے عمال حکومت کہنا چاہئے۔

پس اس صورت میں کسی صوبہ یا ملک کی خود مختاری کا حقیقی مفہوم صرف یہی ہوسکتا ہے کہ قانون بنانے والی جماعت قانون کا

اور عمال حکومت بالکل اس قانون کے مطابق عمل کریں لیکن ہندوستان کے صوبوں کی خودمختاری کی صورت یہ ہوگی کہ مجلس آئین ساز قانون تو بناتی رہیگی مگر جماعت عمال اس قانون کی پابند نہ ہوگی۔

اس کی توجیہہ مشترک کمیٹی کی رپورٹ میں یہ کی جاتی ہے کہ ہندوستان میں چونکہ منظم سیاسی جماعتیں موجود نہیں ہیں اور مجلس آئین ساز میں فرقہ وارانہ نیابت بجائے سیاست کے مذہب کی بنا پر پائی جاتی ہے اس لئے کسی سیاسی رائے عامہ کا پیدا ہونا ممکن نہیں اور قیام امن وسکون یا حفاظت اقلیت کے لئے ضروری ہے کہ یہاں کی جماعت عاملہ مجلس آئین ساز کے سامنے جوابدہ نہ ہو۔

اس میں شک نہیں کہ بظاہر یہ دلیل قرین عقل نظر آتی ہے، لیکن حقیقتاً یہ ایک بڑا سیاسی مغالطہ ہے۔ کیونکہ اول تو فرقہ وارانہ نیابت کی ذہنیت خود حکومت کی پیدا کی ہوئی ہے اور مشترک حق نیابت کو پامال کرکے وجود میں لائی گئی ہے اس لئے یہ کہنا کہ ہندوستان میں مسئلہ نیابت، مذہبی نقطۂ نظر سے طے کیا جاتا ہے، اور منظم سیاسی جماعتوں کے اختلاف کی بنا پر کسی طرح درست نہیں، لیکن اگر تھوڑی دیر کے لئے ہم اس کو صحیح باور کرلیں، تو بھی اس حقیقت کو کسی دلیل سے محو نہیں کیا جاسکتا کہ اس وقت ہندوستان کی تمام سیاسی جماعتیں خواہ ان میں باہمی اختلاف مذہب کتنا ہی شدید کیوں نہ ہو، اس مطالبہ میں پوری طرح متحد الخیال ہیں کہ ہندوستان کی حکومت ہندوستانیوں کے ہاتھ میں ہونا چاہئے اور کسی غیر قوم کی حکومت کو صرف اس لئے گوارا کرنا کہ وہ فریق ثالث کی حیثیت سے اُن کے مناقشات دور کرنے کا بڑے سے بڑا معاوضہ حاصل کرتی رہے، ملک کی سخت توہین ہے۔

رہگیا منظم سیاسی جماعتوں کا پیدا ہونا، سو یہ ہمیشہ نتیجہ ہوا کرتا ہے ذمہ دار حکومت کا اور جب تک ہندوستانیوں کو حکومت کے اختیارات کامل نہ مل جائیں ان میں خالص سیاسی جماعتوں کا پیدا ہونا ممکن ہی نہیں ــــ الغرض جدید آئین حکومت میں بھی مجلس آئین ساز کی بیکسی و بیدست و پائی بدستور وہی قائم ہے جو اس سے پہلے تھی، البتہ فرق اگر ہے تو صرف یہ کہ پہلے مجلس آئین ساز میں حکومت کے نمایندوں کی تعداد زیادہ ہوتی تھی اور اب ملک کے نمایندوں کی کثرت ہے، لیکن اس سے نتیجہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا، کیونکہ حکومت جس چیز کا نام ہے اُسے جو اختیار سیاہ وسفید کا پہلے حاصل تھا اس سے زیادہ اب ملگیا ہے۔

جدید آئین حکومت میں ہر صوبہ کے گورنر کو جو اختیارات عطا ہوئے ہیں وہ اتنے وسیع ہیں کہ مجلس آئین ساز کا وجود بالکل بے معنی ہو کر رہجاتا ہے ــ گورنر کو دو طرح کے اختیارات تفویض کئے گئے ہیں، ایک وہ جنھیں وہ خود اپنی ذاتی رائے سے استعمال کرسکتا ہے اور دوسرے وہ جنھیں اپنے وزراء کے ذریعہ سے بروئے کار لاسکتا ہے ــــ ان کی تفصیل بھی سن لیجئے:-

جہاں تک ذاتی اختیارات کا تعلق ہے گورنر صوبہ میں امن وسکون قایم رکھنے کے لئے جس وقت جو چاہے تدبیر عمل میں لاسکتا ہے، اسی طرح تجارتی تفریق کو روکنے، اقلیتوں کے مفاد کی نگہداشت، سرکاری ملازموں اور ہندوستانی ریاستوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے وہ ایک مستبد حکمراں کی حیثیت رکھتا ہے اور مجلس آئین ساز سے اس کو کوئی سروکار نہیں۔

اب آپ ان اختیارات کا تجزیہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ تمام تر اختیارات گورنر ہی کو حاصل ہیں اور ملک وقوم کی آواز کو کسی اہم معاملہ میں دخل نہیں ــ تجارتی تفریق کو روکنے کے معنی صرف یہ ہیں کہ اگر برطانیہ و ہندوستان کے باہمی تعلقات تجارت کے سلسلہ میں اگر کبھی برطانوی تجارت

کو کسی قسم کا نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہوگا تو ہندوستانی تجارت کے مفاد کو آسانی سے پامال کیا جا سکیگا۔ قیام امن و سکون کی ذمہ داری نہایت وسیع معنی رکھتی ہے یہاں تک کہ ملک کے جایز مطالبات کے لئے اگر کوئی سیاسی ہنگامہ ہوا تو گورنر اس کو فرو کرنے کے لئے نہ مجلس آئین ساز کی پرو کریگا نہ مجلس وزراء کی۔ اس باب میں مجلس وزراء کو بھی بالکل علحدہ کر دیا گیا کیونکہ ممکن تھا وہ اہل ملک کے دباؤ یا مروت سے استبداد کو کام میں نہ لا سکتے۔

رہگیا اقلیتوں کا مفاد، سو اس سے مقصود گورنروں کے لئے یہ آسانی بہم پہونچانا ہے کہ وہ جمہور کی آواز کو آسانی سے دبا سکیں۔ اسی قسم کے دو ذرایع سرکاری ملازموں اور ہندوستانی ریاستوں کے حقوق کی حفاظت کے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب سرکاری ملازم مجلس آئین ساز یا مجلس وزراء سے بے تعلق رہیں گے تو لامحالہ گورنر کے اشارہ پر چلیں گے اور پبلک کے مفاد سے ان کا احساس بالکل بیگانہ رہیگا۔ اسی طرح ریاستوں کے حقوق کی حفاظت کے سلسلہ میں گورنروں کو موقعہ حاصل ہوگا کہ وہ جمہور کی خواہش کو رد کر سکیں۔

آئین سازی کے سلسلہ میں گورنر کے اختیارات اور زیادہ نامحدود ہیں، یعنی اس کو اختیار حاصل ہوگا کہ ضرورت و مصلحت کے لحاظ سے جو قانون چاہے بنائے، جتنا روپیہ چاہے صرف کرے، جو آرڈننس مناسب ہو جاری کرے اور مجلس آئین ساز کو معطل کر کے حکومت کا تمام انتظام اپنے ہاتھ میں لیلے۔

الغرض گورنروں کے ذاتی اختیارات پہلے سے بھی زیادہ وسیع ہو گئے ہیں اور دنیائے حکومت کی تاریخ میں سوائے اس جدید آئین کوئی دوسری مثال ایسی نہیں ملسکتی جس میں مجلس آئین ساز اور حکومت عاملہ کے درمیان اس درجہ بے اعتمادی و بے تعلقی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہو۔

گورنروں کو علاوہ ذاتی اختیارات کے بعض اختیارات وزراء کی وساطت سے بھی مرحمت ہوئے ہیں، یعنی مجلس وزراء کا ہاتھ مجلس آئین میں بھی رہیگا اور اس کے معنی یہ ہیں کہ پبلک کے نمایندوں کو جس حد تک مجلس آئین ساز میں ووٹ دینے کا حق ہے اس کو بھی ضعیف کر دیا جائے تا کوئی تجویز با تفاق آراء پاس نہ ہو سکے۔

صوبجات بنگال، یوپی، بمبئی، اور مدراس میں دو ایوان ہوں گے ایوان ادنی کا نام لجسلیٹو اسمبلی اور ایوان اعلی کا نام لجسلیٹو کونسل ہوگا۔ ان دونوں کو علاوہ مالیات کے برابر کے حقوق حاصل ہوں گے اور اگر بعض مسائل میں دونوں ایوان متفق الرائے نہ ہوں گے تو ان کا مشترک اجلاس کیا جائے گا اور کثرت آراء سے فیصلہ ہوگا۔ بظاہر یہ تجویز بہت خوشنما معلوم ہوتی ہے، لیکن اس کا راز یہ ہے کہ ایوان اعلی کے ممبر چونکہ دولت مند طبقہ کے نامزد کئے ہوئے ہوں گے، اس لئے ظاہر ہے کہ اس ایوان میں قدامت پسند و رجعت پسند لوگوں کی تعداد زیادہ ہوگی اور اس طرح گویا گورنر کا ہاتھ اور زیادہ مضبوط ہو جائے گا۔

اب مرکزی حکومت پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے۔ اول اول کمیشن کی رائے یہ تھی کہ مرکزی حکومت کو بڑی حد تک غیر ذمہ دار رکھا جائے اور یہ صرف اس لئے کہ ہندوستانیوں کو کوئی موقعہ حکومت میں دخل دینے کا نہ ملے۔ لیکن بعد کو مشترک کمیٹی نے یہ سفارش منظور نہیں کی، کیونکہ اول تو ریاستوں نے اعتراض کیا کہ جب تک مرکزی حکومت ذمہ دارانہ ہو وہ وفاق میں شامل نہیں ہو سکتیں، دوسرا سبب یہ تھا کہ اگر مرکزی حکومت غیر ذمہ دا

ہوگی تو مجلس آئین ساز کے مقابلہ میں اس کی کوئی قوت باقی نہ رہیگی، اس لئے اب یہ صورت تجویز کی گئی ہے کہ محکمۂ خارجہ اور دفاع براہ راست گورنر جنرل کے اختیار میں دیدئے جائیں اور باقی تمام اُمور کی ذمہ داری وزراء کے سپرد کردیجائے، لیکن شرط یہ ہے کہ جن اُمور میں گورنر جنرل کو خصوصی اختیارات سیاہ وسپید کے حاصل ہیں، ان پر کوئی حرف نہ آئے۔

اُمور خارجہ پر گورنر جنرل کے اختیارات کے معنی یہ ہیں کہ حکومت ہند خود براہ راست نہ کسی دوسرے ملک سے کوئی معاہدہ کرسکتی ہے اور نہ بین الاقوامی سیاسیات میں حصہ لے سکتی ہے، بلکہ یہ تمام باتیں حکومت برطانیہ سے متعلق ہوں گی۔ بہ الفاظ دیگر اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ ہندوستان کی کوئی علٰحدہ ہستی سیاسیات میں شمار نہیں ہوسکتی بلکہ وہ صرف تاج برطانیہ کا ایک ایسا ماتحت حصہ ہے جسے علٰحدہ کوئی مستقل ہستی نہیں ملسکتی۔

ہندوستان کی حفاظت ودفاع میں صرف گورنر جنرل کو ذمہ دار قرار دیا جانا محض اس لئے ہے کہ ہندوستانیوں کو نہ فوج میں زیادہ درخور پانے کا موقع مل سکے اور نہ فن حرب کے اُصول سے ان کو آگاہی حاصل ہو۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ اس وقت اگر انگریز ہندوستان سے چلے جائیں اور کوئی غنیم اس پر حملہ آور ہو تو ہندوستان مدافعت نہیں کرسکتا کیونکہ نہ وہ فنون جنگ سے واقف ہے اور نہ آلات حرب طیار کرسکتا ہے، لیکن اس عذر کی بنا پر کسی ملک کو ہمیشہ کے لئے اس فن سے بیگانہ رکھنا اور اُس کو کبھی اس بات کا موقعہ نہ دینا کہ وہ ملک کی حفاظت کا اہل بن سکے کتنا غیر روادارانہ بلکہ غیر منصفانہ طرز عمل ہے۔

مالیات کا انتظام ہرچند مرکزی وزراء کے سپرد ہوگا، لیکن چونکہ اصل ذمہ داری گورنر جنرل کی ہے اس لئے وہ بجٹ میں مداخلت کرکے جس تجویز کو رد کرنا چاہے فوراً مسترد کرسکتا ہے۔

مرکزی حکومت میں دو ایوان ہوں گے، ایک کونسل آف اسٹیٹ کے نام سے، دوسرا ہاؤس آف اسمبلی کے لقب سے۔ اول الذکر ایوان کے ارکان ۲۶۰ تک ہوں گے جن میں ۱۵۰ ملک کے نمایندے ہوں گے ۱۰۰ ریاستوں کے اور ۱۰ گورنر جنرل کے نامزد کئے ہوئے۔ دوسرے ایوان کے ارکان کی تعداد ۳۷۵ تک ہوگی جن میں ۲۵۰ ملک کے نمایندے، اور ۱۲۵ ریاستوں کے۔

چونکہ ان دونوں ایوانوں میں ایک بڑی تعداد ریاستوں کے نمایندوں کی ہوگی اور یہ نمایندے وہاں کی پبلک کے منتخب کئے ہوئے نہ ہوں گے بلکہ ریاستوں کے نامزد کردہ ہوں گے، اس لئے ظاہر ہے کہ انھیں برطانوی ہند کے معاملات سے کیا دلچسپی ہوسکتی ہے اور وہ حکومت کی رائے کے خلاف کبھی برطانوی ہند کی رعایا کا خیال نہ کریں گے۔

ان دونوں ایوانوں کو برابر کے اختیار حاصل ہوں گے اور اختلاف رائے کی صورت میں دونوں کا مشترکہ اجلاس ہوگا اور کثرت رائے سے جو فیصلہ ہوگا اس پر عمل کیا جائے گا، لیکن اس مشترکہ جلسے کے معنے یہ ہوں گے کہ اکثریت رجعت پسندوں کی ہوجائے گی، کیونکہ کونسل آف اسٹیٹ کے تمام اراکین صوبوں کے ایوان اعلیٰ کے منتخب کئے ہوئے ہوں گے اور مشترکہ اجلاس میں ان کی اور ریاستوں کے نمایندوں کی تعداد ملکر نصف سے زیادہ ہوجائے گی۔

الغرض، مختصراً یہ ہے وہ جدید آئین حکومت جو ہندوستان کو ملنے والا ہے اور یہ ہیں وہ آزادیاں جو ملک و اہل ملک کو یہاں کے نظم ونسق میں عطا ہوئی ہیں۔ میں دیکھتا ہوں کہ بعض حضرات ان جملہ ناکامیوں کا ذمہ دار برطانیہ کی پالیسی اور یہاں کے قدامت پسند طبقہ کو

قرار دیتے ہیں، لیکن سیاسیات کے باب میں میرا مسلک ہمیشہ آزاد رہا ہے اور میں اس کو بالکل خلاف فطرت نہیں سمجھتا اگر برطانیہ اپنے مفاد کے لئے ہندوستان کی خواہشوں کو پامال کر دینا چاہتا ہے، کیونکہ وہ یہاں درس اخلاق و روحانیت دینے نہیں آیا بلکہ اپنی قوم اور اپنے ملک کو فائدہ پہونچانے کی نئی راہیں نکالنے کے لئے آیا ہے اور اُس سے زیادہ احمق کوئی نہیں ہو سکتا اگر وہ ہندوستان کے مفاد پر اپنے مفاد کو قربان کر دے ۔ اس لئے حکومت کو مورد الزام ٹھہرانا نہایت لایعنی بات ہے، اور ان تمام ناکامیوں و مایوسیوں کا سبب خود ہمیں اپنے ہی اندر تلاش کرنا چاہئے ۔

دنیا میں کوئی قوم اس وقت تک نہیں اُبھر سکتی، جب تک وہ خود اپنے اندر تغیر پیدا نہ کرے اور احساس آزادی کا ثبوت بجائے زبان کے اپنے افعال و کردار سے نہ دے ۔

اس میں شک نہیں کہ ہندوستان میں آزادی کا احساس بڑی حد تک پیدا ہو گیا ہے، لیکن مصیبت یہ ہے کہ یہاں کی سیاسیات کا قیام زیادہ تر مذہبی جذبات پر ہے اور وطنیت کا رشتہ کوئی چیز نہیں سمجھا جاتا ۔ یہی وجہ ہے کہ شروع سے اس وقت تک کوئی متفقہ آواز اہل ملک کی بلند نہ ہو سکی اور حکومت نے ہمیشہ اسی اختلاف کی آڑ پکڑ کر ملک کی آزادی کو اسقدر تعویق میں ڈالا ۔ اور نہیں کہا جا سکتا کہ کب تک ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ اسی طرح معلق رہیگا ۔

گزشتہ ماہ کا رسالہ

افسوس ہے کہ جنوری ۳۵ء کے رسالہ میں ملاحظات کے لئے جگہ نہ نکل سکی اور مجھے بالکل اسکا موقعہ نہ ملا کہ اس بزم ادب میں شریک ہونے والوں کا شکریہ ادا کرتا ۔

جس وقت اول اول میں نے اس کا اعلان کیا تو مجھے توقع تھی کہ مضامین کثرت سے اور اچھے موصول ہوں گے ۔ سو جس حد تک کثرت کا تعلق ہے اس میں تو مجھے مایوسی نہیں ہوئی لیکن جہاں تک "اچھے" ہونے کا سوال ہے یقیناً میری توقعات پوری نہیں ہوئیں اور بہت سے مضامین مجھے نظر انداز کرنا پڑے ۔

۲۳۶ صفحات میں علاوہ میرے مضامین کے جو ۱۱۶ صفحات پر حاوی ہیں، ۱۲۰ صفحات دیگر حضرات کے ہیں اور اس طرح گویا نصف بار میرے احباب نے اُٹھایا جس کا میں از بس شکر گزار ہوں ۔

مقامی احباب میں سب سے زیادہ مدد مجھے مسٹر مشیر احمد صاحب علوی بی اے سے ملی، جنھوں نے نہ صرف یہ کہ خود ایک گرانقدر مقالہ تحریر فرمانے کی زحمت گوارا فرمائی، بلکہ مولوی امیر احمد صاحب علوی اور مولوی نور الحسن صاحب نیر سے بھی دو نہایت پاکیزہ مضمون حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے ۔ علاوہ اس کے جو اخلاقی اعانت انھوں نے کی ہے، اس کا اظہار چنداں ضروری نہیں، لیکن اعتراف لازم ہے ۔

میں مرزا جعفر علی خانصاحب اثر کا بھی زیر بار کرم ہوں کہ سب سے پہلے انھوں ہی نے مضمون بھیجنے میں اقدام کیا اور ایک ایسے بحث کو پیش کیا جو دلچسپ بھی ہے اور مفید بھی ۔ اسی طرح جناب مولوی نصیر الدین ہاشمی، جناب سید تمکین کاظمی، جناب افسر میرٹھی اور حضرت سیماب اکبر آبادی کا بھی شکریہ مجھ پر لازم ہے کہ انھوں نے میری التجا کو قبول فرمایا اور اس ادبی صحبت میں شرکت کی زحمت گوارا فرمائی ۔

جناب ناطق لکھنوی کا میں خصوصیت کے ساتھ ممنون ہوں کیونکہ اگر وہ اپنی نظم "تخلیق اُردو" مرحمت نہ فرماتے تو رسالہ غالباً نظم کے لحاظ سے بالکل معرا نظر آتا۔ جناب ناطق نے اس نظم میں جس خوبی و پاکیزگی سے اُردو شاعری کی تاریخ پر تبصرہ فرمایا ہے وہ ارباب نظر سے مخفی نہیں۔

صوبۂ بہار کی شاعری پر عزیز محترم مولوی عبدالمالک صاحب آروی نے جو کچھ لکھا ہے وہ انھیں کا حصہ تھا، ان کا شکریہ میں اس لئے ادا نہیں کرتا کہ خود اپنے مضمونوں پر میں نے اپنا شکریہ کب ادا کیا ہے۔

جنوری ۳۶ء کا نگار یہ بات تقریباً طے ہو چکی ہے کہ جنوری ۳۶ء کا نگار ہندی شاعری کے لئے وقف ہو اور اگر ناظرین کرام گوارا فرمائیں تو بجائے لیتھو کے ٹائپ میں شایع کیا جائے۔

عرصہ ہوا ہندی شاعری پر میری ایک کتاب "جذبات بھاشا" کے نام سے شایع ہو چکی ہے، لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ مجھے اس زبان پر عبور حاصل ہے درست نہیں، لگاؤ ضرور ہے اور بہت ہے۔ لیکن اس خدمت کو میں تنہا کبھی انجام نہیں دے سکتا اگر برادران وطن میری اعانت نہ فرمائیں۔ ارادہ ہے کہ اس سلسلہ میں پریاگ، کاشی اور اجودھیا کا سفر کر کے اس زبان کے ماہرین سے تبادلۂ خیال کروں اور اس زبان کے جتنے رتن میسر آسکتے ہیں وہ سب پیش کر دوں۔

مسلمانوں میں اس زبان پر ماہرانہ عبور رکھنے والے بہت کم ہیں، لیکن یہ جانتا ہوں کہ اس سے لطف اُٹھانے والوں کی کمی نہیں، اسلئے میں بہت ممنون ہونگا اگر ارباب قلم و اہل نظر اس باب میں اپنے علم و مشورہ سے میری اعانت فرمائیں گے۔ میں جن عنوانات پر مضامین چاہتا ہوں ان میں سے خاص خاص یہ ہیں:-

(۱) ہندی شاعری کی تاریخ — (۲) ہندی شاعری کے مختلف ادوار اور ہر دور کے بہترین شعرا کے کلام کا انتخاب اور ان پر تنقید۔ (۳) ہندی شاعری کا اثر اُردو شاعری پر — (۴) اُردو شاعری کا اثر ہندی شاعری پر۔ (۵) مسلمان فرمانرواؤں نے ہندی شاعری کی ترقی میں کیا حصہ لیا — (۶) ہندی شاعری کی عروض — (۷) ہندی شاعری کے مختلف اصناف اور اُن کے تدریجی ارتقاء کی تاریخ — الغرض یہ و راسی قسم کے بہت سے عنوانات قایم ہو سکتے ہیں جن پر کامل تحقیق و استقصاد کے ساتھ لکھنے کی ضرورت ہے اور غالباً ایک سال کی فرصت اس کے لئے ناکافی نہ ہوگی۔

مختصر تاریخ عالم اس کتاب میں نوع انسانی کے ظہور، اس کی تدریجی ترقی اور عہد قبل تاریخ کے متعلق (بقول اڈیٹر نگار) "نہایت مفید معلومات فراہم کی گئی ہیں اور اُردو میں کوئی کتاب اس مقصد کو سامنے رکھ کر اس خوبی سے مرتب نہیں کی گئی" زبان کی سلاست، ترجمۂ اصطلاحات، انداز بیان کی دلچسپی اور ماخذ کی تحقیق و تفتیش اس تالیف کی نمایاں خصوصیات میں ہیں۔

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول سید نعیم احمد - باون پائگاہ لشکر (ریاست گوالیار)

اشو[1] زردشت

اس کرۂ ارض کے اور ملکوں کی طرح فارس کا آدم زاد بھی شروع میں اس توہم پرستی کا شکار تھا جو نابالغ دماغوں کی خو ہے۔ سحر و جادو انداح اور عجائب پرستی کے ساتھ چاند سورج اور قدرت کی دوسری روشن و نمایاں مخلوق کی پرستش مصریوں، بابلیوں اور ہندوؤں کی طرح ایرانیوں میں بھی جاری و ساری تھی ان قوتوں کے علاوہ ان کے اور بھی اپنے من گڑھت دیوتا تھے جن کو وہ مختلف صورتوں اور شکلوں میں پوجتے تھے۔ وہاں کے پیشدادیوں[2] کے وقت میں ملک میں ایک وبا آئی اور بکثرت موتیں ہوئیں عزیزوں اور رفیقوں کی مفارقت سوہان روح تھی۔ اُنھیں ہمہ وقت پیش نظر رکھنے کے لئے زندوں نے مردوں کے مجسمے[3] بنائے اور ان کی منزلت کرنے لگے۔ یہ منزلت ترقی پا کر پرستش ہوگئی اور آخر اُن کی عبادت ہونے لگی۔ پھر مختلف عناصر کے مجسمے بنے اور باضابطہ طور پر ان کے آگے بھی سر جھکنے لگے۔ یوں وہاں بُت پرستی کی بنیاد پڑی اور قوم کی قوم اس میں مبتلا ہوگئی۔ ان ہی پیشدادیوں میں مشہور ہوشنگ ہے۔ چقماق (چکمک پتھری) کی رگڑ سے آگ اسی کے وقت میں نکلی اور وہ عجیب سمجھ کر نور خدا مانی اور سمجھی گئی۔ تہمورس[4] اس کے خلف کے زمانہ میں شیراسپ ایک عقیل و فرزانہ پیدا ہوا۔ اس نے نہ صرف سلطنتی اُمور میں بادشاہ کو مدد دی بلکہ فنِ کتابت ایجاد کر کے ایرانیوں کو تعلیم بھی دینے لگا۔ جمشید اس تہمورس کا بھتیجہ اور جانشین ہے۔ یہ وہی جمشید ہے جس کا جام ایرانیوں ہی کی محفل عیش میں نہیں بلکہ ہماری بزم ادب میں بھی ابتک گردش کر رہا ہے۔ اس کے زمانہ تک بُت پرستی اتنی ترقی پا گئی اور اس کی اہمیت اس درجہ بڑھ گئی تھی کہ جمشید کو اپنے پرستش کئے جانے کی بھی ہوس ہوئی اور آخر وہ بھی ایک قوت تسلیم کر کے دیوتا بلکہ خدا کی طرح مانا جانے لگا۔ پیشدادیوں کے زوال پر کیانی ایران کے حکمران بنے اور جیسا کہ اوپر کہا جا چکا اخیر کے وقت میں زرتشت کا ظہور ہوا۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ بیرونی حملوں اور خصوصاً تورانیوں کی زیادتیوں سے ملک تاراج ہو رہا اور پھر شاہ پرستی کے زور سے رعایا تباہ اور مخلوق خدا سخت عذاب میں مبتلا ہو رہی ہے۔

دنیا کی تاریخ بتاتی ہے کہ جب کسی ملک و قوم پر ایسا کڑا وقت آتا ہے تو ان میں ہمیشہ ایک ایسا بندۂ خدا پیدا ہوتا ہے جس کے قوائے عقلی اُسوقت کی ذہنیت سے بالاتر ہوتے ہیں۔ یہ "مرد غیب" اپنے زمانہ کی حالت پر غور کرتا اور ملک و قوم کی حالت سدھارنے کے لئے آخر کوئی دوا تجویز کرتا ہے۔ یہ قانونِ قدرت ہے اور اس قانون سے اُسوقت کا ایران مستثنیٰ کیونکر ہو سکتا تھا؟ کہتے ہیں کہ شاہ ایران کی نسل[5] اور

---

[1] پہلوی زبان میں اشو حضرت کے ہم معنی ہے۔ [2] ایران کے اول حکمران۔ [3] گبن اور سفرنامہ مشرق دیا۔ از ولیم وی رو بر کوائس سنہ ۱۸۵۳ء۔ [4] چھٹا فارسی لفظ خواہ مخواہ عربی بنا اور حرف ش اس میں داخل کیا گیا۔ [5] بندہش کتاب دعائے پارسیان و مسعودی۔

فریدوں و منوچہر کے خانوادے میں آذربیجان شمال ایران کی طرف (بزمانۂ کیخسرو) پوروسپ کے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام زرتشت[۱]
رکھا گیا۔ قدیم پہلوی میں زرت کے معنی دلاور و خشمگیں کے ہیں اور شت بمعنی شتر (اونٹ) یعنی شترِ خشمگیں۔ اس زمانہ میں ایسے نام و عرف اکثر
رکھے جاتے اور وہ اچھے سمجھے جاتے تھے۔ زرتشت کی تعلیم و تربیت سات برس کے سن میں شروع ہوئی اسوقت کا بہتر سے بہتر معلم تجویز ہوا
اور بہت کم عرصہ میں اُنھوں نے وہ سب حاصل کر لیا جو اس زمانہ کے لحاظ سے ضروری تھا۔ رُشد تک پہونچتے ہی اُن کا پُر فکر و روشن دماغ
اپنے ملک و قوم کی ابتر حالت پر غور کرنے لگا اور کامل سات سال کی ریاضت مراقبہ یا تپسیا کے بعد وہ ایک نتیجہ پر پہونچے اور تیس سال کی عمر
میں یہ نتیجہ یعنی اپنے خدا کا پیغام لیکر قوم کے سامنے آئے اور اُس کی تبلیغ کرنے لگے۔

یہ زمانہ لہراسپ و گشتاسپ کا ہے۔ زردشت سمجھے اور خوب سمجھے کہ ہماری قوم کے قوائے دماغی ابھی ایسے قوی نہیں ہیں کہ کسی نئی بات
کے سننے پر بہ آسانی متوجہ ہو جائیں اس لئے اُنھیں سلطنت کی طاقت سے مدد لینی پڑی اور وہ گشتاسپ کی معیت سے پوری ہوئی۔ اُن کی
کتاب (اوستا) جس میں اُن کے سکون و مراقبہ کے زمانہ میں احکام ربانی قلمبند ہوئے تھے ساتھ ہی بادشاہ وقت کے سامنے پیش کی گئی۔
گشتاسپ کو مخاطب کرکے آپ نے کہا کہ ہم پیامبر احکام خدا ہیں ہماری نصیحت سنو اس خدائے واحد کے سوا کسی کی پرستش نہ کرو زمین خدا
کی امانت و خون سے بچاؤ جنگلوں کو کاٹو باغ بناؤ وہاں درخت لگاؤ زراعت کرو اور مویشیوں کو نگاہ رکھو۔ یہ تمھارے مصرف کے اور تمھاری زراعت
کے کام کے ہیں۔ آتش یعنی آگ کا خاص لحاظ کرو اس سے تمھاری زندگی ہے وہ خموش نہ ہونے پائے! (اوستا) یہ احکام بجلی کی طرح کوندے اور
دربار شاہی کو منور کرنے لگے۔ اسوقت ایک عظیم الشان درخت نظروں کے سامنے نمودار ہو گیا۔ یہ حقیقتاً درختِ خرد[۲] تھا جس کے پھل چکھ لینے
کے بعد حیات جاوداں ممکن تھی۔ ان احکام نے یزدان (نیکی) پرستی بتائی اور اہرمن (بدی) پرستی مٹائی۔ اسوقت کا سماں دقیقی[۳] یوں کھینچتا ہے

زایوانِ گشتاسپ تا پیش کاخ ۔۔۔ درختِ گشن بیخ و بسیار شاخ
همہ برگِ او پند و بارش خرد ۔۔۔ کسے کو چنیں بر خورد کے مُرد
خجستہ پے و نام او زرتُشت ۔۔۔ کہ اہرمنِ دُرکنش را بکُشت

گشتاسپ متاثر ہوا ایمان لایا۔ جمشید کی فرعونیت دور ہوئی اور شاہ و گدا ایک ہو کر خالق کی طرف جھک گئے۔ یہ احکام جرسہ پر کندہ کرکے ملک
میں تقسیم ہوئے۔ اسوقت سے پھر ایران یزدان پرست و موحد ہو گیا۔

کسی پیامبر کے لئے اگر معجزے (وہ بات جس میں دوسروں کو عجز ہو یعنی عادتاً وہ اُس کے کرنے پر قادر نہ ہو سکیں) کی بھی واقعی ضرورت
ہو تو زرتشت کی زندگی میں اس کی بھی کمی نہیں اور کسی رسول کے مدعیٔ رسالت ہوئے بغیر اگر اسے نبی تسلیم نہ کیا جائے تو اس پیغمبر ایرانی کے یہاں
کوئی بھی موجود ہے۔ اس پیغمبر کے صرف وہی پیغام و احکام نہیں جو مذکور ہو چکے اور بھی بہت ہیں اور وہ انسانی زندگی کے ہر شعبہ میں مفید ہیں

۱ه زرتشت اور زردشت دونوں درست ہیں۔ ۲ه ایسے استعارے تقریباً ہر مذہب کے ادب میں پائے جاتے ہیں! ۳ه دقیقی وہ مشہور فارسی
شاعر جس نے ساسانی سلطانوں کے حکم سے شاہنامہ نظم کرنا شروع کیا تھا۔ مگر وہ ناتمام رہ گیا۔ اور فردوسی نے اُسے پورا کیا۔

اور لایق عمل۔ مذکورہ احکام معاد و معاش دونوں کا راستہ دکھاتے اور زمین ایران کے جنگل کو پاک و صاف کرکے اس میں کشت و زراعت
کا شوق دلاتے اور انسان کو متمدن بناکر اسے تدبیر منزل بھی سکھاتے ہیں۔ معلوم ہے کہ ہوشنگ کے وقت میں یعنی زردشت سے صدہا سال
قبل چقماق سے آگ نکلی اور وہ متبرک و نور خدا مانی گئی اور محفوظ رکھی گئی۔ قدرت کے اس قابل لحاظ عنصر (آتش) کا خیال اسیوقت سے ہے زردشت
اس کے بانی نہیں۔ انھوں نے دیگر عقلا اور رہبروں کی طرح اپنے زمانہ کی ہر اس چیز کو قایم رکھا جو اصول مذہب میں حارج نہو کر انسانی زندگی کو
مفید ہوسکے۔ ان میں سے ایک آتش بھی تھی جس کی اہمیت اور ہمہ وقت ضرورت مسلّم ہے۔ اس لئے وہ اس مابہ زندگی کی تائید میں بھی گ
ہوئے اور دیگر عناصر پر اسے ترجیح دیکر اس کی نگہداشت کو باقاعدہ بنا گئے۔

کیانیوں کا زمانہ کیقباد سے شروع ہوکر دارائے دوم پر ختم ہوتا ہے۔ پونے سات سو سال ایران اس خاندان کے تحت میں رہا اور اس
عرصہ میں مذہب زردشت وہاں حکومت کرتا رہا۔ نہ صرف توحید و خداپرستی ہی اس زمین پر پھیلی بلکہ اس مذہب کے احکام کی بدولت ارض ایران
سلسلہ در سلسلہ جنگلوں سے پاک و صاف ہوکر قابل زراعت بنی اور ملک و قوم کی خوشحالی و آبادی اسوقت کے اور ممالک کو زیر کرنے لگی۔ انھیں
کیانیوں کے وقت میں دارائے اول کے ہاتھوں سے مصر و یونان فتح ہوا۔ اور اسی دارا کے قوت بازو سے بحر خضر کے قریب وہ سدّ[1] تعمیر ہوئی
جس نے ادھر کی وحشی قوموں (یاجوج ماجوج) کو متمدن زمین کی طرف بڑھنے سے روک دیا۔ دارائے دوم (۳۳۳ ق م) کے وقت میں
یونان پر ایرانی حملہ کا بدلہ لینے کھڑا ہوتا اور فارس پر چڑھتا ہے۔ دارا اپنے خادموں کے ہاتھ سے مارا جاتا ہے۔ اس لئے سکندر کو کھلا راستہ
ملتا اور بہ آسانی وہ ایران پر قبضہ کرلیتا ہے۔ یونان اسوقت اپنی حکمت پر نازاں اور سولن و سقراط کا نہیں بلکہ افلاطون و ارسطو کا بھی مسکن
ہے۔ سکندر اسی ارسطو[2] کا شاگرد ہے۔ یونانی اپنے علم کے آگے کسی قوم کے مذہب و فلسفہ کو خاطر میں نہیں لاتے ہیں۔ ایران، یونان کا زبردست
رقیب ہے۔ اس لئے یونانیوں کو اس کے مٹانے کی فکر ہے کہ اسے فنا کئے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتے۔ یہ فکر سکندر کے ہاتھ سے پوری ہوئی
وہ کیانیوں کی سلطنت ہی کو نہیں مٹاتا بلکہ مذہب زردشت کے خاتمہ کی بھی کوشش کرتا ہے کہ ایرانیوں کی شمع عقل کو گل کئے بغیر اس دنیا
میں یونانیوں کا چراغ روشن نہیں ہوسکتا تھا۔ لشکریوں کے ظلم و ستم سے نہ صرف صنادید عجم ہی تباہ و برباد ہوئے بلکہ وہاں کے مذہبی کتبخانے
یک نذر آتش کردئے گئے اور یوں وہاں وہ قومی مذہب ایک عرصہ کے لئے خموش ہوگیا۔ سکندر کے بعد ایران میں مختلف و مختصر حکومتیں قائم
ہوئیں وہ ملوک الطوائف کہلاتی ہیں۔ یعنی وہ صوبجات میں تقسیم در تقسیم تھیں اور ان کے والی گو خودمختار اور آزاد تھے لیکن ان میں کا کوئی
ایک پورے ملک پر قابض و متصرف نہ تھا اس لئے وہ کمزور رہیں اور مٹیں۔ آخر ساسانی اٹھے اور سارے ملک پر قابض ہوکر اسے متحد
کرنے لگے۔ ان کا زمانہ اردشیر بابکان سے شروع ہوکر یزدگرد پر ختم ہوتا ہے۔ اس خاندان نے چار سو سال ایران پر حکومت کی اور اپنے
پیشروؤں کی طرح اپنے قومی مسلک کے پابند اور سکندر کی بدولت صنادید عجم اور مذہب عجم کو جو صدمہ پہونچا تھا اُسکی تلافی میں سرگرم رہے

---

[1] یہ سد ہمارے یہاں سکندری کہلاتا ہے۔ لیکن سکندر یونان کو اس سے کوئی تعلق نہیں ہے نہ وہ بحر خضر کی طرف گیا اور نہ اسنے وہاں کوئی سد باب کیا یہ دارا ہی جو اس طرف گیا
تھا اس لئے ذوالقرنین سے مراد یہ شاہ فارس ہے نہ کہ سکندر یونانی۔ [2] سکندر ایران کے متعلق ہر بات میں ارسطو کے مشورہ پر چلتا تھا۔ (گبن)

بہرام شاہ اول اس گھر کا وہ مشہور شہر یار ہے جس کے عہد میں حکیم مانی کی نشوونما ہوئی۔ یہ صورت پرست زردشت سے یزداں پرست کے مذہب کی شکل بگاڑنا چاہتا تھا اس لئے شاہی عتاب میں آیا اور قتل ہوا۔ یہ واقعہ ۲۷۶ء کا ہے جس کے بعد دو سو برس تک زمین ایران کسی قابل ذکر مذہبی انقلاب کا شکار نہ ہوئی۔ لیکن قباد پسر فیروز کے زمانہ میں اس مذہبی سکون میں پھر ایک ہیجان آیا۔ مزدک نام ایک مردک اٹھا۔ اس نے اپنا ایک نیا مسلک پیش کیا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ دنیا کا مالک خدا ہے، اور ہم سب اُس کی ملکیت ہیں۔ یہاں کی کوئی چیز سوائے اس ذات کے دوسرے کی نہیں ہوسکتی۔ ہمیں سب کی شرکت ہے اور اس میں سب کا برابر کا حصہ۔ یہاں تک کہ مردوں کی بیبیاں بھی ہم میں مشترک اور دوسروں کے تصرف میں آسکتی ہیں۔ یہ عقیدہ عام ہوا اور ہر طرح کے تصرفات شروع ہوگئے۔ ملک میں انارکی اور بدامنی پھیلی۔ حکومت اس فتنہ کو دور کرسکتی تھی لیکن شاہ وقت یعنی قباد خود مزدک کا مرید ہوگیا۔ اس لئے یہ عقیدہ اور قوی ہوگیا۔ مزدک نے ایک دن بادشاہ قباد سے اُس کی ملکہ (مادر نوشیرواں) کو طلب کیا کہ اس کا وہ بھی حصہ دار و حقدار ہے قباد اس طلب کو رد نہیں کرسکتا تھا۔ لیکن نوشیرواں نے منت اپنی ماں یعنی ملکہ کو اس ذلت سے بچایا اور جب سے وہ (نوشیرواں) مزدک اور اُس کے پیرؤں کے پیچھے پڑ گیا۔ قباد کے بعد جب نوشیرواں تخت جم پر بیٹھا تو ملک کے اصلی و قومی مذہب (زردشتی) کا نئے سر سے شادیانہ بجا لیکن اس عرصہ میں مزدکی ایران میں پھیل کر قوی ہو چکے تھے، ان کا استیصال آسان نہ تھا بادشاہ کچھ دن خموش رہا آخر ایک دن مزدک پنجہ میں آیا اور نوشیرواں عادل نے ۵۳۱ء میں اُس کا فیصلہ کر دیا۔

سمجھنا چاہئے کہ وجود میں آئی ہوئی کوئی چیز فنا نہیں ہوتی۔ ہم محسوس نہ کرسکیں مگر وہ کسی نہ کسی صورت میں موجود رہتی ہے یہی حالت خیالات و عقائد کی بھی ہے مزدک گو بظاہر فنا ہوا مگر وہ اور اس کے عقائد فضائے ایران کو گھیرے رہے اور اس کے سو برس بعد ہی وہ عراق میں نمودار ہوئے جنگ صفین کے خوارج نے بھی یہی مزدکی عقیدہ پیش کیا اور الملک اللہ کا نعرہ مار کر اور مسلمانوں کے عقیدہ سے گریزاں ہوکر اپنا علم علحدہ بلند کرنے لگے ان عجمی و عراقی یعنی مزدکی عقائد نے نہ صرف ساسانیوں اور مذہب زردشت کو کمزور کیا بلکہ تیسری چوتھی صدی ہجری کے مسلمانوں کے عقائد میں بھی تلاطم ڈالا اور وہ مختلف صورتوں میں ظاہر ہوا کیا ہے۔ نوشیرواں کے بعد ایران چین سے نہ رہا۔ ہرمز سوم اور بہرام کی حکومتیں ملک کے ان وزرا و امرا کے زیر اثر تھیں جو اپنے رسوخ و قوت کے لئے آپس میں جنگ کرتے اور تخت جمشید پر اپنے مطلب و اثر کے شہزادوں کو بٹھاتے و اُٹھاتے تھے۔ خسرو پرویز بھی اسی طرح تخت نشین ہوا۔ اس کا زمانہ ہند کے آخر مغل بادشاہوں کے مشابہ ہے سلطنت کمزور رعایا منتشر اور فوج ابتر تھی ملکی و قومی مذہب (زردشتی) بھی شہ زور نہ تھا اور ظاہری ٹھاٹھ کے سوا ملک میں اور کچھ باقی نہ تھا۔ شیریں اسی خسرو کی وہ محبوب نمکین ہے جو فرہاد سے منسوب ہوکر مشہور ہوئی اور ہمارے ادب کی زبان پر اب بھی چڑھی ہوئی مزا دے رہی ہے۔ پوران دخت و شاہنشاہ اور آرزم دخت ملکہ و شاہ شطرنج تھے ان کے بعد یزدگرد شاہ ایران بنا۔ یہ اپنے پیشروؤں سے بھی زیادہ کمزور و بےتدبیر نکلا۔ فارسیوں پر تازیوں کا تسلط اسی کے وقت میں ہوا۔ ضحاک کے بعد ایران اب دوبارہ عربوں کے ہاتھ آیا۔ قدیم قومی نفاق تازہ ہوا اور ساسانیوں کا یوں خاتمہ ہوگیا۔

ساتویں صدی عیسوی تک موسوی مذہب ختم عیسوی مسخ اور ہندی و زردشتی بے سود ہوچکا اور خدائے واحد کی پرستش نابود نہیں تو مردہ ہوچکی اور دنیا انتشار و ہیجان میں تھی اس لئے قانون قدرت کے موافق پھر ایک ایسے راہبر کی ضرورت تھی جس کی بلند آواز دنیا کو چونکائے اور کسی ایک ہستی کی طرف مخلوق کی گردنوں کو جھکائے۔ قدرت کی یہ عادت ایسی ضرورت کے وقت تازہ ہوئی اور اب کہ یہ صدا اس جگہ سے اُٹھی جہاں

اس وقت سے صدیوں قبل خلیل کی تکبیر فضلائے عالم میں گونج چکی تھی۔ اسی ساتویں صدی عیسوی میں ہمارے پیغمبر عرب کا ظہور ہوا وہ وہی احکام و فرمان لائے جو ان سے قبل دنیا میں آچکے مگر فراموش ہو چکے تھے۔ آپ نے اس حکم خدا اور اپنے آنے کی خبر صرف اپنے ملک و قوم ہی کو نہیں دیا بلکہ دنیا کے مختلف ممالک و اقوام کو بھی دعوت بھیجی کہ وہ بیخبری کا عذر کر کے پار نہ ہو جائیں۔ یہ پیام جس طرح موسویوں اور عیسائیوں تک گیا اسی طرح مجوسیوں زردشتیوں تک بھی پہونچایا گیا۔ عجم عرب کا ڈانڈا ہے اور ایک کا دوسرے پر اثر مدت سے چلا آتا ہے۔ اس لئے عجمی زمین پر بھی بہت جلد وہ آسمانی تحفہ بطور پاسخ بھیجا گیا۔ یہ خسرو پرویز کا زمانہ ہے۔ شاہ عجم عرب کی کسی ادا کا دلدادہ نہیں وہ ایسے پیغام و پاسخ کو بھی اپنی قدیم قومی نظر تنفر سے دیکھتا اور ٹال جاتا ہے۔

رسول عربی کا مقصد پیامبری تھا نہ کہ جنگجوئی۔ اس لئے انھوں نے عجم تک اپنا پیغام پہونچا دینے کے بعد وہاں کی زمین پر قبضہ اور عجم پر غلبہ کی نہ کبھی خود خواہش کی اور نہ اپنے بعد کے لئے ایسی فرمائش کر گئے۔ آنحضرت کے بعد جو ملک گیریاں ہوئیں وہ اسلامی فتوحات کے نام سے مشہور ہیں مگر حقیقتاً وہ عربی فتوحات تھے نہ کہ اسلامی! اُسوقت عراق کا وہ حصہ، جو عرب سے ملحق تھا عجمی اثر میں تھا اس لئے فارسیوں اور تازیوں کا تصادم لازمی تھا۔ کوششیں کی گئیں کہ اختلاف نہ ہو۔ عجمی اپنے قوم کی قدامت و شوکت پر نازاں بلکہ مغرور تھے عربوں کی سی قوم کی طرف کیا مخاطب ہوتے۔ اس غفلت کا نتیجہ اختلاف تھا اور اختلاف کا نتیجہ تصادم اور وہ ہو کر رہا۔ آخر تازی و فارسی میدان میں آگئے اور انکی سیاسی جنگ شروع ہو گئی۔

سنہ ۱۱ھ کے بعد ہی یہ اختلاف ہوا لیکن حق یہ ہے کہ عربی اسلامیوں نے اس معاملہ میں بھی بڑی طرحیں دیں۔ وہ چاہتے تھے کہ شاہ عجم اور ان کے درمیان وہ سلوک و مدارا قائم ہو جائیں جو دوسرے صاحب کتاب بادشاہوں کے ساتھ قائم ہو چکے تھے۔ اس خیال سے سنہ ۱۴ھ میں یزدگرد کے پاس ایک اسلامی وفد گیا اس کے سردار شیخ مغیرہ نے شاہ وقت سے مودت و مصالحت چاہی مگر وہ منظور نہ ہوئی۔ آخر نوبت بہ جنگ رسید۔ عجمی پسپا ہوئے اور چار سو سال کی ساسانی حکومت اور ہزار ہا برس کی فارسی سلطنت پامال ہو کر تازیوں کے دست تصرف میں آگئی۔

پیغمبر عربی نے عجمیوں کو ہمیشہ بہ نظر لطف دیکھا۔ نوشیرواں عادل کے عہد میں اپنے وجود ذیجود پر آپ نے فخر فرمایا اور فارسیوں کو اپنی محفل و مجلس میں سرفراز کیا ہے۔ اور سلمان فارسی کا قصہ کسے معلوم نہیں کہ ان کے سے عجمی غلام کو آپ نے آقائے اعراب ہی نہیں بنایا بلکہ انھیں من اہلبیتی فرما کر اپنے گھر میں داخل کر لیا۔ یہ وہی مذاق و اثر تھا کہ اہل بیت رسول میں فارسیوں کی ہمیشہ قدر رہی اور فارسی جنگوں کے بعد جب شاہزادی ساسانیان حضرت شہربانو مدینہ لائی گئیں تو جناب امیر کے تدبر و قدر دانی سے وہ شہزادۂ عرب جناب امام حسین کے نکاح میں ملکہ و مالکہ بنکر رہیں۔ رسول عربی کی نسل ان شہربانوں کی جہت سے چلی اور پھیلی اور آج دنیا میں لاکھوں سادات عرب و عجم کے اس اتفاق سے ہماری زمین پر نظر آتے اور فخر کرتے ہیں۔ اور کیا خوب کہا ہے ڈاکٹر گیگر (جرمن) نے کہ "علی کے اس تدبر نے قدیم عربی و عجمی نفاق ہی کو کم نہیں کیا بلکہ ایک ملک کے ملک اور قوم کی قوم کو بغیر جنگ زیر کر کے ہمیشہ کے لئے انھیں اپنا اور اپنے گھر کا غلام بنا لیا۔

عجمی و عربی مذہب میں حقیقتاً بال[له] برابر کا فرق تھا۔ اشو زردشت بھی غیب سے وہی لائے جو ان سے پہلے دنیا کو اسی ذریعہ سے مل چکا تھا۔ اس آریا معلّم عجم کا حکیم جاماسپ نام (ندیم شاہ گشتاسپ) ایک شاگرد رشید تھا اس حکیم وقت نے بطور پیشینگوئی گشتاسپ سے کہدیا تھا کہ عرب میں آیندہ ایک رسول کا ظہور ہوگا اور اس کا دین و آئین دنیا کو مسخر کر لیگا ؎

به گشتاسپ جاماسپ خود گفته بود — ازاین رازو این راه او رفته بود (شاہنامہ و زینۃ التواریخ)

مجوسیوں پر اس پیشین گوئی کا اُس زمانہ سے اثر تھا اور وہ ایکُ آنے والے" اور یہودیوں کے فارقلیط کے سے "محمود" محمدؐ کے منتظر تھے۔ عجمیوں کے دل و دماغ سے وہ خیال نہ گیا اور آخر نوشیرواں ؎

چناں دید روشن و دانش به خواب — که در شب برآمد یکے آفتاب

[له] مذہب اسلام اور کیش زردشت واقعی اس درجہ ملتے جلتے ہوئے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے ہمارے آنحضرت پر ان کے خاندان میں سب سے اول امیر مومنان حضرت علیؑ ایمان لائے اسی طرح اشو زردشت کی تصدیق پہلے ان کے چچازاد بھائی ندیو آہ نے کی۔ آنحضرت نے دشمنوں کے خوف سے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی۔ زردشت بھی اسی طرح یان ویج (مقامے در ایران) سے باختر جاتے اور وہاں تبلیغ کرتے ہیں۔ لارہبانیت فی الاسلام ہمارا قانون ہے۔ اور زردشت کا بھی یہی آئین۔ قیامت کے قریب ہم بھی ایک مہدی و ہادی کے آنے کا اعتقاد رکھتے ہیں اور زردشتی اس موقع پر شوشیان نام ایک بزرگ کے ظاہر ہونے کی پیشین گوئی کرتے ہیں۔ زردشتیوں کے یہاں قیامت میں جس پُل پر سے گزرنا ہوگا اس کا پہلوی نام چناوت ہے اور عربی میں (اُس کا معرب) صراط۔ ان کی ہماری رسمیں بھی اکثر ایک ہیں۔ شام کو چراغ دکھائی دیا اور ہم نے دعا پڑھی۔ زردشتیوں کے سامنے آتش نمودار ہوئی اور اُنھوں نے حمد کے لئے ہاتھ اُٹھائے۔ ہمارے ان کے مذہبی مراسم بھی دو نہیں ہیں۔ ہم نماز کے لئے وضو کرتے ہیں وہ بھی اپنی عبادت سے پہلے منھ ہاتھ دھوتے اور مسح پاکرتے ہیں۔ ہماری نماز پنجوقتہ ہے اور ان کی عبادت بھی دن میں پانچ مرتبہ۔ اسے دیکھ کر اکثر ارباب دانش کا خیال ہے کہ ہماری پنجوقتہ نماز زردشتیوں کی تقلید ہے ورنہ اسلام میں وہ صرف تین دفعہ فرض تھی۔ موجودہ ایران کے صوبہ کرمان شاہ میں بہت سے آثار اور صنادید عجم ہیں ان میں تخت بوستان یعنی گلزار ایوان نامی ایک عمارت بھی ہے اس میں چند مجسمے وہاں کے قدیم بادشاہوں کے بھی ہیں اور ایک اسٹیچو اشو زردشت کا بھی ہے ان سنگی تصویروں پر پہلوی زبان میں کچھ کندہ ہے یہ فرانس کے مشہور مستشرق اور پہلوی زبان کے عالم سیو سلوسٹر دے سسی نے ان عبارتوں کو حل کیا ہے۔ شاہ پور کے مجسمے پر یہ تحریر ہے۔ یہ تصویر خدا پرست شہنشاہ شاہ پور بادشاہ ایران (ایران) او ژان۔ ایر ان کی ہے یہ بادشاہ بھی اپنے باپ دادا کی طرح ایک بندۂ خدا اور یزداں پرست تھا اور اس کا خاندان آسمانی و بہشتی کہا جاتا ہے۔ وہی عالم کہتا ہے کہ آر کے معنی پہلوی میں مومن کے ہیں ایر ان اس کی جمع ہے یعنی مومنین اور اَن کے معنی کافر کے ہیں ان ایر ان کفار یعنی شاہ پور مومنوں اور کافروں دونوں کا بادشاہ تھا۔ اس لئے ایران (جمع ار) کے معنی مومنستان (جائے مومنین) کے ہیں یعنی وہاں صرف خدا پرست بستے تھے۔ بیرونی مثل ترک و تاتار ان ایرآن یعنی کفار تھے۔ شاہ پور ان دونوں کا حکمراں تھا (تاریخ ایران از سرجان ملکم کا ضمیمہ ۵ صفحہ ۵۴ ہ وہ شہادتیں ہیں جن سے شاہان ایران اور ایرانیوں کا موحد و خدا پرست اور مومن ہونا ثابت ہوتا ہے

چہل مایۂ نرد باں از برش — کہ می رفت تا اوجِ کیواں سرش

برآمد بر ایں نردباں از حجاز — خراماں خراماں بہ کشی و ناز

جہاں قاف تا قاف پر نور کرد — بہ ہر جا کہ بد ماتمی سور کرد

بادشاہ یہ خواب دیکھ کر چونکا تو تعبیر دانوں سے اس نے اس کی حقیقت پوچھی اسوقت کے ایک فرزانہ بزرجمہر نے تعبیر دی کہ ؎

ازیں روز تا دو چہل سال و بیش — نہد مردے از تازیاں پائے پیش

کہ در پیش گیرد رہ راستی — بہ پیچید ز ہر کژی و کاستی

حکیم جاماسپ کی اس قدیم پیشین گوئی پر نوشیرواں کا یہ خواب ایک زبردست اضافہ ہوا۔ عجمی چونکے اور اس "منتظر" کے انتظار میں تھے کہ پیغمبر عرب اسی نوشیرواں کے مبارک عہد میں پیدا ہوئے۔ زردشتی پیغمبری و رسالت کو خوب خوب سمجھتے تھے۔ نوشیرواں کے بعد جب آنحضرت کے ظہور کا چرچا ہوا تو مجوسی اگلی پیشین گوئی اور شاہی خواب کو یاد کر کے رسول عربی کا خیال کرنے لگے۔ یہ دین عجم گیا تو عجمیوں کو اپنے لا الہ اللہ کے بعد محمد رسول اللہ کا کہہ دینا کیا دشوار تھا۔ اُنھوں نے بے تکلف اس دوسرے کلمہ کو بھی یاد کیا اور عربی مسلمانوں سے ملنے لگے۔ اس لئے عربوں کو اپنے مذہب کے معاملہ میں مجوسیوں سے وہ مقابلہ نہ کرنا پڑا جو مشرکوں سے پیش آیا۔ لیکن عقائد کے توحد کے لئے ہمیشہ یہ ضرور نہیں کہ دو (ایک سے) کلمہ گویوں کی قومی یا خاندانی جنگ بھی دور ہو جائے۔ بنی امیہ و بنی عباس کبھی نہیں ملے۔ دونوں عرب تھے اور دونوں مسلمان۔ مگر ان کا نفاق اسلامی تاریخ کا ایک خونی باب ہے۔ اس لئے عرب و عجم کی وہ قومی منافرت کیونکر دور ہو سکتی تھی جو ضحاک کے وقت سے ان دونوں قوم کے دلوں میں گھر کر چکی تھی۔ فارسی ضحاک اور ضحاکیوں کو اپنے ملک و قوم کا تاراج کنندہ جانتے تھے اور اس لئے وہ ضحاکیوں کے ساتھ جملہ عربوں کو اپنا عدو سمجھتے اور ان سے حد کی نفرت کرتے تھے۔ یہ تقاضائے فطرت ہے اس میں مذہب اور برادری کو دخل نہیں۔ عرب بھی عجمیوں سے کچھ کم متنفر نہ تھے۔ عراق عرصہ سے فارسیوں کے قبضہ میں تھا وہ عربوں کو ستاتے اور اُنھیں زیر رکھنا چاہتے تھے اس لئے مسلمان ہونے پر بھی ان دو قوموں کا دلی اتفاق جلد ممکن نہ تھا جو مجوسی بلا جبر و اکراہ محمد رسول اللہ کہنے پر آمادہ ہو گئے عرب اُن سے کسی طرح کا تعرض نہ کر سکتے تھے۔ مگر جنھوں نے ذرا تامل کیا وہ اصول اسلام کے برخلاف فوراً تشہیر کیا گیا اور یہ اسی نفاق کا نتیجہ تھا جو عرب و عجم میں صدیوں سے چلا آتا تھا۔ ان فاتحین کے قبضہ میں جو فارسی جلد نہ آسکے وہ اپنے مرکز سے قہستان جا کر سو سال وہاں مقیم رہے پھر ہرمز پہونچے اور پچاس سال وہاں گزارے اور بعد کو یعنی ۷۱۶ء میں ہندوستان آکر گجرات میں اپنے گھر بنا کر رہ گئے وہاں کے راجہ جے رانا نے اُنھیں پناہ دی اور شرط کی ہماری زبان[۱] و عادات سیکھیں اور رہیں۔ جب سے یہ جلا وطن پردیس میں پڑے ہوئے اپنے ملک کو یاد کرتے اور اپنی قدیم مذہبیت و معاشرت کو غیر ملک میں قائم رکھے ہوئے ہیں۔ یہ قوم اکثر لحاظ سے قابل ستائش ہے اس نے بیشک اسلام کو قبول کر لیا کہ وہ ایک ناقابل انکار اور مطابق فطرت مذہب تھا وہ مسلمان ہوئے لیکن عربوں کے عادات و خصائل کو اختیار نہ کر سکے۔ اس لئے کہ وہ ان کی تہذیب و معاشرت سے اگر پست نہیں تو حد کے بیگانہ تھے۔ پھر یہ کہ انھوں نے کسی حال اپنی زبان نہیں دی۔ عربی فارسی پر گو دو سو برس مسلط رہی مگر آخر اُس کا فارسیوں نے اپنے کندھے سے اس لئے اُتارا کہ عرب اپنی زبان کے بل پر اُنھیں بھی عجم یعنی گونگا

---

[۱] قصہ سنجان از کیقباد نوساری سنہ ۱۶۰۰ء

کہتے تھے۔ ایک غیور قوم ایسی توہین کس طرح برداشت کرسکتی تھی۔ اُنھوں نے اپنی قدیم و میسر زبان کو پھر اُبھارا اور عربی کو پس پشت ڈال دیا۔ ہاں وہ مفتوح ہوئے لیکن یونانیوں کی طرح وہ بھی اپنے فاتحین کے دل و دماغ پر حاوی ہوگئے۔ اُنھوں نے یونان پر قبضہ کیا مگر وہ یونانیوں کو زیر نہ کرسکے بلکہ ان کے قوائے دماغی سے دب گئے۔ ایران میں بھی یہی ہوا۔ عرب اس پر قابض ہوئے مگر ایرانیوں کی ذہنیت اور اُن کی تہذیب و معاشرت سے ہمیشہ متاثر بلکہ اس سے آلودہ رہے۔ شروع میں عام طور پر اس کا اظہار نہ ہوسکا مگر بنی امیہ کے اخیر زمانہ اور عباسیوں کے ابتدائی عہد میں سب کھل گیا۔ ہارون اور امین و مامون عرب باقی نہ رہے تھے بلکہ اچھے خاصے ایرانی تھے۔ مامون کی ماں تک فارسی تھی۔ شاہی محل اور خلیفہ کے دربار کی تہذیب و معاشرت ایرانی اور کسرائی ہوگئی تھی۔ برمکی کون تھے اور طاہر و یعقوب لیث حجازی و عراقی تھے کہ ایرانی و خراسانی اور ان کی ذہنیت تازی تھی یا فارسی؟ تاریخ سے نابلد جو چاہے کہدیں مگر جو آنکھیں رکھتا ہے وہ بے تامل یہ کہدے گا کہ سنہ ۴۲ھ کے بعد عرب، عرب نہ باقی رہے تھے۔ بلکہ ایک طرف وہ شامیوں رومیوں اور یونانیوں کے مرید تھے تو دوسری طرف ایرانیوں کے شاگرد رشید اور اسی وجہ سے دوسری صدی ہجری سے عراقیوں، ساسانیوں، دیلمیوں اور غزنویوں بلکہ خوارزمیوں، سنجریوں، چنگیزیوں، مغلوں، اور صفویوں کے وقت تک کی بیشتر تصنیفات و منثر ہوں یا نظم اور وہ مذہبی ہوں یا غیر مذہبی حجازی خیالات سے کم اور ایرانی جذبات سے زیادہ متاثر نظر آتی ہیں!۔ یہ فارسی دپارسی) بیشک تعداد میں کم ہوگئے لیکن اپنے قوائے ذہنی میں دیگر عظیم قوموں سے اب بھی قوی تر ہیں۔ سر ولیم ہنٹر اپنی تاریخ ہند میں اور سر ٹہری کوٹن اپنی نیو انڈیا (ہند نو) میں اس جماعت کو "Wonderful" یعنی "عجیب" لقب دیکر ہندوستان میں ان کی کارگزاریوں اُن کے فنون، اور اُن کی صنعت و حرفت کے ثناخواں ہیں۔ یہ قوم اگر اپنے ملک میں رہتی اور قومی تنفر کے باعث اسے پامال کرنے اور اس کے اخراج کی فکر نہ کی جاتی تو آج ایران یونان و یورپ نظر آتا اور ایشیا و امریکہ پر بھی چشمک زن ہوتا۔ لیکن افسوس اور سخت افسوس ہے کہ براعظم ایشیا تو خیر، ہندوستان اور ایران تک اُن سے کماحقہ واقف نہیں۔

مسلمان جن کا مذہب زردشتیوں کو بہ آسانی اپنی آغوش میں لے سکتا تھا وہ تک اُن سے غافل رہے اور رہیں۔ اس غفلت بلکہ منافرت کے اسباب میں سے بڑا سبب وہ تازی و فارسی تنفر بھی ہے جو ایک عرصہ سے ان دونوں قوموں میں چلا آتا اور ایک کو دوسرے کی طرف بڑھنے نہیں دیتا ہے۔ مشہور اور قابل لحاظ مسلمان مورخین[۱] نے گو اس قوم کو موحد خدا پرست پابند مذہب اور آئین دوست بتایا ہے مگر ہم نے انہیں آتش پرست اور مشرک سمجھ لیا اور مشرکین سے بھی زیادہ اُن سے کنارہ کرلیا۔ دوسری طرف مسلمانوں سے اُن کی خود علیحدگی ہے۔ اس ملک میں وہ اپنے غیروں سے بہ تپاک ملتے ہیں مگر یہاں کے مسلمانوں سے دور رہتے اور اُنھیں اپنا بنانے میں گریز کرتے ہیں حالانکہ اسلام سے قریب تر اگر کوئی مذہب ہے تو زردشتی۔ اور زردشتی مسلک سے نزدیک تر کوئی مشرب ہے تو اسلام۔ اس لئے ان دونوں کو آگے بڑھنا اور ملنا اور جلد معانقہ کرلینا چاہئے۔

(نواب) نصیر حسین خاں خیالؔ (مرحوم)

(نگار) یہ مقالہ نواب نصیر حسین خاں خیالؔ کا اب سے دو ماہ قبل اُسوقت موصول ہوا تھا جب وہ بقید حیات تھے اور شائع اُسوقت ہو رہا ہے۔ جب وہ ہم میں نہیں ہیں۔ یہ مضمون حقیقتاً پروفیسر رضوی کی کتاب "Parsis" پر ریویو کی حیثیت رکھتا ہے۔

[۱] مثل طبری، زمخشری، شہرستانی اور مسعودی و بیرونی۔

نواب صاحب مرحوم نہایت وسیع المطالعہ انسان تھے اور تحقیقی مضامین لکھنے میں ان کو خاص ملکہ حاصل تھا جس کا علم سب سے پہلے غالباً ۱۹۱۶ء کی اُردو کانفرنس میں ہوا جب انھوں نے کانفرنس کے صدر ہونے کی حیثیت سے اپنا بے مثل خطبۂ صدارت زبان اُردو کی تدریجی ترقی پر سُنایا۔

نواب خیال کی موت اس میں شک نہیں کہ ہمارے علمی حلقوں کے لئے ایک ناقابل تلافی نقصان ہے جسکو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

حال ہی میں داستانِ اُردو کے نام سے وہ ایک نہایت بسیط و جامع تصنیف مرتب فرما رہے تھے، جس کا ایک باب مغل اور اُردو کے نام سے شائع بھی ہوچکا ہے۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ یہ کتاب مکمل ہوچکی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو ہم اُس جماعت سے جس کے پاس یہ مسودہ موجود ہے درخواست کریں گے کہ جلد سے جلد اسے شائع کردے۔

مرحوم نے شاہنامہ پر بھی ایک بسیط ریویو اُردو میں لکھا تھا جسے سید ظہیر احمد صاحب پٹنہ سے کتابی صورت میں شایع کر رہے ہیں بہرحال اب کہ مرحوم کے علمی فیوض سے ہم محروم ہوچکے ہیں، ایک یہی تدبیر باقی رہ گئی ہے کہ اُن کے تمام افادات کو یکجا کردیا جائے اور اُن کو تلف ہونے سے بچا لیا جائے۔

آپ کو کل معلوم ہوگا کہ جنوری ۱۹۳۵ء کا نگار جو اردو شاعری پر ایک جامع تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے، کتنی قیمتی چیز ہے۔

نگار کے مومن نمبر و ظفر نمبر کے لئے روزانہ خطوط موصول ہوتے ہیں، لیکن اب وہ کسی قیمت پر نہیں مل سکتے۔ چند دن کے بعد بالکل یہی حال جنوری ۱۹۳۵ء کے نگار کا ہوگا کہ آپ اس کی ضرورت کو محسوس کریں گے، لیکن نہ پاسکیں گے۔ پھر، کیا اس سے زیادہ ارزاں اور فایدہ کا سودا کوئی اور ہوسکتا ہے کہ صرف پانچ روپیہ میں آپ دو روپیہ کا ایک پرچہ بھی حاصل کریں اور سال بھر تک نگار بھی دیکھتے رہیں۔

جنوری ۱۹۳۶ء کا رسالہ اس سے زیادہ ضخیم شایع ہوگا اور ہندی شاعری کے لئے وقف ہوگا اس لئے وہ حضرات جن کا چندہ ۱۹۳۵ء میں ختم ہو رہا ہے، وہ اسکو نوٹ کرلیں کہ خریداری قائم رکھنے کی صورت میں یہ نمبر ان کو مُفت ہاتھ آئے گا، ورنہ یوں ان کو تین روپیہ ادا کرنے پڑیں گے۔

مینیجر نگار لکھنؤ

ایک افسانہ جو مکمل نہ ہو سکا

(۱)

میں ایک افسانہ نگار ہوں۔

جب کبھی مجھے بخار آتا ہے تو میرے ذہن میں غیر معمولی تیزی و شگفتگی پیدا ہو جاتی ہے۔

میں اسوقت کی حالت کو کچھ اس طرح بیان کر سکتا ہوں:۔

شدت کے ساتھ بخار چڑھا ہوا ہے، جسم بھُن رہا ہے، رضائی اوڑھے پڑا ہوں، رات کی گہری خاموشی ہر طرف چھائی ہوئی ہے، سب سو رہے ہیں، میں جاگ رہا ہوں، صرف جاگ ہی نہیں رہا ہوں ایک ناقابلِ بیان عذاب میں مبتلا ہوں، دماغ ایک ایسی مشین کی طرح کام کر رہا ہے جس کو انجام سے بے پرواہ ہو کر پوری رفتار کے ساتھ چلا دیا گیا ہو، کوشش کرتا ہوں کہ یہ شدید ذہنی مصروفیت ختم ہو جائے اور میں تھوڑی دیر کے لئے آرام کی نیند سو رہوں، لیکن خیالات کی یورش کسی طرح ختم نہیں ہوتی، یہ سیلاب برابر بڑھتا چلا آتا ہے، کبھی ایک خیالی اسٹیج پر پہونچکر تقریر کرنے لگتا ہوں، اور اگرچہ اپنی زندگی میں کبھی کسی قابل ذکر مجمع کے سامنے تقریر کرنے کی جرأت نہ کر سکا لیکن بخار کی حالت میں رضائی میں مُنھ لپیٹ کر اس طرح بے تکان بولتا ہوں کہ بڑے سے بڑا خطیب اگر سُن پائے تو رشک کرنے پر مجبور ہو جائے، پُرجوش اور ہیجان خیز ملفوظات کا دریا بہا دیتا ہوں، میرے جملوں میں لوئل کی سیم کوک یا ایک کامل الفن مطرب کی تانوں کی کیفیت پائی جاتی ہے، ایک فقرہ دوسرے فقرے کی اس طرح پیروی کرتا ہے جس طرح موسلا دھار بارش میں ایک بوند دوسری بوند کی، اور الفاظ کی پاکیزگی کو صرف موتیوں کی نزہت سے تشبیہ دیجا سکتی ہے، جب یہ بے پناہ تقریر کسی طرح ختم ہونے میں نہیں آتی تو میں، گھبرا کر رضائی سے مُنھ نکالتا ہوں اور تقریر کو دماغ سے علیٰحدہ کرنے کے لئے اپنے آپ کو جھنجھوڑتا ہوں، چند منٹ سکون رہتا ہے۔ لیکن اُس کے بعد کسی ہنگامی موضوع پر شعر کہنے لگتا ہوں، اور باوجود اس امر کے کہ میں شاعر نہیں ہوں اور عمر بھر میں مشکل سے تین چار مصرعے موزوں کر سکا ہوں، ایسی کامیاب نظم لکھتا ہوں کہ جو صرف ایک کہنہ مشق اور حقیقی شاعر ہی کا حصہ ہو سکتی ہے۔ نظم کا مفہوم مسلسل ہوتا ہے اور بے حد طویل ہوتی ہے۔ مختلف اشعار ایک دوسرے سے اس طرح مربوط ہوتے ہیں جس طرح کسی عمارت کی ایک اینٹ دوسری اینٹ سے۔ نظم ابھی مکمل نہیں ہونے پاتی کہ گھنٹے کی ٹن ٹن مجھے بیدار کر دیتی ہے اور میرے دماغ کو شاعری کے اثر سے آزاد کر دیتی ہے۔ میں مضطرب ہو کر کروٹ بدلتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر یہی کیفیت رہی تو صبح تک میرا کیا حال ہوگا۔ لیکن زیادہ وقت گزرنے نہیں پاتا کہ ایک افسانہ لکھنے میں مصروف ہو جاتا ہوں۔ اُس وقت مجھے افسانے کا پلاٹ سوچنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ذہن بیک وقت قصے کے واقعات بھی تیار کرتا ہے اور اُن کو الفاظ کا جامہ بھی پہناتا ہے۔ میں نے

صفیر بلگرامی

آرہ اپنی علمی و ادبی مرکزیت کے لحاظ سے نہ صرف بہار بلکہ ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں معروف ہے، اس نے گزشتہ ڈیڑھ سو برس کے اندر اُردو کی جو بیش بہا خدمات انجام دی ہیں ان کو ادب اُردو کی تاریخ فراموش نہیں کر سکتی، اُردو کا قدیم ترین شاعر جو آرہ میں گزرا ہے وہ مولانا انور علی یاس (متوفی ۱۲۶۲ھ) تھے، آپ شیخ غلام علی راسخ (متوفی ۱۲۳۸ھ) کے تلامذہ میں تھے، آرہ کی ادبی زندگی کا یہ دور اولین تھا، اسی عہد ماموں میں مارہرہ و بلگرام کے ارباب سخن آرہ میں تشریف لاتے تھے، چنانچہ یاس مرحوم نے حضرت سید سلطان عالم صاحب سجادہ نشین مارہرہ، سید محمد عسکری، سید بندہ علی وغیرہ سے اپنے تعلقات کا ذکر کیا ہے۔

اس دور کے گزر جانے کے بعد ادبی قیادت کی عنان حضرت صفیر مرحوم کے ہاتھ آئی اس عہد میں اُردو کو بہت بڑا فروغ ہوا چنانچہ مطبع کا قیام، مشاعروں کی بنیاد، تصنیفات و تالیفات کا سلسلہ، صحافت کی ترویج اسی زمانہ سے متعلق ہے، اور اسکو ہم اپنی اصطلاح میں خیر القرون کہہ سکتے ہیں اسی دور کی برکات کا یہ اثر ہے، کہ آرہ میں سیکڑوں نامی و ماہر اساتذہ اُردو پیدا ہوئے، شیخ محمد حسن نظیر سید سبحان حیدر نذیر، آغا حسن ظہیر، لالہ امرچند جمیل، چودھری ریاض الدین آرزو، برکت خاں سیفی، سید لقمان حیدر اسی دور کے نکتہ سنج شعرا تھے،

صفیر مرحوم کی قیادت کا یہ سلسلہ ۱۳۰۸ھ میں ختم ہو گیا اور وہ اپنے بعد ایسے ایسے نونہالان ادب چھوڑ گئے جنھوں نے اُردو شاعری کو چار چاند لگا دئے، مولانا اسمٰعیل قہر، مولوی عظیم، شاہ ابراہیم فوق، مولانا ابراہیم فوق، مولانا ضمیر الحق قلیس، قاضی واجد حسین وجد سید امیر حسن بدر مولانا ابوالفضل حشر، چودہری فخر الدین فخر، سید قمر الدین قمر، جے نند کمار جوہر نے اپنی نگارش جمیل اور بدیعہ افشار سے اُردو نظم و نثر کو بڑا فروغ دیا، مولانا قہر بہت بڑے گلتراش اور صناع تھے، مولوی عظیم ظریفانہ شاعری میں بڑی مہارت رکھتے تھے آپ کے صاحبزادہ ابوالبرکات برق آرہ کے اُن اکابر شعرا میں ہیں جو مشاعرہ میں میر سوز کی شعر خوانی کے مناظر پیش کر دیتے ہیں شاہ ابراہیم فوق اس عہد کے بہت بڑے ماہر سخن تھے، مولانا ضمیر الحق قیس شمشاد لکھنوی کے شاگرد ہیں آپ کو عروض میں پوری دستگاہ ہے، مولانا بدر مرحوم کے "خمخانہ" پر "مخزن" (لاہور) میں ایک بار لکھا جا چکا ہے۔

آج میں اپنے وطن کے مشہور شاعر حضرت صفیر کے حالات و کلام پر تبصرہ کرنا چاہتا ہوں۔

نام و نسب، ولادت و وطن | آپ کا نام فرزند احمد، تخلص صفیر ہے ۱۲۴۹ھ میں بمقام مارہرہ اپنے ننہال میں پیدا ہوئے۔

"شمس الضحیٰ" سے آپ کی تاریخ ولادت نکلتی ہے، ایک سال کے ہوئے تو بلگرام آئے جو آپ کا آبائی وطن تھا، چار سال کی عمر میں قصبہ آرہ میں وارد ہوئے، چنانچہ خود فرماتے ہیں:۔

مو رو مسکن وطن ہے اے صفیر   تین جا مارہرہ، آرہ، بلگرام

آپ کا سلسلۂ نسب یہ ہے:۔

فرزند احمد بن میر سید احمد، بن سید غلام یحییٰ، بن سید بندہ علی بن سید خورشید علی سید خورشید علی کا سلسلۂ نسب سید ابو الحکیم بن سید ابو القاسم۔ بن سید خان محمد بن محمود بہتہ کی وساطت سے سید محمد صغریٰ فاتح بلگرام تک اور حضرت صغریٰ کا نسب عیسیٰ موتم الاشبال بن زید شہید بن امام زین العابدین بن امام حسین تک پہونچتا ہے۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ سید محمد صغریٰ کے اخلاف میں سے ہیں، سید صاحب نے ۶۱۴ھ میں بلگرام کو فتح کیا تھا اسکے بہت عرصہ قبل سید ابو الفرح واسطی اہل وعیال اور متعلقین کے ساتھ ہندوستان میں آباد ہو چکے تھے، یہی وجہ ہے کہ "سادات صغرادی" خود کو واسطی کہتے ہیں چونکہ ان کے جد امجد واسط سے ہندوستان میں آئے تھے۔

اکثر مثالوں میں پتہ چلتا ہے، کہ انسان کی ذہنی ترقی اور تعمیر سیرت میں خاندان کو بہت بڑا تعلق ہوتا ہے، لیکن اس سے ہٹ کر اس کی کوئی اصلیت نہیں اگر ایک شخص علم وفضل کے ساتھ اچھے عادات وخصائل بھی رکھتا ہے، تو پھر اس کے لئے خاندان کا فخر کوئی معنی نہیں رکھتا، لیکن جہاں ہماری ادبیات میں بہت سے زہریلے جراثیم داخل ہو گئے وہاں خاندانی فخر ومباہات کا عنصر بھی شامل ہو گیا اور آج سیرت پر مشکل ہی سے کوئی کتاب دستیاب ہو سکتی ہے، جو اس قسم کے ترہات سے پاک ہو، سرسید نذیر احمد جیسے قومی فدائیوں نے بھی کسی نہ کسی پیرایہ میں اپنی خاندانی عظمت کا تذکرہ کیا اور "حیات جاوید" کے مصنف حالی نے تو سرسید بت بنا کر رکھدیا۔

میں یہاں مختصراً سید فرزند احمد صاحب کے ان افکار پر ایک تنقید کرنا چاہتا ہوں جو انھوں نے اپنے نسب وحسب کے سلسلہ میں ظاہر کئے ہیں، فرماتے ہیں:۔

> "بسکہ سادات صغرادی بلگرام کو حفظ نسب کا خیال سب خیالوں سے بڑھکر ہے، اور اس کی احتیاط ابتک کہ سات سو برس سے زیادہ ہندوستان میں آئے ہوئے، بڑے زور شور سے رہی ہے، کہ دوسری قوموں کو جائے رشک، اور باعث استعجاب، اور وجہ رغبت ہے اور اس حفظ نسب کی مشق یہاں تک کی گئی ہے کہ جس قدر قربت میں نسبت ملتی ہے، وہ باعث فخر ہوتی ہے، اور انتہا یہ ہو گئی ہے کہ احتیاط کرتے کرتے چار بھائیوں سے اگر بڑے بھائی کی اولاد سے سنجھلے اور منجھلے کی اولاد سے چھوٹے کی اولاد کو وصلت واقع ہوئی اور اس وصلت کو تواتر ہو گیا ہے تو وہ بھائی اسی کا ہو گیا گویا بڑے اور سنجھلے کو منجھلے اور چھوٹے سے اور چھوٹے اور منجھلے کو بڑے اور سنجھلے سے قرابت ہی باقی نہیں رہی" (تاریخ بلگرام ص ۱۲۵)

"یہ قصبہ (بلگرام) سادات ہی کی بود و باش کے سبب سے مشہور ہوا ہے اور اعلیٰ درجہ کے ساکنین سادات ہی شمار کئے جاتے ہیں اور ان سادات کی ناموری "خاندانی" کے لقب سے شہرت پذیر ہوئی اور خاندانی ہونا خوبی اصلیت و نجابت و شرافت کی دلیل ہے، پس سادات صغراوی کے حفظ نسب نے یہ جلوہ دکھایا کہ سب لوگ ان کی بزرگی کے قایل ہیں" (تاریخ بلگرام ص ۱۷۰)

"اگرچہ بفضل خدا لئے یکتا عاصی کے بزرگوار حسب و نسب میں نامور زمانہ اور علم و فن میں یگانہ ہوتے آتے ہیں"

(صفیر بلبل ص ۱۲۵)

صفیر مرحوم نے اسی طرح صفیر بلبل، تاریخ بلگرام، معراج الخیال، اور جلوۂ خضر کے کثیر صفحات رنگین کئے ہیں، میرا روئے سخن صفیر مرحوم کی طرف نہیں کیونکہ اب وہ دنیا میں باقی نہیں میں ان کو ایک بزرگ خاندان کا قابل رشک فرزند خیال کرتا ہوں، انفرادی اعتبار سے جو کچھ صفیر نے اپنے نسب و حسب کے متعلق لکھا ہے، وہ محل اعتراض نہیں، لیکن آپ نے سادات صغراوی کے عجیب و غریب تخیل نسبی کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، وہ نہ صرف نظریۂ قومیت بلکہ اسلام کی روح تعلیم کے بھی منافی ہے

سادات صغراوی کو بروایت صفیر حفظ نسب کا جنون ہے، جیسا کہ ان کے سطور بالا سے پتہ چلا ہوگا اب غور طلب یہ امر ہے کہ واقعتاً یہ سارا داعیہ فضل و شرف بقول غالب "رعایت مستی و ذوق" کا نتیجہ ہے، یا اس کے اندر کچھ حقیقت بھی ہے ؟ -

ہم نے یہ مانا کہ سید ابوالفرح ہندوستان میں اہل و عیال کے ساتھ تشریف لائے تھے، اور اس لئے سادات صغراوی کی نسل میں کسی غیر عنصر کا شامل ہونا مستبعد ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ سید ابوالفرح اور حضرت امام حسین کے درمیان جو پشتیں گزری ہیں ان میں کوئی غیر فاطمی خون شامل ہوا ہے یا نہیں ؟ پہلے تو حضرت امام زین العابدین ہی کی والدہ ایرانی تھیں اس کے بعد حضرت زید شہید کی والدہ ام ولد (لونڈی) تھیں پھر آپ کے صاحبزادہ عیسیٰ موتم الاشبال ساری عمر خلیفہ منصور اور مہدی عباسی کے آوان حکومت میں مخفی رہے اور لوگوں کو اجرت پر پانی پلایا کرتے تھے، اسی لئے آپ کا لقب "سقہ" ہوگیا چنانچہ ۱۶۶ھ میں بمقام کوفہ آپ نے اسی اختفائی حالت میں وفات کی اس وقت آپ کی عمر چھیالیس سال کی تھی (ملاحظہ ہو صحاح الاخبار علامہ رفاعی ص ۳۵ و ۴۰) خلیفہ منصور ۱۳۶ھ میں تخت خلافت پر بیٹھا، اور خلیفہ مہدی نے ۱۶۹ھ میں وفات کی، چونکہ بروایت رفاعی، حضرت عیسیٰ موتم الاشبال نے ۱۶۶ھ میں بعمر ۴۶ سال وفات کی اس لئے ۱۲۰ھ آپ کی تاریخ ولادت قرار پائی، لہذا نتیجہ نکلا کہ منصور کے زمانہ خلافت میں آپ سولہ برس کے تھے، ظاہر ہے کہ آپ اس وقت مجرد ہوں گے اور آپ کو وطن سے دور مخفی طور پر اپنا عقد کرنا پڑا ہوگا اس کے بعد آپ کے صاحبزادے، زید، احمد، محمد و حسین پیدا ہوئے جو سادات صغراوی محمد کے اعقاب میں ہیں، کیا، سادات واسطی بتا سکتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ موتم الاشبال نے اس بے بسی و آشفتگی کی زندگی میں کسی فاطمیہ سے رشتۂ ازدواج باندھا تھا ؟ ایسی صورت میں سادات صغراوی غور کریں کہ نسب و حسب کے پندار، اور رشتہ ازدواج کے قیود میں وہ کہاں تک حق بجانب ہیں، آج ہندوستان کے اندر سینکڑوں کی تعداد میں ایسے صغراوی سادات کے گھرانے موجود ہیں جن کو ان کی برادری کے مجرمانہ قیود نے حد درجہ بے نام و ننگ بنا رکھا ہے آپ کا علم و فضل مسلم، آپ کی فاطمیت مصدق، لیکن یہ محشرستان

رسوم کیسا؟ خدا کے لئے غور کیجیے ساڑھے چھ سو سال کے اندر آپ کی دنیائے خیال نے آپ کی برادری کے اندر کیسی قیامت برپا کر دی، اب آپ کے یہاں آزاد جیسا ادیب جلیل، عبدالجلیل جیسا لغوی، مبارک جیسا محدث، سید اسمٰعیل جیسا متکلم کیوں نہیں پیدا ہوتا، استغنا سے سید علی بلگرامی، اور سید حسین اب کئی سو برس سے آپ کے یہاں سے علم و ادب کا مہر درخشاں کیوں نہیں طلوع ہوتا، آپ جس کو موجب فخر سمجھ رہے ہیں وہ آپ کے جسمانی و ذہنی ادبار کا مؤید ہے۔

صفیر کا خاندان علم و فضل کے اعتبار سے بہت بلند اور سر برآوردہ تھا آپ کے اجداد پدری میں مسلسل کئی پشت تک شعر و ادب کا ذوق رہا چنانچہ خورشید علی صاحب خورشید خود شاعر تھے، آپ کے فرزند بندہ علی بندہ اور پوتے غلام یحییٰ صاحب یحییٰ کو بھی شعر و سخن کا مذاق تھا صفیر کے والد سید احمد صاحب نے اردو میں شعر کہنا شروع کیا یہی خاندانی شاعری صفیر مرحوم کو بھی ورثہ میں ملی۔

یہ تو دادھیال کی حالت تھی، آپ کے نانا سید صاحب عالم صاحب بہت بڑے ادیب اور شاعر تھے، غالب نے "اردوئے معلی" اور "عود ہندی" میں آپ کو جو خطوط لکھے ہیں ان سے آپ کا پایہ ادبی واضح ہوتا ہے، "صفیر بلبل" کے آخر میں حضرت صاحب عالم کی ایک تاریخ طبع بھی مرقوم ہے، غالب نے بھی صفیر مرحوم کی "رشحات" پر دیباچہ لکھا، جو عود ہندی کے آخری صفحات میں پایا جاتا ہے، الغرض صفیر مرحوم پشتینی شاعر تھے، آنکھیں کھولیں تو نانا اور دادا کی آغوش میں شعر و ادب کا درس لیا۔

تصنیفات | صفیر مرحوم نے اپنی ساری زندگی تصنیف و تالیف، اور شعر و سخن میں بسر کی، آرہ میں سب سے پہلے آپ ہی نے اپنا مطبع "اسٹار آف انڈیا" قائم کیا جہاں سے اردو میں دو اخبار نکلے، آپ نے مختلف فنون پر کتابیں لکھیں ان میں بعض تو طبع ہو چکی ہیں اور بعض کا قلمی مسودہ آپ کے خاندان میں محفوظ ہے۔

"صفیر بلبل"— یہ آپ کے منتخب کلام کا مجموعہ ہے، جو ۱۲۸۰ھ میں آپ کے شاگرد شاہ حفاظت حسین مطیر کے اصرار سے شائع ہوا تھا، مقالہ ہذا میں یہی کتاب پیش نظر رکھ کر آپ کے کلام پر تنقید کی گئی ہے۔

"تاریخ بلگرام"— اس کا ایک مطبوعہ حصہ میرے پاس ہے، تاریخ طباعت مذکور نہیں یہ آپ کے ابتدائی زمانہ کی تصنیف معلوم ہوتی ہے، اس میں سادات صغرادی کا شجرہ، بلگرام کا جغرافیہ، محلات کی تفصیل، اور برادری کے رسوم و رواج کا مفصل تذکرہ ہے۔

"رشحات صفیر"— یہ آپ کا بہت بڑا ادبی کارنامہ ہے، اس میں آپ نے تذکیر و تانیث کے متعلق مبسوط علمی بحث کی ہے اور اساتذۂ قدیم کے اشعار سے استدلال کیا ہے، اسی کی ایک تلخیص "خلاصہ فیض صفیر" کے نام سے شایع ہوئی ہے۔

میلاد معصومین— یہ کتاب بہت زیادہ مشہور ہے، اس میں ائمہ اثنیٰ عشری کے حالات درج ہیں———— "جلوۂ خضر" بھی آپ ہی کی تالیف ہے— ان کے علاوہ آپ نے اور بھی غیر مطبوعہ کتابیں چھوڑی ہیں جن کا حال صفیر بلبل اور تاریخ بلگرام سے معلوم ہوتا ہے، مصنف کا خود بیان ہے کہ انھوں نے تیس مثنویاں لکھیں، اردو میں پانچ قصے لکھے، "قصہ بوستان خیال" کی اٹھارہ جلدوں کا فارسی سے اردو میں ترجمہ شروع کیا تھا، ۱۲۸۰ھ ہی میں غزلیات کا اتنا بڑا مجموعہ تیار ہو گیا تھا کہ کئی دیوان مرتب ہو جاتے اس کے بعد ستائیس سال اور زندہ رہے، خدا جانے کتنی غزلیں کہیں، ۱۲۸۱ھ میں لکھنؤ سے واسوخت کا ایک مجموعہ "شعلہ جوالہ" کے نام سے شایع ہوا تھا،

اس میں صفیر کا واسوخت بھی شامل ہے،

رفقا و تلامیذ آرہ کے تہر، وجد، بدر، جمیل، نظیر، آرزو وغیرہ تو خیر ان کے تلامذۂ ارشد میں تھے ہی عظیم آباد کے بہت سے شعرا کے ساتھ آپ کے مراسم و روابط تھے، چنانچہ اس سلسلہ میں مفصلہ ذیل بزرگوں کے نام گنائے جاسکتے ہیں۔

مرزا انور علی انور عظیم آبادی، مرزا یوسف بیگ یوسف عظیم آبادی، علی مرزا وفا عظیم آبادی، آغا مرزا عطا عظیم آبادی، حامد حسین عرف میرن صاحب نکہت عظیم آبادی، علی محمد شاد عظیم آبادی وغیرہ، ان تمام حضرات نے "صفیر بلبل" کی تاریخ طبع لکھی ہے۔

اولاد آپ کی پہلی بی بی بلگرام کی تھیں ان سے صرف ایک صاحبزادہ زندہ رہے، مثنوی معراج الخیال میں آپ نے ان کا تذکرہ کیا ہے، فرماتے ہیں :-

از من نور احمد است یک پور روشن کن خانہ چشم را نور

نور احمد صاحب نے دو صاحبزادے چھوڑے سید عنایت احمد دلگیر اور سید وصی احمد فانی دونوں ڈپٹی کلکٹر ہیں، دلگیر صاحب مشاعرے میں ایک خاص انداز سے پڑھتے ہیں، وصی احمد صاحب فانی بہت بڑے ادیب اور شاعر ہیں نثر میں آپ نے بہت سی موثر خدمات انجام دی ہیں، چنانچہ "نگار" میں "ملک خطا کے شہزادے" "گونڈہ گزٹ" میں "دیر و حرم کا افسانہ" اور "ندیم" میں "جلتر نگ کے تین بیٹے" شایع ہوکر فانی صاحب کو غیر فانی بنا چکے ہیں، فانی صاحب سے مجھے غائبانہ عقیدت ہے۔

صفیر مرحوم نے دوسرا عقد آرہ میں کیا تھا ان سے دو صاحبزادے سید غنی حیدر اور حافظ سید ولی حیدر گہر صاحب ہوئے لوگوں کا بیان ہے کہ غنی حیدر مرحوم رفتار و گفتار، عادات و خصایل، شکل و صورت میں حضرت صفیر مرحوم سے بہت مشابہ تھے، غنی حیدر صاحب نے پہلے آرہ میں ایک "مطبع مصطفائی" قایم کیا اس کے بعد کلکتہ تشریف لے گئے وہاں "مطبع ستارہ ہند" قایم کیا یہ مطبع ہندوستان کے چند اعلیٰ مطابع میں ہے، یہاں کی اعلیٰ طباعت و کتابت ہندوستان و ایران میں مشہور ہو چکی ہے غنی حیدر مرحوم نے آخری عمر میں حج کیا، آپ بہت بڑے خطاط ہفت قلم تھے، حافظ ولی حیدر صاحب "کتب خانہ حیدری آرہ" کے مالک اور متعدد کتابوں کے مصنف ہیں آپ کو شعر و سخن کا بہت بڑا ذوق ہے، گہر تخلص کرتے ہیں اور آرہ کی "بزم ادب" کے صدر ہیں،

صفیر کی شاعری سطور بالا میں لکھا جا چکا ہے، کہ صفیر مرحوم کے اجداد پدری و مادری دونوں میں نسلاً بعد نسلٍ شاعری چلی آتی ہے، اس لئے صفیر کو گہوارہ ہی میں شاعری کا درس ملا، پندرہ برس کی عمر سے آپ نے شعر کہنا شروع کیا پہلے اپنا کلام چھپایا، پھر دو تین سال کے بعد سید محمد مہدی متخلص بہ خبر سے اصلاح لینی شروع کی، خبر مرحوم صفیر کے دادا کے چچا زاد بھائی تھے، اس کے بعد صفیر کو لکھنؤ کا شوق ہوا، اپنا کلام شیخ امان علی سحر کو دکھلایا مرثیہ گوئی کی طرف طبیعت راغب ہوئی، مرزا سلامت علی دبیر سے اصلاح لی، سحر مرحوم نے لکھنؤ چھوڑا، اور دبیر کو عظیم آباد والوں نے مدعو کیا وہ یہیں آگر رہے، صفیر مرحوم بھی عظیم آباد میں نواب الطاف حسین خان بہادر کے یہاں قیام پذیر ہوگئے آرہ سے برابر آمد و رفت کا سلسلہ قایم تھا، مرزا دبیر نے محبت و رافت کے ساتھ آپ کی پذیرائی کی۔

صفیر کی شاعری ایک معجون مرکب کی حیثیت رکھتی ہے، ان کی شاعری پر خبر، سحر، دبیر کے علاوہ اور اساتذہ کا بھی اثر پڑا ہے، چنانچہ خواجہ وزیر، حیدر علی آتش، صبا، قدر بلگرامی وغیرہ کے کلام سے بھی انھوں نے استفادہ کیا تھا بعض مقطعات میں صفیر نے ان لوگوں کا تذکرہ کیا ہے :-

شکر خدا دل میرا شامل حضرت آتش صفیر　　عاشق شیدا علی مرتضیٰ کا ہو گیا

طرز وزیر میں لکھی اچھی غزل صفیر　　اب آپ کا کلام بھی پرکار ہو گیا

اب دیکھئے بقول صبا کیا بنے صفیر　　آئی بہار داغ جنوں پھر ابھر چلے

صفیر قدر کا ہے اشتیاق مدت سے　　ہمارا عزم سوئے بلگرام ہے بیشک

لیکن "صفیر بلبل" پر ایک نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کے یہاں میر کے سوز و گداز، غالب کی مضمون آفرینی، وحدت طرازی، ناسخ کی محاورہ بندی، ورعایت الفاظ، داغ کی رندانہ سرمستی و سلاست نگاری کی بھی کافی مثالیں موجود ہیں۔

طرز میر　ایک ایسے شاعر سے جس نے لکھنوی اساتذہ کی تربیت سے استفادہ کیا جو لکھنؤ کی ناسخی فضا سے متاثر ہوا، جس نے داغ کی سی رنگ رلیوں کو سراہا، جس نے شاہان اودھ کے عشرتکدوں کے اجڑنے پر ماتم کیا۔

صفیر کھا گئی حاسد کی آنکھ لکھنؤ کو　　کہاں وہ دن کہاں پریاں کہاں وہ قیصر باغ

کیا ہم امید کر سکتے تھے کہ وہ اپنے دل کی گہرائیوں میں لذت غم اور پیام روح کا سرمایہ بھی رکھتا ہوگا، لیکن جب اس کے کلام کا جائزہ لیا جاتا ہے، تو اس کے یہاں بیشتر ایسے اشعار نکلتے ہیں جو میر کے سوگوارانہ انداز بیان سے مالا مال ہیں[1]

پھر کیا کروں نہ روؤں جو کہہ کے ہائے دل　　اک درد رہ گیا ہے فقط اب بجائے دل

کیا شکوہ ہو اگر کہیں جاتے نہیں ہیں ہم　　مدت سے آپ بھی آتے نہیں ہیں ہم

تو نے تو بڑھ کے خاک میں مجھ کو ملا دیا　　اے آرزوئے دل تو ہی ملجائے خاک میں

[1] (نگار) اول تو صرف چند اشعار پر اعتماد کر کے یہ حکم لگانا کہ صفیر کے کلام میں میر کا سوز و گداز پایا جاتا ہے درست نہیں دوسرے یہ کہ جو اشعار انتخاب کئے گئے ہیں وہ خود میر کے رنگ سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے ۔ صفیر بلگرامی کو میر و غالب سے ممکن ہے بہت عقیدت رہی ہو لیکن رنگ سخن کو ان سے کوئی نسبت نہیں وہ خالص لکھنوی اسکول کے شاعر تھے اور اسی رنگ میں انھوں نے ہمیشہ شاعری کی

....

....

....

صاف ہم سے ہوا وہ گل اس وقت　　ہائے جب موسم بہار نہیں

زندگی وہی جو ناکامیوں میں بسر ہو،

آج آتا ہے شوخ غارتگر　　دین و ایمان کا خدا حافظ

پھر ہمیں یاد آیا کوئے صنم　　لے چلے ناصحا خدا حافظ

پابوس یار کی حسرت نہایت ہے صفیر　　خاک میری کاشکے بنتی مکان نقش پا[۱]

پھر گئے ہم سے یار کیا کہنا　　یونہی کرتے ہیں پیار کیا کہنا

لباس ہیں نہ واقف نہ تاج سے واقف　　تمہارے وحشی نہیں احتیاج سے واقف

اتباع غالب "صفیر بلبل" میں بہت سے ایسے اشعار ملتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ غالب کے کلام نے صفیر کے دماغ پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ صفیر نے غالب کو دیکھا تھا، حضرت صاحب عالم صاحب مارہروی کے نواسہ کی حیثیت سے غالب صفیر کو بہت ہی محبت و رافت کی نظر سے دیکھتے تھے چنانچہ "رشحات صفیر" کے دیباچہ میں غالب مرحوم لکھتے ہیں :-

سیدی سندی نور بصر، لخت جگر قرۃ العین اسد، مولوی سید فرزند احمد کی طول عمر، و دوام دولت و بقائے اقبال کی دعا مانگتا ہوں جن کو مبداء فیاض سے اس رسالہ کے لکھنے کی توفیق عطا ہوئی ہے سبحان اللہ تانیث و تذکیر کی تقریر کہ وہ اور مطالب کی توضیح پر بھی مشتمل ہے، کس لطف سے ادا ہوئی ہے (عود ہندی ص ۱۸۳) -

افسوس ہے کہ ہمارے وطن کے اس ہیرو نے بجائے دہلی، لکھنؤ کی طرف توجہ کی، اور سحر مرحوم کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اگر وہ غالب جیسے شفیق اُستاد سے اصلاح لیتے تو یقیناً آج صفیر بہار کے سب سے بڑے شاعر ہوتے، لکھنؤ کی شاعری کے اس صنف نے جو زلف و

---

[۱] یہ شعر میر کے رنگ میں ہے تو ضرور، لیکن غالب کے ایک شعر سے مل جاتا ہے

مشہد عاشق سے کوسوں تک جو اُگتی ہے حنا　　کسقدر یارب ہلاک حسرت پابوس تھا

صفیر نے سادہ الفاظ میں جس آرزو کا اظہار کیا ہے، وہ غالب کی جدت تخیل اور بلند پروازی سے زیادہ اثر آفریں ہے یہی غالب اور میر میں فرق ہے۔ (نہ میر کا رنگ ہے نہ غالب کا۔ اڈیٹر)

چوٹی، شانہ، زلف، سرمہ و مسی سے متعلق تھا ان کے اندر پریشان نظری وادبی گمراہی پیدا کر دی چنانچہ وہ اپنی فطری ودیعتوں سے کام نہ لے سکے مگر صفیر مرحوم کو زیادہ مورد الزام نہیں بنایا جا سکتا، کیونکہ اس عہد میں غالب کی مشکل پسندیاں کچھ اچھی نظر سے نہیں دیکھی جاتی تھیں، لیکن آج وہ دور بھی آگیا جب کہ ہندوستان کا ہر ادیب غالب کے مختصر اُردو دیوان کا حافظ ہے، ہر انشاپرداز اس کے بدیعہ شعری سے استدلال کرتا ہے، فلسفی اس کو فلسفہ طراز، نفسی اس کو ماہر نفسیات، مصور اس کو اپنا موضوع تخیل بنائے ہوئے ہے اور مشرق کا یہ فاقہ مست شاعر اپنی ناکامیوں اور حسرت سنجیوں کے بعد جب دنیا سے رخصت ہوگیا تو اہلِ دنیا اس کو چوم چاٹ رہے ہیں، غالب کی ناکام زندگی اور کامیاب موت فطرت کی ستم ظریفیوں کی ایک عبرت آموز مثال ہے۔

صفیر مرحوم نے غالب کی تقلید میں جو اشعار کہے ہیں ان میں دقت معنی اور بلندی تخیل کے ساتھ غالب کے مخصوص طنزیاتی رنگ کا بھی تتبع کیا گیا ہے، فرماتے ہیں:۔

زاہدا حور تری میری پری — خلد تیرا ہے پرستان مرا

فرط دعا جنت و حور و قصور سے — خم ہو کے شیخ صورت محراب ہوگیا

غالب کا ایک شعر ہے:۔

پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں — سر زیر بار منت درباں کئے ہوئے

صفیر کہتے ہیں:۔

محفل میں اسکی آئے بھی لوگ اور چلے گئے — میں نامراد منت درباں میں رہ گیا

تخیل کے اعتبار سے دونوں شعر برابر ہیں البتہ غالب کے خاص اسلوب نے ان کے شعر میں زیادہ گداختگی و برشتگی پیدا کر دی ہے۔ صفیر کہتے ہیں

نگاہ گرم، رحمت سے نہیں کم، زار کو تیرے — فروغ طالع اپنا شعلے کو ہر خار و خس سمجھا

بالکل اسی معنی میں اور انھیں فقروں کے ساتھ غالب کے یہاں بھی ایک شعر ہے:۔

فنا کو سونپ گر مشتاق ہے اپنی حقیقت کا — فروغ طالع خاشاک ہے موقوف گلخن پر

غالب نے تصوف کی چاشنی پیدا کر دی ہے، صفیر، معشوق کی گرم نگاہیوں کو رحمت بتاتے ہیں، لیکن دونوں کے یہاں اسلوب بیان ایک، مشبہ بہ، اور وجہ شبہ ایک، کیونکہ دونوں خار و خس کے جل اُٹھنے کو "فروغ طالع" سے تعبیر کرتے ہیں،

صفیر کا ایک مطلع ہے:۔

عشق اور حسن کا چرچا رہا دیوانوں تک — سب یہ ساماں تھا ترے بے سروسامانوں تک

غالب فرماتے ہیں:۔

منصب شیفتگی کے کوئی قابل نہ رہا — ہوئی معزولی انداز و ادا میرے بعد

اسی طرح جستجو کی جائے تو صفیر کے یہاں بہت سے ایسے اشعار ملتے ہیں جن کا غالب کے کلام سے توارد ہو جاتا ہے، ذیل کے اشعار غالب کی پیروی کا نتیجہ ہیں۔

اُڑتی پھرتی خاک مری کوئے یار میں — مجنوں ہی تھا جو تھک کے بیاباں میں رہ گیا

رندوں نے سمجھے معنی توحید ولا شریک — زاہد تو بحث کفر و مسلماں میں رہ گیا

ہے یاد شور خندۂ دنداں نمائے یار — سینے نمک بھرا ہے، دلِ چاک چاک میں

اُٹھاؤں کس طرح دل اس بت بے مہر کافر سے — کہ فرط لاغری سے خود جہاں سے اُٹھ چلا ہوں میں

دکھا خدا کیلئے شمع رو کہ ڈھونڈوں میں — ہجوم گریہ میں تار نظر نہیں ملتا

دار الشفائے عشق کی ہے رسم راہ اور — اچھا وہی رہا کہ جو اچھا نہ ہو سکا

غالب کہتے ہیں:۔ "میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا"

داغ کی پیروی "صفیر بلبل" کے اوراق کا مطالعہ کرنے کے بعد ایک ناقد حیران رہ جاتا ہے، کہ وہی شاعر جو میر و غالب کی زبان استعمال کر رہا تھا، جس کے الفاظ میں خواجہ درد کے جذبات کارفرما تھے وہ یکایک اس ادنیٰ سطح پر کیونکر چلا آیا یہ نتیجہ ہے اسی بے راہروی کا جو مختلف اساتذہ کے تتبع سے کسی شاعر کے کلام میں پیدا ہو جاتی ہے، صفیر مرحوم نے پیاپے ایسے اُستادوں سے اصلاح لی جو مختلف بلکہ متضاد رجحان رکھتے تھے، سطور بالا سے پتہ چلا ہوگا کہ صفیر کے ننہال کو غالب کے ساتھ گہرے مراسم تھے حضرت صاحب عالم صاحب اور غالب دونوں کا کلام انھوں نے مطالعہ کیا پھر لکھنوی اساتذہ کے دواوین دیکھے نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ایک معجون مرکب بن گئے، ذیل کے اشعار داغ کے رنگ کے ملاحظہ ہوں:۔

رشک انگیز آج کیسا ماجرائے آب تھا — انکے سینہ پر جو دریا میں کف سیلاب تھا

یعنی معشوق نہا رہا ہے، اور کف سیلاب اس کے سینہ سے گزر رہا ہے، یہ دیکھ کر ہمارے شاعر کو پانی میں رشک آتا ہے۔

اندنوں بوسوں کے باقی ہونگے تقاضے جاتے — ورنہ سابق میں حساب آپ کا بیباق رہا

گڑگڑاتے تھے جو ہم کہتے تھے وہ — دیکھئے اب یہ مرا ہاتھ آیا،

صفیر کے یہاں اس رنگ کے اشعار کی کمی نہیں، وہی سطحیت، وہی بوالہوسی، وہی جذبات پست کی ترجمانی جو لکھنوی اسکول کے

ایک خاص دور میں مایۂ نازش تھی ان کے یہاں بھی ہے، ملاحظہ ہو:-

کون عارض سے ملاتا ہے تمہارے عارض — نہ ڈرو میں ابھی رکھے ہوں کنائے عارض

اور یہ مرحلہ یہیں تک ختم نہیں ہوتا بلکہ اس کا انجام یہ ہوتا ہے:-

آرسی دیکھ کے وصل میں کہنا ان کا — دیکھو تو ہو گئے نیلے مرے سلے عارض

اس سے بھی ایک پُر لطف شعر سُنئے اور شاعر کے حساس دل اور ذہن رسائی کی داد دیجئے:-

رنگا کر کا ہے انگیا اپنی چھاتی پر جمائی ہے — یہ اس نے خاتمہ بالخیر اپنے پال ڈالے ہیں

شاعر نے اپنی روایاتی تہذیب سے ہٹ کر یہاں محض تفنن شعری کی بنا پر وہ سب کچھ کہہ ڈالا جس کو نثر میں ادا کرنا "غیر مہذب" سمجھا جاتا ہے، شعر کا مطلب یہ ہے کہ شاعر کی محبوبہ نے رنگین انگیا پہنی ہے، وہ اس کو دیکھ کر سمجھ رہا ہے کہ اس کی محبوبہ نے "خاتمہ آم" کا پال ڈالا ہے۔
اسی قسم کی ایک اور شوخی ملاحظہ ہو:-

سودائے خام ہے طمع اس نونہال سے — سینہ سپاٹ ہے ابھی ہموار کیا کریں

پھل جوانی کا ملے غیرت گلشن کب تک — دیکھئے ابھرے پر یرد ترا جوبن کب تک

الغرض "صفیر بلبل" کے صفحات میں اس نوع کی سطحی اور سوقیانہ شاعری کے اور بھی بہت سے نمونے موجود ہیں۔

ناسخی اسکول صفیر کے یہاں ناسخیت بھی پائی جاتی ہے، محاورہ زبان، رعایت الفاظ، نازک تشبیہات و استعارات انکے یہاں بھی ہیں۔

چڑھ گیا جب سے نظر پر آپ کی — اپنی نظروں سے بھی بندہ گر گیا

رات دن سرمست رکھتے ہیں خیالات اے صفیر — دل بغل میں ہے کہ شیشہ بادۂ گلفام کا

ڈوب مرنے پر بھی سودائی اسیر آب تھا — موجیں تھیں زنجیر پا، طوق گلو گرداب تھا

انکے لبوں نے قہقہوں پہ ایسا دھر لیا — کٹ کٹ کے رنگ لعل بدخشاں میں رہ گیا

بے وجہ نہیں آپ الگ پھرتے ہیں ہم سے — کچھ جوڑ مقرر کسی استاد نے مارا

وہ دھیان اس محیط حسن کا آنکھوں میں آ گیا — دیکھو کہ دو حباب میں دریا سما گیا

دعائیں پڑھنے لگے پاؤں جلد اٹھانے لگے　　کبھی جو بھول پڑے عاشقوں کے مدفن میں

باتیں سُن سُن کے اسکی جیتے ہیں　　چشمۂ خضر ہے ، دہن ہم کو

اساتذۂ فارسی سے استفادہ | صفیر مرحوم کے بہتیرے اشعار جامی، عرفی، حزیں، اور شعرائے متاخرین کا ترجمہ معلوم ہوتے ہیں، یہ بھی نتیجہ ہے، فارسی دواوین کے زیر مطالعہ رہنے کا،

صفیر کا ایک شعر ہے :-

ان لبوں کیلئے مٹی سے مری جام بنا　　شکر ہے کام مرا گردش ایام بنا

شیخ علی حزیں لاہجی یہی خیال یوں ادا کر گیا ہے :-

در میکدہ خاکم را پیمانہ کنی یا رب　　شاید دل حسرت کش لب را بہ لبے وارد

صفیر اور حزیں میں اگر کوئی فرق ہے، تو صرف اس قدر کہ ایک نے اردو میں کہا ہے، اور دوسرے نے فارسی میں، صفیر کی مٹی سے زمانہ نے پیمانہ بنا کر ان کو معشوق کے لب لعلیں سے ملا دیا، اور حزیں ابھی اس کی تمنا میں ہیں -

صفیر فرماتے ہیں :-

یہ نون نیستی کی خبر پیری میں ہے شیخ　　اے جو الف سا قد ترا ہم شکل نون ہوا

مطلب یہ ہے کہ شیخ کو پیری نے سرو قد سے جو حرف الف کے مشابہ تھا اب جھکا کر نون کی شکل کا بنا دیا اور یہ "نون" گویا "نیستی" کا حرف اول ہے، اس سے شیخ کو سمجھنا چاہیئے کہ اس کے آخری دن آ گئے اس کے قبل بیدل یوں کہہ گیا ہے :-

نقش پیری نفی ہستی می کند ہشیار باش　　صورت قد دو تا آئینہ ترکیب لاست

یعنی بوڑھاپے میں جُھک جانا گویا لفظ "لا" کی صورت بنجانا ہے، اس لئے پیری کا جھکا ہوا قد ہستی کی نفی ہے -

صفیر کا ایک شعر ہے :-

اے دل نجھے تو عشق میں تو خاک کر چلا　　او خانماں خراب بتا اب کدھر چلا

عرفی کہتا ہے :-

بلائے دیدۂ دل راز پے شناسا نم　　کسے نگویدم اے خانماں خراب کجا

کسی قدر لفظی رد و بدل کے ساتھ صفیر اور عرفی کا مرکزی تخیل اور بعض فقرے باہم ملجاتے ہیں -

صفیر کا ایک مطلع ہے :-

سرد تیرے چہرے سے ہو گرمی بازار شمع　　اک گل پژمردہ ہو گویا گل بے خار شمع

صفیر شمع کی ضو فشانیوں کو محبوب کے چہرے کے آگے ماند بتاتے ہیں گویا شمع کی روشنی محبوب کے چہرۂ منور کے نزدیک ایک گل پژمردہ

ہے، بالکل یہی تخیل حزیں کے ایک شعر میں بھی موجود ہے:۔

گرہ سازوزبان شعلہ شمع انجمن پیرا   دراں محفل کہ حرفے زاں عذار آتشیں باشد

لیکن قبل اس کے کہ یہ مضمون ختم کیا جائے، یہ بتادینا ضروری ہے، کہ ان کی غزل جو "موج مے" کی ردیف میں ہے، اُردو لٹریچر میں اپنی نوع کی یگانہ چیز ہے، پہلے میرا خیال تھا کہ سید امیر حسن بدر مرحوم ہی اس مستانہ غزل کے موجد ہیں جس کی مثال غزلیات ابونواس اور میکدۂ خیام میں بھی مشکل ہی سے دستیاب ہوسکتی ہے، لیکن "صفیر بلبل" کے دیکھنے سے پتہ چلا، کہ بدر مرحوم نے اپنے اُستاد کی اختراع فائقہ، اور بدیعہ نگارش سے استفادہ کیا ہے۔

بدر	صفیر
گاہ خم میں گہ سبو میں، شیشہ و ساغر میں گہہ	جستجو اس کو ہے کس یوسف گم گشتہ کی
منزلیں طے کر رہا ہے، کاروان موج مے	گردشوں میں رات دن ہے کارروان موج مے

صفیر مرحوم نے "کاروان موج مے" کی گردشوں کا ثبوت نہیں دیا تھا، حضرت بدر نے اس کے لئے خم، سبو، شیشہ، ساغر کے ارتقائی منازل بیان کئے، اور واقعتہً بتادیا کہ "موج مے" "منزلیں طے کر رہی ہے، اور ایک وقت ایسا آئیگا جبکہ کسی کے لب میگوں سے ملجائے گی، حضرت صفیر کے یہاں "یوسف گم گشتہ" کا فقرہ بہت معنی خیز ہے، مولانا بدر اگر یہی فقرہ اپنے مصرعۂ ثانی میں چسپاں کردیتے تو ان کا شعر زیادہ بلند ہوجاتا پھر بھی بدر کا شعر صفیر سے بڑھا ہوا ہے، کیونکہ صفیر "موج مے" کو نہ تو "کارواں" کہنے کی کوئی توجیہ پیش کرتے ہیں اور نہ "گردش" کا کوئی ثبوت

بدر	صفیر
آسماں خم ہے شفق ساغر مہ و خورشید ہیں	چشم مست ساقی خود بیں ذکیا [illegible]
کہکشاں پر مجھکو ہوتا ہے، گمان موج مے	آنکھ کے ڈوروں پہ مجھکو ہے گمان موج مے

تشبیہات کے میدان میں حضرت بدر اپنے اُستاد سے بڑھ گئے ہیں۔

بدر	صفیر
بوسے کیا کیا میں لب ساغر کے لیتا جھوم کر	ہے ترے مینوش کے لب پر بیان موج مے
لب بہ لب مجھ سے اگر ہوتی زبانِ موج مے	چوستا ہوں رات دن ساقی زبان موج مے

عبدالمالک (آروی)

اِن قدموں کی چاپ سے اس کے کان آشنا تھے، اس کا باپ بھری سہرگرمی آ رہا تھا، اور ہنمنتا اپنے باپ کی اس آمد کا مفہوم نہ سمجھتے ہوئے بہت زیادہ پریشان ہوگیا۔ دروازہ کے باہر کھڑے ہوکر اس کے باپ نے چلاکر کہا۔ "ہنمنتا اپنی بیوی کو فوراً باہر نکال دو۔"

ہنمنتا نے اپنی بیوی کے چہرہ پر نظر ڈالی، لیکن اس میں کسی استعجاب وحیرت کے آثار نظر نہ آئے۔ اس نے اپنے معصوم چہرہ کو اپنے دونوں نازک ہاتھوں سے چھپا لیا گویا وہ یہ چاہتی تھی کہ یہیں بیٹھے بیٹھے زمین میں سما جائے ـــــ پپیہا اپنی "پی کہاں" کا جگرسوز راگ بلند کر رہا تھا لیکن کسی نے اس کی طرف توجہ نہ کی، دنیا کے محاسن لامحدود ہیں لیکن افسوس ہے کہ ہر شئے کس قدر جلد تبدیل ہو جاتی ہے۔

(۲)

باہر سے واپس آکر ہنمنتا نے اپنی بیوی سے پوچھا۔ "کیا یہ سچ ہے؟"

"بیشک" کُسم نے جواب دیا۔

"تم نے مجھ سے اب تک اس کو کیوں چھپا رکھا"

"میں نے کئی بار کہنے کی کوشش کی لیکن ہر دفعہ آواز میرے حلق میں اٹک جاتی تھی، میں ایک بدنصیب عورت ہوں!"

"تو پھر سب کچھ صاف صاف بیان کر دو۔"

کُسم نے اپنی داستان، انتہائی متانت وسنجیدگی کے ساتھ بیان کر دی، ایسا معلوم ہوتا تھا، کہ وہ ننگے پاؤں انگاروں پر سے آہستہ آہستہ گزر رہی ہے اور کوئی اس بات کا احساس نہیں کرتا کہ وہ کس قدر جھلس گئی ہے، اس کی کہانی سُنکر ہنمنتا اُٹھا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔

کُسم نے سوچا کہ اس کا شوہر چلا گیا ہے، اور اب کبھی لوٹ کر نہ آئے گا یہ بات اس کو تعجب خیز نہیں معلوم ہوئی۔ اُس نے اس واقعہ کو بھی روزمرہ زندگی کے ایک غیر معمولی واقعہ سے تعبیر کیا۔ اس کا دماغ صرف چند لمحوں کے اندر اس قدر معطل ہوگیا تھا کہ اُس کو دنیا ابتدا سے انتہا تک بالکل خلا معلوم ہوتی تھی اور اُن باتوں کی یاد جو اس کے شوہر نے گزشتہ زمانے میں اُس سے کی تھیں، اُس کے حسین لبوں پر ایک خشک، افسردہ اور بے کیف تبسم کے سوا اور کچھ پیدا نہ کرسکی۔ شاید اسوقت وہ یہ سوچ رہی تھی کہ وہ محبت جو ایک انسان کی زندگی پر اس قدر چھائی ہوئی تھی اور جو اپنے ساتھ اس قدر چاہ اور عمیق احساسات لائی تھی اور جس کی وجہ سے ایک لمحہ کی جدائی بھی انتہائی تکلیف دہ، اور ایک لمحہ کی ملاقات انتہائی مسرت اور لطف آفریں معلوم ہوتی تھی جس کی وسعت لامتناہی اور جس کی زندگی دائمی معلوم ہوتی تھی ـــــ کیا وہ اس قدر نازک بنیاد پر قائم تھی، صرف چند لمحے قبل، ہنمنتا نے اس سے کہا تھا۔ "کیسی خوشگوار رات ہے!" وہ رات ابھی ختم نہ ہوئی تھی، وہی پپیہا اب تک "پی کہاں" کا راگ الاپ رہا تھا اور وہی نسیم جانفزا، کمرے کے پردوں کو حرکت دیتی ہوئی چل رہی تھی اور وہی چاندنی کھڑکی کے باہر ایک تھکی ہوئی ملکہ کی طرح محوِ خواب تھی۔ لیکن یہ سب کچھ غیر حقیقی تھا........؟

(۳)

دوسرے دن صبح کو ہنمنتا، افسردہ و مضمحل پیارے شنکر گھوسال کے گھر پہونچا۔ اور اس کو آواز دی "میرے لڑکے کیا خبر لائے ہو؟"

پیارے شنکر نے اُس سے کہا۔

ہمنتا نے ایک بھڑکتی ہوئی آگ کی مانند تھرتھراتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "تم نے ہماری ذات میں بٹا لگا دیا۔ تم ہمارے لئے تباہی کا باعث ہوئے ہو، اور اب تم کو اسکا معاوضہ ادا کرنا پڑیگا۔" اُس نے اور کچھ نہ کہا۔ اس کی آواز حلق میں اٹک گئی۔

"اور تم نے شاید میری ذات کو بچا لیا اور اُس سے میرے اخراج کو روک لیا۔ اور مجھے پیار سے تھپکا اور دلاسا دیا؟" پیارے شنکر نے طعن آمیز تبسم کے ساتھ جواب دیا۔

ہمنتا کا دل، اس وقت یہ چاہ رہا تھا کہ وہ اپنے برہمنی غیظ و غضب کی آگ سے پیارے شنکر کو جلا کر راکھ کر دے۔ لیکن وہ اپنے غصہ کی آگ میں خود ہی جل گیا۔ پیارے شنکر اُس کے سامنے مسرور اور مطمئن بیٹھا رہا۔

"کیا میں نے تم کو کبھی کوئی نقصان پہونچایا ہے؟" ہمنتا نے شکستہ لہجہ میں پوچھا۔

"مجھے صرف ایک سوال کرنے کی اجازت دو۔" ——— شنکر بولا۔ "میری بیٹی ——— میری تنہا اولاد ——— اس نے تمہارے والد کو کیا ضرر پہونچایا تھا؟ تم اس وقت بہت کم سن تھے اور شاید اس کے متعلق کچھ نہ سنا ہو۔ لیکن اب سنو۔ اور ٹھنڈے دل سے غور کرو، میں جو کچھ اب تم سے کہنے جا رہا ہوں اُس میں تھوڑی سی ظرافت بھی ہے۔"

"تم بہت چھوٹے تھے جب میرا داماد، نابھر کنت، میری بیٹی کا بہت سا زیور چرا کر انگلستان بھاگ گیا۔ تم کو گاؤں کا وہ ہنگامہ یاد ہوگا جو اُس کے انگلستان سے پانچ سال کے بعد بیرسٹر ہو کر آنے پر مچا تھا یا شاید تم کو اس امر کی اطلاع نہ ہوئی ہو۔ کیونکہ اس وقت تم کلکتہ میں اسکول میں تعلیم پا رہے تھے۔ تمہارے والد نے اپنے آپ کو، ساری ذات اور برادری کا سرگروہ سمجھ کر یہ اعلان کر دیا کہ اگر میں اپنی بیٹی کو اسکے شوہر کے گھر بھیجوں تو مجھے اپنی بہبودی کی خاطر اُسے یکلخت چھوڑ دینا چاہئے۔ اور پھر کبھی اپنے گھر آنے کی اجازت نہ دینی چاہئے۔ میں تمہارے باپ کے قدموں پر گر پڑا۔ اور اُس سے التجا کی۔ "بھائی۔ مجھے اس مرتبہ معاف کر دو۔ میں اپنے داماد کی اس غلطی اور قصور کا کفارہ ادا کرنے کو تیار ہوں۔ براہ کرم اس کو ذات میں شریک کر لو۔" لیکن تمہارا باپ پتھر کی مانند بے حس و حرکت کھڑا رہا اور ٹس سے مس نہ ہوا۔ لیکن یہ میرے امکان میں نہ تھا۔ میری پدرانہ محبت مجھے اس بات کی اجازت نہ دیتی تھی کہ میں اپنے بیٹے کو عاق کر دوں۔ چنانچہ اپنے وطن اور عزیزوں کو خدا حافظ کہہ کر میں کلکتہ چلا گیا۔ لیکن مصائب نے وہاں بھی میرا پیچھا نہ چھوڑا۔ جب میں اپنے بھتیجے کی شادی کے تمام انتظامات مکمل کر چکا تو تمہارے والد نے لڑکی کے والدین کو ورغلا کر یہ نسبت چھڑا دی، اس وقت میں نے قسم کھائی کہ اگر میری رگوں میں برہمنوں کے خون کا ایک قطرہ بھی موجود ہے تو میں اس کا انتقام ضرور لوں گا۔ اب میرا خیال ہے کہ یہ معاملہ تمہاری سمجھ میں بخوبی آگیا ہوگا، کیوں؟ لیکن ذرا تامل کرو۔ جب میں تم سے پوری داستان بیان کر دوں گا تو تم کو اور زیادہ اس میں لطف آئے گا۔ یہ بڑا دلچسپ قصہ ہے۔

جب تم کالج میں پڑھتے تھے تو تمہارے مکان کے قریب ایک شخص بپرداس چٹرجی رہتا تھا، خدا اُس کے گناہوں کو معاف کرے۔ وہ اب مر چکا ہے۔ اس کے مکان میں ایک جوان بیوہ کسم نامی رہتی تھی۔ وہ ایک کایستھ خاندان کی یتیم لڑکی تھی، لیکن تھی بہت سُندر۔ اور اس لئے بوڑھے برہمن نے اس کو کالج کے طلبا کی حریص نگاہوں سے محفوظ رکھنے کی حتی الامکان کوشش کی۔

لیکن ایک جوان لڑکی کے لئے، بوڑھے سرپرستوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنا دشوار کام نہ تھا۔ چنانچہ وہ اکثر اپنے گیلے اور بھیگے کپڑوں کو چھت پر پھیلانے کی غرض سے جاتی تھی۔ اور مجھے یقین ہے کہ تم نے بھی اپنی چھت کو مطالعہ کے لئے بہترین مقام سمجھا تھا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ آیا چھت پر تم دونوں ایک دوسرے سے باتیں کرتے تھے یا نہیں۔ لیکن لڑکی کے طرز عمل سے اُس کے بوڑھے سرپرستوں کے دلوں میں شبہات پیدا ہونے لگے۔ وہ خانہ داری کے فرائض کی تکمیل سے جی چُرانے لگی۔ اور پاربتی کی طرح اپنے خیالات میں اس قدر مستغرق رہنے لگی کہ رفتہ رفتہ کھانا پینا بھی بند ہونا شروع ہوا، اور نیندیں بھی حرام ہونے لگیں۔ بعض اوقات وہ اپنے سرپرستوں کی موجودگی میں بلاسبب رونے لگتی تھی۔

"آخر کار اس نے تم دونوں کو، اکثر چھت پر ایک دوسرے کو جھانکتے ہوئے دیکھا اور بعض اوقات تم کالج بھی نہ جاتے تھے اور کتاب ہاتھ میں لئے چھت پر بیٹھے رہتے تھے۔ اور مطالعہ اور تعلیم سے بھی اچانک طور پر غفلت برتنے لگے تھے۔ پھر وہ میرے پاس مشورہ کی غرض سے آیا۔ اور مجھ سے پوری داستان بے کم وکاست بیان کردی۔ میں نے اس سے کہا۔ "تم کو ایک مدت سے بنارس جاترا، جانے کی خواہش ہے اسلئے بہتر ہے کہ اب تم اس خواہش کو پورا کرو، اور لڑکی کو میرے حوالہ کردو میں اس کی نگرانی کروں گا۔"

بوڑھا برہمن چلا گیا۔ اور لڑکی کو میرے سپرد کردیا۔ میں نے اُس لڑکی کو سری پتی چٹرجی کے مکان میں یہ کہہ کر رکھا کہ وہ اس کا باپ ہے۔ اسکے بعد جو کچھ ہوا وہ تم کو معلوم ہے۔ آج تم سے پوری داستان بیان کردینے کے بعد میں انتہائی اطمینان محسوس کررہا ہوں۔ اور میرے سینہ پر سے ایک بھاری بوجھ ہٹ گیا ہے۔ کیا یہ ایک فسانہ نہیں ہے؟ میں چاہتا ہوں کہ اس داستان کو قلمبند کرکے کتاب کی شکل میں چھپواؤں لیکن میں خود مضمون نگار نہیں ہوں۔ لوگ کہتے ہیں کہ میرے بھتیجے کو اس فن سے کسی قدر لگاؤ ہے۔ میں اُس سے کہوں گا کہ وہ اس کو میرے لئے تحریر کردے۔ سب سے بہتر صورت یہ ہوگی کہ تم بھی اس کی تکمیل میں اس کا ہاتھ بٹاؤ۔ کیونکہ اس داستان کا انجام مجھے پوری طرح معلوم نہیں ہے۔"

اختتامی الفاظ کی جانب زیادہ توجہ کرتے ہوئے ہمنتا نے پوچھا۔ "کسم نے اس شادی سے اختلاف نہیں کیا؟"

"اس کا قیاس کرنا ذرا دشوار ہے۔" شنکر نے جواب دیا۔ "تم جانتے ہو میرے لڑکے۔ کہ عورت کے دماغ کی ساخت کس قسم کی ہوتی ہے؟ جب وہ نہیں کہتی ہے تو اُس سے اس کا مطلب "ہاں" ہوتا ہے۔ دوسرے مکان میں منتقل ہونے کے بعد چند روز تک وہ تم کو دیکھے بغیر دیوانی سی ہو رہی تھی، معلوم ہوتا ہے کہ تم نے بھی اُس کے نئے مکان کا پتہ لگا لیا۔ کیونکہ کالج جاتے وقت تم راستہ کاٹ کر اکثر سری پتی کے گھر کے سامنے چکر لگاتے تھے، اور تمھاری نظریں، کالج کو تلاش کرنے کی بجائے ایک شریف آدمی کے مکان کی سلاخ دار کھڑکیوں پر گڑی رہتی تھیں جس میں صرف کیڑے، پتنگے یا دیوانوں کی نگاہیں کچھ کامیابی حاصل کرسکتی تھیں۔ مجھے تم دونوں کی اس حالت پر ترس آتا تھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ تمھاری تعلیم میں ناغہ پر ناغہ ہو رہا ہے اور لڑکی کی حالت بھی ناگفتہ بہ ہو رہی ہے۔

ایک روز میں نے کسم کو بلا کر اس سے کہا۔ "سنو میری بیٹی۔ میں ایک ضعیف آدمی ہوں۔ اور تم کو میرے سامنے شرمانا نہ چاہئے۔ مجھے معلوم ہے کہ تمھارا دل اور تمھاری جان، کس کے واسطے ستی ہو رہی ہے اُس نوجوان کی حالت بھی قابل رحم ہے۔ میری یہ خواہش ہے کہ میں تم دونوں کو متحد کردوں۔" یہ سُنکر کسم کی معصوم آنکھوں سے موتی کی مانند آنسوؤں کے قطرے ڈھلک پڑے۔ اور وہ اپنا مُنھ چھپاتی ہوئی بھاگ گئی۔

اس کے بعد میں متعدد بار سری تپی کے گھر گیا - اور کستم کو بلا کر اُس سے تمہارا ذکر کیا - رفتہ رفتہ میں اپنی باتوں سے اُس کی شرم وحیا پر غالب آگیا۔
اور آخر کار ایک دن جب میں نے اُس سے کہا کہ میں تم دونوں کی شادی کی کوشش کروں گا تو اس نے پوچھا - " یہ کیسے ہو سکتا ہے ؟"
"اُس کی فکر مت کرو" - میں نے جواب دیا - " میں تم کو ایک برہمن لڑکی ثابت کر دوں گا" بہت دیر تک بحث مباحثہ ہونے کے بعد اس نے مجھ سے استدعا کی کہ میں اس کے متعلق تمہارا المنشا معلوم کروں - " کیسی بیوقوفی کی باتیں کرتی ہو ؟" میں نے کہا - " وہ لڑکا بالکل دیوانہ ہو رہا ہے ان تمام پیچیدگیوں کو اُس سے بیان کرنے کی کیا ضرورت ہے ؟ پہلے شادی ہو جانے دو - اس کے بعد جو کام بخیر وخوبی ختم ہوتا ہے وہ سب اچھا ہی ہوتا ہے - اور خصوصاً جبکہ اس راز کے فاش ہونے کا ذرا بھی خطرہ نہیں ہے، کیوں راستہ سے بھٹک کر، ایک نوجوان کی ساری زندگی تباہ و برباد کی جائے ؟"

مجھے معلوم نہیں کہ آیا کستم نے میری تجویز کی تائید کی یا نہیں - تاہم یہ بات میں دیکھتا تھا کہ بعض وقت وہ روتی تھی، اور کبھی بالکل ساکت اور خاموش رہتی تھی - اور اگر میں کبھی کہتا کہ خیر اس معاملہ کو نظر انداز کر دو تو وہ بحد مضطرب ہو جاتی تھی - جب حالات اس درجہ پر پہونچ گئے تو میں سری تپی کو شادی کا پیغام دیکر تمہارے پاس بھیجا - تم نے بلا پس وپیش اس کو منظور کر لیا - اور سب کچھ طے ہو گیا -

تاریخ مقررہ سے چند روز قبل سے، مجھے اس کو اس امر پر رضامند کرنے میں بڑی مشکل کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ اس نے انکار کر دیا تھا - وہ مجھ سے برابر یہی کہا کرتی تھی - " چچا اس معاملہ کو نظر انداز کر دیجئے " میں اُس سے برہم ہو کر کہتا - " بیوقوف لڑکی، تیرا اس سے کیا مطلب ہے ؟ جب تمام معاملات طے ہو چکے ہیں تو ہم انکار کیسے کر سکتے ہیں ؟"

اس نے کہا " یہ مشہور کرا دیجئے کہ میں مر گئی ہوں اور مجھے کہیں بھیج دیجئے "

میں نے کہا " اس نوجوان لڑکے کا کیا حشر ہوگا ؟ وہ اسوقت خوشی کے مارے ساتویں جنت میں پہونچ گیا ہے - محض اس امید میں کہ کل اُس کی ایک دیرینہ آرزو پوری ہو جائے گی، اور آج تم چاہتی ہو کہ میں اُس کو تمہاری موت کی خبر بھیجدوں ؟ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کل مجھے اس کی موت کی خبر تم کو سنانی پڑے گی اور اُسی روز شام کو تمہاری موت کی خبر میرے کانوں میں پڑیگی - نادان لڑکی کیا تیرا خیال ہے کہ میں اس عمر میں ایک نوجوان برہمن، اور ایک بیوہ لڑکی کو قتل کرنے کے قابل ہو سکتا ہوں ؟

خوش قسمتی سے، وقت مقررہ پر شادی بخیر وخوبی، انجام پا گئی - اور اس اہم کام کی تکمیل کے بعد میں ایک بہت بڑے فرض سے سبکدوش ہو گیا - اس کے بعد جو کچھ ہوا اُس سے تم بخوبی واقف ہو "

" کیا ہم کو ایسا ناقابلِ تلافی صدمہ پہونچانے پر تم اکتفا نہ کر سکتے تھے ؟ " ہمنتا نے ایک مختصر سے سکوت کے بعد کہا - " تم نے اب اس راز کو کیوں فاش کر دیا ؟ "

انتہائی اطمینانِ قلب کے ساتھ پیارے شنکر نے جواب دیا " جب میں نے دیکھا کہ تمہاری ہمشیرہ کی شادی کے تمام انتظامات مکمل ہو چکے ہیں - تو میں نے اپنے دل میں غور کیا - کہ میں نے ایک برہمن کی ذات میں تو دھبہ لگا دیا ہے - اور یہ محض فرض کی انجام دہی کی غرض سے کیا گیا تھا - اب یہاں ایک دوسرے برہمن کی ذات بھی خطرہ میں پڑ رہی ہے اور اس مرتبہ میرا یہ اہم فرض ہے کہ میں اسکو بچاؤنگی

کوشش کروں۔ اس لئے میں نے ان کو لکھ بھیجا کہ میں دعوے کے ساتھ ثابت کرسکتا ہوں کہ تم نے ایک شودر کی لڑکی سے اپنی شادی کی ہے"

ہمنتا نے انتہائی صبر و ضبط سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "اب اس لڑکی کا کیا حشر ہوگا؟ جس کو میں چھوڑ دوں گا۔ کیا تم اس کو روٹی کپڑا دوگے؟"

"میں نے اپنا فرض ادا کر دیا" پیارے شنکر نے متانت سے جواب دیا۔ "اب یہ میرا کام نہیں ہے کہ دوسروں کی چھوڑی ہوئی اور مطلقہ بیویوں کی دیکھ بھال کرتا پھروں ـــ کوئی ہے، جاؤ، ہمنتا بابو کے لئے برف اور شربت لاؤ۔ اور پانی بھی"

ہمنتا اُٹھکر کھڑا ہوگیا اور اس خاطر تواضع کا شرمندۂ احسان ہوئے بغیر وہاں سے چلدیا۔

(۴)

چاند کی پانچویں رات تھی۔ اور بہت تاریک۔ پرندے ساکت تھے، لیچی کا درخت زمین پر ایک سیاہ داغ کے مانند نظر آرہا تھا۔ اور بادِ صرصر کے جھونکے، ایک نیند میں ڈوبے ہوئے آدمی کی طرح چل رہے تھے۔ آسمان پر چمکنے والے ستارے، اپنی تنویروں کو اس تاریکی میں اس لئے پیوست کئے دے رہے تھے تاکہ کوئی عمیق راز معلوم کرسکیں۔

کمرہ میں کوئی روشنی نہ تھی، ہمنتا کھڑکی کے قریب بستر پر بیٹھا ہوا تھا، اور سامنے تاریکی میں اپنی آنکھیں جمائے تھا۔ کسم، فرش پر پڑی تھی، وہ اپنے دونوں سیمیں اور خوبصورت ہاتھوں سے اپنے شوہر کے قدموں کو مضبوط پکڑے ہوئے تھی اور اُس کا سر قدموں پر تھا۔ وقت ایک سمندر کی مانند تھا جو کامل طور پر سکوت میں ڈوبا ہوا ہو۔ رات کے صفحہ پر، معلوم ہوتا تھا کہ قسمت نے ہمیشہ کے لئے یہ ایک تصویر نقش کردی ہے ـــ تباہی ہر طرف کھڑی ہے اُس کے بیچ میں ایک منصف ہے، اور مجرم اُس کے قدموں پر سربسجود ہے۔

پھر سلیپر کی چاپ سُنائی دی، ہری ہر مکرجی نے دروازے کے قریب پہونچکر کہا۔ "بس بہت وقت ہوچکا ہے۔ اب میں زیادہ وقت نہیں دے سکتا۔ اس لڑکی کو فوراً گھر سے باہر نکالدو"

جب کُسم نے یہ آواز سُنی تو پورے جوش اور جذبات کے ساتھ ہمنتا کے پیروں سے چمٹ گئی۔ ان کو پیار کیا اور تعظیماً اپنی پیشانی اُن پر رکھدی اور پھر کھڑی ہوگئی۔

ہمنتا اُٹھا۔ اور دروازہ کی طرف بڑھ کر بولا۔ "اباجان۔ میں اپنی بیوی کو نہ چھوڑوں گا"

"کیا کہا؟" اس کے والد نے چیخ کر پوچھا۔ "کیا تو اپنی ذات کو چھوڑ دیگا؟"

"میں ذات کی پروا نہیں کرتا۔ مجھے انسانیت کا خیال ہے" ہمنتا نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"تو میں تم کو بھی چھوڑتا ہوں" اس کے والد نے کہا اور چلا گیا۔

(ٹیگور) محشر عابدی بی۔اے

باب المراسلۃ والمناظرہ

کسبی کا دامن ایک ڈاکٹر کے ہاتھ میں

جناب ڈاکٹر محمد الیاس صاحب - ٹکاری (گیا)

نیاز صاحب!

اپنی کوتاہی فہم سے ابتک یہ سمجھتا رہا تھا کہ صرف جدت طرازی "نگار" کا حصہ ہے۔ لیکن ماہ اگست ۳۴ء کے پرچے کے مطالعہ کے بعد یہ حقیقت بھی منکشف ہوئی کہ ہر بری بات یا بالفاظ دیگر سوسائٹی کے ہر بہتر قانون کی توہین بھی اس کا طرۂ امتیاز ہے۔

کسبی والے مضمون میں فاضل مضمون نگار کی شعلہ ریزیاں دیکھ کر مجھ پر جو کیفیت طاری ہوئی وہ غصہ در نج کی نہیں بلکہ حیرت واستعجاب کی اور حسرت ویاس کی ہے۔ اب اسے آپ یا تو میری قدامت پرستی سے تعبیر کریں یا کسی اور چیز سے لیکن مجھے کہنے دیجئے کہ جہاں جہاں علمی استدلال کا نام لیا گیا ہے بجز ابلہ فریبی کے میں اور کچھ نہیں پاتا۔ ایسے مضامین "نگار" کے صفحات کی تزئین تو کر سکتے ہیں لیکن، سوسائٹی کے افرادِ کی عقل سلب نہیں کر سکتے۔

آپ نے جرائم کی دو قسمیں کی ہیں (۱) شخصی (۲) جماعتی۔ مجھے بھی تسلیم ہے۔ آپ کسبی کو کسی طرح کی مجرم نہیں پاتے اور میں کہتا ہوں کہ وہ دونوں طرح کی مجرم ہے اول اس لئے کہ عملی دنیا میں کہیں کوئی مثال ایسی نہیں ملتی جہاں وہ حد اعتدال سے آگے نہ بڑھ گئی ہو۔ علاوہ ازیں کیا روحانیت کی موت کوئی موت نہیں ہے؟ کیا فریب کاری سے کسی کو مستثنیٰ کیا جا سکتا ہے؟ کیا وہ پیشہ صرف اس لئے نہیں کرتی کہ دوسروں سے حصول زر کیا جائے۔

اب رہا جماعتی جرم کا سوال یہ اس سے بھی زیادہ روشن ہے، شاید آپ بھی اس سے بے خبر نہ ہوں گے کہ بدترین امراض کے جراثیم یہیں سے تقسیم ہوتے ہیں ایک دو نہیں ہزاروں خاندان کی مٹی انہیں پیشہ وروں کے ہاتھوں پلید ہوئی اور تباہی وذلت کے جہنم میں گر گر فنا کے گھاٹ اُتر گئے۔ آپ کہیں گے کہ نفس پیشہ میں کونسی قباحت لازم آتی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ کسبی کو آپ اس سے

مستثنےٰ کر ہی نہیں سکتے۔

عورت اور مرد کے اتصال کی جو تین غرضیں آپ نے بتلائی ہیں۔ اپنی جگہ بہت صحیح ہیں۔ لیکن آگے چونکہ آپ نے جس فریب سے کام لیا ہے، اللہ کی پناہ۔ یہ کیا ضرور ہے کہ "بقائے نسل" اور "تدبیر منزل" کی تکمیل تو گھریلو عورت کرتی رہے اور تیسری غرض یعنی "آلام حیات سے کسی قدر آسودگی" کو کسی کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے۔ کیوں نہ ہم یہ تینوں تمنائیں ایک ہی ذات سے وابستہ کر دیں کیا یہ تین تمنائیں اس درجہ ایک دوسرے کی ضد ہیں کہ ایک ذات سے ان کی تکمیل ممکن نہیں۔ اگر یہ حقیقت نہیں اور یقینی نہیں تو پھر یہ تقسیم کس بنا پر ہے۔ اور اگر فرض کر لیں کہ اول ہی دو اغراض کی تکمیل بیویوں سے ممکن ہے تو پھر نکاح و شادی کو آپ کیوں ضروری قرار دیں۔ ان کی تکمیل تو جانور بھی کر لیتے ہیں۔ وہ بچے بھی دیتے ہیں اور ان کی پرورش بھی ہو جاتی ہے۔ بچوں کو محض ایک مرد سے موسوم کرنے کا مقصد اتنا اہم نہیں کہ اس کے لئے نکاح و شادی کا اتنا بڑا بار آج کل کے "ترقی یافتہ دماغ" کا انسان برداشت کر سکے۔ آپ کو بھی اولیں دو اغراض کے جبلی ہونے کا اقرار ہے۔ اور رسم شادی قطعی جبلی شے نہیں۔ معلوم نہیں کہ آپ کیوں اس سے بے خبر ہیں کہ جس ہندوستان کی سوسائٹی کا ہاتھ آپ کو خون سے بہت زیادہ رنگین نظر آتا ہے وہیں کی سوسائٹی نے عورتوں کا یہ فرض قرار دیا ہے کہ وہ اہلی زندگی کے اور لوازم کے ساتھ یہ بھی سیکھ لیں کہ ان کے مردوں کو کس آسائش کی ضرورت ہے۔ ان کی کونسی رنگینیاں مرد کے جمالیاتی ذوق کو پورا کر سکتی ہیں۔ ان کی کیا کیا ادائیں مرد کی طلب آسودگی کو پورا کر سکتی ہیں جس عورت میں ان کی کمی ہے وہ سب کچھ ہو سکتی ہیں لیکن حقیقی معنی میں بیوی نہیں بن سکتی۔ اب یہ اور بات ہے کہ ہر عورت اس آواز پر کان نہیں دھرتی تو یہ افراد کا جرم ہے، اس سے سوسائٹی کے قانون میں کونسی قباحت لازم آتی ہے۔

آپ جس آسودگی کا نام لیکر کسبی کی قربانگاہ پر انسانیت کی بھینٹ چڑھانا چاہتے ہیں اس کا کسبی کے یہاں کہیں پتہ نہیں، اسکی تمام اداؤں میں فریب۔ اس کی تمام رعنائیاں یکسر مکاری اور اس کی تمام رنگینیاں یکسر مصنوعی ہیں۔ وہ ریشمی ساری اس لئے اور محض اس لئے پہنتی ہیں کہ آپ یہ محسوس کرنے لگیں کہ اس ساری کے اندر ریشم سے بھی زیادہ نرم و نازک جسم چھپا ہوا ہے وہ آپ کو رنگ و بو کی فضا میں صرف اس لئے لیجانا پسند کرتی ہے کہ وہاں پہونچکر آپ بہت زیادہ آسانی سے مسحور ہو جائیں اور اپنا سب کچھ اس پر نثار کرنے کو تیار۔ وہ اعضاء کے ہر پیچ کے ساتھ آپ کے دماغ کو مسلسل ایسے جھٹکے پہونچاتی ہے کہ آپ مفلوج ہو کر اپنی جیب خالی کر دیتے ہیں۔ وہ صرف نمائش کرتی ہے عشق و محبت کی اسی عشق و محبت کی جو آپ کے عجیب و غریب لا ابالی شاعرانہ دماغ کا نتیجہ ہے یہی وہ شے ہے جس کا جادو آپ پر سب سے زیادہ چلتا ہے اور اگر یہ فن ان سے چھین لیا جائے تو پھر ان میں آپ کے لئے کوئی دلکشی باقی رہے نہ جاذبیت۔

رہی یہ بات کہ سوسائٹی کے ان تمام جذبات کراہت کے باوجود یہ پیشہ اتنا شاداب کیوں نظر آتا ہے محض ادنیٰ تدبر اس مسئلہ کو حل کر دیتا ہے۔ یہ کرشمہ ہے محض حیوانی جذبہ کا جو مرد کو ہر اس شے کے پاس کشاں کشاں لیجاتا ہے جس میں نسائیت ہو، لوچ ہو۔ رنگینی ہو اور عطریت ہو۔ آپ کو نہیں معلوم کہ ہندوستان کا مرد کتنا عجیب و غریب ہے۔ گھر کی بیویاں وہ ناز و

عشوے کہاں سے لائیں جو کسبیاں صرف اسی لئے حاصل کرتی ہیں کہ مرد کو بیوقوف مرد کو دھوکا دیا جائے۔ یہاں سادگی ہے وہاں پُرکاری۔ یہاں خلوص ہے اور وہاں فریب کاری۔ بیوی ایک شریف بیوی اپنا سب کچھ شوہر کی ایک نظر التفات پر نثار کر دینے کو طیار ہے۔ لیکن ناکارہ مرد آسودہ ہو کر عرصہ تک فریب میں مبتلا رہنا پسند کرتا ہے۔ محض یہی تلاش اسے وہاں لیجاتی ہے اور ہمیشہ کے لئے غرق کر آتی ہے۔

آپ نے یہ نتیجہ خدا جانے کہاں سے نکال لیا ہے کہ مرد وہ ذلیل اور کمینہ مرد جو کسبی کی گلی کی خاک چھانتا پھرتا ہے اور اسکے کوٹھے پر چڑھتا ہے سوسائٹی کی نظر میں قابل احترام رہتا ہے۔ یہ حقیقت اس طرح واضح ہو جاتی ہے کہ جب کبھی بھی وہ اس کے ارتکاب کی ہمت کرتا ہے تو ٹھیک اسی طرح جس طرح چور پولیس کی نظر سے بچکر سب کچھ کر جاتا ہے، ہاں حکومت کا قانون البتہ کسی کی طرح اس پر بھی کوئی دفعہ عائد نہیں کرتا۔

میں نے اس مضمون میں اکثر جگہ آپ کو مخاطب کیا ہے صرف اس سبب سے کہ مضمون کی اشاعت کی پوری ذمہ داری ایڈیٹر کے سر ہوتی ہے۔ اور آپ نے بغیر کسی اختلافی نوٹ کے کسبی والے مضمون کو شائع فرمایا ہے۔

مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ میری اس تحریر کی اشاعت آپ ہرگز گوارا نہیں فرمائیں گے اور مجھے اس بارہ میں کبھی آپ کا مرہون منت ہونا نہیں پڑے گا پھر بھی اپنی مجرمانہ نقاشی کی معافی چاہتا ہوں۔

(نگار) اس تحریر کی شانِ نزول یہ ہے کہ اگست ۴۳ء کے نگار میں ایک مضمون کسبی کے عنوان سے جناب بزمی بھوپالی کا شائع ہوا تھا، جس میں پیشہ ور زنان بازاری کے متعلق بہت روادارانہ انداز سے بحث کی گئی تھی اور اُن کے وجود کو سوسائٹی کے لئے ایک ضرورت قبیحہ" (Evil Necessity) کے طور پر جایز ثابت کیا گیا تھا۔

محترم مراسلہ نگار کی یہ عتاب آمیز تحریر، ستمبر ہی میں مجھے مل گئی تھی، لیکن میرے حیدر آباد کے طویل قیام اور پھر جنوری کے رسالہ کی طیاری کی وجہ سے اس کی اشاعت کا موقعہ نہ ملا۔ اس دوران میں ایک سے زاید بار ڈاکٹر صاحب موصوف نے طعن آمیز تقاضے بھی کئے، لیکن افسوس ہے کہ اس سے قبل، میں اس کی اشاعت پر قادر نہ ہو سکا۔ بہرحال اب میں اس کو درج کرتا ہوں اور بتانا چاہتا ہوں کہ جس مسئلہ پر جناب بزمی نے اظہار خیال کیا تھا، اس کے لئے اسقدر رزمی انداز اختیار کرنے کی ضرورت نہ تھی۔

میرا کسی مضمون کو نگار میں شائع کرنا یہ معنی نہیں رکھتا کہ میں اس کا موافق بھی ہوں۔ اس سے قبل بارہا خود میری اور میرے مسلک کی مخالفت میں مضامین موصول ہوئے اور میں نے انھیں شایع کر دیا، اس لئے مسئلہ زیر بحث میں صرف اس دلیل پر کہ میں نے بزمی صاحب کے مقالہ کی مخالفت میں کوئی نوٹ نہیں لکھا، مجھے اس کی موافقت کا مجرم قرار دینا بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ زنان بازاری کے خلاف ڈاکٹر صاحب کی برہمی کو دیکھ کر میں یہ نتیجہ اخذ کروں کہ ضرور ان کو اس پیشہ والیوں نے بہت ستایا ہے اور اسی لئے وہ یہ انتقام اُن سے لے رہے ہیں۔

ہم لوگوں میں یہ سخت عیب ہے کہ اپنی مخالفت میں کوئی بات سننا پسند ہی نہیں کرتے اور یہی وہ ذہنیت ہے، جس نے ہماری نہ صرف

اجتماعی و سیاسی بلکہ مذہبی زندگی کو بھی ناکارہ بنا رکھا ہے۔

اگر ترمیمی صاحب نے کسبیوں کی حمایت میں کوئی مضمون لکھا تھا، تو اس پر غور کر کے سنجیدگی سے اس کا جواب لکھنا چاہئے تھا، برہمی کی ضرورت نہ تھی اور پھر لطف یہ کہ اظہار برہمی بھی مقالہ نگار پر نہیں ہے، بلکہ مجھ پر ہے کہ میں نے کیوں اسے شایع کیا۔ وہ آج تھا لیکہ دنیا کی کوئی اصلاح اسوقت تک ممکن نہیں جب تک ریب و شک یا ایراد و اعتراض کی تمام صورتوں کو محو کر کے لوگوں کے قلوب کو متاثر نہ کیا جائے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہم مخالفین کی باتیں سُنیں اور اُن کے شبہات و اعتراضات کو دور کریں۔

پیشہ ور عورتوں کا مسئلہ سوسائٹی کا نہایت قدیم مابہ النزاع مسئلہ ہے اور باوجود اس کے کہ ہمیشہ اور ہر زمانہ میں ان کے وجود کو بُری نگاہوں سے دیکھا گیا، لیکن دنیا ان سے پاک نہ ہو سکی، یہاں تک کہ حکومتوں کے قوانین بھی ادارۂ فحاشی کا استیصال نہ کر سکے اور یہ طبقہ جوں کا توں ابتک باقی ہے۔ اگر آپ نے میری تصنیف ترغیبات جنسی اب تک نہیں پڑھی تو اب مطالعہ کیجئے اور دیکھئے کہ فحاشی کتنی قدیم چیز ہے اور اس کے رواج کے خلاف کیا کیا تدابیر اختیار نہیں کی گئیں، لیکن آخر کار سب کو ناکامی کا مُنھ دیکھنا پڑا۔

میں نے جہاں تک غور کیا ہے اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ شروع سے تشخیص ہی غلط کی گئی، یعنی زنان بازاری کے استیصال سے قبل اس امر پر کبھی توجہ نہیں کی گئی کہ آیا ان کا وجود نتیجہ ہے مردوں کی آوارگی کا، یا مردوں کی آوارگی نتیجہ ہے ان کے وجود کا۔

اگر آپ نے تاریخ تمدن کا مطالعہ کیا ہوگا تو یہ حقیقت آپ سے مخفی نہ ہوگی کہ عہد وحشت میں مرد و زن کے تعلقات کیا تھے، اُس وقت نہ نکاح کا رواج تھا، نہ کسی عہد و پیمان کا، ایک مرد ایک ہی وقت میں مختلف عورتوں سے تعلق رکھ سکتا تھا اور عورت کی حیثیت اس بازاری جنس سے زیادہ نہ تھی جس کو قیمت ادا کر کے ہر وقت حاصل کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اب بھی بہت سی قوموں میں نقد معاوضہ ادا کر کے بیوی حاصل کرنے کا دستور باقی ہے۔

اس لئے اس سے انکار ممکن نہیں کہ تعلق جنسی کے سلسلہ میں مرد کی خواہش کو ہمیشہ فایق سمجھا گیا اور عورت اس امر پر مجبور کی گئی کہ وہ مرد کی اس خواہش کو طوعاً یا کرہاً پورا کرے۔ جب تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ نکاح و ازدواج کو اصلاح معاشرت کے لئے ضروری قرار دیا گیا تو اسکے بعد بھی ایک عورت کی پابندی ضروری نہ قرار دی گئی، بلکہ اسی کے ساتھ یہ ظلم بھی غریب عورت پر روا رکھا گیا کہ وہ ایک ہی وقت میں خاندان کے مختلف مردوں سے تعلق رکھے۔ اس کے بعد جب انسانیت نے زیادہ ترقی کی تو بعض قوموں نے صرف ایک ہی بیوی کا مرد کو پابند بنانا چاہا اور بعض نے مرد کی تنوع پسند طبیعت کا لحاظ کر کے ایک سے زاید بیویاں رکھنے کی اجازت دی۔

الغرض تعلق جنسی کے سلسلہ میں عورت کی حیثیت ہر ملک اور ہر زمانہ میں حد درجہ مظلومانہ رہی ہے اور مرد کی دست درازیوں اور متعدد عورتوں سے تعلق پیدا کرنے کی تمناؤں نے ہمیشہ کسی نہ کسی صورت میں ادارۂ فحاشی کو قایم رکھا۔ پھر چونکہ صورت حال یہی تھی اس لئے رفتہ رفتہ عورتوں میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا، جن کا کام ہی یہ تھا کہ وہ مرد کی اس ناجایز خواہش کو پورا کرتی رہیں اور حکومتوں نے بھی سوسائٹی کو اس بلا سے محفوظ رکھنے کے لئے اس نوع کے ادارۂ فحاشی کا قیام جایز قرار دیا۔

بہر حال یہ واقعہ ہے کہ رواج فحاشی کی ابتدا مرد کی طرف سے ہوئی اور عورت نے اسے مجبوراً صرف اس لئے اختیار کیا کہ مرد زبردستی

اسے اس سطح پر گھسیٹ کر لے آیا تھا اور اب سوائے اس پیشے کے کوئی دوسری صورت اس کی زندگی کی باقی نہ رہی تھی۔

میرے نزدیک مرد کے اُن تمام مظالم میں جو اس نے عورت پر روا رکھے ہیں، بدترین ظلم یہی تھا اور تماشہ یہ ہے کہ اس وقت بھی جبکہ مرد اپنے آپ کو بہت آزاد و ترقی یافتہ کہتا ہے، عورت کی یہ مظلومیت اس کے نزدیک ایک ناقابلِ معافی جُرم کی حیثیت رکھتی ہے۔

ہمارے فاضل مراسلہ نگار ادارۂ فحاشی کے سخت مخالف ہیں اور وہ زنانِ بازاری کے اتنے سخت دشمن ہیں کہ بقول شخصے اگر انھیں مل جائیں تو وہ کچا ہی چبا جائیں، لیکن انھوں نے اس حقیقت پر غور نہیں فرمایا کہ یہ بلا تو خود انھیں کی "جنس" کی لائی ہوئی ہے اور یہ اس وقت تک دور نہیں ہو سکتی جب تک خود مرد اپنی ذہنیت میں تبدیلی پیدا نہ کرے۔

پیشہ ور عورتیں، نہایت ہی پلید قسم کی بیماریوں کا گہوارہ ہیں۔ بالکل صحیح۔ ان کے گھر بدترین اخلاقی جرائم کا مرکز ہیں۔ یقیناً درست۔ ان کی عشوہ فروشیوں نے ہزاروں گھر تباہ کر دئیے، لاریب فیہ۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ بیماریاں اُن کو کس نے لگائی ہیں، یہ اخلاقی جرائم کس کی وجہ سے قائم ہیں اور یہ مال و زر کی تباہیاں کیا اس لئے نہیں ہیں کہ مرد اپنے جذبات کا بندہ اور اپنے نفس کا غلام ہے۔

آگ کا کام جلانا ہے اور پانی کا بہا لیجانا، لیکن آپ کیوں آگ میں کودیں اور کیوں دریا کے اندر قدم رکھیں۔ اگر آپ ایسا کریں گے تو دنیا آپ ہی کو بیوقوف بنائے گی، آگ اور پانی کو کوئی بُرا نہیں کہیگا۔

آپ اس طبقہ کے خلاف تو جہاد پر آمادہ ہیں، لیکن خود اپنی جماعت کی اصلاح پر متوجہ نہیں جو اصل محرک و سبب ہے فحاشی کے قیام کا۔ کیا کبھی ایسا ہوا ہے کہ کوئی بازاری عورت زبردستی مرد کو اُس کے گھر سے گھسیٹ لے گئی ہو، کیا کبھی اس نے ایسا کیا ہے کہ وہ راہ چلتے آدمی کو جبر اپنے کوٹھے پر کھینچ لائی ہو۔ پھر جب صورتِ حال یہ نہیں ہے تو کسبی کا کیا قصور۔ شراب کی کشید اسی لئے جاری ہے کہ انسان اسے استعمال کرتا ہے، افیون کی کاشت اسی لئے ہوتی ہے کہ لوگ اس کے شایق ہیں، دنیا میں ہر پیداوار، طلب کے لحاظ سے ہوا کرتی ہے اس لئے پیداوار کے خلاف احتجاج کرنا سخت لایعنی سی بات ہے کیونکہ وہ تو نتیجہ ہے طلب کا۔ ہم اصل سبب کو کیوں نہ دور کریں کہ ہمیشہ کے لئے انسداد ہو جائے، ورنہ یوں اگر اصلاح ہوئی بھی تو بالکل عارضی ہوگی اور اس کا قیام پائدار نہ ہوگا۔

جو تحریک مراسلہ نگار نے کی ہے، وہ کوئی نئی چیز نہیں، اس سے قبل بعض حکومتوں نے بجبر قحبہ خانوں کو بند کرا کے سخت سزائیں پیشہ ور عورتوں کے لئے تجویز کیں، لیکن آخرکار اس میں کامیابی نہ ہو سکی اور بعد کو مانع فحاشی قوانین منسوخ کرنے پڑے۔ کیونکہ ان قوانین کے نفاذ سے مردوں کے اخلاق پر تو کوئی اثر پڑا نہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اندرونی طور پر سوسائٹی کے اندر فحاشی کا رواج شروع ہو گیا جو بہت زیادہ مہلک تباہ کن تھا۔

تنوع پسندی اور ہر جدید چیز سے لذت اُٹھانا، انسان کی فطرت ہے، اس لئے یہ نا ممکن ہے کہ مرد یا عورت کے ذہن سے اس خواہش کو دور کر دیا جائے، لیکن چونکہ عورت نسبتاً زیادہ صابر و ضابط اور زیادہ شرمیلی واقع ہوئی ہے، اس لئے اس کی خواہش کو تو ہم سوسائٹی کے قوانین سے دبا سکتے ہیں لیکن مرد جو زیادہ بیباک پیدا ہوا ہے اور رسم و رواج کے ماتحت اس کی فحاشیوں کو اتنا معیوب نہیں سمجھا جاتا مشکل سے قابو میں آسکتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ آج تک انسدادِ فحاشی نہ ہو سکا۔ اور نہ عملی طور پر پیشہ ور عورتوں سے دنیا کو پاک کیا جاسکا۔

بہرحال، میں اس باب میں معزز مراسلہ نگار کا بالکل ہمنوا ہوں کہ پیشہ ور عورتوں سے ملک میں ہلاکت و تباہی پھیل رہی ہے اور ہماری معاشرت میں ان کا وجود نہایت بدنما داغ ناصیۂ انسانیت کے لئے ہے، لیکن میں اس باب میں اُن سے متفق نہیں کہ ایک وقت ایسا بھی آسکتا ہے جب دنیا کی رونق ان کے نہ ہونے سے کم ہو جائے گی، یہ طبقہ ہمیشہ اسی طرح قائم رہیگا اور اس وقت تک کہ مرد خود اپنی فطرت میں کوئی تبدیلی پیدا نہ کرے (جو یقیناً محال ہے) یہی چرچے دنیا میں رہیں گے۔ انسان اگر درندہ پیدا نہیں ہوا، تو اس کے فرشتہ ہونے کا بھی کوئی ثبوت موجود نہیں، اور غالباً دُنیا کا لطف اسی پر قائم ہے۔

بیا کہ رونقِ ایں کارخانہ کم نہ شود
زُ زُہدِ ہمچو توئی یا زفسقِ ہمچو منی !

اہتمام سرسری اطلاعنامہ بنام دائنان

(دفعہ ۴۷ ایکٹ نمبر ۵ سنہ ۱۹۲۰ء)

بعدالت جناب سید خورشید حسین صاحب جج خفیفہ لکھنؤ

درخواست دیوالیہ نمبر ۲۷ سنہ ۱۹۳۴ء

بمقدمہ قرار دئے جانے دیوالیہ مسمی تلشی رام ولد کنجی قوم تنبولی ساکن لال باغ لکھنؤ

بنام
- ۵ - بلھداس ساکن رستوگی ٹولہ تھانہ چوک شہر لکھنؤ
- ۷ - دامودر داس ساکن رستوگی ٹولہ تھانہ چوک شہر لکھنؤ
- ۱۲ - لالہ پرسوتم داس ولد لالہ ہرنرائن رستوگی ساکن اشرف آباد تھانہ چوک شہر لکھنؤ

اطلاع دی جاتی ہے کہ بتاریخ ۱۰ ماہ مارچ سنہ ۱۹۳۴ء مدیون مذکور الصدر نے ایک قطعہ درخواست اس عدالت میں بدیں غرض پیش کی ہے کہ وہ دیوالیہ قرار دیا جاوے اور یہ کہ بتاریخ ۱۷ ماہ مارچ سنہ ۱۹۳۴ء عدالت ہذا نے اس امر کا اطمینان کرکے کہ مدیون کی جایداد غالباً مبلغ پانچ سو روپیہ سے زائد نہ ہوگی ہدایت کی ہے کہ مدیون کی جایداد کا اہتمام سرسری طریقہ پر کیا جاوے اور تاریخ بیس ۲۰ ماہ فروری سنہ ۱۹۳۵ء بنا بر مزید سماعت درخواست و اظہار مدیون مذکور مقرر کی ہے۔ اس امر کی بھی اطلاع دی جاتی ہے کہ عدالت تاریخ مذکور الصدر پر تصفیہ و تقسیم جایداد مدیون مذکور کی فوراً کارروائی شروع کر سکتی ہے۔ تم کو اختیار ہے کہ تم حاضر ہو کر اُس تاریخ پر ثبوت دو۔ ثبوت کسی دعویٰ کا جو تم کرنا چاہو تاریخ مذکور پر یا اُس کے قبل داخل عدالت کرنا لازمی ہوگا۔

میرے دستخط اور مہر عدالت کے آج بتاریخ ۲۳ ماہ جنوری سنہ ۱۹۳۵ء جاری کیا گیا۔

دستخط جج بخط انگریزی

وقت حاضری عدالت دس بجے سے چار بجے تک

چند دلچسپ نتائج مطالعہ

چینیوں کا جہنم

ہر مذہب میں خواہ وہ قدیم ہو یا جدید، وحشی ہو یا غیر وحشی، معاد کا اعتقاد ضرور پایا جاتا ہے اور اس سلسلہ میں جنت و دوزخ کے جو حالات بیان کئے جاتے ہیں، ان میں ہر جگہ عجیب و غریب شاعری سے کام لیا گیا ہے، جو ہر ملک کے ماحول کے لحاظ سے کچھ نہ کچھ مختلف ہوتی ہے۔

مثلاً اگر کسی مذہب نے نہایت گرم ملک میں نشو و نما پایا ہے تو دوزخ نہایت شدید گرم ہوگی جہاں آگ کی لپیٹ ہے اور باد سموم کے جھونکے برخلاف اس کے قطب شمالی کے رہنے والوں کی دوزخ وہ ہے، جہاں ہر وقت برفباری ہو رہی ہے اور ہر چیز یخ بستہ نظر آتی ہے۔

الغرض ہر ملک کی مدنیت اور اس کے ماحول کو اعتقادات مذہب و معاد میں بڑا دخل ہوا کرتا ہے اور اگر کوئی شخص تحقیق کرے تو مذاہب کے مطالعہ سے اہل مذاہب کی فطرت، ان کے ماحول و تمدن اور ذوقِ شاعری کا علم بڑی حد تک اسے حاصل ہو سکتا ہے۔

مثلاً چینیوں کو لیجئے کہ اُن کے یہاں جہنم کے دس یا اٹھارہ درجے قائم کئے گئے ہیں اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انھوں نے تقسیم جرائم اور سی لحاظ سے ترتیب قانون میں کافی دقّتِ نظر سے کام لیا تھا۔

ان کے یہاں جہنم کا پہلا درجہ قاتلوں، خودکشی کرنے والوں اور حیات بعد الموت کے منکروں کے لئے مخصوص ہے جس میں وہ بھوکے پیاسے رکھے جائیں گے اور روز مار مار کر زندہ کئے جائیں گے۔ چونکہ یہ تینوں زندگی کی نعمت کو ٹھکرانے والے ہیں، اس لئے سزا بھی وہی تجویز کی گئی جو ان کے مناسب حال تھی اور جس میں شاعرانہ تشبیہ و استعارہ دونوں مکمل طور پر پائے جاتے ہیں۔

دوسرا درجہ جہنم کا جھوٹ بولنے والے کے لئے ہے، اس طبقہ میں صرف ایک صحرا ہے جس کے درختوں کے پتّے تلوار کی طرح تیز ہیں اور جہاں دریاؤں کا پانی چونے کا ہے۔

چونکہ جھوٹ بولنے کا تعلق زبان اور حلق سے ہے اس لئے سزا بھی وہی تجویز کی گئی جو زبان اور حلق کو تکلیف پہونچانے والی ہے۔

تیسرے درجہ میں وہ لوگ رکھے جائیں گے جنھوں نے سرداران قوم کا احترام نہیں کیا ہے، یہاں سوائے نمک کے اور کچھ نہ ہوگا، جسے کھائیں گے اور اسی میں زندگی بسر کریں گے، اس سزا کا بھی شاعرانہ تعلق جرم سے ظاہر ہے۔

چوتھا طبقہ ان لوگوں کے لئے ہے جو ملک کے محاصل ادا نہیں کرتے، جو ناکارہ دوائیں فروخت کرتے ہیں اور جو راستے میں کانچ کے ٹکڑے ڈال دیتے ہیں یا اپنے جانوروں کو سڑک پر آزاد چھوڑ دیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو پتھروں اور لکڑی کے بڑے بڑے کندوں کے نیچے دبا کر پیسا جائیگا۔

پانچواں طبقہ کافروں، ساحروں، غیبت کرنے والے، خوشامدیوں اور اپنا قرض نہ ادا کرنے والوں کے لئے ہے۔ اور چھٹا ان لوگوں کے لئے ہے جنھوں نے قربانیاں پیش کرنے میں تامل کیا تھا، یہ ایک پنجرہ میں بند کردئے جائیں گے اور چوہے اور ٹیڑیاں ان کو نوچ نوچ کر کھائیں گے اسی طرح ایک درجہ زانیوں کے لئے ہے اور ان کی سزا عجیب غریب بتائی گئی ہے یعنی ایک زانی کی شخصیت متعدد شخصیتوں میں تبدیل کردی جائیگی اور ہر ایک پر علحدہ علحدہ عذاب کیا جائے گا۔ یہ شاعرانہ توجیہ کسقدر دلچسپ ہے۔

آپ دُنیا کے کسی مذہب کو لیجئے اس کے یہاں عذاب و ثواب کی شاعرانہ مصوری تقریبًا اسی قسم کی نظر آئے گی اور اگر اس میں کوئی فرق ہوگا تو صرف اس نفسیاتی احساس کی وجہ سے جو مختلف قوموں میں اُن کے ماحول و تمدن کے لحاظ سے علحدہ علحدہ پیدا ہوگیا ہے۔ لیکن اب مذہب کی شاعری کا یہ دور ختم ہوگیا ہے کیونکہ یہ زمانہ حقایق کی جستجو کا ہے اور محض ظن و قیاس پر اعتماد کر کے کسی نظریہ کی بنیاد قایم نہیں ہوسکتی۔

ترکی کی جدید اصلاحات

(۱) ۱۹۳۵ء کا آغاز ترکی میں مزید اصلاحات کے ساتھ ہوا ہے جن میں سب سے زیادہ اہم اصلاح ترکی خواتین کی سیاسی اہمیت کو بڑھانا ہے۔ اس سے قبل وہ میونسپل ممبروں کے حق میں رائے بھی دے سکتی تھیں اور خود بھی ممبر ہوسکتی تھیں، لیکن پارلیمنٹ میں انکی کوئی آواز نہ تھی۔ اب حکومت نے ایک قدم اور آگے بڑھایا ہے، یعنی ۲۲ سال کی عمر رکھنے والی خواتین ممبران پارلیمنٹ کے حق میں رائے دے سکتی ہیں اور ۳۰ سال کے عمر کی خود بھی پارلیمنٹ میں جاسکتی ہیں۔

(۲) ۶ سال قبل عربی رسم الخط کے بجائے لاطینی حروف کا استعمال وہاں شروع ہوا تھا اور اس تحریک کے سلسلہ میں ایک عام رجحان تعلیم کا لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوگیا تھا، لیکن اب مصطفےٰ کمال نے ترکی زبان سے عربی و فارسی الفاظ کے اخراج کا بھی تہیہ کرلیا ہے اور اس باب میں اتنا قدغن ہے کہ وہ قدیم ناموں کو بھی ترک کررہا ہے، چنانچہ خود اسنے اپنا نام بجائے مصطفےٰ کمال کے "اتاترک" رکھا ہے جسکے معنی "ترک اعظم" کے ہیں اور اپنے وزراء کا نام بھی بدلدیا ہے۔

چنانچہ اس تحریک نے وہاں کی زبان میں بڑا تغیر پیدا کردیا ہے اور اب وہاں کا سمر لٹریچر خالص ترکی زبان میں شائع ہو رہا ہے جسمیں غیر زبانوں کا کوئی ایک لفظ بھی نہیں پایا جاتا۔

(۳)۔ مصطفےٰ کمال نے مشرقی موسیقی کو کبھی پسند نہیں کیا۔ کیونکہ اس سے یاس و حزن پیدا ہوتا ہے اور لوگوں کے دلولولۂ عمل پر اس کا بُرا اثر پڑتا ہے۔ اس لئے اس نے حال میں احکام جاری کئے ہیں کہ مشرقی موسیقی کی آواز کسی جگہ سے بلند نہ ہو، اور جدید مغربی اصول پر اس کو مرتب کیا جائے۔

(۴) اصلاح مذہب کے سلسلہ میں اُس نے جدید احکام یہ جاری کئے ہیں کہ کسی مذہب کا پیشوا کوئی خاص لباس ایسا استعمال نہیں کرسکتا، جس سے اس کی مذہبی قیادت کا اظہار ہو، اس کے معنے یہ ہیں کہ نہ مسلمان علماء وہاں عمامہ و عبا استعمال کرسکیں گے

اور نہ عیسائی پادری اپنی دراز قبائیں۔ اس اعلان سے وہاں کی عیسائی آبادی میں ہیجان پیدا ہو گیا ہے اور پاپائے روم نے فیصلہ کیا ہے کہ ان حالات میں وہاں عیسوی مدارس کا قایم رکھنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔

مغرب اور جنگِ مستقبل

یقیناً اس وقت مغرب کا کوئی ملک جنگ کرنا پسند نہیں کرتا اور بظاہر دنیا میں امن و سکون پیدا کرنے کی کوشش ہر ملک کی طرف سے کی جارہی ہے، لیکن اسی کے ساتھ بے اعتباری اور امکانِ جنگ کی طرف سے خوف کا یہ عالم ہے کہ ہر قوم اپنی ساری قوت اسباب حرب کی طیاری میں صرف کر رہی ہے۔

حال ہی میں مغرب کی اکثر سلطنتوں نے اپنے یہاں فوجی مشقوں اور مصنوعی جنگوں کی نمایش کی تھی اور اس سلسلہ میں جو حالات معلوم ہوئے ہیں وہ آیندہ جنگ کے ہولناک مناظر کی ایسی ڈراونی پیشین گوئی کرنے والے ہیں کہ اگر واقعی کبھی لڑائی چھڑ گئی تو شاید کرۂ ارض کو اپنی تباہی کے لئے کسی صورِ اسرافیل کے انتظار کی ضرورت باقی نہ رہیگی۔

یہ سب کو معلوم ہے کہ آیندہ جنگ بالکل فضائی جنگ ہوگی اور زمین کا فیصلہ ہوا میں ہوگا، لیکن اس ہوائی تاخت کی کامیابی میں سب سے بڑا مانع ایک تو جہازوں کا شور ہے جو بہت دور سے راز کو افشا کر دیتا ہے اور دوسرا یہ کہ ان کے مقابلہ میں دوسرے ہوائی جہازوں کو اُڑانے کے لئے بھی اتنا وقت درکار ہوتا ہے کہ تباہیوں کو نہیں روکا جا سکتا۔ لیکن ان مصنوعی جنگوں کی نمایش سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ دشواریاں بھی دور ہو کر رہیں گی۔ کیونکہ بعض ماہرینِ فن نے ایسے جہاز پیش کئے جن میں شور بالکل نہیں ہوتا اور برطانیہ کی وزارت بحری نے ایسے جہازوں کا بغور مطالعہ کیا جن کی آواز ۵۰۰ فٹ سے آگے نہیں جاتی۔ اسی کے ساتھ فرانسیسی انجینیروں نے اس کا بھی امکان ظاہر کیا ہے کہ وہ چھ چھ ہزار فٹ کے بلند مینار اس وضع کے طیار کر سکتے ہیں جہاں متعدد ہوائی جہاز رہ سکیں اور ضرورت کے وقت وہیں سے بالا بالا اُڑ کر دشمنوں کے جہازوں پر بم برسا سکیں۔

فرانس نے اُڑنے والے دبابہ (Tank) کی بھی نمایش کی تھی۔ گویا یہ خاص قسم کے ہوائی جہاز ہیں جن میں نہایت سریع چلنے والی توپیں بھی نصب کر دی گئی ہیں، اسی طرح کے اور متعدد آلاتِ حرب پیش کئے گئے جن کا استعمال مستقبل کی جنگ میں کیا جائے گا اور نہیں کہا جا سکتا کہ درندوں کی اس جنگ ناخن و چنگال میں کون غالب رہیگا اور کون مغلوب، لیکن یہ یقینی ہے کہ شہری آبادی خواہ وہ کسی غالب ملک کی ہو یا مغلوب ملک کی، بکثرت تباہ و برباد ہوگی اور اس طرح آنے والی جنگ کا بڑا کارنامہ یہ ہوگا کہ اس نے سب سے زیادہ کتنے امن پسند شہریوں کو ہلاک کیا۔

مغرب میں تعیینِ اُجرت کا معیار

جس زمانہ میں ہوور امریکہ کا پریسیڈنٹ تھا، اس کی بیوی نے چھ منٹ کے لئے آلۂ نشرِ صوت پر تقریر کرنے کے لئے تین ہزار ڈالر

گویا فی منٹ پانسو ڈالر معاوضہ وصول کیا۔

رڈیارڈ کپلنگ مغرب کے مشہور فسانہ نویس نے اس وقت تک جتنا روپیہ کمایا ہے اس کا اوسطی لفظ ایک شلنگ (تقریباً بارہ آنے) پڑتا ہے۔ چنانچہ مشہور ہے کہ ایک بار کسی شخص نے اس کے پاس ایک شلنگ کا منی آرڈر بھیجکر استدعا کی کہ ایک لفظ خط میں لکھ کر اسکو بھیجدیا جائے کپلنگ نے منی آرڈر وصول کر کے ایک کارڈ پر لفظ (Thanks) لکھ کر اس کے پاس بھیجدیا۔

آرنلڈ بنٹ کی سالانہ آمدنی سولہ ہزار پونڈ بتائی جاتی ہے، برنارڈشا اس سے بھی زیادہ یعنی ۲۰ ہزار پونڈ سالانہ کماتا ہے۔ نوبل کوارڈ کی عمر جب ۲۷ سال کی تھی تو اس کی آمدنی ۵۰ ہزار پونڈ سالانہ تھی۔ مسز اسکوتھ نے اپنے حالات زندگی لکھ کر تیرہ ہزار پونڈ میں فروخت کئے اور مسٹر ہچنسن کو اس کے مشہور ناول (If winter comes) کا معاوضہ ۴۰ ہزار پونڈ ملا۔

حال ہی میں مسٹر لائڈ جارج کو ایک پبلشر نے ۹۰ ہزار پونڈ پیش کئے کہ وہ اندازاً تین لاکھ الفاظ کی ایک کتاب لکھدے۔ سر آرتھر کینن ڈائل کو بارہ افسانوں کے لئے ۹ ہزار پونڈ دئے گئے۔ مسٹر چرچل کو بعض مضامین کا معاوضہ بحساب ۲۵۰ پونڈ فی مضمون دیا گیا۔

اس کے مقابلہ میں ہندوستان کے اہل قلم کا ذکر کیا جائے جبکہ یہاں ایک گریجویٹ کی قیمت بیس روپیہ ماہوار سے زیادہ نہیں ہے سُنا ہے کہ کسی دفتر میں کلرکوں کے لئے یہ نوٹس لکھ کر لگایا گیا کہ "اُن کی تنخواہ ان کا ذاتی معاملہ ہے اس لئے اس کے اعلان کی ضرورت نہیں" یہ نوٹس دیکھ کر ایک کلرک نے کہا کہ "ہم خود ہی شرم سے اس کا ذکر کسی سے نہیں کر سکتے، اس نوٹس کی ضرورت ہی کیا تھی"

بعض خرافات کی حقیقت

اس وقت ترقی عقل وعلم کے زمانہ میں بھی بعض عقاید ایسے پائے جاتے ہیں جو عہد قدیم کی واہمہ پرستی کی یادگار ہیں۔ مثلاً گھوڑے کی نعل کو بہت مبارک چیز سمجھا جاتا ہے اور اگر کسی کو راستہ میں پڑی ہوئی مل جائے تو سمجھا جاتا ہے کہ اس کا سارا دن بلکہ پورا سال خوشی میں بسر ہوگا بعض لوگ تفاؤل کے طور پر اسے دروازہ پر بھی لٹکا دیتے ہیں۔ ہر چند لوہے کی دریافت کو صرف ۳ ہزار سال کا زمانہ ہوا ہے اور آہنی چیزوں کی ساخت انسان کے عہد تمدن کی یادگار ہے، خصوصاً گھوڑے کی نعل کہ یہ تو بہت بعد کی چیز ہے۔ لیکن اس عقیدہ کا تعلق یقیناً عہد وحشت سے ہے۔

نعل کی شکل ہلال کی سی ہوتی ہے اور دنیا کی تمام وحشی قومیں رویت ہلال پر اظہار مسرت کیا کرتی تھیں، چونکہ جانی تھی۔ طریقہ یہ تھا کہ جب پرے درندوں اور دشمنوں کے خطرات سے محفوظ رہتے تھے، چنانچہ لوہے کی دریافت سے قبل ہڈی یا لکڑی کی جنبشوں سے اطلاعات بہم تھے اور سمجھتے تھے کہ اس کی برکت سے وہ ردّ بلا کر سکیں گے۔ جب گھوڑے کی نعل بننے لگی تو وہ ہڈی یا لکڑی ...رسایل موسیقی کے ذریعہ سے اطلاعات ہوگئے اور اس کو ان کی جگہ سمجھا جانے لگا۔

بعض قوموں میں دستور ہے کہ جب بچہ کا دانت ٹوٹتا ہے تو اسے کسی بڑے درخت کی جڑ

مدعا یہ ہوتا ہے کہ بچہ بھی قوت و رفعت میں اس درخت کے برابر پہونچ جائے۔ ہندوستان میں عورتیں چوہے کے بل میں ڈالدیتی ہیں تاکہ ویسے ہی تیز اور چھوٹے چھوٹے خوبصورت دانت بچے کے بھی نکلیں۔ بعض قبائل میں یہ رواج اب بھی چلا آرہا ہے کہ جب لڑکا جوانی پر آتا ہے تو اس کے ایک دو دانت توڑ ڈالتے ہیں۔ اس کا تعلق بھی عہد وحشت سے ہے، کیونکہ اُس وقت جب کوئی نوجوان قبیلہ میں داخل ہونا چاہتا تھا تو اسکے ایک دو دانت توڑ کر دیکھا جاتا تھا کہ اس میں تکلیف برداشت کرنے کی اہلیت پائی جاتی ہے یا نہیں۔

اہل مغرب کے نزدیک ۱۳ کا عدد بہت منحوس سمجھا جاتا ہے، یہاں تک کہ بعض ہوٹلوں میں اس نمبر کا کوئی کمرا ہوتا ہی نہیں۔ بارہ نمبر کے بعد چودہ نمبر ڈالدیتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ (۱۳) ایسا ہندسہ ہے کہ وہ پوری طرح تقسیم نہیں ہو سکتا اور عہد وحشت کے لوگ چونکہ ریاضی سے بالکل نابلد تھے اس لئے کسور وغیرہ سے بہت گھبراتے تھے، اور وہی احتراز ابتک چلا آرہا ہے۔

انگریزی زبان کی ایک مثل ہے کہ بلی ۹ جانیں رکھتی ہے۔ یہ واہمہ پرستی قدیم مصریوں کی یادگار ہے جو بلی کی بڑی عزت کرتے تھے اور اسی جذبۂ احترام کی بنا پر بجائے ایک کے اُس سے ۹ جانیں منسوب کرتے تھے، ان کے یہاں ایک دیوی بھی تھی جس کا سر بلی کا سا ہوتا تھا اور اس کو بھی نوجانوں والی دیوی سمجھا جاتا تھا۔ الغرض اہل مغرب میں یہ خیال واعتقاد مصر سے آیا ہے۔

عورتوں میں آئینہ کا ٹوٹ جانا بری فال سمجھا جاتا ہے۔ اس کا تعلق بھی عہد وحشت سے ہے۔ قدیم انسان سمجھتا تھا کہ اس کا سایہ یا عکس بھی اسی کی ہستی کا ایک جزو ہے اور اس لئے اس کی ایذا خود روح انسانی کی ایذا ہے۔

رات کو کتے کا رونا بھی منحوس بات سمجھی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہ علامت ہے کسی کے موت کی۔ اس کا تعلق بھی اہل مصر کی واہمہ پرستی سے ہے، کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ فرشتۂ موت کتے کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔

بعض قوموں میں دستور چلا آتا ہے کہ مہمان کے سامنے سب سے پہلے نمک پیش کیا جاتا ہے، اس کا تعلق بھی انسان کے عہد جاہلیت سے ہے، کیونکہ زمانۂ قدیم میں نمک نہایت نادر چیز سمجھا جاتا تھا اور اتفاق سے اگر انھیں کبھی میسر آجاتا تھا تو اس کو نہایت قیمتی چیز سمجھ کر بڑی احتیاط سے صرف کیا جاتا تھا۔ پھر چونکہ مہمان کے سامنے بہترین چیز پیش کرنے کا دستور ان میں بھی تھا، اس لئے سب سے پہلے نمک ہی پیش کیا جاتا تھا اور وہی رسم ابتک بعض قوموں میں چلی آتی ہے، چنانچہ ہندوستان میں بوہرہ قوم اس کی بہت پابند ہے۔

جاسوسی کی جدتیں

ملک کی ہر ... شہریوں کو ہلاک کیا۔ مکانات کا اندازہ صرف آلات حرب کی طیاریوں ہی سے نہیں ہوتا بلکہ دوسری سرگرمیوں سے بھی ہو سکتا ہے۔ مثلاً

مغرب میں تعین

ا سو آدمی جاسوسی کرتے ہوئے ممالک مغرب میں گرفتار کئے گئے اور کہا جاتا ہے کہ اندازاً دس ہزار ماہر فن جاسوس اس کے معنے یہ ہیں کہ اسوقت بے اعتباریاں حد سے زیادہ بڑھ گئی ہیں اور موجودہ حلیف قوتوں کو بھی ایک

جس زمانہ میں ہو ... امریکہ کا پریسیہ

اس جگہ مختصراً یہ ذکر کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ جاسوسوں کی جماعت اپنے ملکوں کو اطلاعات پہونچانے کے لئے کیسے کیسے عجیب طریقے استعمال کرتی ہے۔

سوویٹ روس کے جاسوس اپنی خفیہ اطلاعات اُبلے ہوئے انڈوں کے ذریعہ سے روانہ کرتے ہوئے پائے گئے۔ یہ انڈے معمولی انڈوں کے ساتھ ٹوکروں میں رکھ کر روانہ کئے جاتے ہیں، لیکن منزلِ مقصود پر پہونچکر جب ان کا چھلکا علحدہ کیا جاتا تھا تو اندر منجمد سفیدی پر سیاہی مایل بھورے رنگ کی تحریر نظر آتی تھی۔ اول اول تو یہ انکے کسی طرح سمجھ میں نہ آیا کہ چھلکے کے نیچے تحریر کیونکر منقوش ہو سکی، لیکن بعد کو بہت تحقیق کے بعد دریافت ہوا کہ اگر شکر اور پھٹکری کے پانی سے چھلکے کے اوپر لکھدیا جائے تو اندر سفیدی تک پہونچکر ایک خاص رنگ اختیار کر لیتا ہے اور اوپر کوئی علامت تحریر کی نظر نہیں آتی۔

اس سے بھی زیادہ عجیب طریقہ یہ ہے کہ موزوں، سلے ہوئے کپڑوں اور کارچوب کئے ہوئے رومالوں کے ذریعہ سے پیغامات بھیجے جاتے ہیں۔ یہ پہلے سے طے ہو جاتا ہے کہ فلاں قسم کے آڑے ٹانکے یا پھول پتیاں اس مفہوم کو ظاہر کریں گے اور پھر انھیں مقررہ اصول کے مطابق چھوٹے بڑے آڑے ترچھے ٹانکے دیکھ کر مفہوم اخذ کر لیا جاتا ہے۔

انگلستان میں ایک ایسا شخص جاسوسی کی علت میں گرفتار کیا گیا جو پرانے ٹکٹوں کے جمع کرنے کا شایق تھا اور اس کے البم میں سوائے استعمالی ٹکٹوں کے اور کچھ نہ تھا۔ لیکن اسکی ترکیب یہ تھی کہ مختلف بندرگاہوں سے مختلف قسم کے ٹکٹ لفافہ میں بند کرکے اپنے ملک کو روانہ کیا کرتا تھا اور اس میں رمز یہ تھا کہ جس بندرگاہ سے خط پوست کیا جاتا تھا وہاں کے جہازوں کی تعداد اور ان کی قسموں کا پتہ ٹکٹوں کی تعداد اور قسموں سے لگایا جاتا تھا۔ چنانچہ ایک بار اس نے تین ٹکٹ مانٹی نگرو کے، دو پیرو کے اور چار جزیرۂ چلّی کے بھیجے، اس سے مطلب یہ تھا کہ فلاں بندرگاہ پر تین بڑے جنگی جہاز دو چھوٹے اور چار ہلکے کروزر موجود ہیں۔

دن کی روشنی میں تحت الاحمر (In-fra-red) شعاعوں کے ذریعہ سے میلوں تک خبر پہونچائی جا سکتی ہے۔ ان شعاعوں کو ایک خاص شیشے کے ذریعہ سے محسوس کرکے ان کی اطلاعات کو آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے۔ رات کے وقت چمنی کے اندر اس لمپ کو رکھکر ہوائی جہازوں کو بھی اطلاعات بہم پہونچائی جا سکتی ہیں۔

حال ہی میں جب جمعیت اقوام کے اجلاس جنیوا میں ہو رہے تھے اور جنگ چین و جاپان کے سلسلہ میں منچوریا کا قصہ در پیش تھا، تو جاپانی جاسوس ہوٹلوں کے ملازموں کو بڑا بڑا انعام دیکر ٹوکریوں کی ردی حاصل کرتے تھے اور اس طرح بہت سی خفیہ قرار دادیں انھیں معلوم ہو جاتی تھیں۔

ایک عورت کسی سفیر کے یہاں ملازم تھی اور اس کا کام کھڑکیوں کے شیشے وغیرہ صاف کرنا تھا، جس وقت وہ باہر جاتی تھی تو اسکے کپڑے وغیرہ اچھی طرح دیکھ لئے جاتے تھے، لیکن باوجود اس تمام احتیاط کے وہ سفیر کے یہاں کی بہت سی خبریں باہر پہونچا دیتی تھی۔ طریقہ یہ تھا کہ جب کھڑکی کو رومال سے صاف کرتی تھی تو دور کسی بلند جگہ پر ایک آدمی کھڑا ہو کر دیکھا کرتا تھا اور یہ ہاتھوں کی مختلف جنبشوں سے اطلاعات بہم پہونچایا کرتی تھی۔

گزشتہ جنگ عظیم کے دوران میں جرمن جاسوس اپنے ساتھیوں کو جو فرانس میں موجود تھے رسایل موسیقی کے ذریعہ سے اطلاعات

بہم پہونچاتے تھے۔ ان رسالوں میں صرف موسیقی کے نشانات ہوتے تھے، لیکن ان سے مدعا کچھ اور تھا۔ اس کا پتہ اس طرح چلا کہ ان میں سے ایک شخص کی ڈاک کی جانچ کی گئی اور جب یہ معلوم ہوا کہ اس کے پاس ہر ہفتہ جرمنی سے موسیقی کا ایک رسالہ آتا ہے تو شبہ پیدا ہوا اور آخر کار پتہ چلا کہ ہفتہ وار جو رسالہ بھیجا جاتا ہے اُس کا ٹائٹل تو ایک ہی ہوتا ہے، لیکن گیت ہمیشہ بدلا ہوا ہوتا ہے۔

ایک بار کوئی جاسوس گرفتار کیا گیا جو ایک نقاش کی حیثیت سے مختلف قسم کی تیتریاں پکڑ پکڑ کر انکی تصویریں بنایا کرتا تھا۔ یہ تیتریاں پکڑنے کے بہانے سے اونچے اونچے پہاڑوں پر پہونچ جاتا اور وہاں سے قلعوں کی اندرونی حالت اور ان کی جنگی طیاریوں کی اطلاع تیتریوں کے نقش و نگار کے ذریعہ سے اپنے ملک کو پہونچاتا تھا۔

جرمن جاسوسوں نے یہ ترکیب بھی کی تھی کہ بعض پیغامات مچھلیوں کے گلپھڑوں میں رکھدیتے تھے اور انھیں دریا کے بہاؤ پر چھوڑ دیتے تھے دوسری بندرگاہ پر ان مچھلیوں کو پکڑ کے ان اطلاعات کو حاصل کر لیا جاتا تھا۔

چمنیوں کے دُھوئیں کے ذریعہ سے بھی خفیہ اطلاعات پہونچائی جاتی ہیں۔ دھوئیں کی کمی زیادتی اور مختلف وقفوں سے ان کا نکلنا، خاص خاص اشاروں کو ظاہر کرتا ہے۔

نظر نہ آنے والی سیاہیوں میں (*Ammonia*) کا محلول خاص چیز ہے۔ اس سے جو عبارت لکھدی جاتی ہے وہ یوں تو نظر نہیں آتی لیکن فوق بنفشی شعاعیں ڈالنے سے فوراً نمودار ہو جاتی ہے۔

مکتوبات نیاز

کی کتابت و طباعت کا کام جنوری کے رسالہ کی وجہ سے بند ہو گیا تھا لیکن اب پھر شروع کر دیا گیا ہے اور اپریل تک اس کی اشاعت کی توقع کی جاتی ہے۔

جن حضرات کی پیشگی رقم وصول ہو گئی ہے وہ مطمئن رہیں کہ کتاب شایع ہوتے ہی ان کے نام روانہ کر دی جائے گی۔

بعض حضرات نے بغیر رقم بھیجے ہوئے صرف نام درج کرایا ہے، لیکن ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ محض نام درج کرا لینا رعایتی قیمت سے فائدہ اُٹھانے کا مستحق قرار نہیں دیتا۔ ضرورت ہے کہ دو روپیہ پیشگی رقم بھیجدی جائے۔ ورنہ اشاعت کے بعد ان کو تقریباً اس سے دو چند ادا کرنا پڑے گا۔

غالباً اس کے اظہار کرنے کی ضرورت نہیں کہ ادب اُردو میں یہ مجموعہ کیا چیز ہوگا اور اس سے محروم رہنا، اُردو کے اُس صنف انشار سے محروم رہنا ہوگا جس کی نظیر اس وقت تک پیش نہیں کی جا سکتی۔

منیجر نگار

ذوق کا مذہب

تھوڑے دن ہوئے، مجھے ایک خاص وجہ سے ذوق کے مذہب کے متعلق تجسس کی ضرورت پیش آئی۔ میں نے سب سے پہلے آب حیات سے استفادہ کیا۔ کیونکہ آزاد مرحوم سے زیادہ شیخ کا کوئی ارادتمند نہ تھا۔ اور آب حیات میں جس شرح و بسط سے انھوں نے اپنے اُستاد کے حالات تحریر فرمائے ہیں۔ اس سے بعض حلقوں میں تو یہ خیال پیدا ہو گیا ہے۔ کہ اس کتاب کی تصنیف کی علت غائی حضرت شیخ کی ذات اور شاعری کو اُجاگر کرنا ہے۔ مگر جب میں نے آب حیات کی ورق گردانی کی۔ تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ جب یہ سطور دیکھیں:۔

" فقرا اور بزرگان دین کے ساتھ انھیں ایسا اعتقاد تھا کہ اس کی کیفیت بیان نہیں ہو سکتی۔ علما اور اساتذۂ سلف کو ہمیشہ با ادب یاد کرتے تھے۔ اور کبھی ان پر طعن و تشنیع نہیں کرتے تھے۔ اس واسطے ان کے مذہب کا حال کسی کو نہ کھلا"۔ (صفحہ ۴۶۶)

مانا کہ ان کی صلح کل طبیعت کی وجہ سے "ان کے مذہب کا حال کسی کو نہ کھلا" مگر کیا یہ حال حضرت آزاد پر بھی نہ کھلا۔ کہ ان کا کیا مذہب ہے ان کا فرض تھا کہ اس باب میں اپنے علم کے مطابق لوگوں تک صحیح واقفیت پہونچا دیتے اور تذکرہ نگاری کا حق ادا فرماتے۔ بعینہ یہی الفاظ انھوں نے اپنے مرتبہ دیوان ذوق کے دیباچہ میں بھی لکھے ہیں۔ (صفحہ ۲۶)

اب اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ میں خود دیوان ذوق کو دیکھ کر فیصلہ کرتا۔ اگرچہ یہ طریقہ نہایت غیر یقینی اور شبہات سے پُر ہے۔ مگر چونکہ اسکے علاوہ کوئی اور ماخذ نہ تھا (یا کم از کم مجھے اس کا علم نہیں) اس لئے مجبوری تھی ــــ دیوان کھولتے ہی پہلی غزل میں یہ اشعار نظر آئے:۔

ہوا حمدِ خدا میں دل جو مصروف رقم میرا ــ الف الحمد کا سا بن گیا گویا قلم میرا

رہے نام محمد لب پہ یارب اول و آخر ــ اُلٹ جائے بوقتِ نزع جب سینہ میں دم میرا

محبت اہلِ بیتِ مصطفیٰ کی نور برحق ہے ــ کہ روشن ہو گیا دل مثلِ قندیلِ حرم میرا

دکھائی مجھ کو راہِ شرع اصحاب پیمبر نے ــ چراغِ راہ ہے اکرام اصحاب کرم میرا

کہیں شاہ نجف کے عشق میں دل میرا ڈوبا تھا ــ کہ ہے دُرِّ نجف ہو کر چمکتا دُرِّ یتیم میرا

رہیگا دانہ افشاں مزرع امید بخشش میں ــ غمِ آلِ نبی سے دانۂ ہر اشکِ نم میرا

شہِ بغداد کا خط غلامی ذوق رکھتا ہوں ــ نہ کیوں دل اس خطِ بغداد سے ہو جام جم میرا

اس ایک غزل میں جناب شیخ نے حمد و نعت کے دو شعروں کے علاوہ اہلِ بیت اور حضرت علی اور صحابہ کرام کی شان میں چار اشعار کہے ہیں۔ مقطع میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کا ذکر ہے اس سے مولانا آزاد کے مندرجہ صدر کلام کی تصدیق ہوتی ہے۔ کہ ان کو بزرگانِ دین سے اعتقاد اور وہ علماء سلف کا بہت ادب کرتے تھے۔

اہلِ بیت اور خصوصاً شہید کربلا کے متعلق انھوں نے بعض اور جگہ بھی لکھا ہے۔ اور ان کی محبت کو ذریعہ سعادت قرار دیا ہے فرماتے ہیں:۔

حُبِّ حسین ذوق وہ شے ہے کہ جس سے حُر ۔۔۔ تھا گرچہ اشقیا میں سعیدوں میں مل گیا

ایک رُباعی میں حضرت امام حسن اور امام حسین دونوں کا ذکر دیکھئے کس والہانہ انداز سے کرتے ہیں۔

سبطین نبی یعنی حسن اور حسین ۔۔۔ زہرا اور علی کے دونوں وہ نور العین
عینک ہے تماشائے دو عالم کے لئے ۔۔۔ اے ذوق لگا آنکھوں سے ان کے نعلین

ایک قصیدہ کو جو جناب سید عاشق نہال صاحب کی مدح میں تحریر فرمایا ہے، اپنے متعلق اس دعا پر ختم کیا ہے۔

نکلے بہ صبح حشر تو رنگ اس کا جوں شفق
ہو سرخ دوستی سے محمد کی آل کے

ان سب اشعار سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انھیں حضرت علی اور ان کے اوالعزم صاحبزادوں سے خاص وابستگی تھی اور ان کا رجحان بلاشبہ "تفضیلیت" کی طرف تھا۔ مگر جیسا کہ ان کے سرنامہ کی غزل سے عیاں ہے۔ انھیں غالی شیعوں کے مانند دوسرے صحابہ کبار سے کوئی عناد نہ تھا بلکہ وہ انھیں بھی عزت کی نگاہ سے دیکھتے اور حامیانِ اسلام سمجھتے تھے۔ ان کا مذہب وہی تھا جو عام اہلِ سنت کا مذہب ہے کہ وہ سب صحابۂ رسول کو ذکرِ خیر سے یاد کرتے ہیں۔ مگر اس میں صرف اتنا اضافہ تھا کہ وہ تفضیلی تھے انھیں حضرت علی سے خاص محبت نظر آتی ہے۔ بعینہٖ اسی طرح جیسے پچھلے دنوں حضور نظام دکن نے اپنے ایک اعلان میں اپنے مذہب کے متعلق بعض غلط فہمیوں کا ازالہ کرتے ہوئے فرمایا کہ میں حنفی سنی ہوں البتہ تفضیلیت سے ممتاز ہوں۔ حضرت ذوق بھی ایک رباعی میں حضرت علی کے متعلق لکھتے ہیں:۔

اعلیٰ ہے علی کی امامت کا مقام ۔۔۔ رکھتے ہیں خبر اس سے یہاں خاص نہ عام
جو لوگ صفِ اول میثاق میں تھے ۔۔۔ پوچھے کوئی ان سے کہ وہ کیسا تھا امام

اس کے باوجود وہ پہلے تینوں خلفاء اسلام کے حامیِ شریعت اور عابد و مرتاض ہونے کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔

رہے تا کام دینداروں کو احکام شریعت سے ۔۔۔ خوشی تا حاجیوں کو ہووے کعبہ کی زیارت سے
رہے تا عابدوں کو شوق محراب عبادت سے ۔۔۔ نمازِ اہلِ سنت تا ہو مسجد میں جماعت سے

ترا خطبہ میں ہو نام اور خطبہ زیر منبر ہو
ترا حامی ابوبکر و عمر، عثمان و حیدر ہو

اس سے ظاہر ہے کہ شیخ مرحوم کا عقیدہ دوسرے سُنی حضرات سے الگ نہیں، انھیں خلفائے اربعہ میں سے ہر ایک سے محبت تھی وہ سب کو ایک آنکھ سے دیکھتے اور ان کی خدماتِ دینیہ کی تعریف کرتے تھے۔ ہاں جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ انھیں حضرت علی سے ان کے زہد و عمل کے، شوہر زہرا اور حسنین کے والد بزرگوار ہونے کی وجہ سے خاص محبت تھی۔ مگر اس میں اتنا غلو نہ تھا کہ وہ دوسرے صحابہ کو غاصب قرار دے لگیں اور ان پر تبرا بازی شروع کر دیں۔ وہ حُبّ علی کو نور سے موسوم کرتے ہیں۔ مگر تبرہ کو اس نور میں ظلمت کی آمیزش سے کم نہیں سمجھتے چنانچہ فرماتے ہیں

تم بیٹھے بغل میں ہو رقیب دغلی کی ۔۔۔ کی گرم بغل ہم نے بھی گور بغلی کی

اے ذوق نہ کر نور میں آمیزشِ ظلمت ۔۔۔ کیا کام تبرہ کو محبت میں علی کی

الغرض میں نے دیوان ذوق کے مطالعہ سے یہ نتیجہ نکالا کہ حضرت ذوق شیعہ نہ تھے۔ جن لوگوں کو یہ شک گزرا ہے کہ ذوق شیعہ تھے۔ مگر بہادر شاہ کے سنّی ہونے کے سبب سے وہ کھل کر اپنی شیعیت کا اظہار نہیں کر سکتے تھے اس لئے انھوں نے تقیہ کیا۔ میرے خیال میں ان صاحبان کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ اس کی تائید میں ایک اور امر بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔

آزاد کے والد مولوی محمد باقر کے تعلقات شیخ مرحوم سے نہایت گہرے تھے اور آزاد ان کے ایسے شاگرد رشید پیدا ہوئے، کہ اگر وہ نہ ہوتے تو غالباً آج کوئی دیوان ذوق کا نام نہ جانتا۔ یہ ناممکن ہے۔ کہ اس خاندان سے ان کے معتقدات پوشیدہ رہے ہوں۔ اس لئے اگر اس پر بھی حضرت آزاد نے اپنے اُستاد کے حالات میں اس موضوع کو تشنہ چھوڑ دیا۔ تو اس کا کوئی خاص سبب ہونا چاہئے۔ دیوان ذوق کی ترتیب یا آبِ حیات کی تالیف کے وقت انھیں بہادر شاہ کی سیاست کا خوف نہ تھا کہ وہ تقیہ پر مجبور ہوتے۔ بس اس کا ایک ہی سبب ہو سکتا ہے کہ ان کے اُستاد کا عقیدہ ان کے عقیدہ سے مختلف تھا۔ جس کا اظہار انھیں ناپسند تھا۔ خاندانِ آزاد کی شیعیت سے کسی کو انکار نہیں۔ اگر ذوق بھی شیعہ ہوتے تو آزاد کے لئے مقامِ فخر تھا کہ انھیں بھی اپنا ہم نوا ظاہر کرتے۔ بہر حال اس باب میں ان کی خاموشی اور ایہام معنی خیز ضرور ہے۔

کیا آپ اس مسئلہ پر کچھ مزید روشنی ڈال سکتے ہیں۔ ممکن ہے کسی معاصر کے قول یا کسی اور ماخذ سے آپ اور واقفیت مہیا کر سکیں۔ والسلام

مالک رام (ایم۔ اے۔ ایل ایل بی)

(نگار) آپ نے جس انداز سے اس مسئلہ پر گفتگو کی ہے، اس سے یہ بات تو یقینی طور پر ثابت ہوتی ہے کہ ذوق کے عقائد مایل بہ تفضیلیت تھے، اور خلفاء ثلٰثہ کے سب و شتم کو پسند نہ کرتے تھے لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ وہ "حنفی" تھے اُصولاً درست نہیں۔

میں اس موقعہ پر مذہبی نقطۂ نظر سے کوئی بحث کرنا ضروری نہیں سمجھتا کہ حضرت علی کو افضل سمجھنے کا کیا مفہوم ہے اور محض عقیدۂ "افضلیت" ہی تشیع کے لئے کافی ہے یا نہیں، لیکن اس امر کے اظہار سے باز نہیں رہ سکتا کہ وہ شخص جو جناب امیر کی افضلیت کا قایل ہے لیکن خلفاء ثلٰثہ کے سب و شتم کو اچھا نہیں سمجھتا، اس کو بجائے حنفی تفضیلیہ کے

"شیعہ غیر تبرائی" کہنا زیادہ موزوں ہے۔

آپ کو دیوان کھولتے ہی جو غزل ذوق کی نظر پڑتی ہے، اس میں یقیناً صحابہ کا ذکر ہے، لیکن "خلفائے ثلثہ" کا تو نہیں صحابہ کی جماعت میں خلفاء کے علاوہ اور بھی تو بہت سے حضرات شامل تھے ـــــ رہ گیا "شہ بغداد" کا ذکر، سو ممکن ہے کہ وہ صرف بادشاہ کے خوش کرنے کے لئے ہو۔

رہا یہ امر کہ اگر ذوق شیعہ ہوتے تو آزاد ضرور اس کا اظہار کرتے، سو اس کی توجیہہ یہ ہو سکتی ہے کہ چونکہ ذوق، آزاد کی طرح کے غالی شیعہ نہ تھے اس لئے انھوں نے گوارا نہیں کیا کہ ایسے ضعیف الاعتقاد شیعہ کو "شیعہ" کہا جائے۔

بہرحال یہ وہ ایرادات ہیں جو آپ کے نتیجۂ تحقیقات پر وارد ہو سکتے ہیں۔ لیکن خود میرا ذاتی خیال یہی ہے کہ وہ شیعہ نہ تھے اور ان کی "تفضیلیت" محض تقلیدی یا روایتی بات تھی جو صوفیہ کے اثر سے ہندوستان کے اہل تسنن میں رائج ہوئی اور جس کا تعلق "اہل تشیع" کے عقیدۂ افضلیت علی سے کوئی نہیں ہے۔

باب الاستفسار

مہدوی جماعت اور امام مہدی

(جناب محمد ابراہیم صاحب - اعظم جاہی روڈ - حیدر آباد دکن)

یہاں حیدر آباد میں ایک جماعت مہدویین کے نام سے پائی جاتی ہے۔ براہ کرم مطلع فرمایئے کہ ان کی کیا اصلیت ہے اور کہاں کہاں پائی جاتی ہے۔ اسی کے ساتھ اس مسئلہ پر بھی روشنی ڈالئے کہ امام مہدی کا ظہور کیا حقیقت رکھتا ہے؟

(**نگار**) (۱) جونپور میں ایک صاحب سید محمد مہدی وسطویں صدی کے آخر میں پائے جاتے تھے اور یہ اپنے آپ کو "مہدی موعود" کہتے تھے ان کی یہ تبلیغ چونکہ گجرات میں شروع ہوئی تھی اس لئے احمد آباد و دیگر بلاد گجرات میں ان کے ارادتمند معقول تعداد میں پیدا ہو گئے۔ ان کے متبعین کا عقیدہ ہے کہ وہ حامل معجزات بھی تھے، یہاں تک کہ مُردوں کو زندہ کر سکتے تھے اور گونگے بہرے کو اچھا کر دیتے تھے۔

کچھ عرصہ تک تو یہ جماعت بغیر کسی روک ٹوک کے اپنے عقاید کا اعلان کرتی رہی، لیکن شاہ مظفر اول، والی گجرات نے سخت گرفت شروع کی اور ان میں سے بعض کو پکڑ کر قتل بھی کر دیا۔ اس کے بعد اورنگ زیب نے بھی جب وہ احمد آباد کا گورنر تھا ان کو سزائیں دیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان لوگوں نے تقیہ شروع کر دیا اور اب تک یہ لوگ اس کے عادی ہیں۔

اسی جماعت کے افراد بمبئی، دکن، سندھ، گجرات اور کہیں کہیں شمالی ہند میں بھی پائے جاتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ سید محمد مہدی، مہدی موعود اور آخری امام تھے۔ شادی و موت کے وقت ان کے یہاں خاص مراسم ادا کئے جاتے ہیں جو عام مسلمانوں سے علیحدہ ہیں۔

(۲) لفظ مہدی جس کے معنے "ہدایت یافتہ" کے ہیں، کلام مجید میں تو کہیں نہیں پایا جاتا، لیکن یوں احادیث و تاریخ میں کثرت سے نظر آتا ہے۔ لغوی معنی میں اس کا استعمال تو اکثر لوگوں پر ہوا ہے، چنانچہ خلفاء اربعہ کو بھی "الراشدون المہدیون" کے لقب سے یاد کیا گیا ہے اور اہلِ تسنن نے حضرت علی کا ذکر بھی "ہادیا و مہدیا" کے الفاظ سے کیا ہے۔ اسی طرح جریر نے حسان بن ثابت کو مہدی کے لقب سے پکارا اور امام حسین کو سلیمان "مہدی ابن مہدی" کہتا تھا۔ یہاں تک کہ خلفاء بنی امیہ کے نام کے ساتھ بھی اُن کے ہوا خواہوں نے مہدی کا لفظ

ضافہ کیا۔ الغرض لغوی معنی میں اظہار عزت و احترام کے لئے یہ لفظ بہت سے امراء و خلفاء کے لئے استعمال کیا گیا، لیکن مہدی موعود کو یا مہدی منتظر و اس سے کوئی واسطہ نہیں۔

یہ حیثیت سب سے پہلے جناب حسین کے قتل کے بعد محمد الحنفیہ کو دی گئی جو جناب امیر کے صاحبزادہ (دوسری بیوی سے) تھے — ان کو مختار ابی ابن عبید نے دعویدار خلافت کی حیثیت سے پیش کر کے "مہدی ابن الوصی" کے لقب سے مشہور کیا۔ ہر چند انھوں نے خود اپنے آپ کو اسکا اہل نہیں سمجھا، لیکن اس طرح ایک فرقہ کیسانیہ کی بنیاد ضرور پڑ گئی اور یہیں سے سلسلۂ امامت میں شیعی جماعت کے دو گروہ ہو گئے، ایک وہ جس نے محمد الحنفیہ کی امامت کو تسلیم کر کے انھیں مہدی منتظر سمجھا اور دوسرا اثنا عشری گروہ جو محمد الحنفیہ کی امامت کو اس لئے تسلیم نہیں کرتا کہ خاندان نبوت سے ان کو کوئی واسطہ نہ تھا۔ مہدی کا عقیدہ ان کے یہاں بھی ہے لیکن اس طرح کہ وہ چھپے ہوئے ہیں اور ابھی تک ظاہر نہیں ہوئے۔

چونکہ اس وقت دعویداران خلافت کی کمی نہ تھی اور نیم سیاسی و نیم مذہبی جماعتیں ابھر رہی تھیں اس لئے اپنی حقانیت کے ثابت کرنے کے لئے ان میں سے ہر ایک کوئی نہ کوئی بات ایسی پیش کرتی تھی جس کا تعلق فرمان رسول سے ہو اور اسی سلسلہ کی چیز ظہور مہدی کا بھی مسئلہ تھا۔

اہل تسنن کے یہاں ظہور مہدی کا عقیدہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا اور بخاری و مسلم میں کسی جگہ مہدی کا ذکر نہیں ہے۔ عقاید کی کتابوں میں بھی کسی جگہ اس سے بحث نہیں کی گئی، البتہ دجال کا ظہور اور نزول عیسیٰ کا بیان ضرور پایا جاتا ہے جس کا مہدی موعود سے کوئی تعلق نہیں۔

ابن خلدون نے تاریخ کے مقدمہ میں اس مسئلہ میں نہایت محققانہ گفتگو کی ہے اور اس نے ثابت کیا ہے کہ ابتدائی حدیث کی کتابوں میں اس قسم کی کوئی روایت نہیں پائی جاتی اور یہ خیال بعد کو پیدا ہو کر وضع احادیث کا سبب بنا۔ ابن خلدون نے ۲۴ احادیث اس موضوع کی جمع کر کے ان پر تنقید کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ ان میں سے کوئی ایک بھی ایسی نہیں ہے جس پر اعتماد کیا جائے۔

بعض روایات کی تفسیر سے جو حالات مہدی موعود کے معلوم ہوتے ہیں یہ ہیں کہ وہ آل فاطمہ سے ہوں گے، ان کا نام وہی ہوگا جو رسول کا ہے، اور ان کے باپ کا نام بھی وہی ہوگا جو رسول اللہ کے والد کا تھا، خُلق میں رسول اللہ کے مشابہ ہوں گے، چندیا کے بال صاف ہوں گے، ناک اونچی اور آگے کو جھکی ہوئی ہوگی جس وقت وہ ظاہر ہوں گے، دُنیا میں فتنہ و فساد پھیلا ہوگا یہانتک کہ اگر کوئی اللہ کا نام بھی زبان سے نکالے گا تو مار ڈالا جائے گا۔ یہ آکر فتنہ و فساد کو رفع کریں گے اللہ کا نام بلند کریں گے، عدل و انصاف کو رواج دیں گے اور مسلمانوں پر ایسا زمانہ خوشحالی کا آئے گا کہ اس سے قبل کبھی نہ آیا تھا، اگر کوئی شخص اُن سے کہیگا کہ "اے مہدی مجھے کچھ دو"، تو وہ اسکے دامن میں زر و دولت بکھیر دیں گے۔

یہ حالات احادیث میں نہیں ہیں بلکہ مفسرین احادیث نے اپنی طرف سے بڑھائے ہیں۔ الغرض اہل تسنن کے یہاں مہدی موعود کے ظہور کو تسلیم نہیں کیا جاتا البتہ اثنا عشری طبقہ اس کا قایل ہے اور اُن کی آمد کا منتظر۔

بات یہ ہے کہ پیشین گوئیوں کی جتنی احادیث ہیں وہ کسی طرح چنداں قابل لحاظ [illegible] کیونکہ "علم غیب" کے جاننے سے خود رسول اللہ [illegible] [illegible] کے لئے وضع کر لی گئی ہیں۔

برتھ کنٹرول یا ضبطِ تناسُل

(جناب عبدالحی صاحب۔ کٹرہ۔ الہ آباد)

اس وقت برتھ کنٹرول کے متعلق دنیا میں زیادہ زور دیا جارہا ہے کیا ہندوستان کے لئے اس پر عمل کرنا مناسب ہے اور شرعًا اس کو جائز قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس تحریک کا اصل مقصد کیا ہے؟

(نگار) جس حد تک جذبات یا عواطف کا تعلق ہے، انسان و حیوان دونوں میں زیادہ فرق نہیں، لیکن جو چیز انسان کو عام حیوانات سے جدا کرتی ہے وہ اس کی عقل و فراست ہے، یعنی ایک حیوان اس چیز سے معرّا ہے اور انسان کی تمام ترقیاں اسی سے وابستہ ہیں۔ پھر چونکہ یہ دور عقل و فراست کا دور ہے اس لئے جذبات و عواطف کے مقابلہ میں زیادہ تر اسی کے احکام پر عمل کیا جاتا ہے اور مسئلۂ "ضبط تناسل" بھی منجملہ اُن چند مسائل کے ہے جن میں جذبات پر عقل و مصلحت کو ترجیح دیجاتی ہے۔

اب مختصرًا موافق و مخالف دونوں جماعتوں کے دلایل بھی سُن لیجئے:۔

ضبط تناسل کے محرکین کی ایک دلیل تو یہ ہے کہ جس طرح انسان تمام خواہشات میں عقل کا پابند ہے، اسی طرح خواہش تناسل میں بھی اس کو مصالح معاشرت و تمدن کا پابند ہونا چاہئے۔ غذا کی خواہش انسان کی فطری خواہش ہے، لیکن وہ ہمیشہ اس امر کی احتیاط رکھتا ہے کہ نامناسب یا زیادہ غذا سے اس کی صحت کو نقصان نہ پہونچے، اسی طرح تناسُل کے باب میں بھی مصلحت خاندانی، صحت ذاتی، منشاءِ اقتصاد اور تربیت صحیحہ کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ اس وقت دنیا میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو ضعیف العقل ہیں، مجہول الاعضاء ہیں، اور نہایت خراب صحت رکھتے ہیں، اس لئے اگر ان کو افزایش نسل کے لئے آزاد چھوڑ دیا گیا تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ نوع انسانی میں بیکار یعنی افراد کا اضافہ کیا جاتا ہے اور اس سے دنیا کی اقتصادی حالت اور ملکی و ملی ترقی کو جتنا نقصان پہونچ سکتا ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔

تیسری دلیل یہ ہے کہ کرۂ زمین محدود مساحت رکھتا ہے اور انسان کا سلسلۂ تناسل غیر محدود ہے، اس لئے اگر ضبط تناسُل سے کام نہ لیا گیا تو ایک وقت آئیگا، جب کثرت آبادی سے (اور آبادی بھی وہ جس میں زیادہ حصہ ناکارہ افراد کا ہے) زمین پر آزادی سے سانس لینے کی جگہ باقی نہ رہیگی اور لامحالہ حرب و استعمار کے مصائب اور بڑھیں گے۔

چوتھی دلیل یہ ہے کہ کثرت تناسُل کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مزدور جماعت کے افراد بڑھیں گے، اس لئے لازمًا اُن میں تصادم و تزاحم پیدا ہوگا اُجرت میں کمی ہوگی اور معیشت و معاشرت خراب ہوکر تمدن کو سخت نقصان پہونچے گا، برخلاف اس کے اگر ان کی تعداد کم ہوگی تو

اُجرتیں بڑھیں گی اور ان کی معاشرت بلند ہو کر نظام تمدن پر اچھا اثر پڑے گا۔

مخالفین کی دلیل یہ ہے کہ ضبط تناسُل ارادۂ خداوندی اور منشار فطرت کے خلاف ہے اور اس حجت کو زیادہ تر اہل مذاہب پیش کرتے ہیں، کیونکہ انھیں کو افزائش نسل کا زیادہ شوق ہے اور اپنے جذبۂ شہوانی کو ضبط کرنے میں وہی سب سے زیادہ کمزور واقع ہوئے ہیں چنانچہ تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ جہاں کیتھولک عیسائیوں کی جماعت زیادہ ہے، وہاں بہ نسبت پروٹسٹنٹ عیسائیوں کے نسل زیادہ بڑھ رہی ہے۔

مادی علمار کا اعتراض اسباب عمرانی کی بناء پر یہ ہے کہ جن طبقوں میں اولاد کی کمی کی شکایت ہے وہ اونچے اور متوسط طبقے ہیں اور انھیں طبقوں پر ملک و قوم کی علمی و دماغی ترقیاں منحصر ہیں۔ لیکن حالت یہ ہے کہ ان طبقوں میں افراد کی کمی کو ہمیشہ طبقۂ عمال پورا کیا کرتا ہے یعنی رفتہ رفتہ نیچے طبقہ کے لوگ متوسط و اعلیٰ طبقہ تک پہونچ جاتے ہیں، اس لئے اگر اس جماعت میں ضبط تناسُل کا رواج ہوگیا تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ متوسط اور اعلیٰ طبقے دونوں آہستہ آہستہ کم ہو جائیں گے اور تمدنی و علمی ترقیوں کو سخت نقصان پہونچے گا۔

فرانس میں ایک زمانہ تک ضبط تناسُل کی اتنی احتیاط کی گئی کہ عرصہ تک اُن کی آبادی بجائے بڑھنے کے برابر گھٹتی رہی، برخلاف اسکے جرمنی نے افزائش نسل کی کوششیں برابر جاری رکھیں، نتیجہ یہ ہوا کہ فرانس نے اس خطرہ کو محسوس کیا اور آخر کار اس کو بھی ادھر توجہ ہوئی اور اُن خاندانوں کے وظائف مقرر کئے جن میں اولاد زیادہ ہوتی ہے۔

ایک امریکن خاتون مسز سانگر نے ضبط تناسُل کی ایک کانفرنس میں اہل امریکہ کو مخاطب کر کے کہا کہ:-

"اگر امریکہ دوسری قوموں کے لئے اپنے ملک کے دروازے اس لئے بند کرتا ہے کہ اُن کے امتزاج سے یہاں کی نسل خراب ہو جائے گی تو اسے یہ بھی توجہ کرنی چاہئے کہ خود ملک کے اندر ناقابل افراد کی زیادتی نہ ہو درانحالیکہ اس کا کوئی لحاظ نہیں کیا جاتا اور امریکہ میں بیماروں، مجرموں اور ناقص العقل لوگوں کی آبادی بڑھتی جارہی ہے۔"

اسی جلسہ میں انگریزوں کے ایک نمایندہ مسٹر بلانڈ نے کہا کہ:-

"مدنیت کا مستقبل دنیا کے مسئلہ آبادی حل کرنے پر موقوف ہے، یعنی یہ کہ ہم کو دنیا کی لغو و ناکارہ آبادی زہریلی گیس کے ذریعہ سے کم کرنا پڑے گی یا ضبط تناسُل سے۔ اگر آج کرۂ عطارد کا بسنے والا کوئی فرد کرۂ ارض پر آجائے تو وہ ہماری موجودہ خسارت کو دیکھ کر حیران رہجائے کہ کیسی قوم ہے جو ایک طرف نسل بھی بڑھاتی جاتی ہے اور دوسری طرف اُن کے ہلاک کرنے کی بھی فکر میں ہے۔"

اسوقت دنیا میں تقریبًا ایک ارب ۵۰ لاکھ نفوس پائے جاتے ہیں اور موجودہ پیداوار غذا کسی نہ کسی طرح ان کے لئے کافی ہو جاتی ہے لیکن اگر ازدیاد نسل کا یہی عالم رہا تو ایک صدی میں موجودہ آبادی دوچند سے زیادہ بڑھ جائے گی (کیونکہ ہر سال پندرہ ملین آبادی بڑھ رہی ہے) اور ضرورت ہوگی کہ کم از کم ۰۰ املین ایکڑ زمین اور قابل زراعت پیدا کی جائے، درانحالیکہ اس کا کسی طرح امکان نہیں، اس لئے لامحالہ اسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ قلت غذا، کثرت امراض اور تصادم باہمی کی وجہ سے مصائب دنیا زیادہ بڑھ جائیں گے۔ مسٹر ہارلڈ کاکس نے دوران تقریر میں ظاہر کیا کہ:

"اس تلخ حقیقت کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ سطح زمین بہت محدود ہے اور انسان کی قوت تناسل غیر محدود

اس لئے اگر نسل کشی کو کم نہ کیا گیا تو ایک دن وہ آئے گا جب انسان ایک ایک انچ جگہ کے لئے باہم کشت و خون پر مجبور ہوگا اور نظام تمدن درہم برہم ہو جائے گا۔"

بہرحال اس وقت متمدن دُنیا کا میلان زیادہ تر اسی طرف ہے کہ نسل انسانی کو بڑھنے سے روکا جائے اور صرف ایسے افراد کا اضافہ کیا جائے جو صحت جسم و عقل کے لحاظ سے دنیاوی ترقی میں معاون ثابت ہوں۔

ہندوستان میں بھی یہ تحریک روز افزوں ترقی کر رہی ہے اور ہر چند اس وقت تک کوئی عملی قدم تو اس طرف نہیں اُٹھایا گیا لیکن اس خیال کا پیدا ہو جانا ہی دلیل ہے اس امر کی کہ کسی نہ کسی وقت اس پر عمل ہو کر رہیگا۔ رہا اس امر کا فیصلہ کہ یہاں کے لئے یہ تحریک قابل عمل ہے یا نہیں، چنداں دشوار نہیں۔

یہ امر مسلم ہے کہ دُنیا میں جب کبھی کوئی انقلاب پیدا ہوا ہے، اس کا تعلق ہمیشہ ذہن انسانی سے رہا ہے نہ کہ جسم انسانی سے، یا دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ کام ہمیشہ "کیفیت و احساس" نے کیا ہے نہ کہ "مقدار و تعداد" نے ۔ اس لئے ظاہر ہے کہ کسی ملک میں ناکارہ افراد کی زیادتی کبھی باعث برکت نہیں ہو سکتی۔ بلکہ بجائے فائدہ کے اس سے مضرت پہونچتی ہے ۔

کیا اس حقیقت سے انکار ممکن ہے کہ اگر ہندوستان کی آبادی بجائے ۳۲ کروڑ کے صرف ۱۸ کروڑ ہوتی تو یہ ملک اس وقت تک اسی غلامی کی حالت میں پایا جاتا۔ یقیناً اس سے بہت قبل بیداری و قوت عمل پیدا ہو جاتی اور اتنے کثیر افراد کو کسی ایک مرکز پر لانے کی زحمت گوارا نہ کرنا پڑتی۔ پھر اسی کے ساتھ اقتصادی دشواریوں کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ ہندوستان کی سب سے بڑی لعنت یہی ہے کہ غریب و جاہل، بیمار و ضعیف بے عقل و معتوہ افراد میں برابر اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور عُسرت و افلاس اس حد تک پہونچ گیا ہے کہ اس کا چارہ بجز اس کے اور کوئی نہیں کہ فطرت پھر ان کو ہلاک کر ڈالے۔ اس لئے اگر افزائش نسل صرف اس لئے چاہی جاتی ہے کہ ہم بار بار اُن کی ہلاکت کا تماشہ دیکھتے رہیں تو کیا اس سے زیادہ مناسب یہ نہیں ہے کہ ابتدا ہی سے ہم اس کی احتیاط کریں اور آفرنیش و ہلاکت کے اس مسابقت میں بجائے فرشتۂ موت کے ساتھ دینے کے فرشتۂ امن و سکون کی راہ میں آسانیاں بہم پہونچائیں۔

تذکرۂ طوطیانِ ہند

کے نام سے شعر کہنے والی خواتین کا ایک تذکرہ شائع ہو رہا ہے، جس میں شروع سے اس وقت تک کی اُردو شعر کہنے والی عورتوں کے حالات اور کلام کے نمونے درج ہوں گے ۔

جو اصحاب اس قسم کا مواد دے سکیں براہ کرم جلد روانہ کر دیں کیونکہ تذکرہ پریس میں جا رہا ہے۔

سید تمکین کاظمی۔ عثمان پورہ۔ حیدر آباد دکن

محبت سے پہلے

ابھی اختر نہ تھا میں مبتلائے دردِ محبت میں
مگر پھر بھی تغیر ہو چلا تھا میری حالت میں

پسند آنے لگی تھیں پُرسکوں تنہائیاں مجھ کو
نہ بھاتی تھیں جہاں والوں کی بزم آرائیاں مجھکو

مجھے دنیا کے ہنگاموں سے اک وحشت سی ہوتی تھی
یہاں کے بے مزہ کاموں سے اِک وحشت سی ہوتی تھی

مگر آغوشِ فطرت میں عجب آرام ملتا تھا
مناظر کی محبت میں عجب آرام ملتا تھا

پہونچتا تھا میں پو پھٹنے سے پہلے روز دریا پر
نمودِ صبح کے منظر کو دیکھوں تاکہ جی بھر کر

فلک پر چودھویں کا چاند جب ہوتا تھا جلوہ گر
تو یہ جی چاہتا تھا باغ میں پھرتا رہوں شب بھر

بوقتِ شام جب شور و شغب معدوم ہوتا تھا
کوئی سرگوشیاں کرتا ہوا معلوم ہوتا تھا

میں یہ محسوس کرتا تھا کہ ساون کی سیہ راتیں
میرے دل کو سُنانا چاہتی ہیں راز کی باتیں

ہوائے گلستاں جب ناز سے اٹھلا کے چلتی تھی
تو قلب و روح میں اک دھیمی دھیمی آگ جلتی تھی

تڑپتا تھا میں قمری کی نوائے جانستاں سُنکر
کلیجہ تھام لیتا تھا صدائے "پی کہاں" سُنکر

ادائے مست سے جسوقت کوئل کوک اُٹھتی تھی!
تو اُس کے نشتریں نغموں سے دل میں ہوک اُٹھتی تھی

گھٹا گھِر گھِر کے آتی تھی تو ہر ہر رگ پھڑکتی تھی!
دلِ سرشار کے ارمانوں کی چھاتی دھڑکتی تھی

وہ ارماں کیا تھے، کیسے تھے یہ مجھکو بھی نہ تھا معلوم
نہ اُن کی ماہیت ظاہر، نہ اُن کا منتہا معلوم

تمناؤں کی اصلیت سمجھ ہی میں نہ آتی تھی
ان ارمانوں کی نوعیت سمجھ ہی میں نہ آتی تھی

یہ حالت تھی کہ میں آٹھوں پہر خاموش رہتا تھا
کسی گہری سہانی فکر میں مدہوش رہتا تھا

تصور کی فضاؤں میں رہا کرتا تھا میں ہر وقت
کسی دریا کی لہروں پر بہا کرتا تھا میں ہر وقت

بنائی تھیں تخیل نے کئی رنگین دنیائیں
کہ جن میں دل، دماغ اور روح عیشِ بیکراں پائیں

میں دن رات آہ! اک موہوم مستقبل میں رہتا تھا
اُسی موہوم مستقبل کے قصے دل سے کہتا تھا

چھپی ہوتی تھی غمگینی مرے رنگیں خیالوں میں
بھری ہوتی تھی رنگینی مرے غمگیں خیالوں میں

مزا آتا تھا بے حد عشق پُرخوں کے فسانوں میں
محبت کی حدیثوں میں جنوں کی داستانوں میں

غِنائی شاعری سے ہوگئی تھی گہری دلچسپی ہوئی پہلے، نہ ہو آیندہ اِتنی گہری دلچسپی
کوئی باجا بجاتا تھا تو دل میں درد ہوتا تھا رسیلے گیت گاتا تھا تو دل میں درد ہوتا تھا

ستاتی تھی مجھے جس طرح موسیقی، سُناؤں کیا
رلاتی تھی مجھے کس طرح موسیقی، بتاؤں کیا

حواس و ہوش پر وارفتگی سی چھائی رہتی تھی طبیعت پر شباب افروز مستی چھائی رہتی تھی
نشے میں چور سی رہنے لگی تھیں خوابناک آنکھیں چمکتی تھیں اُمنگوں کی ضیاء سے تابناک آنکھیں
مرے سینے میں تھی آباد حسیات کی دنیا! ہمیشہ مضطرب رہتی تھی یہ جذبات کی دنیا!
جوانی کا لہو میری رگوں میں گنگناتا تھا بہت پُر کیف لیکن ایک بہم گیت گاتا تھا

مجھے محسوس ہوتا تھا کہ آفت آنے والی ہے
محبت قہر بن کے روح پر چھا جانے والی ہے

اختر انصاری دہلوی

رقص

رقص کیا ہے؟ "دامنِ امکاں پہ نیرنگِ نشاط نغمۂ حسن و محبت کا مسلسل ارتباط"
رقص کیا ہے؟ جنبشوں میں داستانِ آرزو نرم و نازک لوچ میں پلٹی ہوئی سی گفتگو
رقص کیا ہے؟ شوق کا تحلیل ہونا لوچ میں جوشِ احساسات سے موتی پرونا لوچ میں
رقص کیا ہے؟ نرگسِ مخمور کی بیداریاں حسنِ خوابیدہ کی لذت کوشیاں۔ ہشیاریاں
رقص کیا ہے؟ جلوۂ تقدیس کی بیباکیاں داستانِ خامشی یا خامشی کی داستاں
رقص کیا ہے؟ پیکرِ حسن و لطافت کی ادا ہوش کے انداز میں تعلیمِ پیمانِ وفا
رقص کیا ہے؟ ایک نغمہ حسن میں ڈوبا ہوا انقلابِ سازِ ہستی کروٹیں لیتا ہوا
رقص کیا ہے؟ ایک تمہیدِ تماشائے بہار محفلِ اسرار میں تشہیرِ لیلائے بہار
عشوۂ و ناز و ادا کی شاعرانہ گفتگو یا نگاہِ نیم وا کی ملہمانہ گفتگو
خواہشوں کی بیقراری ولولوں کا اضطراب کسوتِ مینا میں گویا لرزشِ موجِ شراب
ساغرِ ہستی میں جیسے ارتعاشِ موجِ نور یا پیاماتِ الوہیت کا الہامی ظہور

شمیم بہلوری

"ہمت"

زندگی کی راہ سے انساں بھٹک جاتا ہے جب
منزلوں سے دور تر، گھبرا کے تھک جاتا ہے جب

اعتبارِ زندگی مشکل نظر آتا ہے جب
ذرہ ذرہ دشمن و قاتل نظر آتا ہے جب

جب خیالِ راحت و آرام ہوتا ہے گناہ
مانگتا ہے موت کے سائے میں انساں جب پناہ

خستہ کام آتا ہے جب ملاح ساحل کی طرف
شام کو جب لوٹتا ہے اپنی منزل کی طرف

جب ہوائیں ڈال دیتی ہیں اسے گرداب میں
موت کے ساماں نظر آتے ہیں موجِ آب میں

سب سے پہلے منحرف ہوتا ہے وہ تقدیر سے
کام پھر لیتا ہے اپنی "ہمت و تدبیر" سے

بادبانوں کو سنبھالے ـــ رُخ ہوا کا دیکھ کر
اور وہ سہمی ہوئی سی اپنی کشتی پر نظر

مست اپنی دُھن میں اور چپو چلانے سے غرض
اپنی اُس چھوٹی سی کشتی کو بچانے سے غرض

رفتہ رفتہ ـ جاں رُبا موجوں سے ٹکراتا ہوا
یعنی ساحل پر پہونچ جاتا ہے گھبرایا ہوا

"ہمت" ان جذبات کی بیداریوں کا نام ہے
منزلوں کو جن سے حاصل ایک "قربِ تام" ہے

"ہمت" ان بیتابیوں کی سرفرازی کا ہے رنگ
جن سے انسانوں کی "عقلِ تام" ہو جاتی ہے دنگ

"ہمت" ان بیداریوں کے خواب کی تعبیر ہے
"نصرتِ جاوید" جسکی "مستقل تفسیر" ہے

"ہمت" ان بکھرے ہوئے سے حوصلوں کا ہوش ہے
جن سے خود "رعنائی تقدیر" ہم آغوش ہے

"ہمت" ان کیفیتوں کا اجتماعِ خاص ہے
منحصر جن پر جہاں میں قسمتِ غوّاص ہے

"ہمت" اک انساں کے سر پہ جگمگاتا تاج ہے
ہمت انسانی تمدن کے لئے معراج ہے

"ہمت" اس اعلانِ آزادی کی اک تمہید ہے
جسکی ہر منزل میں پنہاں انبساطِ عید ہے

"ہمت" و "مردانگی" وابستہ ہیں اُس ذوق سے
جس کا افسانہ پڑھا کرتی ہیں قومیں شوق سے

"ہمت" ان بدمستیوں کا وہ "خیالِ خام" ہے
جن کا دنیا میں "رضا شاہ پہلوی" انجام ہے

"ہمت" اک تقدیرِ برگشتہ کا ہے واحد علاج
ورنہ کرلیں غیر قومیں آکے ہندوستان پہ راج

"ہمت" اس تکمیلِ خواہش کا ذریعہ ہے شمیم
جس کا احساں مانتی ہے آج تک "جنگِ عظیم"

شمیم نعمانی بیاوری

ساگر کے کنارے

مندر میں پجاری لگے ناقوس بجانے
وہ اُن کے بھجن پیارے وہ گیت اُنکے سہانے

تاریکیِ شب اوڑھ کے رخصت ہوا عصیاں
تقدیس کے جاری ہوئے ہر سمت ترانے

وہ چھاؤں میں تاروں کی وہ کھیتوں کے کنارے
دہقاں بھی بھیرویں میں لگا تان اُڑانے

کوئل نے کسی کنج سے کو کو کی صدا دی
مرغانِ چمن جاگ اُٹھے گانے لگے گانے

انگڑائیاں لیتا ہوا طوفانِ جوانی
ملتا ہوا آنکھیں اُٹھا فتنوں کو جگانے

کچھ لڑکیاں آنچل کو سمیٹے ہوئے بر میں
گگری لئے سر پر چلیں پانی کے بہانے

انگشتریِ حسن کے انمول سے نگینے
سرچشمے محبت کے مسرت کے خزانے

چلتی ہیں اس انداز سے دامن کو سنبھالے
صدقے ہوئی شوخی تو بلائیں لیں ادا نے

پانی میں لگی آگ پریشان ہے مچھلی
کچھ شعلہ بدن اُترے ہیں پانی میں نہانے

گہ شرم سے مُنھ اپنا چھپانا پسِ آنچل
گہ کھیلنا پانی سے وہ جھینپ اپنی مٹانے

تالاب پر افلاک کے گم گشتہ ستارے
آتے ہیں صبح ہوتے ہی ساگر کے کنارے

مخدوم محی الدین۔ بی اے عثمانیہ

جذبات فرخ بناری

پھر کوئی تسکین دہ آشفتہ سامانی نہ ہو
تو اگر سرگرمِ پرسشہائے پنہانی نہ ہو

عشق کو خود ترجمانِ عشق ہونا چاہیئے
ورنہ وہ آئینہ ہی کیا جس میں حیرانی نہ ہو

لوں ہر اک موجِ حوادث سے نیا درسِ حیات
زندگی گر وقفِ آلامِ گراں جانی نہ ہو

ویسے ہی صرفِ تحیر ہے نگاہِ امتیاز
یوں نقاب اُلٹو کہ جلووں میں فراوانی نہ ہو

ایک عالم ہے خریدارِ متاعِ نازِ دوست
اتنی بھی جنسِ گرانمایہ کی ارزانی نہ ہو

اے مصیبت دینے والے یوں مصیبت دے مجھے
جان پر چاہے بنے لیکن پریشانی نہ ہو

کیوں جنوں میں کوئی رسوا ہو گریباں پھاڑ کر
شغلِ بیکاری روادارِ پشیمانی نہ ہو

مد و جزرِ درد سے ٹھیری ہوئی ہے جانِ زار
میں تو مر جاؤں اگر گہوارہ جنبانی نہ ہو

کیوں فریبِ سادگی ہو نشترِ جانِ خیال
یوں ستم کیجے کہ احساسِ ستم رانی نہ ہو

خوگرِ بیداد ہوں فرخ ازل کے روز سے
ایسی مشکل ڈھونڈھتا ہوں جس میں آسانی نہ ہو

فرخ بناری

شاعر

ہو سکی جب مادیت سے نہ تفسیرِ جمال — ذہنِ فطرت میں ہوا تخلیقِ شاعر کا خیال
پہلے اُس کی روح کی تحقیق فرمائی گئی — پھر نوا و سوز سے تخلیق فرمائی گئی
پرتوِ روح القدس سے کر کے اُسکو فیضیاب — وحی اور الہام سے لبریز دیدی اک کتاب
اُس پہ اسرارِ حقیقت کر دئے فطرت نے فاش — عرش کی راہیں سب اُس پر کھول ڈالیں نے تلاش

"شاعر" آیا، کامیابِ منصبِ پیغمبری — محفلِ عالم میں لے کر ایک شمعِ رہبری
"شاعر" آیا ابر بنکر، گونجتا گاتا ہوا — مزرعِ ہستی پر اپنا سایہ پھیلاتا ہوا
"شاعر" آیا صورتِ جبریل پر تولے ہوئے — لب سے دل تک راستے الہام کے کھولے ہوئے
مادی دُنیا کو "شاعر" نے دیا درس و پیام — بھر گئی اُس کے پیام و درس سے دُنیا تمام

لیکن اے "شاعر" وہ تیری شان و عظمت کیا ہوئی — وہ بلندی، اور وہ پرواز و رفعت کیا ہوئی
کیا ہوا "شاعر" وہ تیرا منصبِ پیغمبری — قابلِ افسوس ہے تیری یہ بے بال و پری
اب تخیل ختم ہے تیرا چمن کی فصل تک — اب تری پرواز ہے محدود ہجر و وصل تک

ہوشیار اے شاعرِ خوابیدہ قسمت ہوشیار — ہے مٹانے کا ترے دورِ فلک کو انتظار
تیری فطرت کو زوال آئے کہیں ایسا نہ ہو — نام بھی دُنیا سے مٹ جائے کہیں ایسا نہ ہو
قعرِ پستی سے اُبھر آنے کا پھر سامان کر — جوش میں آ اور عالم میں بپا طوفان کر
دیکھ تیری قوم پھر تیرے لئے ہے بیقرار — پھر ہر اک محفل میں ہے نغموں کا تیرے انتظار

اپنی قوت، اپنے ذہن، اپنی نوا سے کام لے
قافلہ تیار ہے۔ بانگِ درا سے کام لے

نبی احمد (بریلوی)

پارسی اہلِ کتاب ہیں

حضرت زرد شت اپنے عہد کے برگزیدہ پیغمبر تھے

تمہید

ہزار سال قبل مسیح سے ابتک روئے زمین پر بے شمار تغیرات رونما ہوئے لیکن پارسی قوم کی تاریخ بجائے اس کے کہ دنیا کو اُسکی حقیقت کا علم ہوتا بدستور تاریکی کے پردہ میں پوشیدہ رہی،

دین زرتشت کے اُصول سمجھنے میں لوگوں کو جسقدر غلط فہمی ہوئی ہے اسقدر شاید ہی کسی اور مذہب کے سمجھنے میں ہوئی ہو۔ اس کا زیادہ قوی سبب یہ ہے کہ تمام وہ کتابیں جو اس مذہب کے متعلق معلومات پہونچانے میں معین ہوسکتی تھیں قدیم دار السلطنت ایران (استخر) کی غارتگری و تباہی کے وقت برباد ہو گئیں۔ علاوہ ازیں پیروان زرتشت کی طبیعت چونکہ تبلیغ سے ہمیشہ علٰحدہ رہی ہے اس لئے دیگر ممالک کے رہنے والے اس مذہب کے آئین و اُصول سے ناواقف رہے۔

مندرجۂ بالا اسباب کے ماتحت ایران کی قدیم و ابتدائی تاریخ کے متعلق ہمیں فردوسی کے شاہنامہ پر جو قدیم روایات کے حامل ہونے کی وجہ سے اس قدر مشہور و مستند ہے بھروسہ کرنا پڑتا ہے اور جہاں تک خالص تاریخی واقعات کا تعلق ہے ہمیں دیگر ممالک کے ادیب و مصنفین اور عرب مورخین کی تصانیف سے مدد لینی پڑتی ہے۔

مغربی مصنفین نے ایران اور اُس کے قدیم تمدن کے حالات قلمبند کرتے وقت ایرانیوں کے قدیم مذہب کا بھی کچھ ذکر کیا ہے ورنہ مشرق کے اہل قلم نے جن کی جبلّی عادت سوائے اپنے مذہب کے دوسرے مذاہب کا حال رقم کرنے سے گریز کرنے پر مجبور کرتی ہے اس قدیم مذہب زرتشت کا حال رقم کرنے سے ہمیشہ پرہیز کیا ہے۔

یہ امر حیرت انگیز ہے کہ زرتشتی مذہب جس کے پیرو اُنگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں اور جن کو اپنے وطن میں ایکہزار برس سے زاید عرصہ تک سکون و اطمینان نصیب نہ ہوا کیونکر قایم رہسکا۔ اس باب میں ڈی۔ مینانٹ کا خیال غالبًا صحیح ہے کہ[1] :-

"یہ مذہب باوجود گوناگوں مصائب کا مقابلہ کرنے کے ہنوز ایک مقررہ اُصول کا حامل ہے اور اس کے

---

[1] دائرۃ المعارف دین و اخلاق جلد ۹ صفحہ ۶۴۶ -

احکام اوامر و نواہی میں بہت توازن پایا جاتا ہے۔ اس مذہب کی سب سے نمایاں خصوصیت اپنے مذہبی
روایات کو قائم رکھنا ہے اور حقیقتاً یہ امر قابل ستایش ہے کہ یہ جماعت غیر مذہب والوں میں اس قدر
گھل مل کر رہنے کے باوجود اپنے خصوصیات کو محفوظ رکھ سکی اور باوجود اس کے کہ ان کے علما عبادت خانوں
کے اندر اس زبان میں عبادت کی تعلیم دیا کرتے تھے جس سے پارسی بالکل ناواقف و نابلد تھے یہ اپنے مذہب
کے اصول سے واقف اور اس پر استوار رہ سکے۔

تقریباً تمام مشرقی و مغربی مذاہب کے پیروؤں کا عموماً اور مسلمانوں کا خصوصاً یہ اعتقاد ہے کہ "پارسی" آتش پرست ہیں اور آگ ہی کو تمام عالم کا خالق جانتے ہیں۔ اکثر علمائے مغرب نے اس امر کی سعی کی کہ زرتشت کی زندگی و تعلیم کو تمام اتہامات و غلط فہمیوں سے پاک کر کے اصلی صورت میں منظر عام پر لائیں۔ لیکن باوجود ان قابل قدر کوششوں کے اب تک عوام کے خیال سے اس بدگمانی اور غلط فہمی کا ازالہ نہ ہو سکا۔ عام مسلمانوں کا بلکہ تعلیم یافتہ حضرات تک کا باستثنائے چند یہ خیال یقین کی حد تک پہونچ گیا ہے کہ زرتشتی یزدان پرست نہیں ہیں بلکہ آگ ہی کو اپنا رب و خالق تصور کرتے ہیں۔

اس ناچیز مقالہ کا ماخذ وہی کتب ہیں جو علما و مورخین کی کاوشوں کا نتیجہ ہیں اور اسی کے ساتھ اس بات کی بھی ہر امکانی کوشش کی گئی ہے کہ مسلم علما و فضلا کے اقوال سے خاص طور پر سند پیش کی جائے تاکہ مسلمان اس حقیقت کو جان لیں کہ حضرت زرتشت حقیقتاً پیغمبر تھے، ایک مصلح اعظم تھے جن کی تمام جد و جہد کا اصل مقصود یہی تھا کہ لوگ راہ راست اختیار کریں۔

دین زرتشتی جسے غلطی سے مذہب آتش پرستی بھی کہتے ہیں عام طور پر بت پرست مذاہب میں شمار کیا گیا ہے اور یزدان پرست مذاہب صرف تین شمار کئے جاتے ہیں۔ اسلام، نصرانیت اور یہودیت[1]۔ حالانکہ ان کے اعتقاد بھی قدیم بنی اسرائیل نصاریٰ اور مسلمانوں سے ملتے جلتے ہیں اور ان کا اصل اصول مذہب بھی یہی ہے کہ خدائے واحد جسم و جسمانیات سے منزہ ہے اور اُسے کوئی شخص کسی وقت دیکھ نہیں سکتا[2]۔ پس اس مخصوص عقیدہ میں زرتشتی مذہب نصرانیت سے جس میں تثلیث پر ایمان بھی شامل ہے یقیناً افضل و برتر ہے۔
مارخم بجا تحریر کرتے ہیں کہ:۔

"اس خیال میں کسی قسم کے شبہ کی گنجایش نہیں ہے کہ ذی فہم ایرانی خدائے وحدہٗ لاشریک کی پرستش
کیا کرتے تھے اور صدیوں تک ایسا ہی کرتے رہے اور یہ بات حد درجہ قابل ستایش ہے کہ تمام اقوام
عالم میں ایرانیوں ہی کی وہ قوم ہے جس نے کبھی کسی زمانہ میں کسی قسم کے خود ساختہ اصنام کی پرستش
نہیں کی"[3]

---

[1] مضامین ہاگ و میڈیا مصنفہ راگزن و اشعار قدیم ایران مصنفہ مولٹن [2] شرح زردشتی معتقد و ہلا و تاریخ پارسیاں مصنفہ کارکا
[3] تاریخ ایران صفحہ ۸۔

اس میں شک نہیں کہ پارسی آگ اور روشنی کی بے حد عزت کرتے ہیں لیکن کوئی شخص عام اس سے کہ وہ یہودی ہو، نصاریٰ یا مسلمان اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ خدا کی کوئی صورت نہیں ہے اور وہ سرچشمۂ نور ہے۔ انجیل میں مرقوم ہے کہ خداوند نے سب سے پہلے روشنی پیدا کی[1] اور خدا خود نور ہے[2]۔ علاوہ ازیں خدا آتش بر باد کنندہ ہے[3]۔ جنت کی وہ مخلوق جس کے سپرد یہوا کے تخت کو سنبھالے رہنا ہے مثل جلتی ہوئی آگ کے شعلہ کے ہے[4]۔ یہوا کو نذرو قربانی دینے کا ذریعہ آگ کو خیال کرتے تھے اسی لئے قانون موسوی کا شدید حکم تھا کہ قربان گاہ کے پاس آگ ہمیشہ روشن رہنی چاہئے[5]۔

اسی طرح قرآن حکیم میں خدا کو "نور الارض والسماوات" بتایا ہے[6]۔ آگ ہی کی تلاش میں جناب موسیٰ کو نبوت ملی[7]۔ وادی طور میں جب حضرت موسیٰ آگ کے قریب پہونچے تو ایک آواز سُنائی دی کہ "اے موسیٰ بلاشبہ میں تمھارا خدا ہوں اور یہ وادیِ مقدس ہے بس اپنے جوتوں کو اُتار دو[8]۔"

الغرض چونکہ آگ خداوند کریم کی پیدا کی ہوئی اشیاء میں نہایت جلیل القدر چیز ہے لہٰذا آگ کا قابل عزت ہونا ظاہر ہے۔

اُصول دین زرتشت سے ناواقفیت کا دوسرا نتیجہ یہ ہے کہ لوگ زرتشتیوں پر یہ الزام رکھتے ہیں کہ یہ دو خداؤں پر ایمان رکھتے ہیں اور خدا کی "دوئی" کے قائل ہیں۔ یعنی ایک خدا یزدان ہے جو نیکی کی جانب رہنمائی کرتا ہے اور دوسرا اہرمن جو بدی اور برائی کا مسبب ہے۔ ان میں سے ہر ایک اپنے معاملات میں خود مختار ہے اور ہر دو برابر کے شریک ہیں یا یوں کہئے کہ دو بادشاہ ہیں جو ایک ہی سلطنت پر انتظام کرتے ہیں لیکن ہر ایک کا طریق سلطنت جدا و مختلف ہے۔ ہم اس سلسلہ میں ڈاکٹر جیمس مولٹن کے خیالات پیش کرنا مناسب سمجھتے ہیں[9] موصوف لکھتے ہیں کہ :۔

> "نیکی اور بدی کا وجود زرتشت کے نزدیک بھی بالکل ایسا ہی ہے جیسا یہود، نصاریٰ اور مسلم کے نزدیک یعنی مذہب زردشت میں نیکی کا آخر میں غالب آنا اسی طرح پر مذکور ہے جیسا کہ انجیل و توارات میں البتہ یہ فرق ہے کہ زرتشت نے اس خیال کو اپنے مخصوص انداز میں ظاہر کیا ہے اور بتایا ہے کہ اولین دو روحوں میں سے ایک نے نیکی اختیار کی اور دوسری نے بدی۔ اور پھر ان دونوں میں ضد و اختلاف ہونے کے باعث جنگ شروع ہوئی جس کا اختتام اُسوقت ہوگا جب بدی اور اُس کے متعلقات بالکل فنا ہو جائینگے اس جنگ میں انسان کو بھی شرکت کرنا پڑیگی اور پاک زندگی، عبادت، راستی اور مسلسل جانفشانیوں کی اعانت سے بدی کی حکومت کا خاتمہ کرنا پڑیگا[10]۔ زردشت کی تعلیم یہ تھی کہ اہورامزدا ہر شئے کا تنہا خالق ہے

---

[1] باب اول سفر پیدائش آیۃ ۳۔ [2] کتاب اشعیا باب دہم، ایضاً ۸۔ [3] سفر تثنیم باب چہارم آیۃ ۲۴۔ [4] کتاب حزقیال نبی باب اول آیۃ [5] سفر لاویان۔ باب ششم آیۃ ۱۲۔ ۱۳۔ [6] سورۂ ۲۴۔ آیۃ ۳۵۔ اللہ نور السموات والارض۔ [7] سورۂ ۲۰ آیۃ ۱۲۔ [8] فلما اتیھا نودی موسیٰ انی الخ۔ [9] ملاحظہ ہو کتاب "ادیان و اشعار ایران" باب پنجم "تاریخ ایران" مؤلفہ ملکم صفحہ ۵۹ و مضمون بہ کتاب دائرۃ المعارف دین و اخلاق صفحہ ۸۶۔ [10] ان کلمات کو قرآن حکیم کے اُن آیات سے مطابق کیجئے سورۂ ۱۳ آیۃ ۲۲۔ سورۂ ۲۲ آیۃ ۹۶۔

لیکن جب وہ نیکی سی کوئی قوت خلق کرتا ہے تو خود بخود اس کی ضد یعنی بدی کی روح وجود میں آجاتی ہے[1] یہ خیال
عربی کی اس مشہور مثل سے بھی ظاہر ہے کہ ہر شئے اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے"۔[2]

قرآن شریف میں بھی ہدایت کی گئی ہے۔ انسان کو چاہئے نیک و بد میں تمیز کرے۔ یہ شیطان ہے جو برائی کی طرف لیجاتا ہے اور اس طرح پر بندوں کے امن و امان میں فرق ڈال دیتا ہے[3] الغرض اس تعلیم میں ہمیں آئین زرتشت اور دیگر انبیا کے اصول میں بہت کم فرق نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر وسٹ نے خوب لکھا ہے کہ:۔

"اس خیال کی تصدیق محال ہے کہ دین زرتشت میں مسیحیت سے زیادہ دوئی کی بو ہے"۔

حقیقت یہ ہے کہ مذہب زردشت لوگوں کے پرانے معتقدات کا مصلح تھا۔ آریا اکثر عناصر فطرت کو شخصی حیثیت دیکر "دیو" کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ اس لفظ کا ماخذ آریا لفظ "دیو" ہے جس کے معنی چمکنا ہے اور اسی لقب سے وید میں دیگر معبودوں کو یاد کیا گیا ہے[4] جس وقت مصلح اعظم زرتشت کی پیدائش ایران میں ہوئی اُسوقت اس سرزمین کا معیار روحانیت اس قدر پست ہو گیا تھا کہ بجائے خالق کی پرستش کرنے کے لوگ مختلف عناصر کی جو خود مخلوق تھے پرستش کیا کرتے تھے پس اس مصلحت و دور اندیشی کے ماتحت کہ واحد حقیقی و وحدانیت اپنی جگہ پر محفوظ رہ سکے زرتشت نے "دیو" کو بدی سے منسوب کر دیا اور اس طرح پر اوستا و دیگر پارسی مذہبی ادبیات میں یہ لفظ قایم رہا۔ وید مذہب نے دیو پرستی کو باقی رکھا۔ لیکن مذہب زرتشتی نے اس اہورا یعنی خدائے واحد کی پرستش کو رواج دیا۔ اہورا یا اسورا جیسے الفاظ وید میں بھی کئی جگہ اچھے معنوں میں استعمال کئے گئے ہیں۔ کہیں کہیں وید میں یہ الفاظ فرشتوں کا مفہوم بھی ادا کرتے ہیں۔ وید کے "اندرا"، کا ذکر "وندیداد" سلسلۂ شیاطین میں کیا گیا ہے۔ اور وید کے سورج دیوتا کا شمار "اوستا" میں فرشتوں کے ساتھ کیا گیا ہے۔ وید کے ایک اور معبود اریمن کا ذکر زرتشتی اعتقاد میں[5] اہرمن کے نام سے پایا جاتا ہے۔

(۲)

زردشت

آج سے سیکڑوں سال قبل جب مشرق میں انسان عناصر فطرت کی پرستش فرض سمجھ رہا تھا[6]۔ جب ہندوستان کے دیوتاؤں نے

---

[1] برائے مطابقت قرآن سورۂ ۹ آیۃ ۸۳ تا ۸۷۔ [2] علامہ غلام حسین کنتوری مرحوم نے اپنی کتاب انتصار الاسلام میں اس بحث پر کہ خدا کو نیکی اور بدی ہر دو کے پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی بڑی خوبصورتی و خوبی سے بحث کی ہے۔ [3] سورۂ ۷، آیۃ ۱۲ و ۲۶۔ [4] تعلیمات زردشت صفحہ ۴۲ و کتاب شرع مذہب زردشت مؤلفہ دھالا صفحہ ۷۔ [5] تاریخ ایران مصنفہ مارخم صفحہ ۵۴-۵۳۔ دین ایرانیان مولفہ ڈاکٹر ٹایل باب ہفتم و پانچ عظیم الشان سلطنتیں مصنفہ راولنسن جلد ۴ صفحہ ۹۶-۹۴۔ [6] ناسخ التواریخ حصۂ اول جلد اول۔ شرع مذہب زردشت۔ "میڈیا" مصنفہ راگوزن و کتاب زردشت پیغمبران ایران قدیم مصنفہ جیکسن۔

رشیوں پر الہام کے سلسلہ کو موقوف کر دیا تھا، جب یہودیت اصل اُصول سے علٰحدہ ہو چکی تھی۔ جب بودھ کے اصول "نروان" کی ترویج وجود میں نہ آئی تھی، جب دنیا میں عیسیٰ مریم کی ولادت نہ ہوئی تھی، جب صحرائے عرب زندگی و نجات کے سرچشمہ سے محروم تھا بلکہ یوں کہنا چاہئے جب کفر و ضلالت کا عالم میں دور دورہ تھا اور لوگ صراط مستقیم سے دور ہو کر ایک خضر کی ضرورت محسوس کر رہے تھے اُسوقت ایران کے ایک گوشہ سے ایسی روشنی نمودار ہوئی جس کا ظہور اس سے پیشتر عالم کے کسی حصّہ آب و گل پر اسقدر پر نور صورت میں نہ ہوا تھا جس وقت مغرب اور مشرق کے ممالک اُس دور حیات سے گزر رہے تھے جس کی تاریخ کا پتہ ہمیں نہیں ملتا اسوقت دریائے دُرجی (جو جبلِ جبر سے نکل کر بہتی تھی) کے کنارے ایک بستی موسومہ میڈیا آباد تھی اور اُسی مسعود بستی کے اقبالمند خاندان اسپتاما میں زردشت کی پیدائش ہوئی۔ زرتشت ابھی ماں کی گود ہی میں پرورش پا رہے تھے کہ لوگ احترام کا خراج آئندہ ہونے والے نبی کی خدمت میں بصورت محبت پیش کرنے لگے۔[1]

حضرت زرتشت کی تاریخ پیدائش کا صحیح اندازہ ابتک نہیں ہوسکا۔ علمائے مغرب و مشرق کو اختلاف ہے اور خود پارسی فضلاء تاریخ پیدائش کے متعلق متفق نظر نہیں آتے۔ لیکن باوجود تاریخ ولادت کے نامعلوم ہونے کے تمام مورخین و محققین زرتشت کی ایک تاریخی شخصیت ہونے کا اقرار کرتے ہیں اور کسی کو اُن کے وجود سے انکار نہیں ہے۔[2] عام طور پر بزرگوں کا اتفاق ہے کہ عہد زرتشت جناب مسیح کی پیدائش سے ایکہزار سال قبل کا زمانہ ہے۔ ڈاکٹر ہاگ رقمطراز ہیں کہ:۔

> "ہم کسی طرح پر بھی یہ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ زرتشت کو گزرے ہوئے حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے ایکہزار سال سے کم عرصہ ہوا ہے۔ اگر لوگ ایکہزار سال قبل پیدائش مسیح سے زائد بھی بتائیں تو بڑی حد تک صحیح ہونے کا گمان ہے"

زرتشت نامہ کے مشہور مصنف نے یونانی اور یہودی مصنفین کے بیانات کے علاوہ کونیفورم کے کتبوں کو بطور دلیل پیش کرتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ زرتشت کا زمانہ ۱۳۰۰ صدی قبل مسیح ہے اور کلائیگر کے خیال میں عہد زرتشت چودہ سو سال قبل پیدائش مسیح ہے۔

بہر حال اگر ہم مندرجۂ بالا مصنفین کے دلایل و بیانات کو غیر صحیح تصور کرلیں تو بھی سب سے قریب تاریخ ....

...... پانچ چھ سو سال قبل مسیح کی قرار پاتی ہے۔[3] چنانچہ پروفیسر ولیمس جیکسن کے خیال میں زرتشت کم از کم چھ سو سال قبل

---

[1] دایرۃ المعارف برطانیہ جلد ۲۸ نہم ایڈیشن۔ ملل و النحل مصنفہ شہرستانی۔ مجمل البلدان مؤلفۂ یاقوت میں مرقوم ہے کہ جائے پیدائش زرتشت شہر "اورمیہ" ہے۔ [2] مروج الذہب تالیف مسعودی صفحہ ۱۱۔ کتاب الفصل فی الملل والنحل مؤلفہ امام ابی محمد بن احمد بن حزم جلد اول صفحہ ۱۱۲۔ تاریخ الکامل مؤلفۂ ابن الاثیر۔ جلد اول صفحہ ۱۱۲۔ و ناسخ التواریخ حصّہ اول جلد اول صفحہ ۱۹ - ۱۲ ۵۔
[3] میڈیا مصنفہ راگزن فصل دوم۔ دایرۃ المعارف برطانیہ جلد ۲۸ و تاریخ ادبیات ایران مصنفۂ ایڈورڈ براؤن۔ جلد اول صفحہ ۲۹۔

پیدائش حضرت عیسیٰ گزرے ہیں اور اُن کا زمانہ گوتم بودھ سے تھوڑے ہی عرصہ قبل کا ہے۔

آریا اور ایرانی دونوں قومیں مناظر فطرت سے بے حد متاثر ہو رہی تھیں اور عناصر فطرت کی پرستش میں نہایت غلو سے کام لے رہی تھیں، اگر بودھ آریاؤں کے لئے مصلح ثابت ہوئے تو زرتشت ایرانیوں کے واسطے رہبر و رہنما بنے۔ اگر بودھ کی تعلیم کا خلاصہ دنیا سے کنارہ کشی اور سکون و خاموشی تھا تو زرتشت کا خلاصۂ تعلیم جد و جہد اصلاح و عمل اور پاکبازی تھا[1]۔ آج زرتشت کو محققین اُن انبیاء کی فہرست میں بھی سب سے پہلی جگہ دیتے ہیں جنھوں نے انسان اور خدا کے درمیان تعلقات کی تشریح کی۔ حضرت زرتشت کی ذات وہ اولین ذات ہے جس نے آریاؤں پر خدا کے وجود کو بوضاحت ظاہر کیا۔ اس جگہ ہم ربندر ناتھ ٹیگور کے خیالات کو جو انھوں نے اس سلسلہ میں ظاہر فرمائے ہیں نقل کرتے ہیں[2]، وہ لکھتے ہیں کہ:۔

"تاریخ ایران کا سب سے درخشاں باب وہ واقعہ ہے جب زرتشت نے مذہب کی اصلاح کی۔ اس امر سے شاید کسی کو انکار نہ ہوگا کہ جہاں تک ہمارے معلومات کا تعلق ہے زرتشت ہی پہلے شخص ہیں جنھوں نے مستقل طور پر اخلاقی مذہب کا راستہ بتا کر خدا کی وحدانیت کی وہ تبلیغ فرمائی جو نیکی کی اساس اولین ہے۔ قدیم مذاہب انسان کو اُن اُصول کا پابند رکھنا چاہتے تھے جن کا تعلق بیرونی تجربات و مشاہدات پر تھا.... زرتشت اُن انبیا میں تھے جنھوں نے انسان کو راہ آزادی دکھا کر نیک و بد کی تمیز میں آسانی فراہم کی اور مہمل رسوم کی بیجا پابندی سے چھٹکارا دلا کر مندروں اور معبدوں کے گورکھ دھندوں سے پاک کیا، بہت اولوالعزم نظر آتے ہیں۔"

لفظ زرتشت پر بہت سے علماء نے بحث و تحقیق کی ہے[3]۔ زرتشت کا تعلق کسی پست طبقہ سے نہ تھا۔ اُن کا خاندانی سلسلہ فریدوں شاہ ایران سے ملتا ہے جو پیشدادیان نسل سے متعلق تھا۔ ذیل میں ہم حضرت زرتشت کا نسب نامہ درج کرتے ہیں[4]:۔ زرتشت ابن پورشاسپا ابن پیتر سپ، ابن اُرغداسپ ابن ہیکاتسیو ابن کیخنش ابن پیتراسپ ابن آریجادُھرشن ابن ہردہر ابن اسپتاسن ابن ویدست ابن آیاظم ابن ایرک ابن دراس رو بو ابن مانش سہر۔

پورشاسپا اور دودھو دے پیارے فرزند زرتشت[5] کو جب وحی ہوئی کہ خدا کے بندوں کو صراط مستقیم کی طرف دعوت دیں، تو وہ اس پر آمادہ ہو گئے۔ اور انھوں نے صانع حقیقی کا راز جو ان پر بذریعہ الہام و وحی منکشف ہو رہا تھا عام مخلوق پر ظاہر کر دیا۔

---

[1] زردشت پیغمبر ایران مصنفہ پروفیسر ولیم جیکسن۔ [2] ملاحظہ فرمائیے رسالہ "وسوا بھارتی" اکتوبر ۱۹۲۳ء (رسالہ سہ ماہی)۔ [3] تاریخ پارسیان جلد دوم۔ "زردشت" مصنفہ جیکسن۔ عہد اوستا و زردشت مصنفہ گیگر و اسپیجل۔ دین ایرانیان باب نہم۔ [4] کتاب "زردشت" صفحہ ۱۹، عہد اوستا صفحہ ۱۰۔ مروج الذہب صفحہ ۱۱۰۔ ناسخ التواریخ۔ یہ سب کتب بوضاحت اس مسئلہ پر بحث کرتے اور نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ منوچہر خاندان پیشدادیان ایرانی سے تھا اور فریدوں کا جانشین تھا۔ [5] تاریخ پارسیان جلد ۲۔ ملل والنحل صفحہ ۱۸۵۔ دایرۃ المعارف دین و اخلاق جلد ۱۲ صفحہ ۸۶۲۔

زردشت کے ابتدائی حالات اور ان کی ابتدائی تبلیغی سرگرمیوں کا حال کتابوں سے کچھ نہیں معلوم ہوتا۔ اوستا سے محض اسقدر پتہ
متا ہے کہ بچپن میں وہ وطن کے کسی قریبی پہاڑ پر چلے جایا کرتے تھے اور وہیں بیٹھ کر غور و خوض میں مشغول رہتے تھے۔ اسی عالم میں ان پر
یک خاص کیفیت طاری ہوجاتی تھی[1]۔ ان پر تیس سال کی عمر میں وحی نازل ہوئی۔ اول اول انھوں نے اپنے دین کے اصول کی تبلیغ اپنے
سایوں میں کی اور جب کچھ لوگ اُن کے پیرو ہوچکے تو اُنھوں نے بلخ کا رُخ کیا جو ایران کا دارالسلطنت تھا اور جہاں گشتاسپ حکمران تھا
ربار شاہی میں پہونچکر زرتشت نے تمام امراء اور حاضرین دربار کے سامنے اپنے پیغام کی اصلیت اور نئے مذہب کے اُصول کی حقیقت کو
ابت کیا۔ اُس عقلمند بادشاہ نے اس نئے مذہب کی عظمت اور سچائی سے مطمئن ہوکر فوراً اس مذہب کو قبول کرلیا[2]۔ اور اکثر امرا بھی اس
نئے مذہب کی طرف مائل ہوگئے۔

جب گشتاسپ نے اس مذہب کو اختیار کرلیا تو دین زرتشتی، سلطنت کا مذہب ہوگیا اور عام تبلیغ شروع ہوگئی۔

فراشوشترا اور جاماسپا جو پیغمبر کے اولین شاگرد تھے ایران کے مختلف حصص میں زرتشت کے پیامبر اور مبلغ بنکر سیاحت کرنے
لگے۔ اور اکثر لوگوں نے اس نئے مذہب کو قبول کرلیا[3]۔ ہمیں یہ معلومات مقدس کتاب اوستا سے حاصل ہوئے ہیں لیکن زرتشت کی آخر
حصۂ عمر کی کارگزاریوں کے متعلق اوستا ساکت ہے۔ پہلوی ادبیات سے ہمیں اسقدر پتہ ملتا ہے کہ ۷۷ سال کی عمر میں ایک روز صبح کے وقت
جب زرتشت عبادت و نماز میں مشغول تھے بادشاہ ارجسپ کے ایک سپہ سالار نے جو اس دین زرتشتی سے متنفر تھا کسی تیز اوزار کو زرتشت
پر پھینک مارا اور وہی زخم پیغمبر کی موت کا باعث ہوا[4]۔

قاتل یعنی براترکش بھی زندہ نہ رہسکا کیونکہ زرتشت نے باوجود موت کی جانکنی میں مبتلا ہونے کے اپنی تسبیح کو اس پر پھینکا اور اسکے
پھندے میں اُسے اُلجھا کر مار ڈالا۔

حضرت زرتشت نے تین شادیاں کی تھیں اور اُن شادیوں سے کئی لڑکے اور لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ ان اولاد کے متعلق ہمیں اوستا اور
پہلوی ادبیات سے بہت کچھ معلومات حاصل ہوتے ہیں۔ گاتھا[5] کے ایک حصہ میں (یسنا ۵۳) حضرت زرتشت کی ایک صاحبزادی
موسومہ پوروچستا کے بیاہ کا حال جو پیغمبر کے ایک خاص شاگرد جاماسپا سے ہوا تھا مذکور ہے[6]۔ خود پیغمبر نے ہاوُوی سے شادی کی تھی۔
ہاوُوی کا باپ فروشسترا، زردشت کا شاگرد تھا اور اس مذہب کا مشہور مبلغ تھا۔ یاشت سے پتہ چلتا ہے کہ فروشسترا گشتاسپ کے

---

[1] یہی حال تقریباً تمام انبیا کا ہے۔ موسیٰ قبل درجۂ رسالت پر پہونچنے کے کوہ طور جاتے اور حضرت محمد مصطفیٰ کوہ حرا میں عبادت فرمایا کرتے تھے۔ [2] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: ابن الاثیر، تاریخ الکامل۔ مروج الذہب۔ تاریخ طبری کتاب الملل والنحل۔ دائرۃ المعارف برطانیہ دائرۃ المعارف دین و اخلاق۔ تاریخ ایران مصنفۂ مالکم۔ ناسخ التواریخ۔ دین ایرانیان مصنفۂ تائل۔ عہد اوستا و زردشت۔ شرع مذہب زردشت مصنفۂ مانکجی دھلا اور تاریخ پارسیان مصنف کارکا
[3] شرع مذہب زردشت اور ناسخ التواریخ۔ [4] تاریخ پارسیان جلد دوم۔ زردشت مصنفۂ جیکسن اور عہد اوستا مصنفۂ سنجو۔ [5] تاریخ پارسیان
اشعار قدیم ایران اور ناسخ التواریخ۔ [6] تالیفات مولٹن و مقالۂ گلڈنر (دائرۃ المعارف برطانیہ) و ناسخ التواریخ وغیرہ ملاحظہ فرمائیے۔ جو دُعا پیغمبر کی صاحبزادی نے
بوقت عروسی پڑھی تھی وہی دُعا ابتک ہر پارسی عروس برائے برکت پڑھا کرتی ہے۔

شاہی دربار کا ایک رکن تھا۔ گاتھا میں اُسے اس مذہب کا معروف معاون و مددگار بتایا گیا ہے۔ جیسا کہ ہر نئے مذہب کو اول اول مصائب کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے اُسی طرح دین زرتشتی کو بھی ابتدائی دور میں گوناگوں دقتوں سے دوچار ہونا پڑا۔ اس مذہب کا شدید مخالف دیو پرستوں کا فرقہ تھا۔ اِس فرقے نے اپنی تمام کوشش اس امر میں صرف کر دی کہ اس مذہب کی مقدس و پاکیزہ تعلیم کو جھوٹ اور غلط ثابت کرے لیکن فروشسترا اور جماسپا کی جدوجہد نے تمام مخالفتوں کا کامیابی سے مقابلہ کیا۔[1]

توران کے بادشاہ آرجاسپ نے جو اہورامزد کا پرستار نہ تھا، گشتاسپ کے خلاف جنگ کا اعلان کیا۔ گشتاسپ نے جو دین زرتشتی کا پیرو تھا بڑے جوش و خروش سے آرجاسپ کا مقابلہ کیا۔ آرجاسپ نے دو بار ایران پر فوج کشی کی۔ ایکبار ۶۰۱ء قبل مسیح[2] میں گشتاسپ کی فوج کو اسفندیار پسر گشتاسپ کی سپہ سالاری میں فتح حاصل ہوئی اور دوبارہ ۵۸۳ء قبل مسیح میں ہر چند ان فتوحات سے جو مسرت دین زرتشتی کے پیرووں کو ہوئی تھی وہ زرتشت کے قتل کے باعث رنج و ملال سے مبدل ہو گئی۔ تاہم اس مذہب کی تبلیغی رفتار پر کوئی اثر نہ پڑا اور بادشاہ ایردشیر کا نام ولایتی ممالک میں دین زرتشتی کی تبلیغ کے سلسلہ میں ہنوز زبان زد خلائق ہے۔ اخمینیوں نے دین زرتشتی کو ایران کا قومی مذہب قرار دیا۔ سیروس اور دارائے اعظم نے اور بھی ترقیاں کیں اور خصوصیت کے ساتھ ساسانیوں نے تو اس کا بہت ساتھ دیا۔

پروفیسر طاہر رضوی۔ ام۔ اے (مترجم) سید وجاہت حسین ام اے

مکتوبات نیاز

کی کتابت و طباعت کا کام جنوری کے رسالہ کی وجہ سے بند ہو گیا تھا لیکن اب پھر شروع کر دیا گیا ہے اور اپریل تک اس کی اشاعت کی توقع کی جاتی ہے۔

جن حضرات کی پیشگی رقم وصول ہو گئی ہے وہ مطمئن رہیں کہ کتاب شایع ہوتے ہی ان کے نام روانہ کر دی جائے گی۔

بعض حضرات نے بغیر رقم بھیجے ہوئے صرف نام درج کرایا ہے، لیکن ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ محض نام درج کرا لینا رعایتی قیمت سے فائدہ اُٹھانے کا مستحق قرار نہیں دیتا۔ ضرورت ہے کہ دو روپیہ پیشگی بھیجدیا جائے ـــ ورنہ اشاعت کے بعد ان کو تقریباً اس سے دوچند ادا کرنا پڑے گا۔

غالباً اس کے اظہار کرنے کی ضرورت نہیں کہ ادب اُردو میں یہ مجموعہ کیا چیز ہوگا اور اس سے محروم رہنا، اُردو کے اُس صنف انشا سے محروم رہنا ہوگا جس کی نظیر اس وقت تک پیش نہیں کی جاسکتی۔

منیجر نگار

[1] تاریخ پارسیان۔ میڈیا۔ نور ایران قدیم مصنفہ پیتہ والا۔ [2] زردشت مصنفہ جیکسن اور علم الاساطیر ایرانیان مؤلفہ کرنائی و تاریخ ایران مصنفہ مالکم و عہد اوستا

حقیقت

پہلا سین :-

آواز —— یہ جہنم نہیں ہو سکتا کیونکہ ایک آرام دہ، خوبصورت، کمانی دار کرسی پر بیٹھا ہوا ہوں ۔ بھلا ایسا آرام دوزخ میں کہاں نصیب ۔ (شک کے لہجہ میں) لیکن جنت میں ایسا گھر؟ ۔ میرا تو دم گھبرا رہا ہے —— اور یہ تنہائی —— معاذ اللہ —— ہو کا عالم ہے ۔ ایک آدمی بھی نہیں جس سے باتیں کر دل ۔

(گھر دفعتاً غائب ہو جاتا ہے اور ایک شخص سامنے کھڑا ہوا نظر آتا ہے)

روح —— (خوشی سے اُچھل کر) خدا کا شکر ہے کہ تم یہاں ہو —— میں سمجھتا ہوں کہ تم فرشتہ ہو ۔

خادم —— جی ہاں —— میں آپ کا خادم ہوں اور آپ کے احکام بجالانے کے لئے آپ کی خدمت میں بھیجا گیا ہوں ۔

روح —— مجھے بڑی مسرت ہوئی —— اچھا میاں، اگر میں تمھیں عبدل کے نام سے پکارا کروں تو تم کو برا تو نہیں معلوم ہوگا ۔ دنیا میں عبدل میرا بہت ہی پیارا خادم تھا ۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اُس نے مجھے یہاں اُس کا نعم البدل عنایت کر دیا ۔ (جواب میں شخص نے سر کو جھکا دیا) —— عجیب جگہ ہے ۔ میری اُمیدوں کے بالکل خلاف —— اچھا کیا یہ مکان میرے لئے ہے ؟ —— لیکن مکان آراستہ نہیں ہے ۔

خادم —— آپ کی خواہش کے مطابق فوراً آراستہ ہو سکتا ہے ۔

روح —— بغیر کچھ خرچ کئے ہوئے، جتنا قیمتی سامان میں چاہوں آ جائے گا ؟

خادم —— یقیناً جو آپ کا حکم ہوگا فوراً اس کی تعمیل کی جائے گی ۔

روح —— میں جو چیز چاہوں ؟

خادم —— سوائے چند مخصوص باتوں کے

روح —— وہ کونسی باتیں ہیں ؟

خادم —— رنج کا گزر یہاں نہیں ہے ۔ لہذا آپ کسی ایسی چیز کی خواہش نہیں کر سکتے جس سے خود آپ کو یا کسی اور کو رنج پہونچے اچھا اب آرائش کے متعلق حکم دیجئے ۔

روح —— میں فرانسیسی معاشرت پسند کرتا ہوں۔
خادم —— بہتر ہے، آپکو کھانا کھلانے کے بعد آپ کا مکان آپ کی خواہش کے مطابق آراستہ کر دوں گا
روح —— کھانا! —— میں تو بھول ہی گیا تھا —— میں بہت بھوکا ہوں —— جلدی لاؤ
خادم —— حضور کیا تناول فرمائیں گے ؟
روح —— یہ میں تمھارے اوپر چھوڑتا ہوں۔ جنت کا بہترین کھانا کھلاؤ۔ کیا میں یہاں سگریٹ پی سکتا ہوں ؟
خادم —— ضرور، ضرور —— یہ تو آپ کی خوشی پر منحصر ہے۔
روح —— ہاں بھائی، اس لعنت میں مدتوں سے گرفتار ہوں۔ اور باوجود اپنی انتہائی کوششوں کے یہ بُری عادت نہ چھوڑ سکا
خادم —— (ادب سے ملامت کرتے ہوئے) حضور کیسی باتیں کر رہے ہیں، یہ جنت ہے یہاں لعنت اور بُرائی کا کیا ذکر۔
روح —— ہاں میاں عجلت میں بھول گیا۔ معاف کرو۔ مجھے صرف نعمتوں کا ذکر کرنا چاہیے
خادم —— کھانا حاضر ہے حضور (دونوں جاتے ہیں)۔

دوسرا سین :-

(روح اور خادم دونوں ایک کمرہ میں داخل ہوتے ہیں۔ کمرہ فرانسیسی فیشن کے مطابق سجا ہوا ہے)

روح —— ایسا کھانا میں نے کبھی نہیں کھایا تھا اور سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہاں وقت بھی ضائع نہیں ہوتا۔
(سامان آرائش کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے)
ان پر کتنا خرچ ہوا ہوگا ؟
خادم —— صرف آپ کی ایک خواہش۔
روح —— ایک پیسہ بھی خرچ نہیں ہوا ؟
خادم —— حضور یہ دنیا کی طرح خرید و فروخت کی جگہ نہیں ہے خدا کے نیک بندوں کے لئے یہ خداوندی انعامات کی بارش کی جگہ ہے
روح —— تب تو اس کے معنی ہوئے کہ جس شخص کا جو جی چاہے بغیر کسی خرچ کے حاصل کر سکتا ہے
خادم —— اگر آپ روپیہ چاہتے ہیں تو میں چشم زدن میں آپ کی خدمت میں کروڑوں روپیہ پیش کر سکتا ہوں۔
روح —— لیکن روپیوں کی قدر و قیمت ہی کیا، جب اُن سے کوئی چیز خریدی نہیں جا سکتی ؟
خادم —— بعض لوگ جنت میں ایسے بھی آتے ہیں جو اپنے سامنے روپیہ کا ڈھیر لگا کر اُسے دیکھتے رہتے ہیں۔ اسی طرح بعض ایسی عورتیں بھی آتی ہیں جن کے سامنے جڑاؤ زیوروں اور جواہرات کا ڈھیر لگانا پڑتا ہے۔
روح —— لیکن جب ان چیزوں کا کوئی مصرف نہیں تو پھر ان کی فراہمی کا کیا سوال ہے۔

خادم —— حضور درست فرماتے ہیں، کیونکہ یہ شوق بھی صرف چند دن باقی رہتا ہے اور پھر خود بخود اس سے نفرت ہو جاتی ہے۔

روح —— مجھے یہاں ابد تک رہنا ہے لیکن ابد ایک لامتناہی مدت ہے،

خادم —— جی ہاں ہے تو یہی"

روح —— لیکن اتنا طویل زمانہ بیکار بیٹھے بیٹھے تو مجھ سے نہیں کٹیگا، میں کچھ کام کرنا چاہتا ہوں۔

خادم —— میں حضور کے سامنے کس قسم کا کام پیش کروں؟

روح —— پہلے یہ بتاؤ کہ یہاں کام ہی کیا ہے اور میں کیا کام کر سکتا ہوں؟

خادم —— یہاں کام سے مراد یہ ہے کہ آپ کے لئے آپ کی خواہش کے مطابق کسی ایسی تفریح کا سامان کروں جس سے آپ کو مسرت حاصل ہو۔

روح —— (گھبرا کر ہاتھ کے اشارے سے زور دیتے ہوئے) اس کو کام ہرگز نہیں کہا جا سکتا۔ کام اُس سعی کا نام ہے جس کا مقصد اپنی خواہش کے مطابق کچھ حاصل کرنا ہو۔ لیکن یہاں وہ بات حاصل نہیں ہے کیونکہ میں جو کچھ چاہتا ہوں وہ بغیر کوشش کے فوراً مل جاتی ہے۔ اس لئے میں کام کیونکر کر سکتا ہوں؟ اور کیا کر سکتا ہوں؟ —— کس مقصد کے لئے کوشش کروں —— نہ کوئی مقصد ہے —— نہ کوئی کام —— میں سمجھتا ہوں کہ میرے لئے سوائے اس کے کچھ نہیں یونہی بیکاری میں پڑے پڑے کڑھا کروں۔

خادم —— بالکل لاجواب دلائل ہیں حضور۔ کوئی شخص جواب نہیں دے سکتا۔ ہر فیلسوف جب جنت میں بھیجا جاتا ہے تو کم و بیش دس سال تک اسی طرح گفتگو کرتا ہے

روح —— (حیرت سے) اُس کے بعد وہ کیا کرتے ہیں؟

خادم —— جو دوسرے لوگ کرتے ہیں —— یعنی بجھ جاتے ہیں۔

روح —— دوسری جنتوں میں لوگ کیا کرتے ہیں؟ کیا وہاں بھی یہی حال ہے؟

خادم —— مجھے معلوم نہیں کیونکہ جب سے یہ جنت آباد ہوئی ہے مجھے دوسری جنتوں میں جانے کا موقعہ نہیں ملا۔

روح —— لیکن کیا اس سے قبل تم دوسری جنتوں میں بھی رہ چکے ہو؟

خادم —— ہاں آج سے چالیس ہزار برس قبل —— میرا خیال ہے کہ جسوقت شروع شروع آپ یہاں داخل ہوئے ہوں گے، تو چکرا گئے ہوں گے۔

روح —— ہاں۔ چند لمحوں تک تو میں بہت گھبرایا لیکن جب کُہر دور ہو گیا اور تم سامنے نظر آئے تو میری گھبراہٹ دور ہو گئی اور سمجھ گیا کہ یہ جنت ہے —— میں سمجھتا ہوں کہ میری مسرت کے لئے جو جو چیزیں تم مجھے دے چکے ہو اُسکے علاوہ اب یہاں اور کچھ نہیں ہے۔

خادم —— کیا چند نئی نئی کتابیں حاضر کروں ؟

روح —— کتابوں سے میں تنگ آ گیا ہوں ۔

خادم —— کیا دُنیا میں آپ کو سائنس سے ذوق تھا ؟

روح —— کیوں ؟

خادم —— جنت میں ایک پروفیسر صاحب تشریف لائے تھے ۔ میں اُن کی خدمت میں دیا گیا تھا ۔ جب کچھ دنوں بعد آپ کی طرح وہ بھی گھبرانے لگے تو میں نے عہدِ عتیق کے ایک جانور کی ہڈی اُن کی خدمت میں پیش کی ۔ یقین مانئے کہ خوشی کے مارے وہ ناچنے لگے ۔ اس کے بعد میں نے چند پتھر کے ٹکڑے ، اور ایک انوکھا آلہ اُن کے حوالہ کر دیا ۔ بس وہ چالیس سال اسی میں لگے رہے ۔

روح —— اُس کے بعد اُنھوں نے کیا کیا ؟

خادم —— چنے گئے ۔

روح —— نہیں ! اِن چیزوں سے مجھے کوئی خوشی حاصل نہیں ہو سکتی ۔

خادم —— اچھا حضور تو میں آپ کے سامنے ایک خوردبین پیش کرتا ہوں جو دنیا میں ۲۲۴۰ء میں ایجاد ہونے والی ہے اس خوردبین کے ذریعہ آپ دنیا والوں کے حالات بیٹھے بیٹھے معلوم کر سکیں گے ۔

روح —— (اُچھل کر) ہاں ! ہاں !! ضرور لاؤ ۔

تیسرا سین :-

روح —— عبدل ! عبدل !! عبدل !!!

خادم —— حاضر ہوا ، حضور (خادم سامنے نمودار ہوتا ہے)

روح —— میں اب بہت تنگ آ گیا ہوں ۔ میں یہاں اب ہرگز نہیں رہ سکتا ۔

خادم —— (منھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے) حضور ایسا نہ فرمائیے ۔ یہ جنت ہے ۔ یہاں سے آپ نہیں جا سکتے ۔

روح —— (بگڑ کر) واہ اچھی زبردستی ہے ۔ میں جنت میں نہیں رہنا چاہتا ۔ میں دوزخ میں جانا چاہتا ہوں ۔

خادم —— (طعن آمیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے) اور حضور ہیں کہاں ؟ ۔

روح —— (حیرت سے) اچھا تو ، تمھارا بھی یہی حال ہے (دونوں ، ہمدردی کے جوش میں ایک دوسرے سے لپٹ جاتے ہیں)

شبلی ابراہیمی - ایم - اے

مسئلہ خلافت وامامت

(ایک غیر مسلم کے نقطۂ نظر سے)

"محترم مدیر نگار"

میں ایک عرصہ سے نگار کا مطالعہ کر رہا ہوں اور اس میں کلام نہیں کہ مذہب کے باب میں آپ کی بے لاگ تنقیدوں سے میں نے کافی استفادہ کیا، لیکن افسوس ہے کہ اس وقت تک آپ نے اسی مسئلہ پر توجہ نہیں کی جو یقیناً جماعت اسلامی کے ہر فرد کی اولین توجہ چاہتا ہے۔

مجھے شیعہ، سنّی کسی جماعت سے تعلق نہیں ہے، کیونکہ میں ایک غیر مسلم شخص ہوں، لیکن میں نے ہمیشہ جماعت اسلامی کے ان دونوں فریقوں کے اختلاف کو نہایت افسوس کے ساتھ دیکھا ہے اور حیران ہوں کہ اس وقت تک کیوں اس تفریق کے مٹانے کی کوشش نہیں کی گئی۔

ممکن ہے، آپ نے مسئلہ خلافت وامامت پر صرف اس لئے اظہار خیال نہ کیا ہو کہ یہ نزاع عرصہ سے چلی آ رہی ہے اور اس کا فیصلہ دشوار ہے لیکن یہ ضرور نہیں کہ ماضی کا عقدۂ لانحل، مستقبل وحال میں بھی بدستور معمہ بنا رہے، بہرحال میں عرصہ سے متمنی تھا کہ آپ کے خیالات اس باب میں معلوم کروں اور اس کی تدبیر میں نے یہی مناسب سمجھی کہ خود اپنی تحقیق اس مسئلہ میں آپ کے سامنے پیش کروں اور اگر آپ کو اس سے اختلاف یا اتفاق ہو تو "باب المراسلۃ والمناظرۃ" کے وساطت سے جو غالباً اسی غرض کے ساتھ نگار میں قایم کیا گیا ہے آپ مجھے جواب دے سکیں۔

آپ دیکھیں گے کہ میں نے اس مقالہ کی طیاری میں تاریخ اسلامی کے اصل ماخذوں کو سامنے رکھا ہے اور اس لئے مجھے اُمید ہے کہ جواب دینے میں آپ بھی اس کا التزام رکھیں گے۔

"ہرنام"

فلسفہ کے کیسے کیسے عمیق مسائل طے ہو گئے، ریاضی کے کیسے کیسے دقیق نظریے حل ہو گئے، نظام بطلیموسی کی جگہ نظام فیثاغورس

نے لیلی۔ نیوٹن کے نظریہ کشش کو آئنسٹائن نے بدل کر رکھ دیا، لیکن خلافت کا جھگڑا مسلمانوں میں ساڑھے تیرہ سو برس گزرنے کے بعد بھی اسی طرح اُلجھا ہوا پڑا ہے۔

"خلافت" عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی "جانشینی یا قائم مقامی" کے ہیں۔ لیکن "جانشینی" کا مفہوم صرف جگہ پر بیٹھ جانا نہیں ہے، بلکہ "جانشینی"، بہ حیثیت عہدہ، بہ حیثیت منصب، بہ حیثیت فرائض، بہ حیثیت اخلاق و اعمال اور بہ حیثیت مراتب و کمال ہوا کرتی ہے۔ ایک شاعر کا جانشین شاعر، طبیب کا جانشین طبیب، قاضی کا جانشین قاضی اور وکیل کا جانشین وکیل ہوا کرتا ہے۔ ایک شاعر کی جگہ حکیم اور حکیم کی جگہ قاضی اور قاضی کی جگہ وکیل سے پُر نہیں ہو سکتی، بلکہ ایک ہی نوع میں صنف کے بدلنے سے بھی خصوصیت مختلف ہو جاتی ہے، یعنی خود شعرا میں مرثیہ گو کا جانشین غزلگو اور غزلگو کا جانشین قصیدہ گو نہیں سمجھا جا سکتا، چہ جائیکہ شاعر کی جگہ لوہار اور قاضی کی جگہ معمار صحیح جانشین سمجھا جائے۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ "خلیفہ" حقیقتاً وہ ہے جو اپنے کمالات و خصوصیات میں اپنے پیشرو کے کمالات و خصوصیات کا زیادہ سے زیادہ شریک و حصہ دار ہو۔

اس نظریہ کے ماتحت ہمارے سامنے قدرتاً یہ تنقیح پیش ہوتی ہے کہ آنحضرت کی حیثیت ایک دُنیاوی بادشاہ کی سی تھی یا ایک معلم روحانی کی ـــ یعنی آپ کا مقصود صرف حکومت و سلطنت قایم کرنا تھا یا لوگوں کے اخلاق کو درست کرنا ـــ ظاہر ہے کہ آپ کسی سلطنت کی بنیاد نہیں رکھ رہے تھے بلکہ ایک قوم بنا رہے تھے جو انسانیت و اخلاق کے جوہر سے آراستہ ہو اور بجائے تیغ و خنجر کے اپنی شرافتِ نفس سے روحانی حکومت دنیا میں قایم کرے۔

اگر آپ کی حیثیت صرف ایک دنیاوی بادشاہ کی سی ہوتی تو بیشک آپ کی خلافت کے لئے ایک بادشاہ ہونے کی حیثیت کافی تھی اور جو کوئی آپ کا خلیفہ مقرر کر دیا جاتا کسی کو اعتراض کا حق حاصل نہ تھا، لیکن اگر رسول کی حیثیت صرف ایک بادشاہ کی سی نہ تھی بلکہ معلم روحانی ہونے کی خصوصیت بھی آپ میں پائی جاتی تھی تو ہم کو دیکھنا چاہئے کہ اس باب میں افضلیت کس کو حاصل تھی۔

اب آیئے واقعات تاریخی پر ایک نگاہ ڈالکر دیکھیں کہ اُن کا فیصلہ اس مسئلہ میں کیا ہے۔

سب سے پہلے یہ دیکھنا ہے کہ اسلام قبول کرنے کی حیثیت سے کس کو کس پر تفوق حاصل ہے ـــ ظاہر ہے کہ منصب نبوت ملنے کے بعد آنحضرت نے اول اول اپنے ہی گھر والوں سے تبلیغ کی ابتدا کی ہوگی جن میں جناب خدیجہ اور علی کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ اور ـــ اگر اہل سنت کی مستند کتابوں پر اعتماد کیا جائے تو یہ فیصلہ دشوار نہیں کہ سب سے پہلے جس انسانی ہستی نے قبول کیا وہ جناب امیر کی ذات تھی ـــ شیخ الاسلام حافظ ابن حجر عقلانی، تقریب التہذیب[1] میں لکھتے ہیں کہ:۔

اُمرجح انہ اوّل من اسلم

یعنی ترجیح اسی امر کو ہے کہ سب سے پہلے آپ اسلام لائے ـــ اسی کتاب کے باب الالقاب[2] سے پتہ چلتا ہے کہ آپکا سابق الاسلام

---

[1] مطبوعہ دہلی صفحہ ۸۴ ـ [2] تقریب التہذیب صفحہ ۴۳۱

جتنا اتنا مشہور تھا کہ آپ کا خطاب ہی "سابق العرب" (اہل عرب میں سب سے پہلے اسلام لانے والا) قرار پاگیا تھا۔
واقعات سے بھی اس قول کی ترجیح ظاہر ہوتی ہے۔ عفیف کندی کی روایت ملاحظہ ہو:۔

"میں تاجر تھا، حج کے لئے کہ آیا تو عباس ابن عبدالمطلب کی ملاقات کو جایا کرتا تھا، ایک دن اُنکے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ میں نے دیکھا ایک شخص پردہ سے نکلا اور پھر عبادت میں مصروف ہوگیا۔ اس کے بعد ایک خاتون پردہ سے باہر آئیں اور اس شخص کے پیچھے کھڑی ہوگئیں، میں نے عباس سے پوچھا یہ کون ہیں۔ انھوں نے کہا کہ یہ محمد ابن عبداللہ ہیں۔ میں نے پوچھا وہ خاتون کون ہیں، کہا اُن کی بیوی خدیجہ بنت خویلد۔ تھوڑی دیر میں ایک کمسن نوعمر صاحبزادہ آیا اور وہ بھی ان کے ساتھ مصروفِ عبادت ہوگیا، میں نے پوچھا یہ کون ہیں؟ عباس نے کہا کہ یہ محمد کا چچازاد بھائی علی ہے۔ میں نے کہا یہ کرتے کیا ہیں۔ جواب ملا کہ نماز پڑھتے ہیں۔ محمد کا خیال ہے کہ خدا نے اُن کو پیغمبر بنایا ہے اور اس وقت تک سوائے اُن کی بیوی اور چچازاد بھائی کے کسی نے اُن کے اس دعویٰ کو تسلیم نہیں کیا، اس کے باوجود محمد کا خیال ہے کہ وہ قیصر و کسریٰ کے ممالک کو فتح کریں گے۔"

عفیفؓ اس واقعہ کے بعد اسلام لائے تھے اور کہا کرتے تھے کہ "لو کان رزقنی الاسلام یومئذٍ کنت ثانیاً مع علی ابن ابی طالب" (یعنی اگر اُس دن مجھے اسلام لانے کی توفیق ہوجاتی تو علی کے بعد دوسرا میں ہوتا)

اس روایت کو علامہ ابن عبدالبر قرطبی نے استیعاب[1] میں، ابن اثیر جزری نے اسد الغابہ[2] میں، ابن جریر طبری نے تاریخ کبیر[3] میں اور ابن اثیر نے کامل[4] میں درج کیا ہے۔

یہ اُس وقت کی بات ہے جب آنحضرت مخفی طور پر تبلیغ اسلام کر رہے تھے، لیکن جب آیت "وانذر عشیرتک الاقربین" نازل ہوئی اور ایک محدود دائرہ کے اندر تبلیغ کا حکم نازل ہوا تو آنحضرت نے اپنے اقرباء اور اولاد عبدالمطلب و ہاشم کو جمع کیا اور اُس وقت جو تقریر آپ نے کی وہ خلافت کے مسئلہ کو بھی ہمیشہ کے لئے حل کر گئی۔

ارشاد ہوتا ہے:۔

یا بنی عبدالمطلب انی والله ما اعلم شابا فی العرب جاء قومه بافضل مما قد جئتکم۔ انی قد جئتکم بخیر الدنیا والآخرة وقد امرنی الله تعالیٰ ان ادعوکم الیه فایکم یوازرنی علی هذا الامر علی ان یکون اخی، ووصیی وخلیفتی فیکم	اے فرزندانِ عبدالمطلب باور کرو کہ میں نہیں سمجھتا عرب کے کسی جوان نے اپنے قوم کے سامنے وہ تحفہ پیش کیا ہو جو میں تمھارے سامنے پیش کرتا ہوں۔ میں دُنیا اور آخرۃ کی بہتری کا تحفہ پیش کرتا ہوں اور خدا نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تمکو اس کی دعوت دوں۔ پھر کون ہے جو اس امر میں میرا ساتھ دے تاکہ وہی میرا بھائی، میرا ولی عہد اور میرا جانشین قرار پائے

[1] مطبوعۂ دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن جلد ۲ صفحہ ۲۲۵۔ [2] مطبوعۂ مصر جلد ۳ صفحہ ۴۱۴۔ [3] مطبوعۂ مصر جلد ۲ صفحہ ۲۱۲۔ [4] جلد ۲، صفحہ ۲۰

یہ سنکر مجمع پر خموشی کا عالم طاری ہوگیا اور کسی طرف سے کوئی آواز بلند نہ ہوئی۔ آخر کار علی اُٹھے اور بہ آواز بلند کہا کہ "انا یا نبی اللہ ان اکون وزیرک علیہ" (اے رسول اللہ میں آپ کی اعانت وہمدردی کے لئے آمادہ ہوں) ـــ حضرت نے یہ سُنکر فرمایا "ان ھذا اخی ووصیی وخلیفتی فیکم فاسمعوا لہ واطیعوہ" (دیکھو یہی میرا بھائی میرا ولی عہد اور میرا جانشین ہے، تم سب کو اس کی بات سننا اور اسکی اطاعت کرنا چاہیئے)[1]

چلئے معاہدہ ہوگیا، قرار داد پایۂ تکمیل کو پہونچگئی، علی نے بیعت کی، رسول نے بیعت لی۔ کس بات پر؟۔ نصرتِ اسلام پر۔ اعلاء کلمتہ الحق پر اور رسول نے اسی وقت اپنی خلافت وجانشینی کا مسئلہ بھی طے کردیا۔

بیشک اگر خود علی اس کے بعد اپنے فرائض میں کوتاہی کرتے، اپنے اقرارِ وفا میں ثابت قدم نہ ٹھہرتے، اپنے عہدِ نصرت میں کمزور ثابت ہوتے، تو یہ معاہدہ بھی کالعدم ہوجاتا، لیکن چونکہ آپ کی خدمات شروع سے اخیر تک یکساں طور پر اسی طرح قائم رہتی ہیں، اس لئے ہم کیونکر کہہ سکتے ہیں کہ وہ معاہدہ منسوخ ہوگیا ــــ اب آئیے اس کی تحقیق بھی کرلیں کہ آپ نے کسی وقت کوئی کمزوری تو نہیں دکھائی، اعانت رسول سے کبھی مُنھ تو نہیں پھیرا اور جو قول وقرار ایک بار ہوچکا تھا اُس سے کبھی انحراف تو نہیں کیا۔

یہ امر تاریخ اسلام کے دیکھنے والوں سے مخفی نہیں کہ جب رسول اللہ نے تبلیغ شروع کی تو کفار کی ایذا رسانیاں بڑھنے لگیں، آپ کے قتل کی تدبیریں ہونے لگیں اور مسلمانوں کی جماعت ہجرت پر آمادہ ہوگئی۔ چنانچہ حد یہ ہے کہ قبایل عرب میں سے چند لوگ اس بات پر تُل گئے کہ گھر کا محاصرہ کرکے آپ کو قتل کر ڈالیں ــــ ظاہر ہے کہ یہ وقت کتنا نازک تھا اور ایسے وقت میں مدد دینے والا کوئی نہیں ہوتا۔ لیکن رسول اللہ جانتے تھے کہ کون کام آنے والا ہے اس لئے آپ نے بلا تامل مکہ سے پوشیدہ طور پر ہجرت کا ارادہ کرلیا اور کفار کے عزائم کو ناکام بنانے کے لئے آپ نے جناب امیر سے یہ خیال ظاہر کرکے کہا کہ

"نم علیٰ فراشی واتشح ببردی الحضرمی الاخضر فنم فیہ"

(تم میرے بچھونے پر سو رہو اور میری سبز چادر اوڑھ کر لیٹ جاؤ)

کتنا سخت مرحلہ تھا، کیسی دشوار گزار منزل تھی، مگر وہ جو ایک بار جاں نثاری ووفاداری کا عہد وپیمان کرچکا تھا، اپنی جان دینے کے لئے چادر تان کر سو رہا اور رسالتمآب تشریف لے گئے۔

قسطلانی کہتا ہے:۔

"فکان اول من شری نفسہ" (وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے اپنی جان بیچ ڈالی)[2]

امام غزالی[3] لکھتے ہیں کہ اس موقعہ کے لئے علی کے باب میں یہ آیت نازل ہوئی:۔

"ومن الناس من یشری نفسہ ابتغاء مرضات اللہ" (ایسے بھی لوگ ہیں جو خدا کی مرضی پر اپنی جان بیچ ڈالتے ہیں)

---

[1] تاریخ کبیر طبری جلد ۲ صفحہ ۲۱۷ ـــ ابوالفداء مطبوعہ مصر جلد ۱ صفحہ ۱۱۶ ـــ کامل ابن اثیر جلد ۲ صفحہ ۲۲ ـــ لباب التاویل خازن بغدادی مطبوعہ مصر جلد ۵ صفحہ ۱۰۶ ـــ معالم التنزیل برحاشیہ تفسیر خازن مطبوعہ مصر جلد ۵ صفحہ ۱۰۵ ـــ [2] مواہب اللدنیہ جلد ۱ صفحہ ۸۷ ـــ [3] تاریخ خمیس جلد ۱ صفحہ ۳۶۷ ـــ

اکثر مورخین نے ظاہر کیا ہے کہ رسالتمآب اپنے بعد علی کو اس لئے چھوڑ گئے تھے کہ وہ لوگوں کی امانتیں جو رسول اللہ کے پاس تھیں واپس کردیں[1]۔

آنحضرت کی معیت میں حضرت ابوبکر تشریف لے گئے اور غار میں پناہ لی، جب کفار قریش تعاقب میں یہاں تک پہونچ گئے تو حضرت ابوبکر کو فکر دامنگیر ہوئی، آنحضرت نے فرمایا، رنج نہ کرو، خدا ہمارے ساتھ ہے۔ قرآن کی آیت یہ ہے:۔

ثانی اثنین اذ ھما فی الغار یقول لصاحبہ لا تحزن ان اللہ معنا، فانزل اللہ سکینتہ علیٰ رسولہٗ

وہ وقت جب ہمارا رسول اپنے ایک ساتھی کے ساتھ تھا اور وہ دونوں غار میں تھے۔ وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا غم نہ کرو خدا ہمارے ساتھ ہے۔ تو خدا نے اطمینان و سکون نازل کیا اپنے رسول پر۔

اس واقعہ پر حضرت ابوبکر کے فضایل بیان کئے جاتے ہیں کہ خدا نے انھیں "صاحب" کے لفظ سے یاد کیا اور آنحضرت نے (ان اللہ معنا) کہکر اپنے ساتھ ان کو بھی شامل کرلیا۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک شخص کو محض لفظ "صاحب" یا ساتھی سے یاد کرنا، بلکہ وہ واقعی ساتھ ہو، کس فضیلت کو ثابت کرتا ہے۔ لفظ (صاحب) تو ایسا ہے جس میں ہر شخص شامل ہوسکتا ہے، چنانچہ قرآن میں دوسری جگہ کسی مومن و غیر مومن کی گفتگو کے سلسلہ میں لفظ (صاحب) اسی طرح نظر آتا ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

اذ قال لہ صاحبہ وھو یحاورہ اکفرت بالذی خلقک الغرض، ایک ساتھی کو ساتھی کہنا کوئی ایسی بات نہیں جس سے کوئی فضیلت ظاہر ہو۔ رہا خدا کا ساتھ ہونا، سو ظاہر ہے کہ جس جگہ رسول ہوں گے، وہاں خدا کی معیت بھی ہوگی۔

غار والی آیت میں سب سے زیادہ قابل غور آخری الفاظ ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے صرف اپنے نبی پر اطمینان و سکون نازل کیا۔ یہاں اُن کے ساتھی کا ذکر بالکل نہیں ہے۔ اگر جناب ابوبکر کے اطمینان و سکون کو بھی ظاہر کرنا مقصود ہوتا تو (علیٰ رسولہ) کے بجائے (علیہما) ارشاد ہوتا۔

بہرحال اس واقعۂ ہجرت و واقعۂ غار میں حضرت علی نے جس ایثار و قربانی، جس دلیری و بےنفسی کا ثبوت دیا وہ بجائے خود اتنا اہم ہے کہ حضرت ابوبکر کی معیت وغیرہ کا کوئی سوال اس کے مقابلہ میں لایا ہی نہیں جاسکتا۔ اب اور آگے چلئے۔

مدینہ میں آنے کے بعد آنحضرت نے مہاجرین و انصار کے درمیان دوبارہ مواخاۃ قائم کی۔ ظاہر ہے کہ بھائی چارا انھیں دو آدمیوں میں قائم کیا جاتا ہے، جو اپنی خصوصیات مزاجی و عادات و خصایل کے لحاظ سے باہم گہرے بہت ملتے جلتے ہوں۔ چنانچہ اس سلسلہ میں حضرت ابوبکر کو حضرت عمر کے ساتھ بھائی بھائی قرار دیا، حضرت حمزہ کو زید ابن حارثہ کے ساتھ، حضرت عثمان کو عبدالرحمٰن ابن عوف کے ساتھ، زبیر کو ابن مسعود کے ساتھ، عبیدہ ابن حارث کو بلال کے ساتھ، مصعب ابن عمیر کو سعد ابن ابی وقاص کے ساتھ، ابوعبیدہ جراح کو سالم مولیٰ ابو حذیفہ

---

[1] ابوالفداء جلد ۱ صفحہ ۱۲۶ ـــ تاریخ خمیس دیار بکری جلد ۱ صفحہ ۲۲۶ ـــ کامل ابن اثیر جلد ۲ صفحہ ۳۹ ـــ مواہب لدنیہ قسطلانی مطبوعہ قسطنطنیہ جلد ۱ صفحہ ۸۰ ـــ

ے ساتھ اور سعید ابن زید کو طلحہ کے ساتھ۔ رہ گئے علی سو اُن کا بھائی چارا اپنے ساتھ کیا، چنانچہ مورخ ابوالفدا لکھتا ہے[1]:۔

خی رسول اللہ فاتخذ رسول اللہ علی ابن بی طالب اخا وکان علی یقول علی منبر الکوفۃ ایام لافتہ انا عبد اللہ و اخو رسول اللہ	آنحضرت نے اپنے اصحاب میں مواخات قرار دی اور علی ابن ابی طالب کو اپنا بھائی قرار دیا اور علی اپنے زمانۂ خلافت میں کوفہ کے منبر پر کہا کرتے تھے کہ میں خدا کا بندہ اور رسول خدا کا بھائی ہوں۔

سا دوسرے موقعہ پر بھی رسول اللہ نے سب کو ایک دوسرے کے ساتھ بھائی بنایا تھا اور علی کو اپنے ساتھ رکھا تھا۔ ابن عبدالبر نے تیعاب[2] میں لکھا ہے:۔

خی رسول اللہ بین المہاجرین ثم اخی بین المہاجرین الانصار وقال فی کل واحد منہما لعلی انت اخی فی الدنیا والآخرۃ[3]	رسول اللہ نے ایک بار مہاجرین کے درمیان مواخاۃ قائم کی اور دوسری بار مہاجرین و انصار کے درمیان اور ہر مرتبہ یہی فرمایا کہ علی دُنیا و آخرت میں میرا بھائی ہے۔

کا تذکرہ ابن حجر مکی کی صواعق[3] محرقہ اور تاریخ خمیس[4] میں بھی موجود ہے۔

مسجد نبوی کی صورت یہ تھی کہ اس کے چاروں طرف صحابہ کے گھر تھے اور ان سب کے دروازے مسجد میں کھلتے تھے، جس سے ں کی آمد و رفت صحن مسجد میں رہتی تھی۔ ایک مرتبہ آنحضرت نے حکم دیا کہ سب دروازے چُن دئے جائیں مگر علی کے مکان کا دروازہ نہ چنا جائے حکم پر لوگوں میں چہ میگوئیاں ہوئیں تو حضرت نے منبر پر جا کر فرمایا کہ "مجھے جو حکم خدا کی طرف سے ہوا وہ میں نے کیا، میں نے اپنی مرضی سے دروازوں کو بند کیا نہ اس کو کھلا رکھا[5]۔

اس واقعہ سے اور اس قسم کے بہت سے نظائر سے جن کا ذکر آگے آئے گا، معلوم ہوتا ہے کہ لوگ رسول کی ان توجہات کو جو جناب کے ساتھ تھیں، اچھی نگاہوں سے نہ دیکھتے تھے اور جناب رسالتمآب کی موجودگی میں بھی نکتہ چینی سے باز نہ آتے تھے، اور یہ وہ جذبات جن کا آہستہ آہستہ قوی ہونا ضروری تھا کیونکہ رسول اللہ کے الطاف جناب امیر پر برابر بڑھتے ہی جاتے تھے اور جیسا کہ آئندہ صفحات علوم ہوگا حضرت علی اپنی خصوصیات اخلاق کی وجہ سے رسول اللہ کے دل میں گھر کرتے ہی جا رہے تھے۔

سنہ ۲ھ میں اسلام کی سب سے پہلی لڑائی ہوئی جس کا نام جنگ بدر ہے۔ مسلمانوں کی تعداد کم تھی، ساز و سامان بھی نہ تھا اور رسول اللہ کے لئے میدان جنگ سے کچھ علحدہ ایک عرش بنا دیا گیا تھا تاکہ وہاں سے جنگ کی حالت کا مشاہدہ تے رہیں۔

---

[1] ریخ ابوالفدا جلد ۱ صفحہ ۱۲۷ — [2] مطبوعہ دائرۃ المعارف حیدر آباد جلد ۲ صفحہ ۴۷۳ — [3] مطبوعہ مصر صفحہ ۷۵ — [4] جلد ۱ صفحہ ۴۰۹ — [5] خصائص نسائی صفحہ ۳۷ — ریاض نضرہ جلد ۲ صفحہ ۱۹۲ —

حضرت ابوبکر نے اس لڑائی میں کوئی عملی حصہ نہیں لیا بلکہ وہیں عریش پر بیٹھے رہے[1]۔ حضرت عثمان اپنی بیوی کی علالت کی وجہ سے مدینہ ہی میں رہ گئے تھے[2]۔ میدان جنگ اُس دن چند آدمیوں کے ہاتھ رہا جن میں نمایاں حصہ رسول اللہ کے قرابتداروں نے لیا مثلاً حضرت حمزہ ابن عبدالمطلب، عبیدہ بن حارث اور حضرت علی۔ عبیدہ شہید ہوگئے اور حضرت علی کے ہاتھ سے بڑے بڑے کفار قتل ہوئے[3]۔

اسی سال حضرت نے علی ابن ابی طالب کو اپنی دامادی سے سرفراز کیا اور اپنی محبوب صاحبزادی حضرت فاطمہ زہرا کا عقد اُن سے کردیا۔ تاریخوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر دونوں نے خواستگاری کی مگر رسول اللہ نے کوئی جواب نہ دیا لیکن جب حضرت علی نے خواہش ظاہر کی تو حضرت نے فرمایا کہ:۔

قال امرنی ربی بذالک (اس کا تو مجھے خدا نے حکم دیا ہے)[4]

جب عقد ہوچکا تو حضرت نے جناب فاطمہ سے فرمایا:۔

اما ترضین یا فاطمۃ ان اللہ اختار من اھل الارض رجلین جعل احدھما اباک والاٰخر بعلک[5]	اے فاطمہ کیا تم اس بات سے خوش نہیں ہو کہ خدا نے تمام اہل زمین میں دو شخصوں کا انتخاب کیا جن میں سے ایک تو تمہارا باپ ہے اور دوسرا شوہر۔

اس سے ظاہر ہے کہ اس شادی کی بنیاد صرف ذاتی قرابت پر نہیں تھی بلکہ انتخاب الٰہی اور فضیلت ذاتی پر تھی۔ مصالح اسلامی کے لحاظ سے لڑکیاں لے لینا اور خود داماد بن جانا دوسری بات تھی، لیکن جب لڑکی دینے کا وقت آیا تو بڑے بڑے صحابہ کی خواہش رہ گئی اور حضرت علی کا انتخاب کیا گیا۔ یہ واقعہ ایسا تھا جس کا اثر زائل ہوجاتا۔ یاد رہ عمر بھر رہا، چنانچہ حضرت عمر فرماتے تھے۔

لقد اعطی علی ثلث خصال لان تکون لی خصلۃ منھن احب الیّ من حمر النعم فسئل ماھی قال تزوجہ ابنتہ[6]	علی کو تین باتیں ایسی حاصل ہوئیں کہ اگر ان میں سے ایک بھی حاصل ہوتی تو سرخ اونٹوں سے زیادہ مجھے محبوب ہوتیں۔ پوچھا وہ کیا ہیں۔ کہا کہ ایک تو یہی ہو کہ رسول کی صاحبزادی کا عقد اُن سے ہوا

---

[3] ۳ھ میں اُحد کی جنگ ہوئی، یہ وہ سخت و فیصلہ کن جنگ تھی۔ جسے قدرت کو مسلمانوں کے عزم و ثبات کی کسوٹی بنانا منظور تھا۔ اول اول حالات بہت اُمید افزا تھے، کیونکہ لشکر کفار کے علمدار طلحہ بن عثمان کو حضرت علی نے قتل کرکے دشمنوں کو شکست دیدی تھی

---

[1] طبری جلد ۲ صفحہ ۲۸۰۔ ابوالفدا جلد ۱ صفحہ ۱۲۸۔ تاریخ خمیس جلد ۱ صفحہ ۴۲۰۔ طبقات ابن سعد جلد ۲ صفحہ ۹۔ [2] طبری جلد ۳ صفحہ ۲۹۶ ابوالفدا جلد ۱ صفحہ ۱۲۹ تاریخ خمیس جلد ۱ صفحہ ۴۱۸۔ طبقات ابن سعد جلد ۲ صفحہ ۶۔ [3] تاریخ ابوالفدا جلد ۱ صفحہ ۱۲۹۔ [4] صواعق محرقہ مطبوعہ۔ تاریخ خمیس جلد ۱ صفحہ ۴۰۹۔ مواہب الدنیہ جلد ۱ صفحہ ۸۹۔ [5] ریاض نضرہ جلد ۲ صفحہ ۱۸۲۔ [6] صواعق محرقہ صفحہ ۷۸۔ تاریخ الخلفا سیوطی صفحہ ۱۱

جب کفار بھاگ کھڑے ہوئے اور مسلمان مال غنیمت لوٹنے کے لئے پس وپیش سے بے خبر ہوگئے تو خالد ابن ولید نے (جو اس وقت تک اسلام نہ لائے تھے) پشت کی طرف سے پھر حملہ کر دیا اور اس کا نتیجہ جو کچھ ہوا اُسے شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی زبان سے سن لیجئے، مدارج النبوۃ میں لکھتے ہیں کہ:۔

"مسلمانان رُو بہ ہزیمت آوردند وحضرت رسول را تنہا گزاشتند، حضرت در غضب آمد و عرق از پیشانی ہمایونش متقاطر گشت، دراں حالت نظر کرد علی ابن ابی طالب را کہ بر پہلوئے مبارکش ایستادہ است فرمود کہ تو چرا بہ برادران خود ملحق نہ گشتی یعنی فرار نہ کردی، علی گفت اکفر بعد الایمان ان لی بک اسوۃ یعنی آیا کافر شوم بعد از ایمان۔۔۔ بتحقیق کہ مرا بتو اقتدا است بایارانِ مفرور چہ سروکار باشد۔ دریں اثنا جمعے از کفار متوجہ آنحضرت شدند۔ آنحضرت فرمود "اے علی، مرا ازیں جمع نگہدار، وحق خدمت بجا آر کہ وقتِ نصرت ست۔ پس علی متوجہ آن قوم شد۔ چناں تیغ تمع نمود کہ جمعے کثیر بدوزخ فرستادند و باقی ماندگان متفرق گشتند۔ می گویند کہ دراں روز شانزدہ زخمہا بر تنِ مبارکِ جناب امیر رسیدند"

دل تھرّا آتا ہے، قلم لرزتا ہے۔ جی چاہتا ہے مورخوں کے منہ پر ہاتھ رکھ دوں، تاریخ کے صفحات سے ان حروف کو چھیل کر پھینک دوں۔ کس طرح دیکھوں اور کیونکر لکھوں کہ کس کس نے فرار کیا۔ لیکن حاکم کو کیا کروں، امام فخرالدین رازی، محمد ابن جریر طبری، ابن اثیر جزری، شیخ الاسلام سیوطی۔ ان سب کے بیانات کو کہاں لے جاؤں، جا بجا دیکھئے اُس طرف سے "رو بہ ہزیمت آوردند و رسول اللہ را تنہا گزاشتند" کی آواز آرہی ہے اور لطف یہ کہ ایک ایک کا نام بھی لکھ دیا ہے۔

تاریخ خمیس (جلد ۱ صفحہ ۴۸۵) میں ہے کہ حضرت ابوبکر فرماتے ہیں:۔

لمّا صرف الناس یوم اُحد عن رسول اللہ کنت اول من جاء النبیؐ

یعنی (جب لوگوں نے اُحد کے دن رسول اللہؐ سے روگردانی کی تو میں رسالتمآب کے پاس سب سے پہلے واپس آیا)

تفسیر جامع البیان ابن جریر طبری (جلد ۴ صفحہ ۹۶) میں لکھا ہے:۔

قال عمر لما کان یوم احد ھزمنا ففررت حتی صعدت الجبل فلقد رأیتنی انزو کانی اروی"

یعنی حضرت عمر نے فرمایا کہ "جب اُحد کے دن لوگوں نے شکست کھائی تو میں بھاگ کر پہاڑ پر چڑھ گیا وغیرہ وغیرہ"

امام فخرالدین رازی تفسیر کبیر (جلد ۳ صفحہ ۴۷) میں لکھتے ہیں:۔

ومن المنھزمین عمر الا انہ لم یکن فی اوائل المنھزمین ولم یبعد بل ثبت علی الجبل الی ان صعد النبی ومنھم ایضاً عثمان انھزم مع رجلین یقال لھما سعد وعقبۃ انھزموا حتی بلغوا موضعا بعیدا ثم رجعوا بعد ثلثۃ ایام فقال لھم النبی لقد ذھبتم فیھا عریضۃ

(فراریوں میں حضرت عمر بھی تھے مگر وہ سب سے پہلے فرار کرنے والوں میں نہ تھے اور بہت دور بھی نہ گئے تھے بلکہ پہاڑ پر چلے

گئے تھے۔ فراریوں میں سے حضرت عثمان بھی تھے اور سعد و عقبہ کے ساتھ فرار کیا تھا اور یہ لوگ بہت دور نکل گئے تھے اور جب تین دن کے بعد واپس آئے تو رسول اللہ نے فرمایا کہ تم لوگ بہت لمبے نکل گئے تھے)

حضرت عثمان مقام اعوص کے حدود تک پہونچ گئے تھے اور جب وہاں سے تین دن کے بعد واپس آئے تو رسول اللہ نے وہ فقرہ فرمایا جس کا ذکر اوپر آیا ہے[1]۔

خود قرآن مجید میں جو تصویر اس جنگ کی پیش کی گئی ہے وہ بھی ملاحظہ ہو۔ ارشاد ہوتا ہے:

اذ تصعدون ولا تلوون علی احد والرسول یدعوکم فی اخراکم	وہ وقت جب تم پہاڑ پر چڑھے چلے جارہے تھے اور مڑ کے بھی کسی کو نہ دیکھتے تھے اور رسول تمہیں پیچھے سے آواز دے رہا تھا۔

یہ تھا وہ عبرت انگیز سماں اور یہ تھا وہ امتحانِ محبت و صداقت جس میں سوائے ایک ذاتِ علی کے اور کوئی دوسرا کامیاب ثابت نہ ہوا۔ رسول اللہ کو اس دشکن طرز عمل کی وجہ سے اتنی بے اطمینانی پیدا ہوگئی تھی کہ آپ نے خاص جنگ پر قتل ہو جانے والوں کے متعلق فرمایا:۔ ھؤلاء اشھد علیھم یہ وہ ہیں جن کے ایمان کی گواہی میں دیتا ہوں)۔۔۔ حضرت ابوبکر نے کہا "یا رسول اللہ کیا ہم انکے بھائی نہیں ہیں اور کیا ہم اسلام نہیں لائے اور کیا ہم نے کبھی آپ کے ساتھ جہاد نہیں کیا"، حضرت نے فرمایا:۔ بلیٰ ولا ادری ما تحدثون بعدی" (ہاں، مگر کیا معلوم میرے بعد تم لوگ کیا کروگے)[2]

۵ھ میں جنگ خندق واقع ہوئی۔ اُحد کے واقعہ کا دھبا دامنوں پر موجود تھا اور اس کے چھڑانے کا یہ موقع اچھا تھا لیکن عمرابن عبدود کا ساپہادر پورے جوش و خروش سے مبارزطلبی کر رہا تھا، کس میں ہمت تھی کہ موت کے منھ میں چلا جائے۔ تاریخ کا بیان ہے کہ:۔ "طلب المبارزۃ والاصحاب ساکتون کانما علی رؤسھم الطیر لانھم کانوا یعلمون منہ وعتہ" (اس نے مقابل طلب کیا اور اصحاب تمام خاموش تھے گویا کہ ان کے سروں پر طایر بیٹھا ہوا ہے کیونکہ وہ سب اس کی شجاعت سے آگاہ تھے) جناب امیر پہلی ہی آواز میں اُٹھ کھڑے تھے، مگر رسول اللہ نے انھیں روک دیا، لیکن جب ہر طرف خاموشی چھائی رہی اور عمرابن عبدود کی لن ترانیاں بڑھنے لگیں تو رسول اللہ نے جناب امیر ہی کو اجازت دی اور آخر کار انھیں کی تلوار نے اس مہم کو بھی سر کیا[3]

۶ھ میں صلح حدیبیہ واقع ہوئی۔ رسول اللہ بظاہر حج کے ارادہ سے تشریف لے گئے تھے لیکن مشرکین کے سدراہ ہونے سے آپ نے حج کا ارادہ ترک فرما دیا اور چند شرائط کے ماتحت صلح کر لینا منظور فرما لیا۔۔۔ یہ شرطیں ایسی تھیں جن سے رسول اللہ کی

---

[1] طبری جلد ۳ صفحہ ۲۱ ۔۔۔ استیعاب جلد صفحہ ۵۰۲ ۔۔۔ تفسیر جامع البیان جلد ۴ صفحہ ۹۶ ۔۔۔ [2] موطا امام مالک مطبوعہ مطبع مجتبائی دہلی صفحہ ۱۷۴ ۔۔۔ [3] تاریخ خمیس جلد ۱ صفحہ ۵۴۷

طرف ایک قسم کی کمزوری کا پہلو نمایاں تھا۔ اس صلح نامہ کے کاتب حضرت علی تھے۔ لیکن دوسرے اصحاب کو اس موقعہ پر طرح طرح کے شکوک پیدا ہو گئے اور اس رواداری پر عجیب قسم کے غصہ و غم کی لہر دوڑ گئی۔

طبری نے لکھا ہے:۔

قد کان اصحاب رسول اللہ خرجوا وھم لا یشکون فی الفتح لرؤیا راٰھا رسول اللہ فلما راٰوا ما راٰوا من الصلح والرجوع وما تحمل علیہ رسول اللہ فی نفسہ دخل الناس من ذلک امر عظیم حتی کادوا ان یھلکوا۔[1]

جو صحابہ رسول اللہ کے ساتھ آئے تھے انھیں یقین تھا کہ فتح ہوگی کیونکہ رسول اللہ نے ایک خواب دیکھا تھا، لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ حضرت نے صلح کر لی ہے اور سخت شرائط منظور کرکے واپس جا رہے ہیں تو ان کے دلوں میں ایسی بُری باتیں پیدا ہوئیں کہ قریب تھا وہ ہلاکت یعنی گمراہی میں مبتلا ہو جائیں۔

حضرت عمر کا جو عالم تھا وہ خود اُن کی زبان سے سُنئے:۔

اتیت النبی فقلت الست نبی اللہ قال بلی قلت السنا علی الحق وعدونا علی الباطل، قال بلی۔ قلت فلم نعطی الدنیۃ فی دیننا اذاً قال انی رسول اللہ ولست اعصیہ وھو ناصری قلت اولیس کنت تحدثنا انا سنأتی البیت فنطوف بہ قال بلی افاخبرتک انا نأتیہ العام، قلت لا قال فانک اٰتیہ وتطوف بہ قال فاتیت ابا بکر فقلت یا ابا بکر الیس ھذا نبی اللہ حقاً قال بلی، قلت السنا علی الحق وعدونا علی الباطل قال بلی قلت فلم نعطی الدنیۃ فی دیننا اذاً قال ایھا الرجل انہ رسول اللہ ولیس یعصی ربہ وھو ناصرہ فاستمسک بغرزہ فو اللہ انہ علی الحق قلت الیس کان یحدثنا انا سنأتی البیت ونطوف بہ قال بلی افاخبرک انک تاتیہ العام قلت لا فقال فانک اٰتیہ فتطوف بہ[2]

میں رسول اللہ کے پاس آیا اور کہا کیا آپ رسول خدا نہیں ہیں کہا کیوں نہیں، میں نے کہا کیا ہم حق پر اور ہمارا دشمن ناحق پر نہیں ہے، فرمایا ہاں ایسا ہی ہے ۔ میں نے کہا پھر ہم اس ذلت کو کیوں برداشت کریں، فرمایا میں خدا کا رسول ہوں اور خدا کے حکم کے خلاف نہیں کرتا اور وہی میرا مددگار ہے ۔ میں نے کہا کیا آپ نے ہم سے نہیں کہا تھا کہ ہم عنقریب خانۂ کعبہ کی طرف جائیں گے اور اس کا طواف کریں گے ۔ حضرت نے فرمایا کیوں نہیں لیکن کیا میں نے اسی سال کے لئے کہا تھا میں نے کہا کہ یہ تو نہیں کہا تھا، فرمایا پھر میں اب بھی وہی کہتا ہوں کہ میں خانۂ کعبہ آؤں گا اور یہاں کا طواف کروں گا ۔۔۔۔ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد میں ابوبکر کے پاس گیا اور اُن سے بھی وہی گفتگو کی جو رسول اللہ سے کی تھی۔

---

[1] تاریخ طبری جلد ۳ صفحہ ۷۹ ۔ [2] مواہب لدنیہ قسطلانی جلد ا صفحہ ۱۳۱ ۔

طبری کی روایت میں آپ کا پہلے حضرت ابوبکر کے پاس اور پھر آنحضرت کے پاس جا کر سوال وجواب کرنا تحریر ہے۔ تاریخ خمیس (جلد ۲ صفحہ ۴۲) میں ہے کہ حضرت عمر نے کہا کہ:۔

واللہ ما شککت منذ اسلمت الا یومئذٍ (جب سے میں اسلام لایا کبھی مجھے شک نہیں ہوا، جیسا اُس دن ہوا)

یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت عمر فرماتے تھے "کہ میں نے اس جسارت کے کفارہ میں بہت نمازیں پڑھیں اور روزے ادا کئے"۔

الغرض صلح حدیبیہ کی وجہ سے صحابہ رسول اللہ سے اس قدر خفا ہو گئے تھے کہ جب صلح کے بعد رسول اللہ نے اپنے اصحاب[۱] سے فرمایا کہ "قوموا، فانحروا ثم احلقوا"۔ (اٹھو قربانیاں کرو اور سر منڈواؤ) تو ان میں سے ایک بھی آمادہ نہ ہوا، یہاں تک کہ حضرت نے تین مرتبہ فرمایا اور جب اس کے بعد بھی کسی نے تعمیل حکم نہ کی تو حضرت کبیدہ خاطر ہو کر حضرت ام سلمہ کے خیمہ میں تشریف لے گئے[۲]

جب رسول اللہ قربانی کرنے کے بعد سر منڈوا چکے تو لوگوں نے بادلِ ناخواستہ خود بھی قربانیاں شروع کیں، یہ "بادلِ ناخواستہ" کا حال ابن عباس کی روایت ذیل سے معلوم ہو سکتا ہے۔

حلق رجال یوم الحدیبیة وقصر آخرون فقال رسول اللہ یرحم اللہ المحلقین، قالوا والمقصرین یا رسول اللہ قال یرحم المحلقین قالوا والمقصرین یا رسول اللہ قال یرحم المحلقین قالوا یا رسول اللہ والمقصرین قال والمقصرین قالوا یا رسول اللہ فلم ظاهرت الترحم للمحلقین دون المقصرین قال لانهم لم یشکّو

کچھ لوگوں نے حدیبیہ کے دن سر منڈوایا اور بعض نے بال ترشوا لئے رسول اللہ نے فرمایا سر منڈوانے والوں پر خدا رحمت کرے لوگوں نے کہا اور بال ترشوانے والوں پر، آپ نے پھر وہی کہا۔ آخر تیسری مرتبہ کہا کہ بال ترشوانے والوں پر بھی رحمت ہو، لوگوں نے پوچھا کہ آپ نے اُن کو کیوں ترجیح دی، فرمایا کہ انھوں نے شک نہیں کیا تھا[۳]۔

محمد ابن سعد کاتب واقدی کی روایت ہے کہ حضرت عثمان اور ابوقتادہ نے سر نہیں منڈوایا تھا[۴]۔

ھ میں خیبر کی مہم درپیش ہوئی۔ اتفاق سے جناب امیر کی آنکھیں آشوب کر آئی تھیں اور آپ مدینہ ہی میں رہ گئے تھے۔ خیبر کے قلعوں میں جو سب سے زیادہ مضبوط قلعہ تھا وہ دشمن کا مرکز تھا۔

تین روز تک متواتر حضرت ابوبکر اور حضرت عمر پرچم اسلام لیکر تشریف لے گئے، لیکن ہر بار ناکام واپس آئے[۵]۔

---

[۱] تاریخ طبری جلد ۳ صفحہ ۸۰ ـــ تاریخ خمیس جلد ۲ صفحہ ۲۵ ـــ [۲] تاریخ طبری جلد ۳ صفحہ ۸۱ ـــ تاریخ خمیس جلد ۲ صفحہ ۲۵ ـــ [۳] طبقات ابن سعد جلد ۲ مطبوعہ لیڈن صفحہ ۷۵۔ [۴] تاریخ خمیس جلد ۲ صفحہ ۵۳ ـــ السیرۃ النبویہ عبدالملک ابن ہشام برحاشیہ روض الانف جلد ۲ صفحہ ۲۳۹۔

تاریخ طبری میں لکھا ہے کہ "آنحضرت نے علم حضرت عمر کو دیا اور بہت سے لوگ آپ کے ساتھ گئے، لیکن خیبر والوں سے مقابلہ ہوا تو آپ سے کے، اور آپ کے ساتھیوں کے پاؤں اُکھڑ گئے اور رسالتمآب کے پاس واپس آئے، اس حال میں کہ ساتھ والے اُن پر بزدلی کا الزام لگاتے تھے اور آپ ساتھیوں پر"[1]

جب یہ صورت دیکھی تو رسول اللہ نے فرمایا:—

اما واللہ لاعطین الرایۃ غداً رجلاً کراراً غیر فرار یحب اللہ ورسولہ ویحبہ اللہ ورسولہ یفتح اللہ علی یدیہ[2]	کل میں علم اس شخص کو دوں گا جو بھاگنے والا نہیں ہے جو اللہ اور رسول کو دوست رکھتا ہے اور جسے اللہ و رسول دوست رکھتے ہیں۔ خدا اسی کے ہاتھوں سے فتح کرائے گا۔

بعض روایات میں "کراراً غیر فرار" کا ٹکڑا نہیں ہے (ملاحظہ ہو صحیح بخاری جلد ۲ صفحہ ۳۰۳ و طبقات ابن سعد جلد ۲ صفحہ ۸۰) لیکن اگر اس ٹکڑے کو علحدہ کر دیا جائے تو معنی تشنہ رہتے ہیں، کیونکہ صورتِ حال یہ تھی کہ برابر تین دن سے اصحاب کی سرکردگی میں مہمیں بھیجی جا رہی تھیں اور برابر یہ لوگ شکست کھا کر واپس آ جاتے تھے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ رسول اللہ نے یہی کہا ہوگا کہ کل میں اس کو علم دوں گا جو بھاگ کر واپس نہ آئے، ورنہ کہنے کی ضرورت ہی کیا تھی، علاوہ اس کے اس فقرہ کو علحدہ کر دینے سے یہ معنی پیدا ہوتے ہیں کہ "کل میں علم اس کو دوں گا جو خدا و رسول کو دوست رکھتا ہے اور جسے خدا اور رسول دوست رکھتے ہیں" گویا وہ لوگ جو اس سے قبل پرچم اسلام لیکر خیبر فتح کرنے گئے تھے وہ خدا اور رسول کے دوست نہ تھے اور اس صورت میں صحابہ کی اور زیادہ توہین ثابت ہوتی ہے۔

بہرحال "کرار غیر فرار" کا ٹکڑا ہو یا نہ ہو، یہ امر مسلّم ہے کہ رسول اللہ تین دن کی مسلسل ناکامیوں کی وجہ سے کسی اور شخص کا انتخاب کرنا چاہتے تھے جس کا اظہار آپ نے ان الفاظ میں فرمایا

اس خبر کے سُننے کے بعد صحابہ پر کیا اثر ہوا؟ اس کا حال بخاری کے الفاظ میں سنئے:—

فبات الناس یدوکون لیلتھم ایھم یعطاھا فلما اصبح الناس غدوا کلھم یرجوان یعطاھا[3]	تمام رات لوگوں نے چہ میگوئیوں میں بسر کر دی اور جب صبح ہوئی تو ہر شخص یہ تمنا لئے ہوئے تھا کہ علم اسے ملیگا۔

طبقات ابن سعد کاتب واقدی میں ہے کہ "حضرت عمر کا بیان ہے کہ مجھے کبھی اس دن سے پہلے سرداری کی خواہش نہیں ہوئی تھی مگر اس دن میں اونچا ہو ہو کر دیکھ رہا تھا اور منتظر تھا کہ علم مجھ کو دیا جائے گا"[4]

طبری نے لکھا ہے کہ "جب دوسرا دن ہوا تو حضرت ابوبکر اور حضرت عمر علم کے واسطے گردنیں اونچی کر کر کے دیکھنے لگے"[5]

لیکن اس دوسرے دن صبح کو کیا ہوا—؟ حضرت نے علم کو لیکر جنبش دی، اور فرمایا کون اس کو لیتا ہے ایک صاحب آگے بڑھے اور کہا

[1] تاریخ طبری جلد ۳ صفحہ ۹۳ — [2] تاریخ خمیس جلد ۲ صفحہ ۵۲ — خصائص نسائی صفحہ ۱۱ — الریاض النضرہ جلد ۲ صفحہ ۱۸۷ — سیرۃ نبویہ عبدالملک روض الانف جلد ۲ صفحہ ۲۳۹ — استیعاب جلد ۲ صفحہ ۴۷۳ — [4] طبقات جلد ۲ صفحہ ۸۰ — [5] تاریخ طبری جلد ۳ صفحہ ۹۳ —

میں، آپ نے فرمایا، جاؤ جاؤ آگے بڑھو، قسم اس خدا کی جس نے محمد کے چہرہ کو عزت دی ہے میں یہ علم اس شخص کو دوں گا جو بھاگنے والا نہیں ہے، اے علی، اُٹھو اور علم لو،[1]

چنانچہ آپ نے علم لیا، قلعہ فتح کیا اور کامران و بامراد واپس آئے۔

۸ھ میں مکہ معظمہ فتح ہوا اور مسلمان خوشیاں منا رہے تھے لیکن نبی اور علی دو ہستیاں ایسی تھیں جو اسلام کی خدمت سے غافل نہ تھیں۔ وہ اصنام جو خانہ کعبہ میں نصب کر دئے گئے تھے، رسالتمآب اور علی ابن ابی طالب ان بتوں کو توڑنے کی خدمت انجام دے رہے تھے۔ وہ بت جو سب سے بڑا تھا اور خانہ کعبہ کے اوپر نصب تھا اس کے توڑنے کے لئے رسول اللہ نے علی کو اپنے کاندھے پر بلند کیا اور آپ نے اس کو توڑ ڈالا۔

مورخ دیار بکری نے لکھا ہے کہ اس وقت رسول اللہ نے حضرت علی سے فرمایا:—

طوبیٰ لک تعمل للحق وطوبیٰ لی احمل للحق	(مبارک ہو تم کو کہ تم حق کے لئے کام کر رہے ہو اور خوشا حال میرا کہ میں حق کیلئے تمہارا بار اُٹھائے ہوئے ہوں[2])

یہ باتیں بظاہر دیکھنے میں بہت معمولی حیثیت رکھتی ہیں لیکن انھیں جزئی واقعات سے عمومی تاریخ مرتب ہوتی ہے اور ایک مورخ انھیں واقعات سے صحیح نتیجہ تک پہونچنے میں کامیاب ہوتا ہے۔

اسی سال کے آخر میں حُنین کی جنگ ہوئی۔ یہ رسول اللہ کی آخری لڑائی تھی کیونکہ اس کے بعد جنگ تبوک ہوئی جس میں رسول اللہ بغیر جنگ کئے ہوئے واپس آگئے تھے۔

اس لڑائی کی کیفیت بڑی حسرت خیز و حیرت انگیز ہے اور قرآن مجید میں اس کی کیفیت حسب ذیل الفاظ میں بیان کی گئی ہے:—

ویوم حنین اذ اعجبتکم کثرتکم فلم تغن عنکم شیئا وضاقت علیکم الارض بما رحبت ثم ولیتم مدبرین	اور حُنین کے دن کو یاد کرو جبکہ تمھاری کثرت نے تمھیں مغرور بنا دیا تھا مگر اس نے تمھیں کوئی فائدہ نہ پہونچایا اور زمین تم پر تنگ ہو گئی اور تم نے جنگ میں پیٹھ دکھا دی۔

صورت یہ ہوئی کہ دشمن کی فوج کمینگاہ میں تھی، اس نے اچانک حملہ کر دیا اور مسلمانوں کے قدم اُٹھ گئے۔ سوائے سات آٹھ آدمیوں کے کوئی باقی نہ رہا۔[3]

ان آٹھ آدمیوں کی فہرست میں اکثر کتابوں میں حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کا نام بھی نظر آتا ہے لیکن صحیح بخاری میں ابو قتادہ کی روایت ہے کہ

"تمام مسلمانوں نے راہِ فرار اختیار کی اور میں بھی اُن کے ساتھ بھاگا۔ ایک مرتبہ میں نے دیکھا کہ سب کے ساتھ

---

[1] الریاض النضرہ جلد ۲ صفحہ ۱۸۷۔ [2] تاریخ خمیس جلد ۲ صفحہ ۹۶۔ [3] الروض الانف سہیلی جلد ۲ صفحہ ۲۹۔ مواہب لدنیہ جلد ۱ صفحہ ۱۶۳۔

حضرت عمر بھی ہیں، میں نے کہا یہ کیا ہوا۔ آپ نے فرمایا کیا بتاؤں خدا کی مرضی۔ پھر اس کے بعد رفتہ رفتہ لوگ رسالتمآب کے پاس واپس گئے۔"[1]

محدث ابن ابی شیبہ کا بیان ہے کہ:۔

"آنحضرت کے ساتھ صرف چار آدمی رہ گئے تھے، تین بنی ہاشم میں سے اور ایک اور جن کی تفصیل یہ ہے۔ علی و عباس آپ کے آگے تھے، ابوسفیان لگام پکڑے ہوئے تھے اور ابن مسعود پہلو میں تھے اور کوئی شخص دشمنوں میں سے حضرت کی طرف نہ بڑھتا تھا مگر یہ کہ وہ قتل ہو جاتا تھا"[2]

ان فرار کرنے والوں پر ایک عورت ام سلیم بنت ملحان نے انتہائی غم و غصہ کا اظہار کیا، وہ رسالتمآب کے پاس سے بالکل جدا نہیں ہوئی۔ حضرت نے پکار کر فرمایا "ام سلیم" اس نے کہا۔ "جی حضور، میرے ماں باپ آپ پر نثار، آخر آپ فرار ہونے والوں کو قتل کیوں نہیں کر ڈالتے"۔ حضرت نے اس کے جواب میں صرف اس قدر ارشاد فرمایا کہ "یہ بھاگ جاتے ہیں، تو کیا ہوا خدا کافی ہے"[3]

استیعاب میں حضرت عباس کے حالات میں لکھا ہے کہ:۔

"حنین کے دن آنحضرت کے پاس سے سب فرار کر گئے سوا عباس، عمر، علی اور ابوسفیان کے، بعض لوگوں نے کہا ہے کہ سات آدمی حضرت ہی کے گھر کے رہ گئے تھے، ابن اسحاق نے کہا ہے کہ یہ سات آدمی، علی، عباس، فضل ابن عباس، ابوسفیان، جعفر بن ابی سفیان، ربیعہ بن حارث اور اسامہ بن زید ہیں اور اسامہ بن زید ہیں اور ان کے علاوہ آٹھویں ایمن ابن عبید۔ بعض مورخوں نے ابوسفیان کے بجائے حضرت عمر کا نام لیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ابوسفیان تو یقیناً حضرت کے ساتھ تھے، حضرت عمر کے متعلق بیشک اختلاف ہے"[4]

اس جنگ سے فارغ ہونے کے بعد رسول اللہ نے طایف کا محاصرہ کیا، کیونکہ مشرکین وہاں پناہ گزیں ہو گئے تھے۔ اسی دوران میں ایک دن رسول اللہ نے جناب امیر کو بلا کر بڑی دیر تک رازکی گفتگو کی۔ اس پر لوگوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں اور کہا:۔ لقد طال نجواہ مع ابن عمہ (آج تو رسول اللہ اپنے ابن عم سے بڑے طولانی مشورے کر رہے ہیں) ۔۔۔ رسول اللہ نے سنا تو فرمایا۔ ما انتجیتہ ولاکن اللہ انتجاہ " (میں نے علی کو مشورہ کے لئے منتخب نہیں کیا ہے بلکہ خدا نے کیا ہے)۔ اس روایت کو حافظ ترمذی نے درج کیا ہے اور حسن صحیح قرار دیا ہے۔[5]

۹ھ میں غزوہ تبوک واقع ہوا۔ رسول اللہ کی زندگی کو صرف ایک سال باقی ہے اور یہ غزوہ آخری غزوہ ہے۔ گرمی کا زمانہ ہے

---

[1] صحیح بخاری مطبوعہ مصر جلد ۲ صفحہ ۴۳۔ [2] مواہب لدنیہ جلد ا صفحہ ۱۶۳۔ [3] طبری جلد ۳ صفحہ ۱۲۹۔ [4] استیعاب جلد ۲ صفحہ ۹۱۰۔ [5] الریاض النضرہ جلد ۲ صفحہ ۲۰

شدت کی لُو چل رہی ہے اور رسالتمآب نے اپنے ساتھ چلنے کے لئے تمام اصحاب کو حکم دیا ہے، لیکن حضرت علی کے متعلق ارشاد ہوتا ہے کہ تم مدینہ میں قیام کرو اور میری جگہ رہو۔ حضرت علی کبیدہ خاطر ہو کر کہتے ہیں :۔

اتخلفنی فی الصبیان و النساء (کیا آپ مجھے بچوں اور عورتوں میں چھوڑ جائیں گے)

حضرت جواب دیتے ہیں :۔ اما ترضی ان تکون منی بمنزلۃ ھارون من موسیٰ الا انہ لانبی بعدی (کیا تم اس پر راضی نہیں ہو کہ تم مجھ سے وہی نسبت رکھو جو ہارون کو موسیٰ سے تھی، سوائے اس کے کہ میرے بعد کوئی نبی ہونے والا نہیں ہے)[1]

اگر آخری جملہ "لا نبی بعدی" کا نہ ہوتا تو ہارون کی منزلت کو صرف وقتی جانشینی اور عارضی خلافت تک محدود سمجھا جا سکتا تھا، لیکن اس جملہ سے ثابت ہوتا ہے کہ زندگی میں اور بعد وفات دونوں حالتوں میں جناب امیر کو اسی جانشینی و خلافت کا درجہ حاصل ہے جو ہارون کو موسیٰ کے بعد حاصل ہوا۔

دُنیا کو معلوم ہے کہ ہارون موسیٰ کے شریک کار، معاون اور وزیر و جانشین تھے اور اگر ان کی زندگی موسیٰ کے بعد باقی رہتی تو خلافت کا حق سوائے اُن کے کسی کو نہ پہونچتا۔ بالکل اسی طرح جناب امیر کے لئے ثابت ہوتا ہے کہ وہ حیات و ممات ہر حالت میں رسول اللہ کے جانشین تھے اور اگر ہارون سے کوئی فرق تھا تو صرف یہ کہ ہارون نبی تھے اور رسول اللہ کے بعد سلسلۂ نبوت ختم ہو گیا لیکن اگر یہ سلسلہ ختم نہ ہوتا تو نبی بھی سوائے حضرت علی کے دوسرا نہ ہوتا۔

اسی سال کا واقعہ ہے کہ سورۂ برأت کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں جن کا اعلان مکۂ معظمہ میں حج کے موقعہ پر ہونا تھا، اس واقعہ کے متعلق مختلف روایات ہیں۔ نسائی کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے حضرت ابوبکر کو ان آیات کے ساتھ روانہ کر دیا تھا، اس کے بعد ان کو واپس بلا کر یہ خدمت حضرت علی کے سپرد کی، دوسری روایت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اُن کو واپس نہیں بلایا بلکہ خود حضرت علی کو روانہ کیا کہ حضرت ابوبکر سے وہ آیات لیکر خود اس خدمت کو انجام دیں۔ بہرحال ان تمام روایات میں رسول اللہ کا یہ قول قدر مشترک کے طور پر پایا جاتا ہے کہ ۔ علی منی و انا منہ و لا یودی عنی الا انا و علی۔ یعنی علی مجھ سے ہے اور میں علی سے اور اپنی ترجمانی یا میں خود کر سکتا ہوں یا علی ۔ دوسری روایت میں یہ الفاظ اس طرح پائے جاتے ہیں :۔ انی امرت ان ابلغہ انا او رجل من اھل بیتی (مجھے حکم دیا گیا ہے کہ یا میں خود اس کو پہونچاؤں یا ایسا شخص جو میرے اہلبیت میں داخل ہو)[2]

بہرحال حضرت ابوبکر روانہ ہو چکے تھے یا نہیں، وہ واپس بلائے گئے یا نہیں، یہ مسلّم ہے کہ آیات قرآنی کی تبلیغ کے لئے حضرت نے جناب امیر کو منتخب کیا اور یہ کہکر کہ اس خدمت تبلیغ کا اہل میں ہوں یا پھر وہ جو میرے اہلبیت میں داخل ہو۔

---

[1] صحیح بخاری جلد ۳ صفحہ ۵۴۔ تاریخ خمیس جلد ۲ صفحہ ۱۲۸۔ تاریخ طبری جلد ۳ صفحہ ۱۴۴۔ الریاض النضرہ جلد ۲ صفحہ ۱۶۲۔ سیرۃ ابن ہشام جلد ۲ صفحہ ۳۱۷۔ مواہب لدنیہ جلد ۱ صفحہ ۱۷۳۔ تاریخ الخلفا سیوطی ۶۷ و ۱۶۸۔ [2] خصائص نسائی صفحہ ۶۲-۴۶۔ روض الانف جلد ۲ صفحہ ۳۲۸۔ طبری جلد ۳ صفحہ ۱۵۴۔ تاریخ خمیس جلد ۲ صفحہ ۱۵۷۔ ریاض نضرہ صفحہ ۱۷۴

سنہ ۱۰ھ میں رسول اللہ نے جناب امیر کو یمن کی طرف تبلیغ کے لئے روانہ کیا اور اس شان سے کہ عقد لواءً وعممه بیده فقال امض ولا تلتفت (حضرت نے ان کے لئے علم طیار کیا خود اپنے ہاتھ سے اُن کے سر پر عمامہ باندھا اور عمامہ کا ایک سرا آگے کی طرف قریب ایک ہاتھ کے سینہ پر ڈالدیا اور دوسرا سرا پشت کی طرف ایک بالشت لٹکا دیا) [1]

اس مہم کی سرکردگی کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام قبیلۂ ہمدان اور اکثر اہل یمن ایک ہی دن میں آپ کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوئے اور آپ مدینہ واپس لوٹے۔ اس مہم پر پہلے خالد ابن ولید کی نامزدگی ہو چکی تھی اور چونکہ حضرت علی کے بھیجے جانے سے وہ معزول ہوئے اسلئے بعض حضرات کو یہ بات بہت ناگوار ہوئی [2] اور اس کا انتقام یوں لیا گیا کہ چند لوگ جناب علی کی یہ شکایت لیکر مدینہ پہونچے کہ آپ نے اموالِ خمس میں سے ایک کنیز پر بغیر اجازت رسول تصرف کر لیا۔ اس کا جو جواب رسول اللہ نے دیا ہے وہ کتب احادیث میں اب تک محفوظ ہے۔ ملاحظہ ہو۔

عمران حصین کی روایت ہے کہ اقبل رسول اللہ والغضب یعرف فی وجهه فقال ما تریدون من علی ثلاثًا ان علیًا منی وانا منه وهو ولی کل مومن بعدی (حضرت مخاطب ہوئے مگر اس طرح کہ غصہ آپ کے چہرہ سے نمایاں تھا اور کہا تم لوگ علی سے کیا چاہتے ہو، آخر کیا چاہتے ہو۔ علی مجھ سے ہے، میں علی سے ہوں اور وہ ہر مومن کا میرے بعد ولی ہے) [3]

بریدہ کی روایت میں ہے:۔

لما اتیت النبی دفعت الکتاب فقرا لاعلیه فرایت الغضب فی وجهه فقال لاتقع فی علی فانه منی وانا منه وهو ولیکم بعدی (یعنی جب میں آیا اور حضرت کو خط دیا تو آپ نے پڑھنا شروع کیا اور چہرہ پر غصہ کے آثار نمایاں ہوتے جا رہے تھے، آپ نے فرمایا علی کی برائی نہ کرو، وہ مجھ سے ہے میں اُس سے ہوں اور وہ تمہارا حاکم ہے میرے بعد) [4]

علامۂ ابن حجر کی شرح قصیدۂ ہمزیہ [5] میں لکھتے ہیں:۔

ماصح عنه صلی اللہ علیه وسلم وهو اللهم وال من والاه وعاد من عاداه ان علیًا منی وانا منه وهو ولی کل مومن بعدی (صحیح اسناد سے ثابت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا خداوندا دوست رکھ اسے جو علی کو دوست رکھے اور دشمن رکھ اس کو جو علی کو دشمن رکھے اور یہ کہ علی مجھ سے ہے، میں علی سے ہوں اور وہ ولی ہے ہر مومن کا میرے بعد)

اسی سنہ ۱۰ھ کے آخر میں رسالتمآب نے آخری حج کیا ہے جو حجۃ الوداع کے نام سے مشہور ہے، یہ جناب رسالتمآب کی زندگی کا

---

[1] تاریخ خمیس جلد ۲ صفحہ ۱۹۰ [2] بخاری مطبوعۂ مصر جلد ۳ صفحہ ۱۳۴ [3] ریاض نضرہ جلد ۲ صفحہ ۱۷۱۔ خصائص نسائی صفحہ ۲۳، ۲۵۔ استیعاب مطبوعہ حیدر آباد صفحہ ۴۷۰ [4] [5] مطبوعہ مصر صفحہ ۲۳۷۔

آخری زمانہ ہے اور صرف چند ماہ آپ کی رحلت کو باقی ہیں۔

جناب امیرؑ زکوٰۃ و خمس لینے یمن چلے گئے تھے جب رسول اللہ حج کے لئے روانہ ہوئے، لیکن آپ وہاں سے واپس آکر رسول اللہ سے مل گئے تھے۔ اس موقع پر بھی جناب امیر کی دیانت و امانت سے فوج والوں کو شکایت پیدا ہو گئی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ جب آپ یمن سے واپس ہوئے اور مکہ معظمہ کے قریب پہونچے تو آپ فوج سے علٰحدہ ہو کر پہلے پہونچ گئے اور صحابہ میں سے ایک شخص کو فوج کا سردار بنا آئے۔ اس قائم مقام سردار نے تمام اسباب و اموال میں سے جو یمن سے آیا تھا لباس فاخرہ نکلوا کر فوج کے تمام سپاہیوں کو پہنوا دیا، جب فوج کا داخلہ ہونے لگا تو حضرت علی معائنہ کے لئے گئے اور یہ دیکھ کر بہت برہم ہوئے اور تمام لباس اتروا کر اموال میں پھر شامل کر دیا۔ یہ بات بھی لوگوں کو بہت ناگوار ہوئی اور رسول اللہ سے شکایت کی گئی تو آپ نے ایک عام تقریر کی اور فرمایا۔ لا تشکوا علیا فواللہ لاخشن فی ذات اللہ من ان یشکی (یعنی علی کی شکایت نہ کرو، خدا کی قسم وہ اللہ کی مرضی کے لئے اتنا بے لوث ہے کہ اس کی شکایت کا موقعہ ہی نہیں ہے)[1]

یہ حج سے پہلے کا واقعہ ہے۔ اب وہ وقت ہے کہ رسول اللہ حج سے فارغ ہو کر مدینہ واپس تشریف لا رہے ہیں۔ حضرت چلتے چلتے غدیر خم تک پہونچتے ہیں، پورا قافلہ روک دیا جاتا ہے اور اعلان ہوتا ہے کہ رسول اللہ تقریر فرمائیں گے۔ ہزاروں آدمی خطبۂ نبوی سننے کے لئے مجتمع ہیں اور آپ منبر پر تشریف لیجا کر ایک مبسوط خطبہ کے ذریعہ سے اپنے قرب وفات کی پیشین گوئی کرتے ہیں، اپنی خدمات ہدایت کا ذکر فرماتے ہیں، لوگوں سے اصول اسلام و ایمان کی گواہی لیتے ہیں اور اس کے بعد وہ کچھ فرماتے ہیں جس سے انکار کی گنجائش نہیں اور جس نے ہمیشہ کے لئے آپ کی جانشینی کے مسئلہ کو طے فرما دیا۔

اس سلسلہ میں حافظ طبرانی کی روایت جو بہ سند صحیح منقول ہے حسب ذیل ہے:۔

ایھا الناس انی یوشک ان ادعی فاجیب انی مسئول و انکم مسئولون فماذا انتم قائلون (مسلمانو، عنقریب مجھے بلا لیا جائے گا اور میں تم سے رخصت ہو جاؤں گا، میں بھی جوابدہ ہوں اور تم بھی جوابدہ ہو اس لئے بتاؤ کہ جب یہ وقت آئے گا تو تم کیا کہو گے، فقال الیس تشھدون ان لا الہ الا اللہ وان محمدا عبدہ ورسولہ، وان جنتہ حق، وان نارہ حق وان البعث حق بعد الموت وان الساعۃ اٰتیۃ لا ریب فیھا وان اللہ یبعث من فی القبور قالوا بلیٰ نشھد بذلک قال اللھم اشھد۔ ثم قال یا ایھا الناس ان اللہ مولای وانا مولی المؤمنین وانا اولیٰ بھم من انفسھم فمن کنت مولاہ فھذا مولاہ یعنی علیا اللھم وال من والاہ وعاد من عاداہ (حضرت نے فرمایا کیا تم لوگ اس بات کی گواہی نہ دوگے کہ سوائے اللہ کے کوئی خدا نہیں اور یہ کہ محمد خدا کا بندہ اور رسول ہے اور جنت حق ہے، جہنم حق ہے اور موت حق ہے اور زندگی بعد موت کے حق ہے اور قیامت آنے والی ہے اس میں کوئی شک نہیں اور خدا مردوں کو زندہ کریگا۔ سب نے کہا ہاں،

[1] سیرۃ ابن ہشام برحاشیۂ روض الانف جلد ۲ صفحہ ۳۵۱۔ طبری جلد ۳ صفحہ ۱۶۸۱۔ استیعاب مطبوعہ حیدرآباد صفحہ ۵۰۷۔ صواعق محرقہ مطبوعہ مصر صفحہ ۷۶۔

ہم اس کی گواہی دیتے ہیں حضرت نے فرمایا، خداوندا گواہ رہنا۔ پھر فرمایا اے لوگو خدا میرا مولا ہے اور میں تمام مومنین کا مولا ہوں اور اُن کے نفسوں کا خود اُن سے زیادہ حقدار ہوں۔ اس کے بعد جس کا میں مولا ہوں اُس کا یہ مولا ہے (علی کی طرف اشارہ کیا) خداوندا دوست رکھ اس کو جو علی کو دوست رکھے اور دشمن رکھ اس کو جو علی کو دشمن رکھے) ثم قال ایھا الناس انی فرطکم وانتم واردون علی الحوض، وانی اسئلکم حین تردون علی عن الثقلین فانظروا کیف تخلفونی فیھما الثقل الاکبر کتاب اللہ سبب طرفہ بید اللہ و طرفہ بایدیکم فاستمسکوا بہ لا تضلوا و لا تبدلوا و عترتی اھل بیتی فانہ قد نبأنی اللطیف الخبیر انھما لن ینقضیا حتی یردا علی الحوض (پھر حضرت نے فرمایا اے لوگو، میں تمھارے آگے جاتا ہوں اور تم حوض کوثر پر میرے پاس پہونچو گے تو میں تم سے دریافت کروں گا کہ تم نے میرے بعد ثقلین کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ ایک ان میں سے کتاب خدا ہے جو ایک زنجیر ہے جس کا ایک سرا خدا سے متصل اور دوسرا تمھارے پاس ہے اس کو پکڑے رہو گمراہ نہ ہو اور ادل بدل نہ کرو، دوسرے میری عترت، میرے اہلبیت۔ خدا نے مجھے بتایا ہے کہ یہ دونوں فنا نہ ہوں گے جب تک میرے پاس حوض کوثر پر وارد نہ ہوں)

علامہ ابن حجر مکی نے صواعق محرقہ (مطبوعہ مصر صفحہ ۲۵ - ۲۶) میں اس روایت کو درج کیا ہے اور لکھا ہے کہ حضرت نے تین مرتبہ صحابہ سے دریافت کیا الست اولی بکم من انفسکم (کیا میں تم پر تم سے زیادہ اختیار نہیں رکھتا)۔ سب نے کہا بیشک، بیشک اور پھر اس کے بعد رسول اللہ نے حضرت علی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر فرمایا:-

من کنت مولاہ فعلی مولاہ اللھم وال من والاہ و عاد من عاداہ وانصر من نصرہ واخذل من خذلہ وادر الحق معہ حیث دار (یعنی جس کا میں مولیٰ ہوں علی اس کا مولیٰ ہے خداوندا دوست رکھ اس کو جو اسے دوست رکھے اور دشمن رکھ اسے جو اسے دشمن رکھے، مدد کر اس کی جو اُس کی مدد کرے، ساتھ چھوڑ اُس کا جو اس کا ساتھ چھوڑے اور حق کو اُس طرف گردش دے جس طرف وہ گردش کرے)

اس کے بعد اس روایت پر تبصرہ فرماتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:-

"یہ حدیث صحیح ہے، اس میں کوئی شک نہیں، اور ترمذی، نسائی، احمد بن حنبل وغیرہ ایک جماعت نے اس کی تخریج کی ہے اور اس کے طرق و اسناد بہت زیادہ ہیں۔ چنانچہ ۱۶ صحابیوں نے اسکی روایت کی ہے اور احمد بن حنبل کی ایک روایت میں ہے کہ ۳۰ صحابیوں نے اس کے سننے کی گواہی دی ہے اور اس کے اسناد اکثر صحیح و حسن ہیں"[1]

[1] صواعق محرقہ مطبوعہ مصر صفحہ ۲۵۔

استیعاب ابن عبدالبر[51] ـ اسدالغابہ ابن اثیر جزری[52] میں متعدد مقام پر یہ روایت مذکور ہے ـ حافظ محب طبری نے اس روایت کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ :ـ

"اس واقعہ کے بعد حضرت عمر، جناب علی سے ملے اور کہا کہ مبارک ہو آپ کو کہ آپ ہو گئے ہر مومن و مومنہ کے مولا"[53]

اب رسول کی زندگی صرف دو ماہ اور چند دن کی باقی رہ گئی ہے اور مسلمانوں کی شب یلدا جب ہاتھ کو ہاتھ نہ سجھائی دے گا نزدیک ہے ـ آیئے واقعات کا ذرا جائزہ لے لیں، شاید رسول اللہ کے بیانات سے کوئی شمع ہدایت ایسی مل جائے جو تجلیات نبوی کے او جھل ہو جانے کے بعد ہمارے لئے دلیل راہ بن سکے ـ

گزشتہ صفحات کے مطالعہ سے معلوم ہو سکتا ہے کہ شروع سے اخیر تک ہر موقع پر رسول کے ساتھ مواسات و ہمدردی میں پیش پیش رہنے والا، کسی موقع پر قدم میں تزلزل نہ آنے دینے والا اور سخت سے سخت وقت میں اطاعت رسول سے سرمو انحراف نہ کرنے والا کون تھا؟ آپ نے یہ بھی دیکھا ہو گا کہ جناب امیر کی اس اطاعت و جاں نثاری کی بنا پر رسول کی بارگاہ میں جو رسوخ ان کو حاصل تھا وہ دوسرے صحابہ کو گراں گزرتا تھا اور وہ اپنے جذبات سے مجبور ہو کر شکوہ و شکایت بھی کر گزرتے تھے ـ

مسجد نبوی میں صحابہ کے مکانوں کے جو دروازے کھلتے تھے اُن کے بند کر دئے جانے کا واقعہ طائف میں رسول اور علی کی رازدارانہ گفتگو کا حال، بریدہ کا واقعہ، اور حجۃ الوداع سے قبل یمن سے واپسی کا واقعہ آپنے ملاحظہ فرمایا ہو گا اور رسالتمآب کی طرف سے جناب امیر کے خلاف اعتراض یا شکوہ کا جو جواب ملتا تھا وہ بھی آپ نے پڑھ لیا ہو گا ـ ظاہر ہے کہ نفسیات کے لحاظ سے یہ تمام واقعات اور زیادہ صحابہ کی برہمی کا باعث ہوئے ہوں گے ـــ چنانچہ رسالتمآب کو احساس تھا کہ جب میری زندگی میں یہ ہو رہا ہے تو بعد میں خدا جانے کیا ہو؟ احد میں صرف اتنی سی افواہ پر کہ رسول اللہ قتل ہو گئے سب کے قدم میدان سے اُٹھ گئے اور زبانوں پر یہی تھا کہ پیغمبر نہ رہے تو اسلام کیسا اور لڑائی کیسی ـ انس بن نضر نے لوگوں سے پوچھا ـ "تم ہاتھ پر ہاتھ دھرے کیوں بیٹھے ہو" جواب ملا کہ :ـ "رسول تو ہیں نہیں پھر ہم کیا کریں" ـ انس نے کہا "رسول نہیں تو نہ سہی تم ان کے دین پر تو قائم ہو اٹھو اور جہاد کرو" مگر بیٹھ رہنے والے بیٹھے ہی رہے اور انس نے جان دیدی ـــ قرآن مجید کی جو آیتیں اس موقع سے تعلق رکھتی ہیں غور سے پڑھنے کے قابل ہیں ـ ارشاد ہوتا ہے :ـ

ما محمد الا رسول اللہ قد خلت من قبلہ الرسل افئن مات او قتل انقلبتم علی اعقابکم ومن ینقلب علی عقبیہ فلن یضر اللہ شیئاً

(محمد نہیں ہیں مگر ایک رسول جن کے پہلے بہت رسول گزر چکے تو کیا وہ مر جائیں یا قتل ہو جائیں تو کیا تم اسلام سے پلٹ جاؤ گے اور جو شخص ایسا کرے گا تو خدا کو اُس سے کوئی نقصان نہیں پہونچ سکتا)

---

[51] مطبوعہ حیدرآباد جلد ۲ صفحہ ۴۷۳ ـ [52] جلد ۵ صفحہ ۲۰۵، جلد ۳ صفحہ ۲۷۴، ۳۰۷، ۳۲۱ ـــ [53] ریاض نضرہ جلد ۲ صفحہ ۱۶۹ ـ

اس کے علاوہ رسالتمآب نے اپنی بے اطمینانی کا جن الفاظ میں اظہار کیا وہ بھی گوشگزار ہو چکے ہیں۔ جب آپ نے شہداء اُحد کے متعلق فرمایا کہ میں ان کا گواہ ہوں تو حضرت ابوبکر نے کہا کیا ہم نے کبھی ان کی طرح جہاد نہیں کیا۔ یہ سنکر رسول اللہ نے فرمایا "ہاں مگر کسے خبر ہے تم لوگ میرے بعد کیا کروگے"

دوسرے موقعوں پر حضرت نے اس خطرہ کے وقوع کی صریح پیشین گوئی کی ہے۔ بخاری کی حدیث ہے کہ:۔

"آنحضرت نے فرمایا میں تم سے پہلے حوض کوثر پر پہونچونگا، کچھ لوگ تم میں سے میری طرف لائے جائیں گے اور جب میں چاہوں گا کہ انھیں اپنے قریب بلاؤں تو وہ مجھ سے جدا کردئے جائیں گے، میں کہوں گا خداوندا یہ تو میرے اصحاب ہیں، ارشاد ہوگا تمھیں معلوم نہیں انھوں نے تمھارے بعد کیا گل کھلائے"[1]

آنحضرت کو جن چیزوں کے متعلق یہ خطرہ تھا ان کو صاف طور پر حجۃ الوداع کے خطبہ میں ظاہر فرما دیا جس کی اصل عبارت پہلے درج ہو چکی ہے) اس میں آنحضرت نے اس تمہید کے ساتھ کہ انا فرطکم علی الحوض (میں حوض کوثر پر تمھارا پیشرو ہوں) یہ فرمایا ہے کہ میں تم میں دو چیزیں بہت گرانقدر چھوڑے جاتا ہوں، ایک کتاب خدا دوسرے اپنی عترت و اہلبیت، دیکھوں میرے بعد تم ان کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہو۔ اس طرح حضرت نے اس پہلی بیعت کے موقعہ پر جب "انذر عشیرتک الاقربین" کا حکم نافذ ہونے پر لی گئی تھی، علی کی وزارت وصایت و خلافت کا اعلان فرما دیا تھا پھر اس کے بعد مختلف طرح سے علی کے کمالات کو روشن کیا، علمی حیثیت سے "انا مدینۃ العلم و علی بابہا" فرما کر یہ ثابت کیا کہ میرے علوم اگر دستیاب ہو سکتے ہیں تو صرف علی کے ذریعہ سے۔ "اقضاکم علی" کہکر فصل مقدمات کا بہترین ماہر بتایا۔ "علی منّی" کہکر انتہائی یگانگت و وابستگی کا اظہار فرمایا اور سب سے آخر میں غدیر خم کے میدان میں "من کنت مولاہ فعلی مولاہ" کہکر علی کی حکومت، ولایت و خلافت کا صریح اعلان فرما دیا، یہاں تک کہ صحابہ نے علی کو مبارکباد بھی دی، لیکن کیا رسول اللہ کو اطمینان ہو گیا تھا، ہرگز نہیں، واقعات بتلاتے ہیں کہ آپ مطمئن نہ ہوئے تھے۔

حضرت اس خطبہ کے بعد غدیر خم سے روانہ ہو کر مدینہ پہونچے، محرم کے مہینہ بھر آپ اچھے رہے، صفر میں بیمار پڑے اور اس بیماری میں مبتلا ہوئے جو آپ کے لئے مرض الموت ثابت ہوئی۔ حضرت نے اس بیماری کی حالت میں تقریر کی اور فرمایا:۔

ایھا الناس یوشک ان اقبض قبضا سریعا فینطلق بی وقد قدمت الیکم القول معذرۃ الیکم الا انی مخلف فیکم کتاب ربی و عترتی و اھل بیتی (اے لوگو بہت قریب ہے وہ وقت کہ میں دنیا سے اُٹھ جاؤں اور تم سے رخصت ہوں۔ میں نے اس سے قبل تم سے سب کچھ کہہ دیا ہے اور حجت تمام کر دی ہے۔ بس تم کو معلوم ہونا چاہئے کہ میں تمھارے درمیان خدا کی کتاب اور اپنی عترت اہلبیت کو چھوڑے جا رہا ہوں)

یہ کہکر حضرت نے جناب امیر کا ہاتھ پکڑا اور اسے بلند کر کے فرمایا:۔

ھذا علی مع القرآن والقرآن مع علی لا یفترقان حتی یردا علی الحوض فاسئلھما ما خلفت فیھما (علی قرآن کے ساتھ ہے

---

[1] بخاری جلد ۴ صفحہ ۱۳۶ -

اور قرآن علی کے ساتھ یہ دونوں جدا نہ ہوں گے یہاں تک کہ میرے پاس حوض کوثر پر پہنچیں۔ میں ان سے دریافت کروں گا کہ تم نے ان سے میرے بعد کیا سلوک کیا[1]

اب مرض کی شدت اور زیادہ بڑھ گئی۔ حضرت نے اسی عالم میں ایک علم اسامہ بن زید کے لئے طیار کیا اور تمام بڑے بڑے صحابہ کو اسامہ کی ماتحتی میں جنگ کے لئے روانگی کا حکم دیا۔ تاریخیں متفق ہیں کہ حضرت ابوبکر، حضرت عمر بھی اسامہ کے ساتھ جانے پر مامور ہوئے تھے۔

لوگوں کو بڑا ناگوار ہوا کہ رسالتمآب نے اتنے بڑے بڑے صحابہ پر اسامہ بن زید کو حاکم بنا دیا۔ حضرت کو معلوم ہوا تو آپ کو بہت غصہ آیا اور اسی حالت میں چادر اوڑھے، سر پر رومال باندھے باہر آ گئے اور منبر پر جا کر فرمایا:-

"تم لوگ اسامہ کی امارت پر معترض ہو، یہ نئی بات نہیں ہے۔ اس سے پہلے تم اس کے باپ (زید بن حارثہ) کی امارت پر بھی اعتراض کر چکے ہو۔ بخدا وہ امارت کے لائق تھا اور یہ اس کا بیٹا بھی امارت کے لائق ہے[2]"

بیشک ان اشخاص میں جو ساتھ جانے پر مامور تھے حضرت علی کا نام نظر نہیں آتا۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے مدارج النبوۃ میں تصریح کر دی ہے کہ:-

"حکم عالی چناں صادر شد کہ از اعیان مہاجر و انصار مثل ابوبکر صدیق، و عمر فاروق و عثمان ذی النورین و سعد بن ابی وقاص و ابوعبیدہ بن الجراح وغیرہم الا علی مرتضیٰ را کہ ہمراہ نکرد دراں لشکر ہمراہ اسامہ باشند"

واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ رسول اللہ کو اپنی زندگی کے آخر ہونے کا یقین تھا وہ اپنی موت کی اطلاع رکھتے تھے اور اسکے لئے طیاریاں کر رہے تھے۔ اس موقعہ پر حضرت کا خاص طور سے لشکر اسامہ کی روانگی کا حکم دینا اسی لئے تھا کہ وہ ان تمام لوگوں کے وجود سے مدینہ کو خالی کر دینا چاہتے تھے۔

اگر آپ کا منشا کسی حیثیت سے یہ ہوتا کہ آپ کے بعد اُمورِ خلق کی ذمہ داری ان اشخاص میں سے کسی کے سپرد ہو تو ظاہر ہے کہ وہ اپنے وقتِ آخر میں ان لوگوں کو لشکرِ اسامہ کے ساتھ جانے کی تاکید نہ فرماتے ــــ حضرت کو اس امر میں اتنا اہتمام تھا کہ شدتِ مرض میں جب آنکھ کھلتی تھی تو بار بار یہی تاکید فرماتے تھے کہ لشکر فوراً روانہ ہو جائے ــــ لوگ رسول خدا کے اس منشاء کو سمجھتے تھے اور اسی لئے تعمیل حکم میں پس و پیش ہو رہا تھا۔ لیکن اسامہ کا لشکر نہ جانا تھا نہ گیا اور گیا اُس وقت جب رسول اللہ کی وفات ہو چکی اور خلافت کا مسئلہ تکمیل کو پہنچ گیا۔

اب رسالتمآب کا مرض انتہائی شدت تک پہنچ گیا ہے، مگر اب بھی اگر کوئی خیال آپ کو ہے تو صرف وہی ایک، کوئی اندیشہ

---

[1] صواعق محرقہ مطبوعہ مصر صفحہ ۷۷ ــــ [2] طبقات ابن سعد جلد ۲ صفحہ ۱۳۶ ــــ مواہب لدنیہ جلد ۱ صفحہ ۱۷۹ ــــ تاریخ خمیس جلد ۲ صفحہ ۱۷۱۔

تو وہی ایک۔ ایک بار غش سے آنکھ کھلتی ہے تو فرماتے ہیں "دوات قلم منگواؤ میں تمھارے لئے ایک نوشتہ چھوڑ جاؤں تاکہ میرے بعد تم گمراہی میں مبتلا ہو" مگر حضرت عمر نے انکار کر دیا، فرمایا کہ "پیغمبر پر مرض کا غلبہ ہے، اور ہم کو کتاب خدا کافی ہے"!

صحیح بخاری میں متعدد روایتیں پائی جاتی ہیں۔ ایک روایت ابن عباس سے ہے کہ:۔

"ابن عباس کہتے تھے۔ ہائے پنجشنبہ کا دن، تم جانتے ہو کہ پنجشنبہ کے دن کیا ہوا۔ رسالتمآب پر مرض کی شدت ہوئی، حضرت نے فرمایا لاؤ میں تمھیں ایک نوشتہ تحریر کر دوں تاکہ میرے بعد تم گمراہ نہ ہو، لوگوں نے اختلاف شروع کیا اور کہا کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، ذرا پھر پوچھو، لوگ آپ کے قریب گئے کہ پھر آپ سے دریافت کریں حضرت نے فرمایا "جاؤ، چھوڑ دو مجھ کو، میں جس حال میں ہوں اسی حال میں رہنے دو"[1]

دوسری روایت یہ ہے کہ:۔

"جب رسالتمآب کا آخر وقت تھا اس وقت گھر میں بہت سے آدمی موجود تھے حضرت نے فرمایا آؤ میں تمھیں ایک نوشتہ تحریر کر دوں تاکہ میرے بعد تم گمراہ نہ ہو ان میں سے بعض نے کہا کہ حضرت پر مرض کا غلبہ ہے اور تمھارے پاس قرآن تو موجود ہی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس وقت جو لوگ گھر میں موجود تھے ان میں اختلاف شروع ہو گیا، کچھ لوگ کہتے تھے قلم دوات دیدو، کچھ اس کے مخالف تھے، جب بہت شور ہوا تو حضرت نے فرمایا کہ اٹھ جاؤ میرے پاس سے"

ان دونوں روایتوں میں اختلاف کرنے والوں کا نام درج نہیں ہے، لیکن تیسری روایت سے یہ ابہام بھی دور ہو جاتا ہے اور یہ صاف صاف تحریر ہے کہ مخالفت کرنے والے حضرت عمر تھے (ملاحظہ ہو بخاری باب قول المریض قوموا عنی)[2]

رسالتمآب کو اس واقعہ سے جتنا صدمہ بھی پہونچا ہو کم ہے، چنانچہ اسی صدمہ کا نتیجہ تھا کہ آپ نے برہم ہو کر سب کو اپنے پاس سے ہٹا دیا۔ لیکن اس منظر کی ایک آخری کڑی اور ہے جو دیکھنے کے قابل ہے، اس داستان کا ایک ٹکڑا اور ہے جو سننے کے قابل ہے اور یہ کسی اور کے منھ کی بات نہیں ہے بلکہ خود جناب عایشہ کا بیان ہے۔

قالت، قال رسول اللّٰہ لما حضرتہ الوفات ادعوالی حبیبی فدعوالہ ابابکر فنظر الیہ ثم وضع راسہ، ثم قال ادعوالی حبیبی فدعوا لہ علیاً فلما راٰہ ادخلہ معہ فی الثوب الذی کان علیہ فلم یزل یحتضنہ حتی قبض وید ہ علیہ اخرجہ الرازی۔

حضرت عایشہ کی روایت ہے کہ جب حضرت کا بالکل وقت آخر تھا تو آپ نے فرمایا بلاؤ میرے حبیب کو، کوئی جا کر حضرت ابوبکر کو بلا لا

---

[1] بخاری مطبوعہ مصر جلد ۳ صفحہ ۵۸ [2] بخاری جلد ۴ صفحہ ۵

آپ نے تکیہ سے سر اُٹھا کر دیکھا اور پھر تکیہ پر سر رکھدیا، دوبارہ فرمایا بلاؤ میرے حبیب کو۔ اب جا کر حضرت عمرؓ کو بلا لائے آپ نے ان کو بھی دیکھ کر تکیہ پر سر رکھ لیا، تیسری مرتبہ پھر آپ نے یہی فرمایا کسی نے علیؓ کو بلا لیا۔ جب آپ نے علیؓ کو دیکھا تو انھیں اپنی چادر میں لے لیا جس کو آپ اُوڑھے ہوئے تھے اور برابر اسی طرح لئے رہے یہاں تک کہ حضرت کی روح مبارک نے جسم سے پرواز کی تو آپ کا ہاتھ علیؓ کے اوپر تھا[1]

(نگار) اس میں شک نہیں کہ شیعہ و سُنّی اختلاف کی بنیاد یہی مسئلۂ خلافت و امامت ہے اور اگر آج اس کا فیصلہ ہو جائے تو ان دونوں جماعتوں میں تفریق کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس کا امکان نہیں، کیونکہ جس مسئلہ پر ان دونوں مذاہب کی تفریق قائم ہے، اس کو میرے نزدیک اصل مذہب اسلام سے کوئی واسطہ نہیں اور جب کسی مذہب میں فروع کو اصول میں داخل کر لیا جاتا ہے تو وسعت نظر مفقود ہو جاتی ہے اور مفاہمت و اصلاح کی کوئی توقع باقی نہیں رہتی۔

شیعہ و سُنّی دونوں کا مذہب اُصول کے لحاظ سے ایک ہے۔ کیونکہ توحید و رسالت سے دونوں کو انکار نہیں، رہگیا یہ امر کہ رسول اللہؐ کے بعد خلافت و امامت کا مسئلہ رسول اللہ کی خواہش کے مطابق طے ہوا یا نہیں، یا یہ کہ جو کچھ ہوا وہ درست تھا یا نادرست، صرف سیاست و تاریخ سے متعلق ہے اور اس کو مذہب سے متعلق کرنا میرے نزدیک کسی طرح جائز نہیں۔

پھر جب یہ نزاع صرف تاریخ و سیاست کی نزاع ہے، تو ہمیں اسی حیثیت سے اس پر نگاہ ڈالنا چاہئے اور اس اختلاف کی نوعیت بھی وہی ہونی چاہئے جو دو مختلف الخیال مورخین یا ماہرین سیاست کے اختلاف کی ہوتی ہے۔ اس کو اخروی جزا و سزا، بہشت و دوزخ یا بخشایش و عدم بخشایش سے کیا واسطہ؟

بہرحال میں آپ کا مضمون شایع کئے دیتا ہوں اور کوشش کروں گا کہ علمائے اہلِ سنت کے خیالات اس باب میں حاصل کر کے انھیں بھی شایع کر دوں تاکہ جس حد تک روایات مذہبی کا تعلق ہے یہ مسئلہ فریقین کی جانب سے منقح ہو جائے اور اس کے بعد اگر ضرورت ہوئی تو میں اپنی رائے بھی پیش کر دوں گا۔

نیاز

---

[1] ریاض نضرہ مطبوعہ مصر جلد ۲ صفحہ ۱۸۰ -

چند دلچسپ نتائج مطالعہ

قدیم تہذیب ہند و بابل سندھ میں محکمۂ آثار قدیمہ کی تحقیق و کاوش سے جو کتبے و نقوش عہد عتیق کے دستیاب ہوئے ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی وقت بابل و ہندوستان دونوں ایک ہی تہذیب و معاشرت کے پابند تھے اور ہندوستان کے قدیم باشندوں ([illegible]) کے متعلق یہ خیال کہ وہ سواحل بحر متوسط سے بلوچستان ہوتے ہوئے سندھ پہونچے تھے بڑی حد تک درست ہے۔

قدیم بابلی و ہندی رسم الخط کی مماثلت جو ذیل کے نقشہ سے ظاہر ہوتی ہے غالباً اس نظریہ کا کافی ثبوت ہے کہ عہد قدیم میں ہندوستان اور ایشیائے کوچک تہذیب و حضارت کے لحاظ سے ایک ہی چیز تھے۔

ہندی	بابلی	سنہ قبل مسیح	تلفظ	معنی
		۲۸۰۰	خا	مچھلی
		۲۹۰۰	سار	۳۶۰
		۳۰۰۰	غال	بڑا
		۳۰۰۰	ساغ	دل، قلب
		۲۸۰۰	باد	مُردہ
		۳۰۰۰	کو	تنک
		۲۸۰۰	سو	ہاتھ
		۲۸۰۰	اوس	پردہ، آڑ
		۳۰۰۰	ای	گھر

ایک دلچسپ تمثیل

ژان دی لافانیتی نے "دو مرغ" کے عنوان سے فتح و نصرت پر نہایت دلچسپ تمثیلی رنگ میں اظہار خیال کیا ہے۔ لکھتا ہے:۔

دو مرغوں میں نہایت گہری دوستی تھی جب ایک مرغی کا قدم درمیان آیا تو فوراً جنگ چھڑ گئی۔

اے عشق! تو نے ٹرائے کو تباہ و برباد کر دیا اور تو ہی وہ تھا جس نے کہ دریائے زنتھس کو دیوتاؤں کے خون سے رنگین کر دیا۔

ہمارے دونوں مرغ ضد اور ہٹ سے باہم گر بہت عرصہ تک لڑتے رہے اور جنگ کی شہرت سارے قرب و جوار میں پھیل گئی ـــــ تماش بینی دار شرفا اس نظارے کو دیکھنے جمع ہو گئے اور آخر کار فاتح کو ایک سے زیادہ حسین بال و پر والی مرغیاں انعام میں عطا کی گئیں۔ مفتوح مرغ فرار ہو گیا، اس نے اپنے آپ کو تنہائی و عزلت کے پردوں میں چھپا لیا اور اپنی کھوئی ہوئی عظمت پر اپنی محبوبہ کے لئے آہ و بکا کرنے لگا۔ وہ محبوبہ، جس پر ایک رقیب نے فتح پا کر خود اس کی نگاہوں کے سامنے قبضہ کر لیا تھا۔ یہ خیال اس کے دل میں روزانہ نفرت اور شجاعت کی آگ بھڑکاتا رہتا تھا۔ اس نے اپنی چونچ تیز کی، اپنے بازو ہوا میں پھٹ پھٹا کے ورزش کی، اور حاسدانہ قہر و غضب سے اپنے آپ کو مسلح کیا ـــــ یہ سب بہرحال محض بیکار تھا ـــــ فاتح چھت پر پہونچا اور وہاں اپنی فتح کے راگ گانے لگا ایک عقاب نے اس کی تیز اور چبھتی ہوئی آواز سنی۔ آخر کار اس کا سارا گھمنڈ عقاب کے پنجوں کا شکار ہو گیا۔ اور اس کا رقیب اس کی محبوبہ کے ساتھ عیش میں مصروف ہو گیا۔

تقدیر پر بھروسہ بیکار ہے اگر فتح کے بعد اپنی حفاظت کا خیال دل سے محو ہو جائے۔

غالب کے چار شعر

بیا و جوشش تمنائے دیدنم بنگر — جو اشک از سرِ مژگاں چکیدنم بنگر
زمن بہ جُرم تپیدن کنارہ می کردی — بیا بخاکِ من و آرمیدنم بنگر
شنیدہ ام کہ نہ بینی و نا اُمید نیم — نہ دیدنِ تو شنیدم، شنیدنم بنگر
دمید دانہ و بالید و آشیانگہ شد — در انتظار ہماں دام چیدنم بنگر

بھوت پریت اور شیخ محمد عبدہ

شیخ محمد عبدہ کے ایک تلمیذ رشید کا بیان ہے کہ ایک بار تفسیر کا درس ہو رہا تھا اور علامہ شیخ محمد عبدہ کسی ایسی آیت کی تفسیر بیان کر رہے تھے جس میں بھوت پریت کا بھی ذکر ضمناً آ گیا۔ انھوں نے ایک واقعہ خود اپنا بیان کیا کہ:۔

"میں بہت کمسن تھا ایک رات کسی گلی سے گزرنے کا اتفاق ہوا، جو تنگ تھی تاریک تھی اور لوگوں میں بھوتوں کا

مسکن ہونے کی وجہ سے بہت بدنام تھی، تھوڑی دیر میں میں نے ایسا محسوس کیا کہ کوئی شخص گاڑی پر بیٹھا ہوا میرا تعاقب کر رہا ہے، خوف سے میں نے قدم تیز کر دئے تو گاڑی کی آواز اور زیادہ تیز ہوگئی اور میں گھبرا اُٹھا۔ لیکن اس واقعہ میں حقیقت صرف اتنی تھی کہ میں نے کپڑے بغیر دُھلے ہوئے نئے پہنے تھے اور میرے خوف نے ان کی سرسراہٹ کو گاڑی کی آواز میں تبدیل کر دیا۔"

حقیقت یہ ہے کہ بھوت پریت کے جتنے افسانے مشہور ہیں وہ سب واہمہ کی خلاقیاں ہیں اور ان کی اصلیت کچھ نہیں

حُسنِ اتفاق کی عجیب مثال

ہکسلے انگلستان کا نہایت مشہور مفکر و فیلسوف تھا، ایک بار وہ کسی لڑکے کا امتحان لے رہا تھا، یہ لڑکا اس کے ہر سوال کا جواب صحیح صحیح دیتا تھا اور ہکسلے حیران تھا۔ آخر کار اس نے سوچا کہ اس سے کوئی ایسا سوال کرنا چاہئے جس کا جواب دینا اس کے امکان میں نہ ہو۔ چنانچہ اس نے پوچھا کہ "فلاں جھیل کتنی بلندی سے گرتی ہے"۔ یہ جزیرۂ جمیکا کی ایک نہایت معمولی جھیل تھی جس کا علم بھی لوگوں کو نہ تھا لیکن ہکسلے خود ایکبار دوران سفر میں وہاں مقیم ہوا تھا۔

لڑکے نے اس سوال کا جواب بھی بغیر کسی تامل کے دیا اور کہا کہ "جس جھیل کو آپ پوچھ رہے ہیں وہ ۲۲۶ فٹ کی بلندی سے گرتی ہے"۔

ہکسلے نے گھبرا کر کہا کہ "تو انسان ہے یا کوئی اور مخلوق جو ہر بات سے واقف ہے"۔ اس نے کہا کہ "یہ جھیل تو میرے باپ کی ملکیت ہے اور میں وہیں پلکر بڑا ہوا ہوں، مجھے اس کا حال نہ معلوم ہوگا تو کیا آپ کو ہوگا"۔

مومن کی بعض لطیف فارسی ترکیبیں

موئے نہ عشق میں جب تک وہ مہرباں نہ ہوا
بلائے جاں ہے وہ دل جو بلائے جاں نہ ہوا

وہ آئے بہر عیادت تو تھا میں شادیِ مرگ
کسی سے چارۂ بیدادِ آسماں نہ ہوا

لگی نہیں ہے یہ چُپ لذتِ ستم سے کہ میں
حریفِ کشمکشِ نالہ و فغاں نہ ہوا

شکر اثر تھا گلۂ دشمناں
نالہ مرے کام سے یار وگیا

یہ عذرِ امتحانِ جذبِ دل کیسا نکل آیا
میں الزام اس کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

پھرنے سے شام وعدہ تھکے یہ کہ سو رہے | آرام شکوۂ ستم اضطراب تھا

دیتے تکلیف شب ہجر میں آہ، اپنے پاس | نقد جاں پیشکش مرگ کے قابل نہ ہوا

جوش قلق نے اس کو بھی دیوانہ کر دیا | پہلے تو ورنہ طبع تحمل میں رم نہ تھا

میری نگاہ خیرہ دکھاتے ہیں غیر کو | بیطاقتی پہ سرزنش ناز دیکھنا

محو جفا کشاکش الطاف کب ہوا | رحم اس کو میرے حال پہ آیا غضب ہوا

کیا رشک غیر تھا کہ تحمل نہ ہو سکا | میں جانکر حریف تغافل نہ ہو سکا

شعلۂ دل کو نازِ تابش ہے | اپنا جلوہ ذرا دکھا دینا

فلسفۂ لذت

عرب کا ایک شاعر، ایک خاتون سے محبت کرتا تھا اور اُس کے عدم التفات نے اس کو دیوانہ بنا رکھا تھا۔ اس کے فراق میں اشعار کہتا تھا، اس کی گلی میں جا جاکر بلند آواز سے وہ اشعار گاتا تھا تاکہ کسی طرح محبوبہ کے کان تک اس کی التجائے شوق پہونچ جائے۔

اتفاق سے یہ خاتون اور اُس شاعر کی بیوی دونوں ایک دوسرے سے واقف تھیں جس کا علم اُس کو نہ تھا۔۔۔

ایک دن خاتون نے اس کی بیوی سے کہا کہ "تمھارے شوہر نے ناک میں دم کر رکھا ہے اور کسی طرح پیچھا ہی نہیں چھوڑتا، کیا کروں، سخت حیران ہوں" وہ اپنے شوہر کی یہ حرکت معلوم کرکے بہت نادم ہوئی، اور دونوں نے باہم مشورہ کرکے ایک تدبیر سوچ لی۔

اس کے دوسرے ہی دن عاشق مہجور پھر اس کی گلی سے اشعار گاتا ہوا نکلا۔ یہ گھر سے باہر نکل آئی اور نہایت محبت آمیز لہجہ میں اظہار ہمدردی کرتے ہوئے کہا کہ "آج رات کو میں تم سے ملونگی، آدھی رات کے بعد یہ دروازہ کھول کر خاموشی سے اندر آجانا"

یہ سُنکر جو حالت عاشق کی ہوئی ہوگی ظاہر ہے۔ شام کرنا مشکل ہوگیا، لیکن چونکہ اپنی بیوی سے ڈرتا بھی بہت تھا، اس لئے

وہ سوچ رہا تھا کہ کس بہانہ سے گھر چھوڑے، اتفاق سے شام کو اس کی بیوی بھی کسی ضرورت سے اپنے ایک عزیز کے یہاں چلی گئی اور اس لئے یہ خلش بھی اس کی دور ہوگئی۔

رات کو حسب قرارداد، یہ اپنی محبوبہ کے مکان پر پہونچا اور دروازہ کھلا پاکر اندر چلا گیا۔ لیکن کمرہ بالکل تاریک تھا۔ اس نے کہا کہ روشنی کیوں نہیں ہے تو اس خاتون نے نہایت آہستگی سے جواب دیا کہ "چُپ چاپ رہو، کوئی سن لیگا"

الغرض جب اسی تاریکی میں "شوق وصل و شکوۂ ہجراں" سبھی کچھ بیان ہوگیا۔ تو وہ خاتون اُٹھی اور چراغ روشن کر کے ایک ایسا دو ہتڑ اُس کی پیٹھ پر لگایا کہ حواس گم ہوگئے۔ اب جو یہ آنکھ اُٹھا کر دیکھتے ہیں تو سامنے بیوی کھڑی ہوئی ہے۔

اس وقت جو جواب شاعر نے دیا وہ نکاہی و نفسیاتی ہر لحاظ سے عجیب و غریب تھا۔ اس نے مار کھانے کے بعد منھ پھیر کر اپنی بیوی کو دیکھا اور نہایت سنجیدگی سے کہا کہ :-

"واللہِ ما اروک حلالاً و ما اطیبکِ حراماً"

یعنی قسم خدا کی حلال ہونے کی حالت میں تو کیسی ذلیل تھی لیکن آج حرام ہونے کے بعد کتنی پرلطف ثابت ہوئی!

باب المراسلة والمناظره

ادارۂ فحاشی اور مرد

(اختر ریحانہ - دہلی)

نیاز صاحب، تسلیم

شاید آپ اس کو اپنے موقر رسالہ کی توہین سمجھیں گے کہ مجھ جیسی "لعنت زدۂ روزگار" بھی اس کو دیکھے، اگست ۳۴ء کے رسالہ میں دفعتاً "کسبی" کا عنوان دیکھکر کچھ حیرانی سی ہوئی ـ پڑھنا چاہتی تھی ـ لیکن یہ خیال کرکے رک گئی کہ روزانہ ۲۴ گھنٹوں میں لعنت و نفریں کے جو جوتے میرے سر پر پڑتے رہتے ہیں انھیں کو کسی نئے قالب میں ڈھالکر آپ نے بھی اپنے رسالہ کی زینت بنایا ہوگا ——— "ان سے بچو، یہ رنگین ناگنیں آدمی کو دونوں جہان میں کہیں کا نہیں رکھتیں، ان کی روح داغدار ہوتی ہے اور انکی ہر حرکت سراسر معصیت وغیرہ وغیرہ ———" مگر پہلی سطر پڑھنے کے بعد خود بخود آگے پڑھتی چلی گئی حتی کہ سارا مضمون ختم ہوگیا' اگرچہ فاضل مضمون نگار کے منطقی استدلال اور عالمانہ طرز بیان کو بخوبی نہ سمجھ سکی' تاہم کئی بار پڑھا اور سمجھنے کی کوشش کی ـ حیران تھی کہ یا خدا یہ کس کی جرأت ہے جو ساری سوسائٹی کو علانیہ چیلنج دے رہا ہے ؟ پھر اس کے بعد کے تمام رسالوں کو اشتیاق سے دیکھتی رہی لیکن تعجب تھا کہ کسی "مرد خدا" نے اس کے خلاف آواز کیوں بلند نہیں کی ـ اپنے ذہن میں اسکی مختلف تاویلیں کرتی تھی ـ بالآخر فروری کا نگار آیا' دیر تک دیکھتی رہی، سوچتی رہی ——— اور روتی رہی !

نیاز صاحب، سب کہتے ہیں کہ کسبی بری ہے لیکن خدا کے لئے مجھے یہ بتلا دیجئے کہ ان کہنے والوں میں سے کتنے ایسے ہیں جنھوں نے اپنی زندگی میں کم از کم دو چار معصوم لڑکیوں کو کسبی نہ بنایا ہو' جا بجا اور

انکی زندگیوں کو ٹٹول کر دیکھئے کہ ان کے چچا اور پھوپھی کی لڑکیاں، ان کے گھر میں آنے جانے والیاں، ان کے گھر کی خادمائیں، ان سے پڑھنے والی بچیاں ـــــــ غرض کہ کتنی ہیں جنکو یہ "معصوم فرشتے" محبت اور خلوص کے نام پر، ادب و شاعری کے نام پر، نکاح و شادی کے نام پر، بلند ذوقی اور رومانیت کے نام پر، رشتہ داری اور قرابت کے نام پر، مستقبل کی خوشگوار توقعات کے نام پر ـــــــ دن رات رومالوں، ناولوں، شب تاچوں، انگوٹھیوں اور ساریوں کے تحفے پیش کرکرکے "کسبی" بناتے رہتے ہیں !!

نیاز صاحب، کون ماں کے پیٹ سے افلاطون اور ارسطو بنکر پیدا ہوتا ہے! لڑکی کا بھی یہی حال ہے۔ پھر اگر وہ خاموش، شرمناک اور بالکل سادہ ہو، داغ اور جلیل کے اشعار کو نہ سمجھتی ہو اور نہ پڑھتی ہو تو "تعلیم یافتہ" نوجوان کی نظروں میں وہ "منہ لگانے" کے قابل نہیں۔ اور اس لئے فطرتاً والدین کے کندھوں پر ایک مستقل عذاب ـــــــ لیکن اگر وہ ذہین ہے، طباع ہے، چست و چالاک ہے تو پھر اس کا وہ حشر ہوتا ہے جو ابھی عرض کیا گیا

نیاز صاحب، میں اپنی داستان لے کر بیٹھنا نہیں چاہتی لیکن اتنا کہوں گی کہ مجھے میری زندگی کے بارھویں سال سے جس نے "کوٹھوں" پر بھیجنے کے لئے تیار کیا وہ میرا "روحانی باپ" تھا اور میرا خالہ زاد بھائی تھا میرے سامنے زندگی کو جسطرح پیش کیا گیا مجھے اسی طرح سمجھنا چاہئے تھا۔ حتیٰ کہ خواب ختم ہوا، آنکھ کھلی اور میں تنہا تھی !!

مسجدوں کے ملا، کالجوں کے طلبہ، اخباروں کے اڈیٹر، ادیب، انشا پرداز، شاعر، واعظ، بڑے اور چھوٹے ـــــــ یہ سب چاہے آپس میں کتنے ہی مختلف الخیال کیوں نہ ہوں لیکن "عورت" کو درجہ بدرجہ اس انحطاط تک پہونچانے میں ایک حیثیت سے ایک دوسرے کے شریک ہیں۔

نیاز صاحب، یہ کسبی کو برا کہنے والے کبھی اپنے دل پر ہاتھ رکھکر یہ بھی غور کرتے ہیں کہ ان کے قبا کے دامن میں کتنی کسبیاں چھپی ہیں۔ اور یہ معصیت سے روکنے والے راست کردار، کبھی اپنے گریبان میں منہ ڈالکر یہ بھی دیکھتے ہیں کہ وہ دن رات کتنی لڑکیوں کو (حسب استطاعت) اپنی نظروں، گفتگوؤں، شعروں، مضمونوں اور خطوں سے دن رات زینت آغوش بنانیکی سعی کرتے رہتے ہیں ـــــــ خدا کی قسم یہ جھوٹے ہیں، اگر ان کا بس چلے تو پہلے یہ ساری کائنات کو لڑکی بنا دیں اور پھر ہر لڑکی کو کسبی

نیاز صاحب، آپ خفا ہوں گے کہ ایک لڑکی اور اتنی منہ پھٹ، لیکن آپ کو کیا معلوم کہ میں نے اس رسالہ کو پڑھنے کے بعد سے کتنی مرتبہ آپ کو خط لکھنے کا ارادہ کیا اور پھر نہ معلوم کن کن چیزوں سے ڈر کر رک گئی۔ اور اب جو لکھ رہی ہوں تو کتنی رک رک کر،

نیاز صاحب، آپ کسی طرح میری حالت کا صحیح تصور نہیں کر سکتے۔ دنیا کا ہر قریب و بعید انسان ہم کو کسی نہ کسی طرح "کھانا چاہتا ہے" اور پھر کھا لینے کے بعد ہم سے اس لئے نفرت کرتا ہے کہ اس نے ہمیں کیوں "کھایا"

نہ معلوم میں آپ کو یہ لکھ کیوں رہی ہوں ۔ لیکن اگر میں اپنی شخصیت کو اس سے زیادہ بے نقاب کرنے سے
نہ ڈرتی تو آپ سے پوچھتی کہ "حجاب بزمی" کون ہیں، تاکہ میں ان سے براہ راست یہ معلوم کر سکتی کہ اس مضمون
کے لکھنے کے بعد ان کے حلقۂ احباب نے کیا گوشمالی کی ۔

(**نگار**) جس حد تک آپ کے ذاتی حالات و واقعات کا تعلق ہے میں سوائے اس کے کیا عرض کر سکتا ہوں کہ یقیناً آپ پر بہت ظلم کیا گیا
لیکن سوال یہ ہے کہ ان تمام بلند شریفانہ احساسات کے نشو و نما پانے کے بعد آپ نے عملاً احتجاج کی کوئی صورت اختیار کی یا نہیں۔ اسمیں
شک نہیں کہ ایک انسان کسی مخصوص ماحول میں عرصہ تک زندگی بسر کرنے کے بعد کچھ ایسا مجبور ہو جاتا ہے کہ نہ اس ماحول سے علیحدہ ہونے کی
جرأت اس میں باقی رہتی ہے اور نہ سوسائٹی کی طرف سے ہمت افزائی ہوتی ہے، تاہم انسانی آبادی میں اگر سو شیطان ہیں تو دو چار انسان
بھی مل جاتے ہیں اور متعدد مثالیں اس امر کی ملیں گی کہ آپ ایسی احساس رکھنے والی عورتوں کا جواب کافی ایثار و ہمدردی سے دیا گیا
بہر حال یہ آپ کے مخصوص حالات ہیں اور ان کے متعلق میں یا کوئی کیا کہہ سکتا ہے جب تک تفصیلی علم نہ حاصل ہو۔ لیکن اس میں کلام نہیں کہ
سوسائٹی کی عام اخلاقی حالت کا جو اندازہ آپ نے کیا ہے وہ بالکل صحیح ہے اور پیشہ ور عورتوں سے کہیں زیادہ قابل الزام وہ مرد ہیں
جو بظاہر نہایت مہذب و شائستہ، حد درجہ شریف و مستعلیق نظر آتے ہیں، لیکن اپنے اخلاق کے لحاظ سے حقیقتاً وہ بھیڑیے ہیں جو بھیڑ کی کھال
اوڑھے ہوئے آہستہ آہستہ سماج میں ہلاکت پھیلا رہے ہیں ۔

اس میں شک نہیں کہ مرد، عورت کا تعلق بالکل فطری چیز ہے اور چونکہ اس تعلق میں مرد کے اندر قدرتاً ایک ہلکی سی کیفیت
عجز و فتادگی کی پیدا ہوتی ہے، اس لئے آج نہیں، بلکہ عہد وحشت ہی میں مرد نے اپنی اس جذباتی کمزوری کو اپنی جسمانی قوت سے پورا کرنا
چاہا اور باوصف اس کے کہ اسکی روح عورت کے لئے یکسر التماس و سوال تھی، اس نے اپنے اعصاب کی قوت، ہاتھ پاؤں کی مضبوطی،
اور پھاڑ کھانے والی جسمانی طاقت کا مظاہرہ کر کے، اپنے اس عجز کو کبھی عورت پر ظاہر ہونے نہیں دیا اور اس کے اندر ہمیشہ یہ غلط احساس
پیدا کیا کہ وہ مرد کی حفاظت کی محتاج ہے، اور تنہا کچھ نہیں کر سکتی ——

اس کے بعد جب ذہنی و تمدنی ترقی وسیع ہوئی تو مرد کا یہ احساس بھی اس کے ساتھ بڑھتا رہا لیکن اس فرق کے ساتھ کہ پہلے
عورت کو مجبور و پابند رکھنے کے لئے کوئی خاص قاعدہ نہ تھا، اور اب اس نے عورت کو شکنجہ میں کسنے اور اپنے آپ کو آزاد رکھنے کیلئے
آئین و قانون وضع کرنے شروع کئے ۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ قرونِ ماضیہ میں ایک زمانہ ایسا بھی گذرا ہے جب عورت برسر اقتدار تھی اور کہا جاتا ہے کہ
اس کا ثبوت ان دیویوں کا وجود ہے جو عہد قدیم کے صنمیات میں پائی جاتی ہیں ۔ لیکن میرے نزدیک یہ قیاس درست نہیں ۔
کیونکہ عہد وحشت کے مرد کا کسی دیوی کی پرستش کرنا حقیقتاً صرف احساسِ عجز کی بنا پر تھا جو فطری طور پر عورت کے مقابلہ میں اس کے

اندر پایا جاتا تھا، لیکن جس حد تک کاروبار دنیا کا تعلق ہے اس نے ہمیشہ اپنی ہی پرستش عورت سے کرائی اور اپنی خواہشات کے مقابلہ میں اس کے جذبات کی کبھی پرواہ نہیں کی۔ عورت کی رضامندی حاصل کئے بغیر اس کو بیوی بنالینا، ایک ہی وقت میں متعدد مردوں سے تعلق رکھنے پر مجبور کرنا، جب چاہنا چھوڑ دینا اور جب جی میں آئے قیمت ادا کرکے دوسری عورت لے آنا، اور اس سے بھی زیادہ ماں بہن کی تمیز اٹھا دینا، یہ سب مرد ہی کے قابل فخر کارنامے ہیں اور تاریخ عالم میں کوئی زمانہ عورت پر ایسا نہیں گذرا جب خود اس نے ان بدتمیزیوں کی ابتدا اپنی طرف سے کی ہو۔ اس کے ساتھ طرفہ تماشہ یہ ہے کہ پہلے تو خود اسی نے عورتوں کی آبروریزی کی۔ خود ہی ان کو عصمت فروشی پر مجبور کیا۔ اور پھر خود ان کو حقارت کی نظر سے دیکھنے لگا۔

آج مرد "ادارۂ فحاشی" کو انسانیت کے لئے ذلت و لعنت قرار دیتا ہے، مالی تباہیوں کا ذمہ دار پیشہ ور عورتوں کو قرار دیتا ہے، مکروہ بیماریوں اور نسلی خرابیوں کا سبب کسبیوں کو ظاہر کرتا ہے، لیکن اس حقیقت سے بے خبر ہے کہ یہ لعنت اسی کی لائی ہوئی ہے، یہ بربادیاں اسی کے ہاتھوں نے پیدا کی ہیں اور یہ جسمانی و اعذاریاں خود اسی کے وحشیانہ جذبات کا نتیجہ ہیں۔ اگر آج کوئی شخص اس تحقیق میں کامیاب ہو جائے کہ دنیا میں کس مخصوص خاندان یا قبیلہ سے فحاشی کی ابتدا ہوئی تو یقیناً اس خاندان یا قبیلہ کی سب سے پہلی وہ عورت جس نے اول اول فحاشی اختیار کی ہو گی وہی ہو گی جسے پہلے مرد نے خراب کیا ہو گا اور پھر بعد کو غارت حسن و شباب کے بعد ذلت کی زندگی بسر کرنے کے لئے گھر سے باہر نکال دیا ہو گا۔

ایک معلم اخلاق احتجاج کرتا ہے کہ کسبیوں کے وجود سے دنیا کو پاک کر دینا چاہئے، لیکن اگر ہمارے کان ہوں تو ہم سنیں کہ عورت کی فریاد کیا ہے اور وہ کس کس طرح مرد سے پناہ مانگ رہی ہے جو اسے کسبی بننے اور کسبی رہنے پر مجبور کر رہا ہے۔ ایک "ڈاکٹر" قوم کے نوجوانوں کی بیماریوں کا سبب پیشہ ور عورتوں کو بتا کر ان کے فنا کر دینے کا مشورہ دیتا ہے۔ حالانکہ اصولاً وہ خود مردوں کے مٹا دئے جانے کا مطالبہ کر سکتی ہیں، جنھوں نے ان کو یہ تمام بیماریاں لگائیں اور جو تمامتر ان کی اور اپنی خرابی صحت کے ذمہ دار ہیں ——

آپ نے اس باب میں جو کچھ لکھا ہے اس سے مجھے حرف بحرف اتفاق ہے، اور اس میں مطلقاً شک کی گنجائش نہیں کہ وہ لوگ جو آج عمر ڈھل جانے کے بعد اپنے آپ کو بڑا پرجوش معلم اخلاق کہتے ہیں، حقیقتاً وہی ہیں، جن کی جوانی سب سے زیادہ ناپاک بسر ہوئی ہے اور جنھوں نے خانقاہوں کے حجروں میں بیٹھ کر "قحبہ" بازار پر بیٹھنے والی کسبیوں سے زیادہ ادارۂ فحاشی کے رواج میں مدد دی ہے۔

بہرحال ماضی کے استبداد نے جو طرح جور و ستمرانی کی ڈالدی ہے اس کے اثرات تو اب مٹ نہیں سکتے اور یہ ناممکن ہے کہ وہ مرد جو پہلے علانیہ عورت کی عصمت کو خراب کر دیتا تھا، اب چوری چھپے بھی اس حرکت سے باز آجائے، لیکن اس دور میں ایک انقلاب ضرور آنے والا ہے، جو یقیناً فحاشی کا محو کرنے والا تو نہ ہو گا، لیکن اس کی نوعیت کو بدل کر مرد سے اس کی گذشتہ تخریب اخلاق کا انتقام عورت کی طرف سے لے کر رہے گا۔

عورت جب تک جاہل تھی، نہ وہ اپنے جائز حقوق سے آگاہ تھی نہ ان عطایائے فطرت سے جو مرد ہی کی طرح اس کی خلقت میں بھی ودیعت کئے گئے تھے۔ لیکن اب کہ وہ اپنی اہمیت اور اپنی دماغی صلاحیت سے واقف ہو گئی ہے وہ مرد سے بے نیاز ہوتی جا رہی ہے اور

اپنا وجود علیحدہ قائم کرنے میں مرد کے جذبات اسی طرح ٹھکرا دے گی، جس طرح اب سے قبل مرد کیا کرتا تھا۔

مجھے نہیں معلوم کہ آپ کو کبھی جدید تعلیم یافتہ عورت کے مطالعہ کا موقع ملا ہے یا نہیں، لیکن بدقسمتی یا خوش قسمتی سے چونکہ مجھے روز اس کی فرصت نصیب ہو جاتی ہے اس لئے میں جانتا ہوں کہ وہ مرد سے گذشتہ مظالم کا انتقام کس کس طرح لے رہی ہے اور وہی مرد جو پہلے عورت کی ذرا سی بدعنوانی پر تیغ خاراشگاف لے کر کھڑا ہو جاتا تھا اب اس کے سینہ پر عورت کیسی کیسی چھریاں چلا رہی ہے اور وہ ہے کہ خون کے سے گھونٹ پی پیکر رہجاتا ہے۔ اس نے مرد کے بنائے ہوئے قانونِ اخلاق کو پارہ پارہ کرکے رکھ دیا ہے، اسنے مرد کے تراشے ہوئے آئینِ شرم و حیا کو ٹھکرا کر اس کے منہ پر کھینچ مارا ہے، اور اب وہ مرد کے کام و دہن کو ان تمام تلخیوں کے گوارا کرنے پر مجبور کر رہی ہے جو کسی وقت عورت کو گوارا کرنے پڑے تھے ــــ الغرض اب عورت آزاد ہے، جسمانی و اخلاقی دونوں حیثیتوں سے، پہلے وہ مرد کا کہنا ماننے پر مجبور تھی کیونکہ کسب معاش میں اس کا کوئی حصہ نہ تھا، لیکن اب کہ وہ مردوں کے دوش بدوش ہر کام پر آمادہ ہے، اور اپنی پردہ بالی کی بندشیں علیحدہ کر چکی ہے، اپنا قانون اخلاق و معاشرت خود علیحدہ بنائے گی اور مرد کو اس کی پابندی پر مجبور ہونا پڑیگا، خواہ اس کو کتنے ہی "جور رقیب" کے صدمے کیوں نہ اٹھانا پڑیں ــــ

پھر آپ کو معلوم ہے کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا ــــ جب عورت کی آزادی کی انتہا ہو جائے گی، جب سارا عالم موجودہ اصول اخلاق کے لحاظ سے یکسر ادارۂ فحاشی ہو کر رہ جائے گا، جب عورت کی وفاداری و عصمت کا مفہوم سوائے اس کے کچھ نہ ہوگا کہ وہ کسی کی طرف مائل ہے اور کسی کی طرف نہیں ــــ اُس وقت مرد، مجبور و ذلیل مرد، اخلاق و معاشرت کا ایک جدید قانون مرتب کرے گا، جسمیں نہ رشتۂ ازدواج کوئی چیز رہے گا، نہ ضبطِ نفس و جذبات، دنیا ایک فردوس ہوگی "خیالی" نہیں "عملی" احساسی جیتی جاگتی ــــ جہاں عورت مرد کے ساتھ کھیلتی رہے گی جب تک اس کا جی چاہے اور مرد عورت کے ساتھ کھیلتا رہے گا جب تک عورت اس کی اجازت دے ــــ پھر اس زندگی کے جدید نظرئے قائم ہوں گے، بہت سی نفسیاتی پاکیزگیوں کا وجود ان میں ثابت کیا جائے گا ــــ اور ــــ ہرچند اس وقت بھی مرد میں اتنی جرأت تو نہ ہوگی کہ وہ اپنی عورتوں کو کسبی کہہ سکے، لیکن کسبیوں کے سامنے اپنی آغوشِ کھول کر یہ کہنے میں، اس کو مطلق دریغ نہ ہوگا کہ

"بیا بیا عراقی تو زخاصگان مائی"

باب الاستفسار

علامہ ابن تیمیہ

(جناب غلام جیلانی صاحب برق - ام - اے - گورنمنٹ کالج ہشیار پور)

۱- ابن تیمیہ کے سوانح حیات کس کتاب میں مفصل ملیں گے۔

۲- عربی، انگریزی، فارسی یا اردو زبان میں اگر کوئی کتاب اس موضوع پر جناب کے علم میں ہو تو مطلع فرمائیے۔

۳- ابن تیمیہ کے تمام تصانیف کی تعداد کیا ہے۔ اب کسقدر باقی ہیں اور ہندیا مصر میں کتنی دستیاب ہو سکتی ہیں۔

۴- کیا آپ نے بہ سلسلہ استفسارات اس موضوع پر کبھی روشنی ڈالی ہے۔

(نگار) (۱)-(۲) — ابن تیمیہ کے حالات آپ کو جن کتابوں سے مل سکتے ہیں، ان کی فہرست حسب ذیل ہے۔

طبقات الحفاظ (السیوطی) — تذکرۃ الحفاظ (الذہبی) — فوات الوفیات (القطبی) — طبقات (السبکی) — تاریخ ابن الوردی — جلاء العینین (آلوسی) —

علاوہ ان کے ایک کتاب "الکواکب الدریّہ فی مناقب ابن تیمیہ" مرعی بن یوسف الکرمی کی ہے، جس میں صرف ابن تیمیہ کے حالات سے بحث کی گئی ہے۔

(۳) کہا جاتا ہے کہ ابن تیمیہ نے ۵۰۰ کتابیں تصنیف کیں لیکن ان میں زیادہ سے زیادہ ۵۰ - ۶۰ باقی ہیں۔ ایک مجموعہ جس پر تقریباً ۳۰ رسائل جمع کر دئے گئے ہیں مجموعات الرسائل الکبریٰ کے نام سے شایع ہو چکا ہے اس کے خاص خاص رسالے یہ ہیں (۱) رسالۃ الفرقان بین حق والباطل (۲) معارج الوصول (یہ کتاب قرامطہ کے جواب میں لکھی گئی ہے جو کہتے تھے کہ انبیاء جھوٹ بول سکتے ہیں) (۳) التبیان فی نزول القران (۴) الوصیۃ الصغریٰ (۵) الوصیۃ الکبریٰ (۶) الارادۃ والامر وغیرہ۔

اور خاص خاص تصانیف یہ ہیں :- الفرقان بین اولیاء الرحمن و اولیاء الشیطان ——— الواسطہ بین الحق والخلق ——— رفع الملام عن الائمۃ الاعلام ——— کتاب التوسل والوسیلۃ ——— الجواب الصحیح لمن بدّل دین المسیح ——— الجوامع فی السیاستہ الالٰہیۃ والآیات النبویہ ——— تفسیر سورۃ النور ——— کتاب صارم المسلول علیٰ شاتم الرسول ——— المسئلۃ النصیریہ ——— کتاب الرد علی النصاریٰ ——— مسئلۃ الکنائس ——— الکلام علیٰ حقیقۃ الاسلام والایمان ——— کتاب فی اصول الفقہ ———

ان میں سے سب دستیاب ہوتی ہیں۔ بعض یہیں ہندوستان میں طبع ہوئی ہیں، بعض مصر میں اور بعض مستشرقین یورپ نے شائع کی ہیں (۲) نگار میں غالباً اس وقت تک کوئی مضمون ابن تیمیہ کے حالات پر شایع نہیں ہوا، مختصراً درج کرتا ہوں :-

اس کا پورا نام مع القاب و کنیت کے یہ ہے :- تقی الدین ابو العباس احمد بن عبدالحلیم بن عبدالسلام بن عبداللہ بن محمد بن تیمیۃ الحرانی الحنبلی ——— ۱۰ ربیع الاول ۶۶۱ھ کو بمقام حرّان پیدا ہوا۔ لیکن فتنۂ مغل کے وقت اس کے باپ نے مع اپنے تمام خاندان کے دمشق میں پناہ لی اور یہیں ہمارے ہیرو کی تعلیم شروع ہوئی۔ چونکہ اس کا باپ خود حنبلی فقہ کا بڑا ماہر تھا اس لئے علاوہ دیگر اساتذۂ وقت کے خود اپنے باپ سے بھی پڑھا۔ بیس سال کے عمر تک یہ فارغ التحصیل ہوگیا اور جب ۶۸۱ھ میں اس کے باپ کا انتقال ہوگیا تو یہ اس کا جانشین ہوا۔ یہ قرآن، حدیث و فقہ کا بڑا ماہر تھا لیکن چونکہ اپنے طریق استدلال میں نسبتاً زیادہ آزاد و روشن خیال تھا اس لئے اکثر قدامت پرست علماء اس کے دشمن ہوگئے تھے۔ ۶۹۱ھ میں یہ حج کی غرض سے مکہ گیا۔ ۶۹۹ھ میں بمقام قاہرہ اس نے صفات خداوندی کے متعلق ایک استفسار کا جواب ایسا دیا کہ شافعی جماعت اس سے برہم ہوگئی۔ اور پروفیسری کی خدمت اس کی چھن گئی۔ دوسرے سال وہ مغلوں کے خلاف تبلیغ جہاد کے لئے مامور کیا گیا اور جب دمشق کے قریب مغلوں سے جنگ ہوئی تو یہ اس میں شریک تھا۔ اس کے بعد ۷۰۴ھ میں اس نے اس جنگ میں حصہ لیا جو جبل الکسروان کے اسماعیلی و نصیری شیعوں کے خلاف قائم ہوئی تھی ——— ۷۰۵ھ میں جب یہ قاہرہ پہونچا تو اس کے خلاف عقیدہ "تجسیمیہ" کا الزام قائم کرکے مع اپنے دو بھائیوں کے دو سال کے لئے مقید کر دیا گیا۔ ڈیڑھ سال گذرنے کے بعد ۷۰۷ھ میں پھر اس کی ایک تصنیف کے خلاف ہنگامہ برپا ہوا لیکن چونکہ اس کے دلائل کا جواب کسی سے بن نہ پڑا اس لئے اصل الزام میں تو اسکو سزا نہ دی جا سکی لیکن مصالح سیاسی کے بنا پر وہ پھر مقید کر دیا گیا۔

اس کے بعد جب وہ قاہرہ آیا تو سلطان الناصر کا زمانہ تھا۔ یہ ابن تیمیہ کا بڑا طرفدار تھا اس لئے اس نے ابن تیمیہ کو اجازت دیدی تھی کہ وہ اپنے دشمنوں سے انتقام لے سکتا ہے، لیکن اس نے انکار کر دیا اور مدرسہ میں پروفیسر مقرر کر دیا گیا۔

۷۱۲ھ میں فوج کے ساتھ اسے شام جانے کی اجازت ملگئی اور دمشق پہونچکر اس نے پھر سلسلہ درس شروع کیا۔ ۷۲۰ھ میں پھر ایک فقہی مسئلہ کے اختلاف پر مقید کر دیا گیا لیکن چند ماہ کے بعد رہا ہوگیا۔ رہا ہونے کے بعد اس نے زیارت قبور انبیاء و اولیاء کے متعلق جو فتویٰ دیا اس پر سلطان نے اس کو پھر مقید کر دیا۔ یہاں وہ برابر تصانیف میں مشغول رہا، لیکن جب بعد کو معلوم ہوا کہ اس کی تمام تحریریں عقاید رائجہ کے خلاف ہیں تو وہ اس مشغلہ سے بھی محروم کر دیا گیا اور آخر کار ۷۲۸ھ میں وہ انتقال کر گیا۔

ابن تیمیہ، حنبلی مسلک رکھتا تھا، لیکن وہ مقلد نہ تھا بلکہ خود مجتہدانہ حیثیت سے رائے زنی کیا کرتا تھا۔ کواکب الدریہ میں بعض

ان مسائل سے بحث کی گئی ہے جن میں ابن تیمیہ نہ صرف تقلید بلکہ اجماع کا بھی قائل نہ تھا۔

یہ بدعت کا سخت مخالف تھا اور اسی لئے اس نے زیارت قبور کے خلاف فتویٰ صادر کیا تھا۔ وہ قرآن و حدیث میں تاویل کا قائل نہ تھا اور اسی لئے جو صفات الٰہیہ کلام مجید میں مذکور ہیں ان پر بالکل لغوی معنی کی حیثیت سے ایمان رکھتا تھا' چنانچہ ابن بطوطہ کی روایت ہے کہ

"ایک بار ابن تیمیہ نے دمشق کی مسجد جامع میں منبر پر بیٹھکر کہا کہ خدا آسمان سے زمین پر بالکل اسی طرح اترتا ہے' جیسے میں منبر سے اتروں" اور یہ کہکر وہ منبر سے اتر پڑا۔

اس کی فطرت نہایت سخت قسم کی مناظرانہ و مجادلانہ واقع ہوی تھی۔ اس نے تحریر و تقریر دونوں طرح سے خارجی' مرجی' رافضی' قدری' معتزلی' جہمی' اور اشعری عقاید کی مخالفت کی اور اسی لئے سب اس کے دشمن تھے۔ اس نے طلاق و نکاح کے بعض مسایل فقہیہ سے بھی اختلاف کیا۔ وہ اس کا قائل نہ تھا کہ ایک عورت طلاق مغلظ کے بعد کسی اور سے نکاح کرکے پھر اپنے شوہر اولیٰ کے عقد میں آسکتی ہے' وہ اجماع کے مخالفت کو کفر و فسق سے تعبیر کرنے کا بھی سخت مخالف تھا۔

وہ کہا کرتا تھا کہ خلفاء و صحابہ سے بھی غلطیوں کا امکان ہے اور انھوں نے بارہا غلطیاں کیں' چنانچہ اس نے کہا کہ حضرت عمر نے مسجد الجبل کے منبر پر بہت سی غلطیاں کیں' اسی طرح وہ جناب امیر کا تین سو غلطیاں کرنا ظاہر کرتا تھا۔ وہ غزالی' ابن عربی اور صوفیہ کا مخالف تھا۔ غزالی کی تصنیف "منقذ من الضلال" پر اظہار رائے کرتے ہوے کہتا ہے کہ جو فلسفہ اس میں پیش کیا گیا ہے بالکل غلط ہے۔ اسی طرح احیاء العلوم پر اس کو یہ اعتراض تھا کہ غزالی نے اس میں بہت سی موضوع احادیث سے استناد کیا ہے ۔۔ صوفیہ و متکلمین کو بھی وہ برا سمجھتا تھا اور ابن سینا کے فلسفہ کا بھی مخالف تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ اسلام میں مختلف فرقوں کا پیدا ہو جانا محض فلسفہ کے بدولت ہوا ۔۔۔۔۔۔ وہ یہود و نصاریٰ کا بھی شدید دشمن تھا۔

اس کے مخالفین میں سے خاص خاص لوگ یہ تھے :۔ ابن بطوطہ ۔ ابن حجر الہیثمی ۔ تقی الدین السبکی ۔ عبدالوہاب ۔ ابوحیان ۔۔ اور موافقین میں ابن قیم الجوزی ۔ الذہبی ۔ ابن قدامہ ۔ ابن الوردی ۔ محمود الآلوسی قابل ذکر لوگ ہیں۔

مطبوعات موصولہ

زوالِ غازی

یہ تاریخ ہے امان اللہ خاں فرماں روائے کابل کے زوال اور اس انقلاب کی جس نے چند دنوں کے لئے بچہ سقہ ایسے معمولی انسان کو افغانستان کے تخت و تاج کا مالک بنا دیا تھا۔

یہ کتاب کسی ایسے شخص کی لکھی ہوئی نہیں ہے جو زبانی روایات، یا جراید و رسائل کی اطلاعات سے آگے نہ بڑھ سکتا ہو، بلکہ ایک ایسے واقف احوال شخص کی تصنیف ہے جو کابل دس سال تک افغانستان میں رہ چکا ہے، اور جس نے انقلاب کے تمام خونیں مناظر اپنی آنکھ سے دیکھے ہیں، الغرض یوں سمجھئے کہ یہ "قصۂ زمین" اس کا بیان کیا ہوا ہے جو "بر سرِ زمین" موجود تھا اور خود بھی اس فتنہ سے متاثر ہوا تھا۔

اس کتاب کے مصنف، عزیز ہندی ہیں، جو کابل سے واپس آنے کے بعد یہاں نظر بند کر لئے گئے ہیں اور جنھوں نے ملتان سنٹرل جیل ہی سے اس کتاب کو شایع کیا ہے۔ اس تصنیف کو دس ابواب میں تقسیم کرکے نہ صرف امان اللہ خاں کی سیاحت یوروپ سے لیکر نادر خاں کی تخت نشینی تک کے تمام واقعات کو مسلسل طور پر بیان کیا ہے، بلکہ وہاں کے قبایل کی سیاست، سیاسی جماعتوں کا قیام، امان اللہ خاں کے پیش نظر اصلاحات، ملاؤں کی ذہنیت، بغاوت کے اسباب، بچہ سقہ کی کامیابی کے وجوہ سبھی کچھ اس تصنیف میں پائے جاتے ہیں اور سیاسیات افغانستان سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے اس میں کافی مواد فراہم کر دیا گیا ہے۔

اس کی ضخامت ۴۵۶ صفحات کی ہے اور طباعت و کتابت دونوں بہت روشن ہیں، غیر مجلد نسخہ کی قیمت تین روپیہ ہے اور فاضل مصنف سے سنٹرل جیل ملتان کے پتہ پر مل سکتی ہے۔

نرگسِ جمال

ترجمہ ہے میٹرلنک کے ڈرامہ جوائزل کا۔ مارس میٹرلنک (بلجیم کا مشہور ڈرامہ نگار) ہمارے شاہد صاحب کا نہایت محبوب مصنف ہے، اور اس میں شک نہیں کہ ان کا یہ ذوق نہایت مشکل پسند ذوق ہے۔

میٹرلنک کے ڈرامے عموماً چونکہ اسٹیج کے لئے نہیں ہوتے اس لئے ان میں علمی و فلسفیانہ شان زیادہ پائی جاتی ہے اور طبقہ خواص ہی کی "تسکینِ ذوق" انکا اصل مقصود ہوتا ہے۔

میٹرلنک زیادہ تر "عشق و جمال" اور اس کے متعلقات سے گفتگو کرتا ہے، اسی لئے اس کے یہاں جذبات کی نزاکت و وسعت، اور فطرتِ انسانی کی وہ لچک جسے ہم چاہیں تو روحانیت سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں، ہر جگہ پائی جاتی ہے۔ وہ دہشت انگیز مناظر پیش کرکے دلوں کو دہلانا پسند نہیں کرتا، وہ انسان کی خون آشامیوں کے فسانے سنا کر روح کے سکون کو مضطرب کرنا نہیں چاہتا بلکہ صرف

ان لطیف و پاکیزہ انعطافات کی داستان سناتا ہے جو حسن سے پیدا ہوتے ہیں، محبت کی آغوش میں پرورش پاتے ہیں اور روح میں جذب ہو کر شاہراہ انسانیت کو منور بنا جاتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ جس ادیب کا ذوق سخن یہ ہوگا، اس کے یہاں خیال کی نزاکت، بیان کی ندرت، طرز ادا کی جدت اور معنی کے لحاظ سے الفاظ کا اشکال سبھی کچھ ہوگا اور ایک غیر زبان سے ان تمام خصوصیات کو اپنی زبان میں منتقل کرنا یقیناً آسان کام نہیں، لیکن مسٹر شاہد احمد بی۔اے۔ اس میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے ہیں، اور اس کا سبب یہی ہے کہ وہ خود اسی ذوق کے ادیب ہیں۔

ایسی کتابوں کے ترجمہ میں بڑی دقت یہ ہوتی ہے کہ ایک طرف جذبات کی سادگی یہ چاہتی ہے کہ الفاظ بھی ویسے ہی سلیس و سادہ ہوں اور دوسری طرف احساس کی بلندی جو لازماً بیان میں نزاکت پیدا کر دیتی ہے، اس کی مقتضی ہوتی ہے کہ الفاظ و تراکیب بھی دقیق ہوں اور ایک مترجم گھبرا جاتا ہے کہ وہ ان دونوں کو کیونکر ایک جگہ مجتمع کر سکتا ہے۔ ہر چند شاہد صاحب نے ان دونوں باتوں کے امتیاز میں کافی احتیاط سے کام لیا ہے اور اسی لئے اصل مصنف کے کلام کی روح مترجمہ سے مفقود نہیں ہوئی۔ تاہم اس میں اصلاح و ترقی کی کافی گنجایش باقی ہے۔

مثلاً میں چند الفاظ اور جملے مختلف مقامات سے پیش کرتا ہوں۔ ترجمہ کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے "تو خفتہ ہے میری روحی" — "لفظ خفتہ" اردو میں تنہا بغیر کسی ترکیب کے مستعمل نہیں ہے، اس لئے "تو سو رہی ہے" لکھنا زیادہ مناسب تھا — فقرہ کے اختتام پر "تو سو رہی ہے" انھوں نے لکھا ہے، اس لئے یہ تکرار اور زیادہ پر لطف ہو جاتی۔ ایک جگہ لکھتے ہیں "تیرے موئے پریشاں نیلے کہر کی طرح پھیلے ہوئے ہیں" — اس میں "موئے پریشاں" کے بجائے صرف بال ہونا چاہئے تھا۔ پریشان کی صفت کا اظہار ضروری نہ تھا جبکہ بعد کو "پھیلے ہوئے" سے یہ مفہوم متعین ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد ایک جگہ "شب کی خوشبوؤں" لکھا ہے، حالانکہ بجائے شب کے اگر رات لکھا جاتا تو زیادہ دلکشی پیدا ہو جاتی۔

"گلاب کے ورق انداختہ پھولوں" سے معلوم نہیں ان کی کیا مراد ہے۔ فارسی میں ورق انداختن صرف گنجفہ کی اصطلاح ہے یعنی پتہ ڈالنا، لیکن پھولوں کے لئے کبھی استعمال نہیں ہوتا۔

"چاند میں غیر محسوس طور پر آمیز کر دیتی ہے" — لفظ آمیز یہاں کانوں کو بہت برا معلوم ہوتا ہے۔ علاوہ اس کے "چاند میں آمیز کر دینا" کوئی معنی نہیں رکھتا۔ جس منظر کو پیش کیا گیا ہے اس کے لحاظ سے میری رائے میں یوں ہونا چاہئے تھا "چاندنی میں غیر محسوس طور پر جذب کر دیتی ہے یا ملا دیتی ہے"

"ہمارا تخئیل یہ نہیں جانتا" — تخئیل بروزن تفعیل ہے اس لئے اسکو مونث استعمال کرنا چاہئے۔ علاوہ اس کے جس موقعہ پر یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے اس کا اقتضا یہ ہے کہ بجائے تخئیل کے تخیّل لکھا جائے۔ تخیّل کا مفہوم وہی ہے جو انگریزی لفظ "Imagination" کا، لیکن تخئیل کا مفہوم ہے خیال سے کوئی بات پیدا کرنا — تخیّل کے بجائے تخئیل کا استعمال اور بھی کئی جگہ کیا گیا ہے۔

صفحہ ۳۴ میں ایک جگہ "خوفناک ادویۃ" نظر آتا ہے، حالانکہ "خوفناک دواؤں" زیادہ موزوں ہوتا۔

صفحہ ۴۳ ــــ "صعب دکرب میں محو تھا" لفظ محو کا استعمال درست نہیں۔ اس کے بجائے اگر یوں لکھا جاتا کہ "درد و اذیت میں مبتلا تھا" تو بہتر ہوتا۔ ایک جگہ یہ جملہ نظر آتا ہے۔ "اپنی بیوفا آواز کو اظہار منشاء مافی الضمیر سے باغی پایا" یہاں لفظ منشاء بالکل بیکار ہے جس نے خواہ مخواہ توالی اضافات پیدا کر دیا۔

بعض جگہ ہندی الفاظ کے ساتھ عربی و فارسی کے الفاظ ایسے استعمال کئے گئے ہیں جو ناگوار معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً "حیرت انگیز چاہت طویل ڈنٹھل ــــ دائمی گھمبیری ــــ ملائم مصیبتیں ــــ

کہیں کہیں غلط الفاظ بھی نظر آتے ہیں مثلاً "متلاشی" جستجو کرنے والے کے معنی میں، حالانکہ فارسی و اردو میں تلاش سے ڈھونڈھنے والے کے معنی میں تلاشی کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے داغ لکھتا ہے:۔

جلوت میں یوں ہے وہ کہ تلاشی ہے چشم شوق   خلوت میں اسطرح ہے کہ خلوت گزیں نہیں

نورالعین واقف کا شعر ہے:۔   دل تلاشی ست آں شکر لب را   شکر اللہ سعیہ ابدا

یہ عربی لفظ نہیں ہے کہ اس کا اسم فاعل متلاشی بنایا جائے۔ اسی طرح انکسار کے جگہ انکساری ایک جگہ نظر آتا ہے جو صحیح نہیں۔ الغرض اس ترجمہ کو ابھی اور سادہ کرنے کی ضرورت ہے امید ہے کہ شاہد صاحب آئندہ اشاعت میں اس کا خیال رکھیں گے مثلاً "آسمان سے بارشِ گل ہوی ہے" اس کے بجائے اگر یہ لکھا جاتا کہ "آسمان سے پھول برسے ہیں" تو کتنا اچھا معلوم ہوتا۔

یہ کتاب مجلد شائع ہوی ہے اور ایک روپیہ میں دفتر رسالہ ساقی دہلی سے ملسکتی ہے۔

پروین و ثریا

یہ بھی ترجمہ ہے مٹرلنک کے ایک ڈرامہ (اینگلے ون اینڈ سیلے سٹ) کا جو شاہد صاحب اور دہلی کے مشہور ادیب جناب فضل حق قریشی کی مشترکہ قوت فکر کا نتیجہ ہے۔ یہ ترجمہ بہ نسبت "نرگس جمال" کے زیادہ سلیس و شگفتہ ہے۔ اس کا ایک سبب غالباً یہ ہے کہ یہ ڈرامہ جوائزل سے کم دقیق ہے اور دوسرا یہ کہ "نرگس جمال" پہلی کوشش تھی اور یہ دوسری ہے۔

کہیں کہیں اسمیں بھی نظر ثانی کی ضرورت ہے اور امید ہے کہ آئندہ اشاعت میں اس کا لحاظ رکھا جائے گا۔ مثلاً:۔

"میں یہ سطور تحریر کر رہی ہوں" ــــ اس کی جگہ یوں بھی ہو سکتا تھا "میں یہ سطریں لکھ رہی ہوں"۔ "تم بالکل ایک بھائی کیطرح مجھ سے ملاقات کرو گے" ــــ بجائے "ملاقات کرو گے" کے "ملو گے" کافی تھا۔ "سابقہ کنجی" ــــ کی جگہ "پہلی کنجی" لکھنا زیادہ اچھا تھا۔ "تکلم خاموش" کے بجائے "خاموش گفتگو" یا "زبانِ بیزبانی" لکھ سکتے تھے۔ "مجھے خائف کئے رکھتا ہے" ــــ یہاں لفظ کئے بالکل بیکار ہے۔ "وہ چاندنی کی روشنی میں ممتزج ہوتی معلوم ہو رہی ہے" ــــ اس جملہ میں لفظ ممتزج بہت ثقیل ہے؟ بجائے اس کے تحلیل لکھ سکتے تھے یا جملہ کی ترکیب بدل کر یوں لکھتے کہ "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ چاندنی کی روشنی میں گھلی جا رہی ہے"

اسکی قیمت بھی ایک روپیہ ہے اور دفتر رسالہ ساقی دہلی، ملنے کا پتہ

اردو میں ڈرامہ نگاری

سید بادشاہ حسین صاحب حیدرآبادی کی تصنیف ہے ۔ اس میں ڈرامہ کی ابتدا اور اسکی مختلف قسموں سے بحث کرنے کے بعد ڈراما اور تھیٹر کے تعلق کو ظاہر کیا گیا ہے اور پھر اردو ڈرامہ نگاری کے ماضی، حال و مستقبل پر گفتگو کی گئی ہے ۔ ایک باب "فلم اور اردو ڈراما" کے عنوان سے بھی اس میں نظر آتا ہے، جو "موسم" کی چیز ہے ۔

ادبیات میں ڈرامہ ہی وہ چیز ہے جو نفسیاتِ انسانی سے "تادیبی" تعلق رکھتی ہے اور اس لئے اس کی ترقی یقیناً ایک قوم کے صحیح ذوق کی ترقی ہے ۔

ڈرامہ یوں تو بظاہر ایک جداگانہ فن لطیف کی حیثیت رکھتا ہے، لیکن حقیقتاً وہ مجموعہ ہے تمام فنونِ لطیفہ کا کیونکہ اس میں نثاری بھی ہے اور شاعری بھی، نقاشی بھی ہے اور موسیقی بھی، اسی لئے ہر ادیب اچھا ڈرامہ نگار نہیں ہو سکتا جب تک اس کا ذوق جملہ فنونِ لطیفہ پر حاوی نہ ہو۔ اسی کے ساتھ ڈرامہ نگار کو نفسیاتِ انسانی کا بھی ماہر ہونا چاہئے، کہ بغیر اس کے ڈرامہ کا تادیبی مقصد کبھی پورا نہیں ہو سکتا ۔

افسوس ہے کہ ہندوستان میں اس وقت تک اس فن نے کوئی قابل ذکر ترقی نہیں کی اور اس کا سبب یہ ہے کہ عرصہ تک ڈرامہ اور اسٹیج کو ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ علیحدہ رکھا گیا اور وہ لوگ جو اپنے دماغ کے لحاظ سے اچھے ڈرامہ نگار ہو سکتے تھے، انھوں نے اداکاری کو توہین سمجھا، لیکن اب یہ بُعد و احتراض کم ہوتا جا رہا ہے اور نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کی توجہ روز بروز اس طرف بڑھتی جاتی ہے۔

اِس کتاب کے مصنف حیدرآباد کے ایک خوش فکر نوجوان ہیں اور اس سے قبل بھی ایک دو کتابیں ان کی شائع ہو چکی ہیں ۔ کتاب مفید ہے اور کافی معلومات اسمیں فراہم کر دی گئی ہیں ۔ قیمت دو روپیہ ہے اور آرکیڈیا نیوز ایجنسی حیدرآباد سے مل سکتی ہے ۔

بھگوت گیتا یا نغمۂ خداوندی

اردو ترجمہ ہے بھگوت گیتا کا ۔ اصل کتاب کی اہمیت ایک جانی بوجھی حقیقت کی حیثیت رکھتی ہے اس لئے اسپر اظہار خیال کی ضرورت نہیں، رہگیا ترجمہ سو اُس کی صحت و خوبی کے متعلق کیا گفتگو ہو سکتی ہے جب کہ ڈاکٹر بھگوانداس ایسے فاضل شخص نے جو سنسکرت اور فلسفۂ ہندو مذہب کے مشہور ماہر ہیں، اس کو دیکھکر پسند فرمایا ہو ۔

ترجمہ کے ساتھ ساتھ جو ذیلی صراحتیں، فاضل مترجم نے جا بجا کی ہیں وہ بہت مفید ہیں اور کہیں کہیں ہندو فلسفہ کے اصطلاحوں کو قرآن، حدیث اور مسلم صوفیہ کے اقوال سے مطابق کر کے ان کو بہت دلچسپ بنا دیا ہے ۔

ابتدا میں ایک بسیط مقدمہ بھی ہے جس میں بھگوت گیتا کی تعلیم، اور فلسفۂ ویدانت پر نہایت پرمغز بحث کی گئی ہے ۔ سخت ضرورت ہے کہ مسلمان جنکو ہندوؤں ہی کے ساتھ زندگی بسر کرنا ہے اس کتاب کا مطالعہ کریں، نہ صرف اس لئے کہ وہ خود اُن کے مذہب و مسلک کو سمجھ سکیں، بلکہ اس لئے بھی کہ خود ہندوؤں سے بھگوت گیتا کی تعلیم پر چلنے کا مطالبہ کر سکیں، جو یکسر اخوت و ہمدردی کی تعلیم ہے ۔

اس کے مترجم محمد اجمل خانصاحب ام ۔ اے ۔ ہیں اور کتاب کے ملنے کا پتہ ادارۂ نوامیس الٰہیہ (دائرہ) الٰہ آباد، قیمت ایک روپیہ ہے ۔

علم الحروف

یہ تالیف ہے جناب حکیم محمود علی خانصاحب ماہر کی جو دہلی کے مشہور طبیب ہیں، اس مجموعہ میں مختلف زبانوں کے حروف ہجا، اور رسم الخط کے متعلق غیر معمولی محنت و کاوش سے کام لے کر ایسا اور اتنا مواد فراہم کردیا گیا ہے کہ کسی دوسری جگہ دستیاب ہونا دشوار ہے۔ اس کتاب میں زبانوں کی تحقیق ان کی پیدائش اور درجہ بدرجہ ترقی کا ذکر کرکے تمام دنیا کے رسم الخط سے بحث کی گئی ہے اور خطاطی کی وہ تمام قسمیں جو مسلمانوں میں رائج ہوئیں بیان کی گئی ہیں، اسی کے ساتھ جو بڑے بڑے مشہور خطاط گذرے ہیں ان پر تاریخی روشنی ڈالتے ہوئے اُن کے خط کے نمونے بھی دئے گئے ہیں۔ علاوہ اسلامی زبانوں اور مسلمان خطاطوں کے دوسرے ممالک کی زبانوں اور اُن کے نقوش تحریر کا بھی نہایت محققانہ انداز میں ذکر کیا گیا ہے

معلوم نہیں حکیم صاحب نے اِس کتاب کی ترتیب میں کتنے سال صرف کئے ہوں گے اور کہاں کہاں سے یہ معلومات فراہم کی ہوں گی۔ اس کی قیمت تین روپیہ ہے اور فاضل مؤلف سے فراشخانہ دہلی کے پتہ پر ملسکتی ہے۔

قربانی

ایک اصلاحی ڈرامہ ہے جسے پنڈت کشن پرشاد صاحب کول نے تصنیف کیا اور منیجر لیڈر پریس الہ آباد نے شایع کیا ہے۔ پنڈت کشن پرشاد کول، سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی کے ممبر ہیں اور اردو زبان کا نہایت صحیح ذوق رکھتے ہیں۔ ان کی متعدد تالیفات اس سے قبل شایع ہوکر مقبول ہو چکی ہیں۔

اس ڈرامہ کا موضوع ہندو عورت کی معاشری اصلاح ہے۔ اور نکاح کے مسئلہ میں قدامت پرستی کے خلاف احتجاج زبان کے لحاظ سے بھی ڈراما بہت صاف و دلکش ہے۔ ۸ر آنہ قیمت ہے اور لیڈر پریس الہ آباد سے مل سکتا ہے۔

دِلّی کا آخری دیدار

رسالہ نگار کے ظفر نمبر میں دو مضمون عجیب و غریب شایع ہوئے تھے ایک مرزا فرحت اللہ بیگ کا اور دوسرا سید وزیر حسن صاحب کا۔ مرزا صاحب کا مضمون خواجہ حسن نظامی صاحب نے علیحدہ کتابی صورت میں شایع کیا اور ادارہ ساقی نے سید صاحب کا مضمون۔

اس مضمون کا عنوان "دلی کا آخری دیدار" ہے اور اس میں دہلی کی تہذیب اور آخری عہد تیموری کی رنگین و دلچسپ معاشرت کو حد درجہ موثر اور محاکاتی انداز میں ظاہر کیا گیا ہے۔ سید وزیر حسن صاحب دہلی کے ان مخصوص انشا پردازوں میں سے ہیں جو "بالقوۃ" تو ہمیشہ سے بہترین ادیب تھے، لیکن "بالفعل" ہوئے وہ کسی نہ کسی خاص تحریک سے۔ اور یہ فخر غالباً نگار کیلئے کم نہیں کہ سب سے پہلے اسی نے سید وزیر حسن صاحب کی اس خصوصیت کو ملک کے سامنے پیش کیا۔

یہ جواہر ریزے ۱۲ر آنہ میں دفتر رسالہ ساقی دہلی سے مل سکتے ہیں۔

آغاز ہستی

ترجمہ ہے برنارڈشا کے ایک ڈرامہ کا جو نگار (جنوری و فروری ۱۹۳۶ء) میں شایع ہوا تھا۔ برنارڈشا کا ڈرامہ اور جناب مجنوں گورکھپوری کا ترجمہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے ــــ "حسن اس پر وش نگار دو میر یاں اپنا" شروع میں ایک مختصر سا مقدمہ بھی ہے جس میں برنارڈشا کی تمثیل نگاری پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ چھوٹی تقطیع کی ۷۰ صفحات کی کتاب ہے اور قیمت ایک روپیہ جو یقیناً زیادہ ہے۔ ملنے کا پتہ ایوان اشاعت گورکھپور ہے

ہوش کے ناخن

ڈرامہ ہے جسے حیدرآباد کے دو فاضل نوجوانوں (یحییٰ حسن و مخدوم محی الدین) نے اسٹیج کیلئے لکھا ہے اور جسمیں حیدرآباد کی سماجی زندگی پیش کیگئی ہے۔ یوں تو یہ ایک انگریزی ڈرامہ سے ماخوذ ہے، لیکن پیش کیا گیا ہے ایسی صورت سے کہ بالکل اپنی چیز معلوم ہوتا ہے۔ یہ دو ماہ حیدرآباد میں اسٹیج ہو کر لوگوں کی پسندیدگی بھی حاصل کر چکا ہے۔ اس میں حیدرآبادی زبان کے جو نمونے پیش کئے گئے ہیں، ان سے شاید ایک مقصود یہ بھی ہوگا کہ وہ غیر ملکی تنقید سے بے نیاز ہو جائیں۔ اسکی قیمت ۱۰ آنہ ہے اور مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد سے مل سکتا ہے۔

معاشقۂ نپولین

ترجمہ ہے ایک فسانہ کا جو پہلے فرانسیسی زبان میں لکھا گیا اور پھر فارسی و عربی میں منتقل ہوا۔ یہ ترجمہ فارسی سے کیا گیا ہے اور مولوی سید تمکین کاظمی اور مولوی محمد عبدالمنعم سعیدی کی مشترکہ محنت کا نتیجہ ہے۔ اس میں نپولین کی حیات عشقیہ کا ایک خاص واقعہ بیان کیا گیا ہے اور بعض خصوصیات کے لحاظ سے پڑھنے کی چیز ہے۔ ترجمہ صاف و سلیس ہے لیکن نظر ثانی کا محتاج۔ متعدد تصاویر بھی شامل کر دی گئی ہیں جن سے کتاب کی دلکشی اور بڑھ گئی ہے۔ مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد سے ایک روپیہ میں اسکو حاصل کیا جا سکتا ہے۔

(ضمیمہ ۱۱ و ۱۵ قاعدہ (۲۰) ضابطہ دیوانی)

سمن بغرض انفصال مقدمہ

مقدمہ نمبر ۲۳۵۶ سنہ ۱۹۳۴ء

بعدالت جناب سید خورشید حسن صاحب بہادر جج خفیفہ لکھنؤ

لالہ گھنشیام داس ولد لالہ بالمکند رستوگی ساکن رستوگی ٹولہ تھانہ چوک شہر لکھنؤ و مالک بی ڈی آفاق کمپنی نظیرآباد .... مدعی

بنام

مرزا باقر علی وغیرہ

بنام { نمبر ۱ مرزا باقر علی ولد مرزا لطف علی ساکن بادشاہی منڈی الہ آباد حال وارد ڈیوڑھی آغا میر شہر لکھنؤ
نمبر ۲ حشمت علی ولد عظمت علی ساکن ڈیوڑھی آغا میر شہر لکھنؤ .... مدعا علیہ

ہرگاہ مدعی نے تمہارے نام ایک نالش بابت ۹۵/۵ روپے دائر کی ہے لہذا تم کو حکم ہوتا ہے کہ تم بتاریخ چار ۴ ماہ مارچ سنہ ۱۹۳۵ء بوقت دس بجے اصالتاً یا معرفت وکیل کے جو مقدمہ کے حال سے قرار واقعی واقف کیا گیا ہوا اور جو کل امور اہم متعلقہ مقدمہ کا جواب دے سکے یا جس کے ساتھ کوئی اور شخص ہو جو جواب ایسے سوالات کا دے سکے حاضر ہو اور جوابدہی دعویٰ مدعی مذکور کی کرو اور ہرگاہ وہی تاریخ جو تمہارے احضار کے لئے مقرر ہے واسطے انفصال قطعی مقدمہ کے تجویز ہوئی ہے پس تم کو لازم ہے کہ اپنے جواب دعویٰ کی تائید میں جن گواہوں کی شہادت پر یا جن دستاویزات پر تم استدلال کرنا چاہتے ہو پیش کرو۔

مطلع رہو کہ اگر بروز مذکور تم حاضر نہ ہوگے تو مقدمہ بغیر حاضری تمہارے مسموع اور فیصل ہوگا۔

آج بتاریخ ۱۴ ماہ فروری سنہ ۱۹۳۵ء میرے دستخط اور مہر عدالت سے جاری کیا گیا۔

(دستخط جج بخط انگریزی)

رباعیات آسی

ہمارے عزیز دوست مولوی عبدالباری آسی اپنے رنگ تغزل کے لحاظ سے ایک خاص مرتبہ کے شاعر ہیں لیکن اب کہ عمر کے ساتھ عقل کی پختگی بڑھتی جارہی ہے، انھوں نے رباعیوں کی طرف بھی توجہ کی ہے اور اس میں شک نہیں کہ ایک رباعی کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہے وہ ان کے یہاں تمیز کے ساتھ پائی جاتی ہیں۔ زبان کی سادگی و روانی، خیال کی ندرت و پاکیزگی، طرز ادا کی ندرت، ان میں سے کسی بات کی کمی ان کے یہاں نہیں ہے۔ وہ اپنی رباعیات کا مجموعہ کتابی شکل میں شائع کرنے والے ہیں، لیکن قبل اشاعت چونکہ وہ ان کو پبلک سے روشناس کرانا چاہتے ہیں اسلئے انھوں نے چند منتخب رباعیاں نگار کو اشاعت کے لئے مرحمت فرمائی ہیں جس کا میں ممنون ہوں۔ نیاز

گردوں کی بساط بے شکن کسکی ہے ۔۔۔ رقاصۂ چرخ نغمہ زن کسکی ہے
خورشید و قمر لئے ہوئے ہیں مشعل ۔۔۔ اے بار خدا یہ انجمن کسکی ہے

یہ نرگس پر خمار کیا کہنا ہے ۔۔۔ یہ سنبل تار تار کیا کہنا ہے
یہ صحن چمن یہ سبزہ یہ باغ گل ۔۔۔ کیا کہنا ہو لے بہار کیا کہنا ہے

جب فصل بہار خندہ زن آتی ہے ۔۔۔ یوسف بنکر سوئے وطن آتی ہے
مہجور بہار چیخکر کہتے ہیں ۔۔۔ فریاد کہ بوے پیرہن آتی ہے

اکسیر ہے اور خاک کہتے ہیں اسے ۔۔۔ غفلت ہی اور انہماک کہتے ہیں اسے
یہ عشق ہے اسکے ہیں نرالے انداز ۔۔۔ بیداری خوابناک کہتے ہیں اسے

اک بار ہے وہ اگر اٹھائیں اسکو ۔۔۔ دستور عمل اگر بنائیں اس کو
ہے مکتب عشق کا یہ پہلا ہی سبق ۔۔۔ جو کچھ کہ پڑھا ہے بھول جائیں اسکو

اک قطرہ سے چشمے سو ابلتے ہیں یہاں ۔۔۔ اک رمز سے رمز سو نکلتے ہیں یہاں
ہے پردہ بپردہ پرتو عالم شرق ۔۔۔ اک شعلہ سے سو چراغ جلتے ہیں یہاں

پہلو میں اک آگ سی بھری رہتی ہے ۔۔۔ آنکھوں میں ابھی تک اک تری رہتی ہے
دل شاخ امید تھا اور اکثر یہ شاخ ۔۔۔ کٹنے پہ بھی مدتوں ہری رہتی ہے

دردوں سے وہی کلام کر آتا ہوں ۔۔۔ افسانۂ غم تمام کر آتا ہوں
جس در پہ ہوا تھا انکا دیدار نصیب ۔۔۔ روزانہ اسے سلام کر آتا ہوں

سرمایۂ عافیت کو کھونا ہی پڑا ۔۔۔ اس ناؤ کو بیچ میں ڈبونا ہی پڑا
انجام وفا سے پہلے دی جان عزیز ۔۔۔ قصہ جو طویل تھا تو سونا ہی پڑا

چھوٹے ہوئے یار منتظر ہیں میرے ۔۔۔ مرغان بہار منتظر ہیں میرے
پابستگی وفا اجازت دیدے ۔۔۔ پر دشت میں خار منتظر ہیں میرے

جو جام غم و الم دئے جاتے ہیں ۔۔۔ ہم ان کو خوشی خوشی پئے جاتے ہیں
جینے کی امید تو نہیں ہے لیکن ۔۔۔ مرنے کی امید پر جئے جاتے ہیں

رہبر ہی ملا نہ کوئی ہمراہ ملا ۔۔۔ ثمرہ کوئی نہ حسب دلخواہ ملا
ہم دیر بھی ہو پہنچے اور کعبے بھی گئے ۔۔۔ ہم کو تو نہ بت ملے نہ اللہ ملا

ہم بھی ہیں اسی جہاں کے رہنے والے ۔۔۔ ہم بھی ہیں یہیں کے رنج سہنے والے
کچھ ہم پہ کھلے ہیں راز ہم کہتے ہیں ۔۔۔ کچھ اور کہیں گے آکے کہنے والے

یہ موت بھی ہیچ زندگانی بھی ہیچ ۔۔۔ افلاس بھی ہیچ کامرانی بھی ہیچ
سرمایۂ عمر نوجوانی ہے مگر ۔۔۔ عبرت کہتی ہے نوجوانی بھی ہیچ

پارسی اہل کتاب ہیں

(مسلسل)

پارسیوں کے مذہبی ادبیات

دین زرتشتی کے اصول کی تشریح سے قبل اس کی مذہبی کتب و تصانیف کا مختصر ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔

جب سکندر اعظم نے ایران فتح کیا اور ۳۲۳ سال قبل مسیح پایۂ تخت فارس کو نذر آتش کیا تو تمام وہ تصنیفات و مخطوطات بھی ضائع ہوگئے جن کا تعلق قدیم ایرانی تمدن و فلسفہ اور دیگر علوم سے تھا[1]۔ اس غارتگری میں دین زرتشتی کی مذہبی کتابوں اور مقدس ادبیات کو اسقدر نقصان پہونچا کہ آج اس مذہب کے متعلق مکمل حالات معلوم کرنے اور بہم پہونچانے کی کوئی قابل وثوق صورت نظر نہیں آتی۔ موجودہ اوستا اصلی اوستا کا ایک جزو ہے اور اس کا بھی یہ حال ہے کہ اکثر دیگر ابواب کے جملے خلط ملط ہوگئے ہیں۔ موجودہ اوستا کی تدوین اصلی اوستا کی بربادی کے سالہا سال بعد عہد ساسانی میں ہوئی ہے۔ اور اس کی ترتیب یوں ہوئی کہ زرتشتی علماء کی ایک مجلس منعقد ہوئی۔ اور ان علماء کے ذہن میں جو کچھ باتیں اور جملے اصلی اوستا کے محفوظ تھے انھیں قلمبند کردیا ظاہر ہے کہ اس طرح اصل خیالات میں کتنا ردّ و بدل ہوگیا ہوگا[2]۔

اس امر کا ثبوت کہ آیا زرتشتی ادبیات کا وجود یونانی فتح سے قبل تھا یا نہیں، ایک یونانی مصنف ہرمپو کی تحریر سے ملتا ہے جس نے پارسیوں کے مذہبی ادبیات کی ایک مفصل فہرست مع عنوانات و مضامین تیار کی تھی۔ سکندر اعظم کی غارتگری کے بعد زرتشتی کتابوں کا محفوظ رہنا دشوار تھا تاہم کچھ باقی رہگئی تھیں لیکن اُن کا خاتمہ بھی ساسانی عہد میں ہوگیا[3]۔ اس کے بعد عہد خلافت عباسیہ میں اس ادبی تباہی اور نقصان کی کسی حد تک تلافی کی گئی یعنی سلطنت نے اپنے خرچ سے قدیم ایرانیوں کی مذہبی کتب کو جمع کرایا اور ترجمہ کراکر کتبخانوں میں انکو محفوظ کردیا[4]۔

---

[1] تفصیل کے لئے مغربی و مشرقی علماء کی اُن تواریخ کا مطالعہ اس سلسلہ میں ضروری ہے جو انھوں نے تمدن ایران پر تصنیف کی ہیں۔ طبری شہرستانی، جیکسن، مارٹیم اور ٹائل کے مصنفات خصوصاً قابل ذکر ہیں۔ براؤن کی تاریخ ادبیات ایران اور مالکم کی تاریخ ایران بھی نظر انداز کئے جانے کے قابل نہیں۔ [2] دائرۃ المعارف برطانیہ۔ میڈیا مصنفہ راگزن۔ تاریخ پارسیان۔ مضامین ہاگ اور شرح مذہب زردشت مصنفہ دھلا۔ [3] میڈیا صفحہ ۲۷۔ دائرۃ المعارف۔ مضامین ہاگ۔ دین ایرانیان مصنفہ ٹائل اور شہرستانی طبری اور مسعودی کی تصانیف۔ [4] شرح مذہب زردشت اور رسائل شبلی صفحہ ۷۲-۱۷۱۔

طبری (۹۲۳ - ۸۳۸ء) ناقل ہے کہ زرتشتی تحریریں ۱۲ ہزار چرم ہائے گاؤ پر منقش و مرقوم تھیں[1] لہذا موجودہ اوستا پروفیسر جیکسن کے تخمینہ کے مطابق محض ۱/۴ حصہ اُس اوستا کا ہے جو عہد ساسانی میں ترتیب پایا تھا[2]۔ بقیہ حصے آخری زرتشتی تاجدار کی حکومت کے بعد فنا و غارت ہو گئے۔

ہمیں اس جگہ یہ بھی ظاہر کر دینا چاہئے کہ زرتشتیوں کی مقدس کتاب کی اصل زبان کیا تھی۔ اس کی زبان اَستا تھی۔ یہ زبان آریاؤں کی ایرانی شاخ میں بولی جاتی تھی لیکن آریاؤں کی ایرانی شاخ بھی دو حصوں میں منقسم تھی۔ ایک کو مشرقی ایرانی اور دوسرے کو مغربی ایرانی کے نام سے پکارتے تھے۔ اور استا کی زبان مشرقی ایرانیوں کی زبان تھی جو بیکٹریا اور اُس کے ملحق مقامات میں مروج تھی۔ مذہبی ادبیات کے ایک حصہ کو گاتھا کہتے ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ حصہ حضرت زرتشت کے کلام پر مشتمل ہے۔ بقیہ مذہبی ادبیات زبان استا میں تھے مارخم لکھتے ہیں کہ[3]

> "اگر "وید" کو ہم موجودہ کتب میں قدیم ترین کتاب کہہ سکتے ہیں تو بلاشبہ لحاظ قدامت فارسی گاتھا کا درجہ دوسرا ہے۔ اس کتاب میں ہمیں عناصر فطرت کی پرستش سے بلند تر کسی اور شے کی عبادت کی ابتدا نظر آتی ہے۔ ویدک نظموں اور مناجاتوں میں خالق اعظم اور آیندہ زندگی کے ادراک کا جو موہوم نقشہ ملتا ہے اُسکی تفسیر کے لئے ہمیں گاتھاہی کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔"

مذہبی ادبیات کے چند اجزاء اصلی اوستا کی تفسیر و توضیح پر مشتمل ہیں اور انھیں زند کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اس مقدس ادبی مجموعہ کو زند اَستا کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ پھر اجزائے زند کی توضیح اور شرح جن کتب میں مرقوم ہیں انھیں پازند کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ عہد ساسانی میں جو کچھ کتابیں مذہبی مسائل و عقائد پر تصنیف و تالیف ہوئی ہیں اُن کی زبان عہد ساسانی کی مروجہ زبان پہلوی ہے۔

ہمیں اِس سلسلہ میں اُن کاوشوں اور کوششوں کا ذکر کر دینا ضروری ہے جو علمائے مغرب نے پارسیوں کے مذہبی ادبیات کی جستجو اور ان کو منظر عام پر لانے میں کی ہے۔ مشرقی مصنفین میں طبری، مسعودی، شہرستانی، ابوالفدا، یاقوت اور البیرونی نے اپنے تصنیفات میں اِس مذہب کا ذکر بالتفصیل کیا ہے۔ ملا محسن فانی کشمیری مصنف دبستان مذاہب نے اِس مذہب کا ذکر بوضاحت کیا ہے اور مجوسی علماء و فضلاء علی الخصوص اُن کا جن سے ہندوستان میں ملاقات کا انھیں شرف حاصل تھا خاص طور پر کیا ہے۔

مغربی علماء میں پہلا شخص ہائڈ ہے جو اکسفورڈ یونیورسٹی سے متعلق تھا۔ اِس نے مغرب میں سب سے پہلے زرتشتی مذہب اور اُس کے ادبیات کے متعلق تحقیق و تفتیش کی۔ اُس نے سنہ ۱۷۰۰ء میں ایک ضخیم کتاب اپنی تحقیقات کے مطابق اِس مذہب پر شایع کی تھی۔ ہائڈ کے بعد مشہور عالم اور سیاح انکیو دو پیرن نے ہندوستان سے فرانس واپس جا کر سنہ ۱۷۷۱ء میں زند اوستا کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ شایع کیا۔ بعدہٗ معروف مستشرق سر ولیم جونس نے اس مذہب کے متعلق اکثر مصنفات شایع کئے۔ سنہ ۱۸۲۶ء میں ملکٹے ین کے

---

[1] تاریخ ایران جلد اول باب ۱۲ مصنفہ مالکم ۔ [2] زردشت مصنفہ جیکسن ۔ [3] تاریخ ایران صفحہ ۳۴ ۔

رہنے والے ایک عالم نے جن کا نام ایرسمس رسک تھا ایک رسالہ زبان زند اور اُس کے ادبیات کے متعلق شایع کیا اُسی زمانہ میں پیرس کے ایک ماہر سنسکرت پروفیسر برنف نے اسی قسم کی ایک تصنیف شایع کی ۔ ۱۸۲۹ء میں ہمبرگ کے جسٹس اولشاسن اور فرانسس بوپ نے ان لوگوں کی تقلید کی ۔ پھر حکومت بویریا کی تحریک پر فریڈرک اسپیجل نے اُن مخطوطات کا ترجمہ کیا جو اسوقت یورپ کے کتب خانوں میں اس مذہب و زبان کے متعلق پائے جاتے تھے ۔ ڈاکٹر گیگر کا احسان بھی پارسی مذہب کے ادبیات پر بہت زیادہ ہے ۔ ۱۸۵۲-۵۴ء میں ملک ڈین کے مشہور فاضل وسٹر گارڈ نے زند اوستا کو پہلی بار مکمل طور پر کتابی صورت میں شایع کیا ۔ اس اشاعت میں اس زبان کے قواعد اور لغت کو بھی بطور ضمیمہ شامل کیا ۔ پھر ۱۸۵۸-۶۰ء کے عرصہ میں ڈاکٹر مارٹن ہاگ نے گاتھا کو شایع کیا ۔

ڈاکٹر موصوف کا پارسی مذہب اور ادبیات مذہب کے متعلق ایک بسیط مضمون جو ۱۸۶۲ء میں شایع ہوا تھا کچھ کم اہمیت نہیں رکھتا ۔ اس سلسلہ میں وسٹ ۔ گولڈ زہر ۔ ڈار مسٹیٹر ۔ لسن ۔ بارتھولومیو اور ٹائل جیسے مستشرقین کے نام بھی قابل ذکر ہیں ۔

زند اوستا جو اب گم ہو چکی ہے اکیس جلدوں میں تھی ۔ ارد ویراف نامہ سے بالتفصیل معلوم ہوتا ہے کہ مذہبی ادبیات یونانی حملہ کے وقت سکندر اعظم کے حکم سے کیونکر برباد و تباہ کئے گئے ۔ ذیل میں اُن اکیس جلدوں کے نام مع اُنکے پہلوی ناموں کے ہدیۂ ناظرین ہیں[1] ۔

اسمائے اوستا	پہلوی نام	اسمائے اوستا	پہلوی نام
(۱) یتا	سودگر	(۱۱) منثگھو	دادرک
(۲) اہو	ورشتمنسار	(۱۲) شکیوتنہ نام	چیدرستو
(۳) دیریو	بگو	(۱۳) انگھی زش	اسپیت
(۴) آتا	رامراد	(۱۴) مزدائی	باکان لشت
(۵) رتش	نادر	(۱۵) خشترمیچا	بنکادم
(۶) اشد	پاجک	(۱۶) اہورارہی	دباسرج
(۷) چید	زرتشتی	(۱۷) آ	ہوسپارم
(۸) ہچیا	پارس	(۱۸) ییم	سکادم
(۹) دنگھی اتش	کشکیسرب	(۱۹) درہ گوبیو	دزدودام
(۱۰) وزدا	وستاسپساستو	(۲۰) دوست	بادھت
		(۲۱) وہستارم	ستودیشت

[1] تاریخ پارسیان ۔ دین زرتشت مصنفہ مسانی ۔ دائرۃ المعارف ۔ ادبیات مقدسہ مشرقی اور دین ایرانیان ۔ تاریخ ساسانیان کے مصنف نے ج ۲ بعہد مظفرالدین شاہ گزرا ہے اس سلسلہ میں مفصل حالات قلمبند کئے ہیں ۔

پہلے حصے میں ۲۲ ابواب تھے۔ ان میں عبادت و پرہیزگاری کے فوائد سے بحث کی گئی تھی۔
دوسرے حصہ میں بھی ۲۲ ابواب تھے جن میں مذہب زرتشتی کے عقاید سے بحث کی گئی تھی۔
تیسرے حصہ میں بیس یا اکیس ابواب تھے اور ان میں نجات پانے اور گناہوں سے بچنے کا طریقہ بتایا گیا تھا۔
چوتھے حصہ میں ۳۲ ابواب تھے جن میں الہیات اور سائنس کے مضامین سے بحث کی گئی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ حشر و نشر اور آیندہ زندگی کے متعلق بسوط بحث تھی۔

پانچویں حصہ میں ۳۵ ابواب تھے اور اُن میں علوم ہیئت اور نجوم سے بحث کی گئی تھی۔
چھٹے حصہ میں ۲۲ ابواب تھے اور اُن میں چند مذہبی رسوم اور تیوہار کا تذکرہ تھا۔
ساتویں حصہ میں ۵۰ ابواب تھے اور وہ بادشاہوں۔ عالموں۔ مذہبی رہنماؤں اور دیگر معزز شخصیتوں کے احکام سے معمور تھے۔
آٹھویں حصہ میں ۶۰ ابواب تھے اور اُن میں ملک پر حکومت و سلطنت کرنے کے اکثر عمدہ طریقے بتائے گئے تھے۔
نویں حصہ میں بھی ۶۰ ابواب تھے اور عقلمندی۔ پرہیزگاری۔ مذہبیت۔ نیک و بداعمال وغیرہ جیسے مضامین پر بحث کی گئی تھی۔
دسویں حصہ کو ایک تاریخی کتاب کہنا چاہئے۔ اس میں ۶۰ ابواب تھے اور اُن میں عہد گشتاسپ اور مذہب زرتشتی کے ابتدائی دور کی تاریخ قلمبند کی گئی تھی۔

گیارھویں حصہ میں ۲۲ ابواب تھے جن میں صفات باری تعالیٰ۔ حشر، آفرینش اور تمدنی فرائض کا ذکر تھا۔
بارھویں حصہ میں ۲۲ ابواب تھے اور وہ مسئلۂ زندگی پر مشتمل تھے۔
تیرھویں حصہ میں ۶۰ ابواب تھے جن میں زرتشت کے ابتدائی حالات زندگی کا تذکرہ تھا۔
چودھویں حصہ میں ۱۷ ابواب تھے جن میں خداوند عالم اور اُس کے مقرب فرشتوں کا ذکر تھا۔
پندرھویں حصہ میں ۵۴ ابواب تھے۔ اس میں دولت جمع کرنے کے متعلق حکایات و قصص بیان کئے گئے تھے علاوہ ازیں حیات کی معصومیت سے بھی بحث کی گئی تھی۔

سولھویں حصہ میں ۶۵ ابواب تھے اور اس میں شادی بیاہ کا تذکرہ تھا۔
سترھویں حصہ میں ساٹھ یا چونسٹھ یا پینسٹھ ابواب تھے اور اُن میں گناہ گاروں کی سزا اور حرام و حلال کے مسئلہ سے بحث کی گئی تھی۔
اٹھارھویں حصہ میں ۵۰ ابواب تھے جن میں اختیارات اور قوت کے صحیح استعمال کا طریقہ مندرج تھا۔
اُنیسویں حصہ کو دھتدیداد کہتے اور اس کا ذکر ہم بوضاحت آیندہ کریں گے۔
بیسویں حصہ میں ۴۰ ابواب تھے جن میں نیکی۔ عبادت گزاری اور بدکاری وغیرہ کے نتیجہ اور انجام سے بحث کی گئی تھی۔
اکیسویں حصہ میں ۳۰ ابواب تھے جن میں اھورا مزدا اور اُس کے مقرب فرشتوں کی مدح و ثنا کی گئی تھی۔
ان مذہبی ادبیات کے تذکرہ میں دائرۃ المعارف برطانیہ (جلد ششم طبع نہم صفحہ ۵۲۵) سے ذیل کا اقتباس پیش کر دینا

مناسب معلوم ہوتا ہے۔

"بابل کی دوسری فتح کے بعد ۵۱۵ سال قبل مسیح بیہستون کا کتبہ عمل میں آیا جس پر دارا کی زبان سے مرقوم ہے کہ اُس نے قدیم کتاب یعنی قانون الٰہی (اوستا) کا ترجمہ کیا تھا اور ساتھ ہی ساتھ قوانین الٰہی کی ایک تفسیر اور نماز کی ایک کتاب (زند) کا بھی ترجمہ کیا تھا۔"

ڈاکٹر ہاگ کا خیال ہے کہ پارسیوں کے موجودہ مذہبی ادبیات کا قدیم ترین حصہ زیادہ سے زیادہ پندرہ سو سال قبل مسیح کی تحریر ہے اور زند اوستا بہیئت مجموعی تقریباً ۵۰۰ سال قبل مسیح وجود میں آیا۔ اس کے برخلاف ڈاکٹر ٹائل کی تحقیق سے آخری حصہ اوستا ۹ سال قبل مسیح وجود میں آیا اور گاتھا اُس سے ۲ صدی قبل[1]۔ بہرحال اس بحث و اختلاف کا خاتمہ اس وقت تک ہونا دشوار ہے جب تک جدید محققین[2] خود پیغمبر زرتشت کے عہد وجود اور زمانۂ رسالت کو طے نہ کرلیں۔ جہاں تک زند اوستا کی تصنیف کا تعلق ہے تمام علمائے یونان[3] اور علمائے مذہب زرتشت[4] حضرت زرتشت ہی کو اُس کا مصنف بتاتے ہیں لیکن مارخم کا بیان ہے کہ[5]:۔

"یہ خیال قابل وثوق نہیں لیکن اگر زردشت ان لوگوں کو بھی کہتے تھے جو مذہبی قیادت کی خدمت انجام دیا کرتے تھے تو یہ اشکال دور ہو جاتا ہے، زردشت اول یا اس مذہب کے بانی کا نام اسپتاما تھا۔"

راگزن نے بھی اس خیال کی تائید کرتے ہوئے اس مذہب کے علماء کو زردشت کے لقب سے یاد کیا ہے[6]۔

ہرچند کہ متذکرۂ بالا جلدوں اور حصوں کا اب ملنا دشوار ہے لیکن اُن کے مضامین سے مطلع ہونے کے لئے ہمارے پاس دیگر ذرائع موجود ہیں۔ مثلاً زبان پہلوی کی دنکارد اور زبان فارسی کی "روایات" اس سلسلہ میں بے حد معاون ہیں۔ یونانی مصنفین ہیروڈوٹس وغیرہم کے بیانات بھی ہماری مدد کرتے ہیں[7]۔ علاوہ ازیں اصلی حصص کے کچھ اجزا ہنوز باقی ہیں۔ اکیسواں حصہ وندیداد اور دو کتابیں یسنا اور وسپارد تو بصورت مکمل پائے جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ خورد اوستا کے نام سے بھی ایک کتاب علیٰحدہ ہے۔ اس میں محض نماز کا ذکر ہے۔ یہ بہت ممکن ہے کہ آخرالذکر تینوں کتابیں اُن اکیس حصص زند اوستا کے کچھ اجزا ہوں۔

ادبیات مقدسہ کی تاریخ کے متعلق ہاگ[8] لکھتے ہیں کہ:۔

"ایران کے سماری کتبوں سے پتہ چلتا ہے کہ ہخمنی سلاطین، اہورا مزدا پر ایمان رکھتے تھے اور انکی زبان اوستا سے ملتی جلتی کوئی زبان تھی۔ حقیقتاً ہخمنی سلاطین کا عہد زرتشتی ادبیات کے لئے ایک سعید زمانہ تھا اسی عہد میں تمام کتب مقدسہ ترتیب پاکر اکیس حصص میں منقسم ہوئے اور اُن کا نام نسک پڑا۔"

---

[1] دین ایرانیان مصنفہ ٹائل و مترجمہ جی۔ کے۔ نریمان — [2] مضامین ہاگ۔ ادبیات مقدسہ مشرقی — [3] دین زرتشت مصنفہ پی۔ ایس سانی لیکن شرح مذہب زردشت مصنفہ دھلا سے بھی تقابل کیجئے — [4] تاریخ ایران صفحہ ۵۲ — [5] میڈیا صفحہ ۲۷۲ — [6] ادبیات مقدسہ مشرقی۔ مضامین ہاگ۔ دین ایرانیان — [7] مضامین ہاگ صفحہ ۵۴ — تاریخ ایران مصنفہ مارخم صفحہ ۹۴۔

اس عہد کا پتہ ہمیں "ارداویراف" سے معلوم ہوتا ہے جس میں مرقوم ہے کہ تقریباً تین سو سال تک مذہب زردشت پاکیزہ رہا اور لوگ شبہات سے مبرا رہے۔ ہمیں ادبی مصنفین کی تصانیف سے معلوم ہوتا ہے کہ ایکبار اسکندر اعظم نے شراب کے نشہ میں ہخمنی سلاطین کے پایۂ تخت اور قلعہ کو جلادینے کا حکم دیدیا۔ قلعہ میں ۲ جلد زرتشتی ادبیات مقدسہ بصورت مکمل موجود تھیں اُن میں سے ایک تو جل گئی اور دوسری یونانیوں نے رکھ لی۔ اگر کوئی مکمل یا غیر مکمل جلد بچ بھی رہی ہو تو اُس کا بعد کے ۵۵۰ سال کے عرصہ میں برباد ہوجانا کوئی تعجب انگیز امر نہیں ہے کیونکہ اس عہد میں یونانیوں نے دین زرتشتی کی کسی قسم کی اعانت نہیں کی۔ اس عہد میں محض ایک نام وہالکاش کا ایسا ملتا ہے جس نے بقیہ کتب و اجزا کی فراہمی کا حکم دیا تھا۔ (ملاحظہ ہو دنکارد کا چوتھا حصہ[۵۱])۔ عہد ساسانی کے اولین چند سلاطین نے ان منتشر تحریروں کو جمع کرنے اور ترتیب دینے کا انتظام کیا تھا اور پھر دوسرے امن پسند سلاطین ساسانیہ نے ادبی مشاغل کی ہمت افزائی کی — اب موجودہ ادبیات مقدسہ کی بعض مشہور کتابوں کا ذکر سنئے۔ وھندیداد سے جس میں ۲۲ ابواب ہیں اُن ممالک کا حال معلوم ہوتا ہے جن میں دین زرتشتی کی پہلے پہل تبلیغ کی گئی۔ زرتشتی قوانین اور دیگر رسوم مذہبی کا بھی تذکرہ ہے۔ اس کتاب میں اُس عظیم الشان واقعہ کا بھی ذکر ہے جس کا بیان تقریباً تمام کتب سماوی و الہامیہ میں ہے۔ یعنی لوگوں کی بدکاری اور گناہگاری اسدرجہ بڑھ گئی تھی کہ خداوند عالم نے اُنھیں سزا دینے کی خاطر دنیا کو ایکبار بالکل تباہ کردیا اور پھر از سر نو آباد کیا۔ اس کتاب میں مرقوم ہے کہ اُسوقت اہورامزدا نے اپنے چہیتے بندہ جمشید کو حکم دیا کہ وہ ایک حصار تیار کرے اور کُل مخلوق کا ایک ایک جوڑا اُس حصار میں رکھدے تاکہ وہ سب بربادی و تباہی سے محفوظ رہیں۔ بقیہ مخلوق کی تباہی کا باعث اس کتاب میں شدید سردی اور برف باری بتایا ہے۔

انجیل اور قرآن میں اِس واقعہ کو حضرت نوح سے منسوب کیا گیا ہے اور تباہی کا باعث طوفان بتایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ تمام حالات و واردات وہی ہیں جو وھندیداد میں مرقوم ہیں۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر تاراپور والا پروفیسر کلکتہ یونیورسٹی کا پرمغز مضمون بعنوان "حکایات بیما" جو کلکتہ ریویو میں شایع ہوا ہے ملاحظہ کرنا چاہیئے۔ عرب مورخوں نے جمشید جناب سلیمان کا نام اور لقب بتایا ہے۔ میر خوند کی کتاب حبیب السیر جلد ۳ اور عبدالرحیم تبریزی (سنہ ۱۲۵۹ھ) کی ممالک المحسنین کا مطالعہ اس سلسلہ میں مفید ثابت ہوگا۔ پروفیسر براؤن نے بھی اپنی کتاب تاریخ ادبیات ایران جلد اول میں اس نکتہ پر بحث کی ہے۔

وھندیداد لوگوں کو پیشۂ کاشتکاری کی ترغیب دیتی ہے اور اسے ایمانداری اور ترقی کا پیشہ بتاتی ہے۔ اس میں اُن طریق کی تعلیم دی گئی ہے جن کے ذریعہ سے انسان میں راستی کی عادت اور بُرائی سے پرہیز کی قوت پیدا ہوسکتی ہے۔ اس میں چند رسوم اور تیوہار کی پابندی کا بھی حکم دیا گیا ہے۔ اور یہی حکم آخری عہد کی دیگر تصانیف کا باعث ہوا کیونکہ اس وقت لوگ حضرت زرتشت کی اصلی تعلیم کو فراموش کرچکے تھے اور مراسم میں افراط و تفریط سے کام لینے لگے تھے۔ اس کے باوجود جیسا کہ راگزن لکھتے ہیں[۵۲]: "ان عہد اوستا کے کتب میں تعلیم زردشت کا اصل جوہر ضرور موجود ہے کیونکہ مذہبی پیشواؤں کے لغو احکام میں کچھ نہ کچھ حقانیت ضرور نظر آتی ہے"۔

---

[۵۱] دین ایرانیان۔ خزینۂ مغ مصنفہ مولٹن صفحہ ۶۵ — [۵۲] میڈیا صفحات ۱۴۔ ۱۱۰۔

وھسنِد یداد کا اصل زبان سے انگریزی زبان میں ترجمہ ہو چکا ہے لیکن اس ترجمہ کو بہت سے زرتشتی علماء نے مشتبہ قرار دیا ہے اور اُن کا خیال ہے کہ محض جرمن مترجمین قابل وثوق ہیں ۔ لوگ یہ ثابت کرتے ہیں کہ ڈرمیسٹیٹر نے زند اوستا کا جو ترجمہ کیا ہے وہ اغلاط سے بھرا ہوا ہے اور اکثر مقامات پر ترجمہ اصل سے بالکل مختلف ہے ۔ مسٹر گشتاسپ کے . نریمان ، ڈاکٹر ٹائل کی کتاب " مذہب ایرانیان " کے ترجمہ کے دیباچہ میں اس خیال سے اتفاق کرتے ہوئے ڈاکٹر ٹائل کے یہ الفاظ نقل کرتے ہیں ۔

> " جب تم ترجمۂ ڈرمیسٹیٹر سے کوئی ٹکڑا نقل کرنا چاہو تو میرے اُن ترمیمات کا ضرور خیال رکھو جو میں نے اس سلسلہ میں کئے ہیں ۔ کیونکہ میرے خیال میں اکثر مقامات پر ترجمۂ ڈرمیسٹیٹر ناقابل وثوق ہے ۔ اگرچہ آج کوئی عالم ایسا نہیں ہے جو ڈرمیسٹیٹر کی طرح اوستا کا ماہر ہو لیکن اُس کا اصول ترجمہ ہی کچھ ایسا تھا جس نے اس کو برباد اور ناقابل وثوق کر دیا ہے " ۔

لیکن فی الحال ہمارے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اس " ناقابل وثوق " ترجمہ ہی کو سامنے رکھیں ۔ ہم علمائے یورپ کی جانفشانیوں کے ممنون ہیں کہ اُنھوں نے زرتشتی کتابوں کو جہاں تک ممکن ہو سکا اُن کی اصلی صورت اور حالت میں منظر عام پر لائے ، ہر چند یہ امر تقریباً ناممکن ہے کہ ایک ایسی قدیم زبان کی کتابوں کا ترجمہ ایسی حالت میں جبکہ زبان سیکڑوں سالوں سے مردہ اور غیر مستعمل ہو بالکل صحیح ہو سکے ۔ صحیح ترجمہ کیلئے لازمی ہے کہ مترجم ویدک سنسکرت سے ۔ زند و پہلوی تفاسیر سے اور جہاں تک اصلی اوستا کا تعلق ہے علم السنہ سے مقابلتہً بخوبی واقف ہو ۔

بہرحال بحث کا سلسلہ قائم رکھنے کے لئے ہمیں " یسنا " کی طرف متوجہ ہونا چاہئے یسنا میں ۷۲ ابواب ہیں ۔ اس کی تحریر اوستا اور گاتھا دونوں زبانوں میں ہے ۔ حقیقتاً یہ کتاب نماز اور عبادات کے متعلق ہے ۔ اُن ابواب میں جو زبان گاتھا میں لکھے ہوئے ہیں حمد اور قصاید پر مبنی ہیں ۔ ان میں مذہبی نکات اور مسائل پر فلسفیانہ انداز میں اظہار خیال کیا گیا ہے ۔ دوسرے حصہ میں مقررہ اُصول عبادت سے بحث کی گئی ہے ۔ گاتھا تعلیم زرتشتی کا ماحاصل اور اصل جوہر ہے ۔ یہ بھی گمان ہوتا ہے کہ یہ حضرت زرتشت کے اصل اور بجنسہ الفاظ و کلمات ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ کتاب کے اس حصہ کو بہت زیادہ اہمیت دیجاتی ہے ہم نے کسی اور مقام پر گاتھا کا کچھ ترجمہ درج کیا ہے اور زرتشتی تعلیم کی اصل غرض سے بحث کی ہے ۔

" یسنا " کا تذکرہ کر لینے کے بعد تیسری کتاب وِسپَرد کا کچھ تذکرہ کرنا بھی ضروری ہے ۔ اس کتاب میں ۲۲ ابواب ہیں ۔ یہ حمد و ثنا جاتو کا مجموعہ ہے جو مخصوص تیوہاروں کے موقعوں پر مذہبی پیشواؤں اور مقدس نفوس کو مخاطب کرتے ہوئے ورد کئے جاتے ہیں ۔ ان کے ورد سے اہورامزدا کی اعانت اور رحمت حاصل کرنا مقصود ہوتا ہے ۔ اس کتاب میں وہ اجزا بھی شامل ہیں جو یسنا میں اضافہ کئے گئے ہیں ۔ اور اس کے اکثر ابواب یسنا کے چند حصوں سے متعلق ہیں اور اُن کے مضامین کی تکمیل کرتے ہیں [1] ۔

---

[1] ادبیات مقدسۂ مشرقی جلد ۳ صفحہ ۳۳۵ ۔

اس سلسلہ کی چوتھی کتاب خورداوستا ہے جو ژنداوستا سے مختلف ہے۔ اس مخصوص کتاب میں مندرجۂ ذیل صحائف ہیں یشتہا، ہیایشتہا، فرین کانغااور گاہا مع چند متفرق ٹکڑوں کے۔

یشتہا میں عبادت وادعیہ اور دیگر اعمال عبادت کی ادائی کے متعلق طریقے مندرج ہیں۔ اس میں علاوہ اہورامزدا کے چند دیگر موجودات کی پرستش کا بھی ذکر ہے لیکن ہم آیندہ ابواب میں ثابت کریں گے کہ یہ بعد کے لوگوں کا اضافہ اور اُن کی من گھڑت باتیں ہیں۔ ہم مسلمانوں اور عیسائیوں کی مذہبی زندگی میں جو کچھ آمیزشیں ہوئی ہیں اُن کا حوالہ دیکر یہ امر اچھی طرح واضح کردیں گے کہ پارسیوں کی یہ خامی چنداں قابل گرفت نہیں ہے عیسائی تو جناب مسیح کی پرستش کرنے لگے اور مسلمان جنھیں پیدا ہوئے ابھی تیرہ سو سال ہی ہوئے ہیں اولیا اور صوفیوں کا احترام پرستش کی حد تک نہ محض اُن کی زندگی میں بلکہ بعد مرنے کے کرتے رہتے ہیں۔ پارسیوں کو مذہبی تواریخ کو جن حادثات کا مقابلہ اور سامنا کرنا پڑا ہے اُس کا خیال رکھتے ہوئے یہ اضافہ اور افراط و تفریط کچھ حیرت انگیز نہیں۔ علاوہ ازیں ہمیں پارسیوں کے مذہبی ادبیات کے انگریزی تراجم کی کمزوریوں کو بھی مدنظر رکھنا چاہئے۔ ان میں جہاں کہیں بھی فرشتوں اور دیگر اولیاؤں کے احترام و تقدیس کا ذکر ہے اور جہاں کہیں بھی عبادت خداوند عالم کا ذکر ہے ہر جگہ یکساں لفظ پرستش استعمال کیا گیا ہے۔ اور ہمارے خیال میں یہی غلط تراجم بہت حد تک بدگمانی کا باعث ہوئے ہیں۔ کیونکہ لفظ "پرستش" عام ہے جب خدا کے لئے اس کا استعمال کیا جائیگا تو اس کے معنی عبادت ہوں گے اور جب اولیا یا فرشتہ کے لئے استعمال کیا جائے گا تو یقیناً اس کے معنی احترام اور تقدیس کے ہونگے یہ ہرگز خیال نہ کرنا چاہئے کہ مذہب زرتشت کے نزدیک خداوند عالم اور اُس کی برگزیدہ مخلوق میں کوئی فرق نہیں ہے۔ پارسی بھی خدا اور اُس کے برگزیدہ بندوں کے درمیان اتنا ہی فرق کرتے ہیں جتنا دیگر اہل کتاب اس مسئلہ اور نکتہ پر پروفیسر مولٹن نے اپنی ایک تصنیف میں بڑی خوبی سے بحث کی ہے[1]۔

اب ہمیں "گاہا" کی طرف متوجہ ہونا چاہئے۔ اس میں زرتشتی مذہب نے اپنے پیرؤں کو شب و روز میں بہ اوقات مختلف پانچ وقت نماز ادا کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس پارسیوں کی نماز پنجگانہ نے مسلمانوں کی تعداد و اوقات نماز پر بھی نمایاں اثر ڈالا ہے اور اسکی طرف پروفیسر ڈمیسٹر اور گولڈزیہر نے بھی اشارہ کیا ہے[2]۔ گولڈزیہر لکھتے ہیں:—

> "مسلمانوں کی نماز جو یہود و نصاریٰ کے اثر سے وقوع میں آئی بلحاظ تعداد ایرانیوں کے اثر سے ظہور پذیر ہوئی نماز جس کی بنیاد خود حضرت محمد نے ڈالی تھی اصل میں دو وقت تھی پھر بعد کو ۳ وقت کردی گئی۔ جیسا کہ خود قرآن میں اُسے "الوسطیٰ" کے نام سے موسوم کیا ہے[3]۔"

---

[1] خورینہ شع صفحہ ۱۰۰— [2] ملاحظہ ہو "اسلام پر دین مجوس کا اثر" مرقومۂ پروفیسر گولڈزیہر منقولہ جی۔ کے نریمان بہ کتاب "ایران و پارسیان" پروفیسر آرنلڈ کی "تعلیمات اسلام" بھی اس سلسلہ میں قابل مطالعہ ہے۔ اس کتاب میں اُن اسلامی عقاید سے جو پارسیوں سے ملتے جلتے ہیں بڑی خوبی و صفائی سے بحث کی ہے — [3] مشکوٰۃ المصابیح جلد ۱ کتاب ۴ باب نماز

زمانۂ حال کے ایک فاضل مسٹر صلاح الدین خدابخش نے بھی چند روز ہوئے اس خیال سے ہمخیالی کا اظہار کیا ہے ۔
موصوف لکھتے ہیں :۔

"پارسیوں کے پنجگاہا نے جو اُن کی پانچ وقتہ نماز ہے اسلام کے لئے نمونہ کا کام کیا اور اسلام نے جو پارسیوں سے پیچھے رہنا پسند نہ کرتا تھا ۳ وقت سے بڑھا کر پانچ وقت نماز کا حکم دیدیا۔"[1]

یہ امر زرتشت کی پیغمبری اور اُن کے نبی برحق ہونے کی دلیل ہے ۔ خود قرآن حکیم کا قول ہے :۔

"کوئی رسول کسی نئے مذہب کو پھیلانے نہیں آیا بلکہ پیغمبران سابق کی تعلیم کو زندہ اور اُسکا اعادہ کرنے آیا۔"[2]

"نیایشہا"، نفل اور مستحب نمازیں ہیں ۔ ان کی تعداد بھی پانچ ہے ۔ ان نمازوں کے ذریعہ پارسی خدا کے دربار میں اُس کے پانچ اعلیٰ مظاہر یعنی آفتاب ۔ ماہتاب ۔ آب ۔ آتش اور روشنی کے عوض شکرانہ ادا کرتے ہیں ۔[3]

"افرینگان" اُس نماز کو کہتے ہیں جو تیوہاروں کے موقع پر ادا کی جاتی ہے ۔ اور مخصوص مواقع پر پیشوایان مذہب و دیگر مردہ اشخاص کی ارواح کی یاد تازہ کرنے یا موکل فرشتوں سے امداد طلب کرنے کے لئے ادا کرتے ہیں ۔[4]

اب تک جو کچھ ذکر ہوا وہ دور آخر کے عہد اوستا کے مقدس ادبیات کے متعلق تھا[5] ۔ اب ہمیں زرتشتیوں کے پہلوی کتب سے بحث کرنی چاہئے ۔ جہاں تک مذہبی روایات اور مذہبی مراسم و عادات کا تعلق ہے یہ کتب پہلوی بے حد مفید ہیں ۔ وقتاً فوقتاً اضافہ کے باعث پہلوی ادبیات کا ذخیرہ بہت بڑا ہے ۔ "کارکا" کی تاریخ پارسیان کے مطابق پہلوی تالیفات و تصانیف کی فہرست ۵۲ جلدوں میں ہیں ۔ فی الحال ہم چند مشہور اور ضروری پہلوی کتابوں سے بحث کریں گے اور اُن کے مطالب بیان کریں گے ۔

(۱) پہلوی زبان کی سب سے مقدس ترین کتاب "دینکارد" ہے اس میں تواریخ ۔ نجوم اور مذہب کے اہم مسائل سے بحث کیگئی ہے ۔ اور اوستا کے ۲۲ نسخے کی شرح بھی بیان کی گئی ہے ۔

(۲) "نیرنگستان" ۔ اس کتاب میں ان مذہبی مراسم و تیوہاروں سے بحث کی گئی ہے جو دین زرتشت میں زیادہ اہمیت رکھتے ہیں ۔

(۳) "شایست لاشایست" اُن اشیاء کا بیان ہے جو اس مذہب میں حلال و حرام ہیں ۔

(۴) "دادستان دینی" ۔ اس کتاب میں وہ فتاوے ہیں جو ایک زبردست مجتہد دین زرتشت نے عام طور پر مذہب اور دیگر مراسم دینی کے متعلق وقتاً فوقتاً دئے تھے ۔ اس کتاب میں قوانین نکاح و وراثت سے بھی بحث کی گئی ہے ۔

(۵) "شکن گمانی وبجار" اس میں خدا اور عالم کے وجود پر دھریوں کے مقابلہ میں دلائل و براہین پیش کئے ہیں ۔

(۶) "بوندہشنی" اس کتاب کا اہمیت کے اعتبار سے "دنکارد" کے بعد دوسرا درجہ ہے ۔ اس میں پارسیوں کے مذہبی اصول

---

[1] ملاحظہ ہو روزنامہ اسٹیٹسمین مئی ۲۶/ ۱۹۲۶ء کلکتہ ۔ [2] سورہ ۵۰ آیت ۲۷ ۔ [3] تاریخ پارسیان ۔ تاریخ ایران معنفہ ناظم اور شرع مذہب زرتشت ۔ [4] تاریخ پارسیان جلد دوم ۔ [5] تاریخ ادبیات ایران جلد اول صفحات ۱۰۱ - ۹۵ ۔

"دنی" سے بحث کی گئی ہے اور تمام مخلوق پر نیکی و بدی کے اثرات کو بوضاحت بیان کیا گیا ہے۔

(۷) "مینوخرد" اس میں روایات و اخلاقیات دین زرتشت کی شرح بیان کی گئی ہے۔

(۸) "مادیگان گشتوبان" اس میں اسرار الٰہی اور تصوف کے مسائل کو حل کیا گیا ہے۔

(۹) "مادیگان ویراف" یا "ارداویراف نامہ" اس میں ارداویراف کے بہشت و دوزخ کے خواب کا بیان ہے ارداویراف دین زرتشت کے ایک مشہور ولی اللہ تھے۔ انھوں نے اپنی روحانی قوت سے خواب میں اُن مقامات کو ملاحظہ کیا جہاں نیک اور بدبندے بعد مرنے کے رکھے جائیں گے۔ اس مخصوص خواب کی غرض اصل حالات بہشت و دوزخ سے مطلع کرنا اور اُن افواہ کو دور کرنا تھا جو اس وقت عام لوگوں میں ان مقامات کے متعلق مشہور تھیں۔

(۱۰) "مادیگان لکیم" مہینہ کے تیسوں دنوں میں سے ہر روز کے الگ الگ فضائل کو بیان کیا گیا ہے جو روز جس کام کیلئے مسعود اور مخصوص ہے بیان کیا گیا ہے۔

بقیہ ادبیات پہلوی میں یا تو ادبیات اوستا کے تراجم و شرح ہیں یا چند متفرق مسائل مذہبی سے بحث کی گئی ہے۔[۵۱]

ان کتابوں کے علاوہ چند کتابیں "پازند" میں چند فارسی تحریروں کے ساتھ پائی جاتی ہیں۔ "فارسی روایات" دور آخر کی سب سے معروف اور معزز کتاب ہے۔ اس کی تالیف ہندوستان میں پارسیوں کے بس جانے کے بعد ہوئی۔ اس کتاب میں اُن سوالات کے جواب درج ہیں جو پارسی مقیمان ہندوستان نے اپنے ہم مذہب ایرانی بھائیوں سے چند نکات مذہبی کو حل کرنے کی غرض سے ایران بھیجے تھے۔ اس سلسلہ میں اُن خدمات کا ذکر جو مسلمانوں نے زرتشتی ادبیات کو جمع کرنے اور ترجمہ کرنے میں انجام دی ہیں لازمی ہے۔ عربوں کو ایران کے قرب و جوار میں رہنے کے باعث زرتشتیوں کے متعلق مکمل واقفیت رکھنا آسان تھا بلاشبہ اس کی کاوش میں انھوں نے کوئی بات اٹھا نہ رکھی۔ اسلامی دور اول کے خلفاء کو اُن کے زرتشتی مصاحبین نے دین زرتشت کے مذہبی ادبیات کے متعلق اطلاعات پہونچانے میں ہر ممکن طریقے سے مدد دی۔ مسلمانوں کو اقوام اور ملل کی تواریخ سے ہمیشہ دلچسپی رہی ہے لہذا انھوں نے اسی علم ادب کے اس مخصوص شعبہ میں نمایاں خدمات انجام دیں اس مخصوص مضمون پر اصل زبان سے تقریباً تمام کتب عربی زبان میں ترجمہ ہوگئیں۔ اس کی تفصیل کے لئے تصنیفات ابن ندیم۔ حمزہ اصفہانی۔ البیرونی۔ مسعودی۔ طبری وغیرہ کا مطالعہ ناظرین کو کرنا چاہئے۔ اوستا اور اسکے ترجمہ پازند تفاسیر کا جہاں تک تعلق ہے ان مصنفوں نے ملک کے چپہ چپہ سے مخطوطات کو جمع کرکے اُن پر بالتفصیل بحث کی۔ اوستا کا عربی زبان میں ترجمہ کیا گیا اور حمزہ اصفہانی نے اکثر مقامات پر اُس کی عبارت نقل کی ہے۔[۵۲] اس کے علاوہ پہلوی زبان کی اہم کتابوں کا عربی میں ترجمہ ہوا۔

(باقی)

پروفیسر طاہر رضوی، ایم۔ اے — مترجم سید وجاہت حسنین، ایم۔ اے

---

۵۱ زیادہ تفصیل کے لئے براؤن کی تاریخ ادبیات ایران جلد اول صفحات ۹۔۱۰۳ ملاحظہ ہو۔ ۵۲ الفہرست صفحات ۴۵۔۲۴۴۔ کتاب الاشراف صفحات ۹۲۔۹۰۔ الملل والنحل صفحات ۹۲۔۱۸۵۔ ابن الاثیر جلد اول صفحہ ۱۱۰۔ دنیا وری صفحہ ۲۶ وغیرہ۔

ستارہ

میرے چھوٹے بھائی بہن میری زندگی کا عزیز ترین سرمایہ ہیں، میں اُن سے بےحد محبت کرتا ہوں، زیادہ مدت تک اُن سے جدا نہیں رہ سکتا، اُن کی خاطر ہر دوسرے تیسرے مہینے اپنا کاروبار چھوڑ کر وطن جاتا ہوں اور اُن کی معصوم محبت سے دل کی پیاس بجھاتا ہوں۔

پچھلی دفعہ جب میں وطن گیا تو صبح چار بجے، سورج نکلنے سے پہلے گھر پہونچ گیا۔ امّی جان کے سوا سب سو رہے تھے لیکن جوں جوں دن ہوتی گئی سب یکے بعد دیگرے جاگتے گئے اور اسلام کر کرکے میری گرد جمع ہوتے گئے۔ آخر میں سب سے چھوٹی بچی سلیمہ رہ گئی۔ جمیل میاں نے اُس کو جگایا اور کہا کہ بڑے بھائی آئے ہیں اُٹھو! اُس نے اُٹھ کر آنکھیں ملتے ہوئے مجھے دیکھا اور جلدی سے منھ چھپا لیا۔ بڑی مشکل سے اُس کا حجاب دور ہوا اور بالآخر وہ بھی میری گود میں آکر بیٹھ گئی۔

جب دن اچھی طرح نکل آیا تو ان سب کی توجہ کا مرکز میرا سوٹ کیس بن گیا۔ وہ جانتے تھے کہ بڑے بھائی ہمارے لئے سوغات لائے ہوں گے۔ چنانچہ بکس کھولنے کی فرمائش کی گئی۔ اور جب وہ کھلا تو سب بُری طرح اُس پر ٹوٹ پڑے۔ کھانے کی چیزوں کے علاوہ بہ سی مفید و غیر مفید اشیا جن میں بڑا حصہ کھلونوں کا تھا، اُن کے واسطے لایا تھا۔ بجائے اس کے کہ یہ چیزیں میں اُن میں تقسیم کرتا وہ خود اپنا حصہ بانٹنے لگے اور مختلف چیزوں پر قبضہ پانے کے لئے ایک دوسرے سے لڑنے جھگڑنے لگے۔

جس وقت میرا سوٹ کیس اس طرح تاراج ہو رہا تھا میری نظر ایک لڑکی پر پڑی جو کمرے کے دروازے سے لگی ہوئی ہم سب سے چار قدم کے فاصلے پر کھڑی تھی۔ اُس کی عمر چھ سات سال سے زیادہ نہیں معلوم ہوتی تھی۔ بھولی بھالی شکل، سانولی رنگت، اُلجھے ہوئے بال کپڑے میلے اور دیہاتی قسم کے، اُس کی ہیئت سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ آس پاس کے کسی گھر سے تعلق رکھتی ہے اور بچوں کے ساتھ کھیلنے کے لئے آگئی ہے۔ وہ اس لوٹ مار کے منظر کو بہت انہماک کے ساتھ دیکھ رہی تھی۔ اُس کے ہونٹوں کی خفیف مسکراہٹ سے اور آنکھوں کی چمک سے اُس کی دلچسپی کا اظہار ہو رہا تھا۔ میں نے یہ خیال کرکے کہ یہ لڑکی میری موجودگی کے باعث قریب آنے میں جھجکتی ہے اُس کو اپنے پاس بلایا اور بکس میں سے ایک کھلونا دیا جس کو اُس نے بغیر تامل کے قبول کر لیا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ جس جذبے سے متاثر ہو کر میں نے اس لڑکی پر عنایت اور توجہ صرف کی ہے وہ بہت جلد میرے لئے ایک عذابِ جان بن جائے گا۔

تھوڑی دیر بعد جب یہ لوٹ مار ختم ہو گئی اور بچے مجھے اور میرے سوٹ کیس کو بھول کر اپنے کھیلوں میں مصروف ہو گئے تو میں نے دیکھا کہ وہ لڑکی صحن میں جھاڑو دے رہی ہے اور ساتھ ساتھ امّی جان کے بعض احکام کی بھی تعمیل کرتی جا رہی ہے۔ مثلاً "ستارہ! یہ دو[illegible] کی پیالی سلیمہ کو دیدے"۔ "دیکھو بلّی اندر گئی ہے اُس کو وہاں سے بھگا" "کوٹھے پر دیکھ خانم کیا کر رہی ہے، کچھ کام نہ کر رہی ہو تو کہنا ا بلا رہی ہیں"۔ اس سے میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ امّی جان نے اس لڑکی کو نوکر رکھ لیا ہے۔ کسی نہایت حقیر معاوضے پر اُسکی خدمات حا

کرلی ہیں۔ پھر اقی جان نے مجھے بتایا کہ اس لڑکی کے ماں باپ مر چکے ہیں۔ اور اب یہ اپنے چچا کے ہاں رہتی ہے۔ اس کی چچی اس سے بہت محبت کرتی ہے لیکن ان بیچاروں کی مالی حالت ایسی نازک ہے کہ وہ اس کو پیٹ بھر کر روٹی بھی نہیں کھلا سکتے۔ چنانچہ یہ سوچ کر کم از کم بھوکی تو نہ رہے گی انھوں نے اسکو ہمارے ہاں ملازم کرا دیا ہے۔

ہندوستان میں اس نوع کے یتیم بچوں کی کمی نہیں۔ میں نے اپنی زندگی میں ایسی بہت سی لڑکیوں کو دیکھا تھا اس سے بدتر حالت میں دیکھا تھا۔ بھیک مانگتے ہوئے اور فاقہ کرتے ہوئے دیکھا تھا لیکن جسقدر اثر میں نے اس لڑکی سے لیا کسی سے نہیں لیا۔ اسکا سبب شاید یہی تھا کہ وہ ہر وقت میری نظروں کے سامنے رہتی تھی میں اسکا اور اسکی مظلومیت کو ہر وقت دیکھتا تھا اور ہر وقت دیکھتے رہنے پر مجبور تھا۔

میں دیکھتا تھا کہ وہ جھاڑو دے رہی ہے اور اگر جھاڑو دیتے دیتے کسی کھیل میں لگ گئی تو اقی جان نے جھڑک دیا ہے اور غریب پھر اپنے کام میں مصروف ہو گئی ہے۔ یا پھر باورچی خانے میں بیٹھی برتن مانجھ رہی ہے۔ اُس کا چھ سات برس کا ننھا سا وجود بڑے بڑے برتنوں سے گھرا ہوا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ بھر کی مظلومیت اور ستم زدگی اسی ننھے سے وجود میں سمٹ کر آگئی ہے۔ اُسکے ماں باپ اپنی زندگی کے تمام آلام اور ساری مشقتیں اُسی کو سونپ گئے ہیں۔ اور آج جبکہ اس کو کھیل کود اور دوسرے بے معنی مشاغل میں وقت ضائع کرنا چاہیئے تھا وہ محنت کر رہی ہے اور اپنی محنت و مزدوری سے اپنا پیٹ پال رہی ہے۔ اگر وہ کام نہ کرے، جھاڑو نہ دے، برتن نہ مانجھے، سلیمہ کو دودھ کی پیالی نہ دے، چھت پر جا کر خانم کو نہ بلائے، اور صبح سے شام تک ہزاروں احکام کی تعمیل نہ کرے تو وہ بھوکی رہ جائے گی، اُسے کھانے کو سوکھے ٹکڑے بھی میسر نہ آئیں گے۔ اور یہ سب کس لئے ہے صرف اس لئے کہ اُس کے سرپرست مفلس و نادار ہیں اور اُس کے ماں باپ مر چکے ہیں!!

میں یہ بھی دیکھتا تھا کہ اُس کے ہونٹوں پر ہر وقت ایک معصوم طفلانہ مسکراہٹ کھیلتی ہے لیکن اُس کی آنکھوں سے ایک ایسی بے چارگی اور غمگینی ٹپکتی ہے کہ دیکھنے والے کا دل کیفیات غم سے لبریز ہو جاتا ہے، جی زندگی سے بیزار ہو جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی پُر اسرار طریقے پر دنیا کے سارے مظلوموں کی فریادیں انھیں دو بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں آکر جمع ہو گئی ہیں، کائنات کی تمام دردمندیاں انھیں میں کھنچ آئی ہیں۔

میں یہ سب کچھ دیکھتا تھا اور دل ہی دل میں کڑھتا تھا کسی سے کہہ نہ سکتا تھا۔ کہنے کی بات ہی نہ تھی۔ کون میری باتوں پر کان دھرتا سب یہی کہتے کہ میاں دیوانے ہو، ذرا سی بات ہے اُس کو افسانہ بنائے دیتے ہو، دنیا میں یہی ہوتا چلا آیا ہے، کوئی امیر کوئی غریب، ایسا نہ ہو تو دنیا کا کام کیونکر چلے۔

غرض اس لڑکی سے متعلق جو میرے جذبات تھے اُن سے دنیا واقف نہ تھی۔ اور اگرچہ وہ لڑکی بھی دوسروں کی طرح کچھ نہ جانتی تھی اور نہ جان سکتی تھی، تاہم میں سمجھتا ہوں اُس کو میری ہمدردی کا ایک غیر شعوری احساس ضرور تھا۔ ایک شیر خوار بچہ بھی دست شفقت پہچانتا ہے اور محبت بھری آواز کو سن کر مسرور ہوتا ہے۔ وہ تو پھر ایک سمجھ دار لڑکی تھی، عقل اور شعور رکھتی تھی، میری ہمدردیوں سے کس طرح بے خبر رہتی۔ میں اُس کو کبھی جھڑکتا نہیں تھا اور جب اُس سے بات کرتا تھا تو میرے لہجہ میں ایک ایسی نرمی اور محبت ہوتی تھی

جس کو وہ کہیں اور نہ پا سکتی تھی۔ یہی سبب تھا کہ جب اُس کو میرے متعلق کوئی خدمت انجام دینی ہوتی تو وہ بڑی سرگرمی کا اظہار کرتی۔ بلکہ اکثر دوپہر کے وقت جب وہ گھر کے کاموں سے فارغ ہو جاتی تو نہایت خاموشی کے ساتھ میرے کمرے میں آکر کھڑی ہو جاتی اور دل ہی دل میں توقع کرتی کہ میں کوئی خدمت اُس کے سپرد کروں گا۔ میں اُس کا مدعا سمجھ جاتا۔ مجھے بے حد تکلیف ہوتی (جس دردناک منظر کو خیال برداشت نہیں کر سکتا اُس کو آنکھیں زیادہ دیر تک کیونکر دیکھ سکتی ہیں؟) اور میں خواہ مخواہ اُس سے کسی کام کے لئے کہتا مثلاً پینے کے لئے پانی منگاتا۔ وہ بہت خوش ہو کر پانی لاتی لیکن اُس کے بعد بھی بدستور اپنی جگہ میرے احکام کی منتظر رہتی۔ پھر میں اُس سے باتیں کرنے پر مجبور ہو جاتا۔ "ستارہ تم کچھ پڑھتی پڑھاتی نہیں ہو؟" شاید یہ میرا پہلا سوال ہوتا۔ اس کے جواب میں وہ کہتی "اگلے سال میں مولوی صاحب کے مدرسہ میں پڑھنے جاتی تھی، وہ مجھے قاعدہ پڑھاتے تھے، پھر اماں مر گئیں، اور میں یہاں آگئی، بڑے بھائی وہ کتاب میرے پاس رکھی ہے، تم پڑھا دیا کرو، میں امی جان سے پوچھ لوں گی۔" "ہاں میں تم کو پڑھاؤں گا" میں جلدی سے جواب دیتا "لیکن ستارہ! تم اپنی اماں کو کبھی کبھی یاد کرتی ہو؟" وہ اس پر کچھ شرما سی جاتی اور نگاہیں نیچی کر لیتی۔ کچھ کہنا چاہتی لیکن نہ کہہ سکتی۔ اس کے بعد اُس کے باپ کا ذکر آتا۔ باپ کے متعلق وہ اور بھی کم جانتی تھی۔ اُسے مرے ہوئے ایک عرصہ ہو گیا تھا۔ اُس کے دماغ میں صرف چند واقعات کے دھندلے نقوش تھے۔ اور وہ انہی واقعات کو مختصر الفاظ میں دُہراتی۔ پھر اُس کے چچا اور چچی کے متعلق گفتگو ہوتی۔ اُس کی چچی اُس سے بہت محبت کرتی تھی۔ وہ اکثر اُس کے ماں باپ کو یاد کر کے اُسی کے سامنے رویا کرتی تھی۔ اور میرا خیال ہے کہ اسی وجہ سے ستارہ کو اپنے بدقسمت اور کم نصیب ہونے کا احساس بھی تھا اور اُس کی آنکھوں میں رنج والم کی کیفیات استقدر نمایاں تھیں۔ ان باتوں میں بہت کافی وقت گزر جاتا یہاں تک کہ اندر سے "ستارہ، اری ستارہ" کی آوازیں آتیں اور وہ اپنے کام میں مصروف ہونے کے لئے چلی جاتی۔

اس مرتبہ مجھے چند اسباب کی بنا پر بہت دنوں وطن میں رہنا پڑا۔ لیکن اس تمام مدت میں کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرا جب ستارہ کے خیال نے میرا پیچھا چھوڑ دیا ہو۔ اُس کا وجود میری جان کے لئے ایک روگ ہو گیا تھا، ایک مستقل عذاب بن گیا تھا۔ میں کچھ کام کر رہا ہوتا یا کسی کے ساتھ گفتگو میں مصروف ہوتا اور سامنے سے ستارہ آجاتی — صرف اُس کا خیال آجاتا — تو تھوڑی دیر کے لئے دُنیا نظروں میں تاریک ہو جاتی، اور ہر چیز نفرت انگیز اور بیزار کن معلوم ہوتی۔ میں دل میں غور کرتا کہ آخر یہ کیوں ہے؟ اس جذبات پرستی کا کیا سبب ہے؟ اس لڑکی سے میں کیوں اسقدر متاثر ہوتا ہوں؟ لیکن کچھ سمجھ میں نہ آتا۔ صرف یہی خیال ہوتا کہ چونکہ بچوں کو میری زندگی میں بہت اہمیت حاصل ہے اور بچوں کے معاملے میں میں بہت حساس ہوں اس لئے ستارہ کی شخصیت سے بہت زیادہ اثر قبول کرتا ہوں۔ بسا اوقات میں اپنے آپ کو سمجھانے کی بھی کوشش کرتا کہ آخر ستارہ ایسی بھی کیا مصیبت زدہ لڑکی ہے کہ میں اُس کے باعث اپنی زندگی کو بے مزہ کر ڈالوں۔ وہ ہنسی خوشی رہتی ہے اور بے فکری کے ساتھ اپنے دن گزارتی ہے۔ مجھے اُس کے غریب ہونے اور ایک خادمہ کی طرح کام کرنے کا اتنا خیال نہ کرنا چاہیئے۔ لیکن پھر مجھے دو بڑی بڑی سیاہ آنکھیں یاد آجاتیں اور وہ آنکھیں میرے سامنے ایک نئی دنیا پیش کر دیتیں۔ اس دنیا میں بہت سی لڑکیاں، کم عمر، کم نصیب اور شکستہ حال لڑکیاں، جھاڑو دینے اور برتن مانجھنے میں مشغول ہوتیں۔ میں اس نظارے کی تاب نہ لا کر پریشان ہو جاتا اور سراسیمگی کے عالم میں خوفناک خیالات کو اپنے دماغ میں پناہ دینے لگتا۔

اسی طرح دن گزرتے گئے اور ستارہ کے معاملہ میں میری ذکاوت جس زیادہ ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ ایک صبح جب میں سو کر اٹھا تو چند آہنی ارادے میرے ساتھ تھے۔ یہ ارادے گزشتہ شب کے غور و فکر کا نتیجہ تھے۔ اور ان کو پورا کرنے کے لئے میں اپنی کوششیں فوراً اسی صبح شروع کر دینا چاہتا تھا۔ ستارہ عام طور پر بہت سویرے، میرے ناشتے سے پہلے ہی آجاتی تھی۔ کیونکہ اس کا گھر زیادہ دور نہ تھا، مشکل سے سو قدم کے فاصلے پر ہوگا۔ لیکن اس روز میں ناشتے سے فارغ ہو کر اپنے کمرے میں بھی چلا گیا اور ستارہ نہ پہونچی۔ تھوڑی دیر میں امی جان کو بھی تشویش ہوئی اور انھوں نے ماما کو اس کے گھر بھیجا کہ جا کر دیکھے اور اس کے نہ آنے کا سبب معلوم کرے۔ ماما الٹے پاؤں واپس آئی اور اس کی چچی کی طرف سے یہ جواب لائی کہ "ہمارے عزیز و اقارب اس بات کو بہت معیوب سمجھتے ہیں کہ لڑکی ملازمت کرے۔ اور ان کے اعتراض کی وجہ سے اب ہم ستارہ کو نہ بھیجیں گے۔"

میں ماما کے منہ سے نکلے ہوئے یہ الفاظ اپنے کمرے میں سن رہا تھا جب میں ان کا مطلب اچھی طرح سمجھ گیا تو اس علم کے باوجود کہ اب ستارہ کو پیٹ بھر کر دیکھ بھی شکل سے ملیگی، مجھے ایک قسم کا اطمینان حاصل ہوا اور ایسا محسوس ہوا کہ دل میں بہت دنوں سے ایک کانٹا چبھا ہوا تھا، وہ کسی نے نکال لیا اور خلش کی بجائے سکون میسر ہوگیا۔

اختر انصاری

شہوانیات یا ترغیبات جنسی

حضرت نیاز کے قلم سے

جس میں فحاشی کی تمام فطری و غیر فطری قسموں کے حالات اور ان کی تاریخی و نفسیاتی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مذاہب عالم نے اسکے رواج میں کتنی مدد کی اور آیندہ اخلاق انسانی کی بنیاد کن اصول پر قائم ہونا ہے الغرض اپنی نوعیت کے لحاظ سے یہ کتاب بالکل نئی چیز ہے اور ایکبار شروع کرنے کے بعد بغیر ختم کئے ہوئے آپ اسے چھوڑ نہیں سکتے۔ اس کتاب میں ایسے ایسے حیرت انگیز واقعات درج ہیں کہ آپ نے کبھی سنے نہ ہوں گے اگر آپ نگار کے خریدار ہیں تو علاوہ محصول ۸ کے مجلد کتاب صرف ۱۲ میں اور غیر مجلد عا میں ملیگی اور اگر آپ نگار کے خریدار نہیں ہیں تو مجلد ۲ میں اور غیر مجلد ۱ میں علاوہ محصول ۸ کے ملیگی۔

اگر

ارشاد ہو تو کتاب بذریعہ وی۔ پی روانہ کی جائے حجم ۲۷۵ صفحات آرڈر میں مجلد و غیر مجلد کی صراحت ضروری ہے۔

منیجر نگار لکھنؤ

ظلم و استبداد کے خلاف ایک خاموش جنگ

۲۰۰۰ سنہ قبل مسیح، جزیرۂ کریٹ کی خوشحالی کا یہ عالم تھا کہ وہاں کے باشندوں کی نظر میں زر و دولت کی کوئی وقعت باقی نہ رہی تھی۔ ہر فرد کا فرض تھا کہ وہ خود اپنی محنت سے سب کچھ حاصل کرے اور اسلاف کی جمع کردہ دولت کو ہاتھ نہ لگائے، اسی لئے ایک شخص کے مرنے کے بعد اس کی ساری دولت جسم کے ساتھ سپرد زمین کر دی جاتی تھی اور اولاد کا اس سے مستفید ہونا بدترین اخلاقی جرم سمجھا جاتا تھا۔ تقسیم دولت کا اصول بڑی حد تک اشتراکیت پر مبنی تھا اور ہر شخص مشغول و شاد کام زندگی بسر کرتا تھا۔ قحط و فاقہ کا کہیں نام نہ تھا۔

الفامیس کا خاندان سارے جزیرہ میں بہت معزز سمجھا جاتا تھا۔ اور بڑی حد تک ایک سردار کی حیثیت رکھتا تھا۔ حقیقی معنی میں وہاں سرداری کوئی شئے نہ تھی۔ آپس کے فیصلے کے لئے ایک پنچایت ہوتی اور اسی کے فیصلہ پر عملدر آمد ہوتا۔

الفامیس اپنے والدین کا اکلوتا لڑکا تھا اور نہایت ہی محبوب و عزیز۔ ابھی وہ صرف چار برس کا تھا کہ یونانیوں نے جزیرہ پر حملہ کیا اور وہاں کے باشندوں کو غلام بنا لیا۔ عورتوں کو لونڈیوں کی طرح یونانیوں کے اشارہ پر چلنا پڑتا۔ مردوں کو ساری محنت حکومت کے لئے کرنی پڑتی اور اُن کے جسمانی و دماغی مصائب کا معاوضہ اتنا حقیر دیا جاتا کہ مشکل سے وہ زندگی بسر کر سکتے تھے۔

جزیرہ کی تاریخ میں یہ بالکل پہلا واقعہ تھا کہ کسی دوسری قوم کی حکومت وہاں قائم ہوئی، یہاں کے باشندے حکومت و غلامی، سرمایہ داری و مزدوری کے حقیقی مفہوم سے بالکل بیگانہ تھے۔ نہ وہاں فوج تھی کہ مدافعت ہو سکتی نہ استبداد و مظالم کی وہ خوفناک تصویریں کبھی سامنے آئی تھیں جو جذبۂ انسانی کو ابھار کر قوت کے سامنے اپنا آخری قطرۂ خون پیش کر دینے پر مجبور کر دیتی ہیں۔

اول اول جب یونانی جزیرہ پر قابض ہوئے تو وہاں کی شادابی دیکھ کر حیران رہ گئے۔ ہر طرف زر و دولت کے انبار لگے ہوئے تھے۔ یونانی ان پر ٹوٹ پڑے اور ایک تنکا تک وہاں کے رہنے والوں کے لئے نہ چھوڑا۔

اس غارتگری کے سلسلہ میں سب سے زیادہ تباہی جس خاندان کو ہوئی وہ الفامیس کا خاندان تھا۔ کیونکہ اس نے حکومت کے آگے سر جھکانے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کے تمام افراد زنجیروں میں جکڑ کر جلاوطن کر دئے گئے، لیکن کم سن الفامیس کو اپنے والدین کے ساتھ جانے کی اجازت نہ دی گئی وہ جزیرہ میں بغیر کسی سرپرست کے چھوڑ دیا گیا اور ایک

غریب گھرانہ میں حکومت نے اس کی پرورش کا انتظام اسوقت تک کے لئے کردیا کہ وہ مزدوری کرنے کے قابل نہ ہو۔ تعلیم و
تربیت کا کیا ذکر تھا حکومت نے متوسط الحال طبقہ کے لئے بھی اسکو ناممکن بنا دیا تھا۔

ایک ربع صدی کا زمانہ اس واقعہ پر گزر چکا ہے، جزیرہ کی تمام دولت یونان میں منتقل ہو چکی ہے۔ جہاں کی زمین زعفران
اُگلتی تھی آج بنجر پڑی ہے۔ اور رعایا کی تباہی کا یہ عالم ہے کہ سامان فاقہ شکنی بھی ان کے پاس موجود نہیں۔

یہ وہ زمانہ ہے جب فحاشی مذہب کا ایک جزو قرار پا گیا تھا۔ کنواری اور حسین لڑکیاں دیویوں کے لئے وقف کر دی جاتی
تھیں اور کاہنوں کے لئے حلال تھیں۔

جزیرہ کی دولت کوئی پوشیدہ راز نہ تھی اس لئے حکومت کے علاوہ یونان کی پیشہ ور زنان بازاری کا بھی ایک گروہ لوٹ
مچانے کو وہاں آپہونچا تھا اور حکومت نے ان پر بھی ٹیکس عاید کردئے تھے ان میں ایک نوجوان لڑکی عذرا بھی تھی۔

الفامیس غیر معمولی حسین پیدا ہوا تھا جوانی نے اس کے اعضا کو حد درجہ جاذب نگاہ بنا دیا تھا۔ محنت اور کاوش کی
زندگی نے جہاں اس کے چہرہ پر پژمردگی پیدا کردی تھی وہیں اس کے اعضا کو مضبوط و توانا بھی بنا دیا تھا۔ مردانہ حسن و شباب نے
اس میں وہ تمام کیفیات پیدا کردی تھیں جنھیں دیکھ کر ایک عورت مشکل سے ضبط کر سکتی ہے۔ عذرا نے الفامیس کو دیکھا اور دیکھتے
ہی اس پر عاشق ہو گئی۔

الفامیس جانتا تھا کہ عذرا یونانی عورت ہے اور ایک غلام کو کوئی حق حاصل نہیں کہ وہ آقا کی ہمقوم عورت سے محبت کرے،
اس لئے باوصف اس کے کہ وہ خود بھی بیقرار تھا زبان سے ایک حرف نہ نکالتا تھا اور آہستہ آہستہ محبت کی آگ میں جل رہا تھا۔
ایک زمانہ دونوں کو اس آگ میں جلتے ہوئے ہو گیا۔ اور آخر کار الفامیس، عذرا کے بے انتہا اصرار پر ایک رات اس کے
مکان پر پہونچا۔ عذرا نے اسے دیکھا اور جلدی سے اُسے ایک کوچ پر لیجا کر بٹھایا۔ وہ چاہتی تھی کہ ایک لفظ میں اپنی تمام تمنائیں بیان
کردے لیکن الفاظ اور ان کی محدود وسعتیں محبت کی ترجمانی کے لئے اسے بالکل ناکافی نظر آئیں بالآخر الفامیس کی آغوش
میں ایک عجیب عالم وارفتگی میں گر پڑی اور زانو پر سر رکھ کر بالکل کھو گئی۔ جب تھوڑی دیر کے بعد اس طوفان کا زور کچھ کم ہوا تو اسنے کہا۔

"الفامیس! بولو، تمھیں کس چیز نے تکلیف پہونچائی ہے۔ خدا کے لئے مجھے ان سفید ناگنوں میں شمار نہ کرو جو تمھارے ملک
اور اس کے ایک ایک فرد کا خون چوسنے آئی ہیں۔ میں تمھاری ہوں اور ہمیشہ تمھاری رہوں گی۔ میرا جسم اور اس کا ایک ایک ریشہ
تمھارا ہے، میری روح اور اس کی تمام گہرائیاں صرف اس لئے ہیں کہ تم ان میں سما جاؤ۔ میرا وجود صرف اس لئے ہے کہ تم
اس پر چھا جاؤ۔"

الفامیس جواب تک اظہار محبت کے رموز سے واقف نہ تھا گھبرا گیا۔ وہ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ کس طرح جواب دے۔
ستم رسیدہ انسان کو جب کوئی ہمدرد ملجاتا ہے تو اس کے قلب میں جذبات کا ایک دریا موجزن ہو جاتا ہے۔ اور پھر اس کا اظہار
بجز اس کے اور کسی طرح ممکن نہیں کہ وہ بے اختیار رونے لگے یہی حال الفامیس کا ہوا۔ عذرا کی گرمفرمائیاں اس کے لئے

بالکل نئی چیز تھی۔ بچوں کی طرح بلبلا اُٹھا اور ہچکی بندھ گئی۔

الفامیس ۔۔۔ "عذرا تم کیا کہہ رہی ہو۔ اپنی فطرت۔ اپنی قومیت اور اپنی حکومت کے خلاف تم جنگ پر آمادہ ہو؟ مجھ سے تمھیں کیوں محبت ہو۔ ممکن ہے تم بہت زیادہ مہربان آقا ثابت ہو سکو"

عذرا "آقا! لونڈی کہو، لونڈی! مجھے دُنیا کی پروا نہیں، مال و زر کی احتیاج نہیں، الفامیس! یاد رکھو میں دنیا کی تمام طاقتوں کے خلاف تمھاری ہو کر رہوں گی۔ روح آزاد ہے اور قید و بندگی پابندیاں کسی طرح اس پر عاید نہیں ہو سکتیں"

الفامیس ۔ "عذرا، کیا کہہ رہی ہو۔ تم آزاد ہو میں غلام۔ میری زندگی اور اسکی تمام مسرتیں محدود ہیں۔ حکومت کا قانون جزیرہ کے کسی باشندہ کو کسی یونانی لڑکی سے شادی کی اجازت نہیں دیتا اور شاید اسی کو روکنے کے لئے شادی پر ٹیکس عاید کر دیا گیا ہے، کہ نہ وہ ٹیکس ادا کرے گا نہ اُس کی شادی ہو گی"

عذرا ۔۔ "الفامیس، تم اس راز کو نہیں سمجھتے۔ حکومت کا مقصد یہ نہیں ہے کہ ایسی شادیاں بالکل روک دی جائیں۔ اصل غرض یہ ہے کہ حکومت ابھی تک اس شبہ میں ہے کہ جزیرہ والوں کے پاس ابھی روپیہ موجود ہے۔ لیکن قدیم روایات کے مطابق وہ اسے ہاتھ لگانا گناہ سمجھتے ہیں۔ ہمارے گروہ کی آمد صرف اسی غرض سے تھی کہ باشندے عشق میں مبتلا ہو کر تمام زر و جواہر حکومت کے خزانہ میں منتقل کر دیں۔ میں تمھاری بے نوائی کی شہادت خود دوں گی اور حکومت کو یقین دلا دوں گی کہ تمھارے پاس کچھ نہیں ہے۔ اگر اس کو بھی کسی نے نہ سُنا تو ٹیکس کی رقم اپنی طرف سے ادا کر دونگی"

اسوقت الفامیس کی حالت اس مجبور شیر کی طرح تھی جسے کٹھرے میں بند کر دیا گیا ہو۔ وہ غصہ سے اپنی بوٹی نوچنے لگا۔

الفامیس ۔ "عذرا، ہمارا ملک تباہ ہو چکا ہے۔ ایک اک فرد دانہ دانہ کو محتاج ہے۔ تمام کھیتیاں اُجڑ چکی ہیں۔ ملک ویران ہے۔ لیکن دشمنوں کو تسکین نہیں ہوتی... عذرا تم نے یہ کہا کہ میرے عوض ٹیکس تم ادا کر دو گی، لیکن تمھیں معلوم نہیں کہ یہ احسان اور وہ بھی کسی یونانی کی طرف سے مجھے کبھی گوارا نہیں ہو سکتا"

اس واقعہ کو تقریباً چھ ماہ گزر چکے ہیں۔ اس عرصہ میں الفامیس و عذرا کی اکثر ملاقاتیں ہوتی رہیں اور یہ راز پوشیدہ نہ رہ سکا۔ آخر کار عذرا نے درخواست دیدی کہ وہ الفامیس سے شادی کرنا چاہتی ہے اور حکومت نے اجازت بھی دیدی لیکن اس شرط کے ساتھ کہ الفامیس کو ایک روپیہ ٹیکس حکومت کے خزانہ میں داخل کرنا ہوگا ۔۔ عذرا جانتی تھی کہ ایک روپیہ کی حقیر رقم بھی الفامیس ادا نہ کر سکتا تھا اور یہ بھی ناممکن تھا کہ وہ خود یہ ٹیکس ادا کر دے۔

الفامیس کو بھی خبر ملی۔ عذرا سے کہنے لگا۔ "عذرا تم نے سنا، حکومت نے ٹیکس لگا ہی دیا۔ ایک روپیہ کی کیا حقیقت تھی لیکن آج جان دینے پر بھی یہ روپیہ نہیں مل سکتا"

عذرا ۔۔ "الفامیس تمھیں یاد ہوگا میں نے ابتدا ہی میں کہا تھا کہ حکومت اپنے شبہ کو دور کرنا چاہتی ہے کہ باشندوں کے پاس دفینے ہیں یا نہیں اور اسی لئے یہ ٹیکس عاید کیا گیا ہے کہ اگر یہ صحیح ہوگا تو تم ادا کر دو گے"

کئی ہفتے گزر گئے اور الفامیس کی صورت عذرا کو دکھائی نہ دی۔ عذرا کی افسردگی بڑھتی جا رہی تھی۔ ایک روز کوئی مزدور جو الفامیس کے ساتھ کھیت میں کام کرتا تھا آیا اور اس نے ایک خط عذرا کو لاکر دیا اس میں لکھا ہوا تھا:۔

عذرا!

رخصت ہوتا ہوں اور شاید پھر کبھی واپس آنے کے لئے نہیں، میری آفرینش سے قدرت کو غالباً صرف یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ وہ حد درجہ پست و ذلیل انسان کو بھی وجود میں لاسکتی ہے۔ یہی حال میرے کل ہموطنوں کا ہے۔ فطرت کی یہ سب سے بڑی ستم ظریفی تھی جو میرے لئے روا رکھی کہ دل دیدیا اور بغایت حساس۔ اول اول جب میں نے تمھیں دیکھا آنکھوں کے ساتھ روح نے بھی خدا جانے تم میں کیا شئے پائی کہ یہ محسوس کرنے لگی کہ میں اگر کسی طرح اپنی کلفتوں کو فراموش کرکے سکون سے ہمکنار ہو سکتا ہوں تو محض تمھاری معیت میں، تم نے میری تمناؤں کی پذیرائی کی۔ یہ تمھارا وہ احسان ہے کہ اس سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتا۔ اپنی عنایتوں سے تم نے میرے مستقبل کو اتنا شاندار بنا دیا کہ میں نے اپنے تمام آلام بھلا دئے۔ لیکن عذرا! آج اجازت دو کہ اپنی قوم کی نکبت کی صحیح ترجمانی کرسکوں۔ یہ صحیح ہے کہ میرے لئے تم دولت لٹا سکتی ہو۔ بڑے سے بڑا ٹیکس ادا کرسکتی ہو۔ لیکن یہ بدترین ظلم ہوتا اور پھر ایک غیر محدود مدت کے لئے قوم کی غلامی مسلم ہو جاتی۔ حکومت کو غلط طور پر ہماری دولت کا یقین ہو جاتا۔ اور پھر کوئی صورت نجات کی باقی نہ رہتی اس لئے آج حکومت کے اس شبہ کو اپنی جان دیکر دور کرنا چاہتا ہوں۔

الفامیس

دوسرے دن تمام جزیرہ میں یہ خبر پھیل گئی کہ سمندر نے ایک لاش کنارے پر اُگل دی ہے جو بعد کو الفامیس کی ثابت ہوئی تمام جزیرہ میں اس سے شورش پھیل گئی اور جب دوسرے دن عذرا کی لاش بھی اسی حالت میں دستیاب ہوئی تو یہ شورش بغاوت میں میں تبدیل ہوگئی اور آخر کار یونانیوں کو جزیرہ چھوڑ کر اپنے ملک واپس جانا پڑا۔

الیاس (اسلامپوری)

”کامران“

"مستِ مئے ہوشربا" دیکھنا چاہتا ہے، اس کے پیام کو ہم غیر فطری پیام سمجھیں ـــ بہرحال ہر شاعر کا کوئی نہ کوئی موضوعِ سخن ایسا ضرور ہوتا ہے جس سے اس کے دل کی باتوں کا پتہ چلتا ہے اور اس لحاظ سے جب ہم جناب سیماب کی شاعری پر نگاہ ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا تعلق "کارِ امروز" سے اتنا نہیں ہے جتنا "فسانۂ دیروز" سے ہے یعنی جتنی خوبی کے ساتھ وہ "کل" کی داستان بیان کر جاتے ہیں، اتنی خوبی سے وہ "آج" کے حقایق سے عہدہ بر آ نہیں ہو سکتے یا یوں سمجھئے کہ وہ ماضی کے نقوش کو تو تکمیل کے ساتھ پیش کر سکتے ہیں، لیکن حال کی تعمیر کا خاکہ ان کی قدرت سے باہر ہے۔ وہ ارضِ تاج کی کھوئی ہوئی عظمت کا مرثیہ تو اچھا لکھ سکتے ہیں لیکن دوسری ارضِ تاج پیدا نہیں کر سکتے ـــ اور سچ پوچھئے تو ہندوستان کا شاعر جو صدیوں سے غلامی کی زندگی بسر کر رہا ہے اور وہ بھی خصوصیت کے ساتھ مسلمان جو ماضی کی یاد میں اپنا حال و مستقبل دونوں تباہ کر چکا ہے، اس سے زیادہ کر بھی کیا سکتا ہے ـــ جہاں آگ کا مفہوم "جمودِ یخ" سے زیادہ نہ ہو، وہاں اس آگ کی حقیقت بیان کرنے والے بھی غنیمت ہیں ـــ شمعِ محفل کی آتش افروزیاں جب معدوم ہو جائیں تو لگن کی خاکستر میں چنگاریاں ڈھونڈھنا بھی ہر شخص کا کام نہیں۔

میں نے اس مجموعہ کا مطالعہ بالاستیعاب تو کیا نہیں اور نہ شعر و شاعری کی کتابیں بالاستیعاب پڑھنے کی چیز ہیں ـــ لیکن جب کبھی فرصت نصیب ہوئی تو کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میں نے کسی نظم کو دیکھا ہو اور کاروبار کی اُلجھنوں اور علائقِ دنیا کے مخصوص سے علیحدہ ہو کر تھوڑی دیر کے لئے اس فضا میں نہ پہونچ گیا ہوں جسے بجز ایک حقیقی شاعر کے کوئی دوسرا پیدا ہی نہیں کر سکتا لیکن یہ ضرور ہے کہ جب اُن کی کوئی خالص ادبی نظم سامنے آگئی تو یہ کیفیت زیادہ شدید محسوس ہوئی مثلاً ایک دن میں شام کو گھوڑ دوڑ سے واپس آیا تو بہت مضمحل تھا ـ اضمحلال ہارنے کا بھی اور دن بھر خراب و خستہ پھرتے رہنے کا بھی ـــ واپس آکر اس مجموعہ کو اُٹھا لیا، فہرست میں "رنگین تیتری" پر نظر جمی، اور جب ورق اُلٹ کر اس کو پڑھا تو بڑی حد تک کوفت دور ہو گئی۔

دامانِ گُل سے مستی بن کر اُلجھنے والی ۔۔۔ اور راقِ گُل کو اپنی دنیا سمجھنے والی،
جذبات کی فضا میں اک ذرۂ پریدہ ۔۔۔ رنگوں کے ارتقا میں اک نقشِ برگزیدہ

یا ـــ اُڑنے لگے تو نکہت گرنے لگے تو شبنم ـــ یا ـــ مہکا ہوا سا شعلہ، دہکی ہوئی سی مستی

کیسی پاکیزہ تلاش ہے، کتنا لطیف پیرایۂ بیان ہے۔

اس کے بعد ہی میں نے قشقہ والی نظم پڑھی، کیونکہ تیتری کے ساتھ ہی قدرتاً میرا خیال عورت کی طرف منتقل ہوا، اور نہیں کہہ سکتا کہ مجھے کتنا لطف دے گئی۔

چند شعر ملاحظہ ہوں:-

طلوع کون یہ ہوا صنمکدہ سے صبح کے ۔۔۔ جبین مرمریں میں شمعِ بتکدہ لئے ہوئے
جگائے چتونوں میں اپنی ایک سحرِ حُسن کا ۔۔۔ نظر میں بجلیاں لبوں میں زمزمہ لئے ہوئے

خرام، آہ، وہ خرام جو ہے[1] پائے ناز سے — دلوں کی پائمالیوں کا فیصلہ لئے ہوئے
قدم قدم پر ایک فتنۂ قیامت آفریں — نقوشِ پا صد آئینہ در آئینہ لئے ہوئے
جمال میں بھرے ہوئے ہزار درسِ عاشقی — خیال میں مسرتِ مطالعہ لئے ہوئے

وہ بال جن پر اپنی جان ابرِ نوبہار دے
وہ چال جو نگاہ کو پیامِ انتشار دے

شخصی نظموں میں میرے نزدیک سب سے بہتر نظم اُن کی سری کرشن کے متعلق ہے اور اس کا سبب یہی ہے کہ اکابر مذہب میں سری کرشن ہی کی زندگی ایسی زندگی ہے جو شاعر کے احساساتِ حُسن کو بیدار کر سکتی ہے۔ انھوں نے بودھ اور رسول کائنات پر بھی نظمیں لکھی ہیں، لیکن اُن میں وہ بات پیدا نہ ہو سکی۔ گوتم بودھ کے ذکر میں ان کی شاعری کا اوج اس سے آگے نہ بڑھ سکا کہ

برف زاروں کو ترے انفاس نے گرما دیا — تخت شاہی کو ترے احساس نے ٹھکرا دیا

بیخودی کے نام سے جب دورِ جام[2] بادہ تھا — جب تجلّیٔ حقیقت[3] سے ہر اک دل سادہ تھا
نفس تھا جب عیش کو رازِ بقا سمجھے ہوئے — جب ہوس تھی صرف "عورت" کو خدا سمجھے ہوئے

. . . .

علم و عرفانِ الٰہی کی شہادت تو نے دی — غور کرنے کی دلِ انساں کو فرصت تو نے دی

رسول کائنات کی نظم میں پہلا بند تمہیدی بہت شاندار ہے، چند شعر ملاحظہ ہوں:۔

مسلط بزمِ عالم پر ہوئی یوں تیرہ سامانی — کہ تھی جگنو سے بھی کمزور سورج کی درخشانی
چمن کے رنگ سے تھا اہتمام اخذِ تاریکی — سحر کے نور سے تھا انتظامِ ظلمت افشانی
شکنجہ جور و استبداد کا تھا اور دنیا تھی — کہیں فخرِ جہانداری، کہیں فرِّ جہانبانی

اس کے بعد دوسرا بند شروع ہوتا ہے جس میں کہ خصوصیاتِ نبوی کو نہایت پاکیزہ الفاظ میں ظاہر کیا گیا ہے، مثلاً

مربر، خاکِ بطحا نے کیا آخر نیا پیدا — سیاست میں بھی جینے کی محبت کی ادا پیدا

---

[1] اس مصرعہ کا آخری حصہ تکلف سے خالی نہیں۔ اول تو "جو ہے" کا دوسرا ٹکڑا "فیصلہ لئے ہوئے" سے بہت دور پڑ گیا ہے، دوسرے پائے ناز کی ترکیب بھی محلِ نظر ہے۔ پہلا مصرعہ اگر یوں ہوتا تو بہتر تھا — خرام آہ وہ خرام جو ادائے ناز سے — خرام کے بعد پاؤں کے ذکر کی ضرورت یوں بھی باقی نہیں رہتی — [2] دورِ جام کہنے کے بعد لفظ بادہ کا اظہار بلاغت و فصاحت دونوں کے منافی ہے —
[3] "تجلّیٔ حقیقت" ثقیل ترکیب ہے یوں بھی کہہ سکتے تھے:۔ جب حقیقت کی تجلّی سے ہر اک دل سادہ تھا۔

عرب سے تا عجم وحدت کا سکہ کر دیا جاری — نیا بتخانے کے ماحول سے کعبہ کیا پیدا

سیاست کو کیا آراستہ تہذیب کامل سے — تدبر سے کیا دنیا و دیں میں واسطہ پیدا

تیسرے بند کے بھی بعض شعر نہ صرف جذبات خلوص کے آئنہ دار ہیں بلکہ قوت فکر و شاعری کو بھی پوری طرح نمایاں کرتے ہیں، مثلاً

کہیں تو زندگی پیرا بہ اعجاز لب عیسیٰ — کہیں تو خطبہ فرما اوج طایف پر کلیمانہ

فروغ آفرینش تو توں پر تیری قائم ہے — کہیں تو شمع محفل ہے کہیں تو نور کاشانہ

لیکن سری کرشن کے عنوان سے جو نظم لکھی گئی ہے اس کا انداز کچھ اور ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس عنوان نے سیماب صاحب کے ساز شاعری کے اُن تاروں کو چھیڑ دیا ہے جو ان کے ذوق و احساس کو زیادہ تکمیل کے ساتھ پیش کرنے والے ہیں۔ اس نظم کی استداء ملاحظہ ہو:۔

ہوا طلوع ستاروں کی دلکشی لیکر — سرور آنکھ میں نظروں میں زندگی لیکر

گزشتہ صبح محبت کو ڈھونڈھنے نکلا — اک آفتاب، محبت کی روشنی لیکر

دوسرا بند پورا جذبات کی جان ہے، کیسے کیسے پاکیزہ شعر نظر آتے ہیں:۔

جمال و حسن کے کافر نکھار سے کھیلا — ریاض عشق کی رنگیں بہار سے کھیلا

سمجھ کے عالم فانی کو ایک بازیچہ — کبھی چمن سے کبھی کوہسار سے کھیلا

الغرض معلوم ایسا ہوتا ہے کہ سیماب صاحب قدرتاً تغزل کے لئے پیدا ہوئے ہیں اور جب موقعہ اس نوع کی گفتگو کا آجاتا ہے تو وہ بہت کامیاب نظر آتے ہیں۔

قومی منظومات بھی اس مجموعہ میں متعدد نظر آتی ہیں جن میں مزدور، نوجوان ہندوستان سے — آزادی — اچھی نظمیں ہیں، لیکن خالص عشقیہ نظموں کے مقابلہ میں یہ بھی ہیچ ہیں، چنانچہ چند اشعار سیماب صاحب کے اس حقیقی ذوق کے ملاحظہ ہوں:۔

یہ کون خلوتکدے سے کھڑے اُلٹ کے جلوے دکھا رہا ہو — یہ کس کا کافر شباب رنگیں شفق کے خاکے اُڑا رہا ہو

یہ کسکی آہ اثر نے جنت کی ایک تصویر کھینچدی ہو — بہار رنگ سرور بن کر یہ کون منظر پہ چھا رہا ہو

محبوب کے ماضی کی یاد میں ایک نظم لکھی گئی ہے، اس کا کیف ملاحظہ ہو:۔

مری نظر میں ہے دیباچہ شباب ترا — کہ مست حُسن کے نغموں سے تھا رباب ترا

وہ اپنے کیف میں خود اک طرح کی مدہوشی — وہ اک مجسمہ، آلودۂ شراب ترا

وہ شوق کے لب تشنہ وہ تیرا عارض تر — وہ مشت خاک کے قبضہ میں آفتاب ترا

وہ ابتدائے محبت وہ چاندنی راتیں — مرے کنار میں وہ پرسکون خواب ترا
کبھی وہ نرمی گفتار پر ترا ہنسنا — کبھی وہ گرمی آغوش پر عتاب ترا
وہ شب کے سایہ میں کافر ملاحتیں تیری — سحر کے بھیس میں وہ حسنِ لاجواب ترا

آگرہ کے آثار قدیمہ اور خصوصیت کے ساتھ تاج محل پر جو نظمیں انھوں نے لکھی ہیں وہ بھی پورے برانگیختہ جذبات کا نتیجہ ہیں اور اس لئے بہت کامیاب ہیں۔ اس سلسلہ کی نظموں میں "تاج بہ کنار شفق" میرے نزدیک ان کی بہترین نظم ہے، چند اشعار اس کے ملاحظہ ہوں:۔

افق کے لالہ زار سے گزر رہا ہے آفتاب — فضاؤں کو سلام شام کر رہا ہے آفتاب
گلوں کے قمقمے جلے، کنول جھکا ہوا اُٹھا — شفق ہوئی جو رنگ بار تاج جگمگا اُٹھا
قدح یہاں سبو یہاں، بہار جار سو یہاں — سمٹ کر آگیا ہے اک جہانِ رنگ و بو یہاں
یہ ہلکے ہلکے سائے یہ نکھار برگ و بار کا — کہ جیسے لمحہ اک یہی شباب ہے بہار کا

لیکن جس وقت ہم یہ دیکھتے ہیں کہ باوجود ان تمام محاسن کے یہ مجموعہ اغلاط سے پاک نہیں ہے تو ہم کو افسوس ہوتا ہے۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ ہر کلام میں خواہ وہ نظم کا ہو یا نثر کا ترقی و علو کی گنجایش ہمیشہ باقی رہتی ہے، لیکن غلطیوں کا پایا جانا اور وہ بھی ایسی غلطیاں کہ کہنے والا اخر ادنیٰ تامل کے بعد ان کو دور یا ختم کر سکے، یقیناً بہت تکلیف دہ ہوا کرتا ہے۔

اغلاط شعر دو قسم کے ہوا کرتے ہیں، ایک تو وہ جن کا تعلق عروض و قافیہ سے ہوتا ہے اور دوسرے وہ جو ترکیب الفاظ اور فن معانی و بیان سے متعلق ہیں۔ اول قسم کی غلطیاں زیادہ تر نومشق شعراء کے کلام میں پائی جاتی ہیں، اس لئے ظاہر ہے کہ سیماب صاحب کے مجموعہ کو اس نوع کے اغلاط سے بڑی حد تک پاک ہونا چاہئے، لیکن دوسری قسم کی غلطیاں جو زیادہ تر کہنہ مشق شعراء ہی کے یہاں نظر آتی ہیں ان کے کلام میں بھی موجود ہیں۔

سیماب صاحب نے اپنے مجموعہ کی ابتدا تین فارسی رُباعیوں سے کی ہے۔ پہلی رباعی میں خدا سے خطاب کیا ہے، دوسری میں رسول اللہ سے اور تیسری میں سارى دنیا سے۔

پہلی رُباعی یہ ہے:۔

اے رب قدیم و کردگارِ امروز — دے نزہتِ ماضی و بہارِ امروز
دیروز رہینِ منت رحمت تو — لطف و کرمت ضامن کار امروز

اس رباعی میں ہر جگہ ترکیب اضافی اختیار کی گئی ہے مثلاً کردگار امروز۔ نزہت ماضی، رہین منت، ضامن کار وغیرہ لیکن پہلا ٹکڑا "رب قدیم" صفت و موصوف واقع ہوا ہے، جو علم معانی و بیان کی رو سے خلاف فصاحت ہے۔ علاوہ اس کے رب کی صفت میں جب لفظ قدیم استعمال کیا جائے گا تو اس مفہوم میں "ازل و ابد" دونوں شامل ہوں گے، حالانکہ

محل کا اقتضا یہ ہے کہ صرف ماضی یا عہدِ گزشتہ سے اس کو متعلق کیا جائے۔ اگر بجائے ربِ قدیم کے خالقِ دی کہا جاتا تو یہ نقص دور ہو جاتا۔

دوسری رُباعی یہ ہے :۔

اے سطوتِ دیروزہ و قارِ امروز نورِ فردا و جلوہ دارِ امروز
یک سطرِ مرتب، عالم از دفترِ تو مجموعۂ کارِ تست کارِ امروز

اس رُباعی میں رسول اللہ سے خطاب کیا گیا ہے

تیسرے مصرعہ کا مفہوم یہ ہے کہ "تیرے دفتر کی صرف ایک ترتیب دی ہوئی سطر اک دنیا ہے"۔ لیکن چوتھے مصرعہ میں بیان کا یہ ارتقار گھٹ کر اس حد تک اُتر آیا ہے کہ کارِ امروز کو اس کا مجموعۂ کار بتایا جاتا ہے، حالانکہ ہمارا تمام مجموعۂ کار اس کے صرف ایک نقطہ یا ایک اشارہ کا نتیجہ ہونا چاہئے۔ چوتھا مصرعہ یوں ہوتا تو بہتر تھا :۔

یک لفظِ تو، سازِ جملہ کارِ امروز

تیسری رُباعی ملاحظہ ہو، جس کا عنوان اساسِ فردا ہے :۔

فارغ منشیں ز اقتدارِ امروز مستقبلِ تُست در کنارِ امروز
دانی کہ سوادِ دفترِ فردا چیست یک نقطۂ افسردہ بہ کارِ امروز

رباعی بہت اچھی ہے لیکن مجھے لفظ نقطہ پر اعتراض ہے۔ دوسرے شعر کا مفہوم یہ ہے کہ جس چیز کو کل کی ترقی سے تعبیر کیا جاتا ہے اس کی بنیاد آج ہی پڑتی ہے، مدعا یہ کہ جو کچھ کرنا ہے آج ہی کر لو۔ لیکن گفتگو اس میں ہے کہ کام میں اضافہ نقطہ کا ہوا کرتا ہے یا نکتہ کا۔ ہر چند سوادِ دفتر کی رعایت سے نقطہ زیادہ مناسب ہے لیکن کارِ امروز کے لحاظ سے نکتہ ہونا چاہئے پھر چونکہ کارِ امروز ردیف و قافیہ ہونے کی وجہ سے بدلا نہیں جا سکتا اس لئے پہلے ہی مصرعہ میں تبدیلی کی ضرورت تھی اور اگر لفظ سواد نکال کر اساس اور دوسرے مصرعہ میں بجائے نقطہ کے نکتہ کر دیا جاتا تو یہ نقص دور ہو جاتا۔

اس کے بعد نوائے تجدید کے عنوان سے یک ترجیع بند نظر آتا ہے جس کا پہلا بند یہ ہے :۔

میں کہ اس ہنگامۂ ہستی میں صرفِ نالہ ہوں خونچکاں اپنے لبِ فریاد کا تبخالہ ہوں
اہمیتِ نشوونمائے دل کی باقی ہو چکی اب لہو جس سے ٹپکتا ہے وہ شاخِ لالہ ہوں
میری ہر اک حیثیت سے پیدا ہیں لاکھوں بجلیاں خرمنِ آتش زدہ کا شعلۂ جوالہ ہوں
زندگی کی ڈھونڈتے ہو مجھ میں کیا چنگاریاں اک حریمِ عیش کی خاکسترِ صد سالہ ہوں

جب وہ صہبائے معطر جام میں باقی نہیں
مستیٔ تحقیق میرے نام میں باقی نہیں

اس نظم کے ذریعہ سے شاعر نے اس خیال کو ظاہر کرنا چاہا ہے کہ ہم بحالت موجودہ نہایت ہی پستی و ذلت کی حالت میں ہیں لیکن ہمارا یہ زوال ہی اپنے اندر عروج کے اسباب پنہاں رکھتا ہے اور یہی وہ راز ہے جس کو شاعر نوائے تجدید کے نام سے موسوم کرتا ہے۔

کسی مخصوص خیال یا مخصوص نظریہ کے ماتحت کوئی نظم کہنا حد درجہ دشوار ہے کیونکہ فراوانی جذبات کی وجہ سے ایک شاعر بسا اوقات ربط بیان کو ہاتھ سے کھو بیٹھتا ہے اور متعارض خیالات نظم ہو جاتے ہیں۔ اب اسی بند کو دیکھئے کہ اس کے بیان میں کتنا عدم توازن اور کس قدر تخالف و تضاد پایا جاتا ہے۔ پہلے شعر کا مفہوم یہ ہے کہ اُس وقت ہنگامۂ ہستی میں میرا نالہ کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے تنجا آلہ سے خون ٹپکنا کہ یہ زاری و بیکسی کا انتہائی دلدوز منظر ہے۔ لیکن دوسرے شعر کے دونوں مصرعوں میں تعارض پیدا ہو گیا۔

اول تو "ماہیت کا پانی ہو جانا" کوئی معنی نہیں رکھتا۔ دوسرے یہ کہ دل کے نشو و نما کی ماہیت یہی ہو سکتی ہے کہ اس سے خون ٹپکے، سو وہ دوسرے مصرعہ سے ثابت ہے۔ پھر اس کا پانی ہو جانا کیا معنی۔ اگر شعر یوں ہوتا تو یہ نقص باقی نہ رہتا۔

کیفیت تخلیق آب و رنگ کی باقی نہیں   اب لہو جس سے ٹپکتا ہے وہ شاخِ لالہ ہوں

تیسرا شعر یہ ہے:۔

میری ہر اک جست سے پیدا ہیں لاکھوں بجلیاں   خرمن آتش زدہ کا شعلۂ جوالہ ہوں

پہلا مصرعہ اصل مفہوم کے بالکل منافی ہے، کیونکہ ہر اک جست سے لاکھوں بجلیاں پیدا ہونا تو عروجِ عمل کا ثبوت ہے نہ کہ انحطاط و زوال کا۔ اسی طرح دوسرے مصرعہ میں شعلۂ جوالہ مناسب نہیں، علی الخصوص اس حالت میں کہ اس کے بعد ہی دوسرے شعر میں شاعر اپنے آپ کو خاکستر صد سالہ اور زندگی کی چنگاریوں سے بالکل خالی ظاہر کرتا ہے۔

ٹیپ کا شعر ہے:۔

اب وہ صہبائے معطر جام میں باقی نہیں   مستیٔ تخلیق میرے نام میں باقی نہیں

اگر دوسرے مصرعہ کا تعلق پہلے سے لف و نشر مرتب کی صورت میں ہے تو صہبا کا تعلق مستی سے تو ہو سکتا ہے لیکن تخلیق کا اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ اسی طرح جام و نام میں باہمد گر کوئی مناسبت نہیں۔ لیکن اگر ان دونوں مصرعوں کو علحدہ علحدہ مستقل مفہوم کا حامل سمجھا جائے تو بھی محض نام سے مستیٔ تخلیق کو متعلق کرنا بغیر ثبوت پیش کئے ہوئے کوئی معنی نہیں رکھتا۔

اس نظم کے دوسرے بندوں میں بھی کہیں کہیں اسی نوع کا عدم توازن پایا جاتا ہے۔ ایک جگہ "خواب حسین" کی ترکیب توصیفی استعمال کی گئی ہے جو درست نہیں۔ کیونکہ لفظ حسین نہ فارسی ہے نہ عربی۔ نظم درۃ التاج میں بھی ایک جگہ "مہمان حسین" نظر آتا ہے اور صفحہ ۸، پر بھی "جزوِ حسین" لکھا گیا ہے۔ نظم شعلۂ احساس کے آخری بند میں زندگی کو مخاطب کرکے کہتے ہیں کہ۔

زندگی، ہستی مرحوم پر احساں کر دے   پھر مرتب مرے اجزاء پریشاں کر دے

پھر بنا لا مجھے رنگینیِ دامانِ بہار　　　　پھر گلستاں میں گل ولالہ بداماں کردے

پہلے شعر کا پہلا مصرعہ یکسر آورد و تکلف ہے اور زندگی کو بغیر حرفِ ندا کے استعمال کرنا اس موقعہ پر مناسب نہ تھا۔
دوسرے شعر میں بنا لا بجائے بنا دے کے استعمال کیا گیا ہے اور گل ولالہ بداماں کی ترکیب بھی قابلِ احتراز تھی۔ فارسی میں "گل بداماں۔ لالہ بداماں"، علٰحدہ علٰحدہ لکھ سکتے ہیں لیکن گل ولالہ کو حرفِ عطف سے ملا کر گل ولالہ بداماں لکھنا درست نہیں۔
یہ شعر یوں ہونا چاہئے تھا:۔

سونپ دے پھر مجھے رنگینیِ دامانِ بہار　　　　پھر گلستاں میں مجھے لالہ بداماں کردے

اس طرح دونوں مصرعوں میں مجھے کی تکرار بھی ہوجاتی جو بیان کی قوت کو اور بڑھانے والی ہے۔
اس کے بعد کا شعر ہے:۔

جمع کرکے مرے سامانِ نواسنجی کو　　　　بربطِ خامشیِ عالم امکاں کردے

بربطِ خامشی کے معنے یہ ہیں کہ خاموشی خود بربط کا کام دینے لگے، درانحالیکہ پہلے مصرعہ میں سامان نواسنجی کہکر خاموشی کے امکان کو دور کردیا گیا ہے۔

ایک نظم طلوعِ سیاست کے عنوان سے صفحہ ۸۴ پر نظر آتی ہے جس کا پہلا شعر یہ ہے:۔

محفل عالم جمالِ حسن سے خالی ہوئی　　　　صبح کی صورت جہنم کی طرح کالی ہوئی

جمال اور حسن تقریباً ایک ہی چیز ہے۔ فارسی میں لفظ جمال جلوہ کے معنے میں بھی مستعمل ہوتا ہے لیکن زیادہ تر اسی وقت جب بجائے کیفیت ادراک کے کسی محسوس شے سے اسے منسوب کیا جائے، مثلاً جمالِ رُخ، وغیرہ۔ اس لئے اگر بجائے جمال کے فروغ یا وجود کا لفظ استعمال کیا جاتا تو یہ نقص دور ہوجاتا۔

اسی نظم کا آخری شعر یہ ہے:۔

مستقل جو عہدِ شخصیت کی لعنت ہوگیا　　　　نام اس قانونِ وضعی کا سیاست ہوگیا

شاعر اپنے مفہوم کو اچھی طرح ظاہر نہیں کرسکا۔ اس کی تعقید کو دور کرکے اگر نثر کی جائے تو عبارت یوں ہوگی کہ

"جو (قانون) عہدِ شخصیت کی مستقل لعنت ہوگیا، اس قانونِ وضعی کا نام سیاست ہوگیا۔"

مدعا یہ ظاہر کرنا ہے کہ جس چیز کو اس وقت سیاست سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ حقیقتاً ایک ایسا قانون ہے جو محض استبدادی حکومت کے لئے وضع کیا گیا ہے۔
"شخصیت" اور "قانونِ وضعی" دونوں اصل مفہوم سے بالکل علٰحدہ ہیں نہ لفظ شخصیت سے Autocracy کا مفہوم پیدا ہوتا ہے، اور نہ قانونِ وضعی سے قانونِ استبداد کا۔
اس کے بعد صفحہ ۸۵ پر ایک نظم بیسویں صدی بکرمی کے عنوان سے درج ہے۔ اس نظم کا مقصود یہ ہے کہ ہندوستان کے

اہلِ مذاہب کو باہمگر رواداری کی تعلیم دیجائے اور بتایا جائے کہ اس سے قبل ہر مذہب دوسرے مذہب کا احترام کرتا تھا۔
اس کے پہلے دو شعر یہ ہیں:۔

اک دور وہ تھا روح فزا، کیفیت اندوز، کعبے میں تھی اک عید تو بتخانے میں نوروز
تھا برہمن و شیخ میں اک ربط مسلسل ناقوس و اذاں کا تھا ہر اک نغمہ دل افروز

شاعر اس خیال کے اظہار سے ابتدا کرنا چاہتا ہے کہ اب سے پہلے شیخ و برہمن یا مسلم و غیر مسلم میں بہت اتحاد پایا جاتا تھا اور ہر ایک دوسرے کی مسرت میں حصہ لیتا تھا۔ لیکن پہلے شعر کے مصرعۂ دوم کی تعبیر ناقص اس مفہوم کو پوری طرح ظاہر ہونے نہیں دیتی۔

اول تو بُت خانے کو نوروز سے کوئی واسطہ نہیں، لیکن اگر یہ کہا جائے کہ ظاہر کرنا تو یہی ہے کہ باوجود اس کے کہ بُت خانہ کو نوروز سے کوئی واسطہ نہیں، وہاں یہ رسم منائی جاتی تھی، تو پھر "کعبہ میں تھی اک عید" کہنا کوئی معنی نہیں رکھتا کیونکہ عید تو کعبہ والوں ہی کی ہے۔ اس لئے باہمگر ارتباط کے اظہار کے لئے اس مصرعہ کو یوں ہونا چاہئے تھا۔

آتشکدہ میں عید تھی اور کعبہ میں نوروز

چند اشعار کے بعد موجودہ حالت کو ان الفاظ میں دکھایا گیا ہے کہ:۔

ہر برگ میں ہر پھول میں جھکی ہوئی سازش ہر ساز کی آواز میں دہکا ہوا اک سوز

پہلے مصرعہ میں جھکی ہوئی سازش محل نظر ہے اور دوسرے مصرعہ میں "دہکا ہوا سوز" اصل مفہوم کے منافی پڑتا ہے، کیونکہ ساز میں سوز ہی ہونا چاہئے خواہ وہ دہکا ہوا ہو یا بے دہکا ہوا۔ یہ شعر اگر یوں ہوتا تو مناسب تھا:۔

ہر برگ میں ہر پھول میں اک نکہتِ مسموم ہر ساز کی آواز میں اک شورِ سکوں سوز

آخری شعر ملاحظہ ہو:۔

مندر کے مغنی سے خدارا کوئی کہدے اے مرغِ سحر ضبط زپروانہ بیاموز

ضبط کی تعلیم صرف مندر کے مغنی کو دینا اور اہل صومعہ کو علٰحدہ کر دینا نظم کی اصل روح کے منافی ہے، علاوہ اس کے یوں بھی مرغِ سحر کی رعایت سے پہلے مصرعہ میں بجائے (مندر کے مغنی) کے (مسجد کے موذن) کو لانا چاہئے تھا۔

اس کے بعد سیماب صاحب نے اہلِ عالم کے نام ایک پیغام پیش کیا ہے۔ اس میں شک نہیں نظم اچھی ہے لیکن کہیں کہیں اسی نوع کے اسقام اس میں بھی پائے جاتے ہیں۔ عہد ماضی اور اس کی محبت و صداقت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

ایک آندہ دہ سی چیتون میں بھی تھا حُسن کشاد ایک دزدیدہ نظر بھی گرمیِ افسانہ تھی

اول مصرعہ کا مفہوم انھوں نے یہ رکھا ہے کہ اگر پہلے باہمگر آزردگی بھی پیدا ہو جاتی تھی تو اس میں صداقت پائی جاتی تھی۔ لیکن بہ لحاظ فنِ شعر ان اس میں تین سقم نظر آتے ہیں، اول تو چیتون کے ساتھ لفظ ایک کا استعمال زاید و بیکار ہے، دوسرے

فارسی میں - اشک چکیدن - اشک ریختن ، اشک باریدن ، اشک چیدن ، اشک نشاندن ، اشک فروخوردن ، اشک روئیدن ، اشک شکستن ، تو آتا ہے لیکن اشک انگیختن مستعمل نہیں اور نہ معناً درست ہے ، کیونکہ انگیزیدن اور انگیختہ کے معنے بلند ہونے ، بلند کرنے کے ہیں ، اور پیدا کرنے ، ظاہر کرنے کے معنے میں بھی اس کا استعمال ہوتا ہی لیکن جب تک کسی چیز میں کیفیت بلندی کی نہ پائی جائے اس کے ساتھ اس مصدر یا اس کے مشتقات کا استعمال درست نہیں - آنسو میں کیفیت نیچے گرنے کی ہے نہ کہ اوپر بلند ہونے کی ۔ یوں البتہ کہہ سکتے تھے :-

جب ہر نفس ہو مضطرب ، اور اشک خون آمیز ہو

اس نظم کے دوسرے بند کا شعر ہے :-

پھولوں کے دل میں کھول دے بادِ چمن کے راستے　　　ہموار کر دے دشت میں بکھرے ہوئے ذرات کو

بکھرے ہوئی چیزوں کو ہموار نہیں کیا جاتا بلکہ یکجا کیا جاتا ہے -

اس بند میں رات ، جذبات ، حالات و محسوسات کو ہم قافیہ رکھا گیا ہے جس کی صحت کے متعلق سیاب صاحب کو خود ہی غور کرنا چاہئے -

اس نظم میں عنوان کو ملا کر آٹھ جگہ (نصب العین) بہ سکونِ (صاد) استعمال کیا گیا ہے مثلاً

شاعر کے نصب العین میں تہذیب عالم ہے یہی وغیرہ وغیرہ - حالانکہ صحیح (نَصَب العین) بہ فتح (صاد) ہے . عربی میں نصْب و نصَب دونوں آتے ہیں لیکن ان کے معنے میں فرق ہے - نصَب کے معنے ، بحالت اسم تعب و غم کے آتے ہیں اور مصدری حالت میں قایم کرنا یا بلند کرنا - اور - نصْب کا مفہوم ہے جد و جہد کرنا ، نصَب العین سے مدعا کسی غرض منزل کو مخصوص و متعین کرنا ہے اور اس لئے نَصَب العین ہونا چاہئے ، عربی میں بلند جھنڈے ، میلِ راہ اور نشان منزل کو نَصَب ہی کہتے ہیں -

صفحہ ۱۲۷ -

آہ ، لیکن ہے وہی تیرگی خلوتِ غم　　　نہ تجلّی مسرت نہ تجلائے سکوں

تجلّی و تجلّا دونوں ایک ہی لفظ ہیں - اگر بجائے تجلائے سکوں کے تولائے سکوں ہوتا تو یہ نقص دور ہو جاتا -

صفحہ ۱۲۸ - (نظم تاروں کا گیت)

ہم برق کے زندہ ٹکڑے ہیں ہم جنت کے پروانے ہیں　　　لبریز شرابِ فطرت سے بے گردش کے پیمانے ہیں

تاروں کے متعلق (جو رات دن گردش میں ہیں) یہ کہنا کہ وہ بے گردش کے پیمانے ہیں ، عجیب بات ہے ، دوسرا مصرعہ یوں بھی ہو سکتا تھا :-

لبریز جمالِ فطرت ہیں ، ہم نور بھرے پیمانے ہیں

اسی نظم کا ایک شعر ہے :-

ہاں فرق اگر ہے تو اتنا، تم اپنی حقیقت بھول گئے — ہم اپنی حقیقت پہچانے، باطل کی لعنت بھول گئے

"ہم نے اپنی حقیقت پہچانی یا ہم اپنی حقیقت پہچان گئے" کی جگہ (ہم اپنی حقیقت پہچانے) نظم کیا گیا ہے۔

(باقی)

اہتمام سرسری اطلاعنامہ بنام دائنان

(دفعہ ۴۸ ایکٹ نمبر ۵ سنہ ۱۹۲۰ء)

بعدالت جناب سید خورشید حسین صاحب جج خفیفہ لکھنؤ

درخواست دیوالیہ نمبر ۴۰ سنہ ۱۹۳۴ء

بمقدمہ قرار دئے جانے دیوالیہ مسمیٰ دوبر ولد تلک قوم پاسی ساکن سرون کھیڑہ پرگنہ مہونہ ضلع لکھنؤ

بنام:
- ۵ — رجولال رستوگی ساکن راجہ بازار لکھنؤ
- ۶ — جے کرشن لال کایستھ ساکن مہونہ ضلع لکھنؤ
- ۷ — فتح بہادر کایستھ ساکن مہونہ ضلع لکھنؤ
- ۹ — بدری پرشاد رستوگی ساکن راجہ بازار لکھنؤ

اطلاع دی جاتی ہے کہ بتاریخ ۷ ماہ ستمبر سنہ ۱۹۳۴ء مدیون مذکور الصدر نے ایک قطعہ درخواست اس عدالت میں بدیں غرض پیش کی ہے کہ وہ دیوالیہ قرار دیا جاوے اور یہ کہ بتاریخ ۴ ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۳۴ء عدالت ہذا نے اس امر کا اطمینان کرکے کہ مدیون کی جایداد غالباً مبلغ پانچ سو روپیہ سے زاید نہ ہوگی ہدایت کی ہے کہ مدیون کی جائداد کا اہتمام سرسری طریقہ پر کیا جاوے اور تاریخ چار ماہ اپریل سنہ ۱۹۳۵ء بنابر مزید سماعت درخواست و اظہار مدیون مذکور مقرر کی ہے۔ اس امر کی بھی اطلاع دی جاتی ہے کہ عدالت تاریخ مذکور الصدر تصفیہ و تقسیم جایداد مدیون مذکور کی فوراً کارروائی شروع کر سکتی ہے۔ تم کو اختیار ہے کہ تم حاضر ہو کر اس تاریخ پر ثبوت دو۔ ثبوت کسی عویٰ کا جو تم کرنا چاہو تاریخ مذکور پر یا اس کے قبل داخل عدالت کرنا لازمی ہوگا۔

میرے دستخط اور مہر عدالت کے آج بتاریخ ۱۵ ماہ مارچ سنہ ۱۹۳۵ء جاری کیا گیا۔

دستخط منصرم

وقت حاضری عدالت دس بجے سے چار بجے تک

اَسَدُاللّٰہِ الغالِبُ

افرادِ عالم کے لئے جو رسول تھا اور عالمین کے لئے بشیر و نذیر بنا کر جس کو خدا نے آخری طور پر نسل انسانی کو غلط راہوں سے ہٹا کر صراط مستقیم پر چلانے کے لئے بھیجا تھا۔ اس نے سب سے بہتر قرن کے لئے بہترین قلوب کو چنا۔ اپنی صحبت اور رفاقت میں رکھا اور پھر ان میں ہر ایک کو "بایہم اقتدیتم اھتدیتم" کی سند عطا کر کے سارے بنی آدم کو حکم دیا کہ "ان میں سے جس کسی کی پیروی کروگے سیدھی راہ پاؤگے"۔

مردوں میں ایک ایسا جوان مرد اسلام نے پیدا کیا۔ جو جوانی سے پہلے بلکہ عہد طفولیت کے آغاز ہی سے اگر سات سال نہیں تو باتفاق محدثین و مورخین آغوش نبوت میں اپنی عمر کے آٹھویں سال قطعی طور پر آگیا تھا۔

محمد بن اسحاق "صاحب سیرہ" نے لکھا ہے کہ "فاخذ[1] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علیاً وضمہ الی صدرہ"۔

پھر کون نہیں جانتا کہ جس نے نبوت کے آغوش میں ہوش سنبھالا تھا اس نے سب سے پہلی دفعہ جب غیب کے عالم قدس سے اس خاکدان شہادت کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے سرفراز فرمایا تو کیا یہ وہی جگہ نہ تھی جس کے متعلق ہر مومن کا عقیدہ ہے کہ وہ ہر قسم کے مخالف اثرات سے مامون ہو جاتا ہے۔ ہندوستان کے جلیل القدر محدث حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ مشہور محدث حاکم سے ناقل ہیں۔

"وقد تواترت[2] الاخبار ان فاطمۃ بنت اسد ولدت امیر المومنین علیاً فی جوف الکعبۃ"

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلی دفعہ جب اپنے خاندان کو اسلام کی دعوت دینے کے لئے کھانے پر جمع فرمایا اور اس وقت دریافت فرمایا کہ میرا کون ساتھ دیتا ہے۔ تو ایک نوعمر بچہ نے جواب دیا کہ "گو میرے پاؤں کمزور ہیں لیکن میں آپ کا ساتھ دوں گا"۔ ابولہب اس پر ہنسا کہ بس اسی ایک لڑکے کے بھروسہ پر تمہارا کام چلیگا۔ لیکن دنیا نے دیکھا کہ جسے لڑکا سمجھا گیا تھا اسی نے تمام مخالف قوتوں کا مقابلہ کیا اور جو وعدہ کیا تھا اس کو پورا کر دکھایا۔ اس نے حضور موت کی بنی ہوئی سبز چادر میں اپنے کو اس وقت لپیٹا جس وقت سب کہہ رہے تھے کہ موت کی اس چادر میں لپٹ کر سونے والا شاید کبھی نہیں اٹھے گا حالانکہ جو سویا تھا وہی جاگا اور ابد تک جاگ اسی کے لئے ہے۔ اور جو کفار حملے کے ارادے سے جاگ رہے تھے

---

[1] پکڑ لیا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا علی کرم اللہ وجہ کو (حضرت ابوطالب سے) اور لپٹا لیا اپنے سینہ سے -- [2] یہ متواتر ہے کہ سیدتنا فاطمہ بنت اسد رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے امیر المومنین حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہ کی ولادت کعبہ کے اندر ہوئی۔

وہی سو گئے اور نامرادی کی نیند صرف ان ہی کے لئے تھی۔
نبوت کی شعاعوں کو دیکھو تو دنیا میں کون پھیلا رہا ہے۔ بدر میں اِدھر کفار حملہ آور ہیں اور اُدھر رسول اللہ سربسجود ہیں کہ اگر آج اس چھوٹی سی جماعت کی نصرت نہ کی گئی تو اے خدا! زمین پر پھر تیری پرستش نہ ہو گی۔ مسلمانوں کے متعلق قرآن خبر دے رہا ہے کہ وہ گمان کر رہے تھے کہ ہم موت کی طرف کھینچے جا رہے ہیں لیکن جب قریش کے سورماؤں نے اپنے پرچم ہلا کر غرور کے لہجہ میں پکارا کہ " یا محمد اخرج الناس الکفاءنا[1]" تو لوگوں نے اسی اُنیس (۱۹) سالہ نوجوان کو دیکھا جس کے متعلق ابولہب نے کہا تھا کہ کیا اس لڑکے کی مدد کام آئے گی؟ اور اسی کی مدد سے نہ صرف جنگ بدر بلکہ جنگ اُحد میں بھی مسلمان کامیاب ہوئے۔
پھر اور آگے چلکر دیکھئے کہ خندق کی بازی کس نے جیتی؟ خیبر کا دروازہ کس نے اُکھاڑا؟ اور لوگ کیوں تعجب کرتے ہیں اگر حضور نے جناب امیر کو انا منک کہکر مخاطب کیا۔
محمد کا پیغام، جہاں کہیں پہونچا، اس کی پہونچانے والی وہی ایک ہستی تھی" البتہ تبوک میں وہ نہیں تھی لیکن جو تبوک میں رفاقت نبوت سے محروم کیا گیا۔ سنو! امام بخاری کی زبانی سنو! کہ قلب نبوت نے پھر اس کو کہاں حاضر پایا۔ ارشاد ہوتا ہے:۔
" الا ترضیٰ ان تکون منی بمنزلۃ ہارون من موسیٰ[2]"۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ تبوک کی غیر حاضری کتنی اہم حضوری کی شکل میں بدل دی گئی تھی۔
اب اس کے بعد دیکھو کہ وہ جو عالم قدس سے کعبہ میں آیا۔ اور کعبہ سے دوش اقدس پر آیا۔ وہ رسول کی زندگی کی آخری ساعتوں میں کہاں تھا۔ محمد بن اسحاق راوی ہیں کہ:۔

" علی ابن ابی طالب آپ کو غسل دے رہے تھے۔ اور اُنھیں اپنے سینہ سے لگائے ہوئے کہتے جاتے تھے:۔

" میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں۔ زندگی اور بعد از زندگی۔ ہر وقت آپ کتنے معطر اور خوشبو ہیں"

کیا پوچھتے ہو کہ جو شہادت میں کسی کے ساتھ قبر تک گیا وہ غیب میں اس کے ساتھ کہاں نہیں ہے۔ اندازہ کرو کہ جو رسالت ہی کے گود میں پلا، رسالت ہی کی آغوش میں جس نے پرورش پائی، رسالت ہی کی دعاؤں نے جس کا سینہ کھولا۔ اُسی کی تعلیم و افادہ کا دائرہ اگر سب سے زیادہ وسیع ہو تو کیوں حیرت کی جائے۔ محققین جانتے ہیں کہ اسلام میں فقہ حنفی کا بڑا حصہ سیدنا علی مرتضیٰ پر منتہی ہوتا ہے کیونکہ فقہ ابوحنیفہ کا اصلی سرمایہ وہی علم تھا جو کوفہ میں حضرت سیدنا علی اور حضرت عبداللہ بن مسعود کے ذریعہ سے پھیلا
امہات المومنین کی پوری جماعت میں سے صرف حضرت صدیقہ عائشہ ہی سے علم کا وہ ذخیرہ کیوں منقول ہے جو

---

[1] یعنی آج ہمارے ہم پلہ لوگوں کو بھیجو۔ [2] کیا تم اس پر راضی نہیں ہو کہ مجھ سے تمھاری وہ نسبت رہے جو ہارون کو موسیٰ سے تھی۔

دو ہزار دو سو دس حدیثوں کی صورت میں حدیث کی عام کتابوں میں پایا جاتا ہے۔ حالانکہ اس کے مقابلہ میں دوسری امہات المومنین سے جو حدیثیں مروی ہیں بمشکل وہ انگلیوں پر گنی جاسکتی ہیں۔ اس کا سبب وہی ہو کہ "کل میسر لما خلق لہ" ہر شخص کے لئے وہی بات آسان کردی جاتی ہے جس کے لئے وہ پیدا ہوا ہے۔ اور بلاشبہ حضور فخر موجودات صلی اللہ علیہ وسلم کے مقربین اصحاب میں سے ہر ایک کے سپرد کچھ فرائض تھے پھر دیکھو کتنی خوبیوں کے ساتھ ہر ایک نے اپنے مفوضہ فرض کو انجام دیا۔ لوگ کہتے ہیں کہ علی نے علم عرفان پھیلایا۔ لیکن دولت۔ سلطنت۔ حکومت امارت کی وسعت کا دائرہ آپ کے عہد میں رُک کر رہ گیا۔ یا رک گیا۔ یا روکا گیا۔ جو نا واقف ہیں اس کا فیصلہ کس طرح کرسکتے ہیں۔ اسلام کو حکومت کی قوت کی کس حد تک ضرورت تھی اور دولت کس نقطہ پر پہونچ کر دین و تقویٰ کے حق میں زہر بن جاتی تھی۔ ایک عامی دماغ اس کی تہ تک کس طرح پہونچ سکتا ہے؟۔ خضر کی ان مصلحتوں کو کون جان سکتا ہے کہ کبھی کشتی بنانے کی ضرورت ہوتی ہے اور کبھی ضرورت کشتی کے توڑنے ہی سے پوری ہوتی ہے۔ تاہم ان عامیوں سے یہ تو پوچھنا چاہیئے کہ عہد صدیقی و خلافت فاروقی۔ دورِ عثمانی میں حکومت کے دائرہ کو جن طاقتوں نے وسیع کیا تھا۔ ان طاقتوں کا مہیا کرنے والا کون تھا؟ اگر بدر نہ ہوتا تو یرموک کا نظارہ کون دیکھ سکتا تھا۔ اور خیبر نہ کھلتا تو کیا مدائن کھولا جاسکتا تھا؟ کیسے عجیب لوگ ہیں جب آخر کو دیکھتے ہیں تو اول سے نابینا ہوجاتے ہیں اور جب اول کو دیکھتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آخر کو انھوں نے دیکھا ہی نہ تھا۔

سید محمد بادشاہ حسینی قادری (حیدر آبادی)
معتمد مجلس علماء دکن

مکتوبات نیاز

کی کتابت و طباعت کا کام جنوری کے رسالہ کی وجہ سے بند ہوگیا تھا لیکن اب پھر شروع کردیا گیا ہے اور مئی تک اس کی اشاعت کی توقع کی جاتی ہے۔

جن حضرات کی پیشگی رقم وصول ہوگئی ہے وہ مطمئن رہیں کہ کتاب شایع ہوتے ہی ان کے نام روانہ کردی جائے گی۔

بعض حضرات نے بغیر رقم بھیجے ہوئے صرف نام درج کرایا ہے، لیکن ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ محض نام درج کرا لینا رعایتی قیمت سے فائدہ اُٹھانے کا مستحق قرار نہیں دیتا۔ ضرورت ہے کہ دو روپیہ پیشگی رقم بھیجدی جائے۔ ورنہ اشاعت کے بعد ان کو تقریباً اس سے دو چند ادا کرنا پڑے گا۔

غالباً اس کے اظہار کرنے کی ضرورت نہیں کہ ادب اُردو میں یہ مجموعہ کیا چیز ہوگا اور اس سے محروم رہنا، اُردو کے اس صنف انشاء سے محروم رہنا ہوگا جس کی نظیر اس وقت تک پیش نہیں کی جاسکتی۔

نیجر نگار لکھنو

باب الاستفسار

لفظ امّی کا صحیح مفہوم

(جناب محمد عتیق صدیقی - ہند جدید کلکتہ)

مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ:-

(۱) پیغمبر اسلام "اُمی" تھے اور ان کو مکتب کی ہوا تک نہ لگی تھی۔

(۲) قرآن کی جامعیت اور بلاغت بے نظیر ہے، دنیا آج تک نہ تو اس کا جواب پیش کر سکی ہے اور نہ مستقبل میں پیش کر سکے گی۔

(۳) اسلام دنیا کا مکمل ترین مذہب ہے۔ اور مذہب کے لحاظ سے دنیا کو اب کسی دوسرے مذہب کی ضرورت نہیں۔

عام مسلمانوں کو تو جانے دیجئے جن کا عقیدہ یہ ہے کہ قرآن "آسمانی" کتاب ہے اور اسلام "آسمانی" مذہب، جس کو خدا نے جبریل کے ذریعہ محمدؐ پر نازل کیا وہ مسلمان (جن کو "علمائے کرام" ملحد بے دین، لامذہب اور خدا جانے کیا کیا لقب دیتے ہیں) جن کا عقیدہ عام مسلمانوں کے برعکس ہے ان کے دماغ میں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جو کتاب اسقدر بلند پایہ اور جو مذہب اس قدر برتر ہو اس کتاب کے مصنف اور اس مذہب کے مُرتب کی علمیت کا درجہ کتنا بلند ہوگا، لیکن اس خیال کی تائید کے لئے جب اوراق تاریخ اُلٹے جاتے ہیں تو وہاں پیغمبر اسلام "اُمی" نظر آتے ہیں۔ جو یقیناً غلط ہے۔

کیا آپ مہربانی فرما کر اس مسئلہ پر تاریخی حیثیت سے روشنی ڈال سکتے ہیں۔ نیز اس سوال کے متعلق اپنی ذاتی رائے سے بھی مطلع فرمائیے۔

(نگار) قرآن بہ لحاظ تعلیم اخلاق یقیناً جامع و مکمل چیز ہے اور انشاء کے لحاظ سے بھی وہ عربی زبان میں اعجازی حیثیت رکھتا ہے، اسی طرح اسلام کے متعلق بھی میرا یہی خیال ہے کہ وہ ہر لحاظ سے مکمل ہے بشرطیکہ اس کی اصل روح و تعلیم کو سمجھ کر اس پر

عمل کیا جائے۔ رہ گیا رسول اللہ کا امّی ہونا سو اس کے متعلق بیشک گفتگو ہو سکتی ہے۔ اگر امّی کے معنے یہ لئے جائیں کہ انھوں نے باقاعدہ کسی مکتب میں تعلیم حاصل نہیں کی تھی اور علوم و فنون کا انھوں نے اکتساب نہ کیا تھا، تو میں کیا، کسی کو بھی اس میں کلام نہیں ہو سکتا، کیونکہ واقعی آپ کو کبھی اس کا موقعہ نہ ملا تھا، جیسا کہ خود کلام مجید سے ثابت ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو سورۂ عنکبوت کی آیت ۴۸:—

وما کنت تتلوا من قبلہ من کتاب ولا تخطہ بیمینک

(یعنی اس سے قبل تو نے کوئی کتاب نہ پڑھی نہ لکھی)

الغرض قبل نزول وحی تو آپ کا نوشت وخواند سے ناواقف ہونا مسلم ہے، لیکن بعثت کے بعد اس باب میں لوگوں نے اختلاف کیا ہے۔ میری رائے یہی ہے کہ بعثت کے بعد آپ نے معمولی نوشت وخواند سے واقفیت حاصل کر لی تھی، کیونکہ بعض تاریخی روایات سے آپ کا خود بعض مکاتیب کو لکھنا اور پڑھنا ثابت ہوتا ہے، لیکن اس کے معنے یہ نہیں ہیں کہ آپ نے علوم و فنون حاصل کر لئے تھے پس ظاہر ہے کہ ایسی معمولی واقفیت نوشت وخواند کی ایک انسان کو صحیح معنے میں تعلیم یافتہ یا عالم کہلائے جانے کا مستحق نہیں بنا سکتی۔

لفظ امّی کے اشتقاق کے متعلق بھی لوگوں میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے، بعض کا خیال ہے کہ یہ لفظ ام القریٰ سے لیا گیا ہے جو کہ کا دوسرا نام ہے، بعض اسے لفظ امت سے ماخوذ بتاتے ہیں، اور بعض اس کا ماخذ عبرانی لفظ اموت بتاتے ہیں جس کے معنی بُت پرست کے ہیں اور چونکہ یہود عربوں کو بُت پرست جان کر اس لفظ سے یاد کرتے تھے اس لئے اپنے آپ کو غیر یہودی یا عرب ظاہر کرنے کے لئے وہی لفظ رسول اللہ نے بھی اختیار کر لیا۔

کلام مجید میں متعدد جگہ یہ لفظ استعمال ہوا ہے اور ایسے ایسے محل پر استعمال ہوا ہے کہ ہم کوئی ایک مخصوص معنی اسکے متعین نہیں کر سکتے

آل عمران کی اُنیسوین آیت ہے:—

قل للذین اوتوا الکتاب والامیین ءاسلمتم

(اہل کتاب اور اُمیین سے پوچھو کہ کیا تم اسلام لے آئے)

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ امیین سے مراد غیر اہل کتاب ہیں۔

اسی سورت کی آیت ۷۵ سے اس کی مزید تصدیق ہوتی ہے:—

ومن اہل الکتاب من ان تامنہ بقنطار یودہ الیک ومنہم من ان تامنہ بدینار لا یودہ الیک الا مادمت علیہ قائما۔ ذلک بانہم قالوا لیس علینا فی الامیین سبیل۔

مفہوم یہ ہے کہ بعض اہل کتاب تو ایسے ہیں کہ اگر انھیں دولت کا انبار سپرد کر دو تو وہ واپس کر دیں گے، بعض

ایسے ہیں کہ ایک دینار کی امانت بھی واپس نہ کریں اگر انھیں مجبور نہ کیا جائے اور یہ اس لئے کہ ان کے نزدیک امیین کا معاملہ ایسا نہیں ہے کہ ان کے باب میں کسی سے کوئی باز پُرس ہو۔

لیکن سورۂ بقر کی آیت ۷۸ میں یہی لفظ اُن یہودیوں کے لئے بھی آیا ہے جو لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے :۔

ومنہم امیون لایعلمون الکتاب الا امانی — یعنی یہود میں سے بعض ایسے آمی بھی ہیں جنھیں کتاب کا کوئی علم نہیں اور ہے تو غلط سلط۔ سورۂ جمعہ، اور سورۂ الاعراف کی بعض آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ لفظ آمی صرف عربوں کے لئے استعمال ہوا ہے مثلاً:۔

(۱) ہو اللذی بعث فی الامیین رسولا یتلوا علیہ آیاتہ

(۲) اللذین یتبعون الرسول النبی الامی

(۳) فآمنوا باللہ ورسولہ النبی الامی

پہلی آیت میں امیین سے مراد اہل عرب ہیں اور دوسری تیسری آیت میں لفظ آمی نبی کی صفت واقع ہوا ہے جسکے معنے خواہ غیر یہود کے لئے جائیں یا غیر تعلیم یافتہ کے۔

اس میں شک نہیں کہ بعثت نبوی کے وقت جتنی قومیں عرب میں پائی جاتی تھیں ان میں کفار عرب ہی غیر اہل کتاب تھے اور اس لئے یہود و نصاریٰ نے جو صاحب کتاب تھے ان کو تحقیراً لفظ آمی سے خطاب کرنا شروع کیا جس کے اصلی معنی میں بے پڑھے لکھے ہونا کا مفہوم یقیناً شامل ہے۔

بہرحال رسول اللہ کا بے پڑھا لکھا ہونا ایک واقعہ ہے جس سے انکار نہیں ہو سکتا۔ اب رہا آپ کا یہ خدشہ کہ ۔
"جو کتاب اسقدر بلند پایہ اور جو مذہب اس قدر برتر ہو اس کتاب کے مصنف اور اس مذہب کے مرتب کی علمیت کا درجہ" بہت بلند ہونا چاہئے۔ سو اس کے متعلق میں یہ عرض کروں گا کہ جس حد تک مذہب و تعلیمات مذہب کا تعلق ہے، ایک نبی یا رسول کا علوم ظاہری سے آگاہ ہونا بالکل غیر ضروری ہے۔ قرآن نہ فلسفہ سے بحث کرتا ہے نہ طبیعیات سے، نہ علم الکیمیا سے اس کو کوئی واسطہ ہے نہ فلکیات سے۔ وہ صرف اخلاق و تمدن کا درس دیتا ہے اور اس لئے رسول کا مرتبہ صرف اخلاقی حیثیت سے بہت بلند ہونا چاہئے، سو تھا۔

انسان بہ لحاظ فطرت دو قسم کا ہوا کرتا ہے، ایک وہ جو دماغی حیثیت سے معمولی فہم و ذکا رکھتا ہے اور دوسرا وہ جسکا دماغ کسی خاص ذوق کے لئے غیر معمولی طور پر مناسب و موزوں واقع ہوتا ہے، اور اگر ایک رسول کو ہم دوسرے قسم کے انسانوں میں شمار کریں (اور یقیناً شمار کرنا پڑے گا) تو ہمارے لئے یہ تسلیم کرنا ضروری ہے کہ وہ فطرت کی طرف سے خاص اہلیت اصلاح اخلاق کی لیکر آیا ہے اور یہ ذوق وہ ہے جس کے لئے کسی اکتساب کی ضرورت نہیں، اب رہا کلام مجید کا بہ لحاظ انشا پردازی اعجاز کی حد تک پہونچنا، سو اس کے لئے بھی تعلیم کی ضرورت نہ تھی، کیونکہ اہل عرب میں بڑے بڑے خطیب و شعراء ۔

بے پڑھے لکھے تھے اور قوت بیان کا ملکہ ان میں فطری طور پر پایا جاتا تھا۔ اگر کلام مجید کو اس معنی میں خدا کا کلام یا الہامی کتاب نہ مانا جائے جس معنی میں عام طور پر سمجھا جاتا ہے، تو بھی اس کی معجزانہ فصاحت و بلاغت تسلیم کرنے میں کوئی استحالہ عقلی نہیں، کیونکہ رسول اللہ نہ صرف یہ کہ اسی سرزمین میں پیدا ہوئے تھے، جہاں "سبعات معلقہ" کے شعراء نے جنم لیا تھا بلکہ ایک ایسے قبیلے اور گھرانے کے فرزند تھے جو یوں بھی ہمیشہ افصح العرب مانا جاتا تھا۔

بہرحال ایک پیغمبر کا علوم ظاہری سے واقف ہونا اس کے منصب کے لحاظ سے بالکل غیر ضروری ہے اور اگر زبان و انشاء کی حیثیت سے وہ کوئی چیز ایسی پیش کرتا ہے جو عقل انسانی کو حیرت میں ڈال دینے والی ہے تو اس کا تعلق صرف اس اہلیت ہے ہے جسے وہ آفرینش کی طرف سے لیکر آتا ہے اور جو اکتساب و تعلیم سے یکسر بے بنیاد ہے۔

مطبوعات موصولہ

دلچسپ افسانے مجموعہ ہے جناب کوثر چاندپوری کے ۲۵ افسانوں کا جو چھوٹی تقطیع کے ... صفحات پر شایع کیا گیا ہے۔ جناب کوثر کے افسانوں کا ایک مجموعہ "دلگداز افسانے" کے نام سے پہلے بھی شایع ہو چکا ہے، اس لئے ظاہر ہے کہ دوسرا مجموعہ شایع کرنے کی ہمت اُسی وقت ہو سکتی تھی جب پہلا ملک میں مقبول ہو چکا ہو۔

افسوس ہے کہ مجھے ان افسانوں کے مطالعہ کا موقعہ نہیں ملا، لیکن سرسری تبصرہ کی غرض سے سرسری طور پر ورق گردانی سے میں اس نتیجہ تک ضرور پہونچا ہوں کہ کوثر صاحب جو کچھ لکھتے ہیں سوچ سمجھ کر لکھتے ہیں، پلاٹ بھی دلچسپ پیدا کرتے ہیں اور آخر میں کوئی معقول نتیجہ بھی پیش کرنا چاہتے ہیں۔ زبان و انشاء کی دلچسپیاں بھی اکثر جگہ نظر آتی ہیں اور سیرت نگاری کے سلسلہ میں جزئیات کے استقصار کو بھی وہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ طباعت و کتابت نہایت اچھی ہے اور قیمت دو روپیہ۔ ملنے کا پتہ یہ ہے:- شمیم اختر — بیگم گنج — بھوپال۔

مقصود حیات جناب حافظ غازیپوری کی کاوش دماغ کا نتیجہ ہے اور جیسا کہ انھوں نے ظاہر کیا ہے، راجہ رام کالج کوٹاپور کے پروفیسر مسٹر چاکلڈے کی کتاب (Sexual problem in India) سے ماخوذ ہے۔ اس رسالہ کا موضوع "جنسیات" ہے جس کی طرف اُردو زبان کے مصنفین نے اسوقت تک بہت کم توجہ کی ہے۔ شادی بیاہ کا مسئلہ معاشرت کا اساسی مسئلہ ہے لیکن افسوس ہے کہ ہندوستان میں اس کی اہمیت کا اندازہ نہ علمار مذہب نے کیا نہ قائدین ملک و ملت نے۔

اس کتاب میں اسی مسئلہ پر نہایت ہی پاکیزہ و دلچسپ انداز سے بحث کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ عورت کا مرتبہ ماں ہونے کی حیثیت سے ملک کی ترقی پر کس حد تک موثر ہوتا ہے اور نکاح و ازدواج کی وہ کیا صورتیں ہیں جن میں عورت کی اس حیثیت کو نظر انداز کر کے ناقابل و نالایق افراد کا اضافہ ملک کی آبادی میں کیا جاتا ہے۔

اس رسالہ میں شادی کے موجودہ طریقوں پر بحث کر کے اس کے اصلاح کی ترکیب بھی بتائی گئی ہے اور اسمیں شک نہیں کہ اگر ملک اس پر عمل کرنے کے لئے طیار ہو جائے تو نصف صدی میں وہ خدا جانے کہاں سے کہاں پہونچ سکتا ہے۔

زبان و انشار کے متعلق اظہار رائے کی ضرورت نہیں کیونکہ جناب حافظ غازیپوری اپنے ذوق ادب کے لحاظ سے کافی شہرت رکھتے ہیں اور انھوں نے اس کتاب میں اپنے اس ذوق کی رعایت کا پورا ثبوت دیا ہے۔ مجلد نسخہ کی

قیمت بارہ آنے اور غیر مجلد کی نو آنے ہے۔ ملنے کا پتہ یہ ہے:۔

جناب حافظ غازیپوری۔ اندرون حسن منزل۔ الہ آباد

لال قلعہ کی ایک جھلک سید ناصر نذیر فراق دہلوی (مرحوم) کی تصنیف ہے جس میں انھوں نے دکھایا ہے کہ سلطنت مغلیہ کے آخری تاجدار شاہ ابوظفر کے زمانہ میں لال قلعہ کی کیا حالت تھی اور اُس انتہائی انحطاط کے زمانہ میں بھی وہاں کی دلچسپیوں کا کیا عالم تھا۔ سید ناصر نذیر فراق، دہلی کے مشہور انشاپرداز تھے۔ اور اس اسکول کے لوگوں میں سے تھے جس کا اب ایک فرد بھی باقی نہیں۔ زبان کی حلاوت، انداز بیان کی شیرینی، اُردوے معلے کے ٹکسالی محاورے، تہذیب قدیم کے عوائد و مراسم کا بیان، الغرض اس چھوٹی سی کتاب میں وہ کیا چیز نہیں ہے جس سے اس وقت انشاء کی بڑی سی بڑی کتاب خالی نظر آتی ہے۔ میں نے اس کتاب کو ہاتھ میں لینے کے بعد اس وقت تک کوئی دوسرا کام کیا ہی نہیں جب تک وہ ختم نہیں ہوگئی۔ اور جب ختم کرچکا تو تاثر کا یہ عالم تھا کہ آنکھ اور دل دونوں رو رہے تھے۔

مسٹر شاہد احمد اڈیٹر ساقی کا ملک کو ممنون ہونا چاہئے کہ انھوں نے یہ ملفوظات یکجا کرکے مرحوم ناصر نذیر فراق کی موت کو ہم لوگوں کے لئے آسان بنا دیا۔ قیمت عہ ہے اور ملنے کا پتہ ساقی بک ڈپو دہلی۔

راسپوٹین گزشتہ جنگ عظیم کے دوران میں راسپوٹین نے سلطنت روس کی تباہکاری میں جتنا خاموش لیکن عظیم حصہ لیا وہ اہل علم سے مخفی نہیں۔ یہ بظاہر صوفی و راہب تھا، لیکن اپنے اعمال و افعال کے لحاظ سے اتنا زبردست شیطان تھا کہ شاید ہی اسوقت ہندوستان کا کوئی بڑے سے بڑا مکار و شعبدہ باز صوفی اس کے مقابلہ میں پیش کیا جا سکے۔۔ راسپوٹین نے شہنشاہ روس اور اسکی بیگم پر اپنی شعبدہ کاریوں سے اتنا گہرا اثر قایم کرلیا تھا کہ خلوت و جلوت کی کوئی تفریق اسکے لئے باقی نہ رہی تھی اور ایوان شاہی کی ہر بلند بالا نوجوان لڑکی اس کے شبستان عیش کی شمع دل افروز نظر آتی تھی۔

اسی خوش نصیب شیطان کے حالات ہیں جو راسپوٹین کے نام سے پہلے کلکتہ کے مشہور ہفتہ وار اخبار ہند میں بالاقساط شایع ہوتے رہے اور اب کتابی صورت میں پیش کئے گئے ہیں۔ زبان و انشاء کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں کیونکہ مولوی عبدالرزاق ملیح آبادی کا نام ان کے محاسن کی کافی ضمانت ہے۔ یہ رسالہ ۸ر میں دفتر اخبار ہند کلکتہ سے ملسکتا ہے۔

رہنمائے انجکشن ڈاکٹر مختار احمد صاحب ممتاز لاہوری کی تصنیف ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ انجکشن دینے کے کتنے طریقے ہیں، کس حالت میں، کہاں اور کیونکر انجکشن دینا چاہئے، مختلف امراض میں کون کونسی دوائیں کن حالتوں میں انجکشن کے لئے انتخاب کرنا چاہئے۔ کتاب فی الجملہ مفید ہے، اور وہ لوگ بھی اس سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں جو باقاعدہ ڈاکٹر تو نہیں ہیں لیکن ڈاکٹری معلومات انھیں حاصل ہیں۔ یہ کتاب کتب خانہ طب جدید میورروڈ لاہور سے ۱۲ار میں ملسکتی ہے۔

یوں ہوتا تو کیا ہوتا

مارچ ۳۳ء کے نگار میں ہمارے فاضل دوست مسٹر اختر حسین بی۔اے رائے پوری کا ایک مضمون
"زبان بے زبانی" کے عنوان سے شایع ہوا تھا، جس میں ایک درخت (برگد) کی زبان سے جذبۂ محبت کی
حقیقت سمجھانے کی کوشش کی گئی تھی ـــ یہ داستان بھی اسی قسم کی ہے لیکن اُس بُت کی زبانی ہے
جو اس برگد کے سایہ میں پڑا ہوا تھا۔ اس مقالہ کا موضوع یہ دکھانا ہے کہ ایک عورت اپنی فطرت کے
لحاظ سے اتنی کمزور نہیں ہے جتنی اپنے احول کے لحاظ سے ہے۔ اور جسوقت اس کے سامنے روایاتِ
خاندانی اور تقاضائے محبت میں سے کسی ایک چیز کے اختیار کر لینے کا سوال آتا ہے تو وہ کسقدر مجبوری
کے عالم میں "پیمانِ وفا" توڑنے پر آمادہ ہوتی ہے ـــ اختر حسین صاحب ادب کا نہایت پاکیزہ
ذوق رکھتے ہیں اور اسی کے ساتھ خوش قسمتی سے سنسکرت اور بنگلہ زبان کے بھی ماہر ہیں۔ چنانچہ اس
مقالہ میں "ذوق و اکتساب" دونوں کے امتزاج کا حُسن آپ کو ہر جگہ نظر آئے گا۔ نیاز

اے لوگو سُن لو کہ ہر شخص اپنے محبوب کی جان لیتا ہے۔ کوئی تیکھی تیکھی چتونوں سے اور کوئی میٹھی میٹھی
باتوں سے۔ بزدل اپنے محبوب کو بوسہ سے قتل کرتا ہے اور بہادر تلوار سے۔ (آسکر وائلڈ)

گاؤں کے لوگوں نے صبح اُٹھ کر دیکھا کہ رات کے طوفان میں برگد کا درخت امربیل کو لئے ہوئے زمین پر گر پڑا ہے۔ بجلی اُسکے
تنے میں ایک سیاہ تیر کی طرح پیوست ہو کر زمین میں غائب ہو گئی ہے۔ آشیانوں کے تنکے پرندوں کے بال و پر میں اُلجھ کر ادہر اُدہر
بکھرے پڑے ہیں۔ جیسے آسمان سے نکالا ہوا فرشتہ ستاروں کی انجمن سے مشتری کو اُٹھا لایا ہو اُس کے تعاقب میں بجلیاں
جھپٹتی ہوں اور وہ بیدم ہو کر گر پڑا ہو۔ چبوترے کے خرابے میں ایک طرف میں سرنگوں پڑا ہوا ہوں، کل تک میں گنگا جل سے
نہلایا جاتا تھا، چندن اور سیندور سے سنوارا جاتا تھا۔ صبح کے وقت کنول کے ڈنٹھل سے بھی زیادہ نازک اُنگلیاں پھولوں
کی چادر مجھے اُڑھاتیں اور سرِ شام میرے اردگرد کے چراغ حُسن، محبت کی لو بھڑکائے ہوئے حصولِ آرزو کی دعائیں مانگتے۔ گویا
عشق کی آنکھوں سے ایک آنسو ٹپکا اور منجمد ہو کر مورت بن گیا۔ میرے سینہ میں اس جھلسے ہوئے پیڑ اور مرجھائی ہوئی بیل کی
کہانی دفن ہے۔ حالانکہ یہ مورت عورت کے دل سے زیادہ لچیلی اور مرد کے دل سے زیادہ نازک ہے، مگر اس کی زبان
و عبارت کو سمجھنے کے لئے ہوشیاری کی نہیں بیہوشی کی، فہم کی نہیں جنون کی ضرورت ہے۔ جب زمین ماضی کے خواب

دیکھتے دیکھتے بُدبُدانے لگتی ہے اور اس کی ڈوبی ہوئی آواز کی بازگشت جھرنوں کے ترنم اور چنار کے پتوں کی سرسراہٹ میں سنائی دیتی ہے، جب وقت گردشِ ایام کی داستان قلمِ شفق سے لکھنے کے لئے شب کی سیاہی گھولتا ہے تو انسان اور بوم کے سوا ہر ذی حیات اُس کا ہمنوا اور ہمگوش ہو جاتا ہے۔

ممکن ہے میں 'باغ و بہار' کے اُس شہزادے کا بت ہوں جسے جادوگر نے پتھر بنا دیا تھا۔ کیا عجب کہ میں اس عشوہ فروش 'انسویا' کی صورت ہوں جسے اس کے شوہر کی بددعا نے سنگ جامد بنا دیا تھا۔ کیا ہو سکتا ہے کہ مجھ میں 'الف لیلہ' کی اس دکھیاری شہزادی کی جان ہو جس کا آدھا دھڑ پتھر کا تھا۔ پھر کوئی غزنوی مجھے سومنات کا بت سمجھ کر مسجد کی سیڑھیوں پر چننے کا اصرار کیوں کرے؟ گاؤں کے معمار کیوں مجھے اپنے مشقِ ستم کا ہدف بنائیں؟ کوئی چشمِ عبرت سے دیکھے کہ میرے سنگریزوں میں وہ چنگاریاں مضمر ہیں جو ان سیڑھیوں کو جلا دیں گی، ان پیروں میں آبلے ڈال دیں گی۔ ماضی کی یاد میں اس زخم نصیب بُت کو یونہی سوگوار ماتم رہنے دو۔ دھوپ، پانی اور پالے میں پڑا پڑا وہ کچھ عرصہ کے بعد مٹی میں مل جائے گا۔ رگڑ نہ پہونچی تو رفتہ رفتہ اس کی گرمی کم ہوتی جائے گی اور ایک دن وہ آئے گا جب سنگ تراش اسے کاٹ کر کسی دہلیز پر ڈال دیگا۔

جب جانوروں کا مکروہ شور و شغب تھم جاتا ہے اور لیلیٰ شب کے رباب کو چاند کی کرنیں چھیڑنے لگتی ہیں، جب شمیم نیم شب کی چھیڑ سے تنگ آ کر رات کی کلی اپنا لاجوردی گھونگھٹ ہٹا کر لجائی ہوئی چتونوں سے شبنم کو دست درازی کی دعوت دیتی ہے۔ جب محبت کا دیوتا صوفی کے حجرہ میں شیطان کا غلبہ اور والدین کے گھروں میں بہرام بن کر داخل ہوتا ہے۔ تو یکایک محسوس ہوتا ہے کہ میرے سنگین جسم کی ایک ایک تہ کتابِ زندگانی کا ایک ایک ورق ہے۔ جی چاہتا ہے کہ میں انگڑائی لیتا ہوا اُٹھوں اور دُنیا سے کہوں کہ بے زبان پتھروں میں بھی جان ہے۔ پجاریوں کا ہجوم کس خلوص سے میری منتیں کرتا رہا ہے۔ کتنے لوگوں کو میرے آگے عرضِ مدعا کر کے سکون و قرار حاصل ہوا ہے۔ کاش جیسے ہی کوئی ناکتخدا لڑکی میرے حضور میں اپنی تمنائیں پیش کرے، جیسے ہی ٹھکرائے ہوئے ارمان اور کچلی ہوئی آرزوئیں زبانِ حال سے فریاد کریں —— یک بیک اس ساکت بت میں تھرتھری پیدا ہو، میرا دل دیپک راگ گاتا ہوا دھڑک اُٹھے اور اس کی آگ سب زبان درازوں کو خاک سیاہ کر دے اور محرومِ نطق بے زبانوں کے لئے ایک نیا جلوۂ طور بن جائے —— ایسا طور جس کی تجلی غیر فانی ہو اور دائم ہو۔

مجھے اس تصور سے انتہائی اطمینانِ قلب ہوتا ہے کہ جب میرا ایک ایک ریزہ ایک ایک لفظ بن جائے گا اور جب میری گرمی گویائی میں متبدل ہو جائے گی، جب میں دنیا کو بتا سکوں گا کہ انسان کے بہائے ہوئے خون کا سیلاب چٹانوں کی صورت میں جم گیا ہے، جب میں ثابت کر سکوں گا کہ انسان چلتا پھرتا اور بولتا ہوا شہابِ ثاقب ہے۔ جب میں بُت شکنوں سے کہہ سکوں گا کہ ہماری روح کو جسم کی قید سے آزاد کر کے تم نے اپنے دلوں میں بسا لیا ہے۔ تو انسانیت خودکشی کر لیگی! ہاں، اگر انسانیت مرد کے عشق کی طرح بیوفا اور عورت کے وعدوں کی طرح بے اعتبار نہیں ہے تو وہ یقیناً خدا سے کہیگی کہ اپنے عرش کے سا اسی زمین پر اُتر آئے! —— مگر معلوم نہیں وہ مبارک ساعت کب آئے۔

دوپہر کو جب گڈریا مجھ پر سر رکھ کر بانسری کی تان چھیڑتا ہے، اور اس کے دلفریب سروں کو سن کر دھوپ سے پریشان پرندے دم بخود رہجاتے اور سوچ میں پڑجاتے ہیں کہ یہ نغمۂ حیات پہلے کب سُنا تھا، یا جب کوئی دیہاتی برات میرے گرد و پیش ٹھہرتی ہے اور کوئی معصوم دوشیزہ دوسرے پتھروں کے ساتھ چوہے میں مجھے بھی لگادیتی اور بڑوں کے ڈر سے اِدھر اُدھر دیکھتی ہوئی جھجکتی ہوئی آواز میں پریت کے گیت گاتی ہے یا جب گاؤں کی ننھی لڑکیاں آنکھ مچولی کھیلتی ہوئی مجھے آکر چھوتی ہیں — تو میں ان سے کچھ کہنے کے لئے بیتاب ہوجاتا ہوں۔ مگر جیسے پھانسی کی رسّی کا جھٹکا دمِ واپسیں آخری چیخ کو زبان پر آنے کی اجازت نہ دے، جیسے اوہام کی پابندی کسی دُلہن کی زبان سے بوقت ایجاب و قبول 'نہیں' نہ نکلنے دے — یہاں ویسے ہی میرے جسمِ لرزاں سے عالمِ نزع کی سی ایک ہچکی نکلتی اور سینہ میں رہجاتی ہے۔ البتہ جب کبھی کوئی ٹوٹا ہوا ستارہ میرے قریب گر پڑتا اور مجھ سے ہمسخن ہوتا ہے تو آسمان والوں کی داستان سنتے سنتے میں بھی فرطِ اضطرار سے اُسے زمین والوں کی سیاہ کاری سمجھنے لگتا ہوں۔

بہت دن ہوئے، سورج آہستہ آہستہ اُفق میں غائب ہو رہا تھا، گویا رات کی ناگن اپنے گوہرِ شب چراغ کو نگل رہی ہو۔ ہوا اب اور من ہول جھٹک رہی تھی۔ چراگاہوں سے لوٹتی ہوئی گائیوں کی گھنٹیاں اُنھیں تسلّی دے رہی تھیں کہ یہ قصاب کی چھری کے آرام کا وقت ہے۔ مجھ پر عبیر مل کر اور میرے سر پر آرتی کا چراغ رکھ کر پجارنیں رخصت ہو چکی۔ میرے سنگین جسم کی جلد پر پروانوں کی تڑپ ایک خفیف سی لرزش پیدا کر رہی تھی۔ میں ابھی اس سوچ میں غلطاں و پیچاں ہی تھا کہ جگنوؤں میں پتنگوں کے لئے کوئی کشش کیوں نہیں ہے کہ چبوترے پر پیروں کی چاپ سُنائی دی اور میں نے دل کی آنکھیں کھول کر دیکھا کہ ایک لڑکی پلکوں پر ٹھیرے ہوئے آنسو کی طرح میرے سامنے کھڑی تھر تھرا رہی ہے۔ اس کا رد رہ کر دائیں بائیں دیکھنا، اپنی آہٹ سے آپ جھجکنا، موسم کی خنکی کے باوجود بار بار ماتھے سے پسینہ پونچھنا، پلّو کو سمیٹتے سمیٹتے یک بیک کانپ اُٹھنا۔ یہ سب باتیں اس کی انتہائی بےچینی کا ثبوت دے رہی تھیں۔ اس نے ڈرتے ڈرتے میرے آگے سر جھکایا اور درخت کا سہارا لیکر سہمی ہوئی بیٹھ گئی اور معلوم نہیں کس کا انتظار کرنے لگی۔

اپنے کو خدا سمجھنے کے فریب میں میں اتنے عرصہ تک مبتلا رہ چکا تھا کہ اب دوسروں کے محسوسات کو من و عن سمجھ سکتا تھا۔ مجھے یہ نہیں معلوم کہ اس سرزمین پر عبادتگاہ ہی ایک ایسی جگہ کیوں ہے جہاں دو چاہنے والے مل سکتے ہیں مگر دیکھتا آیا ہوں کہ یونہی ہوتا ہے۔ ایسے واقعات سے مجھے چنداں دلچسپی نہیں لیکن اس دوشیزہ کے اضطراب میں ایک عجیب کیفیت تھی۔ شوقِ ملاقات سے دل کی دھڑکن تیز ہوجاتی ہے، نبض وجد کرنے لگتی ہے۔ خون کو کوئی پنکھا سا جھل جاتا ہے۔ میں اس ولولہ کو سمجھ سکتا تھا۔ لیکن اس بیچاری کا دل بیٹھا کیوں جا رہا تھا۔ سانس کی جگہ ہچکیوں نے کیوں لے لی تھی؟ اس راز کا پتہ چلانے کے لئے میں اس کی روح سے ہم آہنگ ہوگیا۔

ایک گھونسلے میں ننھا سا کا بچہ کنمنایا اور ماں نے اپنے پروں سے اُسے تھپک کر سلا دیا۔ لڑکی نے آبدیدہ ہو کر اوپر دیکھا اور سوچنے لگی۔ "آج دلارے کو نیند کیسے آئے گی۔ اس کے پالنے کو اماں جھلائیں یا ننھی رجنی مگر وہ سوتا کب ہے۔ ہر شام کی طرح آج بھی وہ کالج سے میری واپسی کا منتظر ہوگا۔ جب تک میں پاس بیٹھ کر لوریاں نہ گاؤں وہ ہرگز نہ سوئیگا۔ اور ہائے میری مینا! جلدی میں اس کی کٹوری میں پانی بھرنا بھی تو یاد نہیں رہا۔ کہیں پیاسی نہ مرجائے۔ اچھا، اسوقت اماں کیا کر رہی ہوں گی۔ ابا کلب سے لوٹے ہوں گے، میرے لئے تصویروں کا البم وہ ضرور لائیں گے۔ اسے اوور کوٹ میں چھپا لیا ہوگا۔ راستہ کا سوچتے آئیں گے کہ کامنی کو بہت چھیڑوں گا جب وہ بہت رونے کے قریب ہوجائے گی تو دوں گا۔ پھر وہ پگلی خوشی کے مارے ناچنے لگے گی۔ جب اماں کہیں گی کہ اسکول میں ڈرامہ ہے، لڑکی ہمجولیوں کے ساتھ گئی ہے، نو بجے لوٹیگی تو ابا کچھ کبیدہ ضرور ہونگے جانے رجنی کیلئے کیا کیا لائے ہوں۔ لو ان کے ستار کے تار اتر گئے تھے، مجھ سے ٹھیک کرنے کے لئے کہا تھا۔ اور ہاں شام کو چمیلی میں پانی بھی تو نہیں دیا۔!

یہ پونے آٹھ بجے والی ریل جا رہی ہے۔ یہ نصیبوں جلی داہنی آنکھ رہ رہ کر کیوں پھڑک رہی ہے۔ اب تک راجین کیوں نہیں آیا۔ آتا ہی ہوگا۔ دور سے اُس کی آہٹ کو میں پہچان سکتی ہوں۔ داہنا قدم زور سے، بایاں دھیمے، کتنی بار کہا کہ یوں لڑکھڑاتے نہ چلا کرو مگر وہ کب مانتے ہیں...... رات ہی کو تو گھر بھر میں جاگ پڑ جائے گی۔ ابا کو سرجو سے معلوم ہوجائے گا کہ سب جھوٹ ہے، کالج میں کچھ نہ تھا، کامنی کا پتہ نہیں۔ ابا اماں پر بجلی سی گر جائے گی۔ دیر تک دونوں مبہوت سے رہیں گے اور ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھیں گے۔ کیا عجب کہ اسی وقت کپڑے پہن کر راجین کے مکان پر آجائیں۔ وہاں میں اُن کا سامنا کس منہ سے کروں گی! نہیں، ہرگز نہیں، میں پاگل ہوجاؤں گی۔ میں جانتی ہوں وہ زبان سے کچھ نہ کہیں گے مگر میں ان خاموش جھڑکیوں کو جیتے جی کیونکر برداشت کرسکوں گی اور اگر وہ اماں کو بھی ساتھ لے آئے - تب تو میں زندہ نہ رہونگی اوف، اوہ اس خیال ہی سے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔

آپ ہی آپ وہ چونک کر کھڑی ہوگئی۔ دیوانہ وار درخت سے لپٹ کر دیر تک روتی رہی۔ پھر جب آنکھوں سے آنسو پونچھ کر انھیں جھٹکا تو دو چار قطرے مجھ پر بھی گر پڑے۔ بس یہ محسوس ہوا کہ کسی نے نشتر لگا دئے۔ اب تک وہاں ٹیس سی اُٹھتی ہے لیکن ساتھ ہی لطف بھی آتا ہے۔ پہلی اور آخری مرتبہ مجھ پر اخلاص کی دو چار بوندیں گریں مگر ان کے آگے گنگا جل کی وہ ساری گگریاں ہیچ ہیں جن سے لوگ گناہ کے دھبے دھونا چاہتے ہیں۔

کیا محبت مجھے یہ قوتِ گویائی بخشے گی کہ میں اُن کے سامنے صرف یہ جملہ کہہ سکوں — ہم دونوں کی زندگی ایک ہے چاند اور چاندنی، پھول اور نکہت تصویر اور رنگت کی طرح ہم الگ نہیں کئے جاسکتے۔ کیا کچھ دیر کے لئے حیا اور شرم کو بالائے طاق رکھ کر میں یہ کہہ سکوں گی۔ عورت بے زبان تھی کہ کل تک وہ محبت کی توہین کرتی آئی تھی۔ آج وہ خاندان اور سماج کی نہیں، محبت کی پرستار ہے۔ وقار اور عصمت کی خاک میں بڑی تلاش کے بعد اسے محبت کا ہیرا ملا ہے۔ اسے وہ کسی قیمت پر نہ بیچے

اب تک اپنے حسن کا عکس وہ بوالہوسی اور خود فریبی کے آئینہ میں دیکھتی آئی ہے۔ آج عشق آزادی کی آرسی لیکر اسکے سامنے آیا ہے، مجھے اپنی صورت اس میں دیکھنے دو۔ ماں کی ممتا اور باپ کی چاہت کی پٹی میری آنکھوں پر نہ باندھو۔ کیا میں یہ سب کہہ سکوں گی؟ ــ پاس پڑوس کی بوڑھی عورتیں میرے بڑے بول سے حیرت کی پتلیاں بن جائیں گی۔ والدین لعنت ملامت کریں گے، آسمان میں میرے لئے جگہ نہ ہوگی، زمین سونی ہوگی ــ اور اس خلا میں زندگی کا احساس ڈوبتی ہوئی کشتی کی طرح مدد کا طلبگار ہوگا۔ کیا میں خاندان کے دلدل میں پڑی ہوئی اسے ڈوبتی دیکھوں گی اور کچھ نہ کہوں گی ــ کیا میری آواز میں اتنی طاقت ہوگی کہ ماں باپ کی گریہ وزاری اور بھائی بہن کی منت سماجت کو بند کردے اور عشق کی بلندیوں پر چڑھ کر کہے کہ عورت اپنی روح کو پاگئی۔ اس کی خودی اپنے لئے ایک الگ خدا بنائے گی۔ وہ صرف رسمِ الفت کو مانیگی وہ اپنی دنیا الگ بسائے گی۔ اس کے آئین الگ ہوں گے۔ کیا میں یہ سب کہہ سکوں گی؟ ــ کیا یہ ممکن ہے؟۔

بیجان بت کے آگے گرکر وہ ایک سانس میں سیکڑوں دعائیں مانگ گئی۔ میرا شہ نشین اُس کے آنسوؤں سے بھیگ سا گیا اس کی ہچکیوں کو سن کر پرندوں کے جوڑے کانپ اُٹھے۔ نہ معلوم کیوں انھیں خدشہ ہوا کہ صیاد انھیں الگ کرنا چاہتا ہے۔ اُن کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سے فضا دیر تک متلاطم رہی۔ اس درخت پر سب نے بسیرا چھوڑ دیا اور جاکر دوسری ڈالیوں پر بیٹھ گئے۔ پروانوں کو یقین ہوگیا کہ اُن کی وفا اور شمع کی جفا سب فریب ہے۔ دیر تک وہ اسی اُلجھن میں پھنسی رہی۔ گویا اس کی روح ایک دوراہے پر ٹھٹک کر کھڑی ہوگئی تھی، جہاں سے ایک راستہ خاندان کی طرف اور دوسرا محبت کی طرف جاتا تھا۔ اوہام کے اندھیرے میں اس کی روح بھٹک رہی تھی اور کہیں راستہ نہ ملتا تھا۔ مجھے لوگ خدا سمجھتے تھے اگر انکی دل شکنی کا خیال نہ ہوتا تو میں ہزار زبانوں سے چیخ اُٹھتا کہ آئے وہ جو مجھ سے بڑا ہے، اگر تو میری چنگاریوں میں اتنی فراہمی پیدا کردے کہ وہ مشعل راہ بن جائیں اور میں محبت کی پگڈنڈی اسے دکھا سکوں ــ تو تجھ پر ایمان لے آؤں گا! لیکن یہ نہ ہوا، آہ یہ نہ ہوسکا ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا، وہ دیا جھلملایا اور تاریکی کو زیادہ اندوہ فزا بناکر گل ہوگیا۔

"پرسوں ہولی ہے۔ کل شام کو ماموں آسام سے آئیں گی۔ اندو بھی ہوگی۔ اس سے ملے اب تین ــ تین کیوں پورے چار سال ہوگئے ہائے تمھارے لئے آسام سے ایسی ایسی چیزیں لائی ہوں کہ مرتے دم وصیت کرجاؤ کہ میری جان کے ساتھ یہ بھی میرے ساتھ جلادی جائیں! اثر یہ کہیں کی۔ اور بڑی بہو بھی تو آئیں گی۔ کتنا لطف آئے گا، کیسے جلسے ہوں گے! آج ابا سے کہنا بھول گئی کہ چھوٹے کے لئے ڈھور منگوائیں اور ان پرانی پچکاریوں سے کیا ہوگا۔ میں تو اپنی سہیلیوں سے یوں رنگ نہ کھیلوں گی۔ اور ٹھیر دالی کے کان اُمیٹھوں گی کہ دو دفعہ گھر لے آئی اور ہمیں پوچھا تک نہیں ــ سچ، میں تو اماں سے کہہ دوں گی کہ بوڑھوں کا جمگھٹ الگ ہو، کوئی تک بھی ہو۔"

طرب دوشانہ کے اس تصور سے اس کا چہرہ دمک اُٹھا۔ آنکھوں نے مسکراکر آنسوؤں کی نمی کو گالوں پر خشک کردیا۔ خوشی کے مارے اس کی ان کی مٹھیاں بندھ گئیں۔ بچپن کی سکھیوں اور عزیز داروں کو سوچتے سوچتے کبھی وہ آنکھیں بند کرلیتی

کبھی زیرِ لب مسکراتی اور چبوترے پر بکھری ہوئی پتیوں کو ہتیلی پر ملنے لگتی تھی۔ مگر چشم زدن میں یہ مسرت کافور ہوگئی، جیسے نفیر صبح پر کلی لبیک کہنے بھی نہ پائے اور مالی اسے توڑ لے جیسے تعصب کی دوڑ سے میخانہ میں ماتم بپا ہو جائے۔ "نہیں یہ سب میرے لئے نہیں ہے۔ جب یہ قصہ انھیں معلوم ہوگا تو میں ان کی نظروں میں کتنی گر جاؤں گی۔ میرا نام آتے ہی وہ سب حقارت سے منھ پھیر لیں گی۔ میرا ذکر تک گوارا نہ ہوگا۔ مجھے دیکھتے ہی اُستانیوں کے ہاتھ بددعا کے لئے اُٹھ جائیں گے۔ بھولے بھٹکے میں کہیں سامنے آگئی تو وہ سب سر جھکالیں گی گویا میری بجائی پر ان کی حیا دررہی ہو۔ آبا اور اماں بھول جائیں گے کہ ان کی ایک بیٹی اور بھی ہے۔ محلے والے سرگوشیاں کریں گے، بھابھی ناک پر انگلی رکھیں گی، بھائی جان جنتری میں قیامت کی تاریخ ڈھونڈیں گے ——— اور میرا گناہ؟ میرا گناہ یہ ہے کہ میں نے اپنی آنکھ سے کیوں دیکھا اور اپنے دل سے کیوں مشورہ کیا۔ کیوں نہ شادی کے بازار میں والدین کے منھ بولے دام پر اپنے کو بک جانے دیا۔ کیا ان کلفتوں کو دیکھ کر میں زندہ رہ سکوں گی؟ آگ لگے اس محبت کو۔ کیا واقعی میں راجئین کے بغیر زندہ نہ رہ سکوں گی؟ — نہیں ..... یہ سوال میرے دل میں کیوں پیدا ہوا ...؟"

میں نے دیکھا کہ یہ وسوسہ اس کی روح میں ایک گتھی ڈال گیا۔ اس کی رگ رگ میں اس کشمکش کی وجہ سے اینٹھن سی ہونے لگی۔ درد و کرب کا یہ عالم میں نے کبھی نہ دیکھا تھا کہ بار بار وہ اپنی ساری کا سرا گلے میں ڈال کر اسے گھونٹنے کی کوششِ رائگاں کرنے لگی۔ آپ اپنے کو اذیت دینے کے لئے دانت پیچ کر آنسوؤں کو ضبط کرتی، سانس روک کر ہچکیوں کو مسوس دیتی۔ ابھی وہ اسی بے بسی کی حالت میں تھی کہ سامنے ٹارچ کی روشنی دکھلائی دی اور کسی کی بیقرار آواز نے پوچھا "کامنی، کامنی۔ مگر وہ لڑکی یوں بے حرکت اور ساکت بیٹھی رہی، کہ مجھے شبہ ہونے لگا آیا میں زیادہ بےحس ہوں یا وہ۔

نوجوان چبوترے پر چڑھ آیا اور اس کا نام لیکر متواتر پکارتا رہا مگر لڑکی خاموش رہی۔ پھر وہ قریب آیا اُسے ہاتھ کا سہارا دیکر کھڑا کیا اور ستاروں کی جھلملاتی ہوئی روشنی میں غور سے اُس کے چہرے کو دیکھا اور یہ کہتے ہوئے "آخر یوں چپ کیوں ہو" اس کے لبوں پر اپنے لب رکھ دئے۔

اس سے پہلے میں کئی بار دیکھ چکا تھا کہ عشق کی اُنگلیاں جب پہلے پہل بوسہ کے مضراب سے ربابِ حسن کے تاروں کو چھیڑتی ہیں تو کیسے راگ پیدا ہوتے ہیں۔ ایڑی سے لیکر چوٹی تک ایک تھرتھری سی پیدا ہوتی ہے جیسے کسی نے بجلی کا تار رکھ دیا ہو، جیسے تتلی پھول پر بیٹھی ہو اور اس کے رنگین بازو پنکھڑیوں پر چپک گئے ہوں، جیسے بھونرا کنول کے پھول پر بیٹھا ہو، پتیاں سکڑ گئی ہوں اور وہ باہر نکلنا چاہتا ہو کہ دوبارہ گرفتار ہو ——— ایک بے پیئے کی مستی ——— وہ پہلا پیار۔ مگر آج مجھے معلوم ہوا کہ آخری بوسہ کیا ہوتا ہے۔ جیسے محبوب کی مردہ لاش سے کوئی لپٹ جائے اور یہ سوچے کہ میری التجا اس کی آنکھ کھول دے گی، جیسے خواب سے جاگ کر کوئی پھر آنکھیں بند کرلے اس توقع پر کہ میں پھر اس جہانِ جمیل کی سیر کرسکوں گا، جیسے بچہ کھلونوں کو توڑ کر رونے لگے کہ اس کے آنسو ان ٹکڑوں کو یکجا کردیں گے ——— بس اسی طرح

اس لڑکی کی روح نیم جاں ہوکر اس کے بے رنگ و بو لبوں پر تڑپ رہی تھی اور اس نوجوان کی روح اُسے پکار رہی تھی ــ اُٹھ کہ میں تیرے لئے پیامِ حیات لائی ہوں، مجھے پہچان کہ میں تیری آواز کی بازگشت ہوں۔

آسمان پر ستارے آپس میں ٹکرانے لگے، پتیاں ہل ہل کر رونے لگیں، جگنو چشم زدن میں بینوا ہو گئے اور جب راجین نے اس کی باہیں چھوڑ دیں تو اُسے محسوس ہوا کہ زندگی میں کچھ کمی سی آگئی ہے۔

لڑکی نے جب اوسان سنبھالے تو اُسے معلوم ہوا کہ وہ گہری نیند سے جاگی ہے ــ اتنی گہری اور لانبی نیند کہ اس بیچ میں ایک جادو کی چھڑی نے سب کچھ بدل دیا ہے۔ اسے یہ معلوم ہوا کہ دماغ کی روشوں اور دل کے کھنڈروں میں کوئی لاش کو گھسیٹ رہا ہے۔ راجین کی آواز پر اسے شبہ ہونے لگا کہ دور سے کوئی اجنبی کسی بھولے ہوئے واقعہ کی یاد دلا رہا ہے۔ جب وہ سب کچھ کہہ چکا ــ جب اس کی رنگیں بیانی نے عشق کی ایک ایسی بستی بسا دی جس میں خود فراموشی، بیخودی اور سرشاری کے سوا کچھ نہ تھا، تو وہ چونک پڑی، اپنے کو سنبھالا اور بالوں کو سلجھاتی ہوئی بولی ــ نہیں نہیں، تمھیں دھوکا ہوا۔ میں تو تم سے یہ کہنے آئی تھی کہ وہ کامنی مرچکی، اُسے بھول جاؤ وہ خاندان کے قفس میں رہتی آئی تھی، وہ اپنی بولی بھول چکی تھی۔ اُسے پرواز و رفعت کا خیال بھی نہ آیا تھا۔ ماں اور باپ مقراض کے دو پہلو تھے جو اس کے پر دل کو کترتے تھے۔ ایک دن کسی غبس بیایہ کی طرح یہ پنجرہ ایک چڑیمار کے گھر منتقل ہو جائے گا جسے عرفِ عام میں شوہر کہتے ہیں۔ یہاں تو ایک روز تم قفس کی تیلیوں کے قریب آئے اور تمھارے آزاد نغموں نے میری خودی کی راکھ سے اُس موسیقار کو زندہ کیا جو میری روح ہے اور جو میری لاعلمی میں ہمیشہ وہیں تھی۔ میں بھی اس قید سے آزاد ہونے کے لئے تڑپ اُٹھی اور اس حد تک کہ زمین و آسمان کی تیلیوں کو بھی توڑ دوں۔ میں نے سوچا تھا کہ یہ موسیقار جب نغمہ آفریں ہوگا تو مرد کی ہنگامہ آرائیاں سکتہ میں آجائیں گی۔ وہ نادم ہوگا کہ اسکی زندگی کے تار کتنے بیربط اور اُلجھے ہوئے ہیں .... لیکن ہائے ری، میری خود فریبی! میں نے قفس سے نکل کر دیکھا کہ میری روح ایک چمگادڑ تھی جو خاندان کے تاریک کونے میں ہی زندہ رہ سکتی تھی۔ روشنی میں آتے ہی اس کا دم اُلجھا اور وہ فضا میں اُلٹی اُڑنے لگی ــ مجھے چھوڑ دو، مجھے جانے دو۔ ابھی اس پرندہ میں کویل اور پپیہے کی سی خودداری پیدا نہیں ہوئی کہ صیاد اسے دام میں لاتے ہوئے گھبرائے۔ ممکن ہے کہ کبھی ایسا ہو سکے لیکن ابھی نہیں۔

میں پھر اُسی غلام گردش میں جاکر اپنے کو پا بہ زنجیر کرنا چاہتی ہوں۔ کل خاندان شادی کے بازار میں اس باندی کا نیلام کرے گا۔ بہت سے سوداگر میری خرید کے لئے آئیں گے۔ میرے والدین انھیں روپیوں کی تھیلیوں میں بند کر کے وقار کے ترازو پر تولیں گے اور جو سب سے بوجھل ہوگا میں اُس کے سپرد کر دی جاؤنگی... کیا تم بھی اس نیلام میں بولی بولو گے؟ اگر آؤ تو سودے کے لئے تیار ہو کر آنا۔ مجھے وہیں پہونچا دو، جہاں سے

محبت کا مقناطیس مجھے کھینچ لایا تھا، کہیں میں زندگی کے میلے میں کھو نہ جاؤں۔

رقت سے اُسکے الفاظ گلے میں نوائے سوختہ بن کر رہ گئے اور تھوڑی دیر تک اس کے حواس کشمکش میں مبتلا رہے کہ جاگیں یا سوئیں۔ میں اس محشرِ جذبات میں گم سم سا ہو گیا۔ فریبِ کائنات کا ایسا منظر پہلے نظر سے نہ گزرا تھا۔ جی چاہا کہ شہ نشین سے نیچے لڑھک پڑوں اور میرے جسم کا ہر ذرہ آنسو بن کر بہہ جائے۔ ابھی میں اسی کشمکش و پیچ میں تھا کہ نوجوان نے بغیر کچھ کہے سنے اس لڑکی کا ہاتھ پکڑا اور اُسے لئے ہوئے چپ چاپ اس طرف چل دیا جدھر سے وہ آئی تھی۔ اس لڑکی سے تو وہ کچھ نہ بولا مگر چلتے چلتے مجھے ایک ٹھوکر لگا گیا۔ ہلکی سی ٹھوکر مگر ایسی کہ میرے دل و جگر الگ الگ ہو گئے۔ شاید چاند کے دل کا داغ ایسی ہی کی ٹھوکر کا نقش پا ہے، شاید ایسی ہی ٹھوکروں سے سورج گہن میں آجاتا ہے۔ میں سوچتا رہا کہ اسے دعا دوں یا بد دعا! جب اس نے کبھی مجھے دیوتا سمجھکر حصولِ ارمان کی منت نہیں کی تو اس ناکامی کے بعد مجھے ٹھوکر لگانے کا اسے کیا حق تھا! — کہہ نہیں سکتا، مگر اس خاک جبیں کے ذرات مجھسے کہتے ہیں کہ ایسی ہی ٹھوکروں سے بجیں دیوتاؤں میں جان پڑتی ہے۔

جب صبح ہوئی اور عبادت گزاروں نے مجھے بنایا سنوارا تو میں سوچنے لگا کہ کہیں پتھر سے موم تو نہیں ہو گیا۔ اس واقعہ کو دیکھ کر مجھ میں ایک عجیب تغیر ہو گیا — ایسا کہ دھوپ میں سردی سے کانپنے لگتا اور رات کی نمی میرے لئے آگ بن جاتی۔ یہ تو تھا ہی، ساتھ ہی ساتھ جہاں آنسو کے دو قطرے گرے تھے وہاں ایک جلن اور جہاں ٹھوکر لگی تھی وہاں ایک کھٹک سی ہونے لگتی جب فضا خاموش ہوتی تو مجھے ہر طرف باجا سا بجتا سنائی دیتا اور جب کائنات کا ہر ذرہ شور فشاں ہوتا تو میرے لئے ہر طرف سناٹا چھا جاتا تھا۔ ایک زمانہ گزرا کہ کچھ منچلوں نے دھوپ چھاؤں کے درختوں کے جھرمٹ میں ایک دیوی بٹھائی تھی اور ان کی باتوں سے میں سمجھا تھا کہ یہ میری دلہن ہے۔ ہنوز میں نے اس قسم کے کسی جانور کو نہیں دیکھا تھا، تاہم یہ لفظ کتنا وجد آفریں تھا! میں بہزار جان اس دن کا منتظر رہا جب بہار کی آمد آمد ہوگی اور وہ ننھی سی مورت میرے آغوش میں بٹھلائی جائے گی" لیکن ناگہاں کچھ لکڑہارے ایک روز وہاں آئے اور درختوں کو کاٹنا شروع کیا۔ بعد ازاں میں نے دیکھا کہ وہ جگہ بے برگ و بار پڑی ہے اور وہ مورت بھی سراب کی طرح غائب ہو گئی ہے۔ اب تک مجھے کامل یقین تھا کہ اس بیچاری کو وہ سیہ بخت کہیں پھینک آئے۔ لیکن نہیں — آہ یہ نہ تھا! جب میں نے گزشتہ شب کے واقعات پر غور کیا تو دل پکار اُٹھا کہ اس مورت سے کسی نے کچھ نہیں کہا تھا، وہ خود اُٹھ کر کہیں بھاگ گئی ہے! نہ میری آنکھوں کے آگے یہ درد انگیز سانحہ ہوتا، نہ سکون مجھ پر اس طریقہ سے حرام ہو جاتا۔

جب شام ہوئی تو میری وحشت اور انتشار کا رنگ پلٹا۔ دن بھر تو میں اس ناکام آرزو کو بد دعائیں دیتا رہا تھا کہ کیوں اس عورت کو میرے آستانہ پر بلا کر میری جان پر یہ ستم برپا کیا۔ مگر اب میں دل ہی دل میں منانے لگا کہ وہ پھر آئیں اور مجھے درد آشنا بنائیں، ایک بار دونوں ملکر مجھے ٹھوکریں لگائیں اور اسی وقت سب سے بڑا بُت میری زبان کھولدے اور میں چیخ اُٹھوں

وہ دونوں غم سے پسیج جائیں اور مجھے گود میں اٹھالیں، اپنی گستاخی پر شرمسار ہوں اور میں مچل جاؤں کہ جب تک ہر صبح تم دونوں میری پوجا نہ کروگے، میں ہرگز درگزر نہ کروں گا۔ وہ دونوں مجبور ہو جائیں میرے پاس کٹیا بنا کر رہنے لگیں اور ان کی زندگی اس برگد اور امربیل کی طرح ایک ہو جائے۔ ابھی میں یہ عجیب و غریب منصوبے باندھ رہا تھا کہ وہ نوجوان دور سے آتا ہوا دکھلائی دیا۔ مگر وہ اکیلا تھا۔

اس چبوترے پر سر جھکائے وہ دیر تک بیٹھا رہا۔ اسے وہ دن یاد آئے جب سبزہ کی فراوانی سے زمین پر آسمان کا دھوکہ ہونے لگا تھا اور وہ دونوں اس پیڑ کی ڈال پر جھولا جھول رہے تھے۔ یکایک کسی شریر لڑکے کی غلیل کا نشانہ بن کر ایک مینا زمین پر گری تڑپی اور مر گئی۔ تھوڑی دیر بعد اُس کا جوڑا کچھ تنکے لئے ہوئے آیا اور اپنے آشیانہ کو آراستہ کرنے میں مصروف ہو گیا جو ابھی ادھورا پڑا تھا۔ پھر وہ اُسے پکارنے لگا اور جواب نہ پا کر اُسے ہر ہر پتی اور ہر ہر ڈال پر ڈھونڈنے لگا۔ جب اس کی نظر نیچے گئی تو وہ چیخ کر لاش پر گر پڑا اور ہزار طرح اسے جگانے کی کوشش کرتا رہا لیکن وہ نہ اُٹھی۔۔ نہ اُٹھی! پھر وہ ستم زدہ پرسمیٹ کر اس کے سرہانے بیٹھ گیا اور مردہ مینا کے ادھ کھلے دیدوں پر اپنی چونچ سے سلائی پھیرنے لگا کبھی وہ بیتابانہ دوسرے پرندوں کے پاس جا کر فریاد کرتا کہ دیکھو بسے ہوئے گھر اس طرح لٹتے ہیں کبھی آسمان سے شکایت کرتا کبھی زمین پر لوٹنے لگتا۔ اس روح فرسا نظارہ کو دیکھنے کی تاب وہ دوشیزہ نہ لا سکی تھی۔ اس کی آنکھیں شبنم فشاں ہو گئیں اور نوجوان سے لپٹ کر سسکیاں بھرتی ہوئی بولی۔۔ "وہ بیدرد اسے نہ مارتا تو کیا ہوتا!"

ایک لمبی سانس بھر کر وہ اُٹھا اور دیر تک اِدھر اُدھر ٹہلتا رہا اور آخر اس جگہ آکھڑا ہوا جہاں کل رات آکر وہ بیٹھی تھی پھولوں کی وہ پنکھڑیاں اب بھی بکھری ہوئی تھیں جنھیں اُسنے اضطراب میں مسل ڈالا تھا۔ اب وہ مرجھا چکی تھیں۔ اس نے اپنی جیب سے خطوں کا ایک پلندہ نکالا۔ چراغِ تبخانہ سے پتنگے درسِ زندگی لے رہے تھے۔ اس نے یکے بعد دیگرے ہر خط کو لو دکھائی جس کی بھڑک میں محبت کی کہانی دم بھر میں خاکستر ہو گئی۔ مجھے کچھ نہیں معلوم کہ ان میں کیا لکھا تھا۔۔ صرف اتنا دیکھا کہ آتش بجاں الفاظ غصہ سے آگ کی طرف دیکھتے تھے۔ مگر رفتہ رفتہ سب خاک سیاہ ہو گئے ماسوا کاغذ کے ان ٹکڑوں کے جن پر آنسو کی بوندوں نے روشنائی پھیلا دی تھی۔

وہ ہاتھ باندھے درخت کا سہارا لئے، بت پر ایک پاؤں رکھ کر آنکھیں بند کئے دیر تک کھڑا رہا۔ نیم خوابی کی حالت میں اس نے دیکھا کہ اُس کی زندگی ایک باغ تھی، جہاں کی بہار خزاں دیدہ نہ تھی، جہاں کے غنچے گل چیں کا مذاق اُڑاتے تھے۔ یکایک اس میں ایک نیا پودا لہلہایا جس کے سایہ نے سارے باغ کو ڈھک لیا۔ اس سے ایسے ابخرات نکلے کہ کچھ دنوں بعد باغ ویران ہو گیا، کہیں پھل پھول کا نام نہ رہا۔ یہ عشق کا درخت تھا۔۔ جس کی دو ٹہنیاں تھیں۔۔ مسلک اور عورت! اس باغ میں دو نہریں بہتی تھیں جو ان کی جڑوں کو سینچتی تھیں۔۔ لگاؤ اور الگاؤ! اکثر یہ ٹہنیاں باہم بست و گریباں ہوتیں اور وہ نہریں آپس میں گتھ جاتیں۔ ایک دن لگاؤ کی نہر سے ایک بیل پھوٹی جسکا نام "غرض" تھا

اور جو عورت کی ٹہنی سے لپٹ گئی۔ ان کی سازش سے دوسری ٹہنی سوکھنے لگی اور دوسری ٹہنی بھی خشک سی ہو گئی ابھی وہ درخت اس چوٹ سے سنبھل ہی رہا تھا کہ زندگی کے باغ میں سماج کا دیو وہم کی کلہاڑی لئے ہوئے آیا اور دوسری ٹہنی پر ایسی ضرب لگائی کہ وہ بھی ٹوٹ کر گر گئی اور ساتھ ہی وہ بیل بھی سوکھ گئی۔

نوجوان آنکھیں مل کر زور سے بول اٹھا۔ "کیا میں خواب دیکھ رہا تھا۔ کیا میرے دونوں شہ پر ٹوٹ گئے۔ کیا میری حقیقت؛ برگد کے اس ٹھونٹھ سے زیادہ نہیں۔ کیا میں اس بت کی طرح بیزبانی کا گلہ کرتے کرتے مر جاؤں گا۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ نسیم زندگانی اس درخت کو تر و تازہ کر کے ان ٹہنیوں کو شاداب بنائے اور ان دونوں میں یگانگی کی روح پھونکے...... یا میں اس ویران نخلستان کو چھوڑ کر ایک نئی دنیا بساؤں جس میں بربادی کے سرچشمہ سے خلاء کا بیج پھوٹے جس کا زہر زندگی اور موت دونوں کو ہلاک کر دے!

یہ سوچتا اور مسلے ہوئے پھولوں کی خاک جلائے ہوئے خطوں کی راکھ کے ساتھ ہوا میں اڑاتا ہوا وہ چلا گیا۔ ایک مدت گزری، تاہم میں روز شام کو ان کا انتظار کرتا ہوں اور اکثر میرے کانوں میں اس کا وہ جملہ گونجا کرتا ہے جو بوقت وداع بکمال حسرت و یاس اس کی زبان پر تھا ——— "یوں نہ ہوتا تو کیا ہوتا"

زمین آسمان ہوتی اور آسمان زمین ہوتا تو کیا ہوتا! جنت جہنم ہوتی تو کیا ہوتا! دنیا کا ہر حسین بدصورت اور ہر بدصورت حسین ہو جاتا تو کیا ہوتا! اہرمن یزداں ہوتا تو کیا ہوتا! اگر زندگی بڑھاپے سے شروع ہو کر بچپن پر ختم ہوتی تو کیا ہوتا بُت خدا بن جاتا اور خدا بُت ہوتا تو کیا ہوتا ——— حُسن باوفا ہوتا اور عشق بے وفا ہوتا تو کیا ہوتا! وہ مرد دھوکہ نہ کھاتا تو کیا ہوتا ——— وہ عورت دھوکہ نہ دیتی تو کیا ہوتا۔

ناکام تمنا دل اس سوچ میں رہتا ہے۔
یوں ہوتا تو کیا ہوتا، یوں ہوتا تو کیا ہوتا۔

اختر حسین رائے پوری

اہتمام سرسری اطلاع نامہ بنام دائنان

(دفعہ ۴۸ ایکٹ نمبر ۵ سنہ ۱۹۲۰ء)

بعدالت جناب سید خورشید حسین صاحب بہادر جج خفیفہ لکھنؤ

درخواست دیوالیہ نمبر ۱۳ سنہ ۱۹۳۵ء

بمقدمہ قرار دئے جانے دیوالیہ مسمی بُلاقی ولد تیہو خاکروب محلہ فراش خانہ مصطفےٰ منزل تھانہ چوک کوتوالی

بنام

۱۔ گوپال ولد جے نراین رستوگی ساکن محلہ رستوگی ٹولہ تھانہ چوک شہر لکھنؤ
۲۔ گنگا دھر ولد رام داس قوم رستوگی " " "
۳۔ بلدیو داس ولد لچھمن داس رستوگی ساکن بیگم گنج تھانہ چوک شہر لکھنؤ
۴۔ لالہ متھری ولد نامعلوم قوم رستوگی ساکن باغ مکا " "
۵۔ سندر لال رستوگی ملازم جگل کشور رستوگی باغ مکا تھانہ چوک کوتوالی شہر لکھنؤ
۶۔ سندر لال بقال ساکن شیوالہ بھوانی سنگھ متصل ٹاٹ پٹی " "
۷۔ مدن موہن رستوگی بازار کھالہ تھانہ چوک شہر لکھنؤ

اطلاع دی جاتی ہے کہ بتاریخ ۱۳ ماہ جنوری سنہ ۱۹۳۵ء مدیون مذکور الصدر نے ایک قطعہ درخواست اس عدالت میں بدیں غرض پیش کی ہے کہ وہ دیوالیہ قرار دیا جاوے اور یہ کہ بتاریخ ۱۵ ماہ فروری سنہ ۱۹۳۵ء عدالت ہذا نے اس امر کا اطمینان کرکے کہ مدیون کی جایداد غالباً مبلغ پانچ سو روپیہ سے زائد نہ ہوگی ہدایت کی ہے کہ مدیون کی جائداد کا اہتمام سرسری طور پر کیا جاوے اور تاریخ اٹھارہ ماہ اپریل سنہ ۱۹۳۵ء بنابر مزید سماعت، درخواست و اظہار مدیون مذکور مقرر کی ہے۔ اس امر کی بھی اطلاع دی جاتی ہے کہ عدالت تاریخ مذکور الصدر پر تصفیہ و تقسیم جایداد مدیون مذکور کی فوراً کارروائی شروع کرسکتی ہے [illegible] اختیار ہے کہ تم حاضر ہوکر اُس تاریخ پر ثبوت دو۔ ثبوت کسی دعویٰ کا جو تم کرنا چاہو تاریخ مذکور پر یا اُس کے قبل داخل [illegible] کرنا لازمی ہوگا۔

میرے دستخط اور مہر عدالت کے آج بتاریخ ۲۳ مارچ سنہ ۱۹۳۵ء جاری کیا گیا۔

دستخط منصرم

وقت حاضری عدالت دس بجے سے چار بجے تک

تصانیف نیاز فتحپوری
صحابیات
تاریخ الدولتین
عرض نغمہ
فلاسفۂ قدیم کی روحوں کا اجتماع
جذبات بھاشا
فراست الید
مکتوبات نیاز
منیجر نگار لکھنؤ

پارسی اہلِ کتاب ہیں

(مسلسل)

حضرت زرتشت اور اُنکی تعلیمات

اب ہمیں دینِ زرتشت کی مخصوص کتب مقدسہ کو دیکھکر معلوم کرنا چاہئے کہ اس مذہب کے معتقدات و اصولِ دین کیا ہیں۔ جیسا کہ اس سے قبل بیان ہو چکا ہے یسنا کے اُس حصہ میں جو گاتھا زبان میں ہے حضرت زرتشت کے وہ تمام اقوال و کلمات مرقوم ہیں جو حضرت زرتشت نے تبلیغ دین کے وقت اپنی زبان مبارک سے نکالے تھے۔

یسنا کے تیسویں باب میں وہ اپنے خطبہ کو اس اعلان سے شروع کرتے ہیں کہ:۔ "ہر آدمی کا فرض ہے کہ اپنے اچھے اور بُرے کی تمیز میں اپنی عقل کو استعمال کرے۔ چونکہ یہ وقت نہایت اہم ہے لہذا لوگوں کو چاہئے کہ اپنے لئے ایک اپنا مذہب چُن لیں۔ اور خداوند عالم کے احکام کو بغور سنیں"۔

پھر وہ فرماتے ہیں کہ:۔ "ہر شخص کے لئے اِس دُنیا میں صرف دو راستے کھُلے ہیں اور یہ دو راستے نیکی و بدی کے ہیں۔ نیکی کا راستہ نجات و مسرتِ ابدی کی طرف لیجاتا ہے اور بدی کا راستہ جہنم کی طرف لیجاتا ہے اور ہمیشہ کیلئے مصائب و تکالیف میں مبتلا رکھتا ہے۔ پس خدا نے ہر شخص کو عقل کا مادہ عطا فرمایا ہے تاکہ وہ تباہ و برباد نہو جائے"۔

زرتشت نے نیکی و بدی کے دو متضاد کوائف کے متعلق جو الفاظ کہے ہیں اُن کا ترجمہ ڈاکٹر جیمس مولٹن نے اس طرح کیا ہے[۱]:۔

(۱) عقلمندوں کو چاہئے کہ خداوند عالم کی حمد و ثنا کریں اور سچائی اختیار کریں۔ اس کے عوض وہ رحمت پائیں گے۔

(۲) اپنے کان اچھے کلام کے سننے میں استعمال کرو۔ دروغ و کذب میں دور اندیشی سے کام لیکر امتیاز کرو۔

---

[۱] اشعار ایرانِ قدیم صفحات ۹۲-۹۶ -

(۳) رفتار، گفتار اور کردار میں اچھائی اور برائی دونوں پائی جاتی ہیں۔ دانا وہ ہے جو ان دو دیرینہ ازواج میں نیکی کو اختیار کرتا ہے اور نادان وہ ہے جو برائی کو۔

(۴) جب یہ دو روحیں شروع میں ایکدوسرے سے ملیں تو انھوں نے زندگی اور موت کو پیدا کیا۔ دنیا کے اختتام پر دروغ پرستوں کو بدترین زندگی نصیب ہوگی اور راستی پسند بہترین جگہ پائیں گے۔

(۵) ان دو روحوں میں دروغ پرست نے بدترین کردار کو پسند کیا اور راستی کے پیرو نے حق کو اپنا پیرہن بنایا۔

(۶) یقیناً جھوٹا مسرت سے محروم رہیگا اور وہ لوگ جنھوں نے سچائی کی پیروی کی ہے انھیں حسب وعدہ انعام ملیگا۔

(۷) پس اے لوگو اگر تم ان احکام پر جو "مزدا" نے تمھارے لئے مقرر کئے ہیں غور کروگے اور اس دنیا کے رنج و راحت کا خیال رکھتے ہوئے دروغ پرستوں کے دائمی رنج اور سچوں کے نیک انجام کو پیش نظر رکھوگے تو اس دنیا میں ہمیشہ ہمیشہ شاد و خرم رہوگے۔

جیسا کہ خطبہ سے ظاہر ہے یہ خطبہ اس مجمع کے سامنے دیا گیا تھا جہاں ہر طبقہ اور نزدیک و دور مقامات کے لوگ جمع تھے۔ ان مخصوص باب کے متعلق راگزن لکھتے ہیں ــــ "یہ وعظ دین زرتشت کے عہد اولین میں وہی مرتبہ رکھتا ہے جو مذہب عیسائیت میں "موعظت کوہ" کو حاصل ہے[۱]۔

یہ مسئلہ خیر و شر بالکل ویسا ہی ہے جیسا قرآن اور انجیل میں ہے۔ کوئی شخص اس سے انکار نہیں کرسکتا کہ ان کتب مقدسہ میں بھی لوگوں کو تنبیہہ کی گئی ہے کہ وہ بتائے ہوئے صحیح راستے پر چلیں اور اس راستے پر ہرگز نہ چلیں جس کی طرف شیطان لیجاتا ہے[۲]۔ اللہ کے محبوب بندوں کو بار بار حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنی عقل کو کام میں لائیں تاکہ حق و ناحق (یعنی صواب و خطا) روشنی و تاریکی۔ نیکی و بدی۔ خدا اور شیطان میں تمیز کرسکیں۔ ہم لوگوں کے سامنے اس دنیا میں یہی دو راہیں ہیں[۳]۔ ایک طرف سیدھا راستہ ہے جو خدا اور آرام گاہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور دوسری طرف غلط راستہ ہے جہاں شیطان کی رہنمائی میں جہنم اور آلام ابدی میں مبتلا ہونا پڑتا ہے۔

شر یعنی بدی کے مخلوق خداوندی ہونے سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا۔ ڈاکٹر "میکولوچ" لکھتے ہیں[۴]:ــــ "وہ شخص جو کسی الہامی کتاب کو پڑھنے اور اس پر یقین رکھنے کا دعویٰ کرتا ہے ہرگز یہ نہیں کہہ سکتا کہ "بدی" خدا کے قبضہ سے باہر ہے یا بدی کو خدا نے خلق نہیں کیا۔ نہیں اس خیال پر مجبور ہیں کہ بدی کو ایک ایسی مستقل مخلوق خدا سمجھیں جو خدا کی مشیت کا عمل

---

[۱] ہسٹوریا صفحہ ۱۰۲ ــ [۲] القرآن ــ سورہ ۵ آیت ۲۴ ــ [۳] القرآن سورہ ۹۰ آیت ۱۰ - ۸ ــ [۴] "صفات خداوندی" جلد ۳ صفحہ ۵ لندن ۱۸۴۳ء

کے قبضہ میں ہے۔ ہمیں اس عقیدہ کے آخریں اور نامعلوم نتائج کے متعلق کچھ چون و چرا کی گنجائش نہیں۔

علامہ سر محمد اقبال اپنی ایک تصنیف میں گیگر[1] اور ہاگ[2] کے خیالات پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں[3]: "یہ کہنا کہ صداقت و کذب کی دو روحوں کا ذات واجب الوجود میں یکجا ہوجانا یہ مطلب رکھتا ہے کہ بدی خدا کے وجود کا ایک جزو ہے اور نیکی و بدی میں کشمکش ہونا گویا خود خدا کا بدی سے جنگ کرنا ہے"

اس بحث کے سلسلہ میں شمس العلما شبلی نعمانی کے خیالات یہ ہیں کہ: "تمام گناہ جو انسان سے سرزد ہوتے ہیں وہ حقیقت امر یہ ہے کہ خود خداوند عالم کی مرضی سے سرزد ہوتے ہیں مگر اس حقیقت کے اقرار میں عوام کو شبہ ہوگا کہ ان کا بانی و باعث خود خدا ہے پس ہم اب اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ خیر و شر خداوند عالم کی مخلوق ہے۔ اور یہ دونوں آخر کار اُسی واجب الوجود میں مل جاتے ہیں، کیا قرآن حکیم نے شیطان کے انسانی امن و امان میں مخل ہونے کی شکایت نہیں کی ہے؟ کیا خدائے دانا و بینا کو خود اپنی خلق کی ہوئی شئے یعنی بانیِ شر کی آیندہ شرارتوں کا حال معلوم نہ تھا۔ بہر حال یہ سب اُمور اسرار خداوندی اور خلقت عالم میں ہیں۔

فطرت میں اجتماع ضدین ہر جگہ پایا جاتا ہے ہم روشنی کی محض تاریکی کی بدولت تمیز کرتے ہیں۔ گرمی کا احساس سردی کی بنا پر کرتے ہیں، محبت کا مزہ نفرت کی تلخی سے پہچانتے ہیں اور صحت و تندرستی کی نعمت کا اندازہ بیماری کی تکالیف جھیلنے کے بعد ہوتا ہے۔ خداوند عالم نے ہر شئے کا جوڑا پیدا کیا ہے کوئی شخص کسی شئے کے حُسن کا احساس اسوقت تک نہیں کرسکتا جب تک اُس کے خلاف بُرے نتائج سے اُسے مطلع نہ کردیا جائے۔ علم خداوندی کے مطابق پاکبازی راستی اور مذہب کے شاندار نتائج کی تشریح اُس وقت تک نہیں کی جاسکتی جب تک شیطان کے برباد کن رویہ سے لوگوں کو مطلع نہ کردیا جائے اور یہ امر بوضاحت نہ بتایا جائے کہ شیطان کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے سے خلاف فلاں آلام و مصائب میں گرفتار ہونا پڑتا ہے کامیابی کا اندازہ ناکامی سے ہوتا ہے۔ لیکن خدائے رحمان و اپنے پیارے بندے کے کسی ایسے کام کا جو ناکافی یا بُرے نتائج کا باعث ہوں ذمہ دار نہیں اُس نے ہر شخص کو کافی عقل عطا فرمائی ہے اور اُسے اس دار المحن میں آزمائشوں کا مقابلہ کرنا ہے۔ پس جو شخص اُس کے حکم کو دل سے سنتا اور اُس پر عمل کرتا ہے وہ نجات ابدی حاصل کرتا ہے اور اس کے برخلاف جو اُس کے احکام کی خلاف ورزی کرتا اور غلط راہ اختیار کرتا ہے تباہ و برباد ہوتا ہے۔

---

[1] مشرقی ایرانیوں کا تمدن بزمانۂ قدیم" ملاحظہ ہو — [2] مضامین ہاگ — [3] ارتقائے الٰہیات در ایران" صفحہ ۴ - ۳ -

زرتشت کی غرض بھی یہی تھی کہ وہ فطرت کے دونوں رُخ کو مشرق کے اُن باشندوں کو سمجھا دے جو جہالت کے باعث نفسانی خواہشات کے غلام ہو رہے تھے۔ جیسا کہ اوپر مذکور ہو چکا ہے یہ خیال ایرانیوں کے لئے بالکل نیا تھا اور اسی لئے زرتشت نے اپنے سامعین کی ذہنیت کا لحاظ کرتے ہوئے یوں بیان کیا کہ:۔ "اصل میں دو روحیں تھیں جن میں سے ایک نیکی اور دوسری بدی تھی دونوں آپس میں ملکر اس طرح کام کرتی رہیں کہ انکا علٰحدہ کرنا بالکل ایسا ہی دشوار تھا جیسا دن اور رات کا۔ جو شخص نیک روح کی پیروی کرتا ہے اُسے چاہئے کہ بد روح سے غافل نہ رہے کیونکہ بدی ہر وقت اُسے راہِ غلط کی طرف گمراہ کرنے کے لئے مستعد رہتی ہے[۵۱]۔ یہ دو روحیں ایک دوسرے کی مخالفت میں برابر برسرِ پیکار رہیں اور ان کی یہ کشمکش تا روزِ قیامت جاری رہے گی اور اسوقت خدا نیکی کی مدد کرے گا۔ ہر شخص ان دو روحوں سے ایک کو اپنا رہبر بناتا ہے۔ وہ شخص جو نیکی کو رہبر بناتا ہے وہ یزدان کا معین ومددگار سمجھا جاتا ہے اور وہ شخص جو بدی کو اپنا سردار تسلیم کرلیتا ہے اُس کا اہرمن کی فوج میں شمار ہوتا ہے پس جس نے یزدان کی مدد کی وہ جنت پائے گا اور جس نے اہرمن کی اطاعت کی وہ جہنم میں جھونک دیا جائیگا۔

اس سلسلہ میں شہرستانی کی مشہور کتاب سے چند جملے نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے[۵۲]۔ وہ لکھتا ہے:۔ "نیکی اور بدی۔ پاک و نجس یہ سب روشنی و تاریکی کی طرح وجود میں آئے ہیں۔ اگر ان کا وجود مدغم نہ ہوتا تو دنیا قایم نہ رہ سکتی۔ ہر شئے کی ضد کا پیدا ہونا چونکہ لازمی ہے لہذا تاریکی کا وجود عالمِ آفرینش میں ایک لازمی امر تھا"

چونکہ عموماً لوگ معمولی دماغ و ذہنیت کے ہوتے ہیں لہذا نیکی اور بدی کا پہلے پہل سمجھانا سوائے اس صورت کے کسی اور طرح دشوار تھا۔

خواجہ کمال الدین لکھتے ہیں:۔ "ہم میں اکثر کوئی نامعلوم قوتیں اچھے اور برے کاموں کی تحریک کرتی رہتی ہیں ان قوتوں کو قرآن حکیم نے علی الترتیب فرشتہ و شیطان کے نام سے موسوم کیا ہے[۵۳]"۔ نیکی و بدی میں باہم ربط ہونیکے مسئلہ کو حضرت زرتشت نے توام ارواح کی مثال دیکر سمجھایا ہے۔ پھر اس مثال کی روشنی و تاریکی۔ سچ و جھوٹ زندگی و موت جیسی مثالوں کو پیش کر کے وضاحت کی ہے۔ واضح رہے کہ بجنسہٖ اسی قسم کا موازنہ قرآن و انجیل میں بھی مرقوم ہے ان کتبِ مقدسہ میں بھی روشنی کو نیکی اور تاریکی کو بدی و گناہ سے تعبیر کیا گیا ہے[۵۴]۔ تاریکی کو گناہ اور شر کا نشان بتایا گیا ایوب ۱۹ آیت ۸۔ قرآن سورۃ ۲۴ آیت ۴۰) اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ دن کی روشنی نیکی کی علامت اور

---

۵۱ قرآن حکیم بھی ملاحظہ ہو۔ سورۃ ۷ آیت ۱۶۔ ۵۲ کتاب الملل والنحل۔ ۵۳ قرآن حکیم سورۃ ۲۔ ۷۔ ۲۰۔ ۵۴ اسلام اور مذہب زرتشت مصنفہ خواجہ کمال الدین۔

شب کی تاریکی گناہ کی علامت ہے ۔ بلکہ مندرجۂ بالا تقابل اور موازنہ سے اسوقت کے لوگوں کی کم علمی کا خیال رکھتے ہوئے اس مسئلہ خیر وشر کی سادہ الفاظ میں تشریح کرنا مقصود تھا ۔ زندگی اور موت کا تقابل بھی اسی طرح نیکی و بدی سے کیا گیا ہے اس جگہ زندگی سے مراد روحانیت اور پاکیزگی کی زندگی ہے اور موت کا مطلب نور ایمان سے محروم رہنا ضمیر نیک سے جدا ہونا ۔ نیک اعمال کو چھوڑ کر شیطان کا مقلد ہو جانا ہے[1] ۔ یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ زرتشتی فلسفۂ مذہب میں بدی کا نتیجہ موت ہے زرتشتی مذہب کے پیرو موت کو خداوند عالم کی ایک رحمت سمجھ کر بڑی خندہ پیشانی سے اُس کا استقبال کرتے ہیں ۔ اُن کا اعتقاد ہے جب روح ہمارے مادی جسم کو چھوڑ کر خالص زندگی بسر کرتی ہے تو اُسے بلند معیار روحانیت کا نصیب ہوتا ہے اور روح تمام آلام و مصائب سے نجات پا جاتی ہے[2] ۔ " موت تکمیل حیات ہے " (دینکارد جلد پنجم صفحہ ۳۳۰ ترجمہ پشوتن سنجانا) زندگی اس دنیا میں مختصر مگر آیندہ دنیا میں دراز ہے ۔ (اندرز خسروی کا داتان نجسم) " سوائے موت کے تمام امراض کی دوا مقرر ہے " (دینکارد جلد دواز دہم باب ہفتم صفحہ ۴۷) پس ہم اس نتیجہ پر بلا کسی تامّل کے پہونچتے ہیں کہ موت و بدی کا تقابل محض تشریح کی غرض سے دین زرتشتی میں ہوا ہے ۔

اب ہم یسنا باب سی و یکم کا ترجمہ پیش کرتے ہیں ۔ اس میں سبب کے ارتقا اور کشمکش سے بحث کی گئی ہے یہ ترجمہ پروفیسر ملس کے ترجمہ سے ماخوذ ہے[3] ۔

(۱) ہم اُن اُصول کو بیان کررہے ہیں جو دروغ پرستوں کو تو یقیناً ناگوار ہوں گے لیکن ان لوگوں کے لئے جو مزدا پر ایمان و یقین رکھتے ہیں یہ بہترین کلام ہے ۔

(۲) اگر اس طرح پر تمھاری روح سچائی کو اختیار نہ کرے گی تو میں حسب مرضی اہورا مزدا تمام اُن اختیارات کے ساتھ آؤں گا جو اہورا مزدا اپنے رسولوں کو عطا فرما کر اس دنیا میں حکومت کے لئے بھیجتا ہے اور چاہتا ہے کہ اُن رسولوں کی بدولت اُس کے بندے اُس کی اطاعت و فرمانبرداری کریں اور پاکبازی کی زندگی بسر کریں ۔

(۳) اے مزدا مجھے اُس سزا سے جو تو نے گناہگاروں کے لئے مقرر کی اور اُن انعام سے جو تو نے نیکوکاروں کیلئے مقرر فرمائے ہیں مطلع فرما ۔ تاکہ میں اُن کا دنیا میں اعلان کردوں ۔

---

[1] تقابل فرمایئے انجیل میں نور سے مراد روح اور جان ہے ۔ اسی طرح تاریکی سے مراد موت ہے ۔ قرآن سورۃ ۶ آیت ۱۲۲ ۔ [2] شکند گمانک وِیجار باب ۴ سطر ۸۰ اور باب ۱۲ سطر ۹ پھر اس کا حدیث جناب ختمی مرتبت منقولہ غزالی کیمیائے سعادت) صفحہ ۷۴ تقابل کیجئے ۔ مفتی میر محمد عباس شوستری اعلی اللہ مقامہ نے اپنی مثنوی " من و سلوی " میں بڑی خوبصورتی سے اسے نظم کیا ہے ۔ [3] ادبیات مقدسہ مشرقی جلد ۳۱ صفحات ۵۳ - ۳۶ ۔

(۴) جب مزدا کے فرشتوں کے ساتھ ابدی رحمت ہماری التجا کی طرف متوجہ ہوگی تو دین کی رحمت اور تیری پاکیزگی کی اعانت سے ہم اُس تندرستی اور قوت کا مطالبہ کریں گے جس کے ذریعہ ہم شیطان کا قلع قمع کرسکیں۔

(۵) اے راستی مجھے میرے بہترین حق (حصہ) سے آگاہ کرتا کہ میں اُسے تلاش کروں۔ اے پاک منشی مجھے اُس کا پتہ بتلا دے جس کے ذریعہ تمام نیکیاں اور خوبیاں پہچان سکوں۔ اے اہورا مزدا مجھے اُن چیزوں سے جو پسندیدہ اور غیر پسندیدہ ہیں مطلع کردے۔

(۶) اہورا مزدا مجھے اپنی سلطنت کے اُس حصہ کا جو پاکبازی کے نور سے منور اور نغمہائے جاودانی سے معمور ہے پتہ بتلا۔

(۷) تو ہر شے پر قادر ہے۔ تو ان تمام نیکیوں اور اچھائیوں کا بانی ہے۔ تو اپنے فیاض دماغ کے پرتو سے اولیا کے دماغ کو بلند خیال بناتا ہے۔ اور اُن کی پاک ہستیوں کی اعانت کرتا اور انھیں ترقی دیتا ہے (کیونکہ وہ تیرے مخصوص بندے ہیں) تو ہمیشہ یکساں ہے۔

(۸) اے اہورا مزدا تو ہی اپنے بندوں کے معبود ہونے کے قابل ہے۔ تو ہی پاک منشی کا بانی و مالک ہے۔ میری روشن آنکھوں نے تجھ ہی کو انسان کی نیکیوں اور زندگیوں کا مالک پایا۔

(۱۴) اے اھورا مزدا میں تجھ سے دریافت کرتا ہوں کہ آیندہ کیا کیا باتیں ظہور میں آنے والی ہیں۔ ... اور بدکاروں کی کیا سزا ہے۔ ان کا انجام دحشر کس طرح ہوگا۔

(۱۵) اے اھورا مزدا اُس کی کیا سزا ہے جو بدی کرتا اور بدکاروں کی مدد کرتا ہے اور پاکباز کسانوں کو تکلیف پہونچانا اپنا مقصد حیات جانتا ہے؟۔

(۱۶) اُس کے کلام واقوال کو سننا چاہئے جو دونوں جہاں کی حقیقت سے باخبر ہو اور دہی ہماری زندگی میں ہمارا رہنما ہوسکتا ہے جو بلا رورعایت حق بات کہدیتا ہے اور اے اھورا مزدا تیری جلائی ہوئی آگ جو تو نے اپنے بندوں کی رہنمائی کی خاطر جلائی ہے اُسی کی مطابقت سے وہ کلام کرتا ہے۔

(۲۱) اھورا مزدا دائمی راستی۔ شہریاری۔ پارسائی۔ بُردباری اور پاک منشی اسی کو عطا کرتا ہے جس کے قول۔ فعل اور خیال اُسکی (یعنی اہورا مزدا کی) مرضی کے مطابق ہوں۔

اس کے بعد زردشت اس امر کا اعلان کرتا ہے کہ اس کا لایا ہوا دین تمام دنیا کے لئے یکساں مفید وضروری ہے اور ان باتوں سے ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ زردشت نے دیو پرستی کی بیخ کنی کی غرض سے اہورا مزدا کی اعانت طلب کی تھی۔

بلاشبہ ابتدا میں دینِ زرتشتی تمام عالم کے لئے تھا اور اس مقصد کی تکمیل بھی عہد اولیٰ میں دوسرے مذاہب والوں کو ہم مذہب بنا کر کی گئی[1]۔ زرتشت کے حواریین دور و دراز ممالک میں جا جا کر مزدا پرستی یعنی زرتشت کی زرین تعلیم کی تبلیغ کیا کرتے تھے[2]۔ یہاں تک کہ دیو پرستوں کے فرقہ نے بھی ان کی تقلید میں بت پرستی کی تبلیغ شروع کر دی تھی[3]۔ یشتہا میں اکثر ایسے علماء اور اولیاء کا ذکر ہے جو اولاً تورانی تھے لیکن بعد کو اس نئے مذہب پر ایمان لے آئے[4]۔ پہلوی دینکارد (جلد دہم حصہ پنجم) کی یہ عبارت بھی اس مذہب کے مذہب عالم ہونے پر شاہد ہے۔ "خالق یعنی اہورا مزدا نے اس دین کو محض ایران کے لئے مخصوص نہیں کیا ہے بلکہ دین تمام عالم کے لئے بھیجا گیا ہے تاکہ یہ مذہب کل اقوام میں پھیلے۔ باعتبار روحانیت اس مذہب کا تمام دنیا کے لئے لازمی قرار دیا جانا اسواسطے ضروری ہے کہ اس مذہب میں بہترین فلسفہ۔ پاک ترین خیالات اور سچے کلمات یکجا مجتمع ہیں۔ علاوہ ازیں باعتبار ظاہری اس لئے مفید ہے کہ اسکی بنیاد پاک اخلاقیات پر ہے"

بہرکیف اس کے بعد زرتشت خداوند بزرگ و دانا و خلاق خرد و راستی کو مخاطب کر کے اس کے مختلف اوصاف کو بیان کرتے ہیں اور پھر ہر صفت کے لئے ایک نام مقرر کرتے ہیں۔ اس کے بعد مزدا سے عاقبت کے متعلق سوال کرتے ہیں اور مومنین (پیروان زرتشت) کے حقیقی عقاید کے متعلق جو ان کی سعادت و نجات کا باعث ہوگا دریافت کرتے ہیں پھر دروغ پرستوں کے انجام سے باخبر ہونا چاہتے ہیں۔ اور آخری بار مجمع سے مخاطب ہو کر لوگوں کو دیو پرستی سے باز رہنے کی تلقین فرماتے ہیں۔

حضرت زرتشت کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ خداوند عالم کے متعلق ان کے تصورات و خیالات بہت بلند تھے۔ زرتشت کو خالق مطلق کے متعلق اسقدر معرفت اسوقت ہوئی جب وہ عناصر فطرت کی بے معنی پرستش سے متنفر ہو چکے تھے۔ انھوں نے اپنے ذاتی ادراک اور معرفت کی بنا پر خداوند عالم کے واحد الوجود ہونے کی تبلیغ کی اور یہ معرفت تمام مصلحین و پیغمبران مشرق کی تعلیمات ہی سے ملتی جلتی ہے۔ انھیں خدا کی ذات پر کامل بھروسہ تھا اور نیکی و راستی کی کامیابی کا یقین واثق تھا۔ دین زرتشت میں معاد یعنی آخرت کا تصور جسمانی نہ تھا۔ زرتشت کے خیال میں بہشت ایک ایسے مقام کا نام ہے جہاں انسان کو راحت و سعادت ابدی نصیب رہتی ہو اور خلاق عالم

---

[1] یسنا باب ۱۰ آیت ۷ اور باب ۶۱ آیت ۱ ۔ "نور ایران قدیم" صفحہ ۱۰۶ ۔ اور جمعیتہ التواریخ مصنفہ فقیر محمد بن قاضی محمد رضا (کلکتہ ۱۸۳۶ء) صفحہ ۱۱۷ ۔ [2] یسنا باب ۴۶ آیت ۹ ۔ [3] یسنا باب ۹ آیت ۲۴ ۔ [4] یاشت باب ۱۳ سطر ۱۲۳ ۔ ۱۲۰ ۔ ۱۰۲ ۔ ۹۴ ۔

کے نور مقدس سے بالکل قربت رہتی ہے۔

توریت اور اوستا اس خیال میں متحد نظر آتے ہیں۔ اور اس کا سبب یہ ہے کہ یہودیت اور دین زرتشتی نے عرصہ تک ایک ساتھ زندگی بسر کی ہے اور دین زرتشتی سے ان کے خیالات بڑی حد تک متاثر ہوئے ہیں۔ جانسن و مولٹن وغیرہ جیسے فضلائے مغرب کا خیال ہے کہ عبرانی ادبیات نے اصول الہامی کو تعلیم زرتشت سے اخذ کیا ہے اور اس سے پتہ چلتا ہے کہ مشرقی پیغمبروں میں زرتشت ہی پہلے وہ پیغمبر تھے جنھوں نے معاد کے متعلق ایسے خیالات کا اظہار فرمایا۔[1]

اس سلسلہ میں مارخم کی کتاب تاریخ ایران سے چند جملے نقل کئے جاتے ہیں[2]۔ " زرتشتی خدائے واحد یعنی ہورامزدا پر ایمان رکھتے ہیں۔ مرنے کے بعد سزا و جزا اور روز حشر پر بھی ایمان رکھتے ہیں۔ یہودیوں کی گرفتاری سے قبل تک یہودیوں میں معاد یعنی آخرت کے متعلق کوئی خاص خیال و اعتقاد نہ تھا جس کی دلیل یہ ہے کہ وار برٹن نے اس اعتقاد کی غیر موجودگی کی بنا پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ موسیٰ پیغمبر خدا تھے۔ پھر ڈاکٹر وہٹلی بھی اسی ثبوت کو اپنے مبحث رسالت جناب موسیٰ میں پیش کرتے ہیں۔ زرتشتیوں کے ساتھ تقریباً نصف صدی زندگی گزارنے کے بعد جب یہود اپنے وطن کو واپس گئے تب انھوں نے بھی اپنے یہاں اس مسئلہ اعتقاد حشر و نشر کو رواج دیا۔ ایرانیوں نے جنت کا نام بہشت رکھا تھا اور یہودیوں نے بھی بعد واپسی اسی نام کو اختیار کیا جیسا کہ یہ لفظ عہد نامہ جدید میں اکثر جگہ مرقوم ہے[3]"۔

الغرض دیگر الہامی مذاہب اور تعلیم زرتشت میں کسی قسم کا فرق نظر نہیں آتا ہے اور اس پیغمبر ایران کی کوئی تعلیم ایسی نہیں ہے جو ناپاک یا غیر الہامی ہو۔ بلکہ اُن کی تعلیم کا اصل اُصول بھی وہی ہے جو تعلیمات موسیٰ۔ عیسیٰ اور محمد مصطفٰے کا تھا۔ کسی شخص کو پہچاننے کے لئے بہترین ذریعہ اُس کا قول و فعل ہے۔ اس لئے کتاب گاتھا پر اعتماد کرکے جو ابتک اصلی حالت میں پائی جاتی ہے، ہم زرتشت کے پیغمبر برحق ہونے کا یقین کر سکتے ہیں۔

کتاب یشتہا بھی دین زرتشتی کی تاریخ میں کافی اہمیت رکھتی ہے اور اس کے ذریعہ سے ہمیں اُن تغیرات کا حال معلوم ہوتا ہے جو پیشوایان مذہب نے وقتاً فوقتاً اس مذہب کی بیچارگی و تنزل کے زمانہ میں کئے ہیں۔ مذہبی تعلیم کا ایسے اوقات میں تبدیل ہو جانا کوئی حیرت انگیز امر نہیں۔ اس طرح کے تغیرات اکثر مذاہب میں پیدا ہوئے ہیں۔

---

[1] "روحِ اسلام" مصنفہ سید امیر علی مرحوم صفحہ ۲۲۹ - [2] صفحات ۶۱-۶۶ - فٹ نوٹ بھی قابل مطالعہ ہیں۔ [3] لوقا ۲۳ آیت ۴۳۔

خورد اوستا کا تقریباً ۱/۲ حصہ یشتہا پر مشتمل ہے۔ اور اُس کی زبان و مفہوم دونوں گاتھا سے بالکل متفرق ہیں۔[1] یہ تصنیف یقیناً بعد کے لوگوں کی تصنیف ہے اور مذہب زرتشتی میں نئی باتوں کا رواج دینا انھیں مصنفین کا کام ہے ہر چند کہ اہورامزدا کا خدا اور زرتشت کا پیغمبر خدا ہونا رکن ایمان رہا لیکن رفتہ رفتہ لوگوں نے اُن اوصاف میں جو حضرت زرتشت نے اہورامزدا کے متعلق بیان فرمائے تھے کافی ردوبدل کر دیا۔ خدائے واحد کی پرستش کو فرشتوں کی پرستش سے کچھ اس طرح پر خلط ملط کر دیا گیا کہ خدا کا وجود بالکل نام نہاد رہ گیا اور اسی بات نے ڈاکٹر ولسن (مشہور عیسائی مبلغ مقیم بمبئی) وغیرہ جیسے مخالفین دین زرتشتی کو اعتراض و الزام کا موقع دیا۔[2]

یشتہا میں پیروان دین زرتشتی کو بعض رسوم و عوائد کی پابندی کا حکم دیا گیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ سب بدعات بعد کے پیشوایان مذہب کی پیدا کی ہوئی ہیں۔ پارسی مصنفین کی کثیر تعداد نے یہ امر بخوبی واضح کر دیا ہے کہ "مغ" در حقیقت اُس مذہب کے پیرو تھے جو ظہور زرتشت کے قبل ایران میں پایا جاتا تھا اور اُن کی ایک خاص جماعت بمقام "میڈیا" مقیم تھی۔[3] جب انھوں نے مذہب زرتشتی قبول کیا تو اپنے زہد و اتقا کی بنا پر مذہبی پیشوا بن بیٹھے۔ رفتہ رفتہ جب ایرانی مشرق سے مغرب کی طرف بڑھے اور ان زاہدوں (مغوں) کو پیشوائی کا مرتبہ حاصل ہوا تو یہی لفظ "مغ" جو کچھ عرصہ قبل بت پرستوں کا خطاب تھا زرتشتی دین کے مذہبی پیشواؤں کا لقب ہو گیا۔[4] اور اس طرح موقعہ پا کر ان لوگوں نے زرتشتی احکام کے پردہ میں قدیم مراسم و عادات تورانی کو اس مذہب میں رائج کرنا شروع کیا۔ ڈاکٹر مولٹن لکھتے ہیں کہ[5] "مراسم کے اضافہ کے ذمہ دار مُغ ہیں۔ جس طرح پر ہندوستان میں آریاؤں کے سیدھے سادھے مذہب کو برہمنوں نے پیچیدہ کر دیا اسی طرح مُغوں نے زرتشتی مذہب میں بہت سی فضول باتیں داخل کر دیں۔"

مقدس آتش یا آگ کے احترام میں غلو کو راہ دینا اور مردوں کی لاش کو دھوپ میں اسوقت تک کھُلا چھوڑ دینا جب تک گدھ گوشت و پوست کھا کر ہڈی کا ڈھانچا چھوڑ دیں، اس مذہب کے مراسم نہیں ہیں بلکہ قدیم تورانیوں سے ماخوذ ہیں اور اب زرتشتی مذہب کے ضروری و لازمی عادات میں داخل ہو گئے ہیں۔ مسٹر زریان لکھتے ہیں کہ:۔[6] زرتشت کی بلند اور پاکیزہ تعلیم عہد ساسانی میں مُغوں کے ہاتھوں اپنی اصلیت سے علحدہ ہو کر خراب ہو گئی۔ ان لوگوں نے

---

[1] "اشعار ایران قدیم"، "میڈیا"، "تاریخ پارسیان" اور "شرح مذہب زرتشت" — [2] "مذہب پارسی" (بمبئی ۱۸۴۳ء) — [3] "میڈیا" مصنفہ راگزن — [4] عہد اوستا و زرتشت صفحہ ۶۳ — [5] "خزینۂ مُغ" صفحہ ۶۴ — [6] دیباچہ "ایران و پارسیان" حصہ اول

زرتشت کی نیک تعلیم کو ضرورتِ وقت اور رفتارِ زمانہ کے مطابق ڈھالنا چاہا اور اس کا نتیجہ بہت بُرا ثابت ہوا۔

"ڈاکٹر ایڈورڈ فری مین" لکھتے ہیں کہ:[1]— "عہدِ مابعد میں زرتشت کے بتائے ہوئے اُصول کو پیشوایانِ مذہب نے بہت زیادہ پست کر دیا۔ مثلاً ہرمزد جسمانی ہیئت کو آگ قرار دیکر معبدوں میں آگ رکھی جانے لگی اور اس کی بالاعلان پرستش ہونے لگی اسی طرح مندروں کی تعمیر بھی بالکل نئی بات تھی جسے زرتشت نے ممنوع قرار دیا تھا۔"

بہرکیف پارسیوں کے مذہب پر محض اُن کے مراسمِ مذہبی دیکھکر حکم لگانا مناسب نہیں ہے، کیونکہ اس قسم کی خامیوں کا وجود ہمیں اُن اقوام و ملل میں بھی نظر آئے گا جو موجودہ زمانہ میں اہلِ کتاب سمجھی جاتی ہیں۔ بلاشبہ ایک زرتشتی نماز ادا کرنے کے وقت آفتاب یا آگ کی طرف رُخ کرتا ہے لیکن کیا ایک یہودی عبادت کے وقت قربانگاہ کی طرف اپنی آنکھیں نہیں رکھتا، کیا عیسائی صلیب کے آگے نہیں جھکتے، اور کیا نماز کے وقت مسلمان قبلہ رو ہوکر عبادت نہیں کرتے؟

ایک مجوسی مصنف لکھتا ہے کہ:[2]— "شروع میں جب زرتشتی مذہب کے پیرو ہندوستان آئے تو انھیں مجبوراً بہت سے ہندوؤں کے مراسم اس لئے اختیار کرنے پڑے کہ اُن ریاستوں کے حکمران جہاں اُنھوں نے سکونت اختیار کی تھی اُن سے خوش رہیں اور اُن کی محافظت و سرپرستی کریں۔ کچھ عرصہ بعد یہ مراسم جو وقتی طور پر اختیار کئے گئے تھے توہمات اور غلط فہمیوں کی بنا پر اصل مذہب سے متعلق سمجھے جانے لگے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اکثر ہندوانہ مراسم و خصایل پارسیوں میں رائج ہوگئے۔"

اس مذہب پر ایک یہ بھی الزام ہے کہ اس نے حقیقی بھائی بہن کا عقد جایز قرار دیا ہے۔ اس اتہام و الزام کے بانی وہ یونانی مصنفین ہیں جنھوں نے تعصب اور نادانی سے اپنی تصانیف میں اس کا ذکر کیا ہے حقیقت امر یہ ہے کہ قدیم ایرانیوں کے عادات و خصایل سے ان یونانیوں کو مطلق واقفیت نہ تھی اس ناپاک رسم کا ذکر نہ تو اوستا میں ہے اور نہ پارسیوں کی کسی دوسری مقدس کتاب میں۔ پارسی اس رسم کے وجود سے بالکل انکار کرتے ہیں اور وہ حق بجانب ہیں۔

چچیرے بھائی بہن میں شادی کی اجازت اس مذہب نے بیشک دی تھی اور اسی کو لوگوں نے حقیقی بھائی بہن میں شادی کی رسم سمجھ لیا اور مطعون کیا۔ دائرۃ المعارف دین و اخلاق میں لکھا ہے کہ:[3]— "موجودہ پارسی یہ لکھتے ہیں کہ اس رسم کی اصلیت یہ ہے کہ حقیقی چچیرے بھائی بہن میں شادی کی اجازت دی گئی ہے اور بلاشبہ زمانۂ موجودہ میں ایسا ہی پایا جاتا ہے لیکن لفظ نیتوھید اتھا کے معنی یونانی اور لاطینی مصنفین نے غلطی سے حقیقی بھائی بہن

[1] تاریخ فتوحات سارسینس،، (لندن ۱۸۶۶ء) صفحہ ۱۴۔ [2] تاریخ پارسیان جلد دوم صفحات ۲۹-۲۲۸۔ [3] جلد ششم صفحات ۵۷-۶، ۱۴۵

لے لئے اور غیر پارسی علماء کی ایک کثیر تعداد اس معنی پر متفق ہے۔"

یہ ممکن ہے کہ زمانۂ قدیم میں مصر وغیرہ جیسے ملکوں کی اس بیہودہ رسم کی اتباع چند بادشاہوں نے کی ہو اور اس فعل قبیح کی اجازت علماء مذہب سے حاصل کر لی ہو لیکن اگر ایسا ہوا بھی ہو تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہو سکتا کہ مذہب نے ایسی تعلیم دی تھی یا یہ ناپاک رشتہ زرتشتیوں میں شرعاً جائز تھا۔ ہیروڈوٹس نے ایک ایسا واقعہ لکھا ہے[1] کہ ایکبار ہخامنشی سلاطین میں سے ایک سلطان نے جس کا نام کیمبیسس تھا مذہبی علماء سے دریافت کیا کہ حقیقی بھائی بہن میں شادی جائز ہے یا نہیں۔ لیکن جیسا کہ ہیروڈوٹس نے لکھا ہے اُن کے جواب سے ہرگز یہ پتہ نہیں چلتا کہ یہ امر شریعت زرتشت کے مطابق جائز ہو یا اس رسم کا ایران میں کبھی بھی وجود تھا۔

جارج اولنسن اس الزام واتہام کی تکذیب میں لکھتا ہے کہ[2] "منع اور اُن کے ہم مذہبوں پر یہ اتہام تراشنے والا اصل میں ٹیشیاس ہے اور ظاہر ہے کہ اس کا بیان ایسے واقعہ کے متعلق کسی طرح قابل وثوق نہیں سکتا"

راگزن ینا کے ایک مخصوص باب کا حوالہ دیتے ہوئے اس مبحث پر اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں[3]۔

"یہ ممکن ہے کہ یہ رسم ایرانیوں میں زمانۂ قدیم سے ہو اور اس سے مذہب نے وقتی ضرورت کی بنا پر جائز قرار دیا ہو۔"

لیکن ہم بہت جلد یہ امر ثابت کر دیں گے کہ دینِ زرتشت نے کسی وقت بھی کسی وجہ سے اس رسم قبیح کی اجازت نہیں دی ۔ ہمارے اس بیان کی تصدیق عہد اول و دور آخر کے تمام کتب مقدسۂ مذہب زرتشتی سے ہو سکتی ہے[4]

راگزن لکھتا ہے کہ:[5] ۔ یہ ناپاک رشتہ اور دیگر بیہودہ مراسم مصریوں ۔ یونانیوں اور رومیوں میں پائے جاتے تھے[6] ایک یونانی بیوی کو حق حاصل تھا کہ اگر اُس سے کوئی اولاد نہ ہو تو وہ کسی اجنبی سے شوہر کی اجازت لیکر ناجائز تعلق پیدا کرے تاکہ حمل قرار پاسکے اور اولاد ہو۔ اکثر ایسا ہوتا کہ کئی بھائیوں کی شرکت میں محض ایک عورت رہا کرتی تھی

---

[1] "دلائل دین زرتشت" مصنفہ مولٹن صفحہ ۲۰۷ اور عہد اوستا و زرتشت مصنفہ نجن ۔ [2] "پانچ عظیم الشان سلطنتیں" جلد سوم صفحہ ۲۲ [3] میڈیا باب ۱۲ صفحات ۱۲-۱۱۱ ۔ [4] ینا کے اس باب کا نہایت ہی صحیح اور نفیس ترجمہ "منتخبات از اوستا و فارسی قدیم" مؤلفہ ڈاکٹر آئی ۔ جے ۔ اس تارپوروالا میں موجود ہے ۔ تمام غلط فہمیاں لفظی نزاع کی بنا پر ہیں ۔ حقیقتاً اس لفظ کے معنی چچیرے بھائی بہن ہیں نہ حقیقی اگر حقیقتاً یہ رشتہ اس مذہب میں جائز ہوتا تو یقیناً مذہبی احکام میں کسی نہ کسی جگہ اسکی بابت اشارہ ضرور ہوتا مگر مذہبی احکام میں مطلقاً ذکر نہیں ہے۔ ناظرین "مذہب زرتشت" مصنفہ آئی ۔ جے ۔ اس تارپوروالا (مطبوعہ مدراس) اور تمدن ایرانیان قدیم مصنفہ کلیمنٹ ہورٹ کا اس سلسلہ میں ضرور مطالعہ کریں ۔ [5] "میڈیا" صفحہ ۱۱۱ ۔ [6] آثار قدیمۂ یونان دوم جلد صفحات ۳۹-۴۴ تیسرا ایڈیشن ۔ [8] مصر قدیم صفحہ ۱۶۳-۶۴-۲-۸۸ -

یونانی اور رومی دیوی اور دیوتاؤں کی ننگی تصاویر اور مجسمے اب بھی نظر آتے ہیں - اور یہ امران ممالک کے پستی اخلاق اور تمدن کی خرابی پر دلالت کرتا ہے - راولنسن نے لکھا ہے کہ قدیم مصری معاشرت کے قانون کے مطابق جس طرح ایک حقیقی بھائی اپنی حقیقی بہن سے شادی کرسکتا تھا اسی طرح ایک لڑکا اپنی حقیقی ماں سے شادی کرسکتا تھا[1] - بلاشبہ ایرانی سلاطین اور ان ممالک میں بہت زیادہ قریبی تعلقات تھے - سیرس - کمبائسس و دیگر بادشاہان ایران اُن ملکوں سے برابر جنگ رہی - اکثر اجنبی ایران میں آکر بس گئے اور ممکن ہے کہ ان تعلقات نے ایرانی تمدن پر بھی اثر کیا ہو - ایکبار کیمبائسس نے حقیقی بھائی بہن کے درمیان شادی ہونے کے متعلق استفسار کیا تھا لیکن علمائے مذہب نے کسی ایسے ایرانی یا زرتشتی شریعت کے وجود سے انکار کیا - عہدِ ساسانی میں جب ملحد مزدک نے اپنی غلط رسالت کا دعویٰ پیش کیا تو اکثر ناپاک و قبیح مراسم کو بھی داخل مذہب کرنا چاہا[2] لیکن جب نوشیرواں تخت ایران پر متمکن ہوا تو ان تمام خرافات کا بالکل قلع قمع کردیا اور دین زرتشتی پھر سلطنت کا مذہب بن گیا - لیکن جب ایران کی قومی سلطنت کا زوال ہوا تو کل انتظام ابتر ہوگئے اور عام طبقے میں پھر بد اُصولیاں شروع ہوگئیں جب پیروان دین زرتشت ہجرت کرکے ہندوستان آگئے تو انھوں نے اپنے دیگر مخصوص قوانین کے ساتھ ایک قانون شادی بیاہ کے متعلق بھی حکومت برطانیہ کو بنانے پر مجبور کیا - یہ قانون "پارسی شادی و طلاق" (۱۸۶۵ء) کے عنوان سے مشہور ہے - اس قانون کی غایت و غرض یہ تھی کہ وہ اس رسم کو اپنے مخصوص مذہب اور طرز تمدن کی مطابقت سے انجام دیں - اور ہم کو اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مخصوص رسم کے متعلق اُن کے مذہب اور تمدن کے احکام بھی اسی طرح پاکیزہ ہیں جس طرح مسلمانوں - عیسائیوں اور یہودیوں کے یہاں مروج ہیں[3] - موجودہ ایرانی زرتشتیوں میں مروجہ رسوم کے متعلق مستند حالات ہمیں کولمبیا یونیورسٹی امریکہ کے ایک پروفیسر ولیم جیکسن کے ذریعہ سے معلوم ہوتے ہیں - پروفیسر موصوف نے ایک عرصہ تک ایرانی زرتشتیوں کے ساتھ زندگی گزاری ہے اور ان کے مراسم و عادات کا غائر نگاہ سے مطالعہ فرماکر اپنی ایک تصنیف میں بوضاحت

---

[1] "تاریخ مناکحت انسانی" کے مصنف جلد اول ابواب پنجم و ششم میں اوگسٹائن ہیروڈوٹس - بلاڈوٹس اور دیگر ماخذ سے نقل کرتے ہیں لیڈین آرمینین - سائپرین - فنیقین - ایٹرسکین اقوام میں یہ جائز تھا کہ لڑکیاں قبل مناکحت ناجائز کسب کرکے روپیہ کمائیں -

[2] "دبستان مذاہب" مصنفہ محسن فانی - البیرونی - کتاب المعارف اور مروج الذہب وغیرہ - [3] اس قانون کے منظور ہونے کے سلسلہ میں مفصل معلومات "تاریخ پارسیان" جلد ۲ مصنفہ کارکا سے حاصل ہوسکتے ہیں -

ذکر فرمایا ہے[۵۱]۔ پروفیسر مذکور نے اپنی کتاب میں کسی جگہ بھی اس ناپاک رشتہ و رسم کے وجود کا ذکر نہیں کیا۔ اگر حقیقی بھائی بہن میں مناکحت کا دستور کسی زمانہ میں بھی ایران میں ہوتا تو یقیناً انھیں اس کا پتہ مل جاتا اور وہ درج کتاب کرتے۔

ہیرو ڈوٹس کی مذکورہ روایت کے علاوہ ایک مستند کتاب مصنفہ زنفن بھی ہے[۵۲]۔ زنفن نے واقعۂ "مراجعت دہ ہزار" کے سلسلہ میں کافی شہرت حاصل کرلی ہے[۵۳]۔ زنفن نے اپنی تصنیف میں کسی مقام پر بھی ایران کے امراء۔ رؤسا، سلاطین یا طبقۂ عام میں اس قسم کی رسم قبیح کا ذکر نہیں کیا ہے۔ بلکہ وہ لکھتا ہے کہ ملک ایران دوسرے ممالک کے برخلاف نہ محض قوانین بنا کر جرائم کا انسداد کرتا ہے بلکہ لوگوں کے اخلاق و آداب کو بھی سدھارتا ہے۔ اس ملک میں بچوں کو شروع ہی سے سخت و شدید قوانین و احکام کے ذریعہ پاکیزگی اور مذہب کا پابند بنا دیا جاتا ہے[۵۴]۔

بلاشبہ زرتشتی مذہب کے ادبیات میں لفظ خیتو دھسیدا جا بجا مرقوم ہے لیکن اس لفظ کے معنی "رشتہ داروں کے درمیان شادی" ہے۔ اس لفظ کے حقیقی معنی بتانے کے لئے ہم ایک معروف پارسی مصنف فرامجی کارکا کی عبارت نقل کرتے ہیں[۵۵]:— "اس کے اصلی معنی خود کو تفویض کردینا ہے۔ اس آخری معنی کے اعتبار سے مذہب یا خدا کے کاموں میں خود کو لگا دینا یا حوالہ کردینا ہے۔ اوستا میں اس لفظ کا استعمال اسی معنی میں کیا گیا ہے۔"

اس مسئلہ پر ایک مفصل بحث "جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی بمبئی برانچ" ۱۹۲۶ء میں کی گئی ہے۔ اس مجلہ میں ایک فاضل "داراب دستور پشوتن سنجانا" نے جو مذہباً زرتشتی ہیں "قدیم ایران میں حقیقی بھائی بہن میں شادی کا اتہام" کے عنوان سے ایک بسیط مضمون لکھا ہے جو دیکھنے کے قابل ہے۔

اب ہم دوسرے مسئلہ پر بحث کریں گے یعنی مردوں کی لاش کو دھوپ میں گدھ کے آگے رکھ دینا۔ سو اس رسم کا پتہ ہمیں پیدائش زرتشت سے قبل کے زمانہ میں ملتا ہے۔ یہ رسم اصلاح و تعلیم زرتشت سے قبل مشرق میں جاری تھی جیسا کہ خود ایک پارسی مصنف مسٹر ای۔ اس مسانی اقرار کرتے ہیں[۵۶]۔

ہیرو ڈوٹس[۵۷] کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ایرانی اس رسم سے پرہیز کرتے تھے اور بجائے اس کے کہ مردہ کو

---

۵۱ "ایران گزشتہ و امروزہ" مصنفہ پروفیسر جیکسن — ۵۲ "تعلیم بیروس" ملاحظہ ہو — ۵۳ ۴۰۱ سال قبل مسیح —
۵۴ "زینوفون" مصنفہ الکزنڈر گرانٹ صفحہ ۱۲۸ — ۵۵ تاریخ پارسیان جلد دوم صفحہ ۱۶۳ اور "زرتشتی خواتین کا مرتبہ عہد قدیم میں" مصنفہ پشوتن سنجن صفحات ۴۹-۴۸ — ۵۶ "مذہب زرتشتی" صفحہ ۲۸۴ ملاحظہ فرمایئے — ۵۷ دائرۃ المعارف برطانیہ جلد ۴ صفحہ ۸۲۳ —

زیر آسمان چھوڑ دیں اُسے دفن کیا کرتے تھے۔ اس رسم کا وجود محض پیشوایان مذہب میں تھا اور یہ اُن کی اجتہاد کی بنا پر تھا۔ عموماً ایرانی پارسی، لاش کو موم سے ڈھاک دیتے تھے۔ عہد اخمنی تک طبقۂ مُغ یا پیشوایان مذہب نے اسقدر اقتدار نہیں حاصل کیا تھا کہ عام لوگوں کو اپنی تقلید پر مجبور کرتے۔ سیروس اور دیروس[۵۱] وغیرہ سلاطین کے قبور و مقابر کی موجودگی اس بیان کی تصدیق کرتی ہے۔ لیکن خاندان اخمنی کے زوال کے بعد دین زرتشت بھی تنزل کا شکار ہوا اور عہد ساسانی میں ان پیشوایان مذہب کا اقتدار بھی بہت زیادہ بڑھ گیا[۵۲]۔ چنانچہ مُغوں نے دیگر بدعات کے ساتھ اس رسم (مردہ کو زیر آسمان کھلا چھوڑ دینا) کی پابندی بھی عام پیروان زرتشت پر لازمی قرار دیدی۔

مغربی محققین اس رسم کو میڈیا کے رہنے والوں میں ظہور زرتشت سے بہت قبل رائج بتاتے ہیں۔ ڈاکٹر دھلا لکھتے ہیں کہ[۵۳] "مُغ عناصر فطرت کو مقدس سمجھتے تھے لہذا اُن کے خیال میں زمین کو پاک رکھنا ضروری تھا" بس اسی خیال کی ماتحت اس رسم کا رواج بزور عام کیا گیا۔

مارخم[۵۴] کے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ ساسانی خاندان کے آخری تاجدار یزدگرد کی لاش اُس کے مرنے کے بعد استخر لائی گئی اور وہیں اپنے بزرگوں کے مقبرے میں سپرد خاک کی گئی[۵۵]۔ علاوہ ازیں دارلیوش کے متعلق بھی ڈاکٹر دھلا لکھتے ہیں کہ جب وہ جنگ میں مارا گیا تو اُس کی لاش ایران بھیجدی گئی یہاں وہ اپنے آبا و اجداد کے ساتھ شاہی مقبرہ میں مدفون ہوا[۵۶]۔

اس سے لازماً ہم اس نتیجہ تک پہونچتے ہیں کہ یہ رسم عہد آخر کے اوستا میں اس مرقوم عقیدہ کے باعث وجود میں آئی کہ زمین کو ناپاک نہ کرنا چاہیئے۔ زمانۂ حال کے اکثر پارسی اس رسم کو بنظر اکراہ دیکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہمیں اس رسم سے مخصوص پرخاش کی اسلئے ضرورت نہیں کہ جہاں تک اصل تعلیم مذہب کا تعلق ہے اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا ہے۔ ہم آج دیکھ رہے ہیں کہ اکثر عیسائی مردوں کے دفن کرنے کے خلاف ہیں اور جلانے کی رسم کو روز بروز ترقی دے رہے ہیں حقیقت امر یہ ہے کہ اعتقادات یا کسی مذہب کی تعلیم سے رسوم و عادات کا کوئی تعلق نہیں اور مراسم کا اختلاف زیادہ قابل اعتنا نہیں۔

اس بحث کے اختتام پر ڈاکٹر مونیر ویلیم کے خیالات (مرقومہ کتاب ہندوستانی جلد ۲ صفحہ ۶۴ ۱۸۷۸ء مطبوعہ لندن)

---

[۵۱] زینوفون لکھتا ہے کہ خود سیروس نے بھی یہ وصیت کی تھی کہ اُس کی لاش مرنے کے بعد دفن کیجائے۔ [۵۲] دائرۃ المعارف برطانیہ جلد ۲۴ صفحہ ۱۲۳ "خزینۂ مُغ" مصنفہ مولٹن صفحہ ۱۱۲ [۵۳] "شرح مذہب زردشت" صفحہ ۶۹ [۵۴] تاریخ ایران صفحہ ۴۹ [۵۵] ۱۹۳۵ء [۵۶] شرح مذہب زردشت صفحہ ۶۹

نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے وہ لکھتے ہیں — "میں یہ سوچنے پر مجبور رہا کہ جس طرح اہل یورپ پارسیوں کی رسم کو بُرا سمجھتے ہیں اسی طرح پارسی اپنے نقطۂ نگاہ سے یورپ کی مروجہ رسم دفن کو یقیناً قابل مذمت سمجھتے ہوں۔ جب اپنے مردوں کو زیر زمین مدفون کرتے ہیں تو اس خیال سے کہ صدہا کیڑے اُن جسموں پر حملہ آور ہوں گے با خوف نہیں کھاتے کیونکہ ہماری نظروں سے یہ واقعہ پوشیدہ رہتا ہے۔ اسی طرح پارسی بھی اپنے مردوں پر گدھوں کو حملہ کرتے نہیں دیکھتے اور نہ اُن کی موجودہ شریعت دیکھنے کی اجازت دیتی ہے۔ اور اُن کا یہ سوال حق بجانب ہوگا کہ حفظان صحت کے نقطۂ نظر سے کون قاعدہ زیادہ بہتر اور انسب ہے؟"

بہت ممکن ہے کہ اس رسم کو طبقۂ مغ نے کسی دوسرے خیال سے بھی رواج دیا ہو۔ ان لوگوں نے دیکھا ہوگا کہ مصری اپنے مُردے مستحکم اہرام (جو ابتک موجود ہیں) میں رکھتے اور ہندی اپنے مردے جلا دیتے ہیں اور چونکہ یہ دونوں قومیں بُت پرست و مشرک تھیں پس انھوں نے مشرکوں کی رسم سے اپنے رسوم کو مختلف کر دینے اور مطابقت نہ رکھنے کے خیال سے قدیم ایرانی رسم پر عمل کرنا شروع کر دیا ہو۔ اس رسم کی تفصیل کے لئے رسالہ تھیسوفیسٹ ماہ اگست و ستمبر ۱۹۱۲ء (مضمون شمس العلما رجمشید جی مودی) کا مطالعہ مفید ہوگا۔

المختصر وہ مضامین اور مسائل جو یہاں میں خلاف عقل اور قابل اعتراض نظر آتے ہیں اُنھیں خود پارسی بھی بُرا اور بیکار خیال کرتے ہیں اور اس لئے ان کو سامنے رکھ کر ہمیں یا کسی کو اعتراض کرنے کا حق حاصل نہیں۔

پروفیسر طاہر رضوی ام، اے — مترجم سید وجاہت حسین ام، اے

تذکرۂ معرکۂ سخن شائع ہوگیا

یہ تذکرہ اُردو زبان میں اپنی نوعیت کا بالکل پہلا تذکرہ ہے جس میں زمانۂ قدیم سے لیکر موجودہ عہد تک کے تمام مشہور شعراء فارسی و اُردو کے کلام پر جو اعتراضات کئے گئے ہیں معہ جوابات محاکمہ یکجا کر دئے گئے ہیں، فن شعر و انشاء کے شائقین کے لئے عجیب چیز ہے۔ قیمت معہ محصول ۱۲ؔ

مینیجر نگار لکھنؤ

مکتوبات نیاز

ادب و انشاء کی دُنیا میں مکتوبات نیاز وہ چیز ہیں جنکی نظیر آپ کو مل ہی نہیں سکتی۔ زبان کی صحت و پاکیزگی، طرز ادا کی بیساختگی، ادبی شوخیوں کی ملاحت اور پاکیزہ اور صرف یہ تمام باتیں بیک وقت اگر آپ کو کسی جگہ نظر آسکتی ہیں صرف "مکتوبات نیاز" میں۔ کتاب زیر طبع ہے۔ اشاعت کے بعد قیمت علاوہ محصول تین روپیہ اور اشاعت سے قبل صرف دو روپیہ۔

مینیجر نگار لکھنؤ

دیر و حرم کے قصے

جہاں آرا اور چھپتر سال

جہاں آرا بیگم شاہجہاں کی سب سے بڑی اور نہایت چہیتی بیٹی تھی۔ داراشکوہ (ولی عہد) بھی سب بہنوں میں اس کو زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ بات یہ تھی کہ وہ بڑی صائب الرائے اور روشن خیال شہزادی تھی اور ساتھ ہی ساتھ پہلو میں دل اور دل میں درد رکھتی تھی۔ اُس کی نگاہ میں سلطنت تیموریہ کے بقاو عروج کا راز اور متحدہ ہند کی قسمت کا فیصلہ اکبر کے رواداراانہ مسلک میں پنہاں تھا اور وہ سمجھتی تھی کہ خاندان تیموریہ کا چراغ اگر کوئی روشن رکھ سکتا ہے یعنی اگر اکبر کا نام لیوا کوئی ہو سکتا ہے تو وہ صرف داراشکوہ ہے۔ داراشکوہ کی جانب داری کی ایک وجہ اور بھی تھی۔ سیاسی مصلحت کی بنا پر اکبر نے شاہی خاندان کی بیٹیوں کو کسی کی زوجیت میں دینا ممنوع قرار دیا تھا۔ اس لئے خاندان مغلیہ کی شہزادیاں بالعموم ناکتخدا رکھی جاتی تھیں لیکن شاہی احکام تقاضائے فطرت کو تو مٹا نہیں سکتے، شہزادیاں لاکھ شہزادیاں ہوں پھر بھی انسان ہوتی ہیں۔ جہاں آرا بیگم کا دل محبت کی چوٹ کھائے ہوئے تھا وہ اپنے محبوب سے شادی کرنا چاہتی تھی لیکن بادشاہ کی اجازت ملنی غیر ممکن تھی۔ ایک دفعہ داراشکوہ نے جہاں آرا کی شادی نجابت خاں کے ساتھ کرنے کی تجویز شاہجہاں کے روبرو پیش کی تھی لیکن بادشاہ کسی طرح راضی نہ ہوئے۔ داراشکوہ کا خیال اس معاملہ میں مختلف تھا۔ گو جہاں آرا کو اپنے محبوب سے شادی کرنے میں دشواریاں نظر آتی تھیں تاہم اُسے یقین تھا کہ جب داراشکوہ تخت و تاج کا مالک ہوگا وہ کسی نہ کسی طرح سمجھا بجھا کر اُسے رضامند کرلے گی اس لئے جہاں آرا اور بھی داراشکوہ کی معین و مددگار تھی۔ سلطنت کے اہم مسائل میں بادشاہ اکثر اُس سے مشورہ کرتا اور ولی عہد اُسکی بات پر ہمیشہ کان دھرتا تھا۔ اُسے اپنے مرتبہ کی عظمت اور اُس کی ذمہ داریوں کا پورا احساس تھا۔ وہ زندگی کی آیندہ صور کو خندہ پیشانی سے استقبال کرنے کو تیار ہو رہی تھی اُس کی اُمیدیں اور آرزوئیں سہری بھری تھیں۔ طبیعت کی اُمنگیں ور ارمان خوش خوش نکلنے کے لئے بیچین تھے مگر انسان سوچتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ ہے۔ قدرت سے کسی کا بس نہیں چلتا۔

بادشاہ کی علالت کی خبر پھیلتے ہی ہوا کچھ ایسی بدلی کہ ملک میں طوفان برپا ہو گیا۔ بھائی بھائی اور باپ بیٹے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے نظر آنے لگے۔ شجاع، مراد اور اورنگ زیب ہر ایک "تخت یا تابوت" کا نعرہ بلند کئے ہوئے دارالسلطنت پر یلغار کر رہا تھا۔ اورنگ زیب کا وار چل گیا۔ باپ کو قید کر کے بیٹے نے تخت و تاج پر قبضہ کیا۔ داراشکوہ کچھ عرصہ سرگرداں و پریشاں مارا مارا پھرا کیا بالآخر قید اور قتل ہوا۔ انقلاب زمانہ نے جہاں داراشکوہ کو مٹایا جہاں آرا کو بھی زندہ درگور کیا۔ باپ کے ساتھ بیٹی بھی قید ہوئی۔ اُسے قید ہونے کا اتنا غم نہ تھا جتنا زندگی کے ارمانوں اور اُمنگوں کی اُس دنیا کا یک لخت مٹ جانا جو اُس نے اپنے دماغ میں بسائی تھی۔ جس جنگ میں اورنگ زیب نے داراشکوہ کو شکست دیکر دارالسلطنت پر قبضہ کیا اُسی جنگ میں جہاں آرا کا محبوب بھی اپنی دلیری اور جانبازی کا کرشمہ دکھا کر کام آیا۔ جہاں آرا کو جب یہ خبر ملی تو کلیجہ مسوس کر رہ گئی۔ دردِ دل رازِ سربستہ تھا اس لئے اُف کرنے کی بھی گنجایش نہ تھی۔ خون کے آنسو روتی لیکن چپ رہتی۔ اورنگ زیب نے داراشکوہ کا سر قلم کر کے باپ اور بہن کو تحفہ میں بھیجا۔ دیکھتے ہی زمین پاؤں کے تلے سے نکل گئی۔ کلیجہ پھٹنے لگا۔ زندگی کا آخری سہارا بھی ہاتھ سے جاتا رہا۔ جہاں آرا اب قید خانہ میں بے یار و مددگار زندگی کے دن کاٹنے لگی۔ مایوسی کے عالم میں پڑے پڑے ایک دن سوچنے لگی کہ آخر یہ ہیجان غم و اندوہ کب تک؟ دل کے بہلانے کی کچھ سبیل تو ہونی چاہیئے۔ رفتہ رفتہ اس خیال نے ارادے کی صورت اختیار کی۔ دن تو ادھر اُدھر کی باتوں میں کاٹ دیتی لیکن شام ہوتے ہی جب شمع و پروانہ کے سوز و گداز کا تماشہ آنکھوں کے سامنے ہوتا تو یہ بھی قلم ہاتھ میں لے کر اپنے دردِ محبت کے پُرلطف تصور کا نقش کھینچنے لگتی اور اس طرح طبیعت بہلاتی۔ جوں جوں طبیعت لگتی گئی محبت کی یاد نے خواب و خیال کی باتوں سے تجاوز کر کے داستان زندگی کی صورت اختیار کر لی۔ اس کے اوراق پریشاں جہاں آرا کی قید حیات سے رہائی کے بعد بھی زمین کے کسی کونے میں پڑے رہے۔ صدیوں بعد جستجو کرنے والی نگاہوں نے ان اوراق پریشاں کو قعر گمنامی سے نکالا اور داستان کو مرتب کیا۔ یہاں سے نکل کر یہ بیش بہا خزانہ یعنی فارسی کا قلمی نسخہ جس پر ذیقعدہ ۱۰۶۹ ہجری کی تاریخ درج تھی پیرس یا لندن کے عجائب خانہ میں عرصہ تک محفوظ رہا۔ چند سال کی بات ہے کہ آندریہ بتوشوں* نامے ایک فرانسیسی خاتون مشرق کی سیر و سیاحت کی غرض سے ہندوستان آئی۔ اسلامی دور کی عظمت کی یادگاریں آگرہ، فتحپور سیکری، اور دہلی میں دیکھتی ہوئی حضرت نظام الدین شاہ اولیا کی درگاہ پر پہونچی۔ کسی نے ایک قبر کی لوح کے پتھر کی طرف اشارہ کر کے دکھایا۔ اس پر شہزادی جہاں آرا بیگم کا نام

---

* The Life of a Moghul Princess by Andrea Butenschön (Routledge)

کندہ تھا۔ قبر کس مپرسی کی حالت میں زبان حال سے گویا تھی ؎

بر مزارِ ما غریباں نے چراغِ نے گُلے　　　نے پرِ پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے

یہ خاتون ابھی ابھی شاہجہاں اور ممتاز بیگم کا مزار تاج محل میں دیکھ کر آئی تھی۔ بیٹی کے مزار کی یہ کس مپرسی کی کیفیت دیکھکر حیران رہ گئی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ اس معمہ نے دلچسپی پیدا کی تحقیق و جستجو میں مصروف ہوئی۔ حسن اتفاق سے جہاں آرا کی سرگزشت کا قلمی نسخہ اس کے ہاتھ لگ گیا۔ فارسی سے غالباً فرانسیسی میں اور اب انگریزی زبان میں یہ نسخہ کتاب کی صورت میں شایع ہوا ہے۔ تاریخ کی تاریخ ہے اور فسانہ کا فسانہ۔ تاریخ کی تحقیق اور چھان بین کا نہ دماغ ہے نہ یہ موقع، البتہ جہاں آرا کی ناکام محبت اور دردِ دل کا مرقع جو خود اُس کے قلم کا کھینچا ہوا ہے اخذ کرکے اُردو کے رنگ و لباس میں ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے۔ ممکن ہے بعض چوٹ کھائے ہوئے دل اسکی قدر کریں۔ جہاں آرا بپتی یوں شروع کرتی ہے:۔

انگوری باغ میں سرِ شام چاندنی چھٹکی ہوئی ہے۔ ہرسنگھار پھول رہا ہے۔ ہلکی ہلکی ہوا کے جھونکے اُن کی مہک سے دماغ کو معطر کر رہے ہیں بجز آبشاروں کے زمزمہ کے ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی ہے اس عالم سکون میں دُلارے کی بانسری کے بول میری طبیعت کو اسی طرح بیکل کر دیتے ہیں جس طرح بندرابن کی کنجوں میں کنہیا کی بانسری رادھا کے من کو موہ لیا کرتی تھی۔ یہ عنفوان شباب کے نشہ کا سرور تھا جو بہت جلد جاتا رہا۔ اب تو دُلارے کے نقشہ کے خدوخال کا دھیان بھی یاد سے محو ہوگیا۔ مجھے اُس کی شکل بھی اچھی طرح یاد نہیں۔ لیکن پیار اور محبت کے راگ کو جس نے اور دُھن میں اُسنے چھیڑا تھا وہ من میں کچھ ایسی بس گئی کہ اُس کا سوز و گداز زندگی کا سودا ہوکر سر میں سمایا۔ وہی انگوری باغ ہے وہی سبزہ اور چمن لیکن پھولوں کی مہک اب طبیعت میں وہ مستی اور خروش پیدا نہیں کرتی۔ چاندنی اب بھی کھلی ہوئی ہے لیکن اس میں اب وہ نکھار نہیں۔ آبشاروں کا زمزمہ کانوں پر بار معلوم ہوتا ہے۔ دُلارے کی بانسری کے بولوں کی یاد بھی اب طبیعت میں گُدگُدی پیدا نہیں کرتی۔ شباب کے ساتھ شباب کی رنگ رلیاں بھی گئیں۔ ارمان اور اُمنگوں کے مٹنے کے بعد صرف حسرتیں رہگئیں۔ زندگی کی کایا پلٹ ہوچکی۔ ایک زمانہ گزر گیا۔ پھر یہ ماجرا کیا ہے کہ شباب میں محبت کی چوٹ کھایا ہوا دل آج بھی دُکھتا ہے۔ اس زخم کو تو مدتیں ہوئیں کہ مندمل ہوجانا چاہیئے تھا۔ یہ بھی کوئی بات ہے کہ عمریں گزریں کہ ساقی کے ہاتھ سے جام لے کر صرف ہونٹوں سے لگانے کی گنہگار ہوئی تھی اور کمبخت نشہ ہے کہ آج تک نہیں اُترتا ہے اُس کا سرور مجھے آج بھی ایسا ہی مست اور دیوانہ کئے ہوئے ہے کہ جیسے روز اول عہد شباب کو گزرے جُگ ہوگئے لیکن کل کی سی بات معلوم ہوتی ہے جب میں نے اپنے محبوب کو پہلے پہل دیکھا تھا۔

شہنشاہ دیوان عام میں دربار کر رہے تھے۔ راجہ اور مہاراجہ پنج ہزاری اور ہفت ہزاری سردار مجرا عرض کرنے کے بعد صف باندھے دست بستہ کھڑے تھے۔ میں محل کے جھروکہ کی جالی سے کھڑی یہ نظارہ دیکھ رہی تھی کہ راؤ راجہ نرالے بانکپن کی ادا کے ساتھ شاہی تخت کی جانب آہستہ آہستہ بڑھتا دکھائی دیا۔ اُس نے مودبانہ قدمبوسی کی اُسپر نظر پڑتے ہی مجھ پر سناٹا سا چھا گیا۔ میں نے نل کی تصویر دیکھی تھی۔ اس جوان رعنا کو دیکھتے ہی مجھے اُس کا شبہ ہوا۔ اس کا چہرہ کندن کی طرح دمک رہا تھا۔ آنکھوں میں جوانی کا سرور تھا۔ ہر ادا بتاتی تھی کہ راجپوت سورما ہے۔ ابھی نگاہیں بھی چار نہیں ہوئیں تھیں کہ اُس کا جادو مجھ پر چل گیا میں اُس کی زر خرید لونڈی تھی اور وہ میرے دل و جان کا مالک۔ وہ دن ہے اور آج میں نے پھر کسی اور پر وہ نگاہیں نہیں ڈالیں مجھے حیرت تھی کہ بڑے بڑے دیوتاؤں کو چھوڑ کر دمینتی نے نل کے گلے میں کیوں جے مال ڈالا تھا۔ اُس لمحہ میں نے محسوس کیا اور آج بھی اُسے بھولی نہیں ہوں کہ اس میں کیا راز پنہاں تھا۔ سنتی ہوں کہ میرے بھائی اورنگ زیب نے شاہی حکم صادر کیا ہے کہ گانا بجانا حرام ہے اور ارباب نشاط نے اپنے ساز و سامان کو تجہیز و تکفین کے ساتھ دفن بھی کر دیا ہے لیکن سوز محبت کا وہ راگ جس کے لئے میں زندگی بھر بےچین رہی اور اُس کی وہ دُھن اور سے جو میرے من میں سمائی ہے بغیر اپنا سماں باندھے نہیں رہ سکتے۔ یہ سوز و ساز شاہی حکم کا پابند نہیں ہو سکتا۔

میں اپنے راکھی بند بھائی کا روزانہ انتظار کیا کرتی تھی کیونکہ مجھے یقین تھا وہ آئیگا اور مجھسے ملیگا۔ جو راکھی میں نے اُسکے ہاتھ میں باندھی تھی وہ اُس کی قدر کرتا تھا اُسنے میرا ساتھ دینے اور حفاظت کرنے کا بیڑا اُٹھایا تھا۔ ایک دن جب سورج ڈوب چکا تھا اور آسمان پر تارے چھٹکنے لگے تھے سرِ شام وہ آیا۔ اُسے آتے دیکھ کر میرا دل دھڑکنے لگا میں مثمن برج میں سنگ مرمر کی جالی سے لگی ہوئی کھڑی تھی۔ اُس نے سلام کیا میں جواب دیکر بیٹھ گئی اور سر سے پاؤں تک اُس پر ایک نظر ڈالی۔ مجھے معلوم ہوتا تھا کہ میرے سامنے کوئی فرشتہ کھڑا ہے۔ بات کرنا چاہتی تھی لیکن سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کہوں ایک لمحہ کے سکوت کے بعد میں نے کہا۔

آپ تشریف لائیے۔ بڑی تکلیف کی۔

راؤ راجا۔ (مسکراتے ہوئے)۔ شہزادی آپ یہ کیا فرماتی ہیں۔ میں آپ کا غلام ہوں۔ ہمیں یاد ہے کہ شہنشاہ نے بڑے گاڑھے وقت میں ہماری مدد کی تھی اور ہم کو تباہی سے بچایا تھا۔ ہر راجپوت کے دل پر آپ کے والد ماجد کی اطاعت و وفا کا نقش جما ہوا ہے جب تک ان ہاتھوں میں تلوار کا قبضہ پکڑنے کی سکت ہے یہ ہمیشہ آپ کے ننگ و ناموس کے لئے بے نیام رہے گی۔

میں - اور خود آپ کا ننگ و ناموس ؟

راؤ راجا کے ہونٹوں سے مسکراہٹ غائب ہوگئی اور افسردہ لہجہ میں اُس نے کہا۔ سر زمین ہند زیر عتاب ہے۔ ہم نے خود اُسے اپنے ہاتھوں غارت کیا ہے۔ بھلا ہو ان برہمنوں اور چھتریوں کا جو اُس کے ننگ و ناموس مٹانے کا باعث ہوئے۔ شہزادی! آپ کی رگوں میں تو خود راجستھان کا خون دوڑتا ہے۔ آپ کو تو میواڑ کے سامرسی کا وہ قصہ یاد ہوگا جب وہ دلّی اور اجمیر کے مہاراجہ اور ہند کی راجدھانی کی سلامتی کے لئے محمود غوری کے خلاف جنگ آزما ہوا تھا۔ آدھی رات بعد پلنگ پر پڑے پڑے اُسے ایک نورانی صورت دکھائی دی اور کسی نے اُس کے کان میں کہا کہ "تیرے بعد ہندوستان ہاتھ سے نکل جائے گا" کئی سو برس ہوگئے کہ دلّی کی راجدھانی مٹ گئی اور ہند کے عروج کا آفتاب اس لئے غروب ہوگیا کہ ہم راجپوت جو اُس کے ننگ و ناموس کے محافظ تھے خود آپس میں اُس کے تخت و تاج کے لئے لڑنے لگے۔

میں -- راجپوتوں میں لڑائی تو قنوج کی راجکماری سنجوگتا کے لئے ہوئی تھی۔ راؤ راجا تمھیں یاد ہے کہ جب پرتھوی راج رن پر جا رہا تھا تو راجکماری نے اُس سے کہا تھا کہ چھتری کے لئے رن میں جان دینا امر ہونے کے برابر ہے اور جب وہ خود ستی ہوئی تو اُس کی زبان پر یہ لفظ تھے کہ -- "یہاں نہیں میں پرلوک میں اپنے سوامی سے ملوں گی" کیا تمھارا بھی عقیدہ ہے کہ جو اس دنیا میں ایک دوسرے سے ملنے کے لئے بےچین رہتے ہیں لیکن زندگی میں ان کو یہ خوشی حاصل نہیں ہوتی اُنھیں موت ملا دیتی ہے ؟

میں نے اپنے سوز محبت کے اُس راز کو جو ایک عرصہ سے میری طبیعت کو بےچین کئے ہوئے تھا اس سوال کے چند لفظوں کی تہ میں چھپانے کی کوشش کی۔ میں نے سوال ڈرتے ڈرتے کیا تھا اور جواب سننے کے لئے بیتاب تھی۔ اُس کے چہرے پر تبسم نمودار ہوا۔ میرے افسردہ دل کی کلی کھل گئی۔ اُس نے جواب میں کہا۔

شہزادی۔ چتا کی بھڑکتی ہوئی آگ انسان کی روح کو پاکیزگی نہیں بخشتی۔ نہ اس سے شانتی حاصل ہوتی ہے جس طرح گیان انسان کو سنسار کے مایا موہ سے چھٹکارا دلا کر نروان کی خوشی میسر کرتا ہے اسی طرح سے بھگتی دو قالبوں کو ایک جان بنا دیتی ہے۔ اس میں دُنیا اور عقبیٰ کی تخصیص نہیں۔

ان لفظوں نے میرے مجروح دل پر مرہم کا کام کیا۔ میں جالی سے اور قریب تر ہوگئی گویا کہ صرف یہی ایک پردہ مجھ میں اور میری خوشی میں حائل تھا۔ کاش میں اسے ہٹا دیتی۔ خوشی سے میرا بُرا حال تھا۔ لیکن اس کے چھپانے کے لئے میں نہ معلوم کیا کیا فقرے سوچ رہی تھی۔ مقدر کا لکھا کسی نے مٹایا نہیں۔ آسمان پر تارے چھٹکے ہوئے تھے

دیوان عام میں فانوس روشن تھے لیکن گانے کی آواز اب سُنائی نہ دیتی تھی صرف آبشاروں کا زمزمہ باقی تھا اسکے سوا ہر طرف خاموشی طاری تھی اور ہم دونوں آہستہ آہستہ باتوں میں مشغول تھے۔ میں آیندہ کی دقتوں کا تذکرہ کر رہی تھی اور چاہتی تھی کہ راؤ راجا سے پیمان وفا کو راستوار کراؤں۔

راؤ راجا۔ " ایک زمانہ ہوا کہ ہندوستان کا شہنشاہ اکبر تھا۔ اُس کی سلطنت ہمالہ سے دکن تک پھیلی ہوئی تھی۔ اُسکا ہمعصر رانا پرتاپ تھا گو اُس کا راج بہت محدود تھا لیکن وہ میواڑ کے سامرسی کے تخت پر بیٹھا تھا پرتاب کا عقیدہ تھا کہ اپنے ترکہ اور ورثہ کو ہاتھ سے گنوانا سامرسی کے ننگ و ناموس کو برباد کرنا ہے "

جونہی راجا نے یہ داستان پارینہ چھیڑی مجھے اپنا بچپن کا وہ زمانہ یاد آگیا جب شام کے وقت محل میں میری انا مجھے میواڑ۔ بوندی اور امیر کے دلآویز افسانے سنایا کرتی تھی۔ میں نے راؤ راجا کا قطع کلام کیا اور بے تابی سے بول اُٹھی۔

اکبر کا دادا بابر تھا جس نے سلطنت مغلیہ کی بنیاد ڈالی۔ پرتاپ رانا سانگا کا پوتا تھا جو بابر کا سب سے بڑا غنیم تھا جب بابر شکست کھا کر فرغانہ سے لوٹا تو ایک چھوٹی سی فوج سے اُس نے ابراہیم لودھی کو شکست دی اور دہلی پر قبضہ کیا اور اسی جرار فوج سے تمام راجستھان کے راجاؤں کا مقابلہ کیا۔ راجا تمھیں وہ روایت یاد ہے کہ ایک دن بابر کو سنگین خطرے کا مقابلہ تھا تو اُس نے اپنے ہوش سنبھالے۔ شراب سے توبہ کی اور سونے چاندی کے صراحی و ساغر سبھوں پر لات مار کر شراب لونڈھا دی۔ اُس کے تین سو سرداروں نے بھی اُسی کی تقلید کی اور تمام فوج جو مایوس ہو رہی تھی پھر تازہ دم ہو کر اللہ اکبر کا نعرہ بلند کرتی ہوئی فتح یا موت کے لئے تیار ہو گئی۔ رانا سانگا کی فوج کثیر تھی لیکن چونکہ وہ غافل تھا اسی لئے بابر کو فتح اور سانگا کو شکست ہوئی۔ سانگا بے پروا اور غافل کیوں رہا ؟ ۔

یہ سنکر راؤ راجا کی آنکھیں چمکنے لگیں اور اپنی نظریں میری طرف گاڑ کر بولا :۔

ہم ہندوالے مقدر کو اس حد تک گھورنے کا موقع دیتے ہیں کہ وہ بالآخر ہمیں اندھا کر دیتا ہے۔ شاید یہ غیبی آواز آخری مرتبہ چیتوڑ میں اُسوقت سُنائی دی تھی جب میواڑ کے عروج کا آفتاب نصف النہار پر تھا۔ اُس نے رانا سانگا سے کہا کہ اُسی کے قبیلے سے کوئی غدار اُس کے ننگ و ناموس پر دھبا لگائیگا۔ رانا سانگا بڑا پرتابی راجا تھا۔ اُس نے یہ معلوم کتنے رن سر کئے تھے۔ اُس کے جسم پر اسّی زخموں کے نشان تھے۔ وہ اپنی ایک آنکھ اور ایک بازو بھی تلوار کی نذر کر چکا تھا۔ میدان جنگ کے محشر کے خوف نے اُس کو کبھی آگے بڑھنے سے باز نہیں رکھا مگر مقدر کا مقابلہ وہ کیسے کر سکتا تھا۔

ہیں۔" توبہ، توبہ، راجپوت پر بزدلی کا الزام کون لگا سکتا ہے۔ مگر ہاں ہم تو اکبر اور پرتاپ کا ذکر کر رہے تھے۔ اُودا جا۔ راجستھان کے تمام راجا ایک ایک کر کے اکبر کی اطاعت قبول کر چکے تھے اور سلطنت کے رُکن سمجھے جاتے تھے۔ ان میں صرف رانا پرتاپ اکیلا ایسا تھا جس نے اپنی گردن اکبر کے سامنے نہیں جھکائی۔ چوتھائی صدی تک جنگ و جدل کا محشر برپا رہا۔ نوبت یہاں تک پہونچی کہ صرف ارادلی کی گھاٹیاں اور غار رانا پرتاپ کے لئے قلعوں کا کام دیتے تھے اور جنگل اُس کے محل تھے سونے چاندی کے تھالوں کی جگہ پتوں پر وہ کھانا کھاتا تھا اور مخمل کے گدوں اور قالینوں کی جگہ چٹائی اور گھاس پر سوتا تھا اور یہ سب اس لئے کہ اُس نے بیڑا اُٹھایا تھا کہ وہ باپا راول کی راجدھانی چتوڑ کو اکبر کے چنگل سے نکالکر آزاد کرے گا۔ ایک دن شاہی دربار میں یہ خبر آئی کہ رانا پرتاپ کے اہل و اطفال بھوکوں مر رہے ہیں اور چونکہ یہ نظارہ اُس سے دیکھا نہیں جاتا وہ اطاعت قبول کرنے کے لئے تیار ہے۔ دربار مغلیہ کے اُن تمام راجپوت راجاؤں کے چہرے جو سلطنت کے رُکن اور ستون سمجھے جاتے تھے اس خبر وحشت اثر کو سنتے ہی فق پڑ گئے کیونکہ ان کو رانا پرتاپ کی ذات پر ناز تھا لیکن یہ خبر غلط نکلی۔ رانا پرتاپ آزاد جیا اور آزاد ہی مرا۔ البتہ چتوڑ واپس لینے کی حسرت اُس کے دل میں رہگئی اور اُس کے ساتھ گئی۔ بالآخر غنیم کی یورش سے مجبور ہو کر اُس کے لڑکے نے ہار مانی اور شہزادہ خرم کے علم فتح و نصرت کے آگے میواڑ کے ارغوانی جھنڈے کو نیچا ہونا پڑا لیکن پھر بھی رانا پرتاپ کا لڑکا وہ دن دیکھنے کے لئے نہ جیا کہ اُس کا شمار بھی اراکین سلطنت مغلیہ میں ہوتا۔

راجا کی آنکھوں کی چمک اب مدہم پڑ گئی تھی۔ اُس کی آواز میں کیفیت سوز و درد تھی ایک لمحہ بعد اس نے کہا:۔

"شہزادی۔ رانی پدمنی کے محل کے اُجڑے ہوئے باغ میں آج بھی کوئلیں کوکتی ہیں۔ ان کھنڈروں میں اب بھی طوطے اور مینا چہکتے ہیں اور برسات میں مور اپنے پنکھ پھیلائے خوشی خوشی ناچتے ہیں میواڑ کی عورتیں رام اور کرشن۔ مہاویرا اور گوری کے مندروں میں آج بھی پھول چڑھانے جاتی ہیں۔ رانا کمبھ کے فتح و نصرت کا ستون اب تک آسمان سے باتیں کرتا ہے گویا اسکو چتوڑ کی تباہی کا کچھ بھی حال معلوم نہیں۔ اس کے تلے راجستھان کے بھاٹ آج تک پتا اور جے مل کے گن گاتے اور پتا کی نئی نویلی دلھن کی دلیری اور جانبازی کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ یہ وہ بیر دل دلھن تھی جو ہاتھ میں تلوار لئے فوج کی سرداری کرنے نکلی تھی اور رن میں سب سے پہلے کام آئی۔ راجپوتوں کے ننگ و ناموس کا یہ کرشمہ تھا کہ عورتیں بھی غنیم کے ہاتھوں میں پڑنا نہ چاہتی تھیں۔ رانی پدمنی کے ساتھ سیکڑوں عورتیں چتا پر چڑھ کر ستی ہو گئیں۔ قانون قدرت ہے کہ دنیا میں ہر چیز جو پھلتی پھولتی اور جیتی جاگتی ہے وہ ایک ایک

دن ضائع بھی ضرور ہوتی اور مرجاتی ہے لیکن صرف یوگی اور رشی جنگل اور کھوہ میں سمادھ لگائے میٹھا دھیان اور گیان میں مست رہتا ہے۔ اُس کی آنکھوں سے اس دنیا کے مزخرفات اور مکروہات کا پردہ اُٹھ جاتا ہے وہ باور کرنے لگتا ہے کہ دنیا کی وہ سب باتیں جنکے لئے ہم جیتے ہیں ہر طرح کے دُکھ سہتے ہیں بلکہ جان بھی دیدیتے ہیں مایا اور متھیا ہیں۔ اُس کی آنکھوں کو نور ازل نے اس طرح سے روشن کر دیا ہے کہ اب اسکو سوائے اس کے اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ وہ خواہشات اور نفسانیت پر قابو پاکر صرف اپنے جلوۂ روحانیت کے زور سے کائنات قدرت کو اپنا مطیع رکھتا ہے اور سب پر حکومت کرتا ہے۔ وہی ہمارا مالک اور بادشاہ ہے۔ اکبر نے اس اصلیت کو سمجھ لیا تھا۔ اپنے فتوحات کے دوران میں گو اُس نے بعض مندروں کو ڈھا کر مسجدیں بنائیں لیکن بالآخر اُس نے اپنی عبادت گاہ چرخ نیلگوں کے زیر سایہ ہی قائم کی اور ہر کس و ناکس کو مذہب کی آزادی دی۔ گو اُس نے ہم راجپوتوں کو تلوار کے زور سے فتح کیا لیکن ہمارے دلوں پر اپنی حکومت انسانیت اور فراخدلی سے جمائی۔ اُس نے اپنے دربار میں ہندو کو بھی وہی فضیلت اور مرتبہ دیا جو مسلمان کو۔ گو رانا پرتاپ کے دم توڑنے کے ساتھ ہی ساتھ راجپوتوں کی رہی سہی آزادی بھی مٹ گئی لیکن اکبر کے زیر سایہ انھوں نے متحدہ ہند کی عظمت کا خواب دیکھا اور اس معیار کو پیش نظر رکھنا سیکھا۔ ہم نے اگر اپنا پرانا ورثہ اور ترکہ کھویا تو ایک نئی ملکیت اور دولت بھی معاوضہ میں پائی۔ اور یقین جانئے کہ جب تک خاندان تیموریہ میں اکبر کے نام لیوا موجود ہیں اور اُس اُولوالعزم ہستی کے نقش قدم اور مسلک سے آپ کے پاؤں نہیں ڈگمگاتے ہم راجپوتوں کا جان و مال آپ پر سے نثار ہے۔ راجپوت صرف تلوار کا دھنی ہوتا ہے اور شہزادی میں اس تلوار کی جو میرے ہاتھ میں ہے قسم کھا کر کہتا ہوں کہ یہ آپ کے شہزادے دارا کے اور شہنشاہ کے ننگ و ناموس کے لئے ہر وقت و ہر لحظہ کام آئے گی اور میرا جان و مال آپ پر قربان ہوگا رہی ہند کی آزادی سو اس کو بھی ایک نہ ایک دن آنا ہے آج نہ سہی کل، کل نہ سہی پھر کبھی...

محلوں کی روشنی گل ہو چکی ہے۔ تارے آسمان پر جگمگا رہے ہیں، قلعہ کی دیوار کے نیچے دریا بہ رہا ہے میں تن تنہا چبوترے پر بیٹھی ہوں۔ گورا وُرا جا چکا ہے مجھے ہر سو اُسی کی صورت نظر آتی ہے چاروں طرف وہی دکھائی دیتا ہے اسی کی آواز میرے کانوں میں بسی ہوئی ہے اور محبت کا نشہ مجھے سرشار کئے ہوئے ہے میں اپنی جگہ سے اُٹھتی ہوں دامن میں پھول چن چن کر ڈالتی جاتی ہوں اور پھر بیٹھ کر ایک مالا گوندھتی ہوں۔ میں اس خیال میں مست ہوں کہ گویا میں اپنا سوئمبر رچانے کی تیاری کر رہی ہوں اور مجھ کو نہ صرف تمام دنیا بلکہ کل

کائنات خوش خوش نظر آتی ہے۔ دیوان عام میں شہزادوں۔ راجاؤں اور سرداروں کا دربار لگا ہوا ہے۔ میں شہنشاہ کے پہلو میں تخت طاؤس کے برابر مالا ہاتھ میں لئے بیٹھی ہوں۔ شہنشاہ کا اشارہ پاتے ہی میں اپنی جگہ سے اُٹھتی ہوں۔ تمام راجاؤں اور سرداروں پر لاپروائی سے ایک نظر ڈالتی ہوئی جہاں راؤ راجا اپنی نرالی شان اور ادا سے کھڑا ہوا ہے پہونچتی ہوں اور مسکراتے ہوئے اس کے گلے میں جے مال ڈالدیتی ہوں اور اپنی شادی کے خیال سے مست ہو جاتی ہوں۔ یہ خواب تھا جو اُس رات میں چبوترے پر بیٹھے بیٹھے دیکھا گی۔ فوراً ہی مجھ کو شیخ ابن العربی کا وہ مقولہ یاد آیا کہ جس میں اُس نے بتایا ہے کہ انسان میں اگر قوت ارادی مستحکم و مضبوط ہو تو وہ اپنے خواب و خیال کو اصلیت کا جامہ پہنا سکتا ہے۔ میں نے فوراً ہی ٹھان لی کہ میں اپنے محبوب کو نامۂ شوق لکھوں گی اور اُس کو اپنے رازدل سے ان لفظوں میں آگاہ کروں گی کہ اگر دارا کو اپنے بھائیوں پر فتح ہوئی اور وہ تخت تاج کا مالک ہوا تو پھر اکبر کے اُس قانون ورواج سے جس کی رو سے خاندان مغلیہ کی شہزادیاں زوجیت میں نہیں دیجاتیں۔ قطع نظر کر کے اس پر آمادہ ہو جائے گا کہ وہ اپنی بہن کو شادی کرنے کی اجازت دے اور چونکہ بھائی کو بہن کی خاطر منظور ہے اور بہن کا دباؤ بھائی پر کافی ہے میری شادی اُسی کے ساتھ ہوگی جسکو میں چاہتی ہوں۔

(باقی)

پنڈت کشن پرشاد کول

نگار کے گزشتہ سالوں کے پرچے

حسب ذیل قیمت پر معہ محصول مل سکتے ہیں

ستمبر ۲۲ء - ۳/ - اکتوبر - ۸/ - جنوری ۲۴ء ۸/ - فروری ۴/ - مارچ ۸/ - اپریل ۸/ - مئی ۸/ - اگست ۸/ - جنوری ۲۶ء ۴/ مئی ۴/ - جون ۳/ - اکتوبر ۳/ - نومبر ۳/ - دسمبر ۸/ - مارچ ۲۷ء ۳/ - اپریل ۶/ - مئی ۳/ - جون ۳/ - دسمبر ۲۸ء ۴/ - مارچ ۳۰ء ۸/ مئی ۶/ - ستمبر ۸/ - اکتوبر ۸/ - نومبر ۸/ - جولائی ۳۱ء ۴/ - اگست ۴/ - ستمبر ۴/ - اکتوبر ۴/ - نومبر ۴/ - دسمبر ۴/ - جنوری ۳۳ء ۱۲/ فروری ۴/ - مئی ۸/ - جولائی ۶/ - ستمبر ۸/ - اکتوبر ۶/ - دسمبر ۸/ - فروری ۳۴ء ۸/ - مارچ ۸/ - اپریل ۸/ - مئی ۸/ - جون ۸/ جولائی ۸/ - ستمبر ۸/ - اکتوبر ۸/ -

---

۳۲ء کا پورا فایل بارہ پرچوں کا تین روپیہ میں علاوہ محصول — منیجر نگار لکھنؤ

باب الانتقاد

جناب سیماب اکبرآبادی کا مجموعۂ منظومات

(بہ سلسلۂ ماہ گزشتہ)

صفحہ ۲۷ پر، لینن روسی کو مخاطب کرکے انھوں نے ایک شعر لکھا ہے :-

بیکسی کے زرد چہرہ پر خوشی کا نور تھا　　　افسرِ شاہی بساطِ محفلِ مزدور تھا

افسر تاج کو کہتے ہیں اور تاج کو (بساط) کہنا غلط تعبیر ہے۔ (بساط) میں بسط یا پھیلاؤ کا مفہوم پنہاں ہے، اسلئے (افسر) کو بساط کہنے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔

صفحہ ۳۴ پر فردوس گم شدہ کی نظم میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں :-

بے صدائے دشنۂ و نشتر سر دِ دار تھا　　　موت کی سر پنج ہے اسکے لئے آوازِ چنگ

ممکن ہے دشنہ کے استعمال کے وقت کوئی آواز پیدا ہوتی ہو، لیکن نشتر کے ساتھ لفظ (صدا) کا استعمال بالکل بے محل ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ لفظ (صدا) بہ معنی (طلب) لایا گیا ہے تو پھر دوسرے مصرعہ کے ساتھ اس کا توازن باقی نہیں رہتا کیونکہ اس میں (آوازِ چنگ) آواز ہی کے معنے میں ہے۔ علاوہ اس کے پہلے مصرعہ میں بھی (اس کے لئے) کی تکرار ضروری تھی۔

اسی نظم کا دوسرا بند شاعر نے اس دعوے کے ساتھ شروع کیا ہے کہ

عالمِ ایجاد اک مجموعۂ اضداد ہے　　　اختلافِ رنگ و بو سے انجمن آباد ہے

حالانکہ اختلافِ رنگ و بو تضاد نہیں، بلکہ تنوع ہے۔

اس کے بعد اس تضاد کی صراحت کی ہے کہ :-

باغ میں لالہ بھی ہے، گل بھی سمن بھی خار بھی　　　ایک رنگیں خامشی مُہرِ لبِ فریاد ہے

ضد نہیں آپس میں ان کو باوجودِ اختلاف　　　جانتے ہیں سب نظامِ دہر بے بنیاد ہے

پہلے شعر میں لالہ، گل و سمن میں باہم دگر کوئی تضاد نہیں۔ اگر تضاد ہے تو صرف گل و خار میں اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ صرف مصرعہ پورا کرنے کے لئے لالہ، گل اور سمن لائے گئے ورنہ اول ان کی ضرورت نہ تھی۔ یہ مصرعہ یوں بھی ہو سکتا تھا،

ایک ہی گلبن سے پیدا پھول بھی ہیں خار بھی

دوسرے مصرعہ میں (رنگینیِ خامشی) کا فقرہ لالہ و گل وغیرہ کے لئے تو لا سکتے ہیں لیکن (خار) کی خامشی میں تو کوئی رنگینی نہیں ہے۔ علاوہ اس کے مُہر لب فریاد کہنے سے یہ مفہوم ظاہر نہیں ہوتا کہ اُن میں واقعی کوئی احساس تضاد کا نہیں ہے بلکہ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ فریاد تو کرنا چاہتے ہیں لیکن کر نہیں سکتے۔

پھر آگے چلکر لکھتے ہیں :۔

رکھ لئے ہیں نام پھولوں کے ہمیں نے مختلف　　فطرت گلشن مگر اس قید سے آزاد ہے

اس شعر نے اُس دعویٰ کو بالکل رد کر دیا جو شاعر نے پہلے شعر میں کیا تھا کہ "عالم ایجاد اک مجموعۂ اضداد ہے"۔ نظم کہنے میں شعراء کی ناکامی کا اکثر سبب یہی ہوا کرتا ہے کہ وہ خود اپنے قول کے تضاد کو محسوس نہیں کرتے، اور اس طرح پوری نظم غیر مربوط و غیر متوازن اشعار کا مجموعہ ہو جایا کرتی ہے۔ صفحہ ۳۶ پر آزادی کے عنوان سے ایک نظم نظر آتی ہے۔ اس کا پہلا شعر ہے :

وہ آئی تو نسیم صد بہار و صد چمن در بر　　نشاط دو جہاں در دل حیات انجمن در بر

(صد بہار در بر) اور (صد چمن در بر) علٰحدہ علٰحدہ تو ٹھیک ہے لیکن دونوں کو ملا کر (در بر) سے ترکیب دینا مناسب نہیں علاوہ اس کے جب (صد بہار در بر) کہہ دیا تو پھر (صد چمن در بر) اول تو کوئی معنی نہیں رکھتا، کیونکہ یہ تو تنزل ہوا نہ کہ ارتقا ۔۔۔ دوسرے مصرعہ میں لفظ (در دل) بھی کھٹکتا ہے، کیونکہ (در بر) کی رعایت سے یہاں بھی کوئی ایسا لفظ لانا چاہئے تھا جو کسی محسوس شے کو ظاہر کرتا ہو اور اس لئے اگر یہ مصرعہ یوں ہوتا تو بہتر تھا۔

نوید خرمی بر لب فروغ انجمن در بر

اس نظم کا دوسرا شعر یہ ہے :۔

سیاہ و مست لمبے بال پیچ و خم سے بیگانہ　　نشیلی انکھڑیاں لیکن مذاقِ رم سے بیگانہ

پہلے مصرعہ میں (سیاہ و مست لمبے بال) کی نشست الفاظ کانوں کو بُری معلوم ہوتی ہے۔ یوں بھی کہہ سکتے تھے (وہ لمبے لمبے کالے بال) یا (وہ کالے کالے لمبے بال)۔ علاوہ اس کے (پیچ و خم سے بیگانہ) ہونا بالوں کا کوئی حسن نہیں ہے۔ شاعر کا اصل مدعا یہ ظاہر کرنا تھا کہ وہ اپنے بالوں میں کسی کو پھنسا کر ہلاک نہیں کرتی اور اسی لئے (پیچ و خم)

سے اُن کو بیگانہ ظاہر کیا گیا، لیکن یہ غور نہ کیا کہ ان الفاظ سے مفہوم میں جو تغیر پیدا ہو جاتا ہے وہ اس (حور مجسم) کی تکمیل حسن کے منافی ہے - اسی نظم کا ایک شعر اور ملاحظہ ہو:-

خلش گل کی جگر میں اور دل میں درد لالے کا　　　ادھر اک ہاتھ میں مسجد، اُدھر گنبد شوالے کا

(دل میں درد لالے کا) تو خیر لالہ کے داغدار ہونے کی وجہ سے ٹھیک ہے لیکن (خلش گل کی جگر میں) کیوں ہو۔

دوسرے مصرعہ میں عجیب بات یہ ہے کہ ہاتھ میں مسجد تو پوری دکھا دی گئی لیکن شوالہ کا صرف گنبد۔ ہر چند جزو بول کے کل مراد لینا نادرست نہیں، لیکن مسجد کا ذکر بھی اسی انداز سے کرنا چاہئے تھا۔ علاوہ اس کے مصرعہ کی ترکیب کا تقاضہ یہ تھا کہ مفہوم یوں ظاہر کیا جاتا - ادھر اک ہاتھ میں مسجد اُدھر دوسرے ہاتھ میں شوالہ - لیکن دوسرے ہاتھ کی صراحت کہیں نہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ شاعر کا مقصود یہ بتانا ہے کہ ایک ہی ہاتھ میں مسجد و شوالہ دونوں ہیں تو پھر (ادھر اور اُدھر) کی صراحت کوئی معنی نہیں رکھتی۔

اس کے بعد کا شعر ہے:-

زباں پر نغمۂ ناقوس سے تنویر کی موجیں　　　لبِ خود رنگ پر ... ہیں

ناقوس سے کوئی نغمہ پیدا نہیں ہوتا بلکہ صرف آواز یا صدا پیدا ہوتی ہے، علاوہ اس کے (زبان پر تنویر کی موجیں) کہنا بھی درست نہیں، کیونکہ (تنویر) اور (موجیں) دونوں کا اقتضا یہ ہے کہ اُن کا وجود کسی نمایاں اور کھلی ہوئی جگہ پر ظاہر کیا جائے نہ کہ زبان پر جو منھ کے اندر چھپی ہوئی رہتی ہے۔

دوسرے مصرعہ میں لفظ (خود رنگ) کے استعمال کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی سوائے اس کے کہ مصرعہ پورا کرنا تھا۔

اور ایک شعر اسی نظم کا ملاحظہ ہو:-

ہمالہ کی پری اور طور کا اک جلوۂ رعنا　　　جو اسکی اک نظر زمزم تو اسکی اک نظر گنگا

اس شعر میں سیماب صاحب نے لف و نشر غیر مرتب پیدا کرنا چاہا لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ گنگا کا تعلق ہمالہ سے ضرور ہے لیکن طور سے زمزم کا کوئی تعلق نہیں۔ علاوہ اس کے زمزم نام کنویں کا ہے اور محض زمزم بول کر اُس کا پانی کبھی مراد نہیں لیا جاتا۔ میری رائے میں اس شعر کو یوں ہونا چاہئے:-

ہمالہ کی پری اور نجد کا اک جلوۂ رعنا　　　جبیں پر آب زمزم اور بالوں میں لئے گنگا

نہ صرف ہمالہ (پہاڑ) کی رعایت بلکہ ہندوؤں کی مذہبی روایات کے لحاظ سے بھی (گنگا) کا تعلق بالوں سے زیادہ ہے۔

فضا کی وسعتوں میں اڑنے والی اک ردا پر   ادائیں تیرنے والی ہواؤں کے سمندر پر

معلوم نہیں آزادی کی پری دفعتہً رِدا کیونکر ہوگئی ۔ (اک ردا پر لئے ہوئے ہے) ہونا چاہئے تھا ۔ دوسرے مصرعہ میں غالباً اسی رِدا کو (ادائیں) کہا گیا ہے جو درست نہیں علاوہ اس کے اداؤں کا تیرنا بھی کوئی معنی نہیں رکھتا۔

تنفس میں نجات اُسکے، ترنم میں حیات اُسکے   تکلم گلستاں اس کا جلو میں کائنات اسکے

دوسرے مصرعہ میں (گلستاں) کی رعایت سے بجائے (تکلم) کے (تبسم) لکھنا چاہئے تھا ۔ علاوہ اسکے (کائنات) کی جگہ کوئی ایسا لفظ لانا چاہئے تھا جو نجات و حیات کی قبیل سے ہوتا ۔ یہ شعر یوں کر دیا جائے تو غالباً کوئی نقص باقی نہ رہے ۔

تکلم میں نشاط اسکے ترنم میں نجات اسکے   تبسم گلستاں اس کا تنفس میں حیات اُسکے

اس کے بعد کا شعر ہے :۔

سکوں برسا ہوا اس کے تبسم سے محبت کا   شگفتہ تیوروں میں موجزن دریا صداقت کا

پہلے مصرعہ میں (برسا ہوا) بجائے (برستا ہوا) کے استعمال کیا گیا ہے ۔ دوسرے مصرعہ میں (تیوروں) جمع استعمال کیا گیا ہے جو درست نہیں ۔ (تیور) میں خود جمع کا مفہوم ہے اور اساتذہ نے ہمیشہ اس کو جمع کے مفہوم میں استعمال کیا ہے ۔ داغ کا شعر ہے :۔

غیر کے آتے ہی وہ تیور نہ تھے   تم کو انھیں باتوں نے رسوا کیا

علاوہ اس کے تیور ہمیشہ خشونت و برہمی وغیرہ کے محل پر استعمال ہوتا ہے اور شگفتگی سے اُسے کوئی واسطہ نہیں ۔ یہ شعر یوں ہونا چاہئے :۔

برستا تھا سکوں اس کے تبسم سے محبت کا   جبین صاف پر تھا موجزن دریا صداقت کا

شعاع حسن لرزاں اسکے فردوسی اشاروں میں   بہار افروز پھولوں میں صباحت زیر تاروں میں

دوسرا مصرعہ پہلے سے بالکل علٰحدہ ہے ۔ کچھ پتہ نہیں چلتا کہ بہار افروز پھولوں اور صباحت ریز تاروں میں کیا چیز تھی ۔ اگر کہا جائے کہ دوسرا مصرعہ بدل واقع ہوا ہے فردوسی اشاروں کا تو مناسب یہ تھا کہ لفظ (یعنی) سے اس کی وضاحت کر دیجاتی ۔

علاوہ اس کے بجائے (لرزاں) کے اگر (پنہاں) لکھا جاتا تو زیادہ برمحل ہوتا ۔

صفحہ ۵۸ ۔   شگفت لالہ و گل اور اپنا سینۂ پُر غم

فارسی میں لفظ (شگفت) تعجب و حیرت کے معنے میں آتا ہے اور اس کا تلفظ (شِگِفت) بکسرِ (شین) ہے۔ جس مفہوم میں یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے اس کے لئے فارسی میں (شگفتگی) کا لفظ مخصوص ہے۔

صفحہ ۲۰۸ پر ایک نظم ہے جس کا عنوان چراغِ ساحل ہے اور جو چتا کی آگ کو دیکھ کر لکھی گئی ہے۔ اسکا دوسرا شعر ہے

اک جہنم تپش افشاں ہے سر مرکزِ آب　　　　ایک آتش کدہ لرزاں نظر آتا ہے مجھے

حالانکہ چراغ ساحل یا چتا کے شعلہ کو جو ہمیشہ ساحل پر نظر آتا ہے، (مرکزِ آب) سے کوئی تعلق نہیں۔

صفحہ ۲۴۹ -　　　　ہے غلط تنقید، ہمل طعنۂ بیجا ترا

لفظ (تنقید) غلط ہے۔ عربی میں نقد و انتقاد تو آتا ہے لیکن باب تفعیل میں لاکر (تنقید) کبھی استعمال نہیں کرتے۔

صفحہ ۲۱۵ : -　　　　سینۂ گل چاک ہے، غنچے کے دل میں تیر ہے

معلوم نہیں غنچہ میں وہ کیا چیز ہے جسے سیماب صاحب نے (تیر) سے تعبیر کیا ہے۔

صفحہ ۲۰۵ -　　　　دل بر آتش، بال بلب ہو دا بسر جاتا ہوں میں

(دل در آتش) چاہیئے۔

صفحہ ۱۹۹ -　　　　سینے میں ابتک روشن چراغاں

چراغاں کے ساتھ لفظ (روشن) مستعمل نہیں ہے۔ چراغاں کردن، چراغاں شدن وغیرہ تو لاتے ہیں لیکن چراغاں روشن کردن خلاف محاورہ ہے اور فارسی میں کہیں نہیں دیکھا گیا یوں ہونا چاہیئے تھا: - سینہ ہر ابتک لیکن چراغاں

صفحہ ۱۹۰ - غالب کو مخاطب کرکے کہتے ہیں

اے کہ تو راز بقا اندر فنا فہمیدہ ہے

یہ مصرعہ غالباً غالب کی دشوار پسند طبیعت کو سامنے رکھ کر لکھا گیا ہے اور شاید اس کاوش کے ساتھ کہ مفہوم سے بیگانہ رہے۔ لفظ فہمیدہ اور اس کے موجودہ صورت استعمال کے متعلق میں کیا عرض کروں، سیماب صاحب کو خود غور کرنا چاہیئے۔

صفحہ ۷۷ پر صدور ہجرت کے عنوان سے ایک نظم نظر آتی ہے اور اس میں شک نہیں کہ نہایت پاکیزہ نظم ہے لیکن افسوس ہے کہ اس کا رُخ زیبا بھی بدنما خال سے خالی نہیں - اس کا ایک شعر ہے: -

ہجرت اک تمہید ہے وصلِ دلِ مہجور کی　　　　ہجرت اک تجدید عزم طالب دستور کی

پہلے مصرعہ میں وصلِ دل بجائے تسکین دل کے استعمال ہوا ہے۔ لفظ وصل ہمیشہ اس چیز کے ساتھ ترکیب دیا جاتا ہے

جو مطلوب ہوتی ہے اور اسی لئے وصلِ دوست، وصلِ حبیب وغیرہ کی ترکیبیں استعمال ہوتی ہیں یہاں مطلوب (دلِ مہجور) نہیں ہے بلکہ اس کا سکون مطلوب ہے اور اس لئے (وصلِ دلِ مہجور) کی ترکیب نا درست ہے۔

دوسرے مصرعہ میں (عزم طلب دستور) میں ترکیب اضافی ہے اور لفظ (طلب) کو مکسور ہونا چاہئے درانحالیکہ اس کا آخری حرف یعنی (ب) ساکن پڑھا جاتا ہے۔

صفحہ ۸۲ پر ایک نظم شہید کے عنوان سے درج ہے۔ اس کا آخری شعر ملاحظہ ہو:۔

حدِ معلومہ ہستی سے گزرتا ہی نہیں   صرف اک یہ ہے وہ انسان جو مرتا ہی نہیں

پہلے مصرعہ میں لفظ معلومہ، صفت ہے لفظ (حد) کی، حالانکہ (حد) عربی میں مذکر ہے اور اس کی صفت (معلوم) ہونا چاہئے نہ کہ (معلومہ) جو مونث ہے۔ اس میں شک نہیں کہ (حد) اردو میں مونث ہے لیکن ترکیب توصیفی میں اسکی صفت تو ہمیشہ مذکر لائی جائے گی۔

صفحہ ۸۴ پر منافق کے عنوان سے ایک نظم نظر آتی ہے جس کا پہلا شعر یہ ہے:۔

منافق جس کو مارآستیں کہتے ہیں دنیا میں   وہ ہے اک خطرۂ خاموش آغوشِ تماشا میں

دوسرے مصرعہ میں (آغوشِ تماشا) کا کوئی تعلق شعر کے مفہوم سے ظاہر نہیں ہوتا۔ اگر بجائے (تماشا) کے (تمنا) کہا جاتا تو خیر یک گونہ ربط پیدا ہو سکتا تھا۔

اسی نظم کا دوسرا شعر ہے:۔

لہو پیتا ہے بنکر سانپ اخلاص ومحبت کا   وہ ڈاکو ہے، وہ غارتگر ہے انسانی شرافت کا

سانپ کا کام لہو پینا نہیں ہے بلکہ ڈسکر علٰحدہ ہو جانا ہے، البتہ اگر بجائے سانپ کے (جونک) کہا جاتا تو لہو پینا ٹھیک ہو سکتا تھا۔ ایک اور شعر ملاحظہ ہو:۔

وہ اک تنور ہے جس پر سپیدی ہو سکوں افشاں   وہ اک ناسور ہے جو ہے غلاف رنگ میں پنہاں

اول تو یہ ضروری نہیں کہ ہر تنور پر سپیدی نظر آئے اور اگر اسے تسلیم کر لیں تو بھی اس سپیدی کا (سکوں افشاں) ہونا عجیب بات ہے۔

نقص تعبیر و معنی کی ایک اور مثال ملاحظہ ہو۔ لکھتے ہیں:۔

دل اس کا مزبلہ ہے اور گندہ ہے زباں اسکی   کثافت سے ہیں آلودہ خیال آرائیاں اسکی
زباں پر کچھ ہے دل میں کچھ، نمونہ ہے دورنگی کا   خود اس کا ہر عمل شاہد ہے اسکی ظرف تنگی کا

صرف ان دو شعروں بلکہ پوری نظم میں منافق کی تصویر کھینچکر یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اس کا ظاہر و باطن یکساں نہیں ہے اور جو دل میں ہے وہ زبان پر نہیں ہے۔ لیکن اس مصرعہ میں

دل اس کا مزبلہ ہے اور گندہ ہے زباں اُسکی

بیان کا یہ التزام تمام نہ رہ سکا۔ کیونکہ یہاں دل و زبان دونوں کو گندہ دکھایا۔ اگر اس مفہوم کو یوں ادا کیا جاتا کہ — "گو زباں بظاہر صاف ہے لیکن دل اس کا مزبلہ ہے" تو بیشک درست ہو سکتا تھا علاوہ اس کے زباں اور آرائیاں ہم قافیہ نہیں ہو سکتے۔

دوسرے شعر میں (ظرف تنگی) کی ترکیب بجائے (تنگ ظرفی) کے استعمال کی گئی ہے۔ فارسی میں یوں تو (ظرف تنگ) لکھتے ہیں لیکن جب یائے مصدری کا اضافہ کر کے اسم معنی بنائیں گے تو موصوف و صفت کو اُلٹ کر علامت صفت یعنی (کسرہ) کو غائب کر دیں گے اور اسی لئے وہ (نازک بدنی) کہیں گے، (بدن نازکی) کبھی استعمال نہ کریں گے۔ (کم ظرفی، تنگ ظرفی) کہیں گے اور (ظرف کمی، ظرف تنگی) کبھی نہ بولیں گے۔ (کوتاہ آستینی) استعمال کریں گے اور (آستین کوتاہی) کبھی نہ لکھیں گے اردو میں اس قاعدہ کے خلاف صرف ایک لفظ (دست درازی) کا استعمال ہوتا ہے، لیکن فصحا ہمیشہ (دراز دستی) لکھتے ہیں۔ چنانچہ ایک اُستاد کہتا ہے:-

مطلق پتہ ملا نہ گریبانِ صبح کا کیسی دراز دستیِ شبہائے تار ہے

خود سیماب صاحب نے اسی مجموعہ میں ایک جگہ لکھا ہے:-

تپش آلودۂ حسرت سے برہم خاطری کیسی

حالانکہ (ظرف تنگی) پر قیاس کر کے انھیں (خاطر برہمی) لکھنا چاہئے تھا۔

صفحہ ۱۳۰ پر ایک نظم "دعوت غور و فکر" کے عنوان سے درج اور اچھی نظم ہے لیکن اسی نوع کے نقائص اس میں بھی نظر آتے ہیں۔ اس نظم کا دوسرا شعر ہے:-

تغیرات اور علی التواتر تصرفات اور بے محابا کمال حسن و جمال کیا ہے زوال شیب و شباب کیا ہے

پہلے مصرعہ میں اگر بجائے (تصرفات) کے (تحولات) ہوتا تو اصطلاحی رنگ پیدا ہو جاتا۔ دوسرے مصرعہ میں (زوالِ شیب و شباب) لکھا گیا ہے، درانحالیکہ شیب خود زوال کی صورت ہے، زوالِ شباب تو ٹھیک ہے لیکن زوالِ شیب کے معنے تو پھر از سر نو جوان ہو جانے کے ہیں — اسی نظم کا ایک اور شعر ملاحظہ ہو:-

یہ نغمے کیوں حشر بہ سامعہ ہیں، خمار کیوں ہے آل مستی سرود میں یہ صدا ہے کیسی نوائے چنگ و رباب کیا ہے

(حشر) کے معنے گروہ اندر گروہ جمع ہونے اور اکٹھا ہونے کے ہیں - اور سیماب صاحب کی مراد یہاں سامعہ کی بیداری ہے یا اس کا لطف اندوز ہونا اس لئے بجائے (حشر) کے (نشر) استعمال ہونا چاہئے یا (لطف)

اسی نظم کا ایک شعر اور ہے :-

یہ کیوں درخشندہ ہیں کواکب یہ آسماں کیوں ہے گردشوں میں ہے مہر میں التہاب کیسا یہ نزہت ماہتاب کیا ہے

پہلے مصرعہ میں بجائے (گردش) کے (گردشوں) استعمال کیا گیا ہے - یوں بھی لکھ سکتے تھے :-

یہ کیوں درخشندہ ہیں کواکب، فلک ہے گردش میں رات دن کیوں

دوسرے مصرعہ میں (التہاب) کی رعایت سے بجائے (یہ نزہت ماہتاب) کے (برودت ماہتاب) ہونا چاہئے اس طرح لفظ (یہ) بھی نکل جاتا جو بے ضرورت استعمال ہوا ہے -

صفحہ ۱۰۵ - ایک نظم "طور کی چوٹی پر" لکھی گئی ہے اور خوب ہے - لیکن بے اعتدالیاں اس میں بھی کہیں کہیں پائی جاتی ہیں - مثلاً ایک جگہ لکھتے ہیں :-

لگانا چاہتا ہوں سارے کوہ طور کا سرمہ

یہاں لفظ (سارے) بہت برا معلوم ہوتا ہے - بجائے اس کے (خاک) بھی لکھ سکتے تھے -

دوسرے بند کا پہلا شعر ہے :-

کلیسا میں تجھے ڈھونڈھا حرم میں بھی تجھے ڈھونڈا برہمن بنکے ہر بیت الصنم میں بھی تجھے ڈھونڈا

دوسرے مصرعہ میں لفظ (ہر) اور (بھی) کا اجتماع درست نہیں - یوں بھی ہو سکتا تھا :-

برہمن بنکے، ہاں، بیت الصنم میں بھی تجھے ڈھونڈا

اسی بند کا ایک شعر ہے :-

دفور جستجو نے کر دیا اس درجہ کاہیدہ کہ داماں نسیم صبحدم میں بھی تجھے ڈھونڈا

لفظ (کاہیدہ) کے استعمال کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی - دفور جستجو سے کاہیدگی تو پیدا ہو سکتی ہے، لیکن داماں نسیم کی جستجو کے لئے (کاہیدگی) ضروری نہیں - غالباً سیماب صاحب کا مقصود یہ ظاہر کرنا ہو کہ وہ کاہیدہ ہو کر (تنکہ) بن گئے اور پھر ہوا کے ساتھ ساتھ اڑتے پھرے - لیکن افسوس ہے کہ وہ الفاظ سے اس کو ادا نہ کر سکے -

تیسرے بند کا ایک شعر ہے :-

زمانہ ہو چکا پر شور کا ماحول خالی ہے فضائے شوق میں خاکستر قلب و جگر کر دے

پہلے مصرعہ میں لفظ (پھر) بالکل بیکار ہے، اور (ماحول) کا خالی ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ بجائے (خالی) کے (افسردہ) لکھنا چاہئے۔

دوسرے مصرعہ میں (خاکستر قلب و جگر کردے) بھی صحیح نہیں۔ محاورہ میں یوں کہیں گے کہ "قلب و جگر خاک کردے ۔ قلب و جگر کو خاکستر کردے" لیکن ترکیب اضافی کے ساتھ اس وقت تک مفہوم پورا نہیں ہو سکتا جب تک یہ نہ ظاہر کیا جائے کہ "خاکستر قلب و جگر" کو کیا کردے ۔ یہ شعر یوں ہونا چاہئے

زمانہ ہو چکا ہے طور کا ماحول افسردہ — خدایا پھر اسے معمورۂ برق و شرر کردے

صفحہ ۱۴۸

کلیسا میں بھی مجھ کو موقع تکمیل ملتی ہے — مجھے محراب کعبہ میں بھی اذن بت پرستی ہے

(موقع) کا لفظ کتنا بے موقع استعمال کیا گیا ہے۔ بجائے اس کے (فرصت) ہونا چاہئے تھا۔ جو (اذن) کی رعایت سے بھی یہاں حد درجہ موزوں ہے۔

صفحہ ۹۵ ۔ نظم "کسی کی یاد میں"

دور صبا میں اس درجہ ہوا غم مجھ کو — اب مسرت کبھی ہوتی ہے مگر کم مجھ کو

دوسرا مصرعہ بلحاظ محاورہ انداز و بیان صحیح نہیں ۔ پہلے مصرعہ کی ترکیب الفاظ کا تقاضہ یہ تھا کہ مفہوم اس طرح ظاہر کیا جاتا کہ اب اگر کبھی مسرت ہوتی بھی ہے تو بہت کم یا جلد فنا ہو جانے والی۔ لفظ (کم) تعداد و کیفیت دونوں کے لئے مستعمل ہے لیکن اس مصرعہ میں یہ لفظ (کیفیت) ظاہر کرنے کے لئے لایا گیا ہے۔ اور تعداد کا مفہوم لفظ (کبھی) سے پورا ہوتا ہے۔ اس لئے میری رائے میں شعر یوں ہونا چاہئے تھا :-

دور صبا میں اس درجہ ہوا غم مجھ کو — کہ مسرت بھی ہوتی ہے تو کم کم مجھ کو

اسی نظم کا دوسرا شعر یہ ہے :-

ہم نفس فکر خوشی کیا جو بہار آئی ہے — زندگی میں ہے فقط فرصت ماتم مجھ کو

لیکن پانچویں شعر کے پہلے مصرعہ میں "آمد بہار" کے خلاف یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ :-

ابھی خالی ہیں وہ شاخیں جو کبھی تھیں گلریز

اس نظم کا دوسرا بند پورا اصلاح طلب ہے پہلا شعر ملاحظہ ہو :-

باغباں نظم غلط سے ہے پریشان ہنوز — آشیانوں میں پرندوں کا نہیں سامان ہنوز

معلوم نہیں (نظم غلط) کس مفہوم کے لئے استعمال ہوا ہے علاوہ اس کے باغبان کی پریشانی اور آشیانوں کا سامانِ سکون سے خالی ہونا۔ ان دونوں میں کوئی ربط نہیں۔

دوسرا شعر ہے :۔

پتہ پتہ سے ہے طاری وہی ہیبت اب تک ذرہ ذرہ میں بپا ہے وہی طوفان ہنوز

پہلے مصرعہ میں بجائے (سے) کے (پہ) چاہئے اور دوسرے میں بجائے (میں) کے (سے)۔

تیسرا اور چوتھا شعر ملاحظہ ہو :۔

منزلِ اک قافلۂ نو سے پریشاں ہے ابھی قافلہ ندرتِ منزل سے ہے حیران ہنوز

عظمتِ رفتہ کے آثار کہاں ہیں پیدا غلطی خیز فضائیں ہیں پشیمان ہنوز

نہ ایک مصرعہ کا رابطہ دوسرے مصرعہ سے پایا جاتا ہے اور نہ ایک شعر دوسرے سے کوئی تعلق رکھتا ہے۔ بلکہ حقیقتاً اس کا بھی پتہ نہیں چلتا کہ شاعر کہنا کیا چاہتا ہے اور جو کہہ رہا ہے اس کا تعلق نظم کے عنوان یا سیاق و سباق سے کیا ہے (قافلۂ نو) سے کیا مراد ہے، پھر منزل کا اس سے پریشان ہوجانا اور قافلہ کا ندرتِ منزل دیکھ کر حیران رہجانا کیا معنی رکھتا ہے۔ اسی طرح دوسرے شعر میں عظمتِ رفتہ سے کس طرف اشارہ ہے اور غلطی خیز فضاؤں کی پشیمانی سے کیا ظاہر کرنا مقصود ہے۔

پانچواں شعر یہ ہے :۔

ایک بھولی ہوئی امید بر آئی ہے مگر دل افسردہ میں باقی ہیں کچھ ارمان ہنوز

پھر بند اس شعر پر ختم کیا گیا ہے :۔

کہیں گل ہے کہیں گلچیں ہے کہیں مالی ہے ابھی صدرِ چمنستاں کی جگہ خالی ہے

اول تو (بھولی ہوئی اُمید) کے متعلق یہ لکھنا چاہئے تھا کہ وہ (یاد آئی ہے) نہ یہ کہ (بر آئی ہے) علی الخصوص اسوقت جبکہ اگلے شعر میں یہ کہکر کہ (ابھی صدرِ چمنستاں کی جگہ خالی ہے) تکمیل آرزو کی طرف اس کی حسرت کا اظہار کیا گیا ہے۔ اس شعر کے دوسرے مصرعہ میں "کہیں گلچیں ہے کہیں مالی ہے" لکھا ہے، حالانکہ گلچیں، باغباں اور مالی سب ایک ہی چیز ہیں۔

صفحہ ۷۹ پر ایک نظم ہے جس کا عنوان ہے "اے چراغِ صبحِ سن" جو شاعر کی گزشتہ حسرتناک زندگی کا مرثیہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ نظم کیفیات سے لبریز ہے لیکن افسوس ہے کہ غلطیوں سے یہ بھی خالی نہیں۔

ایک بند میں اور دل کی خوش کامی اور اپنی محرومی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :۔

سرد ہے وہ انجمن جو تھی حق و باطل فروش ۔۔۔ لیگئے حصہ بقدرِ ذوق و قسمت دل فروش
عیشِ منزل ہے رہینِ ظلمت و بے رونقی ۔۔۔ ہوگیا نظروں سے پوشیدہ مہِ منزل فروش
کون ہے اب کس سے سودائے محبت کیجئے ۔۔۔ آہ، باقی ہے وہ محفل اور نہ وہ محفل فروش
جنسِ من صرفِ حریفاں شد خریداری کجا ۔۔۔ یوسفم ہمراہ گرگاں، گرم بازاری کجا

سیماب صاحب فارسی ترکیبوں کے استعمال میں اکثر جادۂ اعتدال سے ہٹ جاتے ہیں اور الفاظ و ترکیب کی ظاہری خوشنمائی سے اسدرجہ متاثر ہو جاتے ہیں کہ مفہوم کی طرف ان کی نگاہ جاتی ہی نہیں۔ پہلے شعر میں انجمن کی صفت (حق و باطل فروش) ظاہر کی ہے۔ فروختن یا فروشیدن کے معنے بیچنے کے ہیں اور فارسی میں ظاہر کرنے کے معنے میں بھی اس کا استعمال ہوتا ہے۔ میرزا صائب کا شعر ہے :۔

ساکنانِ حرم از قبلہ نما آزادند ۔۔۔ رہنمائی بہ من اے خضرِ بیاباں مفروش

ظاہر ہے کہ (حق و باطل فروش) یہاں بھی اسی دوسرے معنے میں استعمال ہوا ہے اور مصرعہ کا مفہوم صرف یہ ہو سکتا ہے کہ "وہ انجمن جو حق و باطل کی ظاہر کر دینے والی تھی اب سرد ہے" لیکن شاعر نے قبل و بعد، دستورِ انجمن کی جو کیفیت ظاہر کی ہے وہ یہ ہے کہ اغیار و حریف تو کامیاب ہوگئے لیکن وہ ناکام رہا۔ اس لئے اس کا کھلا ہوا نتیجہ یہ نکلیگا کہ شاعر کا دعوائے محبت باطل تھا اور اغیار کا حق، حالانکہ ٹیپ کے شعر میں وہ انھیں (گرگ) ظاہر کرکے اُن کے باطل ہونے کو ثابت کرتا ہے۔ یہ ہے وہ تضادِ معنوی جو اکثر فارسی ترکیبوں کے دلدادہ شاعروں کے کلام میں پایا جاتا ہے۔ اسی طرح دوسرے مصرعہ میں اپنے حریفوں کو شاعر نے "دل فروش" ظاہر کیا ہے جو شاید اس کے نزدیک بُری چیز ہے، درانحالیکہ ایک عاشق کا پہلا کام یہی ہوتا ہے۔

دوسرے شعر کا معنوی نقص ملاحظہ ہو :۔

پہلے مصرعہ میں تو یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ صرف عیشِ منزل مفقود ہے اور دوسرے مصرعہ میں "مہِ منزل فروش" کی پوشیدگی دکھا کر، منزل ہی کو غائب کر دیا گیا ہے۔ علاوہ اس کے (عیشِ منزل) کا رہینِ ظلمت و بے رونقی ہونا صحیح نہیں۔ منزل کو بے رونق کہہ سکتے ہیں نہ کہ (عیش) کو ۔۔۔ "شاعرِ امروز" کے عنوان سے ایک نظم صفحہ ۱۱ پر نظر آتی ہے۔ اس میں سیماب صاحب شعرائے موجودہ کو مخاطب کرکے دریافت فرماتے ہیں۔

حشر اُٹھایا ہے کبھی اک نغمۂ بیتاب سے ۔۔۔ کیا ربابِ دل کو چھیڑا ہے کبھی مضراب سے

کیا کسی کا دل پسیجا ہے ترے افکار سے   کیا کبھی شعلے تراشے ہیں لبِ گفتار سے

پہلے شعر میں لفظ (اک) زاید ہے اور (ربابِ دل) کے چھیڑنے کے لئے مضراب بھی کوئی خاص ہونا چاہئے مثلاً مضرابِ احساس، مضرابِ تاثر۔ محض مضراب بالکل غلط ہے۔

دوسرے شعر میں لبِ گفتار سے شعلہ تراشنے کی بدعت بھی پسندیدہ نہیں۔ لب سے شعلوں کی تراوش ہو سکتی ہے لیکن تراشنا لبوں کا کام نہیں۔ آگے چلکر چند سوال اور کرتے ہیں:۔

کیا میسر ہیں تجھے انگڑائیاں تخیل کی   کیا صدا تو نے سُنی ہے شہپرِ جبریل کی

شام کی تصویر کھینچی ہے سحر کے نور سے   تجھ کو آئی ہے کبھی بوئے کفن کافور سے

لرزشِ شبنم سے پھولوں کے ورق پر تو نے کیا   طرح کا مصرعہ کوئی دیکھا کبھی لکھا ہوا

پردۂ اسرار کی محرم ہے کیا تیری نگاہ   کیا نظر آتی ہے ہر ذرہ میں تجھ کو ایک راہ

پہلے شعر میں "تخیل کی انگڑائیاں" بالکل بے معنی بات ہے اور دوسرے مصرعہ سے پہلے مصرعہ کا کوئی تعلق نہیں۔ لیکن اگر دونوں کے باہم مربوط ہونے پر اصرار کیا جائے تو یہ معنی ہوں گے کہ تخیل کی انگڑائیوں کو شاعر نے شہپرِ جبریل کی صدا سے تعبیر کیا ہے، درانحالیکہ بالِ جبریل سے پیدا ہونے والی آواز کو تخیل کی انگڑائی کہنا حقیقتاً اس کی توہین ہے

دوسرے شعر کے بھی دونوں مصرعے دولخت ہیں علاوہ اس کے شاعر کے اصل مدعا سے بھی یہ شعر بالکل الگ ہے۔ سحر کے نور سے شام کی تصویر کھینچنا تو کوئی قابلِ فخر بات نہیں۔ البتہ اگر سوادِ شام سے سحر کا نور پیدا کیا جائے تو بیشک یہ ایک کارنامہ ہو سکتا ہے۔ اسی طرح کافور سے بوئے کفن کا احساس بھی کسی ذہنی علو یا بلند باقی ارتقا کو ظاہر نہیں کرتا، بلکہ ایک متشائم کیفیت کا اظہار ہے، جس کو سیماب صاحب پسند نہیں کرتے۔

تیسرے شعر میں لفظ (طرح) بالکل بیکار ہے اور اس تخصیص کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی ـــــ یہ مصرع یوں ہوتا تو بہتر تھا:۔

مصرعِ ترکبھی کوئی دیکھا کبھی لکھا ہوا   یا   مصرعِ تازہ کوئی دیکھا کبھی لکھا ہوا

شبنم اور پھول کی رعایت سے مصرعِ تر یا مصرعۂ تازہ زیادہ موزوں ہے۔

چوتھے شعر میں دریافت فرماتے ہیں کہ "کیا ہر ذرہ میں تجھ کو ایک راہ نظر آتی ہے" حالانکہ (ذرہ میں) کوئی راہ نظر نہیں آسکتی البتہ وہ کسی راہ کی طرف رہنمائی ضرور کر سکتا ہے ـــــ یہ مصرعہ یوں ہونا

چاہیے :- کیا نظر آئے ہیں ذروں میں کبھی خورشید وماہ

اسی نظم میں ایک جگہ وہ لکھتے ہیں :-

میں ترے، پھپکے ہوئے جذبات کا قایل نہیں

(پھپکنا) درختوں کے نشو و نما کے لئے استعمال ہوتا ہے اور جسم پر آبلے وغیرہ پڑ جاتے ہیں تو اسوقت بھی (پھپکنا) بولتے ہیں، لیکن جذبات کے ساتھ اس کا استعمال اچھا نہیں معلوم ہوتا - علاوہ اس کے معناً یہ نقص ہے کہ اگر "شاعر امروز" کے جذبات واقعی اتنے گرم ہیں کہ وہ پھپک اُٹھے ہیں تو یہ دلیل گرمی جذبات کی ہے نہ کہ ان کی افسردگی کی، اور اس صورت میں "شاعر امروز" پر الزام کیا عاید ہو سکتا ہے -

صفحہ ۱۲۲ — نظم "آئینۂ افق"

کیا خبر سینے میں پیوست ہیں کتنے نشتر خون رِستا نظر آتا ہے رگ جاں سے مجھے

پہلے مصرعہ کا انداز بیان ظاہر کرتا ہے کہ بہت سے نشتر سینے میں پیوست ہیں، لیکن دوسرے مصرعہ میں اسکا نتیجہ صرف خون کا رِسنا ظاہر کیا ہے - اس صورت میں خون رِسنا چاہئے یا اس کو بہ نکلنا چاہئے -

پھول سے ملتی ہے اک تلخ شراب انجام پھانس ہوتی ہے عطا خار بیاباں سے مجھے

پہلا مصرعہ بالکل بے معنی ہے اور پھول سے انجام کی تلخ شراب، کا ملنا کوئی مفہوم نہیں رکھتا - دوسرے مصرعہ سے بھی کوئی خاص معنی پیدا نہیں کئے گئے، خار بیاباں سے پھانس عطا نہ ہوئی تو کیا پھولوں کی سیج ملے گی -

اسی نظم کے چند اور اشعار ملاحظہ ہوں :-

بیخودی میں جو کبھی بس نے جھکالیں نظریں موت نے چھیڑ دیا گور غریباں سے مجھے

رات کا ایک وہ حصہ جو سحر تک ہو سیاہ ایک انبار اندھیرے کا مہیب و ویراں

زندگی کی نہیں ضو ریز کہیں چنگاری صرف ہے راکھ کا اک ڈھیر فضا میں لرزاں

پہلے شعر کا دوسرا مصرعہ بالکل بے معنی ہے - معلوم نہیں سیاب صاحب نے کیا مفہوم ظاہر کرنا چاہا ہے ہر لفظ دوسرے سے علیحدہ ہے اور (چھیڑ دینے) کا محاورہ یہاں بالکل غلط استعمال کیا گیا ہے -

اسی طرح دوسرے شعر کا پہلا مصرعہ مہمل ہے اور "اندھیرے کا انبار" بھی نہایت ناگوار بدعت ہے - تیسرے شعر میں راکھ کے ڈھیر کو فضا میں لرزاں دکھایا گیا ہے - حالانکہ خود لفظ (ڈھیر) اس کا مقتضی ہے کہ اس کو ایک جگہ قایم و غیر لرزاں دکھایا جائے -

اس کے بعد ایک نظم "نقص ہستی" کے عنوان سے نظر آتی ہے۔ اس کے نقائص بھی دیکھ لیجئے:۔
اس نظم میں یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ قدرت نے انسان کو فانی بنایا۔ درانحالیکہ انسان کی خواہش یہ ہے کہ وہ فانی نہ ہو اور اسی کے ساتھ خدا یا فطرت کو مخاطب کر کے یہ شکایت بھی کی گئی ہے کہ اگر انسان کی اس خواہش کو پورا کر دیا جاتا تو کیا حرج تھا۔ "خالق ہستی" کو مخاطب کر کے شاعر دریافت کرتا ہے کہ:۔

حریص اسد رجہ فطرت کیوں ہوئی تخلیق انساں پر　　نہ تھی جب خود ہوس اس کو نشاطِ زندگانی کی

پہلے مصرعہ میں لفظ (حریص) اور (اسد رجہ) دونوں بے محل استعمال کئے گئے ہیں کیونکہ اس شعر سے پہلے فطرت کی شدتِ حرص تخلیق ظاہر کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ اسی طرح دوسرے مصرعہ میں (ہوس اُسکو) کا استعمال صحیح نہیں کیونکہ نشاطِ زندگانی کی ہوس انسان کو ہے نہ کہ فطرت کو اس لئے میری رائے میں یہ شعر یوں ہونا چاہئے:۔

ضرورت کیا تھی فطرت کو کہ وہ پیدا کرے انساں　　نہ تھی جب قدر خود اسکو نشاطِ زندگانی کی

اسی بند میں ٹیپ کا شعر ملاحظہ ہو:۔

چو فطرت آشنائے جرعۂ آبِ بقا کردی　　زیک جام بقا لب تشنۂ صد میکدہ کردی

پہلے مصرعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو جرعۂ آب بقا مل گیا۔ درانحالیکہ اس سے قبل اسکے فانی ہونے پر سر دھنا جا رہا تھا دوسرے مصرعہ سے کوئی مفہوم پیدا نہیں ہوتا اور بالکل سمجھ میں نہیں آتا کہ جام بقا پانے کے بعد انسان (لب تشنۂ صد میکدہ) کیونکر ہو سکتا ہے۔ اگر بے نیاز میکدہ کہا جاتا تو خیر ایک بات تھی۔ یہ شعر یوں ہونا چاہئے:۔

مرا نا آشنائے جرعۂ آبِ بقا کردی　　چہا کردی کہ زیں سو تشنۂ صد میکدہ کردی

دوسرے بند کے دوسرے شعر میں یہ خواہش ظاہر کی جاتی ہے کہ:۔

مجسم ہو کے نتی بار یابی تیری محفل میں

لیکن چوتھے شعر میں جسمانیت کو غائب کر کے اظہار خیال یوں کیا جاتا ہے کہ ۔

ہم اک لمحہ میں مثل روح تیرے پاس آ جاتے

تیسرے بند کا ایک شعر ہے:۔

زمیں پر عرش سے آنا زمیں سے قبر تک جانا　　یقیناً موت بعد موت ہستی بعد ہستی ہے

زمین پر عرش سے آنا موت نہیں ہے کہ زمیں سے قبر تک جانا (موت بعد موت) کہا جائے۔ ٹیپ کا شعر ملاحظہ ہو:۔

شکایت نقص ہستی می کند عزم تلافی کن　　قوانین فنا را جذب الطاف اضافی کن

فارسیت کے لحاظ سے تو خیر یہ شعر جتنا گرا ہوا ہے محتاج بیان نہیں۔ لیکن معنوی حیثیت سے بھی اسکا دوسرا مصرعہ مہمل ہے اور (الطاف اضافی) بالکل بے معنی ترکیب ہے۔

(باقی)

مکتوبات نیاز

شفیق محترم — برسوں گرامی نامہ ملا - اور ہر چند آپ نے اس کا جواب بہ واپسی ڈاک طلب فرمایا تھا لیکن افسوس ہے کہ اسوقت سے پہلے مجھے جواب دینے کی فرصت نہ مل سکی - معذرت خواہ ہوں -

غالبًا اس امر کے اظہار کی ضرورت نہیں کہ جس حد تک سوال صرف تعمیل ارشاد کا ہے، مجھے کیا عذر ہو سکتا ہے، لیکن اگر بحث مصلحت اور طلب رائے کی آپڑی تو یقینًا اس باب میں آپ مجھے اپنا ہمنوا نہ پائیں گے۔

آپ کا یہ فرمانا بالکل درست ہے کہ دنیا میں آہن کا جواب آہن ہی سے دیا جا سکتا ہے میں خود علاج بالمثل کا بڑا حامی ہوں - لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی جانتا ہوں کہ فطرت خود کسی خاص اُصول کی پابند نہیں ہے اور اس لئے انبائے فطرت کے سامنے کبھی کبھی ایسی صورتیں آجاتی ہیں کہ جی تو چاہتا ہے تلوار کھینچکر سامنے آجانے کو لیکن کار برآری ہوتی ہے سپر ڈالدینے سے -

اس میں شک نہیں کہ آپ کو جو تکلیف پہونچائی گئی ہے اس کا اقتضا یہی ہے کہ انتقام لیا جائے، اور میں بھی یہی چاہتا ہوں، فرق یہ ہے کہ آپ انتقام لینا چاہتے ہیں اُسی ادنیٰ سطح پر آکر جو حریف نے اختیار کی تھی اور میں چاہتا ہوں کہ آپ اپنی بلندی فطرت سے ایک انچ نیچے نہ اُتریں -

آپ کے احساس خودداری کو جو صدمہ پہونچایا گیا ہے اس کا جواب یہی ہو سکتا ہے کہ دوسرے کے وقار نفس کا خون کر دیا جائے - لیکن جب اس کا ضمیر ہی مُردہ ہو تو کیا صرف جسمانی آزار یا صعوبت قید و بند سے تلافی ممکن ہے -

لیکن اگر اس کے بعد بھی آپ کو اصرار ہو تو میں تعمیل فرمان کے لئے طیار ہوں - مسودہ بھجوا دیجئے میں کسی ہوشیار وکیل سے مشورہ کر کے استغاثہ دائر کرا دوں گا -

---

اللہ، اللہ، آپ اپنا شمار بھی ان لوگوں میں کرتے ہیں کہ " نہ آئیں تو بلائے نہ بنے " کیوں پاگل ہوئے ہو — کیوں تماشہ بننا چاہتے ہو — وہ منظر کبھی دیکھا ہے جب کتاں کتاں جانور کو مدہ

کی طرف لیجاتے ہیں ——— بس سمجھ لو کہ یہی حشر تمھارا ہونا ہے -

اس لئے اگر خیریت چاہتے ہو، تو بے چون وچرا، چپکے کان دبائے ہوئے کل ٹھیک ۷ بجے شام کو یہاں پہونچ جاؤ ورنہ

تو دانی خرقۂ پشمینہ داری

خط کیا، "واسوخت" ملی - تم پر رحم بھی آیا اور غصہ بھی - غصہ اس لئے کہ میرا کہنا تم نے نہ سُنا، اور وہاں کی آمد و رفت ترک نہ کی - رحم اس لئے کہ جن نگاہوں کا یہ عالم ہو

کہ اندر دل حرم می زنند قافلہ را

ان کے نزدیک تمھاری حقیقت ہی کیا ہے اور جو تباہیاں بھی تم پر نازل کریں کم ہیں - میں نے پہلے ہی تم کو سمجھا دیا تھا کہ انسان بعض اوقات خود اپنی صداقت سے بھی دھوکا کھا جاتا ہے اور آخر کار وہی ہوا — تم کو اپنے خلوص پر اعتماد، اُدھر نمائش بے تعلقی میں محبت کا رنگ — تم کیا کوئی فرشتہ ہوتا تو وہ بھی اپنی جان سلامت نہ لے آتا - ہاروت و ماروت کی مثال سامنے موجود ہی ہے - اس لئے اب یہ شور و واویلا کیسا؟

محبت میں دل کی سب سے بڑی قربانی یہ نہیں ہے کہ وہ اپنے آپ کو زخمی کر لیتا ہے بلکہ یہ کہ وہ اندمالِ جراحت بھی نہیں چاہتا -

نخورد زخم دراں کوچہ کہ مرہم باشد

ہوش میں آؤ، اب بچے نہیں ہو نام خدا جوانی آئی ہے اور دیوانہ وار آئی ہے، تمھارا دل خون نہ ہوگا تو کیا تمھارے دشمنوں کا ہوگا -

اب کہ ہاتھ پاؤں کانٹوں سے مجروح ہیں میں بھی یاد آرہا ہوں، وطن کی یاد بھی ستا رہی ہے — لیکن جب پھولوں کی سیج پر ہوگے تو میں کیا خدا بھی یاد نہ آئے گا -

کیوں گھبراتے ہو، بادل آئے ہیں تو نکل بھی جائیں گے، آج زیادہ نہ روگے تو کل زیادہ ہنسوگے کیونکر

استغفراللہ، تم نے بھی عجیب مذاق کیا — کل آپ کا خط لیکر وہ تشریف لائے اور اس تکلف و تضع کے ساتھ کہ اب کیا کہوں -

آنکھوں میں سرمہ دنبالہ دار، ہونٹوں پر مسّی، کھلے کی بہار، گالوں پر غازہ، ابروؤں پر وسمہ، پنڈلیوں میں چپھا ہوا تنگ پاجامہ، پاؤں میں وصلی کا زرکار جوتہ، تنزیب کی تنگ اچکن، نیچے جامدانی کے کرتہ کی پھبن بس یوں سمجھ لو

بہ تنش پیراہن گل تنگ بود

بیٹھتے ہی کلام کی فرمایش کی، مدعا یہ تھا کہ میں فرمایش کردں۔ بس پھر کیا تھا۔ یوں سمجھ لو کہ ۶ بجے شام سے آدھی رات تک جسمانی و روحانی کوئی اذیت ایسی نہ تھی جو اُٹھا رکھی گئی ہو۔ اخلاقاً پہلے تو دو چار غزلوں کی داد بھی دے دی، لیکن اس کے بعد جب زبان نے یارا نہ دیا تو خاموش ہو گیا، لیکن وہاں تو یہ عالم تھا گویا سیلاب کے بند ٹوٹ گیا ہے اور دنیا کی کوئی قوت اس کو روک نہیں سکتی۔

خدا خدا کر کے جب بارہ بجے یہ دورہ ختم ہوا تو فرماتے کیا ہیں اجازت ہو تو صبح پھر حاضر ہوں۔ میں نے کہا کیوں آپ کا گھر ہے جب مزاج میں آئے تشریف لائیے، لیکن کل صبح میں ایک نہایت ضروری کام سے آگرہ جا رہا ہوں۔ فرمانے لگے، خیر کوئی حرج نہیں میں صبح حاضری ضرور دوں گا کیونکہ ممکن ہے کسی وجہ سے یہ سفر ملتوی ہو جائے۔ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ میں اُن کے جانے کے بعد ہی فوراً اسٹیشن چلا آیا اور یہیں سے یہ خط لکھ رہا ہوں۔ دیکھوں کب تک خارج البلد رہنا پڑتا ہے۔ خدا کے لئے کچھ بتاؤ کہ یہ کون ہیں، کیا یہ تمہارے پاس کیونکر پہونچ گئے کہ یہ بلا تم نے میرے سر پر مسلط کر دی۔

مطاعی الاعز،

اس میں شک نہیں کہ آپ سے زیادہ محبت کرنے والا مجھے اور کوئی نہیں مل سکتا، یہ بھی درست ہے کہ دنیا کی ہر آسایش میرے لئے آپ کے یہاں مہیا تھی اور قولاً و فعلاً ہر قسم کی آزادی مجھے میسر۔ لیکن اب کیا کہوں کہ مجھے وہاں کیا وحشت تھی اور میرے لئے وہاں ٹھہرنا کیوں دشوار ہو گیا۔ آہ،

کس چہ می داند کہ در بزم تو غمنا کم چرا

آقائے محترم،

دُنیا میں ظلم و ستم کی تباہکاریاں اتنی شدید نہیں ہیں، جتنی لطف و کرم کی ہیں۔ اس کے انتقام کے لئے تو آستینیں چڑھائی جا سکتی ہیں، لیکن اس کا علاج سوائے سر جھکا کر خاموش رہ جانے کے اور کچھ نہیں۔ پھر

غور فرمائیے کہ میں کب تک اپنے دل کا خون کرتا رہتا اور آپ کو کیونکر سمجھا سکتا کہ مجھ میں اب تاب تحمل باقی نہیں۔ علاوہ اس کے ایک بات اور بھی تھی جو بالکل میرے ضمیر کے خلاف آپ کا دل دُکھانے پر مجبور کر رہی تھی اور اگر شاید دو دن اور میں وہاں رہجاتا، تو آج آپ کو منھ دکھانے کے قابل بھی نہ رہتا۔

بہرحال آپ کا ممنون احسان ہوں اور جب تک زندہ ہوں اس کا اعتراف کرتا رہوں گا۔ لیکن اب آپکے پاس آکر قیام کرنا بالکل ناممکن ہے۔ امید ہے کہ اس سے زیادہ تفصیل پر آپ مجھے مجبور نہ کریں گے، کیونکہ اس کا نتیجہ صرف یہ ہوگا کہ میں بالکل خاموش ہوجاؤنگا اور پھر آپ کو اور زیادہ شکایت پیدا ہوجائے گی۔ خدا حافظ

بعض کتابوں کی رعایتی قیمت صرف خریداران نگار کے لئے

نام کتاب	اصلی قیمت	رعایتی قیمت	نام کتاب	اصلی قیمت	رعایتی قیمت
نگارستان (نیاز فتحپوری)	عا/	عہ۸/	فراست التحریر	عہ/	۸/
جمالستان (نیاز فتحپوری)	للعہ/	سہ/	شاعر کا انجام (نیاز فتحپوری)	۱۰/	۸/
ترغیبات جنسی (نیاز فتحپوری)	سے/	عا/	فلسفۂ مذہب	عہ/	۸/
مجموعۂ استفسار و جواب (نیاز فتحپوری)	سے/	عا/	لالہ رخ	سہ/	[illegible]
حکمائے قدیم کے ساتھ چند گھنٹے (نیاز فتحپوری)	عہ/	۸/	مثنوی زہر عشق معہ تصاویر و مقدمہ	عہ۸/	عہ/
نگارشات نیاز (نیاز فتحپوری)	۱۲/	۶/	فلسفۂ شوپنہار	عہ۸/	عہ/
جذبات بھاشا (نیاز فتحپوری)	۱۲/	۶/	منچلے	۸/	۴/
فراست الید نیاز فتحپوری)	عہ/	۸/	گلابی اردو	۶/	۴/

(۱) محصول ڈاک ذمہ خریدار ہوگا لیکن تمام کتابیں ساتھ طلب کرنے پر محصول ڈاک بھی نہیں لیا جائے گا
(۲) یہ رعایت صرف خریداران نگار کے لئے ہے اس لئے ان کو اپنا نمبر خریداری بھی درج کرنا چاہئے
(۳) یہ رعایتی قیمت صرف اخیر جون ۳۵ء تک ہے، اسکے بعد شاید اس سے فایدہ اٹھانے کا موقعہ نہ رہے ۔ منیجر نگار لکھنؤ

لکھنؤ کی داستان گوئی

دنیا میں کوئی مہذب ملک ایسا نہیں جہاں علم و ادب اور تہذیب زبان کی ترقی محاکات اور قصص سے نہوئی ہو اسی لئے مہذب ملک میں آپ کو محاکات کے پرستار ملیں گے اور جس ملک کے جسقدر اقتدار وسیع ہونگے اسیقدر اس کے قصص و حکایات میں ترقی نظر آئے گی۔ بات یہ ہے کہ علم ادب قصص اور محاکات ہی سے ترقی پاتا ہے اور جب کسی ملک میں تمدن پیدا کرنا ہوتا ہے تو ملک کے نامور لوگ دوسری زبان اور دوسرے ملک کے قصے اپنی زبان میں ترجمہ کرکے ملک کو متمدن بناتے ہیں۔

ہندوستان میں داستان گوئی کا رواج کب سے ہوا۔ اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اکبر کے زمانہ میں ناچ گانے، ستار اور مردنگ کا رواج کتھا میں بھی بہت ہو گیا تھا اور ہندؤں کی عورتیں بھی کتھا میں شامل ہوتی تھیں لیکن اہل اسلام کی کوئی سوسائٹی کوئی تماشہ گاہ شہر میں ایسا نہ تھا جہاں وہ بیٹھ کر دل بہلائیں علاوہ اس کے بھاکا زبان سے ان کو دلچسپی بھی نہ تھی اس لئے صرف عورتوں کا مجمع دیکھ کر وہ بھی چلے جاتے تھے، اس بات کو فیضی نے محسوس کیا اور ایک طویل داستان اہل اسلام کی فارسی میں لکھی جسے بہت مقبولیت حاصل ہوئی، اسی سلسلہ میں فیضی نے بھی داستانیں لکھنا شروع کیں اور سب سے اخیر میں میر محمد تقی خیال نے کتاب بوستان خیال سات جلدوں میں تصنیف کی جس کی قبولیت کا حال سب کو معلوم ہے۔ جب اردو زیادہ رائج ہوئی تو سب سے پہلے فیضی کی تصنیف داستان امیر حمزہ اردو میں ترجمہ ہوئی اس کے بعد بوستان خیال کا ترجمہ خواجہ بدرالدین عرف خواجہ امان دہلوی نے کیا۔

سب سے پہلے مرزا طور نے داستان گوئی کے فن میں اصلاح کی اور جو غیر فصیح الفاظ داستان گوؤں کی زبان پر جاری تھے ان کو نکالا، لکھنؤ میں سب سے زیادہ مشہور داستان گو بڑے منشی (میر فدا علی) تھے جو اشعار کا استعمال کثرت سے کرتے تھے اس کے بعد چھوٹے منشی نے خوب نام پیدا کیا۔

نواب ہادی علی خاں شہزادہ نیشاپوری بھی نہایت اچھے داستان گو تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اُن سے زیادہ فصیح و بلیغ داستان کہنے والا کوئی دوسرا نہ تھا۔

امیر خاں وزیر باغ کی کوٹھی میں بارہ مہینے شہزادہ ایرج کا حال سُنایا کرتے تھے ہر پندرھ کو ان کی داستان ہوا کرتی تھی۔ حیدری کے امام باڑہ میں بھی ہمیشہ داستان سُنائی جاتی تھی۔ ایک نواب صاحب تھے چھڑ بنا کا ٹوا سے لئے ہوئے آتے تھے اور نواب آغا حیدر افسوس آغا میر کی ڈیوڑھی پر داستان سنایا کرتے تھے سُنا ہے کہ لکھنؤ میں کوئی شخص امبکا پرشاد کایستھ تھے، ان کا حافظہ بہت اچھا تھا، نواب یوسف علی خاں ناظم والی رامپور کے داستان گویوں میں ملازم تھے اور نواب کلب علی خاں عرش آشیاں کے عہد تک ملازم رہے، ایک مرتبہ کسی طلسم کا بیان ختم کئے بغیر نواب صاحب سے چھ مہینے کی رخصت لیکر لکھنؤ چلے آئے بعد ختم رخصت جب حاضر بارگاہ ہوئے تو اسی جگہ سے بیان کرنا شروع کیا جہاں سے چھوڑ گئے تھے اس پر نواب صاحب نے بہت تعجب فرمایا اور ان کی یادداشت کی بہت تعریف کی۔ ان سب داستان گویوں میں رسالدار نواب محمد حسین خاں وثیقہ دار خاص مرتبہ کے تھے یہ نیشاپوری خاندان سے تھے اور پچاس ساٹھ روپیہ ماہوار وثیقہ پاتے تھے، نواب شیش محل کے دربار میں ہمیشہ داستان کہا کرتے تھے ان کی شہرت سنکر نواب بہرام الدولہ نے ایک مرتبہ حیدرآباد میں طلب فرمایا تھا۔ صرف پندرہ روز وہاں قیام کیا اور ایک طلسم سنا کر چلے آئے وہاں ان کا دل نہ لگا کہتے تھے کہ داستان کی تعریف کرنے والے ایسے کہیں نہیں ہیں جیسے لکھنؤ میں۔ پھر رام پور طلب کئے گئے اور وہاں بھی کچھ دنوں قیام کرکے چلے آئے۔ ان کے بعد ان کے ایک شاگرد تھے مولوی احمد حسن ساکن وزیر گنج یہ بھی اچھی داستان سناتے خصوصاً مختار نامہ بہت اچھا بیان کرتے تھے۔ عہد شاہی کے بعد جب داستان گو کم ہوگئے تو منشی نولکشور نے ان داستانوں کو چھپوانے کی کوشش فرمائی اور اسی کام کے لئے منشی محمد حسین جاہ کو تجویز کیا یہ بڑے منشی میر فدا علی کے شاگرد تھے، ان کے پاس داستانوں کی بہت سی جلدیں قلمی محفوظ تھیں۔

ہوش ربا کی پہلی دوسری تیسری چوتھی اور پانچویں جلد کا پہلا حصہ لکھا تھا کہ منشی صاحب سے معاوضہ کے متعلق کچھ جھگڑا پیدا ہوا، آخر ملازمت ترک کرکے منشی گلاب سنگھ لاہوری کے کارخانہ میں چلے آئے۔ منشی گلاب سنگھ کا مطبع اس زمانہ میں لکھنؤ میں تھا مگر وہ اتنی بڑی کتاب فوراً نہیں چھپوا سکتے تھے اسلئے منشی گلاب سنگھ نے پہلے ایک مختصر ٹکڑا ہوش ربا کا چھاپا اور پھر منشی احمد حسین قمر لکھنوی نے دوسری جلد حصۂ پنجم لکھی، جسے منشی صاحب نے فوراً شایع کردیا ملک تو اس کا منتظر تھا ہی ہاتھوں ہاتھ بک گئی، پھر ہوش ربا کی باقی جلدیں جلد جلد چھپنے لگیں، لوگ کہتے ہیں کہ منشی قمر سے زیادہ کوئی زود نویس داستان گو نہ تھا۔

اب یہ بحث آپڑی کہ منشی محمد حسین جاہ اچھی داستان لکھتے ہیں یا منشی احمد حسین قمر اس کا فیصلہ ملک نے اس طرح کیا کہ منشی محمد حسین جاہ بزم اچھی لکھتے ہیں اور منشی احمد حسین قمر رزم بہت عمدہ لکھتے ہیں۔ اسی زمانہ میں ایک اور بھی داستان گو تھے ان کا نام تھا امیر خاں ان سے بڑھ کے عیاری کوئی نہ بیان کرتا تھا، لیکن وہ منشی صاحب کے یہاں نہیں گئے اور ان کو ناز تھا کہ ہماری عیاریاں اس حسن و خوبی سے کوئی نہیں لکھ سکتا داستانوں میں عمر عیار کی جتنی عیاریاں ہیں سب امیر خاں کے بیان کا چربہ ہیں لوگ کہتے ہیں کہ مرزا رجب علی بیگ سرور نے نواب صاحب رام پور کے ارشاد سے ایک داستان لکھی تھی جس کا نام شگوفہ الفت تھا یہ کتاب مطبع نامی لکھنؤ میں چھپی تھی اس میں طلسم اچھا باندھا تھا منشی اسمٰعیل منیر نے بھی ایک داستان نواب صاحب رام پور کے حکم سے لکھی تھی جس میں رزم بزم دونوں خوب تھیں مگر اس کے چھپنے کی نوبت نہیں آئی۔ نواب یوسف علی خاں ناظم کے دربار میں حکیم میر ضامن علی جلال کے والد حکیم سید اصغر علی داستان گوئی کے عہدے پر ملازم تھے اور بعد ان کے نواب کلب علی خاں کی سرکار میں اسی عہدہ پر ملازم رہے۔

منشی احمد حسین قمر نے ہوش ربا کی جلدیں ختم کرکے صندلی نامہ شروع کیا یہ ہوش ربا کے بعد کا طلسم ہے اسمیں شہر فرعونیہ کی تباہی، لقا کی گرفتاری اور باغ ارم کی سیر خوب لکھی ہے اس کے بعد تورج نامہ کا سلسلہ قایم کیا جس میں امیر کی نقاب داروں سے کشتی اور اسی حالت میں دونوں کی بیہوشی طلسموں کی لڑائیاں دیو اور جادوگروں کی چوٹیں درج ہیں۔ پھر دوسری جلد تورج نامہ کی لکھی ہے اس میں رستم ثانی فرزند ایرج کی داستان ہے۔ آٹھواں دفتر لعل نامہ ہے یہ دو جلدوں میں ہے جلد اول میں مختصر داستان ہے جلد دوم میں صاحبقران کی روانگی طلسم خونخوار کی طرف بیان کی ہے، اس کے بعد منشی احمد حسین قمر نے طلسم خیال سکندری اور ہفت پیکر فتنہ نور افشاں کی جلدیں ختم کرکے انتقال فرمایا۔ اس کے بعد شیخ تصدق حسین داستان گو نے جو ایک جاہل آدمی تھے داستان میں ایک نئی روش نکالی ان کی یادداشت بہت اچھی تھی۔ یہ کاتبوں سے داستان لکھواتے تھے اور مطبع منشی نولکشور کو دیتے تھے ان کے یہاں عبارت آرائی اور چہرہ پردازی کم تھی اور جا بجا جو داستان گو اشعار برجستہ ملاتے ہیں انکا لطف بھی کم تھا مگر کاتب اپنے استاد کی غزلیں شامل کرکے کچھ لطف پیدا کر دیتے تھے۔ ایک مرتبہ نواب صاحب بھاولپور نے ان کو بلوایا تھا اور داستان سنکر بہت محظوظ ہوئے لیکن زاید قیام نہوا انعام اکرام لیکر چلے آئے تھے منشی قمر کے بعد انھوں نے داستان لکھنے کا سلسلہ قایم کیا اور طلسم آفتاب شجاعت لکھا۔ آفتاب شجاعت ختم کرکے شیخ تصدق حسین نے گلستان باختر کی داستان لکھی اور طلسم نوخیز جمشید تین جلدوں میں

پورا کیا اس کے بعد طلسم خیال سکندری کی تین جلدیں لکھیں اس کے بعد طلسم زعفران زار سلیمانی لکھا۔ اتنی کتابیں لکھنے کے بعد شیخ تصدق حسین کا بھی انتقال ہو گیا۔ منشی قمر اور شیخ تصدق حسین نے اسقدر داستانیں لکھی ہیں کہ ہندوستان میں کسی داستان گو نے نہیں لکھیں۔

لکھنؤ کے تمام داستان کہنے والے افیون کا استعمال بہت کرتے تھے اور اسی کے سرور میں داستانیں کہا کرتے تھے۔ اب لکھنؤ میں ایک شخص ٹوٹے مارے، افیونیوں کا نام زندہ رکھنے والے عید کی ٹر کی رونق مرزا ٹھن باقی رہ گئے ہیں، دن بھر کا مدانی بناتے ہیں اس میں جو پیسے ملتے ہیں افیون کی نذر ہو جاتے ہیں، بٹیر تیار کر کے بیچ لیتے ہیں، مگر اگلی سال اس پر بھی اوس پڑ گئی دو تین بٹیر بھاگ گئے ایک کی ٹانگ چوہے نے کاٹ لی وہ مر گیا، پارچہ والی گلی سے دو پلی ٹوپی چکن کی چار آنے کو مول لیکر اسے کفن دیا کمپنی باغ میں دفن کر رہے تھے کہ پولیس نے گرفتار کر کے دفعہ ۱۴۴ قائم کی بیچارے نے بہت منت کی سماعت نہوئی اس نے کہا تم نے کمپنی باغ کو قبرستان بنا دیا آج تک تو اس میں کوئی قبر نہ تھی۔ یار دوستوں کی کوشش سے رہائی نصیب ہوئی بٹیر کا تیجہ کیا چالیسواں کیا سال بھر سوگوار رہے، مگر زندہ دل ہیں، عید کی ٹر میں جاتے ہیں افیون کی ڈبیا اور پیالی کلیجے سے لگائے رکھتے ہیں، ٹر میں بھی دو بجے دن سے حقہ کوئیلے تمباکو چلم اور افیون لیکر موتی جھیل سے کچھ فاصلہ پر ڈیرہ خیمہ ڈالدیتے ہیں اور بڑے زناٹے سے داستان شروع کرتے ہیں، کچھ گنے آتے ہیں کچھ میٹھے چاول اسی سے سب افیونیوں کی روزہ کشائی ہوتی ہے، مینڈھے لڑتے ہیں ایک چھوٹا سا میلہ ہوتا ہے مگر بیچارے مرزا ٹھن اپنی بساط کے موافق سب کی مدارات گنڈیریوں سے کرتے ہیں کبھی دو چار پیوندی بیر بھی میسر آگئے تو یہ اور بات ہے داستان شروع ہوتی ہے چہرہ زبردست بیان کرتے ہیں انکسار مزاج میں ایسا ہے کہ جہاں کسی اچھے داستان گو کا نام آتا ہے زور سے اپنے کان اُمیٹھ کر کہتے ہیں واللہ وہ اُستاد تھے میں ایک ناچیز ہوں انھیں کا نام لیکر کچھ داستان کہہ لیتا ہوں جاہل ہوں میرا ان کا کیا مقابلہ اگر داستان کہنے میں کسی نے جماہی لے لی تو غضب ہو گیا اب انسے داستان نہیں کہی جاتی اور جب تک چھ پیسے کی افیون گھول کر نہ پی لیں حواس قابو میں نہیں آتے نواب محمد یوسف خاں خلف نواب مرزا ہادی بن نواب رفعت الدولہ بیان کرتے ہیں اب عید کی ٹر کیا ہوتی ہے اور مرزا ٹھن کیا چیز ہیں جو داستان کہیں گے بھیا انگریز کے وقت تک کچھ داستان گوئی کا چرچا تھا اور عید کی ٹر بھی کچھ ہوتی تھی ہمنے ایک زمانہ میں عیش باغ کے میلہ کی رونق دیکھی تھی اور داستان بھی سنی تھی آخری میلہ میں بیس بیس کوس کے داستان گو آتے تھے اور مسجد کے قریب خیمہ میں ٹھہرتے تھے ان کی خاطر مدارات یہاں کے رؤسا کی طرف سے ہوتی تھی چار بجے سب داستان گو اپنی اپنی داستان سناتے تھے اور لوگوں سے داد لیتے تھے۔ حقہ ہر دم بھرا رہتا تھا اور لوگ جمع رہتے تھے دس بجے رات تک اُٹھنے کا نام نہ لیتے تھے ایک مرتبہ نواب ولایت علی خاں نے اپنے ملازم حسین علی داستان گو کو اس میلہ میں بھیجدیا جب سب داستان گو بیان کر چکے تو حسین علی خاں نے اپنی داستان شروع کر دی بس یہ جی چاہتا تھا کہ بیٹھے سنا کریں، ہنستے ہنستے سب لوٹ گئے۔ اتنے ہنسانے والا داستان گو بھی ایسا نظر نہیں آتا۔۔ خواجہ عبد الرؤف عشرت لکھنوی

حیدرآباد میں ملکی تحریک تقریباً ایک رُبع صدی پہلے شروع ہوئی تھی، لیکن تعلیم کم ہونے کی وجہ سے اس میں کوئی قوت نہ تھی، لیکن اب کہ جامعۂ عثمانیہ کے وجود نے وہاں عام تعلیمی ذوق پیدا کر دیا ہے اور ہزاروں تعلیم یافتہ نوجوان بیکاری کے عذاب میں مبتلا ہیں، اس تحریک کا قوی ہونا بالکل فطری امر ہے اور کوئی صاحب فکر ایسا نہیں جو اس کو مستحسن نگاہوں سے نہ دیکھے۔ حیدرآباد کی سرزمین سے فایدہ اُٹھانے کا حق یقیناً سب سے پہلے وہیں کے بسنے والوں کو پہنچتا ہے اور اگر اُن میں یہ احساس پیدا ہو گیا ہے تو اس کا محو کر دینا آسان نہیں۔

اس میں شک نہیں کہ جب اس نوع کی تحریک کسی ملک میں پیدا ہوتی ہے تو غیر ملکی جماعت کو ضرور نقصان پہونچتا ہے، لیکن دنیا میں ایک کے فایدہ کی بنیاد ہمیشہ دوسرے کے نقصان ہی پر قائم ہوئی ہے اور اس تصادم سے بچنا کسی طرح ممکن نہیں۔

میں چونکہ ہر سال حیدرآباد جاتا ہوں اس لئے مجھے معلوم ہے کہ وہاں اسوقت ملکی و غیر ملکی لوگوں کے درمیان کتنی منافرت پیدا ہو گئی ہے اور مجھے یقین ہے کہ اس جنگ میں اہل ملک کامیاب ہوں گے اور انھیں ہونا چاہئے، لیکن جس وقت خود اندرون ملک کی آبادی اور اس کے حالات پر غور کیا جاتا ہے تو ہم یہ کہنے پر بھی مجبور ہیں کہ اب نہیں تو کل وہ وقت ضرور آئے گا جب یہی ملکی تحریک خالص فرقہ وارانہ رنگ اختیار کر لے گی اور پھر خود ملکی جماعتوں کے اندر کشمکش شروع ہو کر سوال ملکی و غیر ملکی کا نہیں بلکہ ہندو مسلمان کا رہجائے گا۔

حیدرآباد کے مسلمانوں کے سامنے تو یقیناً صرف یہ سوال ہے کہ حکومت کے نظم و نسق اور دفتروں کی ملازمت میں ان کو کیوں پورا حصہ نہیں دیا جاتا اور اگر ان کا یہ مطالبہ پورا ہو جائے تو پھر غیر ملکی لوگوں سے ان کو پرخاش کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی، لیکن وہاں کے ہندوؤں کے سامنے اس سے زیادہ اہم سوال مسلم و غیر مسلم حکومت کا ہے۔ یعنی جس طرح وہاں کے مسلمان، طبقہ عمال میں اپنی اکثریت دیکھنا چاہتے ہیں، اسی طرح ہندو بھی یہی تمنا اپنے دل میں رکھتے ہیں اور اگر حکومت کبھی اس بات پر مجبور ہوئی (اور یقیناً ہو گی) کہ وہ اہل ملک کے اس مطالبہ کو پورا کرے تو وہ یقیناً اس پر بھی مجبور کی جائے گی کہ تناسب آبادی کے لحاظ سے فیصلہ کرے اور اس صورت میں ظاہر ہے کہ غیر ملکی مسلمانوں کے ساتھ ملکی مسلمانوں کو بھی نقصان برداشت کرنا پڑے گا

بہرحال جس حد تک صرف اُصولِ انصاف کا تعلق ہے، کوئی شخص حیدرآبادیوں کے اس جذبہ کو بُرا نہیں کہہ سکتا، لیکن وہاں کے مسلمانوں کو یہ بھی سوچ لینا چاہئے کہ اگر آیندہ کسی وقت ہندوؤں نے اپنا حقیقی مطالبہ پیش کیا (اور یقیناً پیش کریں گے) تو کیا وہ اُسوقت اُسی خاموشی و فیاضی کے ساتھ حکومت کا

تمام نظم و نسق ہندوؤں کے ہاتھوں میں دینے کے لئے طیار ہو جائیں گے، جس خاموشی و فیاضی کی توقع وہ اس وقت غیر ملکی مسلمانوں سے رکھتے ہیں؟ - اگر وہ انصاف و رواداری کے اس اُصول پر کاربند ہونے کے لئے طیار ہیں تو بیشک ان کی یہ تحریک ہر طرح قابل تبریک و ستایش ہے، لیکن اگر آگے چل کر اپنی اقلیت کو اکثریت آبادی کے مقابلہ میں اہم بنانا ناگزیر ہے تو وہ غیر ملکیوں کی مخالفت کر کے کیوں اُس حلیف کی اعانت سے اپنے آپ کو محروم کرنا چاہتے ہیں جس کی امداد حاصل کئے بغیر وہ آیندہ جنگ میں کامیاب ہو ہی نہیں سکتے -

معلوم نہیں اس مسئلہ کا یہ نازک پہلو مسلمانانِ حیدر آباد کے سامنے ہے یا نہیں اور اگر ہے تو وہ اس آنے والے سیلاب کے مقابلہ کے لئے کیا طیاریاں کر رہے ہیں - کیا صرف یہی کہ غیر ملکیوں کو حیدر آباد سے نکال دیا جائے یا آیندہ اُن کو حیدر آباد آنے سے باز رکھا جائے ؟ اور اگر انھوں نے یہی فیصلہ کر لیا ہے تو پھر سوائے اس کے کیا کہا جا سکتا ہے ——— تو ہر گناہ کہ خواہی بکن کہ معذوری ———

قرآن آموز تالیف ہے جناب نذیر بن ابی سلمیٰ کی جنھوں نے قرآن شریف کو سمجھ کر پڑھنے کا طریقہ اس کتاب میں بتایا ہے - یہ بالکل صحیح ہے کہ مسلمانوں میں بلا سمجھے بوجھے قرآن پڑھنے کی عادت قبیحہ بہت عام ہے اور ضرورت ہے کہ اہلِ علم و مذہب اس طرف متوجہ ہوں - لیکن مجھے اس سے اختلاف ہے کہ شروع ہی سے بچوں کو قرآن کی تعلیم دی جائے، البتہ جب مادری زبان کی تعلیم سے فارغ ہو کر ان میں کچھ عقل پیدا ہو تو بیشک قرآن کیا بلکہ قرآن کی تعلیم طرف ان کو متوجہ کرنا چاہئے اور یہ بغیر مطلب سمجھے ہوئے ممکن نہیں -

مجھے یہ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ قابل مولف نے جو طریق تعلیم اس کتاب کے ذریعہ سے پیش کیا ہے وہ بہت پسندیدہ ہے اور ملک میں اس کو مقبول ہونا چاہئے - یہ پہلا حصہ ہے اور دفتر قرآن آموز احاطۂ شہزادہ محمد طاہر - لدھیانہ سے چار آنہ میں مل سکتا ہے -

امہات الامہ شمس العلماء خان بہادر حافظ نذیر احمد مرحوم کی نہایت مشہور تالیف ہے جو کسی پادری کے جواب میں انھوں نے لکھی تھی، لیکن صرف اس لئے کہ انھوں نے اس میں اپنی خالص دہلوی زبان استعمال کی تھی مولویوں نے اس کو جلائے بغیر نہ چھوڑا -

یہ کتاب عرصہ سے نایاب تھی، لیکن اب مسٹر شاہد احمد اڈیٹر ساقی نے جو حافظ نذیر احمد مرحوم کے پوتے ہیں اس کو پھر شایع کیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ان اعتراضات کے جوابات بھی شایع کر دئے ہیں جو اُس وقت

صاحب احسن التفاسیر نے دئے تھے۔ اس کتاب میں رسول اللہ کی ازدواجی زندگی سے بحث کی گئی ہے اور اس میں شک نہیں کہ بعض مقامات پر حد درجہ جرأت سے کام لیکر ایسی باتیں لکھ گئے ہیں جن کو مولویوں کی عام جماعت کبھی برداشت نہیں کرسکتی۔ اس کی قیمت دو روپیہ ہے اور دفتر ساقی دہلی سے ملسکتی ہے۔

دیوان معروف

تذکروں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ نصیر دہلوی کے شاگردوں میں ایک صاحب نواب آلہی بخش بھی تھے جو معروف تخلص کرتے تھے۔ لیکن ان کا دیوان دستیاب نہوتا تھا شاہ عبدالحامد صاحب قادری کو اتفاق سے اس کا ایک نسخہ حیدرآباد میں ملگیا اور انھوں نے شایع کردیا۔ شروع میں ایک مقدمہ بھی ہے جس میں معروف کے سوانح حیات بھی ہیں اور کلام پر ہلکا سا تبصرہ بھی۔ ہرچند معروف کا کلام تغزل کے لحاظ سے کوئی خاص چیز نہیں، تاہم اس کے شایع ہوجانے سے یہ فائدہ ضرور ہوگا کہ تذکرہ نویسوں اور نقد کرنے والوں کو اب سے پونے دو سو سال کی شاعری اور اس وقت کی زبان کے نمونے تلاش کرنے میں اور زیادہ آسانی ہوجائے گی۔ طباعت وکتابت اچھی ہے، اور بلا قیمت۔ ملنے کا پتہ:۔ نظامی پریس بدایوں۔

علاج بہ ریڈیم

رسالہ ہے لفٹننٹ کرنل ڈاکٹر محمد اشرف الحق کا جو تجدید شباب کے باب میں کافی شہرت حاصل کرچکے ہیں، اس سے قبل آپ کے متعدد رسایل اس موضوع پر شایع ہوچکے ہیں اور نگار میں ان پر تبصرہ بھی ہوچکا ہے اس رسالہ میں آپ نے اس مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے کہ ریڈیم کے ذریعہ سے اعادۂ شباب کس حد تک ممکن ہے۔ رسالہ کی قیمت ۴ روپے اور ڈاکٹر موصوف سے قلعہ گولکنڈہ حیدرآباد دکے پتہ پر ملسکتا ہے۔

رہنمائے تعلیم کا رڈکراس نمبر

ماسٹر جگت سنگھ رہنمائے تعلیم کے مالک و اڈیٹر ان لوگوں میں سے ہیں جو کامیابی کی جستجو صرف سعی وعمل میں کرتے ہیں اور جب تک مقصود حاصل نہ ہوجائے چین سے نہیں بیٹھتے۔ یوں تو سرزمین پنجاب کا ہر فرد اس باب میں ہمارے صوبہ کے لوگوں سے ممتاز نظر آتا ہے، لیکن ماسٹر صاحب موصوف اس عزم مردانہ میں جو غیر معمولی خصوصیت رکھتے ہیں، وہ بہت زیادہ واضح و روشن ہے۔ اس سے قبل انھوں نے اپنے رسالہ کا جوبلی نمبر نکال کر اپنی قوت عمل کا جو زبردست ثبوت دیا تھا اسکی مزید توثیق اب رڈکراس نمبر سے کی گئی ہے، جو اس موضوع پر اپنی جامعیت کے لحاظ سے اُردو زبان میں بالکل پہلی چیز ہے۔ وہ حضرات جو اس موضوع سے دلچسپی رکھتے ہیں ان کے لئے یہ اشاعت ازبس مفید و دلچسپ ہے اور اگر ریڈ کراس کی تحریک صرف اس لئے قابل نفرت نہیں ہے کہ اس کو صلیب سے نسبت حاصل ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس سے عام دلچسپی لیجائے۔

سرودِ زندگی

جناب اصغر گونڈوی کی غزلوں کا مجموعہ ہے جس پر ہم کسی آیندہ صحبت میں تفصیل کے ساتھ اظہار خیال کرینگے۔

باب المراسلة والمناظرہ

اختر ریحانہ سے

مارچ کے نگار میں آپ کی تحریر شایع کرنے سے میرا مقصد صرف یہ تھا کہ جس موضوع پر جناب برقی اور ڈاکٹر الیاس صاحب نے اظہار خیال کیا ہے، اس کے ایک ضمنی پہلو پر گفتگو کرنے کا موقع مجھے بھی مل جائے نیز یہ کہ اگر آپ کو آپ کے موجودہ مشکلات سے نکالنے کے لئے کسی مشورہ کی ضرورت ہے تو کم از کم میری طرف سے تو آپ کو یہ یقین ہو ہی جائے کہ میری ہمدردیاں آپ کے ساتھ ہیں - لیکن آپ کی تحریر کو شائع ہوئے ایک ہفتہ بھی نہ گزرا تھا کہ استفسارات کی کثرت نے ایک تیسرا مسئلہ اور میرے سامنے پیش کر دیا اور وہ یہ کہ آیا کسی ایسی عورت کی تحریر شائع کرنا جو آپ جیسا خوبصورت نام رکھتی ہو جس کا ذوق ادب آپ جیسا دلچسپ ہو اور پھر ایسے طبقہ سے بھی تعلق رکھتی ہو جو مادی ذرایع کی دسترس سے دور نہیں ہے، کوئی ایسی بات تو نہیں ہے جو "مقدار بادہ" اور "نفرت قدح خوار" کی نسبت پر غور کرنا میرے لئے ضروری ٹھہرا دے -

باور کیجئے کہ ہندوستان کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے، جہاں سے یہ مطالبہ مجھ سے نہ کیا گیا ہو کہ میں بتلاؤں آپ کون ہیں، آپ کا کیا پتہ ہے اور آپ کی ہستی کوئی فرضی ہستی تو نہیں - پھر آپ ہی بتائیے کہ دنیا کے اس جذبہ "قسمت آزمائی" کی تسکین مجھ سے کیونکر ممکن ہے، جبکہ حقیقتاً خود میں بھی اس باب میں یکسر استفسار و استفہام بنا ہوا ہوں -

جتنے خطوط استفسار حال کے لئے موصول ہوئے ہیں، ان کے لکھنے والوں کی نیت کے متعلق [illegible] مجھے رائے زنی کا کوئی حق حاصل نہیں اور نہ یہ باور کرنے کا کوئی سبب موجود کہ انسانی ہمدردی کے علاوہ کوئی اور جذبہ ان کے اندر کارفرما ہے، لیکن میں یہ کہنے پر ضرور مجبور ہوں کہ اگر اسی بیکسی و بیچارگی کا اظہار کسی مرد کی طرف سے ہوتا تو شاید کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگتی اور نفسیات انسانی کا یہی وہ پہلو ہے جو کبھی کبھی

یہ غور کرنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ عورت کی اس ادائے مظلومیت ہی نے مرد کو ستمرانی پر آمادہ کیا ہو ۔ وہ ستمرانی جو مظلوم سے زیادہ ظالم کو تباہ و برباد کرنے والی ہے ۔

اس میں شک نہیں کہ کسی عورت کا معصیت کے خیال سے گھبرا کر معصیت سے بچنے کا اعلان کرنا بجائے خود اتنی بڑی دعوتِ معصیت ہے کہ مشکل ہی سے کوئی مرد اس سے بچنے میں کامیاب ہو سکتا ہے ۔ علی الخصوص اُس وقت جب یہ بھی نہ معلوم ہو کہ یہ صدائے لن ترانی عورت آ رہی ہے ۔ شمع سے زیادہ کسوتِ شمع پروانوں کی بیتابی کا سبب ہوا کرتی ہے اور نقاب و حجاب جلوۂ عریاں سے زیادہ مار رکھنے والی چیز ہے ۔ اس لئے ۔ اگر وہ صحیح ہے جو مارچ کے نگار میں آپ نے تحریر کیا ہے اور آپ اپنی موجودہ زندگی سے واقعی بیزار ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ ایک بار ہمت و جرأت سے کام لیکر سامنے نہ آ جائیں ۔ اور ایکبار اس جنس کے افراد کو تلافی کا موقع نہ دیں ، جس کی طرف سے آپ لبریز شکایت ہیں ۔ یہ ہے میری ذاتی رائے اس باب میں جس پر اگر آپ نے عمل کیا تو ممکن ہے میں اور میرے ساتھ بعض وہ افراد جو اس مسئلہ کی عمرانی اہمیت سے واقف ہیں کوئی تدبیر علاج و مداوا کی اختیار کر سکیں ورنہ ظاہر ہے کہ آپ کی طرف سے سلسلۂ احتجاج اور دوسری طرف سے دلی ہمدردی دونوں بے سود ثابت ہوں گے اور آیندہ میں نگار کے صفحات کو صرف " جولانگاہ عشق " بنانا کبھی پسند نہ کروں گا ۔

مہدی و مہدویت کے باب میں

جناب ابو رشید صاحب (حیدرآبادی) سے

مکرمی ۔۔۔ آپ کی تحریر جس میں آپ نے جناب سید محمد صاحب جونپوری کی مہدویت کے متعلق مختصراً اظہارِ عقیدت وارادت کرتے ہوئے اہل تسنن کے عقیدۂ ظہور مہدی کو بہ حوالہ کتب عقاید اہل تسنن ثابت کرنا چاہا ہے ، پہونچی ۔ چاہئے تو یہ تھا کہ میں آپ کی تحریر بجنسہ شائع کر دیتا اور اس کا جواب دیتا اگر اس کی ضرورت ہوتی ، لیکن میں نے ایسا نہیں کیا ۔ اور میرا ایسا کرنا اس بنا پر نہیں ہے کہ آپ نے جو انداز تخاطب اختیار کیا ہے ، وہ حد درجہ غیر مہذب و ناشایستہ ہے بلکہ صرف اس لئے کہ اس کا طرز انشاء و استدلال نہایت غیر دلچسپ اور ناقابل برداشت حد تک فرسودہ و پامال ہے ۔ جواباً یہ ظاہر کئے بغیر میں نہیں رہ سکتا کہ آپ نے جو حجت اپنی تحریر میں پیش کی ہے

اس سے کسی طرح یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ اہل تسنن کے یہاں مہدی موعود کا عقیدہ کوئی خاص اہمیت رکھتا ہے
آپ نے اپنی تحریر کی ابتدائی چند سطروں میں لکھا ہے کہ نہ جناب سید محمد صاحب جونپوری نے کبھی دشمنوں کے خوف سے تقیہ کیا اور نہ اسوقت مہدوی جماعت تقیہ کی عادی ہے ۔ اور ہو سکتا ہے کہ آپ کا یہ فرمانا صحیح و درست ہو لیکن اس کے بعد پورے چار صفحات اس کوشش میں سیاہ کر دینا کہ ظہور مہدی کا عقیدہ اہل تسنن کے یہاں کوئی اہمیت رکھتا ہے، البتہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔

آپ نے اپنے استدلال میں ایک قول تفتازانی کا شرح مقاصد سے نقل کیا ہے اور دوسرا بیہقی کا شعب الایمان سے ۔ اس کے بعد آپ نے پورے تین صفحات اس بحث کے لئے وقف کئے ہیں کہ علامۂ ابن خلدون نے نے جن احادیث پر نقد و جرح کر کے ظہور مہدی کے عقیدہ کو ناقابل تسلیم قرار دیا ہے وہ احادیث بالکل صحیح ہیں اور ابن خلدون نے جو کچھ لکھا ہے غلط لکھا ہے ۔

قبل اس کے کہ میں آپ کے دلایل کی طرف متوجہ ہوں، یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ آپ کسی جماعت کے کسی عقیدہ کی اہمیت اس وقت تک ثابت نہیں کر سکتے، جب تک جمہور اکابر علماء کا اس پر اتفاق نہ ہو کیونکہ جبتک ادنیٰ اختلاف بھی کسی عقیدہ میں پایا جاتا ہے اس وقت تک وہ ہر زمانہ میں نقد و تحقیق کے لئے کھلا ہوا ہے اور ہر شخص آزاد ہے کہ اس کو اپنے استنتاج کے لحاظ سے تسلیم کرے یا مسترد کر دے ۔

اب آپ خود اپنے پیش کردہ منقولات پر غور کیجئے کہ ان سے کیا ظاہر ہوتا ہے ۔ علامۂ سعد الدین تفتازانی کے الفاظ یہ ہیں :۔

ذہب العلماء الی انہ امام عادل من ولد فاطمۃ

الفاظ (ذہب العلماء) کا مفہوم ہی صرف یہ ہے کہ بعض علماء کی رائے یہ ہے اور کہنے والا خود اسکو ضعیف تسلیم کرتا ہے ۔ رہگئے بیہقی سو انھوں نے شروع ہی میں ظاہر کر دیا ہے کہ ۔ (اختلف الناس فی امر المہدی)

علامۂ ابن خلدون نے مہدی موعود کی جن احادیث کو ناقابل اعتماد ظاہر کیا ہے، ان کے راویوں کو آپ نے حد درجہ قابل اعتماد قرار دیا ہے اور اپنی تائید میں تہذیب التہذیب اور میزان الاعتدال کا حوالہ بھی دیا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ آپ کی یہ کاوش بھی کسی مفید نتیجہ تک نہیں پہونچتی کیونکہ جس طرح آپ کے نزدیک یہ کتابیں معتبر ہیں اسی طرح کسی اور کے نزدیک ابن خلدون کی تحقیق قابل وثوق ہو سکتی ہے اور اس امر کا فیصلہ کہ ان دونوں میں صحیح کون ہے چنداں دشوار نہیں ۔ وہ لوگ جو ظہور مہدی کی احادیث کو قابل اعتبار سمجھتے ہیں ان کا استدلال صرف

یہ ہے کہ ان حدیثوں کے راوی معتبر ہیں اور اصول روایت کی طرف مطلق اعتنا نہیں کرتے، لیکن ابن خلدون وغیرہ جو اس عقیدہ کے منکر ہیں وہ روایتاً و درایتاً دونوں طرح اس قسم کی احادیث کو مجروح ثابت کرتے ہیں اور اس لئے ایک تیسرا شخص جو راویوں کے ثقاہت وعدم ثقاہت کے متعلق اختلاف رائے سے گھبرا کر کسی نتیجہ تک پہونچنا چاہے وہ مجبور ہوگا کہ ابن خلدون کے قول کو صحیح باور کرے کیونکہ درایت بہرحال درایت ہے اور عقل انسانی اس کے احکام تسلیم کرنے پر مجبور ہے۔ جتنی احادیث پیشین گوئیوں کی رسول اللہ سے منقول ہیں اول تو وہ یوں بھی اُصولاً زیادہ قابل وثوق نہیں سمجھی جاتیں، چہ جائیکہ ظہور مہدی کی احادیث جن کے وضع کرنے کے لئے کھلے ہوئے سیاسی اسباب موجود تھے۔

جس طرح یہ حقیقت مسلمہ ہے کہ اموئین وعباسیین نے علوئین کے مطالبات کو ضعیف اور ان کے اثرات کو کمزور بنانے کے لئے بکثرت احادیث وضع کیں، اسی طرح یہ بھی واقعہ ہے کہ علوئین نے خاندان بنی فاطمہ کے استعلار کے لئے کافی سعی سے کام لیا اور اس سلسلہ میں منجملہ دیگر تدابیر کے ایک تدبیر یہ بھی تھی کہ امام منتظر اور ظہور مہدی کی پشین گوئیاں رسول اللہ سے منسوب کرکے اپنے حقِ خلافت وامارت کو مضبوط کیا گیا۔

میں نے یہ کبھی نہیں لکھا کہ ظہور مہدی کا عقیدہ اہل تسنن کی کتابوں میں کہیں نظر ہی نہیں آتا بلکہ صرف یہ لکھا تھا کہ اس مسئلہ کو کوئی خاص اہمیت ان کے یہاں حاصل نہیں ہے اور اس عدم اہمیت کا سب سے بڑا ثبوت یہی ہے کہ ہمیشہ اس مسئلہ میں باہم اختلاف رہا اور اجتماعی حیثیت سے کبھی اس کو تسلیم نہیں کیا گیا۔ برخلاف اہل تشیع کے یا مہدوئین کے کہ ان کے یہاں متفقہ طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے کہ ظہور مہدی ضروری ہے اور اگر ان دونوں جماعتوں میں کوئی اختلاف ہے تو صرف یہ کہ ایک کے یہاں (جناب سید محمد صاحب جونپوری کی صورت میں) ظہور ہو چکا ہے اور دوسری جماعت کے یہاں امام منتظر ہنوز پردۂ خفا میں ہیں اور نہیں کہا جا سکتا کب رونما ہوں

باب الاستفسار

الف لیلہ اور سندباد نامہ

(جناب مراد علی صاحب - پٹنہ)

براہ کرم مطلع فرمائیے کہ کیا سندباد نامہ اور الف لیلہ دو علیحدہ علیحدہ کتابیں ہیں، اگر علیحدہ ہیں تو الف لیلہ اور اس کی ترتیب میں کیا اختلاف ہے، خود الف لیلہ میں سندباد کا ذکر موجود ہے اس لئے معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یہ دونوں ایک ہی چیز ہیں۔

نگار: یقیناً دونوں کتابیں بالکل علیحدہ علیحدہ ہیں اور ہر چند ان کی ترتیب میں ایک نوع کی مماثلت ضرور پائی جاتی ہے لیکن دونوں کو ایک نہیں کہہ سکتے۔

سندباد نامہ کا قصہ اس طرح شروع ہوتا ہے کہ ایک بادشاہ اپنے لڑکے کی تعلیم ایک حکیم سندباد کے سپرد کرتا ہے اور سندباد اس کو ہدایت کرتا ہے کہ سات دن تک خاموش رہے، اسی زمانۂ سکوت میں بادشاہ کی محبوب ملکہ اپنے سوتیلے بیٹے یعنی شہزادہ کے خلاف نہایت سخت الزامات قائم کرتی ہے اور بادشاہ اس کے قتل کا حکم نافذ کرتا ہے لیکن بادشاہ کے سات وزیر ہیں اور ان میں سے ہر ایک روزانہ ایک ایک قصہ کہکر تعمیل حکم کو ملتوی کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ آٹھویں دن جب شہزادہ کا سکوت ختم ہوتا ہے تو وہ الزامات کو دور کرتا ہے اور بے گناہ ثابت ہوتا ہے۔ الف لیلہ کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے کہ ایک بادشاہ روز نئی عورت سے نکاح کرتا ہے اور صبح کو اُسے قتل کرا دیتا ہے لیکن جب شہرزاد سے اس کا نکاح ہوا تو اس نے روز رات کو ایک کہانی سُنانی شروع کی اور اس کو صبح تک ناتمام چھوڑ کر ایک ایک دن کی جاں بخشی حاصل کرتی رہی، یہاں تک کہ ہزار راتیں اسی طرح بسر ہوگئیں اور اس سے ایک لڑکا پیدا ہوا، جس نے رشتۂ اُلفت کو اور زیادہ استوار کر دیا اور اس طرح بادشاہ کی یہ مذموم عادت ترک ہوگئی۔

اسی نوع کا افسانہ بختیار نامہ کا ہے جس میں دس وزیر شاہزادہ پر الزام قائم کرتے ہیں اور وہ قصے سنا سنا کر اپنی بیگناہی ثابت کرتا ہے۔ طوطی نامہ بھی اسی انداز کا ہے۔

مسعودی نے الف لیلہ کے ذکر میں سندباد نامہ کا بھی ذکر کیا ہے، اور ہر چند بعد کو یہ دونوں کتابیں ملادی گئیں لیکن سندباد نامہ کا وجود الف لیلہ سے حقیقتاً بالکل علحدہ اور زیادہ قدیم العہد تھا۔

بعض کا خیال ہے کہ سندباد نامہ قدیم ہندی افسانہ سدھ پتی سے ماخوذ ہے، لیکن اس کا کوئی ثبوت پیش نہیں کیا جاسکتا کیونکہ سدھ پتی کا وجود کہیں نہیں پایا جاتا۔ علاوہ اس کے سات دن تک خاموش رہنے کا ٹکڑا ایسا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ روایات فیثاغورس سے ماخوذ ہے۔ اس کی مقبولیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ دنیا کی کوئی زبان ایسی نہیں ہے جس میں اس کا ترجمہ نہ کیا گیا ہو۔

انارکی اور انارکزم

(جناب سید ابو اصغر صاحب - ہوشنگ آباد)

انارکی و انارکزم میں کیا فرق ہے، اس کی تحریک کب اور کس نے کی اور اس کے مقاصد کیا ہیں۔

(نگار) انارکزم جسے عربی میں (فوضویت) ہرج مرج کہتے ہیں ایک ایسی اشتراکیت پسندی ہے جو نہ صرف انقلاب حکومت کی آرزومند ہے بلکہ وجودِ حکومت کو بھی دنیا سے محو کر دینا چاہتی ہے۔ اور انارکی سے مراد سوسائٹی کی وہ حالت ہے جو انارکزم سے پیدا ہوتی ہے۔ یا بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ انارکزم کا تعلق اصول و عقیدہ سے ہے اور انارکی کا حالت و کیفیت سے۔

فوضویت میں اشتراکیت پسندی کی شان پیدا کرنے والا سب سے پہلا شخص فرانس کا پراؤڈن (Proudhon) تھا۔ جو ۱۸۰۹ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۶۵ء میں مرا۔ یہ نوع انسان میں انفرادی آزادی کا بڑا موید تھا اور کہا کرتا تھا کہ انسان پر انسان کا حکمراں ہونا انسانیت کی حد درجہ توہین ہے اور آزادی خیال و ضمیر کو محو کر دینے والی ہے۔ اسی لئے وہ ایک ایسے معاشری نظام کا خواہشمند تھا

جس میں حکومت تو کسی کی نہ ہو، لیکن ہر شخص اپنی اپنی جگہ اُصول و قاعدہ کا پابند ہو کر زندگی بسر کرے، اور انسانی ارتقاء کی یہی آخری حد ہے۔

اس کے بعد اس خیال کا سب سے بڑا حامی و مبلغ باکونن (Bakunin) ہوا اور پھر کروٹپکن (Kropatkine) یہ دونوں روس کے باشندے تھے۔

اس تحریک کا سب سے بڑا مطالبہ یہ ہے کہ انسانوں کو مکمل آزادی ملنا چاہئے اور حکومت خواہ وہ شخصی ہو یا جمہوری مٹنا چاہئے کیونکہ حکومت بہر حال حکومت ہے اور یہ ناممکن ہے کہ اُس سے نوع انسانی کو جسمانی یا ذہنی فائدہ پہنچے۔ اس تحریک کے حامی زمین اور سرمایہ کو قوم کی مشترک ملکیت بنانا چاہتے ہیں اور تعلیم کو عام کرنا چاہتے ہیں کہ جس وقت تمام افراد انسانی تعلیم یافتہ ہو جائیں گے تو فطری قوانین کو ہر شخص سمجھکر ان پر عمل کرے گا اور کسی خارجی حکومت یا سیاسی تنظیم کی ضرورت باقی نہ رہے گی —— باکونن کا قول تھا کہ سوسائٹی کے تمام قدیم اُصول کو توڑ دینا چاہئے، کیونکہ ان کی موجودگی میں نہ تعلیم عام ہو سکتی ہے اور نہ انسان کو مکمل آزادی میسر آسکتی ہے۔

الغرض فوضویت کے بنیادی اصول صرف دو ہیں۔ ایک سیاسی اور دوسرا معاشری۔ سیاسی یہ ہے کہ حکومت کے وجود کو خواہ وہ کسی نوعیت کی ہو فنا ہو جانا چاہئے اور معاشری یہ کہ سرمایہ و دولت کو ملکِ عام بنا دینا چاہئے۔

اگر اس جماعت کے یہ اُصول صرف علمی نظریئے کی حیثیت تک محدود رہتے تو شاید دنیا ان کی طرف اعتنا بھی نہ کرتی، لیکن چونکہ انھوں نے حصول مقصود کے لئے قوت استعمال کرنے کو بھی ضروری قرار دیا ہے اور وہ ہر قسم کی جنگ و مقاومت کے لئے طیار رہتے ہیں، اس لئے ہر زمانہ میں اس تحریک کی مخالفت کی گئی اور پوری سختی کے ساتھ اس کو دبایا گیا۔

ان کا کہنا یہ ہے کہ انسان کی ترقی کا معیار یہی ہے کہ وہ قانون یا مذہب کی گرفت سے آزاد ہو کر اپنے آپ کو متمدن ثابت کرے، یعنی دنیا میں امن و سکون کی حمایت اس لئے نہ ہونا چاہئے کہ قانون یا مذہب اس پر مجبور کرتا ہے۔ بلکہ صرف اس لئے کہ انفرادی طور پر وہ ہر شخص کا فطری فرض ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ معیار اخلاق اتنا بلند ہے کہ اگر آج دنیا کے تمام افراد اس مرتبہ تک پہونچ جائیں تو فردوس گم گشتہ ہم کو یہیں حاصل ہو سکتی ہے۔ لیکن جس حد تک عمل کا تعلق ہے ہم کو یہ خواہش خود اقتضائے فطرت کے خلاف معلوم ہوتی ہے اور فوضویت کا

قانون فطرت کی آڑ پکڑ کر جنگ کرنا خود فطرت کے خلاف جنگ کرنا ہے۔

مرز و بوم کا اختلاف، آب و ہوا کا اختلاف، ماحول کا اختلاف اور سب سے زیادہ حوادث طبیعی کا ظہور۔ یہ تمام اسباب ایسے ہیں جن پر انسان کو کوئی اختیار حاصل نہیں اور ان سے انسان کے ذہن و دماغ کا متاثر ہونا بالکل غیر اختیاری امر ہے۔ اس لئے یہ ناممکن ہے کہ وقتِ واحد میں تمام انسان کسی ایک بات پر متفق ہو سکیں اور سچ پوچھئے تو دنیا کی رونق اسی ہنگامۂ تصادم پر قائم ہے۔

یہ ہوسکتا ہے کہ آپ ایک خیال کو کسی ایک جماعت یا زیادہ سے زیادہ کسی ایک ملک کے لئے قابل قبول بنا سکیں لیکن تمام نوعِ انسانی کا اس پر متفق ہو جانا اقتضاء فطرت کے خلاف ہے۔ پھر چونکہ نوضویت کی تکمیل اسوقت تک ممکن نہیں جب تک نوعِ انسانی کے تمام افراد اس پر کاربند نہ ہو جائیں اس لئے اس تحریک کا مستقبل بہت تاریک نظر آتا ہے اور کبھی اس کی توقع نہیں ہوسکتی کہ وہ عالمگیر کامیابی حاصل کرسکے گی۔

حسنِ گریزاں سے

مرے سرو ناز! ابھی نہ جا!
مرے دلنواز — ابھی نہ جا!

نہ ابھی سے پھیر نگاہ تو　　میں نگاہ بھر کے تو دیکھ لوں
ترا پیار ہے مری زندگی　　تجھے پیار کر کے تو دیکھ لوں
تو قرارِ دل ہے — ذرا ٹھہر　　میں ذرا ٹھہر کے تو دیکھ لوں

ابھی دل کی پیاس بجھی نہیں
خلشِ امید مٹی نہیں
کوئی دیر بھی تو ہوئی نہیں

یہ سکوں، یہ فرصتِ آرزو! یہ شب [illegible] ابھی نہ جا
مرے سرو ناز! ابھی نہ جا
مرے دلنواز — ابھی نہ جا

ابھی ماہتاب ہے چرخ پر　　تجھے، ماہتاب نہ دیکھ لے،
ہے یہ سوچ، لیلئ شب کہیں؟　　تجھے، بے نقاب نہ دیکھ لے!
پسِ پردہ، کوئی چھپا ہوا　　تجھے بے حجاب نہ دیکھ لے!

کہیں، قدسیوں میں نہ گل کھلیں
کہیں کہکشاں سے نہ پر لگیں
ترے نقشِ پا کی تلاش میں

کہیں، کھل نہ جائے نجوم پر، یہ حسین راز! — ابھی نہ جا
مرے سرو ناز! ابھی نہ جا
مرے دلنواز — ابھی نہ جا!

جو کبھی کسی نے سنی نہ ہوں　　وہ کہانیاں میں سناؤں گا
جو نشاطِ روحِ بہشت ہوں　　میں وہ گیت، خلد سے لاؤں گا
یہی شب ہے حاصلِ صد سحر　　اسے لازوال بنا دوں گا

کبھی نغمہ بار رہوں گا میں
کبھی گل طراز بنوں گا میں
تجھے دیکھ دیکھ جیوں گا میں

یہی خوابِ خلد نما رہے — یونہی، خلد ساز! ابھی نہ جا!
مرے سرو ناز! ابھی نہ جا
مرے دلنواز — ابھی نہ جا

جو بسی ہے تیرے خیال سے　　اسی کائنات کا واسطہ!
تجھے — آہ! جس سے گریز ہے　　اسی التفات کا واسطہ!
غمِ بے ثبات نہ دے مجھے　　کششِ حیات کا واسطہ!

جو مراد اشکِ چکیدہ ہو!
جو قرارِ جانِ رمیدہ ہو!
وہ دل، روش سے کشیدہ ہو؟

جو نیاز شوق سے ضد ہے کچھ، تو بپاسِ ناز! — ابھی نہ جا!
مرے سرو ناز! ابھی نہ جا!
مرے دلنواز — ابھی نہ جا!

مجھے اب بھی وہمِ فراق ہے　　یہ عجیب وہم مٹا بھی دے
ابھی ہوش شاملِ کیف ہے　　یہ حجابِ ہوش اٹھا بھی دے
جو بسے ہیں تیری نگاہ میں　　وہی خواب مجھکو دکھا بھی دے

مرا دل جمال نما — بنے
مرا ہر خیال — بقا — بنے
"ترا عشق" — میرا خدا بنے

چمنِ قفس میں کھلا بھی دے "گلِ امتیاز" — ابھی نہ جا

مرے سرو ناز! ابھی نہ جا
مرے دلنواز! ابھی نہ جا

شاہکار

ہوئی روزِ ازل تخلیق جب آدم کے پیکر کی
بڑھی تعظیم کرنے کے لئے ہر موج کوثر کی

فرشتے سر بسجدہ ہو گئے ایمائے فطرت پر
یہیں سے مہر لگ جاتی ہے انساں کی فضیلت پر

مگر منشائے فطرت کی ابھی تکمیل باقی تھی
ابھی اک "جلوۂ بے نام" کی تشکیل باقی تھی

صدا آئی ہمیں اک یاسمیں پیکر بنانا ہے
کرشمہ اپنی تخئیلِ درخشاں کا دکھانا ہے

اسے ترتیب دو، صد رنگ جلوؤں سے حقیقت کے
سجا دو روح کو اس کی تبسم سے محبت کے

جمال و حُسن کر دو جذب اسکے روئے روشن میں
ہزاروں بجلیاں بھر دو نظر کے چلبلے پن میں

بنا دو قاش اک مہتاب کی لب ہائے رعنا کو
چھپا دو بہر رگِ مژگاں میں طوفانِ تمنا کو

بسا کر مستیاں آنکھوں میں جانِ میکدہ کر دو
لے جنت [illegible] جذب و کشش بھر دو

فروغِ ماہ سے لیکر اُجالے دو جِلا اس کو
بطورِ خاص دیدو دولتِ حُسن و وفا اس کو

جبیں کو اس کی آئینہ بنا دو نورِ ہستی کا
صحیفہ کھولدو اسکی نظر میں کیف و مستی کا

کرو تعمیر اسکی یوں، کہ مشکل ہو جواب اس کا
ستارے توڑ کر تاباں کرو رنگِ شباب اس کا

حیا کی گرمیوں سے روح تک اسکی لچک جائے
مرتب یوں کرو اس کو کہ جنت بھی چمک جائے

غرض یہ نقش ہوگا ایک نقشِ یادگار اپنا
اسے دُنیا میں بھیجیں گے بناکر شاہکار اپنا

فرشتوں نے سُنا حیرت سے یہ اعلان فطرت کا
خمیر آب و گل میں بھر دیا ہر رنگ جنت کا

کرن اک عرش سے لیکر چمن سے مستیاں لیکر
بنایا اک ہیولا اور کیف افزو زرنگیں تر

خطوطِ چہرۂ زیبا کو ڈھالا جاذبیت میں
ہزاروں حُسن پیدا ہو گئے صانع کی صنعت میں

مزین کر کے اجزائے سرور و نور سے اسکو
نمایاں کر دیا کچھ اور خلد و حور سے اسکو

اُٹھی انگڑائیاں لیتی ہوئی اک موج نکہت کی
اسی نکہت کے سائے میں ہوئی تخلیق "عورت" کی

نبی احمد بریلوی

زاہدِ فریب کار

اندھیری رات اور سرد بزمِ ناؤ نوش ہے
فسونِ خواب سے جہاں کی انجمن خموش ہے

فضائے کائنات کو سیاہیوں نے بھر دیا
زمین و آسماں کو تیرگی نے ایک کر دیا

جبیں بسجدہ ایک زاہدِ فریب کار ہے
نگاہِ حق شناس میں جو ننگِ روزگار ہے

وہی، جو دن کو خون چوستا ہے کائنات کا
بزعمِ خود جو راہبر ہے جادۂ حیات کا

وہی، کہ جس کا آستانہ سجدہ گاہِ خلق ہے
وہی، کہ جس کی ذات باعثِ گناہِ خلق ہے

وہی، عبادتیں ہیں جسکی سیم و زر کے واسطے
بھرا ہے جس نے روپ لقمہ ہائے تر کے واسطے

شریکِ ربِ ذوالمنن، مقلدِ فراعنہ
مرکبِ غرور و جہل، گمرہی کا آئنہ

عبائے راہبانہ کس قدر نظر فریب ہے
گھنی دراز ریش اسکی سر بسر فریب ہے

عیاں جبیں سے انکسار و عبدیت کی شان ہے
مگر عمل کی پوچھئے تو شیطنت کی جان ہے

دماغ کبر و اتقا و زہد سے پٹا ہوا
غبارِ معصیت سے دل کا آئنہ اٹا ہوا

زباں پہ رٹ لگی ہے یا رحیم یا کریم کی
مگر نظر ہے بیکسوں کے مال پر لئیم کی

خدا ہی ایسی ہستیوں سے دہر کو پناہ دے
یہ لاعلاج عارضہ ہیں کائنات کے لئے

انجم رضوانی

نقش و نگار

مجالِ دید کس کو ہوگی ان کے رُخِ روشن کی
حریمِ ناز کو تکلیف ناحق دی ہے چلمن کی

خدا جانے ترے آوارۂ اُلفت پہ کیا گزری
کہیں سے آ رہی ہے کان میں آوازِ شیون کی

یہ فصلِ گل نے کیا تعلیم دی ہے دستِ وحشت کو
گریباں کی وہی حالت ہے جو حالت ہے دامن کی

بیابانِ محبت میں جنوں ہے خضرِ رہ میرا
نہیں دیوانہ میں جو بات مانوں عقلِ رہزن کی

نگار اک دن مجھے مل جائیگا درجہ شہادت کا
کسی کی تیغ سے وابستہ ہے تقدیر گردن کی

نگار

عربوں کا شوق سیاحت اور اُن کی تحقیقات جغرافی

صدر اسلام میں عربوں نے جب علم وفن کی طرف توجہ کی۔ تو دُنیا میں کوئی ان کا مقابل نہ تھا۔ بازار علم کی متاع گراں ارز کے یہی تنہا خریدار تھے۔ اور حکمت وفلسفہ کی دُنیا ان کے وجود پر نازاں تھی۔ عرب لوگ جس وقت علم وحکمت کی غیر فانی دُنیا پر حکمرانی کر رہے تھے۔ اس وقت یورپین قومیں جہالت ونادانی کے تاریک بیابانوں میں سرگرداں تھیں۔ عربوں نے جن علوم کی طرف توجہ کی اُن کے تمام نشیب وفراز پر پورا عبور حاصل کیا۔ اور مختلف علوم وفنون میں ایسی جامع کتابیں لکھیں جو عربوں کی ذہنی برتری کی آئینہ دار تھیں۔

جس شخص نے تاریخ اسلام کا بغور مطالعہ کیا ہے وہ بخوبی جانتا ہے کہ تسخیر ممالک کے بعد عرب میں خدمت علم کی تحریک دفعتہً ایک حیرت انگیز سرعت کیساتھ پیدا ہوئی۔ اور تھوڑے ہی دنوں میں عالم اسلامی کے گوشہ گوشہ میں پھیل گئی۔

اسلام کا آفتاب ساتویں صدی کی ابتدا میں افق عالم پر جلوہ گر ہوا۔ اور ابھی آٹھویں صدی کا چاند نہیں نکلا تھا کہ اُن کی حکومت ایک مستقل وپائیدار حکومت ہوگئی۔ سنہ ۶۳۲ء سے لیکر سنہ ۶۳۵ء تک عربوں نے شامی بلاد فتح کر لئے۔ اور سنہ ۶۳۲ء سے لیکر سنہ ۶۴۰ء تک فرات۔ سندھ اور جیحوں کے درمیانی علاقے اسلامی حکومت میں شامل ہوگئے۔ سنہ ۶۳۸ء میں مصر، سنہ ۶۴۲ء میں قیروان، ۶۴۹ء میں جزیرہ قبرص اور روڈس پر اسلامی پرچم لہرایا۔ اور سنہ ۷۱۰ء میں بلاد ماوراء النہر۔ سنہ ۷۱۱ء سے لیکر سنہ ۷۱۴ء تک بلاد اندلس عربوں کے زیر نگیں ہوئے غرض یہ کہ آٹھویں صدی کے اوائل ہی میں خلفاء اسلام کی حکومت کا دائرہ ہندوستان سے لیکر اوقیانوس اٹلانٹک تک اور جبال قاف سے لیکر صحرائے افریقہ تک پھیل گیا۔

بلاد وممالک کی تحقیق ومعرفت میں عربوں نے بھی اپنی فتوحات سے وہی کام لیا جو رومانیوں نے لیا تھا۔ جس سرزمین پر قدم رکھا اس کے تمام حالات کو تفصیل سے معلوم کیا۔ اور جس شہر کی تسخیر کی اس کی تمام خصوصیات کو دریافت کیا۔ دوسری قوموں کے اختلاط کیوجہ سے عربوں کے دل میں علوم کے اکتساب کا جذبہ پیدا ہوا۔ اور انہوں نے اس جذبہ کی تکمیل میں ہر امکانی کوششوں سے کام لینا شروع کیا۔ چنانچہ وہ لوگ اپنی فطری ذہانت سے بہت جلد ان علوم کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ عربوں نے پہلے پہل یونانی لٹریچر کے ابتدائی سرمایہ کو سریوں سے حاصل کیا۔ اور سوریوں نے اُن نسطوریوں سے اسکی تحصیل کی تھی جو شاہان روم کے ظلم سے

گھبرا کر فارس کی طرف بھاگ آئے تھے۔ یہ لوگ علوم وفنون میں عموماً اور طب میں خصوصاً بڑے ماہر تھے۔ انہوں نے مدینۃ الرہا میں ایک مدرسہ بھی قائم کیا تھا۔ جس کو زینون ایزوری نے اسی زمانہ میں برباد کر ڈالا۔ لیکن پھر انہوں نے جندیساپور (خوزستام) میں اس مدرسہ کی دوسری یادگار قائم کی جو عرصہ دراز تک طالبانِ فن اور اربابِ علم ودانش کا مرجع عام رہی۔

عربوں نے جب حکماء یونان کی تصانیف کا مطالعہ شروع کیا تو اُن کی طبیعتوں میں ان تصانیف سے ایک خاص شیفتگی پیدا ہوگئی۔ اور وہ ان تصانیف کے بڑے دلدادہ بن گئے۔ اس تحریک کے اسباب خلیفہ ابوجعفر المنصور العباسی کے زمانہ میں پیدا ہوئے اور خلافتِ عباسیہ کے فرمانرواؤں میں یہ پہلا بادشاہ ہے جس نے علم وفن کی طرف توجہ کی۔ خلیفہ ابوجعفر نے ملوک روم کے پاس متعدد وفود بھیجکر فلسفہ کی کتابیں منگوائیں۔ اور ماہرین فن مترجمین سے اُن کے ترجمے کرائے۔ دار الخلافتہ میں اربابِ علم وفن کی ایک جماعت تھی جو فلسفہ اور علوم میں یدطولیٰ رکھتی تھی۔ اور خلیفہ منصور چاند کی طرح اسی جماعت کے ہالے میں رہا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ دوسرے اسلامی شہروں میں بھی علماء فن کی بہت سی جماعتیں تھیں۔ جو عصرِ خلافت کی رونق کو چار چاند لگا رہی تھیں۔

اس باب میں تفصیل سے گفتگو کرنی چونکہ ہمارے اس مقالہ کے حدود سے خارج ہے۔ اس لئے ہم اس دلچسپ بحث کو کسی دوسرے وقت کے لئے اٹھا رکھتے ہیں۔ آج کی صحبت میں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ صدر اسلام میں مسلمانوں کے یہاں جغرافیہ کی کیا حیثیت تھی؟ اور وہ کیسا اسباب تھے جو اس فن کی ترقی کا سبب ہوئے؟

پہلا سبب خلفاء راشدین کی وسعت فتوحات تھی۔ زمانہ خلافت میں جو ملک فتح کئے جاتے تھے ان کی دو صورتیں ہوتی تھیں صلح وامان یا جنگ وقوت۔ اور شریعتِ اسلامیہ میں ہر دو قسم کے مفتوحات کے لئے جداگانہ احکام ہیں۔ اس لئے ملکوں کا جغرافیائی علم ان کے لئے ضروری تھا۔ وہ ہر مفتوح ملک اور ہر مسخر قبیلہ کے حالات کو جاننے کی پوری کوشش کرتے تھے۔ پھر چونکہ ان کی حکومت کا دائرہ بڑی حد تک وسیع ہوگیا تھا۔ اس لئے وہ جغرافیائی حیثیت سے ان تمام شہروں کے احوال سے بھی واقف ہوتے گئے۔

دوسرا سبب عربوں کے تجارتی سلسلہ کا غیر معمولی پھیلاؤ تھا۔ عربوں کی تجارت کا دائرہ خود اُن کی فتوحات سے کہیں زیادہ وسیع تھا۔ ان کی تجارت مشرق ومغرب۔ شمال وجنوب تقریباً دُنیا کے ہر ملک میں پھیلی ہوئی تھی۔ فینیشیوں کے زمانہ سے لیکر بطالسہ اور رومان کے عہد حکومت تک یہ لوگ بحر متوسط اور بلاد ہندوستان کے درمیان تجارت کرتے تھے۔ اگر عربوں کے اس سلسلہ کو اور وسعت نظر کے ساتھ تاریخ میں ڈھونڈیے تو آپ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ خود فینیشی (فینیقی) قوم جو اپنے عہد حکومت میں دریاؤں کی مالک تھی۔ اصل میں شجرہ عربیہ کی ایک شاخ ہے۔ اس لئے یہ بلاخوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ زمانہ قدیم میں بھی تجار عرب اسباب تجارت کی تلاش میں مشغول تھے۔ اور ایشیا وشمالی افریقہ کے سوادِ اعظم کے ساتھ بھی ان کا تعلق اسی بناء پر تھا۔ عربوں میں چونکہ قدرت نے تجارت کا ایک طبعی ذوق پیدا کر دیا تھا۔ اس لئے انہوں نے اس باب میں وہ درجہ حاصل کیا جو قدیم قوموں کو اُس وقت تک حاصل نہ ہو سکا تھا حتیٰ کہ انکشافِ امریکہ سے پہلے متاخرین کی بھی کسی جماعت کو وہاں تک رسائی نہیں حاصل ہوئی۔ تجار عرب دُنیا کے گوشہ گوشہ میں مصروف تجارت تھے۔ اور ان کے قافلے دُنیا کے چپے چپے میں تجارتی سامان کی خرید وفروخت کے لئے پھیلے ہوئے تھے۔ عربوں کے تجارتی راستے چار تھے۔

پہلا راستہ اندلس۔یورپ۔اور بلاد صقالبہ (روس) سے ہوتا ہوا بحر خضر۔بلخ۔اور بلاد تغزغز کو جاتا تھا۔ دوسرا[2] شمالی افریقہ۔مصر۔شام۔کوفہ۔بغداد۔بصرہ۔اہواز۔فارس۔کرمان۔سندھ۔اور ہندوستان کا راستہ تھا۔ باقی دو[2] راستے بحر روم کو عبور کرتے ہوئے ایک سویہ اور خلیج عجمی کو جاتا تھا۔ اور دوسرا اسکندریہ اور بحر احمر سے ہوتا ہوا بحر ہند میں مل جاتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ عرب کی تجارت کا سلسلہ مشرق میں جزائر ایشیا سے لیکر چین تک اور شمال میں اواسط ایشیا اور بلاد صقالبہ (روس) سے لے کر بحیرہ بالٹک کے ساحلوں تک اور جنوب میں مشرقی افریقہ کے ساحل سے مڈگاسکر تک اور مغرب میں سوڈان سے لیکر بحر اٹلانٹک کے کناروں تک پھیلا ہوا تھا۔

منجملہ دیگر اسباب کے ایک بڑا سبب فریضہ حج بھی تھا۔ اطراف عالم سے کعبہ کا قصد کرتے تھے (جیسا کہ اس وقت بھی یہ طریقہ جاری ہے) اور بغداد۔قاہرہ اور دمشق میں سب لوگ جمع ہوتے تھے۔ پھر یہیں سے اقطار حجازیہ کے ارادہ پر سفر کرتے تھے۔ اور اسی سلسلہ میں بہت سے لوگ ایسے پیدا ہو گئے جنہوں نے مختلف بلدان و ممالک کے متعلق خود اپنے مشاہدات اور غیروں کے سنے ہوئے واقعات کو مدون کیا۔ متقدمین اسلام نے مقامات کی تحقیق میں جو کتابیں تصنیف کیں، وہ دو قسم کی تھیں۔ بعض کا منشاء صرف مشہور شہروں کا حال بیان کرنا تھا۔ اور بعض کا مقصود صرف ان مقامات کا بیان تھا جو عربوں کی روایات اور اشعار میں اکثر ملتے ہیں۔ جن مصنفین نے شہروں کی طرف توجہ کی وہ تقریباً اس میدان میں متقدمین حکماء یونان کے نقش قدم پر چلے۔ اور راستوں کی مسافت کو بھی متعین کیا۔ اس زمرہ میں ابن خردادبہ۔ احمد بن واضح۔ جیہانی۔ ابن الفقیہ۔ ابوزید البلخی۔ ابو اسحق الاصطخری۔ ابن حوقل۔ ابو عبد اللہ البشاری۔ حسن بن محمد المہلبی۔ ابن ابی عون البغدادی۔ ابو عبید البکری۔ قزوینی۔ یاقوت حموی۔ شمس الدین مقدسی۔ ابو الحسن علی الہروی۔ شریف ادریسی۔ ابو الفداء۔ ابو العباس احمد السرخسی۔ علی بن حسین المسعودی۔ مراکشی۔ عبد الرشید الباکوری۔ ابو القاسم شیرازی۔ شیخ ازری ۔۔۔ الاسفرائینی۔ شیخ تقی الدین المقریزی خصوصیت کیساتھ قابل ذکر ہیں۔ اور جن لوگوں نے اپنی تصنیفات میں صرف اماکن عربیہ اور منازل بدویہ کے بیان پر اکتفا کی ہے۔ ان میں ابو سعید سیرافی۔ ابو محمد الاسود غندجانی۔ ابو زیاد کلابی۔ محمد بن ادریس بن ابی حفصہ۔ ہشام بن محمد الکلبی۔ ابو القاسم زمخشری۔ ابو الحسن عمرانی۔ ابو عبید البکری الاندلسی۔ ابو بکر محمد بن موسیٰ الحازمی۔ ابو الفتح نصر بن ۔۔۔ ۔ عبد الرحمان الاسکندری۔ برہان الدین۔ ابراہیم البقاعی۔ ابو الفتح محمد الہمدانی۔ ابن الجورانی۔ علی بن محمد الخوارزمی۔ محمد بن ایاس الحنفی۔ ابو المجد اسمعیل بن ہبۃ اللہ الموصلی۔ ابو الفضل البقالی الخوارزمی۔ ابو عمر محمد الکندی۔ ابو عبد اللہ محمد القضاعی۔ ۔۔۔ہری۔ ابو الحسن احمد الاشعری۔ ابو سعید اصمعی۔ ابو عبید السکونی۔ حسن بن احمد الہمدانی۔ ابو الاشعث الکندی کا ذکر ضروری ہے۔

مسلمانوں میں ان کے سوا ایک دوسری سیاح جماعت بھی تھی۔ جس نے اپنی سیاحتوں کو کتابی شکل میں مرتب کیا۔ ان میں ابن بطوطہ مشہور اسلامی سیاح کا نام خصوصیت کیساتھ قابل ذکر ہے۔ ان ہی سیاحوں میں بعض اہل ادب نے جغرافیہ طبعی میں بہت زیادہ تحقیق سے کام لیا۔ اسلامی شہروں کے علاوہ دوسرے ممالک کے حالات و واقعات بھی سپرد قلم کئے۔ لیکن غیر اسلامی ممالک کے متعلق ان لوگوں نے جو کچھ بیان کیا ان کا بیشتر حصہ اگرچہ غیر محقق تھا لیکن پھر بھی ان کی محنت کی داد دینا پڑتی ہے

کیونکہ وہ لوگ ان قوموں کی زبانوں سے ناواقف تھے۔ اور ان قوموں کیساتھ چند ناگزیر اسباب کی بناء پر ان لوگوں کا اختلاط بھی مشکل ہو گیا تھا۔ ابوالفدار نے اپنی مشہور تصنیف تقویم البلدان کے مقدمہ میں اس حقیقت پر یوں روشنی ڈالی ہے۔

"میں نے اس مختصر کتاب میں فن کی وہ تمام معلومات یکجا کر دی ہیں جو کتابوں میں متفرق طور سے موجود تھیں۔ اس فن میں اب تک جتنی کتابیں تالیف کی گئیں وہ اصل مقصود پر بہت کم حاوی ہیں۔ اقلیم چین جو اپنی عظمت اور کثرت آبادی میں شہرۂ آفاق ہے اس کی خبریں ہم کو بہت کم معلوم ہیں۔ اور جو کچھ معلوم ہیں وہ بھی غیر محقق ہیں۔ اسی طرح ہندوستان کے متعلق بھی جو خبریں موصول ہوئی ہیں وہ تشنۂ تحقیق ہیں۔ بلاد بلغار۔ بلاد چرکس۔ بلاد روس۔ بلاد سرب۔ بلاد اولق (فلاخ)۔ بلاد فرنگ خلیج قسطنطنیہ سے لیکر بحر محیط غربی تک بہت سے بڑے بڑے شہر ہیں۔ لیکن بعض شہروں کے علاوہ ان ممالک کے اسماء تک سے ہم ناواقف ہیں۔ اسی طرح سوڈان کے جنوبی علاقہ میں بھی بہت سے بلاد ہیں۔ جو حبش۔ زنگ۔ نوبہ۔ تکرور۔ زیلع وغیرہ سے بالکل مختلف اور جدا ہیں۔ لیکن ان کے متعلق بھی معلومات فن کا خزانہ یکسر خالی ہے۔ مصنفین اسلام نے کتب مسالک الممالک کا بیشتر حصہ صرف اسلامی ممالک کی تحقیقات میں صرف کر دیا۔ اور اس کے علاوہ دوسرے ممالک کی طرف انہوں نے بہت کم توجہ کی۔ الخ"

غرض یہ کہ مسلمانوں نے ابتداء میں اس فن کی جو خدمات انجام دیں وہ اگرچہ غلطیوں سے پاک نہیں ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی مسلسل کوششوں نے ان کو آگے چلکر اس میدان میں بہت کامیاب ثابت کیا۔

(۲)

آٹھویں صدی میں جغرافیہ کے متعلق جو کتابیں لکھی گئیں۔ وہ عبارت ہیں ان رسائل سے جن کی تصنیف کا منشاء صرف بدوی قبائل کی نفع رسانی تھی۔ چنانچہ یہ تمام کتابیں محض پہاڑوں۔ وادیوں۔ صحراؤں اور منزلوں کی تعریف سے لبریز ہیں۔ ازانجملہ ایک کتاب النضر البصری مشہور تصنیف ہے۔ جس کو مصنف نے آٹھویں صدی کے اواخر میں خراسان میں بیٹھ کر تصنیف کیا تھا۔ اسکا مصنف ۷۴۰ء میں پیدا ہوا۔ یہ کتاب یورپ کے بعض کتب خانوں میں موجود ہے۔ اس میں زیادہ تر مرد و عورت۔ جانور۔ پہاڑوں۔ چاند و سورج۔ دودھ اور شراب۔ شجر و نباتات۔ پانی اور چشمے۔ ہوا اور بدلی وغیرہ کے خواص و افعال سے بحث کی گئی ہے مصنف نے اس کی ترتیب بڑے عمدہ انداز پر کی ہے۔ اور وہ تمام باتیں تفصیل کیساتھ اس کتاب میں بیان کی ہیں۔ جن کی بدوی قبائل کو اکثر ضرورت پڑا کرتی ہے۔ اس کتاب کے علاوہ اور بھی اس قسم کی بہت سی کتابیں ہیں۔

ممالک و بلدان کی تعریف میں سب سے پہلے جو مبسوط کتاب تالیف کی گئی وہ ابو اسحٰق اصطخری کی مشہور تصنیف ہے۔ ابو اسحٰق ان نامور علماء اسلام اور مشاہیر سیاحین میں سے ہیں جو نویں اور دسویں صدی میں پیدا ہوئے۔ جن لوگوں نے اسباب فن کی تلاش اور درعلم کی جستجو میں مختلف اماکن و امصار کی سیاحت کی۔ ہر ملک کے حالات و آثار کو جمع کیا۔ اور خواص بلدان و امزجۂ اقالیم کی حقیقت بھی معلوم کی۔ ان سیاحوں میں دو قسم کے لوگ ہیں۔ ایک جماعت نے تو صرف اپنے حالات سیاحت

ہی کو مدوّن کرنے پر اکتفا کی۔ اور دوسرے سیاحوں نے اپنے سفرناموں میں مشاہدات کے علاوہ تاریخی۔ جغرافیائی اور ادبی تصنیفات کے معالعات کو بھی حکماءِ یونان کے دستور کے موافق بیان کیا۔ ان لوگوں کے پاس چونکہ علم و فنون کی تحصیل کے ذرایع کثیر نہ تھے۔ اس لئے وہ لوگ اس کے لئے سفر پر مجبور ہوتے تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ زمانۂ قدیم کے نامور مؤرخین مثلاً ہیرودوٹس اور پولنیوس یا مسلمانوں میں مسعودی و ابن حوقل وغیرہ بہت بڑے سیاح بھی تھے۔

ابو اسحٰق

ابو اسحٰق اصطخری دسویں صدی کے نصف اوّل میں مدینہ اصطخر میں پیدا ہوا جو فارس کا ایک مشہور شہر ہے۔ علم کی تلاش میں اس نے بعض اسلامی شہروں کا سفر کیا۔ اور جغرافیہ میں ایک کتاب تصنیف کی جس میں مختلف دیار و امصار۔ جبال و انہار کے مواقع اور بعض بعض مسافتوں کو بیان کیا۔ اگرچہ مصنف خواص بلدان اور امزجۂ اقالیم کی تحقیقات بخوبی نہ کر سکا لیکن پھر بھی موصوف کی یہ کاوشیں بہت کچھ لائقِ تعظیم ہیں۔ یہ اس فن کے امام سمجھے جاتے ہیں۔ اور ان کی یہ تصنیف کتب مسالک والممالک میں بہت مشہور ہے۔ ابن حوقل نے جو ان سے چند سال بعد پیدا ہوا۔ اپنی تصنیفات میں اس کتاب سے اکثر جگہ استشہاد کیا ہے۔ لیکن ابو اسحٰق نے بھی اپنی یہ کتاب ابو زید البلخی کی ایک کتاب تقویم البلدان کو سامنے رکھ کر مرتب کی تھی۔ جس کو ابو زید نے بہ روایت مسعودی تقریباً ۳۰۸ھ میں تصنیف کیا تھا۔ قدما مصنفین کے پاس چونکہ ذرایع معلومات کی کثرت نہ تھی اس لئے بیشتر مسلمان جغرافیہ دانوں کا طرز نگارش یہ تھا کہ وہ لوگ ذاتی مشاہدات کے علاوہ اگلے مصنفین کی کتب تواریخ و جغرافیہ کا خلاصہ بھی اپنی تصنیفات میں درج کر دیا کرتے تھے۔ اور یہی وہ طریقہ ہے جس کو یونان کے ماہرین جغرافیہ اور مشاہیر اہل قلم نے بھی اختیار کیا تھا۔ چنانچہ بطلیموس کی عظیم الشان جغرافیائی تصنیف حقیقۃً میں مارینوس کے جغرافیہ کی دوسری نقل ہے۔ جس کو بطلیموس نے اپنی طرف منسوب کر دیا ہے۔

نویں صدی کے اندر علم الجغرافیہ میں جتنی کتابیں تصنیف کی گئیں اُن میں ایک مشہور کتاب المسالک والممالک مصنفہ ابو العباس بن محمد الطیب السرخسی (المتوفی ۸۹۹ء) بھی ہے۔ اس کتاب تصنیف کا تذکرہ حاجی خلیفہ نے اپنی بعض کتابوں میں کیا ہے۔ اس کے اس فن میں عبد اللہ بن عبد اللہ المشہور با بن خرداد بہ مشہور مؤرخ اور جغرافیہ داں کی یہی ایک تصنیف ہے جو علامہ شریف ادریسی کی مشہور کتاب نزہتہ المشتاق سے بہت مشابہ ہے۔ لیکن اس سے زیادہ مختصر ہے۔ مصنف نے اس کتاب میں مختلف مقامات کی مسافتوں کو بیان کیا راستوں کی تعین کی ہے۔ اور بعض دوسرے جغرافیائی حقایق پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ فرانسیسی زبان میں اس کتاب کا ترجمہ پیرس میں ۱۸۶۵ء میں شائع ہو چکا ہے۔

مسعودی

بغداد میں نویں صدی میں پیدا ہوا۔ مسعودی بچپن ہی سے طلب علم اور سیر و سیاحت کا بڑا شائق تھا۔ عنفوانِ شباب ہی پر وہ تمام ممالکِ اسلامیہ اور قرب و جوار کے ممالک کا سفر کر چکا تھا۔ مسعودی علم و فن کا بڑا حریص تھا۔ اس نے بہت سے علوم کی تحصیل کی لیکن حکمت و ادب۔ تاریخ و جغرافیہ اس کے ذوق کی خاص چیزیں تھیں۔ ۹۱۵ء میں اصطخر آیا۔ اور وہاں ایک مدت تک مقیم رہا۔ پھر ہندوستان کا سفر کیا۔ اور یہاں کے بعض حصوں کی جغرافیائی تحقیقات کی۔ دراصل یہ مرتبہ اور اس سے چار برس پہلے بھی وہ ہندوستان آ چکا تھا۔ اس کے بعد بحرِ جنوبی سے ہوتا ہوا مشرقی افریقہ کے ساحلوں پر اُترا۔ اور کچھ دنوں کے بعد پھر دریا کو عبور

...جزیرہ عرب میں آیا۔ لیکن ہمارے پاس کوئی ایسی صحیح روایت نہیں ہے۔ جو ان سیاحوں کی واقعی تاریخ بتا سکے۔ اس کی تصنیفات
البتہ اتنا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے تقریباً ۹۴۷ء میں سیر و سیاحت کو ختم کرکے باقی عمر ان تصنیف و تالیف میں بسر کردی مسعودی
۳۴۶ھ مطابق ۹۵۷ء میں بمقام فسطاط وفات پائی۔

مسعودی نے ایک کتاب اخبار الزمان و من اباده الحدثان تاریخ میں لکھی۔ جو فن کی عظیم الشان تصنیف ہے مصنف نے اس کتاب
...پہلے ہیئت ارض۔ دیار و امصار۔ جبال و انہار۔ معادن و منابع کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ پھر تمدن و عمران۔ اخبار و حوادث۔
...نسل۔ انقسام اقلیم۔ اور طبائع انسانی کے اختلافات وغیرہ جیسے اہم مسائل کو حوالہ قلم کیا ہے۔ اس کے بعد قرون ماضی کے گذشتہ
...امم۔ ملوک و سلاطین۔ انبیاء اور اولیاء کے واقعات درج کئے ہیں۔ پھر ہر سن کے تحت میں مختلف واقعات اور متفرق حوادث
...وقت تالیف مروج الذہب یعنی ۳۳۵ھ مطابق ۹۴۶ء تک تفصیل کیساتھ ذکر کیا ہے۔ لیکن یہ کتاب اپنے مطالب گوناگوں کی
...سے بہت زیادہ ضخیم ہوگئی۔ اس لئے مصنف نے پھر ایک دوسری تصنیف کتاب الاوسط کے نام سے مرتب کی۔ جس میں اخبار الزمان
...تفصیلات کو اجمال کیساتھ بیان کیا گیا۔ لیکن اس اجمال میں بھی اتنی تفصیل تھی کہ کتاب کی ضخامت کچھ زیادہ کم نہ ہوسکی۔ اس لئے مصنف
...ن اوسط کا بھی ایک معقول اختصار مروج الذہب و معادن الجوہر کے نام سے تالیف کیا۔ مسعودی کی کتاب اخبار الزمان تیس فن پر
...ہے۔ اور یہ تصنیف بہت ہی نادر و کمیاب ہے۔ اور کتاب الاوسط بھی جو اخبار الزمان کیساتھ تین جلدوں سے زیادہ میں شائع ہوئی
...وقت بالکل ناپید ہے۔ مروج الذہب کے مقدمہ میں (جو اس سلسلہ کی تیسری سنہری کڑی ہے) مصنف لکھتا ہے کہ:۔

"میں اس کتاب میں ان تمام باتوں کو مجمل طور سے بیان کروں گا جن کو اخبار الزمان میں بسط و تفصیل کیساتھ لکھ چکا ہوں اور ان
باتوں کو بھی اختصار کیساتھ عرض کروں گا جو کتاب الاوسط میں آچکی ہیں۔ غرضکہ یہ کتاب اخبار الزمان اور کتاب الاوسط
دونوں کے مطالب کا خلاصہ ہوگی۔"

مروج الذہب فن کی موجودہ عربی تصنیفات میں مشہور چیز ہے۔

حوقل

ابو محمد بن علی الموصلی نام اور ابن حوقل کنیت ہے۔ دسویں صدی کے اواخر میں بغداد میں پیدا ہوا۔ اور یہیں نشو و نما پائی۔
جس وقت مسعودی گوشہ نشین ہوچکا تھا۔ اس وقت ابن حوقل بلاد اسلامیہ کی سیاحت میں مصروف تھا۔ اور ۲۸ برس تک
(۹۴۳ء سے لیکر ۹۷۱ء تک) سفر کرتا رہا۔ سفر سے لوٹنے کے بعد ۹۷۶ء میں اس نے اپنے مشاہدات کو کتاب المسالک والممالک میں
...۔ اس کتاب میں زیادہ تر ممالک اسلامیہ ہی کے حالات تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں۔ اور غیر اسلامی شہروں کے متعلق بہت کم معلومات
...کی گئی ہیں۔ ابو الفدا نے اپنی مشہور تصنیف تقویم البلدان کے مقدمہ میں اس کتاب کا ذکر ان لفظوں میں کیا ہے:۔

"ابن حوقل کی یہ کتاب بہت ہی مطول ہے۔ مصنف نے ممالک کا حال نہایت ہی استقصاء کیساتھ بیان کیا ہے لیکن طول و عرض
اور اسماء مقامات وغیرہ کی تفصیل نظر انداز کردی ہے۔ اس طرح سے کتاب کا بیشتر حصہ ناقص اور مجہول الاسم رہ گیا ہے۔"

ابن حوقل نے اس کتاب میں ثروت بلاد۔ تجارت ملک۔ (ٹیکس اور محصول) پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اور راستوں کی مسافت کو

بھی خاص طور سے بیان کیا ہے۔ علماء یورپ نے ۱۸۷۳ء میں اس مفید تصنیف کو لیڈن میں شائع کیا۔ اور ۱۸۷۰ء میں یہیں پر ابو اسحق اصطخری کی مشہور تصنیف بھی شائع ہوگئی۔ اور لیڈن ہی کے کسی مشہور اہل قلم نے ان دونوں کتابوں کا جرمنی زبان میں ترجمہ بھی لکھا۔

دسویں صدی کی جغرافی تصنیفات میں ابو محمد حسین بن احمد الہمدانی النحوی المتوفی ۳۳۵ھ کی ایک کتاب المسالک والممالک اس کتاب میں مصنف نے یمن اور جزیرہ عرب کا حال پوری تحقیقات کیساتھ لکھا ہے۔ شیخ شمس الدین ابی عبداللہ۔ محمد بن احمد المقدسی الحنفی المعروف بابن البناء کی مشہور تصنیف احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم فن کی ایک جلیل القدر کتاب ہے۔ اس میں مصنف نے بلاد ممالک۔ برو بحر۔ جبل و انہار۔ طرق و مسالک۔ معاون و منابع کو بڑی خوبی کیساتھ بیان کیا ہے۔ مصنف اس کتاب کے متعلق خود لکھتا ہے کہ :-

"اگر اس کتاب کا دیکھنا مسافروں کے لئے ضروری ہے۔ تو علماء و رؤساء بھی اس سے مستغنی نہیں ہیں"

مصنف نے پہلے جہانتک ہوسکا اقالیم کی خود سیاحت کی۔ اور مختلف مسافتوں کو فرسخوں سے متعین کیا۔ اور جن چیزوں کا خود مشاہدہ نہیں کرسکا اُن کے متعلق معتبر لوگوں سے تحقیقات کی۔ ان سب کے بعد ۹۸۵ء میں ابن حوقل کے دس سال بعد اپنی یہ بینظیر کتاب تصنیف کی۔ ابو عمر محمد بن یوسف الکندی المتوفی ۹۶۱ء کی بھی ایک کتاب "خطط مصر" بھی اسی زمانہ کی ہے۔

عہد مسعودی میں بلاد اتل کے کسی امیر نے خلیفہ المقتدر باللہ کی خدمت میں یہ درخواست پیش کی کہ آپ میرے پاس کچھ ایسے لوگ بھیجیں جو ماہیت اسلام نماز روزہ کی تعلیم دے سکیں" خلیفہ المقتدر نے علماء اسلام کی ایک جماعت اس امیر کے یہاں بھیجی۔ جن میں احمد بن فضلان مولی۔ محمد بن سلیمان رئیس وفد کی حیثیت سے تھے۔ ابن فضلان نے اس سفر کا ایک مجموعہ مرتب کیا۔ اور اس میں وہ تمام واقعات تفصیل سے بیان کئے جو روانگی بغداد سے واپسی تک مشاہدہ میں آئے تھے۔ اور یہ سفر ۱۱ صفر ۳۰۹ھ (۹۲۱ء) کو ہوا تھا۔ ابن فضلان کا یہ رسالہ نادر الوجود ہے۔ بعض مصنفین کی تصنیفات میں اس کے کچھ کچھ احوال و واقعات ملتے ہیں۔ جو سرتاپا بلاد صقالبہ اور روسی اقوام کے احوال و عادات پر مشتمل ہیں۔ اسی قسم کا ایک دوسرا رسالہ اور ہے جس کو قسطنطین برفیو جینی نے بلدان شمالیہ کے متعلق اسی زمانہ میں تصنیف کیا تھا۔ اور ابن فضلان سے ۶۰ برس پہلے ابن خردادبہ نے بھی بلاد صقالبہ کا سفر کیا تھا۔ اور یہ پہلا سیاح ہے جس نے سب سے پہلے شمالی روس کی سیاحت کی۔ اور بحر ابیض کے کناروں پر رہنے والی قوموں کے حالات و واقعات کی کامیاب تحقیقات کی۔

(۳)

(۲۱) ان کے علاوہ مسلمانوں میں بہت سے ایسے بحری سیاح بھی پیدا ہوئے۔ ان سیاحوں میں بروایت مسعودی سب سے زیادہ مشہور بلکہ لحاظ زمانہ سب سے پہلے سلیمان نامی ایک تاجر گذرا ہے جو نویں صدی کے اواخر میں پیدا ہوا تھا۔ یہ شخص بحر فارس کے کنارے بلدۂ سیراف میں رہتا تھا۔ سیراف اس زمانہ میں فارس کی ایک بہت بڑی اور مشہور بندرگاہ تھی۔ فارس اور مشرق اقصیٰ کی تجارت کا دائرہ چونکہ اس عہد میں بہت زیادہ وسیع ہوگیا تھا۔ اس لئے تمام اطراف عالم سے حتیٰ کہ چین اور ایشیا سے بھی تجارتی جہازات اسی بندرگاہ کا رُخ کرتے تھے۔ سلیمان ایک تاجر تھا۔ اس لئے اسباب تجارت کی تلاش میں اُس نے سفر کرنا شروع کیا۔ اور اسی سلسلہ میں بحر ہند کو عبور کرکے

سیلون و ملاکا سے ہوتا ہوا چین پہنچا۔ اور پھر کچھ دنوں کے بعد وطن لوٹ آیا۔ سلیمان کے اس قیمتی سفرنامہ کو ابوزید بلخی نے ۹۱۶ء کے قریب اور مفید معلومات کا اضافہ کر کے مرتب کیا۔ اس کتاب کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں ہو چکا ہے۔ اور یہ کتاب ۱۷۱۸ء میں پیرس میں شائع بھی ہوگئی ہے۔ چینی بلاد کے متعلق یہ سب سے پہلی اور مفید کتاب ہے۔ علامہ رینوڈ نے ۱۸۴۵ء میں دوبارہ اس کا ترجمہ مع اصل عربی کے شائع کیا تھا۔ ابوزید احمد بن سہل البلخی المتوفی ۹۵۱ء کی ایک کتاب صور الاقالیم بھی ہے۔ اس کے علاوہ کتاب المسالک و الممالک اور کتاب البدء والتاریخ بھی انہی کی تصانیف عالیہ ہیں۔ جو فن کی بے نظیر کتابوں میں شمار کی جاتی ہیں۔

بیرونی بارھویں صدی عیسوی میں بھی بعض ایسے سیاح پیدا ہوئے جنہوں نے جغرافیہ میں بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔ اُن میں سب سے زیادہ قابل ذکر علامہ بیرونی کی ذات گرامی ہے۔ الشیخ العلامہ ابوالریحان محمد بن احمد البیرونی الخوارزمی المتوفی ۱۰۴۸ء ہیئت و نجوم۔ تاریخ و جغرافیہ کے بڑے ماہر تھے۔ چنانچہ ہیئت و نجوم میں "قانون مسعودی" اور تاریخ میں "الآثار الباقیہ عن القرون الخالیہ" آپکی مشہور تصنیفات ہیں۔ موخر الذکر تصنیف معلومات فن کا ایک قیمتی خزانہ ہے۔ اس میں مصنف نے مختلف جماعتوں کی تاریخ بیان کی ہے۔ اور فن تاریخ کے اختلاف اور مبادی و اصول کا بھی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ بیرونی ریاضیات اور علم ہیئت کا امام مانا جاتا ہے۔ اور یہ پہلا شخص ہے جس نے سندھ اور شمالی ہندوستان کے شہروں کی تحقیقات کر کے ان کے نقشوں کی غلطیاں درست کیں۔ خصوصاً بلدان اسلامیہ کی تحقیقات غیر معمولی اعتنا کے ساتھ کی۔ بیرونی گیارہ برس تک (۱۰۱۷ء سے لیکر ۱۰۳۰ء تک) سلطان محمود غزنوی کے ساتھ لڑائیوں کے سلسلہ میں یہاں پر رہا۔ ہندوؤں کی بعض سنسکرت تصنیفات کا عربی زبان میں ترجمہ کیا۔ بیرونی درحقیقت اُن مجتہدین عظام میں سے ہے جنہوں نے علوم و فنون کی غیر معمولی خدمات انجام دیں۔ الآثار الباقیہ کے بعض حصے پیرس میں فرانسیسی ترجمہ کے ساتھ شائع ہو چکے ہیں۔

شیخ ابو محمد الحسن بن احمد الہمدانی نے ۹۳۶ء میں ایک کتاب اسماء اماکن میں تصنیف کی۔ اور ابو عبید عبداللہ بن عبدالعزیز البکری الاندلسی المتوفی ۱۰۹۴ء نے جغرافیہ میں ایک عام کتاب "المسالک و الممالک" کے نام سے تصنیف کی۔ پھر ۱۰۶۷ء میں بلاد مغرب اور افریقہ کے متعلق کتاب المغرب مرتب کی۔ اس میں وادی نیل سے لیکر بحر اٹلانٹک تک اور بحر متوسط سے لیکر سوڈان تک کے حالات لکھے گئے ہیں۔ یہ کتاب بہت مختصر ہے۔ میرا خیال ہے کہ کتاب المغرب مصنف کی پہلی کتاب المسالک و الممالک سے ماخوذ ہے۔ پہلے یہ کتاب ۱۸۵۷ء میں جزائر میں شائع ہوئی تھی۔ پھر پیرس میں دوبارہ فرانسیسی ترجمہ کے ساتھ ۱۸۵۹ء میں شائع کی گئی۔ اس کے علاوہ مصنف کی ایک اور کتاب معجم بھی ہے جس میں عجمی اسماء اماکن کو درج کیا گیا ہے۔ یاقوت نے اس معجم کا تذکرہ کیا ہے اور یہ معجم اس وقت بھی یوروپ کے بعض کتب خانوں میں موجود ہے۔ اور یہ پہلا معجم ہے جو عربی زبان میں مرتب کیا گیا۔ لیکن مصنف نے اس میں صرف اُن ہی منازل عربیہ کے بیان پر قناعت کی ہے جو عربوں کے اشعار و اخبار میں پائے جاتے ہیں۔

ابو عبداللہ محمد بن سلامۃ القضاعی المتوفی ۱۰۶۲ء نے بھی ایک مشہور کتاب "خطط مصر" میں تصنیف کی جس کا نام "المختار فی ذکر الخطط والآثار" ہے۔ شیخ ابوالقاسم محمود زمخشری المتوفی ۱۱۴۳ء نے بھی ایک معجم تصنیف کی جو اگرچہ باعتبار حجم معجم بکری سے

زیادہ مختصر ہے۔ لیکن باعتبار صحت اس سے کہیں زیادہ مستند ہے۔ صاحب قاموس نے زمخشری کے اسی معجم سے بہت سے شہروں کے نام نقل کئے ہیں۔ اور اکثر مقامات میں اسی پر اعتماد کیا ہے۔ حقیقت میں فن کی یہ ایک بہت ہی مستند کتاب ہے۔ زمخشری کے شاگرد رشید علامہ ابوالحسن العمرانی نے اس کتاب میں اپنی طرف سے بہت سے اور قیمتی اضافے کرکے اسکو زیادہ شاندار بنادیا ہے۔ ۱۸۵۶ء میں یہ مفید تصنیف پیرس میں شائع ہوچکی ہے۔ اور لاطینی زبان میں اسکا ترجمہ بھی ہوچکا ہے۔ ابوالفتح نصر بن عبدالرحمٰن اسکندری المتوفی ۱۱۴۶ء کی ایک کتاب "اسماء البلدان" ہے۔ اس کے علاوہ ان کی ایک اور بھی تصنیف ہے۔ جس میں مقامات کے اختلاف کو بڑی خوبی سے بیان کیا گیا ہے۔ حافظ ابوموسیٰ محمد بن عمر الاصفہانی نے اس کتاب کا اختصار لکھا۔ یاقوت حموی اس کتاب کے متعلق لکھتا ہے کہ

"میں نے اسکو ایک محققانہ تالیف پایا۔ اسی وجہ سے میں نے اپنی معجم میں اس کتاب سے بہت جگہ نقل کیا ہے۔"

علی بن محمد الخوارزمی المتوفی ۱۱۶۴ء کی کتاب اشتقاق اسماء المواضع والبلدان بھی اس فن کی عمدہ کتاب ہے۔ "منازل عرب" کے بیان میں ابوالفضل محمد بن ابی القاسم البقالی الخوارزمی المتوفی ۱۱۶۶ء کی بھی ایک تصنیف ہے۔

ادریسی

شریف محمد بن محمد الادریسی الصقلی کی مشہور کتاب "نزہتہ المشتاق فی اختراق الآفاق" اس فن میں بے نظیر ہے۔ علامہ روجیر افرنجی حاکم صقلیہ (سسلی) کے لئے اسکو تصنیف کیا تھا۔ یہ کتاب سات اقلیموں پر مرتب کی گئی ہے۔ ادریسی نے اس کتاب میں بلاد وممالک کے اوصاف وحالات کو پوری تفصیل کیساتھ بیان کیا ہے۔ میل اور فرسخ کے حساب سے مسافتوں کی تعین بھی کی ہے لیکن باینہمہ ممالک کے طول وعرض کے کوئی بحث اس کتاب میں موجود نہیں ہے۔ بعض لوگوں نے اسکا اختصار بھی لکھا ہے۔ شریف ادریسی بارھویں صدی کے مشہور جغرافیہ دانوں میں ہے۔ طلب علم کے لئے پہلے قرطبہ کا سفر کیا۔ پھر وہاں سے صقلیہ (سسلی) چلا گیا۔ ادریسی چونکہ بہت بڑا فاضل اور روشن دماغ تھا۔ اس لئے فرمانروائے سسلی نے اسکو اپنی مصاحبت خاص میں لے لیا۔ اور وہ شاہی دربار میں رہنے لگا۔ اسی تعلق سے ادریسی نے اپنی مشہور تصنیف نزہتہ المشتاق" روجر کے نام پر لکھی۔ ۱۱۵۴ء میں جب اس تصنیف سے ادریسی کو فراغت ملی تو اس نے روجر کے لئے چاندی کا ایک مسطح کرہ بنایا جس کا وزن ۸۰۰ مارک تھا۔ اور اس کرہ پر تمام اقالیم مشہورہ کا نقشہ بنایا۔ ادریسی مسلم اور فرنگی جغرافیہ دانوں میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ جیرائیل صہیونی المتوفی ۱۶۴۸ء اور حنوری یوحنا حصرونی (جبل لبنان) دو مشہور فاضلوں نے اس کتاب کا لاطینی زبان میں ترجمہ کیا۔ جو ۱۶۹۴ء میں شائع ہوا تھا۔ پھر ۱۸۳۶ء میں اسکا فرانسیسی ترجمہ پیرس میں شائع کیا گیا۔ اس کتاب کا وہ حصہ جو مغرب۔ سوڈان۔ مصر۔ اندلس کے حالات میں ہے علیحدہ ۱۸۶۴ء میں فرانسیسی ترجمہ کے ساتھ لندن میں چھاپا گیا۔

ادریسی نے نزہتہ المشتاق" میں اگلے علماء فن کی تصنیفات سے بھی بہت کچھ مدد لی ہے۔ اور ذاتی مشاہدات کے علاوہ تجار وملاحین کے منقولات بھی بہت زیادہ ہیں۔ اس کتاب میں مختلف مقامات کے ۶۹ نقشے ہیں۔ جن کو ادریسی نے مذکورہ بالا کرہ سے بنایا ہے۔ اس کے علاوہ اس فن میں ادریسی کی ایک کتاب "روض الانس ونزہتہ النفس" بھی ہے۔ یہ کتاب نزہتہ المشتاق سے زیادہ عام ہے۔ ابوالفداء نے اس سے بہت مدد لی ہے۔ اور اسکا نام کتاب الممالک لکھا ہے۔ یہ کتاب بالکل نایاب ہے۔

کہا جاتا ہے کہ اس نادر الوجود تصنیف کا ایک نسخہ پیرس کے شاہی کتب خانہ میں موجود ہے۔
فن کی کتابوں میں ابو المجد اسمٰعیل بن ہبۃ اللہ الموصلی کی مشہور تصنیف مزیل الارتیاب عن مشتبہ الانساب بھی ایک عمدہ کتاب ہے۔ علامہ مؤید نے تقویم البلدان میں اسکا حوالہ دیا ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے ضبط انساب پر زیادہ توجہ کی ہے۔ ان کی ایک اور تصنیف "کتاب التفصیل" بھی ہے۔ ابو الحسن علی المراکشی کی کتاب الممالک والمسالک بھی فن کی ایک اچھی کتاب ہے۔ ابن الوردی نے اسکا تذکرہ اپنی کتاب میں کیا ہے۔ اس کے علاوہ شمس الدین محمد الانصاری الدمشقی کی کتاب نخبۃ الدہر فی عجائب البر والبحر اور شیخ ازری اسفرائینی کی کتاب عجائب الدنیا۔ ابن الجزار کی کتاب عجائب البلدان۔ ابو الحسن احمد الاشعری کی کتاب اللباب الی معرفۃ الانساب۔ ابو الفتح محمد بن جعفر الصمدانی کی کتاب اسماء البلدان۔ محب الدین النجار البغدادی المتوفی ۶۴۳ھ/۱۲۴۵ء کی کتاب عیون اخبار الدنیا۔ ابو القاسم مسلم بن محمود الشیرازی کی کتاب عجائب الاسفار وغرائب الاخبار۔ حسن بن احمد المہلبی کی کتاب المسالک والممالک المعروف بہ عزیزی جو عزیز باللہ الفاطمی فرمانروائے مصر کے نام پر تالیف کی گئی۔ اور ابو عبد اللہ الجیہانی وزیر خراسان کی کتاب الممالک الباب میں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ابو عبد اللہ فلسفہ اور نجوم کا بڑا ماہر تھا۔ اس نے غریب سیاحوں کو جمع کر کے مختلف ممالک کے حالات اور پیداوار کو دریافت کیا۔ اور راہوں کی کیفیت بھی تفصیل کے ساتھ پوچھی۔ تاکہ تسخیر ممالک اور فتوح بلدان میں آسانی ہو۔ ابو عبد اللہ نے دنیا کو سات حصوں پر تقسیم کیا۔ اور ہر اقلیم کا ایک کوکب مقرر کیا۔ لیکن بڑے بڑے شہروں کے علاوہ اور دیگر مقامات کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔ صرف راستوں کو البتہ بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ مصنف احسن التقاسیم لکھتا ہے کہ:۔

"اس کتاب میں صرف بڑے بڑے شہروں کے حالات لکھے گئے ہیں۔ اور بہت سی ضروری باتیں چھوڑ دی گئی ہیں اور ان کی جگہ ایسے غیر ضروری واقعات نے لے لی ہے جن کا درج کرنا مصنف کے شایان شان نہ تھا" الخ

فاضل خلیل ابن شاہین الظاہری کی کتاب زبدۃ کشف الممالک فی بیان الطرق والمسالک فضائل مصر میں ایک عمدہ کتاب ہے۔ ابن الجورانی کی کتاب الاشارات الی اماکن الزیارات بھی خاص طور پر لائق ذکر ہے۔ مصنف نے اس کتاب میں شروع سے آخر تک شہر دمشق کے حالات اور وہاں کی قبور صحابہ کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ شیخ علی بن ابی بکر السائح الہروی المتوفی بحلب سنہ ۶۱۱ھ (۱۲۱۴ء) کی ایک کتاب "منازل الارض ذات الطول والعرض" ہے۔ اس کے علاوہ ایک مختصر سی کتاب "الاشارات الی معرفۃ الزیارات" بھی ان ہی کی تصنیف ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے پہلے حلب کے مزارات ومشاہد کو بیان کیا ہے۔ پھر آگے سفر میں جتنے مقامات متبرک معلوم ہو سکے ہیں۔ ان سب کو بھی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ مصنف اسی کتاب میں ایک جگہ لکھتا ہے کہ:۔

"میں نے شام۔ عراق۔ خراسان۔ مغرب۔ یمن۔ جزائر وغیرہ کے شہروں میں بہت سے وہ مشہور آثار نہیں دیکھے جن کو اصحاب تواریخ نے بیان کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان قبور کے نشانات مرور زمانہ سے محو ہو گئے۔"

مصنف کی تصانیف جلیلہ کا ایک معقول حصہ بعض سفروں میں دریا برد ہو گیا۔ معلوم نہیں ان کتابوں میں کیا کیا جواہر پارے رہے ہونگے جن سے اسلامی لٹریچر کا دامن ہمیشہ کے لئے خالی ہو گیا۔ اس کے علاوہ مصنف چونکہ عرصہ تک اماکن مقدسہ کی زیارت

میں مختلف مقامات کا سفر کرتا رہا۔ اس لئے مشاہدات کا بیشتر حصہ خود اسے بھی یاد نہ رہا۔ چنانچہ مصنف نے دیباچۂ کتاب میں اسکی معذرت پیش کی ہے۔ لیکن بایں ہمہ اس کتاب میں شام و روم۔ بلاد فرنگ۔ ارض مقدس۔ دیار مصر۔ مغرب۔ جزائر بحر۔ جزیرہ اطراف ہند۔ حرمین۔ یمن۔ اور بلاد عجم۔ کے مزارات و مشاہد کا تفصیلی بیان موجود ہے۔ جس کو مصنف نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے بعد درج کیا ہے۔

تیرھویں صدی میں بھی مسلمانوں کے اندر ایک جید جماعت پیدا ہوئی جس نے جغرافیہ میں بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔ یہ جماعت سفر و سیاحت میں دوسروں سے زیادہ ممتاز ہے۔ ابن سعید المغربی الغرناطی الاندلسی جو غرناطہ میں ۱۲۱۴ء میں پیدا ہوا اور ٹیونس میں ۱۲۸۶ء کے حدود میں وفات پائی۔ اس جماعت کا سردار ہے۔ ابن سعید پہلے قاہرہ۔ حلب۔ دمشق وغیرہ ہوتا ہوا مکہ مکرمہ گیا۔ اور حج سے فارغ ہونے کے بعد جب وطن واپس آیا تو اس سفر حجاز کا ایک مجموعہ مرتب کیا جس کا نام "النفحۃ المسکیہ فی الرحلۃ المکیہ" ہے۔ اس کے بعد ۶۵۲ھ میں افریقہ کی سیاحت کی۔ اور ۶۶۶ھ میں ٹیونس سے مشرق کا سفر کیا۔ ابن سعید نے جغرافیہ میں بہت سی کتابیں لکھیں۔ جن میں سے دو تو مشرق و مغرب کے متعدد سفروں کا عجیب و غریب مجموعہ ہیں۔ ان میں سے ایک کا نام "المغرب فی حلی المغرب" ہے۔ اور دوسری کا "المشرق فی حلی المشرق" ہے۔ ان کے علاوہ بقیہ دوسرے اسفار کے حالات کا دلچسپ مجموعہ ایک کتاب "عدۃ المستجز وعقلۃ المستوفز" ہے۔ لیکن ابن سعید کی تصنیفات میں بہت سی غلط اور دور از کار روایات بھی پائی جاتی ہیں۔ چونکہ ابن سعید قدماء کی کتابوں سے احوال و واقعات کو بغیر کسی نقد و نظر کے صرف نقل کر لیا کرتا تھا۔ اس لئے اسکی تصنیف میں ایسے اغلاط کا ہونا ضروری تھا۔ چنانچہ بلاد مغرب اور اندلس کے متعلق ابن سعید نے جو غلط روایات اپنی تالیف میں درج کر دی تھیں۔ ان کو بعد میں (ابوالحسن المراکشی نے ایک دوسری) کتاب میں درست کیا۔ ابوالفداء نے اپنی مشہور تصنیف تقویم البلدان میں ممالک کے عرض و طول کے بیان میں ابن سعید کی اسی کتاب کو اپنا ماخذ بنایا ہے۔ اس لئے وہ بھی غلطیوں سے اپنے آپ کو نہ بچا سکے اور ان کی کتاب میں بھی یہ تمام خامیاں باقی رہ گئیں۔

یاقوت

یاقوت حموی کی مشہور تصنیف معجم البلدان فن کی اتنی مشہور کتاب ہے کہ تعارف کی ضرورت نہیں۔ شیخ امام الدین شہاب الدین ابو عبداللہ یاقوت بن عبداللہ حموی البغدادی یونانی مولد تھے۔ بچپن ہی میں گرفتار ہو کر بغداد کے کسی حموی تاجر کے ہاتھ فروخت ہو گئے۔ اپنے آقا کے سایۂ عطوفت میں انہوں نے نشو و نما پائی۔ اور عربی زبان کا مطالعہ شروع کیا۔ اور بہت سے علوم کی تحصیل کی۔ جب جوان ہوئے تو مالک نے ان کو تجارت میں لگا دیا۔ اس سلسلہ میں وہ مختلف ممالک کا سفر کرنے لگے۔ جب مالک نے یاقوت کو آزاد کر دیا تو یہ اپنی ذاتی تجارت کرنے لگے۔ جس میں کتابوں کی تجارت بھی شامل تھی۔ یاقوت کو اس تجارت نے علمی فائدہ بہت زیادہ پہنچایا۔ چنانچہ تھوڑے ہی دنوں میں وہ تقریباً تمام علوم پر قادر ہو گئے۔ مزید براں معلومات سفر کا قیمتی اضافہ اور سونے میں سہاگہ ہو گیا۔ یاقوت نے بلاد عرب۔ مصر۔ شام۔ جزیرہ۔ خراسان سے لیکر نہر جیحون کے کنارے تک سیاحت کی تھی۔ اور بعض روایتوں سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اسی سلسلہ میں انہوں نے قسطنطنیہ کا بھی سفر کیا تھا۔ اور

۱۲۲۰ء کے قریب وہ خوارزم بھی آئے تھے۔ جب چنگیز خاں تاتاریوں کے ساتھ مصروف پیکار تھا۔ اس لئے وہ پھر بلاد شام کی طرف واپس چلے گئے۔ اور یہیں ۱۲۲۹ء میں انہوں نے وفات پائی۔

یاقوت کی کتاب معجم البلدان جغرافیہ کی ایک جلیل القدر تصنیف ہے۔ یہ کتاب حروف معجم کی ترتیب پر مرتب کی گئی ہے۔ اور اس میں تمام مقامات کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ بلاد و ممالک۔ پہاڑ۔ وادیاں۔ گاؤں۔ قصبات۔ دریا معدن وغیرہ کے مفصل تذکرے موجود ہیں۔ دنیا کو سات اقلیم پر تقسیم کیا گیا ہے۔ ہر ملک کی آب ہوا اور دیگر خصوصیات کو بھی بیان کیا ہے۔ صحابہ۔ تابعین اور صلحائے امت وغیرہم کے مزاروں کے حالات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اور ان لوگوں کے مراثی بھی دواوین سے نقل کئے ہیں۔ بعض یورپین سیاحوں کے حالات بھی درج کئے ہیں۔ غرض یہ کہ فن کی یہ ایک بڑی جامع تصنیف ہے۔

۶۱۵ھ مطابق ۱۲۱۸ء میں جب وہ "مرو الشاہجان" میں تھا۔ تو یہیں اس کتاب کے لکھنے کے بعض اسباب پیدا ہوئے مصنف کو اس کتاب کے ختم کرنے میں جو دشواریاں پیش آئیں ان کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ یاقوت ۶۲۱ھ میں اس کتاب سے فارغ ہوا۔ لیکن تصحیح کے لئے دوبارہ کئی مرتبہ نظر ثانی کی۔ یورپ کے کتب خانوں میں اس کتاب کے متعدد نسخے موجود ہیں۔ ایک تو وہ قدیمی نسخہ ہے جس کی نقل ۶۲۵ھ میں ہوئی تھی۔ اس نسخہ کی نقل آٹھ جلدوں کے اندر ۱۸۶۶ء میں لیپیک میں شائع کی گئی۔ یاقوت کی اسی قسم کی ایک اور مختصر کتاب ہے۔ جو اسی معجم البلدان سے بہ ترتیب حروف انتخاب کر کے لکھی گئی ہے۔ یہ کتاب بھی گوتنجن میں ۱۸۴۶ء میں شائع ہو چکی ہے۔ یاقوت اپنی معجم کا ایک بہترین اختصار "مراصد الاطلاع" کے نام سے لکھ رہے تھے لیکن ابھی کتاب ختم نہ ہوئی تھی کہ خود ان کی عمر ختم ہو گئی۔ اس اختصار کو ان کے بعد صفی الدین عبدالمومن بن عبدالحق نے پورا کیا۔ جو یورپ کے بعض کتب خانوں میں موجود ہے۔ اور اچھی چیز ہے۔ شاید جرمنی میں یہ کتاب عنقریب چھپنے والی ہے۔

قزوینی

زکریا بن محمد القزوینی تیرھویں صدی کے آغاز میں پیدا ہوا اور ۱۲۸۳ء میں وفات پائی۔ جغرافیہ میں ایک مشہور کتاب "آثار البلاد و اخبار العباد" کے نام سے لکھی۔ جو ایک مقدمہ اور سات اقالیم پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ ۱۲۷۵ء میں قزوینی نے ایک دوسری کتاب "عجائب المخلوقات" اسی فن میں تصنیف کی۔ لیکن اس کتاب میں رطب و یابس سب کچھ ہے۔ یہ دونوں کتابیں گوتنجن میں ۱۸۴۹ء میں شائع ہو چکی ہیں۔ قزوینی چونکہ تاریخ طبعی کا بڑا ماہر تھا۔ اس لئے بعض ماہرین فن اسکو بھی "مشرق کا بلینوس" کہتے ہیں۔ زین الدین عمر بن المظفر بن الوردی المتوفی ۱۳۴۸ء کی بھی ایک کتاب اس فن میں "خریدۃ العجائب و فریدۃ الغرائب" ہے۔ اس کتاب کے پہلے حصہ میں اقالیم و بلدان کے حالات بیان کئے گئے ہیں اور دوسرے حصہ میں بعض معادن و نباتات کے احوال سے بحث کی گئی ہے۔ یہ کتاب یورپ کے بعض کتب خانوں میں موجود ہے لیکن تعداد زلات اور کثرت اغلاط کی وجہ سے ناقابل توجہ سمجھی جاتی ہے۔ قاضی تاج الدین بن المتوج المتوفی ۱۳۲۹ء کی کتاب "ایقاظ المتامل وایقاظ المتغفل" بلاد مصر کے بیان میں بہترین تصنیف ہے۔

چودھویں صدی عیسوی کے مشاہیر جغرافیہ دانوں میں ابو الفدا سب سے زیادہ نامور ہے۔ ابو القاسم محمد النویری المالکی نے

بھی جغرافیہ میں ایک کتاب تصنیف کی۔ لیکن متقدمین کی روایات کے سوا کوئی نئی بات نہیں لکھی۔ شمس الدین ابو عبد اللہ محمد بن احمد بن عثمان المصری المتوفی ۱۳۴۷ء نے (جو ذہبی کے نام سے مشہور ہیں) ایک معجم صغیر تصنیف کی۔ عبد الرشید بن صالح بن نوری المتولد ۱۳۹۷ء کی ایک مشہور کتاب "تلخیص الآثار فی عجائب الاقطار" اسی صدی کی تصنیف ہے۔

ابو الفداء الملک المؤید عماد الدین اسمٰعیل بن علی بن ایوب بن شاذلی (حاکم حماۃ) ۱۲۷۳ میلاد میں پیدا ہوا۔ اور رفتہ رفتہ الملک الناصر محمد بن قلادون کی بارگاہ میں رسائی حاصل کر کے خدمت سلطانی میں رہنے لگا۔ یہاں تک کہ تھوڑے ہی دنوں میں خلیفہ نے اسکو "حماۃ" کا فرمانروا بنا دیا۔ ابو الفداء فقہ۔ طب اور حکمت کے علاوہ علم ہیئت میں بھی بڑا ماہر تھا۔ ۱۳۳۱ء میں اس نے وفات پائی۔ جغرافیہ میں اسکی مشہور کتاب تقویم البلدان ۱۸۴۰ء میں پیرس سے شائع ہوئی۔ اور پوری کتاب کا ترجمہ لاطینی زبان میں ہوا۔ اس کے بعض حصے فرانسیسی زبان میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔ ابو الفداء مقدمہ کتاب میں لکھتا ہے:۔

> میں نے اس مختصر کتاب میں وہ تمام معلومات یکجا جمع کر دی ہیں جو بہت سی کتابوں میں منتفرق طور سے موجود تھیں۔ اور میں اپنی اس تالیف کو اسی طریقہ پر مرتب کرونگا۔ جس طریقہ پر ابن جزلہ نے اپنی مشہور طبی کتاب تقویم الابدان کو تصنیف کیا ہے۔ چنانچہ اسی انداز پر میں اپنی کتاب کا نام بھی تقویم البلدان رکھتا ہوں۔ اور سب سے پہلے میں بھی اُن ہی باتوں کو بیان کرونگا جو روئے زمین کے حالات جاننے میں ضروری ہیں"۔

ابو الفداء نے اس کتاب میں مبادیات فن کے بعد پہلے ملکوں کی تقسیم کی ہے۔ پھر شہروں کے نام۔ ان کا طول و عرض۔ اور وہاں کے حالات تفصیل کیساتھ لکھے ہیں۔ لیکن بایں ہمہ یہ کتاب ان اغلاط سے پاک نہیں ہے جن کو مصنف نے قدماء کی کتابوں سے بغیر کسی نقد و نظر اور بحث و تمحیص کے نقل کر لیا ہے۔ مگر پھر بھی ابو الفداء کی یہ کتاب بہت ہی قیمتی اور معلومات فن کا گرانقدر خزانہ ہے۔

ابن بطوطہ ابن عبد اللہ محمد بن ابراہیم اللواتی الطنجی المشہور بہ ابن بطوطہ مصنف تحفۃ النظار فی غرائب الامصار و عجائب الاسفار سیاحان اسلام میں سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ ابن بطوطہ ۱۴-حزیران ۱۳۲۵ء کو اپنے وطن طنجہ سے بغرض سیاحت نکلا۔ مغرب۔ افریقہ۔ طرابلس۔ برقہ۔ مصر۔ فلسطین۔ بلاد شام اور حلب سے ہوتا ہوا دمشق آیا۔ اور یہیں سے حج کے ارادہ سے مکہ مکرمہ روانہ ہوا۔ اور زیارت بیت اللہ کے بعد نجد ہوتا ہوا پھر شام لوٹ آیا۔ عجم و عراق اور مابین النہرین کے شہروں میں گھومتا ہوا بحر بربرہ کو عبور کر کے مشرقی افریقہ کے ساحلوں پر پہنچا۔ پھر جزیرہ عرب کے جنوبی حصہ کی سیاحت کرتا ہوا ہرمز آیا۔ اور جزائر بحر فارس میں (جو موتیوں کی غواصی میں مشہور ہے) کچھ دنوں تک مقیم رہا۔ اور دوسری مرتبہ پھر حج بیت اللہ کے ارادہ سے مکہ روانہ ہوا۔ حج سے فارغ ہونے کے بعد شام ہوتا ہوا اناضول آیا۔ اور یہاں سے قرم جانے کے لئے دریائی سفر شروع کیا۔ اور بلاد قبچاق (جنوبی روس) و بلغار وغیرہ کی سیاحت کی۔ بلغار اس زمانہ میں پایۂ تخت تھا۔ ابن فضلان نے اپنے سفرنامہ میں یہاں کے حالات بڑی تفصیل کیساتھ لکھے ہیں۔ بلغار کے آثار قدیمہ ابتک تھراسل کے کناروں پر قایم ہیں۔

ابن بطوطہ نے شمال میں تموره کی اس آخری حد تک سفر کیا تھا۔ جہاں سے "ارض ظلمات" کی سرحد شروع ہوتی ہے۔ بلغار اور ارض ظلمات کے درمیان ۴۰ دن کی مسافت ہے۔ ابن بطوطہ نے ظلمات میں بھی جانے کی کوشش کی لیکن چند ناگزیر وجوہ کی بنا پر اس ارادہ میں کامیاب نہ ہوسکا۔ ابن بطوطہ خود بیان کرتا ہے کہ:-

"ظلمات کی طرف اُن چھوٹی چھوٹی گاڑیوں میں سفر کیا جاتا ہے جن کو بڑے بڑے کتے کھینچتے ہیں۔ چونکہ اس طرف برف بہت ہوتی ہے اور برف پر نہ کسی آدمی کا قدم تھمتا ہے اور نہ کسی چوپائے کی کھر۔ اس لئے گاڑیوں میں کتے جوتے جاتے ہیں۔ جن کے ناخن دار قدم ان کو پھسلنے نہیں دیتے۔ لیکن ان سواریوں میں صَرف بہت ہوتا ہے۔ اس لئے اس خطہ میں مالداروں کے سوا کوئی اور نہیں جا سکتا"

اس کے بعد ابن بطوطہ نے قسطنطنیہ کا سفر کیا۔ اور وہاں ایک مدت تک مقیم رہا۔ پھر قفقاز ہوتا ہوا بحر الخضر کے شمالی شہروں کی سیاحت کی۔ پھر خوارزم (خیوا) بخارا۔ خراسان۔ قندہار۔ وادیٔ سندھ سے ہوتا ہوا دہلی آیا۔ اور دو برس تک بحیثیت قاضی دہلی میں رہا۔ اس کے بعد وہ چین کے ارادے سے روانہ ہوا۔ کنبایت۔ کالی کٹ۔ جزائر ملدیو۔ لنکا۔ سماترا۔ جاوا وغیرہ کا سفر کرتا ہوا چین پہنچا اور خان بالق (پیکن) میں جو پایۂ تخت سلطنت ہے کچھ دنوں مقیم رہا۔ پھر یہاں سے مغربی ممالک کی سیاحت کے لئے آگے بڑھا۔ اور تقریباً ۲۴ برس تک مسلسل گھر سے باہر رہنے کے بعد ۱۳۴۹ء کے قریب طنجہ اپنے وطن واپس آیا۔ لیکن کچھ دن نہ گزرے تھے کہ پھر سفر کی تیاری شروع کردی۔ اور پہلے اندلس آیا اور یہاں سے غرناطہ چلا گیا۔ ۱۳۵۲ء میں سلطان مراکش کی طرف سے قاصد بنکر سوڈان گیا۔ اور سوڈان میں دریائے ٹمبکٹو کے اس پار تک کے ممالک کی سیاحت کی۔ پھر فاس واپس آیا۔ اور یہیں ۱۳۷۷ء میں اسکا انتقال ہوا۔

ابن بطوطہ کا یہ سفرنامہ چار جلدوں میں بمقام پیرس ۱۸۵۳ء میں شائع ہوچکا ہے۔ بعض لوگوں نے فرانسیسی زبان میں بھی اسکا ترجمہ لکھا ہے۔ یہ سفرنامہ عجیب و غریب معلومات فن کا ذخیرہ ہے۔ اگرچہ اس میں بہت ہی غیر محقق اور مضطرب روایات بھی موجود ہیں۔ مگر باینہمہ ارباب ذوق کے لئے اس میں بہت کچھ سرمایۂ دانش و اعتبار اور مایۂ بصیرت و معلومات موجود ہے۔

اس کے علاوہ اور بھی بعض علماء اعلام کے متعدد چھوٹے چھوٹے سفرنامے ہیں۔ جن میں سفرنامہ شیخ ابن حبیب۔ سفرنامہ ابن جبیر (جو جرمنی میں شائع ہوچکا ہے) سفرنامہ ابن خلدون (یہ بہت ہی نادر اور نایاب ہے) سفرنامہ ابن رشید۔ سفرنامہ ابن الصلاح۔ سفرنامہ ابو القاسم المنجیبی۔ سفرنامہ بدر الدین بن رضی الدین الغزی۔ سفرنامہ شیخ جلال الدین سیوطی۔ سفرنامہ کتانی اور سفرنامہ محمد بن رشید الملالکی وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

مقریزی اس مقالہ میں اب تک جن ممتاز ہستیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان کے بعد سب سے زیادہ جلیل القدر ہستی علامہ تقی الدین المقریزی المتوفی ۱۴۴۲ء کی ہے۔ جغرافیہ میں آپ کی کتاب "المواعظ و الاعتبار بذکر الخطط و الآثار" مشہور تصنیف ہے۔ برہان الدین ابراہیم البقاعی المتوفی ۱۴۸۰ء نے بھی ۸۷۴ھ میں ایک کتاب "اسفار عن اشرۃ الاخبار" لکھی۔ جو فن کی بہترین تصنیفات میں شمار کی جاتی ہے۔ محمد بن ایاس المتوفی ۱۵۱۶ء کی ایک کتاب ہے جس کو مصنف نے تواریخ امم سے اخذ کیا ہے

اس کتاب کے شروع میں کسی قدر علم ہیئت کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے بعد مصر وغیرہ کے عجائبات کی تفصیل ہے۔ پندرھویں صدی کے آخر میں غرناطہ کے اندر حسن نامی ایک مسلمان سیاح پیدا ہوا۔ یہ مغرب کے شمالی ممالک کی سیاحت میں مصروف تھا کہ ۱۵۱۷ء میں دو نصرانی سپاہیوں نے اس کو گرفتار کر لیا۔ اور قید کر کے پاپائے دہم کے پاس بھیجدیا۔ حسن یہاں پہنچکر عیسائی ہو گیا۔ اور رومتہ الکبریٰ (اٹلی) میں رہنے لگا۔ حسن اٹلی لاطینی اور عربی تینوں زبانوں کا بڑا ماہر تھا۔ اُس نے عربی میں افریقہ کا ایک جغرافیہ لکھا۔ پھر ۱۵۲۶ء میں اسی جغرافیہ کو اٹلی زبان میں منتقل کر دیا۔ یہ کتاب معلومات فن کا ایک قیمتی خزانہ ہے۔ اس کتاب کا فرانسیسی اور لاطینی زبان میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔ کاتب چلپی یا علبی خلیفہ مصنف جہاں نما المتوفی ۱۶۵۷ء اس سلسلہ الذہب کی آخری کڑی ہے۔ مصنف نے اپنی تالیف میں انگریزی کی کتابوں سے بہت زیادہ مدد لی ہے۔ اور پرتگال و اسپین کے سیاحوں کی روایات کو زیادہ اہتمام کے ساتھ بیان کیا ہے۔

بدر اصلاحی

بعض کتابوں کی رعایتی قیمت صرف خریداران نگار کے لئے

نام کتاب		اصلی قیمت	رعایتی قیمت	نام کتاب		اصلی قیمت	رعایتی قیمت
نگارستان	(نیاز فتحپوری)	عہ	عمر	فراست التحریر		عہ	۸ر
جالستان	(نیاز فتحپوری)	للعہ	سے	شاعر کا انجام	(نیاز فتحپوری)	۱۰ر	۸ر
ترغیبات جنسی	(نیاز فتحپوری)	سے	عہ	فلسفۂ مذہب۔		عہ	۸ر
مجموعۂ استفسار و جواب	(نیاز فتحپوری)	سے	عہ	لالہ رُخ۔		عہ	۱۲ر
حکمائے قدیم کا فلسفہ چند گھنٹے	(نیاز فتحپوری)	عہ	۸ر	مثنوی زہر عشق معہ تصاویر و مقدمہ		عمر	عہ
مذاکرات نیاز	(نیاز فتحپوری)	۱۲ر	۶ر	فلسفۂ شوپنہار		عمر	عہ
جذبات بھاشا	(نیاز فتحپوری)	۱۲ر	۶ر	سہیلے		۸ر	۴ر
فراست الید	(نیاز فتحپوری)	عہ	۸ر	گلابی اردو		۶ر	۴ر

(۱) محصولڈاک ذمہ خریدار ہوگا۔ لیکن تمام کتابیں ساتھ طلب کرنے پر محصولڈاک بھی نہیں لیا جائیگا۔

(۲) یہ رعایت صرف خریداران نگار کے لئے ہے اس لئے ان کو اپنا نمبر خریداری بھی درج کرنا چاہئے۔

(۳) یہ رعایتی قیمت صرف اخیر جون ۱۹۳۵ء تک ہے۔ اسکے بعد شاید اس سے فائدہ اٹھانیکا موقعہ نہ ملے۔

منیجر نگار لکھنؤ

دیر و حرم کے قصے

جہاں آرا اور چھتر سال

(مسلسل)

جو بات میں نے اس رات کو ٹھانی تھی اُسے کر گذری۔ دوسرے روز میں نے اپنے محبوب کو خط لکھ بھیجا۔ جب میر ناظر خط کا جواب لایا تو میں نے سواری کا حکم دیا۔ دہلی کے شہر سے تھوڑے ہی فاصلہ پر جاکر ایک قدیم مسجد ہے۔ اس کی صورت ویران قلعہ کی سی ہے۔ میں وہاں پہنچی۔ ہوا چل رہی تھی۔ آس پاس کے درختوں سے ایک عجیب قسم کی لطیف خوشبو آ رہی تھی۔ مسجد کے برابر سڑک پر ایک یوگی مرگ چھالا بچھائے بیٹھا تھا۔ اسکا کمنڈل اور ڈنڈا اسکے پاس رکھا ہوا تھا۔ وہ دھیمی آواز سے کچھ کبت پڑھ رہا تھا۔ جن کا مطلب یہ تھا " دنیا ناپائیدار ہے اے بیوقوف تو اس میں پائیداری ڈھونڈھتا ہے! یہ دارالمحن ہے اور تو خوشی کا جویا!" یہ جوگی آنکھوں کا اندھا تھا۔ میں نے اسکی جھولی میں چند اشرفیاں ڈالیں۔ اور اسکی متوقع رہی کہ اسکی زبان سے میری آنیوالی زندگی کے متعلق کچھ نکلے۔ یوگی بولا: " اپنی اشرفیاں واپس لے لے میرے کس کام آئیں گی۔ تیری آتما تو سکھ دکھ دونوں سے اونچی ہے تو سکھ کے کھوج میں کیوں باولی ہو رہی ہے؟" یہ کہکر وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور چلدیا۔ میں کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن نہ کہہ سکی۔ پاس ہی کنوئیں کی جگت پر بیٹھ کر میں نے اپنے محبوب کا خط کھولا اور پڑھنے لگی۔ یہ پیامِ شوق اپنی شرافت اور سادگی کے لحاظ سے آپ اپنا نمونہ تھا۔ اس نے مجھے " دیوی " کے لفظ سے خطاب کیا تھا۔ اور لکھا تھا کہ اگر میں سنجوگتا بھی ہوتی تو وہ قنوج پر پرتھوی راج کی طرح دھاوا مار کر مجھ کو لے آتا۔" اس نے مجھے سنجوگتا کے یہ لفظ یاد دلائے تھے کہ " ہم عورتیں جھیل کے پانی کی طرح ہیں اور تم مرد اُن ہنسوں کی طرح جو جھیل کی سطح پر تیرتے ہیں۔ اگر تم کو ہمارے سینہ سے جدا کر لیا جائے تو تم کس طرح رہ سکتے ہو۔" مجھے اس پیامِ شوق کا ایک ایک لفظ ازبر تھا۔ میں خوشی سے پھولوں نہ سماتی تھی۔ جس وقت میں نے شہر کا رخ کیا تو مجھ کو ہر چیز جادو بھری معلوم ہوتی تھی۔ شہر کا نظارہ عجیب لطف پیدا کر رہا تھا۔ انسان اور حیوان، چرند اور پرند سب خوش خوش نظر آتے تھے۔ بازاروں میں آدمیوں کی چہل پہل سے میلہ لگا معلوم ہوتا تھا۔ جب میں چاندنی چوک سے گذر رہی تھی شاہی دربار کا وقت تھا۔ سجے سجائے ہاتھیوں اور گھوڑوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ لوگ زرق برق پوشاکیں پہنیں جوق جوق

چلے جارہے تھے۔ ہر طرف سے صندل۔ اور زعفران، مشک اور عنبر کی لپٹیں چلی آرہی تھیں۔ دوکانیں زر و جواہر سے چمک دمک رہی تھیں۔ سڑک پر عورتوں کے پازیبوں کی جھنکار۔ ان کے رنگ برنگ دوپٹے۔ سروں پر پانی کی مٹکیاں۔ اور گھونگھٹوں سے ان کی مست ناز نگاہیں عجیب لطف پیدا کر رہی تھیں۔ مکانوں کی چھتوں سے رنگ برنگ پتنگ اڑائے جارہے تھے۔ شاہجہان آباد بھی کتنا خوبصورت شہر ہے۔ میں نے سوچا کہ میں یہاں ایک ایسی عالیشان اور آرام دہ سرائے بنواؤں گی۔ جس کا جواب کہیں ہندوستان بھر میں نہ ہو۔ ملک کے تمام اطراف کے لوگ یہاں آئیں گے۔ قیام کریں گے اور آرام پائیں گے۔ میرا نام زندہ جاوید رہیگا۔ اور غربا دونوں میں مالا مال کر دونگی۔"

یہ سوچتی ہوئی میں شاہی محل کے میدان کے قریب پہنچی۔ میں نے یہاں سواری کو ایک طرف کھڑا کر دیا۔ یہ مقام بھی چاندنی چوک کی طرح شارع عام ہے۔ یہاں بھانت بھانت کا پنچھی بولتا ہے۔ دنیا کی ہر قوم و ملت کے مسافر اور تاجر یہاں آکر جمع ہوتے ہیں۔ زنجبار اور شام۔ خراسان اور تاجکستان۔ کابل اور ترکستان۔ مصر و روم۔ چین و عرب حتیٰ کہ انگلستان اور ہالینڈ کے لوگ بھی یہاں دکھائی دیتے اور ملتے جلتے ہیں۔ پھلوں اور پھولوں کی کمی نہیں۔ انگور و انار سیب اور سنتروں کے انبار کے انبار لگے ہوتے ہیں۔ پھولوں اور ہاروں سے دوکانیں لدی ہوتی ہیں۔ طرح طرح کے کھانے پک رہے ہیں۔ جن کی خوشبو ہر تھکے ماندے کو للچاتی ہے۔ قریب ہی رمال بیٹھے فال نکال رہے ہیں۔ عورتیں برقعہ پہنے آتی ہیں۔ ڈرتے ڈرتے ان سے کچھ پوچھتی ہیں۔ ان کے ہاتھ میں دام رکھتی ہیں اور خوشی خوشی چلی جاتی ہیں۔ منصب دار۔ جاگیردار۔ رئیس اور راجہ اپنے اپنے جلوس اور جھنڈوں کے ساتھ دیوان عام کی طرف جا رہے ہیں۔ ہاتھیوں۔ گھوڑوں کا تانتا لگا ہوا ہے۔ گھنٹے اور نرسنگھے بج رہے ہیں۔ طوائفیں بھاری بھاری پشوازیں پہنے زیور سے لدی پالکی نشین پردوں کے اندر سے اپنی جھلک دکھا رہی ہیں۔ میں ایک طرف علیحدہ کھڑی یہ سب تماشہ دیکھ رہی ہوں لیکن میرا دل اپنے محبوب کا ہے۔ میں راؤ راجہ کے انتظار میں ہوں کہ وہ کب ادھر سے نکلتا ہے۔ مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ تھوڑی ہی دیر بعد اس کا رسالہ دکھائی دیا۔ سب سے آگے وہ جوان رعنا اپنے سمند پر سپاہی کی پوری شان سے بیٹھا ہوا نظر آیا۔ جوں ہی اس کی نظر مجھ پر پڑی وہ ٹھہر گیا۔ اور گھوڑے سے اتر کر ایک خاص ادا کیساتھ مجھے سلام کیا۔ میں نے اپنے گلے سے موتیوں کا کنٹھا اتارا اور چند سطریں لکھ کر اپنے ناظر کے ہاتھ اسکو بھیجیں۔ اس نے جھک کر دوبارہ سلام کیا۔ سینہ پر ہاتھ رکھ کر گردن جھکائی۔ اور ایک لمحہ بعد نظروں سے غائب ہو گیا۔ اس لمحہ کی یاد مدتوں دل میں گدگدی پیدا کرتی رہی۔ اور اسکی تصویر میرے دل پر نقش ہو گئی۔

اب میں ایک دن کا واقعہ سناتی ہوں کیونکہ یہ حادثہ بھی یادگار ہے۔ اس زمانہ میں گلرو بائی نامی ایک رقاصہ میری بڑی چہیتی تھی۔ وہ مجھ کو اپنے رقص و سرود سے اکثر شام کیوقت محظوظ کیا کرتی تھی۔ اس نے ایک نیا ناچ ایجاد کیا تھا ایک روز شام کے وقت وہ مجرے کیلئے آئی۔ حسن زیبائش کا پیکر تھی۔ اسکا بناؤ سنگھار غضب کا تھا۔ اس نے ناچنا شروع کیا۔ ناچتے ناچتے وہ ایک ادا کیساتھ کمرہ سے نکلکر میری نظروں سے غائب ہونے لگی۔ میں بھی کیفیت وارفتگی میں اسکا

تعاقب کرنے لگی - ہم محل کے دالان سے گذر رہے تھے - دیوار کے سہارے رنگ برنگ کے کنول روشن تھے - کچھ کچھ ہوا چل رہی تھی۔ ایک جھونکا آیا کنول کو بھڑکا یا جس سے گلرو کے دوپٹہ میں آگ لگ گئی - اور دم کے دم میں شعلے بھڑکنے لگے - اور گلرو بدحواس چیختی چلاتی بھاگی - میں اسکو بچانے لگی تو شعلوں نے مجھے بھی گھیر لیا - ہم لوگ دیوان خاص کے قریب تھے - جہاں شہنشاہ رؤساء اور سرداروں سے مشورہ کر رہے تھے - اگر میں چاہتی تو چیخ پکار کر فوراً مدد حاصل کر سکتی تھی - میں جانتی تھی کہ راؤ راجہ بھی دیوان خاص میں موجود ہے - وہ آسکتا تھا - اور لوگ بھی دوڑ دھوپ کر سکتے تھے - لیکن شرم نے اجازت نہ دی - اور میں ہفتوں صاحب فراش رہی - اسی زمانہ میں میرے راکھی بند بھائی کو اورنگ زیب کیساتھ ایک مہم پر جانا پڑا - مگر جانے سے پیشتر اس نے گویا میرے گلوبند کے جواب میں ایک کنچلی بھیجی - کنچلی سنہرے کمخواب کی تھی - اس میں موتیوں کی گوٹ لگی تھی۔ ہیرے اور موتیوں کے ٹنکے حد درجہ خوبصورت تھے - مجھے شکریہ کا خط بھیجنا لازم تھا - میں نے اپنے محبوب کو لکھا کہ اگر وہ مجھے اپنی تصویر ہاتھی دانت پر نقش کرا کر بھیج سکے تو وہ مجھ کو کنچلی سے بھی زیادہ عزیز ہوگی - خط کے بھیجنے کے بعد کچھ زمانہ انتظار میں گذرا - بالآخر جواب آیا - بیتابی سے کھولا اور پڑھا - پڑھتے ہی زمین پاؤں تلے سے نکل گئی - آنکھوں میں اندھیرا سا آنے لگا - دل بیٹھا جاتا تھا - غم و غصہ طبیعت میں ہیجان پیدا کر رہے تھے - ضبط سے کام لیا دوبارہ نظر ڈالی - انداز خط سے معلوم ہوتا تھا کہ لکھتے وقت ہاتھ نے لغزش کی ہے - لیکن تحریر بلتی جلتی تھی - جواب مختصر تھا - تحریر مہذب اور دلآویز تھی لیکن ہر لفظ سے سرد مہری عیاں تھی - مضمون یہ تھا :-

"محاذ جنگ پر سپاہی کے فرائض منصبی دم لینے کی مہلت نہیں دیتے - اتنی فرصت نہیں کہ خاطر خواہ عبارت آرائی کی جاسکے - یہ لکھنا کافی ہوگا کہ کسی سلطان شہزادی کی تصویروں کے مرقع میں ایک چوہان راجپوت کی شبیہ بے محل اور نازیبا سی معلوم ہوتی ہے - اسکا خیال چھوڑ دینا چاہئے"

میں ان لفظوں کو باربار دہراتی - ان کے معنی سمجھنے کی کوشش کرتی - لیکن کچھ سمجھ میں نہ آتا - کیا کسی نے کچھ میرے خلاف کہدیا - اگر کہا بھی تھا تو اس آسانی سے باور کر لینے کے کیا معنی - کبھی سوچتی کہ کیا وہ اورنگ زیب اور روشن آراء کا طرفدار ہوگیا - مگر چھتر سال ایسا تو نہ تھا - بوندی کا راجہ اور اپنے عہد و پیمان سے منہ موڑے - الغرض کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا اور مجھ پر خوشی کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند ہوچکا تھا - مجھے اچھی طرح یاد ہے جس وقت میری یہ حالت ہو رہی تھی آسمان پر بدلی چھائی ہوئی تھی - کالی کالی گھٹائیں امنڈ امنڈ کر آ رہی تھیں - بادل کی گرج اور بجلی کی چمک دل کو سہمائے دیتی تھی - آن کی آن میں موسلادھار پانی برسنے لگا - گویا کسی نے آسمان میں چھید کر دیا - قیامت کا سماں تھا - معلوم ہوتا تھا کہ عناصر قدرت بھی میری کیفیت مایوسی اور ہراس سے ہمدردی کر رہے ہیں - اور آسمان بھی میری آہ و زاری کا ہمنوا ہے - نہ صرف کئی گھنٹے بلکہ کئی دن تک میرے اوپر برا وقت گذرا - بالآخر اسی غم و غصہ کی حالت میں ایک دن گویا کسی نے کان میں کہا کہ اب کس بات کا انتظار ہے جو کچھ ہونا تھا ہوچکا - عیش و عشرت کے سب سامان مہیا ہیں - دولت و ثروت کی کمی نہیں - جس پر نظر ڈال دیگی وہی

ناز برداری کریگا - خواب وخیال میں زندگی برباد کرنا کونسی عقل کی بات ہے - جس طرح بعض کم نصیب زندگی کے دُکھ درد کے غم کو شراب کے نشہ سے غلط کرتے ہیں - میں نے دُلارے کی بانسری کے بولوں اور اسکی آغوش کی گرمی سے اپنے غم وہراس کی کیفیت کو مٹانا چاہا - دُلارے معمولی گانے والا تھا - لیکن اس کی آواز میں ایک کیفیت تھی اور آنکھوں میں نشہ تھا - ایک دن دُلارے بڑے تزک و احتشام سے اپنا پھریرا اُڑاتا ہوا محل کی جانب آرہا تھا - دوسری جانب سے مہابت خاں رانا پرتاپ کا بھتیجا جس نے میواڑ سے دغا کی اور ہندوستان سے مُنہ موڑا تھا اور جس کا شمار شہنشاہ جہانگیر کے نامی سپہ سالاروں میں تھا اپنے رسالے اور نشان کیساتھ دربار جارہا تھا - کسی چھوٹی سی بات پر دونوں کے ساتھیوں میں تکرار ہوگئی - اس دن سے مہابت خاں شہزادہ دارا کا دشمن اور میرے نام سے بیزار ہوگیا - وہ اپنا رسالہ اور نشان چھوڑکر تن تنہا شاہی دربار میں پہنچا شہنشاہ نے اس کیفیت کا سبب پوچھا - اس نے جواب دیا کہ جب گوَیّے تزک اور احتشام سے نکلنے لگے اور نشان پھریرے اُڑانے لگے تو امراء اور روساء کی کیا حیثیت باقی رہی ؟ شہنشاہ نے اسی وقت حکم دیا کہ دلارے سے اسکا نشان اور رسالہ چھین لیا جائے اور آیندہ کے لئے اسکو اس حرکت سے باز رہنے کی تنبیہ کردی جائے -

مجھے بُرا تو لگا - لیکن میں سمجھ گئی کہ اس میں کیا مصلحت پنہاں تھی - بات یہ تھی کہ دربار میں ویسے ہی اورنگزیب کے کافی دوست اور ہمارے کافی دشمن تھے ان میں اضافہ کرنا خلاف مصلحت تھا - مصلحت وقت کو تو میں سمجھ گئی - لیکن جب میں نے اُس سین کا اندازہ کیا جو دربار میں ہوا ہوگا اور ہر فرد کی زبان پر گوَیّے کے نام کیساتھ ہی ساتھ میرا نام بھی ہوگا تو میں شرم سے گڑ گئی - کہاں میں شہنشاہ شاہجہاں کی نورِ نظر - تاج محل کی چہیتی بیٹی - نورجہاں اور ممتاز محل کی طرح خود سلطنت اور حکومت کی باگیں ہاتھوں میں لینے کی دعویدار - اور کہاں دلارے گوَیّا !

میں اپنے کمرہ میں پلنگ پر پڑے پڑے زار و قطار روتی اور بے چینی سے کروٹیں بدلنے لگی - میں اپنی زندگی کا ماتم کرنے لگی - کاش مجھ کو حسب دلخواہ محبوب اور خاوند پسند کرنیکا موقع ہوتا - میں بھی اپنی زندگی اور معمولی عورتوں کی طرح ٹھکانے لگا سکتی تو اس شرم وذلت کا سامنا کرنے کی نوبت کیوں آتی - اسی کیفیت غم واندوہ میں میں اپنا گریبان چاک کرتی ہوئی اٹھی - اور کھڑکی کے سہارے جا کھڑی ہوئی - شام کا وقت تھا - باغبان اپنا کام ختم کرکے اور اوزار سنبھال کر اپنے گھر کی طرف جارہا تھا - اس کی بیوی کے آج بچہ ہوا تھا - میں دل ہی دل میں کڑھنے لگی کہ دیکھو کیسی خوش نصیب ہے یہ عورت جس کا خاوند اور زندگی کا سہارا اُسکے پاس ہوگا - ہنسی خوشی اس سے باتیں کریگا - اور وہ اپنے پیارے بچے کو ایک خاص انداز سے اس کی گود میں دیگی - وہ اس ننھی سی جان کو گود میں لیکر حیرت اور خوشی سے دیکھے گا - اور پھر ماں کے پہلو میں لٹا دیگا - وہ پہلے اپنے خاوند پر فخر و ناز سے ایک نگاہ ڈالے گی - اور پھر بچہ کو پیار کرنے لگے گی -

میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور میں مُنہ لپیٹ کر پھر پلنگ پر پڑ گئی - باوجود شہزادی ہونے کے اس کیفیتِ عذاب میں نہ میرے پہلو میں میرا بچہ تھا کہ جسے میں پیار کرتی نہ میرا خاوند جو میرے پلنگ کے پاس بیٹھ کر مجھ کو ڈھارس دے سکتا -

روتے روتے بالآخر میری ...."

"اس نسخہ کا درمیانی حصہ محض چند اوراق پریشان ہیں جن کے سلسلہ اور ربط کا پتہ نہیں چلتا۔ تاہم مؤلف نے ربط پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔"

نجابت خاں سلطنت بلخ کے نامی سرداروں میں سے تھا۔ اس زمانہ میں میرے والد ماجد شہنشاہ شاہجہاں زیادہ تر زنانخانہ میں رہا کرتے تھے۔ اور دیوان عام میں دربار کرنے یا امراء و رؤساء سے صلاح و مشورہ کرنے کی نوبت کم آتی تھی۔ اکثر یہ فرائض مجھ کو ہی ادا کرنے پڑتے تھے۔ اسی سلسلہ میں مجھے رموز مملکت کے متعلق نجابت خاں سے گفت و شنید کی کئی مرتبہ نوبت آئی۔ ایک دن شاہجہاں آباد میں جامع مسجد سے نماز کے بعد واپس آئی تھی۔ میری طبیعت بہت افسردہ تھی۔ میں پلنگ پر پڑی پڑی کروٹیں بدل رہی تھی۔ کہ دفعتاً سڑک پر گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ لمحہ بھر بعد میرا بھائی دارا میرے سامنے کھڑا تھا۔ وہ خوش و خرم معلوم ہوتا تھا۔ پہلی بات جو اس نے مجھ سے کی وہ یہ تھی کہ مجھے نجابت خاں سے شادی کرنے میں کچھ انکار تو نہیں۔ ساتھ ہی ساتھ اس نے کہا کہ جب وہ تخت و تاج کا مالک ہوگا میری شادی میں کوئی دقت لاحق نہ ہوگی۔ بلکہ اس رشتہ کے قائم ہونے سے استحکام سلطنت میں بہت بڑی مدد ملیگی۔ لمحہ بھر میں نجابت خاں اور دلاور دونوں کی صورت میری آنکھوں تلے پھر گئی۔ ایک تناور درخت کی طرح سب سے زیادہ سر برآوردہ اور علیحدہ کھڑا معلوم ہوتا تھا۔ دوسرا معمولی سرپت کی طرح ہواہیں جھونکے کھا رہا تھا چونکہ دلاور بے بضاعت اور گمنام شخص تھا میں نے اسی لئے اُسے پسند کیا تھا۔ لیکن اب ان رنگ رلیوں سے طبیعت سیر ہوگئی تھی۔ میں اپنی زندگی کے لئے کچھ سہارا چاہتی تھی۔ میں سوچنے لگی اور بھائی کی طرف دیکھنے لگی۔ اسخاموشی نیم رضا سمجھ کر دارا ہنس پڑا۔ اور کہنے لگا کہ شام کو شہنشاہ سے عرض معروض کی جائیگی۔

جوں ہی شام ہوئی میں چپکے سے شاہی محل کی طرف چلی۔ میں نے برقعہ سے اپنے تئیں ڈھک لیا تھا۔ تاکہ کوئی مجھے پہچان نہ سکے۔ میں حیات بخش باغ سے گذری۔ عجب سماں تھا۔ آسمان پر شفق پھولی ہوئی تھی۔ گل مہر کے درخت گویا شعلوں کی لَو سے جھلک رہے تھے۔ چمیلی۔ جوہی۔ بیلا سب کے سب زعفرانی لباس پہنے ہوئے تھے۔ گلاب کی پنکھڑیوں پر بھی زردی چھائی ہوئی تھی۔ محلات کے بُرج اور کنگرے اور باغ کے سبزے اور درختوں میں گویا کسی نے سنہرا پانی پھیر دیا تھا۔ اس جگمگاہٹ نے میری آنکھوں کو چوندھیا دیا تھا۔ پھولوں کی خوشبو سے دماغ سرشار تھا۔ لیکن طرح طرح کی الجھنیں مجھے مضطرب کئے ہوئے تھی۔ لیموں اور نارنگی کے درختوں کی اوٹ میں ایک پتھر کی چوکی پڑی ہوئی تھی۔ میں اس پر تھک کر بیٹھ گئی۔ میں سراپا انتظار تھی کہ میرا بھائی ادھر ہی سے گذریگا۔ اور مجھے نوشتۂ تقدیر اس کی زبانی معلوم ہوجائیگا۔ نجابت خاں سے شادی کرنے کو طبیعت قبول نہیں کرتی تھی۔ اپنی شاہانہ آزادی کا قربان کرنا اور ایسے شخص کے آگے سر جھکانا جس سے طبیعت کو اُنس نہ ہو بے معنی سی بات معلوم

ہوتی تھی۔ ایک دن دوران گفتگو میں نجابت خاں نے بلخ کے تخت و تاج کا ذکر کیا تھا۔ اس وقت اسکی آنکھیں جوش سے چمک رہی تھیں۔ اس کی آواز میں مسرت اور افسردگی دونوں کے انداز موجود تھے۔ وہ انتہائی انہماک سے کہہ گیا کہ "اگر میں بلخ کے تخت و تاج کا مالک ہو جاؤں تو پھر شہزادی .... یہ سنتے ہی میری طبیعت میں ایک کیفیت پیدا ہوئی۔ اور ایک لمحہ کے لئے صرف ایک لمحہ کے لئے میری یہ خواہش ہوئی کہ میں اسکی ہو کر رہتی۔ لیکن وہ لمحہ گذر چکا تھا۔ اب وہ کیفیت باقی نہ تھی۔ میں کشمکش کی حالت میں تھی اور منتظر تھی کہ جو کچھ فیصلہ ہونا ہے ہو جائے۔ میں اسی کیفیت انتظار میں تھی کہ دیوان عام سے گانے بجانے کی آواز میرے کانوں میں آئی۔ کبھی طبیعت جوش مسرت سے ملتفت ہو جاتی کبھی افسردگی چھا جاتی۔ ایک دھن ایسی چھڑی کہ میرے دل پر سخت چوٹ لگی۔ معلوم ہوا کہ کسی نے خنجر سے کلیجہ چیر دیا۔ مجھے یاد آیا کہ یہ وہی نغمہ تھا جو میں نے اس شام کو سنا تھا جب میں اپنے راکھی بند بھائی کا انتظار کر رہی تھی۔ لیکن آج اس راکھی کی اسکی نظروں میں کیا قدر ہے۔ نہ معلوم وہ کس کے بازو پر بندھی ہوگی۔ اس نامۂ شوق کے کیا معنی ہیں جو اس نے جواب میں مجھے لکھا تھا اور میں نے مسجد کے کھنڈر تلے بیٹھ کر پڑھا تھا۔ گو وہ یوں مجھے خواب سا لگتا تھا لیکن میں اس وقت جوش مسرت سے اتنی مست تھی کہ ہر طرف ہرا ہی ہرا دکھائی دیتا تھا۔ مقسوم کی خبر نہ تھی۔ اب تو وہ اورنگ زیب کی پشت پناہی کو تیار ہے۔ اس کو نہ آن تیمور اور آئین اکبر کا کیا غم ہے۔ غالباً وہ میواڑ اور راجپوتوں کے ننگ و ناموس کی بھی پروا نہیں کرتا۔ وہ اپنے پیمان وفا کو بھی بھلا چکا ہے۔ اب تو اسکو میری یاد بھی نہ رہی ہوگی۔ ایک دن اس نے مجھے بہن کہکر پکارا تھا۔ لیکن اب .... یہ یاد آتے ہی میرا کلیجہ شق ہونے لگا۔ روتے روتے ہچکیاں بندھ گئیں۔ چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد چار و ناچار میں نے اپنے ہوش سنبھالے۔ اب دارا کے لوٹنے کا وقت تھا۔ میں اپنے نوشتۂ تقدیر سے آگاہ ہونے کے لئے بیتاب تھی۔ میں اس دالان کی طرف چلی جہاں سے دارا میرے محل کو آتا تاکہ میں اسے راستہ ہی میں ملجاؤں۔ جونہی میں دیوان خاص کے قریب پہنچی مجھ کو کچھ آوازیں سنائی دیں گویا دو شخص بلند آواز سے باتیں کر رہے ہیں۔ میں فوراً ایک گوشہ میں چھپ گئی۔ مجھے دو شخص دکھائی دیئے۔ ایک ان میں سے قد آور شاندار اور چھبیلا جوان تھا۔ سر پر سبز شملہ۔ بدن پر زرد رنگ کا بوٹے دار خلعت پہنے تھا۔ اسکو میں نے پہچان لیا یہ نجابت خاں تھا۔ دوسرا معمولی سا کم رو آدمی تھا۔ یہ دونوں بیباکی سے قہقہے لگا رہے تھے۔ بعد میں یہ ایک طرف کھڑے ہو کر باتیں کرنے لگے۔ میں قریب چھپ کر سننے لگی۔

نجابت خاں:۔ (حقارت آمیز لہجہ میں) دارا شکوہ کے تیور تو ابھی سے ایسے ہو گئے ہیں کہ گویا وہ واقعی تخت و تاج کا مالک ہے۔ لیکن یاد رہے کہ جب تک میرے ہاتھ میں تلوار باقی ہے اسکا تخت پر چڑھنا دشوار ہوگا۔ تم نے غور کیا تھا کہ جب اس نے مجھے یہ خبر سنائی کہ بادشاہ اپنی لڑکی کی شادی مجھ سے کرنے کے لئے تیار نہیں تو اسکا انداز بیان کیسا مغرور اور حقارت آمیز تھا۔ اگر بادشاہ اپنی بیٹی کو اپنے ہی محل میں رکھنا چاہتا ہے تو کون مزاحم ہو سکتا ہے۔

امیر:۔ غالباً بادشاہ بعد چندے اپنی رائے بدلنے پر مجبور ہوگا۔ اسکو ذی مرتبہ اور ذی ہمت مددگاروں کی ضرورت ہے۔

ورنگ زیب کی نظر تخت و تاج پر ہے۔ جو شاہجہاں جہانگیر کیساتھ کر گذرا۔ اورنگ زیب شاہجہاں کیساتھ وہی سلوک کرنے سے
ریغ نہ کریگا۔ اسکو تمہاری امداد کی ضرورت ہوگی۔ جہاں آرا بیگم تو تم کہتے تھے کہ بڑی حسین اور ذی ہوش شہزادی ہے۔ اور سُنا
ہا تا ہے کہ بڑی دولتمند بھی ہے۔ سورت اُسکی ملکیت ہے۔ اور اسکی آمدنی صرف اُسکے پاندان کے لئے مخصوص ہے۔

نجابت خاں:۔ (جسکا چہرہ غصہ سے سُرخ تھا۔ تڑپ کر بولا) میں نے از خود جہاں آرا بیگم سے شادی کا شوق ظاہر
نہیں کیا تھا۔ یہ تو ولیعہد نے اپنی چاپلوسی کی باتوں اور اُسکی تعریف کے پُل باندھ کر مجھکو اس جال میں پھنسایا۔ اور ہاں کرالی شہزادی
کے حسن کا حال تو غالباً اور لوگ زیادہ اچھی طرح سے جانتے ہیں میں نے تو صرف پس پردہ بانقاب دیکھا ہے۔ اُس کے ناز و نیاز
کا ساز باز یا تو دلالہ کو معلوم ہوگا یا راؤ راجہ کو جس کے نام کیساتھ اسکا نام منسوب کیا جاتا ہے۔ (یہ کہتے ہوئے اُس نے
تمسخرانہ قہقہہ لگایا اور میری یہ کیفیت کہ گویا کسی نے تیر جگر کے پار کر دیا)۔ لیکن شہزادی اگر میرے محل میں آتی تو اس کو یہ سبق
سیکھنا ہوگا کہ وہ میرے ننگ و ناموس کا پورا پورا پاس ولحاظ کرے۔ میں اپنے جانور کو خود ہی اچھی طرح اڑا گڑے میں نکال
سکتا ہوں مجھے اسکی ضرورت نہیں کہ دوسروں سے ایڑ لگواؤں۔

امیر:۔ (جو نہایت خود غرض۔ مکار، اور چاپلوس معلوم ہوتا تھا۔ بولا) میرے دوست اس قدر جوش میں نہ آؤ۔ تمہیں تو
یاد ہوگا کہ شہزادی کی عصمت پروری کا تو بڑا چرچا تھا۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس نے آگ کے شعلوں میں جل جانا منظور کیا لیکن غیر
محرم کے سامنے عریاں ہونا گوارا نہ کیا۔

نجابت خاں:۔ ہاں عورت شاندار ہے۔ وہ اپنے محبوب کا دل مسخر کرنے کے لئے جان پر کھیلنے سے بھی پرہیز نہ کریگی۔
ممکن ہے کہ اس حادثہ کی تہ میں بھی راز پنہاں ہو۔ لیکن اُس وقت اسکا محبوب کون تھا۔ کم از کم میں تو نہ تھا۔ مجھے راؤ راجہ کا شبہ
ہے۔ اور میں ایک نہ ایک دن اس سے سمجھوں گا۔ (ایک لمحہ کے توقف کے بعد آسمان کی طرف نظر اٹھا کر وہ پھر بولا)۔ دوست
مگر یا میں نے ایک مرتبہ ایک حسین شہزادی پر نظر ڈالی۔ وہ ایک کھڑکی سے کھڑی طلوع آفتاب کا نظارہ دیکھ رہی تھی۔ غضب
کی حسین اور قطعی معصوم تھی۔ وہ مجھے بالکل نہیں جانتی تھی۔ میں اس پر شیدا تھا۔ اور اسکو اپنی ملکہ بناتا۔ میں اسکے قدموں کے
نیچے موتی بچھا دیتا۔ اور اسکی آغوش میں مجھ کو بہشت کا لطف ملتا۔ لیکن جس صبح کو میں نے اسے دیکھا تھا اسی شام کو وہ قضا کر گئی۔

امیر:۔ یار عزیز اس قصہ پارینہ میں کیا رکھا ہے۔ ہمتِ مرداں مددِ خدا۔ بادشاہ کی بیٹی کا بڑا مرتبہ ہوتا ہے۔ رقیب کے
چنگل سے چھڑا کر اس پر قبضہ کر۔ نجابت خاں کی آن بان پر کون عورت شیدا نہ ہو جائیگی۔ جب جہاں آرا بیگم تیرے حرم
میں آئیگی تو گویا وہ جنت میں داخل ہوگی۔ جنت میں قدم رکھتے ہی وہ از سرِ نو معصوم بن جائیگی۔ اور کیا چاہئے۔

نجابت خاں:۔ (اسکے چہرہ پر تبسم نمودار نہ ہوا وہ ویسے ہی طیش میں کہتا رہا) میں اسی وقت اپنے شکار کو
رقیب کے چنگل سے چھڑا کر قبضہ میں لانے کا عزم کرونگا جب مجھے یہ اطمینان ہو جائے کہ میرا رقیب میرے ہمرتبہ اور میرا ہمسر ہے
ہاں اگر جہاں آرا میرے حرم سے نکل کر کسی کافر کے گھر پڑ جائے تو ملے اختیار ہے کہ وہ اسکو جنت کی حور سمجھ کر ہر لحظہ قدمبوس

ہوا کرے:

اس کے بعد کی گفتگو میں نے نہیں سنی کیونکہ میں بیہوش ہوگئی تھی ۔ جب میں ہوش میں آئی تو آوس گر رہی تھی ۔ میرا بدن یخ تھا ۔ یہ دونوں چلدیئے تھے ۔ میں اٹھی اور چل کھڑی ہوئی ۔ بلا ارادہ مہتاب باغ پہنچی ۔ اب رات ہو چکی تھی ۔ نوکر چاکر ہاتھ میں روشنی لئے ہوئے سانپ بچھوؤں کی کھوج کر رہے تھے ۔ مجھے کسی نے نہیں دیکھا ۔ نہ میں نے کسی کی پروا کی ۔ روش کے دونوں جانب سرو سنتری کی طرح کھڑے تھے ۔ چنبیلی ۔ بیلے اور نرگس کی خوشبو سے دماغ کو تسکین ہوتی اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا بھلی معلوم ہوتی تھی ۔ آبشار کے اوپر ایک برج اور چبوترہ تھا ۔ بجز شمع و فانوس کے وہاں اور کوئی نہ تھا ۔ میں وہاں تھک کر بیٹھ گئی ۔ رہ رہ کر یہ خیال آتا تھا کہ عورت کی زندگی بھی کس مصیبت کا سامنا ہے ۔ یہ بھی کیسی بے بس ہستی ہے ۔ مرد عورت کی عصمت و پاکبازی کا نگہبان بنتا ہے ۔ کیوں ؟ اس لیئے کہ بلا شرکت غیرے اسکا حظ اٹھائے ۔ اس کو کیا خبر کہ عورت کے دل پر کیا بیتتی ہے ۔ وہ اپنے سوز نہانی سے کس طرح پھنکی جاتی ہے ۔ میں آبشار کی طرف جھکی ۔ پانی ہاتھ میں لیکر منہ دھویا ۔ منہ کی تمتماہٹ کچھ کم ہوئی لیکن خیال نے مجھے یہ محسوس کرنے پر مجبور کیا ۔ کہ لاکھ دھوؤں پیشانی کا یہ داغ بے حرمتی اب کبھی نہیں مٹ سکتا ۔ مردوں کو اپنی قوت و ہمت پر بڑا ناز ہوتا ہے ۔ نجابت خاں بھی اپنے تئیں بڑا اولوالعزم اور ہمت والا سمجھتا ہے ۔ مگر جب وہ ایک عورت کے دکھ درد کا بوجھ بانٹنے کی ہمت و شرافت نہیں رکھتا تو میری نظر میں اسکی کیا قدر ہو سکتی ہے ۔ اس وقت مجھے میرا راکھی بند بھائی یاد آیا ۔ وہی ایک شخص تھا جسے میں چاہتی تھی ۔ اور جس کی محبت کا خیال آج تک مجھے بیچین رکھتا تھا ۔ اس کی صورت میری آنکھوں تلے پھر گئی ۔ اسکی چمکتی ہوئی آنکھیں میرے اوپر جھک گئیں ۔ اس کی باتیں مجھے یاد آنے لگیں ۔ میں نے اپنے گلے میں اس تعویذ کو ٹٹولا جس میں میں نے اسکا پہلا نامۂ شوق نشانی سمجھ کر اپنے سینہ سے لگا رکھا تھا ۔ پھر معاً مجھے اس کے آخری خط کی وہ سطریں یاد آئیں ۔ جنہوں نے میرے نہال امید کو پژمردہ کیا ۔ اور میرے دل کو ٹھکرا کر پاش پاش کر دیا تھا ۔ یہ سوچتے ہی کہ کیا وہ بھی نجابت خاں کی طرح ہمت و شرافت سے نا آشنا اور کٹھور ہے ۔ میں تڑپ گئی ۔ ضبط ہاتھ سے جاتا رہا ۔ ہوش و حواس جواب دینے لگے ۔ بیساختہ میرے منہ سے ایک چیخ نکلی ۔ اور میں بیہوش ہوگئی ۔ دوسرے دن محل میں یہ خبر مشہور ہوئی کہ پچھلی رات مہتاب باغ میں جہاں آرا بیگم کو کسی سانپ نے کاٹ لیا ۔

(باقی)

پنڈت کشن پرشاد کول

بُندے

کمرے میں ایک چھوٹی سی تصویر آویزاں تھی۔ اس کو دیکھنے کے لئے میں نے چراغ اٹھایا۔ نہ معلوم آج مجھے نیند کیوں اڑ گئی تھی۔ شاید اس لئے کہ میں اگلی صبح کو روانہ ہونیوالا تھا۔

عجیب و غریب تصویر ایک بیش قیمت سنہرے چوکٹے میں جڑی ہوئی تھی۔ ایک عورت اپنے سر کو مخملی تکیے پر رکھے ہوئے تھی۔ اسکا ایک بازو ذرا اوپر کی طرف اٹھا ہوا تھا۔ اور شانہ و سینہ کا کچھ حصہ [illegible] نظر آ رہا تھا۔ جیسا کہ میں نے ابھی کہا، یہ تصویر چھوٹی سی تھی۔ جس میں ایک نوجوان لڑکی اپنے داہنے بازو کے [illegible] لیٹی ہوئی تھی۔ لیکن [illegible] سر جو مخملی تکیے پر ہونے کی وجہ سے کچھ اوپر اٹھا ہوا تھا۔ اسکی گردن۔ ایک بازو اور سینہ کا کچھ حصہ نظر آ رہا تھا۔

مصور نے اس تصویر کو کچھ اس طرح بنایا تھا کہ دیکھنے والا خود بخود اسکے وجود کو اس طرح محسوس کرنے لگتا تھا جیسے وہ اپنا منہ تکیے کے قریب رکھے ہوئے محو نظارہ ہو۔ [illegible] جس کو انسان صرف خواب ہی میں دیکھ سکتا ہے —— رخساروں کی گلگونی۔ نیم وا آنکھوں کی گہری سرمگینی۔ ریشم سے زیادہ نرم اور چمکیلے بالوں کی آرائش۔ لبوں کی سرخی۔ حسین کتابی چہرہ! علیحدہ علیحدہ اور یکجائی طور پر —— [illegible] تمام رعنائیوں کے ساتھ نمایاں تھا۔ بائیں کان کی لو میں مجھے ایک عجیب بندا نظر آیا —— [illegible] سے اٹھا کر [illegible] ایک حلقہ میں آویزاں تھا۔ اور معلوم ہوتا تھا کہ وہ نہیں طلائی زنجیر سے جس نے اس کے نازک سیپ کے سے کان کو مقید کر رکھا تھا۔ خود کو آزاد کرنے کے لئے بیتاب ہے۔ کیسا عجیب بندا تھا!

لیکن تصویر میں سب سے زیادہ عجیب و غریب بات اس حسینہ کا انداز تھا۔ اسکا کسی قدر پیچھے کی طرف جھکا ہوا سر۔ وہ نیم وا آنکھیں۔ وہ شبنم کی تازگی اور شراب کی سی کیفیت رکھنے والے لب جو ایک بوسہ کے ملتجی نظر آتے تھے۔ اور ان پر وہ ہلکا سا تبسم! —— فرط لذت سے میں کچھ ایسا مسحور ہو گیا کہ مجھے اسکی معطر سانس تک محسوس ہونے لگی۔ اسکا بلوریں بازو جس کے نیچے ریشمی چمکیلے بالوں کے چھلے نظر آ رہے تھے اس طرح اوپر کی طرف اٹھا ہوا تھا گویا کسی کے گلے میں حمائل ہو جانیوالا ہے۔ میں مصور کے کمال فن اور قوت تخلیق کو دیکھ کر مسحور ہو گیا۔ تصویر میں ایک خاص سحر آفرینی تھی۔ فانوس کی مرتعش روشنی میں مجھے محسوس ہونے لگا کہ اسکی آنکھیں چمکنے لگیں۔ سر آگے کی طرف بڑھنے لگا۔ اور اس کے یاقوتی لب متحرک ہو گئے۔ شاید یہ حماقت تھی لیکن میں نے اپنے لب اس کے لب لعلیں سے ملا دیئے —— ایک بار نہیں بلکہ مسلسل و متواتر کئی بار —— اور اسکے بعد دفعتاً میں خوفزدہ ہو گیا ——

خون آلود مجسموں اور پُراسرار تصویروں کے افسانے مجھے یاد آنے لگے اور ایک نئے مکان اور ایک اجنبی شہر میں تنہا ہونے کی وجہ سے میرے جسم میں کپکپی سی پیدا ہوگئی۔ میں نے فانوس کو میز پر رکھا اور پھر سونے کے لئے پلنگ پر دراز ہوگیا۔

لیکن نیند آنی مشکل تھی۔ جب ذرا بھی غنودگی مجھ پر طاری ہوتی تو مجھے اپنے تکیے پر حسینہ کا سر نظر آتا ——— وہی ہلکا سا تبسم۔ وہی لبوں کی سُرخی۔ وہی بالوں کی نرمی اور خوشبو۔ وہی کافوری سینہ کی عُریانیاں اور وہی خواہش سپردگی ——— میں اُٹھ بیٹھا۔ کپڑے پہنے۔ فانوس کو گُل کردیا اور تاریکی میں کچھ سوچنے لگا۔ وقت گذرتا گیا۔ حتیٰ کہ دریچہ سے آفتاب کی ہلکی ہلکی زرد کرنیں کمرے میں داخل ہونے لگیں۔

خادم نے دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے زور سے کہا ——— "جہاز دو گھنٹہ بعد روانہ ہو جائیگا۔"

روانگی سے قبل میں نے مالکِ مکان سے تصویر کے متعلق دریافت کیا۔

اُس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا:۔ "اس کو ایک دیوانے نے بنایا تھا۔"

"لیکن وہ تھا کون؟ وہ دیوانہ ہو یا نہ ہو لیکن بڑا زبردست آرٹسٹ تھا۔"

"مجھے اس کا نام تک یاد نہیں رہا۔ یہ تصویر اُس نے پاگل خانہ میں بنائی تھی۔ اور اس سے اسکو سکونِ قلب حاصل ہوگیا تھا اُس کے مرنے کے بعد میں نے یہ تصویر اُس کے رشتہ داروں سے لے لی۔ اُن لوگوں نے اس کے معاوضہ میں رقم لینے سے انکار کردیا۔ اور کہنے لگے کہ وہ بخوشی اس کو جُدا کردینا چاہتے ہیں۔"

تصویر کا خیال کلیتہً میرے دل سے فراموش ہوچکا تھا۔ تقریباً پانچ سال بعد میں میکسیکو کے کسی شہر کی ایک سڑک پر چلا جارہا تھا کہ دفعتاً ایک ہسپانوی یہودی کی دوکان میں ایک خاص چیز نے میری توجہ اپنی طرف منعطف کرلی۔ بُندوں کی ایک جوڑی ——— ایک حسین طلائی زنجیر میں لگے ہوئے دو ننھے کیوپڈ ——— مجھے فوراً تصویر اور اُس رات کا خیال آگیا!

جوہری نے کہا۔ "میں ان کو اس وقت تک فروخت نہ کرونگا جب تک ان کی کافی قیمت نہ آجائے۔ ایسے بُندے آپ کو کسی اور جگہ نہیں ملیں گے۔ میں ان کے بنانے والے کو جانتا ہوں۔ یہ ایک آرٹسٹ نے بنوائے تھے۔ اور انکا نمونہ خود اُس نے بنایا تھا۔ وہ ایک عورت کو تحفتہً دینا چاہتا تھا۔"

"کیا وہ ہسپانوی تھی؟"

"جی نہیں۔ امریکن۔"

"حسین۔ سُرمگیں آنکھوں والی ——— اُسکی عمر شاید اُسوقت بیس سال کی ہوگی ——— اُسکا رنگ گلابی تھا؟"

" تو آپ اُس سے واقف ہیں؟ اُس کو جوزی فیٹا کہتے تھے۔آپ کو علم ہے اُس نے اُسکو مار ڈالا تھا؟——
—— مرنے کے بعد بھی اُس کے لبوں پر ایک لطیف تبسم تھا۔جیسے کسی نے سونے میں اُسکو مار ڈالا ہو۔بعد میں مجھے یہ بندے ایک جنگ فروخت ہوتے ہوئے مل گئے"

" اور آرٹسٹ کا کیا ہوا؟"

" وہ پیرس میں مرگیا —— دیوانہ ہوکر۔بعض کہتے ہیں کہ وہ قتل کرنے کے وقت دیوانہ ہوگیا تھا۔اگر دراصل آپ کو بندوں کی ضرورت ہے تو میں ان کو تین سو میں فروخت کردوں گا۔ان کی اصل لاگت ساڑھے چھ سو کی ہے"

سید محمد احسن۔بی اے۔حیدرآبادی

(ترجمہ)

سرمہ۔کاجل۔چورن۔منجن

باب الانتقاد

(مجموعۂ منظومات جناب سیماب اکبرآبادی)

(بہ سلسلۂ ماسبق)

صفحہ ۹۴ پر انقلاب روس کے عنوان سے ایک نظم نظر آتی ہے جس کا ایک شعر ہے ؎

ہر آبادی کچھ ذراتِ رخشاں کا مجموعہ ہے ہر کانِ گہر کچھ قطرات نیساں کا اک مرجوعہ ہے

چونکہ سیماب صاحب عربی زبان سے ناواقف ہیں اس لئے "مرجوعہ" کے صحیح معنی پر اُن کی نگاہ نہ تھی۔ "رجع" کے معنی لوٹنے کے ہیں اور اسی لئے "راجع" اس عورت کو کہتے ہیں جو بیوہ ہونے کے بعد اپنے والدین کے گھر لوٹ جائے۔ اور اگر متعدی حالت میں استعمال کیا جائے تو "مرجوع یا مرجوعہ" کے معنی اُس چیز کے ہونگے جو لوٹائی جائے یا واپس کی جائے۔ لیکن عربی میں "مرجوعہ" خط یا رسالہ کے جواب کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے۔ یا گودنا گدانے کو کہتے ہیں۔

اصل میں کان گہر کو "مرجع" یعنی لوٹنے کی جگہ لکھنا چاہئے تھا۔ لیکن غلطی یا ناواقفیت سے "مرجوعہ" لکھدیا گیا۔ اسی نظم میں ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

وہ سطحِ زمیں پر تن تن کر حوروں کی طرح چلنے والے

معلوم نہیں تن تن کر چلنے والوں کو حوروں سے کیوں تشبیہ دی گئی۔ جبکہ ان کی یہ صفت مذہبی لٹریچر میں کسی جگہ نمایاں نہیں ہے۔ حوروں کو "قاصرات الطرف" بتایا گیا ہے۔ ان کی جوانی کو "کواعب اترابا" سے ظاہر کیا گیا ہے۔ ان کی پاکیزگی و دوشیزگی کو "در مکنون" سے تعبیر کیا ہے۔ لیکن ان کی رفتار کی کوئی خصوصیت کہیں ظاہر نہیں کی گئی۔ تن تن کر چلنے کی تشبیہ عام طور پر طاؤس سے دیجاتی ہے۔ کیونکہ اسکی یہ صفت محسوس و مرئی ہے۔ حوریں نہ اس دُنیا کی چیز ہیں اور نہ اس روئے زمین پر کسی نے ان کو چلتے دیکھا کہ ان کی یہ صفت متعین کی جائے۔ علاوہ اس کے موقعہ تعریف کا ہے اس لئے تشبیہ کسی ایسی چیز سے دینا جو حقیقی معنی میں محاسن کے ظاہر کرنیوالی ہو یوں بھی درست نہیں۔ اس کے بعد کا شعر ہے:۔

وہ جن کے پرتو سے برقِ سینا کی شمعیں جلتی تھیں

اس مصرعہ میں بھی وہی عیب ہے۔ برقِ سینا تو ایک خدائی و متبرک چیز ہے۔ اور اگر کسی کے پرتو سے یہ کیفیت پیدا ہوتی ہے تو اسکی توہین و مذمت کیسی۔ درآنحالیکہ مدعا صرف تعریض ہے۔

اسی نظم کا ایک مصرعہ ہے:۔

زنجیر سیاست پاؤں میں تھی اور بارِ سلاسل ہاتھوں میں

اس میں بیان کا عدم توازن ظاہر ہے۔ کیونکہ پاؤں میں زنجیر سیاست دکھائی ہے جو حقیقی آہنی زنجیر سے کوئی واسطہ نہیں رکھتی۔ اور دوسری طرف بارِ سلاسل سے واقعی ہاتھوں میں ہتھکڑی پڑا ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ یہ مصرعہ یوں ہونا تھا:۔

پاؤں میں تھی زنجیر گراں اور بارِ سلاسل ہاتھوں میں

زار، شاہنشاہ روس کا حال بیان ہوتا ہے:۔

وہ زار، وہ سلطانِ رشیا جو حکم زنداں دیتا تھا

"جو حکمِ زنداں دیتا تھا" صحیح نہیں۔ زنداں۔ قیدخانہ کو کہتے ہیں۔ نہ کہ قید کو۔ اس لئے محاورہ کے اعتبار سے تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ "جو قید کا حکم دیتا تھا"۔۔۔۔یا۔۔۔۔"جو زنداں کا حاکم تھا"۔

سرمایہ دار کی نظم میں ایک جگہ تقسیم دولت کے مسئلہ پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں:۔

نعمتِ مقسوم کا ممنون ہو نا چاہئے　　صاحبِ دولت کو ہے تحدیثِ دولت لازمی

سیماب صاحب نے یہاں "تحدیث" کے معنی فنا ہونے کے لئے ہیں۔ یا تجدید کے۔ درآنحالیکہ "تحدیث" کے معنی صرف بیان کرنے اور گفتگو کرنے کے ہیں یہ بھی نتیجہ ہے عربی سے ناواقفیت کا۔

اسی بند کی ٹیپ کا پہلا مصرعہ ملاحظہ ہو:۔

عارضی دولت کے عزّے پر نہ یوں مغرور ہو

عزّے پر مغرور ہونا غلط اور محاورہ کے خلاف ہے۔ یوں کہہ سکتے ہیں "دولت پر عزّا نہ کرو۔ دولت پر مغرور نہ ہو۔ لیکن عزّہ پر مغرور نہ ہو صحیح نہیں۔ کیونکہ عزّہ کے معنی خود غرور کے ہیں۔

صفحہ ۴۶ پر ایک نظم "جبر باغبان" کے عنوان سے نظر آتی ہے۔ اس کے پہلے بند میں باغبان نے گلشن سے شکایت کی ہے کہ میں یوں تیری خدمت کرتا ہوں۔ اس اس طرح سینچتا ہوں لیکن تجھے پروا نہیں اس لئے میں تیرے اس ستم سے مجبورِ اشتعال" ہوں وغیرہ وغیرہ۔ دوسرے بند میں گلشن نے جواب دیا ہے کہ "تیری طرح یہاں بہت آئے چلے گئے"۔ انسان کے اختیار میں اگر موت ہوتی تو وہ غمِ ایام کی تلخی کیوں سہتا اور آخر میں یہ کہ:۔

یہ جبر و انتداب یہ تخویف خودکشی　　بے اختیاریوں پہ ہے انسان کا یہ حال

کیا جانے کیا کرے جو خدا اختیار دے

سیماب صاحب نے مصرعۂ اوّل میں انتداب غالباً بمعنی ندبہ (ماتم و بکاء) استعمال کیا ہے۔ حالانکہ انتداب کے معنی وفد یا نائب و قائم مقام بنانے کے ہیں۔ اور گریہ و بکاء کے معنی میں کبھی استعمال نہیں ہوا۔ علاوہ اسکے دوسرے مصرعہ کا اقتضاء یہ ہے کہ پہلے مصرعہ میں کوئی ایسی بات بیان کی جائے جو بے اختیاری کے منافی ہے۔ در آنحالیکہ سوائے جبر کے اور کوئی لفظ اس مفہوم کا نہیں لایا گیا۔ ندبہ یا تخویف خودکشی تو خود بے اختیاری و مجبوری کو ظاہر کرنیوالے ہیں۔ نہ کہ جبر زیادتی کو۔

صفحہ ۶۵ پر ایک نظم تنہائی کے عنوان سے مندرج ہے۔ جس کا ایک مصرعہ ہے:۔

اسی اک گوشہ میں کونین سما جاتا ہے

حالانکہ کونین تثنیہ ہے اور اردو میں اسکے لئے فعل جمع کا لانا چاہئے اور بجائے "سما جاتا ہے" کے "سما جاتے ہیں" لکھنا چاہئے تھا۔

صفحہ ۷۷ پر عیدِ قفس کے عنوان سے اظہار خیال کیا گیا ہے۔ جس کا تیسرا شعر یہ ہے:۔

صبح کھانے اور پینے میں رہا مصروف تو　　اپنا معدہ صاف کر کے مسہل و تبرید سے

معلوم نہیں عید سے قبل مسہل و تبرید کا موقعہ کیونکر مل سکتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اشارہ روزہ نہ رکھنے کی طرف ہے تو پھر پہلے مصرعہ میں کھانے پینے کی تخصیص صباح عید کے لئے بیکار ہو جاتی ہے کیونکہ وہ تو رمضان بھر کھانا کھاتا رہا ہے

صفحہ ۸۶۔ نظم "جوش انتقام"۔ پہلا شعر ہے:۔

اُٹھا دو چنگ و رباب اپنی بزم عشرت سے　　کہ آ رہا ہوں میں صد محشر جنوں بردوش

لفظ "بردوش" بالکل غلط و بے محل ہے۔ بزم عشرت کے چنگ و رباب اٹھا دینے کا حکم دینا صرف اسی لئے ہو سکتا ہے کہ یا تو آنیوالا خود کوئی بہتر سازِ موسیقی لیکر آ رہا ہے یا یہ کہ بجائے نغمہ کے وہ کوئی اور ہنگامہ برپا کرنا چاہتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ ان دونوں میں سے کسی بات کا تعلق دوشِ انسانی سے نہیں ہے۔

چوتھا شعر ہے۔

شروع ہوتے ہیں کچھ واقعاتِ نوساماں　　مغنیّہ سے کہو ختم کر فسانۂ دوش

اوّل تو محاورہ کے لحاظ سے بجائے "ختم کر" کے "ختم کرے" کہنا چاہئے تھا۔ علاوہ اس کے مغنیّہ کا کام فسانہ کہنا نہیں ہے جو اس سے ختم کرایا جاتا ہے۔ اس لئے بجائے "فسانہ" کے ایسا لفظ لانا چاہئے تھا جو "نغمہ" کے مفہوم کو ظاہر کرتا۔ اسی نظم کا ایک شعر ہے:۔

مجھے جہانِ ریا کی جڑیں ہلانا ہیں　　ملا ہے اذنِ تکلّم بہ اقتضائے سروش

جہان کی جڑیں ہلانا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ جڑیں درخت کی ہلائی جاتی ہیں اور یہ محاورہ مکان کے متعلق بھی استعمال ہو سکتا ہے۔ لیکن دنیا کی جڑ ہلانا عجیب بات ہے۔ علاوہ اس کے محض اذنِ تکلّم سے قصرِ ریا کی بنیاد کیونکر

بلائی جا سکتی ہے۔ دوسرے مصرعہ میں متقابلاً صداقت یا اسکا ہم معنی لفظ لانا ضروری تھا۔

صفحہ ۱۴۳ پر "اساس کائنات" کے عنوان سے ایک نظم نظر آتی ہے۔ جس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ کائنات کا نظام صرف عشق و محبت پر قائم ہے۔ اسکا ایک شعر ہے:۔

ہے محبت برہمی دہر کو روکے ہوئے   ورنہ تھا اسکا الٹنا از قبیلِ ممکنات

اس شعر میں ایک معنوی نقص ہے اور وہ یہ کہ جب دہر کا الٹ جانا صرف ممکن تھا تو پھر اسکو قائم رکھنا محبت کا کوئی کمال نہیں کہا جا سکتا۔ اگر برہمی دہر کو بجائے ممکن کے لازم ظاہر کیا جاتا تو یہ نقص نہ رہتا۔

اس نظم میں نجات۔ رات۔ جہات وغیرہ کے ہم قافیہ ممکنات۔ اور واردات بھی نظر آتے ہیں۔ حالانکہ یہ بالکل نادرست ہے۔ قافیہ میں اس قسم کی غلطیاں سیماب صاحب نے بہت کی ہیں۔ اور اس سے قبل جا بجا انکا اظہار بھی کر دیا گیا ہے

صفحہ ۱۴۶ پر ایک نظم "رنگین تیتری" کے عنوان سے ہے اسکا ایک مصرعہ ہے:۔

اپنے ہی خاص گل پر قربان ہونے والی

اس مصرعہ کا پہلا ٹکڑا بالکل بے معنی ہے۔ کیونکہ تیتری کا کوئی گل مخصوص نہیں ہے۔ اور اگر "اپنے ہی خاص گل" سے مراد خود تیتری ہو تو اور زیادہ غلط ہے کیونکہ تیتری ہر پھول پر قربان ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔

اسی نظم کا ایک شعر ہے:۔

عصمت کے گلکدے میں پابند دستِ محرم   اڑنے لگے تو نکہت گرنے لگے تو شبنم

پہلا مصرعہ میری سمجھ میں بالکل نہیں آیا۔ معلوم نہیں سیماب صاحب نے کس مفہوم کو ظاہر کرنا چاہا ہے۔ علاوہ اس کے دوسرے مصرعہ سے پہلے کا کوئی تعلق بھی نہیں ہے۔

ایک جگہ ذو تشبیہیں یہ نظر آتی ہیں:۔

پر بستہ ایک کویل محرومِ رم اک آہو

تیتری کو "پر بستہ" اور "محرومِ رم" کہنا۔ جبکہ وہ ہر وقت پراں نظر آتی ہے کسی طرح درست نہیں ہو سکتا۔

اسی نظم کا آخری شعر ملاحظہ ہو:۔

صد رنگ پھول جس میں تیرون کی زندگی ہے   عورت اسی چمن کی رنگین تیتری ہے

"اسی چمن" کا اشارہ کس طرف ہے۔ اسکا پتہ نہ پہلے مصرعہ سے چلتا ہے نہ نظم کے کسی اور شعر سے۔

صفحہ ۱۵۰ پر ایک شعر ہے:۔

تیرے دل میں ہمت احساس مطلق بھی نہیں   تجھ کو پیمانِ وفا کا پاس مطلق بھی نہیں

دونوں مصرعوں میں لفظ "بھی" کا استعمال غلط ہے۔

صفحہ ۵۲ پر شاعر کی بعض خصوصیات کا اظہار کیا گیا ہے۔ منجملہ ان کے ایک یہ بیان کی گئی ہے کہ:-

الفاظ بے زبان کے معنی نکالتا ہے

"الفاظ بے زبان" کے معنی نکالنا بے تکی سی بات ہے۔ "معنی" کے لحاظ سے "الفاظ" کی صفت "مہمل" ہونا چاہئے۔ یا "بے زبان" کی رعایت سے "معنی" کے بجائے کوئی ایسا لفظ لانا چاہئے تھا جو نطق کے معنی پیدا کرتا۔

صفحہ ۵۴ پر ایک جگہ "خُنکی" بسکون نون لکھا ہے۔ حالانکہ بالضم ہونا چاہئے۔

اسی صفحہ میں ایک مصرعہ ہے:-

جہان ہے اور روشنی ہے نظر جہاں تک بھی جا رہی ہے

اس میں لفظ "بھی" زائد ہے۔ بغیر اس کے معنی پورے ہو جاتے ہیں۔

صفحہ ۶۲ پر ایک مصرعہ ہے:-

آہستہ ردائے شب سمٹی ہوئی جاتی تھی

اس میں بجائے آہستہ آہستہ کے "آہستہ" استعمال کیا گیا ہے اور بجائے "سمٹی جاتی تھی" کے "سمٹی ہوئی جاتی تھی" لکھا ہے۔ اگر "سمٹی" سے مراد خاص قسم کا کپڑا ہے جسے "سمٹی" کہتے ہیں۔ تو یہ پیش کردہ منظر کے منافی ہے۔

صفحہ ۶۴ پر ایک جگہ لکھتے ہیں:-

رات کو ڈوبے ہوئے خاموش تاروں کو پڑھا

جب تارے ڈوب جائیں تو پھر ان کے پڑھنے کی کیا صورت ہے؟

صفحہ ۷۵ پر ایک نظم ہے۔ جس کا عنوان "مغالطہ" ہے۔ اسکا ایک شعر ہے:-

حُسنِ اجل بکفِ تسکینِ روح جانا جامِ شفق میں سمجھا سامان تشنگی کا

پہلے مصرعہ میں "اجل" کی رعایت سے بجائے "تسکینِ روح" کے "اسبابِ زیست" لکھنا زیادہ مناسب تھا۔ دوسرے مصرعہ میں ایک عجیب غلطی ہے۔ مقصود تو کہنا یہ ہے کہ جامِ شفق میں "تشنگی" بجھانے کا سامان نظر آیا لیکن "سامان تشنگی" کہکر مفہوم کو بالکل الٹ دیا۔

اسی نظم میں ایک جگہ "خود غرضی" بسکون [illegible] استعمال کیا گیا ہے۔ درآنحالیکہ صحیح بفتح [illegible] ہے۔

صفحہ ۷۶ پر ایک نظم "شاعر کا دل" نظر آتی ہے۔ اسکا آخری شعر ہے:-

عرش کی خلوت سے جب فطرت کا دل گھبرائے گا عرش تیرا ہی دلِ ویراں بنایا جائے گا

دوسرے مصرعہ میں اگر بجائے "تیرا" کے "تجھ کو" لکھا جاتا۔ تو عرش کے معنی دوسرے مصرعہ میں بدل جاتے۔

لیکن یوں کوئی تفریق پیدا نہیں ہوتی۔
صفحہ ۱۸۰ پر ایک شعر ہے:۔

ابر کی آغوش سے قطرہ جو نکلا بے قرار　　گرئی فطرت نے اس کو کردیا جذب شرار

دوسرا مصرعہ بالکل بے معنی ہے۔ ابر سے جب قطرۂ باراں نیچے آتا ہے تو وہ زمین میں جذب ہوجاتا ہے یا بہ جاتا ہے۔ شرار سے اسکا کیا واسطہ۔
صفحہ ۸۵ پر ایک جگہ "زوال اندوز" لکھا گیا ہے۔ جو بالکل غلط ہے۔ اور صفحہ ۸۸ پر ایک جگہ بجائے "حیات دائم کے" احیائے دوام نظم کیا گیا ہے جو درست نہیں۔ صفحہ ۸۹ پر ایک مصرعہ ہے:۔

فطرتاً ہوتا ہے شاعر مایل ومجبور خواب

مصرعہ کے دوسرے ٹکڑے کی ترکیب بالکل غلط ہے۔ "مایل خواب" کہتے یا "مجبورِ خواب" مایل و مجبور دونوں کو حرفِ عطف سے وابستہ کرکے مضاف قرار دینا درست نہیں۔
الغرض یہ اور اسی قسم کی بہت سی غلطیاں ہیں جو اس مجموعہ میں نظر آتی ہیں۔ اور ایک ایسے شخص کے کلام میں ان کا پایا جانا جو اپنے آپ کو "ہندوستان کا شاعر اعظم" کہلانا پسند کرتا ہے۔ یقیناً حیرتناک ہے۔ تاہم اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ سیماب صاحب فطرتاً شاعر پیدا ہوئے ہیں۔ اور اس دور کے اچھا کہنے والوں میں سے ہیں۔ اگر وہ اپنی شاعری کو صرف غزل گوئی تک محدود رکھتے اور نظموں کے خارزار میں نہ الجھتے تو زیادہ کامیاب ہوتے۔ زیادہ کہنے اور تمام اصنافِ سخن پر طبع آزمائی کرنے سے بدرجہا بہتر صرف ایک صنف کو لیکر اس میں کمال پیدا کرنا ہے۔ اور میں جانتا ہوں کہ اگر سیماب صاحب اپنی توجہ تمامتر صرف تغزل پر صرف کرتے تو آج ان کا مرتبہ دنیائے شاعری میں اس سے زیادہ بلند ہوتا۔

ایجادات

معلومات

مجرم کی شناخت کا جدید طریقہ۔

موجودہ دور تہذیب و تمدن میں یہ کوشش جاری ہے کہ ان قوانین کا خاتمہ کردیا جائے۔ جن سے بربریت او بہیمیت اظہار ہوتا ہے۔ مگر کس قدر حیرت کا مقام ہے کہ ابھی تک مجرمین کی گرفتاری اور شناخت کے وہی پرانے اور مذموم طریقے رائج ہیں جن سے غیر مجرم بھی مجرم قرار پاجاتے ہیں۔ مثلاً متہم کو تکلیف جسمانی پہنچاکر جرم کا اقبال کرا جاتا ہے۔ اور اس وقت تک برابر یہ سلسلۂ اذیت جاری رہتا ہے کہ جب تک اقرار نہ کرے۔ یا کسی دوسرے کو مجرم ثابت کرے۔

لیکن سائنس دان حضرات اس طرف سے غافل نہ تھے اور آخرکار انہوں نے ایسے طریقے دریافت کرہی لئے۔ جن ذریعہ سے بہ آسانی اصل مجرم کا پتہ چلایا جاسکتا ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ ان کے اجراء کے بعد انسداد جرائم میں بہت ملیگی۔ کیونکہ یہ طریقے تجربہ کے بعد اس قدر صحیح ثابت ہوئے ہیں کہ اس کے بعد مجرمین کو کسی قسم کے حیلہ کی گنجائش با ہی نہیں رہ سکتی۔ بلکہ وہ صریح الفاظ میں اپنے جرم کے اقبال کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ ذیل میں ہم ان طریقوں کو مختصر کے بعد درج کرتے ہیں:۔

پولیگراف (POLYGRAPH)

یہ آلہ اطباء کے اس آلہ سے بہت مشابہ ہے جس سے خون کی حرارت اور اس کے آتار چڑھاؤ کو دریافت ہیں۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ پولیگراف میں ایک قلم ہوتا ہے جو خطوط کے میلان کو کاغذ پر لکھتا جاتا ہے۔ یہ خط خون کے آتار چڑھاؤ سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور انسان پر جس قسم کے انفعالات طاری ہوتے ہیں اسی مناسبت سے اس تغیر ہوتا رہتا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یوں ہے کہ یہ انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ کہ جب اس سے کسی جرم کے متعلق استفسار کیا جاتا ہے۔ تو اگر وہ اسکا حقیقت میں مرتکب ہوتا ہے تو خوف کیوجہ سے اس کے اندر عجیب و غریب انفعالات ہوتے ہیں۔ پولیگراف ان تمام تغیرات اور حالات کو محفوظ کرلیتا ہے۔ جس سے مجرم کی اندرونی حالت کا اندازہ کرلیا جاتا۔

بعض مجرم کثرت جرم یا اپنے اندر غیر معمولی صبر کی وجہ سے جرم کے اخفا پر کافی قدرت رکھتے ہیں۔ اور وہ اپنے اوپر کسی قسم کی گھبراہٹ ظاہر نہیں ہونے دیتے مگر باوجود اسکے قدرتی طور پر اُن کا دوران خون نہایت تیز ہو جاتا ہے اور نہایت سرعت کیساتھ رگوں میں حرکت کرنے لگتا ہے۔ اور یہ سرعت ہی درحقیقت مجرم کی پہچان ہے۔ جسے یہ آلہ نہایت خوبی کیساتھ کاغذ پر منتقل کر کے بتلا دیتا ہے۔

اس آلہ کو تقریباً ڈیڑھ لاکھ حادثوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ اور اسکا نتیجہ ہمیشہ صحیح ثابت ہوا۔ لیکن باوجود اس کے اسکا استعمال بہت قلیل ہے۔ امریکہ کی بعض کمپنیوں اور بنکوں میں اسے استعمال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ چیکاگو کے ایک بنک کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ وہاں سے پانچ ہزار ڈالر غائب ہو گئے۔ ۵۶ ملازمین پر اسکا تجربہ کیا گیا تو سب کے سب مجرم ثابت ہوئے۔ اور بعد کو سبنے بغیر کسی اکراہ کے اپنے جرم کا اقبال کیا۔ اس کے بعد سے ہر سال بنک مذکور میں اس کے ذریعہ تحقیق کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ بھی دیگر مواقع پر جب اسے استعمال کیا گیا تو اسکا نتیجہ صحیح ثابت ہوا۔

سائیکو گلوو میٹر (PSYCHO GALVANO METAR)

اس آلہ کا موجد ایک راہب ہے۔ اس آلہ میں بجلی کی خفیف سی شعاع ہوتی ہے۔ جو بیٹری سے پیدا ہوتی ہے۔ جب اسے متہم پر لگا کر اس سے سوالات کئے جاتے ہیں تو اگر وہ مجرم ہوتا ہے تو اسکا بدن پسینہ سے تر ہو جاتا ہے جس قدر پسینہ پیدا ہوگا اسی مناسبت سے بجلی کی شعاع جو تمام بدن میں پھیلی ہوتی ہے کم ہو جاتی ہے۔ یہ آلہ اس مقدار کو محفوظ کر لیتا ہے۔ جس سے مجرم کا پتہ چلتا ہے۔

بذریعہ سائیکالوجی (PSYCHOLOGY)

علم النفس کے ذریعہ سے بھی تحقیق کی جاتی ہے۔ کیونکہ ماہران علم النفس نہایت آسانی سے مجرم کو پہچان لیتے ہیں چنانچہ اسی بناء پر جاسوسوں کے لئے علم النفس کا جاننا نہایت ضرور ہے مگر چونکہ اس میں غلطیاں بھی بہت زیادہ ہوتی ہیں اس لئے چنداں قابل توجہ نہیں۔

نیوموگراف (PNEUMAGRAPH)

علم النفس کا یہ تسلیم شدہ مسئلہ ہے کہ جب مجرم سے استفسارات کئے جاتے ہیں تو اس کے تنفس کی رفتار میں غیر معمولی تیزی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور یہ تیزی ہی درحقیقت اس کے جرم کو ظاہر کر دیتی ہے یہ آلہ پولیگراف کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ اسکا کام صرف یہ ہے کہ تنفس کی رفتار کو صحیح طور پر بتلا دے۔ اسکے تجربہ کرنیوالوں کا خیال ہے کہ اس سے کبھی بھی غلطی سرزد نہیں ہوتی۔

اوپر جتنے آلوں کے متعلق گفتگو کی گئی ہے ان سب کا انحصار انفعالات پر ہے - مگر بہت سے مجرم ایسے بھی ہوتے ہیں جو کثرت جرم کے باعث جرم کے پوشیدہ رکھنے پر پوری قوت رکھتے ہیں اور اُن کے قلوب اس قدر مُردہ ہو جاتے ہیں کہ وہ اپنے اوپر کسی قسم کا انفعال طاری نہیں ہونے دیتے - ظاہر ہے ایسی صورت میں یہ آلے بالکل بیکار ثابت ہونگے -

سائینس نے جہاں اس قسم کے آلوں کی ایجاد کی وہاں اس خرابی کے انسداد کا بھی طریقہ ایجاد کیا ہے -

اس قسم کے مجرمین کو ایک دوا استعمال کرائی جاتی ہے - جسے "سکوپولامین" (Scopolamin) کہتے ہیں - یہ دوا قطعی بے ضرر اور غیر تکلیف دہ ہوتی ہے - اسکی خاصیت یہ ہے کہ یہ دماغ کے اُس حصہ کو جسے مرکز کذب کہا جاتا ہے بالکل بیکار کر دیتی ہے - جس کے بعد انسان جھوٹ بولنے پر قادر نہیں رہتا -

کونبل گوڈرڈ نے جو کہ مسئلہ جرائم میں بہت بڑے ماہر ہیں - بارہا اس دوا کا تجربہ کیا ہے - اسکا قول ہے کہ اسکا نتیجہ کبھی غلط نہیں ظاہر ہوا - اور اسکے ذریعہ سے ہمیشہ وہی مجرم ثابت ہوا جو حقیقت میں مجرم تھا -

اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ چونکہ اسکا اثر دماغ کے مرکز کذب پر نہایت شدید ہوتا ہے اس لئے وہ بالکل کمزور ہو جاتا ہے - اس کے بعد مجرم کے لئے سوائے اسکے اور کوئی چارہ باقی نہیں رہتا کہ وہ واقعہ کو اصلی صورت میں پیش کر دے - غیر مناسب نہ ہوگا اگر ہم یہاں اسکے اعجاز کا ایک واقعہ بیان کر دیں -

مسٹر ڈیفینر امریکہ کے محکمۂ قضاء کے ایک بڑے عہدہ دار ہیں - ان کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ چودہ اشخاص پر قتل کا الزام لگایا گیا - انھیں سکوپولامین استعمال کرائی گئی - تو سب کے سب مجرم ثابت ہوئے - موصوف کا بیان ہے کہ محکمہ نے محض ان کے اعتراف ہی کو کافی نہیں سمجھا بلکہ جب دیگر ذرائع سے بھی تفتیش کی گئی تو یہ واقعہ صحیح ثابت ہوا - ظاہر ہے اس قدر شہادتوں کے بعد اسکی صحت پر کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا -

یہاں یہ شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ جب اس دوا کے استعمال کے بعد اس قدر قطعی نتائج برآمد ہوتے ہیں تو اسے عام طور پر مجرمین کے شناخت کے لئے کیوں نہیں استعمال کیا جاتا ؟

عبداللطیف اعظمی

آپ کو جس کتاب کی ضرورت ہو

مطبوعات موصولہ

نغمۂ کہسار شملہ میں ایک انجمن بزمِ اُردو کے نام سے قایم ہوئی ہے جس کا مقصد اُردو زبان کی خدمت ہے۔ اسی سلسلہ میں کبھی کبھی صحبتِ مشاعرہ برپا کرنا بھی اس انجمن کے مقاصد میں شامل ہے۔ چنانچہ ستمبر ۳۴ء میں ایک بزمِ شعر خوانی منعقد کی گئی۔ اور تقریباً ۴۲ شعراء نے اپنا کلام سنایا۔ چونکہ نہ مصرعِ طرح کی قید تھی اور نہ غزل و نظم کی تخصیص۔ اس لئے یہ صحبت عام مشاعروں سے زیادہ دلچسپ رہی۔

ان نظموں اور غزلوں کے مجموعہ کو اب کتابی صورت میں شائع کیا گیا ہے۔ جو سیکرٹری بزمِ اُردو شملہ سے پنج آنہ میں مل سکتا ہے۔

مسیح الاطفال یہ کتاب فنِ طب سے متعلق ہے جس میں بچوں کی پیدائش سے لیکر ایامِ رضاعت ختم ہونے تک ان کے تمام امراض کا حال بیان کیا گیا ہے۔ اور نیز یہ کہ کس بیماری میں کس وقت کیا دوا دینا مناسب ہے۔ اسی کے ساتھ بچوں کے قیامِ صحت کے لئے او جتنی تدابیر کی ضرورت ہے وہ بھی اس میں بیان کردی گئی ہیں۔ چونکہ اس کے مؤلف حکیم مولوی محمد نسیم الدین صاحب خود ایک تجربہ کار طبیب ہیں۔ اس لئے انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ یقیناً مفید و کار آمد ہوگا۔

یہ کتاب صدیقی دواخانہ کھانولی ضلع مظفر نگر سے ایک روپیہ میں مل سکتی ہے۔

حامد کے سو شعر حامد علی خاں بی اے رسالہ ہمایوں کے جوائنٹ ایڈیٹر پنجاب کے اچھے شاعروں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ انھیں کے کلام سے جناب منصور احمد صاحب نے سو شعر انتخاب کرکے اس نام سے شائع کئے ہیں۔ ابتدا میں جناب حامد کی خصوصیات شاعری پر بھی انہوں نے اظہار خیال کیا ہے جو کافی دلچسپ ہے۔ انتخاب کے متعلق اس وقت تک کوئی صحیح رائے قایم نہیں کی جاسکتی۔ جب تک شاعر کا سارا کلام سامنے نہ ہو۔ تاہم بعض شعروں سے مادح و ممدوح دونوں کے ذوقِ سلیم کا پتہ چلتا ہے۔ مثلاً:۔

جب یاد کیا اُس کو تب جان پہ بن آئی ‎ ‎ یا اُس کو بھلاؤں گا یا جان سے جاؤں گا

تجھے بھلا رہا ہوں میں یہ کیا خیال ہے مجھے ‎ ‎ غضب کا سنگدل ہوں میں عجیب بیوفا ہوں میں

مسلمانوں کی صنعت وحرفت

فون کرامر (مشہور جرمن مستشرق) نے ایک کتاب عہد خلفاء کی تاریخ تمدن پر لکھی ہے جس کا ایک باب مسلمانوں کی صنعت وحرفت۔ زراعت وتجارت سے متعلق ہے۔ مولوی محمد جمیل الرحمان صاحب ایم اے پروفیسر تاریخ اسلامی عثمانیہ یونیورسٹی نے اسی باب کا ترجمہ اس نام سے شائع کیا ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ نہایت مفید معلومات کا حامل ہے۔ ترجمہ نہایت سلیس وپاکیزہ ہے۔ اور کتابت وطباعت پسندیدہ۔ کتاب مجلد شائع کی گئی ہے۔ اور "کتابستان سٹی روڈ الہ آباد" سے مل سکتی ہے۔

کارخانہ جلد سازی حیدرآباد

محبوبیہ کارخانہ جلد سازی گولیگوڑہ حیدرآباد نے ہمارے پاس جرمنی کے چھپے ہوئے دیوان غالب کا ایک نسخہ بھیجا ہے تاکہ ہم اسکی جلد کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کریں۔ اور یہ کہنا یقیناً خلاف حقیقت نہ ہوگا کہ اتنی خوبصورت وپاکیزہ جلدیں نے اس وقت تک ہندوستان کے کسی انگریزی کارخانہ کی بھی نہیں دیکھی۔

یہ کارخانہ عرصہ سے قائم ہے اور اسکی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ بچوں کو اس فن کی تعلیم دیتا ہے اور مستحق طلباء کے وظائف کا بھی انتظام کرتا ہے۔ حلقہ "نگار" میں جن حضرات کو کبھی جلد بندھوانے کی ضرورت ہو تو وہ ضرور اس کارخانہ سے خط وکتابت کریں۔

انقلاب فرانس

مصنفہ جناب باری۔ پبلشرز اردو بک اسٹال لاہور۔ قیمت درج نہیں ہے۔ ضخامت ۱۰۷ صفحات۔ تقطیع چھوٹی۔ کتابت وطباعت پاکیزہ۔

یہ ہیں ظاہری خصوصیات اس کتاب کی۔ لیکن معنوی خصوصیات اس سے زیادہ قابل توجہ ہیں۔ کیونکہ جس اختصار و ایجاز اور جس شگفتگی وسلاست کیساتھ دنیا کے اس عظیم الشان انقلاب کا ذکر اس کتاب میں پایا جاتا ہے وہ اردو کی کسی اور کتاب میں (اس موضوع پر) نہیں پایا جاتا۔ ملک کے نوجوانوں کا فرض ہے کہ وہ اس قسم کی کتابوں کا بغور مطالعہ کریں اور ملک و وطن کی خدمت کا وہی جذبہ اپنے اندر پیدا کریں جو انقلاب فرانس کی تاریخ میں نظر آتا ہے۔

قادیانی مذہب

تصنیف ہے جناب الیاس برنی کی۔ جو پہلے جامعہ عثمانیہ میں استاد معاشیات تھے۔ اور اب دارالترجمہ کے ناظم ہیں۔ یہ ایڈیشن اس کتاب کا تیسرا ایڈیشن ہے۔ اور غالباً یہ کافی ثبوت اس کتاب کی مقبولیت کا ہے۔ اس ایڈیشن میں بہ نسبت سابق ایڈیشنوں کے مضامین کا کافی اضافہ کیا گیا ہے۔ اور کچھ ضمیمے بھی بڑھائے گئے ہیں۔ ضخامت ۱۰۰۰ صفحات ہے اور قادیانی مذہب کے متعلق شاید ہی کوئی بات ایسی ہو جو اس میں درج نہ ہو۔ ہرچند اس کتاب میں کوئی مناظرانہ دلچسپ انداز بیان نہیں پایا جاتا۔ لیکن طرز ادا کی سلاست مفہوم کو پوری طرح ذہن نشین کرنیوالی ہے اور وہ حضرات جو ہندوستان کے اس جدید سیاسی مذہب سے واقفیت حاصل کرنا چاہتے ہیں ان کیلئے اسکا مطالعہ بہرنوع فائدہ سے خالی نہیں۔ اسکی قیمت علاوہ محصول دو ۲ روپیہ ہے۔ اور کمال احمد صاحب فاروقی (بیت الاسلام حیدرآباد دکن) سے مل سکتی ہے۔

شاعر کی دُنیا

وہ گرمیوں میں شبِ مہ کی سحرِ سیمینی
وہ برشگال میں شام و سحر کی رنگینی

وہ جھوم جھوم کے گھنگھوروں برسنے والی گھٹا
جو طبعِ مست کو دیتی ہے درسِ بے دینی

وہ لے نواز کے پُرکیف زمزموں کا لوچ
وہ نغمہ گر کے رسیلے سُروں کی شیرینی

جوانیاں، وہ چھلکتے ہوئے شراب کے جام
وہ گیسوؤں کی دمک وہ رُخوں کی زرّینی

وہ گردنوں کی نزاکت، وہ ابروؤں کا کھچاؤ
وہ انکھڑیوں کی گلابی خمار آگینی

کسی کے عشق میں وہ نامرادیوں کے مزے
وہ نوجوان طبیعت کی یاس آگینی

سکوتِ شب میں وہ بچھڑے ہوئے دنوں کی یاد
جو دل کو بخشتی ہے اک لطیف غمگینی

وہ عین اٹھتی جوانی میں موت آ جانا
وہ باغِ زیست میں دستِ فنا کی گلچینی

یہ زندگی کے ہلاکت فروز منظر ہیں
انہی کے مارے ہوئے کلیمؔ اور اخترؔ ہیں

(اختر انصاری)

نغمۂ شاعر

نبضِ گیتی میں ہوا ہے سست رَو خونِ حیات
گردشِ پیہم سے گویا تھک چکی ہے کائنات

بے خبر پردہ سرائے شب میں سوتا ہے جہاں
گویا انساں کو نہیں اندیشۂ سود و زیاں،

محفلِ ہستی پہ یعنی چھا گیا خوابِ اجل
روح کی گہرائیوں میں سو گیا ذوقِ عمل

کتنی گہرائی ہے شب کے نغمۂ خاموش میں
زندگی سوتی ہے گویا موت کی آغوش میں

اہلِ عالم سو رہے ہیں پاؤں پھیلائے ہوئے
شورشِ ہنگامۂ ہستی سے گھبرائے ہوئے

نور کی چادر کو اوڑھے سو رہی ہے رات بھی
رُک گئی ہے سرد ہو کے نبضِ موجودات بھی

آہ! لرزاں ہے مگر میرا رُبابِ جاں ابھی
برقِ بیتابی مرے سینہ پہ ہے رقصاں ابھی

جاگتا ہوں میں زمانے کو سُلانے کے لئے
جل رہا ہوں آگ اوروں کی بجھانے کے لئے

ذوقِ وجد انگیز میں بیٹھا ہوں سرشارِ خیال
نشۂ خواب آفریں میں ہوں پرستارِ خیال

جاگ اٹھے ہیں ہزاروں زمزمے اب خواب سے
سازِ دل کو چھیڑتا ہوں فکر کی مضراب سے

سوز ہے سینہ میں آہوں سے عیاں ہوتا نہیں
شمع اس محفل میں جلتی ہے دُھواں ہوتا نہیں

شرحِ دردِ زندگانی ہے کتابِ آرزو
تشنۂ مضراب ہے میرا ربابِ آرزو

دل اگرچہ قطرۂ خوں ہے مگر طوفان ہے
سینکڑوں خوں گشتہ امیدوں کا گورستان ہے

میرے بربط میں جو نغمے ہیں ابھی گائے نہیں
میں نے بادہ کش ابھی محفل کے بہکائے نہیں

دل ہے کیا شاعر کا؟ صوتِ سرمدی کا ساز ہے
شعر کیا؟ پردہ سرائے قدس کی آواز ہے

خواب سے تم کو جگانے کے لئے آیا ہوں میں
"نغمۂ الفت" سنانے کے لئے آیا ہوں میں

آگ نغموں کی میں اپنے ساز سے برساؤں گا
ابر بن کے آسمانِ شعر پہ چھا جاؤں گا

شفیع منصور۔ لدھیانہ

"نوائے غریب"

تصوّر کس قدر آزاد ہے خوابِ پریشاں کا
معرا ہے حقیقت سے تماشہ اہلِ امکاں کا

مری فطرت میں آزادی کے جلوے رقص کرتے ہیں
مرے اندازِ گوناگوں مصیبت میں نکھرتے ہیں

عنایت ہائے ساقی کا گلہ میں کر نہیں سکتا
نگاپوئے زمانی برطرف۔ میں مر نہیں سکتا

کرم کر مجھ پہ اے ساقی مجھے آزاد رہنے دے
"میں بربادِ تمنا ہوں مجھے برباد رہنے دے"

مری کاوش سے پیدا ہے شرارِ آرزو دل میں
شرر آہنگیاں میری نہ چھوڑیں گی لہو دل میں

جمالِ شاہدِ گیتی نظر افروزِ عالم ہے
مگر قسمت مری وابستۂ اجزائے برہم ہے

مجھے فرصت نہیں شانِ امارت کے تکلّف کی
مجھے حاجت نہیں انبارِ دولت پر تصرف کی

تلاشِ زندگی میں عمرِ فانی کھو چکا ہوں میں
جہاں میں بندۂ بے دامِ الفت ہو چکا ہوں میں

"محبت" چھا گئی ہے میری دنیائے تمنّا پر
زمانہ ہنس رہا ہے میری "لیلائے تمنّا" پر

نمودِ حسن کی نیرنگیاں، واللہ! کیا کہنا!
مگر میرے مقدّر کی رسائی، آہ! کیا کہنا!

زبانِ بے زبانی کی شکایت کر نہیں سکتا
فروغِ ظاہری سے میں محبت کر نہیں سکتا

مری بیتابیاں اک دن نمایاں ہونگی محفل میں
تجلّیاتِ لرزاں کھو گئی ہیں میری منزل میں

امیرِ محتشم کھویا ہوا ہے اپنی دولت میں؟
وقارِ معنوی حاصل ہے مجھ کو اک "محبت" میں!

(شمیم نعمانی نیازی)

پارسی اہلِ کتاب ہیں

(مسلسل)

حضرت زرتشت پیغمبر برحق اور نبی مرسل تھے

زرتشتیوں کے موحد ہونے کی تصدیق اکثر علما نے کی ہے۔[1] اور جس کی دلیل اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ اُن کا خدا تمامی عالم کا خالق[2] کل انسانی افعال کا منصف[3] اور رحم و کرم کا سرچشمہ ہے۔[4] اور محض خدائے واحد ہی کی ذات اطاعت و فرمانبرداری کے لائق اور قابلِ پرستش ہے۔[5]

کل الہامی مذاہب کا اہم ترین اصول نیکی و پاکبازی ہے۔ چنانچہ اس کے متعلق ژند واستا میں بڑے زور کیساتھ ہدایت کی گئی ہے اور مرقوم ہے کہ نیکی ہی مسرت کا باعث ہے اور یہی راہِ امن و امان ہے۔ نیکی کو عزت کا لباس اور بدی کو شرم و ذلت کی پوشاک سے تشبیہ دی گئی ہے۔[6] ژند واستا میں لکھا ہے کہ خدا کے نزدیک سب سے زیادہ قابلِ قبول قربانی اور عبادت انسان کے افعالِ نیک ہیں۔ اور جن کی مقبولیت کے لئے نیت کا نیک ہونا بھی ضروری ہے۔ تمام خوبیوں کی بنیاد سچائی کو قرار دیا ہے۔ اور دروغگوئی کو سب سے بڑا اور ناقابلِ عفو گناہ بتلایا ہے۔ محنت اور جانفشانی کے متعلق لکھا ہے کہ ان کا ثمرہ ملنا لازمی ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ ایمان کو تزلزل سے محفوظ رکھنے کے لئے محنت و مشقت ضروری چیز ہے۔ کاہل انسان کی ذلت اور مفلسی کی

---

[1] قوانین حلم دردین زرتشت (مؤلفہ کوپر) دینیات زرتشتی (مؤلفہ ڈاکٹر دھالا) [2] تذکرہ پارسیان (مؤلفہ کارکا) انوار ایران پاستان (مؤلفہ پیتاوالا) [3] تذکرہ پارسیان اور قوانین حلم دردین زرتشت۔ ملاحظہ فرمائیے۔ [4] تذکرہ پارسیان اور قوانین حلم دردین زرتشت۔

[5] تذکرہ پارسیان صفحہ ۴۵ جلد دوم۔

[6] دائرۃ المعارف دین و اخلاق۔ جلد دوازدہم۔ صفحہ ۵۶۵۔

باعث ہے۔ اسی طرح مہمان نوازی اور غربا پروری بھی اصولِ مذہب زرتشت میں داخل ہیں[1]۔

ان باتوں کو دیکھ کر بھلا کیونکر پیروانِ دینِ زرتشت منکرِ خدا یا کافر کہلانے کے مستحق ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ زمانہ موجودہ کے ایک مسلمان فاضل اس خصوص میں یوں اپنے خیالات کا اظہار فرماتے ہیں[2]

" عام طور پر جو لوگ آتش پرست مشہور ہیں ان میں نیکی و خیرات اور دین میں ایمانداری کی عادتیں عناصر فطرت کی پرستش سے ہرگز ہرگز پیدا نہیں ہو سکتی تھیں۔ انسان سے نیکی و شرافت کا ظہور اُس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنے دل کو پاک و صاف رکھ کر خدائے قدوس کے وجود کا قائل ہو کر انوارِ الٰہی کا پرتو حاصل نہ کرلے۔ خداوند عالم ہی تمام نعمتوں کا جس میں آتش کا بھی شمار ہے سرچشمہ اور خالق ہے۔ زرتشت اُن ہی پیغمبروں میں سے تھے جو رب العالمین کی طرف سے مذہب لے کر بندوں کی ہدایت کے لئے دنیا میں ظہور کرتے رہے ہیں۔"

یہ امر یقینی ہے کہ باری تعالیٰ جو بہترین عادل اور مہر و کرم کا منبع ہے کسی شخص کے اعمال نیک کی جزا دیئے بغیر نہ رہیگا۔ چنانچہ خود قرآن حکیم میں مرقوم ہے کہ وہ لوگ جو اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے اور نیک کام کرتے ہیں وہ اپنے رب سے اسکا بدلہ پائیں گے اور ان کے لئے کوئی امر باعثِ خوف نہیں۔ اور وہ رنج نہ اٹھائیں گے[3]۔

خدا کی وحدانیت اور حشر کے دن نیک و بد اعمال کی جزا و سزا پانے پر ایمان رکھنے کی تعلیم جیسی کہ پیغمبرِ ایران حضرت زرتشت نے دی ہے وہ پارسیوں کی روزمرّہ زندگی میں بھی بخوبی آشکارا ہے۔ موجودہ پارسیوں کا اتّقا اور اُن کی شرافت اس کی بیّن دلیل ہے۔ چنانچہ ان باتوں کو پیشِ نظر رکھ کر بلا پس و پیش اس امر کا اقرار کیا جاسکتا ہے کہ یہ قوم عقیدتاً موحد ہے اور اُن کے پیغمبر بھی مثل دوسرے نبیوں کے سلطنتِ آلہی کی بنیاد ڈالنے کے لئے مبعوث برسالت ہوئے تھے[4]۔

نیکی اور تقوی نام ہے پرہیزگاری کا۔ خدا۔ آخرت۔ فرشتے۔ انبیاء اور الہامی کتابوں پر ایمان رکھنے کا۔ خدا کی محبت میں فقراء۔ غربا۔ یتامیٰ کی اعانت و امداد کرنیکا۔ اور یہی عین عبادتِ آلہی ہے۔ چنانچہ بلاشبہ یہی تعلیم زرتشتی تھی۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ ہر مذہب نے دنیا میں اپنے پیرووں کو اسی راہ پر چلنے کا حکم دیا ہے۔ گو رفتارِ زمانہ نے اس قدر انقلابات ان کے اندر رونما کر دیئے ہیں کہ آج ان کی اصلی شکل پہچاننی مشکل ہے۔ ورنہ تمام مختلف ادیان کا منبع اور سرچشمہ ایک ہی ہے اور کل مذاہب مختلف اقوام و ممالک کے لئے مختلف اوقات میں خدا کا ایک ہی پیغام لیکر آئے۔ باری تعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں صاف طور پر فرمایا ہے۔ "در تحقیق ہم نے ہر قوم کے درمیان ایک ہادی و رہبر بھیجا اور جس نے خدا کی پیری اور شیطان سے بیزاری کی تعلیم دی۔"[5] پھر ایک دوسری

---

[1] ۔ تذکرہ پارسیان صفحہ ۱۰۴ جلد دوئم۔ [2] ۔ اسلام اور دین زرتشت صفحہ ۲۱ (مولفہ مرحوم خواجہ کمال الدین)
[3] ۔ سورۃ ۲ (آیہ ۶۲)۔ سورۃ ۵ (آیہ ۶۹) [4] دائرۃ المعارف امریکائی جلد شانزدہم (زرتشت)
[5] ۔ سورۃ ۱۶ (آیہ ۳۶) قرآن مجید۔

جگہ ارشاد فرمایا کہ "ہم نے جس ملک میں بھی اپنا نبی بھیجا وہ وہاں کے لوگوں کی زبان لیکر مبعوث ہوا۔ تاکہ لوگوں کو خدا کا پیغام صاف طور پر سمجھا سکے"[1]

پاکیزہ خیالات۔ عمدہ اقوال۔ اور نیک اعمال ہی کی ترغیب ہر نبی کی جانب سے بنی نوع انسان کے لئے ہوا کی ہے۔ اور یہی باتیں ہر سچے مذہب کی جڑ ہیں۔ چنانچہ دین زرتشتی بھی ان ہی اصول کا پابند رہا۔ اس مذہب کے پیروؤں نے بھی عام اس سے کہ وہ کسی اعلیٰ طبقہ سے تعلق رکھتے ہوں یا ادنیٰ مرتبہ کے ہوں اپنے ہادی و رہبر کی تعلیمات کو اپنے دل و دماغ سے کبھی محو نہ کیا۔ اسکا نتیجہ آج بھی ظاہر ہے۔ اور پارسی قوم اپنے اعلیٰ اخلاق کے سبب اس وقت بھی آپ اپنی مثال ہے۔

پادری میچل اپنی ایک معروف کتاب میں کیش زرتشتی کے خصوصیات اس طرح گنواتے ہیں[2]:-

(۱) یہ مذہب اپنے معبود کو کسی غیر مہذب صفت سے موصوف نہیں کرتا۔

(۲) کوئی غیر مہذب فعل اس دین کی عبادت میں شامل نہیں۔

(۳) اس کے کسی مذہبی رسم میں ظلم و بیدردی کا شائبہ نہیں پایا جاتا۔

(۴) نیکی و بدی کی جنگ میں زرتشتیوں کو نیکی کی معاونت کا حکم ہے۔

(۵) عورتوں کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور کثرت ازدواج سے روکا جاتا ہے۔

(۶) کسی قسم کی بت پرستی اس مذہب میں داخل نہیں۔

(۷) پاکیزگی نفس اور اخلاق پر بڑا زور دیا گیا ہے۔

(۸) اوستا میں مستقبل کا ذکر اندوہگیں یا تاریک نہیں بلکہ انجام کار نیکی کی فتح مرقوم ہے۔

ژنداوستا کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات ہم پر اچھی طرح واضح ہوجاتی ہے کہ حضرت زرتشت کی تعلیم و اصلاح کا اصلی مقصد اس زمانہ کی پست ذہنیت اور توہم پرستی کا دور کرنا تھا تاکہ لوگ عناصر فطرت اور دیگر مخلوقات کی پرستش سے باز آجائیں[3]۔ زرتشت کے قبل بھی مختلف پیغمبروں نے لوگوں کے لئے ہدایت کے راستے کھولے تھے۔ مگر ان کی تعلیم تقریباً فراموش کی جاچکی تھی۔ سرزمین ہند کی طرح اس وقت ایران میں بھی دیوتاؤں اور معبودوں کی کثرت تھی۔ چنانچہ پیغمبر ایران نے صاف اعلان کردیا کہ سارے کے سارے دیوتا گروہ شیاطین سے متعلق ہیں اور اس لئے ہرگز لائق پرستش نہیں[4]۔ یہ اعلان ایرانیوں کے لئے جو خود بھی آریائی قوم کی ایک شاخ تھے اور دیوتاؤں کے پرستار کچھ عجب نوعیت رکھتا تھا اور یہی سبب تھا کہ اوائل اول حضرت زرتشت کی سخت مخالفت کی گئی۔ مگر انجام کار لوگوں کو ایک سے زاید معبود کی پرستش سے باز رکھنے میں وہ کامیاب رہے اور اہورا مزدا

---

[1] قرآن مجید۔ سورۃ ۱۴۔ آیہ ۴۔ [2] ہندوستان کے معروف مذاہب صفحہ ۱۶۲۔ [3] آئین پارسیان (مولفہ ڈالٹن)۔ میڈیا (مولفہ راگزین)۔ [4] مولفات ہاگ۔ مولٹن اور راگزین۔ ملاحظہ فرمائیے۔

(خدائے یگانہ و دانا) کی عبادت اقلیم ایران میں ہمیشہ کے لئے رائج ہوگئی ؎۱ زرتشت نے ایرانیوں کو اچھی طرح سمجھا دیا کہ انسانی آنکھیں جمالِ باری کے دیکھنے سے معذور ہیں۔ اور ذاتِ معبود کُل مادّی علائق سے مبرّا ہے۔ چنانچہ اس جگہ پر مناسب ہوگا اگر ہم اس خیال کی تطبیق ذیل کی آیتِ قرآنی سے بھی پیش کریں۔ خدا فرماتا ہے:۔

اللہ ہی تمہارا رب ہے۔ اس کے سوا کوئی دوسرا معبود نہیں۔ وہی خالق ہے۔ پس اسکی عبادت کرو۔
وہی سب کا کارساز ہے۔ آنکھیں اسے دیکھ نہیں سکتیں۔ مگر وہ سب کچھ دیکھتا ہے ؎۲

اب ذرا اوستائے مقدس میں بھی حضرت زرتشت کی تخیل اس سلسلہ میں ملاحظہ ہو۔ ؎۳

"اے مزدا جب میں نے دریائے فکر میں غوطہ لگایا تو محض تیری ذات کو ازلی و ابدی اور قابلِ پرستش پایا۔ تو ہی تمام پاکیزہ خیالات کا بانی اور حقانیت و سچائی کا خالق ہے۔ تیری ہی ہستی اعمال انسانی کی منصف ہے۔ اور ان ہی خیالات پر قائم رہ کر میں تجھ پر ایمان لایا ہوں"

نوشیروان جی گوپرا اپنی کتاب "آئین حلیم در دین زرتشت" میں ایک مجوسی عالم (رمنغ) کی زبانی خدا کی تعریف یوں تحریر فرماتے ہیں:۔

"میں اس خدا پر ایمان رکھتا ہوں جو دونوں جہان کا خالق اور پاک و یکتا ہے۔ نہ تو اس کی کوئی صورت (شبیہ) ہے۔ اور نہ اسکا کوئی شریک۔ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہیگا۔ خدا جسم و جسمانیت سے منزّہ ہے۔ وہ پاک پاکیزہ اور بے مثل و درخشندہ نور میں مستور ہے۔ اس کی تعریف کا حق کسی سے بھی ادا نہیں ہو سکتا۔ فرشتے اس کے محکوم ہیں۔ وہ بڑی طاقت والا ہے۔ اور ہر جگہ موجود۔ خدا عادل ہے اور حکیم۔ وہی لائقِ پرستش اور مستحق عبادت و فرمانبرداری ہے۔" ؎۴

پارسیوں کے مذہبی ادبیات میں خدا کی صفات جو مرقوم ہیں ان میں سے چند اس جگہ نقل کی جاتی ہیں:۔ ؎۵

؎۱ مقالات ہاگ۔ پیڈیا۔ ؎۲ سورۃ ۶ (آیۃ ۱۰۲) ؎۳ یسنا۔ باب ۳۱۔ آیۃ ۸۔ ؎۴ اس سلسلہ میں توحید کے متعلق اقوال جناب امیرالمومنین علیہ السلام اور امام جعفر صادق بھی ملاحظہ ہو۔ (اصول کافی جلد دوئم۔ باب ۴-۲)

؎۵ ان کی مطابقت قرآن مجید میں بھی ملاحظہ ہو (سورۃ ۲۔ آیۃ ۱۴۶۔ اور ۲۵۶۔ سورۃ آیۃ ۷۷۔ سورۃ ۱۰۔ آیۃ ۱۰۵۔ اور ۱۰۷۔ سورۃ ۱۹۔ آیۃ ۹۴۔ ۹۱۔ سورۃ ۲۸۔ آیۃ ۸۸۔ سورۃ ۳۱۔ آیۃ ۱۲۔ سورۃ ۳۸۔ آیۃ ۶۵۔ سورۃ ۴۰۔ آیۃ ۶۲-۶۴)

اور بالکل اسی طرح توراۃ۔ سفر تثنیہ باب ۶۔ آیۃ ۴۔ سلاطین۔ کتاب اول باب ۸۔ آیۃ ۲۳۔ تاریخ ایام کتاب اول باب ۱۷۔ آیۃ ۲۰۔ کتاب مزامیر باب ۸۶۔ آیۃ ۱۰۔ کتاب الاشعیا نبی۔ باب ۴۴۔ آیۃ ۹۔ کتاب ارمیاہ نبی۔ باب ۱۰۔ آیۃ ۶۔

اور انجیل مقدس ملاحظہ ہو۔ متی۔ باب ۴۔ آیۃ ۱۰۔ باب ۲۳۔ آیۃ ۹۔ مرقس باب ۱۲۔ آیۃ ۲۹۔ لوقا باب ۴۔ آیۃ ۸۔

وہ بزرگ ترین و برترین ہے۔ (یسنا۔ باب ۴۴۔ آیتہ ۷)
وہ بہترین ہے۔ (یسنا۔ باب ۲۶۔ آیتہ ۸)
وہ غیر منقلب ہے۔ (یسنا۔ باب ۳۱۔ آیتہ ۷)
وہ تمام چیزوں کا خالق ہے۔ (یسنا۔ باب ۴۵۔ آیتہ ۶)
اُس کے قبل کچھ بھی نہ تھا۔ (یسنا۔ باب ۲۸۔ آیتہ ۳)
وہ تمام عالم کا پیدا کرنے والا ہے۔ (یسنا۔ باب ۵۰۔ آیتہ ۱۱)
وہ انسانی ارواح و ضمایر کا خالق ہے۔ (یسنا۔ باب ۳۱۔ آیتہ ۱۱)
وہ رحیم ہے۔ (یسنا۔ باب ۲۸۔ آیتہ ۵)
اُس نے پانی۔ درخت اور کُل دوسری چیزوں کو پیدا کیا۔ (یسنا۔ باب ۵۱۔ آیتہ ۷)
وہ خود مختار ہے۔ (یسنا باب ۴۳۔ آیتہ ۱)
وہ تمام ہستیوں کا مالک ہے۔ (یسنا باب ۲۸۔ آیتہ ۷)
وہ عاقل ہے۔ (یسنا۔ باب ۲۹۔ آیتہ ۶)
وہ سب کچھ جانتا ہے۔ (یسنا۔ باب ۴۶۔ آیتہ 19)
وہ سب کچھ دیکھتا ہے۔ (یسنا۔ باب ۳۳۔ آیتہ ۱۳)
کوئی اُسے دھوکا نہیں دے سکتا۔ (یسنا۔ باب ۴۴۔ آیتہ ۶)
وہ تمام رازوں کا جاننے والا ہے۔ (یسنا۔ باب ۳۱۔ آیتہ ۱۳)
وہ کُل باتوں سے واقف ہے۔ (یسنا۔ باب ۳۱۔ آیتہ ۵)
وہ پاکیزگی کا منبع ہے۔ (یسنا۔ باب ۴۳۔ آیتہ ۳۔ ۴۔ ۵۔ ۷)
اُس کی سلطنت میں رحم و کرم کی بہتات ہے۔ (یسنا۔ باب ۵۱۔ آیتہ ۴)
وہ پاکیزہ ترین ہستی ہے۔ (یسنا۔ باب ۴۴۔ آیتہ ۷)
وہ حکیم۔ رحیم۔ با اختیار اور عادل ہے۔ (یشت ۔ ۱۔ ۷۔ ۱۲۔ ۱۴۔ ۱۵)
اُسی کی حکمت اس مادی دُنیا کی تخلیق کا باعث ہوئی۔ جسے وہ خود اپنی مرضی سے ختم کردیگا۔ (یشت ۱۔ ۲۶)
اس کے علاوہ پارسیوں کی عبادت روزمرہ کی کتاب خورد اوستا میں خداوندکریم کی دیگر صفاتِ حسنہ کا ذکر ہے۔
جو تمامتر قرآن مجید کے مرقومہ صفاتِ الٰہی سے مطابق ہے۔ غرضکہ پارسیوں کے اعتقاد میں خدا ہی سب سے اعلیٰ و برتر و بزرگ
ہے۔ اور وہی تمام آفرینش کا باعث۔ نہ تو وہ کسی شے سے پیدا ہوا اور نہ اُس کے جیسی کوئی شے ہے[1]۔ علاوہ ازیں صفات کا

---

[1] دینیات زرتشتی۔ صفحہ 19 (مؤلفہ ڈاکٹر دھالا)

حامل ہے۔ جو اس کی ذات سے وابستہ اور اسکا عین جزو ہیں[1]

پیغمبر ایران نے قطعی طور پر عناصر فطرت اور مصنوعات کی پرستش ممنوع قرار دیدی تھی۔ چنانچہ اپنے ہادی و رہبر کی ہدایات کے مطابق زرتشتی گروہ نے ہمیشہ اپنے تئیں بت پرستی سے علیحدہ رکھا۔ اور اُسے ایسا گناہِ عظیم سمجھا کہ ان کے معبدگاہ مطلقاً بتوں سے بے سروکار رہے[2] ہیروڈوٹس مشہور یونانی مورخ جسکا زمانہ ساڑھے چارسو برس قبل مسیح گذرا ہے۔ ایک جگہ یوں رقمطراز ہے[3]:-

"ایرانی مجوسیوں نے کبھی اصنام پرستی نہیں کی۔ بلکہ ایران کے بہادر ہمیشہ بت پرستوں سے برسرپیکار رہے۔ اور ان کے صنم کدوں کو خاک میں ملانے کی کوشش جاری رکھی"[4]

اقوام ہنود کی بت پرستی سے قطع نظر کہ جن کے دین آبائی نے ہزاروں سال کے اندر بڑے بڑے انقلابات کا سامنا کیا ہم دیکھتے ہیں کہ خود وہ مذاہب جو آسمانی صحیفوں کے حامل یا کسی کتاب اللہ سے منسلک رہ کر فخر و مباہات کرتے ہیں۔ اُن کے پیرؤں نے بھی ایک حد تک بت پرستی سے تعلق ضرور رکھا ہے۔ موسائیوں نے اپنے برگزیدہ پیغمبر کی زندگی ہی میں گوسالہ پرستی کی تھی[5] اور موجودہ زمانہ میں تو عیسائیوں کی ایک بڑی تعداد حضرت مسیح۔ کنواری مریم اور بہتیرے اولیاء کے بتوں کی پرستش نہایت جوش و خروش کیساتھ اب تک کیا کرتے ہیں۔ ڈاکٹر فارنل ایک مغربی عالم فرماتے ہیں کہ دین عیسوی کی تاریخ اس خصوص میں حد درجہ افسوسناک ہے۔ قبل میں تو ایک مدت تک عبادت گاہیں اصولِ موسوی کی پابند رہیں مگر بہت جلد ہی رومی و یونانی جذبات صنم پرستی نے حضرت موسیٰ کی روحانی تعلیم پر غلبہ حاصل کرلیا۔ چنانچہ آج کل دنیائے مسیحیت باستثنائے چند افراد یورپین پروٹسٹنٹ بت پرستی میں مبتلا ہے[6]

حضرت زرتشت نے ایسے زمانہ میں اپنی تبلیغ شروع کی تھی جبکہ دنیا کے لوگ تہذیب و تمدن سے تقریباً نا واقف تھے[7] اُن کی تعلیم کی حقیقت اور اُن کے اصول ہدایت ہی سے اُن کے وجدان اور معرفت الٰہی کا پتہ چلتا ہے۔ جو درحقیقت کافی غور و فکر اور فیلسوفانہ تخیل کا نتیجہ تھے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ بالکل یہی معاملہ ہر نبی اور پیغمبر کے ساتھ پیش آیا۔ کسی نے بھی اُس وقت تک راہ ہدایت کی تبلیغ پر کمر ہمت نہ باندھی جب تک کہ اُسے الہامی طور پر اس بات کا یقین نہ ہوگیا کہ حقیقتاً وہ معلم بزرگ و برتر کی جانب سے براہ راست اس اہم کام کے لئے مقرر ہوا ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ ہمارے کل انبیائے سلف بھی مثل ہمارے

---

[1] دینیات زرتشتی صفحہ ۲۰ (مولفہ ڈاکٹر دھالا) [2] تاریخ ایران مولفہ مارخم صفحہ ۲۲ ۔ [3] تاریخ قدیم (کیمبرج سیریز) جلد ۴۔ صفحہ ۲۵ اور مقالات ہاگ۔ [4] دینیات زرتشتی (مولفہ دھالا) صفحہ ۸۱ ۔ [5] قرآن مجید۔ سورۃ ۲۔ آیہ ۵۱۔ [6] اوصاف خداوندی۔ صفحہ ۳۶ ۔ [7] تاریخ قدیم (کیمبرج سیریز) جلد ۴۔ صفحہ ۲۷۔ میڈیا (مولفہ راگزین) اعتقاد دینی ایران باستان (مولفہ مولٹن)۔ مقالات ہاگ۔ ملاحظہ ہو۔

افراد مخلوق ہی تھے۔ چنانچہ قرآن مجید میں بھی اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ "ہم نے (اے محمد صلعم) تم سے قبل اپنے رسول بھیجے اور انھیں بھی عیال و اطفال سے سرفراز کیا۔ لیکن کوئی نبی بغیر ہماری اجازت کے کوئی پیغام نہیں لایا۔" [1]

لازمی ہے کہ ہم جو کچھ کہیں یا کریں ذرا اپنی عقل سے بھی کام لیکر۔ زرتشت جیسی شخصیت کی نبوت یا اُن کی تعلیم کے متعلق کوئی خیال ظاہر کرنے سے پیشتر ضروری ہے کہ کچھ تحقیق بھی کر لیں۔ چنانچہ خود کلامِ الٰہی میں بار بار اس کی تاکید کر دی گئی ہے۔ "ہم نے کوئی پیغمبر ایسا نہیں بھیجا جسے ہماری طرف سے الہام نہ ہوا ہو۔ اگر نہیں جانتے ہو تو عالموں سے پوچھو" [2]

اسی بناء پر خواجہ کمال الدین مرحوم نے نہایت بجا و درست فرمایا تھا کہ حضرت زرتشت صحیح معنوں میں خدا کے بھیجے ہوئے رسول تھے۔ [3]

اگر ہم تمام مذاہب اور اُن کے معلمین کی سچی تعلیمات پر غور و انصاف کی نظر ڈالیں تو معلوم ہو جائیگا کہ ہر مذہب کا اصلی مقصد محض اسی قدر تھا کہ چند ایسے اصول و قوانین کی اتباع پر اپنے گروہ کو مجبور کرے جو پسندیدہ خصائل کی تحریک میں معاون ہوں۔ اور ہر نبی کی یہی تعلیم رہی ہے کہ لوگ خدائے واحد کی پرستش کریں۔ جو خالقِ کُل موجودات ہے۔ دُنیا میں امن و سکون قائم رکھنے کی کوشش کریں۔ کہ مقصدِ آفرینش یہی ہے۔ اسی کا نام اسلام ہے۔ محمد عربی صلعم نے کسی نئے دین کی ترویج نہیں فرمائی۔ وہ تو اسی پُرانے مذہب کی اصلاح اور تجدید کے لئے مبعوث برسالت ہوئے جس کی نوح۔ داؤد۔ ابراہیم۔ موسیٰ۔ عیسیٰ وغیرہ نے اپنے اپنے زمانہ میں تعلیم دی تھی۔ اکثر انبیاء کے نام سے ہم واقف ہیں اور اکثر کو نہیں جانتے۔ [4] چنانچہ قرآن حکیم میں ہمارے نبی سے خطاب ہوتا ہے:۔

"ہم نے تم پر اپنی کتاب محض اس واسطے نازل کی ہے کہ تم تمام اختلافی مسائل کو طے کر دو اور لوگوں کیلئے ہادی اور رحمۃ اللعالمین بن جاؤ۔" [5] پھر ارشاد ہوتا ہے۔ "تحقیق کہ ہم نے تمہیں سچائی کے ساتھ بھیجا ہے۔ تم لوگوں کو خوشخبری پہنچانے والے اور ڈرانے والے ہو۔ دُنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں جس کے درمیان ہم نے اپنی طرف سے کوئی سمجھانیوالا نہ بھیجا ہو۔" [6]

پس ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ہر مذہب اور ہر دین کی اصلی غرض محض ایک ہی تھی۔ حالانکہ ان مذاہب کی ترویج مختلف اوقات اور مختلف مقامات میں ہوئی۔ اس جگہ مناسب ہوگا اگر ہم سر سید احمد اعلی اللہ مقامہ کے ایک مشہور خطبہ

---

[1] سورۃ ۱۳۔ آیۃ ۳۸۔ [2] سورۃ ۱۶۔ آیۃ ۴۳۔ [3] اسلام و دین زرتشت۔ صفحہ ۳۵۔

[4] قرآن۔ سورۃ ۴۔ آیۃ ۱۵۸ [5] سورۃ ۱۶۔ آیۃ ۶۳۔ [6] سورۃ ۳۵۔ آیۃ ۲۴۔

اس سلسلہ میں کتاب "النبوۃ والخلافت" مصنفہ شمس العلماء سید نجم الحسن صاحب ملاحظہ فرمایئے۔ موصوف نے نبوت کے معنی اور لوازمات نبوت پر وضاحت کے ساتھ بحث فرمائی ہے۔

جس میں انہوں نے اسلام سے بحث فرمائی ہے۔ مختصر اقتباس ہدیہ ناظرین کریں۔ وہ فرماتے ہیں:۔

"وہ چیز جس پر یقین کرنے سے کوئی شخص مسلم یا مسلمان کہا جا سکتا ہے۔ وہ خدا کی توحید ہے۔ جو شخص خدا کو برحق جانتا ہے اور اس کی توحید پر یقین رکھتا ہے وہ مسلم یا مسلمان ہے۔ یہی رکن اول اور رکن اعظم اسلام کا ہے۔ اور باقی ارکان اس کے تحت میں اور اس کے ساتھ اس طرح ملے ہوئے ہیں جیسے کہ کسی خالص دوا کی معجون ہو اور اس کے ساتھ اور اجزاء بھی ملے ہوئے ہوں۔ خدا کو واحدِ مطلق اور خالق تمام چیزوں کا جاننا اور سمجھنا بلکہ نہ صرف جاننا اور سمجھنا بلکہ اس پر یقین ہونا اسلام ہے۔ اور جو اس پر یقین کرے وہ مسلم ہے۔ خدائے تعالیٰ نے قرآن مجید میں یہود و نصاری کی نسبت بھی اس کا ذکر فرمایا ہے۔ جس نے خدا پر یقین کیا اور اپنا منہ خدا کے سامنے کیا اور نیک کام کرتا ہے۔ اسکا اجر خدا کے پاس ہے [1] خدا نے اہلِ کتاب سے اور کچھ نہیں چاہا۔ بجز اس کے کہ خدا کی توحید مانیں اور اسکی عبادت کریں۔ (اے اہلِ کتاب آؤ اور ہم تم صلح کرلیں کہ ہم سوائے اللہ کے اور کسی کی عبادت نہ کرینگے۔) [2] پھر ایک جگہ خدا نے فرمایا ہے کہ ابراہیم نہ یہودی تھا اور نہ نصرانی۔ بلکہ ٹھیٹ مسلمان تھا۔ [3] پس جو حقیقت اسلام کی خدا نے بتلائی وہ خدا کو ماننا اور اس پر یقین ہوتا ہے۔ خدا پر اور خدا کی وحدانیت پر اس وقت یقین ہو سکتا ہے جب اسکی ذات و صفات پر جو حقیقت میں متحد ہیں اور اس کے استحقاق عبادت پر جو اسکو لازم ہے پورا پورا یقین ہو۔ اس کی ذات پر یقین اس کے موجود بالذات ازلی و ابدی ۔ وحدہٗ لاشریک لہٗ ۔ ہونے پر یقین ہوتا ہے۔ اس کی صفات پر یقین اس کی مانند صفات کسی دوسرے میں نہ ہونے پر یقین کرنا ہے .... اس کے استحقاق عبادت پر یقین یہ ہے کہ کوئی شئے سوائے خدا کے مستحق عبادت نہیں یعنی عبادت کے لائق نہیں۔ جو شخص کہ اس طرح سے خدا پر یقین رکھتا ہے وہ مسلمان ہے میں نہیں کہتا بلکہ خدا نے یونہی کہا ہے۔ ہاں ایسے شخص کو جو محض خدائے واحد کو مانتا ہے میں یہ ضرور کہوں گا کہ وہ محمدی نہیں۔ قرآن کی اصطلاح تو یہی ہے جو میں نے بیان کی۔ مگر ہمارے زمانہ میں محمدی اور مسلمان کے الفاظ ایک ہی معنی میں لئے جاتے ہیں۔ اور مترادف سمجھے جاتے ہیں۔ اس لئے مجھ کو کسی قدر تفصیل سے بیان کرنے کی ضرورت معلوم ہوتی ہے۔ محمدی ہونے کیلئے ضرور ہے کہ ہم اس شخص پر بھی جس نے ہم کو توحید کی نعمت دی اور جس نے ہم کو توحید کی تعلیم کی اور جس کی وجہ سے ہم نے خدا کو جانا۔ اور اس کی صفات کو پہچانا یقین کریں ...." [4]

بہرکیف آپ یہ سمجھ سکتے ہیں کہ محض اسی ذات کی جسے ہم خدا کہتے ہیں پرستش ہر مذہب کا رکن اعظم ہونا چاہئے۔ ہاں یہ دوسری بات ہے کہ طریقۂ پرستش اور عبادت جداگانہ اور مختلف ہو۔ اکثر تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی مذہب کے مختلف گروہ اور جماعت میں طریقۂ عبادت اور پرستش میں نمایاں اختلاف نظر آتا ہے۔ مگر باوجود اس فروعی اختلاف کے ہم انھیں اسی

---

[1] سورۃ ۲۔ آیۃ ۱۱۲۔ [2] قرآن سورۃ ۳۔ آیۃ ۶۳۔ [3] قرآن۔ سورۃ ۳۔ آیۃ ۶۶۔
[4] مجموعہ لیکچر سرسید احمد خاں۔ مطبوعہ لاہور ۱۹۰۰ء صفحہ ۲۸۸۔

مذہب کے پیروؤں میں شمار کرتے ہیں۔ ہر شخص خدا کو پہچاننے کے لئے اس کی کسی مخلوق ہی کو ذریعہ قرار دیتا ہے یعنی اُس کی قدرت سے متاثر ہوتا ہے۔ یہ کہنا کہ مذہب زرتشتی کو بھی بُت پرست مذاہب میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ وہ آتش پرستی کی تعلیم دیتا ہے انصاف پر سخت ظلم کرنا ہے[1] ڈاکٹر مولٹن نے اپنی ایک کتاب میں جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے ان کا اس جگہ پر ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے[2] وہ فرماتے ہیں:۔

"پارسی جو آگ کے ساتھ احترام و ارادت کا اظہار کرتے ہیں۔ اسے لفظ عبادت و پرستش سے یاد کرنا سخت نادانی ہے۔ اگر اس سے ناسمجھ حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ وہ لوگ آگ کو خدا جانتے ہیں تو یہ ان کی سخت غلطی ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ اس مذہب کے پیروؤں میں چند جہلا ایسے بھی ہوں جو اس طریقہ احترام کو عبادت سمجھیں گو پڑھے لکھے اور سمجھدار پارسی کا ایمان صرف ایک خدا کی عبادت کرنا ہے۔ اگر وہ فرشتوں کا احترام کرتا ہے تو وہ بھی محض اس خیال سے کہ اُن کے ذریعہ سے خدا تک پہنچنے کی راہ ملتی ہے۔"

ہمارے ہم مذہب حضرات ہماری اس جرأت کو معاف فرمائیں۔ اگر ہم انھیں بھی خود ان کے غلط فہمی پیدا کرنے والے طریقوں کی طرف متوجہ کریں۔ مسلمانوں کا سنگِ اسود کو ایام حج میں بوسہ دینا ایک اجنبی کو اس غلط فہمی میں مبتلا کر سکتا ہے کہ وہ پتھر پوجتے ہیں۔ حالانکہ یہ حقیقت اپنی جگہ پر قائم ہے کہ مراسم حج ادا کرتے ہوئے اگرچہ حجر اسود کا احترام نہایت ضروری ہے پھر بھی یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ یہ ہرگز کسی طور بھی پرستش کا شائبہ نہیں رکھتا۔ اسی طرح کعبہ کی طرف نماز پڑھنی کعبہ پرستی نہیں کہلا سکتی۔ بس یہی حال پارسیوں کا ہے۔ وہ آگ کا احترام محض اس لئے کرتے ہیں کہ اس کی روشنی خدائی تجلی یا انوارِ الٰہی کا خیال اُن کے دلوں میں پیدا کرتی ہے اور بلا شبہ آگ یا روشنی کا احترام کوئی نیا طریقہ یا غیر معمولی جذبہ نہیں ہے[3] عناصر فطرت میں آتش کو ابتدائے آفرینش سے ایک امتیازی حیثیت حاصل رہی ہے۔ یہاں تک کہ روشنی یعنی نور کو خدا کی تخلیق کی ہوئی مثل [illegible] تسلیم کیا ہے[4] اس دنیا میں تمام مادی چیزوں کی بنا بعض علما کے نزدیک آگ اور اسکی گرمی ہی ہے۔ چنانچہ جب یہی حقیقت زرتشتیوں پر بھی ظاہر ہو چکی کہ آگ اور روشنی خداوند کریم کی قدرت کے سلسلہ میں بہترین اور بزرگ ترین مظہر ہے۔ تو انہوں نے بھی خالق کون و مکان کو پہچاننے کا ذریعہ اسی اعلیٰ ترین عنصر فطرت کو بنایا۔ اسی آگ سے وہ باری تعالیٰ کی قدرت و حکمت کا صحیح اندازہ کر سکے[5] ان کے اس خیال کو ہرگز ہم لچر اور پوچ یا غیر منطقی نہیں کہہ سکتے۔ اس لئے کہ خود قرآن مجید [illegible]

---

[1] مثلاً دراگزینی مقالات آگ۔ اور اشعار دین ایران باستان۔ [2] گنج شائگان صفحہ ۱۴۱ (مؤلفہ مولٹن)
[3] کتاب عقاید عالم (مؤلفہ جمیمز گارڈنر) میں بالتفصیل درج ہے کہ عبرانیوں اور یہودیوں کے مذہبی ادبیات کے مطابق آگ ہی خدا کی نشانی کا کام دے سکتی ہے۔ ملاحظہ جلد اول۔ [4] عقاید عالم (مؤلفہ گارڈنر) جلد اول
[5] دینیات زرتشتی (مؤلفہ دھالا) اور تصنیفات ڈاکٹر مولٹن ملاحظہ فرمائیے۔

میں بھی اکثر و بیشتر اس طرح کا اشارہ کیا گیا ہے:۔

مثلاً۔ خدا نے سب سے پہلے روشنی کو خلق کیا۔ (کتاب سفر۔ پیدائش آفرینش۔ باب اول۔ آیتہ ۳)

روشنی کی اصلیت اور انداز خدا کے علم میں محفوظ ہے۔ (ایوب۔ باب ۳۸۔ آیتہ ۱۹)

خدا ایک نور ہے۔ (اشعیاء۔ باب ۱۱۔ آیتہ ۱۷)

خدا کی مثال زمین و آسمان کے نور کی ہے۔ (قرآن۔ سورۃ ۲۴۔ آیتہ ۳۵)

خدا خود کو پردۂ نور میں ڈھانکے ہوئے ہے۔ (مزامیر۔ باب ۱۰۴۔ آیتہ ۲)

اُس کے نور کی مثال ایسی ہے جیسے کسی ستون پر چراغ روشن ہو۔ (قرآن۔ سورۃ ۲۴۔ آیتہ ۳۵)

خدا کا نور دُنیا سے آب و گل کو ڈھانکے ہوئے ہے۔ (ایوب۔ باب ۳۵۔ آیتہ ۳۰)

روشنی خدا کی علامت ہے۔ (مزامیر۔ باب ۳۸۔ آیتہ ۲۸)

خدا کے نور نے وادئ ایمن میں موسیٰ کی رہنمائی کی۔ (قرآن۔ سورۃ ۲۰۔ آیتہ ۱۰)

اس کے نور نے تاریکی میں بھٹکنے والوں کی ہدایت کی۔ (اشعیاء۔ باب ۹۔ آیتہ ۲)

خدا کی مثال آفتاب کی سی ہے۔ (مزامیر۔ باب ۸۴۔ آیتہ ۲)

اب ناظرین کے مزید اطمینان کی خاطر آگ (آتش) کے متعلق بھی قرآن مجید و دیگر آسمانی صحف سے چند مفید باتیں یہاں پر درج کی جاتی ہیں۔

آگ ہی کو قربانی کیلئے اصل ذریعہ اور واسطہ مقرر کیا گیا۔ (سفر۔ پیدائش آفرینش۔ باب ۱۵۔ آیتہ ۱۷)

قربان گاہ پر ہمیشہ اور بلا ناغہ آگ روشن رکھی گئی۔ (توراۃ۔ سفر۔ پیدائش۔ باب ۸۔ آیتہ ۲۰)

آگ کی اصلیت اسرار الٰہی میں پنہاں بتلائی گئی۔ (سفر۔ لیوی۔ باب ۶۔ آیتہ ۲۰)

سلیمان پیغمبر کے عبادت خانہ میں آگ برابر روشن رکھی گئی۔ (تاریخ ایام۔ کتاب دوم۔ باب ۷۔ آیتہ ۳)

آگ میں عود و لوبان جلا کر قربان گاہ کے اندر رکھا گیا۔ (سفر۔ لیوی۔ باب ۱۶۔ آیتہ ۱۲)

آگ کو خدا کے قہر و جلال کی علامت بتایا گیا۔ (سفر۔ خروج۔ باب ۳۵۔ آیتہ ۳)

آگ خدا کی قدرت۔ وجود۔ پاکبازی اور حفاظت کی علامت ہے۔ (کتاب حزقیل۔ باب ۱۔ آیتہ ۴۔ باب ۱۰ آیتہ ۷)

آگ الہام اور معرفت الٰہی کی علامت ہے۔ (کتاب آرمیا۔ باب ۵۔ آیتہ ۱۴)

موسیٰ پیغمبر نے وادئ طوبیٰ میں آگ دیکھی جس نے ان سے خطاب کیا۔ کہ اے موسیٰ بیشک میں تیرا رب ہوں۔ (قرآن سورۃ ۲۰۔ آیتہ ۱۱)

آگ خدا کے انصاف کی علامت ہے اور یہی انسانی اعمال کو جانچتی ہے۔ (ذکریا۔ باب ۸۔ آیتہ ۹)[۱]

---

[۱] قرآن مجید میں بھی آگ (دوزخ) کا ذکر ہے۔

آگ کے ذریعہ برائی کی سزا ملتی ہے۔ (مزامیر داؤد۔ باب ۹۸۔ آیتہ ۲۔)[1]

خدا وادی سینا میں آگ کے اندر اترا اور وہاں سے تنور کی طرح دھواں اٹھا۔ (سفر خروج۔ باب ۱۹۔ آیتہ ۱۸)[2]

اس نے بنی اسرائیل کی رہنمائی آگ کے ذریعہ کی۔ (سفر خروج۔ باب ۸۔ آیتہ ۲۰۔ باب ۴۰۔ آیتہ ۳۸)

خدا اپنی قدرت سے ایک روشنی مثل آگ کے قائم کریگا۔ (اشعیاء۔ باب ۱۰۔ آیتہ ۱۷)

خدا کی رحمت کا ظہور ابراہیم کے لئے آگ کے اندر ہوا۔ (قرآن۔ سورۃ ۲۱۔ آیتہ ۶۹)

اب ذرا اوستا، ژند اوستا یعنی زرتشتیوں کی مقدس مذہبی کتابوں کو بھی غور سے مطالعہ فرمائیے۔ تو یہ حقیقت منکشف ہوجائیگی کہ مذکورہ بالا عقائد آگ کے متعلق یہاں بھی بجنسہٖ نظر آتے ہیں۔ مثلاً

اہورا مزدا نے آسمانی دنیا کو پہلی مرتبہ روشنی سے منور کیا۔ (ایضاً۔ باب ۳۱۔ آیتہ ۷)

خدا کی بزرگی کی دلیل آتش کا نور ہے۔ (ایضاً۔ باب ۳۰۔ آیتہ ۱)

خدا کا نور دنیا و آسمان کو محیط کئے ہے۔ (روبندہش۔ باب ۲۔ یشت باب ۲۰)

اہورا مزدا کا آخری فیصلہ آگ کے ذریعہ ظاہر ہوگا۔ (ایضاً۔ باب ۳۰۔ آیتہ ۲۹)

خلاق عالم نیکوں کو انعام اور بدوں کو سزا آگ کے ذریعہ دیگا۔ (ایضاً۔ باب ۵۱۔ آیتہ ۹)

نیک بندوں کے اعمال کی جانچ اس وقت ہوتی ہے جبکہ مزدا کی آگ پر قربانی چڑھاتے ہیں۔ (ایضاً باب ۴۳۔ آیتہ ۹)

بلاشبہ اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ آگ کا احترام پارسیوں کے اندر اپنی حد سے کسی قدر تجاوز بھی کرگیا ہے۔ یہاں تک کہ غیر اقوام کو ان کے متعلق آتش پرست ہونیکا گمان ہوگیا۔ چنانچہ ایک زرتشتی عالم نے خود بھی اس سلسلہ میں اظہار خیال فرماکر انھوں نے کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:[3]

"بعض ایسے مراسم جن کو عہد حاضر کے زرتشتی پسندیدہ نگاہوں سے نہیں دیکھتے درحقیقت زرتشت کے اصلی تعالیم سے منحرف اور برگشتہ ہوجانے کے باعث رونما ہوئے ہیں۔ اور یہ مراسم طبقۂ عوام اور جہلا کی توہم پرستی کے نتائج ہیں۔ آج اکثر پارسی اپنے دینی فرشتوں کا احترام جس طور پر بجا لاتے ہیں اسے زرتشت کبھی دیکھکر ناپسند فرماتے۔ ایران میں شاہ بہرام کے قدیمی آتشکدہ پر جانوروں کی گمراہانہ قربانی ایک حد تک بت پرستی کا شائبہ لئے ہوئے ہے۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ یہ بدعات رفتہ رفتہ کم ہوتے جاتے ہیں۔"

---

[1] آتش جہنم کا ذکر قرآن شریف میں بھی ہے۔ [2] قرآن کریم۔ سورۂ ہفتم میں حضرت موسیٰ کی داستان قابل مطالعہ ہے۔
[3] ایران و پارسیان (مؤلفہ نریمان)

تاہم یہ نہ بھولنا چاہئیے کہ اس طرح کی خامیاں تقریباً ہر مذہب اور ملت میں پائی جاتی ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ معمولی عقائد جہلا اور عوام کے درمیان ایک مخصوص حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ خود مسلمانوں میں اس طرح کی کمزوری کے وجود پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ مرحوم شمس العلماء شبلی نعمانی نے صحیح طور فرمایا ہے کہ[1] "مسلمانوں کا عقیدہ عرش اور کرسی کے متعلق یا اُن کا صد درجہ کا احترام کعبہ کے لئے اگر غور سے دیکھا جائے تو بُت پرستانہ رنگ سے مبرا نہیں۔ اور اس بحث نے اتنا طول کھینچا ہے کہ مسلمانوں میں ایک ایسا بھی فرقہ پیدا ہو گیا جو خدا کے جسم رکھنے تک کا قائل ہو گیا۔ خود محدثین بھی خدا کے ہاتھ اور صورت رکھنے اور اس کے روز حشر و نشر انسانی نظروں کے سامنے ظاہر ہونے پر اعتقاد رکھتے تھے"[2]

قدیم ایرانیوں کا اہورامزدا اپنے صفات میں یہودیوں کے جیہووا۔ عیسائیوں کے خدا۔ اور مسلمانوں کے اللہ ہی جیسا ہے۔ وہی تمام کائنات کا خالق اور اسی کی مرضی پر تمام نیک و بد اعمال کا فیصلہ منحصر ہے۔ وہ واحد و یکتا ہے۔ اس کی قدرت و اختیار میں کوئی شریک نہیں۔ اور نہ کوئی قوت اس کے مقابلہ میں کامیاب ہو سکتی ہے[3]۔

زرتشتی خیال کے مطابق کُل مخلوق دو حصوں میں منقسم ہے۔ ایک گروہ مزدا پرست یعنی خدائی۔ اور دوسری جماعت دیو پرست یعنی شیطانی ہے۔ ہر انسان اپنے افعال میں مختار اور اپنی راہ نجات کے انتخاب میں آزاد ہے۔ اگر وہ خدا کو اپنا ذریعۂ نجات سمجھتا ہے تو پھر اسے شیطانی قوت سے جنگ اور مقابلہ لازمی ہوگا اور اس سے کامیاب نکلنے پر اسے نجات حاصل ہو سکے گی۔ اس مقام پر بھی عوام الناس نے غلط فہمی کو راہ دیکر زرتشتیوں کا شمار کافروں میں کیا۔ اور خدا اور شیطان کے متعلق جو اس جماعت کا عقیدہ ہے اسے متعصب مصنفین نے طرح طرح کی رنگ آمیزی کے بعد لوگوں کے سامنے پیش کیا۔ پارسیوں پر یہ الزام کہ وہ دو خدا کے قائل ہیں اور اُن کے عقیدۂ توحید سے دوئی کا اظہار ہوتا ہے۔ سرتاپا بے بنیاد اور لغو ہے۔ بالکل یہی باتیں تو آخر قرآن میں بھی مرقوم ہیں۔ ذرا ملاحظہ فرمائیے:۔

شیطان خدا کے نیک بندوں کا مخالف اور بے ایمان لوگوں کا رہنما ہے۔ (سورۃ ۲۳۔ آیۃ ۹۷)

شیطان لوگوں کو بہکاتا اور برے کاموں کی طرف لے جاتا ہے۔ (سورۃ ۷۔ آیۃ ۱۲۰)

وہ بری باتیں سکھاتا ہے۔ (سورۃ ۴۔ آیۃ ۱۲۰)

شیطان کی بدی گنہگاروں اور ایمان نہ رکھنے والوں پر اثر کرتی ہے۔ (سورۃ ۲۶۔ آیۃ ۲۲۱)

---

[1] شعر العجم جلد پنجم صفحہ ۱۷۹۔ [2] معتزلی اور اشعری عقائد پر مفصل بحث کیلئے ملاحظہ ہو تاریخ ادبیات ایران (مؤلفہ براؤن) جلد اول صفحہ ۲۸۵۔ [3] تاریخ ایرانیان (مؤلفہ کاؤکا)، تجلی ایران باستان (مؤلفہ پیناوالا) دینیات زرتشتی (مؤلفہ ڈاکٹر دھالا) ملاحظہ ہو۔ [4] میڈیا (مؤلفہ راگزین) مجوسیت قدیم (مؤلفہ ہوٹن) اور اسی طرح کے عقیدہ کے متعلق قرآن مجید میں ذیل کی سورتیں بھی دیکھئے:۔ سورۃ ۲۔ آیۃ ۳۶۔ سورۃ ۱۹ آیۃ ۱۰۰۔ وغیرہ وغیرہ۔

شیطان نے خود کو خدا کا سب سے بڑا مخالف ثابت کیا۔ (سورۃ ۲۰۔ آیۃ ۱۲۴)
نیک بندوں کے خلاف کارروائی کرنیوالا ہمیشہ شیطان ہوتا ہے۔ (سورۃ ۴۱۔ آیۃ ۳۶)
انجام کار شیطان کو شکست ہوگی اور وہ بحکم خدا فنا کر دیا جائیگا۔ (سورۃ ۴۔ آیۃ ۷۶)
اب ان ہی کو ژنداوستا کی روشنی میں دیکھئے:۔

بدی کا اصلی موجد دیو (شیطان) ہے۔	(وندیداد۔ باب ۱۹۔ آیۃ ۳-۱)
دیو کی طینت ہی بدی سے ہے۔	(ایضاً۔ باب ۶۱۔ آیۃ ۲)
بدی نتیجہ ہے بُرے بیان اور بُرے علم کا۔	(یشت باب ۲۷ آیت ۱۔ وندیداد باب ۱۱۔ آیۃ ۱۰)
بُرائی کا بانی بناشبہ شر بر قوت ہے۔	(یشت۔ باب ۱۹۔ آیۃ ۹۷)
دیو کی تمام شرارتیں بحکم خدا برباد کر دی جائیں گی۔	(یشت باب ۱۰۔ آیۃ ۱۱۸)

خدا مختلف اوقات میں اہرمن کی شرارت سے بندوں کو محفوظ رکھنے کے لئے اپنے رسول بھیجتا رہا ہے۔
(نیکارد۔ جلد اول باب ۳۶)

(باقی)

"نگار" جنوری ۱۹۳۶ء کے چند عنوانات ملاحظہ ہوں:۔

ہندی شاعری کا پہلا دور۔ رزمیہ شاعری ہندی شاعری کی ابتدائی حالت۔ چند برائی۔ اور اسکے معاصر شعراء۔ جگ نایک۔ سارنگ دھر اور رزمیہ شاعری۔ گورکھ ناتھ اور اس عہد کے دیگر شعراء معہ نمونہ کلام۔ اس عہد کے مختلف شعراء اور ان کا مختصر کلام۔ رزمیہ شاعری پر عام تبصرہ۔ جذبات و اسلوب بیان کے لحاظ سے۔

ہندی شاعری کا دوسرا دور۔ بھگتی تحریک۔ سوامی رامانند اور ان کے پہلے کے بھگت شعراء۔ متقدمین راما ... بھاو ... نند داس بھگت کبیر گرو نانک دیو۔ میراں بائی۔ ملک محمد جائسی تلسی داس۔ سور داس۔ عبدالرحیم خانخاناں وغیرہ

ہندی شاعری کا تیسرا دور۔ (رزمیہ شاعری کا آغاز) کیسو داس اور ہندی شاعری کا عروج۔ کیسو داس کے معاصرین ... سینا پت بابا دین۔ دیال گر۔ ... رام۔ چنتامنی۔ شاعر اعظم بہاری لال اور اسکی بزمیہ شاعری پر تبصرہ۔ ... اور ان کی کتابیں ... کے بعض سنت شعراء۔ اس عہد کے بعض رزم گو شعراء۔ ہندی شاعری کا عروج اور شاہان اسلام۔

ہندی شاعری کا دور چہارم۔ (نثر کا آغاز) للو لال۔ سدل مصر اور راجہ شیو پرشاد کی شاعری۔ موجودہ ہندی شاعری کے علمبردار۔ بھارتندو بابو ہریش چندر۔ پدماکر۔ مینی پردین۔ سری دھر پاٹھک کی شاعری۔ شعراء حال اور ان کے کلام پر تبصرہ۔ ہندی کا برار دو کا اثر۔ اردو شاعری پر ہندی کا اثر۔ ہندی دوہے یا اشعار ہندی رسم الخط میں بھی درج کئے جائیں گے۔ اور اردو رسم الخط میں بھی۔ ضخامت کا اندازہ ... عنوان کیا گیا ہے صرف اس ایک پرچہ کی قیمت ایک روپیہ ہوگی لیکن خریداران نگار سے علاوہ سالانہ چندہ کے اور کوئی رقم زائد نہیں لی جائے گی۔ (مینیجر نگار)

دیر و حرم کے قصے

جہاں آرا اور چھتر سال

(مسلسل)

یہاں شمع و پروانہ کے اس سوز و گداز کے تماشہ پر پردہ پڑ جاتا ہے - یا تو جہاں آرا بیگم نے درمیانی زمانہ کی داستان کو قلمبند کرنا ہی فضول سمجھا یا اس فسانہ کے اوراق پریشان تتر بتر ہوگئے - اور یہ سلسلہ ٹوٹ گیا - بالآخر جب پردہ اٹھتا ہے تو شہنشاہ شاہجہاں کی شدید علالت کا سین سامنے نظر آتا ہے - شہنشاہ دفعتاً کسی شدید مرض میں گرفتار ہو جاتے ہیں - جان کے لالے پڑ جاتے ہیں - جہاں آرا بیگم اور شہزادہ ولیعہد دارا شکوہ آدھی رات کو محل میں طلب کئے جاتے ہیں - بادشاہ کی حالت نازک معلوم ہوتی ہے - ہر ایک ماتم زدہ اور بدحواس نظر آتا ہے - صبح ہوتے ہوتے نہ صرف دارالسلطنت میں بلکہ اطراف ملک میں شہنشاہ کے فوت ہونے کی افواہ عام ہو جاتی ہے - شہر اور بازار بند - کاروبار ابتر اور ملک میں بدامنی اور خانہ جنگی کی تیاریاں نظر آتی ہیں - تینوں شہزادے تخت یا تابوت کا نعرہ بلند کرکے بغاوت کر دیتے ہیں اور دارالسلطنت پر فوج کشی کی تیاریاں - چند ہی روز میں بادشاہ کی طبیعت بہتر ہو جاتی ہے - اور اس نیت سے کہ رعیت کو بادشاہ کی زندگی کا علم و اطمینان ہو جائے شاہجہاں دہلی سے آگرہ کا سفر کرتا ہے - آگرہ پہنچکر شہنشاہ روزانہ جھروکہ درشن میں بیٹھ کر رعیت کے سامنے نمودار ہوتا ہے - تاہم شائستہ خاں اور امین خاں اورنگ زیب کو مطلع کرتے ہیں کہ بادشاہ قریب مرگ ہے - اور اورنگ زیب کو آگرہ پر دھاوا کرنا چاہئے - یہ خطوط دارا شکوہ کے ہاتھ لگتے ہیں - دارا شکوہ ان دونوں امیروں کو قید کر لیتا ہے - لیکن روشن آرا بیگم کی سفارش سے یہ دونوں رہا کر دیے جاتے ہیں - پھر بھی یہ اپنی سازشوں سے باز نہیں آتے - اورنگ زیب کی ریشہ دوانیوں اور بادشاہ کی علالت کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اورنگ زیب تقریباً دو ثلث سپاہ اور سرداروں کو اپنا طرفدار بنا لیتا ہے - اجین کی لڑائی میں شاہی فوج کو شکست ہوتی ہے -

مراد اور اورنگ زیب آگرہ پر دھاوا بولتے ہوئے چنبل کے کنارے تک آپہنچتے ہیں۔ سلیمان شکوہ داراشکوہ کا بیٹا شہزادہ شجاع کا پیچھا بنگال میں کر رہا ہے۔ اور یہاں سوائے مہابت خاں اور راؤ راجہ چھترسال کے داراشکوہ کے ساتھ اور کوئی نامی سردار یا سوبیر موجود نہیں۔

اس تمام داستان کو جہاں آرا بیگم نے نہایت دلچسپ اور رقت آمیز پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ لیکن چونکہ حکومت کی ہنگامہ آرائیوں اور ریشہ دوانیوں سے حسن و عشق کے فسانے کے لطف کو مکدر کرنا منظور نہیں۔ یہ حصہ حذف کیا جاتا ہے۔ ملک میں ہر جانب ایک طوفان برپا تھا۔ سلطنت کی خیر نظر نہیں آتی تھی۔ شاہجہاں اور جہاں آرا دونوں خاندان تیموریہ کے آیندہ عروج و بقا سے مایوس ہوتے جاتے تھے۔ داراشکوہ البتہ مقابلہ کی تیاریاں کر رہا تھا۔ راؤ راجہ چھترسال کی اورنگ زیب سے پیچھا چھڑا کر آگرہ پہنچنے کی خبر مشہور ہو رہی تھی۔ کہ عالم بیم و امید میں جہاں آرا ایک دن سلیم چشتی کے مزار پر دعا و زاری کرنے کی غرض سے فتح پور سیکری چل کھڑی ہوئی۔

تپتی ہوئی دھوپ اور لوؤں میں جہاں آرا فتح پور سیکری پہنچی۔ علاوہ سواروں کے جہاں آرا کے ساتھ صرف اس کا ناظر اور اس کی خادمہ اور سہیلی کوکل تھی۔ نوبت خانہ سے گذر کر بلند دروازہ پر سواری ٹھہری۔ اور جہاں آرا نے مسجد کی طرف قدم بڑھایا۔ کچھ لوگ غریب اور بیکس باوصف تمازت کے خیرات کی لالچ سے ادھر ادھر کھڑے بیگم کی سواری کا نظارہ کر رہے تھے۔ جونہی شہزادی نے مسجد کی طرف قدم اٹھایا ان میں سے ایک نے جو عمر میں جوان اور صورت شکل کا اچھا معلوم ہوتا تھا۔ لیکن جس کی نگاہ سے وحشت اور بدحواسی کے آثار ظاہر تھے باواز بلند اللہ اکبر کا نعرہ لگایا۔ شہزادی چونک پڑی۔ اور اسے اپنے عالم ہراس میں یہ محسوس ہوا کہ آل تیمور کے لئے جو نسلوں سے خدا کو بھلائے ہوئے بیٹھے ہیں یہ آواز غیبی آخری تنبیہ کا حکم رکھتی ہے۔ وہ کانپ گئی۔ اور آہستہ آہستہ آگے بڑھی۔ مسجد میں پہنچکر اس نے یکسو ہوکر پہلے نماز ادا کی۔ پھر سلیم چشتی کے مزار پر سرنگوں ہوگئی۔ کچھ ڈھارس بندھی تو اکبر کے اس اجڑے ہوئے دیار کا گشت لگانے لگی۔ دیوان خاص۔ خاص محل۔ خوابگاہ۔ پنج محل۔ پچیسی محل۔ ہر ایک پر غور سے نظر ڈالتی۔ اکبر کے زمانہ کے نظارہ اور کیفیت کو اپنے خیال میں تازہ کرتی۔ اپنے بچپن اور بھائی بہنوں کے کھیل کود کی باتیں یاد آتیں۔ آنکھوں کے سامنے ایک سماں بندھ جاتا۔ کیفیت درد و عبرت سے آنکھیں نمناک ہو جاتیں۔ اور جب زمانہ حال اور آیندہ کے ہنگاموں اور بربادی کی صورت سامنے آتی تو دل بیٹھنے لگتا۔ اسی خیال میں ڈوبی ہوئی جہاں آرا ایک محل کے بالاخانہ پر کھڑی ہوئی سیکری کے کھنڈروں کی طرف نظر ڈال رہی تھی۔ کہ قریب ہی پانچ سات آدمیوں کا ایک گروہ تالاب کے کنارے دکھائی دیا۔ ان میں سے بعض کے ہاتھوں میں گانے بجانے کا ساز و سامان بھی تھا۔ شہزادی کو دیکھتے ہی ان میں سے ایک نے اپنی وینا کے ساتھ میراں بائی کا یہ بھجن شروع کیا۔

میرے تو گردھر گوپال دوسرو نہ کوئی

رہنمائی کرینگے۔ لیکن شائستہ خاں اور خلیل اللہ خاں۔ جو دونوں کے دونوں دوست نما دشمن ہیں شہزادہ ولیعہد کو اپنے مشورہ سے گمراہ کر رہے ہیں۔ اور دارا شکوہ اس پر بضد ہے کہ فوج کا سپہ سالار وہ خود بنے۔ یہ راستہ تباہی کا ہے۔ اور اگر دارا شکوہ کو اس سے کوئی باز رکھ سکتا ہے تو وہ میں ہوں۔ مجھے یہ کیفیت معلوم کر کے رنج ہوا۔ میں نے اطمینان دلایا کہ مجھ سے جو کچھ ہو سکیگا میں کروں گی۔

وہاں سے اٹھ کر ہم دونوں محل خاص کے ایک کمرہ میں پہنچے اور وہاں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ میں نے سب سے پہلے اس سے اپنے خط اور اس کے جواب کے متعلق دریافت کیا۔ اس نے دونوں سے لاعلمی ظاہر کی۔ میرا اطمینان ہوگیا۔ پھر اورنگزیب کی ریشہ دوانیوں اور رموز مملکت کی الجھی ہوئی گتھیوں کے متعلق بڑی دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ اکبر اور اورنگ زیب راجستھان کے راجپوتوں، سب ہی کا تذکرہ باری باری سے ہوا۔ اگلی اور پچھلی سب ہی باتیں یاد آتی گئیں۔ ہند کی ذلت اور بربادی کا خیال آتے ہی راؤ راجہ کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ اس کے خون میں جوش پیدا ہوا اور تیوریاں بدلکر بولا:۔

"محمود غزنوی کو ہند کی دارالسلطنت کا محاصرہ توڑنے اور ناکام واپس جانے پر جس نے مجبور کیا تھا وہ ایک چوہان راجپوت ہی تھا۔ اس کے بعد محمود غزنوی پھر حملہ آور نہ ہوا۔ مگر افسوس کہ اس معرکہ میں اجمیر کا چوہان مہاراجہ کام آگیا۔ ایک صدی اور گذری اور اس کے بعد ہند کی غلامی کا دور شروع ہوا۔ قنوج کے راجہ نے محمد غوری سے ساز باز کر کے دہلی اور اجمیر کے مہاراجہ پرتھوی راج کو شکست دلوائی۔ گو اس کے بعد قنوج بھی تباہ ہوگیا۔ لیکن ہندوستان پر پھر ہمیشہ کے لئے غیروں کا تسلط ہوگیا۔"

میں:۔ سنجوگتا! (یہ نام میں نے بھی دانستہ اس قدر آہستہ سے لیا تھا کہ گویا میں صرف اپنی یاد تازہ کر رہی تھی لیکن اس نے سن ہی لیا اور بولا:۔

راؤ راجہ:۔ پرتھوی راج سنجوگتا کو قوت و اقتدار سے کہیں زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ ایک دفعہ نہیں بارہا ایسا ہوا ہے کہ ہم راجپوتوں نے محبت اور ننگ و ناموس پر سے ہر چیز قربان کر دی ہے۔ اور معرکۂ جنگ میں پھاند پڑے ہیں۔ اسوقت فتح اور شکست کا بھی خیال نہیں رہا ہے۔ بیگم! اپنے آنچل سے ایک پٹی پھاڑ کر بطور اپنی نشانی کے میری کلائی پر باندھ دو۔ تاکہ لڑتے وقت تم میری نظر کے سامنے ہو۔ اسلام کی زبردستیوں کے خلاف تو راجپوت ہمیشہ سے لڑتے آئے ہیں اور میں بھی اسکا مقابلہ کرنے سے گریز نہ کرونگا۔ لیکن تمہاری نشانی اگر میرے سامنے ہوگی تو میں تمہارے ننگ و ناموس کا بھی ویسا ہی پاس و لحاظ کروں گا کہ جیسا اپنے ننگ و ناموس کا۔ کیونکہ یہ دونوں میری نگاہ میں ایک ہی عزت رکھتے ہیں۔

یہ سنتے ہی میری جان میں جان آئی۔ مجھے پورا پورا اطمینان ہوگیا۔ میں نے اپنے دوپٹہ میں سے ایک پٹی پھاڑ کر اسکی کلائی پر باندھ دی۔ میں وہاں سے اٹھی۔ راؤ راجہ میرے ساتھ تھا۔ شام ہوگئی تھی دن ڈھل چکا تھا۔ سماں نہایت دلکش تھا۔ سامنے تالاب تھا جہاں بابر اسوقت جب سیکری محض ایک گاؤں تھا۔ مچھلیوں کا شکار کھیلا کرتا تھا۔ ہم

دونوں ٹہلتے ٹہلتے وہاں پہنچے ۔ اور میں تالاب کے قریب چبوترہ پر بیٹھ گئی ۔ راؤ راجہ چبوترہ کی سیڑھیوں پر ٹھہر گیا ۔ وہ گردن پھیر کر کسی چیز کو غور سے دیکھ رہا تھا ۔ مجھے اس کے دوپٹہ میں دو موتی چمکتے نظر آئے ۔ میں نے اپنے گلے کے گلوبند کو پہچانا اور خوشی سے میری باچھیں کھل گئیں ۔ اس نے گردن اٹھا کر کہا :۔

" دیکھئے بیگم صاحب سامنے والے میدان کے آگے جو نشیب ہے بابر اور رانا سانگا میں وہیں لڑائی ہوئی تھی "

میں :۔ میں تو ان خانہ جنگیوں اور خونریزی سے تنگ آگئی ہوں ۔ ان باتوں کے ذکر سے میری طبیعت محظوظ نہیں ہوتی ۔ خدا کرے کہ یہ لڑائی جو درپیش ہے آخری لڑائی ہو اور دارا فتحیاب ہو کر فتحپور سیکری میں اپنی فتح کا جشن منائے ۔

راؤ راجہ :۔ (نہایت لاپرواہی سے) فتحپور سیکری چتوڑ کی آخری تباہی کے دوران میں بسایا گیا تھا ۔ اکبر نے بھی تو اپنی سلطنت کی بنیاد خونریزی ہی پر قائم کی تھی ۔ اور خونریزی ہی نے اس سلطنت کو قائم اور مستدر رکھا ہے ۔ اکبر کا ارمان یہ ضرور تھا کہ وہ اپنے نئے عقیدے اور ایمان سے ہندوستان میں متحدہ قومیت پیدا کرے ۔ لیکن جس طرح تیمور لنگ کی عظیم الشان سلطنت اس کے بعد قائم نہ رہ سکی کیونکہ وہ نہایت عظیم الشان تھی ۔ اسی طرح اکبر کا خواب و خیال بھی اس لئے پورا نہ ہو سکا کہ وہ نہایت جلیل القدر تھا ۔

میں :۔ (اضطراب کے ساتھ) اکبر ہند کی رعیت سے محبت رکھتا تھا ۔ اس نے راجستھان کی کماریوں کو رانیوں اور بیگموں کا مرتبہ دیا ۔

راؤ راجہ :۔ ہاں لیکن اس نے ان کے ننگ و ناموس کا پاس و لحاظ ہمیشہ نہیں کیا ۔ لوگ راجستھان میں آجتک کہتے ہیں کہ اکبر پرتھوی راج کی رانی پر بری نگاہ ڈالتا تھا ۔ اور ایک دفعہ جشن نوروزی کے موقعہ پر اس نے رانی پر ہاتھ ڈالنا چاہا تھا ۔ لیکن رانی کمر سے خنجر نکالکر مقابلہ کے لئے تیار ہو گئی ۔

یہ سن کر میری پیشانی پر بل پڑ گئے ۔ میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی ۔ میں نے جوش میں آکر کہا ۔ آدمی آدمی میں بڑا فرق ہوتا ہے ۔ اکبر معمولی آدمی نہ تھا ۔ کتنی عورتیں ہیں جو اس کی ایک نگاہ پر اپنے تئیں قربان نہ کر دیتیں ۔

یہ سنکر راؤ راجہ کے چہرہ کا رنگ بدلا ۔ اس نے اپنی گردن جھکا کر نگاہیں نیچی کر لیں ۔ میں سوچنے لگی کہ میں بھی تو راجستھان کے ایک شہزادہ پر اپنا تن من سب نچھاور کرنے کے لئے تیار ہوں ۔ یہ خیال آتے ہی میں مسکرا دی ۔ میرا نقاب بہت باریک تھا ۔ اس نے شاید مجھے مسکراتے دیکھ لیا ۔

راؤ راجہ :۔ (مسکرا کر بولا) شہزادی معاف کرنا ۔ کچھ خیال آگیا تھا ۔ سپاہی کا خون بہت جلد کھولنے لگتا ہے ۔ معاف کر دو ۔ میں تمہارا ویسا ہی غلام ہوں جیسا تھا ۔ اکبر کی عظمت اور اسکے مسلک کا میں ہمیشہ سے قائل رہا ہوں ۔ اور اب بھی ہوں (یہ کہکر اس نے اس تعویذ کو جو میں نے اس کے ہاتھ پر باندھا تھا بوسہ دیا اور مجھے دیکھنے لگا)

چونکہ دن ڈھل چکا تھا اور دیر ہو گئی تھی ۔ میں نے آگرہ واپس جانیکا قصد صبح تک ملتوی کر دیا ۔ ملک میں شورش

اور بدامنی پھیلی ہوئی تھی۔ لہذا راؤ راجہ کو میرا تنہا فتحپور سیکری میں رات کو ٹھہرنا اندیشہ سے خالی نہ معلوم ہوتا تھا۔ اس نے بھی طے کیا کہ وہ رات کو وہاں ٹھہریگا۔ اور صبح ہوتے ہی جائیگا۔ میں نے محل کے ایک حصہ میں اس کے ٹھہرنے کا انتظام کرا دیا شام کو ہم دونوں محل میں پھر ملے۔ توکل نے بڑے سلیقہ سے دسترخوان بچھایا۔ میوہ جات اور لوزیات اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کے چنے ہوئے تھے۔ شمع و فانوس کمرہ کو جگمگا رہے تھے اور پھولوں کی خوشبو دماغ کو معطر کر رہی تھی۔ راؤ راجہ مہمان تھا اور میں میزبان۔ ہم دونوں قریب قریب بیٹھے تھے۔ لیکن صدیوں کی سرگذشت اور موجودہ کشمکش اور ہنگامہ آرائیاں ہم میں فاصلہ پیدا کر رہی تھیں۔ میں نے جام شراب بھر کر اپنے ہاتھ سے راؤ راجہ کی طرف بڑھایا۔ سلسلۂ گفتگو شروع کرنے کے لئے مجھے اور تو کچھ سوجھا نہیں میں نے پوچھا:-

آخر آپ لوگ جب اپنے ہاتھ سے ننھی جانوں کا خون کرتے ہیں تو کیا اس کی کراہت کا احساس آپکو نہیں ہوتا؟

راؤ راجہ:- (اس نے جام شراب بلا منہ سے لگائے ایک طرف رکھ دیا اور سنجیدگی سے بولا-) اگر ہم راجپوتوں کو تلوار چلانی نہ آتی ہوتی تو نہ راجستھان باقی رہتا نہ سلطنت مغلیہ۔ شہزادی مرنا اور مارنا تو زندگی کا اتار چڑھاؤ ہے ورنہ خالق و مخلوق کا رشتہ تو استحکام ابدی رکھتا ہے۔ کم از کم میں نے تو جب کبھی شہنشاہ کی رفاقت میں تلوار بے نیام کی اور دشمنوں کا خون بہایا ہے تو سوائے ننگ و ناموس کے تحفظ کے اور کوئی جذبہ مجھ پر غالب نہ تھا۔ اور جس دن میں لڑائی میں کام آجاؤنگا میں سمجھونگا کہ میں نے دنیا میں سپاہی کا فرض ادا کیا۔ عاقبت کی خبر خدا جانے۔

یہ سنتے ہی میری طبیعت بے چین سی ہوگئی اور مجھ پر خوف طاری ہوا کہ مبادا میرا محبوب مجھ سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو جائے کھوئی ہوئی سی حالت میں میں نے کہا:-

"ہر لحظہ کی شورش آخر کس کو بھاتی ہے۔ کیا ہم امن و سکون کے جویا نہیں؟ کشت و خون و ہنگامہ آخر تا بکے؟"

راؤ راجہ:- شہزادی ایک زمانہ گذرا کہ ہند میں مہاراجہ اشوک بڑا چکرورتی راجہ ہوا تھا۔ اس نے کشت و خون سے توبہ کی تھی۔ وہ امن و آشتی کا فرشتہ تھا۔ شانتی اسکا سبھاؤ تھا۔ خونریزی کرنا یا جان لینا اس کے نزدیک بڑا گناہ تھا۔ وہ اس گناہ کا مرتکب ہوا۔ مگر نتیجہ کیا نکلا۔ آریہ ورت کا دروازہ دوست و دشمن سب کے لئے کھلا رہا۔ دشمن آئے اور جوق جوق آئے۔ کشت و خون بھی جتنا کر سکتے تھے کیا۔ حتیٰ کہ ہند اس حالت کو پہنچ گیا۔

داستانِ پارینہ سے درگذر کر کے آنیوالی پریشانیوں اور اورنگ زیب اور مراد کی ریشہ دوانیوں کا تذکرہ ہونے لگا۔ میں سب کچھ سنتی جاتی تھی۔ کبھی چپ ہو جاتی کبھی جواب دیدیتی۔ لیکن جوں جوں وقت گذرتا جاتا میری طبیعت اداس ہوتی جاتی۔ کیونکہ میں بہت کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن تاب گویائی نہ تھی۔ جو باتیں کرنے کو دل چاہتا تھا وہ زبان سے نکلتی نہ تھیں۔ جب رات زیادہ گذرنے لگی مجھے خیال آیا کہ راؤ راجہ کو تڑکے ہی روانہ ہونا ہے۔ میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ راؤ راجہ نے رخصت چاہی۔ میں سراپا انتظار تھی۔ کہ وہ بولا:-

"شہزادی! جب آپکا کوئی پیام مجھ کو نہیں ملا تو میں سمجھا کہ آپ نے مجھے بھلا دیا۔ تاہم میرے دل سے آپ کی صورت کا وہ نقش جو میں نے اپنے خیال میں کھینچا تھا ماند نہیں پڑا۔ اور میں اسی تصور کا غلام رہا۔ لیکن اب جبکہ مجھ کو آپکا دیدار نصیب ہو چکا ہے۔ اب جبکہ میری اور آپ کی آنکھیں چار ہو چکی ہیں۔ قسمت ہی یاری نہ کرے تب تو بات دوسری ہے۔ ورنہ چھتر سال آپ سے جدا نہیں رہ سکتا"۔

یہ کہکر اس نے قدم اٹھائے اور نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ میں اپنی خوابگاہ پہنچی۔ اُمید و بیم نے طبیعت کو اُلجھن میں ڈال رکھا تھا۔ کچھ کھوئی ہوئی سی تھی۔ سامنے گلدان میں پھول چُنے ہوئے رکھے تھے۔ بے تحاشہ دوپٹہ کی روپہلی تاریں نکال کر اور چمپا کے پھول گلدان سے لیکر ہار گوندھنے لگی۔ ہار گوندھتے گوندھتے میں کمرہ کے برآمدہ میں جا کھڑی ہوئی۔ اور جھک کر دیکھنے لگی۔ اپنے کمرہ کے برآمدہ میں راؤ راجہ بھی کھڑا ہوا تھا۔ کچھ تو شرمائی تھی کہ کہیں وہ مجھے دیکھ نہ لے۔ اور کچھ انتظار تھا کہ اس کی نگاہ میری طرف پڑے۔ لیکن وہ کسی غور و فکر میں ڈوبا ہوا سامنے دیکھ رہا تھا۔ لمحہ بھر بعد وہ کمرہ میں چلا گیا اور میں بھی اندر آگئی۔ کوئل چٹائی پر پڑی ایک طرف سو رہی تھی۔ میں بھی غلطاں و پیچاں پلنگ پر کچھ دیر پڑی رہی کہ دیکھئے اس کمبخت جنگ کا کیا حشر ہوتا ہے۔ کبھی ملنا بھی بدا ہے کہ نہیں۔ میں اسکی صورت بھی دیکھ سکوں گی کہ نہیں۔ اتنی دیر کے لطفِ صحبت کے باوجود دل کی بات دل ہی میں رہی۔ اور کچھ کہنے نہ پائی۔

اسی خیال میں میں پلنگ سے اٹھی۔ اس دروازہ تک پہنچی جو میرے اور راؤ راجہ کے کمرہ کے درمیان بند تھا۔ بلا کسی ارادے کے جس طرح خواب میں کوئی نقل و حرکت کرتا ہے میں نے دروازہ کھولا۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوا کہ گویا دروازہ خود بخود کھل گیا۔ میں اندر داخل ہوئی۔ کمرہ چاندنی سے روشن تھا۔ راؤ راجہ ایک مرگ چھالا پر ٹرانگے سر سو رہا تھا۔ چاندنی اس کے چہرہ پر پڑ رہی تھی۔ آنکھیں بند تھیں۔ لیکن ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ اُس وقت اسکا حُسن انتہا درجہ دلفریب تھا۔ مجھے اس کی موہنی صورت کبھی ایسی بھولی اور پیاری نہیں معلوم ہوئی تھی۔ ایک لمحہ تو میں کھڑی محوِ نظارہ رہی اور پھر پاؤں پھیلا کر ہاتھ کے سہارے اسکے پہلو میں بیٹھ گئی۔ اس وقت مجھ پر وہ عالمِ محویت طاری تھا کہ مجھ کو دُنیا و مافیہا کی خبر نہ تھی۔ نہ جو کچھ گذر گیا اسکا غم تھا نہ جو کچھ پیش آنیوالا تھا اسکی فکر تھی۔ اگر کسی بات کا احساس تھا تو صرف اس کا کہ ہُوں اور میرا محبوب اور تیسرا کوئی مخل نہ ہو۔ لطفِ محبت کا یہ ایک لمحہ مجھے اپنے نشہ سے اس طرح سرشار کئے ہوئے کہ گویا یہی تمام تر زندگی ہے۔ ہم دونوں کی یہ چھوٹی سی دُنیا مجھے اس لمحہ کُل کائنات عالم میں محیط اور چھائی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ زندگی کا تمام تر مقصد۔ میری ساری امیدیں اور خواہشیں بس اس ایک ارمان میں کُوٹ کُوٹ کر بھر دی گئی تھیں۔ کہ اگر وہ اس لمحہ جاگ جاتا اور آنکھیں چار ہو جاتیں تو میں اپنے اس سوزِ نہانی کا راز جس سے ساری عمر تڑپا کی اپنی زبان سے اُس پر آشکارا کر دیتی۔ اور جواب میں پیامِ محبت و پیمانِ وفا کے دو کلمے اپنے کانوں سے سُن لیتی۔ چاہتی تھی کہ جگا دُوں۔ شوق و انتظار تھا کہ وہ جاگ جائے۔ لیکن وسوسہ تھا کہ کہیں آنکھ کھلنے پر یہ کیفِ خاموشی جاتا نہ رہے۔ اس لمحہ کا جادو

ٹوٹ نہ جائے۔ مجھے اس غلبۂ جذبات میں مشکل سے چند منٹ گذرے ہوں گے کہ اس نے ایک لمبی سانس لی۔ اور کروٹ بدلی۔ میں سراپا انتظار تھی کہ دفعتاً کمرہ کے پاس ہی کچھ شور سا ہوا۔ بھاری بھاری قدموں کی آواز سنائی دی۔ جیسے کوئی آیا اور جلدی واپس دوڑا۔ میں سہم گئی۔ اٹھی اور سیدھی اپنے کمرہ میں واپس آئی۔ میرا دل بلیّوں اُچھل رہا تھا۔ پسینہ میں شرابور تھی۔ تکان نے چُور چُور کر دیا تھا۔ چند لمحہ افسردگی کی حالت میں پلنگ پر پڑی رہی لیکن پھر آنکھ لگ گئی۔

تڑکا ہوتے ہی کسی کے زور سے چیخنے کی آواز نے مجھے جگا دیا۔ اسی وقت کوئل باہر سے کمرہ میں گھبرائی ہوئی آئی۔ میں نے پوچھا کہ کیا ہوا؟ اس نے یہ خبر سنائی کہ پہرے والوں نے کسی آدمی کو جو زبردستی محل میں داخل ہونا چاہتا تھا۔ قتل کر دیا۔ مجھے کچھ زیادہ غم نہ ہوا۔ کیونکہ میں یہ سمجھی کہ غالباً یہ وہی آدمی ہوگا جس نے رات کو مجھے خائف کیا تھا۔ تاہم اس کی چیخ کی آواز دیر تک میرے کانوں میں گونجتی رہی۔ کوئل سے یہ بھی معلوم ہوا کہ راؤ راجہ بڑے تڑکے ہی سوار ہو کر آگرہ روانہ ہو گیا۔ میں جب پلنگ سے اٹھنے لگی تو مجھے اس ہار کا دھیان آیا جو میں رات کو گوندھ رہی تھی۔ میرے آس پاس کہیں اسکا پتہ نہ تھا۔ خیال آیا کہ جب میں راؤ راجہ کے کمرہ میں گئی تھی تو ہار میرے کمرہ میں تھا۔ وہاں جاکر دیکھا تو وہاں بھی نہ پایا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ وہ راؤ کے ہاتھ لگا اور اس کے ساتھ گیا۔ میں دل ہی دل میں شرمائی کہ اب جب ملاقات ہوگی تو مجھ سے آنکھیں چار کیسے کی جائیں گی۔ تاہم میں خوش ہوئی کہ جس کے لئے گوندھا گیا تھا اسی کے ہاتھ لگا۔

تھوڑی دیر بعد میں تیار ہو کر سوار ہو گئی۔ ہماری سواری جس وقت نوبت خانہ سے نکلی تو کسی ہندو کی ارتھی جلانے کے لئے گھاٹ لے جائی جا رہی تھی۔ نہ معلوم کیوں میں پوچھ بیٹھی کہ یہ کس کا جنازہ ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ وہی شخص ہے جو تڑکے پہرے والوں کے ہاتھ سے مارا گیا۔ گو دیوانہ تھا تاہم اس کی آواز بڑی سُریلی تھی اور گاتا اچھا تھا۔ بیگم صاحب کو بھیروین سنانا چاہتا تھا اسی لئے مارا گیا۔ کسی نے یہ بھی کہا کہ اس نے پہلے کہیں سے ایک جڑاؤ پہونچی چُرا لی تھی جو ہر وقت گلے میں ڈالے رہتا تھا۔ مجھے فوراً دھیان آیا کہ یہ وہی شخص ہوگا جس نے میرا بائی کا گیت سنا کر مجھے خوش کیا تھا۔ اور جس کو میں نے اپنی پہونچی انعام دی تھی۔ اسکی ماں روتی پیٹتی ارتھی کے ساتھ جا رہی تھی۔ میں نے ناظر کو حکم دیا کہ پہونچی عورت سے واپس نہ لی جائے بلکہ دوسری پہونچی بھی اتار کر دیدی۔ مجھے اس شخص کے مارے جانے کا افسوس ہوا۔ اور شگون اچھا نہیں معلوم ہوا۔

جب میں آگرہ پہنچی تو ہر طرف جنگ کا چرچا اور لڑائی کی تیاریاں دکھائی دیں۔ میں اپنے بھائی دارا کے پاس جانے کے لئے تیار ہو رہی تھی کہ مجھے ایک خط ملا۔ یہ چھتر سال کا تھا۔ اس نے مجھے یہ اطلاع دی تھی کہ دارا یہاں تک بضد ہے کہ اگر اسکو فوج کا سپہ سالار مقرر نہ کیا جائیگا تو وہ سینہ میں خنجر مار کر خودکشی کر لیگا۔ اس دھمکی کا اثر شہنشاہ پر یہ ہوا کہ دارا کے فوج کا سپہ سالار مقرر کئے جانیکا حکم بادشاہ نے صادر کر دیا۔ اور اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ اسی خط میں میرے محبوب نے رن کے لئے روانہ ہونے سے پیشتر مجھ سے آخری ملاقات کی درخواست بھی کی تھی۔ چنانچہ دوسرے روز شام کو

میں تاج محل میں اس سے ملنے گئی ۔ تاج کا سین حد درجہ پُرلطف و دلفریب تھا ۔ بزمِ گل ولالہ آراستہ تھی ۔ سبزہ قدموں کے نیچے بچھا تھا ۔ سرو پاسبان تھے ۔ ہر طرف سکون کا تسلط تھا ۔ چاندنی کی جگمگاہٹ سے محفل روشن تھی ۔ قدرت گلاب اور چمیلی کی خوشبو سے تواضع کرتی تھی ۔ چڑیاں گھونسلوں میں بسیرا لینے چہچہاتی جاتی تھیں ۔ ان کا چہچہانا نغمہ کا لطف دیتا تھا ۔ اور تاج کا جوبن اور نکھار تو غضب ڈھاتا تھا ۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ پیکرِ حُسن چاندنی کے آئینہ میں اپنا عکس دیکھ کر خود ہی محوِ حیرت ہے ۔ حُسن و محبت کی اس تصویر کو دیکھ کر میں عش عش کر رہی تھی کہ پیچھے سے کسی کے قدموں کی آہٹ نے مجھے چونکا دیا ۔ گردن پھیر کر دیکھا تو راؤ راجہ تھا ۔ جب نگاہیں ملیں تو اس نے سر جھکا دیا ۔ میں نے سلام قبول کیا ۔ اور ہم دونوں سنگ مرمر کے حوض پر بیٹھ گئے ۔ میری طبیعت تو اس وقت جنگ و تذکرۂ جنگ کی طرف ایک لمحہ بھی دھیان دینے کو نہ چاہتی تھی ۔ لیکن اس سے گریز و پناہ بھی نہ تھی ۔ معلوم ہوا کہ اورنگ زیب اور مراد کی فوجیں چمبل کے کنارے پڑی ہیں ۔ اور یہاں سے شاہی فوج کو صبح ہی مقابلہ پر جانے اور کوچ کرنے کا حکم مل گیا ہے ۔ شہنشاہ کی مرضی تھی کہ ولیعہد سلیمان شکوہ کے بنگالہ سے واپس آنے تک انتظار کرے ۔ لیکن اب توقف کا موقع نہ تھا ۔ چمبل پر دونوں فوجوں کا مقابلہ ہونے کو تھا ۔ راستہ کے تمام ناکوں کی مورچہ بندی ہو چکی تھی ۔ صرف ایک مقام جو راجہ چمپت کے علاقہ میں تھا اس لئے باقی چھوڑ دیا گیا تھا کہ راجہ نے پختہ وعدہ کیا تھا کہ وہ غنیم کی فوج کو کسی حالت میں راہ نہ دیگا ۔ راؤ راجہ کو راجہ چمپت کے وعدہ پر پورا بھروسہ نہ تھا ۔ اور سب سے زیادہ خطرہ اس کو سردار خلیل اللہ خاں کی جانب سے تھا ۔ غضب یہ تھا کہ خلیل اللہ خاں کی کمان میں تیس ہزار سپاہی تھے ۔ راؤ راجہ نے غم و غصہ کے لہجہ میں کہا کہ اگر شہزادہ ولیعہد اب بھی خلیل اللہ خاں کی مکاری اور چاپلوسی سے آگاہ ہو جائے تو اورنگ زیب کے گولے اور بارود کا مقابلہ تو چنداں دشوار نہ تھا ۔

میں یہ سنکر تھوڑی دیر تک سوچ میں پڑی خاموش رہی ۔ پھر میں نے چونک کر کہا کہ راؤ راجہ تمہارے راجپوت سوبیرا اور رام سنگھ کے سواروں کا رسالہ تو قابلِ اعتبار ہے ؟ راؤ راجہ نے مجھے اطمینان دلایا کہ میں اُدھر سے بے فکر رہوں ۔

جنگ و تذکرۂ جنگ کو بالآخر دماغ سے ہٹا کر ہم دونوں حوض پر سے اُٹھے اور تاج کی جانب چلے ۔ راؤ راجہ کچھ اُداس اور سوچ میں تھا ۔ اس کی نظر تاج پر پڑی ۔ ایک لمحہ ٹھہرا اور تاج کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا ۔ میں اسکو دیکھتی رہی ۔ پھر آہستہ سے بولا :-

"آدمی بھی عجب طرفہ تماشہ ہے ۔ اپنی ہمت و قوت سے دُنیا پر حکومت کرتا ہے ۔ بناتا بھی ہے بگاڑتا بھی ہے جس شئے کو ساخت کرتا ہے اسی کو غارت بھی کرتا ہے ۔ انسان کی یہ طاقتِ ازلی اس کے حرکات و سکنات سب پر غالب رہتی ہے ۔ ہاں اگر اس سے بھی کوئی قوت زبردست ہے تو وہ عورت کی ہے ۔ جب عورت کا دیو کے نقش قدم پر

چلنے لگتی ہے تو یہ اسی کا کرشمہ ہے کہ وہ نئی زمین اور نیا آسمان پیدا کر دیتی ہے۔"

یہ سنتے ہی مجھے اپنے چمپا کے ہار کا دھیان آیا۔ اور شبہ ہوا کہ کہیں اسکا اشارہ اس رات والی واردات کی طرف تو نہیں۔ اس لمحہ میرے دل کی بےچینی بڑھنے لگی۔ غلبۂ جذبات سے مجبور ہو کر میں تھکنے سی لگی۔ ایک محراب میں دم لینے کھڑی ہو گئی۔ راؤ راجہ نے فوراً ہی اپنا شال میرے بیٹھنے کے لئے بچھا دیا۔ میں بیٹھ گئی۔ میں نے ہمت باندھی۔ اور سوچا کہ جو کچھ کہنا ہے کہہ ڈالوں۔ لیکن پیشتر اس کے کہ میں زبان کھولوں ایک عجیب کیفیت پیش آئی۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ گویا نجابت خاں جسکا مجھے کبھی دھیان بھی نہ آتا تھا اس لمحہ میرے سامنے غیظ و غضب کی حالت میں کھڑا مجھے دھمکا رہا ہے۔ میں راؤ راجہ کو مخاطب ہی کیا چاہتی تھی کہ وہ بڑے غور و تامل کے بعد خود ہی بولا کہ "اورنگ زیب کے تمام لشکر میں سب سے پہلے اگر میں کسی شخص کا خاتمہ کیا چاہتا ہوں تو وہ نجابت خاں ہے۔" میں گھبرا کر لیکن ضبط سے بولی کہ "کیوں؟" اس نے جواب میں کہا:۔
"اس لئے کہ مجھے اس سے سخت تنفر ہے۔"

مجھے شک ہوا کہ مبادا اس نے کچھ سنا ہو۔ ایسا نہ ہو کہ کہیں اس کے دل میں میری طرف سے کچھ شبہ ہو جائے۔ میں نے فوراً ہی منہ سے نقاب الٹ دیا۔ کہ وہ میری نگاہ و بشرے سے میرے دل کی کیفیت معلوم کرلے۔ اور اس کو یقین ہو جائے کہ میرے اور اس کے درمیان کوئی تیسرا شخص حائل نہیں۔ کُجا نجابت خاں! نقاب الٹنے کے فوراً ہی بعد میں نے ہمت کر کے بالآخر کہہ ہی ڈالا۔" راؤ راجہ تمہیں اس خط کا کچھ دھیان ہے۔ جس کو میں نے تعویذ بنا کر اپنے سینہ سے لگا رکھا ہے؟ اس میں لکھا تھا کہ اگر میں سنجوگتا بھی ہوتی......." اتنا کہہ کر میری زبان خود بخود رک گئی۔ راؤ راجہ کے چہرے کا رنگ بدلا۔ اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی۔ اور کہنے لگا:۔

"سالہا سال ہوئے کہ میں نے ایک خواب دیکھا تھا۔ یہ خوابِ شباب نہ صرف سہانا بلکہ ایسا لطیف و پاکیزہ تھا کہ باوجود ایک عرصہ گذر جانے کے مجھے اس طرح یاد ہے کہ گویا کل کی بات۔ وہ جوانی کی عمر تھی اور مجھے خوابوں پر عقیدہ تھا۔ لیکن زمانہ اور تجربہ نے ثابت کیا کہ خواب حقیقتِ زندگی سے بہت دور ہوتے ہیں۔ ان کی اصلیت بہت کم ہوتی ہے۔ ان کا سماں صرف چاندنی رات ہی میں بندھتا ہے۔ روزِ روشن میں یہ دھوپ کی تیزی سے کہرے کی طرح پھٹ جاتے ہیں۔ جنگ کے معرکوں کی یادگار تو دیکھو میری پیشانی "تلوار کے گھاؤ" کے نشان کی صورت میں صاف صاف دکھائی دیتی ہے لیکن جہاں آرا بیگم زندگی نے جو چرکے دیئے۔ خوابِ شباب کی امنگوں کو جس طرح مٹایا! ان زخموں کے داغ میرا دل چھپائے بیٹھا ہے۔ وہ نظرِ اغیار کے تماشہ کے لئے نہیں۔ مگر یہ سچ ہے کہ خوابِ شباب جوں جوں حقیقتِ زندگی سے دور ہوتا جاتا ہے اتنا ہی سہانا اور پیارا معلوم ہونے لگتا ہے۔ اور انسان اس امید پر جیتا ہے کہ جو کچھ اس دنیا میں ہاتھ نہ لگا اس دنیا میں ملیگا۔"

یہ سنکر میری نگاہیں نیچی ہو گئیں۔ ہم دونوں تھوڑی دیر خاموش بیٹھے رہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حوادثِ زندگی ہم دونوں

کو ایک دوسرے سے نہ صرف جدا بلکہ دُور کرتے جاتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ میں یہ بھی محسوس کرتی تھی کہ درحقیقت ہم ایک جان دو قالب ہیں۔ تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد میں نے آہستہ سے کہا "چلئے روضہ کے اندر چلیں" مجاور مقبرے سے ہٹا دیے گئے تھے۔ چراغ روشن تھے۔ موتیوں ٹکی ہوئی زردوزی کے کام کی چادر جو ہر جمعہ کو میری ماں کی قبر پر چڑھائی جاتی تھی ابھی ابھی ڈالی گئی تھی۔ عود و عنبر کی خوشبو سے تمام مقبرہ مہک رہا تھا۔ ہم دونوں ایک لمحہ قبر کے سرہانے مودبانہ خاموش کھڑے رہے۔ پھر وہاں سے ہٹ کر مجّر کا طواف کرنے لگے۔ میں نے اپنے محبوب سے کہا کہ وہ کوئی ایسا نام جو اُسے پیارا ہو اپنے گلے سے ایسی آواز سے نکالے کہ اس کی ہر طرف گونج سنائی دے۔ لمحہ بھر میں میرا نام تاج کے تمام گنبد میں اس طرح گونج اٹھا کہ گویا کسی فرشتہ نے در و دیوار میں جان ڈال دی ہے۔

میں نے اپنا سارا پُرانا دُکھڑا کہہ سنایا۔ تمام داستانِ زندگی لکھ ڈالی۔ لیکن اب میرا قلم آگے چلنے سے خود بخود رُکتا ہے جو راز و نیاز کی باتیں اس وقت میرے اور میرے محبوب کے درمیان ہوئیں وہ میری نگاہ میں ایسا تقدس رکھتی ہیں کہ میں ان کو لکھنا نہیں چاہتی۔ البتہ یہ ضرور کہوں گی کہ جو عہد و پیمان ہمارے درمیان ہوئے وہ شادی کی معمولی رسم سے کہیں زیادہ متبرک و استوار تھے۔ اگر مقدر نے وہ دن دکھایا کہ دارا شکوہ کو اس لڑائی میں فتح ہوئی اور بوندی کے راؤ راجہ چھترسال کی جان سلامت رہی۔ تو اس نے عہد کیا تھا کہ وہ ہماچل کے سمت ایک دیوی کے مندر کی زیارت کو جائیگا اور وہاں جا کر جنگ و خونریزی سے توبہ کریگا۔

ہم دونوں اب روضہ سے واپس ہو رہے تھے اور الوداع کہنے کی گھڑی سر پر کھڑی تھی۔ میں نے دھیمی آواز میں پوچھا۔ کہ "کیا میں بھی ہماچل کی زیارت گاہ کو جاؤں"؟ اس نے جواب میں کہا "ہاں جہاں آرا بیگم میں ہماچل کے دامن میں تمہارا انتظار کروں گا۔ یا تو وہاں ملیں گے یا (اوپر کی طرف اشارہ کرکے) پھر اُس دُنیا میں"!

یہ آخری لفظ تھے جو اُس نے کہے۔ مقدر نہ تھا کہ میں پھر اس کی صورت دیکھتی!

باقی حصہ اس سوانح حیات کا معرکۂ جنگ سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لئے ہمیں یہاں اُس سے سروکار نہیں۔ صرف اس قدر اضافہ کرنا بے محل نہ ہوگا کہ جنگ میں شکست ہونے کی خبر شاہجہاں اور بیگم جہاں آرا کو پہنچ چکی تھی۔ کہ بوندی کے راؤ راجہ چھترسال کے رسالہ کا ایک سوار خاک و خون آلودہ کسی طرح سے جہاں آرا بیگم کے سامنے لایا جاتا ہے اور وہ جہاں آرا بیگم کی نشانی کا وہ گلوبند جو اس نے چھترسال کو دیا تھا واپس سپرد کرکے یہ خبر دیتا ہے کہ چھترسال اپنی بہادری اور وفا کا حق ادا کرکے رن میں نجابت خاں کی گولی سے مارا گیا۔

(پنڈت کشن پرشاد کول)

(نگار) جہاں آرا اور چھترسال کی محبت کا یہ افسانہ جسے ہمارے عزیز دوست پنڈت کشن پرشاد صاحب کول نے انگریزی سے اخذ

کرنل جان لو۔ ۱۸۵۴ء میں گورنر جنرل کی اگزیکیٹو کونسل کا تیسرا ممبر **ملٹری سیکرٹری۔** فوجی مشیر متعینہ گورنمنٹ ہاؤس کلکتہ ۱۸۵۴ء

لارڈ ڈلہوزی۔ ہندوستان کا گورنر جنرل ۱۸۴۸ء تا ۱۸۵۶ء **بخشش علی۔** ۱۸۵۶ء میں جھانسی کا داروغہ جیل

جمعدار لال بہادر۔ ہندوستانی فوج کی بارھویں رجمنٹ کے باغی سپاہیوں کا لیڈر

رسالدار لال محمد۔ ۱۴ بے قاعدہ رسالے کے باغی سواروں کا لیڈر **جنرل سر ہیو روز۔** انگریزی فوج کا سپہ سالار

دیگر افراد۔ محافظ سپاہی۔ پہلوان، نٹ۔ بھان متی۔ خادمائیں۔ اہل شہر۔ اکابر شہر۔ مرہٹہ و پٹھان سپاہی۔ لشکری۔ شکاری۔ شاگرد پیشہ۔ اور گورے سپاہی

۱۸۵۴ء

پہلا ایکٹ۔ پہلا منظر

۱۰۔ دسمبر ۱۸۵۴ء وقت سہ پہر قلعہ جھانسی کے مغربی سمت رانی لکشمی بائی کا خانہ باغ ایرانی وضع کا — ہر طرف امن و سکون ہے۔ دو طرف قلعہ کی بلند دیوار پردہ کا کام دیتی ہے۔ تیسری طرف داہنے ہاتھ کو جہاں زمین کچھ بلند ہے۔ انہی کے درختوں کے آغوش میں راجہ کا محل ہے۔ بائیں طرف قلعہ کی دیوار کے قریب ایک سا زینہ ہے جو مہا دیوجی کے مندر کو جاتا ہے۔ یہ مندر باغ کے بائیں سمت نظروں سے پوشیدہ قلعہ کی دیوار کی آڑ میں ہے۔ زینہ کی سیڑھیوں کا سلسلہ مندر کے ایک گوشہ میں ختم ہوتا ہے۔ اور یہ زینہ صرف رنواس کی گذرگاہ ہے۔ باغ کے وسط میں فوارہ چھوٹ رہا ہے۔ ایک طرف ایک خوبصورت چوبی تخت ہے جس پر ایک قیمتی زرکار شامیانہ تنا ہوا ہے۔ تخت پر نہایت بیش قیمت گدّے اور گاؤ تکئے بچھے ہوئے ہیں۔ تخت کے پاس دو بنچ تپائیاں نظر آتی ہیں۔

رانی لکشمی بائی کا باپ ماما صاحب اور نرسنگھ وزیر اعظم بائیں طرف زینہ سے داخل ہوتے ہیں۔ یہ دونوں اوسط عمر کے ہیں۔ ماما صاحب تناور تنومند سپاہیانہ وضع میں نظر آتا ہے۔ نرسنگھ ضعیف الجثہ ہے اور اس کی کمر کسی قدر جھکی ہوئی ہے۔ چہرہ پر ایک قسم کی متانت بلکہ مکاری برستی ہے۔ دونوں شمالی ہندوستان کے ہندوؤں جیسا سفید لباس پہنے ہیں۔ سر اور پاؤں ننگے ہیں۔ یہ مہا دیوجی کے مندر سے پوجا کر کے

نکلے ہیں - باغ میں خراماں خراماں چلتے ہوئے کہیں کہیں رک جاتے ہیں - آپس میں باتیں ہو رہی ہیں)

ماما صاحب:- میں تو صاف کہتا ہوں - جب تک رانی کی صحبت میں گنگا بائی رہیگی - اس وقت تک جھانسی راج کے متعلق ہماری کوئی تمنا پوری نہیں ہو سکتی - ایشور جانے وہ کونسا منحوس دن تھا جب ہم نے گنگا بائی کو لکشمی کا سہیلی بننے دیا - اور حقیقت مجھ سے ہی حماقت ہوئی - کاش میں جانتا کہ شادی بیاہ کے بعد بھی لڑکیوں کی نگرانی کی ضرورت ہوتی ہے - اگر گنگا بائی کا اثر نہ ہوتا تو مجال تھی کہ لکشمی مجھ سے، اپنے پتا سے اس طرح پھر جاتی - اور مجھ سے ایسا برتاؤ کیا جاتا - اگر مہاراجہ زندہ ہوتے تو میں لکشمی کو ٹھیک بنا دیتا - لیکن کیا کروں مجبور ہوں - ابھی ابھی مندر میں جب ہم پوجا کر رہے تھے - پرماتما جانے ایسا معلوم ہوتا تھا گویا راجہ جی ہمارے پاس کھڑے ہوئے ہیں -

نرسنگھ:- بات یہ ہے کہ آجکل رانی سوگ میں ہیں - اور ان کو دل بہلانے کے لئے ہر وقت سہیلیوں کی ضرورت رہتی ہے ورنہ ایسی تدبیریں کی جا سکتی تھیں کہ گنگا بائی کو اس کے میکے بھیجدیا جاتا -

ماما صاحب:- (اظہار تشکر کیساتھ سر ہلاتے ہوئے) لیکن اب ہم کیا کر سکتے ہیں - لکشمی روز بروز ہاتھوں سے نکلتی جاتی ہے - تم نے تو دیکھا ہوگا کہ کل وہ کتنی برہم ہوئی تھی کہ میں مہاراجہ کی وصیت کے مطابق اس کے نائب فرمانروا تسلیم کئے جانے پر کیوں زور نہیں دیتا - اس نے صاف صاف کہدیا کہ میں نے اور وزیر دلی کیساتھ سازباز کر رکھی ہے تاکہ وہ اپنی جائز پوزیشن حاصل نہ کر سکے -

نرسنگھ:- عورت کے دل کی تھاہ کو پہنچنا اور ریگستان میں پانی ڈھونڈھ نکالنا - دونوں برابر ہیں - چاہئے تو یہ تھا کہ جو لوگ ریاست کے معاملات سمجھتے ہیں انھیں پر تمام انتظامات چھوڑ دیئے جاتیں - مگر رانی صاحبہ یہ چاہتی ہیں کہ ریاست کا تمام نظم و نسق اپنے ہاتھ میں لے لیں - میری سمجھ میں تو آتا نہیں -

ماما صاحب:- (رنجیدگی سے) سمجھ میں کیوں نہیں آتا - یہ جو کچھ ہے سب گنگا بائی کا کیا دھرا ہے - وہ ہر وقت ملکہ وکٹوریہ اور رانی اہلیہ بائی کے گیت گاتی رہتی ہے - جب عورتیں اپنی ہی صنف کے ہیرو اس طرح کھڑے کرتی رہیں گی تو ہم مردوں کا خدا حافظ ہے

{ عین اسی وقت راج کے دو اور وزیر لالہ لاہوری مل اور لالہ ٹیکا چند داہنی طرف سے نکل کر ہندوانہ طریقہ سے ماما صاحب اور نرسنگھ کو سلام کرتے ہیں - یہ متمول طبقہ کے دو ادھیڑ برہمن ہیں - اور سفید لباس میں ملبوس }

لاہوری مل:- اچھا ہوا آپ لوگ یہاں مل گئے - میجر ایلس صاحب یہاں آگئے ہیں - اور قلعہ کے افسروں سے باتیں کر رہے ہیں - ہمارے یہاں کے جیلخانہ میں قیدیوں نے جو لگاتار ہنگامہ مچا رکھا ہے - اس سے سرکار انگریزی سخت متردد ہے - اور اس نے میجر صاحب کو بھیجا ہے تاکہ تفتیش حالات کر کے رپورٹ کریں -

ٹیکا چند:- ہم دونوں نے خیال کیا کہ یہ موقعہ اچھا ہے - میجر صاحب سے معلوم کر لیا جائے کہ ہم نے کمار انند راؤ کی متبنیت تسلیم کئے جانے کے متعلق کلکتہ میں اپیل کی تھی - اسکا کیا حشر ہوا - ہم لوگ یہی کہنے یہاں آئے ہیں -

نرسنگھ:- (خوش ہو کر) شکریہ ! دونوں بھائیوں کا شکریہ - !! آپکا خیال بہت درست ہے -

ماما صاحب:۔ (جوش کیساتھ داہنی طرف کو ہٹکر) ۔اچھا تو چلو۔دیکھیں میجر صاحب کیا کہتے ہیں۔اب تک کچھ نہ کچھ ضرور ہوا ہوگا۔

{ چاروں جلدی جلدی قدم بڑھاکر داہنی طرف نظروں سے غائب ہوجاتے ہیں۔بائیں جانب سے کمار انند راؤ ولیعہد متبنیٰ اور راؤ آپا مرہٹہ داخل ہوتے ہیں۔انندراؤ ایک چست چالاک اور قبول صورت سات سال کا لڑکا ہے۔سفید لباس پہنے ہے۔دونوں ہاتھ میں ہاتھ پکڑے زینہ سے اترتے ہیں۔باغ میں داخل ہوتے ہی انندراؤ کو دتا پھاندتا الگ ہوجاتا ہے۔ }

آنند راؤ:۔ راؤ آپا آؤ۔اور دو دو ہاتھ تلوار کے نکالیں۔آؤ! لپک کر آؤ۔محلسرائے میں چلیں۔اور رانی صاحبہ کو اچانک جا گھیریں۔

راؤ آپا:۔ اچھا کنور صاحب۔چلئے۔تشریف لے چلئے!

{ انند راؤ داہنی طرف دوڑتا جاتا ہے۔اور راؤ آپا پیچھا کرتا ہے۔بائیں طرف کے زینہ سے رانی لکشمی بائی باغ میں داخل ہوتی ہے۔ساتھ میں گنگا بائی بھی موجود ہے۔رانی صاحبہ سفید رنگ کی قیمتی ساڑھی پہنے ہوئے ہیں۔جسم پر بیش قیمت سفید کپڑے کی چولی ہے۔سر اگرچہ ساڑھی سے ڈھکا ہوا ہے۔لیکن سوگ کیوجہ سے منڈوا دیا گیا ہے۔پاؤں برہنہ ہیں جسم پر کوئی زیور نہیں ہے۔یہی حالت گنگا بائی کی ہے۔مگر اس کا سر منڈا ہوا نہیں ہے۔رانی بمقابلہ گنگا بائی کے زیادہ کشیدہ قامت،جوان اور حسین ہے۔رفتار و گفتار حرکات و سکنات سے شاہی شان و شوکت ظاہر ہوتی ہے۔دونوں مندر میں پوجا کرکے باہر آئی ہیں۔رانی لکشمی بائی آگے آگے اور گنگا بائی پیچھے ہے۔ }

رانی:۔ (طنزیہ لہجہ میں) گنگا بائی! جو تمنا میرے دل میں ہے اسے اور کوئی دیوتا تو کیا خود مہا دیو جی بھی شاید پوری نہیں کرسکتے۔اس دنیا میں جہاں مردوں کی حکومت ہے۔کسی عورت کا جنم لینا کس قدر تکلیف دہ بات ہے۔ایک عورت جانتی ہے کہ اسکا کیا حشر ہوتا ہے۔وہ جانتی ہے کہ اس میں کس قدر زبردست طاقتیں ہیں۔بایں ہمہ وہ اس چیز کی جستجو میں نہیں نکل سکتی جو اسے آگے قدم بڑھانے کے لئے اشارہ کر رہی ہے۔

(مسند پر جاکر بیٹھ جاتی ہے اور پاؤں سمیٹ لیتی ہے اور گنگا بائی ایک تپائی پر بیٹھ کر رانی کے پاؤں دابنے لگتی ہے)

گنگا بائی:۔ اگر مہارانی کی خواہش یہی ہے تو انسان تو کیا دیوتا لوگ بھی آپ کی خواہش پوری ہونے سے نہیں روک سکتے۔

رانی:۔ بہن ایک مہاتما کی خواہش آزادی سے ایک بے یار و مددگار عورت کی آرزو سے مختلف ہوتی ہے دنیا سے بچنے کے لئے مرد تو مذہب کے دامن کی پناہ لے لیتے ہیں۔(ٹھنڈی سانس بھر کر) مگر ہم عورتوں کو مذہب کی اس لئے ضرورت ہے کہ اس کے ذریعہ سے ہم کو ایسی الہامی ہدایات حاصل ہوتی رہیں۔جو گرد و پیش کے تمام آلام و مصائب کے بھنور سے ہماری

کشتیٔ حیات کو نکال کر ساحلِ مراد تک پہنچا دیں۔ (جوش میں) جب کبھی مجھے اس بات کا خیال آتا ہے کہ اہلیہ بائی نے کس طرح تیس برس تک مسلسل کوشش کر کے ریاست اندور میں امن و امان بحال رکھا۔ اور دھرم شاستر کا جو علم اسے حاصل تھا اس سے کام لیکر وہ قلمرو سے ہولکر میں کس طرح امن و امان اور خوشحالی قائم رکھ سکی۔ تو میں شرم و غیرت سے زمین میں گڑ جاتی ہوں۔ کیونکہ میں بھی اسی طرح جھانسی راج کو بچانا چاہتی ہوں مگر میرے تمام منصوبوں کو خاک میں ملایا جا رہا ہے۔

گنگا بائی:۔ مہارانی! اگر کسی چیز کے بچانے کی ضرورت ہے تو وہ جھانسی راج ہے۔ میرے سورگباش پتا جی کہا کرتے تھے کہ راجہ رامچندر راؤ کے زمانہ میں جتنے مالگذار تھے سب راج کے قرضخواہ تھے۔ اور حالت یہ ہو گئی تھی کہ تمام ریاست قرضوں کے بوجھ اور لوگوں کی لوٹ مار سے مٹی جا رہی تھی۔ جب سے انگریزوں نے ہماری ریاست کا ایک بڑا علاقہ دبا لیا ہے۔ اس وقت سے ریاست کو ساہوکار لوگ بھی قرض دیتے ڈرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ ریاست میں امن و امان تو ہے نہیں پھر کس بھروسہ پر قرضہ دیا جائے۔

رانی:۔ گنگا بائی! تمہیں خوب معلوم ہے کہ سورگیہ مہاراجہ کی طویل علالت کے زمانہ میں مجھے کس قدر امید تھی کہ جلد یا بدیر میں نائب السلطنت بنا دی جاؤں گی۔ اور اگر وزیروں نے یہ کہہ کہہ کر میری امیدوں کو خاک میں نہ ملایا ہوتا کہ مہاراجہ خود کام کرنے کے قابل ہیں۔ تو میں کبھی کی اپنے شوہر کی جانشین ہو جاتی۔ اور اب کہ مہاراجہ سورگ کو سدھار گئے ہیں اور ہم نے انند راؤ کو متبنیٰ کر لیا ہے۔ تو یہ مکار وزیر کہتے ہیں کہ جب تک انند راؤ کی متبنیت کو گورنر جنرل تسلیم نہ کر لے اس وقت تک ریاست میں کسی جدید انتظام کا اعلان نہیں کیا جا سکتا۔ (بیٹھ جاتی ہے اور زیادہ جوش سے بولتی ہے) ان مردوں کی حماقت اور خود غرضیوں نے مجھے پاگل بنا دیا ہے۔ جی میں آتا ہے کہ ان جھوٹے مکاروں کی زبانیں گدّی سے نکال لوں۔ کیونکہ وہ اب بھی یہی کہے جاتے ہیں کہ انند راؤ کو متبنیٰ اور مجھے نائب السلطنت نہ بنانے سے وہ راج کی خدمت کر رہے ہیں۔ مجھے تو یہ نظر آتا ہے کہ انہوں نے انگریزوں سے سازباز کر لی ہے تاکہ انگریز جھانسی راج کا الحاق کر لیں۔ اور یہ لوگ مزے کریں۔

گنگا بائی:۔ صبر کرو۔ میری بہن صبر کرو۔ مانا کہ انگریز غاصب، ملک گیر اور بے اصول ہیں۔ لیکن وہ بیوقوف نہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ بندھیلکھنڈ کے رجواڑے بھروسہ کے قابل نہیں۔ اور ان کے درمیان جھانسی کی ایک وفادار مرہٹہ ریاست کا وجود خاص قدر و قیمت رکھتا ہے۔

رانی:۔ (اٹھ کر ٹہلنے لگتی ہے) لیکن اس بات کا اطمینان بھی تو ہو جائے۔ کوئی اور گورنر جنرل ہوتا تو فکر کی بات نہ تھی۔ لیکن اس گورنر جنرل (ڈلہوزی) کا منہ ایک بے پایاں خلیج کی طرح کھلا ہوا ہے۔ ستارہ کی قدیم ترین مرہٹہ ریاست کو تو وہ نگل گیا۔ اور اب سننے میں آ رہا ہے کہ وہ ناگپور کے بھونسلا خاندان کی مرہٹہ ریاست کو بھی کھا جانے والا ہے۔ اور بہانہ یہی ہے کہ آخری مہاراجہ نے کوئی وارث تخت و تاج نہیں چھوڑا۔ اور پھر پنجاب کو دیکھو۔ سکیم کی ریاست کو دیکھو۔ برہما کو دیکھو۔ یہ خونخوار انگریزی دیوان سب کو کس طرح ڈکار لئے بغیر ہضم کر گیا ہے۔ مجھے تو جھانسی کی طرف سے بھی ڈر معلوم ہوتا ہے۔

گنگا بائی:۔ اس میں شک نہیں۔ یہ انگریز بڑے چالاک ہوتے ہیں۔ اور ہمیشہ اپنی فیاضیوں کی نمایش کرتے رہتے ہیں

اس لئے میرے خیال میں وہ جھانسی راج کو آزاد وخود مختار رکھنا زیادہ پسند کرینگے۔ تاکہ ہمارے اوپر یہ احسان رہے کہ "دیکھو ہم کمزور رجواڑوں کے کتنے دوست ہیں۔ خصوصاً ان کے جو اپنی ریاستوں کا انتظام ایسا اچھا رکھتے ہیں جیسا سورگباشی مہاراجہ جھانسی نے اپنے عہد کے آخری زمانہ میں رکھا تھا۔ اور اسی بناء پر وہ آنند راؤ کی تبنیت کو تسلیم کریں گے۔ اس معاملہ میں آپ زیادہ تشویش نہ کریں۔ نتیجہ اچھا ہی نکلے گا۔ اور دشمنوں کے کان بہرے۔ اگر خلاف ہوا تو ہر چہ باداباد گنگا بائی آپ کے قدموں سے کبھی علیحدہ نہیں ہو سکتی۔ (جھک کر پا لاگن کرتی ہے)

رانی:۔ (گنگا بائی کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے) ۔بہن ہم دونوں ایک ہی شوہر سے لطف صحبت اٹھا چکے ہیں۔ اور خوب جان گئے ہیں۔ جیسا کہ جلد یا بدیر تمام عورتوں کو معلوم ہو جاتا ہے کہ عورتیں مردوں کے نزدیک صرف کھلونا ہوتی ہیں اس لئے آئندہ سر پہ بُری پڑے یا بھلی۔ ہم دونوں کو ایک دوسرے کا ساتھ دینا چاہئے۔ اور جس طرح دیوی شریب اہلیا بائی نے اپنی تمام زندگی ریاست اندور کی خدمت اور سلامتی کے لئے وقف کر دی تھی۔ اسی طرح ہم کو بھی اپنی تمام قوتیں اور اپنی تمام دعائیں اپنی اس (چاروں طرف ہاتھ سے اشارہ کر کے) چھوٹی سی محبوب ریاست جھانسی کی سلامتی اور خوشحالی کے لئے صرف کر دینا چاہئے۔ ان زمینوں۔ ان عمارتوں۔ ان درختوں۔ اور ان پانیوں پر ہاتھ پاؤں ملے بغیر انگریزوں کو کیوں قبضہ کرنے دیا جائے؟ کیا جس قدر ان چیزوں کی محبت میرے اور تمہارے دلوں میں ہے۔ اسی قدر انگریزوں کے دلوں میں بھی ہوگی؟ کیا ان کے دلوں میں بھی مرہٹہ سورماؤں کی یاد جنہوں نے یہ دلفریب اور زرخیز علاقہ مغلوں اور راجپوتوں سے چھینا تھا۔ اسی طرح قائم رہ سکتی ہے جیسے ہمارے دلوں میں؟ کیا رعایا کی ضرورتوں، ان کی امیدوں اور ان کے خطروں کو بھی وہ اسی طرح محسوس کرینگے جیسے کہ ہم۔ جنہوں نے سو برس سے زیادہ عرصہ سے بندیلکھنڈ کو اپنا وطن بنا رکھا ہے؟ میرے پتا اور وزیروں سے زیادہ ان سوالوں کا جواب اور کوئی نہیں جان سکتا۔ با ایں ہمہ وہ باتیں بنا بنا کر معاملہ کو کھٹائی میں ڈال رہے ہیں۔ اور راج کو بچانے کے لئے کچھ نہیں کرتے۔ (سخت جوش میں) گنگا بائی! میرا دل بار بار کہہ رہا ہے کہ اگر میں خود اٹھ کر کوئی کام نہ کروں گی تو جھانسی راج ہاتھوں سے نکل جائیگا۔

> اس وقت "ہُوا ہُوا" کی آواز سنائی دیتی ہے اور فوراً داہنی طرف سے آنند راؤ ڈھال تلوار سے مسلح اور اس کے پیچھے راؤ آپا لکڑی کی تلوار لئے ہوئے آتے ہیں۔ دونوں رانی کے سامنے شمشیر زنی کرتے ہیں۔ راؤ آپا دبتا جاتا ہے اور بالآخر ایک جگہ گویا ٹھوکر کھا کر گر پڑتا ہے۔ آنند راؤ فتحمندانہ حیثیت سے راؤ آپا کے سینہ پہ پاؤں رکھ کر دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر "آنند کمار کی جے" کا نعرہ لگاتا ہے۔ رانی اور گنگا بائی بھی خوش ہو کر تالیاں بجاتی اور "آنند کمار کی جے" کے نعرے لگاتی ہیں۔

رانی:۔ (فرط مسرت سے) واہ بیٹا واہ! شاباش!! میں یہ دیکھ کر بہت خوش ہوئی کہ تم اس قدر محنت سے تلوار چلانا سیکھ رہے ہو۔ ہر مرہٹہ سردار کا فرض ہے کہ وہ دشمن کا مقابلہ کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہے۔ اچھا اب میرے پاس آؤ۔ میں تمہیں چاچا جی کی سچی پر پنچیا سکھا دوں۔ (آنند راؤ رانی کے پاس آتا ہے) بائیں ہاتھ میں تلوار پکڑ کر سیدھا سامنے کی طرف پھیلاؤ۔ اور اپنا داہنا ہاتھ

سینہ پر رکھو۔ دیکھو اس طرح (ہاتھ رکھ کر دکھاتی ہے) اور اب یہ الفاظ یہ دہراؤ :-

"تلوار دھنی پتا کھانڈو با اور تمہاری جی پر میرا ایمان ہے۔ یہ دونوں شیوجی کے روپ ہیں۔ جو شر کا مٹانے والا۔ شفا بخشنے والا اور زندگی کو پاک کرنیوالا ہے۔ میں ہمیشہ شیواجی اور شمبھاجی اور بڑے بڑے پیشواؤں کے نقش قدم پر چلونگا۔ جو غریبوں کی دستگیری کرتے تھے۔ بھوکوں کو کھانا کھلاتے تھے اور مغروروں کا سر توڑتے تھے۔ میں ایک سچا مرہٹہ بننے کا حلف اٹھاتا ہوں۔ ظالموں سے لڑونگا۔ ستمگاروں کو سزا دونگا۔ اور دھرم کی رکھشا کروں گا۔ میں عاجزوں اور بیکسوں کی فریاد سنونگا۔ اور میرا دروازہ ان لوگوں کے لئے کبھی بند نہ ہوگا جو متقی اور پرہیزگار ہیں اور دھرم کے مقدس طریقہ پر آزادی کے طلبگار ہیں"

{انند راؤ رانی کے الفاظ دہراتا ہے۔ عین اس وقت داہنی طرف سے ماما صاحب۔ نرسنگھ۔ لالہ لاہوری مل اور لالہ ٹمی چند داخل ہوتے ہیں۔ انند راؤ کی پرتگیا سنتے ہیں اور پھر رانی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔}

ماما صاحب:- بیٹی! میجر ایلس جو سرکار انگریزی کی طرف سے بندھیلکھنڈ میں پولیٹیکل ایجنٹ ہیں۔ گھنٹہ بھر ہوا کہ یہاں آئے ہیں۔ وہ ہمارے فوجی افسروں کے ساتھ فوجی استحکامات اور قلعبندیوں کا معائنہ کر رہے ہیں۔ اور ہم ابھی اُن کے پاس سے آرہے ہیں۔ جیل کے قیدیوں نے پھر گڑبڑ مچائی ہے۔ ایسا نہ ہو بغاوت کر بیٹھیں۔ اس لئے احتیاطی تدابیر کی سخت ضرورت ہے۔

رانی:- میں بار بار دریافت کر چکی ہوں کہ آخر جیل میں آجکل اتنے آدمی کیوں ٹھونس دیئے گئے ہیں۔ مگر کوئی شخص قابلِ اطمینان جواب نہیں دیتا۔

لاہوری مل:- مہارانی! پرماتما کی کرپا سے آپ کے راج میں ہر طرف خوشحالی اور فارغ البالی نظر آتی ہے۔ اس لئے چاروں طرف کے بدمعاش یہاں جمع ہوگئے ہیں۔ جہاں کھانے کو ملتا ہے وہیں بھوکے کتے جمع ہو جاتے ہیں۔

گنگا بائی:- (دونوں ہاتھ کمر پر رکھکر غضبناک انداز سے) تو لالہ جی! یہ قصور کس کا ہے کہ کتے بھوکے ہیں؟ کیا ہمارا قصور نہیں۔ نہ ہم بدنظمی کے مرتکب ہوتے نہ لوگ فاقوں سے مجبور ہوکر چوری اور ڈکیتی پر آمادہ ہوتے۔

نرسنگھ:- گنگا بائی! انصاف کرو۔ ہم لوگ تو انتظام کرنے والے کے آلۂ کار ہیں۔ راجہ حکم دیتا ہے اور ہم اسکو بجالاتے ہیں۔ اگر حوصلہ ہے تو سزا دا کو الزام دو۔ ہمارا اس میں کیا قصور ہے۔

رانی:- (اول آہستہ آہستہ اور پھر لہجہ تند اور جوشیلا ہو جاتا ہے) گنگا بائی جو کچھ کہتی ہے وہ بالکل سچ کہتی ہے۔ جھانسی راج کا انتظام انگریزوں کے ہاتھ میں جانے سے پہلے ریاست کی آمدنی روز بروز گھٹتی جاتی تھی۔ اور ریاست کا بال بال قرض میں بندھ گیا تھا۔ لیکن اس وقت ہمارے کسان ہم سے محبت کرتے تھے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اگر اُن کی فصلیں خراب ہوگئیں یا ان کے گھر جلا دیئے گئے تو راجہ ان کی مالگذاری معاف کر دیگا۔ اور دوسرے طریقوں سے بھی ان کی مدد کریگا۔ مگر اب انگریزوں نے زمینداروں کو مجبور کیا کہ راجہ اور پرجا کے درمیان ایک طبقہ کھڑا کر دیا ہے جو کسانوں سے لگان وصول کرکے خزانہ میں داخل کر دیتے ہیں۔ اس طرح

راجہ اور پرجا کا براہِ راست تعلق جاتا رہا ہے۔ اور اس سے بھی بدتر یہ بات ہے کہ لگان ایک مدت دراز کے لئے مقرر کر دیا گیا ہے اور اس میں بھی تشخیص لگان بسا اوقات غیر منصفانہ ہوئی ہے۔ اب خواہ قحط پڑے یا خشک سالی ہو۔ مویشی مر جائیں یا مال چوری ہو جائے۔ مگر بیچارے کاشتکاروں کو قرض لینا پڑتا ہے۔ نہ صرف اس لئے کہ اپنے نقصانات کی تلافی کریں۔ بلکہ اس لئے بھی کہ جابرانہ لگان ادا کرکے زمیندار کی جیب اور ریاست کا خزانہ بھریں۔ پھر دیوان جی! آپ ہی بتائیں کہ جیلخانہ بھرپور نہ ہو تو کیا ہو؟ آجتک وہ بات کبھی سننے میں نہ آئی تھی جو آپ اب کھلے خزانہ کہہ رہے ہیں۔ یعنی جھانسی تو ڈاکوؤں اور ساہوکاروں کی جنت ہے۔ (دفعتاً مندر کی طرف متوجہ ہو جاتی ہے اور ہاتھ اٹھا کر کہتی ہے) اسے ہماری قوم کے دیوتاؤ! اور دیویو! گواہ رہنا کہ نائب السلطنت بنتے ہی میرا سب سے پہلا کام ان آلام و مصائب کا علاج کرنا ہوگا۔ جن میں آجکل ہماری غریب رعایا گرفتار ہے۔

(چند لمحہ سکوت طاری ہو جاتا ہے۔ جسے رانی کے باپ کی کھنکار اور آواز توڑتی ہے)

ماما صاحب:۔ بیٹی ہم تم سے یہ کہنے آئے تھے کہ میجر ایلیس کے نزدیک گورنر جنرل کی طرف سے آنند کمار کی متبنیت تسلیم کر لیا جانا یقینی نہیں ہے۔ میجر صاحب نے ہم سے بیان کیا ہے کہ ان کے افسر بالادست میجر مالکم نے ان کو بذریعۂ خط تنبیہ کر دی ہے۔ کہ متبنیت کے معاملہ میں سرکار انگریزی کی طرف سے ہرگز کوئی وعدہ نہ کرنا۔ اس معاملہ کا فیصلہ برہما سے آکر خود لارڈ ڈلہوزی کریں گے۔

نرسنگھ:۔ اور حضور اس قدر عرض تو میں بھی با ادب کر سکتا ہوں کہ میجر ایلیس جھانسی راج کے ہمیشہ دوست اور خیر خواہ رہے ہیں۔ اور اب سے دس برس گذرے کہ انہی کی کوششوں کی بدولت جھانسی راج کا نظم و نسق ہم لوگوں کے ہاتھ میں آیا تھا۔ پھر جب ایسا شخص ریاست کے متعلق کھٹکا رکھتا ہے تو معاملہ واقعی تشویش انگیز ہے۔ میجر صاحب فرماتے ہیں کہ کرنل لو اور گورنر جنرل کی کونسل کے دیگر ممبروں کا گورنر جنرل کی عدم موجودگی میں آنند کمار کا حق تسلیم کرنے سے انکار کر دینا بہ معنی رکھتا ہے کہ جو شخص ستارہ۔ پنجاب۔ سکیم۔ برہما اور بہت سے دیگر علاقوں کو ہضم کر چکا ہے وہ غالباً جھانسی کو بھی نہیں چھوڑے گا۔ الغرض مجھے تو جھانسی کا مستقبل تاریک نظر آتا ہے۔

رانی:۔ اور آپ لوگوں نے میجر صاحب سے کیا کہا؟

ماما صاحب:۔ بیٹی ہم لوگ کیا کہہ سکتے تھے۔ خالی تولی دھمکیاں بیکار ہیں۔ ہم سے بس یہی ہو سکتا ہے کہ عرضیاں گذرانتے جائیں۔ اور بھلائی کی امیدیں رکھیں۔

نرسنگھ:۔ مہارانی! ہم نے میجر صاحب سے التجا کی ہے کہ وہ جھانسی راج کو بچانے کے لئے حتی المقدور کوشش کریں۔ اور باتوں باتوں میں کنایتہً یہ بھی سمجھا دیا ہے کہ جو لوگ اس آڑے وقت میں ریاست کے کام آئیں گے شاہی خاندان ان کی خدمات کا ضرور خیال رکھیگا۔ میجر ایلیس نے بھی ازراہ عنایت فرمایا کہ دو تین روز میں وہ اس معاملہ کے متعلق میجر مالکم سے پھر ملاقات کریں گے۔ لیکن وہ کسی قسم کا وعدہ نہیں کر سکتے۔ مگر ان کا خیال ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس معاملہ میں لارڈ ڈلہوزی پر مقامی افسران

کے کہنے سننے کا کوئی اثر نہ ہوگا۔ (اطمینان سے ہاتھ ملکر) بہرحال اگر بُرا وقت آہی گیا تو انہوں نے وعدہ کرلیا ہے کہ وہ اس بارہ میں ضرور کوشش کریں گے کہ آپ کو اور آنند کمار اور دیگر متعلقین اور متوسلین کو گذارہ کے لئے ایک معقول بخشش دیجائے۔

رانی :۔ کیا میرے پنّاجی اور میرے بہادر افسر آستاہی کرسکتے ہیں؟ کیا خوشامدیں کرنے اور ناک رگڑنے کے بعد وہ اسی نتیجہ پر قناعت کرنے کے لئے آمادہ ہیں۔ (آواز کسی قدر بلند کرکے) سنئے! اور کان لگاکر سنئے! کہ آج سے میں اور صرف میں انگریزوں کیساتھ جھانسی راج کی ترجمانی کروں گی۔ کیونکہ میں ہی وہ ہوں جسے سورگیہ مہاراجہ نے نائب السلطنت اور ولیعہد آنند راؤ کا سرپرست نامزد کیا تھا۔ آپ لوگوں کی غلامانہ پالیسی سے میں بھرپائی۔ نہ اس سے کبھی پہلے کام چلا تھا۔ نہ اب چلے گا۔ انگریز تم لوگوں کو نفرت وحقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اور تم خود اس بات کو خوب جانتے ہو۔ اب تم مجھ عورت ذات کو کام کرنیکا موقعہ دو۔ کہتے ہیں کہ انگلستان میں ایک بہت بڑی ملکہ راج کرتی ہے۔ اور تمام مرد اسکی فرمانبرداری کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ اس خاص وجہ سے بھی وہ مجھ سے کوئی تعارض نہ کریں۔ میں آپ لوگوں کو جتائے دیتی ہوں کہ آیندہ سے مجھے ایک عاجز اور بے دست وپا ہندو بیوہ نہ سمجھا جائے۔ بلکہ نام اور کام دونوں لحاظ سے جھانسی کی رانی سمجھا جائے۔ دیوان صاحب! فوراً منادی کرادیجئے کہ لوگ شام کیوقت قصر شاہی کے صحن میں دیوانخانہ کے سامنے جمع ہوں۔ تاکہ آنند کمار کے بارہ میں اعلان کردیا جائے۔ اگر انگریزوں نے اس کی متبنیت کو تسلیم نہ کیا تو ان سے نہ صرف جھانسی کی رعایا، بلکہ تمام ہندوستان نفرت کرنے لگیگا۔ لو پنّاجی! آپ میجر ایلیس کو ساتھ لیکر قصر شاہی میں تشریف لائیں۔ ہم اُن سے اپنے ارادوں کا اظہار کرینگے۔ اگر جھانسی کو ہمارے ہاتھ سے نکلنا ہی ہے تو پھر کیوں نہ بہادر مرہٹوں کی طرح جان پر کھیل کر دیا جائے؟ لالہ جی! تمام پہلوانوں، شمشیر بازوں اور بازیگروں کو بھی محل میں جمع ہونیکا حکم دیدیجئے۔ دُنیا کو دکھا دینا چاہیئے کہ جھانسی والے اب بھی لڑنا مرنا خوب جانتے ہیں۔ راؤ آبا! درختوں کے پیچھے ہماری پالکی کھڑی ہے اسے طلب کرو۔ اور تم سب لوگ یہ بات کان دھر کر سُن لو کہ جو حکم میں دُونگی۔ اُسے ماننا پڑے گا۔ کسی چھوٹے بڑے کی تفریق نہ ہوگی۔ اگر کسی شخص نے میرے حکم کی تعمیل میں قصور کیا یا مجھے راج کا مالک نہ سمجھا تو وہ سزا پائے گا۔؟

[ایک بڑی شاندار اور آراستہ پالکی آتی ہے۔ سوار ہونے سے قبل رانی ہاتھ اٹھاکر "کمار آنند راؤ کی جے" کا نعرہ لگاتی ہے۔ جس میں سب حاضرین شریک ہوجاتے ہیں۔ گنگا بائی پالکی کے ساتھ ساتھ بائیں طرف ہولیتی ہے۔ ماما صاحب اور وزراء سلام کرتے ہیں۔ رانی کے بعد ماما صاحب آنند راؤ کو پکڑکے چاروں طرف گھماتا ہے اور اسے اپنے کاندھے پر بٹھا لیتا ہے۔ لڑکے کا مُنہ وزیروں کی طرف ہوتا ہے۔ اس کے بعد ماما صاحب "جھانسی راج کی جے" کا نعرہ لگاتا ہے۔ سب وزراء بھی دو تین مرتبہ یہی نعرہ لگاتے ہیں۔]

(باقی)

مسئلۂ خلافت و امامت

"نگار" مارچ ۳۵ء کی اشاعت میں "خلافت و امامت" کے عنوان سے ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس کو کسی ہندو اہلِ قلم جناب "ہرنام" کی کاوشِ دماغی کا نتیجہ ظاہر کیا گیا ہے۔ اگرچہ اس طرح سے دیکھنے والے پر بظاہر یہ اثر پڑتا ہے کہ ایک بے تعلق غیر مسلم کے خیالات ہونے کی بنا پر بحث میں غیر جانبداری کیساتھ خالص تحقیقی نقطۂ نگاہ کو پیشِ نظر رکھا گیا ہوگا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ محترم موصوف باوجود ہندو ہونے کے "شیعیت" کیساتھ جذباتی ہمدردی رکھتے ہیں۔ اور اس لحاظ سے گو بظاہر ان کا اسم گرامی "ہرنام" ہے لیکن شاید وہ اپنے اس مضمون میں اس حقیقت کو چھپانے میں کامیاب ہو سکے کہ دل کی گہرائیوں سے وہ حضرت علیؓ کی امامت کو ایک مذہبی کے تمام جذباتی رنگ کیساتھ تسلیم کر چکے ہیں۔ تحریر کا رنگ قدم قدم پر ان کی اس شکست پر غمازی کرتا ہے۔ بالخصوص جہاں ان کا "دل تھراتا ہے۔ قلم لرزتا ہے۔ جی چاہتا ہے مورخوں کے منہ پر ہاتھ رکھدیں، کس طرح دیکھیں اور کیونکر لکھیں کہ کس کس نے فرار کیا" (صفحہ ۴۴)

بہرحال جو کچھ بھی ہو ان کی تحقیقی کاوش کی داد نہ دینا بڑی بے انصافی ہوگی۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ شاید اس مبحث پر قلم اٹھاتے وقت موصوف نے واقعات پر "فلسفۂ تاریخ" کی روشنی میں نفسیاتی اعتبار سے کوئی نظر نہیں ڈالی۔ نیز "فلسفۂ نبوت" اور عام اخلاقِ انسانی کے فلسفہ کے پہلو سے بھی اس سوال پر تفصیلی غور نہیں فرمایا۔ ممکن ہے کہ میری یہ حقیر کوشش کسی حد تک حقیقت کے چہرہ کو بے نقاب کرنے میں مدد دے۔

افسوس ہے کہ میں یہاں تفصیل کیساتھ مقالہ نگار کے استدلال کے ہر ہر جزو پر نظر نہیں ڈال سکتا۔ میں جو کچھ کروں گا وہ ایک ایسے مورخ کے اجمالی تبصرہ کے مترادف ہوگا جو واقعات کو منطقی علل و استنتاج کے ساتھ ساتھ دنیا کے عملی فلسفہ کی روشنی میں دیکھتا ہے۔ بہرحال میں مسلمان ہوں اور پھر اہلِ سنت۔ اس لئے میں حتی الوسع کوشش ضرور کروں گا کہ اپنی تحریر میں جذباتی رنگ نہ آنے دوں۔ لیکن پھر بھی کسی بے راہ روی کا پہلے سے معذرت خواہ ہوں۔

بزمی

فلسفہ کے تمام عمیق مسائل طے ہو سکتے ہیں۔ ریاضی کے دقیق سے دقیق نظریئے حل کئے جا سکتے ہیں۔ نظام بطلیموسی

کی جگہ نظام فیثا غورث لے سکتا ہے۔ نیوٹن کے نظریہ کشش کو آئنشٹن بدل کر رکھ سکتا ہے لیکن اگر بلند نظری اور بے لوث تحقیقی نگاہ سے ایک لمحہ کے لئے بھی اعراض کر لیا جائے تو نہ یہ مسائل طے ہو سکتے ہیں اور نہ مسلمانوں میں ساڑھے تیرہ سو برس گذر جانے کے باوجود خلافت و امامت کا مسئلہ سلجھ سکتا ہے۔

اس سے کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ نبی کریم کی سب سے بڑی حیثیت ایک اخلاقی مؤدب کی حیثیت ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں لئے جا سکتے کہ آپ کی اس حیثیت سے "سیاست ملکی" خارج ہے۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ دنیا میں عام طور پر اخلاقی درس دینے والے مصلحین کی زندگی میں سیاست بہت کم داخل ہوتی ہے۔ لیکن رسول عربی کا مسئلہ ان سب سے جدا ہے آپ کی تعلیم کا کوئی جزو اسوقت تک حقیقی معنی میں مکمل نہیں ہو سکتا جب تک حکومت و سیاست کی اعانت اس کیساتھ شامل نہ ہو۔

پھر یہ کوئی ایسی حقیقت نہیں ہے جس کو اہل سنت مسلمان تعصب کی بنا پر کہتے ہوں۔ بلکہ یورپ کے بے تعلق مستشرقین بھی متفقہ طور پر اس رائے کی تائید کرتے ہیں۔ اگر گولڈ زیہر۔ فان کریمر۔ نولڈکی۔ دی ساسی۔ کائتری۔ نکلسن اور براؤن جیسے مسلّم فاضل مصنفین کی تصانیف کا مطالعہ کیا جائے تو قدم قدم پر اس حقیقت کا علم ہوتا ہے کہ ——— محمد کی تعلیمات میں "چرچ" اور "اسٹیٹ" دو جدا جدا چیزیں نہیں ہیں۔

غور کیجئے کہ اگر تھوڑی دیر کے لئے یہ مان لیا جائے کہ نبی کریم سیاست سے بالکل علیحدہ رہ کر اخلاقی تعلیم دینا چاہتے تھے تو پھر قرآن و حدیث کی ان سینکڑوں ہدایات کی کیا تاویل کی جائے گی جن میں خاص سیاسی مسائل بیان کئے گئے ہیں۔ مثلاً جزیہ - ذمی - حربی - جہاد - حد زنا و سرقہ وغیرہ وغیرہ۔

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْناً - (سورہ المائدہ - آیۃ ۳)

کی آیت فتح مکہ کے بعد نازل ہوئی۔ اگر نبی کریم کے معاشرتی اور اخلاقی اصلاح کے پروگرام میں حکومت و سیاست داخل نہ ہوتی تو اس آیت میں "الیوم" کا مفہوم ہی کچھ باقی نہ رہتا۔ اس لئے کہ اگر فتح مکہ کے بعد سے نبی کریم کی سیاسی حیثیت کا مسلّم ہو جانا آپکے "درس" کی تکمیل میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا تو پھر "الیوم" کا لفظ بھی کچھ زیادہ بامعنی نہیں رہتا۔

پھر اخلاقی اور معاشرتی اصلاح (سوشل ریفارم) کو سیاست کے ساتھ ساتھ رکھنے کا نظریہ کوئی ایسا نظریہ نہیں ہے جس کو عقل باور نہ کر سکے۔ دنیا کا بڑے سے بڑا مصلح اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ معاشرتی اصلاح اسوقت تک ناممکن ہے۔ جب تک ملکی سیاست کے ارباب حل و عقد اس میں دستگیر و معاون نہ ہوں۔ گاندھی ہندوستان کا بلند ترین سیاسی رہبر سمجھا جاتا ہے۔ لیکن وہ ایک دفعہ نہیں ہزار دفعہ اس حقیقت کو تقریروں اور تحریروں میں آشکارا کر چکا ہے کہ "میرا حقیقی مشن معاشرتی اصلاح ہے۔ لیکن وہ اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ ہندوستان کی حکومت ہندوستانیوں کے ہاتھ میں نہ ہو"

حقیقتاً وہ لوگ اسلام کا صحیح مفہوم نہیں سمجھتے جو یہ کہتے ہیں کہ اسکو سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسلام صرف

ریاضت کرنے یا گوشہ میں بیٹھ کر عبادت کرنیکا ایک نظام نہیں ہے۔ بلکہ اس کے برخلاف وہ ایک ایسا عملی پروگرام ہے۔ جو انسان کو زندگی کے ہر شعبہ میں صحیح مسلک پر کاربند رکھنا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس مقصد کا صحیح حصول اسوقت تک نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ ملکی نظام پر صحیح معنی میں پورا پورا اختیار نہ ہو۔

پھر اگر یہ باور بھی کر لیا جائے کہ نبی کریم کا مقصد سیاست سے بالکل علیحدہ تھا اور یہ بعد کی بدعت ہے تو پھر وہ جماعت جو حضرت علی کو نبی کریم کا صحیح جانشین قرار دیتی ہے۔ اسکا کیا جواب دیگی کہ خود حضرت علی نے بھی مسند خلافت پر متمکن ہونے کے بعد اس کے خلاف آواز بلند نہیں کی۔ بلکہ اس کے علی الرغم اپنی سیاسی اہمیت کے قیام و بقاء کے لئے جنگ جمل میں صف آرائی کی۔ طلحہ و زبیر کو قتل کرایا۔ معاویہ کے مقابلہ کے لئے میدان صفین میں پڑاؤ ڈالا۔ اور پھر نہروان میں تقریباً تین ہزار[1] کلمہ گو اہل عرب کو تہ تیغ کرایا۔ میں پوچھتا ہوں کہ ان تمام مقتولین کے خلاف اگر "بغاوت" کا الزام نہ تھا جو خالص سیاسی الزام ہے تو پھر حضرت علی کی پوزیشن جس درجہ نازک ہوجاتی ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ اگر ان کی حیثیت ایک "بڑے پیر" سے زیادہ نہ تھی تو آجکل کے مجتہد کی طرح انہوں نے ان مواقع پر صرف خاموشی کا اظہار کیوں نہ کیا؟ یا زیادہ سے زیادہ اُن سے اپنی برأت کا اعلان کر کے خاموش کیوں نہ ہو گئے؟

بہرحال خلافت و امامت کے مسئلہ میں اگر بے تعصبی کیساتھ ذرا سے غور سے بھی کام لیا جائے تو یہ حقیقت بے نقاب ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی کہ نبی کریم کا صحیح جانشین وہی ہو سکتا ہے جو ایک طرف تو اخلاقی فضیلت میں دُنیا کا مکمل ترین انسان ہو اور دوسری طرف سیاسی حل وعقد میں دُنیا کا مہذب ترین فرمانروا۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ان دونوں حیثیتوں کے اعتبار سے صحابہ کرام کے گروہ میں سے نبی کریم کا صحیح جانشین کون ہو سکتا تھا اگرچہ دُنیا کا عام اصول تو یہ ہے کہ جو شخص کسی عہدہ کو بغیر کسی قباحت کے انجام دے۔ اسے اس عہدہ کا اہل سمجھا جاتا ہے۔ اور اس لئے حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کی اہلیت میں تو کوئی شک ہونا ہی نہ چاہئے۔ جبکہ دُنیا کا ہر بلند نظر مورخ ان حضرات کی اخلاقی پاکیزگی سیاسی بلند نظری۔ اور عام معاشرتی رفعت و برتری کا بھی قائل ہے۔

لیکن یہاں پہنچکر ہم کو جس پُرخار وادی میں داخل ہونا پڑتا ہے وہ یہ ہے "کیا نبی کریم حضرت علی کو اپنے بعد اپنا خلیفہ بنانا چاہتے تھے"؟

حضرت علی ایک متقی، زاہد اور فداکار صحابی ہونے کے علاوہ آپ کے چچیرے بھائی تھے۔ ابتدا سے آپ کے رفیق و معاون رہے۔ بعد میں داماد بھی ہو چکے تھے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ نبی کریم نے مختلف اوقات میں مختلف حالات سے متاثر ہو کر آپ کے

---

[1] ملاحظہ ہو۔ الکامل المبرد مطبوعہ مصر جلد سوم صفحہ ۱۰۵۔ فان کریمر وغیرہ مستشرقین یورپ نے اس کتاب کو حضرت علی کی خلافت کے واقعات میں نہایت ہی مستند مرتبہ دیا ہے۔

اوصاف بیان فرمائے ہیں لیکن اگر ان اوصافی الفاظ کی منطقی اور لغوی تحلیل کرکے یہ نتیجہ نکالا جائے کہ نبی کریم آپ کو اپنا جانشین بنانیکے خواہشمند تھے۔ تو منصب نبوت کو سمجھنے میں اس سے بڑھکر اور کوئی بنیادی غلطی نہیں ہوسکتی۔ غور تو کیجئے کہ جس شخص کو محمد عربی کے الہامی نبی ہونے پر ایمان ہو وہ یہ سوال کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اگر فی الواقع آپ الہامی طور پر حضرت علی کو اپنا خلیفہ بنانے پر مامور ہوچکے تھے تو پھر آپ نے علی رؤس الاشہاد اس کا اعلان کیوں نہ فرمادیا؟ جو بے خوف اور نڈر پیغمبر اپنے عزم و ثبات کے مقابلہ میں ساری دنیا کو چیلنج دے سکتا ہے۔ اُن کے بت خانوں کو چکنا چور کرسکتا ہے۔ شراب کے قرابوں کو توڑ واکر پھنکوا سکتا ہے۔ اہل عرب کے نسبی فخر کو پاؤں کے نیچے کچل سکتا ہے۔ کیا اس کی اس اخلاقی کمزوری کا کسی حیثیت سے بھی اعتراف کیا جاسکتا ہے۔ کہ وہ محض چند لوگوں کے ڈر سے اپنے جانشین کا اعلان کرتے ہوئے ڈرتا ہے؟ ہر وہ شخص جس کو الہام اور وحی پر ایک راسخ العقیدہ مسلمان کی طرح عقیدہ ہو وہ یہ باور نہیں کرسکتا کہ دنیا دارانہ مصلحتوں کے ماتحت ایک عظیم المرتبت نبی اپنی زندگی کے آخری لمحہ تک "خلافت" جیسی عظیم حقیقت کے اظہار سے جان چراتا رہے؟

علاوہ ازیں اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ نبی کریم قدم قدم پر اشارۃً اور بالواسطہ طور پر حضرت علی کو اپنا قائم مقام بنانیکی رہبری کرتے رہے تو اس سے رسول کی پوزیشن جس درجہ نازک ہوجاتی ہے وہ زیادہ توضیح کی محتاج نہیں ہے۔

اگر ابوبکر اور عمر بلا کسی دنیوی نفع کے اور بلا کسی رشتۂ قرابت و عزیزداری کے صرف اس لئے رسول پر جان دیتے ہیں کہ وہ خدا کی طرف سے بھیجا ہوا ایک سچا راہنما ہے۔ اور اپنی اس صداقت کے ثبوت میں اپنی حیات کے آخری سکون تک عشق رسول کا دم بھرتے رہتے ہیں۔ اپنی نوجوان لخت جگر صاحبزادیوں کو اس کے حبالۂ ازدواج میں دیدیتے ہیں۔ اس کے ایک ایک اشارہ پر کٹھ پتلیوں کی طرح ناچتے ہیں۔ اس کے حکم کے سامنے اپنی ساری دھن دولت لٹا دیتے ہیں ——————— غرضکہ وہ سب کچھ کرتے ہیں جو ایک جانفروش کو کرنا چاہئے۔ لیکن اس کے باوجود بھی اگر وہ رسول کی بارگاہ میں صرف اس لئے نظر انداز کئے جاتے ہیں کہ اُن کے مقابلہ میں رسول کا چچیرا بھائی اور اسکا داماد ہے ——————— تو پھر اسکا نام "متعصبانہ اعزہ پرستی" (Favouritism) نہیں تو اور کیا ہے؟ اور اگر اس کو بدترین قسم کی "بیرحمانہ جانبداری" اور "غیر منصفانہ پاسداری" نہیں کہہ سکتے تو اور کیا کہیں گے؟

لیکن تاریخ اسلامی کا سرسری طالب علم بھی جانتا ہے کہ نبی کریم کی شخصیت گرامی اس قسم کی تنگ نظریوں سے بہت بلند ہے۔

اب ہم بحث کے اُس رُخ کی طرف آتے ہیں۔ جہاں یہ ثابت کیا جاتا ہے کہ "حضرت علی تمام صحابہ سے زیادہ خلافت کے مستحق تھے" اس حقیقت کو بے لوث تحقیقی نگاہ سے جانچنے کے لئے ایک بہترین طریقہ تو یہ ہوسکتا ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ مستشرقین یورپ اس کے متعلق کیا کہتے ہیں۔ ہم یہاں صرف نکلسن کے الفاظ کو نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ جو تقریباً تمام ذی رتبہ مستشرقین کی رائے کی وضاحت سے ترجمانی کرسکتے ہیں:-

"حضرت علی میں بیکار انسان ہونے کے علاوہ اور تمام صفات موجود تھیں"[1]

---

[1] لٹریری ہسٹری آف عرب مصنفہ نکلسن صفحہ ۱۹۱۔

اس کے بعد ہمارے سامنے جو چیز ابوبکر و عمر کے مقابلہ میں حضرت علی کے شرف و فضیلت کا صحیح معیار پیش کر سکتی ہے وہ ان دونوں کے عہد خلافت کا مقابلہ ہے۔

خلفاء کی زندگی کا یہ پہلو اگرچہ ہماری بحث کا فیصلہ کن جواب ہونا چاہیئے تھا لیکن ہمیں افسوس ہے کہ چونکہ یہ مقابلہ بے انتہا غیر مبہم اور واضح ہے اس لئے "مؤیدین امامت" نے اس میدان میں اپنی شکست کو یقینی سمجھتے ہوئے اپنی رزمگاہ کے دو اور میدان تلاش کئے ہیں۔ یعنی ایک تو یہی کہ آیا خلافت کے مفہوم میں سیاست داخل ہے یا نہیں۔ اور دوسرے یہ کہ نبی کریم کے اقوال سے حضرت علی کی بے انتہا فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ پہلے مسئلہ پر ایک اجمالی تبصرہ کیا جا چکا ہے اسلئے اب ہمارے سامنے صرف دوسرا سوال باقی رہ جاتا ہے۔ یعنی یہ کہ خود نبی کریم کے اقوال سے حضرت عمر و ابوبکر کے مقابلہ میں حضرت علی کی کیا فضیلت ثابت ہوتی ہے۔

اس سلسلہ میں "مؤیدین امامت" "اَنَا مَدِیْنَۃُ الْعِلْمِ وَعَلِیٌّ بَابُہَا" کی حدیث کو نہایت شدت کیساتھ پیش کرتے ہیں۔ لیکن اس کے مقابلہ میں حضرت عمر کے متعلق صحیح بخاری کی ان احادیث کو ملاحظہ فرمایا جائے:۔

> رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ خواب میں میرے سامنے کچھ لوگ پیش کئے گئے جو کُرتے پہنے ہوئے تھے۔ ان میں سے کسی کا کُرتہ سینہ تک تھا۔ کسی کا اس سے نیچے۔ پھر عمر میرے سامنے لائے گئے اُن کا کرتہ اتنا لمبا تھا کہ اس کا دامن زمین پر گھسٹتا جاتا تھا۔ لوگوں نے پوچھا "اس کی تعبیر؟" آپ نے فرمایا۔ "عمر کی دینداری" [1]

اسی قسم کی ایک دوسری حدیث ہے جس میں آپ نے خواب میں ایک گلاس سے کچھ دودھ پیا۔ اور باقی حضرت عمر کو دیدیا۔ اور لوگوں کو اس کی تعبیر "علم" بتلائی۔ [2]

حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اس سے پہلے بنی اسرائیل میں ایسے لوگ گذر چکے ہیں جو اگرچہ پیغمبر نہ تھے لیکن ان پر خدا کی جانب سے الہام ہوتا تھا۔ اگر میری امت میں سے کسی شخص کو یہ مرتبہ حاصل ہے تو وہ عمر ہیں" [3]

حضرت ابن عباس سے مروی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عمر کی وفات کے وقت حضرت علی کو یہ کہتے سنا ہے کہ "مجھے یقین تھا کہ خدا تجھ کو تیرے دونوں ساتھیوں (رسول کریم و ابوبکر صدیق) کے ساتھ رکھیگا۔ کیونکہ میں نے اکثر نبی کریم کو یہ کہتے سنا ہے:۔ "کُنْتُ اَنَا وَاَبُوْبَکْرٍ وَّعُمَرُ" و "فَعَلْتُ اَنَا وَاَبُوْبَکْرٍ وَّعُمَرُ" و "اِنْطَلَقْتُ اَنَا وَاَبُوْبَکْرٍ وَّعُمَرُ" [4]

ممکن ہے کہ پہلی حدیث کو محض اس لئے زیادہ قابل وثوق نہ سمجھا جائے کہ وہ حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے۔ لیکن دوسری حدیث کے رواۃ کو تو یقیناً اس سے بلند ہونا چاہئے۔

---

[1] صحیح بخاری۔ کتاب الایمان۔ [2] صحیح بخاری، کتاب العلم۔ [3] و [4] صحیح بخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی۔

اس سلسلہ میں بخاری کی وہ حدیث بھی قابلِ تذکرہ ہے جس میں رسول کریم سے ایک عورت نے پوچھا ہے "آپ کے بعد میں مسایل کس سے پوچھوں گی؟" آپ نے فرمایا "ابوبکر سے" لہ

ایک موقعہ پر رسول کریم نے حضرت علی کے متعلق یہ فرمایا تھا "علی دُنیا اور آخرت میں میرا بھائی ہے" اس سے یہ استدلال نہیں کیا جاسکتا کہ نبی کریم اس طرح آپ کو اپنا جانشین بنا رہے تھے۔ حضرت علی واقعتہً آپ کے بھائی تھے۔ اور اس لئے یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے آپ کہتے "آمنہ دُنیا اور آخرت میں میری ماں ہیں" یا "عبداللہ دنیا اور آخرت میں میرے باپ ہیں"۔

حضرت ابوبکر کی جاں نثارانہ اور فداکارانہ جذبہ کی ایک بہت بڑی مثال ان کا وہ کارنامہ ہے جس کے متعلق قرآن میں مذکور ہے:-

"ثَانِيَ اثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا"

یہ آیت غیر مشتبہ طور پر حضرت ابوبکر کی منقبت کو ظاہر کرتی ہے۔ اگر کج بحثی کے ساتھ تاویل بعید کو کام میں نہ لایا جائے تو اس کے معنی میں کوئی اشکال نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ "خدابخش لائبریری پٹنہ" میں قرآن کا ایک قلمی نسخہ ہے۔ جس پر گو کاتب کا نام درج نہیں ہے لیکن کسی شیعہ کی کوشش کا نتیجہ ہے۔ اس میں دو سورتیں زیادہ ہیں۔ جن میں سے ایک کا نام "نورین" ہے اور دوسری کا نام "ولایت"۔ نیز ۳۳ آیات بھی حسب ضرورت بڑھادی گئی ہیں۔ ان سورتوں اور آیات کو قرآن میں بڑھا دینے کے بعد "مصنف" نے شیعیت کے تمام مشتبہ مسایل کو قرآن میں داخل کر دیا ہے۔ اور اس اضافہ کے متعلق یہ خیال کیا گیا ہے کہ چونکہ قرآن کے یہ حصے اہلِ تشیع کی صریح حمایت میں تھے اس لئے اہلِ سنت نے ان کو اصل قرآن سے نکال دیا۔ (نعوذ باللہ)۔ بہرحال اس قرآن میں مذکورہ بالا آیت کے مفہوم کو حضرت ابوبکر کی مذمت میں تبدیل کرنے کی خاطر اس طرح لکھا گیا ہے:-

"يَقُولُ لِصَاحِبِهِ، وَيْلَكَ، لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا"

ڈوبتا آدمی تنکے کے سہارے کو غنیمت سمجھتا ہے۔ چنانچہ بعض اوقات حضرت علی کی امامت کو ثابت کرنے کے لئے ان کے سابق الاسلام ہونے کو پیش کیا جاتا ہے۔ لیکن اول تو یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے۔ تاہم اگر مختلف مستند اقوال کو یکجا جمع کرنے سے کوئی یقینی نتیجہ نکالا جاسکتا ہے۔ تو وہ صرف یہ ہے کہ آپ نوجوانوں میں سب سے پہلے مسلمان تھے۔

بہرحال اگر اس بات کو مان بھی لیا جائے کہ آپ سب سے پہلے ہی اسلام لائے۔ تب بھی یہ امر اتنی اہمیت نہیں رکھتا کہ محض اس کی وجہ سے آپ کو دیگر تمام صحابہ سے افضل قرار دیدیا جائے۔ اس لئے کہ گو اس میں اختلاف ہے کہ اسلام لانے کے وقت آپکی عمر کیا تھی۔ لیکن جس روایت میں سب سے زیادہ عمر بتلائی گئی ہے وہ ۱۰ برس ہے۔ اگر اسی روایت کو صحیح تسلیم کر لیا جائے۔

لہ۔ صحیح بخاری۔ کتاب فضائل [illegible]

تب بھی یہ عمر وہ ہے جب انسان میں عقل و شعور کا آغاز ہوتا ہے۔ اس عمر میں انسانی دماغ غیر پختہ ہوتا ہے۔ اور بہت جلد نئی باتوں پر یقین کر لیتا ہے۔ اور اس لئے اگرچہ حضرت علی کی مذہبی رفعت شان اور جلالت و مرتبت میں کسی مسلمان کو شبہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن مقابلۃً اُن کے اسلام کو حضرت ابوبکر و حضرت عمر جیسے پختہ کار شرفائے قریش کے اسلام کے مقابلہ میں زیادہ قابلِ اہمیت بھی قرار نہیں دیا جا سکتا۔

اس کے علاوہ دوسرا سبب جس کی بناء پر ان کی یہ مسابقت فی الاسلام مقابلۃً اتنی اہم نہیں رہتی جتنی بیان کی جاتی ہے۔ یہ ہے کہ وہ رسول کریم کے چچیرے بھائی تھے۔ اور اس لئے ظاہر ہے کہ ان کی اس "مسابقت ایمانی" میں قریبی عزیز ہونے کی وجہ سے "وصول الی الحق" کا وہ بے لوث جذبہ کارفرما نہیں ہو سکتا جو ابوبکر و عمر جیسے غیر متعلق اشخاص میں پایا جا سکتا ہے۔ علاوہ ازیں رسول کے بھائی ہونے کی وجہ سے قدرتی طور پر رسول کا پیغام سب سے پہلے آپ کے کانوں تک پہنچا ہوگا۔ پھر اس کو حُسنِ اتفاق کی مثال کہیں تو کہہ سکتے ہیں۔ لیکن اس میں فخر کی کوئی بات نہیں۔ فخر البتہ یہ ہے کہ رسول کا پیغام سنتے ہی فوراً "آمنا" کہہ دیا جائے۔ حقیقتاً حضرت علی کو یہ فخر پہنچتا ہے۔ لیکن اس میں حضرت ابوبکر بھی برابر کے شریک ہیں۔

ابتدائے اسلام میں ایک مرتبہ نبی کریم نے اپنے اعزا کے سامنے اسلام کو پیش کرتے ہوئے حضرت علی کے متعلق کہا تھا:-

"اِنَّ هٰذَا اَخِي وَ وَصِيِّي وَ خَلِيفَتِي فِيكُم"

لیکن اس سے خلافتِ علی پر استدلال کیا جانا کسی صورت سے صحیح نہیں ہو سکتا۔ اس وقت رسول کریم کی پوزیشن ایک بے یار و مددگار "لیڈر" سے زیادہ نہ تھی۔ اور اس لئے ان جملوں سے اس موقعہ کے لحاظ سے جو کچھ مراد لی جا سکتی ہے وہ اس سے زیادہ نہ ہونا چاہئے۔ کہ حضرت علی کی حوصلہ افزائی کے ساتھ ساتھ ان کو اس حالت میں نبی کریم کا واحد معتمد علیہ قرار دیا گیا ہے۔

پھر جو طبقہ حضرت علی کی اُلوہی امامت کا قائل ہے وہ اسی طرح حضرت حسن کی اُلوہی امامت کو بھی مانتا ہے۔ اگر اس عقیدہ کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو پھر میں پوچھتا ہوں کہ امام حسن کے اس "انتقام" کو سامنے رکھتے ہوئے جو آپ نے حضرت علی کے قاتل ابن ملجم سے لیا۔ اُن کی اخلاقی فضیلت کا کیا معیار قائم کیا جائیگا؟ [1]

میں اس سلسلہ میں زیادہ تفصیلی بحث کرنا نہیں چاہتا۔ لیکن اتنا اور کہہ دینا چاہتا ہوں کہ "شیعیت" کی جانب سے حضرت علی کی الہامی امامت کو ثابت کرنے کے لئے جتنے دلائل پیش کئے جاتے ہیں وہ حقیقتاً اسلام کے بنیادی اصول سے کوئی دور کا تعلق بھی نہیں رکھتے۔ اس جھگڑے کا آغاز محض بعض مقامی پیچیدگیوں سے ہوا تھا۔ جن کو اس وقت کامیاب

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو۔ الکامل للمبرد جلد سوم مطبوعہ مصر صفحہ ۱۱۶۔

بنانے کی خاطر مذہبی رنگ دیا گیا۔ اور جن کو اب غلطی سے مستقل مذہبی عقائد میں داخل کر لیا گیا۔

عربوں کی فطری "خاندانی عصبیت" کے ماتحت نبی کریم کی وفات کے بعد بنو ہاشم کے ہر فرد نے اپنے موروثی جذبہ کے ماتحت اپنے خاندان کے ایک ممتاز فرد کو خلافت کا مستحق سمجھا اور اس کے لئے انہوں نے حضرت علیؑ کا نام پیش کیا۔ اس میں ان کو ناکامی ہوئی۔ پھر خلافتِ راشدہ کے ختم ہوتے ہی بدقسمتی سے حضرت معاویہ نے جس سلطنت کی بنیادیں دمشق میں استوار کیں۔ وہ خالص "بدوانہ" ذہنیت رکھتی تھی۔ ایران ہمیشہ سے ایک بلند اور مہذب حکومت رہی ہے۔ جنہوں نے ہمیشہ عربوں کو اپنے سے فروتر سمجھا ہے۔ لیکن جب اسلامی فتوحات نے ایران کو دمشق کے پایۂ تخت سے متعلق کر دیا۔ تو اہلِ ایران کی عزتِ قومی اور حمیتِ ملی کے لئے یہ چیز سخت ناقابلِ برداشت تھی کہ وہ عربوں کے جور و استبداد کے سامنے اپنی گردنوں کو خم ہوتا دیکھیں[1] گو وہ زمانہ کی ناسازگاری کے ہاتھوں اپنی کھوئی ہوئی عظمت کو واپس نہیں لے سکتے تھے۔ لیکن اپنے جذبات کے ماتحت عربوں سے انتقام لینے کے معمولی سے معمولی موقعہ کے منتظر تھے۔ اسلام نے خلافت کے مسئلہ میں جس بلند معیار کو قائم کر دیا تھا وہ اگر چالیسویں صدی ہجری میں حضرت علی کی شہادت کے بعد معاویہ کے بیرحم ہاتھوں سے تباہ نہ ہو چکا ہوتا تو وہ وقت کی ضروریات کے ماتحت مختلف ارتقائی دوروں سے گذرنے کے بعد آج دنیا کی اعلیٰ سے اعلیٰ جمہوریت کے لئے بھی قابلِ رشک ہوتا۔ لیکن خلافت کے مسئلہ میں اس "انتخابی نظام" سے دنیا قریب قریب ناواقف تھی۔ ایران میں "وراثت" کا قانون نافذ تھا۔ انہوں نے عربوں سے بدلہ لینے کا یہ بہت اچھا موقعہ دیکھا۔ کہ حضرت علیؑ کی الہامی نبوّت کی آڑ میں خاندان اموی کے خلاف پروپیگنڈا شروع کر دیں۔ چنانچہ بالآخر ۹۔ جون ۷۴۷ء کی صبح کو خراسان کے ایک گوشہ سے ابومسلم نے عباسیوں کا سیاہ جھنڈا بلند کر دیا۔ اور گو عباسیوں کے دورِ حکومت میں ایران پوری طرح مطمئن نہ ہو سکا۔ لیکن جب چنگیز خاں کے حملہ کے بعد ایران میں ایک مستقل خود مختار حکومت کی بنیاد قائم ہوئی تو ایرانیوں کو دل کے پھپھولے پھوڑنے کا کافی موقعہ ملا۔ چنانچہ خاندانِ صفویہ اٹھا اور اس نے صحیح معنوں میں عربوں سے اس طرح انتقام لیا کہ سارے ملک کو بنوکِ شمشیر شیعیت کے رنگ میں رنگ دیا۔

یہی حال عبداللہ ابن میمون القداح کی اس عظیم الشان تاریخی سازش کا ہے جس کے بعد مصر میں تقریباً دو سو برس تک بنو فاطمہ کے جھنڈوں کے نیچے شیعیت پرورش پاتی رہی۔[2]

---

[1] اس سلسلہ میں فردوسی کے مندرجۂ ذیل اشعار ملاحظہ فرمائیے جو بتلاتے ہیں کہ راسخ العقیدہ مسلمان ہونے کے باوجود جب قومی اور ملّی جذبہ کے ماتحت وہ ایرانیوں کے مقابلہ میں عربوں کا ذکر کرتا ہے تو کتنا "پرشور" نظر آتا ہے:-

ز شیرِ شتر خوردن و سوسمار — عرب را بجائے رسید است کار

کہ تختِ کیاں را کنند آرزو — تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

[2] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: مسلم تھیالوجی مصنفہ میکڈانلڈ۔

مختصراً ان واقعات کی روشنی میں یہ حقیقت محتاج تشریح نہیں رہتی کہ خلافت و امامت کا مسئلہ نہ تو کوئی ایسا مسئلہ ہے جو آج درخور اعتنا کہا جا سکے۔ اور نہ "شیعیت" اسلام کا کوئی مذہبی فرقہ۔ فقط

سید ابو سعید بزمی بھوپالی۔ بی اے

نگار:۔ "ہرنام" کے "مضمون" "مسئلہ خلافت و امامت" کا جواب متعدد حضرات نے دیا ہے۔ بعض نے نہایت سطحی و معمولی۔ بعض نے ایک حد تک تحقیقی و استدلالی۔ لیکن اس وقت تک کوئی مقالہ ایسا وصول نہیں ہوا۔ جس میں تمام جزئیات سے اسی تفصیل و ترتیب سے بحث کی گئی ہو جو ہرنام صاحب کے مضمون میں پائی جاتی ہے۔ بہرحال ان موصولہ مضامین میں ہم سب سے پہلے جناب بزمی بی اے کا مضمون شائع کرتے ہیں۔ مقالہ نگار نہ صرف انگریزی کے فاضل ہیں۔ بلکہ عربی علوم کے بھی فارغ التحصیل طالب علم ہیں۔ میں نے "مولوی" اس لئے نہیں کہا کہ اس وقت تک ان میں وہ جراثیم پیدا نہیں ہوئے ہیں جو ایک انسان کو اس اعجوبہ روزگار چیز میں تبدیل کر دیتے ہیں جس کو اگر ہم "مولوی" کے علاوہ کسی اور نام سے پکاریں تو نہ اس کی ہیئت ظاہری سمجھ میں آسکتی ہے اور نہ اسکا بطون ــــــ لیکن بہرحال ایک پابند مذہب شخص ہیں۔ اور گروہ اہل سنت سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لئے ظاہر ہے کہ وہ ایک شخص ثالث کی حیثیت سے اس پر گفتگو کرنے کے لئے تیار نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ اس نقطۂ نظر سے اس مسئلہ کو دیکھنا شیعہ و سنی دونوں کو پسند نہیں آسکتا۔ بہرحال اس مضمون میں جس اصول کو سامنے رکھا گیا ہے وہ بھی مسئلہ خلافت پر کافی روشنی ڈالنے والا ہے۔ اس کے بعد ہم اور مضامین بھی شائع کرینگے اور سب سے آخر میں اپنی رائے پیش کرینگے۔

آیندہ اگر کوئی اور صاحب اس مسئلہ پر لکھنا شروع کریں تو انھیں ہرنام کا مضمون پڑھ کر یہ غور کر لینا چاہئے کہ اس کے استدلال کی بنیا دکن امور پر ہے۔ یعنی ایک یہ کہ جو روایات انہوں نے اہل سنت کی کتابوں سے پیش کی ہیں وہ واقعی ان کتابوں میں پائی جاتی ہیں یا نہیں۔ اور دوسرے یہ کہ ان واقعات و روایات سے وہی نتیجہ نکلتا ہے یا نہیں جو ہرنام نے پیدا کیا ہے۔ اگر نتیجہ واقعی وہی نکلتا ہے اور روایات بھی اہل سنت کی کتابوں میں پائی جاتی ہیں تو پھر یہ دیکھنا چاہئے کہ وہ روایات صحیح ہیں یا نہیں۔ اور اگر صحیح نہیں ہیں تو اکابر اہل سنت نے کیوں ان کو اختیار کیا۔ یہ تو بحث کا وہ ضروری پہلو ہے جس کو ترک کیا ہی نہیں جا سکتا۔ اب رہا مسئلہ کا نفسیاتی پہلو سو اس کو وہی شخص چھو سکتا ہے جو دونوں جماعتوں میں سے کسی سے تعلق نہ رکھتا ہو۔ سو اس کو مجھ پر چھوڑ دیجئے۔

نیاز

آفتاب کی کرشمہ سازیاں

آبشاروں کا نظارہ کرنے والے مثلثی شیشوں کے دیکھنے والے اس امر کی شہادت دے سکتے ہیں کہ آسمان پر دکھلائی دینے سے پہلے نہ معلوم کتنے قوس قزح ان کی نگاہوں سے گذر چکے ہیں۔ لیکن پچھلے زمانہ میں انسان ترقی و تہذیب کے میدان میں بچہ کی طرح تھا اس لئے اسکا یہ خیال کہ:۔

"قوس قزح فی الاصل وہ راستہ ہے جس پر سے مرنیوالوں کی روحیں ملائے اعلیٰ کی طرف جاتی ہیں"

اس کی تسکین کے لئے کافی تھا۔ اس کے بعد یہ دیکھکر کہ وہ بارش کے موسم ہی میں اکثر دکھائی دیتی ہے۔ اُس نے اپنا خیال کسی قدر بدلا اور یہ کہنا شروع کیا کہ:۔

"قوس قزح کا نمود پیغام الٰہی ہے کہ اب بارش نہ ہوگی"

لیکن یہ خیال صرف اس ملک کے انسانوں میں پیدا ہوا۔ جہاں وقت بے وقت بارش ہوا کرتی تھی۔ یا جہاں بارش کثرت سے ہوتی تھی۔ مگر شعریت پسند یونانیوں کا خیال دوسرا تھا۔ ان کے خیال میں "قوس قزح اصل میں وہ راستہ تھا۔ جس پر سے خدا کے پیغامبر گذرا کرتے تھے"!

جب ارسطو نے اس قسم کے خیالات کو سنا تو بول اٹھا کہ "یہ شاعرانہ اعتبارات ہیں ورنہ قوس قزح روشنی۔ نمی اور قطرات آب کے امتزاج کا دوسرا نام ہے"

مگر اسکا بیان دُنیا کے لئے ناقابل قبول ٹھہرا۔ کیونکہ روشنی و رنگ کا تجزیہ اس وقت تک ناممکن تھا۔ اور لوگوں نے گذشتہ اقوال ہی پر اعتبار کرنا مناسب سمجھا۔

کہا جاتا ہے کہ چودھویں صدی میں ایک عظیم المرتبہ راہب کو قوس قزح کا صحیح علم ہوگیا تھا۔ مگر یہ خیال صرف عقیدتاً تھا۔ ورنہ تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ اندلس میں الذرغل نے اس سے بہت پہلے قوس قزح کی عقدہ کشائی کردی تھی۔ اور اپنی تحقیقات سے یورپ کو آشنا کردیا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ باوجود اس خیال کے موجود ہونے کے کہ:۔

"جہاں قوس قزح کی کمان ختم ہوتی ہے۔ اگر کوئی پہنچ جائے تو اس کو ایک سونے کا پیالہ ملیگا"

اسحق۔نیوٹن وغیرہ تجزیہ رنگ میں مصروف تھے جس کا نتیجہ مابعد زمانہ میں یہ نکلا کہ شاعرانہ خیال میں سرگرم رہنے والے اپنی جگہ رہ گئے اور تحقیقات کرنے والوں نے وہ جواہرات حاصل کرلئے جو قوس کے رنگین طول وعرض میں پوشیدہ تھے۔اور تمام دُنیا کو سمجھانے کے لئے یہ مثال پیش کی کہ:-

"فرض کرو ایک مقابلہ کی دوڑ کا اس طرح انتظام کیا جائے کہ میدان کے وسط میں ایک" قوس نما"
لوہے کی کمان اس طرح بنائی جائے کہ سب سے چھوٹا آدمی اس میں سے آسانی سے گذر جائے اور تمام
دوڑنے والوں کے لئے یہ شرط ہو کہ ان کی وردیاں قد کے لحاظ سے الگ الگ رنگ کی ہوں۔یعنی
سب سے چھوٹے آدمی کی بیجنی یا نیلی ہو۔متوسط کی پیلی اور قدآور کی سُرخ۔اور جو سب سے پہلے حلقۂ قوس
سے گذر جائے وہ قابل انعام ٹھہرے"

اس شرط کے بعد دوڑ شروع ہو۔تم غور کرسکتے ہو کہ اس دوڑ کا کیا رنگ ہوگا۔تمام دوڑنے والے حلقۂ مذکور سے گذر جانے کے لئے دوڑینگے۔نتیجہ یہ ہوگا کہ وردیوں کے اختلاط سے جو لہر رونما ہوگی وہ قوس قزح کی مکمل تصویر تو نہیں۔لیکن دُھندلا سا خاکہ ضرور پیدا کردے گی۔

مشاہدات نے یہ ثابت کردیا ہے کہ جب قوس قزح کی طرف دیکھا جائیگا تو سورج عقب میں ضرور ہوگا۔جس کی شعاعوں کو ابخرات آلودہ ہوا سے گذرنا ہوتا ہے۔مگر پانی کی بے شمار باریک باریک بوندیں ان کو روکتی ہیں۔مگر وہ اُن سے لڑ بھڑ کر ہماری نگاہوں تک پہنچ ہی جاتی ہیں۔اس تصادم کیوجہ سے جو لہر پیدا ہوتی ہے وہ شعاعوں کا عکس حاصل کرکے قوس قزح کا دائرہ بنا دیتی ہے

موجودہ تحقیقات سے یہ بات مان لی گئی ہے کہ سفید رنگ (اگر اسکو رنگ کہہ سکتے ہیں) تو ایسا رنگ ہے۔جو تمام رنگوں پر محیط ہے۔اسی طرح یہ بھی ثابت ہوچکا ہے کہ تھوڑی سے تھوڑی روشنی بھی چھوٹی اور بڑی لہروں پر مشتمل ہوتی ہے جن میں سے ہر ایک لہر جب نگاہ تک پہنچتی ہے۔تو قوس رنگین بن جایا کرتی ہے۔اسی کو "شکستگیٔ نُور" اور "انعکاس رنگین" بھی کہہ سکتے ہیں۔

بعض وقت جب روشنی کو قدرے کثیف فضا سے گذرنا پڑتا ہے تو چھوٹی کرنیں بیجنی رنگ لئے ہوتی ہیں۔اور پہلے گذر جاتی ہیں۔سب سے بڑی کرنیں جو نگاہوں کو سُرخ معلوم ہوتی ہیں۔سب سے آخر میں گذرتی ہیں۔انھیں تبدیلیوں کا دوسرا نام مشرقی ممالک میں غروب آفتاب کے وقت شفق ہے۔اور مغربی ممالک میں" شعلۂ سما"۔

اسی طرح اور بالکل اسی طرح ابخرات آلودہ ہواؤں میں مہین مہین بُوندیوں کے اثر سے تبدیلیاں بھی ہوتی ہیں۔بعض تبدیلیوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم آسمان کو نیلگوں کہتے ہیں۔اور بعض کی وجہ سے قوس قزح کے متعدد دائرے نظر آتے لگتے ہیں۔اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ:-

"جب ابخرات آلودہ ہواؤں سے شعاع گذرتی ہے تو وہ ذرات ہوا جو بوندوں سے بڑے ہوتے ہیں اُن نیلی شعاعی لہروں کو جذب کر کے ہماری نگاہوں تک واپس کر دیتے ہیں - اور اسی وجہ سے ہم کہتے ہیں کہ آسمان نیلگوں ہے "

بجنسہ جب پانی کی بوندیں شعاعی لہروں کو روک کے اُن کے زاویہ خاص سے منعطف کر دیتی ہیں - اور بلحاظ طول و عرض ان کو ہماری نگاہوں تک واپس کر دیتی ہیں - اگر روشنی کی قوت زیادہ ہوتی ہے تو قوس قزح کا ایک دوسرا دائرہ مرکزی دائرے کے نیچے بن جاتا ہے - اسی طرح "کرشمۂ نور" کی نیرنگیوں کی بدولت ایک سے زیادہ دائرے بن سکتے ہیں -

ان کو الفت کی موجودگی میں قوس کی رنگین کمان تک پہنچکر "سونے کا پیالہ" حاصل کرنا بالکل بے معنی ہے - کیونکہ اسکا وجود ہے - لیکن اس کی کوئی انتہا نہیں - اس لئے کہ ہم سے کچھ فاصلہ پر ابخرات آلود ہواؤں کا وجود ممکن اور اس سے روشنیوں کا گذرتے رہنا یقینی ہے - پس قوس پر قوس کی رنگینیوں کا بننے اور بگڑتے رہنا بھی لازمی ہے -

قوس قزح کی طرح ہالوں کا بھی وجود ہے - جو "شکستگی نور" کی وجہ سے سورج چاند اور دیگر بڑے تاروں کے گرد دیکھے جاتے ہیں - لیکن ہالۂ قمر کا سمجھ لینا بہ نسبت سورج یا دیگر ہالوں کے مشکل نہیں ہے - کیونکہ ہالۂ قمر کی مثال کہر والی راتوں میں ان قندیلوں کے گرد مل سکتی ہے جو سڑکوں کے کناروں پر جلتی ہیں - لیکن ہالہ جب متشکل ہوتا ہے تو یہ نہیں ہوتا کہ پانی کی بوندیں روشنی کو روکتی ہوں - بلکہ ہوتا یہ ہے کہ یہی بوندیں روشنی کو منتشر بھی کر دیتی ہیں - اور منعکس بھی - منتشر اس طرح کہ بوندیں جس قدر طول و عرض میں خود منتشر ہوتی ہیں اسی قدر "جذب نور" میں انتشار و بُعد پیدا ہو جاتا ہے - اور منعکس اس طرح کہ بوندیں اپنی شفاف آغوش میں شعاعوں کو جذب کرتی ہیں جس سے بالکل اسی طرح انعکاس پیدا ہو جاتا ہے - جیسے آئینہ کو سورج کے سامنے رکھ کر کسی اور طرف عکس ڈالتے وقت پیدا ہوتا ہے -

جہازران چاند کے ہالوں کو دیکھ کر طوفان یا بارش کی آمد کا خیال کرتے ہیں - کیونکہ چاند اپنی منتشر روشنی کے ذریعہ اُن پانی کی بوندوں کی خبر دیتا ہے - جو بادلوں کے بننے سے پہلے ہوا میں پوشیدہ رہتی ہیں -

"شکستگی نور" ہی کی وجہ سے سورج کے گرد بھی ہالوں کا وجود موسم سرما میں نظر آتا ہے - کیونکہ اس موسم میں چھوٹے چھوٹے برف کے ذرات یا منجمد آبی قطرے فضا میں موجود رہتے ہیں - موسم گرما میں ان کا وجود کمیاب ہوتا ہے - لیکن سورج کے ہالوں کا معائنہ بغیر کسی آلۂ شعاعی کے بہت مشکل ہے -

ہالوں کے علاوہ فضا میں ایک اور چیز موجود پائی جاتی ہے جسکو "گرد رقصاں" کہہ سکتے ہیں - اور یہ بھی شکستگی شعاع کا ایک کرشمہ ہے - اس "گرد رقصاں" کی وجہ سے بھی بہت سے ہالوں کا وجود ہوتا ہے - چنانچہ ۱۸۸۳ء میں جب کراکٹو (Karahtu) کوہ آتش فشاں کے پھٹنے کی وجہ سے کئی ہفتہ تک گرد سے فضا تاریک رہی تو بہت سے رنگین حلقے سورج کے گرد دیکھے گئے - اس قسم کے حلقوں کو ازمنۂ ماضی میں شگون بد سے تعبیر کیا جاتا تھا - اور اب بھی کسی حد تک اسکا خیال عوام میں باقی ہے - لیکن سنجیدہ طبقہ اب ان نشانات و ارتسامات کو نفشا و نور کے معصوم کھیل کے سوا کچھ نہیں تصور کرتا -

حافظ - غازی پوری

باب الاستفسار

نورِ محمدی اور پلِ صراط

(جناب مرزا محمد مہدی صاحب - جبل پور)

عام طور پر مسلمانوں میں مشہور ہے کہ قیامت کے دن تمام آدمی ایک پل سے گذریں گے جس کا نام صراط ہے - اور وہ بال سے زیادہ باریک تلوار کی دھار سے زیادہ تیز ہے - پھر جو اچھے بندے ہیں وہ اس سے محفوظ گذر جائیں گے - اور جو گناہگار ہیں وہ نیچے جہنم میں گر جائیں گے - یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جو لوگ قربانیاں کرتے ہیں انھیں جانوروں پر سوار ہو کر اس پل سے گذرینگے - بہت سے واعظوں کو بھی یہی بیان کرتے سنا گیا ہے - اور مولود کی اکثر کتابوں میں اسکا ذکر موجود ہے - براہ کرم مطلع فرمائیے - اسکی کیا حقیقت ہے اور کیا واقعی قرآن پاک یا احادیث میں اسکا ذکر ہے؟
اسی طرح نور محمدی کے متعلق میلاد کی کتابوں میں عجیب و غریب باتیں بیان کی گئی ہیں - اور کہا جاتا ہے کہ یہ سب احادیث سے ثابت ہیں ؟

(نگار) آپ کیا پوچھتے ہیں کہ ان جاہل مولویوں اور کم عقل واعظوں نے کس کس طرح اسلام کو بدنام کیا ہے - اور ان کی گندہ تصانیف نے بانی اسلام پر کیا کیا تہمت تراشی ہے - ایک صراط پر کیا موقوف ہے - اور ہزاروں باتیں ایسی ہیں - جن کا پتہ نہ کلام پاک میں ہے اور نہ تعلیمات اسلامی میں - لیکن آج وہ عام مسلمانوں کے نہایت اہم عقائد میں شامل نظر آتی ہیں - جس زمانہ میں رسول اللہؐ مبعوث ہوئے ہیں - عرب میں موسوی - عیسوی اور زردشتی مذاہب کے اثرات ہر جگہ پائے جاتے تھے - اور ان کی روایات عام طور پر بیان کی جاتی تھیں - چونکہ عرب خود بت پرست تھے - اور وہ کسی الہامی کتاب

رکھنے کے مدعی نہ تھے - اس لئے ان مذاہب سے بڑی حد تک مرعوب و متاثر ہو رہے تھے - اور ان کے خاندانوں میں ایک زمانۂ نامعلوم سے ان مذاہب کی بہت سی روائتیں منتقل ہوتی چلی آ رہی تھیں -

جب ظہور اسلام ہوا اور اس نے عربوں کی ذہنیت کو ان تمام اساطیری خرافیات سے پاک کرنا چاہا تو اسکو بہت دقتیں پیش آئیں - کیونکہ صدیوں سے جو باتیں ذہن میں مرتسم چلی آتی تھیں ان کا دفعتہً محو کرنا آسان نہیں تھا - تاہم اس نے اساس و بنیاد کی طور پر ایک ایسی چیز (کلام مجید) پیش کر دی - جو اس نوع کے لغویات سے پاک تھی - اور ہر چند ابتدائے عہدِ اسلام میں لوگوں کو اس کے حقیقی مفہوم پر بحث و تحقیق کا موقعہ نہیں ملا - تاہم اس نے ایک ایسے صاف و سادہ مذہب کی داغ بیل ضرور ڈالدی - جو انسان کی عملی زندگی اور اس کے تمدنی تعلقات کے لحاظ سے نہایت ہی پائدار اور بلند مستقبل اپنے اندر رکھتا تھا - لیکن افسوس ہے کہ نہ رسول اللہؐ نے اتنی عمر پائی کہ وہ اس بنیاد کو مستحکم کر جاتے - اور نہ آپ کے بعد خلفاء کو اندرونی سازشوں اور سیاسی جھگڑوں کیوجہ سے اس کی فرصت نصیب ہوئی - یہاں تک کہ مذہب اسلام نام ہوگیا حکومتِ اسلام کا - اور قرآن کی جگہ لے لی احادیث نے - جو لاکھوں کی تعداد میں رسول اللہؐ کے نام سے گڑھی اور روایت کی جاتی تھیں - پھر ان احادیث میں سے ایک حصہ تو ایسا ہے جو صرف سیاسی مصالح کے بناء پر وضع کیا گیا - اور ایک حصہ وہ ہے جس میں دل کھولکر دیگر مذاہب کی اُن تمام روایتوں کو لے لیا جو عرب خاندانوں میں رائج تھیں - اور تھوڑا سا تغیر کر کے ان کو "اسلامی چیز" کی حیثیت سے پیش کیا گیا - انھیں میں سے وہ احادیث بھی ہیں جو صراط (عوام کی زبان میں پُل صراط) اور نور محمدی کے متعلق آپ کو میلاد کی کتابوں میں نظر آتی ہیں - اور یہ دونوں خیال صریح ایرانی روایات سے ماخوذ ہیں - لفظ صراط عربی لفظ نہیں ہے - بلکہ فارسی لفظ "چنوات" کا معرّب ہے - اوستا میں ایک لفظ ہے "چنواتو پرِدتوس" جس کے معنی ہیں "نیک و بد شمار کرنیوالے کا پُل" - یہی لفظ مخفف ہو کر فارسی میں چنوات ہوا اور عربی میں صراط -

زردشتیوں میں اس پُل کے متعلق جو روایت پائی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ مرنے کے بعد انسان کی روح کو ایک پُل سے گذرنا پڑتا ہے - اور اس کے بعد اس کے نیک و بد اعمال کا احتساب ہوتا ہے - پہلوی کتاب دنکارت کی ایک عبارت ملاحظہ ہو :-

"میں تیری عبادت نیک خیال اور نیک عمل کیساتھ کرتا ہوں تاکہ میں روشنی کے راستہ میں رہوں - دوزخ کے عذاب میں مبتلا نہ ہوں - اور پُل چنوت کو عبور کر کے اس جگہ پہنچ جاؤں جو نکہتوں سے معطر اور مسرتوں سے مملو ہے -

اوستا میں بھی آپ کو یہی خیال نظر آئیگا - چنانچہ نیک عورتوں اور مردوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ :-

"انھیں بھی میں تم جیسے آدمیوں کی دعاؤں کے ذریعہ سے لے جاؤں گا اور تمام برکتوں کے ساتھ پُل چنوات تک

اُن کی رہنمائی کروں گا" (یسنا-۴۶-۱۰)

اس نوع کا عقیدہ نہ صرف قدیم ایرانیوں میں بلکہ تمام آریہ قوموں میں پایا جاتا ہے۔ اور معلوم ایسا ہوتا ہے کہ جہاں جہاں وہ پہنچے یہ اعتقاد اپنے ساتھ لے گئے۔ چنانچہ ناروے اور سویڈن کی قدیم روایات میں ایک چیز "بفروست" نظر آتی ہے۔ جسے عام طور پر "دیوتاؤں کا پُل" کہتے ہیں۔ اور اس سے مراد اُن کی غالباً قوس قزح ہے۔ یہی خیال ادنیٰ تغیر کے ساتھ یونانیوں میں بھی آیا۔ چنانچہ وہ قوس قزح کو دیوتاؤں کا قاصد کہا کرتے تھے۔ غرض صراط کے متعلق جو روایات مسلمانوں میں رائج ہوگئی ہیں وہ یکسر ایرانی روایات ہیں اور قول رسول سے انھیں کوئی واسطہ نہیں۔

کلام مجید میں کم و بیش چالیس جگہ لفظ صراط استعمال کیا گیا ہے۔ لیکن آپ کو کوئی ایک آیت بھی ایسی نہ ملیگی جس میں ان خرافات کی تصدیق کی گئی ہو۔ قرآن میں صراط کی صفت میں زیادہ تر لفظ مستقیم استعمال ہوا ہے۔ اور کہیں حمید اور سوی کے الفاظ۔ اور کسی ایک جگہ بھی راہِ عمل کے علاوہ کوئی اور مفہوم نہیں لیا گیا۔ پس یہ تو ہو سکتا ہے کہ عربی زبان میں قبل بعثت نبوی لفظ صراط فارسی زبان کے لفظ چنوات سے معرب کرکے لے لیا گیا ہو۔ اور اسی کے ساتھ ایرانی روایات بھی اس کے متعلق رائج ہوگئی ہوں۔ لیکن کلام مجید میں لفظ صراط صرف راہ یا راستہ کے معنی میں لیا گیا ہے اور اس کے ساتھ ایرانی روایات کا عدم شمول اس بات کو بھی ظاہر کرتا ہے کہ اُن کی کوئی حقیقت و اصلیت نہیں ہے۔

نور محمدی کا ذکر کلام مجید میں کسی جگہ نہیں ہے۔ البتہ احادیث و روایات ضرور اسکے متعلق موجود ہیں کہ وہ کس طرح آدم سے منتقل ہو کر رفتہ رفتہ جناب آمنہ تک منتقل ہوا۔ لیکن یہ احادیث بھی بالکل غیر موضوع ہیں۔ اور رسول اللہ سے ان کو منسوب کرنا درست نہیں کیونکہ اس میں بھی وہی آرین روایات کی جھلک پائی جاتی ہے۔ پارسیوں کی مذہبی کتاب اوستا میں بھی جمشید کے حالات کا ذکر کرتے ہوئے اسی طرح کی ایک روایت پائی جاتی ہے۔ یہ جمشید وہی ہے جسے "یم کھشیت" بھی کہتے ہیں اور جسکے معنی "یم نورانی" کے ہیں۔ یم یا جم کا ذکر سنسکرت لٹریچر میں بھی پایا جاتا ہے۔ چنانچہ رگ وید میں اسکو سب سے پہلا آدمی بیان کیا گیا ہے۔ ایرانی لٹریچر میں جم کے باپ کا نام "ویوہوت" درج ہے اور ہندوستانی روایات میں ویوسوت جو سورج کا دوسرا نام ہے۔ اور ہندوؤں کا سورج بنسی خاندان اسی کی یادگار ہے۔ اوستا کی روایت میں بھی اس نور کے نسلاً بعد نسل منتقل ہونیکا ذکر بالکل اسی طرح پایا جاتا ہے۔ جیسا اسلامی روایات میں۔ یعنی وہ نور پہلے جمشید کی پیشانی میں چمکا۔ اس کے بعد فریدوں میں منتقل ہوا اور پھر کیباسپ میں۔

الغرض نور محمدی کے متعلق جو روایات پائی جاتی ہیں وہ بھی خرافیات میں داخل ہیں اور رسول اللہ کے قول سے ان کو کوئی واسطہ نہیں۔ آپ کو اگر واقعی اسلام کا صحیح مفہوم معلوم کرنا ہو تو احادیث کو بالکل نظر انداز کر دیجئے اور صرف کلام مجید کا مطالعہ کیجئے۔ کہ وہی اصل چیز ہے اور وہی اصل بنیاد ہے تعلیمات اسلامی کی۔

جذباتِ عدم

ایک لمحہ :-

بیخودی گھُل مل رہی ہے رفتہ رفتہ ہوش میں
جاگتا ہے اک تصوّر ذہن کے آغوش میں

اک تصوّر زندگی کے اک حسیں لمحہ کا خواب
خواب، جس سے ماند پڑ جائے طلوعِ ماہتاب

وہ مرے محراب در سے اس طرح گذرے ندیم!
جیسے اک اُجڑے ہوئے مندر میں داخل ہو نسیم

آہ اُس شاعر کا گھر، جو ہو پرستارِ جمال
ہوں، زہے تابا، نمازیں عشق کی جس کے خیال!

معبدِ ویراں نہیں تو اور کیا ہے ہمنشیں
ایسا معبد جس کو کہیے، اک مناجاتِ حسیں

جس کے ہر ذرّے کو ہو اک دیوتا کا انتظار
جس کی ویرانی کا مطلب ہو خدا کا انتظار

شام کے جیراں دھندلکوں میں تھا اک ادراکِ راز
اور خموشی سے ٹپکتی تھی محبت کی نماز

میرے گھر کی شمع، میرے عشق کی غمّاز تھی
ناتواں سی روشنی میں درد کی آواز تھی

روبرو بیٹھے تھے وہ میرے اور اُن کی ہر نظر
کر رہی تھی مجھ کو اسرارِ بقا سے باخبر

آہ ادراکِ الوہیت کا حسنِ لازوال
مٹ چکا تھا دل سے اس دنیا کا ہر فانی خیال

او زمانے میرا وہ لمحہ بھی تیرے پاس ہے
اپنے روحانی خسارے کا مجھے احساس ہے

خامشی :-

خامشی اک غیر مرئی حسن ہے تخییل کا
جلوۂ صد رنگ، حسنِ صوت کی تحلیل کا

کیا تخیل آفریں ہے رسم و راہِ خامشی
فلسفہ کیا ہے؟ جلالِ بارگاہِ خامشی

عقل کی صناعیوں کو جانچتی ہے خامشی
فکر کی گہرائیوں کو جانچتی ہے خامشی

خامشی قدرت کا وہ ایمائے غور و فکر ہے
نغمہ جس کا اک دریائے غور و فکر ہے

خامشی سرگوشیوں کا اک طلسمی ساز ہے
ایک بھولی، بسری اور بھٹکی ہوئی آواز ہے

خامشی، ذی روح، پُر اسرار، زندہ خامشی
آشنائے لذتِ گفتار، زندہ خامشی

میری پنہاں قوتوں کا امتحاں ہے خامشی
حیرتِ ادراکِ پنہاں کی رازداں ہے خامشی

خامشی سے معنیٔ حسن آفریں لیتا ہوں میں
فکر کی کشتی کو جوئے نور میں کھیتا ہوں میں

دیکھتی ہے خامشی کے حسن کو چشمِ خیال
خود بخود کھلتے چلے جاتے ہیں اسرارِ جمال

خامشی کی گونج میں ہے ایک روحانی صدا
جس میں میں گم ہو گیا ہوں، کھو گیا ہوں بارہا

کیا بتاؤں تجھ کو اے ہمدم کہ کیا ہے خامشی
خامشی تو ہے مگر جانِ نوا ہے خامشی!

کچھ نہیں کھلتا کہ خاموشی ہے یا آواز ہے
ساز ہے فطرت کی یہ یا اک ادائے ناز ہے

بادل اور کہسار:۔

کوہسار اور بادلوں کے جمگھٹے، شام اور شفق
ڈوبتے سورج کا رومان آفریں جام اور شفق

بادلوں میں کیف و رعنائی کی تصویروں کے نقش
سینیوں کے خال و خد، صد رنگ تصویروں کے نقش

روح پرور رنگ، دلکش سائے، نورانی غبار
کچھ حقیقت، کچھ تصور کا طلسمِ سحر کار

ہلکی ہلکی تیرگی میں دھیمی دھیمی سرخیاں
سرخیوں میں حیرت افزا داستانوں کا جہاں!

چھن رہا ہے بادلوں سے رنگ و ظلمت کا غبار
نور کے چھینٹوں کے اندر جیسے پھولوں کی پھوار

دور کا کوئی افق ہے چشمِ دل کے سامنے
سرخ آنچل جس پہ پھیلائے ہیں اپنے شام نے

رقص میں مشغول ہیں پریاں، گھٹائیں اوڑھ کر
شعریت سر دھن رہی ہے جن کے ہر انداز پر

ذہن میں لہرا رہے ہیں کچھ سہانے خواب سے
چھو رہے ہیں بربطِ تخیل کو مضراب سے!

آ رہی ہے دھیمے دھیمے مست گیتوں کی صدا
بج رہا ہے آنکھ سے اوجھل، کہیں اک ساز سا

جس کو سن کر رفتہ رفتہ جھومتا جاتا ہوں میں
خواب میں جیسے کسی کو چومتا جاتا ہوں میں

جانِ تغزّل:-

ہوش کھو دیتا ہوں، اور وجد میں آ جاتا ہوں
وسعتِ حُسنِ تصوّر میں سما جاتا ہوں

تم تماشائی بنے تھے، تو تماشا بھی بنو۔
مر کے میں، اب تمہیں دیوانہ بنا جاتا ہوں

ڈوب جاتا ہوں خیالات کی گہری رَو میں
اور کسی دوسرے عالم میں چلا جاتا ہوں

چاندنی راتوں میں، وہ اُن کی ملاقات کا کیف
رخصت! اے ہوش! کہ بیہوش ہوا جاتا ہوں

بے حقیقت نظر آنے لگے شکوے اپنے
تیری گفتار کے دھارے پہ بہا جاتا ہوں

آہ! انسان ہوں پھنس جاتا ہوں باتوں میں، مگر
چوٹ لگتی ہے تو پھر ہوش میں آ جاتا ہوں

نبضِ کونین پر انگلی تو ذرا رکھنا عدم!
دُنیا اُلجھی ہے کہ میں آپ اُلجھا جاتا ہوں؟

اضداد کی آویزش، یہ فطرتِ دُنیا ہے
ساحل سے ہر اک طوفاں ٹکرا کے گذرتا ہے

جلوے کی حقیقت ہم، معلوم کریں کس سے
جو اہلِ نظر ہے وہ حیرانِ تماشا ہے

دیوانے گذشتہ اور آئندہ کو کیا جانیں
اس حال سے وابستہ، ماضی ہے نہ فردا ہے

دلدوز حقائق سے اچھے ہیں حسیں دھوکے
رنگین فریبوں میں تسکینِ تمنّا ہے

تقدیر، زبردستی ہے کاتبِ قدرت کی
تدبیر، بشر کا اک معقول تقاضا ہے

محویّت و سرشاری، مدہوشی و بے خبری
نادان تماشائی! تو آپ تماشا ہے

طغیانیٔ غم دل میں اور ضبطِ فغاں، توبہ!
نادان عدم! شاید جل بجھنے کا سودا ہے

ایک مکتوب

ـــ عزیز دوست کے نام:-

وہ دَورِ زیست کہ جس سے گذر رہا ہوں میں
وہ تجرباتِ دل افگن جو کر رہا ہوں میں

گِلا ہے۔ نطق و تکلّم ہیں آ نہیں سکتے
کہ لفظ بارِ معانی اُٹھا نہیں سکتے
بہت سی سادہ و معصوم و دلربا خوشیاں
ہزار دلکش و شاداب و بے بہا خوشیاں
ہوا تھا جس سے محبت کا افتتاح کبھی
تھی جن کے دم سے درخشاں مری ہر ایک گھڑی
گئی ہیں ایسی، کہ اُن کا نشاں نہیں ملتا
نشاطِ رفتہ کا رنگیں سماں نہیں ملتا

کسی نے شوق سے رودادِ آرزو بھی سُنی
مری فسردہ نگاہوں کی گفتگو بھی سُنی
سکوت کا وہ تکلّم، جو ہے زباں دِل کی
وہ خامشی جو ازل سے ہے ترجماں دِل کی
وہ التجائے نظر، جس کو عشق کہتے ہیں
وہ اشک، جن میں محبت کے درد رہتے ہیں
مشاہدہ کیا اُس نے تمام باتوں کا
مرے اُداس دنوں کا، خموش راتوں کا
اور اب بھی حال سے میرے، وہ ناشناس نہیں
نہیں، کہ اُس کو مرے دردِ دل کا پاس نہیں
ہے احترام مرے عشق کا اُسے دل سے
خدا و بندہ یہ دو جزو ہیں محبت کے
مگر بہ ایں ہمہ ربط و نیاز و صدق و صفا
ہمارے عشق کی رسوائیاں ہیں رنج فزا
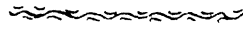
عزیز دوست! یہ دُنیا عجیب دُنیا ہے
کہ حق کو بھی یہاں بدنامیوں کا کھٹکا ہے
دلوں کو ملتے ہوئے کون دیکھتا ہے یہاں
گلوں کو کھلتے ہوئے کون دیکھتا ہے یہاں
وہ چیز جس کا خدا احترام کرتا ہے۔
زمانہ اس کا ہمیشہ سے نام دھرتا ہے

زمانہ مار چکا مجھ کو، کر چکا پامال
ہے سامنے، مگر، اپنی بقا کا اب تو سوال
دَبا ہوں جتنا، اَب اُتنا مجھے اُبھرنا ہے
جدید شان سے، تجدیدِ زیست کرنا ہے
کہوں گا اُس کو، علی الرغم اہلِ دہر، عدمؔ
زبانِ خلق کی مجھ کو نہیں ہے اب پروا
میں بے شعوریٔ دُنیا پہ مسکراؤں گا
کہ ہو کے دہر میں بدنام، جھوم جاؤں گا
جہاں کی عقل کا کیا دخل میرے کاموں میں
مرے حسین دنوں میں، لطیف شاموں میں
جنونِ عشق پہ میں ناز کر کے چھوڑوں گا
جہاں کو اَب نظر انداز کر کے چھوڑوں گا

عدمؔ

رباعیاتِ آسی

اک سمت نظر فریبیِ جرم و قصور
اک سمت شرابِ عشقِ حق کا سرور
یہ دامِ گرفتِ اہل یعنی دنیا
آسی ہمیں اک آگ میں پھانسنے کو ضرور

اس سے دورِ شباب کی رونق ہے
اس سے ہے لطافتوں کا چہرہ فق ہے
تو یہ کس منہ سے کر رہا ہے ظالم
تیرے اوپر گناہ کا بھی حق ہے

داماں نجاتِ عیش سیتا ہوں میں
مینا مجھے چاہیے کہ جیتا ہوں میں
اللہ رحیم اور شیطان رجیم
اچھا تو پھر اب شراب پیتا ہوں میں

انسان خودی کا اپنی کیا مالک ہے
ہر چیز کو اس کے اک بلا مالک ہے
بھیجا تھا لے کے خدا نے بندوں کی طرف
بندوں نے کہا کہ جا خدا مالک ہے

اس جود کو اور اس سخا کو دیکھا
اس لطف کو اور اس عطا کو دیکھا
جس کا بندہ نہیں بجز تیرے کوئی
دیکھا واعظ ترے خدا کو دیکھا

دل خوش ہو تو آہ بھی جگر سے نکلے
ہنستے ہوئے اشک چشمِ تر سے نکلے
پیتا ہے تو پی کے شب کو توبہ کر لے
سورج کیا جانے کل کدھر سے نکلے

نغمہ بھی حرام تو حسن خوانی بھی حرام
مے ہی نہیں مستیِ جوانی بھی حرام
اس جینے سے فائدہ ہی کیا ہے آسی
کہہ دے کوئی کاش زندگانی بھی حرام

سرگرمِ غرور و کبریا ہیں لاکھوں
انا کے دعویٰ کیا ہیں لاکھوں
آیا ہے عجیب یہ دور اُلٹا آسی
بندا نہیں ایک بھی خدا ہیں لاکھوں

بگڑے نہ غریب بادہ نوشوں کا بھی حال
اور حکم بھی ہو نہ واعظوں کے پامال
اب بھی جو حرام کرنے والے ہے کو
عقبیٰ میں حرام کر کے دنیا میں حلال

اے حضرتِ زاہد جلیل القاب
دیجئے مرے اک سوال کا مجھ کو جواب
دوزخ میں رہیں گے جب شرابی سارے
تو کون پئے گا جا کے جنت میں شراب

ہو جاتا ہوں پست جب ابھرتا ہوں میں
مغروریِ نفسِ بد سے ڈرتا ہوں میں
ہوتا ہے خلوصِ توبہ جس دن دل میں
اس روز گناہ ضرور کرتا ہوں میں

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

شمارہ ۲	فہرست مضامین اگست ۴۵ء	جلد ۴۸

ایڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۲۸	اگست ۳۵ء	شمار ۲

ملاحظات

افسانۂ روح و روحانیت

انسان کی زندگی اس میں شک نہیں کہ بہت سے معتقدات و مزعومات سے گھری ہوئی ہے، اور ہر عقیدہ کیلئے وہ کوئی نہ کوئی دلیل بھی ضرور رکھتا ہے، لیکن اگر اُن دلایل کی قوت پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ سب سے زیادہ کمزور دلیل وہ ہے جو بقاء روح کے باب میں اس کی طرف سے پیش کی جاتی ہے۔ قبل اس کے کہ آپ اس دلیل کو سنیں یہ معلوم کر لینا مناسب ہے کہ بقاء روح کے معتقدین کہتے کیا ہیں۔

ان میں ایک جماعت تو کہتی ہے کہ صرف روح کو بقا ہے یعنی انسان میں جس چیز کو احساس تشخص، حافظہ اور تاثر سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ مرنے کے بعد بھی قائم رہیگا۔ دوسری جماعت جس میں زیادہ تر مذہبی لوگ شامل ہیں

روحیں پھر اپنے جسموں سے مل جائیں گی اور وہ تقریباً اسی قسم کی زندگی بسر کریں گی جیسی اس دنیا میں بسر کی ہے۔

حیات بعد الموت کا عقیدہ کوئی نیا عقیدہ نہیں ہے بلکہ یہ اتنا ہی قدیم ہے جتنی نوع انسانی ـــ اول اول جب انسان کی عقل بہت محدود تھی، تو وہ اپنے مردہ عزیزوں اور دوستوں کو خواب میں دیکھ کر سمجھتا تھا کہ یہ ضرور کسی نہ کسی حیثیت سے اب بھی موجود ہیں اور اُن کو اپنے پسماندگان کے ساتھ وہی تعلق باقی ہے جو ان کی زندگی میں پایا جاتا تھا اور یہیں سے یہ اعتقاد پیدا ہوا کہ روح اور جسم دو بالکل علحدہ علحدہ چیزیں ہیں اور جب روح جسم سے جدا ہو جاتی ہے تو اس کی ہستی کسی نہ کسی طرح قائم رہتی ہے چنانچہ اسی بنا پر ایک شخص کے مرنے کے بعد اس کی قبر پر کھانے پینے کی چیزیں رکھدی جاتی تھیں تاکہ اس کو حیات بعد الموت کے طویل سفر میں تشنگی و گرسنگی کی تکلیف نہ پہونچے (مسلمانوں میں مرنے کے بعد فاتحہ وغیرہ کی رسمیں سب اسی عہد وحشت اور اسی اعتقاد جاہلانہ کی یادگار ہیں)

خیر، اگر عہد قدیم کا جاہل انسان ایسا سمجھتا تھا تو جائے حیرت نہیں کیونکہ وہ غریب حیات کی حقیقت سے واقف ہی نہ تھا، لیکن اب کہ آغاز حیات کے اسباب سے ہر شخص واقف ہو گیا ہے روح کے بقا کا قائل ہونا سخت حیرتناک امر ہے۔

حیات حیوانی کی تمام ترقی یافتہ شکلوں کی بنیاد صرف ایک خلیہ یا کریا (Cell) ہے لیکن حقیقتاً حیات کا آغاز اس وقت ہوتا ہے جب اس کا پیوند دوسرے خلیہ سے ہو[1] اس پیوند کے بعد بیشمار خلایا بنتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ حیوانی صورت ظہور پذیر ہوتی ہے اور ایک وقت معینہ کے بعد وہ اس دنیا میں قدم رکھتا ہے۔ پھر حیات دنیاوی میں بھی بیشمار خلایا اس کے جسم میں پیدا اور فنا ہوتے رہتے ہیں یہاں تک کہ کسی بیماری یا حادثہ یا بڑھاپے کی وجہ سے خلایا کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے اور زندگی ختم ہو جاتی ہے۔

ظاہر ہے کہ اگر مناسب حالات کے ماتحت خلایا کا پیوند نہ ہو تو وجود حیات نہیں پایا جا سکتا یہ درست ہے کہ سب سے پہلا خلیہ جو حیات حیوانی کا باعث ہے خود جان رکھتا ہے، لیکن وہ حیات ایسی نہیں ہوتی جو کسی دوسرے خلیہ سے ملے بغیر ظاہر ہو سکے۔

عورت میں تقریباً دس ہزار پہلی قسم کے خلایا موجود رہتے ہیں اور مرد میں ارب در ارب (بلکہ بیشمار) خلایا دوسری قسم کے پائے جاتے ہیں، لیکن ان میں سے صرف چند خلایا کا پیوند ہو کر حیات رونما ہوتی ہے۔ پھر اگر ان غیر پیوند شدہ بیکار خلایا میں بھی روح کا وجود مانا جائے اور مرنے کے بعد حیات مابعد کی وہی صورت تسلیم کی جائے جو ان غیر تعلیم خیز

---

[1] نباتات میں عام طور پر کسی دوسرے خلیہ سے پیوند ہونے کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ ایک ہی خلیہ ترقی پا کر اور اپنے اندر سے [illegible] کر کے نشو و نما کا باعث ہوتا ہے۔

خلایا میں پائی جاتی ہے، تو میں نہیں سمجھ سکتا کہ ایسی حیات سے کیا فائدہ ہے اور کیوں اس کی تمنا کیجائے۔

اگر وہ چیز جس کا نام "روح" ہے جسم سے بالکل علٰحدہ کوئی شے ہے تو پھر لامحالہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کب کہاں اور کیونکر جسم کے اندر آگئی۔ جب انسانی وجود عبارت ہے دو بے روح خلایا کے اتصال سے، تو پھر روح انہیں کہاں سے آگئی۔ اس کا جواب دینا ہمارا فرض نہیں۔

آپ نے سُنا ہوگا کہ ایک جنین جس نے رحم مادر میں پوری پرورش پائی تھی اور جس میں جان پڑگئی تھی کسی صدمہ سے بالکل بیجان پیدا ہوا، لیکن بجلی اور دیگر آلات کی مدد سے اس میں جان پھر عود کر آئی اور وہ اپنی طبیعی زندگی پوری کرکے مرا، اسی طرح آپ نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ ایک شخص پانی میں ڈوب کر بالکل بیجان ہوگیا لیکن اس میں تنفس دوبارہ پیدا کردیا گیا۔ پھر اگر روح واقعی جسم سے بالکل علٰحدہ کوئی دوسری چیز ہے، تو بتایا جائے کہ اس مُردہ جنین اور اس غرق شدہ انسان میں اتنے عرصہ کے لئے روح کہاں چلی گئی تھی اور وہ کیوں ان تدابیر کا انتظار کر رہی تھی جو کو اگر اختیار نہ کی جاتیں تو پھر روح کے واپس آنے کا امکان نہ تھا۔

کہا جاتا ہے کہ محض حیات کا وجود، وجود روح کے لئے ضروری نہیں اور نہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جس چیز کو ہم جسم انسانی میں حیات سے تعبیر کرتے ہیں اسی کا دوسرا نام روح ہے، کیونکہ دیگر ذیحیات مخلوق اور انسان کے درمیان مابہ الامتیاز یہی امر ہے کہ انسان میں روح پائی جاتی ہے اور ان میں نہیں۔ ایک درخت میں "حیات" ہے لیکن روح نہیں، ایک جانور میں "زندگی" ہے لیکن روح نہیں۔ پھر یہ تو صحیح ہے کہ زندگی کا آغاز ایک خاص وقت سے شروع ہوتا ہے اور اس لئے اس کی انتہا بھی ہونی چاہئے، لیکن انسان کا حافظہ اور ادراک نفس مرنے کے بعد بھی قایم رہ سکتا ہے اور یہی وہ چیز ہے جسے روح کہتے ہیں۔

میں نہیں سمجھ سکتا کہ یہ دعوٰی کس حد تک درست ہے۔ انسان میں وجود روح کو تسلیم کرنا اور دیگر مخلوقات کو اس سے محروم سمجھنا ایک ایسی بات ہے جس پر کوئی دلیل پیش نہیں کیجا سکتی۔ اور کوئی وجہ نہیں کہ انسان کی طرح اور ذیحیات اشیاء میں بھی ادراک و حافظہ نہ پایا جائے، گھوڑے، کتے اور بلی کا برسوں کے بعد اپنے مالک کو پہچان لینا اس بات کا قوی ثبوت ہے کہ ان میں قوت حافظہ بھی پائی جاتی ہے اور ادراک بھی اور اگر تھوڑی دیر کے لئے مان لیا جائے کہ ادراک و حافظہ صرف انسان ہی کو میسر ہوا ہے تو پھر انسان کو اس وقت کی باتیں کیوں یاد نہیں رہتیں جب وہ رحم مادر میں تھا، یا جب دنیا میں آنے کے بعد اس نے گھٹنیوں چلنا سیکھا تھا، اسی طرح ضعیف ہونے کے بعد انسان کیوں اپنے شباب کی بہت سی باتیں بھول جاتا ہے۔ اس لئے قرین قیاس یہی ہے کہ مرنے کے بعد یہ حافظہ و ادراک بھی محو ہو جائے گا اور جس طرح پیدا ہونے سے پہلے عدم کی تاریکی تھی اسی طرح مرنے کے بعد طاری ہو جائے گی، نہ پہلے کچھ تھا، نہ بعد کو کچھ ہوگا۔

عہد قدیم میں جب انسان نہ اپنے جسم کی تعمیری حقیقت سے واقف تھا اور نہ کائنات کے اور مخلوقات کا اسے علم تھا، اس کا روحوں کے وجود کو جسم سے علحدہ سمجھنا ٹھیک تھا کیونکہ آسمانی جغرافیہ کی حقیقت اس کے نزدیک صرف یہ تھی کہ زمین کو آسمان گھیرے ہوئے ہے اور اس میں ستارے جڑے ہوئے ہیں، آسمان سے اوپر بہشت ہے جہاں سے فرشتے اوپر سے نیچے آتے جاتے رہتے ہیں۔ لیکن اب کہ مکان و زمان کا مفہوم بہت وسیع ہو گیا ہے اور ہماری دوربینوں نے کرۂ زمین سے بہت زیادہ عظیم المرتبت اجرام سماوی ہمارے سامنے پیش کر دئے ہیں، ہمارے لئے یہ باور کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ لامتناہی فضا کے ان بیشمار دنیاؤں میں، صرف کرۂ ارض ہی کے باشندوں کو کوئی خاص اہمیت حاصل ہے اور انھیں کی روحوں کو بقاء دوام کے خلعت سے سرفراز کیا گیا ہے۔ پھر اور کروں کو جانے دیجئے، خود اسی زمین کے اور تمام مخلوقات کو لیجئے۔ کیا وجہ ہے کہ انسان کی روح کو بقا حاصل ہو اور جانوروں کی روحیں فنا کر دی جائیں اور اگر اس کا جواب صرف مصلحت خداوندی ہو سکتا ہے تو کیا وہی رضاء الٰہی و مصلحت ربانی روح انسانی کو فنا نہیں کر سکتی۔ ایسا کرنے سے اُسے کون باز رکھ سکتا ہے اور اس میں کونسا استحالۂ عقلی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ مرنے کے بعد روح عالم برزخ میں رہتی ہے بعض کہتے ہیں کہ اسی وقت بہشت و دوزخ کی طرف لیجاتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ عالم برزخ یا بہشت و دوزخ ہیں کہاں؟ روح کا یہ سفر کس ذریعہ سے ہوتا ہے اور اپنی منزل تک پہونچنے کے بعد وہ کہاں اور کیونکر رہتی ہے۔ کہنے والے یہ بھی کہتے ہیں کہ وہاں عزیزوں اور دوستوں سے بھی ملاقات ہو گی، گویا کوئی جگہ ایسی ہے جہاں ان سب کا جمگھٹ ہو گا اور وہ اسی دنیا کی طرح آپسمیں تبادلۂ خیال کر سکیں گے۔ اب اسی اعتقاد کے ساتھ ان علمی حقایق کو بھی سامنے رکھئے کہ زمین اپنے محور پر نہایت تیزی سے گردش کر رہی ہے اور ۲۴ گھنٹہ میں پوری ایک گردش کر لیتی ہے یعنی فی گھنٹہ ایک ہزار میل کی رفتار سے وہ گھوم رہی ہے۔ اسی کے ساتھ اس کی دوسری گردش آفتاب کے گرد ہے جو تقریباً ۹ کروڑ ۳۰ لاکھ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہ گردش پورے ایک سال میں پوری ہوتی ہے یعنی فی منٹ ایک ہزار میل کی رفتار سے زیادہ زمین کو آفتاب کے گرد چکر لگانا پڑتا ہے۔ پھر یہ قصہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا بلکہ ایک اور تیسری گردش ہمارے نظام شمسی کی ہے جو قطب کے گرد ہوتی رہتی ہے اور چوتھی گردش نظام قطبی کی ہے جو خدا معلوم کتنے نظامہائے شمسی کے ساتھ فضاء کہکشاں میں کسی اور مرکز کے گرد چکر لگا رہی ہے۔ پھر کیا ان تمام چکروں اور گردشوں میں باشندگان کرۂ ارض کی روحوں کا جسم سے جدا ہو کر باہم گر ملنا یا کسی ایک جگہ قرار پانا باور کیا جا سکتا ہے۔

بعض نہایت سخت مذہبی قسم کے لوگ باور کرتے ہیں کہ انسان قیامت کے دن مع اپنے جسم کے اُٹھایا جائیگا اب سے دو ہزار سال قبل اہل فلسطین جب وہ نہ زمین کی حقیقت سے آگاہ تھے نہ کائنات کی وسعت سے، یقین کرتے تھے کہ زمین کی عمر چار ہزار سال کی ہے اور طوفان کے بعد دنیا کو بسے ہوئے صرف دو ہزار سال کا زمانہ گزرا

اور جلد ہی اس کو پھر تباہ ہو جاتا ہے۔ لیکن آج یہ امر پایۂ تحقیق کو پہونچگیا ہے کہ انسان کا وجود کرۂ زمین پر لاکھوں سال سے پایا جاتا ہے اور اس دوران میں دنیا خدا معلوم کتنی مرتبہ بدل چکی ہے کم از کم تین چار تو صرف برفیلے دور ایسے آچکے ہیں جنھوں نے زمین کی تمام انسانی آبادی کو یا تو سمندر میں ڈبوکر رکھدیا یا زمین کے اندر دفن کرکے ختم کر دیا۔ خدا جانے کتنی بار نوعِ انسانی جانوروں کی غذا بنکر ختم ہوئی اور پھر انھیں سے پیدا ہوئی۔ الغرض موجودہ انسان میں معلوم نہیں کتنے گزشتہ انسانوں اور جانوروں کے اجزا شامل ہیں اس لئے اگر حشرِ اجساد کو تسلیم کیا جائے تو وہ کونسا کیمیائی طریقہ ہوگا جو لکھوکھا سال قبل کے انسانوں کے تقسیم شدہ اجزا کو پھر فراہم کر سکے گا اور اگر میرا حشر ہوا تو کن کن جانوروں کن کن درختوں اور کن کن انسانوں سے میرے اجزا فراہم کرکے میرا اصلی جسم طیار کیا جائے گا۔

فطرت کے وہ تمام تغیرات جو انسانی ہیولی میں نشو و نما، بیماری، ضعیفی اور موت وغیرہ کی صورتیں اختیار کرتے رہتے ہیں بالکل ایسے ہی ہیں جیسے ہم ایک جلنے والے کوئلہ میں دیکھتے ہیں۔ آپ انگیٹھی میں کوئلہ ڈالدیتے ہیں اس کا کیا حشر ہوتا ہے ایک حصہ اس کا دھواں بنکر غائب ہو جاتا ہے، ایک حصہ حرارت میں تبدیل ہوکر آپ کے کمرہ کو گرم کرتا ہے اور کچھ حصہ راکھ بنجاتا ہے۔ بالکل یہی حالت انسان کی سمجھئے۔ فطرت ہر وقت جوڑنے، توڑنے، ملانے اور منتشر کرنے میں مصروف ہے اور قوت و مادہ کو وہ اسی طرح نئی نئی صورتوں میں تبدیل کرتی رہتی ہے۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ انسان جو اسی دنیا اسی نظام اور اسی مادہ سے متعلق ہے، اس عمل سے بچ رہے اگر انسان کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے آپ کو غیر فانی سمجھے، تو ایک چیونٹی بھی یہی دعویٰ کر سکتی ہے، ایک گھاس کا تنکا بھی یہی کہہ سکتا ہے۔ روح ہم میں بھی ہے اور اُن میں بھی اور اگر ہماری روح کو بقا ہے تو اُن کی روحوں کو بھی ہونا چاہئے۔

زندگی حقیقتاً نام ہے صرف اس توازن کا جو فطرت کی تعمیری و تخریبی دو متضاد قوتوں میں پایا جاتا ہے ــــ فطرت کی تعمیری قوت ہمیں قائم رکھنا چاہتی ہے اور تخریبی قوت مٹانے پر تُلی ہوئی ہے، جب تک ان دونوں میں توازن قائم ہے، ہم صحیح و توانا کہلاتے ہیں، لیکن جب رفتہ رفتہ تخریبی قوت غالب آنے لگتی ہے تو ہم ضعیف ہو جاتے ہیں، اور جب اس کا بالکل تصرف ہو جاتا ہے تو ہم مرجاتے ہیں، لیکن ہماری قوت کے بعد فطرت کا یہ عمل بند نہیں ہوتا بلکہ برابر جاری رہتا ہے، اور ہماری تخریب سے پھر تعمیر شروع ہونے لگتی ہے، خواہ وہ تعمیر کیڑوں کی ہو یا نباتات، وحیوانات کی۔ اس لئے اب پھر ہمارے انھیں اجزاء کا فراہم ہوکر یکجا ہونا اور اصلی صورت و شکل سے رونما ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا اور نہ اس کی کوئی ضرورت ہے۔

حشر و نشر یا بقاء روح کا عقیدہ صرف جذبۂ محبت کی بنا پر پیدا ہوا ہے جس سے مقصود اپنے آپ کو تسکین پہونچانا بھی تھا، اول اول جب انسان نے دیکھا کہ اس کے ماں باپ، اس کے بچے، اس کے بھائی بہن اسکے سردار و بزرگ دفعتہً مرجاتے ہیں تو اسے سخت صدمہ ہوا اور اسے کسی طرح یقین نہ آیا کہ یہ واقعی ہمیشہ کیلئے

فنا ہو گئے ہیں۔ اس کے بعد اس نے انھیں خواب میں بھی دیکھا، خواب میں ان سے باتیں بھی کیں اور اس سے اس کو اور زیادہ یقین ہو گیا کہ ان کی روحیں موجود ہیں اور ہم سے وہی تعلق محبت کا رکھتی ہیں۔ پھر یہ عقیدہ برابر اس وقت تک قائم رہا جب تک انسان نے حیات کی حقیقت کو نہیں جانا اور اب بھی انھیں قوموں میں باقی ہے جو اس حقیقت سے ناواقف ہیں یا ناواقف رہنا چاہتی ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ وہ لوگ جو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کیا فی الحقیقت انھیں اس کا یقین بھی ہے۔ ممکن ہے وہ اس کا اقرار کریں لیکن مجھے اس میں کلام ہے ــــ اس سے قبل نگار کے صفحات پر میں عقیدہ و یقین کا فرق بتا چکا ہوں اور ثابت کر چکا ہوں کہ تمام وہ عقاید جن کا تعلق ما بعد الموت سے ہے وہ سب مزعومات و قیاسات ہیں، حقیقت سے انھیں کوئی واسطہ نہیں۔ کیونکہ علم حقیقی کا تعلق صرف ہمارے حواس اور ہمارے ادراک سے ہے یا اُن تجربات سے جو بربنائے تواتر محسوسات کا حکم رکھتے ہیں ــــ اور یہاں ان دونوں میں سے کوئی بات نہیں۔

اچھا اس فلسفیانہ موشگافی کو جانے دیجئے۔ وہ لوگ جو حیات بعد الموت کے قایل ہیں اور حقیقی سکون و آرام کی زندگی اسی کو سمجھتے ہیں، اُن سے پوچھئے کہ باوجود اس علم کے کہ دنیاوی زندگی ناپایدار و مکلف ہے اور اُخروی زندگی ابدی راحت، وہ کیوں یہاں کی زندگی پر جان دیتے ہیں، جب بیمار پڑتے ہیں تو کیوں علاج کرتے ہیں، تپ دق اور سرطان میں مبتلا ہونے کے بعد انھیں موت کا یقین ہوتا ہے لیکن پھر بھی چارہ و علاج ضرور کرتے ہیں ــــ اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ انھیں اُخروی زندگی کا صرف اعتقاد ہے، یقین نہیں اگر انھیں یقین ہوتا تو وہ ایک لمحہ کے لئے اس دنیا میں رہنا پسند نہ کرتے اور جلد سے جلد اس عالم میں پہونچنے کی کوشش کرتے جہاں بہشت کی راحتیں ہیں، حوروں کی آغوشیں ہیں، بچھڑے ہوئے احباب ہیں، چھوٹے ہوئے اعزہ ہیں، جدا ہو جانے والی اولادیں ہیں اور وہ سب کچھ ہے جو یہاں میسر نہیں آسکتا۔

کہا جاتا ہے کہ مرنے سے ڈر اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کے گناہوں کی سزا وہاں ملیگی، میں کہتا ہوں کہ اس خیال میں بھی وہی اعتقاد کام کر رہا ہے جسے یقین سے کوئی واسطہ نہیں۔ کیونکہ اگر واقعی سزا کا یقین ہو تو قیامت تک کوئی گناہ سرزد نہیں ہو سکتا۔ اصل یہ ہے کہ مرنے کے بعد نہ معاصی کی سزا کا یقین ہے اور نہ نیکیوں کی جزا کا ورنہ ممکن نہیں کہ یہاں کسی سے کوئی گناہ سرزد ہو یا اس دنیا میں جیتے رہنے کی تمنا دل میں پائی جائے۔

وہ لوگ جو بقاء روح کے قایل ہیں وہ اپنے عقیدہ کے ثبوت میں امریکہ و مغرب کے اُن روحانئین کے بیان کو بھی پیش کرتے ہیں جنھوں نے روحوں سے ہمکلام ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ اس کی نسبت ہم اجمالاً پہلے بھی لکھ چکے ہیں کہ یہ دعوے بالکل جھوٹے ہیں، اور آیندہ ماہ کی اشاعت میں بتفصیل بیان کریں گے کہ ان مدعیان روح و روحانیت نے کس کس طرح لوگوں کو دھوکہ میں مبتلا کیا ہے اور جس چیز کو روحوں سے نامہ و پیام کرنا کہا جاتا ہے وہ کتنا بڑا مکر و فریب ہے۔

الغرض مسئلہ روح یا حیات بعد الموت منجملہ اُن چند مسایل کے ہے جو صرف انسانی تمنا کی پیداوار ہیں اور اُن عقاید سے متعلق ہیں جن کے لئے نہ صرف یہ کہ کوئی عقلی دلیل پیش نہیں کیجا سکتی بلکہ جو سراسر اصول فطرت و نظام عالم کے منافی ہیں۔ پس اگر مذاہب عالم کا انحصار صرف معاد یا حیات بعد الموت پر ہے جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے، تو اب کوئی امید نہیں کہ وہ عرصہ تک قایم رہ سکیں، کیونکہ جوں جوں مادی و علمی ترقی بڑھتی جا رہی ہے انسان میں خود اعتمادی کی کیفیت زیادہ پیدا ہوتی جاتی ہے اور وہ کسی بات کو محض اس دلیل پر ماننے کے لئے طیار نہیں ہو سکتا کہ اب سے پہلے کے لوگ ایسا کہہ گئے ہیں، لیکن اگر مذاہب کی زندگی کا تعلق کسی ایسے درس اخلاق سے بھی ہے جو اسی دنیا میں کام آنے والا ہے اور اسی عالم میں داعیات تمدن کو پورا کرنے والا ہے، تو ان کے لئے لازم ہے کہ وہ صرف اسی پرانی بنیاد قایم کریں اور اُن عقاید پر زور نہ دیں جو ان کی کمزوری کو ظاہر کرنے والے ہیں۔ لیکن چونکہ اس کی بظاہر کوئی امید نہیں ہے، اس لئے مذاہب عالم کا مستقبل بہت تاریک نظر آتا ہے اور ڈماکریسی و مشینری کی ترقی کے ساتھ ایک دن اس کو بالکل ختم ہو جانا ہے، کیونکہ اسوقت تک سب سے زیادہ دشمنی مذہب کے ساتھ انھیں دو چیزوں نے کی ہے اور ان کی ترقی کا کھلا ہوا نتیجہ مذاہب کا زوال ہے۔

مجموعۂ استفسار و جواب

اس کی ایک جلد سال گزشتہ شایع ہو چکی ہے۔ باقی حصہ کو دو جلدوں میں شایع کرنے کا خیال تھا، لیکن بعد کو میں نے سوچا کہ کیوں نہ ایک ہی جلد میں اس کو ختم کر دیا جائے، چنانچہ کام شروع کر دیا گیا اور ایک چوتھائی حصہ کتاب کا چھپ بھی گیا ہے ---- اب سوال یہ ہے کہ اس صورت میں قیمت چار روپیہ سے کسی طرح کم نہ ہوگی اور ممکن ہے کہ بیک وقت اتنی رقم دینا ناظرین نگار کو دشوار ہو جائے اس لئے میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ قارئین کرام باقی حصّہ کو دو روپیہ فی جلد کے حساب سے دو جلدوں میں لینا چاہتے ہیں یا چار روپیہ کے حساب سے ایک ہی جلد میں۔

منیجر نگار

پارسی اہل کتاب ہیں

حضرت زرتشت پیغمبر برحق اور نبی مرسل تھے

(مسلسل)

علمائے مغرب نے اکثر و بیشتر اپنی کتابوں میں اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ زرتشت نے کسی نئے دین یا نئے اُصول کی تعلیم نہیں دی اور زرتشتی عقیدہ کے مطابق بدی کی قوت خداوند عالم کے مدمقابل یا خدا کی حیثیت ہرگز نہیں رکھتی ہے[1]۔ پروفیسر فارنل لکھتے ہیں:۔ "ہمیں کسی جگہ سے بھی اس کا پتہ نہیں چلتا ہے کہ زرتشتی گروہ نے کسی وقت بھی اہرمن کا کسی صورت میں احترام کیا ہو بلکہ مزداپرستوں کے نزدیک اہرمن کی مخالفت اُصول مذہب میں داخل ہے[2]"

اسی طرح کتاب "تعالیم زرتشت" میں مرقوم ہے کہ[3] بدی کی قوت (اہرمن) حقیقت میں انسانی فطرت کے اُس رُخ کو کہتے ہیں جس سے خباثت اور بُرائی و بدکاری کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کا وجود بالذاتہٖ مطلقاً نہیں ہے۔

کیا مسلمانوں کا عقیدہ بھی فرشتوں اور شیاطین کے متعلق بالکل اسی قسم کا نہیں ہے[4]۔

کسقدر حیرت انگیز واقعہ ہے کہ عیسائی باوجود اپنی تثلیث[5] کے اہل کتاب باقی رہیں اور رکھے جائیں مگر زرتشتی خدا کی توحید پر ایمان رکھتے ہوئے بھی محض اسی بنا پر کافر کہلائیں کہ اُن کے پیغمبر یا اُن کی الہامی کتاب کے متعلق کوئی قطعی آیت قرآن مجید میں موجود نہیں ہے۔ ہمارے ناظرین کو شاید یہ گمان ہوسکتا ہے کہ عیسائیوں کی جماعت بعد کے زمانہ میں تثلیث کی قائل ہوئی اور اُن کا عقیدہ حضرت عیسیٰ کی الوہیت یا ابنیت کے متعلق حضرت محمد عربی صلعم کے

---

[1] تاریخ قدیم (کیمبرج سیریز) جلد اول صفحہ ۲۰۸ ـ [2] اوصاف خداوندی صفحہ ۱۶۳ ـ [3] دینیات زرتشتی (مولفہ دہالا) صفحہ ۳۰۔ [4] موعظۂ اسلام (مولفہ ارنلڈ) صفحہ ۲۰۸ ـ اسلام و دین زرتشت (مولفہ خواجہ کمال الدین) صفحہ ۸۸ ـ [5] تفصیلی بحث کے لئے "تثلیث کی اصلیت" (مطبوعہ کرسچین لائف پبلشنگ کمپنی لندن ۱۸۸۳ء) ملاحظہ فرمائیے۔

زمانۂ نبوت میں نہ تھا لہذا اس سلسلہ میں مناسب ہوگا کہ ہم خود قرآن سے اس بات کو ثابت کر دیں کہ عیسائی جیسے اسوقت ہیں ویسے ہی اُسوقت بھی تھے اور قرآن مجید نے صاف صاف کھلے الفاظ میں باوجود اُن کے عقیدۂ باطل کے اُنھیں اہلِ کتاب کہکر مخاطب کیا ہے - چنانچہ ارشاد ہوتا ہے :-

" اے اہلِ کتاب تمھیں چاہئے کہ اپنے مذہب کی حد سے باہر قدم نہ رکھو اور خدا کے خلاف کچھ نہ کہو بلکہ سچ بولو - مسیح ابن مریم تو خدا کے صرف رسول ہیں اور روح اللہ جو بحکم خدا مریم کے اندر داخل کی گئی تھی پس تم خدا اور اُس کے رسولوں پر ایمان لاؤ اور تثلیث کا ذکر چھوڑ دو کہ اسی میں تمھاری بہتری ہے - خدا تو بس ایک ہی ہے - اُس کی شان سے بعید ہے کہ کوئی اُس کا بیٹا ہو - جو کچھ دنیا میں ہے سب کچھ اُسی کا ہے اور وہی تمھارا سب سے بڑا محافظ ہے "

(سورۂ ۴ - آیتہ ۱۶۹)

بہرطور اب ضروری ہے کہ ہم اپنے اصلِ بحث کی طرف پھر رجوع کریں - پیغمبر ایران کو یقین کامل تھا کہ نیکی کو انجام کار بدی پر غلبہ حاصل ہوگا ورنہ خدا کے انصاف میں فرق آجائے گا - اسی طرح زرتشت کا عقیدہ تھا کہ ہماری آیندہ زندگی یعنی حیات بعد الموت ایک ایسا عالم ہوگا جہاں خدا اپنے نیک بندوں کو اُنکے اعمال کی جزا اور بروں کو اُن کے افعال کی سزا دیکر اپنے عدل و انصاف کا بہترین مظاہرہ فرمائے گا - ظاہر ہے کہ یہ ایسی ہی تعلیم کا نتیجہ تھا جو آج بھی زرتشت کے ماننے والے خدا کے آخری انصاف کو مدنظر رکھکر نیکی کی زندگی بسر کرنے کی کوشش میں مصروف اور بُری راہ سے محفوظ رہنے کی سعی کرتے ہیں [1]

دیگر الہامی مذاہب کی طرح زرتشتی بھی فرشتوں پر ایمان رکھتے ہیں [2] - اگرچہ اس سلسلہ میں اُن کا اعتقاد غلو کی حد تک پہونچ گیا ہے - ہم ڈاکٹر مولٹن ایک مغربی عالم کا خیال اس خصوص میں نقل کرنا مناسب سمجھتے ہیں جو خالی از دلچسپی نہیں [3] وہ فرماتے ہیں :-

" مذہب اوستا میں توحید کے متعلق جو کچھ عقیدہ ہے وہ ایک حد تک عیسائیوں کے خیال سے ملتا جلتا نظر آتا ہے یعنی "رومن کیتھلک" اور "گریک ارتھوڈوکس" فرقے بھی پارسیوں جیسا عقیدہ رکھتے ہیں - توحید اگرچہ اپنی جگہ پر قائم ہے مگر خدا کے ماتحت فرشتوں کے متعلق ایسے الفاظ استعمال کئے گئے جن سے لوگوں کو غلط فہمی ہوتی ہے اور وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ اُمور خداوندی میں ملائکہ کی بھی شرکت ہے، حالانکہ واقعہ ایسا نہیں بلکہ جس طرح ہلوگ دنیا وی

---

[1] اسلام اور توحید مولفۂ خواجہ غلام حسین مطبوعہ حیدر آباد ملاحظہ ہو - [2] یسنا - باب ۳۰ - آیتہ ۹ باب ۳۱ - آیتہ ۴ - اسکے ساتھ ہی مشہور جرمن مستشرق الکزنڈر کوہٹ کی معرکۃ الآرا تصنیف "فرشتوں اور شیطانوں کا مسئلہ مذہب یہود میں" جہاں وہ اس عقیدہ پر پارسی خیال کی روشنی میں تفصیلی بحث کرتے ہیں ملاحظہ فرمائیے - [3] گنجینۂ معاں صفحہ ۱۰۰ -

معاملوں میں حکومتِ اعلیٰ کو براہ راست مخاطب نہ کرکے ماتحت حکام سے چارہ جوئی کرتے ہیں اُسی طرح پارسی بھی (مثالاً) جب عقل و فراست کا خواستگار ہوتا ہے تو فرشتہ ہوما کا نام لیتا اور فتح و ظفر کے سلسلہ میں ویریتھاگوما کو یاد کرتا ہے دراںحالیکہ اُس کا اصلی مخاطب اہورامزدا ہی کی ذات ہوتی ہے اور ان ملائکہ کو وہ محض ذریعہ اور واسطہ سمجھتا ہے۔"

یہاں اس بات کو بھی ملحوظ رکھنا چاہئے کہ پارسیوں کی مذہبی تاریخ طرح طرح کے انقلابات کا شکار رہی ہے۔ اور اس بنا پر مذکورۂ بالا بدعقیدگی کچھ زیادہ حیرت انگیز نہیں۔ یونانیوں نے جسوقت ایران فتح کیا پائے تخت استخر کی تباہی کے ساتھ جیسا کہ قبل میں ذکر کیا جا چکا ہے زرتشتی ادبیات بھی کلیتہً برباد ہوئیں اور صدیوں بعد تک بزمانۂ تسلطِ یونانی ایرانیوں کا مذہب سخت خطرہ میں رہا[1]۔ عوام کے مذہبی معلومات کا دارومدار محض علمائے مجوس کی ذات پر منحصر تھا جنھوں نے صرف اپنی یادداشت سے کام لیکر ساسانیوں کے زمانہ میں اپنی دینی کتابیں کسیقدر ترتیب دیں۔ ظاہر ہے کہ اصل اور نقل میں زمانہ کے ردو بدل اور خیالات کے اختلاف کی بنا پر کسقدر فرق پیدا ہو سکتا ہے چنانچہ غیر شرعی رسومات اور عقاید کی بنیاد دراصل ساسانیوں کے زمانہ میں پڑی اور آج خود بہتیرے پارسی حضرات انکو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں[2] پھر بھی باوجود اس کے کہ پارسی آگ کے احترام میں مبالغہ کو راہ دیتے ہیں۔ آفتاب کے رُخ کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر عبادت کرتے ہیں۔ اور خدا کا تقرب حاصل کرنے کے لئے فرشتوں کا توسط ڈھونڈتے ہیں تاہم اُن کے ارکانِ دین اور اُصولِ مذہب میں ان ہزاروں سال کے بعد بھی کسی طرح کا فرق نظر نہیں آئے گا۔ اپنی شریعت کے آج بھی وہ پابند اور پاکبازی و نیک عملی کے اسوقت بھی وہ قایل ہیں۔ زرتشت کے تین مشہور اُصول نیک خیال۔ نیک اقوال اور نیک افعال۔ کی پیروی آج بھی اُن کی جماعت مستعدی سے کر رہی ہے[3]۔ اور پروفیسر مولٹن کے قول کے مطابق حقیقت میں یہ نتیجہ ہے اوستا کی اُس تعلیم کا کہ ہر شخص اپنے اعمال کے مطابق انجام کار جزا و سزا پائے گا۔ اگر نیک اعمال کا پلہ بھاری ہوگا تو انعام کا مستحق سمجھا جائے گا اور بُرے کاموں کی سزا بھگتنی پڑے گی[4]۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ صداقت۔ ایمانداری۔ پاکبازی۔ اخلاص۔ دریا دلی۔ اور غربا پروری و ہمدردی میں اس مخصوص قوم کو دیگر اقوامِ عالم پر عجب طرح کی فوقیت حاصل رہی ہے اُن کی ایک مذہبی کتاب میں مرقوم ہے کہ وہی شخص متقی کہا جا سکتا ہے جو اپنے دنیاوی کاروبار میں نہ محض یہ کہ سچا اور ایماندارانہ رویہ اختیار کرتا ہے بلکہ محتاجوں

---

[1] رالنسن مشہور انگریز مورخ کی تصنیف "ساتویں عظیم الشان سلطنت" صفحہ ۵۸ - ۵۵ دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ یونانی (پارتھی) دورِ حکومت کے اختتام پر کس طرح شاپور اردشیر بانیِ خاندان ساسانی نے مجوسی علماء کے ذریعہ مذہبی کتابوں کی تدوین کی جو اسوقت تقریباً ناپید ہو چکی تھیں۔ [2] گنجینۂ مغاں (مولفۂ مولٹن) اور دینیاتِ زرتشتی (مولفہ دہالا) — [3] تصنیفات ڈاکٹر دہالا۔ پروفیسر جیکسن اور ڈاکٹر مولٹن ملاحظہ فرمائیے — [4] گنجینۂ مغاں صفحہ ۱۷۹۔

پر روپیہ خرچ کرتا اور اپنے عزیزو اقارب سے نیک برتاؤ لازم جانتا ہے۔ محنت و مشقت کرتا اور اپنے گھر کو آتش اور مویشی سے رونق دیتا ہے۔ اسی طرح کیشِ زرتشتی عورتوں کے لئے عصمت نفس اور اطاعت شوہر اُنکا بہترین وصف قرار دیتا اور مردوں کو عورتوں کے ساتھ عمدہ برتاؤ کرنے کی تاکید کرتا ہے۔ چنانچہ اس تعلیم کا نتیجہ بھی ظاہر ہے کہ آج پارسی قوم کے زن و مرد باوجود اس کے کہ زمانہ اس قدر ترقی کر چکا ہے خوش و خرم زندگی بسر کرتے اور خانگی جھگڑوں سے ایک حد تک بچے رہتے ہیں۔ بداطواری اور طلاق اس جماعت میں مفقود ہیں۔ لارڈ ایمپتھل نے (جو کسی زمانہ میں مدراس کے گورنر تھے) ایک بار فرمایا تھا کہ "پارسیوں کے اندر اُن کے آبا و اجداد کے مفتخر جذبات کی پابندی ایک حد تک کامیابی کے ساتھ نظر آتی ہے۔ اُنھوں نے ابتک مکروہ پیشوں کے اختیار کرنے سے اپنے تئیں بچائے رکھا ہے۔ یہ اُنھیں کی زندگی کا عدیم المثال واقعہ ہے کہ اُن کی جماعت کی کسی عورت نے آج تک "کسب" سے روزی حاصل نہیں کی"[له]۔ اسی طرح دائرۃ المعارف دین و اخلاق میں ایک مغربی عالم یوں رقمطراز ہے[۵۲]۔ "یہ فخر امتیاز پارسیوں ہی کو حاصل ہے کہ اُن کی عورتوں میں مشکل سے کوئی ایسی ملیگی جو آوارگی اور بدچلنی کی شکار ہوئی ہو"۔

خواجہ کمال الدین مرحوم نے خوب فرمایا ہے کہ پارسیوں کا شمار اُن برگزیدہ اقوام میں کیا جاسکتا ہے جن کے پیش نظر زندگی کے عمدہ اور پسندیدہ اُصول ہوں[۵۳]۔ اور بلاشبہ حضرت زرتشت کے تعلیمات کا باوجود اسقدر عرصۂ دراز گزر جانے اور زمانہ میں گوناگوں انقلاب ہوجانے کے اپنی اصلی حالت میں نہ محض اُصولاً بلکہ عملاً بھی قائم اور باقی رہجانا ہی اُن کی بزرگی اور بلند نظری کی بہت بڑی دلیل ہے۔ آج ہمدردیٔ بنی نوع انسان کے سلسلہ میں پارسیوں کا مقابلہ کون کرسکتا ہے جو اپنے لاکھوں روپئے ہر سال محض خیرات خانوں۔ مدرسوں۔ یتیم خانوں۔ شفاخانوں اور مسافرخانوں وغیرہ کی تعمیر میں نہ صرف ہندوستان میں بلکہ بیرونی ممالک میں بھی بے دریغ خرچ کرتے اور عوام الناس کو بلا امتیاز مذہب و ملت آرام و آسائش پہونچاتے ہیں۔

اپنے اصل موضوع سے الگ ہوکر ہم ذرا دوسری طرف متوجہ ہوتے اور ناظرین کی دلچسپی کے لئے تاریخ عالم کے ایک اہم باب سے بحث کرتے ہیں۔ دارائے اعظم شاہنشاہ ایران قدیم کے متعلق اکثر و بیشتر مورخین کا خیال ہے کہ اُس نے زرتشت کی وفات کے بعد مذہب کی ترویج و ترقی میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ اس دارائے اعظم کا ذکر قرآن مجید اور دیگر صحفِ آسمانی میں بھی پایا جاتا ہے۔ قرآن میں

[له] لارڈ موصوف نے اپنی ایک تقریر میں بمقام لندن مارچ ۱۹۰۸ء میں اس خیال کا اظہار فرمایا تھا اور جسے مسٹر مانکجی کوپر نے اپنی کتاب "حلم در دین زرتشت" میں نقل کیا ہے۔ [۵۲] جلد نہم صفحہ ۴۴۰۔ [۵۳] اسلام و دین زرتشت صفحہ ۱۱۔

ذوالقرنین (دو سینگ والے) کا ذکر آتا ہے[1]۔ کہ خدا نے اُنھیں ہر چیز پر قادر کیا تھا اور اُنھوں نے شمال اور مشرق و مغرب کے دور دراز مقامات کا سفر کر کے بے گناہ اور مظلوم قوموں کو ظالموں کے پنجہ سے رہائی دی تھی۔ بعض مقامات جہاں اُن کا گزر ہوا بحر اسود اور درمیان "دو کوہ" کے قرب وجوار میں بتائے جاتے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ دو وحشی اقوام (یاجوج وماجوج) سے محفوظ رہنے کی غرض سے اُنھوں نے مذکورہٗ بالا دو پہاڑوں کے درمیان ایک "سد" تعمیر کیا تھا (جسے لوگ غلطی سے سد سکندری بھی کہتے ہیں اور اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ذوالقرنین کو لوگوں نے سکندر یونانی سمجھا)۔ یہ باتیں انجیل مقدس میں بھی "دانیال کے خواب" میں مذکور ہیں[2] لیکن وہاں اس "سینگ دار بھیڑ" (میش) کی تشریح بھی کر دی گئی ہے کہ وہ بادشاہ میڈیا اور فارس تھا[3]۔ ظاہر ہے کہ یہ بادشاہ سوائے دارائے اول کے کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا کیونکہ اُس کا زمانہ ۴۸۵-۵۲۱ سال قبل مسیح گزرا ہے اور "دائرۃ المعارف یہودیان" کے مطابق اسی دارا نے ایرانی سلطنت کو پایدار بنا کر آرمینیا، کوہ قاف، ترکستان اور وسطِ ایشیا کو اپنے قبضہ واختیار میں لایا تھا[4]۔ انجیل میں اس بادشاہِ اعظم کے متعلق ذکر ہے کہ اُس نے اپنے اخراجات سے یہودیوں کا معبد تعمیر کیا[5] اور اُن کے ساتھ نہایت دریا دلی کو راہ دیا[6]۔ اسی طرح دارا کے اجداد میں سروش اعظم (سائرس) بھی یہودیوں کے ساتھ رواداری اور رحم وکرم کے لئے معروف گزرا ہے[7]۔ اُس کا دور ۵۲۹-۵۴۹ سال قبل پیدائش مسیح تھا اور عہدِ عتیق کے تذکروں میں سروش کو بھی "خدا کا چرواہا"[8] "برگزیدہٗ باری"[9] اور "نجات دہندہ بنی اسرائیل"[10] کے معزز القاب سے یاد کیا گیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ خدائے بزرگ و برتر نے اُسے کفار کی سرکوبی کے لئے قوت عطا فرمائی تھی[11] اور وہ یہوآ کا سچا پیرو اور ماننے والا تھا[12]۔ چنانچہ اسی بنا پر ڈاکٹر ہاگ رقمطراز ہیں کہ جن مہذب ومعزز القاب سے سروش کو جو دینِ زرتشتی کا پابند تھا انجیل مقدس میں یاد کیا گیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ کیشِ زرتشت اصلاً یہودیت سے زیادہ مختلف نہیں۔ اور یہ حقیقت کہ سروشِ اعظم بُت پرستی سے علٰحدہ تھا نہ محض پارسیوں کی مذہبی ادبیات سے ظاہر ہوتی ہے بلکہ ہیروڈوٹس جیسے معروف یونانی مورخ کے بیان سے بھی اس کی پوری تصدیق ہوتی ہے[13]۔ دارائے اعظم کے متعلق دائرۃ المعارف برطانیہ[14] میں مرقوم ہے کہ اُنھے ایرانی سلطنت

۱؎ سورۃ ۱۸۔ آیۃ ۹۸-۸۳۔ ۲؎ دانیال۔ باب ۸۔ آیۃ ۲۰ و ۲۲۔ ۳؎ جلد چہارم۔ ص۴۴۱۔ ذونوفون کی تالیف سائیروپیدیا بھی ملاحظہ فرمائیے۔ ۴؎ دائرۃ المعارف یہودیان۔ جلد چہارم ص۴۴۲۔ ۵؎ عذرا۔ باب ۴۔ آیۃ ۵۔ زکریا۔ باب یکم۔ ۶؎ لغات الانجیل جلد یکم۔ ص۴۱۵۔ ۷؎ الشعیا۔ باب ۴۵۔ آیۃ ۲۸۔ ۸؎ الشعیا۔ باب ۴۵۔ آیۃ ۱۔ ۹؎ دائرۃ المعارفۃ الانجیل۔ جلد یکم۔ ۱۰؎ کتاب الاشعیا۔ باب ۴۵۔ آیۃ یکم۔ ۱۱؎ دائرۃ المعارفۃ الانجیل۔ جلد یکم۔ ۱۲؎ مقالات ہاگ صفحہ ۴ و ۵۔ ۱۳؎ جلد ششم صفحہ ۸۲۵ (طبع نہم)

کے حدود کوہ قاف اور آرمینیا تک بڑھا کر وحشی اقوام کو اُن اطراف میں زیر کیا تھا۔ پھر اسی بادشاہ کے بارے میں مستند تواریخ سے اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ اُس نے دین زرتشتی کو استوار اور پایدار بنایا۔ پھر یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دارا نے بنی اسرائیل کے خدا کی پرستش میں اپنی زندگی گزاری[۱]۔ کیا ان باتوں کے بعد بھی دین زرتشتی کے مذہب الٰہی ہونے میں کسی طرح کے شبہ کی گنجایش باقی رہتی ہے۔

ملا باقر مجلسی ایک مشہور و معروف شیعی عالم اپنی کتاب حیات القلوب میں تحریر فرماتے ہیں[۲] کہ کسی شخص نے حضرت علی سے ذوالقرنین کے متعلق دریافت حال کیا آپ نے فرمایا کہ اُن کا نام ایاش تھا اور وہ خدا کے ایک برگزیدہ بندے تھے[۳]۔ پھر اسی کتاب میں ایک دوسرے مقام پر امام جعفر صادق کا قول نقل ہے کہ خدا نے ذوالقرنین کو اُنکی قوم پر حکمران بنا کر بھیجا اور مشرق و مغرب کی پوری دنیا اُن کے ماتحت فرمائی۔ اور جب وہ یاجوج و ماجوج نامی وحشی اقوام کے نزدیک پہنچے تو اپنی قوم کی حفاظت کے لئے درمیان میں ایک دیوار تعمیر کر دی۔

یہاں پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بحر اسود اور مذکورہ بالا "دیوار" پر تاریخی نظر ڈالی جائے اور انجیل مقدس کے بیان کو قرآن مجید کی روشنی میں پڑھا جائے۔ انجیل میں یاجوج و ماجوج کو وحشی اقوام بتایا گیا ہے جو انتہائے شمال اور شمالی و مشرقی ممالک میں جاگزیں تھیں[۴]۔ دائرۃ المعارف یہودیان میں اُنھیں اسکاتھین اقوام میں شمار کیا گیا ہے جو کوہ قاف اور بحر خضر کے قریب بستی تھیں اور اس کی تصدیق دائرۃ المعارف برطانیہ سے بھی ہوتی ہے[۵]۔ قرآن شریف میں جس بحر اسود کا ذکر ہے وہ یہی موجودہ زمانہ کا بحر اسود ہے کیونکہ زمانۂ قدیم میں یہی اُن وحشی اقوام کا مسکن تھا جو اسکاتھین کے نام سے مشہور تھیں۔ تفسیر جلالین میں یاجوج و ماجوج کو شمالی ایران کی دو وحشی قومیں بتایا ہے اور "دیوار" کی تاویل ترکستانی پہاڑوں سے کی گئی ہے۔ تفسیر بیضاوی میں دو "دیواروں" سے آرمینیا اور آذربائجان کے دو پہاڑ مراد لئے گئے ہیں[۷]۔ تقریباً کل مسلمان مصنفین کی اس غلط فہمی کے سبب کہ ذوالقرنین اُنکے خیال میں سکندر یونانی تھا مذکورۂ بالا سد جو درحقیقت دارائے اعظم کا تعمیر کردہ تھا سدِ سکندری مشہور ہو کر رہ گیا۔ حالانکہ مستند تواریخ سے اس کا پتہ چلتا ہے کہ دارائے اول شاہنشاہ ایران ہی نے آرمینیا اور آذربائجان کے درمیان سکونت رکھنے والی اقوام کو وحشی اسکاتھین کے ظلم سے ۵۱۲ھ قبل مسیح میں نجات دلائی تھی۔ دارا کے مشہور

---

[۱] دائرۃ المعارف برطانیہ جلد ۱ صفحہ ۸۲۵ - دائرۃ المعارف یہودیان جلد ۴ صفحہ ۱۴۴ - دائرۃ المعارفۃ الانجیل جلد یکم - [۲] جلد اول نسخہ خطی (بانکی پور پٹنہ کتبخانہ) ص۹۷ - [۳] داریوش (دارا) اور ایاش میں شباہت لفظی بھی دلچسپ نظر آتی ہے - [۴] حزقیل - باب ۳۸ آیتہ ۲ - یوحنا - باب ۲۰ - آیتہ ۸ - تاریخ ایام - باب یکم - آیتہ ۵ - [۵] دائرۃ المعارف یہودیان جلد ۶ - ص۱۹ - [۶] جلد دہم ص۲۳۹ (طبع نہم)
[۷] تیسر القاری فی شرح صحیح بخاری - (باب ذوالقرنین) جلد سوم بھی ملاحظہ فرمایئے۔

عالم کتبوں سے بھی اس کا حال معلوم ہوتا ہے کہ وہ زرتشت کے مذہب کا سختی کے ساتھ پابند تھا اور محض اسی بنا پر اُسنے موحد یہودیوں کے ساتھ ہمیشہ رواداری کا برتاؤ جاری رکھا[۱]۔

بہرکیف اب ہم دوبارہ اپنے اصلی موضوع کی طرف رجوع کرتے ہیں اور قرآنی تعلیم اور عقاید زرتشتی کے مقابلہ کے بعد اس حقیقت کے اظہار میں ذرا بھی تامل نہیں کر سکتے کہ پارسی اپنے مذہبی خیال میں اسلام اور اسکے اُصول سے مخالفت نہیں رکھتے۔ "خدا نے صحیح اور غلط راستوں کی تمیز بہت آسان کردی ہے۔ جو شخص بھی خدا پر ایمان لایا اور شیطان سے متنفر ہوا اُس نے یقیناً ایسی مضبوط رسّی پکڑی جو ہرگز کبھی ٹوٹنے والی نہیں[۲]"، پارسی خدا سے محبت اور شیطان سے نفرت پر اس درجہ غلو سے کام لیتے ہیں کہ عوام الناس نے اُنکو دو خداؤں کا پرستار تک سمجھنے میں دریغ نہ کیا۔

ڈاکٹر ہاگ فرماتے ہیں کہ زرتشتی اُصول اور عیسائی و موسائی تعلیمات میں اکثر و بیشتر حیرت انگیز یگانگت پائی جاتی ہے۔ مثالاً اُسی ذات کو لیجئے جو کل بُرائیوں اور بدکاریوں کی باعث سمجھی جاتی ہے یا پھر عقیدۂ حیات بعد الموت پر غور کیجئے۔ یہ چیزیں ہر سہ مذاہب میں بالکل یکساں خیال کے ماتحت نظر آتے ہیں[۳]۔

بالکل اسی طرح دین محمدی میں بھی بہت سی باتیں پارسی عقاید سے ملتی جُلتی معلوم ہوتی ہیں۔ زرتشتیوں نے جس پاکبازانہ زندگی کا عملاً ثبوت دیا ہے اُس سے اُن کے پیغمبر کی اعلیٰ و ارفع تعلیم کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے اور یقیناً یہی طرز معاشرت باعثِ نجات اُخروی ہے۔ "یحقیق کہ اللہ اُن ہی لوگوں کو جو ایمان رکھتے اور اعمال صالح کرتے اُس باغ میں داخل فرمائے گا جس کے نیچے دریا بہتے ہیں[۴]"۔

حیات بعد الممات کے متعلق جسٹس سید امیر علی مرحوم اپنی مشہور تصنیف "روح الاسلام" میں تحریر فرماتے ہیں کہ اس طرح کا عقیدہ درحقیقت یہودیوں کے یہاں اوائل میں مطلق رائج نہ تھا بلکہ جب یہودی اور زرتشتی دونوں اقوام یکجا ہوئے (غالباً سرؔدش اعظم اور داراے اول کے زمانہ میں) تو آپس کے میل جول سے یہ خیال بھی اُنکے درمیان پھیلا۔ اسی طرح مرحوم شمس العلماء جمشید جی جیونجی مودی نے بھی علمائے مغرب کی سند سے یہ بات ثابت کردی ہے کہ عیسائی اور یہودی جو ملائکہ اور شیاطین کے متعلق عقیدہ رکھتے ہیں وہ حقیقتاً نتیجہ ہے ژند اوستا کی قدیم و جدید تعلیمات کا[۵]۔

---

۱ دائرۃ المعارف برطانیہ۔ جلد ششم صفحہ ۲۵ ۴۔ دائرۃ المعارف یہودیان جلد چہارم۔ اور دائرۃ المعارف الانجیل جلد اول۔ کتاب لغات الانجیل جلد اول صفحہ ۵۵۸۔ ۲ قرآن سورۃ دوم۔ آیۃ ۲۵۶۔ ۳ مقالات صفحہ ۵۔ ۴ قرآن سورۃ ۲۲ آیۃ ۲۳۔ ۵ مضمون "معرفت انسان"۔ (مقالات مودی صفحہ ۱۹۰۔ ۱۷۳)۔

ہم غالباً بتا چکے ہیں کہ زرتشتی گروہ مسلمانوں کی طرح یہ عقیدہ بھی رکھتا ہے کہ جب خدائی مخلوق عالم ہیجان و انتشار میں ہوتی ہے تو خدا اُن کی ہدایت کے لئے اپنا کوئی نبی یا رہبر بھیجتا ہے۔ دنیا کے آخری دور میں جو ہادی بنکر آئیگا، اُس کا نام سوشیانس ہوگا اور اُسی کے بعد پھر قیامت رونما ہوگی۔ یہ عقیدہ مسلمانوں کے مہدی یا مسیح موعود سے ملتا جلتا ہے[1]۔

اوستائے مقدس کے سب سے قدیم حصّہ گاتھا میں دو طرح کی دُنیا کا ذکر ہے۔ ایک تو ہماری موجودہ زندگی والی دُنیا اور دوسرے وہ جس کا دور مرنے کے بعد شروع ہوتا ہے یعنی آخرت کا عالم[2]۔ جہاں ہمارے اچھے اور بُرے اعمال کی سزا ملے گی[3]۔ موت کے بعد دو فرشتے جو انسان کے نیک و بد افعال کا حساب لکھتے ہیں روح کو اُس عالم میں پہونچا دیں گے۔ مسلمانوں میں بھی کراماً کاتبین کے متعلق قریب قریب یہی عقیدہ ہے[4]۔ اچھائی اور بُرائی جب میزانِ انصاف میں تل جائے گی تو ارواحِ انسانی کو پُل چینات پر سے گزرنا ہوگا[5]۔ جو نیک بندے ہیں اُن کی اعانت خود پیغمبر زرتشت فرمائیں گے اور وہ بہ آسانی پُل سے گزر کر نجات ابدی پالیں گے[6]۔ بدکاروں اور بدعقیدہ لوگوں کو چینات کی باریکی اور تلوار کی دھار جیسی تیزی سے زحمتِ شدید پہونچے گی اور وہ پُل پر سے گزر نہ سکیں گے بلکہ گر کر ہمیشہ کے لئے قعرِ مذلت میں رہ جائیں گے[7]۔ اسلام میں بھی صراط کے متعلق تقریباً یہی خیال ہے۔ جنت ایک ایسی جگہ ہے جہاں سکون و آرام کے سوا پریشانی و غم کا نام نہیں[8]۔ جہنم وہ مقام ہے جہاں فقط بے چینی اور غم و الم ہی کا عالم طاری ہے[9]۔ اگر کسی نیکوکار کافر کے بُرے اعمال نہایت کم درجہ پر ہونگے تو اُسے جہنم میں نہ ڈالا جائے گا بلکہ ایک درمیانی مقام بہشت و دوزخ کے بیچ اُس کا مسکن ہوگا[10]۔ اُسی طرح وہ لوگ بھی (یعنی ایماندار) جن کے نیک و بد اعمال برابر درجے کے ہوں گے بہشت میں داخل نہ کئے جائیں گے بلکہ وہاں سے علیحدہ ایک دوسری جگہ اُنھیں عطا کی جائے گی[11]۔ مذکورۂ بالا خیال قرآن کے "اعراف" سے ایک حد تک ملتا ہوا نظر آتا ہے[11]۔

---

[1] دینکرد۔ جلد اول۔ صفحہ ۲۹۔ (ترجمہ پشوتن سنجانا)۔ جلد چہارم صفحہ ۲۴۴۔ جلد ششم صفحہ ۳۷۹۔ قرآن سورۂ ۱۶۔ آیۃ ۳۶۔ روح الاسلام (مؤلفہ سید امیر علی) وغیرہ وغیرہ۔ [2] یسنا۔ باب ۲۸۔ آیۃ ۲۔ باب ۴۳۔ آیۃ ۳۔ [3] یسنا۔ باب ۳۰ آیۃ ۱۰۔ باب ۴۵۔ آیۃ ۷۔ مینوخِرد۔ باب ۲۱۔ آیۃ ۱۰۔ [4] قرآن سورہ ۸۲۔ آیۃ ۱۲-۱۰۔ [5] یسنا باب ۱۲۔ آیۃ ۱۴۔ بُندہشن۔ باب ۱۲۔ آیۃ ۷۔ [6] یسنا باب ۴۶۔ آیۃ ۱۰۔ [7] یسنا۔ باب ۵۱۔ آیۃ ۱۲۔ مینوخِرد۔ باب ۲۔ آیۃ ۱۲۳۔ [8] یسنا۔ باب ۱۱۔ آیۃ ۱۰۔ وِسپرد۔ باب ۴۔ آیۃ ۱۔ [9] یسنا باب ۳۱۔ آیۃ ۴۔ دادستانِ دینیک۔ باب ۲۷۔ آیۃ ۵-۲۔ [10] شایست ولایست۔ باب ۶۔ آیت ۲۔ [11] یسنا۔ باب ۴۸۔ آیۃ ۴۔ سورۃ الاعراف ملاحظہ فرمائیے۔

مسلمانوں کی طرح زرتشتیوں کا بھی خیال ہے کہ آخرت میں بداعمالی کی سزا دائمی نہ ہوگی بلکہ ہر شخص ایک وقت معین تک اپنی بُرائیوں کی سزا بھگت کر ابدی آرام و سکون کے مقام پر پہونچ جائے گا[1]

تخلیقِ کائنات کی داستان بھی پارسیوں کے یہاں اُسی طرح بیان کی جاتی ہے جیسی کہ یہودیوں عیسائیوں اور مسلمانوں کے یہاں مشہور ہے۔ آدم ابوالبشر یا دنیا کا سب سے پہلا انسان کیونکر پیدا ہوا۔ کتنے دنوں تک زندہ رہا۔ اور نسل انسانی کب اور کس طرح شروع ہوئی کل باتیں جیسی ہمارے یہاں کی روایات میں ہیں وہی زرتشتیوں کے یہاں بھی ہیں[2]۔

ہم کسی گزشتہ باب میں ذکر کر چکے ہیں کہ ژند آستا میں طوفان نوح جیسے واقعہ کا بھی ذکر ہے جو بزمانہ شاہنشاہ جمشید ظہور میں آیا تھا۔ یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ جمشید اسلامی روایات کا سلیمان تھا کیونکہ اُس کے قبضہ و اختیار میں بھی اجنّہ تھے اور جن کے متعلق مشہور ہے کہ پائے تخت استخر کے عظیم الشان عمارات اور خوبصورت باغات اُنھیں کے بنائے ہوئے تھے[3]۔ لیکن طبری[4] نے حضرت سلیمانؑ کو کیقباد کا ہمعصر بتلایا ہے اور لکھا ہے کہ ان دونوں کے درمیان برادرانہ تعلقات قائم تھے یہاں تک کہ سلیمان علیہ السلام نے کیقباد کے جانشین کیکاؤس کو افراسیاب کے زیر کرنے میں مدد بھی پہونچائی تھی۔ خود پیغمبر زرتشت کو اکثر علماء نے حضرت ابراہیم سمجھا ہے[5]۔ بہر طور کم از کم یہ بات تو پایۂ ثبوت کو پہونچ جاتی ہے کہ مجوسیوں کا ہادی غیر خدا کا پیغام لیکر لوگوں کی رہبری کو نہیں آیا تھا بلکہ حقیقت میں خدا کا بھیجا ہوا نبی تھا۔ شیخ الاشراق (المتوفی ۵۸۵ھ) نے اپنی کتاب "حکمت الاشراق" میں زرتشت کو انبیائے برحق میں شمار کیا ہے[6] اور حق تو یہی ہے کہ اولیت کے طرۂ امتیاز کا فخر پیغمبر ایران ہی کو حاصل ہے جنھوں نے اپنے زمانہ میں توحید کی علمبرداری کی جبکہ آریائی ایشیا عناصر فطرت کی پرستش میں محو ہو رہا تھا اور اُسوقت تک کسی ہستی کو اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کی جرأت نہو سکی تھی۔ زرتشت کے سوا کسی دوسرے کا نام اس سلسلہ میں تاریخِ عالم بتلانے سے قاصر ہے[7]۔ پروفیسر میکس مُلر کا خیال ہے کہ آریائی اور ایرانی اقوام کا اختلاف جو در حقیقت

---

[1] داداستان دینک۔ باب ۱۴۔ آیتہ ۸۔ باب ۳۰۔ آیتہ ۱۵۔ ۱ اور دینکرد جلد ہفتم صفحہ ۵۸۴ ملاحظہ فرمائیے۔ خواجہ کمال الدین مرحوم نے اپنی تصنیف "اسلام اور دین زرتشت" صفحہ ۹۸ میں اس مخصوص عقیدہ کے متعلق ہر دو مذہب میں یکساں خیال موجود رہنے پر نہایت تفصیلی بحث فرمائی ہے۔
[2] معجم البلدان (مولفہ یاقوت) جلد اول۔ کتاب آثار الباقیہ (البیرونی) مروج الذہب (مسعودی)۔ مسئلہ تخلیقِ انسان (مولفہ جمشید جی مودی)
[3] تاریخ ادبیات ایران (براؤن) جلد اول۔ کتاب المعارف (ابن قتیبہ)۔ [4] ترجمہ فارسی (نولکشور) جلد دوم صفحہ ۱۸۹۔
[5] روضتہ الصفا (میرخوند) جلد اول جزو اول)۔ [6] ملاحظہ ہو کتاب الکلام (مولفہ مولانا شبلی) جلد اول صفحہ ۱۴۹۔۔۔
[7] ملاحظہ ہو روح الاسلام (دیباچہ) مولفہ مرحوم سید امیر علی۔

ایک ہی جماعت کے افراد تھے محض زرتشتی تبلیغِ توحید کے بعد ظہور میں آیا[1]۔ یہاں پر مناسب ہوگا کہ علامہ سر محمد اقبال کی معرکۃ الآرا تصنیف "ترقیِ الٰہیات در ایرانِ قدیم" سے اسی موضوع پر چند سطریں نقل کی جائیں۔ موصوف فرماتے ہیں:۔

"اُس زمانہ میں جبکہ وید کے اشلوک ابھی وسطِ ایشیا میں نظم کا جامہ پہن رہے تھے اور ایرانی آریا ہر چہار طرف خانہ بدوش ہو کر پھر رہے تھے۔ زرتشت کا ظہور ہوا لوگوں میں یکبارگی اطمینان کی زندگی گزارنے کی عادت پڑی اور زراعت و کاشتکاری میں سب کے سب مصروف ہوگئے۔ حکماء اور فلاسفہ کی جماعت میں زرتشت کا درجہ سب سے بلند اور ارفع ہے۔ ایرانیوں کی شاخ آریاؤں سے الگ ہوتی ہی جا رہی تھی کہ زرتشت نے اپنی مذہبی تعلیم سے اُنھیں بالکل ہی جداگانہ قوم بنا دیا۔"

بدقسمتی سے پیغمبرِ ایران کے زمانہ کا صحیح طور تعین کرنے کے لئے ہمارے پاس مواد موجود نہیں۔ مغربی علماء نے بابلی اور یونانی مورخین کے بیانات پر کیانی اور اخمنی خاندانوں کو جنکی جداگانہ حکومتیں ایران کی تاریخ میں مسلم ہیں ایک ہی سلسلۂ حکمرانان سمجھ کر زمانہ بعد کے لئے غلط فہمی کا دروازہ کھولا۔ عربوں نے اُن ہی کی تقلید کی۔ حالانکہ ایرانی روایات سے اس بات کا پورا پتہ چلتا ہے کہ یہ دو مختلف خاندان تھے جنھوں نے ایران پر یکے بعد دیگرے حکومت کی[2]۔ اخمنیوں کی ابتدا سروش اعظم کے عہد سے ہوتی ہے جس نے ۵۴۹ھ قبل مسیح میں میڈیا۔ فارس (جنوبی ایران) اور بابل پر تسلط حاصل کیا تھا۔ اس خاندان کا اختتام ۳۳۰ء میں قبل مسیح ہوا۔ زرتشت کا ظہور شاہ گشتاسپ کیانی کے عہد میں بہت عرصہ قبل ہو چکا تھا اور اُسوقت پورا فارس (ایران) میڈیا والوں کے زیر اثر تھا[3]۔ کیانی خاندان کی حکومت شمالی مشرقی خطۂ ایران پر محدود تھی اور ان کا پایۂ تخت باختر تھا۔ اور چونکہ ان کا تسلط پورے ایران پر نہ تھا اس لئے لوگوں نے ایرانی حکمرانوں کے سلسلہ پر کیانیوں اور اخمینوں کو (جن کا قبضہ سارے ملک پر آخر زمانہ میں ہوا) غلط ملط کر کے ایک کر ڈالا[4]۔ اخمنی پکے زرتشتی تھے اور انھوں نے اس مذہب کو تمام ایران میں رائج کیا[5]۔ تاریخ میں پیشدادی شاہان ایران کے بعد اخمنی خاندان ہی کا نام آتا ہے یا کبھی کبھی یہی اخمنی سلاطین کیانی بھی کہلاتے ہیں۔ البیرونی نے اس مسئلہ پر کافی روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے[6]۔ وہ لکھتا ہے کہ تمام وہ کتابیں جو سیر و تاریخ سے متعلق مغربی زبانوں سے ترجمہ کی گئیں اُن میں سلاطین ایران و بابل کا حال فریدوں کے عہد سے شروع اور دارائے ثانی پر ختم

---

[1] تاریخ ادبیات ایران (براؤن) جلد اول صفحہ ۴۴ — [2] تجلی ایران قدیم (مولفہ پیتھاوالا) اور تاریخ ایران قدیم (مولفہ کرشاسپ) ملاحظہ فرمایئے۔ — [3] پانچ عظیم الشان سلطنتیں (مولفہ راالنسن) جلد سوم صفحہ ۲۲۴ — [4] ایضاً صفحہ ۲۰۲۔ اور تاریخ ایران جلد اول ب ۳۰۱ (مولفہ سائکس)۔ — [5] پانچ عظیم الشان سلطنتیں۔ جلد سوم صفحہ ۲۲۵۔ — [6] آثار الباقیہ صفحہ ۱۱۴ (ترجمہ انگریزی طبع سخاؤ)

ہوتا ہے لیکن جب ہم ان کی تعداد اور اُن کے نام اور زمانۂ حکومت کا مشرقی روایات سے مقابلہ کرتے ہیں تو بیحد اختلاف معلوم ہوتا ہے۔ میرے خیال میں واقعہ کی اصلیت یہی ہو سکتی ہے کہ لوگوں نے ایرانی سلاطین کے ناموں کو اُن کے بابلی حکام کے ناموں کے ساتھ خلط ملط کر دیا ہے۔" حمزہ اصفہانی نے بھی تقریباً یہی باتیں بیان کی ہیں[1]۔ ان دو مسلم مورخوں کے علاوہ عہد حاضر کے ایک مغربی عالم ڈاکٹر کیتھ جو قدیم آریائی اور ایرانی تواریخ و تمدن کے بہت بڑے ماہر ہیں تحریر فرماتے ہیں[2] کہ "زرتشت کا ظہور دارائے اخمنی کے زمانہ میں معین کرنا سخت نادانی ہے" اخمنیوں کے عہد سے قبل کیانیوں کی حکومت ایران پر مسلم الثبوت ہے۔ اور جیسا کہ قبل میں ذکر کیا جا چکا ہے پیغمبر ایران نے اپنی تبلیغ کیانی خاندان کے بادشاہ گشتاسپ کے زمانہ میں شروع کی تھی۔ علاوہ ازیں دارائے اعظم (اخمنی) کے وہ کتبے جو کوہ بیستون اور نقش رستم میں کندہ کئے ہوئے پائے جاتے ہیں اُن میں دارا نے کسی نئے مذہب کے رواج دینے کا ذکر نہیں کیا ہے بلکہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت تک ایران میں زرتشتی مذہب قائم ہو چکا تھا اور دارا خود بھی اُس کا پابند تھا۔

(باقی)

محمد طاہر رضوی۔ ایم۔ اے

[1] تاریخ۔ باب یکم۔ صفحہ ۶۱۰ — [2] رسالہ سہ ماہی تاریخ ہند (مارچ ۱۹۲۵ء)

جھانسی کی رانی

(مسلسل)

پہلا ایکٹ - دوسرا منظر

(قصرشاہی کا صحن - آفتاب غروب ہونے کو ہے - صحن کے سامنے شہ نشین ہے جو سنگ مرمر کی مغلی وضع کی جالیوں سے گھرا ہوا ہے - صحن کے بیچ میں پہلوانوں کا اکھاڑہ ہے - ہندو اور مسلمان زرق برق درباری لباس پہنے دکھائی دیتے ہیں عورتیں بھی ہیں - تھوڑی دیر بعد ڈھول اور سنکھ بجتا ہے - قصرشاہی کا دروازہ اندر کی طرف سے کھول دیا جاتا ہے - جس میں سپاہی پہلوان شمشیرباز اور پھنکیت داخل ہو کر صف بصف قرینہ سے کھڑے ہو جاتے ہیں - اس کے بعد ایک توپ دغتی ہے اور مہارانی انند راؤ کا ہاتھ پکڑے مع دیوان اور دیگر وزرار کے شہ نشین پر نمودار ہوتی ہے - تمام مجمع تین مرتبہ باادب جھک کر سلام کرتا ہے تیسرے سلام کے بعد دیوان صاحب مع رانی و انند راؤ آگے بڑھتے ہیں -)

نرسنگھ :- بھائیو اور بہنو! تمھیں یہ افسوسناک واقعہ معلوم ہے کہ ہمارے محبوب اور ہردلعزیز راجہ گنگا دھر راؤ کا ایک مہینہ ہوا انتقال ہو گیا ہے - لیکن خوش قسمتی سے انھوں نے مرنے سے قبل اپنا ولیعہد اور جانشین متبنیٰ کر لیا تھا - یہ لڑکا رانی صاحبہ اور وزیروں نے منتخب کیا تھا جسے خود آنجہانی راجہ نے دیکھ کر پسند کر لیا تھا - اور اس طرح متوفی راجہ کے جنازہ کی آخری رسمیں ادا کی جا سکی تھیں - متوفی راجہ صاحب نے یہ بھی ہدایت اور وصیت کی تھی کہ جب تک متبنیٰ ولیعہد حکومت کرنے کے قابل ہو اسوقت تک ان کی بیوہ رانی لکشمی بائی، جن کا بیحد احترام ہمارے دلوں میں ہے، ولیعہد کی طرف سے ریاست کا نظم و نسق انجام دیں، اگرچہ ابھی تک کمار انند راؤ کی تبنیت گورنر جنرل نے باقاعدہ طور پر تسلیم نہیں کی، لیکن رانی صاحبہ کی خواہش یہ ہے کہ اب بلا توقف تم لوگوں کے سامنے وہ شخص پیش کر دیا جائے جو آیندہ تمھارا فرمانروا ہوگا - (انند راؤ کی طرف گھوم کر) - لہذا یہ میرا گرانقدر اور خوش آیند فرض ہے کہ میں کنور انند راؤ کو

تمھارے سامنے پیش کروں جو سورگیہ راجہ گنگا دھر راؤ کا متبنی بیٹا اور ولیعہد ہے جس وقت ہماری انگریزی سرکار کی طرف سے تبنیت کو تسلیم کئے جانے کی اطلاع رانی صاحبہ کو یا مجھے بحیثیت دیوان پہونچے گی اسوقت تمام وفادار رعایا اور عہدیداران ریاست کی طرف کنور صاحب کی پذیرائی مناسب طور پر عمل میں آئے گی۔ فی الحال ہم اسیقدر کافی سمجھتے ہیں کہ اپنے آیندہ فرمانروا کے متعلق عام اعلان کردیں۔" "کنور انند راؤ کی جے!" "کنور انند راؤ کی جے!!"

(مجمع نعروں کی تکرار کرتا ہے، اور رانی آگے بڑھ کر اس طرح خطاب کرتی ہے)

رانی:۔ میری محبوب رعایا اور محترم دوستو! جو کچھ پچھلے دنوں محلسرا میں ہوچکا ہے اسے دیوان صاحب نے بالکل صحیح طور پر بیان کیا ہے۔ جس پر میں مزید اضافہ کی ضرورت نہیں سمجھتی لیکن ممکن ہے کہ میرے بعض تازہ کاموں کی وجہ سے آپ لوگوں کے دلوں میں کسی قسم کا اضطراب ہو اس لئے ضروری ہے کہ ان کی کسی قدر توضیح کردیجائے آپ میں سے بعض کو تعجب ہوگا کہ میں ایک ہندو بیوہ ہوکر جس کا دھرم شاستر کے احکام پر عمل کرنا فرض ہے، اپنے محترم شوہر کی وفات کے بعد اس قدر جلد کیوں منظر عام پر آگئی مگر بات یہ ہے کہ اگر حالات ایسے نہ ہوتے تو میں سوگ کی قدیم رسموں کو ہرگز نظر انداز نہ کرتی۔ لیکن موجودہ زمانہ سخت خطرات سے پُر ہے۔ ایک عجیب قسم کی بےچینی اور گھبراہٹ ملک میں پھیلی ہوئی ہے۔ اور ملک میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک آئے دن نت نئی افواہیں پھیلتی رہتی ہیں۔ الغرض موجودہ فضا تغیر وانتشار سے معمور ہے۔ مغلیہ سلطنت کا خاتمہ ہوچکا ہے اور اس کی جگہ دیکھتے دیکھتے ایک نئی بالادست طاقت نے لے لی ہے۔ حال ہی میں ہمارے بعض بہت پُرانے حکمران خاندان مٹ چکے ہیں۔ اور ابھی کل کی بات ہے کہ جو سلطنتیں ہندوستان میں نمایاں حیثیت رکھتی تھیں وہ نابود ہوچکی ہیں۔ پھر کیا تعجب ہے اگر ہمیں اپنی چھوٹی سی مگر محبوب ریاست جھانسی کی طرف سے بھی فکر وتشویش لاحق ہو۔ اس لئے میرا یہ کہنا ہرگز قابل اعتراض نہیں ہوسکتا کہ جو حشر ہم سے زیادہ طاقتور اور بڑی ریاستوں کا ہوچکا ہے، اس سے جھانسی کو بچانے کے لئے ہمیں جلد از جلد کوئی تدبیر کرنا چاہئے اور ابتلاء ومصائب کے موجودہ نازک دور میں ولیعہد کی وراثت اور حقوق کو محفوظ رکھنے کے لئے اگر میں سرگرم کار ہوجاؤں تو اس سے گویا میرے سورگیہ پتی کی زیادہ عزت وتوقیر ہوگی۔ جس طرح دیوی سروپ اہلیا بائی نے سرگرم عمل ہوکر قلمرو سے ہولکر کو محفوظ رکھا، اسی طرح خدا کی توفیق ونصرت سے میں بھی خدمت وطن کرنے کی کوشش کروں گی، اور تاحدِ امکان جھانسی راج کو بچاؤں گی۔ اسی لئے آج میں آپ لوگوں سے کہتی ہوں کہ آپ صاف صاف بتادیں کہ آپ سورگیہ راجہ کی اس دور اندیشی کو کہ انھوں نے کمار انند راؤ کو اپنا ولیعہد بنایا، پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں یا نہیں؟ ہمیں چاہئے کہ اس بارہ میں انگریزوں کے دل میں ذرا سا بھی شک وشبہ نہ رہنے دیں کہ جھانسی کے لوگ حکمران خاندان کے وفادار ہیں۔ نیز یہ کہ ستارہ یا ناگپور کے حالات خواہ کچھ بھی ہوئے ہوں لیکن جھانسی اپنے موجودہ حکمرانوں کے ماتحت مطمئن ہے۔ ہم اپنی اس چھوٹی سی ریاست میں اپنی آزادی و

خود مختاری کو عزیز رکھتے ہیں اور اس کی حفاظت و قیام میں ہم کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کریں گے۔

(رانی کے آخری الفاظ پر ہر طرف سے تعریف کی صدائیں بلند ہوتی ہیں۔ اور تقریر ختم ہوتے ہی "رانی لکشمی بائی کی جے" کا نعرہ بلند ہوتا ہے مجمع نعرہ کی تکرار کرتا ہے جس سے تمام محل گونج اٹھتا ہے۔ اسکے علاوہ "انند کمار کی جے" کے نعرے بھی لگائے جاتے ہیں۔ پھر رانی مجمع کا سلام لیتی ہے، انند راؤ کا ہاتھ پکڑکر چلی جاتی ہے، اس کے پیچھے پیچھے دیگر وزرا بھی چلے جاتے ہیں۔ صرف دیوان رہجاتا ہے، جو بازیگروں پہلوانوں وغیرہ کو اپنے کرتب دکھانے کا حکم دیتا ہے۔ اور خود بھی چلا جاتا ہے۔ باجہ بجتا ہے اور کھیل شروع ہو جاتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد ایک ترپ دغتی ہے۔ فوراً سب لوگ باادب صف بستہ ہوجاتے ہیں۔ دروازہ کھلتا ہے جس میں سے انند راؤ سادہ لباس میں اور راؤ آپا تلوار ہاتھوں میں لئے داخل ہوتے ہیں۔ اسی وقت رانی صاحبہ، دیوان اور دیگر وزرا بھی شہ نشین پر نمودار ہوتے ہیں راؤ آپا اور انند کمار شہ نشین کی طرف اپنی تلواریں اٹھاکر سلامی دیتے ہیں۔ سلام کا جواب اوپر سے ملتا ہے۔ بعد ازاں مجمع کی طرف رُخ کرکے سلامی دی جاتی ہے۔ مجمع بھی جواباً تین سلام کرتا ہے اس کے بعد راؤ آپا اور انند کمار دونوں شمشیر زنی کرتے ہیں۔ ہر طرف سے واہ واہ کی صدائیں بلند ہوتی ہیں۔ اس کے بعد پہلوانوں، بازیگروں وغیرہ کے تماشے شروع ہو جاتے ہیں۔ راؤ آپا کا پاؤں پھسلتا ہے وہ گر پڑتا ہے اور انند کمار اس کے سینہ پر پاؤں رکھ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ "رانی کمار انند کی جے" کا نعرہ لگاتی ہے۔ پردہ گرتا ہے اور ہر طرف سے "رانی صاحبہ کی جے" اور "جھانسی راج کی جے" کے نعرے بلند ہوتے ہیں۔)

پہلا ایکٹ۔ تیسرا منظر

(اسی دن غروب آفتاب سے ایک گھنٹہ بعد قصر شاہی کا دربار آراستہ ہے۔ وسط میں تخت رکھا ہوا ہے، داخلہ کا دروازہ دور فاصلہ پر سامنے نظر آتا ہے۔ پردہ اٹھتا ہے اور دیوان، ماما صاحب، دو دیگر وزرار اور میجر ایلیس (اس زمانہ کی سُرخ اور نیلی وردی پہنے) نظر آتے ہیں۔ میجر صاحب گدی کے قریب اور اس کے برابر ماما صاحب بیٹھے ہیں۔ دیوان ان کے سامنے کھڑا ہے۔ دوسرے دو وزیر کسیقدر فاصلہ پر آہستہ آہستہ سرگوشیاں کررہے ہیں۔)

میجر ایلیس :- دیوان صاحب! میں عجب کشمکش و پیچ میں ہوں۔ اگر میرے دل میں متوفی راجہ صاحب کا احترام نہ ہوتا تو یہاں ایک لمحہ بھی ٹھہرنا گوارا نہ کرتا اور اب میجر مالکم مجھ سے ضرور جواب طلب کریں گے کہ جب رانی گورنر جنرل سے کھلم کھلا سرتابی کر چکی تھی تو میں نے اس سے ملاقات کرنا کیوں منظور کیا۔ یہ معاملہ بہت نازک ہو گیا ہے اور گزشتہ چند سال سے میں ذاتی طور پر جھانسی راج کی فلاح و بہبود میں جو دلچسپی لیتا رہا ہوں اس کا اب مجھے افسوس ہو رہا ہے۔

نرسنگھ :- میجر صاحب! پر ماتما جانتا ہے کہ مجھے اور ماما صاحب کو آپ کی حالت کا بخوبی احساس ہے (ماما صاحب بھی سر ہلا کر ہاں میں ہاں ملاتے ہیں) اور ہم آپ سے التجا کرتے ہیں کہ آپ صبر و استقلال اور اپنی حسب معمول فیاضی سے کام لیتے رہیں۔ آپ یقین فرمائیں کہ ہم لوگوں نے رانی صاحبہ کو روکنے کی ہر چند کوشش کی مگر انھوں نے ایک نہ مانی۔ بلکہ اُلٹی ہم کو یہ دھمکی دی کہ وہ لوگوں میں اعلان کر دیں گی کہ ہم جھانسی راج کے الحاق کے بارہ میں انگریزوں سے ساز باز کر رہے ہیں۔

ماما صاحب :- میجر صاحب! میں آپ سے بہ حلف عرض کرتا ہوں کہ ہم لوگ بالکل مجبور تھے۔ میں نے رانی کو بہت سمجھایا مگر اُس نے انکار کر دیا۔

میجر ایلیس :- (سوچ کر) آپ کہتے ہیں کہ لڑکے کی صغر سنی کے زمانہ میں وہ ریاست کا نظم و نسق اپنے ہاتھ میں رکھنگی۔

دونوں :- جی ہاں!

میجر :- کیا آپ دونوں صاحبوں کے دشمن بھی ہیں؟

نرسنگھ :- نہیں! کم از کم ہمارے محکمہ جاسوسی کو تو اس کا علم نہیں ہے۔

میجر :- (معنی خیز طور پر ماما صاحب سے) ہوں! آپ کا کوئی دشمن نہیں ہے۔ تو گستاخی معاف! کیا رانی صاحبہ کا کوئی دوست ایسا ہے جس سے ان کے بہت زیادہ گہرے تعلقات ہوں؟

ماما صاحب :- بحیثیت رانی کے ان کے مشیر کار ضرور ہونے چاہئیں۔ لیکن بلحاظ وفاداری وہ اپنے مرنے والے شوہر پر اب بھی جان دیتی ہے گویا وفاداری شوہر کی زندگی میں بھی صرف فرض کی حیثیت رکھتی تھی اور اس میں کوئی جذبۂ لطف و محبت شامل نہ تھا۔

(گھنٹا بجتا ہے سب چوکنا ہو جاتے ہیں۔ میجر اور ماما صاحب دونوں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور دوسرے دو وزیر بھی آ کر دیوان صاحب کے قریب کھڑے ہو جاتے ہیں)۔

میجر :- صاحبو! یہ معاملہ بہت ہی نازک ہو گیا ہے۔ واقعی بہت نازک۔ اور نہ معلوم اس کا نتیجہ کیا ہو۔ لیکن آپ سمجھ لیجئے۔ میں رانی صاحبہ سے تنہا ملاقات نہیں کر سکتا۔ ایسا کرنا گویا انھیں جھانسی راج کا فرمانروا تسلیم کر لینا ہے۔

اور جو کچھ احکام مجھے دئے گئے ہیں وہ بھی آپ خوب جانتے ہیں۔ پس آپ پوری طرح سمجھ لیجئے تاکہ کسی قسم کی غلط فہمی نہ ہو جب تک آپ لوگ موجود رہیں گے، میں رانی صاحبہ کے سامنے رہوں گا۔ اگر آپ لوگ ہٹ جائیں گے تو میں بھی چلا جاؤنگا۔

(کمرہ میں دور سامنے کی طرف سے ایک جلوس داخل ہوتا ہے۔ آگے آگے دو لڑکے چنور لئے ہوئے ہیں ان کے پیچھے چار عورتیں خاصدان وغیرہ لئے ہوئے ایک کشتی میں شربت کی بوتل اور چند بلوریں گلاس۔ دو آدمی زرکار پردہ تانے آتے ہیں ان کے پیچھے رانی اور گنگا بائی داخل ہوتے ہیں۔ تمام وزراء ماما صاحب اور اہلِ دربار جھک کر سلام کرتے ہیں۔ میجر ایلیس جس کے ہاتھ میں پروں کی کلغی دار خود ہے جھک کر سلام کرتا ہے۔ رانی گدی کے سامنے ایک تخت پر بیٹھ جاتی ہے۔ میجر ایلیس کی طرف سے پردہ رہتا ہے۔ خادم خنجر بکف پردہ کے پاس استادہ ہوجاتے ہیں۔ گنگا بائی بھی رانی کے پاس بیٹھتی ہے)

رانی :۔ دیوان صاحب! آپ نے ہمارے معزز مہمان کے لئے کیا سامان تفریح بہم پہونچایا ہے؟

نرسنگھ :۔ (پردہ کے قریب آکر)۔ میں نے تو میجر صاحب سے اصرار کے ساتھ عرض کیا تھا کہ گویوں اور ناچنے والیوں کو طلب کرلیا جائے لیکن انھوں نے عذر پیش کرکے انکار کردیا۔ اور فرمانے لگے کہ دن بھر سخت کام کرتے گزرا ہے۔ خستہ ہوگیا ہوں اس لئے رات کو سویرے ہی سو کر علی الصباح یہاں سے دور کسی ضروری کام کو چلا جاؤں گا۔

رانی :۔ اوئی! میجر صاحب کو جھانسی سے چلے جانے کی اسقدر جلدی ہے۔ میں تو سمجھتی تھی کہ وہ ہمارے یہاں تشریف لانا ہمیشہ پسند کرتے ہیں اور خود آپ نے ہی تو کہا تھا کہ وہ ہمارے بڑے دوست ہیں۔

(دیوان میجر ایلیس کی طرف دیکھتا ہے جو کچھ پس وپیش کے بعد اُٹھ کر پردہ کے قریب آتا ہے)

میجر :۔ رانی صاحبہ! نہیں یہ بات نہیں، میں جھانسی آتے میں ہمیشہ خوش رہا اور خوش رہوں گا۔ لیکن آج کل، جیسا کہ آپ کو بھی معلوم ہے، صورت حالات کسی قدر نازک ہوگئی ہے۔ اور مجھے اندیشہ ہے کہ کمار صاحب کی تبنیت کی منظوری ملنے سے قبل جو میں آپ کے دربار میں حاضر ہوگیا ہوں اس پر مجھ سے ضرور جواب طلب ہوگا۔

رانی :۔ میجر صاحب! میں آپ کو ہرگز پریشان کرنا نہیں چاہتی خصوصاً اس لئے کہ آپ جھانسی راج کے خیر خواہ ہیں۔ میں مرہٹہ قوم کی عورت ہوں اس لئے میں آپ کو حکم سے سرتابی کرنے کی ہرگز ترغیب نہ دوں گی۔ مگر چونکہ اب آپ یہاں موجود ہی ہیں، اس لئے اگر تھوڑا سا رقص وسرود ہوجائے تو کیا مضایقہ ہے؟ اور اس بات سے تو آپ خود واقف ہیں کہ اس ملک کے رہنے والے کسی اہم کام کو ہاتھ لگانے سے پہلے دل ودماغ کی کسی قدر تفریح بہت پسند کرتے ہیں علاوہ ازیں ایسا شغل نہ صرف ہمارے مہمانان عزیز کا حق ہے بلکہ ہماری خودداری بھی اسی امر کی متقاضی ہے۔ بہرحال اگر آپ بہت زیادہ خستہ ....

میجر :۔ (جوش کے ساتھ مگر پھر کچھ سنبھل کر)۔ نہیں رانی صاحبہ ہرگز نہیں! بلکہ میں تو آپ کی خاطر مدارات کو

اپنے لئے باعث عزت و مسرت سمجھتا ہوں۔ مجھے یہ خیال تھا کہ شاید اسوقت آپ خود ہی اس قسم کے مشاغل تفریح کی طرف مائل نہ ہوں۔

رانی :۔ (حاکمانہ لہجہ میں) ۔ میجر صاحب ! آج کی تاریخ سے جھانسی راج کی عنانِ حکومت میں نے اپنے ہاتھوں میں لے لی ہے ۔ اور اگرچہ رنڈاپے کا سوگ میں حتی الامکان حسب رواج زمانہ میں مناؤں گی، لیکن راج کے متعلق جو فرائض مجھ پر عائد ہوتے ہیں وہ سب باتوں پر مقدم رہیں گے۔ لہذا آپ میرے آرام و سہولت کا کچھ خیال نہ فرمایئے میرا مرتبہ اس امر کا متقاضی ہے کہ میں جھانسی میں اپنے معزز مہمان کے شایان شان کوئی انتظام کروں اور تاوقتیکہ آپ ہمارے خیر مقدم کو قبول کرنے سے قطعی انکار نہ کر دیں میں گویوں اور اپنے یہاں کی ایک بہترین رقاصہ کو ضرور طلب کروں گی۔

(خفیف سا سکوت ۔ میجر ایلیس دیوان صاحب کی طرف دیکھ کر خاموش ہو جاتا ہے ۔ ادھر گنگا بائی پردہ کے پیچھے سے میجر کو جھانک کر دیکھتی ہے ۔ اور پھر پیچھے ہٹکر آنکھوں ہی آنکھوں میں تمام کیفیت رانی سے بیان کرتی ہے ۔ اگرچہ میجر ایلیس کی طرف سے پردہ ہے مگر تمام دربار رانی اور گنگا بائی کو دیکھ رہا ہے)

رانی :۔ دیوان صاحب ! میرا بائی کو حکم دیجئے، سازندوں کو فہمایش کر دیجئے کہ زیادہ شور نہ ہو۔ میجر صاحب اور آپ سب صاحب تشریف رکھیں ۔ اور مجھے بزم رقص و سرود کی شرکت سے معاف فرمائیں مگر یہ سمجھ لیں کہ آپ صاحب کی تفریح سے میرا دل خوش ہوگا۔

(رانی اور گنگا بائی اُٹھ کر چلی جاتی ہیں میجر صاحب، وزراء اور دیگر درباری اپنی اپنی جگہ بیٹھ جاتے ہیں اور تھوڑی دیر بعد میرا بائی کو جو جھانسی دربار کی سب سے اچھی اور مشہور رقاصہ ہے لیکر آتے ہیں۔ میرا بائی پردہ کے پاس آکر مجرا و بندگی کرتی ہے ۔ بعد ازاں رقص شروع ہوتا ہے ۔ میجر صاحب خوش ہو کر رقاصہ کو انعام دیتے ہیں۔ گنگا بائی دبے پاؤں پس پردہ آکر چاروں طرف جھانکتی ہے اور پھر رانی کو اشارہ سے بلاتی ہے ۔ مگر رقص و سرود کا سلسلہ برابر جاری رہتا ہے)

رانی :۔ لالہ جی ! میرا بائی، اور سازندوں کو معقول انعام دیا جائے ۔ ان لوگوں نے آج بڑی محنت سے میجر صاحب اور اہلِ دربار کا جی خوش کیا ہے ۔

(میرا بائی جھک جھک کر پہلے پردہ کو، پھر میجر ایلیس، دیوان صاحب، دیگر وزراء اور معززین دربار کو سلام کرتی ہے) ۔

رانی :۔ اچھا تو اب میں میجر صاحب سے بات چیت کرنے کے لئے تیار ہوں، پتا جی آپ، دیوان صاحب اور

سب لوگ یہاں سے جا سکتے ہیں کیونکہ میں میجر صاحب سے تخلیہ میں گفتگو کروں گی۔

(میجر الیس، دیوان اور ماما صاحب جلد جلد ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں۔ دیوان کے اشارہ سے سب لوگ ہٹ جاتے ہیں)

نرسنگھ:- رانی صاحبہ! یقیناً میں، اور سب لوگ آپ کے حکم کی تعمیل کے لئے طیار رہیں لیکن میجر صاحب نے ہم سے فرمایا ہے کہ ان کا رانی صاحبہ سے تخلیہ میں ملنا ممکن نہ ہوگا۔ ان کو اندیشہ ہے کہ اگر انھوں نے یور ہائنس سے تخلیہ میں ملاقات کی تو ان کے اس فعل کو آپ کی نیابت تسلیم کرلینے کے مترادف سمجھا جائے گا۔ اس لئے میجر صاحب مجبور ہیں کہ آپ سے گفتگو کرنے کے وقت جھانسی راج کے تمام وزراء موجود رہیں۔ حضور میری اس ناچیز گزارش کو قبول فرمائیں۔ کیونکہ موجودہ صورت حال ہم سب کے لئے بہت نازک ہے۔

رانی:- (بگڑ کر کھڑی ہو جاتی ہے)۔ اچھا تو یوں کہئے کہ ملکہ معظمہ اور گورنر جنرل کا نمایندہ جھانسی میں صرف اس لئے آتا ہے کہ وہ ریاست کے خلاف ریاست کے ملازموں سے ساز باز کرے، اور کیا ان معزز صاحب بہادر کا جھانسی راج سے اظہار محبت اور میرے محترم بتاجی اور لائق وزیروں کے مجھ سے اظہار وفاداری کا یہی طریقہ ہے؟

ماما صاحب:- بیٹی شانتی سے کام لو۔ تم نہیں سمجھتیں کہ تمھارا ایسا کہنا ہمارے معزز مہمان پر ظلم کرنا ہے۔ جس طرح ہم لوگ یعنی تمھارے ملازم تمھاری ہر بات کی تعمیل کرتے ہیں، اسی طرح میجر صاحب بھی اپنے افسران بالادست کے احکام کی تعمیل کر رہے ہیں۔ جب تک انگریزی ارباب حل وعقد کمار صاحب کی تبنیت تسلیم نہیں کرلیں گے اسوقت تک میجر صاحب صرف دیوان صاحب اور وزیروں سے تعلق رکھنے پر مجبور ہیں۔ اصول یہی ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ ان سے جھانسی راج اور دیگر ریاستوں میں امتیاز کرنے کی توقع رکھی جائے۔

رانی:- (تلخ لہجہ میں) اچھا اگر میجر صاحب مجھے جھانسی راج کا نمایندہ سمجھ کر ملاقات نہیں کر سکتے تو مجھ سے عورت ذات ہی سمجھ کر بات چیت کریں۔ دنیا کا کوئی قاعدہ اس امر کا مانع نہیں کہ مرد کسی عورت سے بات چیت کرے اور خصوصاً انگریزوں میں تو کوئی ایسا قاعدہ ہے ہی نہیں کیونکہ یہ لوگ عورتوں سے اسقدر دلچسپی لیتے ہیں کہ بمقابلہ اپنی بیویوں کی دوسروں کی بیویوں کی طرف زیادہ توجہ کرتے ہیں۔

میجر:- (مصالحانہ لہجہ میں) رانی صاحبہ! میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کی دعوت قبول کرنا میرے لئے بہت کچھ باعث عزت ہوگا۔ لیکن میں یہ خیال نہیں کر سکتا کہ آپ عدول حکمی کی سزا میں میری بے عزتی اور ملازمت سے برطرفی کو گوارا کریں گی۔

رانی:- لیکن اگر آپ مجھ سے چند لمحے اس طرح باتیں کریں جیسے ایک مرد کسی عورت سے گفتگو کرتا ہے، تو اس کی خبر کس کو ہوگی؟ میں وعدہ کرتی ہوں کہ جہاں تک میرا تعلق ہے، اس واقعہ کی کسی کو اطلاع نہ ہوگی، خواہ کمار انند راؤ کی تبنیت کے

بارہ میں آیندہ کچھ بھی ہوتا رہے۔ اور آپ اس بات سے بھی مطمئن رہیں کہ نہ تو دیوان صاحب، نہ دیگر وزراء اور نہ میرے والد اس بارہ میں کوئی گفتگو کریں گے کیونکہ وہ چاہتے ہیں کہ انگریزوں سے بگاڑ نہ ہو۔ (طنزیہ لہجہ میں) یا یوں کہئے کہ وہ زبان سے ظاہر کرتے ہیں۔

(دیوان صاحب، ماما صاحب اور دوسرے دونوں وزیر گھبرا جاتے ہیں اور ندامت سے سرنگوں ہو جاتے ہیں)

میجر:۔ (نرم ہوکر) بہت اچھا رانی صاحب! اگر آپ یہ معاملہ اس طرح رکھنا چاہتی ہیں تو بہتر ہے میں طیار ہوں، (دیوان صاحب)۔ چونکہ رانی صاحبہ کا منشا یہی ہے اس لئے آپ ہم کو تنہا چھوڑ سکتے ہیں۔ لیکن یاد رہے کہ باہر ایک حرف زبان سے نہ نکلے۔

رانی:۔ اور ان لوگوں کے بھی کان کھول دئے جائیں کہ اگر کسی قسم کی سرگوشیاں میرے لئے ہوئیں تو سخت سزا دونگی۔

(نرسنگھ ماما صاحب کی طرف آنکھ سے اشارہ کرتا ہے بعد ازاں پردہ کو سلام کرکے چل دیتا ہے۔ دیگر وزراء بھی سامنے کے دروازہ سے اس کے پیچھے پیچھے چلے جاتے ہیں)۔

ماما صاحب:۔ (پردہ کے پاس جاکر) میں سمجھتا ہوں کہ شاید آپ میرا یہاں سے چلا جانا پسند نہ کریں گی۔ کم از کم اپنی رعایا کے خیالات اور محسوسات کا تو آپ کو ضرور خیال ہونا چاہئے۔ کیونکہ وہ لوگ ضرور اعتراض کریں گے کہ سورگیہ راجہ کی بیوہ رانی ایک انگریز سے تنہا ملاقات کرتی ہے۔ دل میں سوچ لو کہ ہمارے دشمن بندیلکھنڈ والے یہ افواہ سنکر کیا کہیں گے کہ جھانسی کی رانی نے ایک انگریز افسر سے تنہا ملاقات کرنے پر اصرار کیا۔ میں امید کرتا ہوں کہ میجر صاحب میری اس آزادی کو معاف فرمائیں گے کہ میری گفتگو میں ان کا نام آیا۔

(میجر صاحب کی طرف دیکھ کر آہستہ سے آداب عرض کرتا ہے)

رانی:۔ پتاجی! چونکہ آپ نے صاف گوئی سے کام لیا ہے اس لئے اگر میں بھی آپ کو صاف گوئی سے جواب دوں تو کوئی تعجب کی بات نہ ہوگی اور میں امید کرتی ہوں کہ میجر صاحب مجھے اسی طرح معاف فرمائیں گے جیسے کہ آپ کو پتاجی! آپ میری رعایا کے خیالات اور محسوسات کی طرف اشارہ فرماتے ہیں، لیکن آپ کو اسوقت میرے جذبات کا خیال نہ آیا جب آپ نے مجھے ایک ایسے شخص کے حبالۂ نکاح میں دیدیا جو عمر میں میرے نانا کے برابر تھا۔ اور قوائے جسمانی کے لحاظ سے قطعی بیکار۔ آپ کو اسوقت کچھ خیال نہ آیا جب آپ نے مجھے اوائل عمر کی بیوگی کی مصیبت میں پھنسایا۔ مجھے جو اسوقت بھی جوان ہے، صبر تند رہے، جس کا ارمان تھا کہ بچوں کی ماں بنے، جو شوہر کی معیت اور محبت کی خواہاں تھی لیکن جو بقصور ان تمام باتوں سے محروم کر دی گئی،۔

(پردہ ہٹا کر میجر ایلیس کے سامنے آجاتی ہے جو رانی کے حسن وجمال کو دیکھ کر حیران رہجاتا ہے)

پتاجی! اب میں اپنی ذات اور اپنی زندگی کی آپ مالک رہوں گی اور اپنے اغراض و مقاصد اور جھانسی کے لئے جان قربان کردوں گی مجھے راجہ گنگا دھر راؤ کی رانی بنا کر آپ اس مرتبۂ اعلیٰ پر پہونچ گئے ہیں جس کی آپ کو تمنا تھی۔ اب اس اعزاز اور منصب کو قائم رکھئے۔ لیکن آیندہ اپنے معاملات طے کرنے کے لئے مجھے آزاد چھوڑ دیجئے۔

(ماماصاحب کسی قدر کشمکش و پیچ کے بعد رانی اور میجر ایلیس کو جھک کر سلام کرتا ہے۔ اور کمرہ سے نکل جاتا ہے۔ رانی ادھر اُدھر دیکھ کر مسند پر بیٹھ جاتی ہے۔ میجر صاحب بھی سرک کر رانی کے قریب ہو جاتے ہیں۔ اور گنگا بائی اُٹھ کر کمرہ کے ایک گوشہ کی طرف چلی جاتی ہے)۔

رانی:۔ (کچھ سکوت کے بعد حزیں آواز سے) میجر صاحب! کیا ملکۂ معظمہ بھی کبھی تنہائی محسوس کرتی ہیں؟

میجر:۔ (سٹ پٹا کر)۔ رانی صاحبہ! اس امر پر میں نے کبھی غور نہیں کیا۔ لیکن قیاس یہی کہتا ہے کہ اور لوگوں کی طرح سے ہماری نیک اور شریف ملکہ وکٹوریہ بھی ضرور کبھی تنہائی محسوس کرتی ہوں گی، اگرچہ ان کی شادی کو اب تیرہ سال سے زیادہ گزر چکے ہیں۔ اور اپنی اہلی زندگی سے وہ بہت خوش ہیں۔

رانی:۔ کہتے ہیں کہ وہ اپنے شوہر سے بہت محبت کرتی ہیں۔ اگر خدانخواستہ ان کے موجودہ شوہر کا انتقال ہو جائے تو کیا آپ کے خیال میں وہ دوسرا نکاح کرلیں گی؟ آپ کے یہاں ازدواج ثانی کا رواج ہے یا نہیں؟

میجر:۔ ہاں رانی صاحبہ ہمارے یہاں اس کا رواج ہے۔ لیکن اس کے یہ معنے نہیں کہ ہماری قوم کی وہ تمام عورتیں جو بیوہ ہو جاتی ہیں دوسرا شوہر کرلیتی ہیں۔ ہماری قوم کی بعض بیوائیں اپنی محبت میں اسقدر صادق ہوتی ہیں کہ وہ بیوہ ہونے کے بعد اپنے شوہر کے نام پر بیٹھی رہتی ہیں۔ اور یونہی زندگی گزار دیتی ہیں۔ ہاں بعض ایسی ہیں جو دوسرا نکاح کرنا پسند کرتی ہیں یا حالات انھیں ایسا کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ لیکن اِن کی تعداد اُن سے بہت زیادہ ہے۔ (کسی قدر مسکرا کر) کہتے ہیں کہ کنوارے مرد، جیسا کہ میں ہوں، بیوہ عورتوں کو بہت زیادہ پسند کرتے ہیں اور اسی وجہ سے انگلستان میں یہ مثل مشہور ہے کہ "بیوہ عورتیں خطرناک ہوتی ہیں"۔

رانی:۔ آپ نے یہ تو ضرور سُنا ہوگا کہ کلکتہ میں اس معاملہ پر بحث ہو رہی ہے کہ ہندو عورتوں کو دوسرا نکاح کرنیکی اجازت دی جائے۔

میجر:۔ (رانی کی طرف غور سے دیکھ کر)۔ ہاں! میں نے یہ بات سُنی ہے اور مجھے اس معاملہ سے دلچسپی بھی ہے۔ اس مسئلہ میں آپ کی کیا رائے ہے؟

رانی:۔ (چھت کی طرف دیکھتے ہوئے)۔ ہاں معمولی درجہ کی عورتوں کے لئے تو یہ تجویز بہت مفید ہو سکتی ہے لیکن اونچی ذات کی کوئی ہندو بیوہ، اگر دل میں یہ خواہش رکھتی بھی ہو تو دوسرا شوہر کرنے کی جسارت نہیں کرے گی کیونکہ ایسا کرنے سے ہندو سوسائٹی میں وہ اسقدر حقیر و ذلیل ہو جائے گی کہ لوگ اسے اچھوت کی طرح سمجھنے لگیں گے اور

وہ زندگی پر موت کو ترجیح دینا پسند کرے گی۔

میجر:۔ تو کیا رانی صاحبہ! آپ کے خیال میں ایک اونچی ذات کی ہندو بیوہ کے لئے یہی زندگی مناسب ہے کہ وہ دنیا بھر سے الگ تھلگ رہے!

رانی:۔ میجر صاحب! ہمارے یہاں کے رسم ورواج کا سمجھنا آپ کے لئے اسی قدر مشکل ہے جس قدر کہ ہمارے لئے آپ کے رسم ورواج کا سمجھنا۔ ہندو عورتوں کی پرورش اس عقیدہ کی فضا میں ہوتی ہے کہ بیوی اپنے شوہر کا ایک جزو لاینفک ہے۔ جس کے بغیر اس کی زندگی مکمل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں کسی ہندو لڑکی کو اچھا شوہر مل جاتا ہے تو وہ فرض سمجھتی ہے کہ شوہر کی وفات کے بعد بھی وہ اس کی وفادار رہے۔ اسی وجہ سے ہندو بیوائیں ستی ہو جایا کرتی تھیں۔ مگر چونکہ سرکار انگریزی نے ستی کی رسم ممنوع قرار دیدی ہے اس لئے وہ اپنے شوہر سے دیگر طریقوں پر اظہار وفاداری کرنے پر مجبور ہوتی ہے اسی سبب سے میں خیال کرتی ہوں کہ ہندوؤں میں اونچی ذات کی بیوائیں دوسری شادی کرنا کبھی پسند نہ کریں گی۔

میجر:۔ لیکن ان عورتوں کی نسبت آپ کا کیا خیال ہے جن کی اہلی زندگی مسرور ثابت نہیں ہوئی؟ یا جن عورتوں کے خاوندوں نے ان سے بُرا برتاؤ کیا تھا، کیا وہ بھی اپنے پہلے شوہر کے نام پر وفادار بیٹھی رہیں؟

رانی:۔ ان کے لئے یہی بہتر ہے کہ وہ اپنے خاندان کی وفادار رہیں، اپنی ذات یا برادری پر جان نثار کردیں یا اپنے راج کی خدمت کرتے کرتے فدا ہو جائیں (مسند سے اُٹھتے ہوئے)۔ یہی وہ اغراض ہیں جن کی تکمیل کے لئے اب میں زندہ ہوں، اور میجر صاحب! یہی وہ مقاصد ہیں جن کے لئے میں نے آپ سے تنہا بات چیت کرنے کی خواہش کی۔

میجر:۔ (خود بھی اُٹھتے ہوئے)۔ رانی صاحبہ! تا حد امکان مجھے آپ کی مدد کرنے میں بیحد مسرت ہوگی .... میں آپ کے خیالات وجذبات کو سمجھتا اور ان کو بنظر استحسان دیکھتا ہوں۔

رانی:۔ (جذبات کو روکتے ہوئے) میجر صاحب میرا دل گواہی دیتا ہے کہ میں آپ پر بھروسہ کرسکتی ہوں۔ لہٰذا میں جو کچھ بھی آپ سے کہوں گی وہ بالکل صاف صاف کہوں گی۔ آج شام جب میں نے آپ سے تنہا ملنے پر اصرار کیا تھا تو میں یہ چاہتی تھی کہ آپ سے دو سوال دریافت کروں۔ پہلا سوال تو یہ ہے کہ جب متوفی راجہ نے انند کمار کی صغر سنی میں مجھے جھانسی راج کے لئے نائب السلطنت نامزد کرنا چاہا تو آپ نے اس کی مخالفت کیوں کی تھی؟

میجر:۔ (سرنگوں ہو کر غور کرتا ہے)۔ اچھا اب میں آپ سے تمام حقیقت آشکار کئے دیتا ہوں بشرطیکہ آپ رازداری کا وعدہ فرمائیں (رانی سر کے اشارہ سے وعدہ کرتی ہے)۔ وجہ یہ تھی کہ میں آپ کے وزیروں کو قابل اعتماد نہیں سمجھتا تھا۔ اس لئے میرے دل میں اندیشہ ہوا کہ یہ لوگ آپ کے باپ کے ساتھ مل کر محض اپنے ذاتی اغراض کے لئے جھانسی راج میں سیاہ و سفید کے مالک ہو جائیں گے۔ اور اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے آپ کو اپنا آلۂ کار بنالیں گے۔

رانی :۔ کیا اب بھی آپ کا خیال وہی ہے ؟
میجر :۔ نہیں رانی صاحبہ! اب میں ایسا نہیں کہہ سکتا۔ بلکہ اب تو یہ خیال ہے کہ جس طرح اہلیا بائی نے اندور کو بچایا غالباً اسی طرح آپ بھی جھانسی راج کو بچا سکیں گی۔
رانی :۔ (مذہبی جوش میں آکر) آہ میجر صاحب! کاش میں دیوی سروپ اہلیا بائی کے نقش قدم پر چلنے کے قابل ہوتی وہ اوتار ہے اور میں اس کی پجاری۔ وہ گرو ہے اور میں اس کی چیلی۔
میجر :۔ اور رانی صاحبہ! آپ کا دوسرا سوال!
رانی :۔ (پہلے پس و پیش کرتے ہوئے اور پھر جرأت کے ساتھ) میجر صاحب! آپ ایک قابل اعتماد دوست ہیں۔ لہذا مناسب ہوگا کہ ہم دونوں صفائی سے گفتگو کریں۔ (آواز دھیمی کرکے) میں یہ معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ جو مصیبت جھانسی راج پر نازل ہوتی نظر آتی ہے، کیا وہ گورنر جنرل سے لیکر آپ تک، کسی شخص کو کچھ دے دلا کر ٹل سکتی ہے؟ اگر ایسا ہوسکتا ہے تو از راہِ مہربانی بتایئے کہ کتنی رقم کس کو نذر کی جائے۔ (بلند آواز سے) جو کچھ بھی ہو میں نے جھانسی کو بچانے کا تہیہ کرلیا ہے۔
میجر :۔ (اٹھ کر گویا جانا چاہتا ہے)۔ رانی صاحبہ! آپ اپنا اور میرا دونوں کا وقت ضائع کر رہی ہیں۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا، اور سرکار انگریزی کے ساتھ رشوتوں سے معاملہ طے نہیں کیا جاتا۔
رانی :۔ (طنزیہ) ممکن ہے میجر صاحب زمانہ بدل گیا ہو لیکن آدمی جیسے تھے ویسے ہی ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ آجکل انگریزی افسران اپنے لئے روپیہ نہ لیتے ہوں، مگر جس گورنمنٹ کے وہ ملازم ہیں وہ روپیہ کے بجائے ہماری املاک و جائدادیں غصب کرتی رہتی ہے۔ (کسیقدر نرمی سے) میجر صاحب! معاف فرمایئے میں آپ کو رنجیدہ کرنا نہیں چاہتی تھی۔ آپ ایک دل شکستہ اور مصیبت زدہ عورت کی مفوات کو معاف کر دیجئے کیونکہ وہ دنیا کے طور و طریق سے واقف نہیں۔
میجر :۔ (رانی کی طرف متوجہ ہوکر) میں تو آپ سے بیشتر ہی عرض کرچکا ہوں کہ اپنی قابلیت کی حد تک میں آپ کی مدد کرنے کو طیار رہوں۔ اب آپ ہی فرمائیں کہ میں اس سے زیادہ کیا کرسکتا ہوں؟
رانی :۔ (دھیمی مگر لجاجت آمیز آواز میں) میجر صاحب! مجھے آپ کی مدد سے زیادہ کچھ اور درکار ہے۔ آپ مجھ سے اس بات کا وعدہ کیجئے کہ میری جھانسی مجھ سے نہ چھینی جائے گی۔ یہ میری جان ہے، یہ میری اولاد ہے، یہی میری زندگی کا سہارا ہے۔ اور خواہ کچھ ہو، میں جھانسی کو اپنے ہاتھ سے نہ جانے دوں گی۔ (قریب آکر اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر) میجر صاحب! ابھی آپ کنوارے ہیں۔ اور ممکن ہے کہ روپیہ نہیں تو ایک صاحب عصمت ہندو بیوہ کا نرم و نازک جسم آپ کو راضی رکھ سکے ۔۔۔ بہر حال میں صرف جھانسی کے لئے جیتی ہوں، اور میں اس کے لئے ہر چیز

کھانے کے بعد ایک اسقاطِ حمل کا ذکر ہو رہا تھا جو حال ہی میں ہوا تھا۔ خاتون نے تیوری چڑھا کر کہا:۔
یہ کیونکر ممکن ہے کہ ایک قصائی کے لڑکے سے تعلق رکھنے والی لڑکی اپنے بچے کو ایک کھائی میں پھینکدے! کسقدر وحشت انگیز، کس قدر تکلیف دہ واقعہ ہے!"

ڈاکٹر جو شام کا کھانا ہمارے ساتھ کھانے والا تھا نہایت استقلال و خاموشی سے اس واقعہ کی تمام جزئیات کا ذکر کر رہا تھا کبھی وہ بدقسمت ماں کی جرأت پر تعجب کرتا جس نے تنہا اس بچے کو جنا اور اس کے بعد اس کو ہلاک کرکے تقریباً دو میل پیدل چلی گئی۔ اس نے کہا کہ "رات کے سناٹے میں اپنے بچے کو لیکر جنگل میں جاتا کتنا سخت کام ہے ذرا اس کی روح کی دہشت اور قلب کی اذیت کا خیال کیجئے! اُف، زندگی کتنی حقیر کتنی قابل نفرت ہے، ہاں مکروہ تعصب، ارتکاب جرم سے بدتر پاس عزت کا جھوٹا خیال، مصنوعی احساسات کا ایک نفرت انگیز آبرو اور فتنہ انگیز شرافت ــ یہی وہ اسباب ہیں جو ایسی حرکتوں پر عورت کو مجبور کر دیتے ہیں۔ حقیقۃً یہ ہے کہ "انسانوں کے فطری اتحاد کو جرم بنا دینا نوع انسان کے لئے باعث شرم ہے!"

خاتون غصہ سے سرخ ہو گئی۔ "تو ڈاکٹر تم بدی کو نیکی پر ترجیح دیتے ہو۔ ایک فاحشہ کو باعصمت عورت سے افضل سمجھتے ہو!

ڈاکٹر جس نے اپنے پیشے کے سلسلے میں بے شمار "زخم ہائے حیات" دیکھے تھے اُٹھ کھڑا ہوا اور زور دیکر کہنے لگا:۔ "آپ بحث کر رہی ہیں اُن باتوں پر جن سے آپ ناواقف ہیں کیونکہ آپ کو کبھی غیر مغلوب نفسانی خواہش پیدا ہی نہیں ہوئی۔ بدقسمت در اصل وہ لوگ ہیں جن کو دغا باز فطرت نے قوی خواہشات عنایت کی ہیں۔ خاموش آدمی جو بغیر قوی احساسات کے پیدا ہوئے ہوں اُن کے لئے نیک رہنا کوئی مشکل نہیں۔ مشکل اُن کے لئے ہے جن کے جذبات طوفانی سمندر کی طرح ناقابل ضبط ہیں۔ وہ عورتیں جو بدنام نہیں، وہ ہیں جن کی طبیعت میں یہ جوش نہیں ہے اور میں اُن کی عصمت و شرافت کو لائقِ تحسین نہیں سمجھتا کیونکہ اُن کو کسی طاقت کا مقابلہ ہی کرنا نہیں پڑتا۔ لیکن میں سچ کہتا ہوں کہ روس کی کیتھرائنیں اور امیرزادیاں کبھی باعصمت و شریف نہیں رہ سکتیں۔ اُن کے لئے باعصمت رہنا ناممکن ہے

وہ پیدا ہوئی ہیں پیار کئے جانے کے لئے۔ اُن کے اعضا مختلف ہوتے ہیں، اُن کا گوشت دوسرا ہوتا ہے۔ وہ زیادہ حساس ہوتی ہیں۔ کسی دوسرے جسم کا اتصال اُن میں بہت جلد شوریدگی پیدا کردیتا ہے۔ اُن کی رگ رگ ترغیب دیتی ہے، پریشان کرتی ہے اور بالآخر اُن کو مغلوب کرلیتی ہے جبکہ آپ کو اُس کا کچھ بھی احساس نہیں ہوتا۔ اچھا آپ ایک باز کو پالئے اور اُس کو وہی بیج کھلائیے جو آپ ایک طوطے کو دیا کرتی ہیں! اگرچہ دونوں پرند ہیں اور دونوں کی چونچیں مُڑی ہوئی ہیں لیکن اُن کے خصائل مختلف نظر آئیں گے۔

کاش آپ کو صرف احساسات کی طاقت کا اندازہ ہوتا کہ کس طرح وہ رات رات بھر آگ میں جلاتے رہتے ہیں۔ جسم پھُن رہا ہے، دل دھڑک رہا ہے اور دماغ عجیب قسم کی اذیت کا شکار ہے۔ ایک واقعہ سنئے:۔

"ایک عورت جس کو میں میلین کے نام سے موسوم کروں گا اُسوقت سے جبکہ وہ بچہ ہی تھی شہوانی جذبات کی حامل تھی۔ اُس کے احساسات اُسی وقت بیدار ہوچکے تھے جبکہ وہ باتیں کرنا سیکھ رہی تھی۔ جب وہ بارہ سال کی تھی تو مجھ سے مشورہ طلب کیا گیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ پوری عورت ہے اور خواہشاتِ شہوانی نے اُس کو مستقل طور پر پریشان کر رکھا ہے۔ اس امر کی گواہی اُس کا چہرہ دے رہا تھا۔ اُس کے خفیف سے اُبھرے ہوئے گداز، قوی گردن، بجائے ... ناک، جوڑے نتھنے، بڑی بڑی سُرمگیں آنکھیں! کون اس کے پُرجوش خون کو ٹھنڈا کرسکتا تھا؟ وہ ساری میجر:—لاٹھ کرکو... ...ی۔ بالآخر جب وہ پندرہ برس کی ہوگئی تو اُس کے والدین نے شادی کردی۔ دو برس بعد اُس کے رہا، اور سرکار ... سے خاتمہ ہوگیا۔ اسی کی بدولت وہ نحیف وکمزور ہوگیا تھا۔ اٹھارہ ماہ بعد دوسرے شوہر کا بھی یہی حشر ہوا رانی:— ...نے چار سال تک ساتھ دیا اور پھر اُس کو چھوڑ کر چلتا بنا۔ یہ بڑا سخت زمانہ تھا۔

اف ...

جب وہ اکیلی رہ گئی تو اُس نے باعصمت رہنے کی کوشش کی۔ بہرحال ایک دن اُس نے مجھے بلوا بھیجا کہ اس پر تشنج کے دورے پڑ رہے ہیں اور وہ نہایت پریشان ہے۔ میں نے دیکھا کہ بیوگی اُس کا خاتمہ کردے گی چنانچہ میں نے اُس سے کہہ دیا کہ وہ کسی سے شادی کرلے۔ وہ ایک ذی عزت عورت تھی۔ باوجود شدید اذیتیں سہنے کے اُس نے میرے مشورے پر عمل نہیں کیا۔ دیہاتی کہتے تھے کہ وہ پاگل ہوگئی ہے رات کے وقت وہ دور دور کے چکر لگاتی تاکہ اُس کا جسم تھک کر چور چور ہوجائے۔ پھر وہ غش کھا کر گر پڑتی اور خوفناک تشنج کے دورے ہوا کرتے اپنی والدہ اور دیگر اعزہ کے مکان کے قریب وہ تن تنہا اپنے مکان میں رہا کرتی تھی۔ میں وقتاً فوقتاً اُسے دیکھنے جایا کرتا تھا اور حیران تھا کہ فطرت کی اٹل مرضی اور اُس کی اپنی ہٹ کا آخر انجام کیا ہوگا؟

ایک دفعہ شب کے آٹھ بجے جبکہ میں کھانا تقریباً ختم کرچکا تھا وہ میرے مکان پر آئی، اُس نے کہا:۔

"میں برباد ہوگئی۔۔ میں حاملہ ہوں! — یہ سنکر میں حیران رہگیا"

اس کے بعد یکایک میرے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے اُس نے اضطراب سے کہا:۔

"ڈاکٹر یہ حمل میرے پاس کے باغبان کا ہے۔ پارک میں ٹہلتے ہوئے مجھے غش آ گیا۔ مجھے گرتا دیکھ کر وہ دوڑا ہوا آیا اور اندر لیجانے کے لئے اُس نے مجھے اپنے بازوؤں میں سنبھال لیا، میں نے کیا کیا؟ مجھے خبر نہیں۔ تم میری شرمناک بیماری سے واقف ہو۔ اس طویل قصہ کا خلاصہ یہ ہے کہ میں گناہگار ہوں۔ میں زیادہ ضبط نہ کر سکتی تھی۔" اس کے بعد وہ اپنی ہچکیوں کو روک کر بولی کہ "میں نے اسقاط حمل کی کوشش کی، کھولتے ہوئے پانی میں نہائی، گھوڑوں پر سواری کی جمناسٹک کی۔ دوائیں، شراب اور زعفران استعمال کی مگر لاحاصل۔ تم میرے والد اور بھائیوں کو جانتے ہو، میں برباد ہو گئی۔ میری بہن کی ایک ذی عزت شخص سے شادی ہو چکی ہے، میری بے عزتی کا اُن پر اثر پڑے گا۔ پھر ہمارے دوستوں، ہمسایوں اور نام کا خیال کرو۔ میری ماں........"

وہ ہچکیاں لینے لگی۔ میں نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور اُس سے سوالات کرنے لگا۔ اس کے بعد میں نے اُس کو ایک طویل سفر پر چلے جانے کا مشورہ دیا تاکہ وضع حمل گھر سے دور ہو۔ اُس نے کہا:۔ "ہاں۔۔ ہاں...... بہت اچھا" پھر بغیر یہ سُنے ہوئے کہ میں کہہ کیا رہا ہوں وہ چلی گئی۔

اُسے دیکھنے میں بارہا جاتا رہا۔ اُس کو جنون ہوتا جا رہا تھا۔ اُس بچے کے احساس نے جو اُس کے پیٹ میں پرورش پا رہا تھا، اُس کے دماغ پر ایک تیز تیر کا سا اثر کیا تھا۔ اُس کو ہمیشہ اُسی کا خیال لگا رہتا۔ دن میں نہ وہ باہر نکلتی اور نہ کسی سے ملتی تھی تاکہ کہیں اس قابل نفرت راز کا افشا نہ ہو جائے۔ روزانہ شب کو وہ آئینہ کے سامنے لباس اُتار کر اپنے شکم کی بدوضعی کرتی۔ پھر اپنے آپ کو خاک پر گرا دیتی اور اپنی چیخوں کو روکنے کے لئے منھ میں تولیہ ٹھونس لیتی۔ رات میں بیسیوں دفعہ وہ اپنے بستر سے کودتی، موم بتی روشن کرتی اور اُس بڑے آئینے کے سامنے واپس آجاتی جس میں اُس کے بدنما عریاں جسم کا عکس نظر آتا تھا۔ رنج و غصہ سے وہ اپنی ناف پر گھونسے مارتی تاکہ اُس بچہ کا خاتمہ ہو جائے جس سے خود اُس کی جان کا خطرہ تھا۔ دونوں کی لڑائی نہایت خوفناک تھی لیکن بچہ نہیں مرا۔ اُسکو کچل ڈالنے کے لئے وہ فرش پر لوٹتی اور سوتے وقت اپنے جسم پر پتھر رکھتی تاکہ اُس کا دم گھٹ جائے۔ وہ بچے سے ایسی نفرت کرتی تھی جیسے کوئی اپنے زبردست دشمن سے کرتا ہے۔

بچے سے اپنا پیچھا چھڑانے کی ان ناکام مشقتوں کے بعد، ان غیر فطری کوششوں کے بعد وہ دیوانہ وار کھیتوں میں ماری ماری پھرتی۔ ایک دن صبح کو دیکھا گیا کہ وہ اپنے پاؤں چشمے میں ڈالے ہوئے بیٹھی ہے اور آنکھوں میں ایک مجنونانہ چمک ہے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ اُس کو سرسام ہو گیا ہے لیکن وہ اصل حقیقت سے ناواقف تھے اس ملعون بچے کو اپنے جسم سے نکال پھینکنے کے خیال نے اُسکے دل و دماغ کو بیکار کر رکھا تھا۔

ایک مرتبہ شام کے وقت اُس کی ماں نے مسکراتے ہوئے کہا:۔ تم کیسی موٹی ہوتی جا رہی ہو میلین۔ اگر تم شادی شدہ ہوتیں تو میں یہ سمجھتی کہ بچہ ہونے والا ہے۔

ان الفاظ سے اُس کو سخت صدمہ ہوا۔ وہ فوراً وہاں سے اپنے گھر چلی آئی اور نیچے باورچی خانے میں جاکر الماری کھولی اور ایک بڑا چاقو نکالا۔ پھر دوبارہ بالاخانے پر گئی موم بتیوں کو روشن کیا اور آئینے کے روبرو ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کے بعد اُس نے اُس مقام کو محسوس کیا جہاں بچہ حرکت کر رہا تھا اور پھر چاقو کی ایک ہی ضرب میں اپنا پیٹ اوپر سے نیچے تک چاک کر ڈالا۔

اُس نے اپنے دشمن کو پکڑ لیا جو اب تک اُس کی گرفت سے بچتا رہا تھا۔ اُس کی ٹانگ پکڑی اور چیر کر اُس کو آتشدان میں پھینکنا چاہا۔ لیکن وہ نال سے جڑا ہوا تھا جس کو وہ کاٹ نہ سکی تھی۔ آخر کار اُس کا بھی دم نکل گیا اور خون میں ڈوبی ہوئے بچے کی نعش پر گر پڑی۔

پھر بتائیے کیا آپ اُس کو بڑی بدکار خیال کرتی ہیں؟"

ڈاکٹر خاموش ہوگیا اور جواب کا انتظار کرنے لگا۔ لیکن خاتون نے کوئی جواب نہ دیا۔

(موپاساں) سید محمد احسن بی۔ اے حیدر آبادی

(نگار) موپاساں کے فسانے اکثر و بیشتر سوسائٹی کے ان مسایل سے متعلق ہوتے ہیں، جن کو دوسرے افسانہ نگار نفسیاتی نقطۂ نظر کی بجائے اخلاق کے اُصول کو سامنے رکھ کر دیکھتے ہیں۔

موپاساں کسی جرم و معصیت کو سوسائٹی کے بنائے ہوئے قوانین کی روشنی میں نہیں دیکھتا بلکہ وہ فطرت انسانی کے ماتحت اس کا مطالعہ کرتا ہے، اس لئے وہ ایک مجرم کو ہمیشہ رحم و عفو کے قابل سمجھتا ہے اور اس کی عقوبت و سزا کا موافق نہیں۔ وہ جانتا ہے کہ فطرت قانون کے درمیان ہمیشہ جنگ جاری رہنا ہی ثبوت ہے اس امر کا کہ قانون، داعیات قدرت کے خلاف کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا اور جرم و معصیت حقیقتاً ایک بیماری ہے جس پر انسان کو قابو نہیں۔

اس فسانہ میں اس نے عورت اور اس کی خواہش نفسانی کو سامنے رکھ کر "عصمت و عفت" کا مفہوم متعین کرنا چاہا ہے اور بہ حالات موجودہ جبکہ عورت کی تعلیم و آزادی کا مسئلہ عام توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے اس مسئلہ پر خصوصیت کے ساتھ غور کرنا ہر متمدن انسان کا فرض ہے۔

اس دور آزادی میں عورت کو سب سے بڑی شکایت یہی ہے کہ اگر مرد جذبۂ شہوانی سے مغلوب ہوکر کوئی نازیبا حرکت کر بیٹھتا ہے تو سوسائٹی اس کی طرف سے منہ پھیر لیتی ہے اور عورت اگر اسی کی مرتکب ہو تو اس کو بدترین مجرم جانکر سوسائٹی سے علحدہ کر دیا جاتا ہے۔ ممکن ہے علمائے تمدن و اخلاق اس کی کوئی تاویل پیش کر سکیں، لیکن جس حد تک اُصول اور فطرت کا سوال ہے، اس کا کوئی قابل

اطمینان جواب مرد کی طرف سے نہیں دیا جاسکتا۔ موجودہ علماء نفسیات کا خیال ہے کہ دنیا میں جرم و معصیت کو مکروہ سمجھ کر سزا جسمانی سے اس کا علاج چاہنا سخت غلطی ہے اور اس غلطی کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ باوجود قانون کی اس دار و گیر کے جرائم کی طرف انسان کا میلان بدستور قائم ہے۔

گناہ ایک فطری مجبوری یا نفسیاتی بیماری ہے اور اس کا علاج بھی بالکل فطرت و نفسیات کے اُصول پر ہونا چاہئے نہ یہ کہ اظہار نفرت و بیزاری سے مجرم یا گناہگار میں جذبۂ انتقام پیدا کر کے اسکو اور زیادہ معصیت کی طرف مایل کیا جائے۔

آجکل نگار میں کسبی کے موضوع پر جو اظہار خیال کیا جا رہا ہے اس کو اس فلسفۂ "جنایات" سے بڑا گہرا تعلق ہے، لیکن افسوس ہے کہ لوگ گفتگو کے وقت اس کو بالکل نظر انداز کر جاتے ہیں اور صرف ان اصولِ اخلاق کو سامنے رکھتے ہیں، جو خود ہمارے ہی وضع کئے ہوئے ہیں اور یقیناً وقت و احول کے لحاظ سے بدلجانے والی چیزیں ہیں۔

سوا سو سال قبل دکن کی شاعری

نواب بدر الدین خاں تمیز

خاندان شمس الامرا علم و فضل کے اعتبار سے دکن میں بہت ممتاز مرتبہ رکھتا ہے۔ نواب بدر الدین خاں بہادر رفعت جنگ معظم الدولہ معظم الملک اسی خاندان کے ایک فرد تھے اور شاعری کا پاکیزہ ذوق رکھتے تھے آپ کا مکمل (مطلا و مذہب) دیوان کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔

اس خاندان کی مختصر تاریخ یہ ہے کہ ابوالخیر خاں (جن کا سلسلہ نسب حضرت شیخ فرید گنج شکرؒ سے مل کر حضرت عمر پر ختم ہوتا ہے) شیخ بہاء الدین خاں کے فرزند تھے جو شکوہ آباد ضلع مین پوری کے باشندے تھے۔ عنفوانِ شباب میں محمد شاہ بادشاہ دہلی سے خان بہادر کا خطاب پایا اور آصف جاہ اول کے ساتھ دکن آئے اور دو ہزاراہ ہوار منصب پانچسو سوار اور تیس ہزار پیادہ کی جاگیر سے سرفراز ہوئے۔

نواب ناصر جنگ شہید جب اپنے والد آصف جاہ اول سے معرکہ آرا ہوئے تو ان کو بھی اپنا طرفدار بنانا چاہا مگر انھوں نے یہ کہکر انکار کر دیا کہ باپ کے ملازم کے لئے اسوقت بیٹے کا ساتھ دینا جبکہ وہ باپ کا مخالف ہو سخت نمک حرامی ہے۔ ناصر جنگ کو اس سے سخت ملال ہوا اور انھوں نے تخت نشین ہونے کے بعد جاگیر ضبط کر لی مگر پھر بحال کر کے شمشیر بہادر کا خطاب دیا۔

نواب ہدایت محی الدین خاں مظفر جنگ بہادر نے تخت نشین ہو کر ان کو برہان پور کی سند دی اور نواب صلابت جنگ بہادر نے پالکی جھالر دار اور "امام جنگ" خطاب مرحمت فرمایا۔

ابوالخیر خاں شمشیر بہادر امام جنگ نے ۲۶ ربیع الاول ۱۱۶۴ھ کو بعارضہ فالج برہان پور میں انتقال کیا اور وہیں دفن ہوئے آپ کے دو فرزند تھے ایک ابوالفتح خاں تیغ جنگ ابوالخیر خاں ثانی شمس الدولہ شمس الملک اول شمس الامرا بہادر، دوسرے شیخ ابوالبرکات خان بہادر امام جنگ محمد بہاء الدین خاں ثانی جنھوں نے اپنے والد کی زندگی ہی میں کسی جنگ میں زخمی ہو کر برہان پور میں انتقال کیا۔

ابوالفتح خاں اپنی جاگیر موضع لارشاگر میں رہا کرتے تھے رکن الدولہ کے انتقال کے بعد سرکار نے انھیں دیوان مقرر کرنا چاہا مگر انھوں نے انکار کر دیا، پائگاہ کے ایک خاص رسالہ کے علاوہ بارہ ہزار فوج بھی تھی ۱۱۹۱ھ میں اصل کے علاوہ پنج ہزاری منصب، پانچ ہزار سوار، علم، نقارہ اور جھالردار پالکی، شمس الدولہ خطاب مرحمت ہوا۔

انھوں نے ۲۵ ربیع الثانی ۱۲۰۵ھ کو پانگل کے مقام پر انتقال کیا اور حیدرآباد میں درگاہ برہنہ شاہ میں مدفون ہوئے مرحوم نے اپنے پسماندوں میں ایک فرزند محمد فخرالدین خاں شمس الامراء امیر کبیر اول چھوڑا جو ۵ ار رمضان ۱۱۹۵ھ کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے اور ۱۱۹۹ھ میں بہادالدین خاں اور جنگی، دولائی، ملکی خطاب پایا اور پھر امام جنگ خورشید الدولہ خورشید الملک شمس الدولہ شمس الملک شمس الامراء ابوالخیر خاں، دس ہزار منصب دس ہزار سوار، ماہی مراتب، علم، نقارہ پالکی جھالردار، عماری دوہری جھالردار، مورچھل، جواہرات و محلات متفرقہ محاصلی چالیس لاکھ سے سرفراز ہوئے۔

۱۲۱۵ھ میں نواب نظام علی خاں بہادر نے اپنی صاحبزادی بشیر النساء بیگم صاحبہ کو آپ کے عقد نکاح میں دیکر عزت افزائی کی۔ آپ کو ریاضیات اور فلکیات کا شوق تھا۔ عربی فارسی کے علاوہ فرانسیسی کے بھی ماہر تھے آپ کی تالیفات سے "ستہ شمسیہ" اور "منتخب البحر" وغیرہ مشہور ہیں اول الذکر کتاب ایک فرانسیسی ماہر ریاضیات موسیو کلارک کی تصنیف کا ترجمہ ہے جو ریاضی کی اعلیٰ تصنیف ہے عربی اور فارسی کے علاوہ غیر زبان سے جو پہلا ترجمہ دکن میں ہوا غالباً وہ یہی "ستہ شمسیہ" ہے۔

آپ نے ۱۹ ارشوال ۱۲۷۹ھ کو انتقال کیا اور برہنہ شاہ صاحب کی درگاہ میں دفن ہوئے۔ آپ کے پانچ فرزند تھے۔

۱۔ نواب فخرالدین خاں بہادر جو ۱۲۱۷ھ میں پیدا ہوئے اور چودہ سال کی عمر میں ۱۲۳۱ھ میں انتقال کیا۔

۲۔ نواب رفیع الدین خاں بہادر نامور جنگ عمدۃ الملک شمس الامراء ثالث امیر کبیر ثانی۔

۳۔ نواب سلطان الدین خاں بہادر سیف جنگ محتشم الدولہ بشیر الملک ۱۲ ار رمضان ۱۲۲۹ھ کو پیدا ہوئے اور ۱۵ ارذیقعدہ ۱۲۶۱ھ کو انتقال کیا۔ آپ کے دو فرزند وزیر الدین خاں محتشم جنگ (ولادت ۱۲۵۴ھ وفات ۱۲۹۷ھ) اور مظہر الدین خاں بہادر رفعت جنگ بشیر الدولہ آسمان جاہ تھے۔

۴۔ نواب بدرالدین خاں بہادر، رفعت جنگ معظم الدولہ معظم الملک متخلص بہ تمیز۔

۵۔ نواب رشید الدین بہادر اقتدار الملک امیر کبیر ثالث۔ نواب بدرالدین خاں بہادر، فخرالدین خاں امام جنگ امیر کبیر اول کے چوتھے فرزند تھے۔

بدرالدین خاں بہادر ۲۵ ر صفر ۱۲۲۰ھ کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم و تربیت نہایت اعلیٰ پیمانہ پر ہوئی قرآن مجید حفظ کیا اور فنون سپہ گری میں خاصی مہارت حاصل کی۔ ۱۲۴۵ھ میں نواب ناصر الدولہ بہادر نے اپنی تخت نشینی کی دوسری سالگرہ کے موقع پر رفعت جنگ معظم الدولہ خطاب مرحمت فرمایا۔ ۱۲۴۹ھ میں ۲۲ رذیحجہ کو حمید الدولہ

علی اللہ خاں بہادر کی صاحبزادی سے شادی ہوئی ۱۶ ر ذیحجہ سے شادی کی دعوتیں شروع ہوئیں اور ہر طبقہ کے لئے علحدہ علحدہ انتظام کیا گیا۔ ۱۷ ر ذیحجہ کو مہاراجہ چندو لال بہادر کی دعوت کی گئی، اور رات میں امرائے دربار مدعو کئے گئے۔ ۲۲ ر ذیحجہ کو جلوہ ہوا اور کئی روز تک جشن رہا۔

۱۲۵۶ھ کو بہ تقریب جشن نوروز معظم الملک خطاب عطا ہوا۔ ۲۴ ر رمضان ۱۲۶۱ھ کو بدر الدین خاں حج و زیارت کے لئے روانہ ہوئے اور ذیقعدہ ۱۲۶۲ھ میں حج و زیارت سے مشرف ہو کر واپس آئے۔ شمس الامراء بہادر عمدۃ الملک و اقتدار الملک وغیرہ نے آصف نگر تک بڑھ کر استقبال کیا اور عماری میں سوار کرا کر روپیہ نثار کرتے ہوئے واپس لائے۔

آخر ربیع الاول ۱۲۶۹ھ کو انچاس برس کی عمر میں انتقال کیا اور حیدر آباد میں دفن ہوئے مولف تاریخ رشید الدین خانی نے "حیف معظم الملک" میں تاریخ نکالی ہے۔ ایک خرد سال لڑکی بدر الدین خاں کی یادگار تھی مگر اس نے بھی قبل بلوغ انتقال کیا۔

مولف تاریخ خورشید جاہی لکھتے ہیں کہ "نہایت ذی جرأت، صاحب ہمت، بلند ارادہ حاجی، شاعر خوش فکر خط ظفر خوب لکھتے تھے"۔ مولف تاریخ گلزار آصفیہ نے ان خاص الفاظ سے تعارف کرایا ہے " امیر بیست عالی ہمت صاحب نفس قدسیہ، حافظ قرآن شریف کلام الٰہی، غریب پرور، ترحم شعار برحال افتادگان روزگار، غم خوار، قدر دان اہل علم، بہ علوم عقلی و نقلی یکتائے عصر، کشادہ جبیں"۔

مولف تاریخ رشید الدین خانی کا بیان ہے کہ درگاہ اُجالا شاہ صاحب کے میدان میں بدر الدین خاں بہادر حضور پرنور کے ہمراہ تھے اتفاقاً آپ کا ہاتھی بھڑک گیا اور چنگھاڑیں مارتا ہوا خاصہ کی ہتنی کے پاس پہونچ گیا جس پر بندگان عالی تشریف فرما تھے، بدر الدین خاں بہادر ہاتھی پر سے کود پڑے اور تلوار کھینچ کر سونڈ پر دو وار ایسے کئے کہ ہاتھی منہ پھیر کر بھاگا اور آپ گھوڑے پر سوار ہو کر سواری مبارک کے ہمراہ واپس ہوئے ڈیوڑھی پر آئے تو شمس الامراء بہادر نے سینہ سے لگا لیا اور اس جسارت اور بہادری کی تعریف کی۔

جناب عمر یافعی کے پاس ایک قلمی تذکرہ نقش کا ہے جس میں بدر الدین خاں بہادر تمیز تلمیذ فیض لکھا ہے اس کے علاوہ ہمیں کسی اور جگہ آپ کے تلمذ کا حال نظر نہیں آیا فیض سے تلمذ رکھنا قرین قیاس بھی ہے اس لئے کہ حضرت فیض ہمعصر تھے اور شمس الامراء کے دربار سے بھی تعلق رکھتے تھے۔

بیعت کی نسبت کسی نے کچھ نہیں لکھا مگر وہ خود کہتے ہیں ؎

جب سے بدر الدین ہوا بندہ رفیع الدین کا تب سے اس کے اور ہی رتبہ ہوا آئین کا

مولف گلزار آصفی کا بیان ہے کہ مولانا رفیع الدین قندہار (دکن) کے باشندے تھے نواب سکندر جاہ بہادر کے

زمانہ میں حیدرآباد تشریف لائے اور ہزاروں آدمیوں کو مُرید کیا روزانہ اس قدر ہجوم رہنے لگا کہ آپ کے گھر پر سے آمد و رفت مشکل ہوگئی نواب اعظم الامراء ارسطو جاہ بہادر کو یہ بھیڑ بھاڑ پسند نہ آئی اور انھوں نے حضور میں عرض کیا کہ مولانا کے مُریدوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے اگر یہی جوش و خروش رہا تو وہ دن قریب ہیں کہ حضور اور میں بے کار ہو جائیں گے اور مولانا کی حکومت رہے گی ان کا بلدہ میں رہنا قرین مصلحت نہیں۔ اسی معروضہ کی بنا پر مولانا کو وطن واپس جانے کا حکم ملا اور وہ قندھار تشریف لے گئے۔

یہ لطیفہ بھی قابل ذکر ہے کہ مولانا کے بلدہ سے جاتے ہی نواب اعظم الامراء ارسطو جاہ کے معروضہ کو ان کی شیعیت اور تعصب پر۔ اعظم الامراء کی موت کے متعلق کہ وہ قضائے الٰہی سے مرے یا مولانا کی بددعا سے ہم کچھ کہنا نہیں چاہتے مگر ان کے معروضہ کے متعلق اسقدر ضرور کہیں گے کہ مصلحت وقت یہی تھی اور ایک مدبر دیوان کو یہی کرنا چاہیئے تھا جو انھوں نے کیا ورنہ وہ مذہبی لحاظ سے بالکل غیر متعصب تھے۔ گلزار آصفیہ میں لکھا ہے کہ حضرت مغفرت منزل کے عہد میں شمس الامراء بہادر امیر کبیر اول نے مولانا رفیع الدین کو پھر قندھار سے بلوایا اور جان علی خاں کے مقبرے کے باغ میں ٹھہرایا اسوقت مولانا کے دیدۂ ظاہری بند ہو چکے تھے اور عام لوگوں سے ملتے بھی نہ تھے۔ چند روز ٹھہر کر شمس الامراء بہادر کے تمام خاندان کو مُرید کیا اور پھر قندھار واپس تشریف لے گئے اور وہاں پہونچتے ہی انتقال فرمایا۔

بدر الدین خاں تمیز کا دیوان بڑی تقطیع کے ۱۵۰ صفحات ۱۵ سطری مسطر پر ہے پورے دیوان کے حاشیہ کی لکیر طلائی ہے، سرورق (لوح) مطلا و مذہب ہے اکثر غزلیں بڑی بڑی ہیں دو غزلہ سہ غزلہ اکثر ہیں۔ چار مخمس ہیں، ایک سودا ایک ہمدم ایک جرأت ایک آفاق کی غزل پر ایک قصیدہ بھی ہے اور ایک ترجیع بند جس کے (۱۸) بند ہیں اس کا خط نہایت ہی پاکیزہ اور کاغذ بہت ہی عمدہ ہے یہ نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں آخر آبان ۱۳۲۶ف میں داخل ہوا۔ مشہور اساتذہ کی غزلوں کے جواب میں غزل کہی ہے۔ ہر ایک غزل پر " درجواب فلاں " لکھا ہوا ہے۔

میر کی مشہور غزل پر چند شعر نقل کیے جاتے ہیں:۔

گو جب کہ چمن میں وہ نونہال گیا — خرام ناز سے ہر گل کو پائمال کیا
کبھو نہ ایک بھی اس کے اثر کیا دل پر — اگرچہ ہجر میں نالے ہزار سال کیا

اور ایک میر کی غزل کا جوابی شعر دیکھئے:۔

گزیست اس طرح کی بس از مرگ دہر میں — تا سب کہیں یہ روز کوئی نیک مرد تھا

سودا کی ایک غزل پر غزل کہی ہے، اس کا ایک شعر ملاحظہ ہو:۔

جب دیا بادہ بصد غصہ دیا ساقی نے — ہاتھ سے اس کے خوشی سے نہ کبھو جام لیا

شاہ نصیر کی دو غزلوں کا جواب لکھا ہے جس کے دو شعر یہ ہیں :۔

تھے جو منعم انکے ہے بس مانڈ گوں کا یہ معاش کھودنا اور نگھری اپنے ناک پتھر بیچنا

دیکھ کر جلوہ مرے رشکِ مہ پیکر نور کا بھول جاویں حضرت موسیٰ جھگڑا طور کا

ذوق پر زیادہ مہربانی تھی ان کی اکثر غزلوں پر غزلیں کہی ہیں۔ دو شعر ملاحظہ ہوں :۔

شورِ شن وہ اور بھی برہم ہوا نازک مزاج نالۂ دل کا مرے اس کو اثر اچھا ہوا

وہ ہے مشکل کشا ہے شرم تیری اے تمیز اسکو میں اپنی مشکلیں سب حیدر کرار کو سونپا

ظفر کی غزل پر بھی غزل کہی ہے اس پر لکھا ہے "در جواب مرزا ابوظفر ولیعہد فرزند کلاں بادشاہ دہلی آمدہ"

اس کے ہنسنے سے مرا غنچۂ دل تنگ کھلا باغ میں کوئی بھی بلبل نہ گل سا اس رنگ کھلا

سلیمان شکوہ کی غزل کا جواب بھی دیا ہے :۔

بیتاب دل ہمارا شب یار بن تمیز آہ سو بار گھر میں آیا سو بار گھر سے نکلا

سراج کی غزل کے جواب میں ایک شعر ملاحظہ ہو :۔

صبر و شکیب تاب و تواں کے اُڑے حواس اس کے جو تیر ناز نے دل میں اثر کیا

آفاقی کی غزلوں کا جواب بھی ہے۔

یہ بادِ صبا تو نے کیا شغل کیا پیدا شبنم کو رلا دینا اور گل کو ہنسا دینا

سادہ رو کے رخ پہ شاید خط نمودار اب ہوا خط جو اس کے پاس سے لے نامہ بر آنے لگا

مہاراجہ چندو لال بہادر شاداں کی غزل کے جواب میں بھی غزل موجود ہے۔

دل میرا تجھ سے بہت صاف تھا اب تک تاب جانبِ غیر کیا تو جو اس نے تارا چمکا

ہمدم کی غزل کا جواب بھی ہے :

کسو کا یاد آتا ہے وہ عالم نوجوانی کا ادا کا، آن کا، انداز کا، نازک میانی کا

ملائیں صورتیں مانی میں کیا کیا خبر دیو نکی کہوں شکوہ کہاں تک آسماں کی ظلم رانی کا

تمیز بات کی کیجو بقول مصرعۂ ہمدم نمود آدم کی ہے ہو بلبلہ جس رنگ پانی کا

تمیز نے مشاعروں میں طرحی غزلیں بھی کہی ہیں بعض غزلوں پر مشاعروں کے نام ہیں۔

شگفتہ ہیں گل آب جو ہیں رواں ہیں عجب موسم خوش یہ برسات لایا

اس غزل پر "یہ غزل طرحی شمس الامراء بہادر" لکھا ہوا ہے ایسی ہی اور غزلیں بھی ہیں۔

مطلع عموماً اچھے کہے ہیں :۔

صنم، صبح بشکر خدا آن نکلا ۔۔۔ جو کچھ اپنے جی میں تھا ارمان نکلا

کل میں جوں آئینہ اسکا منھ جو تک کر رہ گیا ۔۔۔ اس کا بھی غصہ سے کچھ نہ تھا پھڑک کر رہ گیا

ایسی کیا تقصیر کی ہے میں نے اے دلبر بھلا ۔۔۔ کر رہا جور و ستم ہے اتنا کیوں مجھ پر بھلا

کیوں نگہ چھپنکتے ہو دزدیدہ ۔۔۔ اس قدر کیوں ہو مجھ سے رنجیدہ

نہ اُٹھے پھر جو وہ شب سوئے پہر کے بجے ۔۔۔ جو تک اُٹھے صبحدم اک بار گجر کے بجے

کس طرح دل سے رہ کوچۂ جاناں چھوٹے ۔۔۔ کیونکہ بلبل سے بہاراں میں گلستاں چھوٹے

امید ان سے رکھوں کیا میں آشنائی کی ۔۔۔ بتوں کے کوچہ سے آتی ہے بو خدائی کی

لطف زبان ملاحظہ ہو:۔

بحر غم میں ڈبو دیا دل نے ۔۔۔ نہ کیا وار ہی نہ پار کیا

نہ آہوں کا اثر اس کو نہ کچھ تاثیر نالوں کی ۔۔۔ نظر آیا بت کافر کا دل کچھ سنگ خارا سا

کیا نصیبوں کا لکھا تجھ سے کہوں آہ تمیزؔ ۔۔۔ لیکے قاصد سے وہ مکتوب مرا چاک کیا

میں دیکھ کر انھیں جو ہوا غش تو وہ کہے ۔۔۔ تم تو ابھی کھڑے بھلے چنگے تھے کیا ہوا؟

وائے قسمت طلب بادہ پہ شب ساقی نے ۔۔۔ شیشہ کو چور کیا غصہ سے ساغر پھینکا

بعض بہاریہ شعر اچھے کہے ہیں:۔

یہ برق چمکتی نہیں رقاصی پری ہے ۔۔۔ یہ رعد نہیں، بجتی ہے مردنگ ہوا پر

آمد ہوئی اے بلبل پھر فصل بہاراں کی ۔۔۔ رہتا ہے گلستاں میں صبا دخدا حافظ

رات دن اپنا گزرتا ہے یوں کوئے گلرخاں ۔۔۔ عندلیباں دم گل میں پھرے جوں باغ باغ

اٹھی ہوئی گھٹائیں بجلی چمک رہی ہے ۔۔۔ گلشن میں بادہ پیویں لے بادہ خوار ہم تم

کرتے ہیں میکشی مست اب زیر تاک بیٹھے ۔۔۔ بدلی سے مت دکھا منھ لے آفتاب ہو وقت

بحر طویل میں بھی طبع آزمائی کی ہے اور بعض غزلیں اچھی کہی ہیں۔

گیا باغ میں صبح جیوں غیرت گل تو دیکھ اس کا رخ اور قامت قیامت

حواس اُڑ گئے بلبل و قمریوں کے گل و سرو کا دل خیاباں سے کھینچا

تمیزؔ اس کو شرم اور مجھے اضطرابی کشاکش ہی میں وصل کی رات گزری

گھڑی رات باقی رہی ہووے گی تب بزور اس کو حجرے میں دالاں سے کھینچا

امیر ابن امیر تھے مطلوب کی گالی کا بھی اثر برا لیتے تھے۔

مجھ کو سر مجلس نہیں دشنام گوارا
کہنا ہو جو تم کو سو کہو کان میں صاحب

کبھی یاران گزشتہ پر بھی آنسو بہاتے ہیں۔

فرہاد و قیس و وامق و مہیار اور نل
ہیہات اُٹھ گئے ہیں یہ کیا یار چار پانچ

فرہاد، قیس، وامق، نل تو مشہور ہیں۔ مہیار بھی ایک ایسا ہی منچلا تھا جس کا ”عشاقِ دکن“ میں وہی مرتبہ ہے جو مجنوں کا عرب میں فرہاد کا عجم میں۔ بعض شعر نہایت ہی بے ساختہ کہے ہیں۔

آہوں کی مرے دیکھتے ہی شعلہ فروزی
شب کرمکِ شب تاب ہوئی ونگ ہوا پر

اس شب تو ساقیا مہ و انجم کا ہے سماں
بیٹھے جو تیرے گرد ہیں میخوار سو پچاس

آگے مہیار کا ذکر ہو چکا ہے اب اس کی محبوبہ چندر بدن کو مخاطب کرتے ہیں:۔

سُن اے چندر بدن اب اور تو کیا چاہئے ہی
دیا مہیار نے جی تیرے اک ارشاد کے ساتھ

ایک غزل میں سراپا بیان کیا ہے:۔

ٹک چشم تصور سے دیکھو تو سراپا کو
اعضائے بدن اس کے سانچے کسی ڈھالے ہیں

مژگاں وہ نکیلے ہیں یا تیر ہیں یا نشتر
یا سیل ہیں یا بلم برچھی ہیں کہ بھالے ہیں

توصیف میں اس رخ کی انشائے ظہوری ہے
وصف خطِ تو خط میں طغریٰ کے رسالے ہیں

کیونکر کہوں زلفوں کو کالوں سے ہیں ہم شیری
خونِ دلِ عاشق سے دو ناگ وہ پالے ہیں

معنوی کیفیت کا ایک شعر ملاحظہ ہو:۔

قدم رکھے ہیں زمین پر کب اہلِ کیفیت
کہ ہاتھوں ہاتھ چلے ہے ایاغ مجلس میں

میر سوز نے ایک معرکۃ الآرا غزل کہی ہے:۔

مری جان جاتی ہے یارو سنبھالو
کلیجہ میں کانٹا چبھا ہے نکالو

اسی زمین میں تمیز نے بھی طبع آزمائی کی ہے۔

نہ لچکے کمر دل دھڑکتا ہے میرا
یہ نازک ہے پہونچا نہ گیندیں اُچھالو

چلا روٹھ کر یار میری طرف سے
کوئی پاؤں پڑ کر ذرا تو منالو

اگر یار غصہ ہوا تو تمیز اب
رہو دم بخود کچھ نہ بولو نہ چالو

کچھ متفرق شعر بلا انتخاب نقل کئے جاتے ہیں جن سے ان کی طبیعت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

ہائے بخت خفتہ کیوں شب آنکھ میری لگ گئی
پھر گیا دروازہ پر سے یار گھبرایا ہوا

نہ رکھیں عالم مستی میں مطلق کچھ خبر اپنی
خدا کے واسطے مستوں کو اے ساقی چھکا اتنا

چشمِ تر میں ہے تصور تری زلف و رُخ کا — ابرِ مژگاں سے مرے برسے ہے باراں شب و روز

گردشِ افلاک سے کیا کیا صفیں برہم ہوئیں — ہے کہاں بزمِ فریدوں جشن کیکاؤس حیف

ہزاروں ڈھب سے ہم کہتے ہیں انسے حالِ دل لیکن — وہاں کچھ پیش جاتی ہی نہیں ہیں اپنی تقریریں

گھر اسکے شب جا کے حالِ دل میں کہا تو لوگوں سے اپنے ڈر کر — کہا کہ تک دل لٹے ہوئے تو اسقدر کر پکار باتیں

ہے شاعروں میں ہمدم وہ آفاق و شہرت اب — خوش فکر ہیں یہ بندہ سرکار اک دو تین

بے حیا غیر، کھائے گا دشنام — تم بھلا اب سے مرا نام تو لو

خبردار اے دلِ غافل کہ دم کا — کیا کچھ قافلہ کچھ چل رہا ہے

ایک قصیدہ بھی کہا ہے جس کی تمہید نہایت ہی اچھی ہے (۵۴) شعر صرف تمہید کے بعد سراپا کے ہیں کل قصیدہ ایک سو شعر کا ہے:-

چلی صبح ہوتے جو بادِ بہار — تو کچھ نیند سی آگئی ایک بار

نظر آئی اک مہ جبیں خواب میں — کہ خورشید ہو جس کے رُخ پر نثار

کروں حسن کا اس کے کیا میں بیاں — اسے دیکھ کر دل ہوا بے قرار

مصفّا تھے رخسار آئینہ سال — جبیں اس کی تابندہ تھی ماہ وار

مہ نو کی تفسیر تھیں ابرویں — کہے تو وہ تھی تیز دم ذو الفقار

وہ دو چشمِ میگوں تھے دو جام و مل — وہ دو ترک، مردم تھے دو بادہ خوار

جب اس طرح وہ مجھ کو آئی نظر — میں پوچھا کہ تو کون ہے اے نگار

کہا مجھ سے واقف نہیں ہے تو کیا — مرا نام ہے خرمی و دیار

میں آئی ہوں تجھ کو یہ دینے نوید — ذرا خوابِ غفلت سے ہو ہوشیار

میں اس کی گرہ سال کی رکھ خبر — جو نواب ہے آج با اقتدار

کہیں ہیں اسے شمس الامرا، تمام — ہے مانندِ شمس اس کا نام آشکار

باپ کی مدح میں بیٹے کا قصیدہ ایک انوکھی چیز ہے مگر قدما میں یہ طریقہ معیوب نہ تھا ممدوح کی تعریف کرتے ہوئے کہ

شکر گنج کے خاندان میں ہے تو — نہیں تجھ سا پھر کوئی عالی تبار

آخری دعائیہ شعر یہ ہیں:-

دعا پر بس اب ختم کر اے تمیز — وہ زندہ رہے تا بروزِ شمار

ہے ذاتِ مقدس و یکتائے عصر — کوئی اس کا ثانی نہیں زینہار

سدا خوش رہے آل و اولاد سے سلامت رکھے اس کو پروردگار
ہوا خواہ اسکے جو ہوں خوش رہیں عدو اس کے ہو ویں ذلیل اور خوار

دیوان میں ایک ترجیع بند بھی ہے جس کے (۱۸) بند ہیں:-

کس خود نما سے آئینہ ساں ہوگیا دوچار کوئی تو آنکھ میں ہے چڑھی شوخ طرحدار
نرگس سا رنگ زرد ہے تن ہے نحیف و زار تاب و تواں کنارہ کشی پر ہیں ایک بار
دل کس کی چشم مست کا سرشار ہوگیا
کس کی نظر لگی کہ یہ بیمار ہوگیا

گلخن نمط ہے گرم مرا سینہ ہم نشیں اخگر کی طرح گرنے لگے اشک آتشیں
ہردم شرار ریز ہوا نالۂ حزیں جل گئی متاعِ صبر و تواں کچھ رہا نہیں
"شعلے بھبو کے اُٹھنے لگے دل کے داغ سے"
"آخر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے"

ہر شئے میں ہر جگہ میں تو ہے یار جلوہ گر رکھتا تمیز تیری تجلی پہ ہے نظر
سنتا ہے رات دن تری آواز کان دھر ہر دم ہر آن تو میں تری ہے یقین کر
کیا فرق داغ گل میں اگر گل میں بو نہ ہو
کس کام کا وہ دل ہے کہ جس دل میں تو نہ ہو

موجودہ نواب لطف الدولہ بہادر صدر المہام سرکار عالی و والیِ پائیگاہ خورشید جاہی نواب تمیز کے بھائی کے پوتے ہیں۔ امید ہے کہ آپ نواب تمیز کے دیوان کے طبع کا انتظام فرما کر خانوادۂ خورشید جاہی کے ایک ادبی کارنامے کو محفوظ فرما دیں گے۔

سید تمکین کاظمی

(نگار) نواب تمیز کا مجموعۂ کلام میں خود کتب خانۂ آصفیہ میں دیکھ چکا ہوں، لیکن اس ارادت و عقیدت کے ساتھ میں نے کبھی اس کا مطالعہ نہیں کیا جس سے جناب تمکین کاظمی نے کام لیا ہے۔ چونکہ یہ مجموعہ وہاں کے ایک امیر سے منسوب ہے اور اب سے تقریباً سوا سو سال کی دکنی شاعری و دکنی زبان کی یادگار ہے، اس لئے اس کی اشاعت مناسب یا ضروری جو کچھ قرار دیجائے، ٹھیک ہے، ورنہ یوں تغزل و شاعری کے لحاظ سے اس میں کوئی بات نہیں پائی جاتی ۔۔۔ نواب تمیز کے

اکثر اشعار وہی ہیں جو بہ تبدیل الفاظ دوسرے ہمعصر یا متقدم اساتذہ کے یہاں بھی پائے جاتے ہیں اور اُن سے ہٹ کر جو کچھ انھوں نے کہا ہے وہ تقریباً وہی ہے جو نثر تو اس لئے نہیں ہے کہ کلام موزوں ہے اور شعر اس لئے نہیں کہ محاسن شعر و تغزل میں سے کوئی بات اس میں نہیں پائی جاتی۔

جناب تمکین نے اس مضمون میں نواب تمیز کے اشعار بکثرت نقل کئے تھے اور ان کی کافی داد بھی دی تھی، لیکن میں نے اس "حسن ظن" کے اکثر حصہ کو نکال دیا۔ رہ گیا اس مقالہ کا شائع کرنا سو، وہ اس لئے ضروری سمجھا گیا، کہ دکنی شاعری یا دکنی زبان کی تاریخ سے بہر نوع اس کا تعلق ظاہر ہے اور اس بنا پر اس کی اہمیت سے بھی انکار نہیں ہو سکتا۔

"نگار" جنوری ۱۹۳۶ء کے چند عنوانات ملاحظہ ہوں:-

ہندی شاعری کا پہلا دور (رزمیہ شاعری) ہندی شاعری کی ابتدائی حالت - چند بردائی - اور اسکے ہمعصر شعراء - جگ نائک - سارنگ دھر اور ہمیر کی شاعری - گورو گورکھ ناتھ اور اس عہد کے دیگر شعراء معہ نمونہ کلام - اس عہد کے مختلف شعراء اور ان کا مختصر کلام - رزمیہ شاعری پر عام تبصرہ - جذبات و اسلوب بیان کے لحاظ سے۔

ہندی شاعری کا دوسرا دور:- (بھگتی تحریک) سوامی رامانند اور ان کے پہلے کے بھگت شعرا - مقلدین رامانند - بھاؤنند رے داس بھگت - کبیر - گورو نانک دیو - میراں بائی - ملک محمد جائسی - تلسی داس - سور داس - عبدالرحیم خانخاناں وغیرہ۔

ہندی شاعری کا تیسرا دور:- (بزمیہ شاعری کا آغاز) کیسو داس اور ہندی شاعری کا عروج - کیسو داس کے ہمعصر سندر داس سیناپت بابا دین - دیال گر - بھوشن - متی رام - چنتامنی - شاعر اعظم بہاری لال اور اسکی بزمیہ شاعری پر تبصرہ - گردھر کوی رائے اور ان کی کنڈلیاں - اس عہد کے بعض سنت شعراء اسی عہد کے بعض رزم گو شعراء - ہندی شاعری کا عروج اور شاہان اسلام -

ہندی شاعری کا دور چہارم:- (۱۸۰۰ء کے بعد) للولال - سدل مصر اور راجہ شیو پرشاد کی شاعری - موجودہ ہندی شاعری کے علمبردار - بھارتندو بابو ہرشچندر - پدماکر - بینی بردین - سری دھر پھاٹک کی شاعری شعراء حال اور ان کے کلام پر تبصرہ ہندی شاعری پر اُردو کا اثر - ہندی کا اثر - ہندی دوہے یا اشعار ہندی رسم الخط میں بھی درج کئے جائیں گے اور اُردو رسم الخط میں بھی - ضخامت کا اندازہ ۳۰۰ صفحات کیا گیا ہے صرف اس ایک پرچہ کی قیمت ۸؍ ہوگی - لیکن خریداران نگار سے علاوہ سالانہ چندہ کے اور کوئی رقم زائد نہیں لی جائے گی۔

منیجر نگار

انقلاب کا اثر روسی زبان پر

دنیا اس وقت جس دور ترقی سے گزر رہی ہے اس میں روس ایک نمایاں حیثیت رکھتا ہے ۱۷ء کا انقلاب روس کے غربا کے لئے ایک ابر رحمت تھا۔ صدیوں سے روسیوں کا وہ "ذلیل" طبقہ جو تمام دن محنت کرنے کے بعد بھی شام کو پیٹ بھر کر کھانا نہ کھا سکتا تھا اس کو انقلاب نے روٹی دلوائی، رہنے کو پست جھونپڑے کے عوض پختہ اور عالیشان مکان دیا اور ہفتہ میں ایک بار اس کی بیوی اور بچوں کی ہوا خوری کے لئے موٹر گاڑی کا سامان کر دیا۔ انقلاب کیوں ہوا؟ کیسے ہوا؟ یہ بذات خود اتنا دلچسپ واقعہ ہے جیسے الف لیلیٰ کی کوئی کہانی چونکہ موجودہ بحث نفس انقلاب سے نہیں بلکہ انقلاب زبان سے ہے اس لئے اس حکایت لطیف کو کسی دوسری صحبت کے لئے چھوڑتا ہوں۔

روسی ادب، روسی تہذیب کی طرح پرانا نہیں بلکہ سترھویں صدی کی پیداوار ہے جب پیٹر اعظم روسیوں کو پکڑ پکڑ کران کی داڑھیاں منڈوا رہا تھا اور ان کو فرانسیسی ناچ کی تعلیم دلوا رہا تھا۔ ان کے نیم مشرقی اور نیم مغربی لمبے کوٹوں کو زبردستی ترشوا کر جاکٹ بنوا رہا تھا اس سے پہلے روسی زبان اپنے اہل زبان کی طرح کوئی خاص وضع قطع نہ رکھتی تھی۔ شمال و مغرب، مشرق و جنوب کے رہنے والے دونوں دو قسم کی زبان بولتے تھے جنکو ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہ تھا۔ تاتاریوں کی زبان علیحدہ تھی اور کاسکس (Cossacks) بھی اپنی بھاکا الگ بولتے تھے۔ ایسے غیر طبعی ماحول میں نہ تو قومیت پل سکتی ہے اور نہ کوئی قومی زبان پیدا ہو سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُنیسویں صدی کے قبل مملکت روس میں کوئی ایسی ہستی پیدا نہ ہوئی جس پر ہماری نظر پڑے اور جس کو ہم روس کا شاعر یا مصنف کہہ سکیں۔ پشکن (Phushkin) (۱۷۹۹ء — ۱۸۳۷ء) روسی علم ادب کا پیٹر اعظم تھا۔ یہ وہ پہلا شخص ہے جس کو ہم روس کا مصنف، شاعر، قصہ گو الغرض جو چاہیں کہیں۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ اسکی ......شاعری اور نثر نگاری روسی علم و ادب میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ اس کے مختصر افسانے روسی تہذیب و تمدن، روسی جذبات و خیالات کے بہترین آئینے ہیں۔ لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ پشکن پر مغربی ادیبوں کا بہت زیادہ اثر پڑا ہے خصوصاً شکسپیر اور بائرن کا۔ اس کے خیالات اکثر جگہ ان شعرا کے کلام

سے ماخوذ معلوم ہوتے ہیں، مگر چونکہ اس کی تمام باتیں خواہ نثر میں ہوں یا نظم میں اس قدر روسی ماحول سے مملو ہیں کہ بالکل اچھوتی معلوم ہوتی ہیں۔ پشکن کا دماغ ایک عالمگیر جذبات کا مخزن تھا۔ اس کے کلام میں قومیت، در داور حقیقت نگاری کے عناصر خاص طور پر غالب ہیں۔ کبھی کبھی وہ والٹیر (Voltaire) کی طرح مذہب کے نقاب کو اپنے طعنوں سے چاک چاک کر دیتا ہے اور کبھی ایک روسی دہقان کی طرح صلیب کے آگے دوزانو ہوکر "میڈونا" جیسی نظم کہتا ہے۔ پشکن کی بعض نظموں میں قومیت کی لہر دوڑتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ اس کا دل مفلس اور بھوکے مزدور کو دیکھ کر دکھ اٹھتا ہے جو جاڑے کی رات میں صرف آگ تاپ کر صبح کر دیتے ہیں اور تمام دن نشتر چبھونے والی سرد ہوا میں برت پر کام کرتے ہیں۔ وہ آرام طلب امیروں کو دیکھ کر کڑھتا ہے جو غریبوں کا خون چوس کر خود لطیف غذائیں کھاتے ہیں اور رنگین شرابیں پیتے ہیں۔ ۱۸۲۵ء میں کسانوں کی "بغاوت" پر پشکن کی نظمیں اس بات کی دلیل ہیں کہ وہ انیسویں صدی میں رہتا تھا مگر اس کی آنکھیں ابھی وقت سے انقلاب کا خواب دیکھ رہی تھیں۔ الغرض سکندر اول کے دور حکومت میں اگر روسیوں کی کوئی بولتی ہوئی تصویر ہو سکتی ہے تو وہ پشکن کی تصنیفات ہیں۔ پشکن کے بعد نکولس گوگل (Nicholas Gogol ۱۸۵۲-۵۹) روسیوں کا دوسرا مصنف ہے جس کا کلام روسیوں کے اس درد و غم کا سرمایہ ہے جو اندر اندر ان کی سوسائٹی کو کھوکھلا کر رہا تھا۔ گوگل کے افسانے اس بوجھ کی میزان ہیں جو "اعلیٰ" "ادنیٰ" پر ڈال رہا تھا۔ اس کے افسانے واقعات کے اظہار ہیں۔ ان کو پڑھ کر دل بیٹھ جاتا ہے اور طبیعت اداس ہو جاتی ہے۔ "لبادہ"، "انسپکٹر جنرل"، "مردہ ارواح" ایسے افسانے ہیں جن کا جواب دوسری زبانوں میں مشکل سے ملتا ہے۔ ان افسانوں میں ظلم و تشدد کا نقشہ کھینچ دیا ہے اور یہ نقشہ ہم ہندوستانیوں کے لئے بہت مانوس چیز ہے۔ ان افسانوں کا ہر شخص ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ ہمارا ملاقاتی ہے یا ہم اکثر اس کو دیکھتے ہیں اور اس کا ذکر سنتے ہیں۔ گوگل کی زہریلی پھبتیاں جو وہ روس کے تشدد پسند حکام پر کستا ہے روسی زبان کے بہترین شاہکار ہیں۔ ٹالسٹائی (Tolstoi) ہمارے مصنفوں کی فہرست میں تیسرے درجہ پر آتا ہے اگرچہ اس کی عالمگیر شہرت اس کو روسی مصنفوں میں پہلی جگہ دلواتی ہے۔ اس کے ناول اور دیگر تصنیفات دنیا کی قریب قریب ہر زبان میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔ "انا کرنینا"، "اصلاح"، "کاسک"، "جنگ و صلح" اس کی غیر فانی کتابیں ہیں جو اس کو ڈوما، روسو، گیٹے، دکنز، ہیوگو وغیرہ نے مثل مصنفوں کی صف میں لا کھڑا کرتی ہیں۔ ٹالسٹائی میں گوگل کے خلاف صبر و تحمل کا مادہ زیادہ ہے۔ جہاں گوگل طعنہ زنی کرتا ہے وہاں ٹالسٹائی صبر و استقلال سے کام لیتا ہے۔ اور انسانی کمزوریوں پر ایک خدا ترس انسان کی طرح پردہ ڈال دیتا ہے۔ ٹالسٹائی کے بعد روسیوں میں اس پایہ کا مضمون نگار کوئی نہیں رہا گرچہ اس کے بعد اور انقلاب ۱۹۱۷ء کے قبل تک چیخو (Chehov) انڈریو (Andreyew) کورولنکو (Korolenko) کپرن (Kuprin) وغیرہ کے نام آتے ہیں ان میں شاید سب

زیادہ نازک مزاج اور رحم دل کورولنکو ہے۔ اس کی ہر تصنیف میں زندگی اور آلام زندگی کا رونا ہے۔ آسمان اور زمین کا تعلق ایک دوسرے سے امن پسند اور ہموار ہے مگر انسان نے آکر ان کی ہمواریوں کو مٹا دیا ہے۔ اسکے افسانے تمامتر پکار ہیں مدد کے لئے کہ کوئی آئے اور اس اُلجھے ہوئے انسان کو آزادی اور امن کا راستہ دکھائے۔

متذکرہ بالا مصنفوں کے دور میں روسی زبان نے ایک خاص خصوصیت حاصل کر لی۔ حقیقت نگاری روسی مصنفوں کا طغرۂ امتیاز ہو گیا۔ روسیوں کو ایشیا سے چونکہ بہت زیادہ تعلق تھا اور ہے اس لئے روسی تہذیب میں ایشیائی باتوں کا بھی دخل ہو گیا مثلاً روسی، انقلاب سے پہلے، خدا کا قائل اور مذہب کا فریفتہ تھا۔ روسی مصنفوں کا بھی یہی حال ہے کہ خدا اور خدا ترسی کی باتیں ان کے ہر ورق میں سنائی دیتی ہیں۔ ٹالسٹائی کو اگر صرف اس کی تصنیفوں سے دیکھئے تو معلوم ہو گا کہ کوئی بہت بڑا ریش و بروت والا تقدس مآب پاپائے اعظم ہے جو پہاڑ کی چوٹی سے وعظ و تلقین کا نعرہ لگا رہا ہے۔ اس کی زبان سے محبت و رحم کا دریا اُبل کر تمام دنیا کو سیراب کرنا چاہتا ہے۔ کتاب ختم کرنے کے بعد اس کا پڑھنے والا کچھ دیر کے لئے معصوم صفت ضرور ہو جائے گا۔ روسی کتابیں پڑھنے کے بعد معًا یہ خیال آتا ہے کہ اسکے پڑوس کے رہنے والے جرمن اور فرانسیسی بھی اس زمانہ میں سوچتے اور لکھتے تھے مگر ان کے خیالات اسقدر خدا اور مذہب سے کیوں دور ہیں؟ یہاں پر کچھ دیر کے لئے اپنی آنکھیں بند کر کے دیکھئے تو معلوم ہو گا کہ روس میں اسوقت ہزار میں دس آدمی پیٹ بھر کر کھاتے تھے وہاں بھوک اور مانگ کی ایک لہر دوڑ رہی تھی جو دل کے دھڑکن کو آہستہ کر دیتی تھی اور دماغ کو مفلوج۔ ایسی حالت میں جب کہ مفلسی منہ تاک رہی ہو اور معدہ کھانا مانگتا ہو سوائے خدا اور مذہب کے کہاں پناہ مل سکتی ہے؟ جب امیروں کے دروازے غریبوں پر بند ہو جاتے ہیں تو غریب اپنی تنگ کوٹھری میں جا کر تاریکی میں اپنے دل کی چوکھٹ پر بیٹھ جاتا ہے اور خدا کو بلاتا ہے۔ اس کے آگے روتا ہے، گڑگڑاتا ہے، پھر پیغمبروں کی دہائی دیتا ہے پھر ولیوں کی، آخر میں ٹھنڈی سانس لیتا ہے اور اس طرح اپنے دل کی بھڑاس نکالتا ہے۔ اسوقت روسی زبان کے جاننے اور لکھنے والے بھوکے تھے اور ننگے۔ ان کا دکھ معدودے چند کے آرام کا سبب تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تصنیف کے ہر ورق میں ناکام غصہ، بھوک اور پیاس، خدا اور فریاد ہے اور آخر میں سُرخ آنکھوں کی غضبناکیاں اور دانت پیسنے کی آواز۔ ان کے قلم کی نکلی ہوئی باتیں ایسی دھمکیاں ہیں جن کو پڑھ کر جسم میں جھرجھری سی پیدا ہوتی ہے۔

پھر ۱۷ء کا انقلاب آیا۔ غریبوں نے لاٹھیاں اُٹھائیں، کمر کس کر باندھا اور اپنے کاندھے سے بادشاہ اور بادشاہ کے بوجھ کو اُتار کر پھینکدیا جو صدیوں سے ان کی ریڑھ کی ہڈیوں کو توڑے ڈالتی تھی۔ اسکے بعد طوائف الملوکی اور غارتگری کا زمانہ آیا۔ روس کی سرزمین پر انسان کے بدلے بھیڑیے پھیل گئے جو ایک دوسرے کو چیرنے لگے صدیوں کی دبی ہوئی چنگاری بھڑک اُٹھی۔ شہر اور دیہات میں جمی ہوئی برف سُرخ ہو گئی ۔۔ انسان کا خون بھی

پہ کر جم گیا۔

ایسے آرکٹائی کے دن اور خوف و ہراس کی راتوں میں پرانے لٹریچر کے پرخچے اڑ گئے۔ پشکن اور ٹالسٹائی کا رنگ ان کے ساتھ چلا گیا۔ روسی ادب نے خدا ترسی اور پارسائی کے لبادہ کو اتار کر رکھ دیا۔ اب دل کھول کر باتیں ہونے لگیں وہ اگلی سی چھپی اور دبی ہوئی اشارہ کنایہ کی باتوں کی ضرورت نہیں رہی۔ انسان آدمی کی طرح رہنے لگا۔ غلامی اور بیکاری افسانہائے ماضی ہوگئیں۔ خوشی اور فارغ البالی کا دور آیا۔ اب تو یہ حال ہوگیا ہے کہ روسی لٹریچر کی نظیر دنیا کی کسی زبان میں نہیں ملتی۔ لینن، ٹراٹسکی، گارکی، سولوگب وغیرہ کی تصنیفوں کو دیکھئے تو عقل دنگ ہو جاتی ہے۔ ان کی ہر بات صاف، مختصر اور نہایت آزاد ہے۔ میرے خیال میں ابتدائے آفرینش سے آج تک کسی قوم نے اتنی آزادی سے قلم نہیں اٹھایا ہوگا۔ ان کے خیالات اتنے بے باک اور نڈر ہو گئے ہیں کہ دیکھکر حیرت ہوتی ہے کہ وہی قوم جو صرف اٹھارہ سال قبل صدیوں پرانی رسموں میں بری طرح جکڑی ہوئی تھی یک بیک اسقدر آزاد کیونکر ہوگئی؟ یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دماغ صدیوں سے نہایت آزاد ماحول میں پرورش پا رہے تھے۔

ان کی بات بات پر عقل سلیم کی دلیلیں، جگہ جگہ پر صاف اور لطیف استعارے، قدم قدم پر ہنسی کی ہلکی سی لہر، خیالات میں اتنی آزادی کہ، مذہب بوڑھی عورتوں کی مہمل بکواس، خدا بائبل کا دقیانوس خدا اور یسوع انسان کا بیٹا ہو کر رہ گیا ہے۔ طرز گفتگو میں اتنی قوت اور دلائل اتنے عام فہم اور حقیقت پر مبنی کے سوائے ماننے کے اور کچھ بن نہیں پڑتا۔ سچ تو یہ ہے کہ روسی زبان جس سرعت سے ترقی کر رہی ہے اگر یہ حالت زیادہ نہیں صرف بیس سال تک اور قائم رہ گئی تو انسان کو اپنے دماغ میں نئی چیز اور نئے خیال کو سمجھنے کے لئے ایک اور خانہ کا اضافہ کرنا پڑے گا۔ ڈانٹے (Dante) کا دوزخ اور اعراف قرون وسطی کے یوروپین اقوام کے لئے جیسے بالکل بعید از وہم و قیاس بات تھی اسی طرح روسی علم ادب ہماری اولاد کے لئے ایک نئی شاہراہ عقل و دلیل کے لئے کھول دے گا جس کی زمین بھی نئی ہوگی اور آسمان بھی نیا۔

ڈاکٹر محمد نصیر الدین

مجموعۂ استفسار و جواب جلد دوئم

کی

طباعت شروع ہوگئی ہے

ملنے لگا۔

تاریخ کا ایک گمشدہ ورق

انطانی اور کاہنۂ مصر

روم کی ہزیمت خوردہ فوجیں ساحلِ فنیقیا تک واپس آگئی ہیں اور بحر ابیض کے سفید ریتیلے ساحل پر خیمہ ڈالے پڑی ہوئی ہیں۔ اہلِ لشکر اپنی گزشتہ شکست و ناکامی کی وجہ سے ملول ہیں اور مستقبل کے متعلق فکرمند۔
ان کا سردار انطانی، لشکر کے ہنگامہ اور سپاہ کے شور و غوغا سے گھبرا کر، اپنے رفیق ہتیمو مصری کے ساتھ قریب کی اس پہاڑی کی طرف جا رہا ہے، جس کی بلندی اس سے قبل خدا جانے کتنی شکست خوردہ فوجوں اور کتنے فاتح لشکروں کو اپنے دامن سے گزرتی ہوئی دیکھ چکی ہے۔ اس پہاڑی کے ایک طرف سمندر ہے اور دوسری طرف وہ دریا جو آج دریائے کلب کے نام سے مشہور ہے لیکن اُسوقت اُس کو دلیقوس کہتے تھے۔

اب سے چند ماہ قبل انطانی اپنی فوجوں کو لیکر اسی پہاڑی کے نیچے سے گزرا تھا تاکہ وسط ایشیا پر حملہ کرکے وہاں کے ممالک کو اپنا اور اپنی حلیف کلیوپٹرا ملکۂ مصر کا مطیع بنائے، لیکن آرمینیا، فارس اور ما بین النہرین نے ایسی پامردی سے مقابلہ کیا کہ انطانی شکست کھا کر پھر بحر ابیض تک واپس آگیا اور یہاں مصری فوجوں کی کمک کا انتظار کرنے لگا۔ انطانی کی ہزیمت و ناکامی کا کچھ اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جب وہ اس مہم پر روانہ ہوا تو پچاس ہزار سے زیادہ سپاہ اس کے ساتھ تھی اور جب واپس آیا تو صرف دس ہزار رہ گئی تھی اور اب بھوک پیاس کی حالت میں بحر ابیض کے ساحل پر پڑی کراہ رہی تھی۔

انطانی پہاڑی پر چڑھ رہا تھا اور جب تھک جاتا تو کسی چٹان پر بیٹھ جاتا اور دونوں ہاتھوں پر ٹھوڑی کو رکھ کر دور سمندر کی طرف دیکھنے لگتا کہ شاید افقِ بعید پر مصری جہازوں کے بادبان نظر آجائیں --- کبھی اس کی نگاہیں دھوکا بھی دیجاتیں اور جن چیزوں کو وہ بادبان سمجھتا وہ صرف سمندر کی چڑیوں کا جھنڈ ثابت ہوتیں۔

انطانی اسی فکر و تردد کے عالم میں ایک چٹان پر بیٹھا ہوا تھا کہ ایک کوے کی آواز سے چونک پڑا۔ اس نے سر اٹھا کر اپنے رفیق کو ڈھونڈا جو اس کے پاس بیٹھا ہوا تھا، لیکن اسوقت وہ چند قدم دور آگے کھڑا ہوا تھا اور سامنے

کی ایک چٹان کو غور سے دیکھ رہا تھا۔

انطاآنی اُٹھا اور اس کے پاس جاکر کھڑا ہو گیا اور وہ بھی ان نقوش کو غور سے دیکھنے لگا جو چٹان پر نظر آتے تھے۔ یہاں اس وادی میں، اس دریا کے کنارے، اس وسیع و بسیط سمندر کے سامنے اور انھیں مہیب چٹانوں کے پاس سے خدا جانے کتنے لشکر انطاآنی سے پہلے گزر چکے تھے اور نہیں کہا جا سکتا کہ ان میں سے کتنے فاتحانہ انداز سے سر بلند گزرے اور کتنے شکست خوردہ و سرنگوں ___ وہ بڑے بڑے زلزلہ افگن سردار، وہ بڑے بڑے جسم پر رعشہ طاری کر دینے والے سپہ سالار۔ جنھوں نے ساری دنیا میں اپنی جرأت و بہادری کا سکہ قائم کر رکھا تھا، آج ابدیت کے بحر ذخار میں ڈوب کر فنا ہو چکے ہیں، اور اُن کی نشانیوں میں سے اب سوائے برباد شدہ زمینوں، تباہ و ویران بستیوں، اور سنسان خرابوں کے کچھ نظر نہیں آتا۔ ان چٹانوں پر انھیں فاتحین عالم کے نام منقوش تھے اور جس چٹان کے پاس انطاآنی اور اس کا رفیق کھڑا ہوا تھا اس پر ریمیسس ثانی فرعون مصر کا نام کندہ تھا۔ انطاآنی نے اپنا سر اظہار احترام میں جھکایا اور بولا کہ "کسے خبر ہے کہ میری یادگار ان چٹانوں پر کیا ہو گی ایک فاتح سپہ سالار کی سی یا ہزیمت خوردہ نکبت زدہ انسان کی سی"۔

وہ یہ کہتا ہوا دوسری چٹان کی طرف بڑھا اور پھر تیسری چٹان کی جانب اس پر سلما نصر اور سنجاریب (شاہان اشوریا) کے نام منقوش تھے، جو سات صدی پیشتر ادھر سے گزرے تھے۔ ان کا نام دیکھ کر انطاآنی ماضی کی تاریخ میں غرق ہو گیا اور اسی کے ساتھ خود اپنی زندگی کے تمام ایام ایک ایک کر کے اُسے یاد آنے لگے ___ سب سے پہلا وہ دن جب مصر کی نوجوان ساحر ملکہ (کلیوپیٹرا) سے اس کی نگاہیں دوچار ہوئی تھیں۔ پھر وہ دن جب محبت کا اولین شعلہ اس کے سینہ میں بھڑکا، اس کے بعد وہ دن جب اس نے اپنی بیوی کو طلاق دیکر کلیوپیٹرا کا طوق غلامی اپنی گردن میں ڈالا۔ پھر وہ دن جب اس نے اسکندریہ میں کلیوپیٹرا کے ملکۂ مصر و قبرص اور فرمانروائے افریقہ و سوریا ہونے کا اعلان کیا اور سب سے آخر میں وہ دن جب سلطنت روما نے اس کو ملت فروش اور غدار وطن قرار دیکر اسکے استیصال کا فیصلہ کیا ___ وہ انھیں خیالات میں محو تھا کہ کسی کے پاؤں کی آہٹ آئی۔ اس نے گردن اُٹھا کر دیکھا کہ ایک بڑھیا عورت لکڑی کے سہارے سے آہستہ آہستہ اوپر کی طرف چڑھتی آ رہی ہے۔ جب وہ انطاآنی کے قریب پہونچی تو ٹھہر گئی اور تھوڑی دیر تک خاموش رہنے کے بعد دفعتہً ایک قہقہہ لگایا اور بولی:-

"اے انطاآنی، تو اس ویران و وحشتناک مقام پر کیوں آیا ہے۔ کیا روما کو تباہ کرنے اور شرق و غرب میں جنگ کی تباہیاں پھیلانے کے بعد یہاں اس لئے آیا ہے کہ سانپوں کو اُن کی بلوں سے نکال کر پریشان کرے، گدھوں کے گھونسلوں میں آگ لگا کر انھیں آشیاں برباد کرے، بھیڑیوں اور لومڑیوں کے بھٹ کھود کر ان کو آزار پہونچائے، کیا دنیا میں اب کوئی انسان تیرے ظلم کا نشانہ بننے کے لئے باقی نہیں رہا"۔

انطانی حیران تھا کہ یہ کون عورت ہے جو اس طرح بیباکانہ گفتگو کر رہی ہے اس نے اپنے رفیق کی طرف مخاطب ہو کر کہا:۔

"اے ہیتیو، یہ بڑھیا کون ہے۔ کیا تم پہچانتے ہو؟"

— "نہیں، میں اس سے بالکل ناواقف ہوں"۔

یہ سنکر بڑھیا غصہ سے لال ہو گئی اور چیخکر بولی کہ "اے کمینے، اے منافق ادھر دیکھ میری آنکھ میں آنکھ ڈالکر کہہ کر تو مجھے نہیں پہچانتا۔ اے ذلیل کتے، کیا میں وہ دن بھول سکتی ہوں جب تو نے میرے اکلوتے بیٹے کو اس سردار سے قتل کرا کے میری دنیا کو ویران کر دیا۔

یہ سنکر انطانی کی حیرانی کی انتہا نہ رہی اس نے پوچھا:۔

"اے بڑھیا تو کون ہے، تیرا بیٹا کون تھا اور تو میرے رفیق پر کیوں یہ الزام قائم کرتی ہے"

بڑھیا — "اے انطانی، مجھے تجھ سے کوئی شکایت نہیں، کیونکہ تجھے تو دھوکا دیا گیا تھا، میں تو اس مکار سے مخاطب ہوں جسے تو اپنا رفیق کہتا ہے، ادھر میرے پاس آ اور اپنے رفیق کے کمینہ پن کی داستان تو بھی سن لے۔

میں ایک کاہنہ ہوں اور مسلسل چالیس سال سے ہیکلوں اور معبدوں میں گھوم پھر کر زندگی بسر کر رہی ہوں، مصر و مقبیا کا کوئی مقام ایسا نہیں جہاں کے لوگ مجھے نہ جانتے ہوں اور میری پیشین گوئیوں کو غلط باور کرتے ہوں، میرا ایک بیٹا تھا، اکلوتا بیٹا، جسے میں اپنے علم کے اسرار سکھا رہی تھی اور وہ تمام راز جو صدیوں سے سینہ بہ سینہ چلے آرہے ہیں اس کو بتا رہی تھی۔ ناگہاں اس کی نگاہ ایک نوجوان لڑکی پر پڑی اور وہ اس سے محبت کرنے لگا یہ لڑکی بھی اس سے مانوس ہو گئی اور دونوں میں نکاح کا عہد و پیمان ہو گیا۔ یہ دونوں لطف و مسرت کی زندگی بسر کر رہے تھے کہ ایک اور شخص اس لڑکی کا نہیں بلکہ اس کی دولت کا خواہاں پیدا ہو گیا اور میرے بیٹے کی ہلاکت کا سبب بنا۔ یہ شخص یہی تیرا رفیق ہے، جو میرے سامنے اور تیرے پہلو میں کھڑا ہوا ہے"۔

انطانی نے ہیتیو کی طرف دیکھ کر پوچھا، "کیا یہ صحیح ہے" لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

بڑھیا نے کہا کہ "اے انطانی کیا اس کا یہ سکوت اس امر کا ثبوت نہیں کہ جو کچھ میں کہہ رہی ہوں وہ بالکل صحیح ہے اور اس میں تردید کا حوصلہ نہیں"

انطانی — "پھر کیا ہوا؟"

بڑھیا — "اس کے بعد یہ ہوا کہ اسکندریہ میں یہ تیرے پاس پہونچا اور مخبری کی کہ مصریوں کی ایک جماعت تیرے خلاف سازش کر رہی ہے"۔

انطانی — "یہ صحیح ہے لیکن وہ سازش کرنے والے میرے ہاتھ نہیں آئے"۔

بڑھیا — " ہاتھ کیا آتے جبکہ حقیقت کچھ نہ تھی اور یہ دغا باز صرف اس لئے جھوٹ بول رہا تھا کہ میرے بیٹے کو تیرے ہاتھ سے ہلاک کرا کے اس لڑکی کو حاصل کرے ۔ پھر کیا تجھے یاد نہیں کہ اسی سازش کے الزام اور ملکہ سے محبت کرنے کے جرم میں تو نے میرے جوان بیٹے کے قتل کرنے کا حکم دیا۔ وہ چیخ چیخکر اپنی بے گناہی کا اعلان کر رہا تھا لیکن کوئی سننے والا نہ تھا، وہ آسمان و زمین کو گواہ بنا کر کہہ رہا تھا کہ اس نے کوئی جرم نہیں کیا، لیکن اسکی بات کا یقین کرنے والا کون تھا۔ یہ مکار، منافق تجھے ابھار رہا تھا یہ کہہ کہکر کہ وہ سازش میں شریک ہے، تیری غیرت میں ہیجان پیدا کر رہا تھا یہ یقین دلا کر کہ وہ ملکہ سے محبت کرتا ہے اور ملکہ اُس سے، درانحالیکہ میرے بیٹے نے سوائے اُس ایک لڑکی کے کسی اور سے محبت کی ہی نہیں اور آخر کار اسی کی محبت میں اس نے جان دی —

پھر جس وقت تو نے قتل کا حکم دیا میں وہیں تھی، جس وقت جلاد کی تلوار نے میرے بیگناہ بیٹے کے سر کو تن سے جدا کیا میں وہیں موجود تھی۔ کیا تو سمجھ سکتا ہے کہ مجھ پر اس وقت کیا گزر رہی تھی تو کیا سمجھ سکتا ہے، تیرا بیٹا اگر کبھی تیرے سامنے اس طرح ذبح کیا جاتا تو معلوم ہوتا کہ اولاد کی محبت کیا چیز ہے اور دنیا میں ان ماں باپ سے زیادہ زہر آلود غم کسی کا نہیں جن کے اکلوتے بیٹے نے اُن کے سامنے دم توڑا ہو۔

اس واقعہ کے بعد میں یہاں چلی آئی اور یہاں کے تاریک غاروں میں درندوں کے پاس حشرات کے ساتھ رہنا اختیار کیا اور اسے انطانی یقین کر کر شقاوت میں وہ انسان سے کم اور عدل و انصاف میں اس سے زیادہ ہیں — خیر، یہ تو جو کچھ ہونا تھا ہو چکا، لیکن اسے انطانی اب کا ہنۂ مصر کی وہ باتیں بھی سن لے جو تجھ سے متعلق ہیں۔

ملکہ کلیوپیٹرا جسے تو عورت سمجھتا ہے حقیقتاً خدا کا عذاب ہے، اور یہ ممکن نہیں کہ ایک شخص اس سے چھو جانے کے بعد تمت کے کوڑھ میں مبتلا ہونے سے بچ جائے۔ کیا تجھے پامپیئس کا حال معلوم نہیں، کیا تو سیزر کے حشر سے ناواقف ہے اور کیا تو اس سے بیخبر ہے کہ اس کی وجہ سے کتنے ملک ویران ہو گئے اور کتنی جانیں ہلاک، پھر ہوشیار ہو جا کہ آج کے بعد سے تجھے بھی کوئی مسرت و راحت نصیب نہیں ہونا، اور اس حال میں تجھے مرنا ہے کہ نہ تیرے دوست تیرے پاس ہوں گے نہ اہل وطن، نہ تیرے عزیز تیرے قریب ہوں گے اور نہ تیری وہ محبوب ملکہ جس کی محبت میں تو نے اپنے وطن سے غداری کرنے میں بھی دریغ نہ کیا۔ تیری لاش پڑی ہوگی اور اس پر کوئی آنسو بہانے والا نہ ہوگا، تو تڑپ رہا ہوگا اور کوئی ایک ہاتھ بھی تجھے سنبھالنے کے لئے آگے نہ بڑھیگا "

یہ کہکر اسنے اپنے لباس کے اندر سے چھپا ہوا خنجر نکالا اور خونخوار شیرنی کی طرح ہیتیو کی طرف جھپٹکر اسکے سینے میں ایسی سختی سے پیوست کر دیا کہ سانس لینے کی بھی مہلت نہ دی۔ خنجر اس کے دل کے اندر ڈوب گیا تھا۔ سینے سے خون کی دھار جاری تھی اور بڑھیا ایسی خوش تھی گویا دنیا کی دولت اس کے ہاتھ آ گئی ہے۔

اس نے مبہوت و متحیر انطاکی سے مخاطب ہوکر کہا کہ:-

" مجھے گمان بھی نہ تھا کہ کبھی میں اپنے بیٹے کے قاتل سے انتقام لے سکوں گی۔ اس لئے اے انطاکی میں تیری شکرگزار ہوں کہ اپنے ساتھ تو اس کو بھی لے آیا اور اس طرح میری زندگی کا تنہا مقصود پورا ہوکر رہا۔ اچھا اے ناعاقبت اندیش اندھے عاشق، اب میں تجھ سے رخصت ہوتی ہوں! اس خائن کی لاش کو یہیں چھوڑ جانا کیونکہ آج رات میں نے یہاں کے بھیڑیوں اور گدھوں کو دعوت دی ہے اور جو کچھ میں نے تیرے متعلق کہا ہے اسے بھی یاد رکھنا، کیونکہ ممکن ہے پھر میں تجھ سے نہ مل سکوں"۔

یہ کہکر بڑھیا وہاں سے دفعتاً غائب ہوگئی اور انطاکی اسی طرح مبہوت و متحیر کھڑا رہا۔

پھر اس کے بعد جو کچھ ہوا اس سے ہر تاریخ داں واقف ہے۔ انطاکی پر بعد کو ایک ایسا وقت آیا کہ اس نے خودکشی کرنا چاہی لیکن اس کی شجاعت نے اجازت نہ دی، اس نے جنگ کے دوران میں اپنے آپ کو موت کے منھ میں ڈال ڈال دیا لیکن اس نے قبول نہ کیا - اور --- پھر جب وہ مرا تو اس حال میں کہ نہ کوئی دوست پاس تھا، نہ عزیز، نہ کوئی رونے والا تھا، نہ اُٹھانے والا --- یہاں تک کہ کلیوپٹرا بھی اُس سے دور تھی

یہ واقعہ ہے ۳۰ سنہ قبل مسیح کا۔

مکتوبات نیاز

دنیائے ادب و انشا میں بالکل نئی چیز

اس میں وہ خطوط بھی شامل ہیں جو نگار میں شائع نہیں ہوئے، کتاب مجلد، ۲۸ پونڈ کے کاغذ پر شایع ہوئی ہے اور جناب نیاز کا تازہ ترین فوٹو معہ ایک اصل خط کے بلاک کے بھی اس میں شامل ہے۔

قیمت علاوہ محصول ۸ عہ۔ محصول ڈاک ۶ ر

منیجر نگار

اصحاب کہف

(ڈراما)

اڈیٹر نگار کے قلم سے (۲۰۰ صفحات پر)

تمام وہ حضرات جن کا نام ۳۱ جنوری سنہ ۳۶ء کو رجسٹر خریداران میں مندرج پایا جائے گا صرف بارہ آنے کے ٹکٹ موصول ہونے پر حاصل کر سکتے ہیں ——— منیجر

نگار

جلد ۲۸	فہرست مضامین ستمبر سنہ ۳۵ء	شمار ۳

اڈیٹر:— نیاز فتحپوری

شمارہ ۳	ستمبر ۳۵ء	جلد ۲۸

ملاحظات

ادارۂ قومی میں زبان کی اہمیت

اور

اُردو زبان کے مستقبل پر ایک نظر

انسان خواہ وہ کسی مرز و بوم سے متعلق ہو بہ لحاظ اپنی نوع کے ایک ہی چیز ہے، اور "مستقیم القامۃ متحرک بالارادہ حیوان ناطق" ہونے کی منطقی تعریف، شرق سے غرب تک اور شمال سے جنوب تک ہر ملک و قوم کے انسان پر صادق آتی ہے — لیکن بایں ہمہ اتحاد نوعی و توافق جنسی، ہر ملک کا انسان دوسرے ملک کے انسان سے بالکل علیحدہ نظر آتا ہے، اور یہ ممکن نہیں کہ ایک قوم کا آدمی دوسری قوم میں شامل ہو کر لطف و راحت سے زندگی بسر کر سکے۔ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ انسان کی حقیقت نام اُس کی مخصوص شکل و صورت کا نہیں، بلکہ ایک خاص تہذیب معاشرت ایک مخصوص میلان طبع اور ایک متعین ذوق کا ہے جو جغرافی ماحول اور طبیعی حوادث کے ماتحت پیدا ہو کر نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتا چلا آتا ہے اور اس اختلاف ذوق کا نام اختلافِ تہذیب، اختلاف طبائع، اختلاف معاشرت، اور اختلافِ

زبان ہے۔ آپ قطب شمالی کے منطقہ باردہ اور خط استوا کے نیچے واقع ہونے والے ممالک کا مطالعہ کیجئے تو آپ کو دونوں جگہ کے انسانوں میں بہت زیادہ نمایاں فرق محسوس ہوگا کیونکہ یہاں کے جغرافی حالات ایک دوسرے سے بہت زیادہ مختلف ہیں اور یہ اختلاف نہ صرف تہذیب و معاشرت بلکہ ظاہری شکل و صورت میں بھی کافی تغیر پیدا کردیتا ہے۔ الغرض جغرافی ماحول اور حوادث تاریخی کا اختلاف اتنا زبردست محرک اختلاف طبائع کا ہے کہ اس کا مقابلہ ممکن نہیں اور اسی لئے کہا جاتا ہے کہ قومی خصوصیات بالکل فطری مجبوریاں ہیں اور ان کو دور کرنا نہ صرف فطرت کا مقابلہ کرنا ہے، بلکہ قومی شیرازہ کو درہم و برہم کردینا ہے۔

ان اختلافات میں سب سے زیادہ نمایاں چیز جو بیک وقت ایک قوم کو دوسری قوم سے متمایز کرنے والی بھی ہے اور افراد قوم کی شیرازہ بندی بھی، زبان کا اختلاف ہے کہ اس کو سنتے ہی ہم جان لیتے ہیں کہ فلاں شخص کس ملک و قوم سے تعلق رکھتا ہے اور اگر وہ اپنا ہمزبان ہے تو فوراً جذبۂ ہمدردی داخوت میں تحریک پیدا ہوجاتی ہے۔ اس لئے اصلاح زبان و تحفظ زبان کا مسئلہ ہمیشہ تمام قوموں میں نہایت اہم بالشان مسئلہ رہا ہے اور جب کسی قوم کا دور ارتقار شروع ہوا ہے تو لازماً اس نے اس پر بھی خاص توجہ کی ہے۔

ہم کو اسوقت ساری دنیا سے بحث نہیں صرف ہندوستان کی مختلف زبانوں کے مقابلہ میں اپنی زبان اور اس کے مستقبل پر سرسری نگاہ ڈالنا مقصود ہے۔ اب سے چند سال قبل ہندوستان کی جمہوری زبان اُردو سمجھی جاتی تھی، اسی میں خط و کتابت ہوتی تھی، دفاتر سرکاری میں اسی کا رواج تھا اور ہندو ریاستوں کے کاغذات بھی اسی زبان اور اسی خط میں مرتب ہوتے تھے۔ لیکن جب یہاں کی سیاسیات نے ہندوؤں کے اندر ایک خاص ذہنی انقلاب پیدا کرکے وطنیت کا جذبہ اُن میں اُبھارا، تو زبان اور رسم الخط کی طرف بھی ان کو توجہ ہوئی اور چونکہ اُردو زبان اور اس کا انداز تحریر دونوں بالکل غیر آرین چیزیں تھیں اس لئے وہ ہندی زبان اور ہندی رسم خط کی طرف مائل ہوگئے جو علاوہ خالص قومی و وطنی رنگ رکھنے کے (سنسکرت سے مماثل ہونے کے باعث) انکے لئے مذہبی تقدس کی بھی چیز ہے۔

پھر اس وقت ہم کو اس بحث میں اُلجھنا نہیں ہے کہ اُردو اور ہندی میں کون قابل ترجیح ہے، یہ یادہ ہندوؤں کا یہ میلان قابل ستائش ہے یا لائق استکراہ بلکہ صرف واقعات کو سامنے رکھ کر یہ دیکھنا ہے کہ اُردو کی حفاظت مسلمانوں کے لئے ضروری ہے یا نہیں اور اگر ہے تو اس کی کیا تدابیر ہوسکتی ہیں۔

اس دوران میں اکثر اہل فکر نے اس مسئلہ پر اظہار خیال کیا اور وہ لوگ جو ہندوستان میں متحدہ قومیت دیکھنا چاہتے ہیں انھوں نے باہمی مفاہمت کی چند صورتیں بھی پیش کیں مثلاً یہ کہ بجائے اُردو ہندی کے اس متحدہ زبان کا نام ہندوستانی رکھا جائے، اُردو سے عربی فارسی کے الفاظ نکالکر (جن سے ہندوؤں کو بوئے غیریت آتی ہے)

اُن کے لئے زیادہ قابل قبول بنایا جائے اور ہندو مسلمان دونوں کو اُردو و ہندی رسم الخط سیکھنے پر مجبور کیا جائے وغیرہ وغیرہ ۔ لیکن میں نے ان مشوروں کو کبھی اہمیت نہیں دی کیونکہ ہندو مسلمانوں کے درمیان اختلاف مذہب اور اختلاف معاشرت و تہذیب کی اتنی زبردست خلیج حایل ہے کہ اُس کو پُر کرنے کا کوئی امکان ہی نہیں ہے اور چونکہ ہندو قوم ارتقائی حالت میں ہے اس لئے وہ اپنے بڑھے ہوئے حوصلہ سے کے مقابلہ میں نہ کسی رواداری سے کام لینے پر آمادہ ہوسکتی ہے اور نہ وہ مسلمانوں کے کسی ایثار کی قدر کرسکتی ہے۔

اگر آج مسلمان عربی و فارسی کے تمام الفاظ نکال کر اُردو میں وید اور گیتا کے الفاظ استعمال کرنے لگیں تو بھی ہندو اپنی ہندی تحریروں میں سنسکرت کے ثقیل الفاظ کا استعمال ترک نہ کریں گے، اُن کو نفرت صرف اُردو زبان سے نہیں ہے بلکہ اُردو رسم الخط سے بھی ہے اور وہ کسی ایسی یادگار کو قائم رکھنا نہیں چاہتے جو مسلمانوں کے دورِ حکومت سے کوئی ہلکا سا بھی تعلق رکھتی ہو۔

اس لئے میرے نزدیک مسلمانوں کی یہ کوشش کہ وہ متحدہ زبان کے اُصول کو تسلیم کرکے رسم خط بدستور اُردو کا قایم رکھیں کبھی ہندوؤں کے لئے قابل قبول نہیں ہوسکتی، خواہ وہ اُردو کا نام بدلکر بجائے ہندوستانی کے ہندی یا برج بھاشا ہی کیوں نہ رکھدیں۔

گزشتہ دس پندرہ سال میں ہندی زبان اور ہندی رسم خط کے متعلق ہندوؤں نے کیا تدابیر اختیار کیں اور کس قدر کامیابی حاصل کی، کسی سے مخفی نہیں۔ ملک کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جہاں "ہندی پرچار" کی سبھائیں موجود نہ ہوں اور ہندو قوم نے ہندی زبان اور ہندی رسم خط کے مسئلہ کو سیاسی و مرکزی اہمیت دیکر پورے ملک و قوم کی توجہ مبذول نہ کرلی ہو۔ اُن کے تمام اکابر خواہ وہ سیاست سے تعلق رکھتے ہوں یا اصلاح مذہب و معاشرت سے، طبقۂ امراء سے وابستہ ہوں یا طبقۂ عمال سے، سب اجتماعی حیثیت سے اس طرف متوجہ ہیں اور اسی کا نتیجہ ہے کہ آج ہندی رسایل و اخبارات اور ہندی تصانیف اپنی اشاعت کے لحاظ سے اُردو کے مقابلہ میں بہت زیادہ ترقی یافتہ نظر آتی ہیں۔ ہندی زبان کی درسگاہیں قائم ہورہی ہیں۔ والیان ریاست ہندی تصانیف پر بیش بہا انعامات دے رہے ہیں، ہندو ریاستوں کے دفاتر و قوانین سب ہندی بلکہ سنسکرت زبان میں منتقل ہورہے ہیں، خود حکومت برطانیہ کے دفاتر و عدالتگاہوں میں ہندی اپنی جگہ پیدا کرتی جارہی ہے، یہاں تک کہ اگر آپ ڈاکخانے جائیں تو وہاں بھی ہندی فارم آپ کے سامنے پیش کیا جاتا ہے اور اُردو فارم باوجود طلب کرنے کے نہیں دیا جاتا ـــــ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندی کی ترویج و اشاعت کے لئے ہندو کتنی منظم و باقاعدہ کوشش کررہے ہیں اور اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ ان کو کامیابی نہ ہو۔ برخلاف اس کے مسلمانوں کو دیکھئے کہ وہ اُردو کی ترقی و اشاعت کے لئے کیا کررہے ہیں۔

مسلمانوں کی جماعت کا غالب حصہ وہ ہے جو ہمارے علمار مذہب کے زیر اثر ہے اور ان کو اُردو سے جو دلچسپی ہو سکتی ہے ظاہر ہے۔ کیونکہ ان کی تعلیم یکسر عربی زبان میں ہوتی ہے، اور وہ بھی ادب و انشار کی نہیں بلکہ صرف فقہ و حدیث کی اس لئے وہ خود اُردو سے بالکل نابلد ہوتے ہیں اور ایک فقرہ صحیح نہیں لکھ سکتے۔

اب رہگیا دوسرا گروہ جو ہمارا سیاسی رہنما کہلاتا ہے، سو آپ مسلم کانفرنس، مسلم لیگ اور انجمن ہائے خلافت و تبلیغ وغیرہ کی تمام روئدادیں پڑھ ڈالئے، آپ کو کسی ایک جگہ بھی اُردو زبان کی حفاظت و ترقی کا ذکر نظر نہ آئے گا اور کبھی کسی ایک لیڈر کی زبان سے آپ نے یہ نہ سُنا ہوگا کہ مسلمانوں کی ہئیت اجتماعی میں اُردو زبان کو بھی کوئی اہمیت حاصل ہے ۔۔۔ اور تو اور، خود ہماری مُسلم یونیورسٹی نے اس وقت تک کوئی ایسا لائحہ عمل پیش نہیں کیا جو اس باب میں ہماری رہنمائی کرسکے۔ الغرض اُردو زبان اسوقت حد درجہ نازک دور سے گزر رہی ہے، اور ہندو مسلم نزاع کے سلسلہ میں اس نے خاص سیاسی اہمیت حاصل کر لی ہے، اس لئے اگر اس سیاسی جنگ میں ہندوؤں کو کامیابی ہوئی جس کے کھُلے ہوئے اسباب ہر چار طرف نظر آرہے ہیں تو اُردو زبان اور اُردو رسم الخط کے مستقبل کی تاریکی روشن ہے۔

میں اس وقت یہ بحث چھیڑنا مناسب نہیں سمجھتا کہ اُردو و ہندی میں قابل ترجیح کون ہے اور نہ اس رائے کا وقت و موقعہ کہ ہندوؤں کا یہ طرز عمل انصاف پر مبنی ہے یا نہیں، لیکن بہ حیثیت مسلمان ہونے کے (مسلمان بہ لحاظ مذہب نہیں، بلکہ بہ لحاظ تہذیب و معاشرتِ قومی) میں یہ سوچنے پر ضرور مجبور ہوں کہ کیا اُردو زبان اور اُردو رسم الخط کا چھوڑنا ہمارے لئے ممکن و مناسب ہے اور اگر نہیں، تو پھر ہمکو اسکے تحفظ و بقا کے لئے کیا تدبیریں اختیار کرنا چاہئے۔

یہ میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ عناصر قومی میں زبان کا عنصر نہایت قوی عنصر سمجھا جاتا ہے اور شیرازۂ قومی کو یکجا رکھنے میں زبان سے زیادہ اہم کوئی چیز نہیں۔ اس لئے اگر مسلمان بہ لحاظ قومیت ہندوؤں سے مختلف ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ اپنی قومی خصوصیات کو ترک کرنے کی کوشش کریں جبکہ حقیقتاً کوئی قوم اپنی خصوصیات کو ترک کرہی نہیں سکتی۔

اس میں شک نہیں کہ یہ مسئلہ بجائے خود کافی بحث طلب ہے کہ ایک ہی ملک کی رہنے والی دو جماعتوں میں اختلافِ قومیت کیسا۔ لیکن قومیت کا ایک مفہوم تو وہ ہے جس میں وطنیت چیز مشترک ہوا کرتی ہے اور دوسرا وہ ہے جو تہذیب و معاشرت سے تعلق رکھتا ہے، اس لئے ہندو و مسلمان وطنیت کے لحاظ سے تو یقیناً ایک ہی چیز ہیں اور جس وقت ملک و وطن کی خدمت کا سوال پیش آئے ان دونوں میں کوئی اختلاف نہ ہونا چاہئے، لیکن جس حد تک ذوق و میلان یا تہذیب و معاشرت کا تعلق ہے یہ دونوں بالکل ایک دوسرے

سے علحدہ ہیں اور ہمیشہ علحدہ رہیں گے۔

اس ذوق کے اختلاف کا سب سے بڑا سبب مذہب ہے۔ سامی مذاہب اور خصوصیت کے ساتھ مذہب اسلام کی یہ انفرادیت کہ وہ جہاں کہیں پہونچا تمام ملکی وقومی رشتوں کو توڑ کر اس نے خاص اپنے رشتہ سے لوگوں کو وابستہ کر لیا اور ان کی اندرونی و بیرونی زندگی پر چھا کر ایک مخصوص تہذیب کا عادی بنا دیا اتنی زبردست چیز تھی کہ ہندوستان کے رہنے والے بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور جس شخص نے یہاں اسلام قبول کیا، اس نے گویا اپنی قدیم ہندی تہذیب کو بھی خیرباد کہدیا۔

یقیناً ہندوستان کی مسلم آبادی کا بڑا حصہ وہی ہے جو کسی وقت ہندو تھا، لیکن آج وہ جن خصوصیات کا حامل ہے، وہ ہندو معاشرت، ہندو تہذیب اور ہندو ذہنیت سے اس قدر مختلف ہیں کہ کبھی یہ بات ذہن میں بھی نہیں آتی کہ یہ آبادی کسی وقت ہندو رہی ہوگی ۔ مسلمانوں کی بود و باش، ان کی رفتار و گفتار، ان کی وضع قطع، ان کا ذوق ہندوؤں سے بالکل علحدہ ہے اور اقتصادی ذہنیت کا فرق تو خیر ظاہر ہی ہے کہ ایک کماتا ہے بچانے کے لئے اور دوسرا صرف اُڑانے کے لئے۔

اس وقت اس بحث کی ضرورت نہیں کہ ہندو مسلمانوں میں کس جماعت کا کلچر قابل تعریف ہے اور کس کا لائق مذمت بلکہ مدعا صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے اور ان میں اتحاد معاشرت و معیشت کی صورت پیدا ہونا تقریباً ناممکن ہے اور چونکہ زبان قومی خصوصیات میں سب سے زیادہ اہم بالشان چیز ہے اس لئے مسلمانوں کے لئے بالکل ناممکن ہے کہ وہ ہندی زبان یا ہندی رسم الخط اختیار کریں اور ہندوؤں سے بھی یہ توقع رکھنا کہ وہ ہندی پرچار کو چھوڑ دیں بالکل خلاف عقل ہے۔

ان دونوں جماعتوں کی ذہنیتوں کے درمیان اتنا زبردست فرق ہے کہ کبھی ملکر کام کر ہی نہیں سکتیں اور ان کو علحدہ علحدہ اپنی خصوصیات قومی کا تحفظ ضروری ہے، پھر چونکہ مسلمانوں کی جماعت بہ لحاظ اعداد و شمار ہندوؤں سے کم ہے اس لئے ظاہر ہے کہ اس کشاکش میں ان کو خطرات کا زیادہ سامنا کرنا ہے اور اگر انھوں نے غیر معمولی جد و جہد سے کام نہ لیا تو ان کی شکست یقینی ہے۔

جو لوگ اخباروں کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں ان سے مخفی نہیں کہ ہندو کس سرعت و استحکام کے ساتھ ہندی زبان اور ہندی رسم الخط کو ملک میں رائج کر رہے ہیں، اور برخلاف اس کے مسلمانوں کی بے پرواہی کا جو عالم ہے اس کا حال تصنیفی و صحافتی اداروں سے پوچھئے۔ انفرادی طور پر کہیں کہیں لوگوں نے انجمنیں قائم کر لی ہیں لیکن سوائے کبھی کبھی کوئی مقالہ پڑھ دینے کے وہ کوئی اور تعمیری پروگرام اپنے سامنے نہیں رکھتے۔ اس وقت سب سے زیادہ ضرورت اس امر کی ہے کہ محکمہ تعلیم کو اُردو کی اہمیت کی طرف متوجہ کیا جائے اور اگر مسلمانوں

کی کوئی سیاسی جماعت اس وقت موجود ہے تو وہ اُصولی طور پر ترویج و اشاعت اُردو کو اپنے مقاصد میں شامل کرے۔ علاوہ اس کے انفرادی طور پر ہر مسلمان کو بطور قومی فرض کے اپنی آمدنی کا کوئی ایسا حصہ جسے وہ بہ آسانی نکال سکتا ہے، خریداری کتب و رسایل کے لئے علحدہ کر دینا چاہئے، کیونکہ جب تک کسی قوم کی صحافت اچھی حالت میں نہ ہو، زبان کی صحیح خدمت انجام دینا مشکل ہے۔ اسی کے ساتھ ہر صوبہ میں ایک ایسا ادارہ ہونا چاہئے جو زبان کے متعلق محکمۂ تعلیم سے اپنے حقوق کا مطالبہ کرتا رہے اور نصاب کی کتابوں پر نقد و تبصرہ کر کے بتاتا رہے کہ ان میں کیا نقایص ہیں بلکہ اگر ممکن ہو تو وہ خود نصاب کے لئے کتابیں مرتب کرے اور۔ اسی کے ساتھ ایسے آدمی پیش کرے جو صحیح معنے میں اُردو جانتے ہوں اور اُردو کی تعلیم دینے والے ہوں۔ اس کے لئے تمام مرکزی مقامات پر ٹرننگ کالج قائم کر کے فارسی و عربی کی طرح امتحانات مقرر کرنا چاہئے انعامات وغیرہ کے ذریعہ سے طلبہ میں شوق و ولولہ پیدا کرنا چاہئے اور سفری کتب خانے قائم کر کے نہ صرف شہروں بلکہ قصبات و دیہات میں بھی کتابوں اور اخباروں کا ذوق پیدا کرنا چاہئے۔

ہمیں یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی کہ لکھنؤ میں بعض پُرجوش بہی خواہان اُردو نے ایک ایسے ادارہ کی بنیاد ڈالدی ہے جس کا نام "لکھنؤ اُردو اکاڈمی" ہے۔ یہ چند شعبوں میں منقسم ہے۔ (۱) شعبۂ نقد و مطالعہ، (۲) شعبۂ درس و تعلیم (۳) شعبۂ تصنیف و تالیف

پہلے شعبہ سے مقصود اُردو کلاسکس کی طرف لوگوں کو متوجہ کرنا ہے تاکہ زبان کا صحیح ذوق لوگوں میں پیدا ہو اور وہ سمجھ سکیں کہ اُردو ملک کی دوسری زبانوں کے مقابلہ میں کتنی وسعت رکھتی ہے۔ اسی کے ساتھ اسکا فرض یہ بھی ہوگا کہ وہ صوبۂ متحدہ کے اسکولوں اور یونیورسٹیوں کی درسی کتابوں کی جانچ کر کے اُن کے نقایص کی طرف محکمۂ تعلیم کو متوجہ کرے۔

دوسرے شعبہ کا اہم مقصد مدارس شبینہ کا قیام، اُردو زبان کے ذریعہ سے مختلف علوم کی ابتدائی تعلیم اور ایک اُردو ٹرننگ کالج قائم کر کے "ماہر اُردو۔ فاضل اُردو۔ کامل اُردو" کی ڈگریاں دینا ہے۔

تیسرے شعبہ کا کام معیاری کتابیں تصنیف کرنا، بہترین تالیفات کی طبع و اشاعت میں مدد دینا اور انعامات وغیرہ کے ذریعہ سے طلبہ اور ملک کے نوجوانوں میں تصنیف و تالیف کا ذوق پیدا کرنا ہے۔

کوشش کیجا رہی ہے کہ جلد سے جلد یہ ادارہ گورنمنٹ سے رجسٹر کرا لیا جائے اگر اہل ملک نے بے توجہی سے کام نہ لیا تو اُمید ہے کہ یہ تحریک بہت مفید ثابت ہوگی۔ اسوقت میرے سامنے اس کا تفصیلی لٹریچر موجود نہیں ہے اس لئے اس اجمال سے زیادہ میں اور کچھ عرض نہیں کر سکتا، لیکن جو حضرات اس باب میں تفصیلی معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ جنرل سکریٹری لکھنؤ اُردو اکاڈمی سے خط و کتابت کریں۔

جنوری ۱۹۳۶ء کا نگار جیسا کہ اعلان کیا جا چکا ہے، ہندی شاعری کے لئے وقف ہوگا اور بعض حضرات کے مضامین بھی اس اشاعت کے لئے موصول ہو چکے ہیں، لیکن میں نے اس کو نہایت افسوس کے ساتھ محسوس کیا کہ ہندی زبان کا پرچار کرنے والے اور برج بھاشا پر جان دینے والے ابتک اس منزل پر بھی نہیں پہونچے جن سے اُردو زبان اب سے بیس سال قبل گزر چکی ہے۔

جس حد تک شمار و اعداد کا تعلق ہے ہندی کتابوں اور ہندی رسایل و جراید کی ترقی سے انکار ممکن نہیں لیکن مجھے اس میں کلام ہے کہ ہندی لٹریچر قدر و قیمت کے لحاظ سے بھی اُردو لٹریچر سے آگے بڑھ گیا ہے۔

بعض بڑے بڑے اہل قلم ہندی نگاروں کے مضامین موصول ہوئے ہیں، لیکن اپنے معیار کے لحاظ سے وہ اس درجہ پست ہیں کہ اگر آج اُردو کا کوئی رسالہ ایسے مضامین شائع کرنے پر آجائے تو کوئی آنکھ اُٹھا کر بھی انھیں نہ دیکھے۔ یہ درست ہے کہ ہندی نے حال ہی میں ترقی شروع کی ہے اور اُردو اس سے بہت زیادہ عمر رسیدہ زبان ہے، لیکن میں جس کمی کو محسوس کر رہا ہوں اس کا تعلق امتداد زمانہ سے اتنا نہیں ہے جتنا ذوق جمالیات، ذوق فن سے ہے۔ ہندی کے لکھنے والے اکثر وہ ہیں جو کسی نہ کسی مغربی زبان میں اعلیٰ سند حاصل کر چکے ہیں، اسلئے کوئی وجہ نہیں کہ وہ ہندی میں اُس ذوق سے کام نہ لیں جسے انھوں نے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں حاصل کیا ہے۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ شاید ہندی زبان ہی میں ابھی یہ صلاحیت پیدا نہیں ہوئی کہ وہ کسی بلند ذوق کی چیز کو پیش کر سکے اور اس کے انداز بیان میں وہ تنوع ابھی تک پیدا نہیں ہو سکا ہے جو مختلف مباحث کے لئے مختلف اسلوب ادا کے لئے ضروری ہوا کرتا ہے۔

میں کوشش کر رہا ہوں کہ جنوری ۱۹۳۶ء کا نگار بھی جنوری ۱۹۳۵ء کے نگار کی طرح کام کی چیز ثابت ہو اور غالباً یہ دیکھ کر آپ کو حیرت ہوگی کہ اس میں بہترین مقالے انھیں کے ہونگے جنھیں ہندی زبان کا کوئی حق نہیں ہے۔

زیر طباعت مجموعۂ استفسار و جواب کے متعلق جو خطوط موصول ہوئے ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کا زیادہ رجحان اسی طرف ہے کہ اُسے دو حصوں میں شایع کیا جائے، اس لئے میں بتا دینا چاہتا ہوں کہ دوسرا حصہ تقریباً طیار ہے اور اُمید ہے کہ شروع اکتوبر میں شایع ہو جائے۔ اس کی قیمت بھی خریداران نگار کے لئے دو روپیہ اور غیر خریداران کے لئے تین روپیہ مقرر کی گئی ہے۔ وہ حضرات جو اس کا پہلا حصہ خرید چکے ہیں ان کے لئے دوسرے حصہ کی خریداری کا مسئلہ تقریباً طے شدہ ہے، لیکن جنھوں نے پہلا حصہ بھی نہیں لیا ان کو ضرور اس امر پر غور کرنا ہے کہ دوسرے حصہ کی اشاعت سے قبل پہلا حصہ اُن کو حاصل کرنا چاہئے یا نہیں اور اگر وہ دونوں حصے ساتھ لینا چاہتے ہیں تو ان کو اس کی اطلاع پہلے ہی سے دیدینا چاہئے۔

پارسی اہلِ کتاب ہیں

زرتشتیوں کے ساتھ مسلمانوں کی رواداری

(مسلسل)

تاریخ و سیر کی کتابیں جن کا تعلق اسلام کے دورِ اولین سے ہے صاف صاف اس بات کا اظہار کرتی ہیں کہ زمانۂ ماقبل کے مسلمانوں نے زرتشتیوں کے ساتھ پوری رواداری برتی اور اُنھیں مثل یہود و نصاریٰ کے زمرۂ اہلِ کتاب میں شمار کیا۔ علامہ شہرستانی اپنی مشہور کتاب "الملل والنحل" میں دین زرتشت پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ پیغمبر ایران کی تعلیم میں خدا کی عبادت اور شیطان سے نفرت پر بہت زور دیا گیا ہے اور لوگوں کو امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے متعلق تاکید کی گئی ہے۔[1]

مناسب ہوگا اگر اس مقام پر مولانا عبدالحق حقانی جیسے زبردست فقیہہ کا خیال بھی پیروانِ پیغمبر ایران کے متعلق ظاہر کیا جائے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ:- "مجوسی زرتشت ابن بوراسپ کے پیرو ہیں جنھوں نے عہد گشتاسپ بن لہراسپ میں ظہور فرمایا تھا۔ گشتاسپ خود بھی زرتشت کا پیرو تھا۔ اس گروہ کے خیال میں نور اور ظلمت دو مخالف عناصر پر تمامی ہستی کا وجود منحصر ہے۔ خدائے بزرگ و برتر خالق کلِ موجودات ہے۔ نہ تو وہ کوئی شریک رکھتا ہے اور نہ اُس کا کوئی معین و مددگار ہے۔ نور اور ظلمت گویا نیکی و بدی۔ امن و پریشانی۔ پاکبازی اور خباثت کی علامت ہیں۔ ہر چیز اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے۔ زرتشت اُس کتاب کے مصنف یا مبلغ سمجھے جاتے ہیں جس کا نام زند اوستا ہے۔ لوگوں کا خیال یہ بھی ہے کہ یہ کتاب اُن پر بذریعہ الہام نازل ہوئی تھی اُن کی تعلیم کے مطابق کارخانۂ قدرت کے دو رُخ ہیں ایک تو وہ جو پہلے سے مقدر ہو چکا ہے اور دوسرا انسانی اعمال اور کوشش سے ظاہر ہوتا ہے۔

---

[1] فارسی ترجمہ موسومہ توضیح الملل صفحہ ۲۰۳ (نسخۂ خطی امپیریل لائبریری کلکتہ) اس کے ساتھ ہی کتاب تنبیہہ الاشراف مولفۂ مسعودی صفحہ ۹۳ بھی ملاحظہ ہو۔

دونوں کے درمیان ایک خاص ربط ہے۔ زرتشت کے خیال کے مطابق تمام مصائب کا باعث خود انسان کا عمل ہے۔ دنیاوی سعادت اور نجات اُخروی کے لئے انسان کے اعتقاد اقوال اور اعمال کا پاک ہونا لازمی ہے اور یہی اصل ایمان ہے[1]۔" اکثر علمائے اسلام نے زرتشتیوں کا شمار اہلِ کتاب میں کیا ہے[2]۔ عوام میں جو غلط فہمی انکے متعلق پھیلی ہوئی ہے اس کا اصلی سبب محض ہماری کوتاہ بینی اور تعصب پرستی ہے۔ جو ہمیں اس مذہب کے اخلاقیات کا مطالعہ کرنے سے معذور رکھتی ہیں۔ اس کے علاوہ زرتشتی ادبیات زیادہ تر ہمارے دسترس سے باہر ہیں۔ اب کچھ عرصہ سے مغربی علماء کی جد و جہد سے زرتشتیوں کی دینی کتابیں ترجمہ ہو کر شائع ہوئی ہیں اُن کے مذہب پر [illegible]ے کا کافی موقع ملتا ہے۔ ان ہی کے ساتھ ساتھ اگر ہم زمانۂ سلف کے مسلمان مورخین اور علماء کی تصنیفات [illegible] کریں تو دینِ زرتشت کی اصلی حالت ہمارے سامنے آئینہ ہو جائے گی۔ دبستان مذاہب مولفہ ملا محسن کشمیری میں اس مذہب کے عقاید اور مراسم کا اجمالی احوال درج ہے۔ اور اکثر زرتشتی علماء کے متعلق بھی مفصل ذکر موجود ہے۔ ملائے موصوف ایک مشہور مجوسی عالم آذر کیوان کے متعلق فرماتے ہیں کہ لوگ اُنھیں "ذو العلوم" کہتے تھے۔ ادیانِ عالم پر اُن کو کافی عبور حاصل تھا۔ شمس العلماء شبلی نعمانی نے بھی آذر کیوان کے متعلق اپنے مقالات میں تحریر فرمایا ہے کہ وہ موحد اور صوفی تھے اور اکثر مسلمان عالم اُن کے شاگرد تھے[3]۔ اسی طرح ایکدوسرے مجوسی عالم بہرام بن فرہاد کے متعلق دبستان میں تذکرہ ملتا ہے کہ وہ فلسفہ کی ہر شاخ پر عبور رکھتے تھے۔ عربی، فارسی، سنسکرت اور پہلوی زبانوں کی کل کتابیں اُن کے مطالع سے گزر چکی تھیں۔ ایک اور عالم موبد سروش کے متعلق صاحبِ دبستان کا بیان ہے کہ خود انھوں نے اُس سے خدا کے وجود کے متعلق دو سو بیس دلیلیں سیکھی تھیں۔

اب ہماری سمجھ سے بالکل باہر ہے کہ ایسے مذہب کے متعلق کیونکر خیال کیا جا سکتا ہے کہ وہ شرک اور کفر کی تعلیم دیتا ہے جس میں اس طرح کے خداشناس اور صاحب فہم بزرگ پائے جاتے ہوں — مشہور مسلم سیاح اور مورخ مسعودی اپنی کتاب مروج الذہب میں لکھتا ہے کہ قرونِ اولیٰ کے خلفائے اسلام نے زرتشتیوں کے ساتھ بالکل اہلِ کتاب کا سا سلوک کیا اور اُن کے مذہب میں کسی قسم کی مداخلت کبھی نہ کی خود مسعودی نے عراق۔ کرمان خراسان اور اکثر مقامات کے زرتشتی مرکزوں کو دیکھا تھا جہاں وہ لوگ بلا کسی پابندی اور قیود کے آزادانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ مسلمانوں کے ایران فتح کر لینے کے بعد بھی پیروانِ زرتشت عرصہ تک اپنے وطن میں پُرامن

---

[1] البیان۔ مولفہ مولانا عبدالحق حقانی صفحہ ۱۵۳۔ (ترجمہ انگریزی)۔ [2] نیکلسن کی تصنیف مطالعات الشعائر اسلامیہ۔ باب دوم۔ صفحہ ۱۶۷۔ اور پروفیسر آرنلڈ کا مقالہ مندرجہ دائرۃ المعارف دین و اخلاق۔ جلد نہم ملاحظہ ہو۔ [3] مقالات شبلی صفحہ ۳۸۔

زندگی بسر کرتے رہے[۱]۔ مسلمانوں کے ہاتھ دولت ساسانی کا استیصال محض سیاسی بنا پر ظہور میں آیا۔ اسے مذہب سے کوئی تعلق نہ تھا[۲]۔ ملک پر عربی تسلط ہو جانے کے باوجود وہاں کے نظم و نسق میں تبدیلی تقریبًا بالکل نہ ہوئی۔ خراج کی وصولی اور مالیات کے انتظام کے متعلق خود حضرت عمرؓ کے فرمان کے مطابق مشہور ساسانی بادشاہ نوشیروانِ عادل کے اُصول برقرار رکھے گئے[۳]۔ شمس العلماء مولانا شبلی مرحوم کا خیال ہے کہ یہ کارروائی قصداً عمل میں آئی۔ اس کے اسباب پر ابن الاثیر اور طبری نے بھی وضاحت سے روشنی ڈالی ہے[۴]۔

مرحوم مسٹر نریمان ایک پارسی فاضل فرماتے ہیں کہ "خلفائے اسلام نے عقلمندی سے کام لیکر مجوسیوں کو یہودیوں اور عیسائیوں کے برابر سمجھا اور اُن کا شمار اُن اقوام میں کیا جو کسی مستقل اُصول معاشرت کے حامل تھے[۵]"۔ اسی طرح جسٹس سید امیر علی صاحب مرحوم اپنی مشہور عالم تصنیف روح الاسلام میں تحریر فرماتے ہیں۔ "خود معلّم مذہب اسلام نے اس امر کی اجازت دیدی تھی کہ مسلمان شادی بیاہ کا رشتہ عیسائی۔ یہودی اور مجوسی اقوام سے جوڑ سکتے ہیں۔" ظاہر ہے کہ اگر مجوسی بھی اہل کتاب میں شمار نہ کئے گئے ہوتے تو اُن کے ساتھ شادی بیاہ کا رشتہ پیدا کرنے کی اجازت کیونکر دی جا سکتی تھی۔ اس جگہ صحیح بخاری کی ایک حدیث کا اشارہ نہایت مناسب ہوگا جس میں مرقوم ہے کہ خود جناب ختمی مرتبت رسول کریمؐ نے زرتشتیوں کے اہل کتاب ہونے کا صاف اعلان فرما دیا تھا[۶]۔ اور اس سلسلہ میں مصنف کتاب تیسیر القاری فی شرح صحیح بخاری نے یہ بھی تحریر فرما دیا ہے کہ امام شافعی اور محدث عبد الرزاق کا بھی خیال تھا کہ زرتشتی اہل کتاب ہیں۔ صحیح بخاری میں ایک مخصوص واقعہ کا بھی اسی مبحث کے متعلق ذکر ہے۔ کہ ایک بار مشہور صحابی رسول احنف جبکہ زرتشتیوں سے جزیہ وصول کرنے میں مصروف تھے تو چند لوگوں نے اعتراض کیا کہ زرتشتی اہل کتاب نہیں اس لئے اُن سے جزیہ لینا ناجائز ہے اس پر احنف نے کہا کہ ہم اتنا جانتے ہیں کہ خود رسول اللہ صلعم نے اس گروہ سے جزیہ لینا قبول فرمایا تھا۔ بات کچھ بڑھی اور پھر یہ مسئلہ حضرت علیؓ کے سامنے آخری فیصلہ کے لئے پیش ہوا۔ جناب امیرؓ نے فرمایا کہ حکم رسولؐ کے مطابق زرتشتیوں کے ساتھ بھی مثل دیگر اہلِ کتاب کے سلوک ہونا چاہئے۔ اس مقام پر یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ اُس زمانہ میں جزیہ کی مخصوص رقم صرف اُنھیں لوگوں سے وصول کی جاتی تھی جن کے متعلق گمان غالب تھا کہ وہ موحد اور کسی پیغمبر الٰہی کے پیرو ہے۔ اور اس کے معاوضہ میں اُن لوگوں کی حفاظت مسلمانوں پر لازمی تھی اور فوجی خدمات

---

[۱] تاریخ ادبیات ایران (براؤن) جلد یکم صفحہ ۲۰۶۔ [۲] روح الاسلام مصنفہ جسٹس امیر علی صفحہ ۱۷۷۔ روضۃ الاحباب — تاریخ الفخری۔ [۳] الفخری۔ صفحہ ۱۰۱ [۴] سیرۃ النعمان صفحہ ۱۲۷۔ [۵] ایران و پارسیان۔ جلد اول صفحہ ۸۲۔ اس کے علاوہ آثار خلافت راشدہ مولفۂ ولیم میور صفحہ ۲۷ بھی دیکھئے۔ [۶] بخاری باب الجزیہ۔ اس کے علاوہ جامع ترمذی جلد اول صفحہ ۵۰۳ (نولکشور پریس) بھی ملاحظہ فرمائیے۔

اُن کے لئے معاف تھیں۔ برخلاف اس کے مشرکین اور کفار سے جنھیں ادیانِ الٰہیہ سے کوئی واسطہ نہ تھا جزیہ قبول نہ کیا جاتا تھا اور وہ اسلامی ممالک کی حدود سے باہر نکالدئے جاتے تھے کیونکہ مسلمانوں کے درمیان اُن کی رہایش خطرناک سمجھی جاتی تھی اور جس کا تجربہ بھی اکثر وبیشتر ہو چکا تھا۔[1]

علامہ بلاذری کی مشہور تصنیف فتوح البلدان سے بھی اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ ہمارے رسول عربی صلعم نے مجوسیوں کے ساتھ اہل کتاب کا سا سلوک فرمایا اور اُن لوگوں سے جزیہ قبول کیا۔ یمن۔ عمان اور بحرین کے ساتھ مخصوص مراعات کا حکم حضرت نے جاری فرمایا تھا۔ پیغمبر اسلام ہی کی تعلیم کے مطابق حبیب ابن مسلم گورنر آرمینیا نے یہودیوں۔ عیسائیوں اور مجوسیوں کو اُن کی حفاظت کا یقین دے رکھا تھا۔ ملا باقر مجلسی ایک شیعی عالم خلافت جناب امیر علیہ السلام کا ایک واقعہ اپنی کتاب حیات القلوب میں یوں نقل فرماتے ہیں:[2]۔ ایک دن جناب امیر ممبر پر تشریف لے گئے اور فرمایا پوچھ لو مجھ سے جو کچھ تم لوگوں کو پوچھنا ہو۔ ایسے میں میں ابھی تمھارے درمیان موجود ہوں۔ یہ سُنکر ایک شخص الشعث بن قیس کھڑا ہوا اور کہنے لگا کہ اے امیر المومنین یہ تو فرمایئے کہ آپ مجوسیوں سے جزیہ کیوں لیتے ہیں جبکہ اس کا یقین ہے کہ نہ تو وہ اہل کتاب میں سے ہیں اور نہ اُن کے درمیان کوئی پیغمبر مبعوث ہوا۔ الشعث کے جواب میں حضرت نے فرمایا کہ تمھارا یہ خیال غلط ہے۔ بیشک خدا نے مجوسیوں کے درمیان اپنا پیغمبر بھیجا اور اُن پر ایک کتاب نازل فرمائی۔

ایک دوسرے شیعی فاضل مولانا سید محمد ہارون اپنی تصنیف توحید الائمہ میں زرتشتی مذہب کے متعلق تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جہاں تک وحدانیت باری کا تعلق ہے زرتشتی تعلیم کو کل دیگر مذاہب کے عقاید پر بعد اسلام کے فوقیت حاصل ہے۔ قاضی ابو یوسف اپنی کتاب الخراج میں ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ پیغمبر اسلام نے زرتشتیوں سے مثل اہل کتاب کے جزیہ تو قبول فرمایا تھا مگر یہود و نصاریٰ کی طرح اُن سے شادی بیاہ کرنے کی ممانعت فرمائی تھی کیونکہ مجوسی مشرک ہیں۔

اگرچہ ہمارے پاس قاضی صاحب کے اس بیان کی تردید کے لئے کافی سے زیادہ مواد موجود ہے تاہم بفرض محال یہ صحیح بھی ہو تو ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ حضرت سرور کائنات کا حکم مانی و مزدک کے پیرودں کے متعلق ہوگا جو ظاہر میں مجوسی ہی خیال کئے جاتے تھے اور جن کی اُس وقت بلاد اسلامیہ میں کثرت تھی۔ یہی جماعت ادبیات اسلامی میں اکثر زندیق کے نام سے بھی یاد کی گئی ہے اور جو درحقیقت خدا کے وجود کے بھی قایل نہ تھے۔[3] اس کے ساتھ ہی ساتھ ہم یہ بھی عرض کرنے پر مجبور ہیں کہ اگر صاحب کتاب الخراج کے خیال میں زرتشتی گروہ پر شرک کا اطلاق ہو سکتا ہے تو پھر یہود و نصاریٰ اُن سے زیادہ مشرک کہے جا سکتے ہیں ایک طرف تو یہودیوں کی قوم عزیر کے خدا ہونے کی قائل نظر آئی اور دوسری جانب عیسائیوں میں تثلیث پرستی رائج ہوئی۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ ان باتوں کے باوجود ہر دو گروہ کو

---

[1] خلافت۔ مولفہ میور صفحہ ۳۵۵۔ [2] نسخہ خطی (بانکی پور لائبریری) صفحہ ۲۷۰ الف۔ [3] کتاب الفہرست (ابن ندیم) ص ۳۲۷۔

قرآن شریف میں اہل کتاب کہکر مخاطب کیا گیا اور شریعتِ اسلامی نے ان کے ساتھ اکل و شرب۔ نکاح و شادی جائز قرار دیا۔

حقیقت تو یہ ہے کہ جناب سرور کائنات صلعم نے ایرانیوں کی جانب ہمیشہ بنظر التفات دیکھا اور اکثر و بیشتر موقعوں پر عہد نوشیروانِ عادل میں اپنی ولادت باسعادت کے واقعہ کا ذکر افتخار کے ساتھ فرمایا۔[1] صاحب نزہتہ القلوب آنحضرت سے یہ حدیث بھی نقل فرماتے ہیں کہ بتحقیق خدا نے عربوں کے درمیان سب سے بہتر قوم اہلِ قریش کو بنایا اور عجمیوں (غیر عرب) میں سب سے بہتر مخلوق ایرانیوں کو قرار دیا[2]۔ سلمان فارسی کی ارادت اور خلوص و پاکبازی کا خیال فرماتے ہوئے آپ نے انھیں اپنے اہل بیت میں شامل فرمایا اور اکثر اہم موقعوں پر اُن سے مشورہ فرمایا کرتے تھے[3]۔

فتوح البلدان میں مذکور ہے کہ جب رسول اکرم صلعم نے مجوسیوں کو اہل کتاب گردان کر اُن سے جزیہ لینا جائز فرمایا تو کچھ لوگ منافقین میں سے کہنے لگے کہ محمد نے انھیں اہل کتاب سمجھنے میں غلطی کو راہ دیا۔ بلاذری کا بیان ہے کہ اُسی وقت یہ آیت نازل ہوئی جسے حضرت نے لوگوں کے درمیان تلاوت فرمائی۔" اے وہ لوگ جو ایمان لائے ہو اپنے افعال پر نظر کرو۔ غلطی کرنے والا تمھیں کوئی نقصان نہیں پہونچا سکتا۔ تم خدا ہی کی طرف واپس جاؤ گے اور جس بات کو تم نہیں جانتے ہو وہ تمھیں سمجھا دے گا" (سورۃ پنجم آیۃ ۱۰۴)

یہ تو ایک بدیہی بات ہے کہ قرن اولیٰ کے مسلمانوں نے یہودیوں، عیسائیوں اور زرتشتیوں کے ساتھ نہایت رواداری سلوک جائز رکھا۔ خود پیغمبر اسلام نے اپنے مسلک کی تبلیغ ہمیشہ نہایت پُرامن طریقہ پر فرمائی۔ یہانتک کہ کفار کے ساتھ بھی اگر جنگ کی تو محض مدافعانہ۔ مسلمانوں نے اسلحہ اُسیوقت اُٹھائے جب وہ اس کے لئے مجبور کئے گئے۔ تبلیغ کے سلسلہ میں اگر کوئی جماعت کسی طرف بھیجی گئی تو اُن لوگوں کو رسول اللہ کی مخصوص ہدایت تھی کہ لوگوں کے ساتھ اخلاق و انکسار کے ساتھ پیش آئیں۔ اور ہمیشہ امن و امان سے کام لیں۔ صاحب مروج الذہب لکھتے ہیں[4] کہ ایک بار خالد بن ولید حضرت کے حکم سے قبیلہ خزیمہ کی طرف بغرض تبلیغ بھیجے گئے۔ قبیلہ والوں سے اور خالد سے کسی بات میں تکرار ہوگئی۔ اور موخر الذکر نے تقریباً ایکسو آدمیوں کو اُسی قبیلہ کے قتل کرا ڈالا۔ جیسے ہی یہ خبر رسول اللہ صلعم کے پاس پہونچی تو آپ چیخ اُٹھے "یا رب ہم خالد کے اس فعل کے ذمہ دار نہیں۔ ہم اسے

---

[1] تاریخ ادبیات ایران (براؤن) جلد یکم صفحہ ۱۲۶۔ ناسخ التواریخ۔ جلد دوم صفحہ ۳۹۵ ــ [2] نسخہ خطی (بانکی پور لائبریری) صفحہ ۳ (ب) ــ [3] مجالس المومنین مصنفہ قاضی نور اللہ شوستری ــ [4] نسخہ خطی (بانکی پور لائبریری) صفحہ ۱۳۵ الف اسکے علاوہ ملاحظہ ہو سیرۃ النبی جلد دوم صفحہ ۱۷۰ مولفہ مولانا شبلی۔

نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور تیری پناہ مانگتے ہیں۔" اس کے بعد فوراً ہی آپ نے حضرت علی کو قصاص کا روپیہ دیکر قبیلۂ خزیمہ کے پاس بھیجا اور اُن سے دوستانہ سلوک کرنے کی جناب امیر کو تاکید کی اور جب تک کہ قبیلۂ مذکور نے خالد کو معاف نہ کر دیا رسول اللہ نے اُن سے بولنا ترک فرمادیا تھا۔ جناب سرورِ کائنات کے عہد میں جو کچھ معاہدے یہودیوں عیسائیوں اور زرتشتیوں کے ساتھ کئے گئے تھے اُن کی پابندی خلافت راشدہ تک کی گئی اور "ذمیوں" کی جماعتیں اپنے رسومات ادا کرنے میں آزاد رہیں[۵۱]۔ عدالتوں میں قاضی نے اُن کے ساتھ مثل مسلمانوں کے انصاف کیا۔ مثال کے لئے ہم ایک واقعہ عہد جناب امیر کا پیش کرتے ہیں۔ کسی یہودی نے حضرت پر ایک دعویٰ کیا جو سراسر جھوٹ تھا۔ جناب امیر اپنی بریت میں کافی ثبوت قاضی کے سامنے پیش نہ کر سکے چنانچہ فیصلہ بھی امیر المومنین کے خلاف ہوا جسے حضرت نے بخوشی قبول بھی فرمالیا۔ اگرچہ بعد کو یہودی حضرت کی اس عدالت گستری کو دیکھ کر اپنے دعوے سے باز آگیا اور حقیقت حال کا اقرار کر لیا[۵۲]۔

جنگ نہاوند کے بعد جب ایرانی اسیروں کی جماعت کے ساتھ آخری ساسانی تاجدار کی بیٹی شاہزادی شہربانو دربار خلافت میں پیش ہوئیں تو حضرت عمر نے اُن کا حال سُنکر فوراً قید سے رہا فرمادیا اور جناب علی مرتضیٰ نے خاندان کسریٰ کی شان برقرار رکھنے کے لئے اپنے فرزند امام حسین کے ساتھ شہربانو کا عقد فرمادیا[۵۳]۔ چنانچہ الیعقوبی کہتا ہے کہ ان دو بزرگ خانوادوں کے اتحاد سے امام حسین کے بعد بقیہ ائمہ اثنا عشر کا سلسلہ چلا اور غالباً یہی وجہ ہوئی کہ ایران میں لوگوں کا رجحان زیادہ تر بنی فاطمہ کی طرف رہا[۵۴]۔ حسن اتفاق دیکھئے کہ مسلمانوں کی ایک دوسری کثیر التعداد جماعت یعنی احناف بھی تقلیداً ایران کی سرزمین سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ امام ابو حنیفہ ایرانی النسل تھے اور بقول شمس العلماء شبلی نعمانی مرحوم امام صاحب کے دادا بعہد جناب امیر کوفہ میں آکر سکونت پذیر ہوئے[۵۵]۔ یہ بزرگ اپنے آبائی وطن سے باہر جاکر بھی اپنی قومی عید (نوروز) کو کبھی نہ بھولے۔ چنانچہ ایک بار نوروز کے موقعہ پر آپ نے فالودہ تیار کر کے جناب امیر کی خدمت میں پیش فرمایا تھا اور جسے حضرت نے بخوشی قبول بھی کر لیا تھا[۵۶]۔ خود امام ابو حنیفہ کو ایرانیت سے خاص دلچسپی تھی یہاں تک کہ آپ نے نمازوں میں اکثر سورتوں کے متعلق فارسی زبان میں (بجائے عربی کے) تلاوت کی اجازت دے رکھی تھی[۵۷]۔ امام صاحب کے نزدیک ایک ذمی کا خون اتنی ہی اہمیت رکھتا تھا جس قدر کہ ایک مسلمان کا خون۔ عدالت کے سامنے مسلمان اور ذمی دونوں کا درجہ برابر تھا[۵۸]۔

---

[۵۱] کتاب الخراج (ابو یوسف) صفحہ ۷۰۔ [۵۲] البیان (مولفۂ مولانا عبد الحق حقانی) صفحہ ۲۹۶۔ [۵۳] الفخری ص ۹۹ تاریخ الاسلام مولفۂ عباسی صفحہ ۱۹۴۔ فتوحات عجم (الواقدی) صفحہ ۱۶۸۔ وغیرہ۔ [۵۴] نریمان کی کتاب ایران و پارسیان ص ۲۰ ملاحظہ ہو۔ [۵۵] سیرۃ النعمان۔ [۵۶] سیرۃ النعمان۔ [۵۷] سیرۃ النعمان۔ [۵۸] سیرۃ النعمان۔

مجوسیوں کے ساتھ رواداارانہ سلوک کے متعلق مصنف الکرار جناب امیر کے زمانہ کا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت کو جب خبر ملی کہ آپ کا ایک عامل مجوسیوں پر سختی کرتا ہے تو فوراً ہی آپ نے اُسے سختی کے ساتھ ہدایت نامہ تحریر فرمایا اور تنبیہ کی کہ عموماً کل ذمیوں اور خصوصاً مجوسیوں کے ساتھ مہربانی اور نرمی کا سلوک کرو۔ حضرت علی نے اپنے لشکر میں بھی اعلان فرما دیا تھا کہ اگر کسی سپاہی نے ذمیوں کے ساتھ کسی قسم کی سختی کی تو اُس کے ساتھ بھی ویسا ہی سلوک کیا جائے گا۔

اگر ہم کوشش کریں تو ایسے فرامین کثرت سے ملیں گے جنہیں جناب امیر نے یہودیوں۔ عیسائیوں اور زرتشتیوں کے ساتھ روادارانہ سلوک کا حکم فرمایا تھا۔ ابھی تھوڑا عرصہ ہوا کہ انجمن زرتشتیان بمبئی اور ایران لیگ نے چند اسی قسم کے فرامین کا مجموعہ (عہدنامے) شایع بھی کیا تھا اور جس کے متعلق مسلمانوں کے ایک ادبی ماہوار رسالہ میں تبصرہ کرتے ہوئے ایک صاحب نے اُن کی اصلیت ہی سے قطعی طور پر انکار فرمایا تھا۔[1] ممکن ہے کہ صاحب موصوف اپنی جگہ پر بالکل صحیح ہوں مگر اس حقیقت سے تو انکار کم از کم ہو نہیں سکتا کہ قرون اولیٰ کے مسلمان ذمّی اقوام کے ساتھ بہر طور رواداری کا برتاؤ کرتے تھے اور خلافت راشدہ کا زمانہ اس خصوصیت کے لئے ممتاز ہے۔ کتاب معروف فتوح البلدان میں اکثر ایسے صلحناموں اور معاہدوں کی نقلیں ہمیں ملتی ہیں جو جناب ختمی مرتبت صلعم نے اپنے اکابر صحابہ کے ذریعہ یہود و نصاریٰ اور مجوسیوں کے ساتھ طے فرمایا تھا۔ ان میں رواداری کی خاص شان نمایاں ہے اسی طرح نہج البلاغہ میں جناب امیر کے اُن احکام کی نقل ملیگی جو آپ نے ذمیوں کے ساتھ اچھے سلوک کرنے کے متعلق اپنے عمال کے نام صادر فرمائے تھے۔

بہرکیف جب تک سلاطین اسلام اپنے ہادی و رہبر کے احکام پر عامل رہے ایران کی حالت اچھی رہی اور یہاں کے باشندے۔ مسلم اور غیر مسلم ہر دو خوش حالی سے بسر اوقات کرتے نظر آئے۔ عباسیوں کے عہد میں تو دربار خلافت پر ایرانی اثر غالب آچکا تھا۔[2] فارسی زبان گویا درباری زبان کا درجہ حاصل کئے تھی۔ قدیم ایرانی ادبیات کا عربی زبان میں ترجمہ کرنے کے لئے حکومت کی طرف سے ایک خاص شعبہ قائم کیا گیا تھا۔[3] چنانچہ علامہ ابن ندیم نے اپنی کتاب الفہرست میں[4] مترجموں کی خاصی تعداد کا ذکر لکھا ہے۔ خلیفہ منصور کے عہد میں بہت سے زرتشتی علمار قدیم ایرانی کتابیں جمع کرنے پر مقرر تھے اور مسعودی کا بیان ہے[5] کہ اکثر مسلمان فضلاء مثلاً ابن ابی الارجاع۔ یحییٰ بن زیاد۔ مطیع بن ایاس وغیرہ نے

---

[1] معارف (اعظم گڈھ)۔ [2] مقالہ نوشتۂ ابوالمحاسن محمود علی صاحب (نگار۔ مارچ ۱۹۲۷ء) اور کتاب "خلافت" (مولفۂ میور) صفحہ ۴۵۶۔ ملاحظہ فرمائیے۔ [3] رسائل شبلی صفحہ ۲۳۔ دینیات زرتشتی (مصنفہ ڈاکٹر دھالا) صفحہ ۲۹۹۔ [4] صفحات ۲۴۴-۲۴۵ (مطبوعہ فلوگل)۔ [5] مروج الذہب (ذکر سلطنت القاہر باللہ)

ایرانیوں کی مذہبی ادبیات کے متعلق کتابیں تصنیف کیں۔ بلاشبہ عباسیوں کے زمانہ میں ایرانیوں نے وہ سب کچھ حاصل کر لیا تھا جو جنگ نہاوند و قادسیہ میں اُن کے ہاتھوں سے نکل جا چکی تھیں[1]۔ ہارون و مامون کے کل وزراء ایرانی یا ایرانی النسل تھے[2] اور اُن میں کے اکثر مجوسی۔ شمس العلماء شبلی تحریر فرماتے ہیں کہ[3] مامون الرشید کو زرتشتی علماء سے خاص ارادت تھی۔ ایک مجوسی عالم یزدان بخت مرو سے کسی مذہبی جلسہ میں شرکت کے لئے بغداد آیا تو مامون نے خاص احترام کے ساتھ اُس کا استقبال کیا اور اپنے محل کے قریب رہنے کے لئے جگہ دی۔

ایک مشہور مسلمان عالم لکھتے ہیں کہ[4] "عباسیوں کے عہد میں اکثر مقامات پر مجوسیوں کے معبد پائے جاتے تھے اور پیروان زرتشت سے جس رواداری کا برتاؤ کیا جاتا تھا اس کا اندازہ اسی امر سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ جب مامون نے حکومت کے انتظام کے لئے ایک مجلسِ مشورت قائم کی تو زرتشتیوں کو اپنا نمایندہ بھیجنے کی مخصوص ہدایت کی۔

ایران پر عربی تسلط ہو جانے کے ایک عرصہ بعد پارسیوں (مجوسیوں) کی ایک کثیر تعداد نے ہندوستان کا رُخ کیا اور یہیں آ کر آباد ہو گئے۔ اس ہجرت کے کئی اسباب ہیں۔ ہم یہ مانتے ہیں کہ زرتشتیوں کے لئے اُن کے آبائی وطن میں قومی حکومت کے ختم ہو جانے کے بعد پہلی سی بات باقی نہ رہی تھی تاہم وطن چھوڑ کر دوسرا ملک بسانے میں کچھ اور بھی مصلحتیں اُن کے پیشِ نظر تھیں۔ اُن کی تجارت پسند طبیعت نے اُنھیں مجبور کیا کہ وہ ہندوستان کی پُر امن فضا کی طرف توجہ کریں۔ ایران کی سرزمین اُن فرمانروایان اسلام کے ہاتھوں خانہ جنگی کا شکار ہو رہی تھی جو اپنے رسول اور اُنکی شریعت سے غافل ہو چکے تھے اور جہاں غیر مسلم اقوام کے علاوہ خود مسلمانوں کی حالت تباہ تھی۔

یہ حقیقت کہ پارسیوں کی وطن سے ہجرت کے بعد بھی ایک کافی تعداد مجوسیوں کی ایران میں بدستور جاگزیں رہی[5] اور ہندوستانی زرتشتیوں اور اُن کے ایرانی ہم مذہبوں کے درمیان دینی تعلقات برابر قائم رہے جیسا کہ سلسلۂ "روایات" سے ظاہر ہے اس امر پر کافی دلالت کرتی ہے کہ اس مہاجرت میں مسلمانوں کے مذہبی تعصب کو کم دخل تھا[6]

گزشتہ صفحات میں پیغمبر ایران اور اُن کی تعلیمات کے متعلق کوئی نئی بات بیان نہیں کی گئی۔ دنیا اب بہت کچھ ترقی کر چکی ہے۔ موجودہ زمانہ تحقیق اور بلند خیالی کے لئے معروف ہے۔ مذہبی تعصب اور تنگ نظری سے اب کام نہیں لیا جا سکتا۔ علمائے مغرب نے زرتشتی ادبیات کے ترجمہ و تحشیہ کے سلسلہ میں جیسی کاوشیں کیں وہ ہر طرح لائق تحسین و تشکر ہے۔ بلاشبہ اوائل میں اکثر عرب مصنفین نے بھی اس طرف توجہ ضرور کی اور جس کا مفصل پتہ ہمیں ایک روسی

---

[1] ہندوستان زمنِ وسطیٰ (لین پول) وغیرہ۔ [2] الفخری صفحہ ۲۶۵-۲۶۳۔ [3] الکلام جلد اول صفحہ ۴۳۔ [4] مقالہ نوشتۂ مولوی حمید احمد خاں (رسالہ ہمایوں مئی ۱۹۲۶ء)۔ [5] گنجینۂ مغاں (مولٹن) صفحہ ۱۲۳-۱۲۲۔ [6] تاریخ ادبیات ایران (براؤن) جلد اول صفحہ ۲۰۶۔

عالم کی تصنیف سے ملتا ہے[1]۔ مگر افسوس ہے کہ مسلم مصنفین اور مورخین کی کتابیں قومی اور مذہبی تعصبات سے پاک نہیں نظر آتیں۔ ان میں سے اکثر نے زرتشت کی تعلیم کا بالکل مخالف پہلو پیش کیا ہے۔ پھر بھی باوجود ان خامیوں کے ہم اُن کے شکر گزار ہیں کہ ایسی حالت میں جبکہ قدیم ایرانی تمدن و تہذیب سے باخبر ہونے کا ہمارے پاس سوائے شاہنامۂ فردوسی کے کوئی دوسرا ذریعہ نہیں اِن فضلائے مشرق نے ہمیں کسی قدر حالات سے مطلع کیا۔ مغربی محققین کے نزدیک شاہنامہ کی تاریخی حیثیت محض اتنی ہی ہے کہ اس کی قومی روایات پر بنیاد ہے۔ لیکن ہم جب اس بے مثال مثنوی کے بیانات کا مقابلہ مسعودی، طبری، یعقوبی، حمزہ اصفہانی، دیناوری وغیرہ جیسے اہم مورخین کی مصنفات سے کرتے ہیں تو فردوسی کو کسی مقام پر تاریخی واقعات سے منحرف نہیں پاتے۔ مرحوم مولانا شبلی کے خیال میں اہل مغرب کے نزدیک شاہنامہ کی تاریخی حیثیت محض اُس کے غیر فطری قصص و حکایات کے سبب پست نظر آتی ہے مگر جیسا کہ مولانا موصوف نے اس کی رد میں فرمایا ہے خود ہیروڈوٹس یونانی نے جسے لوگ تاریخ نویسی کا باوا آدم جانتے ہیں اپنی تصانیف میں ایسے ایسے ہزاروں یقین میں نہ آنے والے قصص و حکایات کا ذکر کیا ہے[2]۔ حقیقت امر یہ ہے کہ فردوسی کا مقصد واقعات کو اُن کی اصلی صورت میں پیش کر دینا تھا جیسا کہ اُس نے اپنی ملکی اور قومی روایات میں پایا تھا۔ چنانچہ نہ محض یہ کہ نالدیکی۔ موھول۔ براؤن وغیرہ جیسے مشہور مستشرقین نے اس بات کا اظہار کر دیا ہے کہ فردوسی نے شاہنامہ میں قدیم روائتیں نہایت دیانت کے ساتھ نظم کیں بلکہ اس کی تصدیق یوں بھی ہو جاتی ہے جب کہ ہم شاہنامہ کا تقابل ادبیات پہلوی سے کرتے ہیں۔ بقول ابن الاثیر عربی ادبیات باوجود اسکے کہ لغات العرب میں کثرت اور کافی سے زیادہ وسعت ہے شاہنامہ جیسی گراں بہا اور عظیم الشان کتاب کے وجود سے خالی ہیں[3]۔

بہرطور اب ہم دین زرتشت اور اُس کے پیرووں سے متعلق ایک نئے دور کے آغاز کا کچھ حال بیان کر دینا مناسب سمجھتے ہیں۔ مجوسیوں نے قومی حکومت کے استیصال کے بعد موجودہ صدی کے اوائل تک انقلابات گوناگوں کا مقابلہ کیا یہاں تک کہ اُن کی ایک کثیر تعداد نے وطن سے منھ موڑ کر ہندوستان کو ابایا۔ مگر اب کہ ایرانی سلطنت کی باگ ایک ایسی ہستی کے ہاتھوں میں آئی جس کے پیش نظر محض ملکی اور قومی ترقی ہے اور جسے مذہبی عصبیت سے کچھ بھی تعلق نہیں ہم دیکھتے ہیں کہ موجودہ ہندوستانی پارسی (زرتشتی) اپنے آبائی وطن ایران سے تعلقات کی تجدید میں سرگرم ہیں۔ چنانچہ باوجود اس کے کہ حکومت برطانیہ کے زیر سایہ ہندوستان میں ان پارسیوں نے نہایت پُرامن زندگی بسر کی اور یہ ملک ایک طور پر اُن کا وطن بن گیا اُن کے دلوں میں قدیم آبائی مسکن کی یاد پھر تازہ ہو رہی ہے

[1] اسلامی ادبیات پر ایرانی اثر (مولفہ آئی نوسترانزیو) مترجمہ جی۔ کے۔ نریمان۔ [2] شعر العجم جلد اول صفحہ ۱۷۔ [3] شعر العجم صفحہ ۱۱

کوشش کی جا رہی ہے کہ وہ اپنے سرمایہ سے ایران کی خدمت کے لئے تیار ہو جائیں اور ممکن ہے کہ آئندہ یہ جماعت پھر اپنے اصلی وطن میں سکونت اختیار کرے۔ اعلیحضرت رضا شاہ پہلوی کی حکومت یوں تو بالعموم کل ایرانیوں کے لئے بلاتفریق مذہب باعث رحمت ہے مگر زرتشتیوں کے لئے مخصوص ایسے مراعات ہیں جو انھیں آج تک بعد زوالِ دولت ساسانی نصیب نہ ہوئی تھیں۔ ایران کی مجلس (پارلیمنٹ) میں نہ محض یہ کہ اُن کا بھی نمایندہ موجود ہے بلکہ بڑے بڑے عہدوں پر آج متعدد مجوسی نظر آتے ہیں اور اُن کے گروہ کو ہر قسم کی دینی و دنیاوی آزادی حاصل ہے۔ یزد و کرمان میں جہاں ان کی کثرت ہے ہم دیکھتے ہیں کہ ایران و ہندوستان کے زرتشتی سرمایہ سے، مدرسے، یتیم خانے، مریض خانے، مسافر خانے کثیر تعداد میں موجود ہیں اور دن بدن اُن میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اُن کے دلوں میں مسلمانوں کی جانب سے جو کدورت تھی اُس میں نمایاں کمی نظر آتی ہے اور خود مسلمان اُن کی دلجوئی میں پیش پیش دکھلائی دیتے ہیں۔

محمد طاہر رضوی ام ۔ اے

جھانسی کی رانی

(مسلسل)

دوسرا ایکٹ - پہلا منظر

یکم مارچ ۱۸۵۵ء بوقت سہ پہر گورنمنٹ ہاؤس کلکتہ کے جنوبی حصہ میں گورنر جنرل کی اگزکٹو کونسل کا اجلاس ہو رہا ہے۔ جس میں گورنر جنرل اور چار معمولی ممبر موجود ہیں۔ کمرہ وسیع، مربع اور بلند ہے۔ پچھلی دیوار میں دو بلند کھڑکیاں ہیں جن سے خانہ باغ نظر آرہا ہے۔ ایک لمبا پنکھا ہاتھ سے کھینچنے والا لٹکا ہوا ہے۔ جس کے نیچے ایک ہلالی میز بچھی ہوئی ہے۔ میز کے پیچھے ایک ترخ کرسی کسی قدر بلند رکھی ہوئی ہے۔ میز کے داہنے اور بائیں تین تین کرسیاں اور ہیں۔ کمرہ مختلف قسم کے سامان سے آراستہ ہے۔ بلند کرسی کے سامنے وارن ہسٹنگز کی قد آدم تصویر آویزاں ہے۔ ہر کرسی کے سامنے بڑی بڑی دواتیں، کاغذ اور پر کے قلم سجے ہوئے ہیں۔ اونچی کرسی لارڈ ڈلہوزی گورنر جنرل کی ہے۔ اس کے داہنی طرف گورنمنٹ سکریٹری مسٹر جے۔ پی۔ گرانٹ کی نشست ہے جس کے آگے سرکاری کاغذات کا ڈھیر ہے۔ بائیں طرف کونسل کے سینیئر ممبر مسٹر جے۔ اے ڈورن کی نشست ہے اور اس کی بائیں ہاتھ مسٹر ہالیڈے ممبر کونسل کی کرسی ہے۔ سکریٹری کے داہنی طرف کرنل جان لو کی کرسی ہے۔ یہ اینگلو انڈین وضع کے ایک شگفتہ مزاج اور تنومند انسان ہیں۔ اور دیگر انگریزوں سے کسی قدر مختلف نظر آتے ہیں کیونکہ اگرچہ ان کا لباس صحیح انگریزی قطع کا ہے لیکن دیسی کپڑے کا اور یہیں کا سلا ہوا ہے۔ کالر کے بجائے ان کے گلے میں ہندوستانی ریشم کا گلوبند ہے۔ عمر اگرچہ ساٹھ سال کی ہے لیکن کاٹھی اچھی ہے۔ دوسرے انگریز گلمچھے رکھے ہوئے ہیں مگر کرنل صاحب کی داڑھی مونچھ صاف ہے۔ چھوٹا سا چاندی کا حقہ ہاتھ میں ہے اور وہ باتیں کرتے

کرتے نس لگاتے رہتے ہیں۔ لارڈ ڈلہوزی، پستہ قد، نازک اندام گر نستعلیق وضع کا آدمی ہے۔
چہرہ سے متانت اور امارت برستی ہے۔

پردہ اُٹھتا ہے تو مسز ڈورین، ہالیڈے، اور گرانٹ اپنی اپنی جگہ بیٹھے اور گپ شپ کرتے نظر آتے ہیں۔ مگر گرانٹ سرکاری کاغذات کا بھی مطالعہ کرتا جاتا ہے۔ پنکھا بند ہے۔

ڈورین:۔ میں امید کرتا ہوں کہ آج پھر مسٹر ٹو (ٹوکر) اپنے آپ کو بیوقوف ثابت نہیں کریں گے۔ میں نے انھیں سمجھا دیا ہے کہ ہز ایکسلنسی گورنر جنرل برہما سے نہایت خستہ و پریشان واپس آئے ہیں۔ اور وہ غو باتیں سننا پسند نہیں کریں گے۔

ہالیڈے:۔ میں آج تک نہیں سمجھ سکا کہ ٹو کے دل میں کیا سمائی ہے کہ وہ ہمیشہ گورنر جنرل سے جھگڑا کرتا رہتا ہے، میں انھیں ہمیشہ سمجھاتا رہتا ہوں کہ جو بات لارڈ ڈلہوزی کے دل میں سما جاتی ہے وہ اس کو پورا کر کے رہتے ہیں اس لئے اس معاملہ میں ان کی مخالفت کرنا بے سود ہے۔ مجھ سے زیادہ لارڈ ڈلہوزی کو اور کوئی نہیں جانتا۔ وہ اس قسم کے آدمی ہیں کہ ہمیشہ اپنے دل کی بات کرتے ہیں اور اب جبکہ جدید قانون کے ذریعہ سے گورنر جنرل کو یہ اختیار حاصل ہو گیا ہے کہ اگر وہ چاہے تو اپنے کونسلروں کی نہ مانے، تو وہ اپنے دل کی بات آئینی طور پر بھی پوری کر سکتے ہیں۔ مگر یہ کمبخت تو کچھ دیکھتا ہی نہیں، وہی پرانا راگ الاپے جاتا ہے کہ لارڈ ایمبرا اور لارڈ ہیٹنگ نے یہ کہا تھا اور لارڈ ڈلہوزی لارڈ اینسٹن نے یہ کیا۔ بھلا یہ کونسی عقل کی باتیں ہیں۔

ڈورین:۔ مسٹر گرانٹ! اب مسٹر ٹو کی پنشن میں کتنے دن باقی رہ گئے ہیں؟ اگر وہ موجودہ حکومت سے غیر مطمئن ہیں تو کیوں اپنی پنشن کے کاغذات پیش نہیں کر دیتے۔

گرانٹ:۔ فوجی پنشن تو ان کو فوراً مل سکتی ہے کیونکہ اب ان کی عمر ساٹھ برس کی ہو گئی ہے۔ رہا معاملہ سول پنشن کا تو جتنے سال وہ محکمہ سول میں کام کریں گے اسی نسبت سے انھیں پنشن کا استحقاق ہو گا۔

ڈورین:۔ اچھا اگر آج بھی انھوں نے حسب معمول وہی باتیں کیں تو میں ان سے بھری کونسل میں صاف صاف کہہ دوں گا کہ اگر آپ گورنمنٹ کی پالسی سے موافق نہیں ہیں تو استعفیٰ ہو جائیے۔ میں یقین کرتا ہوں کہ اگر پوری کونسل نے میری تائید نہ بھی کی تو لارڈ ڈلہوزی ضرور میرا ساتھ دیں گے۔ علاوہ ازیں مجھے کرنل ٹو کی یہ بات سخت ناگوار گزرتی ہے کہ جب کبھی اختلاف ہوتا ہے تو وہ اپنے اور گورنر جنرل کے درمیان مجھے حکم قرار دیتے ہیں۔ میں علحدگی میں کرنل سے بار بار کہہ چکا ہوں کہ لارڈ ڈلہوزی جیسے ہمالیہ پہاڑ سے ٹکرا کر میں انگلستان میں اپنا مستقبل خراب کرنا نہیں چاہتا مگر ان کی سمجھ ہی میں نہیں آتا۔

ہالیڈے:۔ حقیقت تو یہ ہے کہ گورنر جنرل پر کسی قسم کا اثر ڈالنے کا ہمارے لئے موقعہ ہی نہیں۔ وہ اپنی کونسل کو

ایسا سمجھتے ہیں گویا وہ ان کے فیصلوں پر صاد کرنے کی ایک مشین ہے۔ وہ ہماری رائے کو ٹھکرا سکتے ہیں اور فی الحقیقت وہ ہمیشہ ایسا کرتے ہیں۔ پھر جو تدابیر بہرصورت کی جانے والی ہیں یا جو کارروائیاں کسی نہ کسی طرح ہونے والی ہیں ان کی مخالفت کرنا کونسی دانشمندی ہے؟

ڈورین:۔ (گھڑی دیکھ کر)۔ اب کام شروع ہونا چاہیے تھا۔ ہز اکسلنسی نے کتنی دیر کے بعد آنے کو فرمایا تھا؟

گرانٹ:۔ (گھڑی دیکھ کر)۔ انھوں نے فرمایا تھا کہ جونہی ڈاکٹری معائنہ ختم ہو جائے گا وہ فوراً چلے آئیں گے۔ ڈاکٹر صاحبان ہز اکسلنسی کی صحت کو تشویش کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ وہ انھیں یہاں زیادہ دیر تک رہنے کی اجازت نہ دیں گے۔ یہی باعث ہے کہ اس طویل ڈاکٹری معائنہ کی ضرورت ہوئی۔

ڈورین:۔ اور کرنل آر ابھی تک کیوں نہیں آئے۔ انھیں تو یہاں وقت پر پہونچ جانا چاہیے تھا۔

گرانٹ:۔ (طنزیہ لہجہ میں)۔ وہ برابر کے ایک کمرہ میں جھانسی کی رانی سے بات چیت کر رہے ہیں۔ جونہی وہ یہ خبر سنیں گے کہ گورنر جنرل ایوان کونسل میں آ رہے ہیں، وہ بھی یہاں چلے آئیں گے۔

ڈورین و ہالیڈے:۔ (تعجب سے)۔ جھانسی کی رانی!

ڈورین:۔ (تحکمانہ لہجہ میں)۔ او مسٹر گرانٹ! وہ یہاں کس کے حکم سے آئی!

ہالیڈے:۔ کیا ہز اکسلنسی نے حکم دیا تھا کہ آج وہ یہاں موجود رہے؟

گرانٹ:۔ حضرات! اس بارہ میں مجھ سے کچھ نہ دریافت کیجئے۔ کیونکہ آپ کی طرح مجھے بھی اس معاملہ سے کوئی آگاہی نہیں۔ میں اس معاملہ میں آپ کو صرف اسقدر بتا سکتا ہوں کہ جب اس جلسہ میں حاضر ہونے کے لئے میں اپنے دفتر سے چلنے لگا تو میرے پاس ایک رقعہ پہونچا جس میں لکھا تھا کہ جھانسی کی رانی کو آج یہاں لانے کی ذمہ داری کرنل آر اپنے سر لے رہے ہیں کیونکہ شاید آخری فیصلہ کرنے سے پیشتر گورنر جنرل باکونسل جھانسی راج کے بارہ میں کوئی بات چیت کرنا چاہے۔ جب میں گورنمنٹ ہاؤس پہونچا تو معلوم ہوا کہ جھانسی کی رانی آ چکی ہے اور برابر کے ایک کمرہ میں ٹھہرایا گیا ہے۔ اس کے تھوڑی دیر بعد کرنل آر نے مجھ سے کہلا بھیجا کہ انھوں نے فوجی معتمد سے کہدیا ہے کہ وہ گورنر جنرل کی نقل و حرکت سے اطلاع دیتے رہیں تاکہ ان کے آنے سے قبل وہ ایوان کونسل میں آ جائیں گے۔

ہالیڈے:۔ (دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ کر) اب تو معاملات بد سے بدتر ہوتے جا رہے ہیں۔ اگر ہز اکسلنسی کو یہ معلوم ہو گیا کہ ان کے پیچھے لگانے کے لئے ایک عورت کو خفیہ طور پر گورنمنٹ ہاؤس میں لایا گیا ہے تو وہ کیا کہیں گے؟ (سر اٹھا کر اور بگڑ کر)۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ بے غیرت تو گردن مارے جانے کے قابل ہے، اچھا دیکھوں میں بھی کیا مزہ چکھاتا ہوں۔

ہالیڈے:۔ (غصہ سے)۔ ایسی گستاخی تو کبھی دیکھی نہ سُنی، کہتے ہیں کہ جب گیدڑ کی موت آتی ہے تو وہ شہر کی طرف بھاگتا ہے۔ بالکل یہی حال تو کا ہے، یقیناً اس کی قضا آ گئی ہے۔

عین اسی وقت کمرہ کے داہنی طرف ایک دروازہ کھلتا ہے اور کرنل جان لو مسکراتے ہوئے
اور ہاتھ میں حقہ لئے داخل ہوتے ہیں اور ڈورین اور ہالیڈے کے پیچھے کھڑے ہوجاتے ہیں۔
بعدازاں اپنی نشست کی طرف بڑھتے ہوئے۔

لو:۔ کیوں کیا معاملہ ہے!! آج تو تم لوگ بہت پھولے ہوئے سے نظر آتے ہو۔ صورتوں پر متانت کی پھٹکار برس رہی ہے ہونہہ! خدا کا شکر ہے کہ میرے اجداد میں بعض آئرلینڈ کے رہنے والے تھے۔ اور اسی لئے یہ بات مجھے معلوم ہے کہ جب امور سلطنت انجام دیتا ہوں تو ماتم زدہ بنکر نہ بیٹھنا چاہئے، ہندوستان کو ان لوگوں نے حاصل کیا ہے جو سخت سے سخت مصیبت کے وقت بھی ہنستے بولتے اور شگفتہ مزاج رہتے تھے۔ لیکن آج وہ زمانہ ہے کہ لوگ یہ خیال کرنے لگے کہ جب تک اعلیٰ حکام کوٹ پتلون سے سجے ہوئے نہ ہوں اور تحصیل کے خزانچیوں کی طرح روکھا منھ بنائے نہ رہیں اسوقت تک داد جہانبانی دی ہی نہیں جاسکتی۔

کرنل صاحب اپنی نشست تک پہونچتے ہیں۔ کرسی پر بیٹھ کر گردن سینہ پر جھکا لیتے ہیں۔ اور سامنے
کی طرف ٹانگیں پھیلا کر خود بخود کچھ بکتے رہتے ہیں۔ دوسرے حاضرین ان کی طرف توجہ نہیں کرتے۔

لو:۔ (آپ ہی آپ) افوہ! کسقدر انقلاب ہوگیا ہے۔ جو صورت ڈورین نے آج بنا رکھی ہے اسے دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ یہ وہی شخص ہے جو آج سے بیس برس پہلے مادر زاد دریائے ہگلی میں کود پڑا تھا اور بارکپور سے کلکتہ تک تیرتا ہوا آیا تھا۔ جسے نہ ڈوبنے کا ڈر تھا نہ گرمچھ کا خطرہ۔ اور یہ سب کچھ محض معمولی شرط کی وجہ سے کیا تھا۔ جب یہ شخص پرنسپ گھاٹ پر پہونچا تو لیڈیاں جمع تھیں، بینڈ بج رہا تھا اور یہ اپنی شرط کی رقم وصول کر رہا تھا۔ اور ذرا ان کا! مسٹر ہالیڈے کا حلیہ بھی تو ملاحظہ فرمائیے۔ یہ وہی ہیں جو جنرل گف کے ساتھ سکھوں سے لڑے، جن کی شجاعت وبسالت کی داستانیں مراسلات میں بیان ہوئیں، اور آج یہ ایسے مرزا پھویا بنے بیٹھے ہیں کہ انھیں گورنمنٹ ہاؤس میں آواز بلند کرتے بھی ڈر معلوم ہوتا ہے۔

ہالیڈے:۔ ہاں لو! سچ کہتے ہو۔

ہالیڈے بےچینی کے ساتھ ادھر اُدھر دیکھ کر کچھ جواب دینا چاہتا ہے۔ لیکن کرنل لو اس کی پروا کئے
بغیر اپنی گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتا ہے۔

لو:۔ (سلسلۂ سخن جاری رکھتے ہوئے)۔ اور تو اور ذرا مسٹر گرانٹ کو دیکھئے جو بڑی آزاد رائے والے سمجھے جاتے تھے!! یہ وہی ہیں جو الفنسٹن کے ماتحت تمام نوجوانوں میں سب سے زیادہ ہونہار تھے۔ یہ وہی ہیں جنھیں اس لئے کلکتہ لایا گیا تھا کہ یہ ہمیں حکومت چلانے کے طریقے سکھائیں گے۔ مگر اُف رے انقلاب، کس کو یقین آسکتا ہے کہ جو شخص بمبئی کے گورنر کا دست راست تھا آج وہ ہزایکسلنسی لارڈ ڈلہوزی کے دفتر کا صرف کلرک اور بوٹ صاف کرنیوالا

بن گیا ہے۔ ہائے ہائے!

ہالیڈے :۔ (غضبناک ہوکر)۔ سنئے جناب! میں آپ سے صاف صاف کہے دیتا ہوں کہ مجھے یہ مسخرہ پن پسند نہیں اور اگر آپ یہ سمجھتے ہوں کہ جھانسی کی رانی کو یہاں لاکر آپ نے آج جس چھچھورے پن کا اظہار کیا ہے اس پر آپ کے مسخرہ پن سے پردہ پڑ جائے گا تو آپ سخت غلطی پر ہیں۔ آنے دیجئے ہز اکسلنسی کو یہاں میں فوراً کہہ دوں گا کہ ایک عورت یہاں گورنمنٹ ہاؤس میں اس طرح لائی گئی ہے۔

لمحہ بھر سکوت۔ لو اپنے پاؤں سمیٹ لیتا ہے۔ اور ایک خاص شان کے ساتھ حقہ لئے ہوئے اُٹھتا ہے۔ اور ہالیڈے کے سامنے پوری طرح اکڑ کر کھڑا ہوتا ہے اور تیز و تند نگاہوں سے دیکھتا ہوا کہتا ہے۔

لو :۔ سنو ہالیڈے! آج تک کسی شخص نے جان لو پر چھچھورے پن یا بزدلی کا الزام نہیں لگایا کہ اسے اس کا مزا نہ چکھا دیا گیا ہو۔ یا تو تم اپنے الفاظ فوراً واپس لو ورنہ کونسل کے بعد تمھیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔

ڈورین :۔ کرنل صاحب! یہ آپکی تمام اکڑ فوں بیکار ہے، بات کرنا ہے تو آدمیت سے کیجئے، ہالیڈے یا اس کمرہ میں کوئی اور شخص آپ کی شجاعت اور دلیری پر حرف لانا نہیں چاہتا۔ لیکن آپ کی صحیح الدماغی پر واقعی ہم سب کو شک ہے۔

لو :۔ میری صحیح الدماغی کا امتحان تو بعد میں ہوتا رہیگا لیکن فی الحال معاملہ عزت و خود داری کا ہے اس لئے یا تو ہالیڈے صاحب اپنے الفاظ واپس لیں یا کونسل کے اجلاس کے بعد مقابلہ کے لئے تیار ہوں۔

ہالیڈے :۔ (جھنکر)۔ کرنل صاحب اگر آپ کو ایسا ہی خیال ہے تو میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔ آپ کا یہ خیال کر لینا کہ مجھے آپ کی شجاعت و بسالت میں شک ہے، یہ ظاہر کرتا ہے کہ آپ ابھی تک مجھ سے واقف نہیں۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ آپ میں دلیری کا مادہ کسیقدر کم ہوتا تو بہتر تھا۔ گورنر جنرل کے علم یا اجازت کے بغیر رانی صاحبہ کو یہاں لانے سے پیشتر آپ کو اس معاملہ پر کافی غور کر لینا لازم تھا اور اب آپ نے ہماری جان نہایت سخت جھگڑے میں پھنسا دی ہے۔ آپ کی حماقت کے باعث ہم سب مصیبت میں مبتلا ہوں گے۔

لو :۔ (کھڑے ہوئے اور ہالیڈے کی طرف دیکھتے ہوئے)۔ ہالیڈے! ہم دونوں تقریباً تیس برس سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ اس عرصہ میں کیا آپ ایک واقعہ بھی ایسا بیان کر سکتے ہیں جس میں جان لو ——— نے اپنے فعل کی ذمہ داری کسی دوسرے کے سر رکھی ہو۔

عین اس وقت میز کے پیچھے کا دروازہ کھولکر گورنر جنرل کا فوجی سکریٹری داخل ہوتا ہے اور دروازہ کو ایک ہاتھ سے کھلا رکھ کر اعلان کرتا ہے کہ :۔ حضرات! نگاہ روبرو! ہز اکسلنسی گورنر

جنرل ایوان کونسل میں تشریف لا رہے ہیں۔ سنتے ہی ڈورین، ہالیڈے اور گرانٹ مودب استادہ ہوجاتے ہیں۔ اور جب لارڈ ڈلہوزی کمرہ میں داخل ہوتے ہیں تو سب جھک کر بادب سلام کرتے ہیں۔ لاٹ صاحب میز کے اطراف میں ایک سرسری نگاہ ڈال کر اپنی بلند کرسی کے کے قریب پہونچکر پہلے سر جھکاتے ہیں بعد ازاں منھ اٹھا کر فرماتے ہیں:۔ "میں اگزکٹو کونسل کے افتتاح کا حکم دیتا ہوں۔" یہ کہکر وہ اپنی کرسی پر متمکن ہوتے ہیں اور ان کے ساتھ ہی دیگر ارکان کونسل بھی بیٹھتے ہیں۔ تو صاحب کے ہاتھ میں اب بھی حقہ موجود ہے اگرچہ کش بند ہیں اور سر جھکائے ہوئے کچھ سوچ رہے ہیں۔ گرانٹ کھڑے ہوکر بعض کاغذات لاٹ صاحب کے ملاحظہ سے گزارتا ہے۔

ڈلہوزی:۔ حضرات! آج ہمارے سامنے سب سے زیادہ اہم معاملہ جھانسی راج کا ہے۔ اگر آپ صاحبان پسند کریں تو سب سے پہلے اسی معاملہ پر غور کر لیا جائے۔

(گرانٹ کے سوائے سب ممبر بہت اچھا! کہہ کر منظور کرتے ہیں)

ڈلہوزی:۔ معلوم ہوا ہے کہ یہ جھانسی والا معاملہ گزشتہ دسمبر میں بھی کونسل کے سامنے پیش ہوا تھا۔ اور چونکہ میں اسوقت برہما گیا ہوا تھا اس لئے اسوقت اس معاملہ میں کوئی کارروائی نہیں کی گئی تھی۔

ڈورین:۔ یور اکسلنسی! بالکل درست ہے۔ چونکہ یہ معاملہ گورنر جنرل کی خاص ذمہ داری کا ہے اس لئے ہم نے یہ معاملہ یور اکسلنسی کی واپسی تک ملتوی کر دیا تھا اور ہدایات جاری کر دی تھیں کہ تبنیت کے معاملہ میں گورنمنٹ آف انڈیا کا ابھی کوئی فیصلہ نہیں ہوا ہے۔ (ڈلہوزی سنکر ڈورین کی طرف سر ہلاتا ہے)۔ مجھے یقین ہے کہ وہ احکام میجر مالکم کے پاس ارسال کر دئے گئے تھے اور ان کے مطابق عمل کیا گیا۔

(گرانٹ کی طرف متوجہ ہوکر) کیوں مسٹر گرانٹ یہی ہے نا؟)

گرانٹ:۔ ہاں حضور اس معاملہ میں ابھی اسیقدر ہوا ہے۔ اگرچہ مقامی افسران متبنیٰ ولیعہد کی تبنیت کے تسلیم کئے جانیکے موافق نظر آتے ہیں لیکن ہم نے ابھی اس بارہ میں کوئی آخری حکم نہیں دیا۔

ڈلہوزی:۔ (پہلے کاغذات اور پھر گرانٹ کی طرف دیکھکر)۔ اچھا تو مسٹر گرانٹ اس معاملہ کے متعلق تمام ضروری باتیں مختصراً بیان فرمایئے۔ مجھے امید ہے کہ آپ نے اس معاملہ کے متعلق تمام باتوں کا خلاصہ تیار کر لیا ہوگا۔

گرانٹ:۔ یقیناً مائی لارڈ! (ڈلہوزی سے کاغذات لیکر کھولتا ہے اور اس طرح بیان کرتا ہے) اس معاملہ کے متعلق تمام غور طلب اور ضروری امور یہ ہیں:۔ اول یہ کہ جھانسی راج ہمیشہ آزاد اور خود مختار رہا ہے۔ اور مرہٹوں کی حکومت کے زمانہ میں جو تعلقات جھانسی کے راجہ سے مرہٹوں کے تھے وہی اب ہمارے ہیں۔ چنانچہ اب اس بارہ میں کوئی سوال

باقی نہیں رہا کہ اگر متوفی راجہ کا کوئی براہ راست وارث نہ ہو تو اس کا فیصلہ کرنا کہ تخت و تاج کا آئندہ مالک کون ہوگا، طاقت بالادست کے اختیار میں ہے۔ مرہٹے اپنے اس اختیار پر ہمیشہ مُصر رہتے تھے، چنانچہ اب وہی حق و اختیار ان کے بجائے ہم کو حاصل ہے۔ اب اصلی سوال یہ نہیں ہے کہ ہم کو اختیار حاصل ہے یا نہیں بلکہ دیکھنا یہ ہے کہ اب تقاضائے مصلحت کیا ہے۔ اسی سلسلہ میں دوسرا نکتہ شروع ہوجاتا ہے۔ جو یہ ہے کہ اس سے قبل جھانسی کے تخت و تاج کی ملکیت پر دو مرتبہ جھگڑا ہوچکا ہے۔ اور دونوں مرتبہ جس راجہ کو ہم نے تسلیم کیا وہ کامیاب نہیں ہوا۔ آخری مرتبہ ہم نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ حوالہ کرنے سے پہلے جھانسی راج پر چند سال تک اپنی نگرانی رکھی جائے۔ لیکن بعد کے واقعات سے ہماری یہ تولیت والی پالیسی بھی ٹھیک نہ رہی اگرچہ اس وقت کا راجہ یعنی گنگا دھر راؤ اپنی رعایا میں بیشک ہر دلعزیز تھا۔ ان واقعات کا یاد رکھنا بھی ضروری ہے کہ جھانسی کی صوبہ داری کو جو بعد میں ریاست کے درجہ کو پہونچگئی ہم نے کیونکر تسلیم کیا۔ جھانسی راج سے ہمارا سب سے پہلا معاملہ اس وقت کے راجہ شیوراؤ بھاؤ کے اور ہمارے ذاتی تعلقات پر مبنی تھا۔ اور ان دونوں معاہدوں میں جو ہم نے شیوراؤ بھاؤ اور اس کے بیٹے رامچندر راؤ سے کئے ہیں انھیں ذاتی تعلقات پر زور دیا گیا ہے۔ اب موجودہ صورت حال یہ ہے کہ شیوراؤ بھاؤ اور رامچندر راؤ کی نسل کا براہ راست وارث تخت و تاج راجہ گنگا دھر راؤ کا انتقال ہوگیا ہے۔ اور اب ان راجاؤں کی نسل کا جن سے ذاتی تعلقات کی بنا پر پچاس سال سے جھانسی راج پر ہماری سیادت قائم ہے۔ کوئی براہ راست دعویدار نہیں رہا۔ اور یہ متبنیٰ لڑکا انند کمار جس کے لئے رانی لکشمی بائی نے بہت زور و شور کے ساتھ دعویٰ پیش کیا ہے، آنجہانی راجہ سے دور کے رشتہ کا تعلق رکھتا ہے۔

(گرانٹ مزید معلومات کے لئے اپنے کاغذات دیکھنے لگتا ہے۔ اور ڈورین جو موقعہ کی تاک میں تھا کہتا ہے)

ڈورین:— اس معاملہ کے متعلق جہاں تک مجھے یاد ہے وہ یہ ہے کہ جب کبھی اس ریاست کا نظم و نسق راجہ کے ہاتھ میں رہا آمدنی گھٹتی چلی گئی اور جس زمانہ میں ریاست کا انتظام ہمارے ہاتھوں میں آیا تو آمدنی بڑھ گئی اور ریاست کی مالی حالت ترقی کرگئی۔ کیوں ہے نا مسٹر گرانٹ؟

گرانٹ:— ہاں عام طور پر تو یہی کہا جاسکتا ہے۔

لو:— (جلدی دخل دیکر) لیکن آمدنی کی ترقی کس طرح ہوئی۔ اسی طرح نا کہ ریاست کے سر استمراری بندوبست منڈھ دیا گیا اور جو خانہ خراب کسان رقوم واجب الادا نہ داخل کرسکے انھیں جیل میں ٹھونس دیا گیا۔

ڈلہوزی:— آرڈر! آرڈر!! کرنل صاحب آرڈر!!! ازراہ مہربانی اپنے الفاظ وہیں تک محدود رکھئے جہاں تک مسئلہ زیر بحث کا تعلق ہے۔ (گرانٹ سے) آنجہانی راجہ کو عنان حکومت سپرد کرنے سے پہلے ہم نے ریاست کا

انتظام کتنے عرصہ تک کیا تھا؟

گرانٹ :۔ مائی لارڈ! تقریباً چھ سال تک۔ اور اس دوران میں ریاست کی آمدنی بہت کچھ بڑھ گئی تھی اور تمام نظم ونسق کی حالت بہت اچھی ہوگئی تھی۔

ڈلہوزی :۔ متوفی راجہ کے عہد کی ابتدا ہی میں ایسے کیا وجوہ پیش آئے کہ ریاست کا انتظام ہم نے اپنے ہاتھ میں رہنے دیا تھا؟

گرانٹ :۔ مائی لارڈ! راجہ گنگا دھر راؤ کے باقاعدہ راجہ تسلیم کئے جانے سے پیشتر ریاست کا انتظام ہمارے ہاتھوں میں تھا۔ کیونکہ سابق راجہ کی وفات کے بعد وراثت کا جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ ایسی حالت میں یہ قدرتی امر تھا کہ ہم اس بات کا اطمینان کرلیتے کہ ہونے والا راجہ ریاست کے قابل بھی ہے یا نہیں، خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ متوفی راجہ کے زمانہ میں ریاست کی حالت بہت خراب ہوگئی تھی۔ تفتیش وتحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ راجہ گنگا دھر راؤ ایک کمزور عقل و دماغ کا آدمی ہے، اس لئے فیصلہ کیا گیا کہ جب تک اس امر کا اطمینان نہ ہوجائے کہ حوالگی راج کے بعد ریاست کا انتظام خراب نہیں ہوگا، ریاست کا نظم ونسق اپنے ہی ہاتھ میں رکھا جائے۔ گر ۱۸۴۲ء میں ہم اس نتیجہ تک پہونچے کہ اگر ریاست کی حکومت راجہ کے ہاتھ میں دیدیجائے تو کوئی نقصان نہ ہوگا۔

لو :۔ (گرانٹ سے) اور غالباً یہ بھی تو صحیح ہے کہ گنگا دھر راؤ کو ریاست دینے سے پہلے ہم نے ریاست کا ایک وسیع اور زرخیز علاقہ اس بہانہ سے غصب کرلیا تھا کہ یہ علاقہ ان مصارف کا معاوضہ ہے جو ہم بندیلکھنڈ رجمنٹ پر کرتے ہیں؟

ہالیڈے :۔ بندیلکھنڈ کی فوج اسی غرض سے وجود میں لائی گئی تھی کہ جھانسی جیسی ریاستوں کا تحفظ کیا جائے۔

لو :۔ (اچک کر دوسروں کی طرف دیکھتا ہے)۔ بالکل صحیح! میں اس پر اعتراض نہیں کرتا کہ جو رجواڑے اس فوج سے فایدہ اُٹھاتے ہیں ان سے معاوضہ لینے کا ہم کو حق حاصل ہے۔ لیکن کیا تمام رجواڑے اور نواب یہ دریافت کر سکتے ہیں کہ جو خدمات جلیلہ اس فوج نے انجام دی ہیں ان کا بدل بصورت نقد کس نے مقرر کیا ہے؟ کیا متوفی راجہ جھانسی سے بھی، جس کی نسبت یہ کہا جاتا ہے کہ وہ ایک ضعیف عقل وفہم کا آدمی تھا تعین معاوضہ کے بارہ میں مشورہ لیا گیا تھا؟ علاوہ ازیں جو علاقہ فوجی خدمات کے عوض ہم کو حوالہ کیا جانے والا تھا کیا اسکا انتخاب خود راجہ گنگا دھر راؤ نے کیا تھا؟

ڈلہوزی :۔ آرڈر! آرڈر!! کرنل لو آرڈر!!! آپ کے پیشرو اور ان کے رفقاء کار جو کچھ کر گئے ہیں اس پر نکتہ چینی کرنے میں آپ اپنی حد سے تجاوز کر رہے ہیں۔ جو مسئلہ اس وقت ہمارے زیر غور ہے اُس سے ان باتوں کا کوئی تعلق نہیں۔ اور میں اس قسم کے سوال اُٹھانے کی ہرگز اجازت نہیں دوں گا۔

لو :۔ (جوش میں آکر کھڑا ہوجاتا ہے)۔ مائی لارڈ! میں التجا کرتا ہوں کہ میرے یہ الفاظ ضبط تحریر میں لائے جائیں

کہ بعض ہندوستانی والیان ریاست کے معاملہ میں اپنے پیشروؤں کے عمل پر کوئی اعتراض نہیں کرتا۔ لیکن یہ ممکن ہے کہ جس زمانہ کی نسبت یور ایکسلنسی نے گیا گزرا زمانہ ارشاد فرمایا ہے وہ پھر واپس آکر ہم کو پریشان کرنے لگے۔

ڈلہوزی:- (سختی سے) - کرنل صاحب! یہ آپ کس طرف اشارہ کر رہے ہیں؟

لو:- (آہستہ اور سنجیدگی سے) - مائی لارڈ! میرا مقصد یہ ہے کہ دیسی رجواڑوں کا جسقدر اعتماد ہم کو حاصل ہوگا، اُسیقدر مضبوطی سے ہم اپنے علاقہ پر قابض رہیں گے۔

(ڈلہوزی اپنی کرسی سے اُٹھ کر اِدھر اُدھر بیقراری کے ساتھ ٹہلنے لگتا ہے۔ اور تھوڑی دیر بعد دفعتہً کرنل لو کے پاس رک کر تیز الفاظ میں خطاب کرتا ہے)

ڈلہوزی:- کرنل لو میں آپ کے خیالات وجذبات کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ لیکن آپ کی زمانہ شناسی پر آپ کو مبارکباد نہیں دے سکتا۔ کیا آپ یہ نہیں دیکھتے کہ ہمارے ارادے خواہ کچھ ہوں لیکن اس ملک میں ہماری موجودگی سے نئی نئی قوتیں وجود میں آرہی ہیں؟ ہمارے اغراض ومقاصد خواہ کچھ ہوں لیکن ہم ملک میں نئے نئے معیار قائم کرنے پر مجبور ہیں۔ دولت مغلیہ کو محض اسی وجہ سے زوال ہوا کہ وہ اقتضاء زمانہ کو پورا نہ کرسکی۔ مغل فرمانرواؤں میں یہ قابلیت نہیں تھی کہ وہ دور جدید کے بدلے ہوئے رنگ ڈھنگ اور بڑھتی ہوئی ضروریات کو دیکھ کر ویسا ہی طریقہ خود بھی اختیار کریں۔ کرنل صاحب ہم اسی وقت کامیاب ہوسکتے ہیں جب ماضی کا خیال کم اور مستقبل کی فکر زیادہ کریں۔ (کرنل کی کرسی کے قریب آکر) یہ چھوٹی چھوٹی دیسی ریاستیں جن کے آپ اسقدر دلدادہ ہیں، یہ کیا ہیں؟ یہ سب بد انتظامی اور خود غرضی کے مرکز ہیں۔ (اپنی کرسی پر بیٹھ کر) زمانہ چلا چلا کر حسن نظام، باقاعدگی، اشتراک عمل، تعلیم، مستعدی اور عمدہ ذرائع نقل وحمل کا تقاضا کر رہا ہے، اور تا وقتیکہ ہم ایک ترقی پذیر حکومت کے یہ عناصر اس ملک میں پیدا نہ کردیں گے، ہماری حکومت بھی اس ملک میں اتنی ہی مختصر ہوگی جتنی کہ مغلوں کی ہوئی۔ میرا مطمح نظر ہمیشہ رعایا کی فلاح وبہبود رہے گا۔ خواہ اس میں مجھے کامیابی ہو یا شکست۔ (سامنے رکھے ہوئے کاغذات کی طرف دیکھ کر) اچھا اب کام کا سلسلہ جاری ہونا چاہئے۔

ڈورین:- یور ایکسلنسی، میں نے جہاں تک اس معاملہ پر غور کیا ہے۔ میرے نزدیک وہی طریقہ مناسب معلوم ہوتا ہے جو مجلس ڈائرکٹران نے ریاست ستارہ کے متعلق قائم کیا ہے اور جس پر ہم حال ہی میں ناگپور کے بھونسلا خاندان کے متعلق عمل کر چکے ہیں۔ ہمیں جھانسی راج کا الحاق کرلینا چاہئے۔ اور ایسا کرنے کا ہمیں کامل حق ہے۔ رانی کو ایک معقول پنشن دیدی جائے تاکہ وہ اس کے ذریعہ سے اپنی تمام جائز ضروریات اور خواہشات پوری کرسکے۔

ڈلہوزی :۔ آپ کا شکریہ مسٹر ڈورین! آپ کی رائے میری رائے سے بالکل متفق ہے۔ (پہلے ہالیڈے پھر لو کی طرف دیکھ کر) کیا کونسل کے دیگر ممبر صاحبان بھی اس معاملہ میں کچھ کہنا چاہتے ہیں ؟

ہالیڈے :۔ میں مسٹر ڈورین اور یور ایکسلنسی کی رائے سے قطعی متفق ہوں۔

(سب کے سب کرنل لو کی طرف دیکھتے ہیں جو کسی خیال میں محو ہے)

ڈلہوزی :۔ اچھا تو کرنل صاحب اگر آپ کچھ نہیں فرمائینگے تو میں یہ سمجھ لوں گا کہ آپ بھی ہم لوگوں سے متفق الرائے ہیں اس صورت میں مجھے صرف یہ کرنا ہے کہ اپنا یہ متفقہ فیصلہ ضبط تحریر میں لے آؤں کہ جھانسی راج کا الحاق کیا ہونا چاہئے۔ بعد ازاں میں اس کے متعلق پورے وجوہ قلمبند کر کے ڈائرکٹروں کی خدمت میں ایک سفارشنامہ ارسال کر دوں گا۔ اور بھیجے جانے سے قبل اس سفارشنامہ کا مسودہ مسٹر گرانٹ آپ لوگوں کے معائنہ کے لئے بھیجدیں گے۔

لو :۔ (ڈلہوزی کی طرف دیکھ کر) یور ایکسلنسی نے رعایا کی فلاح و بہبود کی نسبت جو کچھ فرمایا تھا میں اس وقت اسی پر غور کر رہا تھا۔ اور اسوقت میرے دل میں یہ خیال آیا کہ کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ الحاق جھانسی سے قبل ریاست کی رعایا سے استصواب کر لیا جائے کہ وہ ہمارے ماتحت رہنا زیادہ پسند کریں گے یا رانی اور اس کے متبنیٰ بیٹے کے ماتحت۔

ڈلہوزی :۔ (غضبناک ہو کر کرسی سے کھڑا ہو جاتا ہے) کرنل لو میں آپ سے آخری مرتبہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس قسم کی مداخلت سے باز آیئے، ورنہ مجھے اپنا یہ تکلیف دہ فرض ادا کرنا پڑے گا کہ میں آپ کی شکایت ڈائرکٹروں سے کر دوں۔

لو :۔ (آہستہ اٹھکر آداب بجالاتا ہے) اگر یور ایکسلنسی کا مقصد یہ ہے کہ کونسل کی ممبری سے میرا استعفا طلب کیا جائے گا تو میں یہ نہیں چاہتا کہ یور لارڈشپ اسقدر زحمت گوارا فرمائیں۔ یہ دیکھئے یہ میرے کاغذات تیار ہیں (کوٹ کے اندر سینہ کی جیب سے سربمہر لفافہ نکال کر ڈلہوزی کو دکھاتا ہے) اور میں یہ کاغذات ہز ایکسلنسی کے حوالہ کرنے کو تیار ہوں مگر ایک شرط سے۔

ڈلہوزی :۔ (حیران ہو کر کبھی لو کی طرف دیکھتا ہے کبھی دوسروں کی طرف) کرنل صاحب میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔

لو :۔ (اپنی کرسی سے ہٹ کر اور گرانٹ کے پیچھے آکر) یور ایکسلنسی کو معلوم ہونا چاہئے کہ میں نے اپنی عمر عزیز کے چالیس برس ہندوستان پر قربان کئے ہیں اور اگر وہ لوگ جن کے ہاتھوں میں اسوقت ہندوستان کی عنان حکومت ہے، یہ سمجھتے ہیں کہ اب میں بیکار اور دقیانوسی ہو گیا ہوں تو میں مردانہ وار ملازمت سے دستبردار ہونے پر

آمادہ ہوں۔ بہرحال اگر یور اکسلنسی چاہتے ہیں کہ اب میں چلا جاؤں تو میں یور لارڈشپ سے درخواست کرتا ہوں کہ مجھے اس طرح جانے کی اجازت دی جائے جو میری عزت کے شایان شان ہو۔ اور یہی وجہ ہے کہ میں شرط پیش کرتا ہوں۔

(لمحہ بھر سکوت طاری ہو جاتا ہے۔ سب لو کی طرف دیکھنے لگتے ہیں اور لو ڈلہوزی کے اشارہ کا منتظر ہے۔ ڈلہوزی ہٹکر ایک کھڑکی کے پاس پہونچکر باہر کی طرف جھانکنے لگتا ہے۔ لو اس کے پیچھے جاتا ہے۔ اور پہلے آہستہ پھر تیزی سے گفتگو کرتا ہے)

لو:- یور اکسلنسی! کل شام میرے پاس ایک نوجوان افسر آیا جس کے والدین میرے بڑے عزیز دوست تھے۔ یہ نوجوان پولیٹکل ڈیپارٹمنٹ میں ہے۔ میں نے ہی اس کو تربیت دی ہے۔ اور اس کے کاموں کو فخر کے ساتھ دیکھتا رہا ہوں۔ یہ نوجوان افسر میجر ایلیس ہے جو بندیلکھنڈ میں تعینات ہے اور معاملات جھانسی کا انچارج ہے وہ اپنی ملازمت کو خطرہ میں ڈالکر کلکتہ آیا ہے تاکہ مجھ سے سفارش کرے کہ جس طرح ممکن ہو جھانسی راج رانی اور متبنیٰ راجکمار کے حوالہ کر دیا جائے اور چونکہ رانی اور متبنیٰ لڑکا پہلے سے کلکتہ آئے ہیں اس لئے وہ انھیں کل رات مجھ سے ملانے لایا۔ اس نوجوان افسر کا خیال ہے کہ اگر ہم نے لڑکے کی تبنیت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور جھانسی راج کا الحاق کر لیا تو بہت سخت غلطی ہوگی۔ وہ اس بات کا پختہ ثبوت پیش کرتا ہے کہ شیورا ؤ بھاؤ کے زمانہ سے آج تک جھانسی کے تمام راجہ ہمارے وفادار رہے ہیں۔ علاوہ ازیں وہ قریب کی ایک ریاست اور چھا کی نظیر بھی پیش کرتا ہے جہاں کے متبنیٰ ولیعہد کو ہم نے چند سال ہوئے ایسے ہی حالات میں تسلیم کیا ہے جیسے کہ اسوقت جھانسی میں رونما ہوئے ہیں۔ میں یور اکسلنسی سے بیان نہیں کر سکتا کہ میجر ایلیس کی پرزور اپیل کا میرے دل پر کس قدر اثر ہوا ہے اور چلتے وقت جب وہ اپنی ڈیوٹی پر جانے لگا تو اس نے ایسے الفاظ کہے کہ اب تک کانوں میں گونج رہے ہیں۔ اس نے کہا کہ:- "اگر تبنیت کے معاملہ میں ہم نے وفادار راجاؤں کے حسیات مذہبی کو پامال کر کے ان کا اعتبار کھو دیا تو ایسا سخت طوفان برپا ہوگا کہ اس سے نجات مشکل ہوگی۔"

ڈلہوزی:- (کسی قدر متوجہ ہو کر گو پشت پھیرے ہوئے) آپ کی خاص درخواست کیا ہے۔ کرنل صاحب!

لو:- (اور قریب بڑھ کر) یور اکسلنسی! میں یہ چاہتا ہوں کہ تبنیت کے معاملہ میں حضور کا فیصلہ جو کچھ ہو لیکن کم از کم ایک مرتبہ رانی سے مل لیجئے، تاکہ اس کو کم از کم یہ اطمینان تو ہو جائے کہ جو مصیبت اس پر نازل ہونے والی ہے اس کے رفع کرنے میں وہ ہر ممکن کوشش کر چکی۔ ہمیں رانی کو اس بات کا بھی موقعہ دینا چاہئے کہ وہ ہندوستان کے سب سے بڑے حاکم کی زبان سے یہ سن لے کہ جو فیصلہ ہم نے جھانسی راج کے بارہ میں کیا ہے وہ رموز مملکت پر مبنی ہے خواہ وہ رانی کے خلاف ہی ہو۔ علاوہ ازیں وہ یہ بھی جان لیگی کہ ہم معمولی چور اور ڈاکو نہیں ہیں جیسا کہ ہمارے کاموں کی وجہ سے

بعض لوگ ہم کو سمجھتے ہیں۔

ڈلہوزی:۔ (گھوم کر) اچھا، میں رانی سے ملاقات کروں گا۔ اس لئے نہیں کہ میں اس کی باتوں سے متاثر ہوں، بلکہ اس لئے کہ اس ناگوار معاملہ کی تہ میں جو ہمارے اغراض و مقاصد ہیں وہ اسے سمجھا دئے جائیں۔ (میز کی طرف چلکر) مسٹر گرانٹ! آپ فوجی سکریٹری کو حکم دیدیجئے کہ وہ بہت جلد انتظام کرکے جھانسی کی رانی کو ملاقات کے لئے مدعو کریں آج کی کونسل کا کام ملاقات تک ملتوی رہیگا۔ تاکہ جو کچھ گفتگو رانی سے ہو وہ کونسل میں بیان کردوں۔ اچھا تو ہم الحاق کے بارہ میں متفق ہیں نا؟

(ڈورین اور ہالیڈے سر کے اشارہ سے "ہاں" کرتے ہیں۔ لیکن کرنل لو آگے بڑھکر ڈلہوزی کے پاس آتا ہے)

لو:۔ یور ایکسلنسی! جھانسی کی رانی یہیں برابر کے ایک کمرہ میں موجود ہے۔ اگر زحمت نہ ہو تو ابھی ملاقات فرمالیجئے۔

ڈلہوزی:۔ (کاغذات سے آنکھ اُٹھاکر) کیا یہیں کسی کمرہ میں انتظار کررہی ہے؟

(سکوت طاری ہوتا ہے۔ پہلے گرانٹ، پھر ڈورین اور پھر کرنل لو کی طرف دیکھتا ہے جو اپنا سر جھکالیتا ہے)

ڈلہوزی:۔ (کرسی سے اُٹھکر غصہ میں لو کی طرف آکر) کرنل لو! اگر اس بیہودگی اور توہین کے ذمہ دار آپ ہیں تو میں آپ کا سر توڑنے میں ہرگز رحم وکرم سے کام نہیں لوں گا۔

لو:۔ (سربمہر لفافہ جیب سے نکال کر ڈلہوزی کو دیکر)۔ لاٹ صاحب! میرا سر پہلے ہی ٹوٹ چکا ہے۔ نہ صرف سر بلکہ اس کے ساتھ دل بھی!

(ڈلہوزی ہاتھ بڑھاکر لفافہ جھٹک لیتا ہے۔ اور کھڑکی کے پاس جاکر غصہ کو ضبط کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی اثنا میں ڈورین اور ہالیڈے اُٹھکر لو کے پاس جاتے ہیں۔ ڈورین محبت سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیتا ہے اور ہالیڈے گلے میں باہیں ڈال دیتا ہے۔
تھوڑی دیر بعد ڈلہوزی گھوم کر میز کی طرف آتا ہے اور لفافہ کو چاک کرتا ہے)

ڈلہوزی:۔ (گرانٹ سے) مسٹر گرانٹ! اجلاس ملتوی۔ رانی کو طلب کرو۔

(ڈلہوزی کے الفاظ سنکر کرنل لو ہالیڈے کے شانہ پر گردن جھکا دیتا ہے)

پردہ گرتا ہے

ایکٹ دوسرا۔ منظر دوسرا

(پانچ منٹ بعد وہی کمرہ وہی سین۔ لارڈ ڈلہوزی، جھانسی کی رانی، کمار اندر راؤ اور مسٹر گرانٹ موجود ہیں۔ ڈلہوزی کے دونوں ہاتھ اندر راؤ کے شانوں پر رکھے ہیں۔ اور وہ شفقت آمیز نگاہوں سے لڑکے کو دیکھ رہا ہے۔ رانی مسٹر گرانٹ کی کرسی پر بیٹھی ہے۔ چہرہ پر ہلکے آب دال کا لمبا نقاب ہے۔ رانی اگرچہ ہنوز لباس بیوگی پہنے ہوئے ہے لیکن اوپر سیاہ زر دوز شال اور پاؤں میں دلی کی کامدار جوتی پہنے ہے۔ اندر راؤ ہندو شہزادوں جیسا لباس پہنے ہے اور اسکے پہلو میں ایک چھوٹی سی تلوار لٹکتی ہے۔ گرانٹ کاغذات دیکھ رہا ہے)

ڈلہوزی:۔ (شفقت آمیز لہجہ میں اندر راؤ سے) اچھا تو تم شمشیر زنی اور شہسواری سیکھ رہے ہو؟

(اندر راؤ سر ہلا کر ہاں کرتا ہے)

ڈلہوزی:۔ (مسکرا کر) اچھا دکھاؤ تم تلوار کیونکر چلاتے ہو۔

(اندر راؤ پیچھے ہٹکر تلوار کھینچتا ہے اور چند ہاتھ دکھاتا ہے)

ڈلہوزی:۔ (مسکراتے ہوئے) خوب! خوب!! اچھا اب دکھیں تم نے لکھنے پڑھنے میں کہاں تک ترقی کی ہے۔

(اندر راؤ اپنی تلوار نیام میں ڈال لیتا ہے۔ اور خاموش ہو کر رانی کی طرف دیکھتا ہے)

رانی:۔ مائی لارڈ! یہ بعد میں ہوتا رہیگا۔ جس شخص کو راجہ بننے کی توقع ہو اسے چاہئے کہ پہلے وہ کام سیکھے جو راجاؤں کا خاص شغل ہے۔ لکھنے پڑھنے کے کام کے لئے تو وہ منشی بھی نوکر رکھ سکتا ہے۔ لیکن جب تک وہ فن جنگ سے واقف نہ ہوگا۔ وہ اپنے تخت و تاج کی کیونکر حفاظت کر سکیگا۔

ڈلہوزی:۔ رانی صاحبہ! آپ کو معلوم نہیں میرے بزرگوں کا بھی یہی عقیدہ تھا۔ اور ابھی کوئی سو برس کی ہی بات ہے کہ میرا خاندان ایک چھوٹی سی ریاست کے، حکمراں تھے، اور ہندوستان کے راجاؤں کی طرح، سوائے اپنے بادشاہ یعنی شاہ اسکاٹلینڈ اور کسی کے سامنے سر نہ جھکاتے تھے، اور وہ انگریزوں کے ساتھ لڑا کرتے تھے۔

(رانی حیران ہو جاتی ہے)

رانی:۔ تو کیا آپ انگریز نہیں ہیں؟

ڈلہوزی:۔ نہیں رانی صاحبہ! میں انگریزوں کے بادشاہ کا ملازم ہوں جو اتفاق سے میرے وطن اسکاٹلینڈ کا بھی بادشاہ ہے۔ جس طرح آپ کے مرہٹہ بزرگ کہ ہر چند وہ رنگ مغلوں جیسا رکھتے تھے اور ان کو بعض اوقات اپنا بادشاہ

تسلیم بھی کرتے تھے، اگرچہ وہ مسلمان نہیں تھے، اسی طرح اگرچہ میرا رنگ انگریزوں جیسا ہے اور میں انگریزی جھنڈے کو سلام بھی کرتا ہوں، لیکن میں نسل کے لحاظ سے انگریز نہیں ہوں۔

رانی :۔ (گرانٹ کی طرف دیکھ کر آہستہ سے) - اور یہ صاحب! کیا یہ انگریز ہیں؟

ڈلہوزی :۔ نہیں وہ بھی میری طرح اسکاٹ ہیں۔ بات یہ ہے کہ جب ہم لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ انگریزوں کے بادشاہ کے ساتھ لڑنے سے یہ زیادہ بہتر ہوگا کہ ہم اس کا کام کریں، تو ہم لوگوں نے انگریزی جھنڈے کے نیچے ملازمت اختیار کرلی۔ تاکہ زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائیں۔ اور اب اسکاٹلینڈ والے ہر جگہ جہاں جہاں انگریزی راج ہے بڑے بڑے ذمہ دار عہدوں پر مامور ہیں، فوج میں وہ ہیں، مال میں وہ ہیں، سول میں وہ ہیں، الغرض وکیل بھی ہیں، ڈاکٹر بھی ہیں، پادری بھی ہیں اور تاجر بھی۔

رانی :۔ (گھبرا کر)۔ کیا کرنل تو صاحب بھی اسی نسل کے ہیں جس کے آپ اور یہ صاحب ہیں؟

ڈلہوزی :۔ نہیں نہیں رانی صاحبہ! جہاں تک میرا خیال ہے کرنل تو کے آبا و اجداد انگلستان میں ایک اور ملک سے آئے تھے جو ہے تو انگلستان کے قریب ہی مگر اس سے اور میرے ملک سے بالکل مختلف ہے اس کے ملک کا نام آئرلینڈ ہے۔ اور وہاں کے باشندے ابھی تک انگریزوں کے دوست نہیں ہیں۔ اگرچہ ان میں سے بہت سے انگریز بادشاہ کے اسی طرح ملازم ہیں، جیسے کہ ہم یعنے اسکاٹلینڈ والے۔

رانی :۔ (مضطرب ہو کر کھڑی ہو جاتی ہے) - تو مائی لارڈ! آپ اور تو صاحب بھی گویا ویسے ہی ہیں جیسے راجہ جے سنگھ اور دیگر ہندو راجہ تھے، جو مغل بادشاہوں کے ملازم ہو کر اپنے بھائی ہندو راجاؤں سے لڑتے تھے۔

ڈلہوزی :۔ (آہستہ سے اٹھ کر کھڑکی کے پاس جاتا ہے اور چوکھٹے کے سہارے سے لگ کر کہتا ہے)۔ رانی صاحبہ! اگر آپ اطمینان سے سننا چاہتی ہیں تو میں اپنے خاندان کے تاریخی واقعات سے آپ کو ایک قصہ سناتا ہوں (رانی کو بیٹھ جانے کا اشارہ کرتا ہے) - رانی صاحبہ! جیسا کہ میں آپ سے عرض کر چکا ہوں میرے آبا و اجداد انگریزوں کے خلاف لڑ کر اپنی طاقتیں صرف کیا کرتے تھے۔ ہمارے خاندان کی جائداد اس دشوار گزار اور ناہموار علاقہ میں واقع ہے جو انگلستان اور اسکاٹلینڈ کے درمیان حد فاصل ہے۔ ایک مرتبہ ایک زبردست انگریزی فوج نے اسکاٹلینڈ پر حملہ کیا اسوقت میرے بزرگوں میں سے ایک جو انگریزوں سے بھاگ کر مع اپنے آدمیوں کے غاروں میں جا چھپے تھے، ایسی حالت میں جبکہ انگریز تیار نہ تھے تلواریں سونت کر ان پر آپڑے اور ایک مشہور قلعہ فتح کرلیا۔ اسکاٹلینڈ کے بادشاہ نے خوش ہو کر انھیں مفتوحہ قلعہ کا قلعدار بنا دیا اور گرد و نواح کا علاقہ بھی انھیں کے ماتحت کر دیا۔ بدقسمتی سے اسی قلعہ کو اسکاٹلینڈ کا ایک اور خاندان ہمیشہ للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا کرتا تھا۔ جب اس قلعہ کا حاکم میرے بزرگ کو

بنا دیا گیا تو یہ طاقتور قبیلہ بہت ناراض ہوا۔ اور زیادہ عرصہ نہ گزرنے پایا تھا کہ ان لوگوں نے اجتماع کر کے قلعہ کو گھیر لیا۔ اور کچھ دنوں کے محاصرہ کے بعد فتح کر کے قلعدار کو قید کر لیا۔ وہ بیچارے فاقوں کے مارے قید ہی میں مر گئے۔ (رانی کی طرف بڑھ کر) رانی صاحب! اس قصہ کا ماحصل یہ ہے کہ انسان کو دوست سے بھی اتنا ہی نقصان پہونچ سکتا ہے جتنا کہ دشمنوں سے۔ اور جن لوگوں کا پیشہ ہی لڑنا ہوتا ہے ان کے نزدیک دشمن و دوست سب برابر ہیں۔ انھیں لڑنے سے غرض ہوتی ہے

(یہ کہکر کرسی کی ٹیک لگا لیتا ہے)

رانی :۔ (اچک کر بیٹھ جاتی ہے)۔ لارڈ ڈلہوزی! اگر آپ اپنی عزیز چیزوں کو محفوظ رکھنا چاہتے ہیں تو آپ کو لڑنا پڑیگا کیا آپ کے بزرگوں نے اپنی زمین واپس لینے کے لئے جنگ نہیں کی تھی؟

ڈلہوزی :۔ (مسکراتے ہوئے)۔ ہاں رانی صاحبہ! انھوں نے ضرور جنگ کی تھی، مگر بعد میں انھوں نے مع دیگر امرا و فرمانروایان اسکاٹلینڈ کے اپنی آزادی کھودی اور محض برائے نام زمیندار رہ گئے۔ یعنی دوسروں کی طرح بادشاہ کی رعایا بن گئے۔ اور سوائے اس کے کہ اپنی ذاتی قابلیتوں اور خاندانی روایتوں پر فخر کریں ان کے لئے اور کوئی شرف نہیں رہا۔

رانی :۔ (ڈلہوزی کے قریب جا کر)۔ مائی لارڈ! آپ یہ نہ سمجھیں کہ جھانسی کے فرمانروا محض زمیندار ہو کر رہ جائینگے ہمارا شرف اور ہماری خودداری اس کی ہرگز اجازت نہ دے گی۔

ڈلہوزی :۔ (سیدھے ہو کر اور شاندار لہجہ میں)۔ رانی صاحب! میں آپ کی اس دلیری کی داد دیتا ہوں کہ آپ آج مجھ سے ملنے تنہا تشریف لائیں اور جو کچھ باتیں کیں وہ صاف گوئی سے کیں۔ لیکن میں یہ ماننے کے لئے ہرگز تیار نہیں کہ ایک ڈلہوزی کی عزت اور خودداری کسی طرح سے جھانسی کے راجہ سے کم ہے۔ میرے بزرگ صرف چند سو ایکڑ پر حکومت کرتے تھے اور وہ بجا طور پر اپنی آزادی و خود مختاری پر فخر کرتے تھے۔ اور میں ان کی اولاد ملک ہند پر حکومت کرتا ہوں جو انگلستان اور اسکاٹلینڈ دونوں کو ملا کر بارہ گنا وسیع ہے ——— اور اس لئے زیادہ فخر و شرف رکھتا ہوں۔ بایں ہمہ میں اس میں زیادہ عزت سمجھتا ہوں کہ اپنے بادشاہ کی خدمت کروں اور اسکی وفادار رعیت رہوں۔

رانی :۔ (اپنی جگہ پر سر بہوڑا کر بیٹھ جاتی ہے اور مایوسانہ لہجہ میں کہتی ہے)۔ مائی لارڈ! جو کچھ آپ فرماتے ہیں یہ ممکن ہے کہ گوری قوموں کے لئے صحیح ہو لیکن جھانسی میں انند کمار کو اس سے کوئی فائدہ نہیں پہونچتا۔ اگر ریاست کا الحاق کر لیا گیا تو اس غریب کا کیا حشر ہوگا۔ وہ فرمانروایان جھانسی کی شان کو کیونکر قائم رکھیگا۔ اور وہ رسمیں کیونکر ادا کریگا جو ہمارے رواج کے موافق ایک فرزند رشید کے لئے لازم ہیں؟

ڈلہوزی :۔ (بیٹھ کر انند کمار سے)۔ یہاں آیئے کمار صاحب!

(انند کمار، جو ڈلہوزی اور رانی کی گفتگو کے دوران میں رانی کے قدموں میں فرش پر بیٹھا تھا

اٹھ کر گورنر جنرل کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے ڈلہوزی لڑکے کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر اس کے چہرہ کو تکتا ہے - بعد ازاں ہاتھ ہٹا کر رانی کی طرف دیکھتا ہے - انند راؤ ہٹکر ڈلہوزی کے قریب فرش پر بیٹھ جاتا ہے اور اُس کے چہرہ کو دیکھتا ہے۔

ڈلہوزی :۔ رانی صاحبہ! ممکن ہے جو کچھ میں کہوں گا وہ سنکر آپ حیران ہوں - مگر کاش آپ میری جگہ ہوتیں اور میں آپ کی جگہ یعنی آپ گورنر جنرل ہوتیں اور میں بیوہ رانی، میں جانتا ہوں کہ آپ نے حال ہی میں بڑے بڑے صدمات اُٹھائے ہیں - اور آپ کے شوہر گنگا دھر راؤ آنجہانی کی وفات نے آپ کو سخت صدمہ پہونچایا ہے - لیکن معاف فرمائیگا آپ کے آلام و مصائب نے سامنے آکر حملہ کیا ہے اور آپ ایک طرح سے اس کے لئے تیار تھیں - مگر رانی صاحبہ! میرے آلام و مصائب نے مجھ پر پشت سے حملہ کیا ہے اور ابھی نہ معلوم کیا کیا مصیبتیں مجھ پر پڑنے والی ہیں - ابھی سال بھر نہیں ہوا کہ میری بیوی اس ملک کی سخت آب و ہوا کی تاب نہ لاکر مجھ سے جدا ہوئی اور اپنے وطن کو چلی گئی - اس نے چھ مہینے تک سخت تکلیفیں اُٹھائیں مگر اُف تک نہ کی اور افسوس ہے کہ گھر کے قریب پہونچتے ہی اس کا انتقال ہوگیا - میری دو بیٹیاں جنھیں میں نے کئی سال سے نہیں دیکھا ہے ماں کی بچیاں ہوگئیں - وہ لڑکا بھی جس کے پیدا ہونے کی میں دعائیں مانگا کرتا تھا - میرے دل کو تسکین دیکر میرے دل سے یہ غم کا پہاڑ نہیں ہٹا سکتا - میری صحت تباہ ہوگئی ہے - اور گویا ہر وہ چیز جس کی وجہ سے میں جان کو جان سمجھتا تھا میرے لئے فنا ہوگئی ہے - اب رانی صاحبہ! میں ایک رنجور و مجبور آدمی رہگیا ہوں۔

(ڈلہوزی جسمانی اور دماغی خستگی کے باعث رک جاتا ہے - وہ پھر سنبھلتا ہے اور اچک کر رانی کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے - جو خود بھی کھڑی ہو کر اس کی صورت کو تک رہی ہے - ڈلہوزی چند قدم بڑھا کر رانی کے قریب آتا ہے اور جلدی جلدی کہتا ہے)

ڈلہوزی :۔ (عمیق اندرونی جذبات سے متاثر ہو کر) - رانی صاحبہ! میں جانتا ہوں کہ آپ مجھ سے کیا چاہتی ہیں - مگر وہ محال ہے - اگر آپ کی جگہ کوئی میرا بھائی بھی ایسی درخواست کرے گا تو میں فوراً انکار کر دوں گا - اس لئے رانی صاحبہ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ جو حشر ستارہ اور ناگپور کا ہوا ہے وہی حشر جھانسی کا ہوگا - یہ ایک اُصولی مسئلہ ہے جس میں کوئی مستثنیٰ نہیں ہو سکتا - ہمیں آیندہ کی فکر کرنی چاہئے اور کمزور کو طاقتور کے لئے جگہ چھوڑ دینی چاہئے۔

(رانی یہ سنکر انند راؤ کو لپٹ جاتی ہے اور رونے لگتی ہے)

ڈلہوزی :۔ لیکن رانی صاحبہ! اس سے آپ رنجیدہ نہ ہوں - میں آپ کو اطمینان دلاتا ہوں کہ آپ کے لئے ہر بات کا انتظام ایسا کر دیا جائے گا کہ یہ تغیر ناگوار نہ گزرے گا - اپنی ضروریات کی کفالت اور کمار صاحب کی شایان شان پرورش کے لئے آپ کو معقول پنشن دی جائے گی - وہ متوفی راجہ کی تمام پرائیویٹ ملکیت کے مالک رہیں گے اور رہم شاہی محل اور

عورت کی منطق

جب وہ جنگ کے لئے آمادہ ہوجائے

لیڈی ڈراموند انگلستان کی مشہور صحافت داں خاتون ہیں اور ٹھیک اسوقت جبکہ ساری دنیا امن سکون کے لئے بیتاب ہے، وہ جنگ ہی کو انسانیت کے لئے مفید بتاتی ہیں اور اس میں شک نہیں کہ ان کی اس منطق کے سامنے مشکل ہی سے کسی کو یارائے گفتگو ہوسکتا ہے۔ وہ لکھتی ہیں کہ:-

انسانیت کے لئے جنگ امن وسکون سے زیادہ حریت نواز ہے کبھی ایسا نہیں ہوا کہ جنگ نے کسی قوم کی روح کو فنا کیا ہو یا اس کے اخلاق کو تباہ کرکے برباد کردیا ہو بلکہ یہ برکت صرف عشرت وتنعم کی ہے جو جمود وتعطل پیدا کرکے قوموں کو ہلاک کردیتی ہے، روما کی ہلاکت کا سبب جنگ نہیں بلکہ علیش وتنعم تھا جو افراد قوم کی رگ رگ میں سرایت کرگیا تھا اور جس نے آخرکار اُسے ایک بے حس وبیکار قوم بناکر چھوڑ دیا، آج تک انسانیت نے جو ترقی حاصل کی ہے خواہ وہ ترقی مادی ہو یا اخلاقی مرہون ہے صرف جنگ کی، جنگ نوع انسانی کے جسم پر ایک عمل جراحی ہے جس کے بعد اس میں زیادہ قوت حیات پیدا ہوجاتی ہے، چنانچہ تاریخ اٹھاکر دیکھو کہ ایک قوم کا حال جنگ سے پہلے کیا تھا اور جنگ کے بعد اس کے قوائے عمل میں کتنا تغیر پیدا ہوگیا۔ روحانی ترقی کا بھی یہی حال ہے کہ جب تک خواہشات سے جنگ نہ کیجائے، حاصل نہیں ہوسکتی۔

سرہاری مالٹ اور میجر ہاروی کا قول ہے کہ:- "جنگ اشکال ریاضی کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے" چنانچہ گزشتہ جنگ عظیم کو دیکھئے کہ اس کی حقیقت کیا تھی۔ وہ صرف علم کی لڑائی تھی، ریاضی کی جنگ تھی اور آخرکار وہی کامیاب ہوا جو زیادہ ریاضی داں اور زیادہ صاحب علم ثابت ہوا۔ گزشتہ زمانہ میں بھی جنگ ریاضی کے کھیل کی حیثیت رکھتی تھی۔ بلوتارخ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ارشیداموس نے جب سب سے پہلے تیر کو دیکھا جو صقلیہ سے لایا گیا تھا تو یکایک اس کے منہ سے یہ چیخ نکل گئی کہ "یا خدا! کیا اب سچی شجاعت ہمیشہ کے لئے، رخصت ہوجائیگی اس زمانہ کی جنگیں بھی وہی ریاضی کا کھیل ہیں لیکن زیادہ دقیق، زیادہ عسیر الفہم اور جس طرح ارشیداموس

نے سب سے پہلا تیر دیکھ کر حیرت کی تھی، اسی طرح اب بھی بعض غیر ریاضی داں دماغ ان کو شجاعت کے منافی سمجھتے ہیں۔ جنگ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ زمانۂ قدیم سے لیکر آج تک تاریخ کی بنیاد ہمیشہ اسی پر قائم ہوئی ہے وہ ایک نغمہ ہے جسے ہر زمانہ میں ہر جگہ انسان گاتا ہے۔ وہ لوگ جو دنیا سے جنگ کو مٹا دینا چاہتے ہیں وہ گویا یہ چاہتے ہیں کہ دنیا صدیوں پیچھے ہٹ جائے کیونکہ دنیا اب اس کے لئے طیار نہیں ہے کہ مسیح دوبارہ تشریف لاکر اس کو امن و سکون کا وعظ دیں۔ کیا دُنیا میں بغیر تکلیف و مصیبت برداشت کئے ہوئے کوئی نعمت حاصل ہو سکتی ہے۔ تمام اہل مذاہب کا اعتقاد ہے کہ جب تک تکالیف جسمانی برداشت نہ کی جائیں روحانی و اخلاقی ترقی حاصل نہیں ہو سکتی۔ پھر ہم کیونکر توقع رکھ سکتے ہیں کہ مجتمع انسانی جمود و بے حسی کے عالم میں مسرت و سعادت سے ہمکنار ہو سکتا ہے اور بغیر کسی ایسی چیز کے جو اسے آگے بڑھنے پر اُبھارے وہ ترقی کے زینہ پر قدم رکھ سکتا ہے۔ پھر یہ اُبھارنے والی چیز کیا ہے؟ جنگ اور صرف جنگ۔ یونانیوں کا خیال تھا کہ سلطنت فارس ناقابل تسخیر ہے لیکن جب ۴۹۰ قبل مسیح میں انھوں نے فارس سے جنگ کی تو معلوم ہوا کہ یہ خیال غلط تھا اور آخر کار اسی کامیابی نے یونان کو علوم و فنون کا مخزن اور موجودہ تہذیب یوروپ کا گہوارہ بنا دیا۔ پھر جب تک یہ جنگجویانہ عہد اسپارٹا قائم رہا، یونان کی برتری بھی قائم رہی اور جب وہ عیش و راحت میں پڑ گیا تو فنا ہو گیا۔

اب خود اہلِ برطانیہ کی ترقی کی تاریخ پر نظر ڈالئے کہ اس کی ابتدا کب ہوئی۔ پھر کیا اس سے انکار ممکن ہے کہ اگر ۵۵ھ (ق-م) اہلِ روما اُن سے جنگ نہ کرتے تو وہ بدستور وحشی بنے رہتے۔ اس سے قبل یہ بالکل جاہل و غیر مہذب تھے، انھیں تمدن کی ہوا تک نہ لگی تھی مگر جب اہل روما داخل ہوئے تو انھوں نے انھیں مہذب بنایا اور موجودہ تمدن سے روشناس کیا۔ انھوں نے انواع و اقسام کے درخت لگائے، جھاڑیوں وغیرہ کو کاٹ کر زمین کو کاشت کے قابل بنایا۔ ایسے مقامات کا پتہ چلایا جہاں معدنیات پائی جاتی ہیں چنانچہ ڈین کے جنگل سے لوہا نکلا، کورنوال کی معدن سے ٹین دستیاب ہوا، مونٹگومری سے تانبہ اور سیسہ برآمد ہوا۔ اور شروشیر سے کوئلہ۔ علاوہ اس کے پچاس قلعہ بند شہر طیار کئے جن میں سے ایک لندن بھی تھا۔

اس کے بعد جب ۱۰۶۶ء میں نارمنڈیوں نے جنگ کی تو ترقی و آزادی کی طرف دوسرا قدم اُٹھایا اور میگنا چارٹا حاصل کیا جو دستور آزادی کی پہلی بنیاد تھا۔ پھر جب داخلی جنگوں کا سلسلہ شروع ہوا تو اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۴۸۵ء میں ہنری سابع (تھیوڈور خاندان کا پہلا فرمانروا) تخت نشین ہوا اور اس طرح گویا سب سے پہلے دیمقراطی حکومت کی بنیاد پڑی اور بحری قوت کی تعمیر شروع ہوئی۔ اس کے بعد فرانس کے لوئیس چہاردہم اور انگلستان کے فرمانروا ولیم ثالث سے جنگ ہوئی جس میں فرانس کے خلاف ہالینڈ اور اسپین بھی

انگلستان کے شریک تھے۔ اور اس کا نتیجہ بھی اہلِ تاریخ سے مخفی نہیں کہ اگر لوئیس کے خلاف یہ جنگ نہ کیجاتی تو پروٹسٹنٹ مذہب فنا ہو جاتا اور تمام مغربی یوروپ پر فرانسیسی استبداد کی حکومت قائم ہو جاتی۔

اسی کے ساتھ اس جنگ کو دیکھئے جو فرانس اور پروشیا کے درمیان ستر سال تک جاری رہی کہ جدید جرمن حکومت کی بنیاد اسی کی وجہ سے پڑی اور پاپائے روم کو جو دینوی اقتدار حاصل تھا وہ بھی اسی سلسلۂ جنگ کی وجہ سے محو ہوا۔

اب جاپان کی جنگوں کو دیکھئے جو اس نے چین اور روس سے کیں کہ اگر چین کو ہزیمت نہ ہوتی تو وہ قیامت تک خوابِ عظمت سے نہ چونکتا اور اگر روس کو شکست نہ ہوتی تو استبداد قیصری شاید اب بھی وہاں قائم رہتا۔

اب رہی گزشتہ جنگ عظیم، سو اس کے فوائد سے کس کو انکار ہو سکتا ہے۔ ہوائی جہازوں کی تعمیر میں غیر معمولی ترقی، جدید آلاتِ حرب کے سلسلہ میں میکانکی اکتشافات، مدافعت کے عجیب و غریب علمی ذرائع افواج کی جدید تنظیم، بحری جہازوں کی تعمیر میں غیر معمولی جدتیں، طرح طرح کی گیسوں کی ایجاد، قلعہ بندی و تحفظ کی نئی نئی تدبیریں، الغرض ریاضی، سائنس اور کیمیا کا کونسا چھپا ہوا راز ایسا تھا جو اس جنگ کی بدولت ظاہر نہیں ہوا اور ان اکتشافات کے بدولت وہ کونسا شعبۂ تمدن ہے جو متاثر نہ ہوا ہو۔

نجوم کے بعض تاریخی و علمی مباحث

اور

قصاید خاقانی میں منجمانہ اشارات

ایک مدت سے کلیات خاقانی کا ایک قلمی نسخہ میرے پاس محفوظ ہے اس میں خاقانی کے قصاید مراثی مندرج ہیں یعنی کلیات کا یہ پہلا حصہ ہے اہل نظر جانتے ہیں کہ خاقانی نے اپنا سارا سرمایۂ خیال اور زور قلم قصاید پر صرف کیا ہے اس میں شک نہیں اس کے یہاں عرفی کی طرح شاعرانہ حلاوت و شگفتگی نہیں پائی جاتی اسی لئے اس کے قصاید عوام میں قصاید عرفی کی طرح مشہور و دلپسند نہیں خاقانی کی دقت پسندیوں نے اسکو تغزل کے میدان میں تو بالکل مجہول بنا دیا یہاں تک کہ اس کی غزلیات کا اتنا بڑا مجموعہ اپنی بے تکی کے باعث ایک دفتر بے معنی سمجھا جاتا ہے، رہگیا مجموعہ قصاید تو اس میں بھی عوام کے لئے سامان تفریح نہیں ہاں جو لوگ ادب عالیہ اور انشائے لطیف پر نقادانہ نظر رکھتے ہیں وہ اچھی طرح عرفی اور خاقانی کے قصاید کا فرق و امتیاز سمجھ سکتے ہیں عرفی کی نزاکت تخئیل، معنی آفرینی اور روانی بیان مسلم ہے، خاقانی کے یہاں بھی یہ سب کچھ ہے لیکن تلمیحات نے اس کے کلام کو ادق بنا دیا وہ جس آزادی کے ساتھ قرآن و حدیث، تفسیر و فقہ، تاریخ و سیر، ریاضی و حکمت، فلسفہ و تصوف، نجوم و ہیئت کے مسائل کی طرف اپنے قصاید میں اشارے کرتا ہے وہ اسقدر بلند سطح کی چیزیں ہیں کہ فکر عام کی وہاں تک رسائی نہیں اگر مجھ سے سوال کیا جائے کہ فارسی شعرا میں ملٹن کا کوئی مقابل ہے تو میں فوراً خاقانی کا نام لے دوں گا ملٹن کی "فردوس مفقود" (Paradise Lost) کا ایک سرسری جایزہ لیجئے اور اس کے بعد قصاید خاقانی پر ایک نظر ڈالئے آپ فوراً اس نتیجہ پر پہونچ جائینگے کہ ملٹن اور خاقانی کی بدیعہ انشا اور اسلوب تحریر میں ایک خاص قسم کی مماثلت پائی جاتی ہے[1]۔

---

[1] الیور کرامول (Oliver Cromwell) کا زمانہ جب انگلستان میں جمہوریت قائم ہو چکی تھی ۴۹ء

اوراق ہٰذا میں قصاید خاقانی کے اس حصہ سے بحث کی جائے گی، جس میں شاعر نے منجمانہ اشارات کئے ہیں لیکن قبل اس کے کہ اس مسئلہ پر گفتگو کیجائے نجوم کے بعض تاریخی شواہد و علمی نکات پر روشنی ڈالنا ازبس ضروری ہے۔

میرا یہ مضمون جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے تین حصوں پر منقسم ہے پہلے حصہ میں نجوم کے متعلق تاریخی و علمی مباحث ہوں گے، دوسرے حصہ میں خاقانی کے سوانح حیات سے بحث کی جائے گی اور تیسرے حصہ میں اس کے قصائد کے ان ابیات کی شرح و بسط ہوگی جن میں شاعر نے منجمانہ نکتہ سنجیاں کی ہیں۔

احکام نجوم کے متعلق تاریخ میں بہت سے دلچسپ اور معتبر واقعات نظر آتے ہیں یہاں تک کہ حدیث اور اسماء الرجال میں بھی جستہ جستہ اس کا تذکرہ آجاتا ہے امام بخاری نے ہرقل کے متعلق ایک طویل حدیث روایت کی ہے، اس میں آنحضرت صلعم کے اس خط کی نقل کی ہے جو آپ نے سنہ ۶ھ میں دحیہ کلبی کے ہاتھ بصریٰ کے حاکم کو بھیجا تھا (اور اس نے وہ خط ہرقل کو بھیجدیا) اور جس میں ابوسفیان اور قریش سے پیغمبر صلعم کے متعلق ہرقل کے سوال وجواب کی تفصیل پائی جاتی ہے اسی حدیث میں ضمناً بخاری نے یہ بھی لکھا ہے:-

قال ابن الناطور کان ہرقل حزاءً ینظر فی النجوم فقال لہم حین سألوہ انی رأیت اللیلۃ حین نظرت فی النجوم ملک الختان قد ظہر	ابن ناطور نے کہا ہرقل ستارہ شناس تھا لوگوں نے اس سے سوال کیا تو اس نے کہا کہ رات کے وقت جبکہ میں نے ستاروں کو دیکھا تو پتہ چلا کہ ختنہ کرنے والوں کا بادشاہ غالب ہوا

ابن ناطور ایلیا کا حاکم ہرقل کا مصاحب اور شام کے نصاریٰ کا پیر پادری تھا اس نے بتایا کہ

۱۶۵۳ء سے ۱۶۵۸ء تک کرامول کا اقتدار رہا اس عہد میں ملٹن کی شخصیت بھی تاریخ میں نمایاں حیثیت رکھتی ہے چنانچہ کرامول کی سیاسی کامرانیاں بہت کچھ ملٹن کی عالمانہ سعی کی منت پذیر ہیں، وہ لاطینی زبان کا ماہر اور "معتمد خارجہ" (Foreign Secretary) کے عہدہ پر فائز تھا اجنبی ممالک وددل سے خط وکتابت لاطینی زبان میں ہوتی تھی، عہد حاضر میں ترکی کے اندر مصطفےٰ کمال اور عصمت پاشا کی جو شخصیتیں ہیں وہی حالت الیور کرامول اور ملٹن کی تھی، فرق صرف یہ ہے کہ ملٹن ایک بلند پایہ شاعر بھی تھا اور عصمت پاشا صرف ایک سیاسی ایک مدبر اور علامہ ہیں ہاں بحث یہ تھی کہ ملٹن لاطینی زبان کا ماہر تھا "خلد گم شد" کا ہر صفحہ اس کے ذوق لاطینی کا آئینہ دار ہے۔ خاقانی نے جس آزادی اور بے تکلفی کے ساتھ اسلامیات اور خرافیات کے اشارے کئے ہیں اسی طرح ملٹن یونانی اصنام واساطیر اور لاطینی قصص وروایات کی طرف اشارے کرتا ہے۔

[1] بخاری (کیف بدء الوحی)

یہودیوں کے سوا کوئی ختنہ نہیں کرتا اس کو خبر نہ تھی کہ مسلمان بھی ختنہ کرتے ہیں اور یہی ہوا کہ مسلمان رومی سلطنت پر قابض ہوگئے۔

اسی طرح حضرت ابن حبان محدث (متوفی ۳۵۴ھ) کے متعلق لکھا ہے کہ:-

سوائے علم حدیث علوم دیگر ہم داشت، فقہ ولغت وطب ونجوم رانیک می دانست[1]

قرون اولیٰ میں طب کے ساتھ نجوم کو خاص تعلق تھا چنانچہ اطبا نجوم کی بھی باضابطہ تعلیم حاصل کرتے تھے، ڈاکٹر ڈی بوئر لکھتا ہے:-

> نویں صدی میں جدید ہیئت اجتماعیہ چاہتی تھی کہ اطبا فلسفہ کے بھی حامل ہوں ان کو غذا کی ماہیت، مزاج جسمانی کا علم بھی حاصل کرنا ضروری تھا، اور ہر حالت میں اثر کواکب کی واقفیت لازمی تھی، طبیب منجم کا بھائی تھا، اور اس کی عزت کرتا کیونکہ علم نجوم طبابت سے کہیں زیادہ بلند مقصد رکھتا ہے[2]

احکام نجوم کی تصدیق کے سلسلہ میں معتبر مورخین نے بہت سی روایتیں درج کی ہیں ان میں ابوشجاع بویہ دیلمی ابوریحان بیرونی، الحاکم بامراللہ فاطمی، المعزالدین اللہ اسمٰعیلی، حسن گانگوی بہمنی کے عہد کی منجمانہ پیشین گوئیاں بہت دلچسپ ہیں۔

ابوشجاع بویہ دیلمی چوتھی صدی کے آغاز سے پانچویں صدی کے وسط تک دیالمہ کی حکومت رہی ابوشجاع نے ایک رات خواب میں دیکھا کہ بہت سخت آگ لگی ہے اور پھیل کر بعض شہروں پر چھا رہی ہے یہاں تک کہ اس کی روشنی آسمان تک پہونچی، اس کے بعد یہ آگ تین حصوں میں تقسیم ہوگئی، اور شہروں اور انسانوں کو دیکھا کہ آگ کے ان حصوں کے حضور میں سجدہ کر رہے ہیں اس عرصہ میں بویہ سے ایک منجم ومعبر کی ملاقات ہوگئی بویہ نے اپنا خواب بیان کیا منجم نے کہا یہ بہت بڑا خواب ہے اس کی تعبیر اس شرط پر بتاؤں گا کہ مجھے گھوڑا اور کپڑا انعام دو، بویہ نے کہا، خدا کی قسم سوائے اس کپڑے کے جو پہنے ہوئے ہوں میرے پاس دوسرا کپڑا نہیں ہے منجم نے دس اشرفیاں طلب کیں، بویہ نے اس پر اظہار عجز کیا، آخرکار منجم نے مجبوراً ناچار دیکھا تو کہا تمھارے تین بیٹے ہوں گے اور یہ سب ان آتش زدہ شہروں پر حکمرانی کریں گے، اور چار دانگ عالم میں ان کی شہرت ہوگی۔ بویہ نے کہا کیا یہ جایز ہے کہ تم مجھ سے استہزا کرو، میں مرد فقیر، میرے بچے تمھارے سامنے ہیں کس استعداد کی بنا پر یہ بادشاہ ہوں گے، منجم نے کہا ان کی ولادت کی ساعت معلوم ہو تو بتاؤں، بویہ نے اپنے لڑکوں کی ولادت کی

---

[1] بستان المحدثین صفحہ ۳۸ — [2] (The History of Philosophy in Islam)

تاریخیں و ساعتیں بتائیں منجم نے احتیاط کے ساتھ درجات طالع اور "نظرات کواکب" پر غور کیا، اور سب سے پہلے بڑے لڑکے عمادالدولہ علی بن بویہ کا ہاتھ چوما اور کہا کہ پہلے یہی لڑکا بادشاہ ہوگا اس کے بعد دونوں لڑکوں معزالدولہ اور رکن الدولہ کے ہاتھوں کو بوسہ دیا لڑکوں نے کہا اباجان اس منجم کو کچھ انعام دیجئے، بویہ خفا ہوا اور کہا یہ شخص تم سے مسخراپن کر رہا ہے۔ منجم نے کہا اگر میرے بیان پر تم کو اعتبار نہیں تو کم سے کم یہ عہد کرو کہ جب بلند مرتبہ پر پہونچو گے تو میرے ساتھ مہر و کرم سے پیش آؤ گے، ابو شجاع نے دس درم دئے۔ آج تاریخ کا طالب العلم جانتا ہے کہ منجم کی پیشین گوئی حرفاً بہ حرف صحیح ثابت ہوئی۔

الحاکم بامر اللہ فاطمی فاطمیہ مصر عباسیہ کے زبردست حریف گزرے ہیں تقریباً ڈھائی صدی تک اس خاندان نے حکمرانی کی اس گھرانہ کا مشہور حکمران الحاکم بامر اللہ بہت بڑا منجم گزرا ہے۔ چنانچہ معجم المذاہب والاخلاق (انسائیکلوپیڈیا آف ریجن اینڈ اتھکس) کے مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ باوجودیکہ وہ فن نجوم میں مہارت رکھتا تھا لیکن اس نے عوام کو اس کی تحصیل سے قطعاً روک دیا تھا۔

الحاکم بامر اللہ کا قاعدہ تھا کہ وہ روزانہ صبح کے وقت ایک گدھے پر سوار ہو کر تنہا ایک پہاڑ پر سیر کے لئے جایا کرتا تھا، ایک دن اس نے زائچہ دیکھا تو کہا کہ اگر فلاں شب کو مجھے کوئی آسیب نہ پہونچے، تو میری عمر اسی برس سے متجاوز ہو جائے گی، جب شب معہودہ آپہونچی اور حاکم نے چاہا کہ پہاڑ کے طواف کے لئے روانہ ہو تو اس کی ماں نے بڑی منت و سماجت کے ساتھ اس کو روک لیا حاکم نے بھی کسی قدر توقف کیا لیکن تھوڑی دیر کے بعد سخت مضطرب ہوا، اور ماں سے کہا اگر مجھے جانے نہیں دوگی تو میری روح جسم سے پرواز کر جائے گی چنانچہ وہ پہاڑ پر گیا اور وہیں درباریوں کی ایک مخالف جماعت نے اس کا خاتمہ کر دیا۔

المعزالدین اللہ اسمٰعیلی یہ بھی فاطمیہ مصر کا ایک مشہور فرمانروا گزرا ہے اس کے متعلق محمد بن خوندشاہ لکھتے ہیں:-

> المعزالدین اللہ منجمے ماہر بود روزے ملاحظہ زائچہ خویش کردہ در آنجا قاطعے دید ایں صورت را بایکے از ارباب نجوم درمیان نہادہ دراں باب مشورت فرمود منجم گفت خلیفہ را چند روزے مستور باید تا آن نکبت در گزرد، معز ازیں حدیث اعراض نمود[1]

اس کے بعد معز نے اعیان دولت کو جمع کیا اور فرمایا کہ میری زندگی کے دن ختم ہو رہے ہیں موت سر پر آچکی ہے میں اپنے لڑکے کو تمھارے سپرد کرتا ہوں، اور اس کو اپنا خلیفہ بناتا ہوں امید ہے کہ تم اس کی اطاعت کروگے،

---

[1] ابو شجاع بویہ دیلمی، حاکم بامر اللہ، اور معزالدین اللہ کے ان واقعات کے متعلق ملاحظہ ہو روضۃ الصفا جلد ۴۔

المعز نے اس لڑکے کا لقب العزیز باللہ رکھا اور ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند کرلیں۔

ابوریحان البیرونی

ابوریحان بیرونی عہد غزنویہ کا بہت بڑا علامہ گزرا ہے اس کی تصنیفات سے اسکی عالمانہ جامعیت کا اندازہ ہوتا ہے نجوم میں اس کو خاصہ درک تھا چنانچہ اس کے متعلق فرشتہ نے بہت پر لطف روایتیں لکھی ہیں۔

علم کے ساتھ علم کا پندار ہونا ناگزیر ہے ابوریحان بیرونی کے اسی استغنا سے سلطان محمود غزنوی کچھ خوش نہ تھا ایک دن سلطان اپنے مشہور باغ "ہزار درخت" کے سامنے محل کی چھت پر بیٹھا ہوا تھا کہ البیرونی آیا سلطان نے پوچھا کہ بتاؤ میں قلعہ کے ان چار دروازوں میں سے کس دروازہ سے باہر جاؤنگا منجم نے اسطرلاب مانگا اور طالع درست کرکے دیکھا، اور ایک پرزہ پر کچھ لکھ کر سلطان کے سرہانے رکھدیا اس کے بعد سلطان نے حکم دیا کہ قلعہ کی شرقی دیوار کو توڑ دیا جائے، اور اسی طرف سے باہر گیا، اس کے بعد کاغذ مانگا دیکھا کہ لکھا ہوا تھا کہ ان چار دروازوں میں سے کسی دروازہ سے باہر نہیں جائیں گے، بلکہ پورب کی دیوار توڑ کر نیا راستہ بنایا جائیگا سلطان یہ معلوم کرکے بہت خفیف ہوا، اور حکم دیا کہ بیرونی کو محل کی دیوار سے نیچے پھینک دیا جائے، منجم نے پہلے ہی دیوار سے ایک پھندا لگا دیا تھا، اسی کے ذریعہ نیچے اتر آیا اور اس کو کوئی ضرر نہ پہونچا سلطان نے پوچھا یہ بھی تم نے دیکھا تھا منجم نے کہا ہاں، اور اپنے غلام کے ہاتھ سے تقویم لیکر سلطان کو دکھا دیا کہ اس دن کے احکام میں لکھا ہوا تھا کہ اس کو ایک بلند مقام سے زمین پر پھینک دیں گے لیکن کوئی نقصان نہ پہونچے گا، اس سے سلطان کا غصہ بہت بڑھ گیا، اور علامہ بیرونی کو زندان میں بھیجدیا، اسی طرح چھ ماہ گزر گئے، ایکدن بیرونی کا غلام بازار سے گزر رہا تھا، کہ ایک "فال بین" نے اس کو بلایا اور کہا تمہارے طالع میں چند چیزیں میں نے دیکھیں، انعام دو تو بتاؤں، غلام نے دو درم دئے، فال بین نے کہا کہ تمہارا آقا ان دنوں مصیبت میں ہے لیکن آج سے تین دن کے اندر وہ اس مصیبت سے رہا ہو جائے گا، اور خلعت شاہی زیب جسم کریگا، غلام نے بشارت کے طور پر یہ خبر اپنے آقا کو پہونچائی، وہ ہنسا اور کہا تم میرے غلام ہو کر ایسے ایسے آدمیوں کی باتوں کا اعتبار کرتے ہو، لیکن فال بین کی یہ پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی اور خواجہ احمد بن حسن میمندی کی سفارش سے بیرونی کو رہائی حاصل ہوگئی، بیرونی نے جب فال بین کو بازار میں بیٹھا ہوا دیکھا، تو اس کے سر سے منجمانہ پندار کا سودا بہت کچھ دور ہو گیا۔[1]

حسن گانگوی بہمنی

۷۴۸ھ ہندوستان کی تاریخ کا ایک بہت ہی اہم سال گزرا ہے اسی سال ایک برہمن کا مفلوک الحال خادم ہندوستان کے تخت پر بیٹھتا ہے اور دو سو برس کے

[1] ملاحظہ ہو تاریخ فرشتہ (ذکر فیروز شاہ بہمنی)

لگ بھگ اس کے خاندان میں حکومت رہتی ہے، ظفر خاں دکن میں آچکا ہے اور اس ساعت کے اختیار کرنے کے باب میں گفتگو ہو رہی ہے جبکہ علاء الدین حسن کے سر پر تاج شاہی رکھا جائے گا، اردگرد معلی علما و فضلا سے بھرا ہوا ہے ایک طرف برہمن جوتشی ہیں، دوسری طرف صدر الشریف سمرقندی اور میر محمد منجم بدخشی ہیں اختیار ساعت کے متعلق رائیں طلب کیجا رہی ہیں ہندوستانی نجموں نے متفقہ طور پر ایک ساعت مقرر کر دی اسلامی منجموں نے دوسری ساعت تجویز کی لیکن کثرت رائے برہمنوں کی طرف تھی، اسی ساعت سعید میں سلطان قطب الدین کی مسجد میں علاء الدین کے سر پر دکن کا تاج رکھدیا، ملا داؤد بیدری تحفۃ السلاطین میں اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے، صدر الشریف سمرقندی اور میر محمد منجم بدخشی کے تاسف کا حال لکھتے ہیں ملا صاحب کا بیان ہے کہ جب علاء الدین کو اسلامی منجموں کے تاسف کا پتہ چلا تو ان کو خلوت میں طلب کیا اور کہا کہ آپ لوگوں کے افسوس کی کیا وجہ ہے؟ مجھے از بس تشویش ہے، مسلمان منجموں نے جواب دیا کہ تشویش کی کوئی وجہ نہیں، لیکن ہم لوگوں نے تاجپوشی کے لئے جو ساعت اختیار کی تھی، اگر اسوقت یہ مبارک تقریب انجام پذیر ہوتی تو آپ کے خاندان کے ڈیڑھ سو سلاطین تخت دکن پر جلوہ افروز ہوتے، اور سات سو برس تک آپ کے گھرانہ میں حکومت رہتی، لیکن برہمنوں نے جو ساعت تجویز کی ہے، اس کے مطابق آپ کے خاندان میں بیس حکمران سے کم ہونگے، اور دو سو سال کے اندر حکومت ختم ہو جائے گی، فرشتہ اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہے:۔

مؤلف ایں حکایت بو العجب می گوید کہ بعد از یک صد و ہفتاد و ہفت سال کہ دولت آل بہمنیہ منقضی ہو شد، بر علما و فضلائے صاحب انصاف صدق کلام آں دو بزرگوار و مہارت ایشان در علم نجوم ظاہر گشت و نیز عدد شاہان بہمنیہ ہنوز بہ بست نفر نہ رسیدہ بود کہ آں سلسلہ صفت اختتام پذیرفت[1]

ابوطاہر منجم شیرازی احکام نجوم کی تصدیق کے متعلق حمداللہ مستوفی القزوینی نے بھی تبریز کے سلسلہ میں بعض روایت درج کی ہیں وہ کہتے ہیں کہ زبیدہ خاتون (اہلیہ ہارون الرشید) نے ۱۷۵ھ میں اس شہر کی بنیاد ڈالی، ۶۹ سال کے بعد ۲۴۴ھ میں جبوقت خلیفہ متوکل تخت بغداد پر متمکن تھا یہ شہر زلزلہ سے برباد ہوگیا، خلیفہ نے اس کی دوبارہ تعمیر کی، پھر اکیسو نوے برس کے بعد ۳۳۴ھ میں زلزلہ سے یہ شہر بالکل تباہ ہوگیا اس واقعہ کے وقت ابو طاہر منجم شیرازی تبریز میں موجود تھا، اس نے زلزلہ کی

---

[1] تاریخ فرشتہ مقالہ ۳، روضہ ۱

پیشین گوئی کی تھی، اور کہا تھا کہ یہ شہر بالکل برباد ہو جائے گا، حکام باشندوں کو مستعدی کے ساتھ شہر سے میدان میں لاتے تھے، تاکہ عمارات کی بربادی سے انسانی جانیں تلف نہ ہوں، پھر بھی شب موعودہ کو زلزلہ آیا اور تقریباً چالیس ہزار آدمی اس واقعہ فاجعہ سے ہلاک ہو گئے، خلیفہ قایم باللہ کی طرف سے جو شخص اسوقت اس شہر کا حاکم تھا اسنے ابوطاہر منجم کے مشورہ سے شہر کی تعمیر شروع کی منجم نے برج عقرب کے طالع میں اس شہر کی تیسرے بار بنیاد رکھی اور یقین دلایا کہ پھر کبھی اس شہر کو زلزلہ سے خرابی نہو گی لیکن سیلاب سے تباہی ہو سکتی ہے چنانچہ حمداللہ مستوفی اس کے متعلق لکھتا ہے:۔

تا غایت کہ بر تراز، سہ صد سال است حکم او راست آمدہ است و ہر چند دراں شہر زلزلہ بسیار اتفاق افتادہ اما خرابی عظیم نہ کردہ[1]

اسلامی نجوم کے اصطلاحات

مسلمان لوگ علم نجوم کو پانچ حصوں میں تقسیم کرتے ہیں:۔

(۱) مثلاً منطقۃ البروج کے مختلف حصے، مقامات سماوی اور ہر سیارہ کے خصائص، بارہ بروج اور ان کے مالک سیارہ کے متعین کرنے کے طریقے، اور قرآن سیارگان وغیرہ۔

(۲) الاحکام الی امور العالم (Prognostics of a Universal Character) وہ جنکا علاقہ حکومتوں کے قیام و زوال، خاندانوں کے عروج و ہبوط، مذاہب کے نشر و اضمحلال، جنگ کی خون آشامیوں، قحط کی تنگیوں، طوفان کے مصائب بارش کے انعام، اور بازار کے فروغ و کساد سے ہے نجوم کے اس حصہ کو بطلیموس "تحویل صنع العالم" (Universal Apatelesmatics) کے نام سے موسوم کرتا ہے ان پیشین گوئیوں کا بڑا حصہ سیارہ کے ذریعہ حاصل کیا جاتا ہے جبکہ ہر (Tropics) سال کے موقعہ پر آفتاب برج حمل میں داخل ہوتا ہے[2]۔

(۳) الموالید (Nativities) نجوم کے اس حصہ کو کہتے ہیں جس میں افراد کے حالات کے متعلق پیشین گوئی کی جاتی ہے یعنی ولادت کے وقت سیارہ کے عروج و ہبوط، شرف و زوال کی معلومات بہم پہونچا...

(۴) مسایل (Interrogations) نجوم کا وہ حصہ جس کا تعلق سوالات کا جواب دینے سے ہے مثلاً ایک دور افتادہ عزیز کے حالات کی تفتیش چور کا پتہ لگانا بھاگے ہوئے غلام کے مقام روپوشی کی تعیین وغیرہ نجوم کے اس حصہ کا تعلق محض مسلمان منجموں سے ہے وہ لوگ جو بطلیموس کے حقیقی پیرو ہیں۔

---

[1] نزہت القلوب، مصنفہ حمداللہ مستوفی (بہ سلسلہ شہر تبریز)۔ [2] اسلامی نجوم کے اصطلاحات و ارتقاء کے متعلق "معجم المذاہب والاخلاق" (Encyclopedia of Religion & Ethics) کے مقالہ "شمس قمر و کواکب" سے استفادہ کیا گیا ہے۔

وہ "مسایل" کو تسلیم نہیں کرتے،

(۵) اختیارات (Elections) یعنی کسی خاص کام کے آغاز کرنے کی نیک ساعت اس کا عام قاعدہ یہ ہے کہ منجمین پتہ لگاتے ہیں کہ اس ساعت میں قمر بروج دوازدہ میں سے کس برج کے اندر ہے، غالباً یونانیوں کے یہاں بھی یہی طریقہ مروج تھا، لیکن بعض اسلامی منجمین لحاظ رکھتے ہیں کہ اس وقت قمر اپنے اٹھائیس منازل میں سے کس منزل میں ہے یہ ہندوستان کی پیداوار ہے، درامیوس (Dorotheus) کی طرف منسوب ہے بطلیموس کے تبعین "اختیارات" کو بھی تسلیم نہیں کرتے،

مختلف اثرات اسلامی نجوم پر مختلف ممالک کا اثر پڑا ہے چنانچہ عربی زبان کے کتب نجوم سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمان منجمین نے یونانی، ہندوستانی اور ایرانی اثرات قبول کئے ہیں۔

یونانی اثر بطلیموس کی کتاب (Tetrobiblos Quadrapartitum) دراسیوس سدانیوس (Dorotheus Sidonius) کی تحریریں (پہلی صدی مسیحی) اثینیہ کے مشہور منجم کی کتاب جو "مسایل" اور "موالید" وغیرہ پر ہے (دوسری یا تیسری صدی مسیحی) یہ ساری معلومات عربوں کے پیش نظر تھیں، ایک یونانی منجم ریروس یا زیروس کا نام بھی اسلامی منجموں کی تحریروں میں پایا جاتا ہے لیکن تحریف کے باعث مصنف کے اصلی نام کا پتہ نہیں چلتا، ایک دوسرے یونانی مصنف تنکلوس سے بھی مسلمان منجمین واقف تھے لیکن اس کے متعلق ایرانی ماخذ کے ذریعہ انھوں نے معلومات حاصل کئے۔

ہندوستانی اثر مسلمان منجمین سات یا آٹھ ہندوستانی منجموں کا نام لیتے ہیں لیکن ابھی تک یہ پتہ نہ چلا کہ سنسکرت زبان میں ان کا اصلی نام کیا تھا، انمیں سب سے اہم شخصیت "کنکہ" (K. N. K. H.) یا "کنکہ" (K. J. K. H.) کی ہے جس کے متعلق بعض عربی کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ہندوستانی کتب (ہیئت) کے ساتھ خلیفہ منصور کے دربار (بغداد) میں آیا بعض عربی مصنفوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس نے علم حساب کی تعلیم دی عرب لوگ "موالید" اور "قرآن سبعہ سیارگان" کے متعلق بعض تصنیفات اسکی طرف منسوب کرتے ہیں اس لئے یہ ظاہر ہے کہ اس نے ہندوستانی نجوم پر بحث کی ہوگی جس کو سنسکرت میں "ہورہ" یا "جاتک" کہا جاتا ہے اور جس پر یونانی اثر پڑا ہے، اس سے ایف بال (F. Ball) کے قیاس کی توثیق ہو جاتی ہے ابو معشر کے مقدمہ سے اس نے نتیجہ نکالا ہے کہ کنکہ کے پاس قدیم یونانی ماخذ کے مواد موجود تھے، کیونکہ اجرام سماوی کی جو صورتیں اس نے پیش کی ہیں ان سے یہی ظاہر ہوتا ہے اسلامی منجموں نے عموماً ہندوستانی ماخذ کا حوالہ دینے میں بجائے منجموں کا نام لینے کے صرف ہنود لکھا ہے۔

پھر بھی عربی اصطلاحات میں بعض ایسے ہندوستانی الفاظ کا پتہ چلتا ہے جو اسی شکل میں موجود ہیں مثلاً "دریجان" جو ہندوستانی "درگانہ" Dare khana کی تحریف ہے۔

ایرانی اثر عہد وسطی کی پہلوی زبان سے مسلمان منجموں نے استفادہ کیا ہے پہلی صدی کے نصف آغاز میں تنکلوش بابلی Teuerus کی کتابیں جو اجرام سماوی اور (Decanus) کے متعلق تھیں۔ فارسی ترجمہ کے ذریعہ مسلمانوں تک پہونچیں یہاں یہ مصنف پہلوی تصنیفات کے باعث تنکلوس (یا تنکلوش یا تنکلوشا) کے نام سے مشہور ہوا[1]، اسی لئے ابو معشر نے اپنے مقدمہ میں اسکی تعلیمات کو "مذہب الفرس" کے نام سے موسوم کیا ہے اور اس میں منازل قمر کے بعض فارسی نام بھی پائے جاتے ہیں، دوسرا ذریعہ بزرجمہر کی شرح تھی، جس کا یونانی سے پہلوی میں "وزیزک" (منتخب) کے نام سے ترجمہ ہوا تھا لیکن عربی میں "البزیزج" بن گیا اور اس کے بعد عرب مصنفوں نے توڑ مروڑ کر عجیب و غریب تحریفیں پیدا کر دیں نجوم کے سلسلہ میں مسلمان منجموں نے خرافیاتی زردشت کا بھی حوالہ دیا ہے جس کا نام چوتھی صدی اور اس کے بعد یونانی علم نجوم میں یقیناً متداول تھا، چوتھا ذریعہ زادان فرخ کے بیٹے "الاندرزگر" کی کتاب متعلقہ "موالید" تھی، اس شخص کے متعلق صحیح حالات معلوم نہیں چونکہ القبیصی (مسلمان منجم) کے "موالید" اور ابن عزرا (یہودی منجم) کے لاطینی تراجم میں اس کے نام کی مختلف تحریفیں پائی جاتی ہیں، نجوم کی وہ کتابیں جو جاماسپ (مشہور صوفی بادشاہ گشتاسپ کا مشورہ کار) کی طرف منسوب ہیں آخری زمانہ کے مسلمانوں کے حسن عقیدت کا نتیجہ ہیں ورنہ یہ کتابیں جاماسپ کی لکھی ہوئی نہیں ہیں۔

ہم لوگوں کو اس کا صحیح علم نہیں کہ ان ساری کتابوں کا عربی زبان میں ترجمہ ہوا، لیکن یہ یقین ہے کہ آٹھویں صدی کے نصف ثانی میں یہ کتابیں مشہور تھیں، یہ وہ وقت تھا جبکہ مسلمانوں کے تمدن کا آغاز ہو چکا تھا، اگر "ہرمس" کی کتاب "المفتاح النجوم" کے قلمی نسخہ (جو Milan کے کتب خانہ میں محفوظ ہے) کا بیان صحیح مانا جائے تو ماہ ذوالقعدہ ۱۲۵ھ میں اس کتاب کا ترجمہ ہوا یعنی اسوقت خلفائے بنی امیہ سریر آرائے حکومت تھے خلیفہ منصور (۱۳۶ھ - ۱۵۸ھ) کے زمانہ میں پہلے پہل یحیی البطریق نے بطلیموس کی کتاب مقالات اربعہ Tetra

---

[1] خاقانی نے بھی اپنے قصیدہ میں اس مصنف کا تذکرہ کیا ہے وہ بھی اس کو "تنکلوشا" کہتا ہے اس سے جہاں معجم المذاہب دا لاخلاق کے مقالہ نگار کی اس رائے کی توثیق ہوتی ہے کہ مسلمان منجمین اس مصنف سے پہلوی ماخذ کے ذریعہ واقف ہوئے وہاں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ خاقانی کو اس علم میں کس قدر ید طولی حاصل تھا، اور اس علم کی کیسی اہم کتابیں اور ان کے مصنفین اس کے پیش نظر تھے وہ کہتا ہے:۔۔ بنام قیصراں سازم تصانیف بہ از ارتنگ چین و تنکلوشا

کا ترجمہ کیا آٹھویں صدی کے نصف ثانی میں ماشاءاللہ نے اپنی تصنیفات میں دراسیوس اور انطاکیوس کے حوالے کنکھ کی کتابیں خلیفہ منصور ہی کے زمانہ میں سنسکرت سے عربی میں منتقل ہوئیں نویں صدی کے وسط میں کندی نے نجوم پر مختصر رسائل لکھے، جن کو ہندوستانی نمونہ پر ترتیب دیا گیا تھا یہ تقریباً یقینی ہے کہ خاندان نوبخت کے افراد نے پہلوی زبان سے عربی میں فارسی کتابوں کا ترجمہ کیا اس خاندان کا سردار خلیفہ منصور کے دربار میں "منجم" تھا، بعض ایسے حقایق بھی ہیں جن سے صاف پتہ چلتا ہے کہ عربی نجوم پر ایرانیوں کا اثر پڑا ہے کیونکہ ماشاءاللہ کے رسایل میں جن کا یوحنا اشبیلی نے لاطینی میں ترجمہ کیا ہے ایرانی ماخذ کے بعض اصطلاحات پائے جاتے ہیں جیسے الکتخدا، الجانبختان وغیرہ۔

تحریری دستاویزات کے علاوہ زبانی روایتیں بھی تھیں جو نومسلم قومیں اپنے ساتھ اسلام میں لائیں، حران میں قدیم عہد جاہلیت کے علوم کے ساتھ نجومی روایتیں بھی ترقی پر تھیں سیوفیلوس (Theophilus) بن طامس جو اڈیسہ کا رہنے والا اور مسیحی مذہب کا پیرو تھا خلیفہ مہدی کا درباری منجم تھا چند مسلمان منجموں نے "اختیارات" کے موضوع پر اس سے استناد کیا ہے اس نے شام کی زبانی روایتیں لیں اسی طرح یہ بھی قدرتی ہے کہ مسلمانوں کے تمدن میں آرامی مراکز دیار بکر، اور بابل اور مصریوں کے منجمانہ عقاید جذب ہوئے، مسلمانوں کے علم نجوم سے ابتدائی زمانہ میں یہودی عنصر کا بھی اثر پڑا ہے، اس کا ثبوت یہ ہے کہ دوسری اور تیسری صدی کے مخصوص منجموں میں ماشاءاللہ، سہل ابن بشر، ربان الطبری، اور سند ابن علی ہیں اور یہ سب یہودی تھے۔

یورپ پر اثر بارھویں صدی سے پندرھویں صدی کے اخیر تک لاطینی عہد وسطی کا علم نجوم حقیقۃً عربی نجوم ہے اس عہد میں سارے ذخیرہ نجوم کا ماخذ عربی تھا، چنانچہ ابومعشر، القبیسی، الکندی، المنصور، الفضل، عمر، ماشاءاللہ، ذہیل وغیرہ نے اپنے افکار و آرا اور اپنی تصنیفات و مولفات سے یوروپی علمار کو اثر پذیر کیا بطلیموس کی دو کتابوں کے عربی تراجم سے بھی یوروپی علمار نے استفادہ کیا لاطینی زبان میں منجمانہ اصطلاحات کے لئے یا تو عربی کے لفظی ترجمے ہیں .... یا عربی کلمات کی تحریف، بزنطینی دنیا میں عربی اور فارسی زبانوں کے ذریعہ اسلامی نجوم کے بہت سے آثار پائے جاتے ہیں اس لئے قدیم یونانی تصنیفات کے پہلو بہ پہلو ابومعشر، احمد ابن یوسف الضیاء، ماشاءاللہ، سہل ابن بشر اور دوسرے عربی مصنفوں کی کتابیں نظر آتی ہیں اس طور سے نجوم کے متعلق بزنطینی کتابوں میں سیاروں کے اسمار اور فنی اصطلاحات کے لئے عربی فارسی نام ہیں جن کو قدیم یونانی ناموں سے کوئی مناسبت نہیں آخر میں یہ بھی بتا دینا ضروری ہے کہ یورپ کا یہودی ادب نجومی جس میں ابراہیم ابن عزرا کی نمایاں شخصیت نظر آتی ہے،

عربی ماخذ سے مستفاد ہے۔

اسلامی نجوم کی خصوصیت

ساتویں، آٹھویں اور نویں صدی میں دنیا کے مختلف اقوام یونانی و قبطی، شامی، ایرانی اور اہل ہند پر عربوں کا تسلط ہوا تو ان قوموں نے حوادث اور اثرات کواکب کے متعلق پہلے ہی تمام ممکن اصولی باتیں خیال کر رکھی تھیں اس لئے مسلمانوں کے لئے کوئی نئی چیز پیش کرنے کا موقعہ نہ تھا باوجود اس کے اسلامی نجوم ساری دنیا حتی کہ یونانیوں کے فن نجوم سے بھی بالاتر اور ایک حقیقی ترقی کا علمبردار ہے۔

نجوم اور اسلامی فلاسفہ وائمہ

ابومعشر اپنے مقدمہ (۸۴۸ء) میں سات قسم کے آدمیوں کو نجوم کا مخالف بتاتا ہے اور دناع میں بطلیموس کے انھیں مباحث کو بسط وکشاد کے ساتھ پیش کرتا ہے جو اس نے نجوم کے فواید کے سلسلہ میں لکھے ہیں اور مستقبل کے متعلق پیش بینی سے جو مادی اور اخلاقی منافع ہیں ان پر روشنی ڈالی ہے اسی طرح الکندی (فیلسوف العرب) نے نجوم کو حکمت کی ایک شاخ بتایا ہے وہ اسکو نہ صرف ریاضی کے قوانین اربعہ بلکہ طبیعاتی اور ماورا طبعی قوانین پر مبنی بتاتا ہے غالباً الکندی ہی وہ شخص ہے جس نے نجوم کو عقلی اور باضابطہ اصول وطرق کے ماتحت مرتب کیا لیکن معاملہ نے فوراً ہی دوسرا رخ اختیار کیا دوسری صدی ہجری کے آخر میں ارسطو کی تعلیم پوری طرح ترقی پر تھی، اور یہاں نجوم کا گزر نہ تھا، اس لئے فلاسفہ نے اس فن کے خلاف نزاع شروع کر دی اسی طرح علمائے دین نے بھی مخالفت شروع کی اس سلسلہ میں بہت سی کتابیں ورسایل رد میں لکھے گئے چنانچہ ان میں سب سے قدیم ابوالقاسم عیسی بن علی کی کتاب ہے جو نجوم کے رد میں ہے اور جو حنبلی امام ابن قیم الجوزی کی کتاب، مفتاح دارالسعادہ میں محفوظ ہے عیسی بن علی کا معاصر فارابی بھی اس کا مخالف تھا اور کیوں نہ ہوتا جبکہ وہ ارسطو کے فلسفہ کا ماہر اور پیرو تھا نجوم کے رد میں اس کی ایک کتاب ہے لیکن یہ کتاب ایسی نہیں جو اتنے بڑے فلسفی کے شایان شان ہو اس میں بہت سی بچوں کی سی بحثیں ہیں فارابی کی یہ کتاب محض حواشی کا ایک سلسلہ ہے، جسے اس کے ایک شاگرد نے بجنسہ شائع کر دیا۔

فارابی کے تمام معاصر فلسفیوں نے اس مخالفت نجوم میں حصہ نہیں لیا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جن مذاہب فلسفہ پر ارسطو کا زیادہ اثر نہ تھا انھوں نے اس کی حمایت کی جیسا کہ الکندی کے واقعہ سے ثابت ہوا اسی طرح بصرہ میں اخوان الصفا اور بغداد میں ابوسلیمان محمد بن طاہر ابن بہرام السجستانی المنطقی نے بھی نجوم کے متعلق کتابیں لکھیں اخوان الصفا کے یہاں "قرآن سیارگان" خاص موضوع بحث تھا، سجستانی کے زمرۂ فلاسفہ کی اکثر بحثیں ابوحیان التوحیدی (چوتھی صدی ہجری) نے اپنی کتاب المقالسات میں جمع کی ہیں اسی طرح

اس جماعت نے بھی نجوم پر بھی رد و قدح کی ہے اور یہ پوری بحث ابن قیم کی کتاب میں محفوظ ہے۔

بو علی سینا نے نہ صرف الشفا اور النجات میں نجوم کی مخالفت کی ہے بلکہ اپنی اس خاص کتاب میں بھی اس کے خلاف لکھا ہے جس پر اے ایف مہرن نے ۱۹۴۸ء میں پوری طرح روشنی ڈالی ہے وہ کہتا ہے کہ یہ ایک بے بنیاد فن ہے اور اس کی نظری حقیقت کو تسلیم کرنے کے باوجود وہ لکھتا ہے کہ اس کا علم حاصل کرنا انسان کے لئے ناممکن ہے۔

ابن رشد (۵۹۵ھ) کے متعلق بھی یہ طے شدہ ہے کہ وہ نجوم کا مخالف تھا، جیساکہ خود اس نے ارسطو کی بعض کتابوں کی شرح کے سلسلہ میں لکھا ہے لیکن یہ ایک غیر مفید بات ہے کہ ہم ان فلاسفہ پر ایک تبصرہ کریں جو مخالفت نجوم کے اس مسئلہ میں متفق ہیں بلکہ زیادہ دلچسپ یہ ہوگا کہ ہم مذہبی اماموں کے اس رویہ پر روشنی ڈالیں جو نجوم کے خلاف آخری نویں صدی ہجری میں انھوں نے اختیار کیا تھا۔

امام ابن حزم اشاعرہ اندلس اور ان کے مذہب کے مخالف تھے، انھوں نے نجوم کے متعلق اپنی کتاب الفصال فی الملل والاہوا والنحل میں خیالات کا اظہار کیا ہے وہ ان لوگوں کو جو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ مستقبل کے متعلق کواکب کی وساطت سے پیشین گوئی کی جاسکتی ہے دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں (۱) کفار و مشرکین۔ (۲) گمراہ لوگ۔ پہلے تو وہ ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ کواکب اور اجرام سماوی ذی عقل ہستیاں ہیں، ان کے اعمال ہیں اور ان کا استقرار دائمی ہے موجودات ارضی پر اللہ کے ساتھ یا خود اپنا اثر ڈالتے ہیں دوسری جماعت والے وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ خدا نے کواکب اور اجرام سماوی کو آنے والے واقعات و حوادث کا آئینہ دار بنایا ہے۔

امام غزالی (۵۰۵ھ) جو مذہب اشعری کے محافظ تھے، اپنی کتاب احیاء العلوم الدینیہ میں نجوم کی مخالفت کرتے ہیں اور یہی رویہ حنبلی امام ابن تیمیہ (۷۲۸ھ) نے بھی اپنی کتابوں میں نجوم کے خلاف اختیار کیا ہے لیکن نجوم کے متعلق سب سے زیادہ سخت اور مکمل تردید حنابلہ کے مشہور امام ابن قیم الجوزی (۷۵۱ھ) کی کتاب مفتاح دارالسعادۃ میں پائی جاتی ہے۔

مذہبی دنیا میں غالباً نجوم کی کفالت کرنے والے مجرداً امام فخر الدین رازی (۶۰۶ھ) ہیں یہ قرآن مجید کی عظیم الشان تفسیر کے لئے خصوصیت کے ساتھ بہت مشہور ہیں انھوں نے دینیات، فلسفہ اور نجوم پر بہت سی کتابیں لکھیں اور طب و ریاضی کی بھی تحصیل کی، نجوم پر آپ کو پورا اعتقاد تھا اور یہ نتیجہ تھا علوم حکمیہ کی تحصیل کا، تفسیر قرآن سے آپ کا یہ اعتقاد صاف ظاہر ہے، امام فخر الدین رازی نے جس جرأت کے ساتھ قرآن کی تفسیر اور احادیث کی تاویل کی اس کی نظیر کسی دوسرے دینی عالم کے یہاں نہیں ملتی، نجوم کے متعلق ابن قیم الجوزی اور آپ کے پیشروؤں کی بحث و نظر اور رد و قدح کے بعد اس موضوع کی تمام بحث و نزاع

میں کوئی ندرت باقی نہ رہی ہاں تاریخ کے فلسفی کبیر ابن خلدون (۸۰۸ھ) نے اپنے تاریخی مقدمہ میں جن خیالات کو ترقی دی وہ قابل غور ہیں۔

نجوم کو جس طرح علمائے طب و ریاضی نے اہمیت دی اسی طرح مذہبی علماء اور شعراء نے بھی اس فن پر توجہ مبذول کی چنانچہ موسیقی و شاعری کو بھی نجوم سے وابستگی رہی بالخصوص بعض شعراء تو نجوم کے ماہر گزرے ہیں تیسری صدی ہجری میں یحیٰ بن علی بن یحیٰ المنجم موسیقی کے بہت بڑے عالم اور مصنف گزرے ہیں آپ کا ایک رسالہ جو موسیقی پر ہے متحف برطانی (British Museum) لندن میں محفوظ ہے آپ کو موسیقی کے ساتھ نجوم سے بھی خاص شغف تھا چنانچہ اسی لئے آپ "المنجم" کے لقب سے مشہور ہیں[1]۔ عمر خیام کو مصنف "ہسٹری آف دی سرا سنز" نجومی شاعر یا "فلکی شاعر" کے نام سے یاد کرتے ہیں حکیم مومن خاں کا مشہور شعر ہے:-

اس نصیبے پہ کیا اختر شناس   آسماں بھی ہے ستم ایجاد کیا

مومن خاں ایک بلند پایہ طبیب بھی تھے، اس لئے ممکن ہے ڈاکٹر ڈلی بویر کے سطور بالا کے مطابق انھوں نے اپنے پیشہ کے لحاظ سے اس اہم فن کی تکمیل بھی کی ہوگی، لیکن غالب تو صرف شاعر ہی تھے، وہ بھی فرماتے ہیں۔

ہم ز آغاز بہ خوف و خطر ستم غالب   طالع از قوس و شمار از سرطانم دادند

شعر پڑھنے کے بعد صاف معلوم ہوجاتا ہے کہ شاعر "خصائص بروج" سے واقف تھا[2]۔

(باقی)

عبدالمالک آروی

فلسفۂ مذہب صرف آٹھ آنہ میں

---

[1] دائرۃ المعارف الموسیقیہ، مؤلفہ الاستاذ جول رودانیت مطبوعہ مصر ص ۲۰۔ [2] مسلمانوں کے منجمانہ شغف کا اندازہ ان تصنیفات سے کیا جاسکتا ہے جن کی فہرست حاجی خلیفہ نے "کشف الظنون" میں دی ہے اس کتاب کا ایک نسخہ معہ جرمن ترجمہ میرے پیش نظر ہے، نجوم کی عربی کتابوں اور ان کے مصنفین کی تفصیل مضمون ہذا کے آخر میں درج ہے۔

سبدِ گل

کچھ خبر اس کی نہیں کس گل کی یہ آواز ہے
پھر وہ سرگرمِ تکلم پردہ برانداز ہے
فرصتِ تکمیلِ معصیت بھی تو ممکن نہیں!
دوڑتا پھرتا ہے قلبِ خار میں گل کا لہو
کچھ خبر بھی ہے تجھے بیگانۂ ذوقِ حیات

بلبلِ رنگیں نوا محوِ صدائے ساز ہے
نغمۂ موجِ صبا کیا؟ دور کی آواز ہے
ہر نفس بیدار پھر چشمِ تحیر باز ہے!!
بلبل آسودہ لیکن زمزمہ پرداز ہے
داغِ ناکامی بہارِ مدعا کا راز ہے؟

بہارِ لالہ، نمودِ شبنم، نمائش معتبر نہیں ہے
جو حسن خود راہ زن نہیں ہے تو عشق بھی راہبر نہیں ہے
نسیم نے اس مزے سے چھیڑا کہ نکہتیں ہو گئیں پریشاں
فسانۂ دل سنا رہا ہوں وہ روٹھتے ہیں منا رہا ہوں
تمام صہبا، تمام مستی، وہ سر سے پا تک تمام شوخی
بہار کیا ہے؟ بس تری نوازش، نگاہ کیا ہے؟ صرف ایک سازش

نگہ کی صورت فریب کھانا طریقِ اہلِ نظر نہیں ہے
یہ کیسی افتادگیٔ غم ہے کہ اب کوئی ہم سفر نہیں ہے؟!
کلی کلی میں وہ چھپ گئے تھے کہ پردہ ہی پردہ در نہیں ہے
انھیں بہاروں میں کھو گیا ہوں کچھ اور مجھکو خبر نہیں ہے
نظر اُٹھاؤں تو کیا اُٹھاؤں کہ مجھ میں تابِ نظر نہیں ہے
انھیں کی ساری عنایتیں ہیں کچھ اور مجھکو خبر نہیں ہے

گئی نہ محرومیوں کی اُلجھن مٹا نہ ارمان زندگی میں
نصیب اُنکا ہے قرب لیکن، ہنوز اُلجھن ہے دوریوں کی
نقاب رنگیں، شباب میگوں، ہزار جلوے ہزار افسوں
بہار اُسکی، اُسی کا دامن، نسیم اُسکی اُسی کا گلشن
گلوں سے مستی اُبل رہی ہے شراب نکہت اُچھل رہی ہے
بکھر نہ جائیں تمام جلوے، چھلک نہ جائے تمام صہبا

مآلِ رازِ طلب بھی شاید حریفِ اُلفت ہے عاشقی میں؟
"نشاطِ بے حد" کے تذکرے کیا؟ دلِ ستم کش کی بیکلی میں
عجب تھی حسنِ صنم کی صورت جو میں نے دیکھی تھی میکشی میں
جمال جسکا چھلک رہا ہے چمن چمن میں کلی کلی میں
ہزاروں نغمے تڑپ رہے ہیں نگاہ بلبل کی خامشی میں
ہلاک مستی بنا رہے ہیں، مچل مچل کر ہنسی ہنسی میں

حافظ غازیپوری

میں

میں کیا ہوں کیا نہیں ہوں خدا جانتا ہے خوب صرف خلش ہوں یا خلشِ روزگار ہوں
اک نقش آرزو ہوں کہ نقاشِ آرزو؟ صورت گر خیال ہوں فطرت نگار ہوں؟
یا ہوں فریب خوردۂ فردائے زندگی؟ یا خود ہی ایک وعدۂ نا استوار ہوں؟
میں اک نوائے سازِ لب خونچکاں ہوں یا؟ ناگفتہ داستان شب انتظار ہوں؟
یا ہوں زبان رازِ شبستانِ خامشی؟ یا ناتمامیٔ نفس شعلہ بار ہوں؟
بس مختصر یہ ہے کہ حزیں خراب ہوں! غم آشنا دکھے ہوئے دل کی پکار ہوں!
لذت کش بلا ہوں مصیبت کش فراق منت کش درازیٔ شبہائے تار ہوں،
اک مہر بے بسی ہوں بساط حیات پر مجبور ہوں ستم زدۂ روزگار ہوں

فانوس کائنات میں تصویر آرزو
یعنی فریب خوردۂ لیل و نہار ہوں

حزیں

شاعر کی رات

جب شام کو حسنِ صبح کا عالم ایک فسانہ بنتا ہے
جب شوخ ستارے ہنستے ہیں اور نور کی بارش ہوتی ہے
جب عیش کی موجیں ہستی کو جھولے میں جھلانے آتی ہیں
کچھ نیند سی طاری ہوتی ہے میں کیف میں ڈوبا ہوتا ہوں
احساس میں کچھ مدہوشی سی محسوس و نمایاں ہوتی ہے
بجلی سی چمکتی ہوتی ہے، پر نور نگاہیں ہوتی ہیں
تم میری نظر کے دامن میں انگڑائیاں لیکر سوتے ہو

جب چاند کی ضو سے زیر سما پُر نور خزانہ بنتا ہے
جب حسن کی سارے عالم میں آنکھوں سے پرستش ہوتی ہے
جب نیند کی پریاں دنیا کو چپکے سے سُلانے آتی ہیں
معلوم نہیں اس عالم میں میں جاگتا ہوں یا سوتا ہوں
انفاس میں کچھ سرگوشی سی محسوس و نمایاں ہوتی ہے
جذبات میں جنبش ہوتی ہے مسحور نگاہیں ہوتی ہیں
تم سانس کہیں بھی لیتے ہو محسوس مجھے تم ہوتے ہو

فطرت واسطی

محسوسات

شوریدہ سری وابستہ ہی اجزائے حیات فانی سے
تکمیل عمل کی خواہش میں انجام نظر آتا ہی نہیں
برباد سکوں کی ہر خواہش تعجیل کی خواہاں ہوتی ہی
امید کا ہر روشن پہلو ظلمات کا حامی ہوتا ہی
نیرنگِ ستم، احساسِ الم، اپنی ہی نظر کا دھوکا ہے
اسباب تعیش پیدا ہیں ہر لحظہ حوادث گاہوں سے

تزئینِ جمالِ گیتی ہے ہر کیفیت انسانی سے
احساس سکوں کی منزل میں تسکین الم پاتا ہی نہیں
تعجیل نوائی دنیا میں تخریب بداماں ہوتی ہے
اسے ولولے ابھار ناکامی کا رنگ دوامی ہوتا ہی!
ہر لذتِ امکاں "باقی" ہے ہر سانس مسرت افزا ہی
انسان اگر بد ذوق نہ ہو دنیائے عمل کی راہوں سے

انسان بھٹک جاتا ہی خود اعمال کی بے پروائی سے
ذروں کی سبک رفتاری بھی تحریک کی حامل ہوتی ہی
ایامِ بہارِ رفتہ کی ہلکی سی جھلک تعمیری ہے!؟
ہر تابشِ امکاں باقی ہی ہر کاوشِ ہستی فانی ہی

منزل کا نشاں ملتا ہی ورنہ حوصلہ کی پسپائی سے
یا محفلِ رقص و جوش والم پروانہ پہ مائل ہوتی ہے
فطرت کے نظارے تخریبی ہیں اور جھلک تعمیری ہی!؟
نغموں سے تلاطم پیدا ہی تمہیدِ نظر "حیرانی" ہے!

شمیم نعمانی نیازی

حدیثِ حسن

مصورِ جذبات جناب فطرت واسطی کی پچاس ولولہ انگیز اور سحر اثر نظموں کا مجموعہ ہے جسکی ہر نظم محبت کے لطیف جذبات کی آئینہ دار۔ لطفِ زبان سے رنگین۔ حسنِ تخیل سے مزین۔ ندرت بیان میں معجز نما، اور رومانی شاعری کا شاہکار ہے حدیثِ حسن کی تقریباً نصف نظمیں، نگار، شاہکار، زمانہ، اور دوسرے مشاہیر رسالوں میں شائع ہو کر خراج تحسین اور غیر فانی شہرت حاصل کر چکے ہیں ــــ اس مجموعہ میں رئیس التحریر حضرت نیاز فتحپوری کی تقریظ کے علاوہ ملک کے دو مایۂ ناز ادیبوں کے فاضلانہ مقدمات شامل ہیں۔ حدیثِ حسن ۱۱۲ صفحات میں۔ دو تصاویر۔ بہترین کتابت۔ کلکتہ کی بنی ہوئی خوشنما جلد اور غیر معمولی آب و تاب کے ساتھ بتیس پونڈ کے چکنے کاغذ پر زیورِ طبع سے آراستہ ہی۔ اور باوجود ان محاسن صوری و معنوی کے قیمت صرف ایک روپیہ (عـہ) علاوہ محصول ہے ــــ الملعن: منیجر رسالہ شاہکار گورکھپور (یو۔پی)

اہتمام سرسری اطلاعنامہ بنام دائنان

(دفعہ ۸۴ ایکٹ نمبر ۵ سنہ ۱۹۲۰ء)

بعدالت جناب مولوی احمد کریم صاحب بار ایٹ لا جج خفیفہ لکھنؤ

درخواست دیوالیہ نمبر ۲۷ سنہ ۱۹۳۵ء

بمقدمہ قرار دئے جانے دیوالیہ مسمیان (۱) موتی ولد دُتی (۲) مساۃ لچھمن زوجہ موتی اقوام مہتر ساکنان گڈھیا چار باغ لکھنؤ

بنام

۱- گیا پرشاد } پسران لچھمن داس ساکن رستوگی ٹولہ لکھنؤ
۲- بلدیو سہائے }
۳- لالہ مشری ساکن رستوگی ٹولہ شہر لکھنؤ
۴- گنگا دھر رستوگی ساکن بازار راجہ شہر لکھنؤ
۵- منا ولد مشہری ساکن رستوگی ٹولہ شہر لکھنؤ
۶- تانک سنگھ قوم سکھ ساکن آریہ نگر لکھنؤ
۷- ملک اللہ لبایا ساکن گھسیاری منڈی لکھنؤ
۸- آغا شاہ محمد خاں کابلی ساکن امین گنج لکھنؤ
۹- بنواری لال ساکن رستوگی ٹولہ شہر لکھنؤ
۱۰- موہن مہراج ولد نامعلوم ساکن چتواپور بھویاں عقب چوکی پولیس لکھنؤ
۱۱- گینڈے ساکن تکیہ پیر جلیل لکھنؤ
۱۲- محمود ولد نادر خاں ساکن مولوی گنج لکھنؤ
۱۳- آغا حبیب اللہ ولد نامعلوم ساکن ناکہ عیش باغ لال اسکول بنواری جی لکھنؤ
۱۴- گوکل داس رستوگی ساکن رستوگی ٹولہ لکھنؤ
۱۵- درگا ولد نامعلوم ساکن ناکہ ہنڈولہ شہر لکھنؤ۔

اطلاع دی جاتی ہے کہ بتاریخ ۲۵ ماہ مئی سنہ ۱۹۳۵ء مدیون مذکور الصدر نے ایک قطعہ درخواست اس عدالت میں بدیں غرض پیش کی ہے کہ وہ دیوالیہ قرار دیا جاوے اور یہ کہ بتاریخ ۳۰ ماہ مئی سنہ ۱۹۳۵ء عدالت ہذا نے اس امر کا اطمینان کرکے کہ مدیون کی جائداد مبلغ پانچ سو روپیہ سے زائد نہ ہوگی ہدایت کی ہے کہ مدیون کی جائداد کا اہتمام سرسری طریقہ پر کیا جاوے اور تاریخ تیس ماہ اگست سنہ ۱۹۳۵ء بنا بر مزید سماعت درخواست و اظہار مدیون مذکور مقرر کی ہے۔ اس امر کی بھی اطلاع دی جاتی ہے کہ عدالت تاریخ مذکور الصدر پر تصفیہ و تقسیم جائداد مدیون مذکور کی فوراً کارروائی شروع کر سکتی ہے۔ تم کو اختیار ہے کہ تم حاضر ہو کر اس تاریخ پر ثبوت دو۔ ثبوت کسی دعوے کا جو تم کرنا چاہو تاریخ مذکور پر یا اُس کے قبل داخل عدالت کرنا لازمی ہوگا۔

میرے دستخط اور مہر عدالت سے آج بتاریخ ۱۷ ماہ اگست سنہ ۱۹۳۵ء جاری کیا گیا۔

بحکم عدالت
بشمبر دیال منصرم
عدالت جج خفیفہ لکھنؤ

وقت حاضری عدالت دس بجے سے چار بجے تک

اصحاب کہف

(ڈراما)
اڈیٹر نگار کے قلم سے

تمام وہ حضرات جن کا نام ۳۱ جنوری ۱۹۳۶ء کو رجسٹر خریداران میں مندرج پایا جائیگا
صرف بارہ آنے کے ٹکٹ موصول ہونے پر حاصل کر سکتے ہیں۔
مینجر

نگار

جلد ۲۸	فہرست مضامین اکتوبر ۱۹۳۵ء	شمارہ ۴

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۲۸	اکتوبر ۳۵ء	شمارہ ۴

ملاحظات

دارالعلوم دیوبند کے رسالۂ قاسم العلوم کی جاہلانہ ذہنیت

ذات نبوی کی ناقابل برداشت توہین

اور

احادیث پر ایمان رکھنے والوں کا مضحکہ خیز اسلام

آج اگر آپ کسی مسلمان کے سامنے دارالعلوم دیوبند کا نام لے دیجئے تو وہ تقریباً اسی جذبۂ تقدس و احترام کو محسوس کرنے پر مجبور ہوگا جو "حرمین" کا نام سنکر اس کے اندر پیدا ہوتا ہے، اگر کسی سے یہ کہدیجئے کہ فلاں مسئلہ میں علماء دیوبند نے یہ رائے ظاہر کی ہے تو وہ اس کی صداقت پر اس طرح ایمان لائے گا گویا کہ خود روح القدس نے براہ راست اس سے گفتگو کی ہے اور اگر کسی فتوے پر وہاں کے واقفان شریعت نے مُہر ثبت کر دی ہے تو اسکے معنے یہ ہوتے ہیں کہ آفتاب کے طلوع و غروب سے انکار ممکن ہے لیکن اس سے انحراف کسی طرح ممکن نہیں کیوں؟- اس لئے کہ دیوبند علم الحدیث کا گہوارہ، اقوال رسول کے ضبط و حفظ کا زبردست ادارہ اور خصائص نبو

کی تعیین کا نہایت معتمد علیہ دائرۃ المعارف ہے۔

یہ ہے وہ رسوخ اعتقاد دارالعلوم دیوبند اور وہاں کے علماء کرام کے متعلق جس میں نہ صرف عوام بلکہ ہمارے خواص بھی مبتلا نظر آتے ہیں۔ لیکن آئیے آج کی صحبت میں ہم آپ کو بتائیں کہ یہاں کے محدثین عظام خصائص نبوی کا کتنا گہرا علم رکھتے ہیں اور مذہب اسلام کے ساتھ اُن کا کیا سلوک ہے۔

وہ حضرات جو دارالعلوم دیوبند کے نام سے آگاہ ہیں وہ اس حقیقت سے بھی واقف ہوں گے کہ اس ادارہ کی طرف سے ایک رسالہ بھی شائع ہوتا ہے جو اپنی مذہبی تحقیق اور دینی خدمت کے لحاظ سے پرستاران دیوبند کے نزدیک صحیفۂ مقدس کی حیثیت رکھتا ہے، اس کا نام "قاسم العلوم" ہے۔

افسوس ہے کہ یہ رسالہ میرے پاس نہیں آتا اور اس لئے مجھے نہیں معلوم کہ اسوقت تک وہ تحقیق علمی کے کتنے دریا بہا چکا ہے۔ مجھے اس جریدہ کے وجود کا علم رسالہ بلاغ امرتسر کے ذریعہ سے ہوا جس نے اپنی ماہ ستمبر کی اشاعت میں اس کی ایک عبارت نقل کرکے بے اختیارانہ مجھے ان سطور کے لکھنے پر مجبور کر دیا۔

قاسم العلوم کے جس پرچہ سے یہ عبارت نقل کی گئی ہے وہ جمادی الاولی ۱۳۵۴ھ کا پرچہ ہے جس میں رسول اللہ کی تعدد ازدواج پر بحث کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے کہ:-

> "ہم ناظرین کو پھر ایک اہم بات کی طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں۔ صحیح حدیث میں موجود ہے کہ حضرت انس نے جب یہ بیان کیا کہ ایک شب میں آپ نے تمام موجودہ ازواج کے ساتھ ہمبستری فرمائی تو لوگوں نے تعجب سے پوچھا کہ اتنی طاقت جناب رسول میں موجود تھی۔ اس پر حضرت انس نے فرمایا کہ ہم لوگ آپس میں اُس زمانہ میں گفتگو کیا کرتے تھے کہ آنحضرت کو چالیس مردوں کی قوت باہ عطا کی گئی ہے۔ یہ قول حضرت انس کا نہایت صحیح اور قوی معلوم ہوتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اس آخری عمر میں اس قدر موانع کے موجود ہوتے ہوئے آپ کو روزانہ ایک زوجہ سے ہمبستری کی طاقت نہیں ہو سکتی تھی چہ جائیکہ نو عورتوں سے ایک شب میں ہمبستر ہوں۔ اب اس سے اندازہ کرنا چاہئے کہ جبکہ امت کے ہر ایک مرد کو چار عورتوں نکاح کرنا جایز ہے تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک سو ساٹھ عورتوں کے سنبھالنے کی قوت ہونی چاہئے۔
>
> ہم ناظرین کو اس کے بعد ایک اور ضروری بات یاد دلانا چاہتے ہیں۔ علامۂ سیوطی خصائص کبریٰ میں حضرت انس کا منقولہ مذکورہ بصدر نقل فرماتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جن چالیس مردوں کی قوت باہ آپ کو دی گئی تھی وہ اس دنیا کے مرد نہیں بلکہ جنت کے چالیس مردوں کی قوت آپ کو دی گئی تھی اور چونکہ احادیث صحیحین سے یہ بات دکھائی گئی ہے کہ جنت میں ہر مرد کو دنیا کے سو مردوں کی قوت

دی جائے گی اس لئے آنحضرت علیہ السلام میں دنیا کے چار ہزار مردوں کی قوت ہونی چاہئے۔ اس لحاظ سے بقاعدہ چار ازواج چاہئے کہ آپ کو ۱۶ ہزار ازواج کی اجازت دیجائے اور آپ میں اتنی ہی ازواج کی قوت موجود ہونی چاہئے۔ (قاسم العلوم جمادی الاول ۱۳۵۴ھ)

رسول اللہ کی کثرت ازواج کا مسئلہ ہمیشہ غیر مسلموں کی توجہ کا مرکز رہا ہے اور انھوں نے ذات نبوی پر ہمیشہ شہوت پرستی کا الزام قائم کرنے کی کوشش کی۔ اس کا جواب اہل علم کی طرف سے ہمیشہ یہی دیا گیا کہ رسول اللہ کا متعدد شادیاں کرنا کسی جذبۂ شہوانی کی بنا پر نہ تھا بلکہ صرف اُسوقت کے سیاسی و معاشری حالات کے اقتضاء سے تھا۔ لیکن علوم اسلامی کے مرکز، دارالعلوم دیوبند کے صحیفۂ "قاسم العلوم" کے ذریعہ سے یہ حقیقت آج بالکل پہلی مرتبہ واضح ہوتی ہو کہ رسول اللہ کا گنتی کی چند شادیاں کرنا، حقیقتاً آپ کا انتہائی ضبطِ نفس تھا، ورنہ آپ کے جذبۂ شہوانی کا اقتضاء تو یہ تھا کہ آپ سولہ ہزار عورتوں سے بھی شادی کرتے تو کم تھا ۔۔۔ خوشا رعایتِ ذوق!

اس مسئلہ پر اسوقت تک جو کچھ لکھا گیا وہ اُس عہد کی معاشرت و سیاسیات کو سامنے رکھ کر لکھا گیا تھا رسول اللہ کے غیر معمولی بلند اخلاق کو سامنے رکھ کر لکھا گیا تھا، لیکن چونکہ دیوبند کو تمام علوم کے مرکز ہونے کا فخر حاصل ہے اس لئے کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ عہد حاضر کے تازہ ترین علم "شہوانیات" (Sexology) کو نظر انداز کر جاتا اور اس کے اُصول کو سامنے رکھ کر رسول اللہ کے تعدد ازدواج کا استحسان ایک نہایت معتبر حدیث کے ذریعہ سے ثابت کرنے کی کوشش نہ کرتا۔

ایک بار پھر قاسم العلوم کی عبارت کو پڑھئے اور درود بھیجئے اُن علماء کرام پر جن کی وساطت سے سالہا سال کی پڑی ہوئی گتھی اس طرح آسانی سے سلجھ گئی ۔۔۔ اس سے قبل تو غیر مسلم کہہ سکتے تھے کہ رسول اللہ کی کثرت ازدواج کو جائز ثابت کرنے کے لئے معاشرت و سیاست کی بحثیں چھیڑنا صرف بہانہ ہے، محض تاویل ہے۔ لیکن اب تو انکو سوائے دم بخود رہجانے کے کچھ چارہ ہی نہیں کیونکہ اتنی غیر معمولی قوت رکھنے کے بعد ان کا متعدد شادیوں پر مجبور ہو جانا بالکل فطری مجبوری تھی اور اس پر معترض ہونا گویا فطرت پر اعتراض کرنا ہے ۔۔۔ یہ ہے وہ کھلا ہوا نتیجہ جو قاسم العلوم کی پیش کردہ حدیث سے نکلتا ہے ۔۔۔ واشہد باللہ انی بریٌ مما تشرکون ۔۔۔

آج بھی مسلمانوں کے مذہبی جوش کا یہ عالم ہے کہ اگر ان کے اکابر کا ذکر نامناسب الفاظ میں کیا جاتا ہے تو وہ جان لینے اور جان دینے کی پرواہ بھی نہیں کرتے، چنانچہ گزشتہ چند سال کے اندر اس قسم کے متعدد واقعات پیش آچکے ہیں، لیکن افسوس ہے کہ ان کی نگاہیں اس باب میں لیکھ رام اور راجپال ہی کی طرف پڑتی ہیں اور وہ خود اپنی جماعت کے اُن افراد کو نظر انداز کر جاتے ہیں جو حقیقتاً بانی ہیں رسول اللہ کی توہین کے۔

یہ حقیقت پوشیدہ نہ رہنا چاہئے کہ آریہ اور عیسائی جماعت کے اعتراضات اسلام و بانی اسلام پر وہی ہیں جو

خود مسلمانوں کی روایات مذہبی اور کتب احادیث سے مستنبط ہوتے ہیں اور اگر کوئی فرق ہوتا ہے تو صرف الفاظ و انداز تحریر کا۔ مثلاً آپ اسی حدیث کو لیجئے کہ اگر کوئی آریہ حضرت انس اور علامۂ سیوطی کا حوالہ دئے بغیر یہ لکھدے کہ "مسلمانوں کے رسول اسقدر پرشہوت تھے کہ جب تک وہ ہر رات نو عورتوں سے ہمبستر نہ ہو لیتے اُن کی تسکین نہ ہوتی" تو ایک ہنگامہ بپا ہو جاتا، لیکن چونکہ بہ تبدیل الفاظ بالکل یہی بات دیوبند کے رسالہ میں شائع ہوتی ہے اور حدیث کی صورت میں جس کے راوی حضرت انس اور مفسر علامۂ سیوطی ہیں، اس لئے مسلمانوں کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی اور یہ "زہر" "نوشِ جاں" بن کر رہ گیا ہے۔ یہ ہے ہماری کورانہ تقلید کا عالم اور یہ ہے وہ بلا جو احادیث کی بدولت اسلام پر مسلط ہوئی ہے — ہوسکتا ہے کہ اسلام کے اُصول بدل جائیں، ممکن ہے کہ رسول اللہ کے اخلاق وہ نہ رہیں جو ایک رسول کے ہونے چاہئیں، لیکن یہ ممکن نہیں کہ حضرت ابوہریرہ اور جناب انس کے متعلق ایک لمحہ کے لئے بھی کذب و مبالغہ کا گمان ہو سکے۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء کی حالتِ زار

جب کوئی قوم انحطاط کی منزل سے گزرتی ہے تو اسکی قومیت کے عناصر، اس کی اجتماعیت کے اُصول، اسکے ادارہائے علم و تہذیب سب درہم برہم ہو جاتے ہیں۔ ہندوستان کے مسلمان چونکہ آج کل اسی منزل سے گزر رہے ہیں اس لئے اگر اُن کے ہر نظام میں اختلال و اضمحلال نظر آتا ہے تو حیرت کی کیا بات ہے؟

دارالعلوم ندوہ اپنی عمر، اپنے مقاصد کے لحاظ سے کافی شہرت حاصل کر چکا ہے، (گو اعمال و نتائج سے اس کی تصدیق نہ ہوتی ہو) اور مذہبی و علمی درسگاہ ہونے کی حیثیت سے بھی کافی مشہور ہے (گو اُسکی مذہبی تعلیم احادیث پرستی اور علمی سرگرمی قدماء کی گورکنی سے آگے نہ بڑھی ہو) لیکن ملک کے عام ذہنی انقلاب سے وہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا اور وہی دارالعلوم ندوہ جس میں کسی وقت طلبہ کی کثرت سے چہل پہل نظر آتی تھی اب زیادہ سے زیادہ سو، سوا سو طالب علموں کی تربیت کا ذمہ دار ہے۔ مسلمانوں کی آٹھ کروڑ آبادی کو دیکھئے اور اس تعداد کو۔ ممکن ہے ارباب ندوہ محسوس نہ کریں، لیکن حقیقتاً اس سے زیادہ شرمناک بات اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ جس ادارۂ تعلیم کے قیام کو تقریباً پچاس سال ہو چکے ہوں اور جس کے لئے ہندوستان کے مسلمانوں سے بلا مبالغہ اسوقت تک لاکھوں روپیہ وصول کیا گیا ہو اس کی بے بضاعتی اور اس کے ناکارہ ہونے کا یہ عالم ہو کہ زیادہ سے زیادہ اوسط طلبہ کا سو سے آگے نہ بڑھے اور جب امتحان ہو تو سب سے اونچے درجے میں ایک طالب علم بھی کامیاب نہ ہو سکے[1]

---

[1] ۱۹۳۴ء میں امتحان سالانہ کا نتیجہ ملاحظہ ہو:۔ درجہ اول میں کُل ۱۱ طالب علم تھے جن میں صرف سات شریک ہوئے اور دوم

اس وقت میں اس مسئلہ پر گفتگو کرنا نہیں چاہتا کہ وہاں کی تعلیم کس حد تک بے نتیجہ ہے یا یہ کہ وہاں کے نصاب میں کتنی فرسودگی و قدامت پرستی پائی جاتی ہے کیونکہ یہ داستان جتنی دردناک ہے اتنی ہی طویل بھی ہے۔ بلکہ اسوقت پیش نظر صرف وہاں کے نظام و اہتمام کی ابتری ہے، جن کا ذکر ندوہ کی چار دیواری سے گزر کر (باوجود انتہائی کوشش کے) لوگوں کی زبانوں پر اور اخباروں کے صفحات پر بھی آجاتا ہے، چنانچہ حال ہی کی بات ہے کہ وہاں کے ارکان اہتمام نے تین طلبہ کو بعض ایسی شکایتوں پر جن کے لئے ان کے پاس معقول عذر تھے مدرسہ سے نکال دیا اور جب تک عام اسٹرایک کی صورت پیدا ہو کر مقامی اخبارات میں اس کا چرچا شروع نہ ہوا، ان کو دوبارہ داخل ہونے کی اجازت نہ دی گئی۔

چونکہ دارالعلوم ندوہ میں اکثر و بیشتر طلبہ باہر کے ہیں اس لئے وہ دارالاقامہ میں رہتے ہیں اور انکی زندگی کے تمام مشاغل کا مرکز وہیں کی سرزمین ہے۔ ایسی صورت میں جب تک ارکان اہتمام و طلبہ میں باہم گہرا اعتماد کی کیفیت پیدا نہ ہو، تعلقات کبھی خوشگوار نہیں رہ سکتے اور نہ انتظام میں استواری پیدا ہو سکتی ہے۔

ظاہر ہے کہ دارالعلوم ندوہ کے طلبہ مکتب کے بچے تو ہیں نہیں کہ آپ کان پکڑ کے "دسلے بزندش" کے اصول پر اُن سے کام لے سکیں، وہ نوجوان طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں، سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت ان میں موجود ہے۔ غیرت و خودداری کا احساس بھی رکھتے ہیں اس لئے ان کی تعلیم و تربیت کے لئے سختی و تشدد درکار نہیں بلکہ نفسیات شناسی اور حکمت عمل کی ضرورت ہے۔ اور اگر یہ صحیح ہے کہ وہاں کے ارکان اہتمام غیر معمولی ناجائز سختی سے کام لیتے ہیں (جیسا کہ بعض باتوں سے ثابت بھی ہوتا ہے) تو ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ انھوں نے حد درجہ غیر دانشمندانہ اصول اختیار کیا ہے۔

ایک عام شکایت یہ ہے کہ جب سے جدید ارکان اہتمام آئے ہیں، جرمانوں کی کثرت ہو گئی ہے اور یہ طلبہ کو ناگوار ہونا چاہئے، نہ صرف اس لئے کہ ان میں سے اکثر جرمانہ ادا کرنے کے ناقابل ہوں گے، بلکہ اس بناء پر بھی کہ اس کا اخلاق پر بہت خراب اثر پڑتا ہے اور اسی لئے شرعاً تعزیر بالمال جایز نہیں۔ حیرت ہے کہ ارباب ندوہ نے جو ہر بات کو خالص شریعت اسلامی کے نقطۂ نگاہ سے دیکھنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے کیونکر ایسی

۵۴- تین پاس۔ درجۂ دوم میں چودہ طالب علم اور پانچ کامیاب۔ درجۂ سوم میں بارہ طالب علم اور چار کامیاب۔ درجۂ چہارم کے سترہ طلبہ میں صرف چھ کامیاب۔ درجۂ پنجم کے نو طلبہ میں پانچ کامیاب۔ درجۂ ششم میں سولہ طلبہ اور صرف دو کامیاب۔ ہفتم میں کُل چار طالب علم، کامیاب کوئی نہیں، ہشتم میں نو طلبہ اور چار کامیاب۔ نہم میں چونکہ کوئی کامیاب نہیں ہوا اس لئے اس کا نتیجہ بھی رجسٹر میں درج نہیں کیا گیا۔

غیر شرعی تعزیر کو جاری کرنا پسند کیا۔

ہم کو ماہ اگست ۳۵ء کے جرمانوں کی جو فہرست موصول ہوئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ایک مہینہ میں طلبہ پر دو پیسے سے لیکر ۱ؔ؎ تک تعزیر جرمانہ جاری ہوئی اور اس طرح تقریباً سترہ روپیہ کا مطالبہ عاید کیا گیا۔ (وصولی کا حال معلوم نہیں)

یقیناً ایک دارالعلوم کے لئے سترہ روپیہ ماہوار جرمانہ کوئی ایسی بڑی رقم نہیں ہے لیکن جس وقت ہم یہ دیکھتے ہیں کہ سو، سوا سو طالب علموں میں سے ستر[1] طالب علم جرمانہ کے مستحق سمجھے گئے تو اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ یا تو سوء اتفاق سے امسال طلبہ ہی میں حد درجہ سرکشی پیدا ہو گئی ہے، یا یہ کہ دارالعلوم کا نظم و اہتمام ناقص ہے اور وہ طلبہ پر کوئی اقتدار قائم نہیں کر سکا۔

مہتمم دارالاقامہ یا دارالاقامہ کے محرر کی طرف سے جو احکام اس دوران میں طلبہ کے نام جاری ہوئے ہیں، ان میں سے خاص خاص یہ ہیں:۔

۱۔۔۔ داڑھی نہ منڈوائی جائے۔

۲۔۔۔ انگریزی وضع کے بال نہ رکھے جائیں۔

۳۔۔۔ نماز باجماعت ادا کی جائے۔

۴۔۔۔ صبح کی نماز کے بعد فوراً ورزش گاہ میں پہونچا جائے۔

۵۔۔۔ ۷½ بجے شام کے بعد سے مطالعہ شروع کر دیا جائے۔

۶۔۔۔ بغیر اجازت نامہ کے دارالاقامہ نہ چھوڑا جائے۔

ان احکام میں (سوائے اس حکم کے جو داڑھی اور بال سے تعلق رکھتا ہے) کوئی حکم ایسا نہیں ہے جسے بے محل یا ناجایز قرار دیا جائے، اور اگر طلبہ ان کی پابندی نہیں کرتے تو اس کی وجہ صرف یہی ہو سکتی ہے کہ دارالاقامہ کے مہتمم یا وہاں کے کسی ایسے کارکن سے ان کو اختلاف ہے جو جرمانہ کی سختی سے اپنا استبداد قائم کرنا چاہتا ہے اور اپنی سیرت کے لحاظ سے اس قابل نہیں ہے کہ طلبہ پر کوئی اخلاقی دباؤ ڈال سکے۔

اس سے کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ نماز کا صحیح نتیجہ نماز باجماعت ہی سے حاصل ہو سکتا ہے، لیکن اگر طلبہ نے صرف تعزیر کے خوف سے اس کی پابندی کی تو بیکار ہے، ضرورت تو اس امر کی ہے کہ ان کی ذہنیت میں ایسا انقلاب

---

[1] درجہ وار جرمانہ کی تفصیل یہ ہے:۔

درجۂ اول۔ (۱۹ طلبہ)۔ درجۂ دوم (۵)۔ درجۂ سوم (۱۱)۔ درجۂ چہارم (۱۲)۔ درجۂ پنجم (۱۴)۔ درجۂ ششم (۷)۔ درجۂ ہفتم (۲)

پیدا کیا جائے کہ وہ نماز باجماعت کی اہمیت کو خود محسوس کرنے لگیں اور بغیر کسی جبر و تخویف کے اس کے پابند ہوجائیں یہی حال دیگر احکام کا بھی ہے کہ اگر جبر و تشدد کے خوف سے طلبہ نے ان کی پابندی کی بھی تو کیا نتیجہ ہے۔

ایک دار التعلیم کا اولین فرض طلبہ کے دماغ و ذہن کو متاثر کرنا ہے اور اگر وہاں کے ادارۂ نظم و اہتمام میں یہ صلاحیت نہیں ہے تو طلبہ کی سرکشی کے انسداد سے قبل یقیناً وہاں کے کانسٹی ٹیوشن کو بدلنے کی ضرورت ہے۔ دار العلوم ندوہ کی مجلس انتظامیہ کن افراد پر مشتمل ہے اور ان کی ذہنیت کیا ہے، یہ مسئلہ بھی بجائے خود بہت توجہ طلب ہے۔ لیکن اس گفتگو کو کسی دوسرے وقت پر ملتوی رکھتے ہوئے، اس وقت ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ ناظم دار العلوم (جو تنہا مقامی ذمہ دار ہستی تمام نظم و نسق کی ہے) کس حد تک اس انتشار کا جوابدہ ہے موجودہ ناظم (جناب ڈاکٹر عبد العلی صاحب) اس میں شک نہیں کہ اپنے اخلاق کے لحاظ سے نہایت برگزیدہ انسان ہیں، اس قدر برگزیدہ کہ ان کو دیکھتے ہی ایک شخص دستِ ارادت بڑھا دینے پر مجبور ہو سکتا ہے، اپنی نیک نفسی اور معصومیت کی حیثیت سے بھی وہ بلند مرتبہ رکھتے ہیں کہ اگر انسانوں کی جماعت میں کسی فرشتہ کی جستجو ہو تو لکھنؤ کی طرف سے ہم بلا تامل اُن کو پیش کر سکتے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ ایک ادارہ کے اہتمام کے لئے ہم کو ولی و فرشتہ کی ضرورت ہے یا ایک مصلحت بیں، دور اندیش، نفسیات داں ڈکٹیٹر کی جو اسی دنیا میں رکھکر اسی دُنیا کے اُصول کو سمجھے اور انھیں کے مطابق اپنے شخصی اثر سے کام لیکر ایک خاص دستور العمل پر عمل کرنے کے لئے لوگوں کو مجبور کر سکے۔

موجودہ ناظم ندوہ شہر کے کامیاب ڈاکٹروں میں سے ہیں اور ایک کامیاب ڈاکٹر کے معنی یہ ہیں کہ شب و روز میں کوئی ساعت اس کی اپنی نہیں ہے بلکہ مریضوں کی ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ وہ یوں بھی ندوہ کے کاموں پر پوری توجہ کرنے سے معذور ہیں اور مجبور ہیں کہ وہ اپنے ماتحت کارکنوں ہی کی آنکھوں سے سب کچھ دیکھیں اور انھیں کے کانوں سے سنیں۔

ایسے اداروں میں جن کی مالی حالت اچھی ہے، کسی اعزازی ناظم کا ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ ہمیشہ وہی شخص اہتمام کا ذمہ دار ہو سکتا ہے جو اپنا پورا وقت صرف کرے اور جس کو کافی معاوضہ دیا جائے۔ ایسی صورت میں کہ موجودہ ناظم نہ اپنا پورا وقت صرف کر سکتے ہیں اور نہ کوئی حق الخدمت ان کو ملتا ہے، ان سے بازپرس کی کوئی صورت نہیں اور زیادہ سے زیادہ ہم ان کی خدمت میں یہی اپیل کر سکتے ہیں کہ اگر وہ بھی واقعی اپنے آپ کو اس عظیم ذمہ داری لینے کا اہل نہیں سمجھتے تو ان کو چاہئے کہ وہ اس خدمت سے اپنی سبکدوشی کا اعلان کر دیں اور اس بدنامی سے بچیں جو بہ حیثیت ناظم ہونے کی اُن پر عاید ہوتی ہے۔

(بقیہ ملاحظات صفحہ ۷۶ پر ملاحظہ کیجئے)

نجوم کے بعض تاریخی وعلمی مباحث

اور

قصاید خاقانی میں منجمانہ اشارات

(مسلسل)

قبل اس کے کہ قصاید خاقانی کے ان اجزار پر روشنی ڈالی جائے جن میں شاعر نے منجمانہ اشارات کئے ہیں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ خود شاعر کے بعض نقوش زندگی پیش کر دئے جائیں۔

نام ونسب تذکرہ وتاریخ کی کتابیں تو خاقانی کے حالات سے بھری ہیں لیکن خود شاعر نے بھی قصاید میں اپنے بخ کے حالات درج کر دئے ہیں اس لئے ضروری ہے کہ تذکرہ نگاروں کی روایات لیتے ہوئے خود قصاید کے وہ اجزا بھی پیش کر دئے جائیں، جن میں شاعر نے اپنی زندگی کے اہم پہلوؤں کی طرف اشارے کئے ہیں

آپ کا نام افضل الدین ابراہیم اور کنیت ابو بدیل تھی، عرفی پہلے صیدی اور غالب اسد تخلص کرتے تھے اسی طرح خاقانی نے پہلے اپنا تخلص "حقایقی" رکھا تھا خاقان کبیر منوچہر شروان شاہ کی ملازمت کی تو حقایقی ترک کرکے "خاقانی" تخلص اختیار کیا اپنے نسب وحسب کے متعلق اس نے خود ہی چند قصیدوں میں تذکرہ کیا ہے خاقانی نے اپنے اعمال زندگی سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ انسان جس فضا میں بھی پیدا ہو اس کے لئے میدان ترقی موجود ہے ارادہ کی استواری، ذوق کی پاکیزگی اور سعی وطلب کی فراخ دامانی اس کو یقیناً پستی سے بلندی پر پہونچا کر رہے گی، شہر شروان میں ایک بڑھئی کے گھر میں پیدا ہوئے لیکن علم وفضل اور ہمت وحوصلہ نے آخر شاہی دربار میں زریں کرسی پر بٹھا دیا۔

چنانچہ عزیز الملک ابراہیم خاں خلیل لکھتے ہیں:-

بہ مرور ایام قربت و منادمت خاقانی در حضرت سلطانی بجائے رسید کہ در حضور کرسی طلا می نشست[1]

خاقانی کی زندگی ایک غریب اور غیر مشہور خاندان کے فرد کیلئے بہت کچھ سبق آموز ہے ہندوستان کے اندر اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ اول تو ایسے افراد جن کی پرورش و تربیت اس نوع کی پست فضا میں ہوئی ہو وہ اپنے اندر ابھرنے کا حوصلہ ہی نہیں رکھتے اور جو اتفاقاً ابھر جاتے ہیں وہ اپنا نسب نامہ افراسیاب یا ہلاکو و چنگیز تک پہونچا دیتے ہیں رفتہ رفتہ لوگ ان کی اصل کو بھول جاتے ہیں اور غیر آبا کی نسبت سے ایسے حضرات کو رسمی اعزاز و شہرت حاصل ہو جاتی ہے اس نوع کی ترقی در اصل قومی ترقی نہیں بلکہ انفرادی خود کامی ہے، جسکی عفونت ہماری ہیئت اجتماعیہ میں مہلک جراثیم پیدا کرتی جاتی ہے اگر ایسے افراد خود غرضانہ فراموش کاری سے کام نہ لیں تو ہماری قومی زندگی میں بہت سے آثار جمیل پیدا ہو سکتے ہیں دیکھئے خاقانی کی جرأت، اخلاق علم و فضل جاہ و ثروت، امارت و سیادت کے بعد نہ تو وہ ہاشمی بنا نہ قریشی بلکہ خود بہ بانگ دہل کہتا ہے:۔

از یکے سو چوں خلیل اللہ در دگر زادہ ام بود خواہر گیر عیسیٰ ما در ترسائے من

یعنی باپ کی طرف سے تو میں بڑھئی ہوں۔ لیکن اس سے کیا ہوتا ہے حضرت خلیل اللہ بھی تو آذر بت تراش کے بیٹے تھے، اسی طرح میری ماں ترسا (آتش پرست) تھی، لیکن اس سے کیا ہوتا ہے حضرت عیسیٰ کی منھ بولی (خواہر گیر) بہن بھی تو ترسا ہی تھی۔

ایک دوسرے قصیدہ میں لکھتا ہے:۔

شیخ مہندس لقب پیر درو گر علی کا ذرو اقلیدس اند عاجز برہان او

یوسف نجار کیست نوح درو گر کہ بود تا زہنر دم زنند بر در دوکان او

خاقانی نے صرف یہی اقرار نہیں کیا کہ ان کے باپ بڑھئی کا پیشہ کرتے تھے، بلکہ اپنے پیشہ کی شرافت اور اپنے باپ کی صناعانہ مہارت پر بھی زور دیتے ہیں مطلب یہ ہے کہ علی نجار اپنے پیشہ میں بہت بڑا کمال رکھتے ہیں ایسا کمال کہ آذر کی بت تراشی اور اقلیدس کی ریاضی دانی بھی اس کے سامنے ہیچ ہے، میرا باپ اتنا بڑا ماہر درودگر ہے کہ یوسف نجار (بی بی مریم کا منگیتر) اور حضرت نوح اپنی ملہمانہ فنی استعداد کے باوجود میرے باپ کی دوکان پر اس فن کے متعلق زبان نہیں ہلا سکتے۔

ولادت خاقانی کا وہ زمانہ تھا جبکہ خلافت بغداد پر زوال آچکا تھا ایک طرف اتابکان موصل کا اقتدار تھا، دوسری طرف سلجوقیہ اصفہان برسر عروج تھے، نورالدین محمود اور صلاح الدین ایوبی

---

[1] صحف ابراہیم

مشرق اور مغرب میں زور آزمائیاں کر رہے تھے، خلافت عباسیہ المستضئی بنور اللہ کے زیر نگین تھی یہی وجہ ہے کہ کلیات خاقانی کے اندر، خاقان کبیر منوچہر شروان شاہ، محمد بن ملکشاہ سلجوقی، اتابک مظفر الدین قزل ارسلان اور خلیفہ عباسی المستضئی کی مدح میں بھی قصیدے پائے جاتے ہیں۔

ہمارے پیش نظر اس وقت تذکرہ دولت شاہ سمرقندی، صحف ابراہیم مصنفہ عزیز الملک ابراہیم خاں خلیل، مجالس المومنین سید نور اللہ شوستری، روضۃ الصفا، تاریخ مظفری، نفحات الانس اور خلاصۃ الافکار ابوطالب اصفہانی ہیں جن میں خاقانی کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے، لیکن ان میں سے کسی کتاب میں خاقانی کی تاریخ ولادت مذکور نہیں محمد بن خوند شاہ نے سلطان سنجر کے ضمن میں خاقانی کا تذکرہ کیا ہے۔ انھوں نے پہلے قوم غزان پر سلطان سنجر کے عملہ کی زیادتیوں کا حال لکھا ہے پھر اس قوم کے خروج وطغیان کا تذکرہ ہے، سلطان سنجر کی گرفتاری، مرو کی تباہی اور خراسان کی تخریب کا نقشہ کھینچا ہے اسی ضمن میں فرماتے ہیں:۔

علما ومشایخ واکابر خراسان بہ تعذیب آں ملاعین گرفتار شدہ درجۂ شہادت یافتند از انجملہ محمد بن یحییٰ را کہ فاضل متقی وعالم متورع بود در شکنجۂ خاک ہلاک کردند خاقانی در شانش گوید

اس کے بعد مورخ موصوف نے خاقانی کے قصیدہ کے دو بیت نقل کئے ہیں:۔

در ملت محمد مرسل نداشت کس　　　فاضل تر از محمد یحییٰ فنائے خاک
آں کردہ روز تہلکہ دنداں فدائے سنگ　　　ایں کردہ گاہ قتل دہاں را فدائے خاک

غزوۂ تبوک میں آنحضرت کا دندان مبارک شہید ہو گیا تھا، اسی طرف اشارہ ہے یعنی احمد مجتبیٰ صلعم کا دندان مبارک تبوک کی لڑائی میں شہید ہوا تخریب خراسان کے دن محمد بن یحییٰ کا چہرہ خاک وخون میں آلودہ ہوا محمد بن خوند شاہ نے بس اسی قدر اقتباس پر ختم کیا ہے خاقانی نے اس قصیدہ میں محمد بن یحییٰ کی شخصیت پر اور بھی روشنی ڈالی ہے۔

گفتی کہ بے محمد یحییٰ بہ ماتم اند　　　از قبہ ثوابت تا منتہائے خاک
باعطرہائے روضۂ پاکش عجب مدار　　　کز طوبیٰ بہشت برآرد گیائے خاک

سنجر بہ سعی دولت او بود دولتے　　　باد از سیاستش شدہ مہر آزمائے خاک
بے فرّ او چہ سنجر وتعلیم سنجری　　　بے بادشاہ دیں چہ بود بادشائے خاک

اس سے پتہ چلتا ہے کہ خاقانی محمد بن یحییٰ کے معاصر تھے، محمد یحییٰ سلطان سنجر بن ملک شاہ سلجوقی کے

کے عہد میں گزرے ہیں اور چونکہ سلطان سنجر کی ولادت ۴۷۹ھ اور وفات ۵۵۲ھ میں ہوئی اس لئے خوند شاہ کی روایت کے مطابق خاقانی کے عہد سخن سنجی و طبع آزمائی کی تو تعیین ہوجاتی ہے لیکن اس سے ولادت کی تاریخ متعین نہیں ہو سکتی، خاقانی کی وفات کی تاریخ میں بھی اختلاف ہے، مولانا جامی نے گول مول لکھ دیا ہے۔

در زمان خلافت المستضئی بنور اللہ بودہ است و قصیدہ عربی کہ در مدح بغداد گفتہ ذکر وے کردہ و توفی المستضئی سنہ خمس و تسعین و خمسمایہ[1]

مولانا جامی نے خاقانی کے زمانہ کی تعیین اس کے عربی قصیدہ سے کی ہے جو اس نے بغداد کی تعریف میں کہی ہے، اور اس میں خلیفہ المستضئی بنور اللہ کا تذکرہ کیا ہے عربی قصیدہ کے علاوہ خاقانی نے فارسی میں بھی المستضئی کی مدح کی ہے۔ فرماتے ہیں:۔

من بہ بغداد و ہمہ آفاق خاقانی طلب　　　نام خاقانی طراز فخر خاقان آمدہ
مہدی آخر زماں المستضئی باللہ کہ ہست　　　خاک درگاہش بہشت عدن عدنان آمدہ

یہ فارسی قصیدہ بھی طویل ہے۔

جامی کی روایت سے پتہ چلتا ہے کہ ۵۹۵ھ میں المستضئی نے وفات پائی اس لئے گویا خاقانی کی وفات کا زمانہ بھی اسی کے لگ بھگ ہے خلیفہ المستضئی کی وفات کی تاریخ ۵۹۵ھ نہیں ہے، بلکہ ۵۷۵ھ ہے، "نفحات" کا ایک عمدہ قلمی نسخہ "پٹنہ اورینٹل لائبریری" میں ہے اس میں بھی ۵۹۵ھ ہی درج ہے نفحات میں بعض تاریخی غلطیاں موجود ہیں اس لئے کہا جا سکتا ہے مولانا جامی سے سہو ہوگیا، بہرحال جامی کی روایت سے بھی صرف اسی قدر پتہ چلتا ہے کہ خاقانی خلیفہ المستضئی کے معاصر تھے، اور اس لئے چھٹی صدی کے آخر میں انھوں نے بھی وفات کی ہوگی۔

عزیز الملک ابراہیم خاں خلیل اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں:۔

وفاتش بہ قول بعضی پانصد و ہشتاد و دو ہجری و بہ قول دولت شاہ پانصد و ہشتاد و ہشت است[2]

عزیز الملک کی یہ روایت صحیح نہیں کہ دولت شاہ سمرقندی نے وفات کی تاریخ ۵۸۸ھ لکھی ہے بلکہ انھوں نے بھی ۵۸۲ھ ہی لکھا ہے، اور یہی تاریخ صحیح معلوم ہوتی ہے ابوطالب اصفہانی وفات کی تاریخ ۵۹۵ھ بتاتے ہیں ان کو غالباً نفحات کی عبارت سے غلط فہمی پیدا ہوگئی۔

---

[1] نفحات الانس　　[2] صحف ابراہیم

ان تمام تاریخی واقعات کی موجودگی میں یہ تو پتہ چل جاتا ہے کہ خاقانی کس زمانہ میں پیدا ہوئے اور اس عہد میں کونسی علمی و سیاسی فضا تھی، لیکن پھر بھی ولادت کی صحیح تاریخ نہیں معلوم ہوئی، خاقانی نے اپنے مختلف قصاید و مراثی میں سنہ و تاریخ کے بعض اشارے کئے ہیں جن سے نتائج مترتب ہو سکتے ہیں امیر رشید کو جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:-

طویلہ بخشش سی و یک جواہر داشت　　نہادمش بہ بہائے ہزار و یک اسمار
بہ سال عمر از و بست و پنج بخریدم......

امیر رشید نے خاقانی کی تعریف میں ۳۱ ابیات کا ایک قصیدہ کہا تھا خاقانی کہتے ہیں ان ۳۱ ابیات میں سے پچیس بیت تو میں نے اپنی عمر کی مدت سے خرید کیا یعنی وہ اس وقت پچیس سال کے تھے، اور بقیہ چھ ابیات کی قیمت چھ دن (سنیچر اتوار وغیرہ) ہیں ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں:-

کاندر سنہ نون اختر سعد　　در طالع کامراں بہ بینم

"سنہ ثون" سے مطلب ۵۵۰ھ ہے یعنی مشتری ۵۵۰ھ میں برج اسد میں ہوگا۔

اس سلسلہ میں اور بھی ابیات ہیں جو اس عہد کے ایک فلکی حادثہ اور قران سبعہ سیارہ سے متعلق ہے جسکی تفصیل آگے آتی ہے اس بیت سے اتنا معلوم ہو جاتا ہے کہ ۵۵۰ھ میں وہ ۲۵ سال کے تھے، چونکہ بروایت صحیح انھوں نے ۵۸۲ھ میں وفات کی اس لئے نتیجہ نکلتا ہے کہ ان کی ولادت ۵۲۵ھ یا اسی کے لگ بھگ ہوئی، اور تقریباً ساٹھ سال کی عمر میں انھوں نے اس دار فانی سے کوچ کیا۔

وطن اپنے وطن اور مولد کے متعلق خود انھوں نے کہا ہے۔

پروردہ فقرم مشیمہ دست لطفم قابلہ　　خاک شرواں مولدم دارالادب منشائے من

یعنی شروان میں پیدا ہوئے، اور "دارالادب" میں پرورش پائی، اس عہد میں "دارالادب" کون سا شہر تھا؟ موصل، بغداد، اصفہان، تینوں شہر اس وقت مرجع افاضل تھے، خصوصاً بغداد کو زیادہ اہمیت حاصل تھی، ہر چند عباسیہ کی حکومت زوال پذیر تھی، ہاں سلجوقیہ کی بدولت اصفہان کا ستارہ اوج پر تھا، اور غالباً "دارالادب" سے "اصفہان" ہی مراد ہے اصفہان اور شیراز کو شروع ہی سے اہمیت حاصل ہے قرب وجوار اور دور دست مقامات سے اکثر طلبہ یہیں آکر تعلیم حاصل کرتے تھے، چنانچہ شیخ علی حزیں کا مولد "لاہجان" تھا لیکن انھوں نے اصفہان ہی میں پرورش پائی اور اسی رعایت سے اصفہانی مشہور ہیں، خاقانی کا مولد شروان ہے لیکن اس سے وہ بہت بیزار نظر آتے ہیں چند قصاید میں انھوں نے اپنے وطن اور یاران وطن کی مذمت کی ہے چنانچہ فرماتے ہیں

من شکستہ خاطر از شروانیان و زلفظ من　　خاک شرواں مومیائے بخش ایران آمدہ

اس میں شک نہیں ایران کے مشہور بلاد خراسان و اصفہان، شیراز و تبریز، کی طرح شروان کو بھی شہرۂ آفاق بنانے والا، یہی خاقانی تھا، لیکن خود شاعر اس سے شکستہ خاطر رہا یہی نہیں بلکہ ارباب وطن بھی ان سے آزردہ رہا کرتے تھے، خود کہتے ہیں:۔

قوت عرق عراق از مایۂ طبع من است　　　گرچہ شریان دل شروانیاں رانشترم

یعنی گو اہل شروان کی رگ (شریان) کے لئے میرا وجود نشتر ہے، لیکن عراق کی رگ کو میری طبع عالی سے قوت ہے۔

وطن اور ارباب وطن سے یہ بیزاری اس قدر بڑھی کہ شروان چمن خزاں رسیدہ کی طرح بالکل بے کیف اور بے آب و رنگ نظر آنے لگا، فرماتے ہیں۔

زاں پیشتر کاجل زجہاں وا رہاندش　　　از ننگ نحس خانہ شروانش وا رہاں

خیر یہ تو مختلف قصاید کے چند ابیات ہیں انھوں نے شروان کی مذمت میں مسلسل شعر کہے ہیں مگر اسی کے ساتھ بعض جگہ مصالحت کی بھی کوشش کی ہے اور حب وطنی کا ثبوت دیا ہے فرماتے ہیں:۔

فخر من یاد کرد شروان بہ　　　کہ مباہات خور بہ باختر است
لیک تبریز بہ اقامت را　　　کہ صدف قطب را بہی مقر است
ہم بہ مولد قرار نتواں کرد　　　کہ صدف حبس خانہ در راست
گرچہ تبریز شہرہ تر شہریست　　　لیک شروان شریف تر شہر است
خاک شروان مگو کہ آں شریست　　　کار شرواں بہ خیر مشتہر است
عیب شرواں مکن کہ خاقانی　　　ہست زاں شہر کا بتداش شر است
عیب شروان چرا کنی بدو حرف　　　کاول شرع و آخر بشر است

کسی چیز کی طرف سے دل میں مخالفانہ جذبات پیدا ہو جاتے ہیں تو پھر ہزار ظاہر دارانہ خلوص وارتباط کا اظہار کیجئے، اصل جذبہ آشکارا ہو ہی جائے گا وطن کی تعریف کر رہے ہیں لیکن چونکہ دل بیزار ہے اس لئے بے اختیارانہ مذمت میں بھی چند کلمات نکل پڑتے ہیں فرماتے ہیں کہ لفظ "شروان" کی ابتدا لفظ "شر" سے ہے اس لئے اس کا عیب بیان کرنا فضول ہے، حالانکہ اس نوع کے اظہار خیال کا یہ موقعہ نہ تھا۔

اب آیئے ذرا جستجو کی جائے کہ وہ کیا اسباب تھے جن کی بنا پر خاقانی کو وطن سے بیزاری تھی، اور اہل وطن بھی اس سے ناخوش تھے، شاعر کی نازک مزاجیاں مشہور ہیں۔ خاقانی اس سے مبرا نہ تھے، لیکن جنونیں کی طرح زود رنج اور غضب کوش بھی نہ تھے، معلوم ہوتا ہے کم سنی میں شعر و سخن کی ابتدارگی، اور

بہت جلد فروغ حاصل کرلیا اہل وطن کے لئے یہی ایک قابل رشک بات تھی، بالخصوص حریفوں سے دیکھا نہ گیا اس پر خود شاعر کی سخن گسترانہ طبع آزمائیاں مستزاد تھیں کشمکش شروع ہوئی عرفی کی طرح ارباب وطن نے ان کو بھی کچھ اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا شاعر تھے جوانی کے ولولے تھے، طبیعت میں زور تھا وطن کی ہجو لکھ ڈالی اب کیا تھا چاروں طرف سے ہنگامہ شروع ہوا، یہی وجہ ہے کہ قصاید میں خاقانی نے وطن سے بیزاری کا اظہار کیا ہے، اس سلسلہ میں مفصلہ ذیل ابیات قابل غور ہیں۔

زخاقانی ایں منطق الطیر بشنو کہ چوں او معانی سرائے نہ بینی

نسر د صاحب خراج بر سر عالم توئی بندہ بہ دور تو ہست شاعر صاحبقراں

ازیں قصیدہ کہ گفتم سخنوران جہاں بہ حیرت اند چو از منطق الطیر غراب
زہے تتمہ حسّان ثابت و اعشیٰ زہے نتیجہ سحبانِ وایل و عتاب

ایک نوجوان شاعر کی ان تعلی نوازیوں نے حاسدان وطن کو ابھارا وطنی شعرا میں ایک جماعت "روشنان" موجود تھی، انھوں نے "خاقانی تاریک" کا خطاب دیدیا، چنانچہ فرماتے ہیں:-

روشنان خاقانی تاریک خوانندم ولیک صافیم خواں چوں صفائے صوفیاں را چاکرم

وطنی شعرا کے لئے یہی کیا کم تھا کہ انھوں نے خود کو شاعر صاحبقراں کہا حسان بن ثابت (اسلامی شاعر) اور "اعشیٰ" کی شاعری کو انجام تک پہونچانے والا بتایا اپنے کلام کو سحبان بن وایل اور عتاب کی شاعری کا نچوڑ کہا لیکن اب شاعر نے خود زیادتی شروع کی، اور عرفی نے جس طرح ابوالفرج اور انوری سے اپنے کو بالاتر بتاکر ایرانیوں کو رنجیدہ کردیا اسی طرح خاقانی بھی سنائی جیسے صوفی شاعر اور معزی اور عنصری جیسے باکمال سخنوروں کو اپنے خیال میں نہ لائے، فرماتے ہیں:-

ازیں شعر خجلت رسد عنصری را دگر عنصری جان حسان نماند

ایران بہ تو شد حسرت غزنین و خراساں چوں گفتہ من رشک معزی و سنائی

ایں شعر ہر کہ بشنود از شاعران عصر زہرہ ز رشک صاحب انشا برافگند
گو عنصری کہ بشنود ایں شعر آبدار تا خاک بر دہان مجاز ا برافگند

"مجازا" ایک شاعر کا تخلص ہے جو خاقانی کا حریف اور دشمن تھا، ان ابیات کے علاوہ خاقانی کے قصاید میں تعلی کے اور بہت سے اشعار ہیں اور یہ سب اُن کے عہد شباب کی جولانی فکر کا نتیجہ ہیں۔

تعلیم وتربیت قصاید خاقانی کا مطالعہ کرنے کے بعد ہم کو اس کے تبحر علمیہ کا اعتراف کرنا پڑتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ منقولات اور معقولات کی تمام اصناف پر اس کو یکساں عبور تھا، علوم مذہبی کے علاوہ فلسفہ وتصوف تاریخ وخرافیات، موسیقی ونجوم وہ سب کچھ جانتا تھا خصوصاً نجوم وشاعری سے تو اس کو عشق تھا، ہرچند اس کا باپ ایک بڑھئی تھا اور کس کو توقع ہوسکتی تھی کہ علی نجار شروانی کے گھر میں خاقانی جیسا مہر درخشاں طلوع ہوگا جس کی شعاعیں نہ صرف ایران بلکہ ایک عالم کو خیرہ بنا دیں گی، یوں تو خاقانی نے فخریہ " ازپئے سوچوں خلیل اللہ در دگرزادہ ام" لکھا ہے، لیکن اس کے خاندان والے علوم و فنون میں سرعت کے ساتھ ترقی کر رہے تھے، چنانچہ اس کے چچا علامہ اجل اور حکیم بے بدل تھے، خاقانی نے ان کی وفات پر کئی دردانگیز مرثئے لکھے ہیں، ایک جگہ لکھتے ہیں:—

حیات بخشا در خامی سخن منگر — کہ سوختہ شدم از مرگ قدوۃ الحکما
شکستہ دل ترازاں ساغر بلورینم — کہ در میانہ خارا کنی زدست رہا
فروغ فکر وصفائے ضمیرم از عم بود — چوں عم بمرد بمرد آں ہمہ فروغ وصفا

ان ابیات سے معلوم ہوتا ہے خاقانی کے چچا کو "قدوۃ الحکما" کا لقب ملا تھا اور انھیں نے ابتداً خاقانی کی تعلیم وتربیت بھی کی تھی، دوسری جگہ فرماتے ہیں:—

کو آنکہ ولی نعمت من بود وعم من — عم چہ کہ پدر بود وخداوند بہر باب
آں فخر من مفتخر ماضی واسلاف — آں صدر من ومصدر مستقبل واعقاب
آں خاتمۂ کار مرا خاتم دولت — آں فاتحۂ طبع مرا فاتح ابواب
از دولت عم بود ہمہ مادت طبعم — آری نہ دماغ است ہمہ قوت اعصاب

ابیات بالا سے واضح ہوتا ہے کہ خاقانی نے ابتدائی تعلیم تو اپنے چچا سے حاصل کی ہی تھی، پہلے پہل مشق سخن بھی اس نے اپنے چچا ہی کے سامنے کی اسی طرح خاقانی نے چچا زاد بھائی خواجہ امام وحید الدین جن کی وفات پر شاعر نے پر درد مرثیہ لکھا جو اس کی اہلی زندگی کو بہت کچھ نمایاں کرتا ہے اس کے پڑھنے کے بعد ہمیں شیلی کا فاجعہ انگیز مرثیہ (Elegy) یاد آجاتا ہے،

تذکرہ نگاروں نے اس طرف توجہ نہیں کی ہے کہ ابتداً خاقانی کا مربی اور معلم کون تھا لیکن اس کے قصاید سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ اس کے چچا نے جو علامہ اور فیلسوف تھے، اس کی تربیت کی اور ابتداً

فنون شعری سے انھیں نے اس کو باخبر کیا خاقانی نے اپنے چچا کے علاوہ اپنے اور دو اُستادوں کا تذکرہ کیا ہے۔ ایک تو "فاضل سادی" اور دوسرے بہاؤالدین سعید بن احمد، اول الذکر ہیئت و منطق میں ید طولیٰ رکھتے تھے، اور معقولات میں خاقانی کے اُستاد تھے، فرماتے ہیں :۔

گنج فضایل افضل سادی شناس و بس — کز علم مطلق آیت دوران شناسمش

اُستاد حکمت من و شاگرد سکم دین — کز چند فن فلاطن یونان شناسمش

اسی طرح سعید بن احمد کے متعلق لکھتے ہیں :۔

کلیم طور مکارم اجل بہاؤ الدین — کہ مدح او ستا مسیحائے جان بیمارم

سزائے حمد و محامد سعید بن احمد — کہ خاک درگہش افزود آب بازارم

خاقانی کے تمام سوانح نگاروں نے اس کو ابوالعلاء گنجوی کا شاگرد بتایا ہے مگر کسی نے نہ تو اس کے ابتدائی معلم قدوۃ الحکما کا تذکرہ کیا جو اس کے چچا بھی تھے، اور نہ فاضل سادی اور سعید بن احمد کا حال لکھا مولانا جامی لکھتے ہیں :۔

ہر چند وے شاگرد فلکی شاعر است و بہ شعر شہرت تام یافتہ چنیں گویند کہ ویرا طور شعر طور دیگر بودہ است کہ شعر در جنب آں کم بودہ[1]۔

جامی کی روایت کے اس حصہ "وے را طور شعر طور دیگر بودہ" کی شرح آگے آتی ہے لیکن یہاں صرف فلکی سے بحث کی جاتی ہے جامی نے فلکی کو خاقانی کا اُستاد بتایا ہے حالانکہ عزیز الملک ابراہیم خان خلیل ابوالعلاء گنجوی کو خاقانی کا اُستاد بتاتے ہیں اور صاحب تاریخ مظفری کی روایت کے مطابق فلکی بھی ابوالعلاء گنجوی کا شاگرد تھا، فلکی شروانی پر انگریزی زبان میں حال ہی میں ایک کتاب ہندوستان کے ایک عالم نے لکھی ہے خاقانی نے اپنے قصائد میں اس قدر کثرت سے کیوں منجمانہ اشارات کئے ہیں اس کا جواب خود "فلکی" سے تخلص ہی بتا رہا ہے، کہ فلکی کو ہیئت و نجوم سے شغف تھا اسی کا اثر خاقانی پر پڑا، یا دونوں ہم مشق شاعروں میں ایک ہی اثرات کے ماتحت نجوم کا ذوق پیدا ہو گیا ہو فلکی تخلص اور خاقانی کے منجمانہ اشارات سے قیاس کیا جاتا ہے، کہ اس عہد میں فارسی شاعری کا کیا رنگ تھا اور سلاطین اسلام نجوم سے کیا دلچسپی لے رہے تھے۔

ابوالعلاء گنجوی نے خاقانی کو منوچہر شروان شاہ کے دربار تک پہونچایا بوڑھا اُستاد اپنے شاگرد کو اسقدر عزیز رکھتا تھا کہ اس نے اپنی دختر سے اس کا عقد کر دیا لیکن شاعروں میں نباہ ہونا ذرا مشکل ہے یا دونوں نے

[1] نفحات الانس جامی

دونوں کے کان بھرنا شروع کئے نتیجہ یہ ہوا کہ بروایت صحف ابراہیم دونوں کے درمیان دشمنی پیدا ہوگئی اور "اہاجی رکیکہ" کا تبادلہ ہوا۔

خاقانی اور ابوالعلار گنجوی کی نزاع کے سلسلہ میں یہ واقعہ غالبًا دلچسپی سے سُنا جائے گا کہ ابوالعلار گنجوی نے جب اپنی لڑکی خاقانی سے بیاہ دی تو فلکی شروانی کو اس کا بیحد رنج ہوا، اُستاد کو پتہ چلا تو اس نے اس کو بیس ہزار درم دئے، اور کہا کہ یہ چالیس ترکی لونڈیوں کی قیمت ہے، جو حسن و صباحت میں ہماری لڑکی سے کہیں زیادہ بلند مرتبہ ہوں گی۔

ابوالعلار گنجوی منوچہر شروان شاہ کے دربار میں "ملک الشعرا" کے عہدہ پر فائز تھا خاقانی کا رسوخ ہوا تو وہ اپنے اُستاد کے سامنے شاگردانہ قناد گی کی بجائے بڑے دعوے دینے لگا، اُستاد کو اس کا رنج ہوا خاقانی کو جوانی کی اُمنگ تھی، اُستاد کی ہجو کہہ ڈالی، ابوالعلار کے مفصلہ ذیل اشعار اس سلسلہ میں بیحد اثر آفرین ہیں۔

از آب دیدہ نخل قدش پرورش گرفت	چندانکہ ہیچوں شاخ گل از ناز سرکشید
چوں طفل اشک عاقبت آں شوخ بیوفا	از چشم من برامد و بر روئے من دوید[1]

سیر و سیاحت

مشکل ہی سے ایران کا کوئی ایسا شاعر ہوگا جس کو ذوق سیاحی نہو اور اس نے مختلف ممالک و بلاد کی سیر نہ کی ہو، متقدمین میں بھی بعض ہندوستان میں آئے، اور متاخرین کے لئے تو گویا ہندوستان قسمت آزمائی کا مرکز قرار پا گیا تھا، خاقانی نے اپنے مختلف اشعار میں ہندوستان اور "دبیران ہندی" کا تذکرہ کیا ہے لیکن وہ یہاں آیا نہیں پھر بھی اس نے عرب و عجم کے مختلف شہروں اصفہان و خراسان، تبریز و موصل، بغداد و حرمین کی سیر کی چنانچہ عزیز الملک ابراہیم خاں خلیل لکھتے ہیں:-

مکرر بزیارت کعبہ شریف و اماکن مشرفہ سعادت حاصل کرد[2]

اس کے علاوہ خود اس کے قصاید اس کے ذوق سیاحی کے آئینہ دار ہیں خراسان، اصفہان اور تبریز کی مدح میں اس نے قصیدے لکھے بغداد کے سفر کا بھی حال درج کیا ہے اس سلسلہ میں اس کے مفصلہ ذیل ابیات قابل غور ہیں:-

اصفہان:- مدت سی سال ہست کز سر اخلاص	زندہ چنیں داشتم وفائے صفاہان
موصل:- در سنہ ثانون الف بحضرت موصل	راندم ثانون الف ثنائے صفاہان
گرچہ صفاہان جزائے من بہ بدی کرد	ہم بنکوئی کنم جزائے صفاہان

---

[1] ملاحظہ ہو تاریخ منظفری [2] صحف ابراہیم۔

خراساں:- هفت مرداں کہ منم ہشتم ایشاں بہ وفا　　کہف شاں خانۂ اخواں بہ خراساں یابم
گم شد آں گنج جوانی کہ بسے کم کم داشت　　از پئے گم شدہ تاواں بخراساں یابم
یافت ز ریغت خزانم علم کافوری　　من ہماں سنبل مینساں بخراساں یابم

تبریز:- گرچہ فرماں ندہندم بہ خراساں رفتن　　باز تبریز بہ فرماں شدنم نگذارند
از پئے ایں بدو جا مکتب و دوکاں دارم　　نہ بہ مکتب نہ بہ دوکاں شدنم نگذارند

بسطام:- روضۂ پاک رضا دیدن اگر طغیان است　　شاید ار بر رہ طغیاں شدنم نگذارند
در بہ بسطام شدن نیز زبے سامانیست　　پس سراں بے سر و ساماں شدنم نگذارند

طوس:- گر دہد رخصت کنم نیت طوس　　خوش و شاداں شوم انشاء اللہ

رے:- در خراس ری از ایوان خراساں پرسم　　گرچہ آں طایفہ پرساں شدنم

بغداد:- من بہ بغداد و ہمہ آفاق خاقانی طلب　　نام خاقانی طراز فخر خاقاں آمدہ

ان شہروں کے علاوہ وہ شروان سے بھاگ کر بیلقان بھی گیا تھا لیکن بہ روایت صحف ابراہیم خاقان کے عملداروں نے اس کو گرفتار کرکے دربار شاہی میں بھیجدیا بادشاہ نے سات ماہ تک قید کرکے اس کو رہا کردیا۔ عزیز الملک ابراہیم خاں خلیل فرماتے ہیں:-

وملا جامی در نفحات ایزاد نمودہ کہ در سفر اول در فتوحات عظیم ررداده با خضر ملاقات کردہ[1]

اس میں شک نہیں کہ خاقانی کے سلسلہ میں جامی کی بعض روایتیں ناقابل قبول ہیں مثلاً فلکی کو خاقانی کا اُستاد بتانا اور ۵۹۵ھ میں خلیفہ المستضئی کی وفات وغیرہ لیکن انھوں نے اس کو صوفی مشرب لکھا ہے اور اس کے چند اشعار نقل کرکے صرف اسی قدر فرماتے ہیں:-

ازینہا بوئے آں می آید کہ وے را از مشرب صافی صوفیاں قدس اللہ تعالیٰ اسرارہم شربی تمام بودہ است۔

نہ کہیں خضر کی ملاقات کا تذکرہ ہے اور نہ سفر میں "فتوحات عظیم" حاصل ہونے کا بیان ہمارے سوانح نگاروں کی ستم ظریفی یہ ہے کہ ایک واقعہ سنکر یا کسی نامعتبر کتاب میں دیکھ کر محض حافظہ پر اعتماد کرکے اہل علم کی طرف اسکو منسوب کردیتے ہیں حالانکہ یہ ضروری ہے کہ جس واقعہ کے انتساب میں کوئی شبہ ہو اس کی تحقیق کرنے کے لئے اصل کتاب پر ایک نظر ڈال لی جائے۔

---

[1] صحف ابراہیم۔

مذہب فلسفی، صوفی اور شاعر کا مذہب عوام کے مذہبی دایرہ سے بہت زیادہ وسیع ہوتا ہے اس کے مذہب کا اصول عشق و جمال ہے اور اس کے وجدانات ہماری دنیائے آب و گل کی فریب خیالیوں سے بہت ارفع ہوتے ہیں خاقانی کے حکیم اور شاعر ہونے میں تو کلام ہی نہیں لیکن فلسفی اور صوفی ہونیکے باب میں بحث ضروری ہے ایک جگہ خود کہتے ہیں:-

بدل من آمدم اندر جہاں سنائی را بدیں دلیل پدر نام من بدیل نہاد

اگلے سطور میں لکھا جا چکا ہے کہ امیر معزی اور سنائی کے مقابلہ میں خاقانی نے خود کو برتر بتایا لیکن یہ آغاز زندگی کی باتیں ہیں خود سنائی بھی اپنی اگلی زندگی میں ایسے بلند مشرب صوفی نہ تھے جیسا ان کو سمجھا جاتا ہے اس پر حدیقہ کے وہ اجزا شاہد ہیں جو سلاطین و شاہزادگان امرا و ارباب مناصب کی مدح سے متعلق ہیں اسی طرح خاقانی نے بھی خاقان شروان، و سلاجقہ اصفہان، عباسیہ و اتابکان موصل وغیرہ کی مدح گستری کی لیکن امتداد زمانہ کے ساتھ نفسیات میں تغیر ہوتا گیا اور وہ ایک صوفی صافی بن گئے، درباری زندگی ترک کی، سلطان نے قید و بند ڈال کر دربار سے وابستہ رکھنا چاہا لیکن ایک مرتبہ بادہ للہیت کا مزہ چکھ لینے کے بعد کسی چیز میں لذت تو ملتی نہیں اس عہد میں انھوں نے جو قصاید لکھے ہیں ان کو الہامات صوفیانہ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے وہی پند و موعظت وہی فقر و فاقہ وہی زاویہ نشینی و زہد گزینی جو ہماری صوفیانہ شاعری میں پائی جاتی ہے خاقانی کے یہاں بھی ہے اور اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ رومی و عطار کی طرح انھوں نے بھی حدیقہ سے استفادہ کیا قرین قیاس ہے کہ ۵۲۵ھ میں خاقانی کی ولادت ہوئی جیسا کہ اگلے سطور میں لکھا جا چکا، اور یہی حدیقہ کی تصنیف کا سال ہے اور بعضوں نے سنائی کی وفات کی تاریخ بھی اسی کو قرار دیا ہے لیکن یہ صحیح نہیں .... بہر حال خاقانی نے سنائی کا زمانہ پایا، ممکن ہے طفولیت یا آغاز شباب کا عالم ہو اس لئے ملاقات نہ ہوئی ہو۔

خاقانی کی آخری زندگی یقیناً ایک صوفی صافی کی طرح بسر ہوئی، اسی لئے ان کے تشیع یا تسنن پر زور دینا بے محل سی بات معلوم ہوتی ہے لیکن کیا کیجئے ہمارے یہاں کے تذکرہ نگار اس قدر بلند حوصلہ اور رفیع الخیال ہوتے ہیں کہ خواہ مخواہ کسی کو کھینچ تان کر فرقہ بندی میں مبتلا کر دیتے ہیں چنانچہ تقی کاشی اور ملا نور اللہ شوستری نے اس کو شیعی مذہب لکھا ہے ملا نور اللہ فرماتے ہیں:-

در مواعظ و حکم طریقہ شیخ سنائی پیمودہ نقش مذہب اہل بیت بر لوح اعتقاد فی نگاشتہ

اما چوں در روزگار حکیم خاقانی حکم اسم الباطن و جمیع مواطن جاری بود، بہ تقیہ در طائفہ علیہ شیعہ مرتضویہ ساری لاجرم بعض عقاید خود را در قصیدہ مشہور کہ مذکور خواہد شد بطریق کنایت ذکر نمودہ

وطریق تعمیہ والغاز دراں بیہودہ وتاغایت صورت مضمون آں از انظار ابنائے زمان محجوب دستور بودہ[1]

اس کے بعد شوستری نے خاقانی کا ایک قطعہ نقل کیا ہے اور اس کی لغو و مہمل تاویل کی ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ خاقانی کا خیال ہے کہ گنبد خضرائے مدینہ میں حضرت رسول اکرم صلعم کے پہلو میں صاحبین (حضرت صدیق وفاروق) کی قبریں نہیں ہیں اسی کے ساتھ اس کے چند اشعار سے محبت اہل بیت اور علوی دوستی پر استدلال کیا ہے حالانکہ ملا صاحب کو سمجھنا چاہئے تھا کہ اہل سنت بھی محبت اہل بیت پر زور دیتے ہیں اور ان کے شاعروں اور مصنفوں نے اس موضوع پر کافی اظہار خیال کیا ہے ایک جگہ خاقانی کہتے ہیں:-

برسر روضۂ معصوم رضا　　شہہ رضواں شوم انشاءاللہ

مگر اسی کے ساتھ اپنے چچا کے مرثیہ میں ضمناً یہ بھی فرماتے ہیں

زد دیو گریزندہ داو داعی انصاف　　زد حکمت نازندہ او منہی الباب

زاں عقل و بد دگفت کہ اے عمر عثماں　　ہم عمر خیامی ہم عمر خطاب

دربار شاہی اگلے سطور میں تاریخ مظفری کے حوالہ سے لکھا جاچکا کہ ابوالعلا گنجوی خاقانی کا اُستاد اور خاقان کبیر منوچہر شروان شاہ کے دربار میں ملک الشعراء کے عہدہ پر مامور تھا، اسی نے اپنے ہونہار شاگرد کو بھی دربار تک پہونچایا رفتہ رفتہ اس کو اتنا بلند مرتبہ حاصل ہوا کہ بقول صاحب "صحف ابراہیم" بادشاہ کے سامنے سونے کی کرسی پر بیٹھا کرتا تھا خاقان کے دربار میں اس کو اتنی بے تکلفی حاصل تھی کہ وہ آزادانہ اظہار جذبات کرتا تھا اس ضمن میں تمام تذکرہ نگاروں نے اس کا ایک شعر نقل کیا ہے اور وہ یہ ہے:-

وستقے دہ کہ در برم گیرد　　یا وثاقے کہ در برش گیرم

اس شعر میں انھوں نے خاقان سے ایک کنیز یا امرد غلام طلب کیا ہے اس پر آزاد بلگرامی کا اعتراض اور ابوطالب اصفہانی کا جواب بہت پر لطف ہے عزیز الملک ابراہیم خاں خلیل لکھتے ہیں:-

خاقان برآشفت وگفت چرا ہر دو نخواست مگر قصورے در ہمت من دیدہ خاقانی رنجش خاقان فہمیدہ کسے راپر وبال کندہ بحضور خاقان فرستادہ ومعروض داشت کہ تقصیر ایں کس است کہ بہ افگندن نقطہ داری از فضلہ خود یا وثاقے کرد[2]

اس پر غلام علی آزاد بلگرامی (مؤلف ید بیضا) کا اعتراض یہ ہے کہ خاقان کو تو اس پر خفا ہونا چاہئے تھا کہ شاعر نے

---

[1] "مجالس المؤمنین" مؤلفہ سید نوراللہ بن سید شریف الحسینی المرعشی الشوستری - [2] صحف ابراہیم -

بے ادبی کی، اور بے محابا غلام امرطلب کر بیٹھا ابوطالب بن محمد اصفہانی نے اس کا مفصل جواب دیا ہے اور آزاد کو گنوار بتاتے ہوئے سلاطین مغلیہ کے ناروا طریق معاشرت پر چٹکیاں لی ہیں فرماتے ہیں:-

ایں شبہ بسبب کم تتبعی از اوضاع مردم ولایت دی راروی دادہ چہ در زمان قدیم کنیز وغلام خود جزو مرحمت وخلعت دستور بود وحالی آلان ہم اعزہ تمام ولایت باسلاطین وامرائے خود بشرط اتحاد بے تکلفانہ زندگی می کنند واز عاداتے کہ متاخرین تیموریہ در ہند رواج دادہ اند کہ سائر خلق سلوک عبدیت با اکابر نمایند بغایت دور اند وحق اینست کہ بسیار قبیح است کہ در مواضع خاص اکابر از متوسلان خویش ادب عامیانہ توقع کنند[1]

اس کے بعد ابوطالب اصفہانی نے ہجو اور شوخ نگاری کی تعریف کی ہے اور کہا ہے کہ ہجو شاعر کا حربہ ہے اور بڑے بڑے شعراء نے متفقہ طور پر فیصلہ کیا ہے کہ کسی شاعر میں ہجوگوئی اور رمز نگاری کا سلیقہ نہو تو گویا اسکی شاعری ہی ناقص ہے اس کے بعد انھوں نے اساتذہ فارس سعدی، عرفی، وحید وغیرہ کے کلام سے ہزل وشوخ نگاری کی چند مثالیں دی ہیں۔

مولانا آزاد اور ابوطالب اصفہانی دونوں اپنی اپنی جگہ پر ایک حد تک صحیح ہیں اس وجہ سے کہ ہندوستان کے رسوم وقیود کی دنیا میں یقیناً اس نوع کا بے محابا طریق طلب آقا کے سامنے سخت بے ادبی ہے ہر قوم اور ہر سرزمین کی اخلاقیات کو ایک ہی زاویہ نظر سے دیکھا نہیں جا سکتا ڈاکٹر رسل ویلیس نے اپنی کتاب "معاشرانہ فضا اور اخلاقی ترقی" میں اس مسئلہ پر کافی روشنی ڈالی ہے مولانا آزاد بلگرامی نے اس واقعہ کو ہندوستانی معاشرت کے مطابق نہیں پایا اور اس لئے اس پر تعجب کیا ابوطالب اصفہانی کے جواب کا یہ حصہ بہت ہی معقول ہے کہ لونڈی غلام عطائے شاہی کا جزو سمجھے جاتے ہیں اس لئے خاقانی نے بادشاہ سے یہ بھی طلب کیا اگر معاملہ یہیں تک ہوتا تو مضایقہ نہ تھا لیکن " در برم گیرد" اور " در برش گیرم" ، ہندوستانی نقطۂ نظر سے یقیناً محل نظر ہے، ممکن ہے خاقانی کے عہد میں ولایت میں سلاطین نے اپنے متوسلین کو اجازت دے رکھی ہو کہ وہ ان کے سامنے بے تکلفانہ جس طرح جی میں آئے اظہار خیال کریں لیکن دور متاخرین میں ابوطالب اصفہانی سے پہلے ہی خود شاہزادہ سلیمان صفوی نے صائب تبریزی سے محض ایک معمولی شوخی پر نہ تو کبھی شعر سنا اور نہ مدت العمر کلام کیا۔

شاہزادہ سلیمان صفوی کی شادی تھی، شاہزادہ کی ابھی مسیں بھیگ رہی تھیں وہ بہت ہی حسین وجمیل تھا خوش روئی وخوش پوشی ایک شاعر کو جس طرح بیتاب کر دیتی ہے دنیا سے پوشیدہ نہیں صائب نے ایک قصیدہ پیش کیا اس کا ایک بیت یہ تھا:-

احاطہ کرد خط آں آفتاب تاباں را　　　گرفت خیل پری در میاں سلیماں را

شاہزادہ کو سخت رنج ہوا اور پھر ساری عمر صائب سے بات تک نہ کی[1]

اس لئے ابوطالب اصفہانی کا آخری مغل بادشاہوں پر اعتراض کرنا صحیح نہیں اگر ہندوستان میں امرا و سلاطین اپنے ماتحت سے "ادب عامیانہ" ملحوظ رکھتے ہیں تو ایران میں یہ "کبریائی" ناپید تھی کچھ تھوڑی ہی آئین ہمارے ہندوستانی بھائی جو عرب و ترکستان، ایران و توران کا خواب دیکھا کرتے ہیں اور ہمیشہ اپنا رشتہ ارتباط انھیں غیر ممالک سے وابستہ رکھنے کے لئے وطنی ہمدردیوں سے یکسر دور رہیں، دیکھیں ایرانی شعراء و تذکرہ نگاروں (شیعہ سنی کی قید نہیں) نے محض ملکی عصبیت کی بنا پر ہندوستانیوں پر اکثر پھبتیاں کی ہیں، ایرانی شعراء یہیں کے نان ربا بھی ستے اور اسی ملک کی آب و ہوا اور یہاں کے اوضاع و مراسم کی ہجو بھی کرتے تھے، غرض کے بندے تھے، ادبی تجارت کی اور گھر کا رستہ لیا شیخ آذری اسفرائنی، صائب تبریزی، حکیم رکنائے کاشی سبھی اس مرض میں مبتلا نظر آتے ہیں حزیں نے ہند اور اہل ہند کی سخت سے سخت ہجویں کی، والہ داغستانی پر ملکی عصبیت طاری تھی غالب ہندی نژاد تھا وہ بھی ایرانیوں کی اُستادی تسلیم کرتا ہے اور بیدل و ناصر علی کو نظر میں نہیں لاتا اور قتیل و واقف کو محض ہیچ سمجھتا ہے کاش اہل ہند کی آنکھیں ہوں اور وہ دیکھیں کاش ان کے قلوب ہوں اور ان میں گرمی پیدا ہو کب تک وہ خیالی فریب کاریوں میں گرفتار رہیں گے اور ہندوستانیوں سے رشتہ جوڑنے کی بجائے غیر ملکیوں سے سازباز رکھیں گے، اسلام یقیناً وطنیت کا نام نہیں اور وہ سارے عالم کے انسانوں کو ایک رشتہ محبت و اخوت میں جوڑنا چاہتا ہے مگر اس کا کیا جواب کہ ہم ہر معاملہ کو مذہبی رنگ میں رنگ دیتے ہیں اور دوسرے ملک والے اپنی ملکی و وطنی خصوصیتوں پر بھی نازاں ہیں کاش ہمیں بھی احساس ہو کہ "ہندوستانی" ہونا ہمارے لئے بھی مایۂ نازش ہے!

خاقانی کو منوچہر شروان شاہ کے دربار کے علاوہ سلجوقیہ اور اتابکان موصل سے بھی علاقہ رہا غیاث الدین محمد مسعود بن ملک شاہ کی مدح میں کہتے ہیں۔

اول سلجوقیان سنجر ثانی کہ ہست   سایہ اش خیر العباد سایہ رب انم

قصیدہ بہت طویل ہے اس میں بانوے ابیات ہیں۔

دولت شاہ اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ خاقانی حج کو جا رہے تھے، مکہ کے رستہ میں جمال الدین موصلی سے ملاقات ہوگئی، ان کی تعریف میں ایک قصیدہ کہا اسی طرح اتابک عراق مظفر الدین قزل ارسلاں کی مدح میں بھی ایک قصیدہ دیا ہے:۔

---

[1] ریاض الشعراء الہ داغستانی۔

گرچہ ملک الغرب توئی تا ابد اما بر تخت خراساں ملک الشرق تو شائی

خاقانی نے خود اپنے قصیدہ میں قیام موصل کا حال لکھا ہے جیسا کہ اگلے سطور میں سیر و سیاحت کے ضمن میں لکھا جا چکا ہے۔

خصوصیات کلام خاقانی کی دقت پسندیاں اور دقیقہ سنجیاں تو مسلم ہیں اور اسی لئے اس کو قبول عام حاصل نہ ہو سکا چنانچہ بقول عزیزالملک ابراہیم خاں خلیل فیضی خاقانی کا کلام پسند نہیں کرتا تھا حالانکہ خود فیضی نے سواطع الالہام (تفسیر بے نقط) لکھ کر اپنی مشکل پسندی کا بہت کچھ ثبوت پیش کیا ہے اسی طرح بعض نقادان ادب "لغات و اصطلاحات غیر متعارفہ" کی بنا پر اس کا کلام ناپسند کرتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ جس بادشاہ یا امیر کے دربار میں وہ اپنا قصیدہ بھیجتا تھا تو ایک ہزار اشرفیوں سے اسکو کم صلہ نہیں ملتا تھا۔

خاقانی حج کرنے گیا حرم شریف مشرق و مغرب کے علما و نقادان فن سے بھرا ہوا تھا شاعر نے ایک قصیدہ کہا جس کا ایک بیت یہ ہے ؎ صبح از حمایل فلک آہیخت خنجر شش

اس کا نام "باکورہ الاشعار و مذکورۃ الاشجار" ہے۔

ابوطالب اصفہانی کی روایت ہے کہ "شرفائے مکہ بہ آب زر نوشتہ بامحضر بے نظیرش بہ در خانہ کعبہ آویختند"۔ اس سے بڑھ کر اور کیا کسی شاعر کی پذیرائی ہو سکتی ہے؟ اسی طرح اس نے لیالوشیر کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا جس کا پہلا بیت یہ ہے ؎

رخسار صبح پردہ بہ عمد ابر افگند راز دل زمانہ بہ صحرا بر افگند

ممدوح نے اس کو صلہ میں دو ہزار اشرفیاں دیں۔

(باقی)

عبدالمالک آروی

جھانسی کی رانی

(مسلسل)

۱۸۵۷ء

تیسرا ایکٹ - پہلا منظر

(۵ جون ۱۸۵۷ء کی صبح - جھانسی میں قصر شاہی کا دربار عام - منظر وہی جو پہلے ایکٹ کے تیسرے منظر میں تھا - صرف تخت شاہی موجود نہیں ہے - رانی کی مسند کمرہ کے وسط میں ہے - داہنی طرف ایک ایرانی قالین پر انند راؤ پنڈت جی کے سامنے بیٹھا ہوا سر ہلا ہلا کر پڑھ رہا ہے پنڈت جی ایک موٹی سی کتاب پڑھ رہے ہیں اور کبھی کبھی انند راؤ کو ٹوکتے جاتے ہیں - رانی ادھر اُدھر گھوم رہی ہے گویا کسی گہری فکر میں مبتلا ہے - تھوڑی دیر بعد گنگا بائی دوڑی ہوئی کمرہ میں آتی ہے - لیکن انند راؤ اور پنڈت کو دیکھکر جھجکتی ہے - بعد ازاں جھپٹ کر رانی کے پاس پہونچکر گھبرائی ہوئی آواز میں رانی سے کہتی ہے)

گنگا بائی :- بہن ! بہن !! غدر ہو گیا - ایک حولدار نے جس کے ساتھ پچاس سپاہی ہیں میگزین پر قبضہ کر لیا ہے - اور وہ کہتے ہیں کہ کمپنی کی باقی فوج بھی بہت جلد ان کے ساتھ ہو جائے گی -

رانی :- (ٹہلتی ہوئی دبی آواز میں) - بیوقوف ! گدھے !! بالآخر اس پاگل بخشش علی کے کہنے میں وہ بھی آگیا - اب وہ جیلخانہ کے دروازے بھی کھول دیگا اور پھر ایشور ہی جانتا ہے کیا ہوگا -

گنگا بائی :- ابھی وقت ہے - چلو یہاں سے بھاگ چلیں - جب سپاہی ہاتھوں سے نکل جائیں گے تو معلوم نہیں کیا حشر ہو - ابھی سے لوگ چہ میگوئیاں کر رہے ہیں کہ یہ کریں گے وہ کریں گے -

رانی :- (سخت لہجہ میں) گنگا بائی، بڑی شرم کی بات ہے!! جو عورت حکمراں مرہٹہ خاندان سے تعلق رکھنے کا دعویٰ رکھتی ہو اس کی زبان سے ایسی باتیں مناسب نہیں۔ تم اگر چاہو تو جاسکتی ہو لیکن میں نہیں جاؤں گی۔

گنگا بائی :- (رانی کے پاؤں پر گرکر) بہن معاف کرو۔ اگر پھر ایسے شرمناک الفاظ زبان سے نکالوں تو زبان کاٹ ڈالنا۔ لیکن میں نے بزدلی کی وجہ سے ایسا نہیں کہا۔ میں صرف یہ خیال کرتی تھی کہ اس مصیبت کے وقت کونسا راستہ اختیار کرنا چاہئے۔ اگر کمپنی کی فوج غدر کرے تو ہم کو اس سے کوئی مطلب نہ رکھنا چاہئے اور ہمارے سلئے یہی زیادہ مناسب ہوگا کہ اُسوقت واپس ہوں جب دونوں میں سے کوئی فتح حاصل کرلے۔

رانی :- (آہستہ سے بنچ پر ٹیک لگاکر) گنگا بائی! تم نے اپنی ان ہوشمندانہ باتوں سے تو مجھے تھکا دیا ہے۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ میں جو جھانسی سے اتنی محبت کرتی ہوں عین ایسے موقع پر اُسے خیرباد کہدوں جبکہ اُسے میری ضرورت ہے۔ کیا کوئی آگ لگنے کے وقت اُس گھر کو چھوڑ دیتا ہے جس میں صدہا برس اُس نے اور اُس کے اہل وعیال نے زندگی بسر کی ہو۔ نہیں۔ بلکہ اُس وقت وہ پوری کوشش کرتا ہے کہ اپنے گھر کو کسی نہ کسی طرح بچالے۔

گنگا بائی :- (بنچ کے پاس جاکر) لیکن بہن! اگر کمپنی نے غداروں پر فتح پائی تو انگریز حکام جھانسی کے مقتدر لوگوں کو بدنام کرینگے کہ اُنھوں نے غداروں کو پس پردہ کمک دی۔ اور اگر غدار فتحیاب ہوئے تو وہ اپنی حکومت قایم کریں گے اور کسی مسلمان سپاہی کو اپنا سردار بنالیں گے۔ اس لئے اگر تم یہاں ٹھہری رہیں تو تمھارے دو نقصان ہیں۔ تمھارا گزارہ بھی جاتا رہے گا اور رانی بننے کا جائز حق بھی۔

رانی :- (بیٹھکر) ٹھہرو، ٹھہرو! گنگا بائی! ان پریشان کن خیالات کو مجھ سے الگ رکھو۔ تم بھاگ چلنے کو کہتی ہو، باپ اور دیوان غداروں کا ساتھ دینے کو کہتے ہیں اور مہاراجہ سندھیا انگریزوں سے وفاداری کرنے کا پیغام بھیجتے ہیں۔ میرے سر کے ٹکڑے ہوئے جاتے ہیں۔ (انند راؤ کو دیکھکر) اگر انند کا خیال نہ ہوتا تو میں زندگی ختم کردیتی اور ان جھگڑوں سے نجات پاجاتی۔ تین ہفتے ہوئے جبسے میرٹھ میں غدر کی خبر سنی مجھے نیند نہیں آئی۔ جھانسی ہی میں غدر شروع ہوگیا اور اب کوعرصہ تک چین ملنا ممکن نہیں (ذرا ٹھہرکر اور یکایک پھر گنگا بائی سے مخاطب ہوکر) بہن ذرا جاؤ، میرے باپ کو تو ڈھونڈو یقیناً اُنھیں تازہ خبریں معلوم ہوں گی۔ دوڑو! میں سمجھتی ہوں کہ مجھے جلد کوئی تدبیر اختیار کرنا چاہئے۔ گو کہ اب میں نام ہی نام کو رانی باقی رہگئی ہوں تاہم مجھے یقین ہے کہ اب بھی میری تھوڑی بہت عزت باقی ہے۔

(جونہی گنگا بائی دروازے کی طرف جاتی ہے۔ ماما صاحب اور اُن کے پیچھے تارا سنگھ دیوان داخل ہوتے ہیں۔ گنگا بائی الگ کھڑی ہوکر اُن کو غور سے دیکھتی ہے۔ اور باہر چلی جاتی ہے انند راؤ دونوں آدمیوں کو داخل ہوتے ہوئے دیکھ کر اُن کی طرف دیکھتا ہے لیکن پنڈت جی

اپنی کتاب پڑھے جاتے ہیں)

ماما صاحب :- (خوشی کا چہرہ بناکر) خوشخبری! بیٹی! جھانسی میں مرہٹوں کا راج ایک مرتبہ پھر ہوگا کمپنی کے سواروں نے طے کرلیا ہے کہ باغیوں سے مل جائیں گے۔

تارا سنگھ :- رانی! حولدار گور بخش نے میگزین پر قبضہ کرہی لیا ہے اور بخشش علی داروغہ جیل حکم پاتے ہی قیدیوں کو رہا کردے گا۔

رانی :- (سختی سے) دیوان صاحب! آپ پر مجھے تعجب معلوم ہوتا ہے اور پتاجی، آپ پر بھی۔ میرا خیال تھا کہ آپ دونوں کبھی اسے نہ پسند کریں گے کہ کوئی سپاہی عہد وفاداری توڑے خواہ وہ کسی کا ماتحت ہو۔

تارا سنگھ :- رانی! یوں تو میں بھی اسے نہ پسند کرتا کہ کوئی سپاہی اپنے مالک کے خلاف بغاوت کرے۔ لیکن یہ سپاہی عہد شکنی کی معقول وجہ رکھتے ہیں۔ اُن کی شورش کی وجہ مذہب ہے اور انگریزوں نے اُن کے مذہبی اُصول میں مداخلت کی ہے۔

رانی :- (طعن کے لہجہ کو چھپاکر) اور کیا تم اُن کا ساتھ مذہب کی وجہ سے دیتے ہو؟

ماما صاحب :- (بے صبری سے) ہاں! بیٹی! مذہب کی وجہ سے۔ سیاسی اور مذہبی وجوہ دونوں ایک ہی طرح پاک ہیں۔

تارا سنگھ :- اور یہی میرا بھی جواب ہے۔ مسلمانوں کا خیال ہے کہ انگریزوں نے اُن کے پاک عقیدہ کو گندہ کردیا ہے اور ہم ہندوؤں کا خیال ہے کہ انگریزوں نے ہمارے پاک رسم ورواج تبنیت اور وراثت کو چھین لیا ہے۔ یہ بھی خدا کی مہربانی ہے کہ انتقام کا موقع اُس نے ایسا دیا جس میں دونوں قومیں مشترک ہیں۔

رانی :- (طعن آمیز لہجہ میں) دیوان صاحب! تین ماہ قبل تو آپ انگریزوں کے اس قدر خلاف نہ تھے اب کس بات نے آپ کو ان کا مخالف کردیا ہے۔

ماما صاحب :- بیٹی! بہت سخت مت ہو۔ علاوہ تمھارے ہم سب اُسوقت مغالطہ میں تھے۔ انگریزوں نے ہم کو بیوقوف بنایا اور وہ ہمیشہ ہندوستانیوں کو بیوقوف بناتے ہیں۔

تارا سنگھ :- مجھے اپنی بیوقوفی پر سخت افسوس ہے۔ میں نے جو کچھ کیا آپ کے فائدے کے لئے کیا میری یہ تجویز کہ گدی کے تمام حقوق کے معاوضہ میں معقول پنشن دیدی جائے آپ ہی کے فائدے کے لئے تھی۔ لیکن جب مجھ کو یہ علم ہوا کہ گزارہ میں ایک شرط یہ تھی کہ سرگباش راجہ کا قرضہ ادا کیا جائے تو جی چاہتا تھا اپنا سر پھوڑ ڈالوں کہ میں نے میجر ایلیس کی چکنی چپڑی باتوں پر کیوں اعتماد کیا

رانی :- (غصہ سے) اپنا افسوس چھوڑئے۔ دیوان صاحب! میں ان احسانات کی زیادہ پروا نہیں

کرتی ہوں جو انگریزوں نے زبردستی مجھ پر کئے ہیں۔ یہ مثل قرضہ جات حسنہ کے ہیں اور میں جھانسی کے کسی قرضدار کو قرض نہ ادا کرنے کے بجائے فاقہ کشی سے مرنا زیادہ پسند کرتی ہوں۔ (سخت ہوکر) میجر ایلس کو چھوڑ دو۔ اُنھوں نے تو جھانسی کو بچانے کی تنہا اتنی کوشش کی ہے کہ آپ سب مل کر بھی نہیں کر سکتے تھے۔
ماما صاحب:۔ (مداخلت کرتے ہوئے) بیٹی ہم وقت برباد کر رہے ہیں۔ تھوڑے ہی عرصہ میں اس کی ضرورت پڑے گی کہ از سر نو جھانسی راج کا اعلان کیا جائے۔ انند کمار مستقبل راجہ ہوں گے اور تم نائبہ ہوگی اس لئے سب انتظام تیار رکھو اور اشارہ کی منتظر رہو۔ ہم غداروں سے سازش کر چکے ہیں۔ اور اُنھوں نے نئے راج کی اعانت کا اقرار کر لیا ہے۔
رانی:۔ (کھنچکر اور مستحکم ارادہ کے ساتھ)۔ ماما صاحب مجھے نہ آپ کے احکام کی ضرورت ہے نہ غدار سپاہیوں کے احکام کی۔ انگریز ابھی تک برسر حکومت ہیں۔ میں اس نزاع میں نہ اُن کا ساتھ دینا چاہتی ہوں نہ اُن کے نوکروں کا۔
ماما صاحب:۔ (غصہ سے) تم طوطے کی طرح وہی رٹ رہی ہو جو سندھیا اور اُس کے مکار دیوان ڈنکر راؤ نے تم کو پڑھا دیا ہے۔ میں تمھیں مطلع کرتا ہوں کہ یہاں کے حالات گوالیار اور اندور کے حالات سے مختلف ہیں ہمارے پاس ذاتی فوج مثل سندھیا اور ہلکر کے نہیں جس پر بھروسہ کریں۔ پس فتحیاب فریق سے ہم کو صلح کرنا چاہئے۔ میرٹھ کے سپاہیوں کے غدر کو تین ہفتہ سے زیادہ ہو گئے اور شورش ہر چہار جانب پھیل رہی ہے تھوڑے ہی عرصہ میں ایک انگریز بھی ہندوستان میں نظر نہ آئے گا۔ اس لئے اگر اس جھگڑے میں اپنا پہلو مضبوط رکھنا ہے تو ہم کو ابھی سے اس کا انتظام کرنا چاہئے۔
رانی:۔ (بنچ پر بیٹھ کر) مجھے عجلت نہیں اچھی معلوم ہوتی۔ ابھی سے کوئی تصفیہ نہیں کیا جا سکتا کہ کیا ہوگا۔ ڈنکر راؤ جو کہتا ہے خود سمجھتا ہے۔ انگریز ہمیشہ لڑائی بُری طرح شروع کرتے ہیں۔ لیکن سمندر پار اُن کے پاس بڑے سامان ہیں جو کو ضرورت پر وہ جہازوں میں لے آئیں گے۔ میں محل کے دروازے بند کرا دوں گی اور پہرہ بٹھا دوں گی۔ اور جب تک یہ طوفان دور نہ ہو جائے ہم سب بند رہیں گے۔ (انند راؤ سے جو کھڑا ہوکر ماما صاحب کو گھورنے لگتا ہے۔) انند! تم پڑھو۔ تم کیوں پریشان ہوتے ہو۔
ماما صاحب:۔ (رانی کی طرف غصہ میں گھوم کر) پڑھو! پڑھو! تم تو نہایت ہی سخت احمق نکلیں۔ تم تو بڑی سچی مرہٹہ عورت بنتی تھیں۔ اب کیا ہوا کہ اس چور ڈلہوزی کی باتوں پر عمل کر رہی ہو۔ (انند کی طرف دیکھ کر جو ہٹ کر الگ ہو جاتا ہے) پڑھو، ہاں پڑھے جاؤ، جبکہ تمھیں اپنے حقوق کے لئے جنگ کی تیاری کرنا چاہئے۔ (لکڑی کی چھوٹی میز میں لات مارتا ہے اور وہ گر جاتی ہے۔ انند راؤ رانی کے پاس جاتا ہے جو سیدھی

ہو کر بیٹھ جاتی ہے۔ اور پنڈت متعجب ہو کر جھک جاتا ہے) پڑھے جاؤ! یہاں تک کہ جھانسی راج مسلمانوں کے قبضہ میں چلا جائے اور کوئی مسلمان سردار جھانسی پر حکومت کرنے والا آجائے۔

(ماما صاحب چیزوں کو ٹھکراتا ہوا کمرے سے باہر جاتا ہے اور طعن سے چلاتا جاتا ہے پڑھو! پڑھو! رانی بس پردہ ہوتی ہوئی ایک بازو انند راؤ پر رکھتی ہے جو اپنا سر اُس کی گود میں چھپا لیتا ہے اور نیم وا آنکھوں سے ماما صاحب کو دیکھتا جاتا ہے۔ دیوان جو پیچھے کھڑا تھا ماما صاحب کے پیچھے رانی کو سلام کرتا ہوا باہر چلا جاتا ہے)

پردہ گرتا ہے

دوسرا منظر

(۷ رجون ۱۸۵۷ء۔ خس کی ٹٹی گزرگاہ پر بالاخانہ کے دروازہ پر لپیٹ دی گئی ہے۔ رانی پلنگ پر لیٹی پنکھا جھل رہی ہے۔ انند راؤ فرش پر پلنگ کے نزدیک بیٹھا اُس کی طرف مغموم دیکھ رہا ہے۔ گنگا بائی پیچھے بیٹھی کچھ سی رہی ہے اور وقتاً فوقتاً گزرگاہ کو دیکھتی جاتی ہے۔ نیچی لکڑی والی میز جس پر کتابیں اور لکھنے کا سامان رکھا ہے، داہنی جانب رکھی ہے)

انند راؤ:۔ پھر ہم سپاہیوں سے کیوں نہ مل جائیں اور انگریزوں کو مار ڈالیں۔ قلعہ میں تھوڑے سے ہیں۔

رانی:۔ بیٹا! میں تم سے بار بار کہہ چکی ہوں کہ باغیوں کے بنانے سے راجہ بننا خطرناک ہے۔ اگر گدی مکاری سے حاصل کی جائے گی تو مکاری اُسے چھنوا بھی دے گی۔

انند راؤ:۔ رانی ماں! لیکن آپ مجھے تلوار کی مشق کی ہدایت کرتی تھیں۔ اگر ہم اسوقت انگریزوں پر حملہ نہ کریں گے تو ہم کو جھانسی فتح کرنے کا موقع کبھی نہ ملیگا۔

رانی:۔ (بیٹھ کر ذرا دلیری سے) اگر پیشوا اپنے راج کو دوبارہ سنبھال لیتے اور مرہٹہ فوج باقاعدہ میدان میں آئی ہوتی تو میں انگریزوں پر حملہ کرنے میں ذرا نہ جھجکتی۔ میں اس کو مذہبی لڑائی سمجھتی اور جو کچھ میرے پاس ہے صرف کردیتی حتی کہ اپنی زندگی تک قربان کر دیتی۔ (مغموم ہو کر) لیکن بیٹا وہ موقع نہیں ہے۔ چند باغی سپاہی راج کی بنیاد نہیں ڈال سکتے جس سے ہم مرہٹوں کو اطمینان ہو جائے۔ اگر کمپنی کے مسلمان ملازمین کا ہم سہارا پکڑیں تو ہمارے پاس جو تھوڑا بہت ہے وہ بھی نہ رہیگا۔

انند راؤ:۔ لیکن ماما صاحب کہتے ہیں کہ سب انگریز مار ڈالے جائیں گے اور اگر اب ہم نے سپاہیوں کی مدد نہ کی تو سپاہی پھر ہم کو جھانسی نہ واپس دیں گے۔

رانی :- (غصہ سے کھڑی ہوکر) ماما صاحب اور سب لوگوں کی طرح ہیں۔ اُن کو اپنی فکر ہے کہ جو کچھ مل سکے حاصل کرلیں۔ اُنھیں دوسروں کی خواہش اور آرام کی فکر نہیں۔ اُنھوں نے پہلے مجھے راجہ گنگا دھر کے ہاتھ بیچا اور پھر انگریزوں کے ہاتھ۔ اور اب وہ مجھے ان سپاہیوں کے ہاتھ فروخت کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن میں اب نہ فروخت ہوں گی۔ مہاراجہ سندھیا صحیح کہتے ہیں۔ بغاوت ہمارا کام نہیں ہے۔ ہمیں کسی کی طرفداری نہ کرنا چاہئے۔ اگر ماما صاحب - - -

گنگا بائی :- (دوڑ کر آتے ہوئے) بہن! میں نے ابھی راؤ آپا کو صحن سے آتے اور محل میں داخل ہوتے دیکھا ہے۔ اُن کے کپڑے بالکل پھٹے ہوئے تھے اور معلوم ہوتا تھا کہ کسی جنگ میں مشغول تھے۔ پرمیشور کرے کوئی بُری خبر نہ لائے ہوں۔

رانی :- (خاموش بنچ پر بیٹھی ہوئی) مرہٹوں کی لڑکیوں کو ہمیشہ بُری خبر سُننے کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ گنگا بائی! جاؤ اور راؤ آپا کو اندر لے آؤ۔ (انندراؤ سے جو ابھی تک فرش پر بیٹھا تھا) بیٹا! آؤ! میرے پاس کھڑے ہوجاؤ۔ اب جو کچھ لکشمی بائی پر مصیبت آئے تم بھی اُسمیں حصہ لینا۔ میں سمجھتی ہوں کہ خوشی کے دن ختم ہوگئے۔

(انندراؤ کھڑا ہوجاتا ہے اور رانی سے لپٹ کر ایک طرف ہوجاتا ہے۔ گنگا بائی جو دروازہ میں جھانک رہی تھی دروازہ کھولتی ہے۔ راؤ آپا پاگلوں کی طرح پھٹے کپڑے اور بکھرے بالوں کے ساتھ داخل ہوتا ہے۔ اُس کے سر پر پگڑی بھی نہیں اور بہت مضطرب نظر آتا ہے۔ رانی کے پیروں پر گر کر چلاتا ہے اور پیشانی فرش زمین سے ٹکراتا ہے۔)

رانی :- (بنچ سے جھک کر اور راؤ آپا کا کندھا تھپتھپا کر) مرہٹہ جنگجو سپاہی کو اگر اُس کی رانی پر مصائب پھٹ پڑیں چلانے کی ضرورت نہیں۔ راؤ آپا! کیا ہوا؟ میں تیار ہوں۔

راؤ آپا :- (سسکیاں لیتے ہوئے) رانی صاحبہ! میں آنے والے مصائب سے خائف نہیں ہوں بلکہ میری پریشانی کا باعث سپاہیوں کی نمک حرامی ہے جنھوں نے عرصہ تک جھانسی راج کا نمک کھایا ہے۔

رانی :- کیا محل کے محافظین کے متعلق تم کہہ رہے ہو۔ آج ہی سویرے اُنھوں نے مجھ سے عہد وفاداری کی قسم کھائی ہے اور اقرار کیا ہے کہ خواہ کچھ بھی کیوں نہ ہو وہ میرا ساتھ نہ چھوڑیں گے۔

راؤ آپا :- (پیشانی زمین پر مار کر) افسوس! رانی صاحبہ! اُن سب نے بدعہدی کی اور سب باغیوں سے جاملے۔ کچھ تو اس وجہ سے کہ اُن کو ڈرایا گیا کہ اگر تم رانی کا ساتھ دوگے تو کھانے میں تم کو زہر دیدیا جائے گا۔ اور کچھ اس وجہ سے کہ باغی سپاہیوں نے اُن کو بڑے بڑے انعامات دینے کا وعدہ کیا۔

رانی :- (غصہ کو دباتے ہوئے کھڑی ہوکر) یہ دھمکیاں اور وعدے کس کے نام سے دئے گئے؟

راؤ آپا:۔ بخشش علی داروغہ جیل کے نام سے۔ رانی صاحبہ! اِس شخص نے تمام مخلوق کو اُسوقت سے جب سے کہ قیدی رہا ہوئے سخت خائف کر رکھا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ بالکل دیوانہ ہو گیا ہے۔ اور اُس کا منھ تھوک سے بھر آتا ہے۔ جب کوئی انگریزوں سے اظہار ہمدردی کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خدا نے انگریزوں کو ہندوستان سے نکال باہر کرنے کا کام اُس کے سپرد کیا ہے۔

رانی:۔ اُس پاگل سے باغی سپاہیوں کے سردار کیا کہتے ہیں؟

راؤ آپا:۔ رانی صاحبہ! وہ اُس کو نہیں سمجھا سکتے! اُس کا اثر مخلوق پر بے انتہا ہے۔ اور فوج کے لوگ بھی فتنہ و فساد کے ڈر سے اُس کی مخالفت نہیں کرتے۔ اُسی نے لوگوں کو میرے پیچھے لگا دیا کہ مجھے مار ڈالیں کیونکہ میں محافظین کو واپسی کی ترغیب دے رہا تھا۔

رانی:۔ (مجبور سی ہوکر) میں سمجھتی ہوں کہ باغی اب آکر ہماری محاصرہ والی توپوں کو صحن سے علحدہ کر دینگے محافظین یقیناً اُن کو پتہ بتلا دیں گے کہ کہاں چھپی ہیں۔ اگر ہماری توپیں قلعہ کی دیوار پر چلیں تو انگریز یقینی اطاعت قبول کرلیں گے یا جانیں لڑا کر دیدیں گے۔

راؤ آپا:۔ (کھڑے ہوکر) رانی صاحبہ! جب میں آدمیوں کے ہجوم میں تھا ایک نہایت شرمناک واقعہ پیش آیا۔ تین انگریز مسلمانوں کی صورت میں پکڑے گئے جو آپ کے پاس محصورین کی امداد کے لئے آرہے تھے۔ جب اُن کا لباس علحدہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ تینوں افسر تھے جو قلعہ کی حفاظت نہایت انہماک کے ساتھ کر رہے تھے۔ (منھ پر ہاتھ رکھکر اور منھ پھیر کر) میری آنکھوں کے سامنے بخشش علی کے ساتھیوں نے اُن کو ذبح کر دیا تاکہ اور لوگوں کو جو آپ سے ملنا چاہیں تنبیہ ہو جائے۔ (ذرا ٹھہر کر) اُسی غل و شور میں میں نکل بھاگا۔

(رانی بنچ سے کھڑی ہو جاتی ہے اور مٹھی دبا کر سینہ پیٹتی ہے تم ویرا دھر اُدھر قدم ڈالتی ہے اور سر ہلا کر غصہ میں کہتی ہے)

رانی:۔ بیشک اب بادل گھر آئے ہیں خون برسنا شروع ہو گیا ہے اور معلوم نہیں اب کب بند ہو۔

(پہلے بھلبھناہٹ کی آواز آتی ہے اور پھر یہی آواز بلند ہو جاتی ہے اور شور ہونے لگتا ہے۔ صحن میں ہجوم دکھائی دیتا ہے جو بخشش علی کی قیادت میں توپیں تلاش کرتا ہے۔ غل ہوتا ہے کہ توپیں جل گئیں۔ بخشش علی کی آواز گونجتی ہوئی سُنائی دیتی ہے۔ رانی کو بُرا بھلا کہتا ہے اور مقابلہ کرنے کو تیار ہے۔ ہجوم بھی بخشش علی کی آواز کو دہراتا ہے جس سے وہ خوش ہوتا ہے محل میں سب متوحش ہو جاتے ہیں۔ انند راؤ روتا ہوا رانی کے پاس جاتا ہے۔ ہاتھ کانوں پر رکھے ہوئے اور سر جھکائے ہوئے۔ رانی کوشش کرکے بڑھتی ہے اور راؤ آپا کو بلا کر

انند راؤ کو علحدہ لے جانے کے لئے کہتی ہے۔ اسی اثنا میں گنگا بائی آہستہ سے بالاخانہ پر آجاتی ہے۔ خود چھپکر صحن پر نظر ڈالتی ہے۔ غل کچھ دیر کے لئے کم ہوجاتا ہے اور بخشش علی کی بلند آواز اور ڈانٹ پھٹکار سنائی دیتی ہے۔ راؤ آپا اور لڑکا جب آواز تیز ہوتی ہے ٹھہر جاتے ہیں مگر لڑکا کچھ نہ کچھ بولتا جاتا ہے۔

بخشش علی کی آواز:۔ کہاں ہے؟ وہ لامذہب بت پرست بے حیا عورت! کہاں ہے؟ ہمارے عتاب سے ان کافروں کو کیسے بچائے گی۔ اُس کو باہر لے آؤ میں خود اُسے قتل کروں گا۔ انگریزوں کے سب دوست ہمارے دشمن ہیں۔ لے آؤ! ورنہ ہم اِس منحوس بھٹہ میں آگ لگا دیں گے۔ خدا نے یہ پاک کام میرے سپرد کیا ہے کہ میں ہندوستان کو ان تمام وباؤں اور خباثتوں سے پاک کردوں۔ جاؤ ابھی لاؤ ورنہ تم سب قتل کئے جاؤ گے (باہر شور ہوتا ہے اور اُس کی آواز گم ہوجاتی ہے۔)

رانی:۔ (جس طرح کوئی کسی کام پر تیار ہو انند راؤ کی طرف اشارہ کرکے) راؤ آپا! اِس چوں چوں کرنے والے چوہے کو لے جاؤ اور کسی سوراخ میں چھپا دو۔ نہ یہ سچا مرہٹہ معلوم ہوتا ہے نہ شاہی خاندان کا موزوں قایمقام ہوسکتا ہے۔

(راؤ آپا دروازے کی طرف جاتا ہے اور انند راؤ کو ہاتھ پکڑ کر لے جاتا ہے۔ یکایک لڑکا ہاتھ چھڑا لیتا ہے اور رانی کی طرف جھپٹتا ہے اور چھوٹے ہاتھوں سے اُسکو پکڑ لیتا ہے۔

انند راؤ:۔ مہربانی کرکے مجھے نہ بھیجئے۔ رانی ماں۔ میں اب نہ روؤنگا۔ میں مرنے سے نہیں ڈرتا مگر میں آنسو نکلنے سے مجبور ہوں۔ رانی ماں مجھے علحدہ نہ کیجئے۔ دیکھئے میں اب نہیں روتا ہوں۔ (ماں کی طرف دیکھکر) اور اگر چلاؤں بھی تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ میں ڈرتا ہوں۔ میں مرہٹہ سپاہی ہوں اور دشمن سے خوب مقابلہ کرسکتا ہوں۔

(رانی جھک جاتی ہے اور اُس کو گلے لگا کر پیار کرتی ہے اور راؤ آپا کو اشارہ کرتی ہے کہ وہ بالاخانہ سے دور ایک جانب کھڑا ہوجائے۔

گنگا بائی:۔ (زور سے بالاخانہ سے نیچے دیکھتی ہوئی) وہ توپیں لئے جارہے ہیں۔ محافظ اُن کو امداد دے رہے ہیں۔ اُن کو گولیاں بارود بھی مل گئی ہیں۔ لیجئے اب محافظ بتلا رہے ہیں کہ توپیں کیونکر بھری جاویں گی۔ توپیں اب علحدہ کی جارہی ہیں۔ بخشش علی اور اُس کے ہمراہی محل کی طرف آرہے ہیں۔ شاید اب وہ بدزبانی بھی کرے گا۔

بخشش علی کی آواز:۔ اُس رنڈی کو ادھر لاؤ! لاؤ! ہم اُس کو قتل کریں گے۔ وہ انگریزوں کی حامی ہے

جنھوں نے ہمارے مذہب کی تذلیل کی ہے اور ہماری عزت برباد کی ہے۔ اُس کو باہر لے آؤ! ورنہ اس منحوس جگہ پر کسی کی خیر نہیں۔

(رانی اپنی ساری سنبھالتی ہوئی ایک چھوٹے آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھتی ہے اور بالاخانہ کی طرف بڑھتی ہے۔ گنگا بائی اور راؤ آپا آگے بڑھکر اُسے روکتے ہیں لیکن وہ اُن سے چھوٹ کر دروازے پر پہونچتی ہے)

رانی :- (بالاخانہ سے) بخشش علی! میں بالکل تیار ہوں۔ اگر میری عزیز رعایا میری موت کی طالب ہے تو میں مرنے پر بالکل خوش ہوں۔ لیکن اسے جیل کے داروغہ! یاد رکھ کہ اگر میں اسوقت انگریزوں کی حمایت میں ایک کام بھی کرنا چاہتی ہوں تو تم نے ایسے بیس کام کئے ہیں۔ کیا تم نے اُن کی خوشامد نہیں کی اور بار ہا کتے کی طرح ان کے پاؤں نہیں چاٹے یہی لوگ جو اسوقت تمھارے پیچھے آوارہ کتوں کی طرح چل رہے ہیں تم سے کیا کچھ نقصان نہیں اُٹھا چکے ہیں۔ وہ اور دوسرے جھانسی والے ہمارے مابین فیصلہ کریں۔ جن غریبوں کو میں نے پوشاک دی، جن بھوکوں کو میں نے کھانا کھلایا اور جن فقیروں کو میں نے بھیک دی اور جن قیدیوں کو میں نے رہا کیا اگر میرا خون بہانا چاہتے ہیں بہائیں میں ایک لفظ شکایت زبان پر نہ لاؤں گی۔ لیکن اگر وہ میری زندگی نہیں ختم کرنا چاہتے تو یقیناً اُنھیں تم کو بخشش علی! تم کو اپنا شکار بنانا چاہئے۔ (ذرا سکوت ہوتا ہے اور ایک خفیف گنگناہٹ کی آواز آتی ہے) کیا؟ کیا تم کوئی فیصلہ نہیں کرسکتے؟ اچھا! میں فیصلہ کا انتظار کرتی ہوں اور اندر جاتی ہوں۔ جب تمھاری خواہش ہوگی میں تعمیل کے لئے فوراً آجاؤں گی۔ اگر باشندگان جھانسی جیل داروغہ بخشش علی کو رانی لکشمی بائی کے مقابلہ میں ترجیح دینا چاہیں تو یقیناً رانی لکشمی بائی کو موت سے ہم آغوش ہونا چاہئے۔

(جس وقت رانی بالاخانہ پر تقریر کر رہی تھی ماما صاحب ننگی تلوار لئے مع تارا سنگھ کے کمرے میں داخل ہوتے ہیں۔ ذرا ٹھہر کر ماما صاحب بالاخانہ کی طرف بڑھتا ہے۔ گنگا بائی مداخلت کرتی ہے اور واپس ہونے پر اصرار کرتی ہے۔ وہ سب جب تک تقریر ختم نہ ہوئی مستعدی سے کھڑے رہے اس کے بعد رانی واپس ہوتی ہے اور کسی قدر عام تشویش میں کمی ہو جاتی ہے۔ گنگا بائی بالاخانہ پر اپنی جگہ واپس جاتی ہے ماما صاحب تلوار میان میں کرلیتا ہے۔ رانی تھک کر بنچ پر لیٹ جاتی ہے تھوڑی ہی دیر میں گنگا کسی قدر پہلے سے بلند آواز میں بات شروع کرتی ہے۔)

گنگا بائی :- وہ اپنے خطرناک بھوتوں کے ساتھ واپس جا رہا ہے۔ صحن بالکل خالی ہوگیا۔ اکثر لوگ آپ کی تقریر سُنکر واپس ہوگئے۔ لوگ اُس کو نہیں چاہتے لیکن اُس کے قصاب ساتھیوں سے ڈرتے ہیں۔

بخشش علی کی آواز :- (دور سے) سُن! بے شرم رنڈی! ابھی ہم تجھے چھوڑے دیتے ہیں۔ پہلے تیرے انگریز

رفیقوں کو صاف کر دیں۔ تب تجھ کو سمجھیں گے۔ لیکن اگر اس اثنا میں تو نے ان بے دینوں کو ذرا بھی مدد دی تو ہم پہلے تجھے قتل کر ڈالیں گے۔ تیرا گوشت گدھوں کو کھلا دیں گے۔ خوب سمجھ لے جو بخشش علی کہہ رہا ہے۔ میں نے محافظ سپاہی محل کے گرد تعینات کر دئے ہیں اور اب کوئی بات مجھ سے نہ چھپ سکے گی۔

ماما صاحب:- کیا تم نے اُس کی آواز میں فرق کا امتیاز کیا بیٹی! تم نے اُسے ڈرا دیا ہے۔ اب وہ ہم کو زیادہ نہ ستائیگا جیسے ہی جھانسی راج قائم ہونے کا اعلان ہوگا ہم اُس کی بھی فکر کریں گے۔ (وہ دیوان کی طرف معنی خیز نگاہ سے دیکھتا ہے) ابھی اُسے چھوڑ دو۔ (رانی سے) بیٹی! میں ایک خوشخبری لایا ہوں پیشواؤں کا علم پھر بلند ہو گیا ہے۔ اس بات کا اعلان ہوا ہے کہ تمام سچے مرہٹہ ناناصاحب کی اعانت کے لئے جمع ہو جائیں۔

رانی:- (بیٹھی ہوئی) مرہٹہ کیونکر کامیاب ہو سکتے ہیں جبکہ مسلمان دہلی میں بہادر شاہ کو تخت پر بٹھا رہے ہیں۔

تارا سنگھ:- رانی صاحبہ! بہادر شاہ ضعیف شخص ہے اور وہ صرف برائے نام بادشاہ ہوگا — اصل حکمراں تو مرہٹہ سردار ہی ہوں گے۔

رانی:- کیا سندھیا اور ہلکر نے بادشاہت کا اعلان کر دیا ہے؟

ماما صاحب:- نہیں بیٹی! لیکن جہاں تک معلوم ہے گوالیار اور اندور کے حالات سندھیا اور ہلکر کو باغی سپاہیوں کی اعانت پر مجبور کریں گے۔

(ایک بلند آواز سنائی دیتی ہے اور اُس کے بعد دوسری پھر ایک خوشی کی گونج سنائی دیتی ہے۔ کمرہ میں ہر شخص چونک پڑتا ہے اور رانی بیٹھ جاتی ہے۔ رانی پھر سیدھی لیٹ جاتی ہے اور آہیں بھرتی ہے اور بال نوچتی ہے اور اُس کا چہرہ تکیوں میں چھپا ہے۔ انند راؤ دوڑ کر اُس کے پاس آتا ہے اور روتا ہوا اُس کے قدموں پر گر پڑتا ہے۔ اُسی وقت گنگا بائی بالاخانہ پر دوڑ کر جاتی ہے اور فوراً واپس آتی ہے۔)

گنگا بائی:- (اپنا ہاتھ آہستگی سے رانی کے ہاتھ پر رکھ کر اور غمگین آواز سے) بہن چپ رہیے۔ اچھا ہو کہ اس قلعہ کی دیواریں ہماری توپوں سے گرا دی جاویں بجائے اس کے کہ دشمن کی توپیں گرا دیں۔

(رانی کے غم کو دیکھ کر سب آدمی اپنا سر جھکا دیتے ہیں اور راؤ آپا بظاہر بہت متاثر معلوم ہوتا ہے)

تیسرا منظر

(وقت شب تاریخ ۸ر جون ۱۸۵۷ء۔ شمع روشن تھی۔ کمرہ تاریک اور خاموش تھا۔ رانی پلنگ پر لیٹی ہوئی پنکھا جھل رہی ہے اور پریشان نظر آتی ہے۔ گنگا بائی رانی کے پاؤں کے پاس کھڑی ہے۔ انند راؤ اور

راؤ آپا چوکی پر بیٹھے ہوئے اسلحہ پر صیقل کر رہے ہیں۔)

رانی :۔ (آہ بھر کر) کاش گنگا بائی میں نے تمہاری نصیحت مان لی ہوتی اور اس مصیبت سے بھاگ نکلتی کہ میرے دماغ کو تو سکون ہو جاتا۔

گنگا بائی :۔ (افسوس کرتے ہوئے) بہن! ہونے والا ہو کے رہتا ہے۔ تمہاری تقدیر میں رنج تھا اور میری تقدیر میں اُس رنج میں شرکت کرنا۔ یہی ہمارا دھرم ہے۔ اور پھر بھاگ بھی کہاں جاتے۔ یہ مصیبت تو ہر جگہ پھیلی ہوئی ہے۔

رانی :۔ یہی کہکر میں بھی اپنے دل کو تسکین دیتی ہوں کہ اپنے ہی آدمیوں میں رہکر مصیبت کا مقابلہ کیوں نہ کروں ادھر اُدھر جاکر نئے خطروں میں کیوں پڑوں۔

گنگا بائی :۔ بہن! میں جانتی ہوں کہ بغیر آپ کے جھانسی میں امن دشوار ہے۔ ہر شخص اپنے فائدہ کی فکر میں ہے

(بگل کی آواز باہر سے آتی ہے۔ رانی بیٹھ جاتی ہے اور ہر ایک ہوشیار ہو جاتا ہے۔)

رانی :۔ یہ سپاہیوں کے سردار ہوں گے۔ میرے باپ نے مجھے اُن کو یہاں لے آنے کی دھمکی دی ہے گنگا بائی جلد میری زریں شال لے آؤ۔ ان بدتمیزوں سے رانی ہی کی طرح مجھے بات چیت کرنا چاہیے۔ (گنگا بائی کمرہ سے باہر جاتی ہے۔) انند! تم تلوار اور زرہ بکتر لگالو۔ ہم کو ان معمولی سپاہیوں کو مرہٹہ شاہزادہ کی صورت دکھا دینا چاہیے

(رانی نے آئینہ دیکھا، اپنی ساری اور بال ٹھیک کئے۔ راؤ آپا نے انند راؤ کو اسلحہ پہنائے گنگا بائی واپس ہوتی ہے اور رانی کو شال اُڑھاتی ہے۔ پھر وہ سلیپر پہناتی ہے۔ دروازہ کھلتا ہے اور باباصاحب معہ تارا سنگھ اور دو ہندوستانی حکام کے اندر آتے ہیں۔ اور نمبر ۱۲ رجمنٹ نیٹو انفنٹری اور نمبر ۱۴ ارگر کیولری کو احکام دیتے جاتے ہیں۔ جمعدار لال بہادر اور رسالدار لال محمد دونوں بنگال آدمی ہے کے افسران ہیں جو ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوج ہے۔ اول الذکر ایک چمکدار سُرخ وردی جس پر سفید حاشیے ہیں پہنے ہوئے ہے اور ایک تلوار سفید پٹکے سے لٹکتی ہے۔ رسالدار سفید کوٹ کے ساتھ سفید برجس پہنے ہوئے ہے جو گھٹنے کے نیچے چست ہے اور اوپر کی طرف ڈھیلی اور ایک کرتہ پہنے ہے جو گھٹنوں تک نیچا ہے۔ منھ پر داڑھی ہے اور سر پر پگڑی ہے جھالر کی پگڑی سفید ہے اور رسالدار کی پیلی۔ اول الذکر فوجی بوٹ پہنے ہے اور دوسرا ہندوستانی جوتا۔ رانی کھڑی ہے اور انند راؤ اُس کے پاس کھڑا ہے۔ گنگا بائی اور راؤ آپا پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ رانی کو دونوں افسر فوجی قاعدہ سے سلام کرتے ہیں۔ وہ اپنا ہاتھ کسی قدر اُٹھاتی ہے اور کسی قدر گردن جھکاکر سلام لیتی ہے۔ بعد ازاں خاموش کھڑی رہتی ہے۔ سیدھی لیکن گردن پیچھے گرائے ہوئے۔

جمعدار :- (کرتے سے ایک دستاویز نکال کر) رانی صاحبہ ہم لوگ غیر مہذب آدمی ہیں اور محلات کی تہذیب سے ناواقف ہیں۔ اگر ہم خلاف تہذیب کوئی بات کریں تو معاف کئے جاویں۔ وقت کم ہے اور ہمیں دوسرے ضروری کام ہیں۔ اس لئے معاف کیجئے ہم اُس اعلان کو جو ہم نے آپ کے مقتدر باپ اور دیوان کے مشورہ سے تیار کیا ہے پڑھتے ہیں۔ (دستاویز پڑھنا شروع کرتا ہے) مخلوق خدا کی ہے دونوں مذہب ایک ہی آزادی رکھتے ہیں۔ ملک بادشاہ دہلی کا ہے۔ اور رانی لکشمی بائی اُس کے نام سے جھانسی میں حکمران ہے۔ (تارا سنگھ کو دستاویز دیکر) پس رانی صاحبہ آپ ان شرائط کو قبول کیجئے اور اپنی مہر لگا دیجئے۔

رانی :- جمعدار صاحب شرائط کیا ہیں۔

جمعدار :- ہم نے آپ کے مشیروں سے بار بار کہدیا ہے۔ ہمارے شرائط یہ ہیں کہ آپ ہم کو دہلی لیجانے کے لئے روپیہ آدمی سامان وغیرہ فراہم کر دیجئے۔ آپ جھانسی کے بادشاہ کے نام سے حکومت کیجئے اور انگریزوں اور اُنکے رفقا کے حملوں کا مقابلہ کیجئے۔ آپ اس کام کے لئے حسب ضرورت فوج رکھئے۔ اور آپ وعدہ کیجئے کہ آدمی اسلحہ اور روپیہ سے ضرورت کے وقت آپ مدد کریں گی۔

رانی :- اور اگر میں انکار کروں ؟

رسالدار :- (بدتہذیبی سے) تو آپ اور آپ کا لڑکا تخت سے علحدہ کر دئے جاویں گے۔ یا شرائط قبول کیجئے یا علحدگی منظور کیجئے۔

جمعدار :- (اپنے ساتھی کے بازو پر اُس کو روکنے کے لئے ہاتھ رکھ کر) رانی! ہمارے دوست کو معاف کیجئے۔ اس کی زبان فوجی زبان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے آپ سے فوری فیصلہ کا اصرار نہیں کیا ہے اور وقت میں توسیع کرتے رہے ہیں کیونکہ آپ کے والد نے آپ کو ہمارا ساتھ دینے کے لئے تیار کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ لیکن اب انتظار کا موقع باقی نہیں ہے۔ آپ خود جانتی ہیں کہ جھانسی تباہی میں ہے۔ بدمعاش چور قاتل چاروں طرف گھوم رہے ہیں۔ اور لوگ ہم سے اصرار کرتے ہیں کہ کوئی معقول راج قایم ہو جانا چاہئے تاکہ جرائم کا انسداد ہو جائے۔ وہ یقین نہیں کرتے کہ یہ سپاہیوں کا قصور نہیں ہے کہ دوبارہ جھانسی میں راج نہیں قائم ہوا۔ وہ بار بار کہتے ہیں کہ اگر ہماری پیاری رانی کو تم گدی پر نہیں بٹھاتے ہو تو کسی اور کو بٹھا دو۔

رسالدار :- (بدتہذیبی سے) اور کل صورت حال اور بدتر ہو جائیگی جب انگریز ہم کو قلعہ سپرد کر دیں گے۔ اگر کسی با اختیار آدمی نے اُن کی حفاظت نہ کی تو بخشش علی اور اُس کے ظالم رفقا اُن کو ذبح کر ڈالیں گے ہم اُن کی حفاظت کے لئے نہیں بیٹھے رہیں گے۔ مزید براں ہمارے لئے حکم ہے کہ ہم قلعہ پر قبضہ کر کے فوراً دہلی روانہ ہو جاویں۔

ماما صاحب :۔ (نرمی سے) بیٹی! شاید تم کو معلوم ہوا ہو کہ ہمارے دوست (افسروں کی طرف اشارہ کرکے) سداشیو راؤ سے ملکر آئے ہیں جو تمھارے خلاف اور انند کے خلاف کچھ عرصہ سے سازش کر رہا ہے۔ یہ بدمعاش بہت گستاخ ہوگیا ہے اور راجہ گنگا دھر کا رشتہ دار بنتا ہے۔ گدی کا بذات خود مالک بنتا ہے۔

جمعدار :۔ رانی! یہ درست ہے۔ اور ہم نے سداشیو راؤ سے کہدیا ہے کہ اگر آپ ہمارے شرائط نہ قبول کرینگی تو ہم اُس کے راجہ ہونے کا اعلان کردیں گے۔

(رانی ان کی طرف سے منھ پھیر لیتی ہے اور ہتیلی پر ہتیلی رکھ کر ہاتھ جوڑتی ہوئی تین بار گردن جھکاتی ہے اور کچھ کہتی ہے۔ پھر گھوم کر دونوں افسروں کی طرف دیکھتی ہے۔)

رانی :۔ جمعدار صاحب! قبل اس کے کہ میں اپنا آخری تصفیہ بتلاؤں مجھے ایک سوال کا جواب دو۔

جمعدار :۔ رانی صاحبہ پوچھئے!

رانی :۔ اگر میں جھانسی راج قایم کربھی دوں تو اس بات کی کیا ذمہ داری تم لیتے ہو کہ تم پھر میرے خلاف بغاوت نہ کروگے جبکہ تم انگریزوں کے خلاف غدر کر رہے ہو؟

رسالدار :۔ (اپنے دوست کو الگ ہٹاکر) میں جواب دونگا۔ صرف ایک ذمہ داری۔ اور وہ یہ کہ آپ اُن لوگوں کے ساتھ اچھا سلوک کریں جو آپ کے لئے اپنی جان خطرہ میں ڈالیں۔ انگریزوں نے میری تیس برس کی ملازمت کے صلہ میں مجھے کیا انعام دیا۔ جوانی میں جنرل پولک کے ساتھ میں افغانیوں کے ملک کابل کو گیا اور انگریزوں کو قید سے رہا کرایا۔ بعدازاں نیپر صاحب کے ساتھ سندھ میں خدمات انجام دیں اور میانی کی جنگ میں لڑا۔ بعدازاں گف صاحب کی ماتحتی میں سکھ خالصہ کے مقابلہ میں مدد کی۔ اور فیروزپور میں لڑا۔ پھر فیروزآباد اور سبراؤں میں لڑا۔ سکھ جنگ کے بعد میں برما اور سکیم کے میدان میں گیا۔ میرے جسم پر چھ زخم ہیں۔ بائیں پاؤں کی دو انگلیاں ندارد ہیں صرف دائیں کان سے سُن سکتا ہوں اور اس سب کے صلہ میں مجھے کیا ملا۔ مجھے اپنا گھوڑا۔ سائیس اور وردی رکھنا پڑتی ہے اور اپنی خوراک کا خود انتظام کرنا پڑتا ہے۔ بحالت صلح میری تنخواہ میرے ذاتی خرچ اور بال بچوں کے خرچ کے لئے بالکل ناکافی ہے اور میدان جنگ میں جانے کے لئے مجھے ساہوکاروں کے پاس جانا پڑتا ہے۔ میری تمام جائداد رہن ہے اور میری بیوی کے اکثر زیور گروی ہیں۔ پھر بتلائیں انگریزوں سے کس طرح محبت کروں؟

جمعدار :۔ رانی! میرے دوست رسالدار صاحب بدزبان ہیں لیکن ان کا دل بالکل پاک ہے۔ زبان ضرور تلخ ہے اور ہم سب قریب قریب ایسے ہی ہیں۔ ہم یہ ساری مصیبت برداشت کرلیتے۔ لیکن جب کارتوسوں میں سور کی چربی لگی دیکھی تو ہمارا صبر جاتا رہا۔ ایک سپاہی سب سے زیادہ اپنی عزت کا خیال رکھتا ہے۔

رسالدار:- (آگے جھپٹ کر) بادشاہ کی حکومت کے زمانہ میں اور خود مرہٹہ حکمرانوں کے زمانہ میں ایک جنگجو سپاہی اگر قابلیت اور عقل رکھتا تھا تو وہ ترقی پاکر فوج کا حاکم اور صوبہ دار بن سکتا تھا۔ لیکن اب ایک نوجوان سوار یا سپاہی کوئی امید ترقی نہیں کر سکتا۔ ہم سب کمپنی کے معمولی سپاہیوں سے زیادہ نہیں۔ سب مصیبت اور ذلت میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ انگریزی حکام کرنل جرنل بن جاتے ہیں یا اچھی اچھی جگہوں پر متعین ہو جاتے ہیں۔ مجھکو اور میرے دوست کو سوائے ایک معمولی پنشن کے کیا امید ہے۔ وہ بھی جب زندہ رہے۔ بنگال فوج کے سپاہی اور سوار کمپنی کے علم کو ہندوستان بھر میں لئے گھوم رہے ہیں۔

(جب رسالدار گفتگو کرتا ہے بالاخانہ سے رونے چلانے کی آواز آتی ہے۔ رانی راؤ آپا کو جو کھڑکی کے قریب کھڑا ہے دیکھتی ہے اور یہ بھی دیکھتی ہے کہ صحن میں کیا ہو رہا ہے۔ جب راؤ آپا کی نظر اس پر پڑتی ہے تو راؤ آپا کمرہ سے باہر جاتا ہے۔ آواز زیادہ بڑھتی جاتی ہے یہاں تک کہ رسالدار کے الفاظ سنائی نہیں دیتے۔ رانی دروازہ کو غور سے دیکھتی ہے۔ کہ شاید راؤ آپا آتا ہو اور پھر سب کی طرف دیکھتی ہے۔ اا صاحب دروازہ کی طرف جھکتا ہے۔ جس کو راؤ آپا کھولتا ہے اور الگ ہو جاتا ہے اور بہت سے قصبہ کے باشندے دربار کے کمرہ میں داخل ہوتے ہیں۔ سب خوفزدہ اور گھبرائے ہوئے۔ رانی کے سامنے زمین بوس ہوتے ہیں اور اپنے ماتھے زمین سے ٹکراتے ہیں اور سینہ ہاتھوں سے پیٹتے ہیں اور زار و قطار روتے ہیں جو لوگ باہر کھڑے ہیں وہ بھی رو رہے ہیں۔ راؤ آپا کمرہ کے اندر کی غل کے متعلق دریافت کرنے کی کوشش کرتا ہے)

رانی:- (غصہ سے) راؤ آپا! اس کے کیا معنی ہیں؟ کیا تم پاگل ہو گئے ہو جو سب کو اس طرح دربار میں گھس آنے دیا!

راؤ آپا:- رانی صاحبہ! وہ کوئی خوفناک خبر سنانے آئے ہیں۔

رانی:- (قریب کھڑے ہوئے باشندوں سے) کیا ہے؟ بولو! کیا ہے؟ (اور زیادہ رونا پیٹنا شروع ہوتا ہے) خوف مت کرو۔ جو کچھ کہنا ہے کہو۔

پہلا باشندہ:- (رو کر) انگریز قیدی - رانی صاحبہ! انگریز قیدی - (سسکیاں لیکر)

رسالدار:- (غصہ سے) انگریز قیدی بیوقوف کہاں ہیں؟ بتلاؤ یہ غل و شور کیوں ہے ورنہ میں تم سب کی کھال کھینچ لوں گا۔

رانی:- (آہستہ سے) اسے کہنے دیجئے۔ رسالدار صاحب! آپ اس سے پھر سوال کر سکتے ہیں۔ ہاں! کہو! انگریز قیدیوں کی نسبت تم کیا کہتے تھے؟

سب باشندے:- (رو رو کر اور سینہ پیٹ کر) ان کو قتل کر ڈالا۔ رانی صاحبہ! بے رحمی سے قتل کر ڈالا۔

مرد ۔ عورت ۔ بچے!

(خاموشی پھیل جاتی ہے اور رانی اور حکام ایک دوسرے کو بنظر تعجب غور سے دیکھتے ہیں)

راؤ آپا:۔ (سمجھانے کے لئے آگے بڑھکر) جب رسالدار صاحب اور جمعدار صاحب اس قلعہ سے سہ پہر کو روانہ ہوگئے تو فوراً اُن کے پاس بخشش علی آیا۔ محصور انگریز قیدیوں کو ترغیب دی گئی کہ وہ اسلحہ رکھدیں اور قلعہ سے فوراً باہر نکل آویں اُن کو جھانسی سے بہ حفاظت دوسرے مقام پر پہونچا دیا جاویگا۔ انگریزوں نے شرائط قبول کئے۔ اور بخشش علی نے اُن کی محافظت کی ذمہ داری اپنے اوپر لی۔ کیونکہ وہ ہنوز اُن کا ملازم تھا۔ اُس نے اور اُس کے بدمعاش رفقا نے انگریزوں کو معہ بیوی بچوں کے جوکھن باغ پہونچایا۔ اور وہاں اُن سب کو یہ کہکر کہ سپاہیوں کے سرداروں کا حکم ہے قتل کرڈالا۔

(راؤ آپا کے بیان کے بعد رونا پیٹنا پھر جاری ہوا۔ رانی پریشان حال کرہ میں ادھر اُدھر گھومتی ہے بال بکھیرتی جاتی ہے اور پیشانی پیٹتی جاتی ہے۔ دونوں افسر ما صاحب اور تارا سنگھ سرگوشی کے لہجہ میں تعریف کرتے ہیں۔ راؤ آپا لوگوں کو دلاسا دیتا ہے۔ انند راؤ رانی کو پریشان دیکھکر گنگا بائی کے پاس جاتا ہے اور اُس کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے۔)

رانی:۔ (کسی طرف بغیر مخاطب ہوئے) افسوس! افسوس! ہم سب پر افسوس! اس بے رحمی اور وحشیانہ طریقہ کی خونریزی پر افسوس! ان مقتولین کی روحیں جب تک ہم زندہ ہیں ہمارے مسکن نہ چھوڑیں گی (غصہ سے) گیدڑو! دور ہو! تم اب مجھ سے کہنے آئے ہو جب سب قصہ ختم ہوچکا۔ تم اُسوقت میرے پاس کیوں نہ آئے جب تم کو یہ علم ہوا کہ انگریز قلعہ حوالہ کرنے پر ہیں۔ بیوقوفو! بزدلو! دور ہو! یہاں سے چلے جاؤ!

(رانی سب کو بھگا دیتی ہے اور پنکھے سے بھاگنے کا اشارہ کرتی ہے وہ گرتے پڑتے بھاگتے ہیں

رانی ایک خاص شاہانہ لہجہ میں مخاطب ہوتی ہے)

رانی:۔ جمعدار صاحب! آپ کے شرائط منظور ہیں اور اسی وقت سے جھانسی راج دوبارہ قائم ہوتا ہے اور رانی لکشمی بائی امور سلطنت منجانب کمار انند اپنے ہاتھ میں لیتی ہے۔ رسالدار صاحب میرا پہلا حکم یہ ہے کہ آپ اور جمعدار صاحب جائیں اور بخشش علی کو معہ ان لوگوں کے قتل کرڈالیں جو اس قتل عام میں شریک تھے۔ اُن پر رحم نہ کیا جائے فوراً قتل کرڈالے جائیں۔ آپ کو روپیہ میرے خزانچی دیں گے۔ جائیے اور جب تک کام نہو واپس نہ آئیے۔ (رسالدار اور جمعدار سلام کرتے ہیں اور چلے جاتے ہیں) دیوان صاحب! راج کے اعلان پر مہر لگائیے اور اس کو باہر جاکر پڑھ دیجئے۔ اور منادیوں کو ہر چہار طرف روانہ کیجئے کہ اعلان کردیں کہ رانی لکشمی بائی بطور نائب گدی پر بیٹھ گئی ہے اور لوٹ مار اگر کوئی کرے گا تو سخت سزا دیجائے گی۔ اور یہ بھی اعلان کیا جائے کہ

بخشش علی اور اُس کے بدمعاش رفقا کو کوئی پناہ نہ دے کیونکہ راج نے اُن کے قتل کا حکم دیا ہے۔

(تارا سنگھ سلام کرتا ہے اور رخصت ہوتا ہے اعلان اور مہر اُس کے ہاتھ میں ہے پھر بالاخانہ پر جاتا ہے اور باشندوں کو اعلان پڑھ کر سُناتا ہے۔)

رانی :- ابا! آپ اور راؤ آپا محل کی حفاظت کے لئے ایک گارڈ جلد مقرر کیجئے اور ایک فوج ہوشیار سپاہیوں کی تیار کیجئے۔ دیر نہ کیجئے۔ ہم کو معلوم نہیں کس وقت جنگ کرنا پڑے۔

(ماما صاحب اور راؤ آپا جھک جاتے ہیں اور باہر جاتے ہیں۔ رانی اندر راؤ کی طرف ہاتھ بڑھاتی ہے جو گنگا بائی کے پاس سے جھپٹ کر آتا ہے اور اُس کے چمٹ جاتا ہے۔ تب وہ ایک ہاتھ اندر راؤ کے سر پر رکھتی ہے اور دوسرا ہاتھ پھیلا کر قسم کھاتی ہے)

رانی :- اس وقت سے میں قسم کھاتی ہوں کہ آیندہ فوج کے ساتھ ہمیشہ جنگ میں آگے رہوں گی۔ آج بیگناہوں کا خون جھانسی میں میری مرضی کے خلاف گر میرے نام سے بہایا گیا ہے۔ میں ہمیشہ اپنی رعایا کے لئے اپنا خون بہانے پر تیار رہوں گی۔

(اِدھر اُس نے یہ تقریر ختم کی اور اُدھر اعلان سُنانے پر "رانی لکشمی بائی کی جے" کا نعرہ بلند ہوا)

(باقی)

روحانئین مغرب کی شعبدہ کاریاں

گزشتہ ماہ کے ملاحظات میں ہم نے ظاہر کیا تھا کہ روحانئین مغرب جن طریقوں سے کام لیکر بقاء روح کو ثابت کرنا چاہتے ہیں وہ یکسر مکر و فریب ہیں، اور آج کی صحبت میں ہم کسی قدر تفصیل کے ساتھ بتانا چاہتے ہیں کہ وہ کس کس طرح لوگوں کو دھوکا دیتے ہیں۔

مشرق میں اہل تصوف سے زیادہ روح و روحانیت کا قایل کوئی نہیں، لیکن انھوں نے اس اصطلاح کو ہمیشہ اخلاق انسانی سے متعلق سمجھا اور روحانیت کا مفہوم ہمیشہ درستی اخلاق لیا گیا۔ انھوں نے وجود روح کا مفہوم کبھی یہ نہیں لیا کہ وہ اس دنیا کے انسانوں کی طرح زندگی بسر کرتی ہے اور تمام وہ خواہشات اپنے اندر رکھتی ہے جو عالم آب و گل میں تعلق جسم کے ساتھ اس کے اندر پائے جاتے تھے۔ برخلاف اس کے اہل مغرب چونکہ مادہ پرست ہیں اس لئے وہ وجود روح کے قایل ہوئے بھی تو اس شان کے ساتھ کہ روحیں آتی ہیں، باتیں کرتی ہیں، گاتی ہیں، ناچتی کودتی ہیں، عشق و محبت کرتی ہیں اور وصل و ہجر کی ہر اُس لذت و اذیت سے متاثر ہوتی ہیں جو اس دنیا میں پائی جاتی ہے۔

میں نے یہاں کے بعض کم علم و ناواقف حضرات کو نہایت فخر کے ساتھ یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ "اب تو اہل مغرب بھی روحانیت کے قایل ہوتے جا رہے ہیں اور عنقریب وہ اسلام کی ہر تعلیم کو اسی طرح ماننے پر مجبور ہونگے" لیکن ان کو مطلق اس کا علم نہیں کہ یورپ میں یہ شغلہ ایک کھیل سے زیادہ نہیں ہے اور جن ذرایع سے وہ وجود روح کو ثابت کر رہے ہیں اُن کی حقیقت شعبدہ و فریب نظر کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔

مغرب میں ان روحانی کرشموں کی ابتدا ۱۸۴۸ء سے ہوتی ہے جب موضع ہیڈسول (نیویارک) کے ایک کاشتکار جان فاکس کے مزرعہ میں ان کی اولین نمایش کی گئی۔ فاکس کی کئی لڑکیاں تھیں جن میں ایک کا نام مارگرٹ فاکس تھا اور اسی نے سب سے پہلی مرتبہ ظاہر کیا کہ اس کے ذریعہ سے روحیں آتی ہیں اور اپنا حال بیان کرتی ہیں۔ اس کے بعد یورپ اور خصوصیت کے ساتھ امریکہ میں اس نوع کے مظاہروں کا رواج بڑھتا گیا اور ایسی ایسی ترکیبیں اختیار کی گئیں کہ آخرکار کینن ڈایل اور سر آلیور لاج ایسے لوگوں کو بھی اس کا یقین آگیا اور اس

شدت کے ساتھ کہ ان مکاریوں کا راز کھلنے کے بعد بھی وہ اس خیال سے منحرف نہ ہوئے۔

روحانیئین مغرب نے جن کو مدعی وجود روح کہنا زیادہ مناسب ہوگا روح و روحانیت کا کیا مفہوم لیا ہے اور کن کن طریقوں سے وہ وجود روح کو ثابت کرنا چاہتے ہیں اس کی تفصیل غالباً دلچسپی سے خالی نہ ہوگی۔

اہل مغرب نے چونکہ روحانیت کا تعلق، علی الرغم اہل مشرق، اخلاقیات سے نہیں رکھا ہے اسلئے حیات بعدالموت کی نسبت بھی ان کے تمام خیالات کا مرکز وہی مادہ ہوا کرتا ہے جس کی پرستش وہ دنیائے آب و گل میں کیا کرتے تھے۔ اور اسی لئے وہ وجودِ روح کو بھی بالکل وجود جسم کی طرح مانتے ہیں یعنی روح کے جو حالات و کوائف تعلق جسم کی حالت میں پائے جاتے ہیں وہی جسم سے علیحدہ ہونے کے بعد بھی باقی رہتے ہیں۔ چنانچہ اپنے ملک کی روحوں کے جو پیغامات انھیں موصول ہوتے رہتے ہیں وہ بھی وہی تو سن کھن والی ذہنیت کو ظاہر کرنے والے ہوتے ہیں۔ اور جو تصویریں روحوں کی پیش کی جاتی ہیں ان میں بھی وہی آڑی مانگ، وہی اونچی ایڑی کا جوتہ اور وہی پوڈر لگا ہوا چہرہ سامنے آتا ہے جو اس دنیا میں نظر آتا تھا۔ الغرض وہ لوگ اس دنیا اور دوسری دنیا میں کوئی فرق نہیں سمجھتے اور یہاں وہاں کی زندگی ان کو بالکل یکساں نظر آتی ہے۔ لیکن اس سے زیادہ دلچسپ بیان ان طریقوں کا ہے جن کے ذریعہ سے وہ روحوں کا وجود ثابت کرتے ہیں۔

(ا) سب سے پہلے جس ذریعہ سے روح کی آمد ظاہر کی گئی وہ رگڑ یا کھٹ کھٹ کی آواز تھی اور سب سے پہلے فاکس کی لڑکیوں نے اس دھوکے کو استعمال کیا۔ صورت یہ ہوا کرتی تھی کہ لوگ ایک میز کے پاس خاموش بیٹھ جاتے تھے اور مارگرٹ فاکس ان سے کہتی تھی کہ جب مطلوبہ روح آئے گی تو وہ خود کھٹ کھٹا کر اطلاع دیگی چنانچہ تھوڑی دیر بعد یہ آواز خود بخود پیدا ہوتی تھی اور لوگوں کو روح کی آمد کا یقین ہو جاتا تھا۔ ایک زمانہ تک اس کا پتہ نہ چلا کہ یہ آواز کہاں سے آتی ہے لیکن ۱۸۸۸ء میں خود مارگرٹ نے اس راز کو ظاہر کیا اور بتایا کہ وہ یہ آواز اپنے پاؤں کے انگوٹھے سے پیدا کرتی تھی۔

بعد کو یہ آوازیں لوگوں نے اور مختلف طریقوں سے پیدا کرنی شروع کیں یعنی پاؤں کے ناخن بڑھا کر ان کو ایک دوسرے سے رگڑنا یا میز کی لکڑی پر پوشیدہ طور پر ناخنوں کے تصادم سے آواز پیدا کرنا۔ بعض نے یہ ترکیب اختیار کی کہ گھٹنے کے زیریں حصہ میں لکڑی کا ٹکڑا باندھ لیتے تھے اور اُسے کرسی سے رگڑ کر آواز پیدا کرتے تھے۔ بعض نے میکانکی طریقے استعمال کر کے پنسل، گھڑی، چاقو اور قلم کے اندر سے یہ آوازیں پیدا کیں۔ ایک شخص نے اپنے جوتہ کی ایڑی میں سیسہ کی ہتوڑی چھپا رکھی تھی اور اس کا تعلق ایک دھاگہ سے رکھا تھا جو پتلون کے پائنچوں کے اندر اندر اس کے ہاتھ تک پہونچتا تھا اور جب وہ اس دھاگہ کو کھینچتا تھا تو ہتوڑی کو جنبش ہو کر اس سے عجیب قسم کی آواز پیدا ہوتی تھی۔

زمانۂ حال میں بجلی کی مدد سے بھی یہ آوازیں پیدا کی جاتی ہیں۔ یہ برقی آلات جیب میں چھپے رہتے ہیں اور بجلی کا بٹن قالین کے نیچے ہوتا ہے اور اُسے دبا کر کمرہ کے مختلف مقامات سے آواز پیدا کیجا سکتی ہے۔

(۲) دوسرا طریقہ طلب ارواح کے مظاہرہ کا یہ ہے کہ میز کا ایک کونہ یا دو کونے یا پوری کی پوری میز بلند ہو جاتی ہے اور لوگ اس کا راز نہ سمجھ سکنے کی وجہ سے آمدِ روح کے قایل ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ مکر و شعبدہ یہاں بھی کام کرتا ہے۔ اس کی کئی صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ عامل اپنا ایک پاؤں میز کے پائے کے نیچے سرکا لیتا ہے اور اس کی جنبش سے میز کا ایک کونا اونچا ہو جاتا ہے اگر عامل کا کوئی دوسرا شریک بھی ہے تو وہ دوسرے کونے میں بیٹھکر یہی حرکت کرتا ہے جس سے میز کے دونوں کونے بیک وقت اُٹھ جاتے ہیں بعض عامل یہ ترکیب کرتے ہیں کہ ہاتھ کی اُنگلی میں مضبوط چھلا پہن لیتے ہیں اور جہاں بیٹھتے ہیں وہیں میز میں ایک چھوٹی سی کیل لگا دیتے ہیں تاکہ چھلے کے اندر اس کو ڈالکر میز کو اُٹھایا جا سکے۔ کبھی کبھی بجائے چھلے کے لوہے کی سلاخ استعمال کی جاتی ہے جو آستین کے اندر چھپی ہوتی ہے اور کلائی پر چمڑے کے تسمہ سے مضبوط کس دیجاتی ہے۔ چونکہ طلب روح کا مظاہرہ ہمیشہ تاریکی یا بہت کم روشنی میں کیا جاتا ہے اور دوسرے لوگوں کو ہدایت ہوتی ہے کہ میز کے اوپر اپنے ہاتھ اور نیچے اپنے پاؤں ایک دوسرے سے ملالیں، اس لئے ان کو کوئی موقعہ یہ معلوم کرنے کا نہیں ملتا کہ عامل کہاں اپنا پاؤں رکھتا ہے اور کس جگہ اپنا ہاتھ لیجاتا ہے۔

سائنٹفک میگزین کا مشتہرہ انعام حاصل کرنے کی غرض سے ایک مشہور عامل عورت مارگیری نے یہی عمل کیا تھا لیکن مغرب کا مشہور شعبدہ باز ہوڈنی وہاں موجود تھا، اس نے اس مکر کو معلوم کر لیا اور یہ راز فاش ہو گیا۔

اگر کوئی ایسا عامل آپ کو ملے تو آپ بہت بھاری میز اس کے سامنے رکھئے اور دیکھئے کہ وہ کیا کہتا ہے اول تو وہ میز میں بیسیوں نقص نکال کر ہلکی میز طلب کرے گا اور اگر اس میں کامیاب نہ ہوا تو کوئی اور بہانہ کر کے ٹالدیگا، کیونکہ یہ عمل صرف ہلکی میزوں پر آسانی سے ہو سکتا ہے۔

(۳) تیسرا طریقہ مظاہرہ روحانیت کا یہ ہے کہ پوشیدہ سوالوں کا جواب دیا جاتا ہے۔ اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ عامل تین سادے کارڈ پیش کر کے ایک پر سوال لکھواتا ہے اور اسے باقی دو کارڈوں کے درمیان رکھ کر پیشانی کی طرف لیجاتا ہے اور سوال کا جواب دیتا ہے۔ اس میں ہتھکنڈا یہ ہوتا ہے کہ جن دو کارڈوں کے درمیان سوال والا کارڈ رکھا جاتا ہے اُن میں نیچے کا کارڈ فریم کی طرح کٹا ہوا ہوتا ہے اور پیشانی کی طرف لیجاتے ہوئے اُسے اس طرح لیجاتے ہیں کہ درمیانی کارڈ کی عبارت نگاہ سے گزر جاتی ہے۔

کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ لفافہ کے اندر سوال کا کاغذ بند کرا کے جواب دیتے ہیں اس کی ترکیب یہ ہے کہ

ایک رومال الکحل سے تر عامل کے پاس ہوتا ہے اور جب اس سے لفافہ کو تر کر لیا جاتا ہے تو اندر کی تحریر نمایاں ہو جاتی ہے اور تھوڑی دیر میں الکحل اُڑ جاتا ہے۔

کبھی سوال پیڈ (Pad) پر لکھوایا جاتا ہے۔ اس کی ترکیب یہ ہے کہ پیڈ کے جس کاغذ پر سوال لکھا جاتا ہے اُس کے نیچے کے کاغذ پر پرافن (Paraffin) ملا ہوا ہوتا ہے، اور جب اس پر باریک کوئلہ چھڑکا جاتا ہے تو تحریر نمایاں ہو جاتی ہے۔

ایک صورت یہ بھی ہوتی ہے کہ سوال کے کاغذ کو توڑ مروڑ کر ایک لفافہ کے اندر بند کر دیا جاتا ہے اور اُس لفافہ کو آگ میں جلا دیا جاتا ہے۔ اس میں یہ چالاکی ہوتی ہے کہ جس وقت لفافہ کو آگ میں جلاتے ہیں تو چمٹے سے وہ حصہ لفافہ کا دبا لیتے ہیں جہاں سوال کا کاغذ ہوتا ہے اور اس طرح وہ جلنے سے محفوظ رہتا ہے اس کے بعد اس کو کسی ترکیب سے دوسرے کمرہ میں جا کر پڑھ لیتے ہیں اور جواب دیدیتے ہیں۔

(۴) کہا جاتا ہے کہ روحیں آکر تحریری پیام بھی دیتی ہیں اور لکھ کر سوالوں کا جواب دیتی ہیں۔ ماہرین فن نے اس کی تحقیق کر کے ثابت کر دیا ہے کہ عامل کے سوادِ خط اور ان روحانی تحریروں میں بہت مماثلت ہوتی ہے، اور یہ عمل اس طرح کیا جاتا ہے کہ پوشیدہ و غیر مرئی سیاہیوں کے ذریعہ سے پہلے ہی لکھ لیا جاتا ہے اور پھر گرمی، روشنی، پانی یا دواؤں کے ذریعہ سے وہ تحریر خود بخود اُبھر آتی ہے۔ اگر آپ شیشہ پر فرانسیسی کھریا مٹی سے کچھ لکھ کر صاف کر دیں تو مطلق کوئی تحریر نظر نہ آئے گی لیکن جب آپ منہ کے پاس لیجا کر اپنی سانس اس پر چھوڑیں گے تو تحریر نمایاں ہو جائے گی

(۵) روحانئینِ مغرب سلیٹ سے بہت کام لیتے ہیں اور طرح طرح کی چالاکیاں صرف کرتے ہیں۔ صورت یہ ہوتی ہے کہ سوال کرنے والا اور عامل دونوں میز کے سامنے بیٹھتے ہیں اس حال میں کہ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے ہوتے ہیں اور میز کے نیچے پاؤں سے پاؤں ملے رہتے ہیں۔ وہیں نیچے ایک سلیٹ رکھی ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں کوئی امکان عامل کی چالاکی کا نہیں ہے لیکن پھر بھی سلیٹ پر تحریر ظاہر ہوتی ہے، اس کی ترکیب یہ ہے کہ عامل کے جوتے اور موزے کا پنجہ پھٹا ہوتا ہے اور پنجہ کی مدد سے پنسل کو حرکت دیکر لکھ دیتا ہے۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ سلیٹ پر سوال لکھ کر میز پر اسے اُلٹا کر کے رکھدیا جاتا ہے، لیکن میز کی ساخت ایسی ہوتی ہے کہ ایک پوشیدہ کھٹکے کی مدد سے سلیٹ کے برابر میز کے تختہ کا ایک حصہ سرک جاتا ہے اور پھر مختلف آئینوں کے ذریعہ سے جو میز میں لگے ہوتے ہیں وہ پڑھ لیجاتی ہے۔

بعض دفعہ چالاکی سے سوال والی سلیٹ بدلکر دوسری سلیٹ جواب والی رکھ دیتے ہیں کبھی دو سلیٹوں

سے کام لیا جاتا ہے یعنی معمول کو دو سلیٹ دی جاتی ہیں، کہ وہ انھیں صاف کرکے عامل کو دیدے، اور جب ان کو کھولا جاتا ہے تو اندر سے کوئی پھول نکلتا ہے، حالانکہ یہ بھی ہاتھ کی چالاکی ہے اور کچھ نہیں۔

بعض دفعہ دو سلیٹیں ملاکر رکھدی جاتی ہیں اور ان کے اندر چاک پنسل ہوتی ہے، معمول اور عامل دونوں ہاتھ سے دبائے رہتے ہیں لیکن تھوڑی دیر بعد جب ان کو کھولا جاتا ہے تو چاک سے لکھی ہوئی تحریر نظر آتی ہے، اسمیں عجیب و غریب چالاکی سے کام لیا جاتا ہے اور وہ یہ کہ چاک پنسل خاص قسم کی طیار کی جاتی ہے جس میں لوہے کا بُرادہ بھی شامل ہوتا ہے اور پھر ایک قوی مقناطیس کے ذریعہ سے جو عامل کے ہاتھ میں ہوتا ہے اندر ہی اندر چاک پنسل کو حرکت دیجاتی ہے۔

اگر سلور نائٹریٹ یا کاسٹک پنسل سے کوئی عبارت سلیٹ پر لکھ کر تر کپڑے یا اسفنج سے صاف کر دیجائے تو غائب ہو جائے گی لیکن سلیٹ خشک ہونے پر وہ پھر نمودار ہو جائے گی۔

بعض دفعہ یہ تماشہ دکھایا جاتا ہے کہ آٹھ چھوٹی چھوٹی سلیٹیں ایک جگہ رکھی جاتی ہیں اور اُن کے نیچے ایک بڑی سلیٹ ہوتی ہے۔ سایل سے کہا جاتا ہے کہ نصف سلیٹیں ایک طرف رکھدو اور پھر باقی نصف مع بڑی سلیٹ کے ان کے اوپر رکھدو۔ اس کے بعد عامل و معمول دونوں بڑی سلیٹ پر ہاتھ رکھتے ہیں۔ اور پھر جب چھوٹی سلیٹوں کو اُلٹ کر دیکھا جاتا ہے تو درمیان کی ایک سلیٹ پر پیغام درج ہوتا ہے، اس کی ترکیب یہ ہے کہ بڑی سلیٹ میں ایک اور چھوٹی سلیٹ لگی ہوتی ہے جس پر پہلے سے تحریر درج ہوتی ہے اور بڑی سلیٹ پر ہاتھ رکھتے وقت عامل ایک کھٹکے کے ذریعہ سے اس کو علٰحدہ کر دیتا ہے۔

(۶) بعض عامل کمرہ کی تاریکی میں مختلف ترکیبوں سے روشنیاں بھی پیدا کرتے ہیں اس کی ترکیب یہ ہے کہ کاغذ کی موٹی دفتیوں پر ایک طرف مختلف قسم کے نشانات مثلاً صلیب، ستارہ وغیرہ چمکنے والی سیاہیوں کے ذریعہ سے بنا دیتے ہیں اور جب وہ اپنی جادو کی چھڑی سے انھیں اُٹھا کر کسی جگہ لٹکاتے ہیں تو چمکنے والا حصہ پلٹ کر سامنے کر دیتے ہیں۔ بعض مرتبہ کسی کونہ سے دفعتاً ایک روشنی پیدا ہوتی ہے اور غائب ہو جاتی ہے اسکی ترکیب یہ ہے کہ کسی مختصر سی چیز پر چمکنے والا مسالہ لگا کر کونہ میں چھپا دیتے ہیں اور پوشیدہ تاروں کے ذریعہ سے جن کا تعلق عامل کے پاؤں یا ہاتھ سے ہوتا ہے ان کو بلند کر دیتے ہیں۔

(۷) روحوں کی موسیقی بھی معمول کو سُنائی جاتی ہے اس کی ایک ترکیب تو یہ ہے کہ میز کے نیچے تختے میں باجہ کا بکس نصب کر دیتے ہیں اور تاروں کے ذریعہ سے موسیقی کے بعض ساز تیرتے ہوئے دکھاتے ہیں جس وقت یہ باجہ بجتا ہے تو کمرہ کی تاریکی کی وجہ سے معمول کو یہ معلوم کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ آواز کہاں سے آرہی ہے اور چونکہ کمرہ کی فضا میں وہ موسیقی کے ساز تیرتے ہوئے دیکھتا ہے تو اس کو یقین ہو جاتا ہے کہ یہ آواز ہیں

انھیں سازوں سے از خود پیدا ہو رہی ہیں۔ بعض مرتبہ گانے بجانے والے آڑ میں بٹھا دئے جاتے ہیں اور اُن سے یہ کام لیا جاتا ہے، کبھی ریڈیو گراموفون سے بھی یہ کام لیتے ہیں۔

(۸) بعض مرتبہ یہ ثابت کرنے کے لئے کہ عامل کا کوئی ہتکھنڈا شامل نہیں ہے اس کے ہاتھ پاؤں کرسی یا کسی ستون سے باندھ دیتے ہیں لیکن یہ سب شعبدہ و مکاری ہے کیونکہ رسی باندھنے کے طریقے اور ستون وغیرہ کی ساخت ایسی ہوتی ہے کہ عامل اپنے آپ کو خفیہ طور پر آزاد کر لیتا ہے اور پھر جو کچھ اسے کرنا ہوتا ہے کرتا ہے۔

(۹) کبھی روح کو روشن شعلوں، روشن دھوئیں اور نورانی لباس کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ سب فاسفورس وغیرہ چمکنے والی دواؤں کی مدد سے کیا جاتا ہے۔ کبھی عامل اپنے رومال پر یہ چیزیں مل لیتا ہے، کبھی ریشم کے گولوں پر مل کر اپنے منہ سے نکالتا ہے، کبھی تمام لباس پر مل کر بالکل انسانی قد و قامت کے ساتھ کمرہ کی تاریکی میں نمودار ہوتا ہے۔

اسٹاک ہوم کا ایک شخص نلسن ریشمی گاز کے ٹکڑے جن پر روشن مادہ ملا ہوتا تھا، نہایت خوبی و صفائی سے نگل نگل کر منہ میں لے آتا تھا، اور کہا یہ جاتا تھا کہ روح اس کے جسم کے اندر سے نمودار ہو ہو کر غائب ہو جاتی ہے۔

ایک عورت ایڈا انسی بٹ نے کینن ڈایل کو بھی اسی طرح دھوکا دیا تھا۔ اس نے کھانے کی میز کا تختہ علٰحدہ کر دیا اور ڈھانچے کے اندر اس نے بہت سی روشن روحوں کو پیش کیا، اس تماشہ میں بھی اسی چمکدار مسالہ سے کام لیا گیا تھا۔ جو لوگ روح بنکر آتے ہیں ان کا لباس بالکل سیاہ ہوتا ہے۔ اس سے یہ ہوتا ہے کہ جب کمرہ میں وہ سیاہ حصہ سامنے کر دیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ غائب ہو گئے اور جب دوسرا حصہ سامنے لے آتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ نمودار ہو گئے۔

بعض دفعہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دفعتہً کمرہ کے اندر سخت جھونکا نہایت سرد ہوا کا آ گیا۔ اسکی ترکیب یہ ہے کہ برف کے ٹکڑے ٹین کے ظروف میں بند کر کے چھپا دئے جاتے ہیں اور بجلی کے پنکھے کے ذریعہ سے ان کی برودت ونمی کو کمرہ میں پھیلا دیا جاتا ہے۔

(۱۰) روحوں کی تصویریں بھی لیجاتی ہیں اور اس سے لوگ بہت متاثر ہوتے ہیں، درانحالیکہ یہ سب شعبدہ ہے اور اس کے لئے مختلف طریقے استعمال کئے جاتے ہیں، کبھی پہلے کی اکسپوز (Expose) کئے ہوئے پلیٹ سے کام لیا جاتا ہے، کبھی لنس میں نشان دیکر خاص اثر پیدا کیا جاتا ہے، کبھی نصف پلیٹ پہلے سے اکسپوز کی ہوئی ہوتی ہے۔ الغرض اس کی بہت سی ترکیبیں ہیں جن کی وضاحت اس لئے مناسب نہیں کہ وہ فن فوٹوگرافی سے تعلق رکھتی ہیں اور ان کا سمجھنا آسان نہیں۔

بعض مرتبہ پردہ پر روحوں کی شکل نمودار ہو جاتی ہے، اس کی ترکیب یہ ہے کہ پہلے ہی سے اس پردہ پر بعض دواؤں سے تصویر بنا دیجاتی ہے اور پھر اس کو مختلف طریقوں سے اُبھار دیتے ہیں۔

اس عمل کے لئے سلفیٹ آف آیرن۔ سلفٹ آف کاپر۔ نائٹریٹ بسمتھ اور پر وشیٹ آف پوٹاس وغیرہ مختلف دواؤں کی ضرورت ہوتی ہے۔

(۱۱) بعض عامل، سایل کے بعض نہایت ہی پوشیدہ حالات زمانۂ ماضی کے بتاتے ہیں اس کا طریقہ صرف یہ ہے کہ وہ مختلف طریق پر پہلے ہی سے حالات کی تفتیش کر لیتے ہیں اور ان حالات کے معلوم کرنے میں وہ کافی روپیہ صرف کرتے ہیں۔

دُم دار ستارہ

دُم دار ستارہ نہایت آب و تاب کے ساتھ نمودار ہوا تھا اور اپنی ضیا باریوں سے تمام دنیا کو منور کر رہا تھا، ہر شخص کا دل اُس کی روشن دُم دیکھ دیکھ کر سہما جاتا تھا، امیر و غریب ادنےٰ و اعلےٰ غرضکہ ہر کس و ناکس اُسکا نظارہ کر رہا تھا اور طرح طرح کی خیال آرائیوں میں مصروف تھا، ایک دوسرے کو اس آسمانی نشانی کے دیکھنے کی دعوت دی جا رہی تھی اور ہر شخص پروانہ وار اُس کو دیکھنے چلا جا رہا تھا۔

جہاں ایک عالم اُس کے ظہور پر اپنے ذوق و شوق کا اظہار کر رہا تھا وہاں دو ہستیاں ایسی بھی تھیں جو ذرہ برابر اُدھر ملتفت نہ ہوئیں، یہ دو ہستیاں ایک کم عمر بچہ اور اُس کی ماں تھیں، بچہ کے سامنے چربی کی ایک شمع روشن تھی، جس میں اُس کی ماں ایک قسم کی لپک دیکھ رہی تھی اور وہ اُسے دیکھ دیکھ کر اس خیال سے سہم رہی تھی کہ شاید بچہ کچھ ہی دنوں کا مہمان ہے، یہ ایک فرسودہ وہم تھا جس میں وہ گرفتار تھی اور اُسے خبر نہ تھی کہ اُس کا بچہ اپنی عمر طبعی کو پہونچے گا اور ساٹھ سال کی مدت کے بعد دُم دار ستارہ پھر ایک مرتبہ اُسی کے سامنے نمودار ہوگا۔

لڑکے نے اُس ستارہ کی طرف ذرا بھی التفات نہ کیا۔ اُس کے سامنے صابن کے پھین سے لبریز ایک ظرف رکھا ہوا تھا، وہ اُس میں اک مٹی کی نلکی کو بار بار ڈبوتا اور پھر اُس کے دوسرے سرے کو اپنے لبوں پر رکھکر بلبلے اُڑانا شروع کرتا، بلبلے ایک عجیب دلفریب انداز سے ہوا میں تھرتھراتے دکھائی دیتے تھے اور پھر وہ دم کی دم میں زرد سے سُرخ اور سُرخ سے سبزی میں تبدیل ہو جاتے۔

"خدایا تیری عمر کے سال اتنے ہوں جتنے کہ یہ بلبلے ہیں" ماں نے بچہ کو یہ دعا دی "آہاہ! اتنے سال۔ صابن کا پانی کیا ابھی ختم ہوا جاتا ہے" بچہ نے معصومانہ انداز میں جواب دیا اور اپنے شغل میں مصروف ہوگیا۔

"وہ دیکھو ایک سال اُڑتا ہے ۔۔ اے لو وہ دوسرا سال" بچہ ہر بار ٹوٹتے ہوئے بلبلوں کو دیکھ کر چلا اُٹھتا چند بلبلے سیدھے اُس کی آنکھوں میں چلے گئے، خدا جانے اُن میں کیسی تیزی تھی کہ اُس کی آنکھوں سے بڑے بڑے آنسوؤں کے قطرے بہنے لگے، ہر ایک بلبلے میں بچہ کو اپنا درخشاں مستقبل دکھائی دے رہا تھا۔

"ہمسائیوں نے کہا کہ وہ دیکھو ستارہ اب بہت صاف اور نمایاں ہے، کیا تم لوگ کمرہ میں یونہی

بند بیٹھے رہو گے؟" یہ سنتے ہی ماں نے بچہ کا ہاتھ پکڑ لیا اور باہر چلی گئی۔

بچہ نے اِس آتشیں گیند کو پہلی مرتبہ دیکھا، کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ قریب تین گز لانبا ہے اور کچھ لوگ اُسے ہزاروں گز لانبا سمجھ رہے تھے، ہر شخص اپنے اپنے خیال کے مطابق رائے زنی کر رہا تھا۔ لوگوں کو یقین تھا کہ دُم دار ستارہ دو نسلوں کے گزرنے کے بعد پھر نمایاں ہوگا۔

جب دوسری بار اُس کا ظہور ہوا تو واقعی اُن میں سے اکثر اس دارِ فانی سے کوچ کر چکے تھے۔ وہ بچہ جس کی نسبت ماں کا خیال تھا کہ بہت جلد دنیا سے سدھار جائے گا، ضعیف العمر ہو چکا تھا اور اُس کے بال سفید ہو چکے تھے۔ مثل مشہور ہے کہ سفید بال بوڑھاپے کے پھول ہوتے ہیں۔ وہ اب ایسے کتنے پھولوں کا مالک تھا۔ اب وہ ایک بوڑھا مدرس تھا، لڑکے اُسے ایک عالمِ متبحر تصور کرتے تھے اور اُن کا عقیدہ تھا کہ وہ تاریخ وجغرافیہ کے علاوہ تمام سیاروں کے حال سے بھی بخوبی واقف ہے۔

"فنا اور بقا کا چولی دامن کا ساتھ ہے، ہمیں دنیا کی تمام اشیاء کا بنظرِ غائر مطالعہ کرنا چاہئے،" اُستاد نے طالب علموں سے مخاطب ہو کر کہا۔ اُس کی گفتگو کا رُخ دُم دار ستارہ کی طرف بھی پھرا۔ اُس نے بچوں کو سمجھایا کہ پرانے لوگ دُم دار ستارہ کی نسبت کیا کیا خیالات رکھتے تھے۔ اُس نے یہ بھی بتلایا کہ دم دار ستارہ والا سال شراب والوں کے لئے نہایت موزوں ہے، کیونکہ شراب میں کتنا ہی پانی ملایا جائے کوئی تمیز نہیں کر سکتا۔

کوئی دو ہفتہ فضا ابر آلود رہی اور ستارہ نظروں سے پوشیدہ رہا۔ اُستاد ایک چھوٹے سے حجرہ میں جو مدرسہ سے متصل تھا خاموش بیٹھا تھا، اُس کے ایک طرف کونے میں اُس کے باپ کے وقت کی شکستہ گھڑی رکھی تھی۔ کوئل جو پہلے ایک ایک گھنٹہ کے وقفہ پر سامنے آکر سریلی آواز سے بولتی تھی گھڑی کے ڈبے کے پیچھے خاموش اور گونگی پڑی تھی۔ مگر اُسی زمانہ کا پیانو اب بھی اچھی حالت میں تھا۔ اگرچہ امتدادِ زمانہ سے اُسکے تاروں کا وہ ہلکا پن اور ترنم جاتا رہا تھا پھر بھی اُس پر تمام انسانی نسلوں کے گیت گائے جا سکتے تھے۔

دُم دار ستارہ کو دیکھ کر بڈھے کی آنکھوں میں تمام گزشتہ مسرت وغم کے واقعات کا نقشہ پھر گیا، اُسوقت اُسے وہ الفاظ بھی یاد آئے جو اُس کی ماں نے شمع میں ایک قسم کی لپک دیکھ کر کہے تھے۔ اُس کے دل میں اُن رنگین بلبلوں کی یاد بھی تازہ ہو گئی جو اُسکو اسقدر محبوب تھے۔ اُن میں ہر ایک اُس کی عمر کا ایک سال تھا۔ وہ اُن کی رنگینیاں دیکھ کر کیسا خوش ہوتا تھا۔ اُن میں اُسے اپنی معصوم مسرتیں اور شباب کی سرمستیاں اور تمنائیں جھلکتی نظر آتی تھیں۔ آہ!۔ مستقبل کا حباب بھی کیسا طلسم تھا۔ اُسوقت پیانو کی نغمہ ریزیاں اُس کے کانوں میں گونجنے لگیں۔۔۔۔

اُس کے خیالی ساز سے وہ نغمہ بھی نکل رہا تھا جسے اُس کی ملازمہ نے گایا تھا اور اُسے اُسوقت وہ گیت بھی بے چین کرنے لگا جو پہلی مرتبہ رقص وسرود کی محفل میں اُس کے سامنے گایا گیا تھا۔ الغرض ماضی کے تمام دلچسپ مناظر اُسکے

پیش نظر ہو گئے اور اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

اُس کی آنکھیں کھڑکی کے باہر لگی تھیں کہ یکایک بادل کا ایک ٹکڑا ہوا میں تیرتا ہوا دکھائی دیا۔ اور ساتھ ہی دُم دار ستارہ چمکتا ہوا نظر کے سامنے آ گیا۔ اُس کو ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ ایک روز قبل ہی اُسے دیکھ چکا ہے اور اس مختصر وقفے میں ایک پُشت ختم ہو چکی ہے۔ تب وہ بچہ تھا اور اُس کو بلبلوں میں اپنا مستقبل چمکتا ہوا دکھائی دے رہا تھا اب مستقبل نہ تھا بلکہ ماضی اور تیرہ و تار ماضی۔ اُس کی آنکھیں دہک اُٹھیں اور اُس نے اپنا ہاتھ بے اختیار باجے پر رکھ دیا، پیانو بج رہا تھا مگر اس طرح گویا اُس کا ایک تار ٹوٹ گیا ہے۔

"فوراً آؤ دیکھو آسمان کتنا صاف اور شفاف ہے — ستارہ کتنی دلفریبی سے چمک رہا ہے" ہمسایوں نے پکار کر کہا۔

اُستاد نے کچھ جواب نہ دیا۔ کیونکہ وہ اُسے دیکھنے سے پہلے ہی روانہ ہو چکا تھا۔ اُس کی روح اُس فضا سے بھی اُونچی جا چکی تھی جہاں ستارہ چمک رہا تھا۔ محلوں، جھونپڑوں اور بازاروں میں ہر جگہ لوگوں کی نگاہیں ستارہ پر لگی ہوئی تھیں لیکن اُستاد کی روح اُن تمام اپنے اجل رسیدہ عزیزوں سے جن سے ملنے کے لئے وہ اسقدر بیقرار تھا، ہم آغوش ہو چکی تھی۔

(انڈرسن) (ترجمہ) تحسین الدین علوی - بی۔ اے

معجزہ و خوارق عادات کی حقیقت

(شاہ ولی اللہ کے نقطۂ نظر سے)

اسلام حقیقت میں دنیا کا بہترین مذہب محض اسی وجہ سے ہے کہ وہ دین و دنیا کو دو علٰحدہ چیزیں قرار نہیں دیتا جس کی تفریق کی بنا پر قوموں کو زندگی بسر کرنا دشوار ہو رہی ہے، وہ مذہبیت کو سیاست و معاشرت پر اسقدر غلبہ دینا نہیں چاہتا کہ اس کے پیرو "انسان" کہلانے کی بجائے "روح" اور "فرشتہ" بنکر ظاہر ہوں، وہ اپنے پیروی کرنے والوں کو صرف "طریق معاشرت" اور ان کی تخلیق کا حقیقی نشا "ہمدردی" کی تعلیم دیتا ہے، وہ اپنے ہر نظریہ کو عقلی دلایل کے ساتھ پیش کرتا ہے، ہر چیز فطرت کے موافق ظاہر کرتا ہے، غور و تدبر کی دعوت دیتا ہے، وہ خدا کی ہستی کو زبردستی نہیں منواتا بلکہ اس کی ضرورت اور اس کے وجود کے لئے سیکڑوں عقلی دلائل صراحت اور تمثیل کے ساتھ پیش کرتا ہے، رسول کو ایسی ان ہونی نشانیاں دیکر نہیں بھیجتا جسکو دیکھکر لوگ خوف یا وقتی مصالح کی بنا پر تسلیم کرلیں، بلکہ اس کی نبوت کا ثبوت محض وہ دستور العمل ہے جس کی تلاش میں ہر انسان سرگرداں ہے، اور جس کے حصول کے بعد ہر فلسفی کو تسکین ہوتی ہے

لیکن ہمارے علمائے سلف اور حکیمانِ اُمت نے تفکر و تدبر کو حرام قرار دیدیا اور اپنی اُلٹی سیدھی خراش و خراش سے اس کو ایسا تنگ اور ٹیڑھا بنا دیا کہ ہر چیز مضحکہ خیز حد تک قیاس و گمان کی حد سے باہر پہونچ چکی ہے حتیٰ کہ آپ خدا اور اس کے رسول کو بھی خود سے نا آشنا اور اجنبی خیال کرنے لگیں گے۔

مسلمانوں کی ابتدائی تاریخ پر جب آپ نظر ڈالیں گے تو دیکھیں گے کہ اُسوقت نہ تو اس قسم کی جنگ زرگری کا بازار گرم تھا اور نہ کفر سازی کی مشینیں چل رہی تھیں، لیکن اس کے بعد بہتر چھوڑ بہتر ہزار فرقے پیدا ہوگئے قسم قسم کے عقاید بنائے، ہر شخص کے زعم میں دوسرا کافر ہوگیا، قرآن و سنت کی بجائے لوگوں نے اپنے اُصول اور اپنے زور قلم کے منوانے میں عمریں صرف کردیں، غرض یہ کہ ہر طرح اسلام کو مسخ ہی کرتے گئے خواہ وہ خود کو اہل قرآن سمجھتے ہوں یا اہل حدیث، یا اہل عدل یا اہل فقہ، آہستہ آہستہ مسخ شدہ دین جمہور کے عقائد میں اسطرح

منطبع ہوگیا کہ جو اسلام کی حقیقت سے واقف ہوتے تھے وہ بھی جمہور کے خوف سے کچھ نہیں کہہ سکتے تھے اگر کسی نے جراُت کرکے کچھ کہا بھی تو اس کے نتائج کی تاریخ کے خونی اوراق شہادت دیں گے۔

امام غزالی نے اسّی کتابیں علوم دین پر تحریر کیں لیکن حقیقت کا اظہار کسی میں بھی نہ کرسکے، نہایت دعوے کے ساتھ احیاء العلوم کو پیش کیا لیکن جہاں حقایق ومعارف کو کھول کر بیان کیا جمہور یا یوں سمجھئے کہ ملاؤں کے مخترعہ اُصول کے خلاف چلے؛ اسی پر اعتراضات کئے گئے، کفر کے فتوے لگائے گئے، اور پھر بھی وہ احیاء میں واضح حقیقت نہ لکھ سکے، اور یہ لکھنا ہی پڑا کہ اس میں بھی حقیقت سے پردہ نہیں اُٹھایا ہے جو اصل باتیں ہیں وہ اس میں نہیں ہیں۔ آخر ایک کتاب مضنون لکھی لیکن اس کے لئے اپنے شاگردوں کو سخت تاکید کردی کہ جمہور درکنار علماء کو بھی نہ دکھایا جائے صرف سینہ بسینہ جو لوگ اس کے اہل ہوں اُن تک پہونچایا جائے۔

سب سے آخر دور میں شاہ ولی اللہ صاحب مرحوم پیدا ہوئے جن کے لئے مشہور ہے کہ ہندوستان میں حدیث کی اشاعت کا سہرا انھیں کے سر ہے، شاہ صاحب نے بھی کئی کتابیں لکھیں لیکن وہی مشکلات اب بھی موجود تھیں چنانچہ حجۃ اللہ البالغہ کے مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں :- " بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ شریعت کے احکام میں کوئی مصلحت نہیں ہوا کرتی، اعمال اور ان کی جزائیں جو منجانب اللہ مقرر ہیں کوئی مناسبت نہیں ہے یہ گمان بالکل فاسد ہے اور قرآن وسنت ونیز اسوۂ صحابہ سے اس کی تکذیب ہوتی ہے" (صفحہ ۵ مطبوعہ مصر)

" اسرار دین کی تدوین بہت ضروری ہے اور کثیر فائدوں کی حامل ہے، ایمان لانے کے بعد اس علم سے دلی اطمینان زیادہ بڑھ جاتا ہے"۔ لیکن امام غزالی کی طرح شاہ صاحب بھی حجۃ اللہ میں حقیقت کو بے نقاب نہ کرسکے اور جمہور کے سامنے حجۃ اللہ میں سابقہ شاہراہ سے ملا ہوا ایک راستہ اختیار کیا جہاں سے پہلا راستہ بھی نظر آتا رہے اور مسافر جب چاہے اس راستہ کو چھوڑ کر ایک لمحہ میں قدیم شاہراہ پر چلا جائے۔

اس کے بعد ایک مختصر رسالہ "تاویل الاحادیث" تحریر کیا جس میں بہت ہی مجمل طور سے چند مسئلوں کو تحریر کیا لیکن جو کچھ ہے وہ بھی حقیقت کی رہنمائی اور تحقیق کا راستہ قائم کرنے کے لئے بہت کافی ہے، شاہ صاحب نے اس رسالہ میں انبیاء کے قصے اور ان کے معجزات کی حقیقت پر روشنی ڈالی ہے اور جمہور کے خلاف نہایت بیباکانہ قدم اُٹھایا ہے، ہمیں اسوقت اسی کتاب پر ایک نظر ڈالنا مقصود ہے۔

شاہ صاحب اس کتاب کے مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ " جب خدا اپنا علم نازل کرتا ہے تو وہ بطریق مجاز وکنایہ نہیں ہوتا بلکہ اس طرح ہوتا ہے کہ طبیعت اس کو جائز سمجھے مطلب یہ کہ انسان کے حواس میں جب کسی ہونے والی حالت کا علم دیا جاتا ہے تو وہ خواب وغیرہ کی صورت میں ظہور پاتا ہے، اس کے بعد صفحہ ۷ پر اور وضاحت کرتے ہیں " جب خدائے تعالیٰ کوئی " خرق عادت " کسی تدبیر کے واسطے ظاہر کرتا ہے تو اسے

عادت کے ضمن میں ظاہر کرتا ہے" (خلاف فطرت کوئی واقعہ نہیں ہوتا)

چونکہ "خرق عادت" کا لفظ اصطلاح میں خلاف فطرت وقوع کے لئے استعمال ہورہا ہے اس لئے اس شک کو رفع کرنے کے لئے خرق عادت کی بھی تعریف فرمادی اور حقیقت یہ ہے کہ یہ رسالہ ہی اس مسئلہ کو طے کرنے کے لئے لکھا گیا ہے کہ انبیا کو دنیا میں شعبدے باز بناکر نہیں بھیجا گیا، دنیا میں کوئی واقعہ خلاف عادت وقوع پذیر نہیں ہوتا — "سچ یہ ہے کہ جب خرق نام رکھا جاتا ہے تو وہ اُمور عادیہ ہی سے ہوتا ہے مگر چونکہ اسکے اسباب قلیل الوقوع ہوتے ہیں اس لئے وہ قلیل ہی واقعہ ہوتا ہے اور عام لوگوں کو اس کی توقع نہیں ہوتی اس لئے خوارق کہتے ہیں، اور اکثر خارق کے لئے نظیر ہوتی ہے اور عام لوگوں کے لئے مالوف ہوتی ہے، لیکن عام لوگ اس کی طرف توجہ نہیں کرتے (صفحہ ۸۰)

قرآن شریف میں جتنے معجزوں کا تذکرہ کیا ہے مثلاً عاد وثمود کی ہلاکت، شق القمر، دریا کا پھٹ جانا وغیرہ حقیقت میں یہ سب اسباب عادیہ سے وقوع پذیر ہوئے تھے کہیں زلزلے اور بادوباران سے ہلاکت ہوئی جبکہ اسباب ارضی مواق ہوچکے تھے اور کبھی اجرام فلکی کا اثر تھا بغیر اس کے کوئی واقعہ ظاہر نہیں ہوا۔

قوم لوط کی تباہی کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:۔ "جتنے عذاب کائنات فطرت کی طرف سے آتے ہیں اُسی وقت آتے ہیں جبکہ کواکب کا اتصال وحشت ناک ہوتا ہے، پانی بند ہوجاتا ہے اور آسمان وزمین میں کانی مواد ایک مدت تک جمع ہوجاتا ہے"۔ (صفحہ ۲۵)

یوسف علیہ السلام کے سلسلہ میں لکھتے ہیں" ان کی تقدیر میں مصیبت وبلا اور والد سے جدائی اسی لئے تھی کہ اسباب سماوی اسی کے خواہاں تھے" (صفحہ ۲۵)

نوح علیہ السلام کے طوفان کی تاویل میں لکھتے ہیں کہ جب کشتی وغیرہ سب سامان طیار ہوگیا تو" تدبیر الٰہی ایک ہولناک واقعہ کا فضا کی طرف سے انتظار کررہی تھی، جس کے واقع ہونے پر انھیں عذاب دے چنانچہ عام طوفان آنے کے لئے اسباب سماوی وارضی موافق ہوگئے تو خدا نے اپنا حکم جاری کیا" صفحہ ۱۵

حضرت موسیٰ کے معجزات میں مچھلی کے زندہ ہونے کا قصہ تحریر کرکے لکھتے ہیں "حضرت موسیٰ خستہ ہوکر سوگئے تھے اور یوشع وضو کرنے بیٹھے تو پانی کی بوندیں مچھلی پر گر پڑیں اور پانی میں یہ خاصیت ہے کہ وہ پانی کے جانور کو زندہ کردیتا ہے" (صفحہ ۴۳)

حضرت عیسیٰ کے مردہ جلانے کی نسبت لکھا ہے کہ "جو نفس جسم سے تعلق رکھتا تھا اس کا تعلق وہم کا سا تھا نہ حیات کا سا" (صفحہ ۵۹)

معجزہ شق القمر کی نسبت شاہ صاحب فرماتے ہیں:" یہی ضرور نہیں کہ انشقاق ذات قمر ہی میں ہوا ہو، بلکہ

ممکن ہے کہ دھویں یا ستاروں کے ٹوٹنے یا کسوف و خسوف کی طرح ہو جیسا کہ لوگ دیکھتے رہتے ہیں اور عربی زبان میں اس طرح استعمال کرتے ہیں گویا کہ ذات شئے میں واقع ہوا ہے اور میرے خیال میں اس حادثہ کا سبب یہ ہے کہ اجزائے ہائیہ صیقلیہ ملتمہ سطح واحد کی طرح جمع ہو گئے ہوں گے جس کے پیچھے پہاڑ یا ابر غلیظ آئینہ کی طرح ہو گا اور اس میں چاند کا عکس دیکھ کر لوگ دو چاند سمجھے ہوں، اور کبھی وہ بھی منطبع ہو جاتا ہے جو آسمان میں نہیں ہے اور کبھی چاند چھپ جاتا ہے اور فضا میں دو ٹکڑے نظر آتے ہیں اور ان سب صورتوں کی مثال وہی کسوف و خسوف وغیرہ ہے (صفحہ ۷۴)

دوسری چیز شاہ صاحب یہ ثابت کرتے ہیں کہ نبوت، ولایت یہ سب قوت نفس سے متعلق ہیں جسقدر نفس میں صفائی اور روح کی طاقت وسیع ہوگی اسی قدر نظام سماوی (بالفاظ دیگر ملاء اعلیٰ) سے زیادہ اتصال ہو گا چنانچہ ہونے والے واقعات کی خبر کے لئے کہتے ہیں کہ کوئی چیز بغیر اسباب کے پیدا نہیں ہوتی لہذا "نظام طبیعی کا پہچاننے والا اگر ذکی نفس ہے تو اسباب کے شروع ہوتے ہی حادثہ کی پیشین گوئی کر دے گا اگر کم ذکی ہے تو کچھ دیر میں اور جو اس سے کم ذکی ہو تو وہ اس سے بھی دیر میں پہچانے گا" (صفحہ ۶۶)

"جن لوگوں کو قضا و قدر کی شناخت میں کچھ خصوصیت تھی جیسے کاہن یا نجومی اور راجنہ انھوں نے اپنے علم کے ذریعہ آپ کی صداقت اور پیغمبری کی تصدیق کی تھی" (صفحہ ۷۶)

"نیک بخت اور عادل بادشاہ اپنی استعداد کے موافق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا شریک ہے اور اس سے یقیناً امور خارقہ صادر ہونگے جس شخص میں ایسے اخلاق حمیدہ جمع ہو جائیں یقیناً اس کی پیدایش کے وقت کواکب میں اجتماع سعادت ہو گا" (صفحہ ۷۷)

اور بخت کی تشریح اس طرح فرمائی ہے:- "بخت کی تحقیق یہ ہے کہ نفوس انسانیہ میں ایک نقطہ ہے کہ تمام نفوس اس کی طرف کھنچتے ہیں پھر وہ غالب آجاتا ہے اور نفوس اس کی طرف اس طرح آجاتے ہیں جیسے مقناطیس لوہے کو کھینچتا ہے، پھر اگر وہ قوتیہ السعادت ہے تو ان نفوس میں جو اس کے آس، پاس ہیں فیض پہونچاتا ہے اور اگر شقاوت میں قوی ہے تو آس پاس کے نفوس میں سختی پیدا کرتا ہے" (صفحہ ۷۵)

"ہمنے کئی بار مشاہدہ کیا ہے کہ بعضے آدمیوں کے نفس میں ایک نقطہ ہے روشن ستارہ کی طرح چمکتا ہوا کہ اس میں سے شعاعی خطوط نکلتے ہیں اور دوسرے نفوس میں نفوذ کرتے ہیں" (صفحہ ۷۵)

آج کل بھی تمام ماہر نفسیات اس مسئلہ کی تصدیق کر چکے ہیں چنانچہ موسیو لیبان نے "روح الاجتماع" میں اس کی نہایت واضح تشریح کی ہے اور تمام بڑے بڑے لیڈروں میں اس قوت کا وجود ثابت کیا ہے،

شاہ صاحب لکھتے ہیں "رسول اکرم کی پیدایش احسن تقویم پر تھی یعنی بہت معتدل مزاج میں جبکہ قوی کواکب بہت اچھی صورت میں مجتمع تھے، بزرگی اور غلبہ کے مستدعی تھے (صفحہ ۷۶)

"لہذا آپ نے اچھی طرح سمجھ لیا کہ خیر وشر اور اخلاق کریمہ و ذمیمہ کا انحصار تزکیہ نفس پر ہے اگر قلب منجلی ہے تو اچھے اخلاق ہوں گے اور تاریک ہے تو بُرے حالات، اور یہ تمام علم آئینۂ نفس میں غور کرنے سے پیدا ہوئے خواہ وجدانی طور پر خواہ قیاس کے لحاظ سے" (صفحہ ۶۲)

اسی نفوذ و نفوس کے مسئلہ میں شاہ صاحب نے ابراہیم علیہ السلام کو مکارم اخلاق میں تمام انبیاء سے بہتر شمار کیا ہے، لکھتے ہیں:۔ "افعال عبادت میں ابراہیم علیہ السلام بہت پورے تھے، اس خلق میں اول درجہ کا کوئی نہ ان سے پہلے ہوا نہ ان کے بعد ہوا اسی وجہ سے خدائے تعالیٰ نے ان کو امام کیا اور انبیا کو ان کے دین کی پیروی کرنے کا حکم فرمایا" (صفحہ ۱۹)

اس کے علاوہ شاہ صاحب نے چند اور مسئلے بھی عقل کی ترازو میں تولے ہیں اور یہ ثبوت بہم پہونچایا ہے کہ کوئی امر خلاف فطرت اور خلاف عقل نہیں ہے، اور حقیقت میں یہی اسلام کا دعویٰ بھی ہے وہ خود کو ایک طلسم اور ایک مبہم چیز بنا کر پیش نہیں کرتا۔

عبید اللہ قدسی

جنوری ۳۶ء کے نگار میں کیا ہے

ہندی شاعری کی بے مثل تاریخ

ہندی کلام کا بے نظیر انتخاب

اساتذۂ فن کے دلچسپ حالات

برج بھاشا کے نوادر پر فاضلانہ نقد و تبصرہ

اور

ہندوستان کی گوییوں کی شاعری

قیمت فی پرچہ دو روپیہ ـــ خریداران نگار سے کچھ نہیں۔

انتخاب

(تمثیلچہ)

افراد:—

دُردانہ	بہارستان کی ملکہ
ثاقب	ملکہ کا محبوب مطرب
ارژنگ	وزیر

منظر:— (صبح کو دُردانہ اپنی خوابگاہ میں حریری بستر پرنیم دراز ہے، اچاٹ نگاہیں کہہ رہی ہیں کہ رات بہت بے آرامی سے بسر ہوئی ہے۔ سامنے صندلی تپائی پر زرکار رباب رکھا ہوا ہے۔

دُردانہ دیر تک ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتی رہتی ہے، تھوڑی دیر بعد لیٹے لیٹے اپنا ہاتھ بڑھا کر رباب کے تاروں کو چھیڑتی ہے، جب آواز گونجتی ہے تو رباب سے ہاتھ ہٹا کر کچھ سوچنے لگتی ہے اور پھر رباب کو دور پھینک کر دفعتہً اُٹھ بیٹھتی ہے اور ہاتھ پر سر رکھ کر سوچنے لگتی ہے)

دُردانہ:— (آہستہ آہستہ) کیا کروں، سمجھ میں نہیں آتا۔ کہتے ہیں محبت عورت کی زندگی ہے، لیکن فریضۂ زندگی تو نہیں ہے کہ تمام عالم کو حلقہ بگوش دیکھنا میرا مقصد حیات تھا، آج خود غلام ہوں۔ غلام ہوں ایک مُطرب کی، ایک ایسے شخص کی جو سب سے پہلے فریضۂ زندگی کا احساس چھینتا ہے اور پھر زندگی بخشتا ہے — پھر اگر یہ زندگی صرف میری ہی زندگی ہوتی تو مجھے اختیار تھا خواہ سنوارتی یا برباد کر دیتی، لیکن میں اور میری حیات، ملک و قوم کی ملکیت ہے، اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ آج سے ثاقب کے قدم محل میں آئیں۔ (بلند آواز سے) — بیشک نہیں آئیں گے۔

(دُردانہ اُٹھ کر ٹہلنے لگتی ہے — کچھ دیر بعد دور سے گانے کی آواز آتی ہے وہ ٹھٹک کر کھڑی ہو جاتی ہے، پھر سر پکڑ کر کرسی پر بیٹھ جاتی ہے اور کہتی ہے)

—— ظالم پھر مجھے تباہ کرنے کے لئے آرہا ہے اُس کی نگاہیں میری نگاہوں سے ملیں گی اور میں پھر سر جھکا کر رہ جاؤں گی۔ (دفعتہً کھڑی ہو کر) مگر نہیں میں عزم کر چکی ہوں، ایک شاہانہ عزم اور اب وہی ہوگا جو ہونا چاہیئے۔

(ثاقب ایک خوشرو نوجوان داخل ہوتا ہے اور زمین پر لوٹتے ہوئے رباب کو دیکھتا ہوا آگے بڑھتا ہے) گو اک بہت اچھی ـــ

ثاقب :۔ (ملکہ کے سامنے جھک کر) ملکۂ عالم، کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ رباب کو کس قصور میں پامال کیا گیا ہے۔
دردانہ :۔ (منہ پھیر کر) ثاقب، جاؤ چلے جاؤ اور میری سلطنت کی حدود سے اتنی دور چلے جاؤ کہ اگر میں تمھیں ڈھونڈھوں بھی تو کبھی نہ پا سکوں۔
ثاقب :۔ ملکۂ عالم میں کچھ نہیں سمجھا کیا ارشاد ہوا۔
دُردانہ :۔ جو بات میں خود نہیں سمجھ سکتی اس کو تمھیں کیا سمجھا سکوں گی۔ مگر جو میں کہتی ہوں اس کی تعمیل تم کو کرنا چاہئے کیونکہ تمھارا وجود تمھارے لئے خطرناک ہے اور ملک تمھارا جانی دشمن ہے۔
ثاقب :۔ مگر، میرا قصور؟
دُردانہ :۔ اس کا حال اپنی نگاہوں سے پوچھو، اپنے نغموں سے دریافت کرو، جنھوں نے مجھے فرائض سلطنت سے غافل کر رکھا ہے اور جن کی موجودگی میں میں کچھ نہیں کر سکتی۔
ثاقب :۔ ملکۂ عالم، اگر میں اپنی آنکھیں پھوڑ کر اور زبان کاٹ کر آپ کو فرائض سلطنت ادا کرنے کی طرف مایل کر سکتا ہوں تو میں اس کے لئے طیار ہوں، لیکن خدا کے لئے اس فضا سے مجھے دور نہ کیا جائے جہاں دُردانہ سانس لیتی ہے۔
دردانہ :۔ (جھنجھلا کر) ثاقب، خدا کے لئے، خاموش رہو، میں ڈر رہی ہوں کہ مبادا میری نسائیت پھر مجھے مغلوب کرلے۔
ثاقب :۔ تو کیا ملکہ اپنی نسائیت سے بھی دست بردار ہو جانا چاہتی ہے۔
دردانہ :۔ ہاں، جب ثاقب نہ ہوگا تو دُردانہ صرف ملکہ ہو کر جئے گی اور اپنی نسائیت کو بھلا دے گی،
ثاقب :۔ کاش میں ان الفاظ کو سمجھ سکتا۔
دردانہ :۔ کاش اس ملک کے بسنے والے ایک عورت کے جذبات کو سمجھ سکتے۔ ثاقب، جاؤ، تمھارے سامنے میرے حوصلے پست ہوئے جاتے ہیں، خدا کے لئے جاؤ اور مجھے برباد نہ کرو،

(ملکہ کی آنکھ سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں اور وہ تکیوں میں منہ چھپا لیتی ہے)

ثاقب :۔ دُردانہ مجھے اس ملک کی رعایا کے ہاتھ سے قتل ہو جانا منظور ہے لیکن تجھے چھوڑنا منظور نہیں،
دُردانہ :۔ ثاقب، مجھ پر رحم کر اور چلا جا، تجھے نہیں معلوم کہ تیرے الفاظ میرے عزائم کے ساتھ کیا سلوک کر رہے ہیں،
ثاقب :۔ موت کے سوا کوئی طاقت مجھے یہاں سے نہیں ہٹا سکتی۔
دردانہ :۔ لیکن تجھے معلوم ہے کہ اس موت کے کیا معنی ہیں۔
ثاقب :۔ دائمی سکون۔
دردانہ :۔ نہیں، دُردانہ کی موت۔

ثاقب :۔ (گھبراکر) موت! دُردانہ کی موت! نہیں میں کبھی اسے گوارا نہیں کر سکتا اور میں اس کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر سکتا ہوں۔

(یہ کہکر وہ واپس جاتا ہے اور دروازہ تک پہونچتا ہے)

دردانہ :۔ (گھبراکر) ثاقب، ٹھہر جا، میں بھی تیرے ساتھ چلتی ہوں۔

(وزیر ارژنگ داخل ہوتا ہے)

ارژنگ :۔ مجلس شوریٰ ملکۂ عالم کا فیصلہ سننے کی منتظر ہے۔

دردانہ :۔ جاؤ ان سے کہدو کہ تمھاری ملکہ نے سلطنت اور ثاقب میں صرف ثاقب پسند کیا ہے۔

(وزیر کچھ کہنا چاہتا ہے۔ ملکہ ایک ہاتھ کے اشارہ سے اسے منع کرتی ہے اور دوسرے ہاتھ سے ثاقب کا دامن پکڑ لیتی ہے۔)

دُردانہ :۔ ثاقب، رباب اُٹھاؤ اور چلو، اب تمھارا دل میری مملکت ہوگی اور اس کے امن وسکون کا قیام میرا فرض۔

(دونوں محل کے دروازہ سے باہر نکل جاتے ہیں اور ارژنگ دیکھتا کا دیکھتا رہ جاتا ہے)

سروپ رانی نگار

باب الاستفسار

زلزلہ اور بداعمالی

(جناب فضل الدین احمد صاحب ۔ فورٹ سنڈیمن)

عام لوگوں کا خیال بلکہ یقین ہے۔ کہ کوئٹہ میں جو زلزلہ گزشتہ ماہ میں آیا ہے۔ وہ اہل کوئٹہ کی بداعمالیوں کی وجہ سے آیا ہے۔ چنانچہ قرآن شریف کی ان آیات سے بھی تصدیق ہوتی ہے:۔

"واذا اردنا ان نہلک قریۃ امرنا مترفیہا ففسقوا فیہا فحق علیہا القول فدمرنہا تدمیرا ہ وکم اہلکنا من قریۃ بطرت معیشتہا فتلک مسٰکنہم لم تسکن من بعدہم الا قلیلا وکنا نحن الوارثین ہ"

لیکن سوال اب یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ کیا کوئٹے میں دیگر بڑے بڑے مقامات سے زیادہ بداعمالی تھی؟ جو قدرت کو وہاں غضب سے کام لینا پڑا۔ جہاں تک مجھے علم ہے۔ اور میں نے بچشم خود دیکھا ہے۔ پنجاب ہندوستان اور دیگر ممالک میں کوئٹے سے کہیں زیادہ بداعمالیاں ہوتی ہیں۔ اور وہ کونسا طبقہ ہے جہاں نیک و بد لوگ نہیں رہتے ہیں۔ اسی طرح کوئٹے میں بھی اگر سیکڑوں بدکار تھے۔ تو ہزاروں کی تعداد میں نیکوکار لوگ بھی تھے۔ اگر مسلمان زیادہ تھے۔ تو غیر مسلم عیسائی۔ ہندو۔ پارسی وغیرہ بھی کم نہ تھے۔ زلزلہ ایک اتفاقیہ امر ہے۔ جس کا غضب سے کوئی تعلق نہیں ہوسکتا۔ مگر اکثر مسلمان میرے اس خیال سے متفق نہیں ہیں اور کہتے ہیں کہ غیر مسلم اقوام کو خداوند کریم نے قیامت تک کی مہلت دیدی ہے۔ اُن سے ان کے اعمال کا دنیا میں کوئی مواخذہ نہ ہوگا۔ اسی لئے ان ممالک (جاپان کے زلزلہ کا ثبوت ان کو مطمئن نہ کرسکا) میں زلزلہ نہیں آتا۔ اگر اس کو صحیح تسلیم کرلیا جائے۔ تو کیا لاہور۔ دہلی۔ کلکتہ۔ بمبئی وغیرہ شہروں میں مسلمان آباد نہیں ہیں؟۔ اور وہاں کی بیشتر مُسلم آبادی بداعمال نہیں ہے؟۔ تو پھر وہاں خداوند کریم نے اپنا غضب نازل کیوں نہ کیا؟۔ اور اگر کوئٹہ پر ہوا۔ تو کیوں غیر مسلم برابر بلکہ زیادہ تعداد میں ہلاک ہوئے؟۔

میں امید کرتا ہوں۔ کہ جناب " نگار" کے صفحات پر اس کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں گے اور یہ بھی بتلائیں گے۔ کہ عہد حاضرہ کی عالمگیر تباہی جو زلزلہ۔ آتش۔ سیلاب۔ طوفان آندھی کی صورت میں دنیا کے تمام حصوں میں رونما ہے۔ کیا معنی رکھتی ہے ؟

(نگار) اس سے قبل جب صوبۂ بہار میں زلزلہ آیا تھا، اس وقت بھی عوام نے یہی خیال کیا تھا کہ یہ سزا ہے انسانی بداعمالیوں کی اور اب کوئٹہ کے متعلق بھی لوگوں کا یہی خیال ہے۔ لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں ہے بہار اور کوئٹہ کے زلزلوں سے پہلے جب کبھی دنیا میں زلزلہ یا کوئی اور ایسا ہی سخت حادثۂ طبیعی ظہور میں آیا جس کا سبب عوام نہیں سمجھ سکتے تھے، ہمیشہ اس کو عذاب خداوندی سمجھا گیا اور چونکہ خدا کا عذاب صرف بدکار انسانوں ہی کیلئے مخصوص ہے اس لئے اس کا کھلا ہوا منطقی نتیجہ یہی نکلا کہ جب کبھی زلزلہ آتا ہے وہ نتیجہ ہوتا ہے انسان کی بدکاریوں کا اور اہل مذہب کی طرف سے اس کا ثبوت بھی آسمانی کتابوں سے پیش کر دیا جاتا ہے، جیسا کہ آپ نے سورۂ بنی اسرائیل کی دو آیتوں سے استدلال کیا ہے۔

ان آیتوں کا مفہوم یہ ہے کہ " جب ہم کسی بستی کو برباد کرنا چاہتے ہیں تو ہم وہاں کے خوشحال لوگوں کی ہدایت کے لئے احکام نازل کرتے ہیں اور جب وہ اُن احکام سے سرتابی کرتے ہیں تو ہم اس بستی کو بالکل تباہ کر دیتے ہیں۔ اور نوح کے بعد ہم بہت سی نسلوں کو اسی طرح برباد کر چکے ہیں اور اللہ اپنے بندوں کے گناہوں سے پورا خبردار رہتا ہے"۔

ان آیتوں میں چونکہ بستیوں کی بربادی کا سبب انسانی عدوان و بغاوت کو قرار دیا گیا ہے اور بستیوں کی ویرانی کا بڑا ذریعہ زلزلہ ہوا کرتا ہے، اس لئے بظاہر یہی سمجھ میں آتا ہے کہ ملک کے جن حصوں میں زلزلے آتے ہیں وہ انسانی بدکاریوں کا نتیجہ ہوا کرتے ہیں، لیکن حقیقت یہ نہیں ہے اور نہ قرآن پاک کی ان آیتوں سے یہ استدلال درست ۔

سب سے پہلے یہ امر غور طلب ہے کہ خدا کا یہ ارشاد کہ " اذا اردنا ان نہلک قریۃ " سے کیا مراد ہے۔ یعنی خدا کا کسی بستی کی بربادی کا ارادہ کرنا کیا معنی رکھتا ہے۔ اگر اس کا مفہوم یہ قرار دیا جائے کہ خدا خود بربادی چاہتا ہے اور لوگوں کی عصیانکاری کا بہانہ ڈھونڈھتا ہے تو یہ نہ صرف صفات خداوندی کے خلاف ہوگا بلکہ دیگر آیات قرآنی کے بھی منافی ہوگا۔ سورۂ اعراف میں ارشاد ہوتا ہے :۔ " ان اللہ لا یامر بالفحشاء " (اللہ کسی کو بُرے کام کرنے کا حکم نہیں دیتا) اور خود آپ کی پیش کردہ آیات سے قبل جو آیت نظر آتی ہے اس سے بھی اس خیال کی تردید ہوتی ہے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے :۔ " من اہتدیٰ فانما یہتدی لنفسہ و من ضلّ فانما یضل علیہا "

یعنی جو سیدھی راہ اختیار کرتا ہے وہ اسی کے فائدہ کے لئے اور جو غلط راہ چلتا ہے اس میں اسی کا نقصان ہے اس آیت سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ خدا کسی کو گمراہی پر مجبور نہیں کرتا۔ الغرض یہ خیال کرنا کہ خدا خود کسی قوم کو گمراہ کرنے اور پھر بستی کی بستی کو اُلٹ دینے کا ارادہ کرتا ہے، سخت لایعنی بات ہے اور خدا کا جو مفہوم مذہب نے بتایا ہے اس کے بالکل منافی ہے۔

فی الحقیقت یہ قرآن کا انداز بیان ہے اور عربوں کے نمونۂ خطابت میں بھی اس قسم کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں۔

اب رہگیا بستی کو تباہ کرنے کا مفہوم سو یقیناً اس سے مراد در و دیوار کی مسماری نہیں ہے بلکہ اہل قریہ کی تباہی مراد ہے اور ظاہر ہے کہ جب کسی بستی کے رہنے والے برباد ہو جائیں گے تو وہ بستی آپ اُجاڑ نظر آئیگی۔

اس لئے ان آیات کا صحیح مفہوم یہ ہوا کہ جب کوئی قوم بداعمالی کرتی ہے تو وہ برباد ہو جاتی ہے، لیکن بداعمالی سے مراد ترک صوم و صلوٰۃ نہیں بلکہ احساس قومیت و خودداری کا فقدان، قوائے عمل کا اضمحلال، غلامانہ ذہنیت کا استیلاء، اور جمود و تعطل ہے، جو آجکل ہندوستان کے مسلمانوں پر طاری ہے اور جس کا یقینی نتیجہ اس قوم کی عام بربادی اُن کی بستیوں کی ویرانی ہے، اور جو نتائج زلزلہ سے کہیں زیادہ عبرت خیز و حسرتناک ثابت ہونے والی ہے۔

زلزلہ بھی منجملہ دیگر طبیعی حوادث کے ہے جس کے اسباب متعین ہو چکے ہیں اور اس کو انسانی بداعمالیوں سے کوئی تعلق نہیں، یہاں تک کہ اگر بہار و کوئٹہ میں سوائے اولیاء کرام کے کوئی اور متنفس نہ پایا جاتا تو بھی زلزلہ کی تباہکاریاں اسی طرح ظاہر ہوتیں اور اگر ریگستانی مقامات میں رات دن سوائے فسق و فجور کے اور کچھ نہ ہو تو وہاں زلزلہ کے شداید کبھی محسوس نہیں ہو سکتے۔

اس نوع کا استدلال صرف اس ملایانہ ذہنیت کا نتیجہ ہے جسے عقل سے ہمیشہ دشمنی رہی ہے اور جس نے مذہبی لٹریچر کو بھی اپنی احمقانہ تاویلوں سے گندہ کر کے ہمیشہ دوسروں کو ہنسنے کا موقع دیا ہے۔

حجر اسود۔ تخلیق عالم چھ دن میں

(جناب محفوظ الرحمٰن صاحب۔ جھالاواڑ)

کرامت ظہور حضرت مولانا نیاز صاحب۔ ہدیہ سلام مسنون۔ چونکہ فی زمانناآپ کے فیض تحقیق و

تدقیق سے وسیع النظر و صحیح دماغ روشن اور منور ہو رہے ہیں لہذا یہ نیاز مند بھی بہ وکالت نیاز نامہ ہذا نیازمندانہ حضرت نیاز میں بہ امید عطائے جواب سوال ذیل غائبانہ شرف نیاز حاصل کرتا ہے۔ وہو ہذا

(۱) حجر اسود موجودہ خانۂ کعبہ کے نسبت مختلف اقوال پڑھنے اور سننے میں آتے ہیں مورخ تو کہتے ہیں کہ یہ ایک سیارہ تھا جو ساتویں صدی عیسوی میں بہ صورت شہاب ثاقب معمولاً آسمان سے ریگستان عرب میں گرا جس کو اہل عرب کعبہ میں لے گئے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ پہلے سے اسکو حضرت ابراہیمؑ نے خانۂ کعبہ میں بروقت بنا کعبہ کعبہ میں نصب کیا تھا، چونکہ اس کا وجود ارکان حج فریضہ میں داخل ہے لہذا مطلع فرمایئے کہ اس کی صحیح اصلیت کیا ہے اور در اصل یہ پتھر ہے یا کوئی دھاتی شے۔ اور یہ خانۂ کعبہ میں کب اور کیونکر اور کہاں سے آیا اور اس کے بہ صورت بوسہ دینے کے ارکان حج میں داخل ہونے کی کیا حقیقت ہے۔

(۲) اللہ تعالے نے قرآن میں ارشاد فرمایا ہے کہ: ۔ وہ خلق السمٰوات والارض فی ستۃ ایام ثم استویٰ علی العرش ۔ اور یہ بھی ارشاد ہے کہ: ۔ وہ قال کذالک یخلق اللہ من یشاء اذا قضیٰ امراً فانما یقول لہ کن فیکون ۔ پس استدعا دریافت یہ ہے کہ آیا کن فیکون کے مقابلہ میں زمین و آسمان کا مخصوص چھ روز میں بنانا ظاہر کرنے میں معنیاً یا دلیلاً کیا مصلحت ہے اور کیا آسمان کوئی مرکب یا مادی شے ہے کہ جس کی ترکیب و صنعت میں اس کن فیکون جیسی قادر اور لاتعد و لاتحصٰے طاقت کو بظاہر چھ روز صرف کرنا پڑے اور کیا یہ آسمان بہ درجہ کئی آسمان ہیں جیسا کہ علماء و مفسرین کا بیان ہے۔

میں نے بہ نظر تحقیق آپ کے تحقیقی معیار کے مطابق یہ مسایل حل کرنا مناسب سمجھ کر تکلیف دی ہے امید کہ نگار کے قریبی اشاعت میں اس کا جواب مفصل شائع فرمائیں گے۔

(نگار) (۱) حجر اسود کے متعلق اس سے قبل کئی سال ہوئے میں اظہار خیال کر چکا ہوں، اگر آپ اس کو دیکھنا چاہتے ہیں تو مجموعہ استفسار و جواب جلد اول ملاحظہ فرمایئے۔

(۲) جو آیت چھ دن میں آسمان و زمین کے پیدا کرنے کی آپ نے پیش کی ہے وہ بڑی مابہ النزاع چیز ہے اور مختلف مفسرین نے مختلف مفہوم ظاہر کیا ہے۔ بعض نے یوم سے دور مراد لیا ہے اور ہر دور پچاس پچاس ہزار سال کا قرار دیا ہے، بعض نے ایک دن ہزار سال کا بتایا ہے، بعض نے یوم سے حالت مراد لی ہے، لیکن میرے نزدیک یہ سب بارد تاویلیں ہیں اور عقل سے دور۔

حقیقت یہ ہے کہ آسمان و زمین کے چھ دن میں بنائے جانے کا اعتقاد اسلام کی اختراع نہیں ہے

بلکہ یہود کا اعتقاد ہے اور توریت میں اس کا ذکر موجود ہے۔ چونکہ اہل عرب بھی یہود کی روایات کو صحیح تسلیم کرتے تھے اس لئے انھیں کے عقیدہ کو اُن کے سامنے پیش کرکے ندا کی عظمت ظاہر کی گئی ہے، چنانچہ تفسیر کبیر میں اس کی صراحت موجود ہے اور میرے نزدیک یہی بہترین تاویل ہے۔ صاحب تفسیر کبیر لکھتے ہیں کہ:۔

"توریت میں لکھا ہے کہ خدا نے چھ دن میں آسمان و زمین پیدا کئے، پھر چونکہ اہل عرب کا یہودیوں سے بہت غلط ملط تھا اور انھوں نے یہود سے یہ بات سُنی تھی، اس لئے خدا فرماتا ہے کہ تم بتوں کی پرستش نہ کرو کیونکہ تمھارا پروردگار تمھارے ہی عقیدہ کے مطابق اتنا عظمت والا ہے کہ چھ دن میں اس نے آسمان و زمین پیدا کئے۔"

(۳) "کُن فیکون" سے جو معنے عام طور پر سمجھے جاتے ہیں وہ صحیح نہیں، یعنی اس کا مفہوم یہ قرار دینا کہ لفظ کُن کہا گیا اور کائنات فوراً ظاہر ہو گئی غلط ہے۔

فیکون میں حرف (ف) تدریج و ترتیب کو ظاہر کرنے کے لئے ہے یعنی جب خدا کسی چیز کو پیدا کرنا چاہتا ہے تو اس کے ظہور کا حکم دیتا ہے اور وہ رفتہ رفتہ تدریج کے ساتھ وجود میں آجاتی ہے، علاوہ اس کے کن فیکون کہکر یہ ظاہر کرنا بھی مقصود ہے کہ خدا آفرینش کے لئے کسی نمونہ کا محتاج نہیں ہے اور نہ وہ مادی ذرایع کا پابند ہے۔

یادگار۔ ادبائے ہند کا بے مثل مرقع

جناب وصل بلگرامی ان لوگوں میں سے ہیں جو ہمیشہ کچھ نہ کچھ کرتے ہی رہتے ہیں۔ حال ہی میں ان سے ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ وہ ایک نہایت ہی اہم اور دلچسپ کام میں عرصہ سے مصروف ہیں۔ یعنی وہ ایک ایسا مرقع طیار کر رہے ہیں جس میں ملک کے تمام ادبار ماضی و حال کی تصاویر معہ اُن کے نمونۂ تحریر اور مختصر حالات کے یکجا نظر آئیں۔ اس سلسلہ میں اسوقت تک جتنا کام ہوا ہے وہ میری نظر سے گزر چکا ہے اور بہت کافی ہے۔

لیکن یہ کام اتنا اہم اور اسقدر مشکل ہے کہ تنہا ایک شخص کی کوشش اس کو کامیاب نہیں بنا سکتی بلکہ ضرورت ہے اجتماعی حیثیت سے سعی و عمل کی۔ یقیناً اسوقت ملک کے بہت سے ادیب و مصنف شاعر و ناثر ایسے ہیں جنکی تصاویر یا تحریروں کے نمونے وہ ابتک فراہم نہیں کر سکے ہیں، اس لئے میں چاہتا ہوں کہ تمام ایسے حضرات جو اس مرقع میں شرکت کرنا چاہتے ہیں اپنی تصاویر کے بلاک معہ نمونۂ تحریر و مختصر حالات کے جناب وصل کے پاس بھیجدیں۔ اور اس باب میں تنہا وہی نہیں بلکہ میں بھی ممنون ہوں گا۔ ان کا پتہ ——— قیصر باغ لکھنؤ کا ہے۔

کار امروز نمبر کے تنقیدی حِصّہ پر ایک غیر جانبدارانہ تبصرہ

جناب سیماب اکبرآبادی کا مجموعۂ منظومات (کار امروز) چھپکر طیار ہی ہوا تھا کہ جناب سیماب نے ۲۲ دسمبر ۳۳ء کو مجھے ایک خط لکھا جو بجنسہ یہاں نقل کیا جاتا ہے :۔

محترمی ۔ السلام علیکم ۔ میری نظموں کا جدید مجموعہ "کار امروز" چھپ کر طیار ہو چکا ہے ۔ میرا ارادہ نہ تھا کہ میں اس مجموعہ کے لئے مقدمہ لکھواؤں مگر بعض احباب اور تلامذہ کا اصرار ہے کہ مقدمہ ضرور لکھوایا جائے ۔ میری نظموں پر مقدمہ لکھنے والے میں چند اوصاف کا ہونا ضروری ہے ۔

(۱) وہ میرے یقین میں میرا معاصر ہو (۲) ادبیات مشرق و مغرب پر اسے عبور ہو (۳) اسکا دماغ قدامت زدہ نہ ہو۔

آپ میں یہ تمام اوصاف موجود ہیں ، اس لئے بغیر کسی تکلف و تصنع کے آپ کو دیباچہ نگاری کی تکلیف دینا چاہتا ہوں ۔ مقدمہ کی جلد ضرورت ہے ، کتاب طیار ہو چکی ہے ۔ مقدمہ کی کتابت و طباعت کے بعد شائع ہو جائے گی ۔ اجازت دیجئے کہ کار امروز کے مسودات ذریعہ رجسٹری آپ کو بھیجدوں یا خود لیکر چلا آؤں ۔

مولانا ، نہ انکسار کی ضرورت ہے نہ اعتذار کی ، آپ مجھے جانتے ہیں اور میں آپ کو ۔ مقدمہ لکھ ہی دیجئے ۔ اپنے صوبہ میں آپ سے بہتر مجھے کوئی اور شخص اس کام کے لئے نظر نہیں آتا ۔

منتظر جواب

سیماب اکبرآبادی

میں نے اس کے جواب میں اپنی غیر معمولی مصروفیت کا عذر پیش کیا ، لیکن انھوں نے پھر اصرار فرمایا اور میں نے لکھدیا کہ مسودہ بھیجدیجئے ۔

جس وقت مسودہ آیا اور میں نے جستہ جستہ اس کا مطالعہ کیا تو میں نے یہ دیکھکر کہ وہ اغلاط سے پاک نہیں ہے یہی مناسب سمجھا کہ مقدمہ لکھنے سے احتراز کیا جائے اور آخر کار میں نے مسودہ واپس کر دیا ۔

اس کے بعد جب کتاب چھپ کر ریویو کے لئے موصول ہوئی تو اس وقت بھی میں نے خاموشی اختیار کی، لیکن جناب سیماب کے متواتر و پیہم اصرار سے مجبور ہو کر میں نے ریویو کیا اور محاسن کے ساتھ جو نقایص نظر آئے وہ بھی ظاہر کر دئے۔ جس وقت ریویو کی پہلی قسط اپریل ۳۵ء کے نگار میں شایع ہوئی تو میں متامل تھا کہ آیندہ اس سلسلہ کو جاری رکھوں یا نہیں، لیکن سیماب صاحب کا ایک کارڈ ملا، جس میں تحریر تھا کہ:-

"کارامروز پر مفصل تبصرے کا شکریہ - براہ کرم اس کا حصۂ باقی بھی آیندہ نمبر میں ضرور شائع کر دیجئے تاکہ میں آپ کی رائے اور آپ کے خیال سے کلیتاً مستفیض ہو سکوں"۔

چنانچہ باقی دو حصے اس ریویو کے مئی اور جون کے نگار میں شایع کر کے میں خاموش ہو گیا۔ اس کے کئی مہینے کے بعد رسالۂ "شاعر" (آگرہ) میں کارامروز نمبر کا اعلان دیکھا اور اسی میں کسی جگہ اس مفہوم کا بھی اعلان تھا کہ اس خاص نمبر میں نیاز کی اس "یتیم العلمی" اور نااہلی کو بھی ظاہر کیا جائے گا جو کارامروز کے سلسلۂ تبصرہ میں اس سے ظاہر ہوئی ہے۔

آخر کار بڑے انتظار کے بعد جولائی کا شاعر (جو کارامروز نمبر کے نام سے موسوم ہے) ستمبر میں موصول ہوا اور جناب فضل الدین اثر کا وہ مضمون پڑھا جس میں انھوں نے میرے اعتراضات کا جواب دینے کی کوشش کی ہے۔

خیر اعتراضات کا جواب تو ایسی بات نہیں ہے جس کی طرف مجھے توجہ ہوتی، لیکن تحریر کے انداز بیان نے مجھے بہت لطف دیا اور میں حیران رہ گیا کہ اثر صاحب کو میری سیرت و خصوصیات کا اتنا صحیح علم کیونکر حاصل ہو سکا۔ ہر چند میری سمجھ میں اسوقت تک یہ بات نہیں آئی کہ میرے تبصرہ کا جواب دینے کے لئے میرے اخلاق و عادات سے بحث کرنے کی کیا ضرورت تھی تاہم چونکہ اثر صاحب نے کافی وسعت نظر سے کام لے کر اس خدمت کو انجام دیا ہے اس لئے اس کی داد نہ دینا ظلم ہے۔

سب سے پہلے انھوں نے مجھے "جاہل حاسد" کے لقب سے یاد کیا ہے اور پھر بہ تصدیق و روایت جناب جوش ملیح آبادی "زیب خوردہ انسان" کا خطاب مرحمت فرمایا ہے، اس کے بعد کسی جگہ انھوں نے میری بصارت کے فقدان پر ماتم کیا ہے، کہیں میرے ملحدانہ کفر کا ذکر فرمایا ہے اور اس پیشین گوئی کے ساتھ کہ "وہ وقت بہت قریب ہے جب مولانا نیاز فتحپوری نہ کوؤں میں رہیں گے نہ موروں میں"۔ پھر یہ خطابات تو وہ ہیں جو یونہی گرمی سخن قائم رکھنے کے لئے استعمال کئے ہیں ورنہ جواب کے سلسلہ میں تو انھوں نے اس سے بھی زیادہ حسن مراعات سے کام لیا ہے۔

میں کبھی اس نوع کی تحریروں پر اعتنا کرنے کا عادی نہیں ہوں اور چونکہ جناب اثر کے کسی لفظ سے مجھکو کسی قسم کی کوئی تکلیف ہی نہیں پہونچی اس لئے یوں بھی مجھے جواب دینے کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن اتفاق

صاحب کا مضمون اس موضوع پر آگیا اور میں نے اسے صرف اس لئے شائع کرنا مناسب سمجھا کہ اس کے سلسلہ میں مجھے بھی چند باتیں کہنے کا موقع مل جائے گا اور آثر صاحب اس صدمہ سے محفوظ رہیں گے کہ میں نے اس کا کوئی اثر ہی نہیں لیا۔

رسالۂ شاعر کی اس اشاعت میں جو کارامروز نمبر سے موسوم ہے، تمام رائیں اور تبصرے نقل کئے گئے ہیں، لیکن نگار کا تبصرہ شایع نہیں کیا گیا کیونکہ نگار کے پرچے آثر صاحب مسوری لیکر چلے گئے تھے اور جب وہ واپس آئے تو رسالہ میں جگہ باقی نہ رہی تھی۔ ممکن ہے یہ عذر صحیح ہو، لیکن مجھے نہیں کسی شخص کو یہ شبہ پیدا ہوسکتا ہے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ نگار کا مفصل تبصرہ لفظ بہ لفظ نقل کرنے کے بعد جواب دینا مشکل ہو جاتا، کیونکہ یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ نگار کے تقریباً سو اسو اعتراضوں میں سے صرف ۲۹ اعتراضوں کا ذکر کیا گیا ہے اور باقی کی طرف سے بالکل خاموشی اختیار کی گئی ہے۔

اسی سلسلہ میں مجھے یہ بھی ظاہر کر دینا چاہئے کہ لفظ حسین کے متعلق لطیف صاحب کی جس تحریر کا ذکر کیا گیا ہے وہ میری نظر سے گزر چکی ہے، لیکن لطیف صاحب کو نہیں تو کم از کم سیاب صاحب کو اور ان کی وساطت سے آپ کو ضرور معلوم ہونا چاہئے کہ فارسی زبان یا فارسی انشاء کے باب میں مولانا روم کی مثنوی بالکل ساقط الاعتبار چیز ہے اس کے مرتبہ کی بلندی کا تعلق صرف اس کے مفہوم و مطالب سے ہے، الفاظ یا زبان سے کوئی واسطہ نہیں۔ اس لئے اگر علاوہ مثنوی کے کسی اہل ایران کے کلام میں لفظ حسین کا استعمال ہوا ہو تو اس کے سننے کا میں بھی مشتاق ہوں۔ ایک صاحب نے مجھ سے کہا کہ مثنوی کے قدیم نسخوں میں حسینانِ زمن نہیں ہے بلکہ جمیلانِ زمن ہے۔ خیر، ان کے اس قول کو تو میں سنداً پیش نہیں کرتا لیکن یہ ضرور عرض کروں گا کہ فارسی زبان کی بحث میں آیندہ اگر مولانا روم کی مثنوی سے استناد کی مضحکہ خیز جرأت نہ کیجائے تو مناسب ہے۔

نیاز

انسانی زندگی کے تمام واقعات اکثر و بیشتر نتیجہ ہوتے ہیں جذباتی رجحانات کا۔ ماہرینِ علم النفس اس پر متفق ہیں کہ انسانی جذبات میں جذبۂ محبت اور جذبۂ غیظ و غضب کا غلبہ دماغی توازن کو برباد کر دیتا ہے چنانچہ یہ مسلم ہے کہ ایک فنافی المحبت یا مغلوب الغضب کبھی کسی صحیح رائے کا اظہار نہیں کر سکتا۔

اب تک کارامروز پر جتنے تبصرے ہوئے ہیں اُن میں سوائے مولانا نیاز فتحپوری کے تمام تر مبصرین سیاب اور سیابیت کے دلدادہ ہیں اور اُن کا حسنِ اعتقاد اس بات کی اجازت نہ دے سکا کہ وہ تنقید و تبصرہ کو ٹھنڈے دل سے ادبی کسوٹی پر کھا کر دکھاتے۔ یہ اس بات کا کافی اندازہ ہو جاتا ہے کہ ایک شعر کو کتنا دیانتدار ہونا چاہئے۔ تبصرہ چونکہ کسی امر کے کلی و جزئی مطالعہ کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ اس میں غیر جانبدارانہ رائے کا اظہار ہو۔

قریب قریب نیاز صاحب اس معیار سے کہیں نہیں ہٹے۔

فضل الدین صاحب اثر سیمابی ہیں۔ سیمابیت کے دلدادہ ہیں۔ انھیں تمام اقصائے عالم میں صرف سیماب صاحب ہی کی ایک ایسی ہستی نظر آتی ہے جو ان کے "ادبی جذبۂ اعتقاد" کی مرکز ہے۔ اس لئے تنقید نیاز پر اُن کی برہمی و بیقراری قطعاً حق بجانب ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اُن کا یہ حُسنِ اعتقاد سیمابیت کے تاریک ترین پہلوؤں پر کبھی نظر نہ کرنے دے۔ نیز ہر وہ بات جو سیماب صاحب کے خلاف ہو (چاہے قطعاً درست ہی کیوں نہ ہو) "مجروحِ عقیدت" دل پر تیر و نشتر ثابت ہوگی، لیکن اس میں نیاز صاحب کا کیا قصور؟ نیاز صاحب نے بالکل وہی کیا جو ایک دیانتدار مبصر کا فرض ہوتا ہے جس کے روشن دلائل اُن کے "اعترافاتِ محاسن" اور اعتراضاتِ معائب" ہیں۔

سیماب صاحب فرشتہ نہیں بشر ہیں اور بمقتضائے بشریت غلطی بھی کر سکتے ہیں یہ اور بات ہے کہ اثر صاحب کی عقیدتمندانہ نگاہیں اُن پر نہ پڑیں۔ تاہم ماہرینِ فن کا یہ فرض ہے کہ وہ تمام مطبوعات کی فنی اور ادبی خصوصیات کو روشنی میں لاکر دنیائے ادب کی سپرد کردہ ذمہ داریوں کو ادا کریں۔

سب سے زیادہ حیرت انگیز اور مضحکہ خیز یہ بات ہے کہ اثر صاحب نے جو تنقیدی معیار قائم کئے ہیں اُن پر سیمابی عقائد کی وجہ سے خود بھی ثابت قدم نہ رہ سکے۔ آپ کے موعوعات کے مطابق ناقد کو "گڑے مردے نہ اکھاڑنا" چاہئے۔ لیکن نیاز صاحب کی ملحدانہ زندگی کے تذکرہ سے کیا منشا ہے؟ سمجھ میں نہیں آتا کہ اثر صاحب نے (جو ذہنی توازن اور شائستگیِ خیال کو معیارِ تنقید قرار دیتے ہیں) نیاز صاحب کی پرائوٹ زندگی بیان کر کے کیوں دل کے جلے پھپھولے پھوڑے اور خارج از بحث موضوع نظائر پیش کر کے خود کو ایک زبردست علمبردارِ ادب ثابت کرنے کی ناکام کوششیں کیں اور بقول خود ایک جاہل حاسد کی حیثیت اختیار کر کے ایک ناقد کے منصبِ اعلیٰ سے گر گئے۔

شاعر کی تصنیفات کو غزلوں اور نظموں کی بیاض تسلیم کرنے کے بعد بھی یہ امر تشنۂ تکمیل رہ جاتا ہے کہ نظموں کے موضوعات اور تجزیۂ خیالات کو کیا کہا جائے جو اکثر فلسفیانہ نظائر۔ حکیمانہ تجاویز، مذہبی مشورے، قومی احساسات، سیاسی اسباق اور جذباتی رجحانات کے آئینہ دار ہوتے ہیں کم عقل سے کم عقل بھی یہ کہہ سکتا ہے کہ شعر یا نظم جس موضوع کے ماتحت ہو اُس پر اُسی موضوع کے نظریوں سے بحث کیجائے پھر یہ کہنا کس قدر تنگ نظری اور علمی افلاس کی دلیل ہے کہ شاعر کی رائیں اتفاق و اختلاف کے لئے نہیں بلکہ محض برائے حصول حظ ہوئی ہیں۔ اس حیثیت سے تو شاعر ایک پیغمبرِ فطرت نہیں بلکہ محض ایک کامیڈین Commedian ہے جو بیک وقت چند تماشائیوں کی وقتی تفریح کا باعث بن سکے۔ طرفہ تماشہ یہ کہ اثر صاحب نظموں کی --

بیاض کو پرائیوٹ ڈائری سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان کا میدانِ صحافت میں آنا کیا معنی رکھتا ہے۔ خدا رحم کرے اگر یہی حال رہا تو کیا عجب کہ شاعر کی پرائیوٹ لائف بھی منظرِ عام پر رونما ہو جائے۔

اثر صاحب فرماتے ہیں کہ شاعر نہ تو فلسفی ہے نہ مدبر، نہ سیاسیات کا ماہر نہ اخلاقیات کا مدرس تو پھر شاعر کس مرض کی دوا ہے؟۔ حالانکہ مولانا سیماب فرماتے ہیں کہ:۔

شاعر نہ ہو تو صورتِ الہام فضول جائے　　شاعر نہ ہو تو دنیا نظم اپنا بھول جائے
جب جادۂ اقوام میں دشواریاں ہوں سدِ راہ　　اسوقت شاعر سے کہو تدبیر آسانی کرے (سیاست)
جب گردِ فکر و یاس میں دب جائے سارا قافلہ　　اسوقت شاعر سے کہو سعی درخشانی کرے (اخلاقیات)
جب شورشوں کے بعد بھی ممکن نہ ہو اک انقلاب　　اس وقت شاعر سے کہو خونِ جگر پانی کرے (سیاست)
محبت میں اک ایسا وقت بھی آتا ہے انساں پر　　ستاروں کی چمک سے چوٹ لگتی ہے رگِ جاں پر (محبت)
حدِ معلومِ ہستی سے گزرتا ہی نہیں　　صرف اک یہ ہے وہ انسان جو مرتا ہی نہیں (مذہبیات)

مشتے نمونہ از خروارے ـــــ واللہ اُستاد اور شاگرد کا تضادِ خیال بہت ہی پر لطف ہے۔

عرض حال

نہ تو میں نیازی ہوں اور نہ سیماب صاحب سے کوئی ذاتی پرخاش ہے ـــ فن کی خدمت اور اظہارِ حقیقت کا جذبہ مجھے مجبور کرتا ہے کہ نیاز صاحب کے اعتراضات اور اثر صاحب کے جوابات پر ایک خالص ادبی غیر جانبدارانہ تبصرہ پیش کروں۔

اعتراض:۔　　وہ سطحِ زمیں پر تن تن کر حوروں کی طرح چلنے والے

اس مصرع میں سب سے پہلے اثر صاحب کو مشبہ، مشبہ بہ اور وجہ شبہ میں ایک شدید ابہام واقع ہوا ہے، حالانکہ بتدی شعراء بھی یہ جانتے ہیں کہ مشبہ اور مشبہ بہ میں وجہ شبہ ایک خاص صفت ہوتی ہے۔ حور چونکہ مذہبی تخئیل کی پیداوار ہے اس لئے یہ ضروری ہے کہ اس کی صفات کے لئے مذہبی لٹریچر سے استفادہ کیا جائے۔ صرف اسی خیال کے اظہار پر اثر صاحب نیاز صاحب پر بُری طرح برسے اور اپنے زعمِ ہمہ دانی میں نہ جانے کیا کیا خارج از موضوع جذبات کا اظہار کیا۔ ایک "ذمہ دار شاعر" کم از کم اتنا فاتر العقل تو نہیں ہوتا کہ شعری مشورہ کے جواب میں ذاتیات رنا جائز حملے بھی روا رکھے۔

اعتراض یگرہستی مرحوم پہ احساں کردے　　پھر مرتب مرے اجزائے پریشاں کردے

"گر" کو بغیر مدا کے اس جگہ استعمال کرنا مناسب نہیں۔ وجہ اعتراض چونکہ محلِ استعمال

ہے اس لئے ذوق کے شعر کو دلیلاً پیش کرنا اور اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کرنا کہ منادی بغیر ندا کے بھی استعمال ہوتا ہے ایک بے معنی بات ہے جبکہ دونوں کے محل استعمال میں دور کا بھی واسطہ نہیں ہے شاید اس مسئلہ کی وضاحت اثر صاحب کی تمہید میں کہیں نہیں ہے۔ کیا عجب ہے کہ جس طرح آپ اور مقامات پر اپنے نظریوں سے ہٹ چکے ہیں یہاں بھی منشا صرف معترض کو مرعوب کرنا ہو۔

شعر۔ پھر بنا لا مجھے رنگینیٔ دامانِ بہار　　　پھر گلستاں میں گل و لالہ بداماں کر دے

جہاں تک ادبی تعلق ہے معترض کی زریں رائے قابل قدر ہے۔ اور اثر صاحب باوجود اعتراف احتراز کے فطرت سے مجبور ہو کر یہاں بھی ذاتیات پر حملہ کناں ہیں۔ رہا اصلاح کا سوال تو۔

سونپ دے پھر مجھے رنگینیٔ دامانِ بہار　　　پھر گلستاں میں مجھے لالہ بداماں کر دے

میں "مجھے" کی تکرار نے جو لطف بیان پیدا کر دیا ہے اس سے کچھ ارباب فصاحت ہی حظ اندوز ہو سکتے ہیں نیز سونپ دے کی رکاکت بھی دلیل طلب ہے۔

شعر۔ جمع کر کے مرے سامانِ نوا سنجی کو　　　بر بطِ خامشی عالم امکاں کر دے

اس شعر میں معترض اور مجیب کے درمیان ایک دلچسپ غلط فہمی ہو گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ الفاظ شعر محض المعنی فی بطن الشاعر کی تفسیر کر رہے ہیں۔

شعر۔ محفلِ عالم جمالِ حُسن سے خالی ہوئی　　　صبح کی صورت جہنم کی طرح کالی ہوئی

جمالِ حُسن اور جلوہ کے امتیاز میں معترض کو ایک شدید مغالطہ ہوا۔ تاہم مشورہ نیک ہے اور محض تبادلۂ الفاظ سے معانی میں ایک شاندار اضافہ ہو جاتا ہے ۔۔۔ ثانیاً شاید سیماب صاحب جہنم اور پردۂ ظلمات کو مترادف سمجھتے ہیں۔ ایسی جگہ جہاں شعلے دہکتے ہوں "کالی" کہنا کتنی لغو اور مہمل بات ہے فاضل معترض نے نہ جانے کیوں اسے نظر انداز کر دیا۔ صبح کو جو مرکز انوار و مظہر تجلیات ہے جہنم کی طرح کالی کہنا ایسے گناہ کبیرہ کا ارتکاب ہے جسے مذہبِ فطرت کبھی معاف نہیں کر سکتا۔

شعر۔ مستقل جو عہد شخصیت کا لعنت ہو گیا　　　نام اُس قانون وضعی کا سیاست ہو گیا

نیاز صاحب یہ کہنے میں بالکل حق بجانب ہیں کہ شخصیت سے (Autocracy) کا مفہوم ادا نہیں ہوتا۔ شخصیت اور شخصی حکومت میں جو فرق ہے اس سے سوسائٹی کا ہر فرد واقف ہے۔ شعر کا مفہوم جو آثر صاحب نے پیش کیا ہے وہ صرف اُن کی ذہنی پیداوار ہے جس کا اصل شعر سے کوئی ربط نہیں۔ قانون وضعی سے محض لفظی معنی لینے کے بعد بھی صرف قانون مفاد مراد لینا (اور قانون استبداد کو نظر انداز کر دینا) ایک ایسی بدعت ہے جسے لٹریچر کبھی گوارا نہیں کر سکتا ۔۔۔ یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ محض قانون مفاد ہی کیونکر سیاست بن سکتا ہے

سیاست بجائے خود کوئی قانون نہیں البتہ سیاست کا قانون گر ہونا ممکن ہے۔

شعر:- اک دور وہ تھا روح فزا کیفیت اندوز کعبہ میں تھی اک عید تو بتخانے میں نوروز

حقیقت تو یہ ہے کہ اعتراض بالکل درست ہے اور اصلاح نے سونے پر سہاگہ کا کام دیا ہے۔ مجیب نے حقیقی عید اور مجازی عید کی لفظی بحثوں میں پڑ کر مفہوم اعتراض کو اُلجھا دینے کی ناکام کوشش کی ہے۔ اعتراف شکست کا یہ پہلو نہایت شاندار ہے۔

شعر:- ایک آزردہ سی چتون میں بھی تھا حسنِ کشاد ایک دزدیدہ نظر بھی گرمی افسانہ تھی

جس طرح اور مقامات پر جناب آثر نے "سوال از آسمان وجواب از ریسمان" پر اپنی تنقیدی بنیادیں قائم کی ہیں، اسی طرح یہاں بھی اُنھوں نے اعتراض نہ سمجھتے ہوئے جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ ایک واقعی زاید ہے سیماب صاحب کے "سی" اور جوش صاحب کے "سی" میں محل استعمال جداگانہ ہیں اس لئے ایک دوسرے کی سند نہیں بن سکتا۔ موضوع نظم پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر عہد ماضی کے روادارانہ سلوک اور پرخلوص زندگی کے کامیاب منظر پیش کرنا چاہتا ہے مگر رعایات لفظی اور اظہار قابلیت واجتہاد نے شعر کو مبہم کر دیا۔ حقیقت پسند احباب یہی فیصلہ دیں گے کہ سیماب صاحب کے مفہوم کو نیاز صاحب کے اصلاحی شعر نے پوری وضاحت کے ساتھ ادا کر دیا۔

جناب اثر نے یہ فرما کر کہ نیاز صاحب کے اکثر افسانہائے حیات کی تخلیق کا باعث محض "دزدیدہ نگاہی" ہے اپنے دعوے کو اور کمزور کر دیا۔ وجہ تخلیق افسانہ گرمی افسانہ نہیں بن سکتی کیونکہ گرمی کا لفظ کسی بات کی ارتقائی منزل کو ظاہر کرتا ہے چاہے اُس کی بنیادیں کمزور ہی کیوں نہ ہوں۔

سیماب - چاند کی نظروں میں ہے ابتک وہی عالم کشی سینۂ خورشید میں سوزِ حقیقت بھی وہی
گرمی تخلیق میں ابتک وہی ہے سوز و ساز خوئے ضبط اُسکی وہی اور اسکی نخوت بھی وہی

اصلاح نیاز- سینۂ خورشید میں ابتک وہی ہے التہاب چاند کی نظروں میں پروازِ لطافت بھی وہی
عشق میں اور حسن میں ابتک وہی ہے سوز و ساز خوئے ضبط اُسکی وہی اور اسکی نخوت بھی وہی

عالم کشی پر اعتراض تو کچھ اتنا قوی نہیں البتہ چاند کی عالم کشی اور سینۂ خورشید کے سوز حقیقت کو گرمی تخلیق سے کوئی علاقہ نہیں۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دونوں اشعار دو متضاد معانی کے حامل ہیں درانحالیکہ شاعر کا یہ مقصود نہیں۔

ہاں معترض نے چاند کی پروازِ لطافت اور سینۂ خورشید کے التہاب کو حسن وعشق سے استعارہ کر کے ایک بامعنی اصلاح دی ہے جس سے معترض کی اُستادانہ ذہنیت اور پختہ کلامی کا پتہ چلتا ہے۔

شعر:- بیکسی کے زرد چہرہ پر خوشی کا نور تھا افسرِ شاہی بساطِ محفلِ مزدور تھا

معترض کی درست مقالی کے اعتراف کے بعد یہ کہنا کہاں تک درست ہے کہ بیروں سے کچل کر افسر تو کیا سر بھی بساط بنایا جا سکتا ہے۔ غور طلب امر یہ ہے کہ کسی شے کی (بالخصوص افسر و سر) پامالی سے اس کے بساط بن جانیکا کہاں تک امکان ہے؟ ممکن ہے چودھویں صدی کے اس ایجاد و اختراع کے دور میں جناب آثر صاحب ایسا وسیع سر لیکر آئے ہوں جو کچل جانے کے بعد ایسی بساط بن سکے جس پر محفل مزدور کا انعقاد ہو۔

شعر:- تغیرات او رعلی التواتر تصرفات اور بے محابا کمال حسن وجمال کیا ہے زوال شیب و شباب کیا ہے

تحولات غریب اور غیر شاعرانہ لفظ ہی سہی لیکن معنی کے اعتبار سے ضروری ہے۔ اگر شیب کے زوال کو موت تسلیم کرلیا جائے تو جوانی کی موت کو کیا کہیں گے۔ موت زوال شیب نہیں بلکہ زوال زندگی کا نام ہے۔

شعر:- دورِ صبا دمیں اسدرجہ ہوا غم مجھ کو اب مسرت کبھی ہوتی ہے مگر کم مجھکو

اصلاح نیاز:- دورِ صبا دمیں اسدرجہ ہوا غم مجھ کو کہ مسرت کبھی ہوتی ہے تو کم مجھکو

معمولی عقل والے تو ضرور نیاز صاحب کے مصرعہ کو پھسپھسا کہیں گے۔ البتہ ارباب دانش اور ماہرین فن کی جوہر شناس نگاہیں ایسے گہر پاروں کی قدر کرسکتی ہیں۔

قدر گوہر شاہ داند یا بداند جوہری

رہا شرم کا سوال تو آثر صاحب اپنے گریبان میں منھ ڈالکر دیکھیں "تو" اور "کم" بھرتی سمجھنے پر توں گردن نہ اُٹھا سکیں گے۔

شعر:- مجسم ہو کے ملتی باریابی تیری محفل میں ہم اک لمحہ میں مثل روح تیرے پاس آجاتے

حقیقت یہ ہے کہ لفظی کشمکش نے نیاز صاحب کو معنویت سے بہت دور کردیا ہے۔

شعر:- نعمتِ مقسوم کا ممنون ہونا چاہیئے صاحب دولت کو ہے تحدیث دولت لازمی

سمجھ میں نہیں آتا کہ نیاز صاحب نے تحدیث کے معنی بیان کرنے اور گفتگو کرنے کے لینے کے بعد بھی تجدید وفا کے معنی کیونکر پیدا کرلئے۔ درانحالیکہ شعر کا مفہوم بھی یہ نہیں ہے۔

شعر:- شروع ہوتے ہیں کچھ واقعاتِ نو ساماں مغینہ سے کہو ختم کر فسانۂ دوش

مانا کہ ختم کر صحیح ہے لیکن اعتبار فصاحت سے گرا ہوا ہے۔ کم ازکم ایک اُستاد کے لئے ایسی کمزوری شایان شان نہیں۔ ثانیاً مغینہ واقعی افسانہ گو نہیں ہے۔ اکثر افسانے منظوم ہوتے ہیں مگر قیود غنا سے آزاد۔ مقاصد نظم و غنا میں جو فرق ہے اُس پر آثر صاحب دوبارہ غور فرمائیں۔

رنگین تیتری یا عورت

اس نظم کے متعلق شاعر اور معترض دونوں اپنی جگہ ایک درجہ رکھتے ہیں جس کا امتیاز ارباب نقد و نظر خود کرسکتے ہیں۔

اختتام پر مولانا نے جن اعتراضات کے اقتباس پیش کئے ہیں وہ بجائے خود ایک حقیقت کے حامل ہیں البتہ سیماب صاحب کے "بھی" اور غالب صاحب کے "بھی" میں جو امتیاز ہے اُس پر مولانا غور فرمائیں۔

رہا یہ کہ اس تنقید سے معترض کے علمی وقار کو جو صدمہ (بقول اثر صاحب) پہونچا وہ بھی دلیل طلب ہے۔ محض اپنے احباب اور بالخصوص تلامذہ کی تعریفوں سے خوش ہونا اپنے منہ میاں مٹھو بننے کے مصداق ہے۔ جناب عبدالحفیظ صاحب اثر صاحب کے خاص دوستوں میں سے ہیں اس لئے تنقید نیاز سے اثر صاحب کے ساتھ ہی ساتھ اُن کا برہم ہونا حیرت کی بات نہیں۔

رسالۂ ہندستانی کے اعتراضات کے جواب میں اثر صاحب نے سمن اور سما کے مسئلہ پر روشنی ڈالکر کافی دلچسپی کا سامان فراہم کردیا ہے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ سمن صرف اس لئے زمین کے معنی میں مستعمل ہے کہ وہ زمین کی پیداوار ہے تو جناب موصوف سے یہ پوچھنا غیر ضروری نہیں معلوم ہوتا کہ آفتاب جو فضائے سماوی پر طلوع ہوتا ہے کیا آسمان کے معنی میں مستعمل ہوسکتا ہے؟

ایک بات اور قابل غور ہے کہ اصلاح شعر وسخن کے لئے آگرہ اسکول کا اتباع ضروری ہے کیا یہ نظریہ تمام دنیا کے لئے قابل تسلیم ہے؟ اگر نہیں تو پھر اس کی وسعتیں اسکول تک ہی محدود رہنا چاہئیں —— کارامروز محض آگرہ اسکول کا رسالہ نہیں بلکہ تمام دنیا کے لئے پیغام ہے اور دنیائے شعر و شاعری نے ابتک اساتذۂ سلف کے اتباع کو ضروری مانا ہے۔ اس لئے تنقید و تبصرہ میں جدید قوانین یا (بدعات) بغیر دنیا کے تسلیم کئے ہوئے اساسی اُصول نہیں بن سکتے۔ اگر اساتذۂ سلف کی عائد کردہ قیود بیکار ہیں تو ظاہر ہے کہ اُن کا کلام بھی اس دور کے لئے سند کا کام نہیں دے سکتا، پھر غالب و ذوق سے استناد کے کیا معنی؟ رہا یہ کہ قید و بند یا اغلاطِ شعری محض مبتدی کے لئے ہیں اُستاد کے لئے نہیں تو شاید یہ تسلیم کرنا پڑے کہ اُستاد کے معنی ہیں "مرتکب اغلاط کثیرہ" مگر شاید دنیا اسے بھی نہ مانے —— مضمون کا اختصار کرتے ہوئے صرف ایک بات کا اور اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ نگار کے مسلسل مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اکثر اعتراضات مولانا نیاز نے درست کئے تھے اور غالباً اثر صاحب نے اُن کی درستگی کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں نظر انداز کردیا ہے۔ اپنے مضمون کو اثر صاحب سے مخاطب کرتے ہوئے اس شعر پر ختم کرتا ہوں:-

مختصر ہست کہ گفتم و بدل ترسیدم کہ دل آزردہ شوی ورنہ سخن بسیار است

اگر ضرورت ہوئی تو انشاءاللہ آئندہ اس موضوع پر بعنوانِ انکشافِ راز ایک مبسوط و مکمل تبصرہ ہدیۂ ناظرین کرونگا۔

ریاضت انصاری

باب المراسلۃ والمناظرہ

تحسینِ سخن شناس یا اعترافِ دلدادگی ؟

(جناب ناطق مالوی)

قبلۂ اشرف !

لفافہ میں جو کچھ ملفوف ہے۔ وہ آپ دیکھ ہی لیں گے۔ مجھے صرف اتنا اور عرض کرنا ہے۔ کہ جس غور و فکر سے آپ نے "تصویر" کی غزل کا معائنہ فرمایا تھا اُس سے کہیں زیادہ میرے معروضات قابل توجہ ہیں۔ تاکہ میری غلطی آپ کی ذمہ داری کی شکل میں تبدیل ہو جائے۔ والسلام

"مت پوچھ"

گزشتہ مہینہ کے نگار میں۔ "خاتون بدایونی" کی ایک غزل شایع ہوئی ہے۔ پیر طریقت "حضرت نیاز" نے جس انداز میں داد کلام فرمائی ہے وہ بجائے خود ایک مستقل شعر ہے۔ لیکن یہ کیا ضرور ہے کہ ایک شوریدہ سر اپنی رندانہ جراتوں کو سینہ میں خاکستر ہوتے ہوئے دیکھے اور زبان پر "اُف" بھی نہ لائے۔

ہفوات مسطورہ میں کوشش تو اس بات کی کی گئی ہے کہ جنس لطیف کے ادب و احترام کا کوئی معمولی پہلو بھی مجروح نہ ہونے پائے۔ تاہم "وسعت" جس شے کا نام ہے۔ اُسے محدود نہیں کیا جا سکتا۔ گفتگو کی ادنےٰ لغزش بھی (اگر پائی جائے تو)، بجائے تعریض کے خلوص تصور کئے جانے کے قابل ہے۔

خاتون موصوف معاف فرمائیں کہ آخری اشعار میں "اُن" سے جو خطاب کیا گیا ہے۔ وہ ایک والہانہ کمزوری ہے۔ اپنے ہی جذبات نیاز و نیائش کی۔

محترمہ تصویر سے:- نہ پوچھ اپنے بیاں کی لطافتیں مت پوچھ ہیں شعر شعر میں پنہاں نزاکتیں مت پوچھ

ہر ایک "بول" سے پیدا ہے شوخیِ گفتار
کلام سادہ کی رنگیں حلاوتیں مت پوچھ

دلوں میں ہوتی ہے بیدار جس سے روحِ طرب
حقیقتاً ہیں یہی ۔ وہ عبارتیں مت پوچھ

زباں کی شستگی و دلفریبیاں توبہ !
بیان و نطق کی موزوں اضافتیں مت پوچھ

کھلا ہوا ہے گلستانِ حسن و رعنائی
بہارِ باغِ معانی کی نزہتیں مت پوچھ

ادب نواز تخیل کی دلربا شکلیں
لطیف ذوق وفا کی شکایتیں مت پوچھ

حدیث "بزمِ عدو" پر سنا کہ سُن کے اسے
گزر گئی ہیں ۔ جو دل پر قیامتیں مت پوچھ

"اُن" سے :۔

ستم کے لطف جفاؤں کی لذتیں مت پوچھ
نیاز مند وفا کی مسرتیں مت پوچھ

وہ بار بار سرِ بزم پرسشِ خاموش
تری نگاہ کی کافر شرارتیں مت پوچھ

تجھے قسم ہے ۔ ترے ذوقِ بے نیازی کی
نہ پوچھ مجھ سے مرے دل کی حسرتیں مت پوچھ

ہم اک جہانِ تمنا ہیں ۔ دیکھ ہم کو نہ چھیڑ
ہمارے رنج ۔ ہماری مصیبتیں مت پوچھ

مجھی سے پوچھ ارے میرے پوچھنے والے
رقیب سے مری مایوس حسرتیں مت پوچھ

وہ میری عرضِ تمنا پہ تیرا ہنس دینا
وہ تیرے ہنسنے پہ میری ندامتیں مت پوچھ

غضب کا مصرعۂ "تصویر" ہے مگر ناطق
گزر گئی ہیں ۔ جو دل پر قیامتیں مت پوچھ

(نگار) انگریزی کا مشہور مقولہ ہے :۔

Imitation is the Sincerest form of flattery

یعنی کسی شخص کی نقل و تقلید، تحسین و اعتراف کی نہایت پُر خلوص صورت ہے ۔ اس لئے اصولاً محترمہ تصویر (بدایونی) کو آپ کے ان جذبات کی قدر کرنا چاہئے، رہ گیا میں سو ظاہر ہے کہ مجھے اس میں دخل دینے کا کوئی حق حاصل نہیں، ایک ہدیہ پیش کرتا ہے، دوسرا قبول کرتا ہے یا رد، مجھے اس سے کیا واسطہ کہ ہدیہ کی نوعیت کیا ہے اور رد و قبول کی کیا؟ لیکن اگر دونوں فریق میں بدگمانی پیدا ہونے کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں جناب ناطق سے یہ ضرور دریافت کرتا کہ ایک غزل میں آپ نے محترمہ تصویر سے خطاب کیا ہے اور دوسری میں "اُن" سے تو کیا یہ "اُن" کا اشارہ کسی اور صنف کرّہ مقصود کی طرف ہے ۔ اگر نہیں، تو میری رائے میں اس کا عنوان "پھر انھیں سے" زیادہ موزوں ہوتا ۔

علاوہ اس کے ایک فنی استفادہ بھی جناب ناطق سے کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ پہلی غزل کے چوتھے شعر میں جو

شستگی کا عطف حرف (واو) سے " دلفریبیاں " پر کیا گیا ہے کیا وہ درست ہے ؟ ۔ دلفریب فارسی لفظ ہے لیکن اس کی جمع " دلفریبیاں " فارسی نہیں ، اس لئے شستگی کے ساتھ اس کا عطف بجائے (واو) کے (اور) سے ہونا چاہئے تھا ۔ اگر یہ مصرعہ یوں ہوتا تو کوئی حرج تھا

زباں کی شستگی و دلکشی ، معاذ اللہ !

اسی غزل کے آخری شعر میں " سنا کر سُنکے اسے " بھی نظر ثانی کا محتاج تھا ۔

دوسری غزل کے دوسرے شعر میں بجائے " اپنی نگاہ " کے " تیری نگاہ " اور تیسرے شعر میں بجائے " اپنے ذوق " کے " تیرے ذوق " لکھنا بھی غالباً محلِ نظر ہے ۔

مقطع میں لفظ (مگر) کا صرف بھی میری سمجھ میں نہیں آیا ۔ یہ مصرعہ یوں بھی ہو سکتا تھا :۔

غضب کا معرکۂ تصویر ہے یہ اسے ناطق

یوں بہ حیثیت مجموعی آپ کی دونوں غزلیں خوب ہیں اور خصوصیت کے ساتھ دوسری غزل کا دوسرا اور چوتھا شعر تو قیامت ہے ۔ مگر میں کیا اور میری پسند کیا ۔ " اُن " سے پوچھئے دیکھئے وہ کیا کہتی ہیں ؟

ملاحظات

(بہ سلسلۂ صفحہ ۸)

ایران کی اداے اشتراکانہ

اس وقت عالم اسلامی اور خصوصیت کے ساتھ اثنا عشری دُنیا میں حکومت ایران خاص توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہے اور عراق و ہندوستان اور شاید خود ایران میں بھی بعض جگہ شیعہ حضرات ان جدید احکام کے خلاف صداے احتجاج بلند کر رہے ہیں جو رضا شاہ پہلوی کی طرف سے حال ہی میں شایع ہوئے ہیں۔

وہ احکام جن کے خلاف خصوصیت کے ساتھ اظہار برہمی کیا جا رہا ہے، چار ہیں، ایک یہ کہ عورتوں کے لئے پردہ و نقاب کی ضرورت نہیں ہے اور انھیں بے حجابانہ سامنے آجانا چاہئے، دوسرا یہ کہ متعہ اور تعدد ازدواج دونوں قابل ترک ہیں، تیسرا یہ کہ ٹوپی اور ملبوس مغربی وضع کا استعمال کیا جائے۔ چوتھا یہ کہ کسی شہر میں تین مسجدوں سے زیادہ کی ضرورت نہیں ہے۔

اس مسئلہ میں بحث کے دو پہلو ہیں، ایک یہ کہ حکومت ایران نے ایسے احکام کیوں نافذ کئے اور دوسرا یہ کہ ان احکام کو شیعہ جماعت کیوں پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتی۔

وہ حضرات جنھوں نے رضا شاہ پہلوی کے دورِ حکومت کا ابتدا سے مطالعہ کیا ہے اُن سے یہ حقیقت مخفی نہ ہوگی کہ سرزمین ایران میں قاچاری حکومت کا ختم ہونا اور اس کی جگہ ایک ایسے شخص کی حکمرداری کو قبول کر لیا جانا جو طبقۂ عوام سے متعلق تھا، صرف یہی معنی رکھتا تھا کہ وہاں دورِ ارستقراطی ختم ہو کر اس کی جگہ ڈماکریسی لے رہی ہے جو اس عہد کی سیاسیات کا اُصول اساسی ہے۔

پھر چونکہ ڈماکریسی بنیاد ہے اشتراکیت کی اس لئے اگر ایران اپنے احکام میں مذہبی تقشف کی رعایت کرنے پر آمادہ نہیں تو حیرت نہ کرنا چاہئے کیونکہ دورِ اشتراکیت میں سب سے پہلے جس گرفت کو ڈھیلا کیا جاتا ہے وہ مذہب کی گرفت ہے۔ وہ زمانہ، جب بادشاہ مذہب کے باب میں بھی اتنا ہی سخت ہوتا تھا جتنا سیاست دنیادی میں ختم ہو چکا ہے اور نہ اب وہ دور باقی ہے جب حکومت کا نصب العین، سلطنت کا مقصود اور سیاست کا مدعا صرف مذہب کی اشاعت ہوا کرتا تھا۔ یہ زمانہ ہے علوم صناعی کی ترقی کا، تجارتی مقاومت کا، اقتصادی تفوق و برتری کے حصول کا اور مرکزیت پیدا کرنے کے لئے مذہب کے بجائے قومیت کا جھنڈا بلند کرنے کا، اس لئے مذہب کو

کسی حکومت کے نظام میں زیادہ سے زیادہ اتنی ہی جگہ مل سکتی ہے، جتنی قومی رسم و رواج کو اور چونکہ تنظیم جدید میں اجتماعیت قائم کرنے کے لئے حد درجہ ہم آہنگی و یکسانیت پیدا کرنے کا خیال سامنے ہوتا ہے اس لئے سب سے پہلے روایتی زندگی کو محو کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، جس کی بنیاد وہی اختلاف آراء پر قائم ہے اور یہ ظاہر ہے کہ روایتی زندگی کا خلاق صرف مذہب ہی اور صرف قیام مذہب پر اس کی زندگی کا انحصار ہے۔

نفسیات کا یہ بالکل کھلا ہوا مسئلہ ہے کہ جس طرح انسان کا بطون اس کی وضع و صورت سے ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہتا، بالکل اسی طرح وضع و صورت کا اثر بھی انسانی احساس پر بہت پڑتا ہے۔ ہم ایک شخص کو دیکھکر جسکی داڑھی لمبی ہے، عبا طویل ہے، سر پر عمامہ اور ہاتھ میں تسبیح ہے، یہ سمجھنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ وہ سخت مذہبی انسان ہے۔ اسی طرح جب ہم ایک بے ریش و بروت انسان کو، انگریزی وضع و ملبوس میں دیکھتے ہیں تو اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ اس کو مذہب سے کوئی تعلق نہیں یا بہت کم ہے۔ لیکن اگر ہم اُس مذہبی انسان کو غیر مذہبی اور اس غیر مذہبی انسان کو مذہبی بنانا چاہیں تو منجملہ دیگر تدابیر کے ایک نفسیاتی تدبیر یہ بھی ہوگی کہ مولانا کی داڑھی مونڈ کر اس رند کے چہرہ پر لگا دیجائے اور اس کا کوٹ پتلون اُتار کر اُن کے قامت مبارک کو آراستہ کر دیا جائے۔ ممکن ہے کہ اول اول ان دونوں کو یہ تغیر پسند نہ آئے، لیکن رفتہ رفتہ اُس کے لئے داڑھی کا بوجھ گوارا ہوجائیگا اور یہ صاف چہرہ کی نحوست و تازگی کو محسوس کرنے لگیں گے۔

یہی وہ نفسیاتی نکتہ ہے جس پر ترکی میں مصطفےٰ کمال نے عمل کیا اور اب اس کی تقلید رضا شاہ پہلوی نے کی ہے۔ دنیا میں جب کوئی قوم انتہائی انحطاط کو پہونچ جاتی ہے اور اس کا احساس بالکل جامد و معطل ہوجاتا ہے تو پھر صرف وہی تدبیر اُس میں حرکت پیدا کر سکتی ہے جو بیک وقت دفعتہً ذہنوں میں انقلاب پیدا کر دے اور اس قسم کے احکام جو ترکی و ایران میں نافذ کئے گئے ہیں بدرجۂ اتم اس مقصود کو پورا کرنے والے ہیں۔

پھر ایران و ترکی میں اسوقت جو کچھ ہو رہا ہے ممکن ہے وہ اب سے سیکڑوں سال قبل کے بنائے ہوئے قانون کے منافی قرار دیا جائے، لیکن ضروریات زمانہ اور تمدن عالم کے موجودہ بین الاقوامی نظام کو دیکھتے ہوئے مسلمانوں کے اجتماعی و ملی مفاد کے لئے بہر نوع اس کو مفید تسلیم کرنا پڑے گا۔ علاوہ اس کے اگر خالص مذہبی نقطۂ نظر سے ان مسائل پر غور کیا جائے تو بھی میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان احکام میں کیا کفر و الحاد ملا ہوا ہے عورتوں کا پردہ، اسلام کا کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے جس کی مخالفت مذہب کی مخالفت قرار دیجائے، نہ ملبوس و وضع کا تغیر اعتقادات کے تغیر کو مستلزم ہے، اسی طرح اگر تعدد ازدواج اور متعہ کو ناجایز قرار دیا گیا ہے تو اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ خدا کی مرضی کے خلاف حلال کو حرام قرار دیا گیا ہے درست نہیں، کیونکہ نکاح وغیرہ کے مسایل قوم کی معاشرت سے متعلق ہیں اور وقت و زمانہ کی مصلحت کے لحاظ سے ان میں ہمیشہ تغیر ہوسکتا ہے

یعنی اگر آج تعددِ ازواج یا متعہ بربنائے مصالحِ ملکی مناسب نہیں تو کل پھر ان کے جواز کا حکم صادر ہو سکتا ہے اگر ضرورت اس کی مقتضی ہو، رہا یہ امر کہ ایران کے حالات کا اقتضاء یہ تھا یا نہیں، سو غالباً ہندوستان و عراق کے مسلمانوں سے زیادہ وہیں کے اربابِ فکر و سیاست کو اس کے سمجھنے اور فیصلہ کرنے کا حق حاصل ہے۔ رہا یہ امر کہ کسی شہر میں تین مسجدوں سے زیادہ قائم نہ رکھی جائیں، سو میرے نزدیک اس سے زیادہ مفید کوئی بات اور ہو ہی نہیں سکتی۔ کیونکہ مسلمانوں کی اجتماعیت میں انتشار پیدا کرنے کا ایک سبب مساجد کی کثرت بھی ہے۔ اس وقت حالت یہ ہے کہ ہر محلہ میں متعدد مسجدیں موجود ہیں جس کے معنے یہ ہیں کہ ایک ہی محلہ کے مسلمانوں کو بھی کبھی ایک جگہ جمع ہونے کا موقع نہیں ملتا۔ اگر مسجدیں کم ہوں گی تو ظاہر ہے کہ ان کا اجتماع بھی زیادہ ہوگا اور رشتۂ اخوت و ہمدردی بھی زیادہ وسیع ہو جائے گا۔ علاوہ اس کے یوں بھی دیکھئے کہ شہروں میں کتنی مسجدیں غیر آباد و ویران رہتی ہیں اور ان کی ویرانیوں کو دیکھ کر غیر مذاہب والے کیا سمجھتے ہوں گے۔ اس لئے اگر سجدہ گاہوں کی کثرت کی بجائے سجدہ کرنے والوں کی تعداد بڑھائی جائے تو زیادہ موزوں ہے اور اس کی تدبیر صرف یہی ہو سکتی ہے کہ مسجدوں کی تعداد کو کم کیا جائے۔

الغرض رضا شاہ پہلوی کا کوئی حکم میرے نزدیک ایسا نہیں ہے جس پر ہنگامہ برپا کیا جاتا، لیکن افسوس ہے کہ مشہد مقدس میں شیخ بہلول نے یہ ہنگامہ برپا کیا اور حکومت کو تیغ و تفنگ سے کام لینا پڑا جس کا نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہئے تھا یعنی کچھ مارے گئے، کچھ زخمی ہوئے اور کچھ بھاگ گئے۔

اس میں شک نہیں کہ اس قسم کی اصلاح میں جبر و اکراہ کے ساتھ مناسب نہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ اسوقت ایران میں کتنے نفوس ایسے ہیں جو خوشی سے ان احکام کی پابندی پر مائل نہیں ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ سوائے مولویوں یا اس جماعت کے جو قدیم مذہبی خیال کی پابند ہے، نئی نسل کے تمام افراد رضا شاہ پہلوی کے ہم آہنگ ہیں اور اس کا ثبوت اس سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے کہ جس وقت یہ احکام نافذ ہوئے تو دفعتہً ملک کی تمام نوجوان لڑکیاں بے نقاب باہر نکل آئیں اور مغربی ٹوپی کی قیمت تیس تومان تک پہونچ گئی۔

اس لئے میں نہیں سمجھ سکتا کہ ہندوستان کے شیعہ حضرات کا جلسے کر کر کے مخالفت کی آواز بلند کرنا، جن لوگوں نے مشہد میں حکومت کے خلاف آواز بلند کر کے اپنی جانیں دی ہیں انھیں شہداء کا لقب دیکر فاتحہ خوانی کے مراسم ادا کرنا کیا مفید ہو سکتا ہے۔ مسلمانانِ ہند کی یہ ادا کہ وہ اپنے حال پر ماتم کرنے کے بجائے ایران و حجاز کے معاملات پر سر دھننا زیادہ ضروری سمجھتے ہیں، آج تک میری سمجھ میں نہیں آئی۔

حبش اور اطالیہ کی آویزش

اس وقت ساری دنیا کی نگاہیں افریقہ کی اس سیاہ فام زمین پر لگی ہوئی ہیں جس کو سفید تہذیب سے آراستہ کرنے کے لئے میسولینی نے اپنی تمام محاربانہ

قوتوں کو بروئے کار لانے کا عزم کرلیا ہے۔ اس لئے غالباً بے محل نہ ہوگا اگر ان مدعیان شایستگی کی تہذیب پرستی کی حقیقت پر بھی ایک نگاہ ڈال لیجائے۔

۵ دسمبر ۳۴ء کو حبش اور برطانیہ کے نمایندوں کا ایک کمیشن جس کے ساتھ کچھ حبشی فوج بھی ہے دلول کے قریب حدبندی کے مسئلہ پر غور کر رہا ہے کہ اطالوی فوج کا کپتان دفعتہً بغیر کسی اطلاع کے حملہ کردیتا ہے اور حبشی سپاہ کے ایک بڑے حصہ کو تہ تیغ کردیتا ہے۔ لیکن قبل اس کے کہ یہ خون کا گھونٹ شاہ حبش کے حلق سے نیچے اترتا، خود اٹلی کا سفیر اُٹھا یہ احتجاج کرتا ہے کہ "مسلح حبشیوں نے بغیر کسی اطلاع کے ہم پر حملہ کیا" اور اس کا نتیجہ اٹلی کی طرف سے اس مطالبہ کی صورت میں نکلتا ہے کہ "حبشی گورنر، دلول آکر معافی چاہے، اطالوی جھنڈے کے سامنے سرنگوں ہو، اور حبش کی حکومت دو لاکھ پونڈ بطور تاوان ادا کرے"

غریب حبش نے اس مسئلہ کو جمعیتہ اقوام کے سامنے پیش کردیا، لیکن بدقسمتی کہئے یا ملی بھگت کہ آج تک کوئی فیصلہ اس کا وہاں سے بھی صادر نہیں ہوا۔

جن لوگوں نے حبش کے نقشہ کو دیکھا ہے انھیں معلوم ہے کہ وہ چاروں طرف اطالوی، برطانوی اور فرانسیسی مقبوضات سے محصور ہے۔ شمال میں اریٹریا اور مشرق وجنوب کے گوشہ میں ایک وسیع رقبہ اٹلی کے قبضہ میں ہے جسے اطالوی سومالی لینڈ کہتے ہیں، مشرق میں برطانوی اور فرانسیسی سومالی لینڈ کا حصہ ہے اس کے معنے یہ ہیں کہ اسوقت حبش کے مسئلہ سے گہرا تعلق رکھنے والی یوروپ کی تین حکومتیں، برطانیہ، فرانس اور اٹلی کی باہمی رقابت نے اسوقت تک حبش کی خودمختاری قائم رہنے دی، ورنہ ان میں سے کوئی ایک کب کا اس کو ہضم کرچکا ہوتا۔

اس وقت تک حبش اور ان سلطنتوں کے درمیان، یا حبش کے متعلق خود ان تینوں کے مابین جو جو معاہدے ہوچکے ہیں اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک آہستہ آہستہ اپنے قدم وہاں جمانا چاہتی ہے، چنانچہ اپنی سرحد سے بڑھکر دلول کے کنووں پر اٹلی کا قابض ہوجانا، فرانس کا اپنے علاقہ سے ادیس بابا تک ریل جاری کردینا اور انگلستان کا نیل ازرق کے لئے اٹلی سے خفیہ ساز باز کرنا، سب اس امر کا ثبوت ہیں کہ آج نہیں تو کل حبش کو ختم ہونا ہے خواہ وہ ان سلطنتوں کے باہمی مفاہمت سے ہو یا جنگ وجدال سے۔

بحالت موجودہ یہ مسئلہ جمعیتہ اقوام کے سامنے پیش ہے اور مہینوں گزرجانے کے بعد بھی اس وقت تک کوئی بات طے نہیں ہوئی۔ اٹلی کہتا ہے کہ حبش ایسے وحشی ملک کو جمعیتہ اقوام میں شامل ہی کیوں کیا گیا اور اگر وہ اس کا ممبر رہتا ہے تو میں رخصت ہوتا ہوں۔ برطانیہ اچھی طرح سمجھتا ہے کہ جاپان اور جرمنی پہلے ہی علحدہ ہوچکے ہیں اگر اٹلی بھی علحدہ ہوگیا تو جمعیتہ کا وجود ہی ختم ہوجائے گا، اس لئے وہ ایک طرف یہ بھی ظاہر کرتا جاتا ہے کہ حبش کی خودمختاری قائم رہنا ضروری ہے اور دوسری طرف اٹلی کو بھی سمجھا رہا ہے کہ گھبرانے کی کونسی بات ہے، تمھارے مطالبات پر غور نہ ہو جبھی

شکایت کرنا۔ الغرض سیاسیات مغرب کی وہ مشہور چال جس میں برطانیہ کو کمال حاصل ہے چلی جا رہی ہے اور اگر باہم گر کوئی مفاہمت فرانس، برطانیہ اور اٹلی کے درمیان اندرونی طور پر ہوچکی ہے تو اس کا نتیجہ یقیناً یہ ہوگا کہ اٹلی جمعیۃ الاقوام کی تمام سفارشوں کو رد کردیگا اور پوری قوت کے ساتھ میدان جنگ میں اُتر آئے گا۔ پھر اگر حبش کو شکست ہوئی تو شرائط صلح میں فرانس اور برطانیہ کا حصہ بھی (اُسی خفیہ معاہدہ کی رُو سے) تقریباً برابر ہی رہے گا اور اگر اٹلی تھک گیا تو پھر حبش کے ساتھ برطانیہ اور فرانس کی یہ نمائشانہ ہمدردی، دوستانہ طور پر حبش سے کچھ نہ کچھ حاصل کرنے میں کامیاب ہوسکے گی۔ اس میں شک نہیں کہ یوں اٹلی و حبش کا مقابلہ ہی کیا، لیکن وہاں کے جغرافی حالات ایسے نہیں ہیں کہ اٹلی آسانی سے کامیاب ہوسکے۔ ملک حبش کا مسخر ہوجانا ممکن ہے لیکن حبشی قوم کا مغلوب ہونا بہت دشوار ہے، اس لئے اٹلی کی کامیابی بھی ایک لحاظ سے ناکامی ہی متصور ہوگی اور اس کا اپنی اقتصادی دشواریوں سے بہ آسانی گزر جانا تقریباً ناممکن ہوگا۔ الغرض اسوقت نہ صرف یوروپ بلکہ ساری دنیا سخت خطرہ میں مبتلا ہے اور اگر جنگ چھڑ گئی تو نہیں کہا جاسکتا کہ اس کے شعلے کہاں کہاں بھڑک اُٹھیں گے۔

لکھنؤ اُردو اکاڈمی

اس سے قبل ناظرین نگار کو اس تجویز کی خبر دی گئی تھی جو اُردو اکاڈمی کے قیام کے لئے اہل لکھنؤ کے زیر غور تھی اور یہ امر حد درجہ باعث مسرت ہے کہ آخر کار وہ تجویز بروئے کار آکر رہی اور ایک ادارہ "لکھنؤ اُردو اکاڈمی" کے نام سے قایم ہوچکا ہے، جو یقیناً اپنے مقاصد و آمال کے لحاظ سے نہایت برمحل و اہم ہے۔ اس ادارہ کا مقصد بالکل علمی ذرایع سے متعلق ہے اور صرف کہکر خاموش ہوجانے کی کوئی گنجایش اس کے پروگرام میں نہیں ہے۔ ارادے بلند ہیں اور تدبیریں مستحکم اس لئے توقع کی جاتی ہے کہ اگر اہلِ ذوق و ارباب وطن نے ہمدردی کی تو یہ انجمن صحیح معنی میں خدمت زبان کے فرایض انجام دے سکیگی۔ تعیین مقاصد کے بعد اس کا دستور العمل بھی جلسۂ عام میں کافی بحث و گفتگو کے بعد طے ہوچکا ہے اور اجراء کار کے لئے دفتر بھی قائم کردیا گیا ہے۔ اُمید ہے کہ اکتوبر میں دوسرا جلسۂ عام طلب کرکے انتخاب عہدہ داران کی کارروائی عمل میں لائی جاویگی اور اس کے بعد وفود مختلف مقامات کا دورہ کرنے کے لئے روانہ کئے جائیں گے۔

جو صاحب اس کے مقاصد اور دستور العمل ملاحظہ فرمانا چاہیں وہ جنرل سکریٹری لکھنؤ اُردو اکاڈمی سے مطبوعہ کاپی طلب فرمالیں۔

اُردو میں بالکل نئی اور پہلی کتاب

شہوانیات یا ترغیبات جنسی

حضرت نیاز کے قلم سے

اسمیں تاریخی ونفسیاتی نقطۂ نظر سے فحاشی وعصیانکاری پر عہد قدیم سے لیکر اسوقت تک ایک بسیط تبصرہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ کن کن قوموں میں کس وقت کیسی کیسی فحاشیاں رائج ہوئیں اور اخلاق انسانی پر اس کا کیا اثر پڑا — یہ کتاب نہایت نادر معلومات اور عجیب وغریب واقعات تاریخی کا مجموعہ ہے - اور اس موضوع پر اس وقت تک کوئی کتاب اُردو میں پیش نہیں کی گئی -

اس میں فحاشی کی تمام فطری وغیر فطری قسموں کے حالات اور اُن کی تاریخ ونفسیاتی اہمیت پر بھی روشنی ڈالدی گئی ہے، اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مذاہب عالم نے اس کے رواج میں کتنی مدد کی اور آیندہ اخلاق انسانی کے بنیاد کن اصول پر قائم ہوتا ہے - الغرض اپنی نوعیت کے لحاظ سے یہ کتاب بالکل نئی چیز ہے اور ایکبار شروع کرنیکے بعد بغیر ختم کئے ہوئے آپ اسے چھوڑ نہیں سکتے - اس کتاب میں ایسے ایسے حیرت انگیز حالات وواقعات درج ہیں کہ آپ نے کبھی سنے نہ ہونگے - اگر آپ نگار کے خریدار ہیں تو علاوہ محصول ۸ر کے مجلد کتاب عہ میں - اور غیر مجلد عار میں ملے گی - اور اگر آپ نگار کے خریدار نہیں ہیں تو مجلد عہ میں اور غیر مجلد عہ میں علاوہ محصول ۸ر کے ملیگی - اگر ارشاد ہو تو کتاب ذریعۂ وی پی روانہ کی جائے

منیجر نگار لکھنؤ

نجوم کے بعض تاریخی وعلمی مباحث

اور

قصاید خاقانی میں منجمانہ اشارات

(مسلسل)

خاقانی کے کلام میں تصوف کا بھی گہرا اثر پایا جاتا ہے ہر چند صوفی شعرا عطار و رومی، عراقی و نظامی، کمال خجندی و اوحدالدین کرمانی ساتویں صدی اور اس کے بعد گزرے ہیں لیکن خاقانی سے پہلے صوفی شاعری کے دو بڑے علمبردار حضرت ابی سعید ابن ابی الخیر اور حکیم سنائی گزر چکے تھے، پھر بھی خاقانی کی شاعری پر ان کا کوئی اثر نہیں پایا جاتا، شعرائے متاخرین عرفی و نظیری، ظہوری و بیدل، درد و غالب سبھی نے رومی و عراقی کے صوفیانہ رنگ تغزل کا تتبع کیا لیکن خاقانی کی غزلیات و قصاید کسی میں کوئی تقلیدی عنصر نہیں ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تصوف کے رنگ میں جو کچھ اس کا کلام ہے وہ خود اس کے محسوسات کا نتیجہ ہے اور اس میں وہی بنیادی و اصولی سادگی ہے جو ابتداءً کسی صنعت کلام میں پائی جاتی ہے وہی ترک طمع وہی عزلت و قناعت وہی وحدت و تجرید وہی موعظت و تزکیہ اسکے کلام میں بھی ہے جس کا نمونہ "حدیقہ" میں خاقانی سے پہلے موجود تھا اور جو آیندہ عطار و رومی کے یہاں کمال کو پہونچا ایک جگہ ترک طمع اور عزلت کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:۔

در جرم ماہ و قرصۂ خورشید ننگرم　　　هر گہ کہ دیدہ ہا شود م رہنمائے نان

یعنی شاعر "نان" کے بدلے چاند اور سورج کی نان ناصورت پر قانع ہو جاتا ہے دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

نتواں در خط دہر خط وفا یافتن　　　نتواں بر سطح آب نقش قلم ساختن

یا پھر ان کا یہ فرمانا

از داغ دل بسوز و ز مرہم اثر مجوئے　　　باخویشتن بساز و ز ہمدم لن[illegible] مخواہ

غالباً یہ سب اس زمانہ کا کلام ہے جب وہ دربار سے الگ ہو کر عزلت گزیں ہو چکے تھے، خاقانی کے یہاں پرشوکت قصاید کی طرح المناک مراثی بھی ہیں خاقانی نے اپنے مراثی میں فاجعہ نگاری کے ساتھ شاعرانہ تمثیلات اور خیالی بلند پروازیوں کو بھی ہاتھ سے جانے نہ دیا اس کے مراثی میں بھی وہی رفعت خیال اور شوکت معنی موجود ہے جو اس کے قصاید میں ہے اور اس لئے ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ ان مراثی کو پڑھنے کے بعد ہم اپنے جذبات المیہ میں کوئی اُبھار نہ پاتے کیونکہ اس کے قصاید عموماً اشارات وتلمیحات کے باعث دماغ کو مشوش کر دیتے ہیں لیکن اس کے مراثی ایسے نہیں مثال کے لئے اس کا مشہور مرثیہ "ایوان مداین" پڑھ جائیے آپ نفس کے اندر ایک خاص گداختگی اور جذبات میں سرشاری پائیں گے، خاقانی کے "ایوان مداین" نے ایسا قبول عام حاصل کیا کہ آج یورپ میں اس کو علٰحدہ اصل کے ساتھ ترجمہ کر کے شایع کیا جاتا ہے اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خاقانی کے "ایوان مداین" سے قبل فارسی میں کوئی نظم موجود تھی یا نہیں؟ اس سے قبل سنائی، معزی، عنصری بڑے بڑے شعراگزر چکے تھے لیکن کسی کے یہاں "ایوان مداین" کے رنگ کی کوئی چیز نہیں ملتی، الغرض فارسی ادب میں خاقانی کی یہ نظم بالکل اچھوتی چیز ہے اور آج بھی فارسی زبان میں اس نوع کی آہنگ کا پتہ نہیں معلقات سبعہ کے ابتدائی اشعار ہمیں یقیناً "ایوان مداین" کی یاد دلاتے ہیں ہم امرء القیس کا یہ شعر پڑھتے ہیں۔

قفا نبک من ذکری حبیب و منزل　　　　بسقط اللوی بین الدخول فحومل

ترجمہ:۔ اے میرے دونو دوستو! ٹھہیر و تاکہ ہم محبوبہ اور اس کی منزل کو یاد کر کے روئیں، وہ منزل جو مواضع دخول اور حومل کے درمیان ٹیڑھے ٹیلہ کے کنارہ ہے۔

اور بے اختیار ہمیں "ایوانِ مداین" کا یہ شعر یاد آجاتا ہے۔

یکرہ ز سر دجلہ منزل بہ مداین کن　　　　وز دیدہ دوم دجلہ برخاک مداین ران

یا پھر طرفہ بن عبد کا یہ شعر پڑھئے۔

لخولۃ اطلال ببرقۃ ثہمد　　　　تلوح کباقی الوشم فی ظاہر الید

ترجمہ:۔ سنگلاخ زمین میں "خولہ" کے (ویران) گھروں کی نشانیاں موجود ہیں یہ نشانیاں مہ جبینوں کے نازک ہاتھوں کے نیلگوں نقش و نگار کی طرح نظر آتی ہیں۔

اگر آگے چلکر امرء القیس "عنیزہ" کے ساتھ اپنی ہوس رانیوں کا عریاں مظاہرہ نہ کرتا اور طرفہ اپنی محبوبہ "خولہ" کے حسن اور اس کے اُجڑے دیار کا تذکرہ کرتے کرتے اپنی ناقہ کی صفات نہ بیان کرنے لگتا تو ہم کہتے کہ "ایوان مداین" امرءُ القیس اور طرفہ کے نقوش سے مستفاد ہے، لیکن ایسا نہیں کہہ سکتے؟ اب آئیے غور کریں خاقانی نے یہ اسلوب نگارش کہاں سے سیکھا مصر جدید کا ایک مشہور فلسفی اور نقاد ادب ڈاکٹر زکی مبارک لکھتا ہے کہ نزول قرآن سے

پہلے شعراء کے یہاں عواطف اجتماعیہ (عام جماعتی رجحان) کا فقدان تھا ان کی شاعری میں اجتماعیت کے بدلے "فردیت" کا رنگ غالب تھا قرآن مجید نے عاد و ثمود اقوام یونس و لوط وغیرہ اور ان کی ویران بستیوں کا تذکرہ کر کے ایک جدید موضوع تخیل پیش کیا اور اسی کے بعد سے شعراء کے یہاں "بکا الممالک" مبحث شعر بن گیا چنانچہ علامہ موصوف لکھتے ہیں :-

کانت عواطف الشعراء عواطف فردیۃ لا اجتماعیۃ فکان الشاعر یبکی وجدہ ونعیمہ وھو یندب الرسوم و یتوجع للطلول، ولم یھتم العرب ببکاء الممالک والتفجع للشعوب اذ کانوا فی بدایۃ الحیاۃ وکان الرجل منھم قلما یعنی بغیر نفسہ واہلہ و ذویہ فکانوا فی شغل بانفسھم عن بلایا الانسانیۃ التی تصرخ من حولھم وھم عنھا غافلون۔

ثم جاء القرآن فسلک فی الحدیث عن الممالک البایدۃ مسلک التخویف والترھیب فلم یعطف علیھا بکلمۃ ولم یستر لھا عورۃ لان القرآن لم یکن کتاب شعر یرمی الی روعۃ الفن وجمال الخیال وانما کان کتاب حکمۃ وعظمۃ فکان من حقہ ان یقول بجزم ورزانۃ اولم یسیروا فی الارض فینظروا کیف کان عاقبۃ الذین من قبلھم کانوا ھم اشد منھم قوۃ وآثارا فی الارض فاخذھم اللہ بذنوبھم وما کان من اللہ من واق ذلک بانہ کانت تاتیھم رسلھم بالبینات فکفروا فاخذھم اللہ انہ قوی شدید العقاب" ولو لم یکن الزجر والردع من اغراض القرآن الاساسیۃ لکان لہ شان غیر ھذا الشان[۱]

شعراء کا رجحان ذاتی تھا اجتماعی نہ تھا شاعر اپنے عشق اور ایام راحت کا رونا روتا تھا وہ آثار (قیام محبوبہ) پر آنسو بہاتا تھا اور (محبوبہ کے قرب وجوار) کے ٹیلوں کیلئے بیتابیاں کرتا لیکن عربوں کے یہاں جب وہ اپنی زندگی کے آغاز میں تھے ملکی بکا کا اہتمام نہ تھا اور نہ وہ قوموں کیلئے بیقراریاں کرتے اور ان میں شاذونادر ہی کوئی شخص اپنی ذات، اپنے لوگوں اور اپنی جماعت کے علاوہ کسی دوسرے کو درخور اعتنا سمجھتا، اور وہ اپنے ذاتی ہی شغل میں معروف رہتے درانحالیکہ ان کے چاروں طرف انسانی مصیبتیں اور بلائیں چیخ رہی ہوتیں لیکن وہ ان سے غافل رہتے، پھر قرآن مجید نازل ہوا اور اس نے ڈرانے دھمکانے کے خیال سے قدیم ملکوں کا تذکرہ کیا اور نہ اس سے ادھر اُدھر ہوا اور نہ اس کا نقص پوشیدہ کیا چونکہ قرآن شعر کی کتاب نہ تھا جو فن کی دلآویزی اور خیال کی خوبصورتی کو مدنظر رکھتا بلکہ وہ حکمت اور نصیحت کی کتاب تھا پس اس کا حق تھا کہ جو کچھ وہ کہے وثوق اور سنجیدگی کے ساتھ کہے "کیا وہ زمین میں نہیں پھرتے تاکہ دیکھتے کہ ان لوگوں کا کیسا انجام ہوا جو ان سے پہلے قوت اور آثار کے اعتبار سے زمین میں زیادہ بڑھے ہوئے تھے، پس اللہ نے ان کے گناہوں کے باعث ان کو پکڑ لیا اور اللہ سے چھوڑانے والا ان کا کوئی نہ تھا، یہ اس وجہ سے کہ پیغمبر کھلی ہوئی نشانیوں کے ساتھ ان کے پاس آئے پس انھوں نے کفر کیا پھر اللہ نے پکڑا

[۱] "الموازنۃ بین الشعراء" مطبوعہ مصر ص ۱۲۷

اور وہ زور آور سخت عذاب والا ہے" اور اگر تنبیہ اور باز داشت (نہی عن المنکر) قرآن کے بنیادی اغراض میں نہ ہوتی تو اس کی شان اس شان سے مختلف ہوتی ۔

ہم عربی شعراء پر ایک نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں خاقانی کے ایوان مداین کی طرح ابوعبادہ ولید بن عبید البحتری، (مولود ۲۰۶ھ) کا مشہور قصیدہ سینیہ نظر آتا ہے جو "ایوان کسریٰ" کے متعلق ہے، بحتری کا وطن "منبج" تھا جو حلب اور فرات کے درمیان ایک مقام ہے، عہد عباسیہ کا یہ مشہور شاعر اس درد انگیز اور والہانہ رنگ میں "ایوان کسریٰ" کی ویرانیوں اور آل ساسان کی بربادیوں کا رونا روتا ہے کہ دل پر ایک خاص کیفیت طاری ہو جاتی ہے ۔

اتسلی عن الحظوظ و آسی   لمحل من آل ساسان درس

ریحان شامی کی نکہت بیزیوں اور سرور و انبساط سے میں دل کو تسلی دیتا ہوں آل ساسان کی طرف سے محل میں ایک پیام روح مل رہا ہے ۔

فلہا ان اعینہا بدموع   موقفات علی الصبابۃ حبس

اور یہ "تمنائے گریستن" یہیں ختم نہیں ہوتی، شاعر کے تاثرات حزیں "مکان" تک محدود نہیں رہتے بلکہ وہ "زمان" پر بھی یہی کیفیت مسلط پاتا ہے ۔

لو تراہ علمت ان اللیالی   جعلت فیہ ماتما بعد عرس

اگر تو دیکھے تو معلوم ہوگا کہ راتوں نے اس ویران محل میں جشن و شادی کے بعد ماتم بپا کر رکھا ہے ۔

بحتری نے اسی طرح بہت طویل قصیدہ لکھا ہے اور اپنے دردمندانہ احساسات اور انقلاب زمانہ کی مصوری کی ہے یہ تو اب مسلم ہوگیا کہ خاقانی نے اپنی نظم "ایوان مداین" کے نقوش یہیں سے لئے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس نے اس "نقش ثانی" میں اولیت کی طرح تخلیقی رنگ بھر دیا ہے اور پوری نظم میں کیفیات کی ایک دنیا سما گئی ہے، اس کی خاص وجہ تو خود فارسی زبان کی وسعت و حلاوت ہے اس پر شاعر کے انداز بیان اور شدت احساس نے اور بھی گرمی پیدا کر دی، انصاف یہ ہے کہ خاقانی کے بیان میں اس غضب کی اثریت اور والہانہ انداز ہے کہ قاری مسحور ہو کر رہ جاتا ہے، شاعر کہتا ہے ۔

گہ گہ بہ زبان اشک آواز دہ ایوان را   تا بو کہ بہ گوش دل پاسخ شنوی ز ایوان

دندانۂ ہر قصرے پندے دہدت نو نو   پند سر دندانہ بشنو ز بن دندان

گوید کہ تو از خاکی ما خاک توایم اکنون   گامے دو سہ بر مانہ اشکے دو سہ ہم بفشاں

یہ ہے سحر حلال! شاعر خود سیلاب درد میں بہا جاتا ہے ایوان مداین کے در و دیوار سے اسکو عالم کی بے ثباتی اور زمانہ کی کم ارزی کا سبق مل رہا ہے ایوان فلک وش کے سرنگوں مینارے اس کو بخت کی نگوں ساریاں

یاد دلا رہے ہیں وہ دیوار جہاں کبھی زرکار پردے آویزاں تھے، وہ محل جہاں بلوریں قمقمے ضیا باریاں کرتے تھے، جہاں چمن دستہ دستہ تھا، ایک شہر خموشاں بنکر رہگیا۔

ایں ہست ہما ایواں کز نقش رخ مردم　　خاک در او بودے دیوار نگارستاں

ایں ہست ہماں درگہ کو راز شہاں بودے　　دیلم ملک بابل ہندو شہ ترکستاں

مطلب یہ ہے کہ ہر چند نہ وہ غلامان زریں کمر کا ہجوم ہے نہ چاؤشان خوش پوش کا ہنگامہ، نہ باج گزار حکمرانوں کی جلوداریاں ہیں نہ وظیفہ خوار درباریوں کی حاضر باشیاں، ایک ہو کا عالم ہے ہر طرف حسرت برس رہی ہے لیکن پھر شاعر مصورہ پر زور دیتا ہے اور "سلسلہ درگہ" اور "کوکبۂ میدان" میں اس کو عہد ماضی کے مٹے ہوئے نقوش نظر آنے لگتے ہیں۔

پندار ہماں عہد است از دیدۂ فکرت بیں　　در سلسلہ درگہ در کوکبۂ میداں

شاعر انگور کی بیلوں کو دیکھتا ہے سایہ تاک میں انگور کے خوشے اور ان کے ارغوانی رنگ اس کو شراب ناب کی یاد دلاتے ہیں لیکن دیکھئے اسی بات کو وہ کس انداز حرمانی کے ساتھ بیان کرتا ہے۔

خون دل شیریں است آں مے کہ دہد رزبن　　ز آب و گل پرویز است آں خم کہ نہد دہقاں

شاعر انگور کے خوشوں کو دیکھتا ہے اور کہتا ہے شاید اس میں شیریں کے دل کا خون پیوست تو نہیں وہ شراب کا خم دیکھتا ہے اور اس نتیجہ پر پہونچتا ہے کہ شاید پرویز کے عناصر جسمی نے برباد ہو کر پھر اسی خم کی صورت اختیار کر لی ہے حزیں ایک جگہ کہتے ہیں

در میکدہ خاکم را پیمانہ کنی یارب　　شاید دل حسرت کش لب را بلبے دارد

حزیں مرکر پیمانہ بننے کی تمنا کرتے ہیں یہ اس توقع کی بنا پر شاید اس ذریعہ سے محبوب کے لب سے ان کا لب مس ہوجائے، حزیں کے یہاں ایک فریب خیال ہے ایک شاعرانہ التباس ہے، وہ طلسم آرزو میں بھٹک رہے ہیں خاقانی کی یاس ایک معنوی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہے آخر میں وہ کہتا ہے،

بنگر کہ دریں قطعہ چہ سحر ہمی بارد　　مشہوک مسیحی دل دیوانہ عاقل جاں

یہ شاعرانہ تعلی نہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ خاقانی کی یہ نظم "سحر حلال" کا درجہ رکھتی ہے اس کا ہر بیت ہمارے عضلات میں برانگیختگی اور روح میں بیداری و آگہی پیدا کر دیتا ہے۔

مصر جدید کے مشہور شاعر شوقی نے بھی رومہ کا مرثیہ لکھا ہے جبکہ وہ اسمٰعیل بک رافت ہم سعدی، اسی طرح تھے، انھوں نے مغربی عالم مرجلیوث کو ایک قصیدہ لکھا، تو نیل کی تعریف میں ہے اور حق یہ ہے کہ انھوں نے عربی زبان انھوں نے اندلس کے قصر الحمرا پر بحتری کی تقلید میں ایک طویل نظم لکھی ہے

میں خاقانی کا ساز و ربیان اور والہانہ انداز دکھایا ہے، وہ کہتا ہے۔

مشت الحادثات فی غرف الحمرا　　دِمشی النعی بعد عرس
ہتکت عزۃ الحجاب و فضت　　سدۃ الباب من سیر وانس
عرصات تخلت الخیل عنہا　　واستراحت من احتراس و مس

وخطوط تکفلت للمعانی ،　　ولالفاظہا بازین لبس
وتری مجلس السباع خلاء　　مقفر القاع من ظباء وخنس
لاالثریا ولاجواری الثریا　　یتنزلن فیہ اقمار انس[1]

ان اشعار کا مطالعہ کرنے کے بعد نہیں بے اختیار خاقانی کے وہ ابیات یاد آجاتے ہیں جو سطور بالا میں لکھے گئے، خاقانی کی طرح شوقی بھی قصر کی ویرانگی سے پند لے رہے ہیں وہی دربانوں کی یاد اور قصہ خوانوں اور ندیموں کا رونا ہے، وہی سنسان دربار کی وحشت سامانی اور خدام و درباریوں سے اس کا خالی ہونا شوقی پر بھی اثر کر رہا ہے اگلی سطر میں خاقانی کہہ چکے ہیں۔

ایں ہست ہماں ایواں کز نقش رخ مردم　　خاک در او بودے دیوار نگارستاں

اسی کے ساتھ شوقی کا یہ شعر پڑھئے۔

عرصات تخلت الخیل عنہا　　واستراحت من احتراس وعس

اسی طرح سطور بالا میں خاقانی کا وہ شعر نقل کیا گیا ہے جس میں اس نے " دندانۂ قصر " سے پند حاصل کرنیکا ذکر کیا ہے شوقی نے بھی " خطوط تکفلت للمعانی " کہا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے مصری شاعر کے سامنے نہ صرف بحتری کا قصیدہ تھا بلکہ اس نے ایک حد تک خاقانی سے بھی استفادہ کیا ہے اور اس صورت سے خاقانی نے عربی زبان کے اس احسان کی تلافی کر دی جو فارسی پر تھا،

---

[1] خلاصہ ترجمہ :- قصر حمرا کے بالاخانوں کو حادثات نے اس طرح روند ڈالا ہے جس طرح شادی بیاہ کے گھر میں موت خاک پڑ... نہ حاجبوں کی گرم نگاہیاں باقی ہیں نہ شام کے وقت دوستوں کی منڈلی ہے نہ گپ شپ ہے میدان گھوڑوں سے ... مرزباں ہے نہ نگراں، - خطوط بہترین خوشنما لباس میں معنی کا اظہار کر رہے ہیں، بھیڑیوں (درندہ) کی مجلس ہرنوں اور گورخروں کا سے ... ادی بنکر رہگئی، نہ تو یہاں عقد ثریا جیسی حسینان پریرو اور ان کی سہیلیاں باقی ہیں نہ پری پیکران قمرطلعت محو خرام ہیں - ع - م

اثیر و خاقانی کے معارضات اگلے سطور میں لکھا جا چکا ہے کہ خاقانی شروان سے بیزار تھے، اور اہل شروان بھی ان کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے، چنانچہ شعرا کی ایک جماعت "روشنان" موجود تھی، یہ لوگ اس سے برہم تھے، مجازی اس کا معاند تھا، سلطان مغیث الدین ارسلان بن طغرل کے مداح اثیر کو بھی اس سے مخالفت تھی، اور حریفانہ چشمکیں کیا کرتا تھا دولت شاہ نے تفصیل کے ساتھ ان معارضات پر روشنی ڈالی ہے اور خاقانی اور اثیر کے درمیان جن تعلی آمیز اشعار کا تبادلہ ہوا ہے وہ بھی نقل کیا ہے ملاحظہ ہو

به کردگار که دور زماں پدید آورد　　که دور دور من است و زماں، زماں من ہست
منم که یوسف عہدم به قحط سال سخن　　که میزبان گرسنه دلاں زباں من است
به شرق و غرب رود نامهٔ ضمیرم ازانکه　　کبوتر فلکی پیک رائگاں من است
ز شاعرِ خاقانی ہراسی نه ترسم ازانکه　　ہنوز در عدم است آنکه ہمقران من است
منم به وحی معانی پیمبر شعرا　　که معجز سخن امروز در بیان من است

خاقانی نے یہی قطعہ اثیر کے پاس بھیجا، اثیر نے بھی جواب میں یہ لکھ بھیجا،

گره کشائے سخن خامه نوان من است　　خزینه دار رداں خاطر روانِ من است
کمان من نه کشد دست و بازوئے شرواں　　که تیر چرخ یک اندازی از کمان من است[1]

وفات سطور بالا میں ان کی ولادت و وفات کے متعلق مفصل بحث ہو چکی ہے اتابک مظفر الدین قزل ارسلاں کی مدح کے سلسلہ میں خود لکھتے ہیں۔

کردند همه حکم که در پانصد و ہشتاد　　اعجاز بدست آوری و روم کشائی

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۵۸۰ھ کے قریب وہ زندہ تھے، اور تذکرہ نگاروں کی اکثریت نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ ۵۸۲ھ میں انھوں نے وفات کی، بہرحال شروان میں پیدا ہوئے اصفہان میں نشو و نما ہوئی، تبریز میں وفات پائی اور یہیں بمقام "سرخاب" دفن ہوئے، دولت شاہ لکھتے ہیں:-

"و مرقد او الیوم مشهور و مقرر است و افضل الزمان ظہیر الدین طاہر بن محمد فاریابی و ملک الشعرا شاپور بن محمد اشہری، نیشاپوری ہر دو در پہلوئے خاقانی است"

---

[1] تذکرہ دولت شاہ کے قلمی نسخہ میں جو پٹنہ لائبریری میں ہے کتابت کی بعض سخت غلطیاں پائی جاتی ہیں اثیر نے بھی خاقانی کے ہر شعر کا جواب دیا ہے لیکن نسخہ ہذا میں اکثر ابیات غلط درج ہیں اس لئے یہاں اس کا موقعہ نہیں کہ کتابت کی غلطیوں کی تصحیح کر کے پورا قطعہ لکھا جائے۔

ظہیر فاریابی کے متعلق تو اور تذکرہ نگاروں نے بھی لکھا ہے لیکن اشہری نیشاپوری کے بدلے صاحب "صحف ابراہیم" نے سید ذوالفقار ذہبی کا نام درج کیا ہے، بہرحال خاقانی کی قبر" ابعاد ثلاثہ" کی حیثیت سے اور بھی یادگار زمانہ ہے۔

خاقانی کے قصاید کا مطالعہ کرنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ وہ نجوم میں یدطولیٰ رکھتا تھا اور اس نے باضابطہ اس فن کی تکمیل کی تھی چنانچہ نظرات سیارگان، قرآن سبعہ سیارہ، خصایص و اثرات کواکب، عروج و ہبوط انجم، ماہیات و انتقال بروج پر اس نے مختلف پیرایہ میں روشنی ڈالی ہے۔

قران سبعہ سیارہ

۱۵ر جنوری ۱۹۳۴ء نے عام و خاص تمام نگاہوں کو علیٰ قدر مراتب حوادث فلکی اور اثرات کواکب کی طرف متوجہ کر دیا ہے، اخبار و جراید میں اس موضوع پر بیشمار مقالات شایع ہو چکے ہیں اور فنی اور خیالی حیثیت سے بہت کچھ اس پر طبع آزمائیاں کی گئی ہیں بعض حضرات کا خیال ہے کہ کئی ہزار سال کے بعد قران سبعہ سیارہ ہوتا ہے چنانچہ حادثہ مہابھارت میں بھی اسی طرح سات ستاروں کا اجتماع ہوا تھا، اور ملک کو بے شمار حادثات و مصائب سے گزرنا پڑا تھا لیکن تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ اس قران سبعہ سیارہ کے لئے ہزاروں برس کی طول مدت درکار نہیں بلکہ ایک صدی کے درمیان بھی اسی طرح قران ہوا ہے۔

خاقانی نے چھٹی صدی کے وسط یا آخر میں اپنے قصیدہ میں قران سبعہ سیارہ کے متعلق کافی روشنی ڈالی ہے اور اس کے بعد انوری ساتویں صدی میں بھی اسی طرح قران کے باعث خطرات و مصائب سے خوفزدہ تھا انوری کے متعلق روضتہ الصفا کی اس روایت سے پتہ چلتا ہے کہ ہر چند کوئی مصیبت نازل نہ ہوئی، اور انوری کا خطرہ محض خیالی تھا لیکن یہ بالکل صحیح ہے کہ اس عہد کے منجموں نے فنی حیثیت سے حکم کیا تھا کہ قران ہوگا اسی طرح حمداللہ مستوفی نے تبریز کے سلسلہ میں جو واقعات درج کئے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ ایک یا دو صدی کے درمیان برابر کوئی مصیبت آسمانی نازل ہوئی ہے، خاقانی کہتا ہے

هفت رخشان مه آبان بهم آیند چه باک کہ سعود از مه آبان بخراسان یابم

بست و یک راه قران است به میزان همه را من همان لهو ز میزان بخراسان یابم

یعنی منجموں نے حکم لگایا ہے کہ برج میزان میں سبعہ سیارہ کا قران ہوگا اور اسوجہ سے روم و خجند اور ایران تمام طوفان اور گرہن سے آفتیں برپا ہوں گی، خاقانی اس وقت خراسان کا تہیہ سامان کئے ہوئے تھے وہ اس منجمانہ حکم کا رد کرتے ہیں اور خراسان کو ان آفات و خطرات سے مامون بتا رہے ہیں۔

نکنم باور کاحکام خراسان اینست گرچه صد هرمس دلقمان بخراسان یابم

نامش ادریس رصد داں بہ خراساں یابم[۵۱] — حکم بو معشر مصروع نہ گیرم گرچہ

مطلب یہ ہے کہ ہرمس (یونانی حکیم) اور لقمان جیسے سیکڑوں منجم متفقہ فیصلہ کر دیں اور ابو معشر کو حضرت ادریس کی سی استعداد فلکیاتی حاصل ہو جائے جب بھی خراسان کے باب میں مجھے اس منجمانہ حکم کا یقین نہ ہوگا۔

محمد بن خوند شاہ طغرل بن ملک ارسلان کے ضمن میں لکھتے ہیں۔

> در زمان دولت او سبعہ سیارہ در اوایل میزان کہ از بروج ہوائی است در یک دقیقہ قران کردند منجمانہ گفتند کہ دریں سال بادے پیدا شود کہ عمارتہا خراب کند بلکہ جبال سختۃ البنیان از زمین برگیرد، وانوری دریں باب از سائر ارباب نجوم مبالغہ بیشتر داشت مردم انبیم جان در زیر زمین ساختند و سردابہا پر داختند و بحسب اتفاق دراں ایام کہ لوقات حکم اشاں بود چنداں باد نہ وزید کہ خلق رفع محصول نماید[۵۲]۔

چنانچہ اسی پر اس عہد کے ایک شاعر نے طنزاً کہا

گفت انوری کہ از سبب بادہائے سخت — ویراں شود عمارت و کہسار برسری

در روز حکم او نہ وزیداست ہیچ باد — یا مرسل الریاح تو دانی و انوری

لیکن محمد بن خوند شاہ فیصلہ کرتے ہیں کہ ہرچند تمام لوگوں پر ارباب نجوم کا جھوٹ ظاہر ہو گیا لیکن اسی سال تاتاریوں کے فتنہ اور چنگیز خاں کی بربریت نے دولت خوارزم شاہی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی، اور بالخصوص خراسان میں نہ تو کسی مکان کا مکین رہا اور نہ کسی گھر سے دھواں نکلا تعجب ہے کہ خاقانی اور انوری کے درمیان تقریباً دو سو سال کا فرق ہے، اور قران سبعہ سیارہ دونوں کے زمانہ میں میزان ہی میں ہوا اگر صاحب روضۃ الصفا انوری کے متعلق طنزیہ شعر نقل نہ کرتے تو کہا جاتا کہ یہ واقعہ خاقانی کے عہد کا تھا جس کو انوری کی طرف منسوب کرنے میں مورخ سے تسامح ہو گیا لیکن مرقومہ بالا شعر کی موجودگی میں تو اس کی بھی گنجایش نہیں رہی۔

برج میزان چونکہ "بادی" ہے اس لئے انوری نے "صرصر آتیہ" کی پیشین گوئی کی تھی جنوری ۱۹۳۴ء میں قران سبعہ سیارہ برج جدی میں ہوا تھا اور جدی خاکی ہے اس لئے زمین پر یہ آفتیں برپا ہوئیں زلزلہ آیا قصور و کوشک سرنگوں ہوئے اور "شمالی بہار" جو "گلشن ہند" تھا مساکن عاد و ثمود بنکر رہ گیا۔

---

۵۱ یہ وہی "ہرمس" (Hermes) ہے جس کی کتاب "مفتاح النجوم" کا ایک عربی ترجمہ مخطوطہ سنہ ۱۲۵ھ "میلن" (Milan) کے کتب خانہ میں موجود ہے ابو معشر کی زیچ بقول امیر علی فلکیاتی معلومات کا ماخذ رہی ہے، ابو معشر کو یورپ والے (Albumazar) کہتے ہیں — ۵۲ روضۃ الصفا

خاقانی نے بعض دوسرے قصاید میں بھی اس واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ قصاید کسی قدر تقدم و تاخر کے ساتھ ایک ہی عہد کی پیداوار ہیں فرماتے ہیں۔

کاندر سنہ ثون اختر سعد ... در طالع کامراں بہ بینم
شش سال دگر قران انجم ... در آذر و مہرگاں بہ بینم
ہر ہفت رسد بہ برج میزان ... با لست و یکش قران بہ بینم
کیوان بہ کنارہ بینم ارچہ ... ہر ہفت بہ یک مکاں بہ بینم
گر خطۂ خمسال خسف گیرد ... زیں مکہ روم اماں بہ بینم

ان ابیات کا خلاصہ یہ ہے کہ ۵۵۲ھ میں مشتری (اختر سعد) برج اسد (طالع کامران) میں ہوگا اور چھ سال تک برج قوس اور برج میزان میں قران رہیگا ساتوں ستارے برج میزان میں ۲۱ درجہ پر جمع ہوں گے، گو زحل (کیوان) کنارہ پر ہے لیکن ایک برج میں اجتماع ہوا ہی کیا کم ہے منجموں نے حکم لگایا ہے کہ خراسان میں گرہن لگیگا۔ لیکن مکہ میں امان رہیگا، اس کے بعد خود فیصلہ کرتا ہے۔

حقا کہ دروغ داستانیست ... بطلانی داستاں بہ بینم

دوازدہ بروج

جلال الدین اختسان شاہ کی مدح میں کہتے ہیں

در برہ مریخ گرز گاؤ افریدوں بدست ... وز مجرہ شب درفش کاویان انگیختہ
نیزہ زارے بر فلک بے آب کیواں ہمرآں ... دلورا از نیزہ زارش ریسماں انگیختہ
سازآں ہو عنائے صاحب بربط اندام چرخ ... سوز از آں قرأ صاحب طیلساں انگیختہ
چشم بز غالہ براں خوشہ کہ خرمن کردہ شب ... داس گرز دنداں زراہ کہکشاں انگیختہ
نقش جوزا چوں دو مغز اندر یکے جوز از قیاس ... یا دو پیر وج الصنم از یک مکاں انگیختہ
خور بہ سرطاں ماندہ تا معجون سرطانی کند ... زانکہ معلول صفرا از رفان انگیختہ
مشتری را ماہی صید و کمانے زیر دست ... آفت تیر از کمان ترکمان انگیختہ
بخت بر زہرائے انجم ورتر از وئے فلک ... نام نقش اختسان کامران انگیختہ

خاقانی نے ان ابیات میں بروج اور سیاروں کے متعلق استعارات و تشبیہات کا کافی ذخیرہ جمع کر دیا ہے بروج اور سیاروں کا تذکرہ کرتے ہوئے جس اسلوب جمیل کے ساتھ اس نے گریز کیا ہے وہ اسی کا حصہ ہے آئیے اب ہر شعر کے معنی پر غور کریں۔

در برہ مریخ گرز گاؤ افریدوں بہ دست ... وز مجرہ شب درفش کاویان انگیختہ

خاقانی نے جس خوبی کے ساتھ خرافیات و مذہبیات، فلسفہ و تاریخ کے میدانوں سے خوشہ چینیاں کی ہیں اس کی نظیر کسی اور فارسی شاعر کے یہاں نہیں پائی جاتی، وہ اس روانی اور بے تکلفی کے ساتھ تلمیحات پیش کرتا ہے کہ حیرت ہوتی ہے بہ یکوقت مختلف علوم کے مضامین کی طرف کیونکر اس کا ذہن منتقل ہوجاتا تھا اس سے اسکی وسعت ذہن اور اتقان حافظہ کا پتہ چلتا ہے وہ اس آزادی کے ساتھ دقیق سے دقیق علمی اشارے کرتا ہے کہ قاری کا ذہن بعض اوقات مشوش ہوجاتا ہے وہ جو کچھ لکھتا ہے اس وثوق کی بناپر کہ سارا عالم گوش شنوا، اور دیدہ بینا رکھتا ہے درانحالیکہ اس کی دقت بیانیاں بہتیرے مستعد ارباب ذوق کو بھی بہت زیادہ پریشان نظر اور آشفتہ خیال بنادیتی ہیں سرسری طور پر ابیات بالا کا جائزہ لیجئے، فوراً ملٹن کی "فردوس مفقود" آپ کی نظروں کے سامنے آجائے گی، گرز گاؤں افریدون، درفش کاویان، قرا صاحب طیلسان، یبرو ج الصنم، معجون سرطانی یہ تمام فقرے ملٹن کے بدیعہ نگارش کی طرف ذہن منتقل کر دیتے ہیں۔

خاقانی نے یہاں "برہ" سے "برج حمل" مراد لیا ہے "گرز گاؤ" فریدوں کا مشہور حربہ تھا جس کی شکل گائے کے منھ کی طرح تھی، شیواجی کا "گاؤمکھ" شاید اسی ایرانی حربہ کی نقل ہوگا "مجرہ" کہکشاں کو کہتے ہیں۔ "درفش کاویان" ایرانیوں کا مشہور علم ہے شعر کا مطلب یہ ہوا کہ سیارہ مریخ برج حمل میں گرز گاؤ لیکر آیا اور رات نے کہکشاں نہیں نکالی، بلکہ "درفش کاویان" کا پرچم پھیلا رکھا ہے مریخ کو کتب نجوم میں جوان غصہ ور خونی مزاج بتایا جاتا ہے۔

پنبہ زارے بر فلک بے آب وکیواں بہر آں　　دلو را از پنبہ زارش ریسمان انگیختہ

یعنی آسمان بہ منزلہ پنبہ زار ہے، ایک ایسا پنبہ زار جہاں پانی اور کنواں ناپید ہے اسی لئے برج دلو اس پنبہ زار میں آبیاری کی خدمتیں انجام دے رہا ہے، برج دلو کی شکل یہ ہے کہ ایک عورت ہے جو ڈول رسی لیکر آب کشی کر رہی ہے۔

سازآں رعنائے صاحب بربط اندر بام چرخ　　سوز از آن قرا صاحب طیلسان انگیختہ

"رعنائے صاحب بربط" سے سیارہ زہرہ مراد ہے، "قرا صاحب طیلسان" سے مشتری کی طرف اشارہ ہے۔ سیارہ زہرہ کے متعلق تو مشہور ہے، کہ ایک مغنیہ تھی جو ہاروت ماروت سے اسم اعظم سیکھکر ستارہ بنگئی اور آسمان پر چلی گئی، "مشتری" کو قاضی فلک کہتے ہیں اسی لئے "صاحب طیلسان" لائے، چونکہ اگلے وقت، قاضی خطیب اور مذہبی پیشوا جسم پر ایک چادر ڈالے رہتے تھے، شعر کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح ایک مطربہ کی لحن نوازیاں کسی دل والے قاضی یا مذہبی پیشوا کے اندر "ہاؤ ہو" پیدا کر دیتی ہیں اسی طرح بام آسمان پر سیارۂ زہرہ کی بربط نوازی اور موسیقیت سے قاضی فلک (مشتری) کے دل میں سوز و گداز پیدا ہو رہا ہے۔

چشم بزغالہ بران خوشہ کہ خرمن کردہ شب داس کز دندان زراہ کہکشان انگیختہ

"بزغالہ" سے برج جدی مراد ہے، خوشہ سے برج سنبلہ کی طرف اشارہ ہے، داس تو عموماً اس آلہ کو کہتے ہیں جس سے گھاس وغیرہ کترتے ہیں (یعنی ہنسیا) لیکن "داس" ایک دوسرے معنی میں بھی آتا ہے گیہوں اور جو کے ہر دانہ کے سرے پر ایک باریک سا "کھر" ہوتا اسی کو داس کہتے ہیں مطلب یہ ہوا کہ برج جدی جو بکری کا بچہ ہے "خوشہ" یعنی برج سنبلہ کو بہ نظر طمع دیکھ رہا ہے اس خوشہ کو رات نے خرمن کیا ہے، اور وہ بزغالہ کہکشاں کی راہ سے اپنا دانت خوشہ کے ہر دانہ کی باریک ٹہنیوں پر جمائے ہوئے ہے۔

نقش جوزا چوں دو مغز اندر یکے جوز از قیاس یا دو بیروج الصنم از یک مکان انگیختہ

برج جوزا کی شکل یہ ہے کہ دو انسان باہم لپٹے ہوئے ہیں "بیروج الصنم" ایک قسم کی گھاس ہے، جو ختن و بلخ، یغما و تبت وغیرہ میں پیدا ہوتی ہے اس کی شکل انسان کی سی ہوتی ہے شعر کے معنی یہ ہیں کہ برج جوزا کیا ہے گویا ایک بادام کے دو دانے ایک چھلکے میں ہیں یا دو بیروج الصنم ایک ہی مقام میں اُگے ہوئے ہیں۔

خور بہ سرطان ماندہ تا معجون سرطانی کند زانکہ معلول است صفرا از زعفان انگیختہ

اگلے زمانہ میں علم و ادب کے ساتھ ارباب ذوق طب کی تحصیل بھی لازمی جانتے تھے، چنانچہ اکثر ائمہ و شعرا نے بر بنائے تفنن یا اضافۂ معلومات کی نیت سے طب کی تحصیل کی، ابن حبان، سیوطی، اور رازی جیسے ائمہ مذہب اور رکنائے کاشی، حزیں، اور مومن خاں جیسے شعرا نے بھی باضابطہ اس فن کی تکمیل کی، خاقانی نے جس روانی کے ساتھ طب کے متعلق فنی اشارے کئے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے یہ فن بھی سیکھا تھا اگلے سطور میں اسکا وہ شعر لکھا جا چکا، جس میں اس نے "عرق عراق" اور "شریان شروان" کا استعمال کیا ہے اس شعر سے جہاں علم الابدان سے اس کی واقفیت کا حال معلوم ہوتا ہے وہاں معانی کے اعتبار سے ایک بلاغت جمیل بھی پائی جاتی ہے صنایع و بدایع میں اس کو تجنیس ناقص کہا جاتا ہے اسی طرح اس کا مرقومہ بالا شعر بھی اس کی طبی واقفیت پر دال ہے سرطان کے ساتھ "معجون سرطانی" کا استعمال "عرق عراق" اور "شریان شروان" کی طرح تجنیس میں داخل ہے شعر کا مطلب یہ ہے کہ آفتاب برج سرطان میں داخل ہوا تاکہ "معجون سرطانی" تیار کرے، معجون سرطانی ضعف رجولیت وغیرہ کے لئے مفید ہے۔

مشتری را ماہی صید و کمانے زیر دست آفت تیر از کمان ترکمان انگیختہ

ماہی سے مراد "برج حوت" ہے "تیر" سیارۂ عطارد کو کہتے ہیں "کمان" سے "برج قوس" کی طرف اشارہ ہے برج حوت مشتری کا گھر ہے شعر کا مطلب یہ ہے کہ مشتری نے مچھلی کا شکار کیا ہے اور اس کے پاس کمان تھی، تیر کی آفت ترکمان کی کمان سے برپا ہے "ترکمان" سلجوقیہ کی ایک شاخ ہے،

یہ لوگ بڑے تیر انداز ہوتے ہیں اور برابر تیر و کمان اپنے ساتھ رکھتے ہیں مصرعہ ثانی کے دو مطلب ہیں ایک تو یہ کہ ترکانوں کی قدر اندازی نے آفت بپا کر رکھی ہے دوسرے یہ کہ "تیر" (سیارۂ عطارد) کو "کمان" (برج قوس) میں وبال ہوتا ہے شعر کا مطلب یہ ہے کہ مشتری ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ایک ہاتھ میں کمان یعنی برج قوس ہے اور دوسرے میں ماہی (یعنی برج حوت) مشتری دونوں برجوں کا مالک ہے اور اپنی کمان سے عطارد کو وبال میں ڈال رکھا ہے کتب نجوم میں برج قوس کی تصویر یہ ہے کہ جنگلی گائے کے مثل ایک جانور ہے اس پر ایک نیم مرد سوار ہے اور اس کے ہاتھ میں تیر و کمان ہے اژدہا کی شکل کا ایک حیوان اس مرد پر حملہ آور ہونا چاہتا ہے اور وہ مرد اس کو تیر مار رہا ہے۔

بخت بر زرہائے انجم در ترازوئے فلک　　نام نقش اخفستان کامران انگیخته

ترازوئے فلک سے "برج میزان" مراد ہے یعنی اخفستان شاہ ایسا کامران بادشاہ ہے کہ قسمت نے برج میزان میں ستاروں کو تولا اور سکہ بنایا اور اس پر اخفستان شاہ کا نام نقش کر دیا۔

آفتاب کا داخلہ بروج اور اختلاف موسم

قدیم زمانہ سے آفتاب کے سکون و حرکت کا مسئلہ انسانوں کے زیر بحث رہا ہے چھٹی صدی قبل مسیح میں انغزاغورس نے یہ رائے دی کہ زمین متحرک اور آفتاب ساکن ہے لیکن یہ خیال مناظر کے اعتبار سے اسوقت ذہن انسانی کے لئے ناقابل قبول ثابت ہوا، لوگ اسی ظاہری مشاہدہ پر قایم رہے، کہ آفتاب کو حرکت ہے یہاں تک کہ بطالسۂ مصر میں ایک بہت بڑا ماہر فلکیات پیدا ہوا اس نے نظام شمسی، اجرام سماوی اور جغرافیہ طبعی پر مختلف کتابیں لکھیں، بطلیموس کا نظریہ تھا کہ آفتاب ہی متحرک اور زمین ساکن ہے چنانچہ اسی نظام کے اصول پر اسلامی ہیئت دانوں، ابومعشر، البطانی (جس کو بطلیموس عرب کہا جاتا ہے) البیرونی وغیرہ نے اپنی کتابیں لکھیں لیکن آخر میں کوپرنیکس پیدا ہوا اور اس نے نظام بطلیموس کی تردید کر دی، اور انغزاغورس کی رائے تسلیم کی۔

خاقانی نے اسی نظام بطلیموس کے مطابق آفتاب کی حرکت اور داخلہ بروج پر شاعرانہ روشنی ڈالی ہے اس کے ایک طویل قصیدہ کا ایک حصہ یہ ہے

ماہ بہ ماہ می کند شاہ فلک کدیوری　　عالم فاقہ بردہ را توشہ دہد تونگری
مایدہ ساز داز برہ بر صفت تونگراں　　بذر گری کند بہ گاؤ از قبل کدیوری
موسی و سامری شود گاو و برہ بہ پیرورد　　آب خضر بر آورد ز آئینہ سکندری
منگہ تیر از و شود روضہ صفت بہ تازگی　　خرگہ ماہ از و شود خلد وش از منوری
چوں بہ دہان شیر در خشم پلنگے آورد　　روئے زمین شود ز تف پشت پلنگ بربری

تیر تراز کبوترے برج بہ برج می پرد | بیضۂ زرہمی نہد در بدر از سبک پری
ہر سرمہ بہ برج نو بچۂ نو بر آورد | یکرہ برج از و شود قصر دوازدہ دری
از ہمہ کشتِ فلک دانہ خوشہ خورد و بس | چوں سوے برج خوشہ رفت از سر برج آذری
از سر خوشہ ناگہش داس شکستہ در گلو | کرد رگ گلوش را از سر داس نشتری
گوئی ازاں رگ گلو ریختہ اندر رزاں | اینہمہ خون کہ می کشند آتشی و معصفری

ان ابیات میں خاقانی نے آفتاب کے داخلہ بروج اور اس کے اثرات کا تذکرہ کیا ہے آئیے ہر شعر کی مختصراً وضاحت کی جائے۔

ماہ بہ ماہ می کند شاہ فلک کدیوری | عالم فاقہ بردہ را توشہ دہد توانگری

اس بیت میں خاقانی نے آفتاب کو ایک کسان سے تشبیہ دی ہے، جس طرح ایک کسان مہینوں محنت اور دوا دوش سے کام لیتا ہے اور اپنی جاں فشانیوں کے بعد دنیا کی فاقہ مستیاں دور کرتا ہے اسی طرح آفتاب بھی مہینوں ایک برج سے دوسرے برج میں مارا مارا پھرتا ہے تاکہ عالم کے لئے سامان رزق مہیا کرے چنانچہ آفتاب جب برج حمل میں آتا ہے تو بہار کی نشاط آفرینیاں ہوا کرتی ہیں اور جب وہ برج قوس میں آتا ہے تو خزاں کی ویرانیاں رہا کرتی ہیں۔

مایدہ سازد از برہ بر صفت توانگراں | بذر گری کند بہ گاؤ از قبل کدیوری

یعنی جس طرح ایک امیر آدمی بھیڑ وغیرہ ذبح کرکے مہانوں کی دعوت کرتا ہے اور کسان لوگ گائے کے ذریعہ خرمن کرتے ہیں اسی طرح آفتاب بھی برج حمل (برہ) میں آکر امرا کی طرح اہل دنیا کی ضیافت کرتا ہے اور برج ثور (گاؤ) میں جب آتا ہے تو زراعت پیشہ کی حیثیت سے غلہ کا خرمن تیار کرتا ہے۔

موسیٰ و سامری شود گاؤ برہ بہ پرورد | آب خضر بر آورد ز آئینۂ سکندری

یعنی جس طرح موسیٰ بکریاں چراتے تھے، اور "سامری" نے "عجلاً جسداً" (بچھیڑا) کی پرورش کی تھی اسی طرح آفتاب برج حمل و ثور (گاؤ برہ) کی پرورش کرتا ہے اور آسمان (آئینہ سکندری) سے مینھ برساتا ہے۔

بنگہ تیر از و شود روضہ صفت بہ تازگی | خرگہ ماہ از و شود خلد وش از منوری

"تیر" فارسی میں سیارۂ عطارد کو کہتے ہیں "بنگہ" کے معنی رختگاہ "بنگہ تیر" کنایۃً برج جوزا کے معنی میں استعمال ہوا ہے "خرگہ ماہ" سے برج سرطان مراد ہے شعر کا مطلب یہ ہے، کہ اب جوزا کی نضارت آگینی اور چمن سامانی اور سرطان کی خلد وشی اور نور پاشی شروع ہوتی ہے۔

چوں بہ دہان شیر در خشم پلنگے آورد | روئے زمیں شود ز تف پشت پلنگ بربری

"دہان شیر" سے برج اسد مقصود ہے "پلنگ بربری" صحرائے افریقہ میں ایک قسم کا سیاہ شیر ہوتا ہے یعنی آفتاب جب برج اسد میں آتا ہے تو زمین حرارت اور خشکی کی وجہ سے بربری شیر کی طرح سیاہ ہو جاتی ہے۔

تیز تراز کبوترے برج بہ برج می پرد بیضۂ زر ہمی نہد در بدر از سبک پری

کوئی خاص معنی نہیں اوپر "ماہ بہ ماہ" والے بیت میں یہ خیال ظاہر کر چکے ہیں لیکن اس بیت میں خاقانی نے آفتاب کو کبوتر سے تشبیہ دی ہے، اور جس طرح اگلے ابیات میں کسان اور زراعت کی مثالیں دیکر آفتاب کے فیوض و افادات کا تذکرہ کیا اسی طرح اب کبوتر کی مثال دیکر اس کی سبک پری اور دانہ چینیوں کا تذکرہ کرتے ہیں، "بیضۂ زر" سے روشنی مراد ہے، شعر کا مطلب یہ ہے کہ آفتاب کبوتر کی طرح ایک برج سے دوسرے برج میں اُڑتا ہوا پہونچتا ہے، اور ان میں سونے کے انڈے دیتا جاتا ہے۔

از ہمہ کشتہ فلک دانہ خوشہ خورد و بس چوں سوئے برج خوشہ رفت از سر برج آذری

آسمان بمنزلہ ایک کشت زار ہے، اور آفتاب مثل کبوتر ہے، اب ایک طایر کے لئے خوشہ چینی کرنا ضروری ہے اس لئے برج سنبلہ موجود ہے، برج آذری "برج اسد" کو کہتے ہیں ابیات بالا میں شاعر نے آفتاب کے داخلۂ اسد کا حال لکھا تھا "برج اسد" کے بعد چونکہ برج سنبلہ ہے اس لئے اب اس کا تذکرہ کرتے ہیں۔

از سر خوشہ ناگہش داس شکستہ در گلو کرد رگ گلوش را از سر داس نشتری

یعنی "برج سنبلہ" (خوشہ) میں یکایک آفتاب کے حلق میں داس گڑ گیا اور اس وجہ سے اس کی گردن مجروح ہو گئی، "داس" اس باریک خس کو کہتے ہیں جو ہر دانہ کے سرے پر ہوتا ہے برج سنبلہ میں چونکہ آفتاب کو وبال ہوتا ہے اسی لئے اس کی جراحت کا تذکرہ کیا۔

گوئی از آں رگ گلو ریختہ اند در رزاں اینہمہ خوں کہ می کشند آتشی و معصفری

اب فرماتے ہیں کہ رگ گردن کا یہی خون انگوروں میں پیوست ہو جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ اس سے شراب سرخ و زرد تیار ہوتی ہے۔

نظرات سیارگان

خاقانی زندان میں ہیں ہاتھوں میں ہتکڑیاں، پیر میں بیڑیاں ہیں دل رنجور اور جسم سوگوار بنا ہوا ہے، اسی عالم میں شاعر نے ایک نہایت معرکۃ الآرا مرثیہ لکھا یا یوں کہئے نظم میں دربار شاہی میں اپیل کی اسی سلسلہ میں انھوں نے یہ ابیات بھی لکھے ہیں۔

بہ تثلیث بروج و ماہ و انجم بہ تربیع و بہ تثلیث و ثلاثا

کہ بہر دیدن بیت المقدس مرا فرماں بخواہ از شاہ دنیا

"تثلیث" "تربیع" "تسدیس" اور "مقابلہ" نجومی اصطلاحیں ہیں یعنی دو سیاروں کے درمیان

ایکسو بیس درجہ کا تفاوت ہو تو اس کو "نظر تثلیث" کہتے ہیں مثلاً ایک سیارہ برج حمل میں ہو اور دوسرا برج اسد میں۔ اگر ایکسو اسی درجہ کا تفاوت ہو تو "مقابلہ" کہیں گے، اگر ساٹھ درجہ کا فرق ہو تو "تسدیس" اور نوے درجہ کا فرق ہو تو "تربیع" کہتے ہیں مثلاً آفتاب برج حمل میں اور ماہتاب برج سرطان میں بہ تفاوت نوے درجہ ہو تثلیث و تسدیس کو سعد اور تربیع و مقابلہ کو نحس کہتے ہیں۔

شعر کے معنی ہیں کہ ماہ و انجم کے نظرات تثلیث و تربیع کی قسم بادشاہ سے میرے لئے بیت المقدس جانیکی اجازت حاصل کیجئے، خاقانی نے اس مرثیہ میں وزیر عز الدولہ کو مخاطب کیا ہے اور اسی وزیر سے فرمان شاہی حاصل کرنے کی التجا کی ہے۔

سعد ذابح خاقانی نے ایک قصیدہ میں دشت موقف ہشتم ذی الحجہ، مسجد خیف، جمرہ وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے اور فریضہ حج اور حجاج کے متعلق نہایت ہی لطیف اشعار لکھے ہیں اسی سلسلہ میں قربانی کے مسئلہ پر فرماتے ہیں۔

سعد ذابح بہر قربان تیغ مریخ آختہ   جرم کیوانش چوں سنگ کی افسان دیڑاند

"سعد ذابح"، برج دلو میں ایک ستارہ ہے اور دلو "زحل" کا گھر ہے مریخ کو ترک فلک کہتے ہیں جو تیغ و خنجر کی طرف منسوب ہے، "زحل" کو پتھر کی طرف نسبت دیتے ہیں چونکہ اس سیارہ کا جسم سخت و درشت ہی "افسان" ایک قسم کا سیاہ سبز رنگ کا پتھر ہوتا ہے جس پر چاقو اور خنجر وغیرہ تیز کرتے ہیں۔

شعر کا مطلب یہ ہے کہ سعد ذابح نے مریخ کی تلوار لی اور زحل کے جسم پر جو بمنزلہ "افسان" ہے اسکو تیز کیا اور فریضہ قربانی ادا کیا خاقانی نے حجاج کے فریضہ قربانی کے لئے ایک بے مثل منجمانہ تشبیہ دی ہے۔

دمدار ستارہ جلال الدین شروان شاہ کی مدح میں خاقانی نے "گنج رواں افشاندہ اند" آسمان افشاندہ اند کے قوافی و ردیف میں ایک طویل قصیدہ لکھا ہے اس میں بھی اس نے بہت سے منجمانہ اشارات کئے ہیں فرماتے ہیں۔

تا غبار از چتر شاہ اختران افشاندہ اند   فرش سلطانیش در برتر مکان افشاندہ اند

شحنۂ نوروز نعل نقرہ خنگش ساختست   ہر زرے کاکسیر سازان غزان افشاندہ اند

رستہ چوں یوسف زچاہ دلو پیش ابر و صبح   گوہر از الماس و مشک از پرنیان افشاندہ اند

در رکابش ہفت گیسو دار و شش خاتون ندیف   بر سرش ہر ہفت و شش عقد جان افشاندہ اند

بست و یک پیکر کہ از سقلاب دارد خیلتاش   گرد راہ خیل او تا قیرواں افشاندہ اند

خاقانی نے ان ابیات میں آفتاب کے خروج دلو، اور داخلہ برج حمل کا تذکرہ کیا ہے اور ان سے جو

اثرات موسمی مترتب ہوتے ہیں ان پر روشنی ڈالی ہے اسی سلسلہ میں جلال الدین شروان شاہ کے جلو میں غلاموں اور کنیزوں کو دیکھکر ایک نہایت ہی پر لطف تشبیہ دی ہے اور بتایا ہے کہ بادشاہ کے رکاب میں جو غلام اور لونڈیاں ہیں وہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آفتاب کے گرد دمدار ستارے اور سیارے عقد ثریا نچھاور کر رہے ہیں اور بادشاہ کا جلال یہیں تک منحصر نہیں رکھتے بلکہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ جس طرح فلک ہشتم میں کل ثوابت مرکوز ہیں اور چھتیس صورتیں ہیں اور ان میں ۲۱ صورتیں شمال کی طرف اور پندرہ صورتیں جنوب کی طرف ہیں اسی طرح جلال الدین شروان شاہ کے خدم وحشم نے سقلاب (جو شمال میں ہے) سے قیروان تک غبار بلند کر رکھا ہے مرقومۂ بالا ابیات میں ہر شعر تشریح طلب ہے لیکن ان صفحات میں اس کی گنجایش نہیں پھر بھی ایک شعر کی کسی قدر وضاحت کر دینا ضروری ہے فرماتے ہیں۔

در رکابش ہفت گیسو دار و شش خاتون ردیف — بر سرش ہر ہفت و شش عقد جمان افشاندہ اند

"ہفت گیسودار" سے دمدار ستارے مراد ہیں جو "میل مرکزی" (آفتاب کی کشش) کی قوت سے آفتاب کے گرد چکر لگا رہے ہیں اسمیں شک نہیں خاقانی کے زمانہ میں بھی ان ستاروں کو "مایہ بخار دخانی" سمجھا جاتا تھا جو اثیر کے تصادم مشتعل ہو جاتے ہیں قدیم ہیئت دانوں نے نظام شمسی کے سلسلہ میں ستارۂ دمدار کا تذکرہ نہیں کیا وہ سبعہ سیارہ کے قایل تھے، لیکن اب علم ہیئت کا یہ طے شدہ مسئلہ ہے کہ کثرت سے دمدار ستارے آفتاب کے گرد چکر لگا رہے ہیں ہاں ان میں بعض کی گردش معینہ ہے اور بعض کی غیر معینہ، دو سو دمدار ستاروں کا دائرۂ گردش دریافت ہو چکا ہے، ان میں چالیس ستارے جو ہمارے نظام شمسی میں داخل ہو چکے ہیں ایک زمانۂ معینہ میں آفتاب کے گرد اپنی گردش پوری کرتے ہیں اور ایکسو ساٹھ سیاروں کا مرکز بدلتا رہتا ہے تحقیقات جدیدہ نے ثابت کر دیا ہے کہ ان دمدار ستاروں کا مدار بالکل بیضاوی ہے اور ان کا جسم مثل کہر کے بخارات نیم منجمد کا ہوتا ہے ان دمدار ستاروں میں کئی کے سر پر ایک روشن تارہ نظر آیا ہے جس کی ضیا پاشیوں سے خطوط شعاع پیدا ہو جاتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک طاؤس آسمان پر مستانہ رقص کر رہا ہے، خاقانی نے ان دمدار ستاروں کی تعداد سات ہی بتائی ہے، لیکن دو ہزار سال کے درمیان چھ سو دمدار ستارے نظر آئے، بہر حال عربی میں ان ستاروں کو "ذوات الاذناب" اور یوروپی اصطلاح میں "کومٹ" (Comet) کہا جاتا ہے "شش خاتون ردیف" سے آفتاب کے علاوہ چھ سیارے مراد ہیں "عقد جمان" موتی کے ہار کو کہتے ہیں لیکن یہاں کنایۃً "ثریا" سے ہے جو چھ ستارے برج ثور میں یکجا ہیں تو خاقانی کے شعر کا مطلب یہ ہوا کہ آفتاب جب برج حوت سے برج حمل میں آیا تو دمدار ستاروں اور چھ سیاروں نے عقد ثریا کو "شاہ اختران" یعنی آفتاب پر نچھاور کیا۔

عبدالمالک آروی

جھانسی کی رانی

(مسلسل)

ایکٹ ۴ - ۱۸۵۸ء

منظر اول

(بالاخانے کے نیچے جھانسی راج کے محل کا صحن، وقت شام، تاریخ ۲۰ مارچ ۱۸۵۸ء۔ لوگوں کا ہجوم رانی اور اُس کی فوج کا خیر مقدم جبکہ رانی، راجہ اور چھا اور اُس کے رفقا سے جنگ کر کے واپس آنے والی ہے۔ پردہ اُٹھتا ہے۔ سانپ کا تماشہ، مداری کا تماشہ اور بانس کی ورزش کا تماشہ شروع ہوتا ہے۔ تھوڑے وقفے کے بعد دیوان تارا سنگھ دروازہ سے گزر کر صحن میں پہونچتا ہے اور ایک گھوڑے پر جو اُس کے سامنے فوراً لایا جاتا ہے سوار ہوتا ہے۔ "دیوان صاحب کی جے" کا نعرہ لگایا جاتا ہے۔ اور وہ متانت سے مسکرا کر سلام لیتا ہے، لوگ اُس کے گھوڑے کے اردگرد جمع ہو جاتے ہیں اور وہ گھوڑے پر بیٹھے ہوئے اُن سے مخاطب ہوتا ہے)۔

تارا سنگھ:- بھائیو! چند منٹ میں ہمارا پیارا حکمراں ہمارے پاس آجائے گا۔ راج کے دشمنوں سے کئی مہینے کے سخت مقابلہ کے بعد واپس ہوگا۔ جھانسی راج کی نئی زندگی کے بعد سے نو مہینے تک جیسا آپ سب جانتے ہیں رانی لکشمی بائی راجدھانی کا انتظام کر رہی ہیں، یہ رانی ہی کی ذات ہے کہ راج کو اگر زیادہ نہیں تو کم از کم وہ استحکام حاصل ہے جو راجہ گنگا دھر کے زمانہ میں تھا۔ پھر کیا ہمارا فرض نہیں ہے کہ ہم رانی کا خیر مقدم نہایت گرمجوشی اور دلی محبت سے کریں۔ اور اپنے سپاہیوں کی شاندار فتح کی جو اُنھوں نے نتھے خاں اور مہاراجہ اورچھا کی فوجوں پر حاصل کی سب خوشی منائیں۔ (دیوان صاحب کی جے کے نعرے) میں اب اپنے معزز حکمران کے خیر مقدم کے لئے ٹھہر کے

باہر جاتا ہوں اور اُس کو یہاں لاتا ہوں۔ آپ کا رانی کو خیر مقدم کہنا، رانی کی اُن شجاعانہ کارگزاریوں کا تسلیم کرنا ہے جو اُنھوں نے اور اُن کے معزز باپ نے باشندگان جھانسی کے لئے انجام دی ہیں۔

(راناصاحب روانہ ہوتے ہیں اور "دیوان صاحب کی جے" کے نعرے جاری رہتے ہیں۔

ایک بگل کی آواز سنائی دیتی ہے اور وہ آہستہ آہستہ بڑھکر ایک سریلے راگ میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ جس میں ہندوستانی ڈھول جھانجھ اور شہنائی کی آوازیں شامل ہیں اور وقتاً فوقتاً ناقوس کی بھی آواز آتی ہے۔ باجا وحشیانہ اور بے قاعدہ تھا۔ جب قریب آیا تو مردانی آوازیں جو ایک ساتھ پیدا ہو رہی تھیں کان میں آئیں اور فوراً مسلح آدمی چہار جانب سے صحن میں آ گئے۔ اُن کے آگے باجے والے۔ بگل والے اور ناقوس بجانے والے تھے۔ اکثر فوجی افغان اور روہیلے تھے جو صاحب ریش تھے یا مغربی ہند کے مرہٹے تھے اور مختلف اقسام کے اسلحہ اور بندوق، رائیفل تیر کمان بھالے تلوار اور برچھے وغیرہ مختلف اسلحہ سے آراستہ تھے، وردیاں بنگال کی فوجی سپاہیوں کی سی تھیں اور کچھ دوسری قسم کی ابتدائی وحشی اقوام والی شکاری پوشاکیں بھی تھیں۔ ڈھال زرہ بکتر بھی تھے۔ فوج صحن میں داخل ہوتے ہوئے چند اشعار گا رہی تھی اور اسلحہ کی جھنکار یا تالی بجا کر تال ملایا جاتا تھا۔

سرخ علم بلندی پر نصب کیا گیا جس کو ہر شخص نے دیکھا اور رانی لکشمی بائی کی حکومت سے خوش ہو کر "رانی کی جے، کمار کی جے" کے نعرے لگائے۔

لوگ راگ کا آخری حصہ فوج کے ساتھ غل مچا کر دوہرانے لگے، شور و غل بڑھتا گیا۔ اور جب حد سے زیادہ بڑھ گیا تو رانی اپنے جنگی ہاتھی پر سوار ہوئی، آگے سرخ علم تھا جو کسی وقت علیحدہ نہ ہوتا تھا۔ مرہٹہ گارڈ کے افسر کی وردی رانی نے زیب تن کی تھی جس میں چست کرتہ، سفید پائجامہ اور پگڑی تھی اور پٹکے سے تلوار لٹک رہی تھی۔ اور پگڑی میں ایک نیلے رنگ کا طرہ بھی تھا۔ اُس کے پاس ہاتھی پر انند راؤ بھی ہے اور وہ بھی ایسے ہی لباس سے مزین ہے۔ تارا سنگھ، راما صاحب، راؤ آپا اور گنگا بائی رانی کے ساتھ ساتھ گھوڑوں پر ہیں۔ گنگا بائی رانی کی سی پوشاک پہنے ہے لیکن طرہ نہیں ہے۔ رانی اور انند راؤ ہاتھی پر بیٹھے ہیں، مجمع کے لوگ سلام کر کے ارد گرد آ جاتے ہیں۔ فوجیں اسی اثنا میں باجہ بجاتی ہوئی اپنے اپنے مقام پر کھڑی ہو جاتی ہے۔ راما صاحب اُتر کر محل میں داخل ہوتے ہیں۔ تارا سنگھ راؤ آپا اور گنگا بائی بھی اُترتے ہیں لیکن وہ ہاتھی کے قریب کھڑے رہتے ہیں۔ رانی چاروں طرف سلام لیکر تقریر کی خواہش کرتی ہے۔

(مجمع خاموش ہو جاتا ہے اور عماری سے جہاں انند راؤ بھی بیٹھا ہے تقریر شروع کرتی ہے۔)

رانی :۔ پیارے دوستو! بھائیو! بہنو! آپ نے جو میری واپسی پر دلی مسرت کا اظہار کیا ہے اس سے میرے قلب پر گہرا اثر پڑا ہے۔ ہم کو بھی واپسی پر بہت غیر معمولی خوشی حاصل ہوئی ہے۔ ہم کو گزشتہ مہینوں میں سخت صعوبتیں اُٹھانی پڑیں کیونکہ ہم نے گستاخ دشمنوں پر جو ہماری پاک زمین پر حملہ کر رہے تھے فتح پائی۔ مجھے فخر سے کہنے کا موقع حاصل ہے کہ شیوجی اور مہادیوجی کی مہربانی سے ہمارے بہادر سپاہیوں نے نتھے خاں اور راجہ اورچھا کی فوجوں کو ہر طرف سے پسپا کر دیا۔ (اس پر نعرے رانی لکشمی بائی کی جے کے بلند ہوتے ہیں اور رانی ہاتھ اُٹھا کر پھر سب کو خاموش کرتی ہے) لیکن بھائیو! میں آپ کو تنبیہ کرتی ہوں کہ ہماری مشکلات ابھی ختم نہیں ہوئی ہیں۔ ابھی ہم کو جلد ایک دوسرے دشمن کا جو مہاراجہ اورچھا اور نتھے خاں سے زیادہ سخت ہے مقابلہ کرنا ہے۔ یہ خبر ہم کو راستے میں موصول ہوئی ہے کہ انگریزوں نے ساگر میں ایک بڑی فوج جمع کی ہے اور ہمارے مقابلہ کے لئے وہ روانہ ہو چکے ہیں۔ (مجمع کے لوگوں پر سنجیدگی چھا جاتی ہے) پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم راستی پر ہیں اور ہمارے ذرائع بھی کافی وسیع ہیں۔ ہمارے شہر جھانسی میں صرف غلہ ہی کا ذخیرہ کافی نہیں ہے بلکہ جملہ سامان جنگ بھی موجود ہے اور ناناصاحب، تانتیا ٹوپی اور رنپور کے راجہ نے بھی ہم کو آدمی اسلحہ اور توپیں دینے کا وعدہ کیا ہے جب انگریز حملہ کریں گے تو ان کی مدد ہم کو ملجائیگی (نعرے جھانسی راج کی جے) کے لگتے ہیں۔ پس اگر دشمن ہمارے گھر کے قریب بھی آجائے تو کسی قسم کا خطرہ نہیں ہے۔ اگر آپ ہمارے سپاہیوں کے پیچھے کھڑے ہیں تو آپ نتیجہ سے واقف ہو جائیں گے۔

(فوج پھر نقل و حرکت کا راگ بجانے لگتی ہے۔ رانی اور انند راؤ ہاتھی سے اُتارے جاتے ہیں اور ہاتھی الگ لیجایا جاتا ہے۔ رانی مجمع کے بیچ میں مع انند راؤ کے گزرتی ہے اور دونوں ہاتھ پھیلا کر جو لوگ قریب ہیں اُن سے مخاطب ہوتی ہے۔)

رانی :۔ اب بھائیو! معاف کرنا، چونکہ مجھے مہادیوجی کے مندر جانا ہے اس لئے منہ ہاتھ دھونے کے لئے اندر جاتی ہوں۔ میں تھکی ہوئی ہوں اور میلی ہو رہی ہوں۔ میں نے ماماصاحب اپنے والد بزرگوار سے دریافت کر لیا ہے۔ اُن کی عاقلانہ حکمت کے باعث فتح نصیب ہوئی ہے۔ اس وقت میں جو کچھ کہہ سکتی ہوں یہ ہے کہ تم کو ہماری مہمات اور ہماری فوج کی شجاعت کا علم ہو جائے۔ آج شام کو میں رہنمایان شہر کو جمع کر کے اُن سے مشورہ کروں گی تاکہ انگریزوں کے خلاف تحفظ کا سامان بہم پہونچ سکے اور آپ کو بتاؤں گی کہ جنگ کے لئے میں آپ سے کیا چاہتی ہوں جو آپ میں ہندو ہیں مندر ہو آئیں اور وہاں نذر چڑھائیں اور فتح کے لئے جو ہم کو حاصل ہوئی ہے شکریہ ادا کریں اور اس آیندہ کی جنگ میں کامیابی کی دعا مانگیں۔ اور مسلمان میرے لئے اپنے اللہ سے مدد مانگیں۔ سلام۔ مستقبل سے متوحش و متزلزل میں شک لاؤ۔ نتیجہ اچھا برآمد ہوگا۔ لیکن اپنا وقت غفلت اور آرام طلبی میں نہ گنوانا۔ ہمارے سامنے ایک

بڑا کام ہے۔ اور ہم کو اُس کے لئے تیار ہو جانا چاہیئے۔

(جونہی وہ تقریر ختم کرتی ہے "رانی صاحبہ کی جے" "کمار صاحب کی جے" کے نعرے بلند ہوتے ہیں تمام سپاہی اپنا باجہ بجانے لگتے ہیں اور اُن کے اسلحہ سے جھنکار پیدا ہوتی ہے۔ اسی اثنار میں رانی ہاتھ جوڑ کر چاروں طرف گھومتی ہے اور پھر محل میں داخل ہوتی ہے اور اُس کے آگے سرخ علم اور انند راؤ چلتا ہے اور پھر تارا سنگھ گنگا بائی اور راؤ آبا چلتے ہیں۔ ماما صاحب بالاخانہ پر آتا ہے اور مجمع "ماما صاحب کی جے" کا غل شروع کرتا ہے۔ اور ماما صاحب سلام کرتا ہے۔ پردہ اُس غل مچانے والے مجمع پر گرتا ہے اور وہ سب مجتمع ہو کر بالاخانہ کے نیچے کھڑے ہوتے ہیں کہ ماما صاحب کی تقریر سنیں)

منظر دوم

(دربار کا کمرہ۔ تاریخ ۲ اپریل، وقت آدھی رات، انگریزوں نے سر ہیوگ روز کی ماتحتی میں جو بعد میں لارڈ اسٹراتنارن کے نام سے مشہور ہوا جھانسی کا محاصرہ کر رکھا ہے۔ گدی دکھائی دیتی ہے۔ کمرہ غیر آراستہ ہے اور ہر چہار طرف بندوقیں تلواریں اور اسلحہ پھیلے ہوئے ہیں۔ باہر سے رائفل کے فیر کی آواز آتی ہے لیکن توپ کی کوئی آواز نہیں ہے۔ رانی اپنی پوشاک پہنے ہوئے گدی پر رونق افروز ہے اور انند راؤ اُس کے پاس بیٹھا ہے۔ وہ آخری مرتبہ ذی اقتدار ہستیوں سے مشورہ کر رہی ہے۔ چہرہ پر پریشانی کے کے آثار نمایاں ہیں اور گو کہ وہ خاموش ہے تاہم اس کے چہرہ سے اندرونی حالت کا پتہ لگتا ہے۔ اُس کے سامنے اکابر کا مجمع ہے جن میں سے اکثر ہندو ہیں اور سب سنجیدہ ہیں اور گردن جھکا کر تارا سنگھ کی تقریر سن رہے ہیں۔ رانا سنگھ ایک چھوٹے اسٹول پر بیٹھا مجمع سے مخاطب ہو رہا ہے۔ ماما صاحب بھی بیٹھا ہوا مجمع سے خطاب کر رہا ہے۔ اور دیوان بھی بیٹھا ہے۔ راؤ آبا اور گنگا بائی (وردی میں) گدی کی بائیں جانب بیٹھے ہیں۔ وہ یکے بعد دیگرے بالاخانہ پر جاتے ہیں اور حملہ کی علامات دیکھتے ہیں۔

تارا سنگھ:۔ (سسکیاں روک کر) بھائیو اور دوستو! وہ وقت قریب آ رہا ہے جب ہم کو انگریزوں سے مقابلہ کرنا پڑے گا۔ جب تک تانتیا صاحب کی امداد کی اُمید تھی ہم کو انگریزوں کے مقابلہ کا زیادہ خوف نہ تھا۔ ہمارے لئے انگریزوں سے مقابلہ آسان تھا۔ لیکن اب کہ تانتیا کی فوج ہماری آنکھوں کے سامنے شکست کھا چکی ہے اور وہ خود بتیوا سے کالپی کی طرف بھاگ چکا ہے تو ہماری شکست بھی یقینی ہے، ہمارا دوسرا حامی رنپور کا راجہ بھی شکست کھا چکا ہو۔

ایک سردار:- سچ ہے دیوتاؤں کا دلی منشا سمجھنا بہت مشکل ہے، یہ کون سمجھ سکتا تھا کہ تانتیا صاحب کی توپی فوج کو کمپنی کے چند سپاہی دھوئیں کی طرح اُڑا دیں گے۔

ماما صاحب:- (پریشان ہوکر اور جھٹک کر) یہ کمبخت توپیں اور فوج کی قواعد دانی سب کام خراب کر دیتی ہے۔ یہ توپیں جو ہمارے قلعہ کی دیواروں کو ڈھا دیتی ہیں ہر چیز تباہ کر سکتی ہیں۔ ہمارے بہادر افغانی سپاہی بھی جبکہ توپوں کو دیکھکر کانپنے لگتے ہیں۔ ہمارے قلعہ کی دیوار میں اُنھوں نے گاڑی بھر کا راستہ بنا بھی لیا ہے۔ اور ہم مرمت کی جو کوشش کرتے ہیں بیکار ثابت ہوتی ہے۔ ہم بدقت تمام پتھر لگا کر اُس کی مرمت کرتے ہیں اور وہ اُس کو توپوں سے چکنا چور کر ڈالتے ہیں۔

راؤ آپا:- (خاموشی سے) ہماری توپ کی جگہ کے ساتھ بھی یہی ہوتا ہے جب ہم کسی جگہ توپ رکھتے ہیں تو وہ اسکو برباد کرنے کی فکر کرتے ہیں اور کسی نہ کسی وقت برباد کر دیتے ہیں۔ اکثر ہمارے آدمی بھی جن کے پاس اچھے ہتھیار نہیں ہیں ضایع ہوتے ہیں۔ میدان جنگ کے لئے کوئی بھاری توپ ہمارے پاس نہیں ہے۔ اگر یہ محل ہمارے پاس محفوظ جگہ پر نہ ہوتا توکب کا اُڑا دیا جاتا۔

ماما صاحب:- (کمزور آواز سے) میں صرف اُن کی توپوں ہی کی تعریف نہ کروں گا۔ اصل چیز اُن کا قاعدہ قانون ہے۔ جب انگریز حاکم کسی کام کے کرنے کا حکم دیتا ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ یا تو کام پورا ہوگا یا سپاہی اپنی جان ضایع کر دیں گے۔ ہمارے آدمی بھی انگریز سپاہیوں کی طرح بہادر ہیں لیکن تعمیل حکم نہیں کرتے۔ اگر میں کسی کام کا حکم دوں تو اُس کو پورا کرانے کے لیے مجھے کھڑا رہنا پڑے گا۔ ورنہ حکم بیکار ہو جائے گا۔ ہم فرداً فرداً جنگ کرتے ہیں وہ متحدہ کوشش کرتے ہیں یہی اصل فرق ہے۔ اچھی توپیں اور مستعدانہ قواعد کی پابندی۔

رانی:- (تھکی آواز میں) کیا مناسب نہ ہوگا کہ ہم اُسوقت پر غور کریں جب انگریز یہاں گھس آدیں گے۔ ہم کو اُسوقت کیا کرنا چاہیئے۔ ہماری قسمت پر مہر لگی ہوئی ہے پس ہم کو اُن واقعات کی بات چیت کرنی چاہئے جو تھوڑی دیر میں ہمارے سامنے آنے والے ہیں۔

ایک سردار:- رانی صاحبہ! آہ! مستقبل کا کیا سوچنا۔ ہمارے دل خود اپنی بدقسمتی پر رو رہے ہیں۔ ہم نے سنا ہے کہ انگریز بڑے بڑے لوگوں کو توپ سے اُڑا دیتے ہیں اور ٹکڑے ٹکڑے کرکے ہوا میں چاروں طرف پھینکدیتے ہیں۔ پھر ہم اپنے لئے کیا سوچیں جبکہ ہم کو ڈر ہے کہ رانی لکشمی بائی کے لئے یہی مصیبت آنے والی ہے۔

(دوسرے سردار اس تقریر کی موافقت میں سر ہلانے لگتے ہیں اور کہتے ہیں۔ ہے! ہے! لکشمی بائی! بیچاری رانی لکشمی بائی)

رانی:- (غمزدہ ہوکر مسکراتی ہوئی اور چاروں طرف سلام کرتی ہوئی) دوستو! مت ڈرو! لکشمی بائی انگریزوں کو

اُن کی مہیب توپوں کے لئے بارود نہ مہیا کردے گی۔ (اپنی کمر سے ایک خنجر نکالکر اور دکھاکر) اگر میرا مردہ جسم اُن کو اطمینان بخش سکتا ہے تو آئیں۔ لیکن مجھے وہ زندہ نہیں لے جاسکتے۔ (افسوس کے ساتھ سب نے تائید کی) لیکن ہم ضرورت سے زیادہ پیشین گوئی کررہے ہیں۔ تمھارا کیا ارادہ ہے۔ والد صاحب!

ماما صاحب:- جنگ کرنے والے سپاہی اپنی زندگی بیچنے کے لئے تیار ہیں۔ ہم انگریزوں کے ہاتھوں میں پہونچکر اُن سے کوئی رحم کی اُمید نہیں کرسکتے۔ پس بجائے اطاعت قبول کرنے کے ہم لڑتے لڑتے مرجانا پسند کرینگے

تیسرا سردار:- آبادی کے بھاگنے کا راستہ ہر طرف سے مسدود ہوچکا ہے۔ آج شام کو جب تانتیا صاحب کی شکست کی خبر ملی میرے چند احباب معہ اپنے بال بچوں کے شمالی پھاٹک سے بھاگ جانا چاہتے تھے۔ لیکن انگریزی فوج فوراً اس کو سمجھ گئی۔ اور جو نہیں مارے گئے تھے وہ قصبہ میں مضطرب ہوکر داخل ہوگئے۔ اب جو قسمت دکھائیگی دیکھنا پڑے گا۔

رانی:- والد صاحب! آپ کے خیال میں انگریز کتنی دیر میں حملہ کریں گے۔

ماما صاحب:- اب جسوقت چاہیں حملہ کرسکتے ہیں کیونکہ دیوار میں شگاف ہوچکا ہے۔ جنرل روز اگر سویرے حملہ کردے تو مجھے تعجب نہ ہوگا کیونکہ فوج نے تانتیا کا مقابلہ کیا ہے۔ ان کا افسر بہت جوشیلا ہے اور ہمیشہ حملہ ابتدا ہی میں کرتا ہے۔

رانی:- (کھڑے ہوکر اور فیصلہ کن لہجہ میں) پس ہم کو اپنی ترکیب فوراً سوچ لینا چاہئے۔ میں نے یہ سوچا ہے کہ شرفا کی آبادی اور اُن کے بال بچوں کو کسی طرح اذیت نہ پہونچنے پائے۔ بہت سی عورتوں کی زندگی دیوار کی مرمت میں ضائع ہوئی۔ پس جنوب میں جتنے مکانات ہیں اور جس طرف شگاف ہے سب خالی کردئے جائیں جو لوگ جنگ میں شریک نہیں ہیں وہ شمالی حصہ میں جمع ہوجاویں۔ اُسی طرف دیوان صاحب رہیں گے اور جب انگریز اُدھر آویں گے تو وہ شکست تسلیم کرلیں گے۔ ہمارے لڑنے والے سپاہی جنوب میں رہیں گے اور ہر مکان کے مکین کو پورا مقابلہ کرکے جان دیدینا چاہئے۔ اور محل آخری دم تک نہ چھوڑنا چاہئے۔ جب انگریز شہر میں جنگ وجدل کریں اُسوقت ہم آسانی سے قلعہ چھوڑ سکتے ہیں اور محافظ سپاہی اور سوار بھی قلعہ سے علحدہ ہوسکتے ہیں اُن کا یہ فرض ضرور ہے کہ کمار انند کو دشمنوں کے ہاتھ میں جانے سے بچائیں۔

جب تک کمار آزاد ہے جھانسی راج کے دوبارہ قایم کئے جانے کی اُمید باقی ہے۔ تانتیا نے مجھے پیغام بھیجا ہے کہ اگر جھانسی ہاتھ سے نکل جائے تو میں کمار انند اور جتنے آدمی ہوسکیں اُن کو لیکر فوراً اُس سے کالپی میں ملوں ہمت نہ ہارو! دوستو! سیواجی مغلوں سے اپنی زندگی بچا کر لیگیا اور آخر میں اُن پر غالب آیا۔ جھانسی انگریزوں کے ہاتھ میں چلی جائے لیکن اگر ہم اپنے اعتقاد کو مضبوط رکھیں اور ہوشیاری سے کام لیں تو جھانسی پر پھر

ہماری حکومت ہو جائے گی۔

(رانی تھوڑی دیر تک اُن کی طرف دیکھتی ہے اور گدی سے اُتر کر آتی ہے اور ہر ایک کو کھڑا کر کے اُس کو ہندو طریقہ سے سلام کرتی ہے۔ ہر ایک رانی کے سلام کا جواب دیتا ہے اور جھک کر اُس کا پیر چھوتا ہے اور پھر ہاتھ سر تک اُٹھاتا ہے۔ جب تمام اکابر رخصت ہو جاتے ہیں تو رانی واپس ہوتی ہے، اور ایک مرتبہ گھوم کر پھر سلام کرتی ہے۔ اکابر جو کمرہ میں ہیں رونا شروع کرتے ہیں اور کچھ کی سسکیاں بندھ جاتی ہیں۔ ان اکابر کے جانے کے بعد جو رہجاتے ہیں ماما صاحب ہے جو بے صبری سے رانی کی طرف جھپٹتا ہے اور سسکیاں لیتے ہوئے پیروں پر گر پڑتا ہے)۔

ماما صاحب:۔ (سسکیاں لیکر) بیٹی مجھے اس مصیبت کے لئے جو میری ذات سے تیرے سر پر آئی ہے معاف کر۔ اگر میری موت سے تیری مصیبت میں کوئی کمی ہو جائے تو میں اسی وقت مرنے کے لئے تیار ہوں۔

رانی:۔ (اپنے والد کو اُٹھا کر اور سپاہی کی طرح اُس سے چمٹ کر) والد صاحب! آپ کو اب کسی بات سے شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ جو کچھ آپ نے گزشتہ چند مہینوں میں جھانسی کی خدمت کی ہو وہی ماضی کے واقعات بھلا دینے کے لئے کافی ہے۔ آپ نے مجھے ایک معزز مرہٹہ عورت بننے کا سبق دیا ہے اور جب تک میرے جسم میں جان ہے میں آپ کی نصیحت کی عزت کروں گی۔ قسمت نے ہم کو آپ سے جدا ہونے کا سامان کر دیا ہے۔ آپ جب تک ہو سکے انگریزوں کا مقابلہ کیجئے اور میں انند کمار کو لیکر بھاگوں گی تاکہ پھر جنگ جاری کیجا سکے۔ دیوتاؤں اور دیویوں سے دعا کرتی ہوں کہ وہ لڑنے والوں کو طاقت عطا کریں جس کی کامیابی کیلئے ضرورت ہے۔

(ماما صاحب آستین باندھ کر تعظیم کرتا ہے اور سیدھے ہاتھ سے رانی کے پیر چھوتا ہے اور پھر ہاتھ پیشانی تک اُٹھاتا ہے)

ماما صاحب:۔ (سر جھکا کر) بیٹی! میں منکسرانہ طور پر کہتا ہوں کہ میں تم سی بیٹی کا باپ ہو کر بہت فخر کر سکتا ہوں۔ میں اب مر سکتا ہوں مگر مرتے دم تک مجھے اس بات کا پورا یقین رہیگا کہ خواہ تمھارا اور انند کا مستقبل کچھ ہی کیوں نہو لیکن رانی لکشمی بائی میری عزیز بیٹی کا قصہ مرہٹہ قوم کے دلوں پر ہمیشہ نقش رہیگا بلکہ ہندوستان کے بچوں اور بچیوں کی زبان پر رہیگا۔

(جھکتا ہے سلام کرتا ہے اور کمرہ سے باہر جاتا ہے۔ تھوڑے وقفہ کے بعد تارا سنگھ سامنے آتا ہے اور جھک کر رانی کے پیر سیدھے ہاتھ سے چھوتا ہے اور ہاتھ پیشانی تک اُٹھاتا ہے اور پھر کھڑا ہو کر تقریر کرتا ہے)

تارا سنگھ :- (سسکیاں چھپاکر) رانی صاحبہ! میں آپ کا مطیع اور غلام ہوں۔ میری التجا ہے کہ جو کام آپ نے میرے سپرد کیا ہے کسی دوسرے کے سپرد کر دیجئے۔ میں ماما صاحب اور فوج کے ساتھ اپنی موت کو پسند کرتا ہوں -

رانی :- (دبدبہ سے) دیوان صاحب! کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں ڈر کر بھاگ رہی ہوں۔ تم مجھ سے پوری طور پر واقف نہیں ہو۔ میں ایک باعزت موت کا موقع کھو رہی ہوں جو کہ مجھے اپنی فوج کے ساتھ جنگ کرنے میں حاصل ہے۔ میرا صرف خیال یہ ہے کہ شاید ہم کو تانتیا صاحب کی مدد مل جائے اور ہم دوبارہ لڑ کر فتحیاب ہو سکیں جو کچھ میں کر رہی ہوں مجھے پسند نہیں ہے، لیکن ایسا کرنا اپنا فرض سمجھتی ہوں۔ تم کو بھی میرے حکم کی تعمیل کرنا چاہئے ورنہ پھر تم لکشمی بائی کے نوکر نہیں ہو۔

تارا سنگھ :- (جھک کر اور سلام کر کے) شاہزادی! معاف کرو۔ میں نے سخت بیوقوفی کی۔ میں اپنے کام سے خود واقف نہیں۔ اگر انگریز مجھے زندہ رہنے دیں گے تو میرے دل میں ہمیشہ یہی ہوس رہیگی کہ وہ کونسا دن ہوگا کہ سرخ جھنڈا لہرائے اور لوگ رانی کی جے کے نعرے لگائیں۔ (یہ کہکر باہر جاتا ہے)

(تارا سنگھ جب اپنی تقریر ختم کرتا ہے توپ کے گولے کی آواز آتی ہے۔ اس آواز کے بعد پھر آواز آتی ہے۔ توپیں چلنے لگتی ہیں اور بیچ بیچ میں بندوق کی آواز آتی ہے۔ گنگا بائی بالاخانہ پر دوڑتی ہے اور راؤ آبا انند راؤ کا ہاتھ پکڑتا ہے۔ تارا سنگھ تب دربار چھوڑتا ہے اور رانی بالاخانہ کی سمت روانہ ہوتی ہے جہاں ایک سرخ جھلک دکھیتی ہے)

رانی :- (بالاخانہ کی طرف ہاتھ سے اشارہ کر کے) یہ انگریز ہی ہوں گے۔ انھوں نے پھرتی کی مگر لکشمی بائی کو گرفتار کرنا مشکل ہے۔ عزیزو جلدی کرو۔ چلو قلعہ میں اور وہاں سے گھوڑوں پر کالپی روانہ ہو جائیں۔ ہم کو دیواریں پھاندنا پڑے گا اور راستہ کاٹ کر بنانا ہوگا۔ لیکن حملہ کی گھبراہٹ میں ہم کو بھاگ جانے کا کافی موقع مل جائے گا جلدی کرو ایک لمحہ ضایع کرنے کا موقع نہیں ہے -

(گنگا بائی جو کمرہ میں واپس آئی ہے اور راؤ آبا ٹھکر گٹھری اٹھاتے ہیں۔ وہ انند راؤ کو لیکر کمرہ سے بھاگتے ہیں۔ رانی پیچھے روانہ ہوتی ہے اور دروازہ پر ٹھہر کر گھومتی ہے اور حسرت کی نگاہ کمرہ پر ڈالتی ہے گویا کہ اُس کا نقشہ صفحہ دماغ پر لے لینا چاہتی ہے۔ بالآخر سیدھی ہو کر ہاتھ جوڑ کر سر جھکاتی ہے اور ایک سسکی لیتی ہے)

منظر سوم

(کوٹہ کی سرائے کا ایک باغ۔ شہر گوالیار کے قریب ایک تخلیہ وقت غروب آفتاب تاریخ ۱۷ جون ۱۸۵۸ء)

برٹش افواج کا تانتیا ٹوپی اور رانی جھانسی سے جو دونوں تھوڑے عرصہ کے لئے گوالیار کے مالک بن گئے ہیں مقابلہ۔ مہاراجہ سندھیا نے اُس موقع پر اپنی سلطنت سے دست برداری کرلی ہے۔ رانی اپنی وردی میں ہے اور اُس کے بائیں ہاتھ میں گولی نے ایک سخت زخم کر دیا ہے اور سر پر بھی تلوار کا زخم لگا ہے۔ اُس کو باغ میں مرنے کے لئے لے گئے ہیں۔ اُس کے وفادار رفقا گنگا بائی اور راؤ آبا تیمارداری کر رہے ہیں۔ گنگا بائی بھی مردانہ وردی میں ہے اور سخت غمزدہ ہے۔ اُس کی گود میں رانی کا سر ہے۔ اُس کے زخم کو دھو رہی ہے اور تر کر رہی ہے۔ پانی باغبان نے ایک مٹی کے برتن میں لاکر دیا ہے۔ راؤ آبا ایک جانب کھڑا آنسو بہا رہا ہے۔ اُس کا بھی جنگ میں ایک بازو کٹ گیا ہے اور بہت ہی مضطرب اور پژمردہ ہو گیا ہے۔ رانی کو ایک گدے پر لٹا دیا گیا ہے اور وہ بیہوش ہے۔ تھوڑے عرصہ میں وہ حرکت کرتی ہے اور کسی قدر ہوش میں آتی ہے اور غیر مسلسل تقریر کرتی ہے)

رانی :- (آنکھ بند رکھ کر) تانتیا صاحب کیوں حملہ نہیں کرتے ہیں۔ ہم ہمیشہ انگریزوں کو ابتدا کرنے کا موقع دیتے ہیں۔ ہم کو خود حملہ کرنا چاہئے۔ (ٹھہر جاتی ہے) انند! (پھر زور سے کہتی ہے) انند! (پھر ٹھہر کر اور زور سے کہتی ہے) انند!

(رانی بیٹھ جاتی ہے اور چاروں طرف دیکھتی ہے۔ پھر تکلیف سے بیتاب ہو کر بائیں جانب ہاتھ رکھ کر آہستہ سے آہ بھرتی ہوئی گدے پر گر پڑتی ہے۔ گنگا بائی اُس کا سر نرمی سے ہاتھ پر لے لیتی ہے)

رانی :- (کراہ کر) گنگا بائی! ہم کھو گئے!۔ کھو گئے! شیوجی نے ہم کو چھوڑ دیا۔ مہاراجہ سندھیا صحیح کہتے تھے۔ ہم جب لڑتے ہیں پیچھے ہٹا دئے جاتے ہیں۔ میرا باپ جا چکا ہے۔ انند بھی گیا۔ میں بھی اب جاتی ہوں۔ اُن کی طاقت کا بھید بڑی توپوں اور اُن کی تنظیم میں ہے۔

(خاموشی طاری ہو جاتی ہے۔ راؤ آبا اور گنگا بائی کی پریشانی بڑھ جاتی ہے۔ یکایک رانی بیٹھ جاتی ہے۔ اور پوری کوشش کرتی ہے کہ دوبارہ طاقت عود کرے۔ راؤ آبا سے کچھ کہنا چاہتی ہے راؤ آبا سر جھکا لیتا ہے)

رانی :- صوبے دار صاحب! میں آخری پیغام تمھارے ہاتھ تانتیا کو بھیجتی ہوں۔ جاؤ اور اُسے ڈھونڈھ کر کہدو کہ انگریز کوٹہ کی سرائے کی طرف کمزور ہیں۔ اُنھوں نے ہم کو بے شک ہمارے آدمیوں کی بزدلی کی وجہ سے شکست دیدی ہے۔ لیکن اگر وہ ادھر حملہ کریں تو سیپری تک کے مالک ہو جاویں گے۔ اور اس طرح مغرب کی طرف سے مرہٹہ راج میں داخل ہو جائیں گے۔ لکشمی بائی کا آخری سلام کہنا اور کہنا کہ میں حکم دیتی ہوں کہ جلد حملہ کردیں۔ ورنہ دیر ہو جاویگی اور پھر کچھ نہ ہو سکیگا۔ جلد! جلد! تم اپنی وفادارانہ کارگزاریوں کے لئے دائمی نیکنامی کے مستحق ہو گے۔

(رانی تھک کر گر پڑتی ہے اور راؤ آبا زار و قطار رو کر زمین پر تعظیماً گر پڑتا ہے پھر وہ اُٹھ بیٹھتا ہے)

اور جھک کر رانی کے پیر چھوتا ہے اور ہاتھ پیشانی تک اُٹھاتا ہے۔ بالآخر اپنا سر جھکاتا ہے اور باغ سے باہر جاتا ہے۔ ذرا دیر کی خاموشی کے بعد رانی پھر کسی قدر ہوش میں آجاتی ہے)

رانی:۔ (آہستہ اور محبت کے ساتھ) انند! انند! جاؤ اور اپنی کتاب پڑھو۔ بیٹے! آج تم نے تلوار کی مشق خوب کی۔ ڈلہوزی صاحب نے جو کہا تھا اُس کو یاد رکھنا۔

(یکایک وہ بیٹھ جاتی ہے اور چلا اُٹھتی ہے۔ کمار انند کی جے۔ اور پھر گنگا بائی کی گود میں جان بحق تسلیم ہوتی ہے)

(رانی کی لاش کوٹھ سرائے کے باغ میں پڑی ہے۔ گنگا بائی اُس کے قدموں پر رو رہی ہے۔ برٹش حکام چاروں طرف خاموش کھڑے ہیں۔ جنرل روز اندر آتا ہے۔ اور یکایک لاش کے سامنے ٹھہر جاتا ہے۔ اور کچھ لمحوں تک بغور لاش کو دیکھتا ہے۔ اور سیدھا کھڑا ہوکر اپنی تلوار میان سے کھینچ لیتا ہے اور رانی کو سلام کرتا ہے۔ دوسرے افسران بھی ایسا ہی کرتے ہیں اور سپاہی اسلحہ پیش کرتے ہیں۔

تذکرہ شعر کہنے والی خواتین کا

مدت سے ایک تذکرہ شعر کہنے والی خواتین کا ترتیب دے رہی ہوں گو بہت کچھ کام ہو چکا ہے تاہم مجھے خیال ہے کہ ابھی بہت سی خواتین نے اس طرف خاطر خواہ توجہ نہیں کی ہے اس لئے سخن گو خواتین سے التماس ہے کہ جلد تر اپنے کلام بلاغت التیام سے معہ اِن حضرات کے اسماءِ گرامی کے جن سے مشورہ سخن اور اصلاح سخن فرماتی رہی ہیں اور وطن مقام پیدائش مع سن ہجری یا عیسوی تعلیم کہاں اور کس سے حاصل کی اب مشاغل کیا ہیں تمام امر کی مفصل کیفیت مرقومہ ذیل پتہ پر ارسال فرمائیں۔

کلام وغیرہ بذریعہ رجسٹری روانہ کریں تاکہ گم ہونے کا اندیشہ نہ رہے۔

طاہرہ خاتون ذریعہ سید حسنین صاحب ہیڈ ماسٹر

گورنمنٹ ہائی اسکول بالاگھاٹ (سی۔ پی)

مسئلہ خلافت

(ہرنام کے قلم سے)

مجھے یہ توقع ہرگز نہ تھی کہ میرے اُس خالص سلجھے ہوئے مضمون کے جواب میں جو "خلافت و امامت" کے عنوان سے "نگار" میں شایع ہوا تھا مضمون نگار اصحاب میری "شخصیت" کے متعلق بھی زورِ قلم ضرور صرف کریں گے۔

کوئی کچھ سمجھے۔ مجھے واقعی ہندو سمجھے اور یہ باور کرے کہ مجھے صرف بعض شیعہ احباب کی صحبت اور مطالعۂ کتب سے شیعی مذہب کے متعلق معلومات حاصل ہوئے اور میں نے محض ذوقِ تحقیق کی بنا پر کتابوں میں اُس کے بارے میں چھان بین کی اور غیر جانبدارانہ تصفیہ کی کوشش کی یا یہی خیال کرے کہ میں شیعہ ہوں۔ اس کا اصل حقیقت مسئلہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

بے شک یہ اندازہ کر کے مجھے افسوس ہوا کہ مسلمانوں میں اب ذوقِ تحقیق اتنا گم ہوگیا ہے اور نظریں سطحی پہلوؤں کے دیکھنے کی اتنی عادی ہوگئی ہیں کہ باوجود ملک کے اخباروں اور رسالوں میں میرے مضمون کے متعلق غلغلہ بلند ہوجانے کے کوئی ایک مضمون بھی ایسا شائع نہیں ہوا جس میں میرے مضمون کے تمام جزئیات پر نظر ڈال کر تحقیقی حیثیت سے اُن کے جواب دینے کی کوشش کی گئی ہوتی۔

"نگار" مارچ ۳۵ء میں میرا مضمون شائع ہوا۔ اس کے پورے چار مہینے کے بعد جولائی کے پرچہ میں میرے نادیدہ کرمفرما سید ابوسعید بزمی صاحب بھوپالی بی اے کا مضمون شائع ہوا جس کے ذیل میں حضرت مدیر نگار کا یہ نوٹ قابل لحاظ تھا کہ "ہرنام کے مضمون کا جواب متعدد حضرات نے بھیجا ہے ــــــ ان موصولہ مضامین میں ہم سب سے پہلے جناب بزمی بی اے کا مضمون شائع کرتے ہیں ــــــ اس کے بعد ہم اور مضامین بھی شائع کریں گے"

اس کے بعد قدرۃً مجھے انتظار پیدا ہونا چاہئے تھا اور یقیناً جواب الجواب کے لئے مجھے اُسوقت تک قلم اُٹھانے کا حق نہیں تھا جب تک میرے مخالف مضامین کا سلسلہ ختم نہو۔

لیکن افسوس ہے کہ اُس کے بعد نگار کے دو پرچے نکلے اور وہ بالکل اس بحث سے خالی ہیں۔ جناب نیاز کی وسیع الخیالی سے یہ یقین ہوتا ہے کہ اگر دوسرے مضامین اُن کے معیارِ ذوق کے مطابق ہوتے تو وہ ضرور شایع کرتے

بہرحال اب میرا محورِ نظر صرف جناب بزمی کا مضمون ہے اس لئے کہ نگار کے بساط بحث پر سوائے اُسکے کوئی نہیں آیا ہے۔

پہلی بات جسے محل بحث قرار دیا گیا ہے اسلام میں "تعلیم اخلاق" اور "سیاست ملکی" کا باہمی تعلق ہے۔

نجانے میری کس لفظ سے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ میں پیغمبر اسلام کی زندگی سے "سیاست ملک" کو بالکل علٰحدہ کر دینا چاہتا ہوں یا میں اسلام کو صرف ریاضت کرنے اور گوشہ میں بیٹھ کر عبادت کرنے کا ایک نظام قرار دینا چاہتا ہوں"۔

میرے الفاظ غور سے دیکھے نہیں گئے کہ "اگر رسول کی حیثیت صرف ایک بادشاہ کی سی نہ تھی بلکہ معلم روحانی ہونے کی خصوصیت بھی آپ میں پائی جاتی تھی تو ہم کو دیکھنا چاہئے کہ اس باب میں افضلیت کس کو حاصل تھی"۔

اس "صرف" اور "بھی" کے نظر انداز کر دینے سے نقاد کے قلم کو دو صفحے نذرِ تحریر کرنا پڑے۔ یورپ کے مستشرقین خانۂ شہادت میں الگ بُلا لئے گئے۔ جزیہ۔ ذمی۔ حربی۔ جہاد حد زنا و سرقہ وغیرہ کے ہدایات قرآنی کی دستاویزیں الگ پیش کر دی گئیں اور اخلاق و سیاست کے باہمی ارتباط کی عقلی بحث الگ چھیڑ دی گئی۔

جہاں تک میں سمجھتا ہوں شیعہ اصحاب بھی ان دونوں چیزوں کو الگ الگ نہیں سمجھتے ہیں یعنے امامت کے حقوق کو صرف تعلیم اخلاق اور روحانی تربیت میں منحصر نہیں سمجھتے بلکہ سلطنت کو اُس کا لازمی جزو سمجھتے ہیں ورنہ اُنھیں خلفائے بنی اُمیہ و بنی عباس وغیرہ سے یہ شکایت کیوں پیدا ہوتی کہ اُنھوں نے صاحبان حقوق کے حق پر ناجایز قبضہ کر لیا۔ کیونکہ وہ چیز جس پر قبضہ کیا گیا سلطنت تھی۔ رہ گئی تعلیم روحانی اور ہدایت باطنی وہ کسی کے غصب کرنے کی چیز نہیں اور نہ اُس پر کوئی ناجایز قبضہ کر سکتا ہے۔

لیکن اس کے ساتھ پھر بھی جہاں تک میں نے تاریخ اسلامی اور فلسفۂ احکام اسلام کا مطالعہ کیا ہے میں اپنے ان الفاظ کا اعادہ کروں گا کہ "آنحضرت کی حیثیت ایک دنیاوی بادشاہ کی سی نہ تھی۔ آپ کا نصب العین کسی سلطنت کی بنیاد رکھنا نہیں تھا بلکہ ایک قوم بنا رہے تھے جو انسانیت و اخلاق کے جوہر سے آراستہ ہو۔ بظاہر یہی الفاظ شش و پنج میں ڈالنے والے ہیں تو سنئیے۔

"دُنیاوی بادشاہت" میں اسے سمجھتا ہوں کہ جس کا مقصد اصلی صرف مادی اقتدار کا بڑھانا۔ آس پاس کے ممالک پر فوج کشی کرنا اور حدود مملکت کا وسیع کرنا کمزور اقوام کو مغلوب کرنا اور اپنی طاقت کا سکہ بٹھانا۔ مال و دولت سے سرکاری خزانہ کو بھرنا اور سرمایہ میں اضافہ کرنا ہوتا ہے۔

اس بادشاہت کی پوری کامیابی کا معیار صرف سطوت و اقتدار کی زیادتی توسیع حدود سلطنت اور جاہ و حشمت کی فراوانی میں منحصر ہوتا ہے۔ جہاں نہ حق اور نہ ناحق کا سوال ہے۔ نہ عدل و انصاف کی شرط ہے۔ نہ اخلاق و آداب کی کوئی مراعات ہے۔

اس کا معیار تفوق صرف جہانگیری و جہاں بانی ہے اور کچھ نہیں۔

اس کے برخلاف "روحانی حکومت" جس کے نظام و قانون کو میں "سیاست الٰہی" کا مصداق سمجھتا ہوں وہ ہے جس میں ضروریات اجتماعی۔ لوازم تمدنی۔ انتظامات ملی سب بلندی اخلاق اور صحیح انسانیت کے سایہ میں انجام پائیں۔ وہاں اصل مقصد توسیع حدود مملکت کا نہ ہو بلکہ قوم بنائی جا رہی ہو انسانیت و اخلاق کے جوہر سے آراستہ۔ بے شک قوم کی تشکیل بغیر "توانین اجتماعی" کے ہوتی ہی نہیں اور اُنھیں توانین اجتماعی کا نام "نظام سیاسی" ہے۔ لیکن یہ "سیاست" اُس سیاست سے بالکل مختلف ہوتی ہے جو سلاطین دنیا کے پیش نظر ہوتی ہے۔ یہ سیاست وہ ہے جو کسی طرح تربیت اخلاقی سے علحدہ جا ہی نہیں سکتی اور بالکل لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتی ہے۔

یہ شیعہ اصحاب کی تنگ نظری سمجھئے یا بارگاہ رسالت میں حد سے زیادہ خوش اعتقادی یا جو کچھ کہ اُن کے خیال میں حضرت پیغمبر جس طرح اپنے زمانہ کے خود بہترین مصلح انفرادی و اجتماعی تھے اپنے مخصوصین میں وہی یہ سمجھ سکتے تھے کہ اُس روح اسلامی کی حفاظت کے ساتھ جو اُس کا اصلی طرۂ امتیاز ہے تمدنی و اجتماعی انتظامات کو کون درست کر سکتا ہے۔

اُنھیں دُنیا کے اس عام اُصول میں کچھ تردد نہیں ہے کہ جو شخص کسی عہدہ کو بغیر کسی قباحت کے انجام دے اُسے اس عہدہ کا اہل سمجھا جاتا ہے لیکن اُن کا خیال یہ ہے کہ دنیا نے اُس عہدہ کے سمجھنے میں غلطی کی اس لئے انجام دینے نہ دینے کی حقیقت میں بھی دھوکا ہوا۔

اُن کا مستقل خیال یہ ہے کہ پیغمبر اسلام کے بعد جتنی بھی حکومتیں قائم ہوئیں اُن میں توسیع ملک۔ فتوحات۔ جاہ و حشمت کی فراوانی اور خزانہ و سرمایہ ملکی میں ترقی جتنی بھی ہوئی ہو لیکن اسلامی تعلیمات کی روح فنا ہو گئی اور

وہ باقی نہیں رہی۔

یعنے پیغمبری کی سنت کے بجائے کسروی وقیصری سنتیں قائم ہوگئیں اور اس لئے وہ ہرگز ہرگز ان حکومتوں کے دور کو کامیاب ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

حضرت علی کے مختصر دور حکومت کے ظاہری حیثیت سے ناکامیاب رہنے کا پورا سبب یہ قرار دیتے ہیں کہ آپ بالکل اُسی سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے جو آنحضرت کی تعلیمات سے بالکل متحد تھا اور اس لئے آپ اجتماعات ملکی وتمدنی میں کلیتہً اُسی نظام کو بروئے کار لانا چاہتے تھے جو حضرت پیغمبر کا اصلی منشا تھا مگر امت اسلامیہ کے عام افراد کی پچیس[25] برس کی طولانی مدت میں بالکل عادتیں خصلتیں تبدیل ہوچکی تھیں۔ آپ کے دور کی پوری کامیابی اُسی وقت کھل سکتی تھی جب آپ کی حکومت حضرت رسول اکرم کے بعد بلا فاصلہ تسلیم کرلی جاتی اور آپ برسر اقتدار ہوجاتے۔

پھر بھی اس حیثیت سے آپ کا دور انتہائی کامیاب ہے کہ اتنی مختصر مدت میں بھی آپ نے دنیا کے سامنے یہ نمونہ پیش کردیا کہ دنیاوی سلطنت والے بادشاہوں اور روحانی حکومت کے تاجداروں میں کیا فرق ہے اور "سیاست ملوکیہ" و "سیاست نبویہ" میں کتنا تفرقہ ہے۔

یہ کہنا کہ "حضرت علی ایک متقی، زاہد اور فداکار صحابی ہونے کے علاوہ نبی کریم کے چچیرے بھائی تھے۔ ابتدا سے آپ کے رفیق ومعاون رہے۔ بعد میں داماد بھی ہوچکے تھے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ نبی کریم نے مختلف اوقات میں مختلف حالات سے متاثر ہوکر آپ کے اوصاف بیان فرمائے ہیں"۔

اس کے متعلق یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جو چند صفتیں حضرت علی کی شمار کرائی گئی ہیں ان میں سے "متقی" اور "زاہد" اور "فداکار" اور "صحابی" اور "رفیق ومعاون" کی صفتوں میں تو جمہور اسلام دوسرے صحابہ کو حضرت علی کا ہم پلہ یا آپ سے چند قدم آگے قرار دے ہوئے ہے۔ پھر اب رہ گیا جاتا ہے۔ چچیرا بھائی اور داماد ہونا۔ چچیرے بھائی ہونے کی صفت میں بھی عقیل اور جعفر شریک تھے اور داماد ہونے میں بقول مورخین اہلسنت حضرت عثمان حصہ دار تھے۔ پھر آخر مختلف اوقات میں مختلف حالات سے متاثر ہوکر حضرت علی ہی کے متعلق آنحضرت نے اُن اوصاف کا کیوں تذکرہ کیا۔ دوسرے صحابہ کے متعلق اُس طرح کے اوصاف کیوں ذکر نہیں فرمائے۔

اس کے علاوہ کیا پیغمبر اسلام صرف جذباتی انسان تھے کہ فقط اپنے چچیرے، بھائی اور داماد ہونے کی

وجہ سے وہ تعریفیں کرنا شروع کردیں - حالانکہ دوسرے صحابہ اُن اوصاف میں اُن سے بدرجہا بڑھے ہوئے ہوں۔
اگر حضرت ابوبکر اور حضرت عمر بلا کسی دینوی نفع کے اور بلا کسی رشتۂ قرابت وعزیزداری کے صرف اس لئے رسول پر جان دیتے ہیں کہ وہ خدا کی طرف سے بھیجا ہوا ایک سچا راہنما ہے اور اپنی اس صداقت کے ثبوت میں اپنی حیات کے آخری سکون تک عشق رسول کا دم بھرتے رہتے ہیں - اپنی نوجوان لخت جگر صاحبزادیوں کو اُس کے حبالۂ ازدواج میں دیدیتے ہیں - (بقول بزمی صاحب) اُس کے ایک ایک اشارہ پر کٹھ پتلیوں کی طرح ناچتے ہیں۔ اُس کے حکم کے سامنے اپنی ساری دھن دولت لٹا دیتے ہیں - غرضکہ وہ سب کچھ کرتے ہیں جو ایک جانفروش کو کرنا چاہئے لیکن اس کے باوجود بھی جب موقع پڑتا ہے تو رسول علی کے اوصاف میں رطب اللسان نظر آتے ہیں اور ان حضرات کے لئے ویسے اوصاف اور اُتنی کثرت سے کبھی بیان نہیں کرتے صرف اس لئے کہ یہ اُن کے مقابلہ میں رسول کا بھائی اور داماد ہے ___ تو پھر اس کا نام "متعصبانہ اعزہ پرستی" (Favouritism) نہیں تو اور کیا ہے ؟ اور اگر اس کو بدترین قسم کی "بیرحمانہ جانبداری" اور "غیر منصفانہ پاسداری" نہیں کہہ سکتے تو اور کیا کہیں گے؟ لیکن تاریخ اسلامی کا ہر اسٹوڈنٹ جانتا ہے کہ نبی کریم کی ذات گرامی اس قسم کی تنگ نظریوں سے بہت بلند ہے۔

میری جانب سے اس سوال کا جواب بہت آسان ہے -
میں کہتا ہوں کہ نبی کریم قدم قدم پر اشارۃً اور تصریحاً حضرت علی کو اپنا قایم مقام بنانے کی رہبری کرتے رہے۔ لیکن مسلمانوں کو اپنے پیغمبر کے ساتھ کیا اتنا بھی حسن ظن نہ رکھنا چاہئے کہ آپ کا یہ فعل کسی عزیزداری کے لحاظ اور بیجا پاسداری پر مبنی نہیں ہے بلکہ حقیقتاً اس ذات میں کمالات وخصوصیات ایسے موجود ہیں جو پیغمبر اسلام کو آپ کی تعریف وتوصیف پر آمادہ کرتے ہیں اور آپ کو اپنا قایم مقام بنانے کی دعوت دیتے ہیں -
اگر ایمان بالنبی جو اسلام کا جزو اعظم ہے مسلمان ضروری سمجھیں تو اس کہنے میں کوئی قباحت نہیں ہے بلکہ ایسا ہی سمجھنا ضروری ہے -
یہ سوال کم ازکم میرے سامنے عجیب وغریب ہے کہ "اگر فی الواقع نبی کریم حضرت علی کو اپنا خلیفہ بنانے پر مامور ہوچکے تھے تو پھر آپ نے علیٰ رؤس الاشہاد اس کا اعلان کیوں نہیں کیا۔
اس صورت میں یہ سوال کرنے کے آخر معنی کیا ہیں -

یہ اسلام کا اتنا اہم داخلی مسئلہ - اُس کے حل کے لئے مستشرقین یورپ کے دامن سے تمسک - میری سمجھ میں تو نہیں آتا - کیا مستشرقین یورپ تعلیمات اسلام کی روح کو سمجھ گئے ہیں ؟ تو پھر کیا حضرت پیغمبر کی ذلت پر جو بہت اعتراضات اُن کی طرف سے وارد ہوتے رہتے ہیں اُنھیں صحیح تسلیم کیا جائے !

میرے تمام مضمون کو چھوڑ کر جس میں احادیث بالکل پیش ہی نہیں کئے گئے ہیں بلکہ صرف تاریخی واقعات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ جناب بزمی صاحب نے مویدین امامت کی ایک دلیل پیش فرمائی ہے۔ "انا مدینۃ العلم وعلی بابہا" اس کے مقابلہ میں آپ نے چند حدیثیں حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کے فضائل میں ذکر کی ہیں۔ مجھے میرے سنی احباب معاف فرمائیں گے۔ آپ حضرات کی بحث کا بھی انداز ایک غیر جانبدار کو آپ کی استدلالی قوت سے بدگمان بنا دیتا ہے۔ ہم ہمیشہ یہ دیکھتے ہیں کہ ایک شیعہ اپنے مطلب کی جتنی باتیں پیش کرتا ہے نام لے لے کر صفحہ سطر کا حوالہ دے دیکر آپ کی کتابوں سے۔ آپ اُس کے جواب میں یہ کہدیتے ہیں کہ ہماری بس ایک صحیح بخاری ہے اور کچھ نہیں۔ (دیکھو وہ مضمون جو ہمارے جواب میں رسالہ "فاران" بجنور میں نکلا ہے) اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ صحیح بخاری کے علاوہ جتنی تفسیر۔ حدیث۔ علم رجال و سیر کی کتابیں ہیں وہ سب دریا برد کر دینے کے قابل ہیں۔ حالانکہ صحیح بخاری میں بھی شیعوں کے مطلب کی روایتیں مل ہی جاتی ہیں۔

لیکن آپ جب شیعوں کے مقابلہ میں حدیثیں پیش کرنے پر آتے ہیں تو وہی اپنی کتابوں سے یعنی صحیح بخاری اور دوسرے صحاح سے۔ اب بتائیے شیعہ اُن حدیثوں کو کیوں تسلیم کریں گے اور ایک غیر جانبدار پر اُن روایتوں کا کیا اثر پڑے گا؟

خدا بخش کی لائبریری کے قرآن کو جہاں تک مجھے معلوم ہے شیعہ بھی تسلیم نہیں کرتے۔ پھر اُس کے تذکرہ سے نتیجہ کیا؟ "ثانی اثنین اذ ہما فی الغار" کی آیت کے متعلق ہمارے مضمون میں کافی تبصرہ موجود ہے۔ اب آپ بغیر اُس پر کچھ نقد و تبصرہ فرمائے ہوئے یہ کہدیں کہ "یہ آیت غیر مشتبہ طور پر حضرت ابوبکر کی منقبت کو ظاہر کرتی ہے" تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اُسے کس طرح وقعت دی جائے؟

"سبقت اسلام" کے متعلق حضرت علی کی فضیلت کو سبک کرنے کے لئے جو خامہ فرسائی فرمائی گئی ہے وہاں "کاوش فکری" کے ساتھ "ژولیدگی خیال" کا اثر نمایاں ہے۔

"نوجوانی میں انسانی دماغ غیر پختہ ہوتا ہے" مگر انسان میں ذوق تحقیق ہوتا ہے اور قوت خیال وساوس واوہام زیادہ پیدا کرتی ہے اس لئے ان تمام شکوک واوہام کے مقابلہ میں کسی حقیقت پر سر تسلیم خم کر دینا کچھ کم قابل قدر نہیں ہے۔ "بچیرے بھائی" اور قریب کے عزیز دوسرے بھی موجود تھے لیکن اُنھیں وہ سبقت کا شرف حاصل نہیں ہوا۔ بہرحال سبقت ایک شرف ہے جو "السابقون السابقون اولئک المقربون" میں معیار تقرب قرار دیا گیا ہے۔ اُس میں عزیز اور غیر عزیز۔ نوعمر اور پختہ کار کی کوئی تفریق نہیں کی ہے لیکن ہمارا مضمون دیکھ لیا جائے۔ ہم نے اسکو

کوئی مستقل دلیل خلافت نہیں قرار دیا ہے۔ آخر ہمارے مضمون کے سلسلۂ دلائل کو مرتب صورت سے سامنے رکھکر اُس پر تبصرہ کیوں نہیں کیا گیا!

کہا جا رہا ہے کہ "ابتدائے اسلام میں ایک مرتبہ نبی کریم نے اپنے اعزا کے سامنے اسلام کو پیش کرتے ہوئے حضرت علی کے متعلق کہا تھا " ان ہٰذا اخی و وصیّی و خلیفتی فیکم" لیکن اس سے خلافت علی پر استدلال کیا جانا کسی صورت سے صحیح نہیں ہو سکتا۔ اس وقت رسول کریم کی پوزیشن ایک بے یار و مددگار "لیڈر" سے زیادہ نہ تھی۔ اور اس لئے ان جملوں سے اس موقع کے لحاظ سے جو کچھ مراد لی جا سکتی ہو۔ وہ اس سے زیادہ نہ ہونا چاہئے کہ حضرت علی کی حوصلہ افزائی کے ساتھ ساتھ اُن کو اُس حالت میں نبی کریم کا واحد معتمد علیہ قرار دیا گیا ہے"۔

یہ الفاظ جنھیں پورا نقل کر دیا گیا ہے مجھے بہت افسوس ہے کہ ایک مسلمان کے قلم سے دیکھ رہا ہوں۔ کیا نبی کریم مسلمانوں کی نگاہ میں مکّار لوگوں کی طرح دنیا دار، حیلہ باز۔ خود غرض۔ اور ابن الوقت تھے؟ اُنھوں نے بے یار و مددگار ہونے کی وجہ سے وقتی طور پر حضرت علی کی حوصلہ افزائی کے لئے کہدیا کہ یہ میرے وصی ہیں۔ یہ میرے خلیفہ و جانشین ہیں۔ اس طرح کام نکال لیا اور ان جملوں کے معنی کچھ بھی نہیں تھے؟

میں تو سمجھ سکتا ہوں کہ حضرت محمد مصطفےٰ کی سچائی۔ امانت اور دیانت اور بے لوث اخلاق قولی و عملی کو جاننے والا کوئی غیر مسلم بھی آپ کی نسبت اس خیال کی تصدیق نہیں کر سکتا۔

اس جگہ حضرت علی کی امامت و خلافت کے تذکرہ میں بالکل بے جوڑ طریقہ سے یہ کہدیا گیا ہے کہ جو شخص حضرت علی کو صحیح تسلیم کریگا تو حضرت حسن کو بھی مانیگا لیکن آپ نے حضرت علی کے قاتل ابن ملجم سے جس طرح انتقام لیا ہے اُس کو دیکھکر اُن کی اخلاقی فضیلت کا معیار کیا قایم رہتا ہے۔

اس کے جواب میں پہلے تو میں یہ کہوں گا کہ ایک غیر جانبدار شخص کے سامنے حضرت علی کی خلافت کی بحث میں امام حسن کی امامت کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ بہت ممکن ہے وہ تحقیق کی بنا پر حضرت علی کی امامت کو تسلیم کرے اور حضرت حسن کو تسلیم نہ کرے۔ اس کے علاوہ جو واقعہ حضرت حسن کی نسبت پیش کیا جا رہا ہے اُس کو شیعہ فریق فرقۂ خوارج کی اختراع قرار دیتا ہے۔ لہٰذا قابل تسلیم نہیں ہے۔ پھر اسکے مقابلہ میں وہ متفقہ تاریخ کا واقعہ پیش کرتے ہیں کہ حضرت ابوبکر نے فجاءِ سلمی کو زندہ آگ ڈالکر جلوا دیا۔ اس کے متعلق سوال پیدا ہوگا کہ اخلاقی معیار فضیلت کی بنا پر یہ فعل صحیح سمجھا جائے گا یا نہیں۔

مجھے بھی اب زیادہ تفصیلی بحث نہیں کرنا ہے۔ میرا گزشتہ مضمون درحقیقت ابھی تک بالکل کورا ہے اور

اُس تک دست نقد و اعتراض نہیں پہونچا ہے۔

شیعیت کے ایرانی سایۂ تربیت میں ایجاد ہونے کے فرضی افسانے بنانے سے حقیقت بدل نہیں جائے گی۔ اصل مسئلہ پر گفتگو ان چیزوں سے بالکل علحدہ ہے۔

سب سے آخر میں مجھے اس فقرہ پر ریمارک کرنا ہے کہ "خلافت و امامت کا مسئلہ نہ تو کوئی ایسا مسئلہ ہے جو آج درخور اعتنا، کہا جا سکے اور نہ "شیعیت" اسلام کا کوئی مذہبی فرقہ۔ خلافت کو اہمیت ہے یا نہیں اسکو تو مسلمان ہی سمجھ سکتے ہیں۔ میرے خیال میں تو اس بحث کی اہمیت مسلمانوں کی عملی اخلاقی و تعلیمی زندگی کے اعتبار سے سمجھی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے احکام و تعلیمات مذہبی میں کن پیشوایان دین کو اپنا راہنما قرار دیں اور اُن کے تعلیمات پر عمل کریں۔ اسی طرح یہ فقرہ کہ "نہ شیعیت اسلام کا کوئی مذہبی فرقہ"۔

اس کا جواب شیعہ ہی دے سکتے ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں میں افتراق اسی قسم کی تعبیری بد اعتدالیوں کی وجہ سے ہے۔ آپ کہئے گا "شیعیت اسلام کا کوئی مذہبی فرقہ نہیں" شیعہ کہیں گے "سنیت اسلام کا مذہبی فرقہ نہیں"۔۔۔ نتیجہ اس کا انتشار ہے اور کچھ نہیں۔ یہ کبھی ہو جائے کہ سنی سب شیعہ بن جائیں یا شیعہ سب سُنی غیر ممکن۔۔۔ لیکن اتحاد و اتفاق کی صورت یہ ہے کہ آپ اُن کی مذہبی حیثیت کو تسلیم کیجئے اور اُن کا احترام کیجئے۔ وہ آپ کی مذہبی حیثیت کو تسلیم کریں اور احترام کریں چلئے اس طرح یہ شیرازہ مجتمع رہیگا اور ملت اسلامیہ کا نظام درہم و برہم نہ ہوگا۔۔۔ خدا جانتا ہے مسلمانوں کا خیر خواہ ہوں اس لئے اتنا لکھ ہی دیا نہیں تو مجھ سے کیا مطلب فقط

ہرنام

(نگار) "ہرنام" کے مضمون "مسئلہ خلافت" پر ملک کے اخبارات و رسایل میں جو کچھ لکھا گیا اس کا مجھے تفصیلی علم نہیں ہیں تو صرف اسقدر جانتا ہوں کہ اس کے جواب میں اہل سنت کی طرف سے جو مضامین مجھے موصول ہوئے، ان میں صرف ایک بزمی صاحب کا مقالہ ایسا تھا جو اشاعت کے قابل سمجھا گیا۔ (درانحالیکہ ہرنام کے مضمون کا وہ بھی کوئی معقول جواب نہ تھا) باقی اتنے پست تھے کہ نگار میں ان کی اشاعت کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہو سکتا تھا۔ اس دوران میں زبانی و تحریری دونوں طرح مجھ پر تقاضہ کیا گیا کہ میں اپنی رائے اس مسئلہ پر ظاہر کروں، لیکن میں نے اس وقت تک اس لئے اس مطالبہ کو پورا نہیں کیا کہ جب شیعہ و سنی دونوں حضرات اپنی اپنی کہہ لیں تو یہ "کافر" اپنی رائے پیش کرے۔

پھر اب کہ اس انتظار میں کافی زمانہ گزر گیا ہے اور ہرنام صاحب کا دوسرا مضمون بھی بزمی صاحب کے جواب میں موصول ہو چکا ہے، کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ مزید سوال و جواب کے لئے اس بحث کو جاری رکھا جائے، جبکہ اس موضوع پر حقیقتاً نہ سُنّی اپنے عقاید سے ہٹ کر فیصلہ کرنے کی اہلیت رکھتا ہے اور نہ شیعہ اپنے "حُبّ علیؑ" کے جذبہ کے ماتحت "بغض معاویہ" سے باز آسکتا ہے۔

جس اختلاف کی بنیاد خود رسول اللہ کے زمانہ میں پڑ چکی ہو، اس پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے والے اب تیرہ صدی سے زیادہ طویل زمانہ گزرنے کے بعد کہاں میسر آسکتے ہیں جبکہ وضع احادیث کی ٹکسال نے اس گتھی کو بجائے سلجھانے کے ہمیشہ اُلجھانے ہی کی کوشش کی۔

جیسا کہ میں اس سے قبل کی اشاعت میں عرض کر چکا ہوں اس امر کا فیصلہ نہ احادیث سے ممکن ہے اور نہ اُن تاریخی روایات سے جن کی بنیاد ہی حدیث پر قایم ہے، کیونکہ دونوں فریق میں سے ہر ایک دوسرے کی پیش کردہ روایات کو غلط قرار دیتا ہے، اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں فیصلہ وہی کر سکتا ہے جو دونوں فریق کی روایات کو غلط قرار دیکر یا دونوں کو صحیح سمجھ کر اپنی تحقیق و جستجو کی بنیاد ہی بالکل نئے اصول پر قایم کرے ــــ یہی میرا مدعا ہے اور یہی چارو ناچار مجھے کرنا ہے۔

ہرنام کا مضمون شایع کرنے کے بعد میرے متعلق جو رائیں لوگوں نے قائم کیں وہ خلاف توقع نہ تھیں، اہل سنت نے سمجھا کہ میں مصلحتاً شیعہ بننا چاہتا ہوں، حضرات شیعہ نے خیال کیا کہ یہ بدنصیب شیعہ کیا بن سکتا ہے۔ لیکن یہ کسی نے نہ سوچا کہ وہ شخص جو اب سرے سے مذہب کی ضرورت ہی کو مشتبہ نگاہوں سے دیکھ رہا ہے، شیعہ و سُنّی کے ان لغو مباحث کو کیا اہمیت دے سکتا ہے اور احادیث پر قائم کئے ہوئے ناکارہ دلایل پر وہ تشیع یا تسنن دونوں میں سے کسی ایک کو کیوں ترجیح دینے لگا۔

بہرحال قبل اس کے کہ میں اس موضوع پر قلم اُٹھاؤں، ناظرین نگار کو یقین دلا دینا چاہتا ہوں کہ میرا مسلک سنی و شیعہ کے تفرقہ سے بہت بلند ہے اور میں جو کچھ لکھوں گا وہ بالکل میری اپنی ذاتی رائے ہوگی، سنیوں کی روایات سے علٰحدہ، شیعوں کے دلایل سے بالکل جُدا ــ ایک ایسے شخص کی حیثیت سے جو نہ سنی ہے نہ شیعہ، نہ ہندو ہے نہ مسلمان، بلکہ ایک انسان ہے اور انسانیت ہی کی تمام خصوصیات کو سامنے رکھ کر اس مسئلہ پر گفتگو کرنا پسند کرتا ہے۔

ہر چند مجھے معلوم ہے کہ جو کچھ میں لکھوں گا وہ اہل سنت اور اہل تشیع دونوں کے لئے باعث برہمی ہوگا، لیکن مجھے یہ برہمی گوارا ہے اور تسنن و تشیع دونوں میں سے کسی ایک کی طرف منسوب کئے جانے کی ذلت مجھے منظور نہیں۔

جی چاہتا تھا کہ اسی مہینے میں سرنام صاحب کے مضمون کے ساتھ ہی اپنی رائے بھی ظاہر کر دیتا لیکن چونکہ ایک طویل سفر درپیش ہونے کی وجہ سے اور بہت سے کاموں کا ہجوم ہے، اس لئے میں اپنی مفصل رائے ماہ آیندہ تک ملتوی کرتا ہوں۔

اس دوران میں برہمن واڑی حیدرآباد سے ایک اور ہندو (برنام) کا مضمون موصول ہوا تھا جس میں انھوں نے مسئلۂ خلافت و امامت پر اپنے بعض شبہات پیش کر کے مجھ سے ان کا جواب چاہا تھا۔ لیکن چونکہ ان کا جواب دینا اپنی رائے کو ظاہر کر دینا تھا اس لئے میں نے اسکی اشاعت ملتوی رکھی تھی، اب میں اسی سلسلہ میں ان کو بھی لیلوں گا۔ امید ہے کہ برنام صاحب اس تعویق کو معاف فرمائیں گے۔

اگر بزمی صاحب یا کوئی اور ابھی کچھ کہنا چاہتے ہیں تو وقت باقی ہے۔ میں ایک ماہ کی مُہلت اور دینے کے لئے طیار ہوں، لیکن یہ خیال رہے کہ جو کچھ لکھا جائے وہ یا تو ہر نام کے اعتراضات کا کوئی مُسکت جواب ہو، یا پھر مذہبی عقاید سے بالکل ہٹ کر ایسا جواب دیا جائے جو شیعہ و سُنّی دونوں کو مطمئن کر دینے والا ہو یا یا یوس۔

حکم قرار دئے جانے دیوالیہ

(دفعہ ۲۷۔ ایکٹ ۵ ۱۹۲۰ء)

بعدالت جناب مولوی احمد کریم صاحب بارایٹ لا جج خفیفہ لکھنؤ

درخواست دیوالیہ نمبر ۲۷ ۱۹۳۵ء

بمقدمہ قرار دئے جانے دیوالیہ مسمیان

۱۔ موتی ولد دنی
۲۔ مساۃ لچھمن زوجہ موتی
} اقوام مہتر ساکنان گڈھیا چار باغ لکھنؤ

موتی و مساۃ لچھمن کی درخواست دیوالیہ مورخہ ۲۵ مئی ۱۹۳۵ء کو پڑھنے اور فریقین کے بیانات کو سُننے کے بعد یہ حکم دیا جاتا ہے کہ مدیونان مذکور دیوالیہ قرار دئے گئے اور وقت ۶ ماہ کے اندر اپنی درخواست بریت گزرانیں۔ المرقوم ۲۰ ستمبر ۱۹۳۵ء

بحکم عدالت
بشمبر دیال منصرم
عدالت جج خفیفہ لکھنؤ

انتقام

مترجم تسعیم یم - اے

کرشن دیال نہ اس زمانہ کی پیداوار نہیں کہا جا سکتا تھا، اُس نے اپنے بچپن کا زمانہ اپنے والدین کے ساتھ گاؤں میں گزارا جو اپنے خیالات اور عمل کے لحاظ سے بیحد قدامت پسند واقع ہوئے تھے، اس نے ابتدائی تعلیم گاؤں کے پاٹ شالہ میں حاصل کی، اور انگریزی اُسوقت تک شروع نہ کر سکا جب تک وہ تیرہ برس کا نہو گیا، وہ گھر میں عورتوں کے ساتھ مویشیوں کا سا برتاؤ ہوتے ہوئے دیکھنے کا عادی تھا، اس لئے ہر شخص کو حیرت تھی کہ وہ کس طرح جدید خیالات کو اپنے ذہن میں جگہ دینے کے لئے آمادہ ہو گیا۔

وہ ایک برہمن پنڈت کا لڑکا تھا، یہ ممکن تھا کہ وہ اپنے گاؤں ہی میں رہ کر گزر کر لیتا، لیکن وہ ایک معمولی وظیفہ کی مدد پر کلکتہ انگریزی پڑھنے کے لئے چلا آیا، وہ برہمن ہی نہیں بلکہ کلن برہمن تھا۔ وہ ایک درجن شادیاں کر سکتا تھا، اور اس سے جو کچھ روپیہ ملتا، اس پر اپنی زندگی گزار سکتا تھا لیکن اس نے صرف ایک شادی کی، جب رادھارانی اس کی شریک حیات ہوگئی، تب اس نے اپنا گاؤں چھوڑ دینے اور کلکتہ میں مستقل قیام کا ارادہ کر لیا۔ اس کے باپ نے احتجاجاً اس کی امداد بند کر دی، اور خط و کتابت کا سلسلہ بھی ترک کر دیا، لیکن جب بیٹا ذرا بھی نادم نہ ہوا تو باپ کو بیحد خفت ہوئی۔ کرشن دیال ہوشیار طالب علم تھا، اس نے ہمیشہ وظائف اور ٹیوشن حاصل کئے اور اس طرح کبھی روپیہ کی زیادہ تکلیف نہ اُٹھائی، اُس کی اور اس کی بیوی کی زندگی بہرحال گزر رہی تھی۔ جب اس نے ایم۔ اے پاس کیا اور نوکری ملی، اسی سال اس کے پہلوٹی کی ایک لڑکی راجندر رانی پیدا ہوئی۔

کرشن دیال خوشی سے دیوانہ ہو گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اُس میں دُنیا وی دانائی نہیں تھی، لیکن اس کی بیوی رادھارانی نے اپنے شوہر کی معیت و قربت سے اپنی یہ خصوصیت زیادہ ضائع نہیں کی تھی، اس نے ایک دن منھ بنا کر کہا:۔ "کیا بیوقوفی ہے، ایک لڑکی اور وہ بھی ایک کلن لڑکی، اس پر اس قدر ناز کرنے سے فایدہ؟ بیکار ایک ہنگامہ برپا کر رکھا ہے ـــ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ عمر بیٹھی رہیگی۔ آج کل ایک معقول بر ڈھونڈھنا بہت مشکل ہے، بہت سے لوگ تھوڑی رقم کی وجہ سے اپنی لڑکیاں نیچ گھرانوں میں بیاہ دیتے ہیں۔

"کیا بُرائی ہے" کرشن دیال نے کہا "ہمیں اس وقت رنج ہوتا ہے جب لڑکیاں پیدا ہوتی ہیں اس لئے کہ وہ پرائے گھر کی ہوتی ہیں۔ اس سے تو لڑکیاں اگر اپنے والدین کے ہی یہاں رہیں تو اچھا ہے"

رادھا رانی کا شاداب چہرہ غیر معمولی طور پر سنجیدہ ہو گیا۔ اس نے کہا:۔ تم ایک بچے کے باپ ہو چکے ہو اور تم اب بھی بچوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ تمھیں کب عقل آئے گی؟

کرشن دیال نے ہنسی میں بات ڈال کر گفتگو ختم کر دی۔ لیکن اُسے دل ہی دل میں یہ سوچ ضرور پیدا ہو گیا کہ کہیں اس کی لڑکی، بیوی اور اس کے درمیان، نزاع کا باعث نہ ہو جائے۔

راجندر رانی بڑی ہوتی گئی اور والدین کی محبت میں بگڑتی بھی گئی، اس کے دو چھوٹے بھائی اور پیدا ہوئے اور اس طرح رادھا رانی کی تمنائیں بہت کچھ پوری ہو گئیں لیکن اسے یہ شکایت بدستور رہی کہ راجندر رانی کو اسکے باپ نے بالکل بگاڑ دیا ہے۔ وہ اکثر شوہر سے کہتی:۔ "تم نے لڑکی کا بالکل چوچلوں میں ناس کر دیا بتاؤ اس کا کیا حشر ہوگا۔ لڑکیوں کو بہت مُنھ نہیں لگانا چاہیئے بلکہ انھیں نظر انداز کر دینا بہتر ہے۔ اس طرح اگر انھیں آیندہ مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا تو وہ آسانی سے بھگت لیں گی۔"

تو تمھاری منطق کے بموجب اُنھیں فاقے کرانا چاہئیں، اس اندیشہ سے کہ شاید اُنھیں آیندہ آسودگی سے کھانے کو نہ ملے"

رادھا رانی کے الفاظ پر زور تھے لیکن اس کے دلائل میں زور نہ تھا، اس لئے وہ کچھ دیر کے بعد اپنے شوہر کو "الفاظ کا بادشاہ" اور "باتیں ملانے والا" کہکر خاموش ہو جاتی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ کرشن دیال نے تھوڑا سا اپنی لڑکی کو بگاڑ ضرور دیا تھا لیکن وہ اس کی تعلیم کی طرف سے بے خبر نہ تھا۔ وہ اُسے خود بھی پڑھاتا اور ایک علحدہ اُستانی بھی اُس نے سینا پرونا اور گانا سکھانے کے لئے مقرر کر دی تھی، چند روشن خیال برہمو خاندانوں کو چھوڑ کر اس زمانہ میں کسی لڑکی کو یہ باتیں نہیں سکھائی جاتی تھیں اسی لئے کرشن دیال کے لئے یہ مشہور ہو گیا کہ وہ بالکل عیسائی ہو گیا ہے۔ اس کے رشتہ داروں نے اسے انتہائی تکبر کے ساتھ چھوڑ دیا، لیکن وہ اب بھی مالی امداد کے خواہشمند ہوتے اور جب کلکتہ آتے تو اس کے یہاں ٹھہرنے سے بھی دریغ نہ کرتے۔

راجندر رانی پورے بارہ سال کی ہو گئی — اس مرتبہ دونوں میاں بیوی میں خوب لڑائی ہوئی، رادھا رانی نے عہد کر لیا کہ وہ جس طرح ہو گا لڑکی کی شادی کر دے گی۔ اس کا شوہر بیوقوف تھا، اس نے طے کر لیا کہ وہ اُسکی پیروی نہ کرے گی۔ اُس نے اپنے عزیزوں کی مدد سے راجندر رانی کے لئے شوہر کی تلاش شروع کر دی — کرشن دیال جمارہا اور اُس نے وہ تمام معقول پیام جو اس کی بیوی نے جمع کئے تھے، ایک ایک کر کے رد کر دئے۔

رادھا رانی پھر ایک لفظی جنگ کے لئے آمادہ ہوگئی " ہاں تو تمہارا ارادہ کیا ہے۔ کیا لڑکی کو عمر بھر بٹھائے رکھنے کی ٹھانی ہے ؟" اس نے خطرناک سنجیدگی سے پوچھا۔

" میں اُسے دریا میں جھونکنے سے رہا۔ میں کس سے اس کی شادی کردوں ؟"

" کیوں، میں نے اتنے لڑکے تبلائے، ان میں سے ایک بھی پسند نہ آیا۔ تمہاری لڑکی کہیں کی شہزادی تو ہو نہیں کہ اس کا اسقدر خیال کیا جاوے "۔

" میں نے تم سے ہزار بار کہدیا کہ میں اسقدر کم عمری میں اس کی شادی نہیں کرنا چاہتا، پھر تمھیں کیوں خواہ مخواہ ضد ہے کہ جو کوئی ملے اس سے تم اس کی شادی کرنے کے لئے آمادہ ہو جاؤ۔ میں نے اسی لئے ہر ایک پیام کوئی نہ کوئی عذر پیش کر کے رد کر دیا۔ تمھیں معلوم ہے کہ ایک کلن برہمن کی لڑکی ساٹھ برس تک بلکہ ساری عمر بغیر کسی بدنامی کے کنواری رہ سکتی ہے۔ پھر تم کیوں آخر اسقدر خفا اور پریشان ہو "۔

" اگر تم میری بات سمجھتے تو مجھے ذرا بھی دقت نہوتی ــــ تمہاری لڑکی برہمو اور عیسائی لڑکیوں سے زیادہ بے حجاب ہوتی جارہی ہے۔ اگر تم اسے زیادہ عمر تک کنواری رکھو گے تو وہ خود اپنی پسند کی شادی کرے گی، اور پھر اگر اسنے کسی خراب گھر کے لڑکے کو پسند کیا تب ؟"

" وہی سب سے اچھا گھر ہوگا، جس کو وہ خود پسند کرے گی "۔

" تمہاری طرح نا ــــ کیا ہمارا یہ فرض نہیں ہے کہ ہم یہ دیکھیں کہ اس کی شریف گھرانے اور اچھی ذات کے لوگوں میں شادی ہو "

" لڑکی خود ہر بات دیکھے گی۔ اپنے انتخاب سے تکلیف اُٹھانا اچھا ہے بہ نسبت اس کے کہ دوسروں کی پسند کا غلام ہو کر عمر بھر عیش سے گزار دے ۔

غرض دونوں میں اسی طرح کی نوک جھونک قائم رہی ــــ راجندر رانی جوان ہوتی گئی ــــ اُسے بتھون اسکول میں داخل کر دیا گیا اس لئے کہ کرشن دیال کو اب پڑھانے کا وقت نہیں ملتا تھا۔ آیندہ سال وہ میٹرک کا امتحان دینے والی تھی، اُس نے ہر شخص سے کہدیا کہ وہ یقینی پاس ہوگی اور پھر کالج میں داخلہ کرائیگی وہ اکثر اپنے بھائیوں کو تنگ کرتی اس لئے کہ جہاں تک پڑھنے کا تعلق تھا، اس کا اور اُن کا کوئی مقابلہ ہی نہ تھا۔ اس کی ماں ان حرکتوں سے بہت ناراض ہوتی لیکن پھر بھی ایک تبسم صرف کئے بغیر نہ رہتی ــــ راجندر رانی کی عمر میں وہ ماں بن چکی تھی۔

کرشن دیال محض عورتوں کی تعلیم ہی کا حامی نہ تھا بلکہ آزادئ نسواں کا بھی موافق تھا، رادھا رانی سوائے اپنے عزیزوں کے ہر شخص سے پردہ کرتی تھی۔ جو لوگ بہت بوڑھے اور ضعیف ہوتے تھے اُن کے سامنے بھی

وہ گھونگھٹ نکال کر جاتی تھی، مگر راجندر رانی نے کبھی اس قسم کی عادتیں اختیار نہیں کیں۔ وہ ہر شخص کے سامنے آتی تھی، اور ہر شخص سے بات کرتی تھی۔ ایک نوجوان زنبندر، اس کے دونوں بھائیوں کو شام کے وقت پڑھاتا تھا۔ وہ اس سے بے حجابانہ گفتگو کرتی اور اکثر پڑھائی میں اس کی مدد لینے سے احتراز نہ کرتی، رادھارانی کو یہ باتیں بہت ناپسند تھیں لیکن وہ جانتی تھی کہ اس کے باپ نے اسے اسقدر بگاڑ دیا ہے کہ اب زجر و ملامت بیکار ہے۔ زنبندر برا آدمی نہیں تھا۔ وہ ایک معقول اور مالدار گھرانے سے تعلق رکھتا تھا اس کے اطوار نہایت پاکیزہ اور شریفانہ تھے۔ اسے اپنے باپ سے کچھ اختلاف تھا اور اسی بنا پر گھر بار چھوڑ دیا تھا اور یہ ارادہ کر لیا تھا کہ اب خود کما کر زندگی بسر کرے گا، چنانچہ اب وہ ٹیوشن کر کے گزارہ کر رہا تھا، وہ لڑکوں کو پڑھانے کیلئے رکھا گیا تھا لیکن دراصل وہ اپنا زیادہ وقت راجندر رانی کو دیتا تھا۔ اور یہ کئی مہینے سے ہو رہا تھا۔

پہلے پہلے تو رادھارانی اس سے چشم پوشی کرتی رہی، اگرچہ اس نے کبھی یہ سلسلہ پسند نہیں کیا لیکن رفتہ رفتہ یہ اس پر ظاہر ہونے لگا کہ اب معاملات اس کے قبضۂ اختیار سے باہر نکل گئے ہیں اس نے سوچا کہ اگر راجندر رانی کو روکا نہ گیا تو خدا معلوم وہ کیا سے کیا کر بیٹھے۔ شوہر سے اُسے کسی مدد کی توقع نہ تھی اس لئے کہ وہ لڑکی کی ہر زیادتی پر ہمت افزائی کے لئے آمادہ تھا۔

راجندر رانی کی جانچ کا امتحان ہونے والا تھا، اس لئے اس نے نومبر سے ہی سخت محنت شروع کر دی وہ ذرا بھی آرام نہ کرنا چاہتی تھی اور نہ نرنیدر اسے آرام کرنے دیتا تھا۔ راجندر رانی کے بھائی البتہ مسلسل آرام کر رہے تھے۔

رادھارانی کبھی کبھی اپنے بچوں کی پڑھائی دیکھنے کے لئے باورچی خانہ کا کام چھوڑ کر چلی آتی تھی۔ وہ روزانہ ایک ہی منظر دیکھتی ــــ راجندر رانی پڑھتی ہوتی، نرنیندر اُسے بتاتا ہوتا، دونوں لڑکے بیرن اور میرن ہر قسم کی شوخیوں میں مشغول ہوتے۔ رادھارانی نرنیندر کے سامنے نہیں آتی تھی اس لئے باوجود ناگواری کے خاموش رہی۔

لیکن ایک روز اُسے اپنا سکوت توڑنا پڑا۔ وہ حسب دستور دروازہ میں سے جھانک رہی تھی کہ اس نے راجندر رانی کو دیکھا کہ سوال نکال رہی ہے اور نرنیندر اپنی تمام روح کو آنکھوں میں لئے ہوئے اُسے برابر دیکھ رہا ہے۔ لڑکے حسب معمول ایک دوسرے سے لڑ رہے تھے۔

رادھارانی اس منظر کی تاب نہ لا سکی، اس کا دماغ کھول رہا تھا۔ اپنے اوپر قابو نہ پاکر، وہ دوسرے کمرے میں زور سے چلائی:- "لوگ اپنے اپنے کاموں میں لگے رہیں۔ یہی مناسب ہے، اگر ہمیں لڑکی کیلئے ماسٹر کی ضرورت ہوگی، تو ہم خود رکھ لیں گے۔" وہ زور سے کمرہ کے باہر چلی گئی ــــ تھوڑی دیر میں نوکرانی آئی

اور راجندر رانی سے کہا :- " چلئے بی بی آپ کو اندر بلا رہی ہیں "۔

اس مداخلت نے غیر متوقع نتائج پیدا کئے راجندر رانی، راجیندر سے الگ رہنے پر مجبور کی گئی۔ لیکن اس جبریہ علٰحدگی نے اسے اپنے احساسات کا اندازہ کرنے کا موقع دیا۔ اُسے اپنی جراحتوں اور بے چینیوں کو معلوم کر کے حیرت تھی، راجیندر روزانہ لڑکوں کو پڑھانے آتا تھا۔ لیکن اس کا ذرا بھی جی نہ لگتا۔ وہ کسی نہ کسی طرح اپنا کام پورا کرتا اور چلا جاتا۔ کبھی کبھار راجندر رانی کی ایک جھلک دکھائی دیتی اور کبھی وہ بھی نہیں۔ رادھا رانی نے اپنے شوہر کو یہ سمجھا دیا تھا کہ راجندر رانی کی موجودگی بچوں کی تعلیم میں بہت حارج ہوتی ہے، اس لئے اسنے اُس کو وہاں جانے سے منع کر دیا ہے۔ کرشن دیال کو اس کا یقین آگیا تھا اور اس نے راجندر رانی سے کہدیا تھا کہ وہ خود اس کو پڑھائے گا اگر اسے کسی مدد کی ضرورت ہوگی۔

اس طرح دو تین مہینے گزر گئے۔ راجندر رانی نے جانچ کا امتحان بھی پاس کر لیا اور میٹرک بھی۔ لیکن اتنے اچھے طریقہ سے نہیں جیسی کہ اسے توقع تھی۔ اس کی صحت بھی دفعتاً خراب ہونے لگی۔

رادھا رانی کو ان سب باتوں کا گمان پہلے ہی سے تھا، آخر تو وہ اُس کی ماں تھی ۔۔۔ اُس کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا، اس کے غصہ کی انتہا ہو گئی۔ وہ دوڑی ہوئی شوہر کے پاس گئی اور کہا :- " اب تمھیں صبر آیا؟ ۔۔۔ اس غریب کا آخر کیا ہونا ہے؟"

" تمھیں اسقدر کیوں اُلجھن ہے ۔۔۔ اگر تمھارا گمان صحیح بھی ہے تو اس میں اسقدر غصہ کی کیا بات ہے نرنیندر سے شادی کرنے میں کیا برائی ہے؟"

" خوب یہ کس طرح ممکن ہے، تم ذات، مذہب، برادری کنبہ ہر چیز قربان کر دینا چاہتے ہو"۔

" کیوں، وہ بھی تو برہمن ہے"۔

" برہمن!" رادھا رانی نے غضبناک ہو کر کہا :- " اگر چکرورتی بھی برہمن ہونے لگے تو تمھارے یہاں جھنیگر بھی چڑیاں کہلانے لگیں گی۔ مجھے یہ شوخیاں نہیں بھاتیں، اگر تمھیں یہی کرنا ہے تو مجھے پہلے سے بتا دو تاکہ میں کہیں کو منھ کالا کر جاؤں"۔

" لیکن خاندان سے زیادہ شخص خاص کا خیال کرنا چاہئے۔ کیا ایک بڑے خاندان سے کسی رذیل کو تجویز کر لینا، ایک چھوٹے خاندان سے شریف کے تجویز کرنے کے مقابلہ میں بہتر ہے؟ بتاؤ کون لڑکی کو زیادہ خوش رکھ سکے گا"۔

" یہ سب قسمت کی باتیں ہیں" رادھا رانی نے عقلمندانہ انداز میں کہا " ایک لڑکی کی مسرت خود اسکے بنائے نہیں بنتی ۔۔۔ وہ بے حیا لڑکیاں جو خود شوہروں کا انتخاب کرتی ہیں وہ بھی سب کی سب خوش نہیں رہتیں

اور نہ ہم، جنھیں ہمارے والدین بیاہتے ہیں، سب کی سب اسقدر آزردہ ہوتی ہیں۔ یہ سب فضول باتیں ہیں۔ ہمیں جو بڑوں سے ہوتی آئی ہے، اُسے نہ چھوڑنا چاہئیے"۔

" یہ طے کرنا بہت مشکل ہے کہ کون خوش ہے اور کون ناخوش" کرشن دیال نے کہا۔" اس لئے کہ اس بارہ میں کسی قسم کے اعداد شمار سرکاری یا غیر سرکاری حاصل نہیں ہیں۔ میں تمھیں اپنی رائے بتا چکا ہوں میرے نزدیک اپنے انتخاب کے باعث تکلیف اُٹھانا بہتر ہے بہ نسبت اس کے دوسروں کے غلام ہو کر تمام عمر چین سے گزار دی جائے۔

رادھا رانی ذرا بھی مطمئن نہ ہوئی۔ اس نے یہ نزاع برابر قایم رکھی، اس نے بار بار یہ بات دھرائی کہ وہ اس سال کے اندر اندر راجندر رانی کی شادی کر دے گی۔ اب وہ کسی کی بھی نہیں سُنے گی۔ اسکے خاندان کی کوئی لڑکی کالج میں پڑھنے کا ارادہ نہیں رکھتی، اگر وہ ہر معاملہ میں اس طرح ڈھیل دئے جائے گی تو وہ خاندان میں منھ دکھانے کے قابل بھی نہ رہے گی ـــــ کرشن دیال سنجیدگی کے ساتھ اُٹھا اور چلا گیا۔

اب گھر کی فضا غیر یقینی ہوتی جارہی تھی، بالکل وہی کیفیت تھی جو طوفان اُٹھنے سے قبل ہوتی ہے۔ اس عرصہ میں کوئی لڑائی نہیں ہوئی اس لئے کہ کرشن دیال ذرا الگ ہی الگ رہا لیکن کوئی مفاہمت کی صورت بھی نہ تھی۔

بچے پوری پوری چھٹی منا رہے تھے۔ ہر شخص کو اس کا خیال تھا کہ وہ اپنا وقت کس طرح گزارے۔ غریب راجندر رانی کے لئے یہ سوال سب سے زیادہ تکلیف دہ تھا، اس کا نہ کوئی ساتھی تھا اور نہ اُسے کوئی کام تھا۔ زندگی اب اس کے لئے ریگزار کی سی وحشت کا نام تھا۔ راتیندر کو اس کے باپ نے بلا لیا تھا۔ اس لئے وہ گھر چلا گیا تھا۔ بچوں کے پاس وہ اپنا پتہ چھوڑ گیا تھا لیکن اُن کے دل میں کبھی اُسے لکھنے کا خیال بھی پیدا نہ ہوا۔ راجندر رانی اس کا حال معلوم کرنے کے لئے بیتاب تھی۔ اگر اس کی آنکھیں صرف دو لفظ اسکے لکھے ہوئے دیکھ لیتی تو اُسے تسکین ہو جاتی، لیکن وہ ایک بنگالی لڑکی تھی جو خاموشی ہی کے ساتھ مصیبتیں جھیلنے کے لئے پیدا کی گئی تھی۔

راجندر رانی پہلے گھر کے کام میں ماں کو تھوڑی بہت مدد دیدیا کرتی تھی۔ اب رادھا رانی اس سے زیادہ امداد کی متمنی تھی اس لئے کہ وہ اسکول سے فارغ تھی لیکن اس کی ماں کو بالکل ناامید ہونا پڑا۔ اب اُسے گھر کے کام میں ذرہ برابر دلچسپی نہ تھی۔ راجندر رانی اس سے قبل گھر کو آئینہ کی مانند صاف اور ستھرا رکھتی تھی لیکن اب وہ ہفتہ میں چھ دن تک ہر چیز بے اتفاقی کے ساتھ پڑی رہنے دیا کرتی تھی۔

تاہم وہ ایک دن ڈرائنگ روم اور مطالعہ کا کمرہ صاف کرنے کی کوشش کر رہی تھی، اس کے باپ کی

میز حسب دستور اس کے لئے ذوق نگاہ کا سامان رکھتی تھی، اُسے ہمیشہ یہ کمرہ صاف کرنے میں دیر لگتی تھی، وہ بڑی بڑی کتابوں کی گرد صاف کرکے اُن کو ترتیب دینے سے قبل اُن کا ڈھیر لگا رہی تھی۔ کہ ایک کتاب میں سے ایک لفافہ گرا، اس نے فوراً اُٹھا لیا، اس کے طرز تحریر سے وہ آشنا تھی۔ ـــــ وہ اُسے بحد عزیز تھا۔

یہ خط اس کے باپ کو لکھا گیا تھا، وہ کبھی اس کا مضمون دیکھنے کے لئے تیار نہ ہوتی لیکن ایک "جذبۂ بے اختیار شوق" نے اچھے بُرے کی تمیز اُٹھا دی ـــــ اس نے لفافہ چاک کیا اور دم بخود ہو کر پڑھنا شروع کر دیا۔

اُس نے پورا کمرہ صاف نہیں کیا، کسی نہ کسی طرح اُس نے خط اس کی جگہ واپس رکھ دیا، گئی اور جا کر اپنے پلنگ پر پڑ رہی۔ رادھا رانی نے کچھ دیر بعد راجندر رانی کو وہاں دیکھ کر مضطربانہ پوچھا :- "کیوں؟ کیا بات ہے" راجندر رانی نے دیوار کی طرف منہ کئے ہوئے کہا "میری طبیعت بہت خراب ہے" کامل دو روز تک وہ اپنے کمرہ میں رہی، نہ اُٹھی، نہ کھانا کھایا، نہ پانی پیا۔ حتیٰ کہ کسی کو دیکھنے کی بھی متحمل نہ ہوئی۔

یہ خط جس کا ذکر ہے، رانیندر نے کرشن دیال کے کسی خط کے جواب میں لکھا تھا۔ اس میں اس نے لکھا تھا کہ وہ بچوں کو پڑھانے سے معذور ہے اس لئے کہ اس کے باپ نے اُسے گھر بلا لیا ہے اور اس کی ماں سخت بیمار ہے۔ اس نے کرشن دیال کا شکریہ ادا کیا تھا کہ اس نے اُسے داماد بنانے کے لائق سمجھا لیکن چونکہ اس کے باپ نے اس کی شادی دوسری جگہ ٹھہرا دی ہے اس لئے وہ افسوس کے ساتھ معذرت خواہ ہے۔ آج کل چونکہ اس کا باپ پریشانیوں میں مبتلا ہے اس لئے وہ اس کی درخواست کو رد کرکے اُس کو رنج پہونچانا نہیں چاہتا۔

ایک انسان ہمیشہ رنج و غم میں بسر نہیں کر سکتا ـــــ راجندر رانی کا غم کم ضرور ہوا لیکن اس کا شباب ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔ وہ ایک معمر عورت کی طرح سنجیدہ اور متین ہو گئی کچھ عرصہ میں رانیندر کی شادی کا دعوت نامہ آ گیا اسی دن راجندر رانی اپنے باپ کو گھسیٹ کر اپنے ساتھ کالج لے گئی اور داخلہ کرا لیا۔ رادھا رانی نے بہت کچھ ہائے ویلا مچائی لیکن اُس نے ذرا بھی پرواہ نہ کی۔ اس کے بعد وہ گویا صرف اپنی تعلیم کے لئے زندہ تھی، لیکن راجندر رانی کی قسمت میں شاید سکون تھا ہی نہیں۔ ابھی سال ختم بھی نہ ہوا تھا کہ کرشن دیال بہت سخت بیمار ہوا ـــــ رادھا رانی کی آہ و بکا نے فضا کو اور مکدر کر دیا۔ وہ ہر آئے گئے کے سامنے سسکیاں لے لے کر اُس "بارگراں" کی شکایت کرتی جو اس کا شوہر اُس کے اوپر چھوڑے جا رہا ہے۔

راجندر رانی کے صبر کی انتہا ہو چکی تھی، اُس کے اور اُس کی ماں کے تعلقات کبھی خوشگوار نہیں تھے اب یہ ہر وقت کے طعنوں اور حوالوں نے اس کا دل چھلنی کر دیا۔ "تنگ آمد بجنگ آمد" کے مصداق وہ ایک دن چیخ اُٹھی :- "تو پھر تم میری شادی کر کیوں نہیں دیتیں۔ اس گھر سے تو کم از کم کوئی گھر خراب نہ ہوگا۔"

ان الفاظ پر رادھا رانی کے آنسوؤں کی جھڑی بندھ گئی، لیکن وہ آنکھیں کھولی نہیں ـــــ بہت سی

حجامنیں اور نائنیں آئیں، بہت سی باتیں ہوئیں۔ کرشن دیال اس قدر بیمار تھا کہ وہ کسی رائے کا اظہار ہی نہ کر سکا۔ اس لئے تمام معاملات کم وبیش راجند رانی ہی کی خواہش کے بموجب طے ہوئے۔ بہت سے اچھے اور برے پیاموں میں سے اس نے ایک شخص کو پسند کیا جس کی پہلی بیوی مر چکی تھی اور جس کی عمر بہت زیادہ تھی۔ جس کے کوئی بچہ نہ تھا۔

ہر شخص کو اس کے انتخاب پر حیرت تھی، اور ہر شخص اس بات کا خواہشمند تھا کہ کسی طرح وہ اپنی رائے تبدیل کر دے لیکن اس سنگدل میں ذرا بھی تبدیلی نہ ہوئی —— "اگر تمھیں میری شادی کرنا ہے تو سمجھ لو کہ میں اسی شخص سے شادی کروں گی اور کسی سے نہیں" اس نے ایک آہنی عزم کے ساتھ صاف کہدیا۔

چنانچہ راجند رانی کی شادی اسی معمر شخص سے ہو گئی۔ رخصتی کے وقت رادھا رانی نے اپنے آہ ونالہ کی انتہا کر دی لیکن راجند رانی کی آنکھوں میں ایک آنسو بھی نہ تھا۔ البتہ جب وہ اپنے نیم بیہوش باپ کے سامنے بادب جھکی، اسوقت وہ لوگوں سے چھپا کر اپنی آنکھیں پونچھ رہی تھی۔

وہ اپنے نئے گھر اُسی "سنگین" چہرہ کے ساتھ آگئی، گھر کی عورتوں نے تمام رسمیں برتیں۔ نئے عزیز تعارف کے لئے آئے۔ وہ عمر میں چھوٹی تھی، لیکن گھر میں بہت سے لوگوں کی بڑی تھی اسی لئے وہ ایک سکون آمیز طمانیت اور بردباری کے ساتھ کھڑی رہی اور دونوں اصناف اور ہر عمر کے لوگوں کے آداب قبول کرتی رہی۔ ایک نند کھڑی ہوئی سب کا تعارف کرا رہی تھی۔ راجند رانی نے جب ایک شخص کو دیکھا تو اس کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے —— یہ ایک نوجوان شخص تھا اور صورت سے ملول معلوم ہو رہا تھا۔ "یہ تمھارا بھتیجا نریندر ہے" نند نے تعارف کراتے ہوئے کہا —— نریندر نے ظاہر دارانہ طور پر آداب کیا اور جلدی سے کمرے کے باہر چلا گیا۔

راجند رانی بڑی لڑکی تھی، اس لئے سسرال سے زیادہ عرصہ الگ رہنے کا کوئی عذر نہیں ہو سکتا تھا وہ ایک دو روز کو میکہ گئی اور پھر آگئی —— جس دن کرشن دیال کا انتقال ہوا، وہ پھر ماں کے گھر چلی آئی تھی خوش قسمتی سے کرشن دیال کا انتقال بغیر دوبارہ ہوش میں آئے ہوئے ہوا اور اسے یہ کبھی نہ معلوم ہو سکا کہ اُس کی چہیتی بیٹی نے جان بوجھ کر زندگی بھر کا ایک عذاب اپنے سر مول لے لیا ہے۔

راجند رانی اُسی دن واپس آگئی۔ وہ اپنے گھر سے زیادہ وقت کے لئے الگ نہیں رہ سکتی تھی۔ اس لئے کہ اس کی غیر موجودگی میں کوئی ایک دن کے لئے بھی گھر کا دیکھنے والا نہ تھا۔ اسی لئے اُس کے شوہر نے ایک جوان اور تعلیم یافتہ عورت سے شادی کی تھی جو آتے ہی گھر کی مالک بن جائے۔

چوتھے دن اس نے اپنے باپ کی سر دھر بڑے پیمانہ پر کی۔ وہ پچھلی رات نہ سو سکی تھی اس لئے کہ اپنے مرحوم باپ کی یادیں برابر آنسوؤں کے ہار پروتی رہی۔ لیکن صبح کو اس کا چہرہ بالکل بے اثر تھا۔ جس پر رنج وغم کے

ذرا بھی آثار نہیں تھے۔ مہمانوں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور آپس میں کہنے لگے "عجیب عورت ہے! اس کی آنکھوں میں آنسو کی ایک بوند بھی نہیں۔ ایک عورت کو اس قدر سنگدل نہیں ہونا چاہیئے"۔

تمام دن قریب قریب مہمانوں کو کھانا کھلانے میں صرف ہو گیا۔ شام کو قدرے خاموشی ہوگئی۔ راجندر رانی اُس برآمدہ میں تنہا بیٹھی تھی جو اس کے سونے کے کمرے کے سامنے تھا۔ اس کا شوہر نیچے مہمانوں کے ساتھ تھا۔ اسوقت دفعتاً نرنیندر آیا۔ وہ راجندر رانی کے قریب آیا اور کہا:۔ "میں ان دنوں برابر تنہائی کا موقع ڈھونڈھتا رہا لیکن نہیں ملا۔ کیا میں تم سے ایک سوال پوچھ سکتا ہوں۔ یہ سب کرنے کی کیا ضرورت تھی تم مجھے حقارت کے لائق بھی نہ سمجھ کر آسانی سے بھول جاتیں"۔

راجندر رانی شاید اپنی شادی کے بعد پہلی بار ہنسی "میں نے تم سے دو باتیں سیکھی ہیں" اُس نے کہا "ایک یہ کہ آدمی کو اپنے والدین کے خلاف کبھی کچھ نہ کرنا چاہیئے اور دوسرے یہ کہ روپیہ دنیا میں ہر چیز کے مقابلہ میں بڑی چیز ہے"۔

نرنیندر کچھ دیر خاموش رہا اور پھر کہا "میرے قصور کے لئے میرے سارے گھر والوں کو تو خطاوار نہ ٹھہراؤ۔ تم خوب جانتی ہو کہ ہماری سب کی زندگی کا سہارا اور بھروسا چچا ہی جی ہیں"۔

"لیکن مجھے اپنے برے بھلے کو پہلے دیکھنا چاہیئے" راجندر رانی نے کہا۔

رانیندر نے زیادہ گفتگو بیکار سمجھی۔ آج اُسے اپنے گناہ کبیرہ کا احساس ہوا۔ ایک وہ لڑکی جو پھول کی طرح نرم و نازک تھی اور نسیم سحری کی طرح پاکیزہ۔ آج وہ اس حرکت کی وجہ سے ناگن کی طرح بیرحم اور پتھر کی طرح جامد وسخت ہو گئی تھی۔ اب وہ مجبور تھا، ایک سنگین مجسمہ کے اندر وہ روح نہیں ڈال سکتا تھا وہ آہستہ سے چلا گیا۔

رادھا رانی اپنی لڑکی کی عقل کا ماتم کرتی رہی، لیکن اُسے اس کا اعتراف کرنا پڑا کہ وہ اُس سے زیادہ ہوشیار رہے گی۔ ایک سال ختم بھی نہ ہونے پایا تھا کہ راجندر رانی گھر کی تنہا مالکہ ہوگئی اور اُس تمام دولت کی قابض جو اس کے بوڑھے شوہر کی ملکیت تھی۔ کسی کو یہ نہ معلوم ہوا کہ یہ اُس نے کس طرح کیا۔ تمام وابستگان کو الگ کر دیا انھوں نے بہترا برا بھلا کہا، کوسنے دئے لیکن راجندر رانی نے ذرا پرواہ نہ کی۔ رادھا رانی ان کوسنوں پر کانپ اُٹھتی لیکن اُس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرے۔ راجندر رانی نے اُس سے تمام تعلقات قطع کر لئے تھے اسی طرح برس گزر گئے۔

ایک دن رادھا رانی اپنی لڑکی کے گھر روتی ہوئی آئی اور اس کو اپنے ساتھ لے گئی۔ راجندر رانی بھی اب بیوہ تھی، وہ سفید کپڑے پہنے ہوئے تھی۔ لیکن اس کی آنکھیں خشک تھیں۔ اُسے ماں کے آنسو پسند نہ آے

اور اس نے کہا:۔ تم کیوں روتی ہو، انسان کو بہر حال ایک نہ ایک دن مرنا ہے "۔ رادھا رانی کے حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ "کیا تم پتھر کی بنی ہوئی ہو؟" اُس نے پوچھا " وہ پھر بھی تمہارا شوہر تھا۔ تم اسقدر عرصہ اس کے ساتھ رہی ہو۔ کیا اس کے لئے ذرا بھی دُکھ نہیں محسوس کرتیں"۔

راجندر رانی نے خشمگیں چہرہ بنالیا اور ماں کے پاس سے اُٹھ کر چلی گئی۔

اُسے اپنی ماں کا مکان ناقابل برداشت معلوم ہونے لگا۔ وہ اب اس گھر کی تھی ہی نہیں لیکن اب وہ کہاں رہے؟ خود اپنا بڑا مکان سنسان اور ویران تھا، وہاں تنہا رہنے کی اس کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ اُسکے پاس کافی دولت تھی۔ اس کا کوئی مصرف نہ تھا۔ اُس کی گزرگاہ بدستور ایک بے آب وگیاہ سرزمین ہی تھی۔

وہ رفتہ رفتہ بالکل بت ہوتی جا رہی تھی ـــــ ساکت اور جامد ـــــ اس کی ماں خفا بھی ہوئی کہ " اس قدر احساس نہ کرو۔ ذرا مجھے دیکھو اور صبر حاصل کرو۔ اگر قسمت سخت سے سخت مصیبتیں بھی ڈالے تب بھی زندہ رہنے کے لئے برداشت کرنا پڑتی ہیں"۔

" کیا تم میرے بھتیجے نرنیندر کو ایک دفعہ کے لئے بلا دو گی؟" راجندر رانی نے پوچھا،

"کیوں اب تمھیں اُس سے کیا لینا ہے؟" ماں نے سخت آواز میں کہا۔

رادھا رانی نے مجبوراً اپنے چھوٹے لڑکے کو رانیندر کے بلانے کے لئے بھیجدیا۔

رانیندر نے اول اول آنے سے انکار کیا۔ لیکن لڑکا بغیر اس کے سہکنے والا نہیں تھا اس لئے وہ مجبوراً آگیا۔ بیرنندر نے اُسے ملاقات کے کمرے میں بٹھا دیا۔ اس کے بعد اُس نے اپنی بہن کو بلا یا۔ راجندر رانی اپنے ٹرنک میں سے ایک بھاری لفافہ نکال کر، رانیندر کے پاس پہونچی۔ جب وہ داخل ہوئی رانیندر کھڑا ہو گیا لیکن وہ کچھ بولا نہیں۔

راجندر رانی نے لفافہ اُس کی طرف یہ کہتے ہوئے بڑھایا " اسے حفاظت سے رکھنا"۔ رانیندر اس کو قبول کرنے سے پہلے ذرا گھبرایا۔

" یہ کیا ہے" اُس نے پوچھا۔

" یہ ایک دستاویزی تحفہ ہے" راجندر رانی نے کہا " جو میں نے دوسروں کا چرایا تھا، وہ میں واپس کرتی ہوں"۔

"کیوں؟ تم ایسا کیوں کرتی ہو؟" رانیندر نے پوچھا ـــــ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ " ابھی ہم مرے نہیں، تمہارا انتقام تو غیر مکمل رہے گا"۔

" نہیں اب یہ مکمل ہو چکا ہے۔ تم نے دولت کے غرور میں ایک عورت کے جذبات کو اسقدر مجروح کیا

کہ وہ موت کی طلبگار ہوگئی۔ لیکن اب تمھیں اُسی عورت سے ایک فقیر کی طرح یہ بھیک قبول کرنا ہے"۔

نریندر اس عطیہ کو پھینک دینا چاہتا تھا لیکن اس کا ہاتھ رُک گیا۔ سخت افلاس نے اس کے جذبات سرد کر دئے تھے۔

بیرنندر کچھ فاصلہ سے کھڑا تھا۔ وہ اب قریب آیا اور کہا "تم بالکل ترک و انکار پر آمادہ ہو تم آخر زندگی کس طرح گزارو گی؟"

"تم اندیشہ نہ کرو" راجندرانی نے کہا "میں تمھارے اوپر نہیں رہوں گی۔ ماں نے مجھے غلامانہ تابعداری کا سبق سکھایا اور باپ نے وحشیانہ آزادی کا۔ لیکن ان میں سے ایک چیز بھی میرے سکون کا باعث نہ ہوئی مجھے ایک دوسرا راستہ تلاش کرنا پڑے گا"۔

"تم کہاں جاؤگی؟ راجندرانی" رانیندر نے دریافت کیا۔

"میں نے محبت کے راستہ میں بھی غلطی کی اور انتقام کے راستہ میں بھی۔ میں کوئی اور راستہ ڈھونڈھنے کی کوشش کروں گی۔ میں یہ مکان آج ہی رات کو چھوڑ دوں گی"۔

"کیا تم مجھے اپنا پتہ دیتی جاؤگی؟" نریندر نے پوچھا۔

"نہیں" راجندرانی نے مختصراً کہا۔

(ترجمہ) خواجہ احمد فاروقی۔ بچھرایونی

باب الاستفسار

شاعری کا معیار صحیح اور غالب

(جناب لطافت حسین صاحب - مراد آباد)

میں جاننا چاہتا ہوں کہ آپ کے نزدیک شاعری کا صحیح معیار کیا ہے اور غالب کی شاعری اس معیار پر پوری اترتی ہے یا نہیں ـــ میں دیکھتا ہوں کہ آپ کو بہت کم شعر کسی کی غزل کے پسند آتے ہیں اس لئے میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کن اُصول کے ماتحت حسن و قبح پر حکم لگاتے ہیں۔ ممکن ہو تو غالب ہی کے اشعار مثالاً پیش کرکے جواب دیجئے۔

(نگار) آپ کے سوال کا جزو اول جس تفصیلی جواب کا مقتضی ہے اس کے لئے دفتر کے دفتر درکار ہیں، لیکن جزو ثانی چونکہ ایک محدود و متعین بحث سے آگے نہیں بڑھتا اس لئے میں فی الحال اس کی طرف توجہ کرتا ہوں اور یہی غالباً آپ کا بھی مقصود ہوگا۔

یہ بالکل درست ہے کہ مجھے بہت کم شعر پسند آتے ہیں، لیکن ایسا کیوں ہے؟ اس کا جواب میں کیا دوں جبکہ اس کا تعلق صرف ذوق و وجدان سے ہے اور الفاظ سے ظاہر کرنے کی چیز نہیں ـــ تاہم چونکہ ہر ذوق ایک استدلال خفی بھی اپنے ساتھ رکھتا ہے، اسلئے میں دو چار مثالیں پیش کرکے اس کو واضح کرنے کی کوشش کرونگا۔

جسوقت غزل کا کوئی شعر میری نگاہ سے گزرتا ہے، تو سب سے پہلے میں یہ دیکھتا ہوں کہ اس میں کس خیال کو پیش کیا گیا ہے اور اگر وہ خیال اچھا ہے تو پھر انتخاب الفاظ و انداز بیان کو دیکھتا ہوں کہ وہ اصل جذبہ کو کماحقہ ظاہر کرتا ہے یا نہیں ـــ اگر ان دونوں میں کامل توافق پاتا ہوں تو سمجھتا ہوں کہ مکمل ہے، اور اگر اس میں کمی ہوتی ہے تو اسی نسبت سے اس کے حسن و قبح پر حکم لگاتا ہوں۔

اب رہا یہ امر کہ میں کس خیال یا جذبہ کو پسند کرتا ہوں اور کس اصول پر اسلوب بیان کی ہمواری یا ناہمواری

پر حکم لگاتا ہوں، اس کے تمام جزئیات کی تفصیل تو دشوار ہے، لیکن مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ میرے نزدیک وہی جذبہ زیادہ پسندیدہ ہے جو واقعیت سے زیادہ قریب ہے اور اس لئے وہی اسلوب بیان مجھے پسند آنا چاہئے جو اس حقیقت سے زیادہ متاثر کرنے والا ہو — خیال کی دقت اور بیان کی ژولیدگی غزل میں میرے نزدیک نہایت مکروہ چیز ہے۔ ایک غزل کے شعر کا لطف یہ ہے کہ اس کو سنتے ہی مفہوم ذہن نشین ہو جائے اور انسان کو سوچنا نہ پڑے کہ کہنے والا کیا کہنا چاہتا ہے اور الفاظ سے اس کا مدعا کیونکر ظاہر ہو سکتا ہے۔ الغرض خیال کی پاکیزگی اور انداز بیان کی حلاوت و سلاست جب دونوں پورے توازن کے ساتھ ایک جگہ جمع ہو جائینگی تو میں اسے بہترین نمونۂ تغزل قرار دوں گا اور اگر ان دونوں میں سے کسی میں اصلاح یا حذف و اضافہ کی گنجایش ہوئی تو یقیناً میرا ذوق پوری طرح آسودہ نہ ہوگا۔

اب میں آپ ہی کی خواہش کے مطابق کلام غالب سے چند مثالیں پیش کرکے اس کو زیادہ واضح طور پر بیان کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔

مثلاً آپ غالب کی اولین غزل کو سامنے رکھئے۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا — کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا
کاو کاو سخت جانیہائے تنہائی نہ پوچھ — صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا
جذبۂ بے اختیار شوق دیکھا چاہئے — سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا
آگہی دام شنیدن جسقدر چاہے بچھائے — مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا
بسکہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیر پا — موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

پہلا شعر جس حد تک صرف الفاظ کا تعلق ہے، قابل شکایت نہیں لیکن چونکہ خیال بہت بعید الفہم ہے، اسقدر بعید الفہم کہ خود غالب کا بیان کیا ہوا مطلب بھی اچٹا ہوا سا نظر آتا ہے، اس لئے یکسر تغزل سے علحدہ ہے دوسرے شعر کا دوسرا مصرعہ نہایت سلجھا ہوا ہے اور اس میں کسی اصلاح کی گنجایش نہیں۔ شعر کا مفہوم بھی حدود تغزل میں آتا ہے، اور پہلا مصرعہ بھی غنیمت ہے۔ میں۔ نے غنیمت اس لئے کہا کہ اسی میں لفظ "کاو کاو" اچھا نہیں، اگر اس مفہوم کو لفظ کاوش سے ادا کیا جاتا جو کاو کاو کا مترادف ہے تو یہ نقص دور ہو جاتا۔ مثلاً یوں:-

کاوشیں اب سخت جانیہائے ہجراں کی نہ پوچھ

تیسرے شعر کے دونوں مصرعے علحدہ علحدہ اچھے ہیں، لیکن چونکہ دونوں کا تعلق بالکل لفظی رعایت اور مفروضہ باتوں پر منحصر ہے اس لئے شعر مہمل ہے۔ محض اس لئے کہ دم شمشیر، تلوار کی تیزی و آبداری کو کہتے ہیں اور لفظ دم سانس کے معنے میں بھی آتا ہے "سینۂ شمشیر" پیدا کرکے اس کا باہر ہونا دکھایا گیا ہے۔ علاوہ اس کے

کسی کے جذبۂ شوق کا اثر کبھی یہ نہیں ہو سکتا کہ تلوار اپنے آپ میں نہ رہے۔ الغرض یہ شعر بہ لحاظ تغزل بالکل قابل اعتنا نہیں۔ چوتھے شعر کا مفہوم صرف اسقدر ہے کہ میری بات کسی کی سمجھ میں نہیں آسکتی اور ظاہر ہے کہ غزل سے اس خیال کو کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ اسی طرح پانچویں شعر میں ایک ادعا ہے بغیر کسی ثبوت کے محض لفظ آتش کی رعایت سے حلقۂ زنجیر کو "موئے آتش دیدہ" کہا گیا ورنہ یوں بیتابی کے لحاظ سے جو "آتش زیرپا" ہونے کا صحیح مفہوم ہے، حلقۂ زنجیر قیامت تک "موئے آتش دیدہ" نہیں بن سکتا۔ الغرض مفہوم و بیان دونوں حیثیتوں سے یہ شعر تغزل سے خارج ہے۔

اب میں غالب کے چند اشعار ایسے پیش کرتا ہوں جو بہت مقبول و مشہور ہیں لیکن اس قسم کے نقائص سے خالی نہیں۔

کہیں نظر نہ لگے اُسکے دست و بازو کو — یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

شعر بہ ظاہر نہایت مکمل معلوم ہوتا ہے اور حد درجہ تغزل گوئی کے اندر بھی ہے، لیکن ایک غائر نگاہ انتقاد سمجھتی ہے کہ اس میں کیا نقص ہے۔ شعراء کے یہاں زخم و جراحت، خنجر و شمشیر کا ذکر صرف بہ سبیل مجاز و کنایہ ہوا کرتا ہے یعنی نہ تلوار سے مراد آہنی تلوار ہوتی ہے اور نہ زخم سے واقعی وہ زخم جو گوشت پوست کو متاثر کرتا ہے اسلئے اگر کوئی شاعر ان چیزوں کا ذکر کرتے ہوئے کسی ایسی چیز کو بھی شامل کر دے جو مجاز و کنایہ کو واقعہ و حقیقت میں بدل دے تو یہ شاعری کا نقص ہے۔ غالب دوسرے مصرعہ میں زخم جگر کے الفاظ لکھتا ہے جو ہمیشہ بہ صورت مجاز و کنایہ استعمال کئے جاتے ہیں لیکن پہلے مصرعہ میں دست و بازو کی تعیین ہمیں مجبور کرتی ہے کہ زخم جگر کا مفہوم وہی لیں جو حقیقتاً ایک زخم کا ہوا کرتا ہے۔ اس لئے یہ شعر غزل کی لطافت سے بالکل علحدہ ہو کر فنون سپہ گری کی حد میں آگیا کہ تلوار سے حملہ کرنے کی یہ کیا اچھی صورت ہو سکتی ہے کہ ایک ہی ہاتھ میں جگر تک کاٹ کر جائے۔ اگر اس شعر کا پہلا مصرعہ یوں ہوتا:۔

نگاہ ناز کو اسکے کہیں نظر نہ لگے

تو یہ نقص باقی نہ رہتا۔

مومن نے بھی اسی مضمون کو ایک شعر میں باندھا ہے لیکن حد درجہ لطافت کے ساتھ لکھتا ہے:۔

میرے تغیر رنگ کو مت دیکھ — تجھ کو اپنی نظر نہ ہو جائے

دیر نہیں حرم نہیں، در نہیں آستاں نہیں — بیٹھے ہیں رہگذر پہ ہم غیر ہمیں اٹھائے کیوں

اس شعر کو صرف ایک لفظ غیر نے پایۂ تکمیل سے گرا دیا۔ کیونکہ غیر، در سے اُٹھا سکتا ہے آستان سے اُٹھا سکتا ہے، لیکن دیر و حرم سے اسے کیا تعلق۔ اس لئے اگر بجائے غیر کے لفظ کوئی استعمال ہوتا تو وہ

دیر و حرم پر بھی حاوی ہو سکتا تھا۔ علاوہ اس کے لفظ کوئی کا اشارہ خود محبوب کی طرف ہوتا اور اس صورت میں شعر کا سوز و گداز زیادہ بڑھ جاتا۔

اُبھرا ہوا نقاب میں ہے اُنکے ایک تار مرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو

اس شعر میں صرف ایک لفظ تار نے جو نگاہ، اور نقاب دونوں سے متعلق ہو سکتا ہے، غالب کو جادۂ اعتدال سے ہٹا دیا، اور رعایت لفظی نے کوئی مفہوم پیدا ہونے نہ دیا ورنہ ظاہر ہے کہ تار نگہ کوئی مرئی و مادی چیز نہیں کہ نقاب کے اُبھرے ہوئے تار پر اس کا شبہ ہو سکے۔

یہ چند مثالیں میں نے ان اشعار سے لی ہیں جو عام طور پر بہت مشہور ہیں اور نہایت پاکیزہ سمجھے جاتے ہیں۔ ورنہ غالب کا وہ حصۂ کلام جو اس رنگ کا ہے۔

کارگاہِ ہستی میں لالہ داغ ساماں ہے برقِ خرمنِ راحت خونِ گرم دہقاں ہے

گرم فریاد رکھا شکل نہالی نے مجھے تب اماں ہجر میں دی بردِ لیالی نے مجھے

بالاتفاق یکسر تغزل سے خارج ہے۔ اسی طرح غالب کے بعض ایسے اشعار جو مفہوم کے لحاظ سے کھُلے ہوئے پست و رکیک ہیں[1]۔ ان کا بھی ذکر فضول ہے۔

یہ تو ہوا غالب کی شاعری کا تاریک پہلو، لیکن اب روشن پہلو کو بھی دیکھئے کہ وہ کس قیامت کا ہے۔ ایک اچھے شعر کی صفت یہ ہے کہ کسی حیثیت سے اس میں کسی رد و بدل کی گنجایش نہ ہو یعنی اگر آپ چاہیں کہ کوئی ایک لفظ بدلکر اس کی جگہ دوسرا رکھدیں تو ممکن نہ ہو۔ اس قسم کے اشعار غالب کے یہاں بکثرت پائے جاتے ہیں۔ مثالاً چند یہاں پیش کرتا ہوں۔

رہے آزردہ ہم اُس شوخ سے چند تکلف سے تکلف برطرف تھا ایک انداز جنوں وہ بھی

اس شعر میں الفاظ آزردہ، شوخ، تکلف، انداز جنوں اور ان سب کا محل استعمال اتنا دلکش ہے کہ کوئی دوسرا لفظ ان کی جگہ استعمال ہو سکتا ہے اور نہ اُن کی ترکیب کو بدلا جا سکتا ہے۔ پورا شعر سانچہ میں ڈھلا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

تو اور سوئے غیر نظر ہائے تیز تیز میں اور دُکھ تری مژہ ہائے دراز کا

بالکل یہی رنگ اس شعر کا بھی ہے۔ الفاظ کیا ہیں گویا نگینے جڑے ہوئے ہیں۔

---

[1] مثلاً ــــ صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خو دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کئے

اس قسم کے چند اشعار اور ملاحظہ ہوں :-

وائے دیوانگی شوق کہ ہر دم مجھ کو
آپ جانا اُدھر اور آپ ہی حیراں ہونا

منھ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں
زلف سے بڑھکر نقاب اس شوخ کے منھ پر کھلا

اے ساکنانِ کوچۂ دلدار دیکھنا
تم کو کہیں جو غالب آشفتہ سر ملے

غالب خستہ کے بغیر کونسے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا کیجئے ہائے ہائے کیوں

قہر ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو
کاشکے تم مرے لئے ہوتے

بعض غزلیں پوری کی پوری اسی رنگ کی ہیں خصوصیت کے ساتھ وہ جو سہل زمین اور چھوٹی بحروں میں لکھی گئی ہیں۔

باب المراسلۃ والمناظرہ

عورت اور موجودہ آزادی

(جناب احمد کریم صاحب علیگ۔ ڈھاکہ)

آج جبکہ انسانی ترقیاں کمال کو پہونچ چکی ہیں۔ زندگی کا ہر مسئلہ نئے عنوان سے پیش کیا جا رہا ہے۔ عورتوں کی موجودہ حالت بھی اسی سلسلہ میں زیر بحث رہتی ہے۔

اس دور میں عورت کی آزادی اپنی جگہ پر مفید ہے یا غیر مفید اس سے بحث نہیں۔ اور نہ یہ کسی کے احتجاج یا منطقی دلائل سے رکنے والی چیز ہے۔ عورت آزاد ہوگی اور کامل آزاد۔

یہاں مذہبی نقطۂ نظر سے بھی گفتگو کرنی نہیں ہے بلکہ خالص اخلاقی اور معاشرتی پہلو سے ہندوستانی عورتیں ابھی آزادی کے اُس درجہ کو نہیں پہونچی ہیں جہاں مغربی عورتیں پہونچ چکی ہیں۔ لیکن موجودہ رفتار آزادی سے ظاہر ہے کہ اس صدی کے آخر تک یہاں بھی وہی صورت ہوگی جو آج یورپ کی ہے۔

ممکن ہے کوئی صورت ایسی نکل آئے (جس کی کوئی اُمید نہیں) جو یورپ کی طرح آزاد ہونے سے روک دے۔ کاش یہ نہ ہوا تو اُسوقت یہاں کے اخلاق کا معیار کیا ہوگا؟

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مکمل آزادی کا آخری نتیجہ "عصمت ریزی" ہے اور پھر جب عورت کا شیوہ یہ ہو جائے کہ وہ مرد کے جذبات کو ٹھکرا دے اُس وقت معاشرتی اور خانگی زندگی کا کیا حشر ہونا ہے؟

ایک سوال یہ ہوتا ہے کہ جب عورت اپنے جائز حقوق سے آگاہ نہ تھی اور جہالت کی تاریکی میں زندگی بسر کر رہی تھی اُسوقت مرد کا سلوک بھی اُس کے ساتھ یہی تھا۔ قدرت نے اب عورت کو اس سلوک کا

اور دور تک ایک لکیر بناتی ہوئی غائب ہوگئی - اس کو ہم اپنی اصطلاح میں ستارے ٹوٹنا کہتے ہیں - آپ کو معلوم ہے یہ کیا ہے - یہ حقیقتاً اجرام سماوی کے بڑے بڑے ٹکڑے ہیں جو ہزاروں بلکہ لاکھوں سال سے فضا میں نہایت سرعت کے ساتھ اپنا سفر طے کر رہے ہیں لیکن جب وہ کرۂ ارض کے قریب آتے ہیں تو ہوا کے تصادم سے مشتعل ہوکر گیس میں تبدیل ہو جاتے ہیں - الغرض ہوا کا غلاف جس طرح فضا کی دوسری چیزوں کو زمین تک پہونچنے سے باز رکھتا ہے، اسی طرح زمین والوں کو بھی فضائے بسیط میں بہت زیادہ سرعت کے ساتھ پرواز کرنے کی اجازت نہیں دیتا اور اس لئے اگر انسان ہوا کے حلقہ سے باہر نکل جائے تو پھر اس کے لئے آگے بڑھنے میں واقعی بہت سی آسانیاں ہیں -

بظاہر یہ امر زیادہ مشکل نہیں کہ چاند تک پہونچنے کے لئے ایک غبارہ طیار کر لیا جائے لیکن اس میں ایسی زبردست قوتِ دافعہ پیدا کرنا کہ وہ برابر کام کرتی جائے دشوار ہے کیونکہ جس طرح سمندر کی تہ تک پہونچنے کے لئے پانی کا دباؤ مانع آتا ہے، اسی طرح فضائے بسیط میں پہونچنے کے بعد ہوا کے دباؤ کا مقابلہ کرنا آسان نہیں ہے - علاوہ اس کے ایک دشواری اور یہ پیدا ہوگی کہ غبارہ کا وہ حصہ جو سورج کی طرف رہیگا اس میں تو گرمی اتنی پیدا ہو جائے گی کہ آپ انڈا اُبال لیجئے لیکن دوسری جانب درجۂ حرارت صفر سے بھی ۴۵۹ درجے نیچے گرا ہوا ہوگا اور اس کے لئے ضرورت ہوگی کہ اسبسٹاس (Asbestos) کے ذریعہ حرارت کو ناقابل نفوذ بنایا جائے اور دورۂ حرارت کا توازن دونوں جانب یکساں رہے -

چاند کے مسافر کو عادتاً کھانے پینے کی بھی ضرورت ہوگی، سانس لینے کے لئے آکسیجن کی بھی کافی مقدار درکار ہوگی - پھر سوال یہ ہے کہ سانس سے جو کاربن نکلے گا وہ کہاں جائے گا، ظاہر ہے کہ غبارے سے باہر تو جا نہ سکے گا (کیونکہ وہ تو چاروں طرف سے بالکل بند ہے) اس لئے کوئی اور طریقہ کیمیاوی تحلیل کا اختیار کرنا پڑے گا اور ان تمام باتوں کا اہتمام آسان نہیں -- اسی کے ساتھ اب اور دشواریوں کو لیجئے جو علمی نقطۂ نظر سے پیش آنے والی ہیں -- دنیا میں جس چیز کو ہم وزن سے تعبیر کرتے ہیں وہ نام ہے صرف کشش زمین کا، ہمارا چلنا پھرنا، ایک جگہ سیدھا کھڑا ہو جانا یہ سب جاذبیت ارض کے طفیل میں ہے اس لئے جس وقت غبارہ کشش زمین کی حد سے علٰحدہ ہو جائے گا تو اس کے اندر انسان کا وزن گھٹ کر دھوئیں کے برابر بلکہ اس سے بھی کم ہو جائیگا اور غبارہ کے اندر سطح پر چلنے سے معذور ہو جائے گا، کیونکہ اگر اس نے چلنے کی کوشش کی تو وہ فوراً گر پڑے گا، یہاں تک کہ چھینک اور کھانسی کی حرکت سے بھی اس کے قدم اُکھڑ جائیں گے اور وہ غبارہ کے اندر بجائے چلنے کے بالکل دھوئیں کی طرح تیرتا ہوا اور اُڑتا ہوا نظر آئے گا - اب خور و نوش کے انداز کو دیکھئے کہ کیا ہوگا - کھانا تو خیر کسی طرح کھا لیا جائے گا، لیکن پانی پینے کی کوئی صورت نہیں کیونکہ گلاس یا صراحی سے پانی اُنڈیلنا ناممکن ہوگا اور پانی

کے قطروں کو انگلی سے سرکا کر منھ تک لانا پڑے گا یا کسی نلکی کے ذریعہ چوسنا پڑے گا۔ علاوہ اس کے پانی اگر منھ تک پہونچ گیا تو وہ خود حلق کے اندر اُترے گا نہیں جب تک عضلات کی جدوجہد سے کام نہ لیا جائے۔ یہی دشواری نیند میں بھی ہوگی کیونکہ زوال جاذبیت کی وجہ سے خون کا دورہ صرف دماغ کی طرف رہیگا اور خواب سے جو راحت حاصل ہوتی ہے وہ میسر نہ آئے گی۔

البتہ جب جاذبیت زمین کے حدود سے گزر کر کرۂ قمر کے حدود کشش میں غبارہ پہونچے گا تو یہ کیفیت بڑی حد تک دور ہو جائے گی لیکن اصلی حالت پھر بھی پیدا نہ ہو سکے گی، کیونکہ چاند کی کشش بہ نسبت زمین کے کم ہے اور اس لئے ہر چیز کا وزن ہلکا رہیگا۔

اس کے بعد جب غبارہ چاند کے قریب پہونچے گا تو یہ کشش بڑھتی جائے گی اور اسوقت ضرورت ہوگی کہ غبارہ کو آہستہ آہستہ اُتارنے کے لئے مخالف سمت میں ہوائیاں سر کر کے اس کشش کا مقابلہ کیا جائے جو آسان کام نہیں۔ اور اگر اس میں کامیابی حاصل ہو بھی گئی تو جسوقت غبارہ سطح قمر پر اُترے گا تو سب سے بڑا اہم سوال اس سے باہر نکلنے کا ہوگا کیونکہ جس وقت دروازہ کھلیگا تو اس ہوا کی قوت سے جو غبارہ کے اندر ہے ہر شخص اور غبارہ کے اندر رکھی ہوئی ہر چیز گولی کی طرح باہر نکلے گی اس لئے ظاہر ہے کہ پہلے کسی چھوٹے سوراخ کے ذریعہ سے اس ہوا کو نکالنا پڑے گا اور کوئی ایسا معدنی ملبوس استعمال کرنا ہوگا جیسا پانی میں غوطہ لگاتے وقت استعمال کرتے ہیں، کیونکہ ہوا نہ ہونے کی وجہ سے معمولی لباس کا استعمال کرنا دشوار ہوگا۔

اب ان تمام مراحل سے گزرنے کے بعد جس وقت انسان سطح قمر پر قدم رکھے گا تو بہت ممکن ہے کہ وہ اس باریک غبار سے بالکل اٹ جائے جو لکھوکھا سال سے بغیر بارش اور ہوا کے وہاں پایا جاتا ہے اور وہاں کی سطح کرۂ ارض کے سطح کی طرح سخت و جامد نہ ہو، یا پھر یہ کہ وہاں کی سطح کانچ کی طرح ٹوٹ جانے والی ہو اور اس پر چلنا دشوار ہو۔

اسی کے ساتھ ایک بڑا مسئلہ حرارت و برودت کا ہے جس سے انسان کو دوچار ہونا پڑے گا۔ کیونکہ چاند کا وہ حصہ جو آفتاب کی طرف ہے وہ آگ کی طرح گرم ہوگا اور مخالف سمت میں حرارت صفر سے بھی ۲۹۵ درجے کم پائی جائے گی۔ اس لئے انسانی زندگی کے لئے دونوں سمت موافق نہیں۔

کھانا پکانے یا اپنے آپ کو گرم کرنے کے لئے آگ روشن کرنے کی بھی ضرورت ہوگی لیکن چاند میں اس کا امکان نہیں، کیونکہ اول تو وہاں ایندھن کہاں اور اگر ہو بھی تو ہوا اور آکسیجن کیونکر میسر آئیں گے جن کے بغیر آگ مشتعل نہیں ہو سکتی۔ ایک بڑی زحمت اور یہ ہوگی کہ اگر کھانا کسی طرح پکا لیا گیا تو اس کے کھانے کی کوئی تدبیر نہیں کیونکہ ظرف کا منھ کھولکر منھ کے اندر نوالہ رکھتے ہی ایسی تیز ہوا پیدا ہوگی کہ آنکھیں باہر نکل آئیں گی

ناک کان پھٹ کر خون بہنے لگے گا اور انسان فوراً مرجائے گا۔

بعض کا خیال ہے کہ سطح قمر پر ہوا برف کی طرح منجمد ہے۔ اور اس لئے اس منجمد برف کو غبارہ کے اندر رکھنے سے وہ آہستہ آہستہ گیس میں تبدیل ہوجائے گی اور انسان اس سے کام لے سکیگا۔ لیکن یہ خیال بالکل غلط ہے کیونکہ آفتاب کی طرف جو حصہ چاند کا رہیگا وہاں ہوا کے منجمد ہونے کا کوئی امکان نہیں اور گردش کے سلسلہ میں چاند کے دونوں سمت کا یکے بعد دیگرے آفتاب کی حرارت سے متاثر ہونا ضروری ہے۔

چاند میں چونکہ کسی ذی حیات کا وجود نہیں ہے اس لئے درندے اور جراثیم بھی وہاں نہ ہوں گے اور اس لحاظ سے انسان وہاں محفوظ ہے لیکن درندوں سے زیادہ خطرناک وہاں کے شہاب ثاقب اور چٹانیں ہیں جو اکثر گرتی رہتی ہیں اور ہوا نہ ہونے کی وجہ سے چونکہ کوئی آواز بھی پیدا نہیں ہوتی اس لئے اس خطرہ کی اطلاع بھی پہلے سے ہونا ممکن نہیں۔

چاند کے سیاح کے لئے یہ بھی ضروری ہوگا کہ وہ اپنے ساتھ ایک گاڑی کے تمام اجزاء لیجائے تاکہ انھیں جوڑ کر ایک گاڑی طیار کرسکے جس کی ہوا باہر نہ نکلے اور ایسی قوت سے اسے چلائے جس کے لئے ہوا کی ضرورت نہ ہو۔

آخر میں سوال وہاں سے واپس آنے کا پیدا ہوتا ہے، لیکن اس سوال پر وہاں پہونچنے سے قبل کوئی گفتگو کرنا بیکار ہے۔ الغرض چاند کا سفر ایسا آسان نہیں ہے اور وہ لوگ جو "چاند کی بڑھیا" کے سکون میں خلل ڈالنا پسند نہیں کرتے انھیں مطمئن رہنا چاہئے کہ علوم و فنون کی دنیا میں اکثر حضرات خواب بھی دیکھا کرتے ہیں اور یہ تمام باتیں اسی خواب کی ہیں۔

مطبوعات موصولہ

نجم السحر انگریزی ناول نویسوں میں رائڈر ہیگرڈ خاص شہرت کا مالک ہے اور مصر قدیم کے متعلق تو اسکے فسانوں نے غیر معمولی درجۂ قبول حاصل کیا ہے۔ اسی کا ایک ناول ہے جس کا ترجمہ مولوی عنایت اللہ صاحب بی اے دہلوی نے نجم السحر کے نام سے کیا ہے (صبح کا ستارہ شاید اس لئے پسند نہیں کیا گیا کہ اس نام کا ایک جرمن خضاب موجود ہے اور ستارۂ سحری اس لئے نہیں کہ یہ بالکل عجمی ترکیب ہے اور مصریات کی پُرہیبت داستانوں کی رعایت کے لحاظ سے اس میں وہ ثقل نہیں پایا جاتا جو نجم السحر میں ہے)

مولوی عنایت اللہ صاحب عرصہ تک دار الترجمہ حیدر آباد کے ناظم رہ چکے ہیں اور انگریزی کتابوں کے ترجمہ میں مہارت خصوصی رکھتے ہیں۔ ان کے ترجمہ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ حتی الامکان اصل کتاب کا کوئی لفظ ترک نہیں ہوتا اور با وصف اس پابندی کے بہت صاف و شگفتہ ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کتاب میں بھی یہی خصوصیت ہر جگہ نمایاں ہے اور اگر ان الجھنوں کو نظر انداز کر دیا جائے جو خود رائڈر ہیگرڈ کے شکل و دقیق انداز تحریر میں پائی جاتی ہیں تو کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس کتاب کو ترجمہ کی حیثیت حاصل ہے۔ اس فسانہ میں مصر قدیم کی نہ صرف تہذیب و معاشرت اور مذہبی زندگی کو نمایاں کیا گیا ہے بلکہ اس عہد کی سحر کاریوں کو بھی اس انداز سے پیش کیا ہے کہ قمر و جاہ کی داستان طلسم ہوشربا سامنے آجاتی ہے۔ کتابت و طباعت نہایت پسندیدہ ہے اور ع۲ میں ساقی بک ڈپو دہلی سے دستیاب ہو سکتی ہے۔

بہادر شاہ ظفر منشی امیر احمد صاحب علوی بی اے پنشنر ڈپٹی کلکٹر کی تصنیف ہے جو سراج الدین بہادر شاہ ظفر کے حالات زندگی اور ان کی شاعری سے بحث کرتی ہے۔

بہادر شاہ ظفر اس لحاظ سے کہ وہ مغل فرمانرواؤں میں سب سے آخری فرمانروا تھا، عہد مغلیہ کی تاریخ میں بالکل مقطع الکلام کی حیثیت رکھتا ہے اور اس لئے بہت زیادہ توجہ کا مستحق تھا، لیکن اسوقت تک کوئی کتاب مخصوص اس موضوع پر اُردو میں ایسی نہیں لکھی گئی تھی جو تاریخی و ادبی دونوں حیثیتوں سے قابل ذکر ہو۔ اس کتاب میں نہ صرف ظفر کی ولادت سے لیکر ان کی وفات تک کے تمام حوادث سیاسی پر ناقدانہ و

محققانہ نظر ڈالی گئی ہے بلکہ بہادر شاہ ظفر کی محلی زندگی اور اس وقت کی معاشرت کو بھی نہایت خوبی سے پیش کیا گیا ہے - آخری حصہ ظفر کی شاعری کے لئے وقف ہے اور اس پر حد درجہ لطیف تبصرہ کیا گیا ہے - الغرض تاریخی و تنقیدی حیثیت سے یہ کتاب اسوقت کی بہترین تصانیف میں شمار ہونے کے قابل ہے اور اگر ہم اس تصنیف کی زبان و انشاء اور اس کی ادبی خوبیوں کو سامنے رکھیں تو ہم کو ماننا پڑتا ہے کہ اردو زبان میں شاید ہی اسوقت تک دو چار کتابیں ایسی شایع ہوئی ہوں جن میں تاریخ ایسے خشک بحث کو محض زور انشاء سے اتنا دلچسپ بنا دیا گیا ہو۔

منشی امیر احمد صاحب علوی، متعدد تاریخی تصانیف کے مصنف ہیں اور ان کے انداز تحریر کی یہ دلکش خصوصیت سب میں پائی جاتی ہے، لیکن چونکہ ظفر کے حالات خود بہت دلدوز ہیں، اس لئے منشی صاحب کی تحریر کی اثر آفرینی بھی اس میں اپنی انتہائی درجہ کو پہونچ گئی ہے اور ممکن نہیں کہ کوئی شخص اس کی پہلی سطر پڑھنے کے بعد آخری سطر تک پہونچنے پر مجبور نہ ہو۔

ناظرین نگار میں سے بعض حضرات اب بھی نگار کے ظفر نمبر کی جستجو میں ہیں اس لئے ان کو خوش ہونا چاہئے کہ اس ظفر نمبر سے بہتر ایک چیز ان کے سامنے موجود ہے اور امیر محل لائبریری، کاکوری لکھنؤ سے ؏ عہ میں اسے حاصل کر سکتے ہیں۔

سحر بنگال | مجموعہ ہے جناب طاہرہ دیوی شیرازی کے ان چند افسانوں کا جو اسوقت تک مختلف رسایل و جرائد میں شایع ہو چکے ہیں - ان میں سے تین افسانے تو وہ ہیں جو نگار میں شایع ہوئے ہیں اور باقی وہ جو ساقی اور ہمایوں وغیرہ کے لئے باعث زینت ہوئے۔

طاہرہ دیوی شیرازی اپنے نام کی اس عجیب و غریب ترکیب کے لحاظ سے کیا ہیں، اس کا ذکر میں نگار میں ایک بار کر چکا ہوں اور بہ حیثیت ادیب ہونے کے ان کا کیا مرتبہ ہے۔ اس پر بھی اپنی رائے اُن کے ایک افسانہ (سکون کی جستجو) کو شایع کرتے ہوئے میں نے ظاہر کر دی تھی - چونکہ طاہرہ دیوی نے سرزمین بنگال کی فسانہ خیز فضا میں پرورش پائی ہے اس لئے یوں بھی انھیں ایک اچھا فسانہ نگار ہونا چاہئے تھا، لیکن خوش قسمتی سے انھیں فرانسیسی و فارسی ادبیات کے مطالعہ کا موقعہ بھی مل گیا اس لئے ان کے اس ذوق میں اور زیادہ لطافت و پاکیزگی پیدا ہو گئی ہے۔

اس کتاب کو انھوں نے میرے نام سے منسوب کیا ہے یعنی عمر میں بالکل پہلی مرتبہ مجھ کو اس حقیقت پر غور کرنے کی دعوت دی گئی ہے کہ "بلبل" کا ہم قافیہ "گل" ہونا واقعی کوئی قابل فخر امر ہے یا قابل رحم —

اس مجموعہ میں مصنفہ کی تصویر بھی شامل ہے اور میری بھی لیکن دونوں میں پورے چھ صفحات کی دیوار حایل ہے — یہ کتاب بھی ساقی بک ڈپو کے منشورات ادب میں سے ہے اور نفیس کتابت و طباعت

کے ساتھ مجلد شایع کی گئی ہے ۔ قیمت عہ ہے ۔

آہنگ رزم مجموعہ ہے جناب وقار انبالوی کی چودہ رزمیہ نظموں کا ۔ رزمیہ نظموں کے لئے الفاظ وخیالات دونوں خاص ہوا کرتے ہیں اور جب تک ان میں توافق نہ ہو، کامیابی مشکل ہے ۔

اس مجموعہ میں اکثر نظمیں ایسی ہیں جو اس توافق سے خالی ہیں اور بعض میں اگرچہ ہم آہنگی پائی بھی جاتی ہے تو اس قدر ضعیف کہ اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے ۔ جذبات حماست آورد کی چیز نہیں ہے بلکہ پیدا ہوتے ہیں دل کے اس جوش سے جو انسان کو سرفروشی پر آمادہ کر دیتا ہے ۔ اس لئے اگر ہندو اہل ہند کے موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے ہم وقار صاحب کی نظموں میں اس جوش کا فقدان محسوس کرتے ہیں تو موردِ الزام وہ نہیں ہیں بلکہ ساری قوم ہے جو اس جذبہ کو عرصہ ہوا کھو چکی ہے ۔

اس سے قطع نظر، محض ادبی، شاعرانہ محاسن کے لحاظ سے البتہ اس مجموعہ میں بہت سی چیزیں ایسی پائی جاتی ہیں جو جناب وقار انبالوی کی قدرتِ نظم کے ثبوت میں پیش کی جا سکتی ہیں محاورہ یا فن کی غلطیاں بھی اس میں ہیں لیکن نہ اسقدر کہ محاسن پر غالب آجائیں، یہ مجموعہ ایک روپیہ میں جناب وقار انبالوی سے مزنگ لاہور کے پتہ پر مل سکتا ہے ۔

نوائے تلخ اس کے مصنف کوئی صاحب مسٹر اشفاق ہیں اور تصنیف کا موضوع عورتوں کی معاشری اصلاح ہے مصنف نے ایک خیالی جلسہ کر کے اس میں اس موضوع پر تقریر کی ہے اور پھر خواتین نے اس کا جواب دیا ہے ۔ تقریر اپنی تفصیل کے لحاظ سے بہت جامع ہے اور اسی طرح عورتوں کا جواب بھی ہندوستان کی نسائی ذہنیت کے اعتبار سے بہت مکمل ۔ اس میں چند خطوط بھی شامل ہیں جن میں عورتوں نے اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے ۔

کتاب فی الجملہ مطالعہ کے قابل ہے اور چونکہ ہندوستان کی عورت کا مستقبل اس وقت کا نہایت اہم موضوع ہے اس لئے اس اشاعت کے برمحل ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا ۔

عربوں کی جہازرانی مجموعہ ہے سید سلیمان ندوی کے چار خطبوں کا جو اسلامک ریسرچ اسوسی ایشن بمبئی نے کتابی صورت میں پیش کئے ہیں ۔ ان خطبوں میں نہایت تحقیق و وضاحت کے ساتھ عربوں کی بحری خدمات اور فن جہاز رانی کی ترقیوں کا ذکر کیا گیا ہے اور اردو میں اس موضوع پر یہ بالکل پہلی کتاب ہے جو اسقدر بسط و تفصیل کے ساتھ لکھی گئی ہے ۔ یہ کتاب اسوسی ایشن نے مجلد شائع کی ہے اور کاغذ و طباعت وغیرہ کے لحاظ سے نہایت دلکش ہے ۔ ایک روپیہ میں سکریٹری اسلامک ریسرچ اسوسی ایشن ۳۴ چوپاٹی روڈ بمبئی سے مل سکتی ہے ۔

یادگار اظہر سید دلدار حسین صاحب اظہر الہ آبادی کی منظوم مناجات ہے جس میں تمام مشہور اسمار الٰہی کے جمع کرنے کا اہتمام خاص طور پر کیا گیا ہے، زبان صاف ہے اور طرز بیان اثر آفریں - اخیر میں بعض مسیحی اشعار کی شرح بھی شامل کردی ہے اور مشکل الفاظ کی فرہنگ بھی ــــ

یہ کتاب نفیس کاغذ پر مجلد شایع ہوئی ہے اور طباعت بہت پاکیزہ ہے - اس کے مصنف مدرسہ دارالشفا، حیدر آباد میں فارسی پڑھاتے ہیں، جن صاحب کو ضرورت ہو اُن سے طلب کرلیں - قیمت درج نہیں ہے -

مصری افسانے مصر کے مشہور فاضل و اہل قلم سید مصطفیٰ لطفی کے چند افسانے ہیں جنھیں قاضی زین العابدین صاحب سجاد میرٹھی نے اُردو کے ملبوس میں پیش کیا ہے ــ

تمام مصری اہل قلم اس خصوصیت میں شریک ہیں کہ ان کی ہر تحریر کا نشانہ آزادی وطن، اور حُب قومی کا جذبہ ہوا کرتا ہے، چنانچہ زیرِ نظر افسانے بھی ان جذبات سے مالا مال ہیں، ترجمہ بڑی حد تک صاف و سلیس ہے گو زبان اور محاوروں کی غلطی سے پاک نہیں - مترجم نے اپنی تصویر تو اس میں شامل کردی ہے لیکن لطفی غریب کو اس قابل نہیں سمجھا -

یہ کتاب مترجم سے مطبع مجتبائی میرٹھ کے پتہ پر ۸ میں مل سکتی ہے -

ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش ترجمہ ہے خالدہ ادیب خانم کے اُن آٹھ لکچروں کا جو انھوں نے چند ماہ پہلے جامعۂ ملیہ اسلامیہ دہلی میں دئے تھے - خالدہ ادیب خانم بین الاقوامی شہرت رکھنے والی خاتون ہیں اور بہ لحاظ علم و فضل خاص مرتبہ کی مالک سمجھی جاتی ہیں -

انھوں نے اپنے خطبات میں ترکوں کی تمام تاریخ پر (عہد قدیم سے لیکر اسوقت تک) وہ واقفکارانہ تبصرہ کیا ہے جو ایک غیر ترک سے کسی طرح ممکن ہی نہ تھا - یہ خطبات انگریزی میں دئے گئے تھے، جنکا ترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے کیا ہے یعنی جیسا خطبہ دینے والا تھا ویسا ہی ترجمان اسکو نصیب ہوا ــ اسوقت مصطفےٰ کمال اتاترک نے ترکی کو تمام دنیا کی توجہ کا مرکز بنا رکھا ہے یہاں تک کہ ہندوستان میں بھی اکثر حضرات ترکی کی تاریخِ انقلاب اور اس کے حال و مستقبل سے دلچسپی لینے والے ملجاتے ہیں - اس لئے اس کتاب کی اشاعت نہایت برمحل ہے اور ہر اس شخص پر اسکا مطالعہ فرض ہو جو سلطنت ترکی سے کچھ بھی دلچسپی رکھتا ہے - جامعۂ ملیہ اسلامیہ دہلی نے اسے شایع کیا ہے اور دو روپیہ میں وہیں سے مل سکتی ہے -

دو خدائی خدمتگار ترجمہ ہے مہادیو ڈیسائی کی کتاب کا جس میں انھوں نے خان عبدالغفار خاں

اور ان کے بھائی ڈاکٹر خاں کے حالات خود انھیں کے زبانی قلمبند کئے ہیں۔ ان دونوں بھائیوں کو سیاسیات ہند میں جو شہرت حاصل ہے وہ محتاج بیان نہیں اس لئے قدرتاً ہر شخص ان کے حالات معلوم کرنے کا متمنی رہتا ہے اور ضرورت تھی کہ ایسی کوئی کتاب مرتب کی جاتی۔ یہ حالات مہاتما گاندھی کی فرمایش پر مہادیو ڈیسائی نے انگریزی میں مرتب کئے تھے اور اب اس کا ترجمہ محمود علی خانصاحب نے کیا ہے۔ ترجمہ شگفتہ اور سلیس ہے۔ یہ کتاب بارہ آنے میں مکتبۂ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی سے مل سکتی ہے۔

انجام ڈراما ہے جناب محمد مجیب بی اے (آکسن) پروفیسر جامعہ ملیہ دہلی کا جو اس سے قبل رسالۂ جامعہ میں شائع ہو کر بہت پسند کیا جا چکا ہے۔

اس ڈرامہ کا موضوع یہ ظاہر کرنا ہے کہ طاعت و مذہب کا عام طور پر کتنا غلط مفہوم سامنے ہوتا ہے اور اس پردہ میں لوگ کیا کیا حرکتیں کرتے ہیں۔

مجیب صاحب کو ڈرامہ لکھنے میں خاص سلیقہ حاصل ہے اور وہ اس فن کی تمام خصوصیات کو سامنے رکھ کر پلاٹ کو اس قدر دلچسپ بنا کر پیش کرتے ہیں کہ شروع سے اخیر تک ذوق کی آسودگی یکساں قایم رہتی ہے۔

اس کی قیمت بارہ آنے ہے اور مکتبۂ جامعۂ ملیہ دہلی سے ملسکتا ہے۔

خوشۂ پروین یعنی جناب فضل الدین فدا کے منتخب اشعار جنھیں سید کاظم دہلوی اڈیٹر کہکشاں نے شایع کیا ہے۔ ابتدا میں جناب کاظم اور برہمی جہاں آبادی نے حضرت فدا کی شاعری کے محاسن پر بھی روشنی ڈالی ہے اور کافی حسن ظن کے ساتھ۔

اس مجموعہ میں بہت کم شعر ایسے ہیں جو صحیح معنے میں شعر کہلائے جائیں، لیکن ان کے مطالعہ سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ جناب فدا کی موجودہ شاعری اپنے اندر ایک اچھا مستقبل پوشیدہ رکھتی ہے اور اس لئے بہتر ہوتا اگر انتخاب کی اشاعت میں چندے اور توقف کیا جاتا۔ یہ انتخاب ہم ہمیں دفتر کہکشاں دہلی سے مل سکتا ہے۔

مجموعۂ استفسار و جواب جلد دوم

چھپ کر طیار نہیں ہوا ہے، اس لئے دوسری طیار شدہ کتابوں کے ساتھ اس کا آرڈر دینا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ جس وقت یہ مجموعہ شائع ہوگا، اس کی اطلاع ذریعہ نگار سب کو ہو جائے گی اور اسی وقت قیمت بھی [illegible] ابھی نہیں کہا جا سکتا کہ اسکی ضخامت و قیمت کیا ہوگی۔ مینیجر نگار۔ لکھنؤ

اے مرے گریۂ خوناب کہاں پاؤں تجھے

شوق بیتاب ہے مدت سے ہم آغوش سکوں عشق ہشیار ہے نامحرم اسرار جنوں
اب نہ وہ جوشِ تمنا ہیں نہ اشکوں میں وہ خوں سرنگوں ہیں مگر شوخ کے سارے افسوں

اے مرے گریۂ خوناب کہاں پاؤں تجھے

آکہ اب عشق ہے بیداری مدہوشئ دل حرم ہوش میں مسدود ہے سرگوشئ دل
خندۂ مہر بن اور توڑ خنک جوشئ دل یاد بھی ہے تجھے وہ کیف ہم آغوشئ دل

اے مری مستئ نایاب کہاں پاؤں تجھے

بزم انجم مجھے پھر سر بگریباں دیکھے خندہ ماہ مرا سوز درخشاں دیکھے
دل کو طول شب خاموش پریشاں دیکھے آمد صبح مری دید کا ارماں دیکھے

اے مری کشمکش خواب کہاں پاؤں تجھے

چاند کی خواب اثر نظریں ہوں لب دوز نشاط برق کی زندہ دلی ہو طپش آموز نشاط
شعلۂ چشم فسونگر ہو چمن سوز نشاط اے محبت کی سحر حاصل صد روز نشاط

کاوشیں ہیں مری بیتاب کہاں پاؤں تجھے

سید رشید احمد صہبا واسطی

ڈراما اصحاب کہف

ابھی طیار نہیں ہوا ہے۔ اس لئے کوئی صاحب اس کا آرڈر ابھی نہ دیں یہ ڈراما ۳۱ر جنوری ۱۹۳۶ء کے بعد شایع ہوگا اور صرف انھیں حضرات کو مل سکے گا جو نگار کے خریدار ہیں۔

جو اصحاب اس کی قیمت بھیج چکے ہیں وہ اسے واپس لے سکتے ہیں اگر اتنا انتظار انھیں گوارا نہ ہو۔

منیجر نگار- لکھنؤ

مُفلِس

رعد ہوں، برق ہوں، طوفان ہوں، پارہ ہوں میں — خود پرستار، خود آگاہ، خود آرا ہوں میں
گردنِ ظلم کٹے جس سے وہ آرا ہوں میں — خرمنِ جور جلا دے، وہ شرارہ ہوں میں

میری فریاد پہ اہلِ دول انگشت بہ گوش ؟
لا تبر، خون کے دریا میں نہانے دے مجھے

سر پرِ نخوتِ اربابِ زماں توڑوں گا — شورِ نالہ سے درِ ارض و سماں توڑوں گا
ظلم پرور روشِ اہلِ جہاں توڑوں گا — عشرت آباد امارت کا مکاں توڑوں گا

توڑ ڈالوں گا میں زنجیرِ اسیرانِ قفس
دہر کو نکبتِ عسرت سے چھڑانے دے مجھے

رسمِ کہنہ کو تہِ خاک ملانے دے مجھے — برق بن کر بتِ ماضی کو گرانے دے مجھے
تفرقے مذہب و ملت کے مٹانے دے مجھے — خوابِ فردا کو بس اب حال بنانے دے مجھے

آگ ہوں، آگ ہوں، ہاں ایک دہکتی ہوئی آگ
آگ ہوں آگ، بس اب آگ لگانے دے مجھے

مخدوم محی الدین۔ بی۔ اے (عثمانیہ) حیدرآباد دکن

گزشتہ جنوری کا نگار

اُردو شاعری کے لئے وقف تھا اور ۶ سو ۲ صفحات پر شائع ہوا تھا۔ ارباب قلم کی متفقہ رائے ہے کہ نگار کے اس اشاعت نے اُردو شاعری کے متعلق تمام تذکروں سے بے نیاز کر دیا ہے، چنانچہ بعض کالجوں میں صرف اسی کا پڑھانا کافی سمجھا جاتا ہے۔ اس نمبر کا تقریباً نصف حصہ اڈیٹر کے قلم کا ہے اور اپنی جامعیت و انداز بیان کے لحاظ بالکل نئی چیز ہے۔ اس سے قبل مومن نمبر، ظفر نمبر وغیرہ نگار کے نکلے اور ختم ہوگئے۔ اب لوگ طلب کرتے ہیں اور وہ کسی قیمت پر نہیں ملسکتے۔ چند دن کے بعد یہی حال اس نمبر کا بھی ہوگا۔ اس لئے اب بھی وقت ہے کہ اس کی ایک جلد آپ طلب کریں۔ قیمت علاوہ محصول دو روپیہ (عہ)

منیجر نگار لکھنؤ

حریت فکر اور اشاعت علم کے خلاف مذہب کی جنگ

ہیکل منروا سے متصل خانقاہ سنتا میریا کے درمیانی کمرہ میں ایک لانبی میز بچھی ہوئی ہے اور اس کے چاروں طرف مفتیان مذہب عیسویت کی جماعت حلقہ کئے ہوئے بیٹھی ہے۔ سامنے ستر سال کا ایک ضعیف انسان جس کے بال برف کے گالے کی طرح سفید ہیں سر جھکائے ہوئے دوزانو نظر آتا ہے۔ کمرہ تماشائیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا ہے۔ دفعتاً مفتی اعظم کھڑا ہو جاتا ہے اور ایک کاغذ کھول کر بلند آواز سے اس فیصلہ کو سُناتا ہے جو مذہب کی طرف سے اس ضعیف گنہگار کے خلاف صادر ہوا ہے۔

ایک دوسرا کاغذ مجرم کے ہاتھ میں دیا جاتا ہے اور حکم دیا جاتا ہے کہ بلند آواز سے پڑھ کر سب کو سُنائے، چنانچہ وہ اسے پڑھتا ہے اور انجیل مقدس پر ہاتھ رکھ کر اس کاغذ پر دستخط کرتا ہے اور خانقاہ سے باہر نکال دیا جاتا ہے۔

یہ تھا مقدس منظر اُس مقدس فیصلہ کا جو معمر گلیلو کے خلاف سنایا گیا اور صرف اس معصیت پر کہ وہ اپنے عہد کا سب سے بڑا ہیئت داں تھا اور یہ کہا کرتا تھا کہ زمین آفتاب کے گرد گھومتی ہے۔

فروری ۱۵۶۴ء کی ۱۸ تاریخ تھی کہ گلیلو بمقام پیسا (Pisa) پیدا ہوا یعنی ٹھیک اس تاریخ میں جب میکائیل انجلو کا انتقال ہوا اور جس کے چند ہفتے بعد شیکسپیر عالم وجود میں آیا۔ اسی سال جان کالون کا بھی انتقال ہوا۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ گلیلو کی پیدائش اس زمانہ میں ہوئی جب دنیا کچھ بہتر ہو چلی تھی۔

اس کا باپ (ونسنزو گلیلی) فلارنس کے ایک شریف گھرانے کا آدمی تھا اور اس کی ماں (جولیا) بھی ایک قدیم معزز خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔

گلیلو ابھی بہت چھوٹا تھا کہ اس کے والدین فلارنس چلے آئے جہاں ان کی مستقل سکونت تھی۔ اسکا باپ خاصہ پڑھا لکھا آدمی تھا اور اس نے موسیقی پر ریاضی کے نقطۂ نظر سے کچھ جدید نظریے پیش کر کے کافی شہرت حاصل کر لی تھی۔ گلیلو کی ابتدائی تعلیم اول اول ایک پرائیویٹ ٹیوٹر کے ذریعہ سے ہوئی اور اس کے بعد خانقاہ ولمبروسا بھیجدیا گیا۔ یوں تو اُسے ادب قدیم کے مطالعہ کا بھی شوق تھا، نظم سے بھی لگاؤ تھا، لیکن سب سے زیادہ رجحان علوم حکمیہ کی طرف تھا۔ اسی لئے اس کے باپ نے کلیسۂ پیسا میں فن طب کی تعلیم کے لئے اسے بھیجدیا (۱۵۸۱ء)

یہ وہ زمانہ تھا جب یورپ کی یونیورسٹیوں میں صداقت کا معیار صرف ارسطو کے نظریوں کو سمجھا جاتا اور یونان قدیم کے اس مفکر کے خلاف کچھ کہنا گویا خدا کی خدائی سے انکار کرنا تھا۔ لیکن گلیلو ان معمولی لوگوں میں سے نہیں تھا جو ارسطو کے اقوال پر بغیر سوچے سمجھے ایمان لے آتا۔ وہ ان پر غور کرتا تھا اور بہت سی باتوں میں اس کا مخالف تھا۔

اس کی غیر معمولی ذہانت اور اخذ نتائج کی قوت کا ایک واقعہ اس جگہ بیان کرنا غالباً دلچسپی سے خالی نہ ہوگا ایک دن اپنے عنفوان شباب کے زمانہ میں گلیلو کسی گرجا میں پہونچا اور اس کی نگاہ ایک فانوس پر پڑی جو محراب میں لٹکا ہوا تھا۔ ملازم کلیسا نے اس فانوس کو ایک طرف ہٹا کر روشن کیا اور چھوڑ دیا۔ فانوس اِدھر اُدھر جھولنے لگا۔ یہ منظر گلیلو سے قبل ہزاروں لاکھوں آدمیوں کے سامنے آیا ہوگا، لیکن اس نے جس نگاہ سے دیکھا وہ کچھ اور تھی۔ اس نے غور کیا کہ فانوس کے اہتزاز میں رفتہ رفتہ کمی پیدا ہوئی یہاں تک کہ وہ عمودی خط میں پھر اپنی اصلی جگہ آ گیا، لیکن یہ عجیب بات تھی کہ اس کے تمام اہتزازات میں وقت ایک ہی صرف ہوا، یعنی اگر پہلا لمبا اہتزاز ایک سکنڈ میں ہوا تھا تو دوسرا اس سے کم لمبا بھی ایک ہی سکنڈ میں ختم ہوا یہاں تک کہ اس کی آخری جنبش بھی جس نے بہت ہی کم جگہ لی تھی اتنے ہی وقفہ میں پوری ہوئی۔ اس کا یہ اکتشاف Isochronism (تساوی الزمن) کہلاتا ہے اور سب سے پہلے اسی نے کلاک میں وقت کی پیمایش کے لئے اس اُصول کو استعمال کیا۔

اتفاق سے اسی زمانہ میں اس کی ملاقات ایک مشہور ریاضی داں ونسنزو (Vincenzo) سے ہوگئی اور اس نے باوجود اپنے باپ کی مخالفت کے ریاضیات اور طبیعیات کا مطالعہ شروع کر دیا، لیکن چونکہ اقتصادی حالت عرصہ تک یونیورسٹی کی تعلیم جاری رکھنے کی موافق نہ تھی اور لوگوں کی مخالفت کے خیال سے ٹسکنی کے ڈیوک نے بھی کوئی مدد اس کی نہیں کی اس لئے اُسے یونیورسٹی کی تعلیم ترک کرنا پڑی۔

اب اس نے گھر بیٹھ کر اپنا مطالعہ وسیع کرنا شروع کیا اور علمی تجربات و تحقیقات میں پورے انہماک کے ساتھ لگ گیا۔ اس نے آرشمیدس کا بھی مطالعہ کیا جسے یورپ عرصہ سے فراموش کر چکا تھا اور اسی سلسلہ میں اپنے "توازن مایعات" (Hyrostatic balance) کا اکتشاف کیا جس کی مدد سے جواہر کا ثقل نوعی نہایت صحت کے ساتھ دریافت ہو سکتا تھا۔

اس دوران میں گلیلو کی رقاص والی گھڑیاں کثرت سے بننے لگی تھیں اور بجائے دھوپ گھڑی کے ان کا رواج تمام یورپ میں ہو گیا تھا۔ اور وہ اس قدر مشہور ہو گیا کہ پیسا یونیورسٹی نے اس کو ریاضی کا پروفیسر بنانا منظور کر لیا۔ اس وقت اس کی عمر ۲۵ سال کی تھی۔

اب اسے زیادہ اطمینان کے ساتھ کام کرنے کا موقعہ ملا اور اسی زمانہ میں اس نے وہ زبردست انقلاب انگیز انکشاف کیا جسے "کشش ثقل" کہتے ہیں اور جس کا نام ہی "قانون گلیلو" پڑ گیا۔ اس سے قبل ارسطو نے جو نظریہ "کشش ثقل" کا قائم کیا وہ یہ تھا کہ کسی ٹھوس چیز کی رفتار جب وہ زمین کی طرف مائل ہو منحصر ہے اس چیز کے وزن پر۔ یعنی ایک چیز جس قدر زیادہ وزنی ہوگی اتنی ہی سرعت کے ساتھ زمین کی طرف جائے گی۔ دو ہزار سال سے اسی نظریہ پر سب کا ایمان تھا اور کسی میں ہمت نہ تھی کہ وہ اس کے خلاف کوئی لفظ منھ سے نکال سکے۔ لیکن گلیلو نے منارۂ پیسا پر چڑھکر خود اس کا عملی تجربہ کیا اور آخر کار اس نے ارسطو کے اس نظریہ کی تردید کرکے اعلان کیا کہ جو اجسام ہلکے ہوں یا بھاری سب کو زمین تک پہونچنے میں ایک ہی وقت درکار ہوتا ہے اور اس طرح ایک اور اہم قانون فطرت کا انکشاف اس نے کیا۔

اس پر لوگوں میں بہت برہمی پیدا ہوئی اور ارسطو کے طرفداروں نے اسے یونیورسٹی چھوڑنے پر مجبور کردیا۔ اس کے بعد وہ مارکوس ڈل مانٹی کی مدد سے جو گلیلو کا بہت معترف تھا پڈوا یونیورسٹی میں ریاضی کا پروفیسر ہوگیا یہ واقعہ ۱۵۹۲ء کا ہے۔

یہاں پہونچکر وہ اپنے تجربات میں زیادہ انہماک کے ساتھ مصروف ہوگیا اور ۱۵۹۹ء میں ایک ہوشیار میکانک کی خدمات حاصل کرکے عملی طور پر اپنے تمام نظریوں کا امتحان کرنے لگا۔ گلیلو کے اختراعات و انکشافات بہت ہیں اور انھیں میں سے ایک تھرمامیٹر ہے جسے ۱۶۰۲ء میں اس نے ایجاد کیا[1]۔

لیکن اس کی اہم ترین ایجاد جس نے فلکیات کے قدیم نظریوں کو درہم برہم کرکے رکھدیا اور جو اس کے تکالیف و مصائب کا باعث بھی ہوئی، "دوربین" تھی۔ ۱۶۰۹ء میں جب شکسپیر ڈرامے لکھنے میں مصروف تھا، گلیلو دوربین کے شیشوں کو اپنے ہاتھ سے گھس گھس کر چکنا بنا رہا تھا۔ ہر چند دوربین کا خیال اس سے قبل ڈچ کا ایک عینک ساز پیش کر چکا تھا، لیکن گلیلو نے اس سے بالکل علحدہ خود اپنی قوت فکر سے کام لے کر اس کام کو شروع کیا۔ گلیلو نے اسی زمانہ میں اپنے برادر نسبتی لان ڈوسی کو ایک خط لکھا جس کا اقتباس یہاں پیش کیا جاتا ہے۔ وہ لکھتا ہے:-

> "دو مہینے ہوئے جب یہاں ایک خبر اُڑی کہ فلانڈرس کے کسی آدمی نے ایک ایسا آلہ طیار کیا ہے جس سے دو میل کی چیز بھی صاف نظر آتی ہے۔ میں یہ سنکر بہت متعجب ہوا اور سوچنے لگا کہ ایسا ہونا کیونکر ممکن ہے۔ آخر کار میں اس میں کامیاب ہوگیا اور ایسی قوی دوربین

---

[1] اول اول درجۂ حرارت کی پیمائش میں پانی سے مدد لیگئی، بعد کو اسپرٹ سے اور پھر اس کے بہت زمانہ بعد پارہ سے کام لیا گیا۔

طیار کرلی کہ وینس - کے تمام اکابر و امرار دیکھ کر حیران رہ گئے - کیونکہ اس سے پچاس میل کا فاصلہ صرف پانچ میل رہجاتا ہے "

دوربین طیار کرنے کے بعد گلیلیو نے سب سے پہلے آسمان اور اس کے ستاروں کا مشاہدہ اس کے ذریعہ سے کیا اور وہ یہ دیکھ کر حیران رہگیا کہ جتنے ستارے عُریاں آنکھ سے نظر آتے ہیں اُن سے کہیں زیادہ دوربین سے دکھائی دیتے ہیں - اس ایجاد نے ہیئت کے نظام بطلیموسی کو سخت صدمہ پہونچایا جس کا یوروپ معتقد تھا اور جو بتاتا تھا کہ ستارے کسی ایسی ٹھوس دیوار میں جڑے ہوئے ہیں جو زمین کے چاروں طرف قایم ہے - کیونکہ گلیلیو نے اپنی دوربین کے ذریعہ اس امر کو ثابت کیا کہ ستارے زمین سے مختلف دوریوں پر واقع ہیں اور اس لئے ان کا ایک ہی سطح پر جڑا ہوا سمجھنا درست نہیں - اسی سلسلہ میں اس نے کہکشاں کا مطالعہ بھی دوربین سے کیا اور لوگوں کو بتایا کہ یہ روشن سڑک مجموعہ ہے بیشمار ستاروں کا جو فضا میں مختلف دُوریوں پر پائے جاتے ہیں - اس نے یہ بھی دریافت کیا کہ کرۂ مشتری کے چار چاند ہیں[1]، اس نے یہ بھی بتایا کہ زحل کے چاروں طرف ایک منور حلقہ پایا جاتا ہے اور چاند کے جغرافیہ پر بھی کچھ روشنی ڈالی - یہ باتیں ایسی تھیں کہ دنیا سُنکر حیران رہگئی اور دوربینوں کی مانگ اسقدر بڑھ گئی کہ اس کا پورا کرنا مشکل ہوگیا -

اب گلیلیو کی شہرت اتنی وسیع ہو گئی کہ ٹسکنی کے گرانڈ ڈیوک نے اسے فلارنس واپس بلا لیا اور یہاں اسنے اطمینان سے سیاروں کی گردش کا مطالعہ کرکے نظام کوپرنکیس کا اعلان کیا جو زمین کی گردش کا حامی تھا - لیکن ٹھیک اسی وقت جب اس کے علمی انکشافات دنیا سے خراجِ تحسین وصول کر رہے تھے، فلارنس اور روم کی قدامت پرست مذہبی جماعتیں اس سے بیزار تھیں اور سمجھتی تھیں کہ گلیلو مذہب کا دشمن ہے، وہ صحف مقدسہ کے بتائے ہوئے اُصول ہیئت کے خلاف اس کے انکشافات دنیا میں بیدینی پھیلانے والے ہیں چنانچہ فلارنس ہی میں ایک جلسہ اس کے خلاف منعقد ہوا اور اس میں ایک مذہبی واعظ نے لوگوں کو سمجھایا کہ زمین کی حرکت کا قایل ہونا انجیل کی مخالفت ہے اور اس لئے تمام ایسے لوگوں کو جو علم کے نام سے مذہب و تعلیمات مذہب کی مخالفت کرتے ہیں سخت سزا دینا چاہئے -

گلیلو نے یہ حالات معلوم کرکے پادری کاسٹلی کو ایک دوستانہ خط لکھا کہ " حرکت زمین کی تردید کسی جگہ انجیل میں نہیں پائی جاتی اور اسی کے ساتھ یہ بھی التجا کی کہ خدا کے لئے علمی تحقیقات میں رخنہ اندازی نہ کیجئے " اتفاق سے یہ خط راہب فادر لورینی کے ہاتھ پڑگیا اور اس نے اس کی ایک نقل روم کی مذہبی عدالت

---

[1] اب زیادہ قوی دوربینوں کی مدد سے ان اقمار کی تعداد بجائے چار کے نو معلوم ہوئی ہے -

قتال و جدال برپا کر دیا ہے۔ چھوٹی چھوٹی لڑائیوں کو جانے دو جنگ عظیم پر نظر ڈالو بجز اس کے اور کونسا جذبہ کارفرما تھا ہر قومی ملک کمزوروں کو صرف اس لئے غلام بنانے کی فکر میں ہے کہ اس کے لئے نیا بازار پیدا ہو جائے اور سرمایہ دار اپنی مشینوں کی پوری قوت وہاں کی دولت چھین لینے میں صرف کردے۔

سعید —— لیکن تمھیں معلوم نہیں مزدور بھی اب غافل نہیں ہیں۔ آہستہ آہستہ منظم ہوتے جارہے ہیں گو یہ رفتار بہت سست ہے۔ میں تمھیں سمجھاؤں گا کہ ان کی یہ تنظیم کسی کی سعی و کاوش کی مرہون منت نہیں بلکہ از خود ہوتی جارہی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اکثر مقابلہ کا جذبہ انھیں مغلوب کرکے اس اتحاد میں رخنہ پیدا کردیتا ہے۔ لیکن وہ دن دور نہیں جب ایک بین الاقوامی اتحاد مزدوروں میں رونما ہو کر سرمایہ داری کو ہمیشہ کے لئے فنا کردے گا۔ متوسط طبقہ بھی مزدوروں سے متحد ہوتا جارہا ہے اس لئے کہ ان کی معیار زندگی کا برقرار رہنا دوسری صورت میں ممکن نہیں ...... اچھا اب اس اجمال کی تفصیل......

اجنبی —— خیر، ہوگا میں ان فضول باتوں میں زیادہ وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا کام کی بات کرو۔

سعید —— میں تمھیں کتنی کام کی بات بتا رہا تھا جس پر دنیا کی تمام آیندہ نسلوں کی حیات و موت کا انحصار ہے۔

اجنبی —— یہ باتیں میرے کس کام کی مجھے تو اس زمانہ کے مطابق چلنا ہے اور زندہ رہنے کے لئے جان پر کھیل کر روپئے حاصل کرنا۔ میرے یہاں آنے کی غرض تم سے افسانہ سننا نہیں ہے۔

سعید —— پھر کیا چاہتے ہو۔ ایں! تمھاری یہ داڑھی بھی مصنوعی معلوم ہو رہی ہے!!

اجنبی —— چاہتا کیا ہوں؟ یہ تمھاری سمجھ میں نہیں آیا، انسانی دماغ کے بڑے بڑے راز تو جان لیتے ہو لیکن ایسی معمولی بات نہیں سمجھتے! میری داڑھی نقلی سہی کام تو اصلی کے برابر ہی دیتی ہے۔

سنو! اور کان کھول کر سنو! میں جانتا ہوں کہ آج تم بنک سے ایک ہزار کے نوٹ برآمد کرکے لائے ہو۔ اسوقت سے برابر میں تمھیں تاکتا رہا ہوں، ابتک کمرہ سے باہر کہیں نہیں گئے بتاؤ کس بکس میں ہے۔ لاؤ کنجی لاؤ۔

یہ کہتے کہتے اجنبی نے پستول کی نالی اس کے سر سے لگادی۔

سعید —— (کچھ سوچکر) اچھا بیٹھ جاؤ میرے دوست جلدی کیا ہے۔ میں خود تمھارے حوالہ کئے دیتا ہوں —— بکس کھولنے کی زحمت تمھیں کیوں دوں۔

اجنبی —— خبردار! اپنی جگہ سے اگر ذرا بھی حرکت کی تو میں تمھیں ہمیشہ کے لئے خاموش کردوں گا۔

سعید نے چپ چاپ کنجی کا گچھا اس کے حوالہ کیا اور ایک بکس کی طرف اشارہ کیا۔ اجنبی آگے بڑھا سعید نے میز سے ٹیلیفون اٹھایا۔

اجنبی —— !!! ...... تم نے مجھے اسدرجہ بیوقوف سمجھ رکھا تھا۔ تمھارے ٹیلیفون کا سلسلہ منقطع کردیا گیا ہے

تمھاری گھنٹی بیکار کر دی گئی ہے۔ اور سنو یہاں سے بہت قریب ایک نہایت تیز رفتار موٹر کھڑا ہے اس لئے کہ جب میں تم سے رخصت ہو کر جانے لگوں اور کہیں تم پولیس کو خبردار کر دو تو میں تم لوگوں کی دسترس سے جلد از جلد باہر ہو جاؤں۔

سعید ہکا بکا رہ گیا۔ اجنبی نے بکس کھولا، اور بکس کو خالی دیکھ کر غصہ سے آنکھیں سرخ ہو گئیں۔

اجنبی — کیوں سعید! تم نے مجھے دھوکا دیا، خیر چاہتے ہو تو اب بھی وقت ہے، مجھے بتاؤ کہ روپیہ کہاں ہے، صاف بتاؤ روپئے کہاں ہیں؟ (یہ کہکر وہ پستول کی لبلبی پر انگلی رکھدیتا ہے)

سعید — ٹھیرو! خدا کے لئے ایسا نہ کرنا ورنہ قوم اور اُس کے ساتھ خود تم میرے افسانوں سے محروم رہجاؤگے روپئے میں خود تمھارے حوالے کئے دیتا ہوں۔ لو یہ کنجی، اسی میز کی دراز میں روپئے موجود ہیں، جلدی سے نکال لو اور میرے دماغ کو کام کرنے کے لئے آزاد چھوڑ دو۔

اجنبی — شاباش! اچھا ذرا تم اپنا ہاتھ تو اوپر اُٹھالو۔۔۔۔ اوپر۔۔۔ سر سے اوپر۔۔۔ بالکل سیدھا رکھو اور یاد رکھو اگر ذرا بھی حرکت کی تو۔۔۔

سعید نے ہاتھ اوپر اُٹھالیا اور کرسی سے پیٹھ لگا کر بیٹھ گیا۔

اجنبی داہنے ہاتھ سے میز کی دراز کھول رہا تھا اور بائیں ہاتھ سے پستول سعید کی کنپٹی سے لگائے ہوئے تھا سعید میز کے نیچے نیچے آہستہ آہستہ پاؤں اُٹھا رہا تھا اور ٹھیک جسوقت اجنبی نے نوٹوں کے بنڈل پر ہاتھ ڈالا سعید نے تیزی سے پاؤں اُٹھا کر دراز پر ایک لات اس زور سے رسید کی کہ دراز جھٹکے سے بند ہو گئی اور اجنبی کا ہاتھ کچلکر رہگیا۔ درد سے بلبلا اُٹھا اور ہاتھ کھینچ کر کراہنے لگا۔ پستول بھی زمین پر گر پڑا تھا۔ سعید نے اُسے اُٹھالیا۔

سعید — میرے اچھے دوست! اب تمھیں یہاں ٹھہرنے کی زیادہ ضرورت نہیں۔ میں تمھارا شکرگزار ہوں کہ تم نے میرے افسانہ کو مکمل کرا دیا۔

الیاس اسلام پوری

مجموعۂ استفسار و جواب جلد دوم

چھپ کر طیار نہیں ہوا ہے، اس لئے دوسری طیار شدہ کتابوں کے ساتھ اس کا آرڈر دینا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ جسوقت یہ مجموعہ شائع ہوگا، اس کی اطلاع ذریعہ نگار سب کو ہو جائیگی اور اسی وقت قیمت بھی اسکی ظاہر کر دی جائے گی، فی الحال نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی ضخامت و قیمت کیا ہوگی۔ منیجر نگار

بعض تاریخی کسبیوں کے خطوط

دوسری صدی عیسوی میں السفرآن، یونان کا مشہور انشاپرداز تھا اور اس کی انشاپردازی کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ فرضی خطوط کے ذریعہ سے کردار نویسی کیا کرتا تھا اس کے ایک خط کا ترجمہ ناظرین نگار کی دلچسپی کے لئے پیش کیا جاتا ہے۔　　نیاز

تھایس کا خط یوتھائی ڈیمس کے نام ——

جب سے تم نے فلسفہ پڑھنا شروع کیا ہے، تمھاری حالت ہی عجیب ہو گئی ہے۔ تیوریاں چڑھی ہوئی بھویں تنی ہوئی، گویا جینا وبال ہے! جسوقت تم عبا پہنے، ہاتھ میں کتاب لئے اکاڈمی جاتے ہو تو تم میرے گھر سے اس طرح گزر جاتے ہو گویا مجھ سے واقف ہی نہیں، کبھی اس گھر میں قدم رکھا ہی نہیں۔

یوتھائی ڈیمس تم پاگل ہو اور مطلق واقف نہیں کہ یہ تمھارا پروفیسر جو یقیناً تم سے عجیب وغریب باتیں کرتا ہوگا کیا چیز ہے —— مجھ سے سنو۔

ایک زمانہ سے یہ کمبخت مجھ سے ملنے کی التجائیں کر رہا تھا لیکن میں نے ہمیشہ اس کی دولت کو تم پر قربان کر دیا اور اب وہ میگارا کی نوجوان کنیز پر ڈورے ڈال رہا ہے۔ لیکن چونکہ اب تم اس کے زیر اثر مجھ سے دور دور رہنا چاہتے ہو، میں اس کی التجا قبول کر لوں گی اور اگر تم پسند کرو تو یہ بھی ثابت کر دوں گی کہ وہ لذتِ یک شب سے زیادہ کچھ اور بھی مجھ سے چاہتا ہے۔

کیا تم سمجھتے ہو کہ ایک پروفیسر، کسبی سے مختلف کوئی چیز ہے۔ طریقے میں اختلاف ہو تو ہو، لیکن مدعا دونوں کا وہی ایک ہے —— دولت سمیٹنا۔ اور سچ پوچھو تو ہم کسبیاں اس سے بہتر ہیں کہ ہمارے دلوں میں خدا کا ڈر تو ہے، ہمارے چاہنے والے جب قسم کھا کر اپنی وفا کا یقین دلاتے ہیں تو ہم اسے باور کر لیتے ہیں —— بیشک ہمیں یہ نہیں معلوم کہ بادل کیونکر بنتے ہیں، جوہر و دقایق کی کیا حقیقت ہے، لیکن نتیجہ کے لحاظ سے اس کا علم اور ہمارا جہل دونوں برابر ہیں۔

میں نے بارہا ایسے لوگوں سے باتیں کی ہیں، گھنٹوں ان کی صحبت میں صرف کئے ہیں اور مجھے معلوم ہے کہ جب وہ ہمارے پاس ہوتے ہیں تو دس بجے صبح سے پہلے ان کی آنکھ نہیں کھلتی اور بغیر شراب کے نوالہ نہیں توڑتے۔

میرے پیارے، یہ برہمی چھوڑ دو۔ ایسی خوبصورت آنکھوں میں جیسی تمھاری ہیں غصہ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ آجاؤ، کسی دن اپنی پیشانی کا پسینہ پونچھتے ہوئے آجاؤ، پہلے ایک دو شیشے شراب کے خالی کریں گے اور پھر دونوں ملکر سوچیں گے کہ زندگی کا مقصود کیا ہے۔

زمانہ زیادہ جینے کی بھی مہلت نہیں دیتا، لذت و مسرت کیسی، اس لئے مہلات میں بیکار وقت نہ ضایع کرو، میرے پاس آؤ، کام کی باتیں کریں۔

اطلاعنامہ بنام داینان دربارہ ادخال درخواست بریت

(دفعہ ۱۴ (ا) ایکٹ نمبر ۵ سنہ ۱۹۲۰ء)

بعدالت جناب بابو شیوگوپال صاحب ماتھر جج خفیفہ لکھنؤ

درخواست دیوالیہ نمبر ۱۳ سنہ ۱۹۳۵ء

بمقدمہ قرار دئے جانے دیوالیہ مسمی بلاقی ولد بتو قوم خاکروب ساکن مصطفےٰ منزل فراشخانہ تھانہ چوک شہر لکھنؤ

بنام { گوپال ولد جے نراین گنگا دھر ولد رامداس اقوام رستوگی ساکنان رستوگی ٹولہ تھانہ چوک شہر لکھنؤ بلدیو داس ولد لچھمن داس قوم رستوگی ساکن بیگم گنج تھانہ چوک شہر لکھنؤ لالہ متھری و سندر لال اقوام رستوگی ساکنان باغ مکا تھانہ چوک لکھنؤ، سندر لال قوم بقال ساکن شیوالہ بھوانا سنگھ محلہ ٹاٹ پٹی تھانہ چوک لکھنؤ و مدنموہن قوم رستوگی ساکن بازار کھالہ تھانہ چوک لکھنؤ }

مطلع ہو کہ دیوالیہ مذکور الصدر نے اپنی بریت کی درخواست عدالت ہذا میں گزرانی ہے اور عدالت ہذا نے سماعت درخواست کے واسطے تاریخ پانچ ۵ ماہ دسمبر ۱۹۳۵ء بوقت دس بجے دن مقرر کی ہے۔

تاریخ ۲ ماہ نومبر ۱۹۳۵ء۔

بحکم عدالت

بشمبر دیال منصرم

عدالت جج خفیفہ لکھنؤ

محسن کاکوروی

پیدائش ۱۸۲۳ء ——— وفات ۱۹۰۵ء

ازل میں جب ہوئیں تقسیم نعمتیں محسن
کلامِ نعتیہ رکھا میری زباں کے لئے

لکھنؤ کی خوشامدانہ شاعری کا دور ناسخ کے زمانہ سے شروع ہوتا ہے جس نے دنیائے ادب میں اگر مرثیہ نگاری کے بعد کوئی قابلِ ذکر، دیرپا کارنامہ پیش کیا ہے تو وہ یقیناً صوفیانہ شاعری اور نعت گوئی ہے جس کو حضرت غوث ملت شاہ تراب علی قلندرؒ، مولانا غلام امام شہید، مولانا امیر احمد امیر مینائی اور حسان الہند علامہ محسن سے تعبیر کرنا کچھ بیجا نہیں ہے یہ واقعہ ہے کہ اگر غزل گوئی میں میر، صوفیانہ شاعری میں شاہ تراب علی اور مرثیہ نگاری میں میر انیس کا مقابل اور مماثل دار السلطنت دہلی پیدا نہ کر سکا تو حضرت محسن کی نعت گوئی کا بھی جواب آج تک نہ ہو سکا۔ اساتذۂ دہلی نے تو خیر اس صنفِ سخن میں دلچسپی ہی نہ لی البتہ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اساتذۂ لکھنؤ نے ضرور اس صنف کو قابلِ اعتنا خیال کیا جو بعد میں شاہانہ زرپاشیوں کی بدولت منقبت نگاری میں تبدیل ہو گئی۔

حضرت محسن خالص لکھنوی تھے۔ انھوں نے وطنی جوش میں عجم پرستی کی کورانہ تقلید کے ذہنی خطِ غلامی کے خلاف علی الاعلان پرچمِ بغاوت بلند کیا بلبلوں کی نغمہ سرائی اور طائف کی شبِ ماہ کی جگہ برسات کے جگنو اور ہندوستان کے کالے بھونروں کی موسیقی سے کام لیا۔ کنہیا جی اور گوپیوں کی عارفانہ داستانِ عشق لیلیٰ مجنوں شیریں فرہاد کی فرسودہ اور پامال تمثیلات کو افسانۂ کہن بنا دیا۔ اور تموج اور گنگا کی طغیانی سے جیحون اور سیحون کو گونگے کا خواب ثابت کر دکھایا۔

یہی وہ ذہنی انقلاب تھا کہ محسن نے ایک اندازِ خاص سے اپنے خالص مذہبی قصیدے میں انوکھی وطنی تشبیب

استعمال کرکے ہمیشہ کے لئے ایک طرف تو ہند و مسلم اتحاد کا بنیادی پتھر رکھا اور دوسری جانب ان بے نظیر تلمیحات سے اپنے کلمہ گو بھائیوں کے کانوں کو آشنا کر دیا۔ اور واقفین رموز پر آشکارا ہو گیا کہ محسن بحیثیت وطنی شاعر کے اپنی صنف خاص میں یکتا و فرد ہیں۔

حضرت محسن نے دور مغلیہ کے آخری عہد میں آنکھیں کھولیں۔ برطانوی اقتدار کی بڑھتی ہوئی تیز اقبالی شعاعوں کو فرداکے آئینہ میں دیکھا۔ یا دش بخیر اودھ کے شباب کی رنگینیوں اور سرمستیوں کا بھی مطالعہ کیا اور اس سے بھی بڑھکر ہنگامۂ مشرق کے خون آشام افسانوں کو بنظر تعمق دیکھا لیکن تعجب انگیز امر تو یہ ہے کہ محسن نے خود اُن دھوپ چھاؤں کی کائنات سے ماورا اپنے لئے جو ماحول وضع کیا وہ بالکل انوکھا اور جداگانہ تھا۔ اُن کے اجداد آستانۂ رسول اللہ دارض مقدس سے جدا ہو کر قصبۂ صحرام توابع حوات میں جو بغداد و ممالک خراسان کے وسط میں واقع ہے آباد تھے۔ قاری محمد صدیق اس خاندان کے اول فرد ہیں جو ہندوستان تشریف لائے۔

مولانا حسین شہید حسن کے سایۂ عاطفت میں جناب محسن نے زانوئے ادب تہ کیا، اپنے والد ماجد حضرت شاہ میر محمد قلندر کے مرید اور صاحب ارشاد و اجازت تھے۔ عین حالت نماز میں ایک ظالم کے ہاتھوں انھوں نے جام شہادت نوش فرمایا۔ اور بہ برکت اسم مبارک حضرت شہید کربلا حیات جاوید پائی اور

سر دشمن بُریدہ گشت تراب سال رحلت شہید اکبر گشت

سے حضرت غوث ملت شاہ تراب علی قلندر نے تاریخ شہادت نکالی۔

حضرت محسن کے والد ماجد مولانا حسن مرحوم صاحب تفریح الاذکیا فی احوال الانبیا بہت بابرکت بزرگ اور عالم تبحر تھے۔ وہ دو با اقبال صاحبزادوں مولوی محمد محسن اور مولوی محمد احسن کو خوش و خرم اور با اقبال چھوڑ کر ۱۹ جمادی الاول ۱۳۰۱ھ کو رحلت فرما گئے۔

غرض اس متبرک اور قابل تقلید فضا میں حضرت محسن نے آنکھیں کھولیں اور ہوش سنبھالا اور یہی وجہ تھی کہ حضرت محسن کے کلام پر ان حالات کا بہت گہرا داخلی اور خارجی اثر پڑا اور جب جناب محسن کو اپنے جذبات دنیا کے سامنے پیش کرنے کی ضرورت ہوئی تو وہ اُسی سلسلۃ الذہب کی شاہراہ پر چلنے کے لئے مجبور ہوئے اور دنیا کو بھی مذہب کی بھولی بسری ہوئی داستانیں سنائیں۔

جناب محسن کی ولادت ۱۲۴۲ھ بمقام قصبۂ کاکوری ہوئی نظر محمد اور منظور الہی تاریخی نام تھے۔ سات سال کے سن سے اپنے جد امجد حضرت حسین شہید کے سایۂ عاطفت میں پرورش پائی۔ اُن کی ابتدائی تعلیم حسب طرز

سے ہوئی اس کا اقتضا یہی تھا اور دانشمندان کہن سال کا تجربہ بھی پیشین گوئی کرچکا تھا کہ یہ بچہ بڑا ہوکر صاحب کمال ہوگا۔ تین چار بجے رات سے اُٹھکر نماز تہجد پڑھتے اور تلاوت کلام پاک کے بعد درود شریف اور دیگر وظائف خاندانی میں مشغول رہتے تھے۔ مذہبی عقیدت اور نبی کی محبت رگ رگ میں سرایت کرتی جاتی تھی عمر کے متجاوز ہوتے ہی شب بیداری اور یاد حق کی عادت محمود نے طبیعت ثانیہ بنکر تمام عمر ان کا ساتھ دیا۔

جناب محسن کا نشو و نما اپنے والد حضرت ابوالحسن حسن کے ساتھ مین پوری میں ہوا۔ کتب درسیہ کا اتمام مولوی عبدالرحیم اور اپنے باکمال پدر نامدار سے کیا۔ شاعری میں مولانا ہادی علی اشک مرحوم سے مشورہ کرتے تھے اور بیعت اپنے جد امجد سے تھی۔

۱۹۰۵ء اپریل کی پانچویں تاریخ پیام مصیبت لائی یعنی حضرت محسن اسہال کبد کے مہلک مرض میں مبتلا ہوئے۔ اشتہا بالکل جاتی رہی۔ علاج و معالجہ سے کوئی افاقہ نہ ہوا اور طبیعت روز بروز خراب ہوتی چلی گئی، یہاں تک کہ ۲۳ اپریل ۱۹۰۵ء روز یکشنبہ کو بعد نماز ظہر ارشاد فرمایا کہ اب ہمارا آخری وقت ہے تجہیز و تکفین کی تیاری کرو کل کوچ ہے۔ اپنے بڑے صاحبزادے سے درمختار نکلوا کر باب الشہید استماع فرمایا شب کو مرض میں اشتداد ہوا اور بروز دوشنبہ بتاریخ ۱۸ صفر ۱۳۲۳ھ مطابق ۲۴ اپریل ۱۹۰۵ء کو علی الصباح ارشاد فرمایا کہ اب ہمارا کوچ ہے یہ کہکر یاد حق میں مشغول ہوگئے پاس انفاس جاری تھا۔ حالت تلقین میں ہر بار بطریق تشہد (اللہ ھو) پر انگشت شہادت اُٹھاتے تھے اسی حالت میں دس بجے دن کو اس عالم فانی سے عالم جاودانی کو رحلت فرمائی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اور صحن عیدگاہ مین پوری میں اپنی وقف کردہ زمین میں دفن کئے گئے۔

مولانا فرجاد نے کلام پاک کی ایک آیت سے مادۂ تاریخ نکالا۔ اور ایک تاریخ انکے بڑے صاحبزادے علامۂ نورالحسن نیر صاحب نوراللغات نے فارسی میں لکھی جو کتبے پر کندہ ہے۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق　　ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

اُردو کی نشو و نما سے قبل ہندوستان کے تعلیم یافتہ طبقہ کا ادبی مذاق فارسی تھا۔ عدالت کی زبان فارسی تھی۔ مراسلت فارسی میں بعد کو ہوئی تھی۔ شعر کا مذاق فارسی تھا۔ حتیٰ کہ دادھن کے طریقے بھی خالص ایرانی تھے نے عجمی تھے۔ لباس عجمی تھے۔ اور معاشرت میں بھی ایرانی رنگ کا اثر موجود تھا چنانچہ جناب محسن نے بھی اسی فضا میں آنکھیں کھولیں اور ابتدائی شاعری میں ان کے یہاں بھی عجمی رنگ کافی نمایاں ہے۔ لیکن

دولت مغلیہ کے شجر اقبال میں گھن لگتے ہی قدیم دقیانوسی رنگ نے پلٹا کھایا۔ اور جناب محسن نے بھی زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ساز کے مقولہ پر مہر تصدیق ثبت کر دی اور خالص ہندی سماج میں ہندی عوامل کو پیش کر کے دنیائے ادب میں بقائے دوام کا اکلیل جہانبانی سر پر رکھا۔

جناب محسن میانہ قد، گندمی رنگ کے تھے اور چہرہ گول۔ اُن کے چہرہ پر چند داغ چیچک کے بھی موجود تھے مگر ایسے کہ بادی النظر میں دکھائی نہیں دیتے تھے۔ اکثر داڑھی خشخشی رکھواتے اور شروع میں خضاب کرتے تھے آخر حصہ عمر میں داڑھی بڑھا لی تھی اور خضاب ترک کر دیا تھا۔ برادران وطن کا خیال ہے کہ وہ ہر معاملہ میں متانت اور سنجیدگی سے کام لیتے تھے۔ ان کی آواز میں نرمی اور لوچ تھا۔ اس کے ساتھ خوش تقریر بھی تھے۔

اطاعت والدین میں آپ اپنی نظیر تھے۔ عمر بھر حضرت ابوالحسن حسن (اپنے والد ماجد) کی رائے سے اختلاف نہیں کیا۔ ہر شخص سے خندہ پیشانی سے ملتے اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ مین پوری میں جہاں وہ وکالت کرتے تھے تمام شہر بلا قید مذہب و ملت ان کا گرویدہ تھا۔ ہر شخص کے ساتھ رنج و راحت ہوتے ہوئے وہ ہر دم درست رہتے تھے۔ قدرے اُن کی اعانت و ہمدردی کرتے تھے۔ غرض جناب محسن قدیم ایشیائی تہذیب کا ایک مکمل نمونہ تھے تمام عمر ایک طرح سے نباہی اور لطف یہ تھا کہ ہر آدمی یہی سمجھتا رہا کہ ہم سے زیادہ مولانا کسی دوسرے سے دلچسپی نہیں رکھتے ہیں۔ وہ اکثر فرماتے تھے کہ "شکستن دل دوستاں سہل است و کفارہ یمین سہل"

جناب محسن سفید اور صاف کپڑا پسند کرتے تھے اتنی بھی بساط سے ان کو فخر تھا۔ جو شان فقر کا لازمی نتیجہ تھا۔ وہ اکثر خود اور احباب کی خفیہ طور پر مدد کرتے رہتے تھے۔

جس چیز نے جناب محسن کو معراج کمال پر پہنچایا وہ ان کی شاعری و انشا پردازی تھی جس کا شہرہ تمام ہندوستان میں ہے۔ ان کا نعتیہ کلام ہندوستان سے عرب و عجم تک مقبول خاص و عام ہوا اور ان کی سخن سنجی اور معجز بیانی کا سکہ تمام شعرا کے قلوب پر بیٹھ گیا۔ جناب محسن نے نعتیہ کلام سے شہرت و عزت یا شاعرانہ وقعت حاصل کرنا نہ چاہا۔ اور ان کو دنیاوی دولت کی خواہش بھی نہ تھی بس یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں خلوص، عقیدت، جلال، ہیبت اور عظمت کا رنگ بہت نمایاں ہو کر ابھرا۔ اس زمانہ میں شیخ ناسخ کے دور تناسخ سے گزر رہا تھا جانشین آتش، مرزا شوق، اسیر و امیر کا آفتاب کمال نقطہ نصف النہار پر تھا لیکن جناب محسن نے اس پریشان ماحول سے علٰحدہ اپنے لئے ایک نئی شاہراہ ترتیب کی اور مسکین کی طرح انھوں نے کلام پاک اور احادیث صحیحہ سے درجنوں بہا چن لئے اور گل و بلبل، ہجر و وصل کے بجائے افتادہ مضامین کی جگہ اُن کے اس سینہ سے ایک کامیاب مرصع ساز کی طرح سلک شعر کیا کہ جوہریوں کو داد سخن دیتے ہی بن پڑی۔ سامعین ادب اور

سخن سنجان صوفی مشرب اس شاعری کو خلوص سے سنتے اور درود کے فلک شگاف نعروں سے مجالس کو گرماتے رہتے ہیں۔

جناب محسن کی قادر الکلامی کا بین ثبوت یہ ہے کہ بیان حکایت میں شاعرانہ شوخی، حدو تہذیب و متانت سے ایک قدم آگے نہیں بڑھتی۔ اور مبالغے کے استعارات صلاحیت کا جوہر اپنے ساتھ لئے رہتے ہیں جہاں کوئی امر مناسب موقع ہے اور حدیث صحیح میں اس کی تصریح نہیں تو اس کو اس انداز خاص سے پیش کرتے ہیں کہ پڑھنے والے کو صاف تمیز ہو جاتی ہے کہ اس قدر مضمون جزو حدیث نہیں ہے بلکہ کلام بزبان حال ہے۔ ان کی صدا بہار طبیعت حسرت و یاس کے مضامین سے الگ رہتی ہے شگفتگی طبع اور زندہ دلی کی کہربا قوت ہر صنف بیان میں اپنی چمک دکھاتی ہے۔ مضامین کی بلند پروازی۔ الفاظ کی شان و شوکت بندشوں کی چستی انکا خاصۂ طبیعت ہے۔ تشبیب و گریز لوان کا حصہ ہے اور خاتمہ و مناجات میں وہ اسلوب جدید کے موجد ہیں۔ گو اس امر میں شبہ نہیں کہ جناب محسن کا کلام تلمیحات کی بنا پر عوام کی سمجھ سے باہر ہے لیکن بندش الفاظ کا سحر اپنا کام کرتا ہے اور سخن شناس اور کم استعداد دونوں طبقوں سے خراج تحسین و آفرین وصول کرتا ہے۔

جناب محسن کاکوروی نے اپنا سارا فضل و کمال مدح رسول میں صرف کر دیا اور کل زندگی نعت گوئی کیلئے وقف کر دی اور حقیقت یہ ہے کہ اس صنف سخن میں وہ اپنے تمام معاصرین سے گوئے سبقت لے گئے۔ سخن شناسوں نے ان کی سعی و محنت پر تحسین و آفرین کے پھول برسائے، شوکت الفاظ خوبی بندش اور زور طبیعت کی داد تو اغیار نے بھی دی۔

جناب محسن کے کلام سے لطف اندوز ہونے کے لئے چند امور پیش نظر رکھنے ضروری ہیں۔ اول یہ کہ محسن کی شاعری کا آغاز اس دور میں ہوا جب شبنم شاداب، مینا بازار، پنج رقعہ اور سہ نثر ظہوری کی پرستش کیجاتی تھی۔ چنانچہ محسن پر بھی اس دور کے استعارات و مبالغہ آمیز تحریروں کا اثر پڑا چنانچہ آپ کے ابتدائی خطوط مرزا بیدل کے رقعات کا ایک رخ معلوم ہوتے ہیں۔ غرض محسن کی خصوصیات کلام میں سب سے زیادہ قابل لحاظ ان کی صناعی اور معنی آفرینی ہے اور انھیں صنائع بدائع کے مناسب استعمال سے محسن کا کلام انکے معاصرین کی نعتیہ نظموں سے زیادہ دلکش نظر آتا ہے۔ اب تک نعت کی بے قدری کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ اس کی زبان بیشتر عامیانہ ہوتی تھی محسن نے نعتیہ مثنوی کو مثنوی غنیمت کے رنگ میں پیش کیا اور اس خشک و بے آب و گیاہ زمین میں استعارہ و ایہام کا ایسا دریا بہا دیا کہ باوجود تمام تر لکھنوی تکلف و تصنع ان کے زور طبیعت کی داد

خواہ مخواہ دینا پڑتی ہے اور یہی وہ اعجاز ہے جس نے جناب محسن کے کلام میں سحرِ سامری بھر دیا ہے ۔
محسن کے کلیات نعت میں قصاید، مثنویاں، مسدس، رباعیاں اور غزلیں سبھی کچھ نظر آتا ہے، لیکن قصاید میں اُن کا بہاریہ قصیدۂ لامیہ[1] بہت مقبول ہوا اور مثنویوں میں چراغ کعبہ ۔ سراپا کا مسدس بھی اُن کی قوتِ شاعری کا بے مثل نمونہ ہے ۔

چونکہ قصیدۂ لامیہ کی تشبیب بالکل انوکھی تھی اور اس میں کاشی، متھرا، گنگا جل اور گوکل وغیرہ کا ذکر تھا جو ہندو مذہب کی روایات سے مخصوص ہیں، اس لئے لوگوں کو خاص دلچسپی پیدا ہوئی اور محسن کا یہ کارنامہ بہت مشہور ہوا ۔ اب ہم کہیں کہیں سے ان کے کلام کا انتخاب پیش کرتے ہیں جس سے اُن کی خصوصیات، شعری پر کافی روشنی پڑتی ہے :۔

مسدس سراپا یوں تو سراپا انتخاب ہے لیکن بعض بند تو قیامت کے ہیں رعایت لفظی کے ساتھ مضمون آفرینی اور زورِ بیان کے ایسی مثالیں بہت کم ملتی ہیں ۔ ملاحظہ ہوں :۔

ہم دکھاتے ہیں طبیعت سے تماشے کتنے — عالمِ نور میں چھوڑ آئے ہیں شوشے کتنے
حل کئے غنچۂ خورشید سے نکتے کتنے — عقد پروین سے لکھے ہم نے معمے کتنے
سادہ کاغذ ورقِ مہرِ درخشاں ہے آج
دستِ پُر نور عطارد میں قلمداں ہے آج

یوں خرامندہ بہ شوخی تسلم رعنا ہے — موج ہے جس سے خجل غرقِ عرق دریا ہے
بال پرواز پری چٹکیوں میں اُڑتا ہے — آہوئے شوخ ہے کیا، کبک خراماں کیا ہے
کوئی شاخ آہوؤں کی جلوہ گری میں تو نہیں
کوئی سرخاب کا پر کبک دری میں تو نہیں

رعایت لفظی کا طوفان ملاحظہ کیجئے کہ کوئی ایک مصرعہ بھی اس سے خالی نہیں لیکن باوصف اسکے روانی کا یہ عالم ہے کہ طبیعت اس سے ایک خاص سرور حاصل کرتی ہے ۔

خاقانی کی طرح بعض جگہ وہ علمی اصطلاحات سے بھی استعارہ کرتے ہیں اور نہایت خوبی کے ساتھ مثلاً
تیری صورت سے کھلے معنیٔ ماقلّ و دلّ — انبیا شرحِ مفصّل ہیں تو متنِ مجمل

---

[1] اس کا مطلع یہ ہے :۔
سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل
برق کے کاندھے پہ لاتی ہے صبا گنگا جل

توہے خورشید ترے سامنے انجم ہیں بنی   توہے شمسیہ، تصوریں توسب ہیں قطبی

ان اشعار میں علم منطق کی اصطلاحات سے کام لیا گیا ہے۔ شمسیہ اور قطبی منطق کی مشہور کتابیں ہیں۔

تشبیہات واستعارات کو کامیاب بنانے کے لئے سب سے بڑی چیز ندرت وجدت ہے اور کلام محسن میں اس کی بھی کمی نہیں، رسول اللہ کے دونوں ابروؤں کے درمیان ایک رگ بشکل الف نمایاں تھی اس رگ کے ساتھ ابرو اور آنکھ کو ملاکر محسن نے عجیب ندرتِ خیال سے کام لیا ہے ملاحظہ ہو:۔

رگ جو کانٹا ہے تو شاہین[1] ترازو ابرو   مردمک سنگ ہے اور پلہ ہے چشم دلجو

آنکھ پڑ جائے اگر جانب اُمت سرِمو   صاف رکھی رہے میزانِ قیامت یکسو

آپ پلّے پہ ہمارے ہوں تو کیا کھٹکا ہے

مردم چشم کہیں ہم نے اسے تولا ہے

ترازو اور وزن کے متعلق کوئی بات باقی نہیں رکھی اور لطف یہ ہے کہ سامع یہ محسوس نہیں کرسکتا کہ ان کو قصداً استعمال کیا گیا ہے۔

چہرۂ نبوی کی تعریف کا ایک بند ملاحظہ ہو:۔

روبرو آئے جو آئینہ تو اک سکتا ہو   شمع کے بھی دھوئیں اُڑ جائیں جو کچھ دعوا ہو

شامت آجائے جو خورشید کو یہ سودا ہو   صبح ہوجائے قمر حُسن پہ گر پھولا ہو

حشر برپا ہو جو کنعانی مقابل آئیں

چرخ پر سورۂ یوسف کو ملک لیجائیں

آئینہ۔ سکتا۔ شمع۔ دھواں۔ خورشید۔ قمر۔ صبح۔ کنعان۔ یوسف، الغرض کوئی رعایت لفظی ایسی نہیں جو چھوڑ دی ہو لیکن انداز بیان کی بیساختگی نے ان سب کو ایک "خوشگوار نوش" بنا دیا ہے۔

لب کی تعریف کا ایک بند ملاحظہ ہو۔

لب جاں بخش کی تشبیہ دمِ عیسیٰ سے   دی نہ، دم دیتے رہے گرچہ مسیحا بھی مجھے

آب حیواں نہ کہا خضر نے گو چھینٹے دئے   اب فقط رہ گئے خورشید کے جھوٹے شوشے

کہوں یاقوت تو وہ باتیں یہاں پائیں نہیں

لعل سمجھوں اسے آنکھیں مری پتھرائیں نہیں

---

[1] شاہین ترازو اس ڈنڈی کو کہتے ہیں جس سے دونوں پلے متعلق رہتے ہیں۔

محاورات کے ساتھ لفظی رعایت کا ایسا دلکش امتزاج، "نعت" گوئی کے سلسلہ میں سوائے کلام محسن کے کہیں اور نظر نہیں آتا۔

سراپا کا آخری بند بھی ملاحظہ ہو:۔

ہے یہ امید کہ جب گرم ہو بازارِ نشور — یوں کہے بادشہ بارگہِ عالمِ نور
تو سراپا ہمیں تم دو عوضِ حور و قصور — میں کہوں واہ مجھے یہ نہیں ہرگز منظور

مفت حاضر ہے۔ مگر اس کی یہ تدبیر نہیں
کھوٹے داموں بکے یوسف کی یہ تصویر نہیں

دوسرے مصرعہ میں باوجود توالی اضافات کے جو سلاست پائی جاتی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انتخاب الفاظ کی کتنی زبردست قوت محسن کو حاصل تھی۔

مثنویوں میں ایک مثنوی صبحِ تجلی کے نام سے لکھی ہے جس میں ولادت نبوی کا بیان ہے۔ اس کے بعض اشعار ملاحظہ ہوں:۔

ظلمت کا چراغ بے ضیا ہے — انجم کا ستارہ ڈوبتا ہے
مہتاب کی چاندنی ڈھلی ہے — مریخ کی سمت مشتری ہے

زہرہ کا سفید ہو گیا رنگ — نظم پروین کا قافیہ تنگ

غنچے پہ ہے خامشی کا عالم — یا صومِ سکوت میں ہے مریم
کیاری ہر اک اعتکاف میں ہے — اور آبِ رواں طواف میں ہے

ہر تخم بہ خلوت آرمیدہ — ہر ایک ثمر خدا رسیدہ
سجادہ بدوش لالہ یکسو — یکسو شب زندہ دار شبو

مثنوی چراغ کعبہ بھی بالکل اسی رنگ کی ہے لیکن زیادہ طویل ہے۔ اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

بھیگی ہوئی رات آبرو سے — داخل ہوئی کعبہ میں وضو سے
اوڑھے ہوئے لیلیٔ گل اندام — شبنم کی ردا بہ قصدِ احرام
گویا کہ نہا کے آئی فی الحال — جھکسا جھٹک کے نچوڑتی ہوئی بال

ڈھائی سیر آٹا

(۱)

پروائی چل رہی تھی - مولی کو بائی نے پکڑ رکھا تھا - اور آٹھ دس روز سے کام پر جانے کے قابل نہیں رہا تھا دو تین روز تک جو دو چار پیسے جمع تھے وہ خرچ ہوئے - اور پھر اُدھار پر کام چلتا رہا - دو چار روز کے بعد بنیا بھی حیلے حوالے کرنے لگا - مجبوراً ایک دن مولی ٹانگ میں ذرا آرام پاکر صبح تڑکے ٹوکری لیکر مزدوروں کی بانار گیا - کئی کاریگروں کے ساتھ کام کر چکا تھا - ان میں سے ایک نے جس کا کام لگا ہوا تھا اس کو ساتھ لے لیا - دن بھر اینٹ گارا ڈھوتا رہا - شام کو ساڑھے چار آنے پیسے ملے - بجے لیکر گھر چلا - راستہ میں ایک آنہ بنیے کو قرضہ کا ادا کیا - ایک آنہ مکان کے کرایہ کے لئے رکھ لیا - اور ایک پیسہ کل کے چبینے کے لئے بچا لیا - باقی بچے نو پیسے اس میں سے ایک پیسہ کے آلو - ایک کا باجرے کا آٹا - پانچ پیسے کے ڈیڑھ سیر چاول - اور ایک پیسے کی دال ایک پیسہ کی لکڑی لیکر ایک لمبی سی گلی میں گھس گیا - جو آگے چل کر اتنی تنگ ہو گئی تھی کہ وہاں ابھی سے اندھیرا تھا - اس گلی میں برابر برابر کئی کوٹھریاں بنی تھیں - دو ایک سے دھواں نکل رہا تھا جو ٹھنڈا ہو کر گلی میں بھر رہا تھا - مولی کی بیوی منی جس سے شادی تو نہیں ہوئی تھی مگر پندرہ برس سے تعلقات میاں بیوی ہی کے ایسے تھے -

دو لڑکیاں اور دونوں سے چھوٹے لڑکے جاڑے کے مارے پاس پاس بیٹھے مولا کا انتظار کر رہے تھے سبھوں نے خوش ہو کر اس کو گھیر لیا - یہ تھکا ہوا بہت تھا، زمین پر بچھے ہوئے ٹاٹ پر لیٹ گیا - اور پوٹلی رکھ کر بولا -

"سب لیتا آیا ہوں"

بیوی چولھے کے پاس گئی، جو اسی کوٹھری میں ایک طرف بنا ہوا تھا - آگ سلگائی، اور دال چاول پکنے کو چڑھا دئے لڑکے اور لڑکیاں چولھے کو گھیر کر بیٹھ گئے اور دال پکنے کی دل خوش کن - کھدر کھدر، سننے لگے - ان لوگوں کے لئے اس سے بہتر اور کوئی موسیقی نہیں ہو سکتی تھی -

کمرے میں سیل اور میلے کپڑوں کی بو پھیلی ہوئی تھی - اب وہاں دھواں بھی بھرنے لگا - مگر سب کی توجہ چولھے کی طرف تھی - لڑکے بھوک سے پریشاں تھے اور چاہتے تھے کہ دال چاول جلد سے جلد پک جائیں -

اس لئے وہ اکثر زیادہ لکڑی چولھے میں لگا دیتے۔ یہ دیکھ کر ان کی ماں ڈانٹ دیتی۔

"کمبختو! کل کھانا کیسے پکے گا؟"

بڑی لڑکی جس کی پلکیں بال خورے نے غائب کردی تھیں چولھے کے برابر بیٹھی مسلسل بدن کھجلاتی جاتی تھی اور تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد لکڑی کی ڈوئی سے دال، اور چاول نکال کر چٹکی سے ملتی۔ اس وقت لڑکے پوچھتے۔

"کتنی دیر ہے؟"

"بس تھوڑی ہی کسر اور ہے"

یہی جواب آدھ گھنٹے تک چلتا رہا۔ مولی ایک پرانی دری اوڑھے جس میں سیکڑوں چھید تھے ٹاٹ پر خاموش لیٹا تھا تھوڑی دیر کے بعد بولا۔

جیسے نیند آرہی ہے"

استنے میں کسی کے چیخنے اور رونے کی آواز آنے لگی۔ کوئی مزدور تھا جو تاڑی پیا کرتا تھا اور اکثر اپنی بیوی کو مارتا تھا۔ جب غل غپاڑا زیادہ ہوتا تو آس پاس کے لوگ جا کر معاملہ رفع دفع کرا دیتے اسوقت یہ غل سُنکر منی بولی:-

"ان لوگوں کے یہاں روز بروز یہی رہتا ہے۔ نہ معلوم کیسے کمینے ہیں"

مولی۔ ہونہہ —— چاول گلے نہیں اب تک؟

منی نے دیکھا چاول گل گئے تھے اُتار لئے گئے۔ ہانڈی بند تھی۔ مگر اُبال میں ہانڈی کے کگروں پر کچھ چاول آگئے تھے۔ چھوٹے لڑکے بھو نے اس میں سے دو تین چاول پوچھ کر کھالئے۔ دوسرا لڑکا منو فوراً بولا۔

"ہونہہ۔ میں بھی"

اس نے اور زیادہ کھالئے۔ اس پر دونوں میں لڑائی ہونے ہی والی تھی کہ منی نے دونوں کو ڈانٹا۔

"کمبختوں میں ذرا صبر نہیں۔ میں کہتی ہوں ——

تھوڑی دیر لڑکے منی کی بات پوری ہونے کے منتظر رہے۔ جب وہ کچھ نہیں بولی۔ تو پھر کھانے کی طرف متوجہ ہوگئے۔ اب دال کا سب کو بہت بے صبری سے انتظار تھا۔ آخر ایک لڑکی بولی:-

"اماں اب گھونٹ دو"

ماں نے دال کو دیکھا تو وہ تھوڑی بہت گل گئی تھی۔ اب زائد انتظار کون کرتا۔ اس نے دال گھونٹ کر نمک ڈالا اور اُتار لی۔ پھر تین تامچینی کی پلیٹیں جس کی چینی تقریباً بالکل اُڑ گئی تھی اور ایک مٹی کی رکابی سامنے رکھی پہلے ایک بڑی پلیٹ میں چاول نکالے اور اس پر دال ڈال کر مولی کے سامنے رکھدئے۔ مولی بہت بے صبری سے کھانے لگا

سب بچے اب ٹکٹکی باندھ کر منی کے ہاتھوں کی حرکت دیکھ رہے تھے۔ اس نے مٹی کی تھالی میں چاول دال نکال کر دونوں لڑکیوں کو دئے اور پھر تامچینی کی دونوں پلیٹوں میں برابر برابر چاول نکالے۔ اس پر دال ڈالی

بہو۔ "منو کی پلیٹ میں اتنا اور ہماری پلیٹ میں اتنا"

منی نے تھوڑی سی دال اس کی پلیٹ میں اور ڈالدی۔

منو۔ "اماں ہم بھی"

ماں نے دو چار چاول اس کی پلیٹ میں بھی ڈالدئے۔ اور پھر باقی چاولوں کو دال کی ہانڈی میں اُلٹ کر خود کھانے لگی۔ ابھی چولھے میں کچھ کوئلے باقی تھے جن کی ہلکی ہلکی روشنی میں ان لوگوں کے چہرے اور چلتے ہوئے منھ دکھائی دیرہے تھے۔ چھوٹے لڑکے کھاتے جاتے اور پلیٹ کی طرف دیکھ کر اندازہ کرتے جاتے کہ ابھی اتنا اور ہے، اتنا اور ہے۔ آخر منو اپنی پلیٹ پوچھ کر بولا۔

"بس — کھا چکے"

مولی بھی چاول ختم کر چکا اور بولا۔

"چاولوں میں خدا نے بڑی برکت دی ہے۔ ذرا سے کھالو اور پیٹ بھر گیا۔ اور روٹی کا یہ ہے کہ سیر بھر آٹے کی ہو تو کچھ نہیں۔ اور دو سیر ہو تو کچھ نہیں"

بہو۔ "اماں! صبح کو کیا پکے گا؟"

منی۔ "میں کہتی ہوں ان لوگوں کی نیت کبھی نہیں بھرتی۔ ابھی کھا چکا ہے۔ اب پوچھ رہا ہے کل کیا پکے گا"

منی نے بانس کے پلنگ کے نیچے سے جو کوٹھری کا چوتھائی حصہ گھیرے ہوئے تھا ایک پاندان نکالا۔ جس کا پیندا گھس گیا تھا۔ اور سب کلھیاں ایک دفتی پر رکھی ہوئی تھیں۔ یہ پاندان منی کی ماں کا تھا اور اس کو بہت عزیز تھا۔ ہمیشہ سوچا کرتی تھی کہ میں کسی گھر میں اوپر کا کام کاج کرنے کو نوکر ہو جاؤں تو سب سے پہلے اسی کو ٹھیک کراؤں گی منی نے ایک پان کے چار ٹکڑے کئے ایک خود کھایا۔ ایک مولا کو دیا اور دو دونوں لڑکیوں کو۔ پھر کوٹھری کے بیچ میں ایک ٹاٹ کا پردہ ڈالدیا گیا جس سے اس کے دو حصے ہو گئے۔ ایک طرف پلنگ ہو گیا۔ اور دوسری طرف ٹاٹ کا فرش۔ پلنگ پر منی اور مولی لیٹ گئے۔ اور ٹاٹ پر دونوں لڑکے اور دونوں لڑکیاں۔ سردی تیز ہو گئی تھی۔ مولی اور منی نے تو یہی دری اوڑھ لی۔ اور لڑکوں اور لڑکیوں نے بھی کسی نے موٹی چادر، اور کسی نے ٹاٹ کا ٹکڑا دھر اکر اوڑھ لیا۔ اور پھر چڑیا کے بچوں کی طرح ایکدوسرے سے چپک کر لیٹ رہے۔ کوٹھری کے دروازے سے ٹھنڈی ہوا آرہی تھی، اس لئے مولا نے اُٹھکر اس کو بند کر دیا ہوا کی آمد و رفت بند ہو گئی، اور کوٹھری میں حبس کی وجہ سے گرمی ہو گئی۔ تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد منی بولی۔

"آج منشی جی پھر آئے تھے۔ اور کہہ گئے ہیں کہ نواب صاحب نے حکم دیدیا ہے کہ جس پر کرایہ چڑھا ہو اس سے کوٹھری فوراً خالی کرالو۔"

مولی۔ "نکالدیں گے۔ نکالدیں گے۔ جب سنو یہی ہے۔ آئیں۔ آکر نکالیں۔ ہم جاڑوں میں بچوں کو لیکر کہاں جائیں۔ ہوا کریں وہ بڑے آدمی۔ ہم تو نہیں نکلیں گے۔ کہدو جب کرایہ جمع ہو جائے گا دیدیں گے۔ ضرور دیں گے مرجائیں تو بات دوسری ہے۔ بڑے آئے ہیں نکالنے والے۔"

اس کے بعد تھوڑی دیر کے لئے خاموشی ہوگئی۔ پھر مولی بولا۔

منشی جی کے یہاں کی نوکری کا پتہ چلا۔

منی۔ "وہ کہتے ہیں چھوٹی لڑکی سے میرا کام نہیں چلے گا۔ ایسی لڑکی ہو جو جھاڑو بہارو کرے، اور دو گھڑے پانی اُٹھا کے رکھدے۔" اس کے بعد منی ذرا رکی پھر آواز نیچی کر کے بولی:۔

"میں کہتی ہوں کہ جوان لڑکی کو کیسے بھیجدوں۔ اس موئی کا بھی دیدہ ہوائی ہے۔ پانی بھرنے جاتی ہے تو ٹھٹھا کرتی ہوئی۔"

مولی۔ "جائے گی تو حرامزادی اپنے سے جائے گی۔ ایک چلی گئی تو کیا کرلیا؟ لڑکا ہوتی تو چار آنہ روز کما لاتی۔"

مولی کی بڑی لڑکی بھاگ گئی تھی۔ اور سال بھر سے پتہ نہیں تھا۔

منی۔ "کر کیا لیا؟ موئی تھی ہی ایسی۔ ایسی نہ ہوتی تو جاتی کیوں؟ لڑکے کب اچھے نکلتے ہیں؟ کس نے لا کر ماں باپ کو کھلایا ہے؟ اِدھر کمانے کے قابل ہوئے، اُدھر چلدئے۔ بھورے کو دیکھو۔ ٹھیلہ چلاتا ہی۔ دس آنے روز پاتا ہے اور سب اُڑا دیتا ہے۔"

منی ایک ٹھنڈی سانس بھر کر خاموش ہوگئی۔ اور پھر مستقل خاموشی چھاگئی جس کو کبھی کبھی ان لوگوں کی کھانسی کی آواز برطرف کردیتی تھی۔ ابھی آٹھ ہی بجے تھے، اور بازار میں چہل پہل تھی۔ مگر یہاں سوتا پڑ گیا۔

(۲)

صبح جب مولا کی آنکھ کھلی تو اس نے منی کو جاگتا پایا۔ پانچ منٹ تک پلنگ پر پڑا رہا۔ پھر کراہتا ہوا اُٹھا، اور بولا۔

"سردی کے مارے جان نکلی جاتی ہے۔ بدن جیسے تختہ ہوگیا۔ بیڑی کہاں ہے؟"

منی نے اُٹھکر ایک کونے سے ایک بیڑی کا بنڈل اور دیا سلائی کی ڈبیہ نکال کر دی۔ مولی نے ایک بیڑی سلگائی اور پینے لگا اور بیڑی جب تک چٹکی سے پکڑنے کے قابل رہی اس نے ہاتھ سے نہیں چھوڑی۔ پھر پلنگ سے اُٹھا، اور لوٹا لیکر باہر چلا گیا۔ پندرہ منٹ کے بعد سردی سے کانپتا ہوا اندر آیا۔ اور لوٹا رکھکر بولا۔

"ایک بیڑی اور۔ اتنا دن چڑھ آیا، دھوپ کا پتہ نہیں۔"

مولی نے ایک بیڑی اور سلگائی۔ پھر ٹوکری اُٹھاکر بیڑی پیتا ہوا باہر چلا گیا۔

مولی کے جانے کے دو گھنٹہ بعد منی لڑکوں، اور لڑکیوں کو لیکر باہر نکلی۔ اور کوٹھری میں کنڈی لگاکر ٹہلنے چلی۔ کچھ دور پر دوسرے مزدوروں کی عورتیں دھوپ میں بیٹھی بک بک کر رہی تھیں، یہ جاکر اس میں شریک ہوگئی۔ لڑکے اور چھوٹی لڑکی آنکھ بچاکر ادھر اُدھر ہو رہے۔

تین چار گھنٹہ کے بعد منو آیا اور ماں سے کہنے لگا:۔

"ماں رے! بھوک لگی ہے۔"

منی ویسے ہی باتوں میں مشغول رہی۔ گویا یہ سننے والی بات ہی نہ تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد ببو آیا اور اس نے بھی اسی فقرے کو سنایا۔ مگر اس نے ادھر بھی توجہ نہ کی۔ اسوقت وہ کسی شریف گھرانے کے گھر کی عورتوں کی بدچلنی بہت جوش و خروش سے بیان کر رہی تھی۔ اس جوش میں یہ فخر پوشیدہ تھا "گو چھوٹی ذات سہی۔ مگر میں ایسی نہیں ہوں۔" تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد ایک لڑکا۔ یا دونوں کے دونوں، اپنی صدا لگا دیتے اسی طرح ایک گھنٹہ گزر گیا۔ اب چھوٹی لڑکی بھی کہیں سے آئی اور ماں کے پاس بیٹھ گئی پھر چپکے سے بولی۔

"اماں چلو۔"

منی ۔ "ابھی سویرا ہے ۔ ذرا ٹھیرو۔"

دس منٹ اور گزرے اب تو ببو ماں کا کندھا پکڑ کر کھڑا ہو گیا، اور رونی آواز سے رٹ لگا دی۔

"کھانا دو ۔ کھانا دو ۔ کھانا دو۔"

منی تھوڑی دیر تک یہ ریں ریں سنتی رہی۔ پھر اس کو ڈانٹ دیا۔ جس پر ببو بھوں بھوں رونے لگا۔ آخر یہ بڑبڑاتی ہوئی اُٹھی۔

"میں کہتی ہوں ۔ یہ سب غارت ہوں ۔ یا میں غارت ہوں ۔ زندگی دوبھر ہے موئی۔"

منی نے کوٹھری میں آکر آگ سلگائی۔ اور باجرے کے آٹے کی پانچ ٹکیاں پکائیں۔ دو چھوٹی، اور تین بڑی ان پر ذرا ذرا سا گڑ رکھ کر چھوٹی دونوں لڑکوں کو دیں اور بڑی خود لی اور دونوں لڑکیوں کو دیں۔ ان لوگوں کا کھانا تین چار منٹ کے اندر ہی اندر ختم ہوگیا۔ اور پھر یہ سب لوگ گھومنے چلے گئے۔

شام کو مولی جب مزدوری کے پیسے لئے پلٹ رہا تھا تو اس کی نگاہ گلی کے کونے پر پڑی۔ دیکھا تو دو، ڈھائی سیر آٹا یوں ہی پڑا ہوا ہے۔ اس نے قریب جاکر آٹے کو چٹکی میں اُٹھایا۔ گویا یہ یقین کرنا چاہتا ہے کہ آنکھیں دھوکا تو نہیں دے رہی ہیں۔ جب یقین آگیا تو متحیر کھڑا رہ گیا۔ دل کہتا تھا کہ اُٹھا لے چلو۔ مگر ایک تو یہ ڈر کہ شاید

کوئی کچھ کہے۔ اور دوسری یہ جھجھک کہ اس کے ساتھی مزدور بھی پیچھے آرہے ہوں گے۔ اگر وہ مجھے آٹا اُٹھاتے دیکھیں گے تو کیا کہیں گے۔ آخر آٹا اُٹھانے کی ہمت نہیں پڑی اور یہ چل کھڑا ہوا۔ مگر ہر قدم پر رفتار سست ہوتی جاتی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دس ہی قدم پہونچکر بھوچکا سا کھڑا ہوگیا۔ جیسے چوراہے پر پہونچکر راستہ بھول گیا ہو یہ سوچ رہا تھا کہ کوئی دوسرا مزدور اس آٹے کو ضرور اُٹھالیگا۔ مجھے نہیں ملے گا اور اس کو مل جائے گا۔ رفتہ رفتہ یہ خیال اتنا گہرا ہوگیا کہ مولا خیالی آٹا اُٹھانے والے مزدور کو حد سے زیادہ رشک کی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ اور یہ سوچتا ہوا آٹے کی طرف واپس آیا۔ بلا سے کوئی ہنسے گا، تو ہنس لے گا۔ بیوی بچے تو آٹا پاکر خوش ہوجائیں گے مولی کے قدم اتنے جوانمردی سے آٹے کی طرف بڑھ رہے تھے گویا وہ کسی ڈوبتے ہوئے لڑکے کو دریا سے نکالنے جارہا ہے آٹے کے پاس پہونچکر اطمینان سے بیٹھ گیا۔ اپنا انگوچھا پھیلا دیا۔ اور آٹا اُٹھانے لگا۔ ساتھ ہی ساتھ بڑبڑاتا جاتا تھا۔

"کیا لوگ ہیں! اناج اس طرح پھینک دیا۔ پیروں تلے الگ آئے۔ نالی میں الگ جائے۔ اس سے تو بہتر ہے کہ مرغی چڑیاں کھالیتیں۔"

جس بات کا ڈر تھا وہی ہوئی۔ پانچ چھ مزدوروں کی ایک ٹولی پاس سے گزری۔ اور یہ عجیب تماشا دیکھکر تین چار مزدور کھڑے ہوگئے۔

ایک۔ "کیا مل گیا مولی"

مولی۔ "کچھ نہیں۔ خراب آٹا ہے۔ مگر ہے تو اناج۔ پیروں تلے آرہا تھا۔ میں نے کہا مرغی بکری کھالیں تو سوارت ہوجائے"

دوسرا۔ "کیا گلی کی پڑی ہوئی چیز! کہیں نظر گزر نہو"

پہلا۔ "اُٹھالے۔ اُٹھالے۔ اس کو بکنے دے۔ کام آجائے گا"

مولی۔ گردن جھکائے اپنے کام میں مشغول رہا۔ یہ لوگ چل کھڑے ہوئے۔ کچھ ہی دور پہونچکر ایک مزدور نے تان لگائی:۔

"سو سے برا تو ایک سے بہتر بنا دیا"

دوسرا اس کے تان ہی کی اثنا میں بولا۔

"غریب سہی، مگر ہم گلی سے گرا پڑا نہیں اُٹھاتے"

یہ مزدور بڑائی کی لے رہے تھے۔ مگر حقیقت میں ان میں سے ہر ایک کو مولی کی اس خوش نصیبی پر کہ اتنا آٹا یوں ہی پڑا مل گیا رشک و حسد ہو رہا تھا ——— اس آٹے کا بھی عجیب قصہ ہوا۔

(۳)

دس بجنے کے قریب تھے، مگر کھانا ابھی تک تیار نہیں ہوا تھا۔ شوکت میاں اسکول جانے کو تیار ہو رہے تھے۔ ان کی پھوپھی نے جلدی جلدی دو چار روٹیاں ڈلوادیں اور چار کباب تلدئے۔ جلدی سے ان کو میز پر چُن کر شوکت میاں کو کھانے کے لئے آواز دی۔ شوکت میاں ایک ہاتھ میں کتابیں لئے دوسرے ہاتھ سے شیروانی کے بٹن لگاتے کھانے کے کمرے میں گھس گئے۔ اور بلا ہاتھ دھوئے کھانا شروع کر دیا۔ مگر پہلا ہی نوالہ منہ میں رکھا تھا کہ ایسا منہ بگاڑ لیا گویا کونین پی گئے ہوں۔ جلدی سے وہ نوالہ پانی کے سہارے پیٹ میں پہونچا دیا، اور پھر روٹی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا توڑ کر منہ میں رکھا۔ چبایا۔ اور پھر منہ بگاڑ کر بولے۔

"پھوپھی جان! آٹا خراب ہے"

"آٹا خراب ہے!! کیا؟"

"شاید اکرا گیا"

پھوپھی نے بھی روٹی کا ذرا سا ٹکڑا منہ میں رکھا۔ اور پھر بولیں:۔

"تمہاری باتیں! "اکرا گیا"۔ کچھ روٹیاں جلدی پکنے سے دھواں گئیں"

شوکت میاں نے کچھ جواب نہیں دیا۔ جلدی سے کتابیں اُٹھا کر بھاگتے ہوئے باہر چلے گئے۔

بیگم صاحبہ دھوپ میں بیٹھی کچھ سی رہی تھیں۔ اپنے بیٹے کو اتنی جلدی کھانے کے کمرے سے نکلتے دیکھ کر بولیں:۔

"کیا بات ہے؟"

شوکت میاں کی پھوپھی ۔ "کچھ نہیں۔ ذرا روٹیاں دھواں گئیں"

بیگم صاحبہ ۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا، شوکت میاں کب تک فاقے سے اسکول جاتے رہیں گے۔ ذرا روٹیاں میں تو دیکھوں!"

شوکت میاں کی پھوپھی ایک پلیٹ میں روٹی رکھ کر سامنے لائیں۔ بیگم صاحبہ نے ذرا سا ٹکڑا منہ میں رکھا اور بولیں:۔

"یہ دھواں گئیں ہیں۔ میں کہتی ہوں بہن تم کو کب عقل آئے گی۔ "اکرایا ہوا آٹا میرے بچے کے سامنے رکھدیا۔ جہاں میں ذرا غافل ہوئی بس دلدّر پنا ہونے لگتا ہے"

اس فقرہ کا نشانا پھوپھی تھیں۔ یہ بیچاری بہو میاں کے باپ کی خالہ زاد بہن تھیں۔ دس برس ہوئے بیوہ ہو گئیں تھیں اور ان کا یا ان کی لڑکی کا بجز اسی گھر کے اور کوئی سہارا نہیں تھا۔ بظاہر تو یہ ایک

غریب بہن کی طرح رکھی جاتی تھیں۔ مگر حقیقت میں یہ "صدر ماما" یا نوکروں کے انچارج کی خدمات انجام دیتی تھیں۔ اور ہر قسم کی بدنظمی کی براہ راست ذمہ دار تھیں۔ بیگم صاحبہ کا الزام سن کر بولیں :۔

"اے میں نے تو بھلے کی سوچی تھی۔ چھوٹی مٹکی میں آٹا تھا۔ میں نے کہا یہ کیوں پڑا رہے۔ کام ہی آجائے"

"یہ نہ ہوا کر دیکھ لیتیں آٹا ہے کیسا ؟ وہ تو روٹی کی صورت سے معلوم ہوتا ہے —— خیراتن"

ان کی آواز پچیس گز کا فاصلہ طے کر کے اسی کڑک سے باورچی خانے پہونچی۔

خیراتن "—— جی بیگم صاحبہ —— پکار رہی ہوں"

"سب آٹا نالی میں پھینکدے۔ بڑے گگرے سے آٹا نکال کر پکا"

شوکت میاں کی پھوپھی اس حکم کی تعمیل کرانے دوڑیں اور باورچی خانے میں آکر بڑبڑانے لگیں۔

"نالی میں پھینک دو۔ نالی میں پھینک دو۔ سچ ہے کہ جب چیز ہوتی ہے تو اس کی قدر نہیں ہوتی اناج بڑی چیز ہے بہن ! بڑی چیز"

خیراتن —"ہاں گندھا گندھایا آٹا۔ سب محنت اکارت"

"تم پھیکو دیکھو نہیں۔ لیتی جاؤ بکری کو کھلا دینا۔ ہاں، اور دیکھو مٹکی میں ابھی ڈھائی دو سیر آٹا او ہو گا دو آنے دس پیسے کا مال ہے۔ وہ بھی تم لیتی جاؤ۔ میں پھکوا کر کیا کروں گی"

خیراتن چاہتی تو تھی کہ آٹا لیجائے۔ مگر یہ دیکھ کر کہ پھوپھی مری بچھیا برہمن کے نام کر کے احسان کرنا چاہتی ہیں۔ بولی :۔

"ہاں، آٹا لیجا کر کسی کونے میں ڈالدوں گی۔ پیروں تلے نہ آئے۔ اب ہے یہ کس کام کا"

پھوپھی نے اس ڈر سے زیادہ باتیں نہیں کہیں کہ کہیں خیراتن آٹا لیجانے سے بالکل ہی انکار نہ کر دے۔ اور اس طرح ذرا ظہور احسان کرنے کا جو موقع مل رہا ہے وہ بھی ہاتھ سے نکل جائے۔ فوراً کوٹھری کے اندر جا کر آٹا اپنے ایک میلے ڈوپٹے میں باندھ لائیں اور بولیں :۔

"ذرا ڈوپٹہ کا خیال رکھنا۔ پھٹنے نہ پائے۔ اور شام ہی کو اپنے ساتھ لیتی آنا"

خیراتن نے پوٹلی کی طرف ایک نظر ڈالی، اور پھر کام میں مشغول ہو گئی۔ جب گھر جانے لگی تو پکی ہوئی روٹیاں۔ گوندھا ہوا آٹا اور آٹے کی پوٹلی سب سامان لیکر گھر آئی۔ خیراتن کی بڑی لڑکی نے، جو شوہر سے لڑائی ہونے کی وجہ سے مستقل ماں کے پاس رہتی تھی۔ اس سامان کا حال پوچھا۔ جب خیراتن نے قصہ بیان کیا تو اس نے روٹی چکھی اور پھر بولی :۔

"کھانے کے قابل نہیں۔ کڑوا ہو گیا"

"بکری کھا لیگی"

"اس کا دودھ نہ گھٹ جائے گا"

خیراتن نے اُٹھکر روٹیاں بکری کے سامنے ڈالدیں۔ اس نے ایک روٹی تو کھالی۔ مگر اس کے بعد مُنھ ہٹالیا۔ پھر ان لوگوں نے لاکھ چمکارا مگر وہ ادھر متوجہ بھی نہیں ہوئی۔ اور ادھر متوجہ کیسے ہوتی۔ وہ تو بیگم کے یہاں کے بچے کھچے مرغن کھانوں پر پلی تھی۔ اسوقت بھی اسی سے پیٹ بھرا تھا۔

اب خیراتن سوچ میں پڑگئی کہ آٹے کا مصرف کیا ہو۔ بیٹی نے تجویز پیش کی۔

"دُلارے کی نظر اُتار کر چوراہے پر ڈالدو"

یہ تجویز معقول تھی۔ اگر آدھ سیر تک آٹا ہوتا تو اس پر ضرور عمل کیا جاتا۔ مگر اکدم سے ڈھائی سیر آٹا اس طرح پھینکنے پر خیراتن کے دل نے گواہی نہیں دی۔

رات کو جب خیراتن کام کاج سے واپس آئی۔ اور اطمینان سے کھانا کھا کر لیٹی تو یہ مسئلہ اُٹھا کہ آٹے کا کیا ہو۔ دوست اور عزیزوں کی فہرست دہرائی۔ مگر کوئی کام آتا شخص نظر نہ آیا۔ صبح کو ایک فقیر نے صدا لگائی، خیراتن نے موقع غنیمت جانا اور فوراً پاؤ بھر آٹا نکال کر بھیک دینے لگی۔ مگر فقیر تھا شہر کا۔ آٹا دیکھ کر بولا:-

"مائی فقیر کو خراب چیز نہ دیا کر۔ اللہ بھلا کرے"

یہ کہکر چلتا ہوا۔ خیراتن آٹا لئے بڑبڑاتی اندر آئی۔

"موئے۔ موئے فقیر۔ بھیک مانگنے چلے ہیں"

اب پھر وہی مسئلہ۔ آٹے کا کیا ہو؟ سہ پہر کو ایک عورت دو بچوں کو ساتھ لئے ان کے گھر میں آئی۔ اور اس نے اپنی کتھا یوں سنائی۔ میں کوئٹہ کی رہنے والی ہوں۔ زلزلے میں میرا سب کچھ تباہ ہوگیا۔ میرے باغات تھے۔ بڑے بڑے مکانات تھے شوہر اور لڑکے تھے۔ مگر سب تباہ ہوگئے۔ اور میں دکھیا دربدر گھوم رہی ہوں۔

خیراتن کو اور اس کی بیٹی کو ان تینوں کے حال پر بڑا ترس آیا۔ اور سب آٹا اُٹھا کر ایک مشت اان لوگوں کو دیدیا —— وہ عورت غریب آدمیوں سے خلاف توقع اتنا آٹا پاکر متعجب ہوئی۔ مگر عورت تھی، ان عورتوں کے خلوص میں اسکو شک ہوا۔ ذرا دور گلی میں جاکر اس نے پوٹلی کھولی۔ جب حقیقت معلوم ہوئی تو خوب بڑبڑائی۔ کوسنے دئے اور آٹا گلی میں ڈالکر چلتی ہوئی۔ اس کو خراب آٹے کی کیا پرواتھی۔ اس کی جیب میں آج کی تحصیل وصول کے روپیہ کھنک رہے تھے

(۴)

شام کے وقت منی مولی کا انتظار کر رہی تھی۔ اور ببوا اس کے کندھے سے لگا ریں ریں کر رہا تھا۔

"اماں بھوک لگی —— اماں بھوک لگی"

منی — دوپہر کو تھیں اور منو کو برابر کی ٹکیاں دیں تھیں۔ دیکھو وہ کہاں ردتا ہے۔

منو ایک لال لنگوٹے کا پھٹا کاغذ سر پر لپیٹے۔ ایک لکڑی ہاتھ میں لئے سپاہی بنا ٹہل رہا تھا۔ یہ سُنکر بولا:—

" اماں کل اور کم دینا۔ تب بھی ہم نہیں روئیں گے "

منی — اب بتا ببو — وہ دیکھو کتنا اچھا لڑکا ہے "

ببو حیرت میں آکر خاموش ہوگیا۔ مگر پھر تھوڑی دیر کے بعد ویسی ہی ریں ریں کرنے لگا۔ اب منی کہنے لگی:—

" رو نہیں۔ دیکھو وہ آتے ہوں گے۔ اور تمھارے لئے چیز لاتے ہوں گے "

اتنے میں مولی آٹے کا پوٹلا لئے ہوئے کوٹھری میں داخل ہوا۔ منی نے پوٹلا کھولا۔ اور دیکھکر حیرت سے بولی:—

" گیہوں کا آٹا!! کہاں ملا ؟ "

جب سے مولا بیمار تھا ان لوگوں نے گیہوں کی روٹی نہیں کھائی تھی۔ اسے دیکھکر سب خوش ہوئے۔

مولا — " مل گیا — دیکھو کتنا ہے! "

منی دوڑ کر کہیں سے ترازو مانگ لائی۔ اور آٹا تولنے کے لئے بیٹھی۔ ایک سیر تولا۔ اور اس کو ایک اور کپڑے میں رکھدیا۔ پھر دوسری بار ترازو بھرا۔ نتیجہ دیکھنے کو سب انتہائی ذوق و شوق سے منتظر تھے جیسے لڑکے اسکول میں امتحان کا نتیجہ سننے کے منتظر کھڑے ہوتے ہیں۔ آخر منی بولی:—

" سوا دو سیر سے کم نہ ہوگا۔ کتنا اچھا آٹا ہے۔ چل چھوکری۔ دیکھ اس کے گیہوں چن۔ پہلے چراغ جلا— اندھیرا بہت ہے "

ایک لڑکی نے دوڑ کر ایک میلی سی لالٹین اُٹھا کر جلائی۔ اور پھر دونوں بیٹھ کر گھن چننے لگیں۔ دونوں چھوٹے لڑکے غل مچانے لگے۔

" گیہوں کا آٹا — گیہوں کا آٹا "

منی تھوڑی دیر چپ رہی۔ پھر جھلا کر بولی:—

" چپ رہو کمبختو۔ کان پھاڑے ڈالتے ہو۔"

اس کے بعد خاموشی طاری ہوگئی۔ تھوڑی دیر تک چھوٹی لڑکی کے کھانسنے کی آواز۔ یا بڑی لڑکی کے بدن کھجلانے کی کھر کھر کے اور کوئی آواز نہ تھی۔ پانچ منٹ کے بعد منی نے حکم سنایا۔

" بس اب صاف ہوگیا۔ آدھا آٹا کل کے لئے رکھدو "

مولی — " اب رکھو گی کیا۔ آج ہی پکالو۔ سب جی بھر کر کھالیں "

دونوں لڑکے — " ہاں — ہاں — میری اماں "

منی آٹا گوندھنے لگی - آٹے میں اب بھی گھن موجود تھے - گوندھنے میں اس کو کچھ شک ہوا - اس نے آٹا نکالکر چکھا - پھر ذرا منھ بناکر بولی :-

نمک ڈال کر پکانے والا ہے دو پیسے کا تیل لے آؤ تو آج پوریاں پکیں - دو پیسے کے آلو بھی لے آؤ ذرا جاکر بقالی کے یہاں سے کڑھائی تو لانا -

دونوں لڑکے بیتابانہ کڑھائی لینے دوڑے - پیچھے پیچھے چھوٹی لڑکی چلی - مولا بنیئے کے یہاں سامان خریدنے لگا - منی نے آٹا گوندھ کر رکھا - اتنے میں لڑکی کڑھائی لئے آپہونچی اور پیچھے پیچھے دونوں لڑکے چیختے ہوئے آئے -

"ہم لیجائیں گے ہم لیجائیں گے"

منی نے کوٹھری کے باہر نکل کر کڑھائی مانجی - مولی لکڑی وغیرہ لیکر آیا - لڑکیوں نے آگ بنائی - سب لڑکے چولھا گھیر کر بیٹھے - کڑھائی چڑھائی گئی - منی نے ایک مٹی کی رکابی میں ایک بڑی سی روٹی بڑھائی - کڑھائی میں دو قطرے تیل ڈالا - جب وہ کڑکڑانے لگا تو اس نے روٹی ڈالدی - وہ چرّے بولی - تیل کی بو کمرے میں پھیل گئی - لڑکے کھانسنے لگے - پوریاں پکتے دیکھ کر سب کے چہروں پر بحالی آگئی -

منو — "اہاہا کیسی اچھی خوشبو نکلی"

منی نے روٹی دوسری طرف الٹی -

منو — کیسی لال لال - اماں یہ ہم کھائیں گے"

ببو — نہیں ہم — ہم -

منی نے پوری اتاری - پھر کڑھائی میں دو قطرے ٹپکائے - اور دوسری پوری ڈالی - اسی طرح اس نے ایک گھنٹہ میں دھیمی دھیمی آنچ میں سب پوریاں نکال لیں - کھانے میں بہت دیر ہوگئی تھی - مگر خوشی میں کسی کو محسوس نہیں ہوا - پوریاں پکاکر منی چلائی :-

"ارے آلو لاؤ - آلو لاؤ - کسی نے ابھی تک کاٹے ہی نہیں - میں کہتی ہوں یہ چھوکریاں کسی کام کی نہیں - سب کھڑی تماشا دیکھ رہی ہیں"

جلدی جلدی آلو کے پتلے پتلے قتلے کاٹے گئے - اور پھر کڑھائی میں پکانے کے لئے چڑھا دئے گئے - یہ انتظار بیشک کھل گیا - سب خاموش بیٹھے رہے - صرف کھانسی کی آواز اسکو توڑ دیتی تھی - آخر آلو تیار ہوگئے - تیار کیا ہوگئے، ذرا ملائم پڑ گئے - منی نے پلیٹیں نکالیں - اور سب میں دو دو پوریاں اور ان پر تھوڑے تھوڑے آلو رکھ کر سب کے سامنے بڑھا دئے - اب جو ان لوگوں نے خیال کیا تو ببو سو رہا تھا -

منی ــــ "بو اٹھو، اٹھو، دیکھ پوریاں تیار ہوگئیں"

لڑکیاں ــــ اے بو ۔ بو ۔

بو آنکھیں ملتا ہوا اٹھا اور رونے کی نیت سے پورا منھ کھولکر ایک چیخ لگائی۔ مگر ابھی چیخ پوری نہیں ہوئی تھی کہ اس کی نگاہ پوریوں پر پڑگئی جس کو دیکھکر رونا بھول گیا ــــ سب ہنس ہنس کر پوریاں کھانے لگے۔

منو ــــ "اہاہا ۔ کتنی مزے کی ہیں"

چھوٹی لڑکی ــــ "اماں! سالن ہوتا"

بڑی لڑکی ــــ "ہاں! اور پلاؤ متنجن نہوتا ۔ گدھی"

پھر خاموشی ہوگئی ۔ یہ لوگ خوب مزے لیلیکر کھا رہے تھے جس سے اچھا خاصہ شور پیدا ہوگیا تھا جب پوریاں ختم ہوگئیں تو منی نے آدھی آدھی سب کو اور دیں ۔ اور پھر خود بھی لی ۔ مولی نے آٹا ملنے کا قصہ بیان کیا۔

اس پر منی بولی :- یہ بھی خدا کی دین ہے ۔ میں بیو سے کہہ رہی تھی کہ آج ابا چیز لاتے ہوں گے۔

بو ــــ "اماں ہم کر اگرم پوری والے بنیں گے ۔ اور خوب پوریاں کھائیں گے"

منو ــــ "ہم سپاہی بنیں گے ۔ سب کو پکڑ پکڑ کر جیل خانے بھیجا کریں گے"

بو ــــ "ہم تم کو پوریاں نہیں دیں گے۔

منو ــــ ہم تم کو خوب پیٹیں گے ۔ اور پکڑ کر تھانے میں بند کر دیں گے ۔

بو ــــ ہم ــــ ہم تم کو ــــ

بو کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کہے ۔ اس نے منو کا منھ چڑھا دیا ۔ اس پر منو نے ایک گھونسا رسید کیا مولا نے دونوں کو ڈانٹا ــــ "کمبختو! آج تو خوب ٹھونس ٹھونس کر کھایا ہے ۔ آج تو چپ رہو"

دونوں خاموش ہوگئے ۔ مولا بولا :- "خدا اب روز پیٹ بھر دے"

جب یہ لوگ سونے لیٹے تو بو بولا :-

"اماں! کہانی کہو"

لڑکیاں ــــ "ہاں، ہاں ۔ بادشاہزادے والی"

منی کی بھی طبیعت آج موزوں تھی ۔ وہ کہنے لگی :-

"ایک تھا بادشاہ ــــ ہمارا تمہارا خدا بادشاہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

محمد حیات اللہ انصاری ۔ بی ۔ اے (علیگ)

باب المراسلۃ والمناظرہ

مذہب کی کورانہ تقلید

(جناب مشتاق حسین صاحب وکیل ہائیکورٹ لشکر)

ذریعہ ہذا ایک مضمون آپ کو ارسال کرتا ہوں۔ امید کہ اُس کا جواب بذریعہ نگار عطا فرمایا جائیگا۔ ممکن ہے کہ مضمون مرسلہ اُس معیار پر پورا نہ اُترے۔ جو آپ نے نگار کیلئے مخصوص کر رکھا ہے۔ لیکن عرصہ تک نگار کا مطالعہ کرنے کے بعد میرے دل میں جو شکوک وشبہات پیدا ہوگئے ہیں۔ میں ان کا ازالہ کرنا چاہتا ہوں۔ یا بالفاظ دیگر اپنا اطمینان کرنا چاہتا ہوں۔ اس لئے امید کرتا ہوں کہ آپ اس کا جواب معقول عنایت فرما دیں گے۔

میں رسالہ نگار کا تاریخ اجراء رسالہ سے مسلسل مطالعہ کر رہا ہوں۔ ابتک مذہب اسلام کے متعلق آپ نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے۔ اور مذہب کے بارہ میں آپ کی جو رائے ہے وہ کوئی پوشیدہ امر نہیں ہے۔ میں یہ بحث تو کرنا نہیں چاہتا کہ آپ نے معتقدات و مذہبی جذبات کے متعلق جو کچھ تحریر فرمایا ہے۔ وہ صحیح ہے یا غلط۔ لیکن آپ سے یہ معلوم کرنا ضروری خیال کرتا ہوں کہ اگر تمام رسم ورواج واعتقادات واُصول وایمان کو آج خیرباد کہدیا جاوے۔ اور بقول آپ کے صرف قرآن کی صحیح تعلیم کو پیش نظر رکھا جائے۔ تو کیا مسلم قوم کی اجتماعی قوت زندہ ہوسکتی ہے؟

مورخ وعلم النفس کے ماہرین اس امر پر متفق ہیں کہ قومی ترقی وعروج کے لئے کسی عقیدہ کا ہونا ضروری ہے اور جس قوم کا عقیدہ جس قدر راسخ ہوگا اسی قدر اس میں قوت زیادہ ہوگی۔ مثلاً مذہب اسلام کے ابتدائی زمانہ کو لیجئے کہ عرب کے ان جاہلوں میں وہ کونسی قوت تھی جس کی وجہ سے۔ روم۔ یونان اور ایشیا کی تمام اقوام لرزہ براندام تھیں۔ اور فتح وکامرانی ان جاہلوں کے ارادہ کے ساتھ چلتی تھی۔ میرے خیال میں ان تمام اشخاص یا قوم میں صرف عقیدہ کی قوت کام کر رہی تھی۔ یعنی ان کو بتلایا گیا تھا کہ جو کچھ تم کر رہے ہو وہ خدا کے حکم سے کر رہے ہو۔ اور اگر تم شہید ہوگئے تو تم کو جنت ملے گی۔ اور جنت میں تم کو یہ آرام وآسائیاں ملیں گی۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ یہ جاہل موت کو تلاش کرتے تھے۔

اور موت ان سے گریز کرتی تھی۔ آج آپ جنت و دوزخ کو فرضی نام بتلاتے ہیں۔ مگر اسوقت اس فرضی نام میں ہی یہ قوت تھی کہ انھیں فرضی اعتقادات کے تحت لاکھوں انسانوں نے اپنی جانوں کو متاع حقیر خیال کیا۔ ابتک آپ نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے۔ ممکن ہے کہ آپ اسکا یہ جواب دیں کہ وہ صرف تعلیم یافتہ طبقہ کے لئے ہے۔ جاہلوں سے اسکا کوئی واسطہ نہیں مگر آپ کے پاس اس کا کیا جواب ہوسکتا ہے کہ جب کسی عقیدہ یا اصول مذہبی میں بحث و دلیل شروع کردیجائے اور عوام کو مشاہدات و احساسات کی روشنی میں عقیدہ یا اصول کی پرکھنے کی عادت ڈالدیجائے۔ تو پھر نہ اصول باقی رہتا ہے نہ عقیدہ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تمدنی ترقی کے اسباب مفقود ہوجاتے ہیں اور قوم پر ایک قسم کا جمود طاری ہوکر دور وحشت لوٹ آتا ہے۔ آپ کا یہ فرمانا کہ عقیدہ یا ایمان کو جب تک عقل سلیم قبول نہ کرے۔ انسان کیونکر تقلید گوارا نہ کرسکتا ہے۔ میری رائے میں آپ کا یہ مشورہ صحیح نہیں ہے۔

دنیا میں جب کبھی قومی انقلابات ہوتے ہیں۔ تو کیا آپ بتلا سکتے ہیں کہ ان انقلابات میں کتنے انشاپرداز۔ ایڈیٹر۔ منطقی و فلاسفر شامل ہوتے ہیں غالباً اس کا جواب نفی میں ہوگا۔ انقلابات کے بانی صرف مذہبی لوگ ہوئے ہیں جنھوں نے اصول و اعتقادات اور ان کی حمایت میں اپنی جانوں کو بیدریغ قربان کیا۔ آج بھی آپ روزانہ کا عمل دیکھ رہے ہیں کہ آپ کسی واقعہ کو مذہبی رنگ دیکر سیکڑوں ہزاروں انسانوں کی قربانی کرا دیجئے۔ برخلاف اس کے آپ کسی منطقی دلیل سے کسی ایک انسان کی بھی بھینٹ نہیں چڑھا سکتے۔ چنانچہ آج بھی آپ کو ہر قوم میں لاکھوں آدمی ایسے مل سکتے ہیں جو اپنے اصول و اعتقادات کے تحت اپنی جانوں کو بیدریغ قربان کرسکتے ہیں۔ حالانکہ آپ ان اصول و اعتقادات کو مجموعہ خرافات خیال کرتے ہیں۔

میرے خیال میں کسی قوم کی اجتماعی اور تمدنی ترقی کے لئے کسی اصول و عقیدہ کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ خواہ وہ اصول یا عقیدہ صحیح ہو یا غلط۔ کیونکہ بغیر اس کے کامیاب ہونا ناممکن ہے۔ اگر بقول آپ کے تمام اسلامی عقاید مثل جنت دوزخ۔ معجزات۔ کتب الہامی۔ معراج و حیات بعد الموت۔ وغیرہ جن سب سے آپ کو انکار ہے۔ اگر آج ان کل عقاید کو کل دنیا کے ہر مسلمان غلط قرار دیدیں تو پھر یہ بتلایئے کہ ان غلط عقاید کے مقابلہ میں آپ کونسا صحیح عقیدہ یا حل پیش کرتے ہیں۔ جس سے وہ تمام فوائد جو ان عقیدوں سے اب تک حاصل ہوئے ہیں آیندہ حاصل ہوسکتے ہیں۔ کسی عقیدہ کے قوت و نفوذ کو وہی عقیدہ ضعیف کرسکتا ہے۔ جو قوت و نفوذ میں اس کے برابر ہو۔ اس بنا پر ایمان کا دشمن ایمان ہی ہوسکتا ہے۔ رہا یہ امر کہ مولوی۔ ملاں عقیدہ یا اصول سے ناجائز فایدہ اٹھاتے ہیں۔ اور گمراہی پھیلاتے ہیں اور انھوں نے اس کو اپنی معاش کا ذریعہ بنا رکھا ہے۔ تو جناب والا اس کے لئے خواہ کتنی ہی کوشش کریں۔ یہ طبقہ برابر فائدہ اٹھاتا رہیگا اور کوئی دلیل یا منطق ان کو اس فعل سے باز نہیں رکھ سکتی۔ جب تک مثل ایران۔ ٹرکی اس طبقہ پر پابندیاں عاید نہ کردیجا ویں۔ اور ان کو خود حلال کی روزی کمانے پر قانوناً مجبور نہ کر دیا جاسکے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ اب تک آپ نے جو کچھ اعتقادات و اُصول کے خلاف تحریر فرمایا ہے ۔ وہ اگر صحیح بھی مان لیا جائے تو اس کا نتیجہ بجز اس کے کچھ نہیں ہے ۔ کہ ۹۵ فیصدی غیر تعلیم یافتہ طبقہ جو معتقدات پر سختی سے عامل ہے اور جو اس کے موروثی عادات کا جزو ہو گئے ہیں ۔ اور جن کے تمام اعمال میں معتقدات سرایت کر گئے ہیں ان کو غلط راستہ پر ڈالدیا جائے اگر آپ ان کو بھی صحیح راستہ بتانا چاہتے ہیں تو مہربانی فرما کر اس عام ایمان کے مقابلہ میں کوئی پختہ ایمان تجویز فرمائیے ۔ جو ان کی ذہنیت اور ماحول کے مطابق ہو ۔

دنیا آپ کی تخریبی پروگرام سے تو واقف ہو چکی ہے ۔ اب تعمیری پروگرام کا انتظار کر رہی ہے ۔ فقط

(نگار) آپ کی تحریر کا خلاصہ غالباً صرف اس قدر ہے کہ :۔

۱ ۔ رسم و رواج یا اعتقادات کا وجود قومی ترقی کے لئے ازبس ضروری ہے اور

۲ ۔ عقاید کو علم یا عقل کی روشنی میں دیکھنا اجتماعی زندگی اور تمدنی ترقی کے مانع ہے ۔

اور انھیں دو بنیادی اُصول پر آپ نے محاکمہ کرتے ہوئے میری مذہبی آزادی کو مضرت رساں اور جہلاء کے عام عقاید کو مفید ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور اس باب میں آپ کا غلو اس حد تک پہونچ گیا ہے کہ خالص قرآنی تعلیم کو بھی آپ کافی نہیں سمجھتے ۔ گویا بہ الفاظ دیگر آپ کا کہنا یہ ہے کہ مسلمانوں کی ترقی کا راز صرف یہی تھا کہ وہ حشر و نشر دوزخ و جنت وغیرہ کے قایل تھے اور اگر اب ان کو اس عقیدہ سے ہٹایا جائے گا تو وہ یقیناً گمراہ ہو کر اپنی قومی و اجتماعی زندگی تباہ کر لیں گے ۔

آپ کے اس بیان میں نظریہ و واقعہ و حقیقتہً جتنا اختلاف و تضاد پایا جاتا ہے اور بہ لحاظ نتیجہ آپ کا استدلال جس درجہ نادرست ہے ، افسوس ہے کہ وکیل ہونے کی حیثیت سے بھی آپ کی نگاہ اس پر نہیں گئی ، اسلام کے صحیح نقطۂ نظر کا کیا ذکر ہے ۔

میرے عزیز دوست افسوس ہے کہ آپ نے اس مسئلہ پر غور کرنے سے قبل اعتقاد اور معتقدات کے فرق و امتیاز کا کوئی لحاظ نہیں کیا ۔ ایک چیز " اعتقاد " ہے یعنی وہ کیفیت یقین جو ہمارے نفس میں پائی جاتی ہے اور دوسری چیز " معتقدات " یعنی وہ مسایل جن سے ہماری کیفیت یقین متعلق ہے اور ان دونوں کا فرق ظاہر

پھر یہ تو آپ بھی کہتے ہیں کہ اعتقاد نام ہے ایک ایسے یقین کا جس میں ادنیٰ شائبۂ ریب و شک کی گنجایش نہیں لیکن شاید اس حقیقت کی طرف آپ کی نگاہ نہیں گئی کہ یقین نام ہے اس کیفیت کا جو استدراک و شعور کے ماتحت نفس انسانی میں پیدا ہوتی ہے ۔ اس لئے آپ کا " یقین کی منزل " کو عقل و استدلال کی دسترس سے باہر سمجھنا بالکل ایسا ہی ہے جیسا آپ کا کسی ملزم کی صفائی میں عدالت کے سامنے یہ کہدینا کہ اس نے

جُرم کیا ہے اور اسی لئے اس کو سزا نہ ملنی چاہئے۔

بہر حال درجاتِ یقین میں کوئی پست ترین درجہ بھی ایسا نہیں ہے جو بغیر شعورِ نفس کی مدد کے حاصل ہوجائے اور چونکہ قوتِ شاعرہ بڑی حد تک تربیت و ماحول، اسباب و حوادث خارجی سے متاثر ہوتی رہتی ہے اس لئے یہ ضرور نہیں کہ ہر زمانہ میں ہر ملک و قوم کا شعورِ نفس ایک ہی طرح کا ہو۔ ذوق و وجدان کے اس اختلاف کی صراحت بیکار ہے کیونکہ اس سے آپ کو بھی انکار نہ ہوگا۔ وہی ایک چیز جو میرے لئے قابل قبول ہے آپ کے لئے نہیں، اور جو آپ کے نزدیک واضح نہیں ہے وہ میرے لئے کھلی ہوئی حقیقت ہے۔ بہر حال آپ کا یہ کہنا کہ مذہب و اعتقاد کے باب میں عقل و شعور کو درخورِ حاصل نہیں! اصولاً و طبعاً بالکل غلط ہے۔ ایک بُت پرست اگر پتھر کی مورتی کو پوجتا ہے تو اس کیفیتِ شعور کے ساتھ کہ واقعتاً وہی اس کے مقاصد کو پورا کرنے والی ہے اور آپ خدائے واحد کی پرستش کرتے ہیں تو بھی اس احساس کے ساتھ کہ وہی مستجاب الدعوات ہے۔ اس لئے جس حد تک "اعتقادِ محض" کا تعلق ہے، کفر و اسلام میں کوئی فرق نہیں، لیکن "معتقدات" کے باب میں تمام مذاہب ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور یہیں سے یہ امر واضح ہوجاتا ہے کہ یہ اختلاف حقیقتاً شعور و ادراک کا اختلاف ہے، استدلال و استنتاج کا اختلاف ہے، عقل و طبایع کا اختلاف ہے اور اس لئے آپ کا یہ کہنا کہ "معتقداتِ مذہب" کو علم و عقل سے علٰحدہ رکھنا چاہئے نفسیاتی اُصول کے لحاظ سے بالکل ناقابلِ عمل اور داعیاتِ فطرتِ انسانی کے بالکل منافی ہے۔

یہ درست ہے کہ کسی قوم کی ترقی و عروج کے لئے کسی نہ کسی عقیدۂ راسخ کا پایا جانا بالکل ضروری ہے، کیونکہ جب تک کوئی غرض مشترک نہ ہو اجتماعی مرکزیت پیدا نہیں ہوسکتی۔ لیکن مجھے حیرت ہے کہ اس اُصول کو سامنے رکھ کر آپ یہ کیونکر ثابت کرسکتے ہیں کہ وہ عقیدۂ راسخ جو ترقی کا ضامن ہوسکتا ہے اسلام کے سوا کسی اور جگہ نہیں پایا جاتا۔

آپ کا یہ فرمانا بالکل درست ہے کہ عرب کے جاہلوں کی بیداری اسلام ہی کی ممنون تھی اور یہ ہوسکتا ہے کہ ان کا یہ تمام جوش و ولولہ صرف اس عقیدہ کی بنا پر ہو کہ انھیں مرنے کے بعد "حورِ مقصورات فی الخیام" مرحمت ہوں گی۔ لیکن کیا میں اپنے فاضل دوست سے پوچھ سکتا ہوں کہ اسلام سے پہلے جتنی قومیں ترقی کرچکی تھیں کیا وہ سب انھیں معتقدات کی قایل تھیں جو اسلام نے پیش کئے اور اب جو ممالک ترقی کر رہے ہیں اس کا سبب یہی ہے کہ وہ مسلمانوں کی طرح حیات بعد الممات، حشر و نشر اور دوزخ و جنت کے قایل ہیں۔ بحث کا یہ پہلو میں نے اس لئے اختیار کیا ہے کہ آپ ہی کی تحریر کے مطابق ترقی و عروج کا مفہوم صرف فتوحاتِ دنیاوی قرار پاتا ہے، ورنہ شاید میرا طریقِ بحث اس سے زیادہ نازک و دقیق ہوتا۔ خیر، تو مدعا یہ ظاہر کرنا ہے کہ قوموں

کی ترقی کے لئے اتحادِ خیال و عقیدہ یقیناً ضروری ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ عقیدہ وہی ہو جو اسلام نے پیش کیا ہے۔
آپ نے جاہل عربوں کی فتوحات کا تو ذکر کیا، لیکن میدیوں اور کلدانیوں کے عروج، یونان و روما کی فتوحات، قدیم مصریوں کی شوکت و جبروت، ہند و چین کی دولت و ثروت اور موجودہ عیسوی قوموں کے ارتقاء کو نظر انداز کر گئے۔ کیا ان سب کے معتقدات وہی تھے جو اسلام نے پیش کئے اور کیا تاریخ میں بت پرست قوموں کی فتوحات و ترقی کا حال آپ کی نگاہ سے نہیں گزرا۔ پھر آپ کا یہ کہنا کہ مسلمانوں کی ترقی کا سبب صرف اُن کے معتقدات تھے درست نہیں۔ کیونکہ ان معتقدات کے علاوہ دوسرے عقاید کے ماننے والوں نے بھی اپنے اپنے زمانہ میں ترقی کی اور آیندہ بھی جب آسمانی مذاہب کا خیال بھی لوگوں کے دلوں سے محو ہو جائے گا، ترقی کا دروازہ بدستور کھلا رہیگا اور ایک قوم دوسری قوم پر غلبہ پانے کی اسی طرح کوشش کرتی رہیگی۔

آپ کا یہ ارشاد بھی بجا و درست ہے کہ دنیا کے انقلابات میں انشا پردازوں، اڈیٹروں، منطقیوں اور فلاسفروں نے کوئی حصہ نہیں لیا اور بقول آپ کے یہ مذہب ہی کی کورانہ تقلید کا نتیجہ تھا کہ لاکھوں آدمیوں نے اپنی گردنیں کٹوا دیں، لیکن معاف فرمائیے، اگر مذہب کا مدعا واقعی صرف کشت و خون ہے اور جان لینا اور جان دیدینا ہی اس کا حقیقی مقصود ہے تو شاید انشا پردازوں، اڈیٹروں اور فلسفیوں کو بانیانِ مذاہب کی زندگی پر غبطہ کرنے کی ضرورت کبھی لاحق نہ ہوگی۔

تو و طوبیٰ و ما و قامت دوست !

اس قدر بیان سے غالباً دو باتیں آپ پر واضح ہوگئی ہوں گی۔ ایک یہ کہ اعتقاد و معتقدات ایک دوسرے سے بالکل جُدا دو چیزیں علٰحدہ علٰحدہ ہیں اور دوسرے، یہ کہ اجتماعیت کا اصل راز صرف اشتراکِ خیال ہے، خواہ وہ کسی نوعیت کا ہو۔ پھر کیا یہ بات آپ کی سمجھ میں آتی ہے کہ کورانہ عقیدہ تو انسان کی ترقی کا باعث ہو جائے اور وہ عقیدۂ راسخ جو علم و تجربہ کے بعد پیدا ہو، انحطاط و زوال کو مستلزم ہو۔

بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست

معاف فرمائیے، آپ نے شروع ہی سے نفسِ مذہب اور خصوصیت کے ساتھ تعلیماتِ اسلام کا مفہوم بالکل غلط قرار دیا ہے، آپ سمجھتے ہیں کہ انسانی ترقی نام ہے صرف توسیعِ حکومت و سلطنت کا اور چونکہ یہ بغیر جنگ و جدل کے ممکن نہیں اس لئے آپ کے نزدیک وہی مذہب سب سے بہتر ہے جس نے سب سے زیادہ خونریزی کی ہو ۔ حقیقت یہ ہے کہ بدنصیب ہے وہ مذہب جس کی حمایت کرنے والے ایسی خوں آشام ذہنیت رکھتے ہوں اور لایق صد ہزار تحسین ہے وہ لامذہبیت جو انسانی ترقی کا معیار صرف ذہنی و اخلاقی عروج پر قایم کرنے والی ہو ـــــــ رسول اللہ کا دعویٰ تو یہ تھا کہ اسلام دنیا میں امن و سکون

قائم کرنے کے لئے آیا ہے، انسان کو "نفس مطمئنہ" کی اس لذت سے آشنا کرنا چاہتا ہے جو مادی دُنیا سے ماوراء صرف اخلاق کی دنیا سے متعلق ہے اور اسی لئے بانی اسلام کو "رحمۃ اللعالمین" کے لقب سے یاد کیا گیا، لیکن آپ یہ فرماتے ہیں کہ نہیں اسلام نام ہے صرف اُن معتقدات کا جنھوں نے مسلمانوں کو خونریزی پر آمادہ کیا اور چونکہ آپ کے پندار کے مطابق مسلمانوں ہی نے زیادہ خونریزی کی ہے اس لئے تمام مذاہب عالم میں اسلام ہی کو یہ دعوی کرنے کا حق حاصل ہے کہ اس سے زیادہ سچا مذہب اور کوئی نہیں۔
آپ نے یہ بھی دریافت فرمایا ہے کہ اگر

"تمام اسلامی عقاید مثل جنت، دوزخ، معجزات، کتب الہامی، معراج، وحیات بعد الموت وغیرہ جن سے آپ کو انکار ہے، آج اگر ان عقاید کو کل دنیا کے مسلمان غلط قرار دیدیں تو پھر یہ بتائیے کہ ان غلط عقاید کے مقابلہ میں آپ کونسا صحیح عقیدہ پیش کرتے ہیں جس سے وہ تمام فواید حاصل ہوں جو ان عقیدوں سے اب تک حاصل ہوئے ہیں"

اس کے جواب میں مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ اگر موجودہ عقاید کے فواید وہی ہیں جنھوں نے بقول آپ کے روم ویونان کی اقوام کو لرزہ براندام کردیا تھا اور جو انسانوں کو اپنی جان دینے پر آمادہ کر دیتے تھے، تو میں نہایت ادب سے عرض کروں گا کہ اس لحاظ سے ہلاکو اور چنگیز کے عقاید کیا بُرے تھے۔ لیکن اگر مذہب کا تعلق حریت فکر و رائے سے بھی ہے تو پھر سوال عقاید جہلاء کی پیروی کا نہیں بلکہ ان کی اصلاح کا ہوا کرتا ہے اور اہل علم کو محض اس خیال سے خاموش نہ بیٹھ رہنا چاہئے کہ عوام کو ان کے عقاید سے ہٹانا دشوار ہے۔ اگر دوزخ وجنت یا حیات بعد الممات کا عقیدہ انسان کو آمادۂ عمل کر سکتا ہے تو اس عقیدہ کا انکار بدرجۂ اولیٰ جد وجہد پر آمادہ کرنے کی اہلیت اپنے اندر رکھتا ہے، کیونکہ اُس صورت میں تو سب کچھ "وعدۂ فردا" پر منحصر ہے اور اس صورت میں معاملہ "نقد سودے" کا ہے۔

آپ کو علم نہیں، مجھ سے پوچھئے کہ اس وقت تعلیم یافتہ ممالک میں مذاہب کی طرف سے کیسی عام بیزاری پیدا ہو رہی ہے اور مذہبیت کے خلاف کیسی سخت باضابطہ جنگ شروع ہوگئی ہے۔ اس کا سبب حقیقتاً یہ نہیں ہے کہ نفس مذہب سے ان کو عناد ہے بلکہ اس کی وجہ وہی عقاید کی لغویت ہے۔ اس لئے اس زمانہ میں اگر کوئی مذہب قایم رہ سکتا ہے تو صرف وہی جو اپنے عقاید کے لحاظ سے ترقی علم کا ساتھ دے اور ایسا پروگرام دنیا کے سامنے پیش کرے جو باوصف اختلاف نسل و رنگ ساری دنیا کو ایک مرکز پر لے آنے والا ہو۔

اگر آپ نے گزشتہ ماہ کا نگار ملاحظہ فرمایا ہے تو مجھے بتائیے کہ ملاحظات میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کو ناقابل عمل سمجھنے میں آپ کے پاس کیا دلایل ہیں اور اگر اسلام کا وہی مفہوم قرار دیا جائے جو اس میں ظاہر کیا گیا ہے تو کیا

کسی فرشتۂ عذاب کے نازل ہونے کا اندیشہ ہے ——آپ اس کے جواب میں کہیں گے کہ اسلام کی تعلیم آ وہ نہیں ہے جو اس میں ظاہر کی گئی ہے۔ میں کہوں گا کہ سوائے اس کے کوئی اور مقصد اسلام کا ہو ہی نہیں سکتا۔ آپ تاریخ اسلام سے استدلال کریں گے، میں تعلیم اخلاق کو پیش کروں گا، یعنی آپ مسلمانوں کا حال دیکھکر اسلام کا مفہوم متعین کریں گے، اور میں اسلام کے مفہوم سے مسلمانوں کا جایزہ لوں گا۔ آپ فرمائیں گے کہ اسلام نام ہے دوزخ وجنت کے عقیدہ کا، میں عرض کروں گا کہ اسلام کا مدعا صرف نوع انسانی کی فلاح و بہبود ہے، ان عقاید سے کوئی تعلق نہیں ——یہ ممکن ہے کہ اس "تو تو میں میں" میں آپ کامیاب ہو جائیں کیونکہ آپ ٹھیرے مسلمان جس کے نزدیک جان دیدینا اور لے لینا کوئی بڑی بات نہیں۔ لیکن جس وقت سوال صلح و آشتی کا پیدا ہوگا اور اسلام کو ایک عالمگیر مذہب کی حیثیت سے پیش کرنے کی ضرورت ہوگی، تو اس وقت آپ کی یہ جنگجویانہ تعبیر بیکار ثابت ہوگی (کیونکہ میدان جنگ وجدل میں بھی اس وقت وہی قومیں آپ سے زیادہ کامیاب ہیں جو جنت و دوزخ وغیرہ کے عقاید کو بالائے طاق رکھ چکی ہیں۔) اور آپ کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ ایک مذہب کے لئے یہ امر کبھی وجہ افتخار نہیں ہو سکتا کہ اس نے جہلا کو اُن کے جہل پر برقرار رکھا بلکہ اس کا سب سے بڑا فخر یہ ہونا چاہیئے کہ اس نے ذہنی ترقی کے لئے نئی نئی راہیں کھولدیں اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک مذہب علم وعقل کو مشعل راہ نہ بنائے ...

جنوری ۳۶ء کے نگار

میں کیا ہوگا

ہندی شاعری کی مفصل تاریخ ——ہندی کلام کا بے نظیر انتخاب —— اساتذۂ فن کے دلچسپ حالات —— برج بھاشا کے نوادر پر فاضلانہ نقد و تبصرہ —— سخن شاعری کے بے مثل نمونے —— ہندی کے عاشقانہ رنگ کے عجیب و غریب دوہے —— ہندوستان کی گوپیوں کی شاعری ——

قیمت فی پرچہ دو روپیہ —— نگار کے سالانہ خریداروں سے کچھ نہیں —— نگار کا سالانہ چندہ پانچ روپیہ ہے ——

مینیجر نگار لکھنؤ

مکتوبات نیاز

ادب و انشاء کی دنیا میں وہ چیز جسکی مثال آپ کو اُردو زبان میں مل ہی نہیں سکتی۔ طنزیات و محاکات شوخی و رنگینی سلاست و بیساختہ پن، لطیف و پاکیزہ اشعار کا محل استعمال، جذبات کی پاکیزگی، طرز ادا کی ندرت، اگر آپ ان تمام خوبیوں کو یکجا دیکھنا چاہتے ہیں تو وہ آپ کو صرف "مکتوبات نیاز" میں نظر آئیں گی اس میں حضرت نیاز کی تازہ تصویر بھی شامل ہے اور ان کی تحریر کا بلاک بھی۔ ضخامت ۲۸۸ صفحات۔ کاغذ دبیز۔ قیمت معہ محصول ۱۲؍ —— کتاب مجلد شایع ہوئی ہے

مینیجر نگار —— لکھنؤ

باب الاستفسار

فارسی زبان اور طنزیات

(جناب سید فضل الدین صاحب - دھرمپور)

میں (Satire) پر ایک کتاب لکھ رہا ہوں اور اس سلسلہ میں مجھے فارسی کی طنزیہ شاعری کا مطالعہ کرنا ہے - براہ کرم مطلع فرمایئے کہ اس کے لئے کیا تدبیر اختیار کروں - جناب رشید احمد صاحب صدیقی کا ایک مضمون اس موضوع پر نکل چکا ہے، لیکن اسکا تعلق زیادہ تر اردو سے ہے - تمہید و مقدمہ میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ زیادہ بسیط نہیں اور فارسی زبان کی طرف تو کوئی توجہ ہی نہیں کی گئی، امید ہے کہ جلد سے جلد جواب دینے کی زحمت گوارا کی جائے گی -

---

(نگار) فارسی میں "طنزیہ شاعری" ایک خاص صنف کی حیثیت رکھتی ہے اور اگر اسی میں ہجو کو بھی شامل کر لیا جائے تو پھر یہ دفتر اتنا وسیع نظر آتا ہے کہ شاید ہی کسی دوسری زبان کی شاعری اس کا مقابلہ کر سکے -

اس موضوع پر آپ کو کوئی خاص تصنیف تو ملیگی نہیں، البتہ اگر آپ شعراء فارس کے کلام کا بالاستیعاب مطالعہ فرمائیں گے تو کافی ذخیرہ ہاتھ آجائے گا - مہرجی بھائی نوشیرواں جی کوکا نے انگریزی میں فارسی لطائف و ظرائف پر ایک کتاب لکھی ہے اور اس میں بعض مثالیں طنزیہ شاعری کی بھی دی ہیں، اسے ملاحظہ فرمایئے چند یہیں درج کئے دیتا ہوں، جن سے معلوم ہوگا کہ صرف انداز بیان کی ندرت سے کیسی پاکیزہ صورتیں ہجو و طنز کی پیدا کی گئی ہیں :-

ا - خواجہ ظہیر کو کسی امیر نے کافر کہدیا تھا - اس نے جلکر دو شعر کا ایک قطعہ لکھا جو شاعر و امیر دونوں سے

زیادہ مشہور ہوا اور ابتک دنیا میں موجود ہے۔ لکھتا ہے:-

نظام بے نظام ار کافرم خواند　　　چراغ کذب را نبود فروغے
مسلماں خوانمش زیرا کہ نبود　　　سزاوار دروغے جز دروغے

بدتمیز امیر نے مجھے کافر کہا حالانکہ جھوٹ کا چراغ عرصہ تک روشن نہیں رہتا۔ بہرحال میں اُس کو مسلمان ہی کہوں گا کیونکہ جھوٹ کا جواب جھوٹ ہی ہوا کرتا ہے۔

۲۔ بالکل اسی انداز کا ایک قطعہ کمال الدین اسماعیل کا بھی ہے ملاحظہ ہو:-

گر خواجہ بہر ما بدی گفت　　　ما چہرہ زغم نمی خراشیم
ما غیر نکوئی اش نگوئیم　　　تا ہر دو دروغ گفتہ باشیم

اگر خواجہ نے مجھے بُرا کہا تو رنج کی کیا بات ہے، میں اسے اچھا کہوں گا تاکہ دونوں کا جھوٹ برابر کا ہے۔

۳۔ جمال الدین اصفہانی کو کسی رئیس نے شراب تحفتاً بھیجی جو اُس کے لئے بہت ہلکی تھی اور اُسے پسند نہیں آئی اس نے چار شعر کا ایک قطعہ لکھ کر جن الفاظ میں شکریہ ادا کیا ہے، وہ سننے کے قابل ہیں:-

اے کریمے کہ دام منت را　　　کرم و بخشش تو دانہ ماست
از تو مارا شکایتے ست لطیف　　　واں نہ از تست کز زمانہ ماست
آں چہ مے بود کم فرستادی　　　کہ ہمہ شہر پُر فسانۂ ماست
اگر آنرا شراب شاید خواند　　　چاہِ ما پس شرابخانۂ ماست

یعنی یہ آپ نے کیسی شراب بھیجی کہ اگر واقعی اس چیز کا نام شراب ہو سکتا ہے تو میں اپنے گھر کے کنوئیں کو کیوں نہ شراب خانہ کہوں، جس میں ہر وقت ایسی شراب موجود رہتی ہے۔

۴۔ شہاب ترشیزی نے کسی کی ہجو میں دو شعر لکھے ہیں بیان کا ارتقار ملاحظہ ہو:-

زبہر تاختن در وادی ہجو　　　سمندِ طبع را چوں رام کردم
ترا خر خواندم و گشتم پشیماں　　　کہ آں بیچارہ را بدنام کردم

یعنی تجھے خر کہا اور یہ کہکے پشیمان ہوا کہ ناحق بیچارے گدھے کو بدنام کیا۔

۵۔ ایک بار مولانا جامی کو کسی شاعر نے غزل سنائی جو نہایت مہمل تھی لیکن اس میں التزام اس بات کا تھا کہ حرف (الف) کہیں نہیں پایا جاتا تھا۔ شاعر نے اس صنعت کی طرف مولانا جامی کو خاص طور سے توجہ دلائی انھوں نے جو داد دی ہے وہ سننے کے قابل ہے:-

شاعرے خواند پُر خلل غزلے　　　کہ بہ حذف الف بود موصوف

گفتمش نیست صنعتے بہ ازاں — کہ کنی حذف ازاں تمام حروف

یعنی اگر الف کے ساتھ ہی غزل کے سبھی حروف حذف کر دئے جاتے تو زیادہ مناسب تھا۔

۶ — تاج الدین سرخسی نے کسی ظالم شخص کی موت پر ایک رباعی لکھی تھی، اس کی طنزیہ شان ملاحظہ ہو:-

در ماتمت آں قوم کہ خوں می بارند — مرگ تو حیات خویش می پندارند

غمناک ازانند کہ تا دوزخیاں — جاوید چگونہ با تو صحبت دارند

یعنی تیرے ماتم میں جو لوگ خون کے آنسو بہا رہے ہیں تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ تیرے مرنے کا انھیں افسوس ہے کیونکہ تیری موت تو حقیقتاً اُن کی زندگی ہے۔ بلکہ غم اس بات کا ہے کہ اہل دوزخ تیرے ساتھ دائمی زندگی کیونکر بسر کر سکیں گے۔

۷ — کمال الدین اسماعیل نے کسی بخیل کا حال ایک رباعی میں لکھا ہے۔ اور انداز بیان میں عجیب مزاح پیدا کیا ہے لکھتا ہے:-

بر دہن نانِ خواجہ چوں بُردم — خواجہ گفتا کہ آہ من مُردم

گفتمش خواہ میر و خواہ ممیر — کہ من ایں لقمہ را فرو بُردم

میں نے خواجہ کے دسترخوان پر روٹی کا نوالہ توڑ کر منھ میں رکھا تو وہ بولا کہ "آہ میں مرگیا"، میں نے اُس سے کہا اب تو مرے یا جیے، میں تو اس لقمہ کو نگلے بغیر رہتا نہیں،

۸ — عبدالعلی طوسی نے بھی ایک رباعی میں کسی بخیل کا ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں:-

اے کاسۂ تو سیاہ و دیگِ تو سفید — از آتش و آب ہر دو ببریدہ امید

آں شستہ نمی شود مگر در باراں — ویں گرم نمی شود مگر از خورشید

یعنی تیرا سیاہ پیالہ اور تیری سفید دیگ دونوں آگ اور پانی سے بالکل بے نیاز ہیں، کیونکہ پیالہ اگر کبھی دُھلتا ہے تو بارش کے پانی سے اور دیگ اگر کبھی گرم ہوتی ہے تو صرف دھوپ میں۔

۹ — ہجو میں مبالغہ کی ایک نہایت دلکش مثال میرزا ابوقاسم شیرازی کے اس قطعہ میں پائی جاتی ہے:-

بہ فلاں گفتم اے پسر پدرت — جز بتاریکی ازچہ ناں نخورد

گفت ترسد ز روشنی کہ مباد — سایہ اش دست سوئے کاسہ برد

میں نے ایک لڑکے سے پوچھا کیا بات ہے تیرا باپ، جب کھانا کھاتا ہے تاریکی میں۔ اس نے کہا کہ وہ روشنی سے اس لئے گھبراتا ہے کہ مبادا اس کا سایہ کھانے کی طرف ہاتھ بڑھا دے۔

۱۰ — مولانا شہاب الدین کسی طبیب سے جس کا نام اصیل تھا خفا ہوگئے تو اس کی ہجو میں ایک قطعہ لکھا:-

ملک الموت از اصیل طبیب — می بنالید بدرگاہ خدائے

کہ جہاں را ز خلق خالی کرد   اندریں دور گم شدہ سرپائے
یا ازیں شغل دور کن او را   یا مرا خدمتِ دگر فرمائے

یعنی فرشتۂ موت خدا کے حضور میں رو رو کر عرض کر رہا تھا کہ اصیل طبیب نے تو دنیا خالی کر دینے پر کمر باندھ رکھی ہے اس لئے یا تو اس کے لئے کوئی اور پیشہ تجویز کر یا مجھے کسی اور خدمت پر مامور فرما۔

۱۱ــــ کمال الدین اسماعیل کو اس کے خواجہ نے کچھ غلہ عنایت کیا جو اچھا نہ تھا۔ اس نے تین شعر کا قطعہ شکایت میں لکھا۔ ملاحظہ ہو:۔

غلہ کامسال داد خواجہ مرا   گر نہ بُد جملہ بود اکثر خاک
نسبت خاک وگندمش باہم   ہمچناں بد کہ تخم اندر خاک
خاک مردم خورد، ندانستم   کہ خورد مردم اے برادر خاک

امسال خواجہ نے مجھے غلہ عنایت کیا جو اگر سب کا سب مٹی نہ تھا تو اس کا اکثر حصہ ضرور مٹی تھا، اور اسمیں گیہوں اور مٹی کی نسبت بالکل وہی تھی جیسے مٹی اور تخم کی ہوتی ہے۔ میں سنا کرتا تھا کہ مٹی انسان کو کھاتی ہے لیکن اب معلوم ہوا کبھی کبھی انسان بھی مٹی کھانے پر مجبور ہوتا ہے۔

۱۲ــــ کاتبی نیشاپوری کو کسی امیر کی طرف سے کوئی سالانہ امداد مقرر تھی لیکن وہ اتنی کم تھی کہ اس کا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔ چنانچہ ایکبار اس نے شکایت لکھ بھیجی کہ:۔

خسروا از خورد و پوشِ من نداری آگہی   چوں نباشد ہر دم از تو نالہ و افغاں مرا
نیستم کعبہ کہ در سالے دہی یک جامہ ام   یا نیم گردوں کہ روزے بس بود یک ناں مرا

یعنی تو جو میرے کھانے پینے کی طرف سے غافل ہے تو شکایت نہ کروں تو کیا کروں، بندہ نواز، میں کوئی کعبہ تو ہوں نہیں کہ سال میں صرف ایک لباس میرے لئے کافی ہو اور نہ آسمان ہوں کہ روزانہ صرف ایک روٹی پر (کنایہ ہے آفتاب کی طرف) قناعت کر لوں۔

۱۳ــــ کمال الدین اسماعیل کو کسی رئیس نے گھوڑا مرحمت کیا، لیکن شاعر کے پاس خود اسی کے لئے اسباب معیشت تنگ ہوتے ہیں وہ گھوڑے کو کیا کھلاتا۔ اس نے اس واقعہ کو ایک نہایت لطیف مکالمہ کے ذریعہ سے ظاہر کیا ہے:۔

دی اسپ مرا گفت کہ دایں چہ شک است   کاصطبل تو از نادیہائے فلک است
نے آب دراں نہ سبزہ، نے کاہ نہ جو   ایں جائے ستور نیست جائے ملک است

کل میرے گھوڑے نے مجھ سے کہا کہ تیرا اصطبل اس دنیا کی چیز تو ہے نہیں ممکن نہ ہے کوئی آسمانی

چیز ہو۔ نہ اس میں پانی ہے نہ سبزہ، نہ گھاس ہے نہ جو اس لئے یہاں بجائے گھوڑے کے تو کسی فرشتہ کو لاکر باندھ، میں یہاں کیا کروں گا۔

۱۴۔ رشدی سمرقندی نے وزیر کی مدح میں قصیدہ کہا لیکن کوئی صلہ اس کو نہ ملا۔ اس نے خفا ہو کر دو شعر اور لکھے

تو وزیری و منت مدحت گوئے — دست من بے عطا روا بینی

تو وزارت بمن سپار و مرا — مدحت گوئے تا عطا بینی

تو وزیر ہے اور میں تیرا مدح گو لیکن مفلس و محتاج۔ تو وزارت میرے سپرد کر اور میری تعریف میں قصیدہ لکھ تو پھر میں بتاؤں کہ انعام و صلہ کیونکر دیا جاتا ہے۔

۱۵۔ عبید زاکانی اپنے افلاس کا حال لکھتا ہے:۔

در خانۂ من زنیک و بد چیزے نیست — جز بنگے و پارۂ نمد چیزے نیست

از ہر چہ پزند نیست غیر از سودا — وز ہر چہ خورند جز لکد چیزے نیست

میرے گھر میں سوائے بھنگ اور کمل کے ٹکڑے کے اور کوئی چیز نہیں۔ پکانے کی چیز اگر کوئی ہے تو صرف "سودا" اور کھانے کی چیز اگر کوئی ہے تو صرف "لات"۔

۱۶۔ اسیری نے کسی بخیل امیر کے دسترخوان کا حال نہایت لطیف انداز میں بیان کیا ہے۔ لکھتا ہے:۔

ترا اے خواجہ کز امساک بر خواں — ز نعمتہائے الواں ہیچ اثر نیست

چو مہ بر نطع گردوں سفرہ ات را — شب از یک گردۂ نان بیشتر نیست

دے ہر کو شکست آں گردۂ ناں — اگرچہ دانم آں حد بشر نیست

کند گر دعوئے اعجاز شاید — کہ ایں معجز کم از شق القمر نیست

اے خواجہ تیرا دسترخوان آسمان سے کم نہیں کہ وہاں بھی چاند کی صرف ایک روٹی ہے اور یہاں بھی ایک اس لئے اگر کوئی شخص تیرے ساتھ کھانے میں شریک ہو سکے (جس کا بظاہر کوئی امکان نہیں) تو اس کا دعویٰ اعجاز غلط نہ ہوگا کیونکہ اس کا تیرے دسترخوان پر روٹی توڑنا گویا چاند کے دو ٹکڑے کرنا ہوگا۔

ڈراما اصحاب کہف